اردو دائرہ معارف اسلامیہ

زیر اہتمام

دانش گاہ پنجاب لاہور



شعبہ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

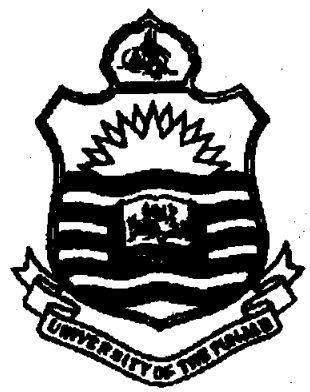
besturdubooks.wordpress.com

اردو

دائرۂ معارفِ اسلامیہ

زیرِ اہتمام

دانش گاہِ پنجاب، لاہور



جلد نمبر ۱۷

(ک..... الان)

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ادارۂ تحریر

مزسید محمد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ (پنجاب)	.....	رئیس ادارہ
پروفیسر سید محمد امجد الطاف، ایم اے (پنجاب)	.....	سینئیر ایڈیٹر
پروفیسر عبدالقیوم، ایم اے (پنجاب)	.....	سینئیر ایڈیٹر
پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی، ایم اے (پنجاب)	.....	ایڈیٹر
شیخ نذیر حسین، ایم اے (پنجاب)	.....	ایڈیٹر
ڈاکٹر عبدالغنی، ایم اے، پی ایچ ڈی (پنجاب)	.....	ایڈیٹر

مجلس انتظامیہ

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا، ایم ایس سی (علیگ)، پی ایچ ڈی (براؤن، یو ایس اے)، وائس چانسلر، دانش گاہ پنجاب (صدر مجلس)

۲۔ ڈاکٹر رفیق احمد، ایم اے (پنجاب)، بی اے (مانچسٹر)، ڈی فل (اوکسفرڈ)، پرو وائس چانسلر، دانش گاہ پنجاب لاہور

۳۔ جسٹس ڈاکٹر ایس، اے رحمٰن، حلال پاکستان، سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ، پاکستان، لاہو

۴۔ جسٹس مولوی مشتاق حسین، لاہور ہائی کورٹ، لاہور

۵۔ سید بابر علی شاہ، ۷۰۔ایف سی گلبرگ، لاہور

۶۔ معتمد مالیات، حکومتِ پنجاب، لاہور (یا نمائندہ)

۷۔ معتمد تعلیم، حکومتِ پنجاب، لاہور (یا نمائندہ)

۸۔ پروفیسر شیخ شیخ امتیاز علی، ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)، ایل ایل ایم (پنجاب)، ایل ایل ایم (سنفرڈ)، پرنسپل یونیورسٹی لاء کالج و ڈین کلیۂ قانون، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۹۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ (پنجاب)، ڈین کلیۂ علوم اسلامیہ و شرقیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۰۔ ڈاکٹر محمد نذیر رومانی، ایم ایس سی (پنجاب)، پی ایچ ڈی (لنڈن)، ڈین کلیۂ سائنس، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۱۔ رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۲۔ خازن، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۳۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ، پروفیسر ایمریطس، سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور (رکن و معتمد)

بار دوم: ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ

زیر نگرانی: ڈاکٹر محمود الحسن عارف

صدر شعبہ اور ادارہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

اختصارات ورموز وغیرہ

اختصارات

(الف)

عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ کتب اوران کے تراجم اور بعض مخطوطات، جن کے حوالے اس موسوعہ میں بکثرت آئے ہیں

آ آ=اردو دائرہ معارف اسلامیہ

آ آ، ت=اسلام انسائیکلوپیڈیا (=انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ترکی)

آ آ، ع=دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (=انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، عربی)

آ آ، لائیڈن ۱ یا ۲=Encyclopaedia of Islam (=انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، انگریزی)، باراوّل یا دوم، لائیڈن.

ابن الابّار= کتاب تکملۃ الصلۃ، طبع کودیرا F.Codera، میڈرڈ ۱۸۸۷ تا ۱۸۸۹ء (BAH, V-VI).

ابن الابّار= تکملہ=M.Alarcony Palencia - C.A.Gonzalez: *Apendice a la adicion Codera de Tecmila Misc de estudios y textos arabes*، میڈرڈ ۱۹۱۵ء.

ابن الابّار، جلد اوّل= ابن الابار= تکملۃ الصلہ، *Texte arabe d' apres un ms.de Fes, tome I, completant les deux vol. edites par F. Codera* طبع A. Bel و محمد ابن شنب، الجزائر ۱۹۱۸ء.

ابن الاثیر ایا ۲ یا ۳ یا ۴= کتاب الکامل، طبع ٹورنبرگ C.J.Tornberg، بار اول، لائیڈن ۱۸۵۱ تا ۱۸۷۶ء، یا بار دوم، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، یا بار سوم، قاہرہ ۱۳۰۳ھ، یا بار چہارم، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ۹ جلدیں.

ابن الاثیر، ترجمہ فاینان= *Annales du Maghreb et de l' Espagne*، ترجمہ فاینان E.Fagnon، الجزائر ۱۹۰۱ء.

ابن بشکوال= کتاب الصلۃ فی اخبار ائمۃ الاندلس، طبع کودیرا F. (Codera)، میڈرڈ ۱۸۸۳ء (BAH, II).

ابن بطوطہ= تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار (Voyages d' Ibn Bato cota)، عربی متن، طبع فرانسیسی مع ترجمہ از *C.Defremery و B.R.sanguinetti*، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۵۳ تا ۱۸۵۸ء.

ابن تغری بردی= النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ، طبع W. Popper، برکلے ولائیڈن ۱۹۰۸ تا ۱۹۳۶ء.

ابن تغری بردی، قاہرہ= وہی کتاب، قاہرہ ۱۳۴۸ھ، ببعد.

ابن حوقل، کریمرز۔ وائٹ= ابن حوقل، ترجمہ J.H.Kramers and G. Wiet، بیروت ۱۹۶۴ء، دو جلدیں.

ابن حوقل= کتاب صورۃ الارض، طبع J.H.Kramers لائیڈن ۱۹۳۸ تا ۱۹۳۹ء (*BGA*,II، بار دوم)، ۲ جلدیں.

ابن خرداذبہ= المسالک والممالک، طبع ڈخویا (M.J.de Goeje) لائیڈن ۱۸۸۹ء (*BGA*, VI).

ابن خلدون: عبر (یا العبر): کتاب العبر ودیوان المبتداء والخبر ..... بولاق ۱۲۸۴ھ.

ابن خلدون: مقدمہ= *Prolegomenes d'Ebn Khaldoun* طبع E.Quatremere، پیرس ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۸ء (*et Notices Extraits,XVI-XVII*).

ابن خلدون: روزنتھال= *The Muqaddimah*، مترجمہ Franz Rosenthal، ۳ جلدیں، لنڈن ۱۹۵۸ء.

ابن خلدون: مقدمہ، دیسلان= *Les Prolegomensesd' Ibn Khaldun*، ترجمہ وحواشی M.de Slane، پیرس ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۸ء (طبع دوم) ۱۹۳۴ء

ابن خلکان= وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان، طبع وسٹنفلڈ (F.Wustenfeld)، گوٹنجن ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۰ء (حوالے شمار تراجم کے اعتبار سے دیئے گئے ہیں).

ابن خلکان= وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۸ جلد، بیروت ۱۹۶۸ تا ۱۹۷۲ء.

ابن خلکان= کتاب مذکور، مطبوعہ بولاق ۱۲۷۵ھ، قاہرہ ۱۳۱۰ھ.

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ابن خلکان، ترجمہ دیسلان Biographical dictionarol

دیسلان: کتاب وفیات الاعیان، ترجمہ M. de Slane، ۴ جلدیں، پیرس ۱۸۴۲ تا ۱۸۷۱ء.

ابن رستہ = الاعلاق النفیسہ، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۲۹۲ تا ۱۸۹۲ء (BGA, VII).

ابن رستہ، ویت Wiet: Les Atours precieux، مترجمہ G.wiet، قاہرہ ۱۹۵۵ء.

ابن سعد: کتاب الطبقات الکبیر، طبع زخاؤ (H.Sachau) وغیرہ، لائیڈن ۱۹۰۴ء تا ۱۹۴۰ء.

ابن عذاری: کتاب البیان المغرب، طبع کولن (G.S.Colin) ولیوی پروونسال (E.Levi-provencal)، لائیڈن ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۱ء؛ جلد سوم، پیرس ۱۹۳۰ء.

ابن العماد: شذرات = شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، قاہرہ ۱۳۵۰ تا ۱۳۵۱ھ (سنین وفیات کے اعتبار سے حوالے دیئے گئے ہیں).

ابن الفقیہ: مختصر کتاب البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۸۶ء (BGA. v).

ابن قتیبہ: شعر (یا الشعر) = کتاب الشعر والشعراء، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۴ء

ابن قتیبہ: معارف (یا المعارف) = کتاب المعارف، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۰ء.

ابن ہشام: کتاب سیرۃ رسول اللہ، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۰ء.

ابوالفداء: تقویم = تقویم البلدان، طبع رینو (J.T.Reinaud) و دیسلان (M.de Slane)، پیرس ۱۸۴۰ء.

ابوالفداء: تقویم، ترجمہ = Geographie d' Aboulfeda traduite de l' arabe en franciaz، ج ۱ و ۲/۱، از رینو، پیرس ۱۸۴۸ء و ج ۲/۲، از St.Guyard، ۱۸۸۳ء.

الادریسی: المغرب = Description de l' Afrique et de Espagne، طبع ڈوزی R. Dozy و ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء.

الادریسی، ترجمہ جوبار = Geographie d' Edrisi، مترجمہ P.A.Jauber، ۲ جلد، پیرس ۱۸۳۶ تا ۱۸۴۰ء.

الاستیعاب = ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۲ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۸/۱۳۱۹ھ.

الاشتقاق = ابن درید: الاشتقاق، طبع وسٹنفلٹ، گوٹنجن ۱۸۵۴ء (اناستاتیک).

الاصابہ = ابن حجر العسقلانی: الاصابہ، ۴ جلد، کلکتہ ۱۸۵۶ تا ۱۸۷۳ء.

الاصطخری = المسالک والممالک، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۰ء (BGA.I) و باردوم (نقل باراول) ۱۹۲۷ء.

الاغانی ۱، یا ۲، یا ۳: ابوالفرج الاصفہانی: الاغانی، باراول، بولاق ۱۲۸۵ھ، یا باردوم، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، یا بارسوم، قاہرہ ۱۳۴۵ھ و بعد.

الاغانی، برونو = کتاب الاغانی، ج ۲۱، طبع برونو R.E.Brunnow، لائیڈن ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ء.

الانباری: نزہۃ = نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء، قاہرہ ۱۲۹۴ھ.

البغدادی: الفرق = الفرق بین الفرق، طبع محمد بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء.

البلاذری: انساب = انساب الاشراف، ج ۴ و ۵، طبع M.Schlossinger، S D.F.Goitein، بیت المقدس (یروشلم) ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء.

البلاذری: انساب، ج ۱ = انساب الاشراف، ج ۱، طبع محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء.

البلاذری: فتوح = فتوح البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۶۶ء.

بیہقی: تاریخ بیہق = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تاریخ بیہق، طبع احمد بہمنیار، تہران ۱۳۱۷ش.

بیہقی: تتمہ = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تتمہ صوان الحکمۃ، طبع محمد شفیع، لاہور ۱۹۳۵ء.

بیہقی، ابوالفضل = ابوالفضل بیہقی: تاریخ مسعودی، Bibl.Indica.

ت ۱ = تکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

تاج العروس: محمد مرتضی بن محمد الزبیدی: تاج العروس.

تاریخ بغداد = الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۴ جلدیں، قاہرہ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء.

تاریخ دمشق = ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۷ جلدیں، دمشق ۱۳۲۹ء/۱۹۱۱ء تا ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۱ء.

تہذیب = ابن حجر العسقلانی: تہذیب التہذیب، ۱۲ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء تا ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء.

www.besturdubooks.wordpress.com

الثعالبی: یتیمۃ = الثعالبی: یتیمۃ الدھر، دمشق ۱۳۰۴ھ.

الثعالبی: یتیمۃ، قاہرہ = کتاب مذکور، قاہرہ ۱۹۳۴ء.

جوینی = تاریخ جہاں کشا، طبع محمد قزوینی، لائڈن ۱۹۵۶ تا ۱۹۳۷ء (GMS XVI)

حاجی خلیفہ: جہان نما = حاجی خلیفہ: جہان نما، استانبول ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء.

حاجی خلیفہ = کشف الظنون، طبع محمد شرف الدین یالتقایا (S.Yaltkaya) ومحمد رفعت بیلگہ الکلیسلی (Rifat Bilge Kilisli)، استانبول ۱۹۴۱ تا ۱۹۴۳ء.

حاجی خلیفہ، طبع فلوگل = کشف الظنون، طبع فلوگل (Gustavus Flugel)، لائپزگ ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۸ء.

حاجی خلیفہ: کشف = کشف الظنون، ۲ جلدیں، استانبول ۱۳۱۰ تا ۱۳۱۱ھ.

حدود العالم = The Regions of the World، مترجمہ منورسکی V.Minorsky، لنڈن ۱۹۳۷ء (GMS, XI، سلسلہ جدید).

حمداللہ مستوفی: نزہۃ = حمداللہ مستوفی: نزہۃ القلوب، طبع لی سٹرینج (Le Strange)، لائیڈن ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۹ء (GMS, XXIII).

خواندامیر: حبیب السیر تہران ۱۲۷۱ھ و بمبئی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء.

الدرر الکامنۃ = ابن حجر العسقلانی: الدرر الکامنۃ، حیدرآباد ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۰ھ.

الدمیری = الدمیری: حیوۃ الحیوان (کتاب کے مقالات کے عنوانوں کے مطابق حوالے دیے گئے ہیں).

دولت شاہ = دولت شاہ: تذکرہ الشعراء، طبع براؤن E.G. Browne، لنڈن ولائیڈن ۱۹۰۱ء.

ذہبی: حفاظ = الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۴ جلدیں، حیدرآباد (دکن) ۱۳۱۵ھ.

رحمان علی = رحمان علی: تذکرہ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۹۱۴ء.

روضات الجنات = محمد باقر خوانساری: روضات الجنات، تہران ۱۳۰۶ھ.

زامباور، عربی = عربی ترجمہ، از محمد حسن وحسن احمد محمود، ۲ جلدیں، قاہرہ ۱۹۵۱ تا ۱۹۵۲ء.

زبیری، نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع پروونسال، القاہرہ ۱۹۵۳ء

الزرکلی، اعلام = خیرالدین الزرکلی: الاعلام تاموس تراجم لاشہر الرجال والنساء من العرب والمستعربین والمستشرقین، ۱۵ جلدیں، دمشق ۱۳۷۳ تا ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۹ء.

السبکی = السبکی: طبقات الشافعیۃ، ۶ جلد، قاہرہ ۱۳۲۴ھ.

سجل عثمانی = محمد ثریا: سجل عثمانی، استانبول ۱۳۰۸ تا ۱۳۱۶ھ.

سرکیس = سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، قاہرہ ۱۹۲۸ تا ۱۹۳۱ء.

السمعانی، عکسی = کتاب الانساب، طبع باعتناء مرجلیوث D.S.Margoliouth، لائیڈن ۱۹۱۲ء (GMS, XX).

السمعانی، طبع حیدرآباد = کتاب مذکور، طبع محمد عبدالمعید خاں، ۱۳ جلدیں، حیدرآباد، ۱۳۸۲ھ، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۶۲ء-۱۹۸۲ء.

السیوطی: بغیۃ = بغیۃ الوعاۃ، قاہرہ ۱۳۲۶ھ.

الشہرستانی = الملل والنحل، طبع کیورٹن W.Cureton، لنڈن ۱۸۴۶ء.

الضبی، الضبی = بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس، طبع کودیرا (Codera) و ریبیرا (J.Ribera)، میڈرڈ ۱۸۸۴ تا ۱۸۸۵ء (BAH, III).

الضوء اللامع = السخاوی: الضوء اللامع، ۱۲ جلد، قاہرہ ۱۳۵۳ تا ۱۳۵۵ھ.

الطبری: تاریخ الرسل والملوک، طبع ڈخویا وغیرہ، لائیڈن ۱۸۷۹ء تا ۱۹۰۱ء.

عثمانلی مؤلفلری = بروسہ لی محمد طاہر، استانبول ۱۳۳۳ھ.

العقد الفرید = ابن عبد ربہ: العقد الفرید، قاہرہ ۱۳۲۱ھ.

علی جواد = علی جواد: ممالک عثمانیین تاریخ وجغرافیہ لغاتی، استانبول ۱۳۱۳-۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۹ء.

عوفی: لباب = لباب الالباب، طبع براؤن، لنڈن ولائیڈن ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۶ء.

عیون الانباء = طبع مُلر A.Muller، قاہرہ ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۲ء.

غلام سرور = غلام سرور، مفتی: خزینۃ الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۴ء.

غوثی ماندوی: گلزار ابرار = ترجمہ اردو موسوم بہ اذکار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ.

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

فرشتہ = محمد قاسم فرشتہ: گلشن ابراہیمی، طبع سنگی، ممبئی ۱۸۳۲ء.

فرہنگ = فرہنگ جغرافیائی ایران، از انتشارات دائرۂ جغرافیائی ستاد ارتش، ۱۳۲۸ تا ۱۳۲۹ھ ش.

فرہنگ آنندراج = منشی محمد بادشاہ: فرہنگ آنندراج، ۳ جلد، لکھنؤ ۱۸۸۹ تا ۱۸۹۴ء.

فقیر محمد = فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیۃ، لکھنؤ ۱۹۶۰ء.

فلٹن و لنگز: Alexander S. Fulton و Martin Lings: *Second Supplementary Catalogue of Arabic printed Books in the British Museum*، لنڈن ۱۹۵۹ء.

فہرست (یا الفہرست) = ابن الندیم: کتاب الفہرست، طبع فلوگل، لائپزگ ۱۸۷۱ تا ۱۸۷۲ء.

(ابن) القفطی = ابن القفطی: تاریخ الحکماء، طبع لپرٹ J. Lippert، لائپزگ ۱۹۰۳ء.

الکتبی، طبع بولاق، فوات = ابن شاکر الکتبی: فوات الوفیات، ۲ جلد بولاق ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء.

الکتبی، فوات طبع عباس = وہی کتاب، طبع احسان عباس، ۵ جلد، بیروت ۱۹۷۳ تا ۱۹۷۴ء.

لسان العرب = ابن منظور: لسان العرب، ۲۰ جلدیں، قاہرہ ۱۳۰۰ تا ۱۳۰۸ھ.

م آ آ = مختصر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ.

مآثر الامراء = شاہنواز خان: مآثر الامراء، Bibl Indica.

مجالس المؤمنین = نور اللہ شوستری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ھ ش.

مرآۃ الجنان = الیافعی: مرآۃ الجنان، ۴ جلد، حیدرآباد (دکن) ۱۳۳۹ھ.

مسعود کیہان = مسعود کیہان: جغرافیائی مفصل ایران، ۱ جلد، تہران ۱۳۱۰ و ۱۳۱۱ھ ش.

المسعودی: مروج: مروج الذہب، طبع باربیہ مینارد (C.Barbier de Meynard) و پاوہ دکورتی (Pevet de Courteille)، پیرس ۱۸۶۱ تا ۱۸۷۷ء.

المسعودی: التنبیہ = المسعودی: کتاب التنبیہ والاشراف، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۹۴ء (BGA. VIII).

المقدسی = المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۷۷ء (BGA. VIII).

المقری: Analectes = المقری: نفح الطیب فی غصن الاندلس الرطیب، *Analectes sur l' histoire et la litterature des Arabes de l' Espagne*، لائیڈن ۱۸۵۵ تا ۱۸۶۱ء.

المقری، بولاق = کتاب مذکور، بولاق ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء.

منجم باشی: صحائف الاخبار، استانبول ۱۲۸۵ھ.

میرخواند: روضۃ الصفاء، بمبئی ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء.

نزہۃ الخواطر = حکیم عبدالحی: نزہۃ الخواطر، حیدرآباد ۱۹۴۷ء بعد.

نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع لیوی پروونسال، قاہرہ ۱۹۵۳ء.

الوافی = الصفدی: الوافی بالوفیات، ج ۱، طبع رٹر (Ritter)، استانبول ۱۹۳۱ء؛ ج ۲ و ۳، طبع ڈیڈرنگ (Dedering)، استانبول ۱۹۴۹ و ۱۹۵۳ء.

الہمدانی = الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع ملر (D.H.Muller)، لائیڈن ۱۸۸۴ تا ۱۸۹۱ء.

یاقوت طبع وسٹنفلٹ: معجم البلدان، طبع وسٹنفلٹ، ۵ جلدیں لائپزگ ۱۸۶۶ تا ۱۸۷۳ء (طبع انا ستاتیک، ۱۹۲۴).

یاقوت: ارشاد (یا ادباء) = ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب، طبع مرجلیوث، لائیڈن ۱۹۰۷ تا ۱۹۲۷ء (*GMS.VI*): معجم الادباء، (طبع انا ستاتیک، قاہرہ ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء.

یعقوبی (یا الیعقوبی) = الیعقوبی: تاریخ، طبع ہوتسما (W. Th. Houtsma) لائیڈن ۱۸۸۳ء؛ تاریخ الیعقوبی، ۳ جلد، نجف ۱۳۵۸ھ؛ ۲ جلد، بیروت ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء.

یعقوبی: بلدان (یا البلدان) = الیعقوبی: (کتاب) البلدان، طبع ڈخویا، لائیڈن ۱۸۹۲ء (*BGA. VII*).

یعقوبی، ویت = Wiet، *Yaqubi, Les pays*، مترجمہ G. Wiet، قاہرہ ۱۹۳۷ء.

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

(ب)

کتب انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، جدید ترکی وغیرہ کے اختصارات، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

Al-Aghani:*Tables=Tables Alphabetiques du Kitab al-aghani, redigees par I. Guidi*, Leiden 1900.

Babinger= F. Babinger: *Die Geschichtschreiber der Osmanen und ihre Werke*, 1st ed.,Leiden 1927.

Barkan: Kanunlar= *Omar Lutfi Barkan: XV ve XVI inci Asirlarda Osmanli. Imparat orlugunda Zirai Ekonominin Hukuki ve Mali Esaxlari, I. Kanunlar*, Istanbul 1943.

Blachere: *Litt.*=R. Blachere: *Histoire de la Litterature arabe, i*, Paris 1952.

Brockelmann, I, II=C. Brockelmann: *Geschichte der Arabischen Litteratur, Zweite den Supplement-banden angepasste Auflage*. Leiden 1943-1949.

Brockelmann, *SI*, II, III=*G.d A.L., Erster (Zweiter, Dritter). Supplementband*, Leiden 1937-42.

Brown i = E.G.Brown: *Al literary History of Persia, from the earliest times until Firdowsi* London 1902.

Browne, ii=*A Literary History of Persia, from Firdawsi to Sadi*, London 1908.

Browne, iii=*A History of Persian Literarture under Tartar Dominion*, Cambridge 1920.

Browne, iv=*A History of Persian Literature in Modern Times*, Cambridge 1924.

Caetani: *Annali*=L. Caetani: *Annali dell' Islam, Milano* 1905-26.

Chauvin: *Bibliographie*=V. Chauvin: *Bibliographie des ouvrages arabes et relatifs aux Arabes*, Lille 1892.

Dorn: *Quelen*=B. Dorn: *Muhammedanische Quellen zur Geschichte der sudlichen Kustenlander des Kaspischen, Meeres*, St. Petersburg 1850-58.

Dozy: *Notices*=R. Dozy: *Notices sur quelques manuscrits arabes*, Leiden 1847-51 and D.S. Margoliouth, London 1937.

Dozy :*Recherches*= R. Dozy : *Recherches sur l'histoire et la litterature de l' Espagne Pendant le maoyen-age*, 3rd ed., Paris-Leiden 1881.

Dozy, *Suppl.*=R.Dozy :*Supplement aux dictionnaires* arabes, 2nd ed., Leiden-Paris 1927.

Fagnan :*Extraits* =E. Fagnan: *Extraits incdits relatifs au Maghreb*, Alger 1924.

Gesch. *des Qor.*=Th. Noldeke: *Geshichte des Qorans*, new edition by F. Schwally, G. Bergst rrasser and O. Pretzl, 3 vols., Leipzig 1909-38.

Gibb: *Ottoman Poetry*= E.J.W. Gibb: *A History of Ottoman Poetry*, London 1900-09.

Gibb-Bowen= H.A.R. Gibb and Harold Bowen: *Islamic Society and the West*, London 1950-57.

Goldziher:*Muh.St.*=1.Goldziher: *Muhammedanische Studien*, 2 Vols., Halle 1888-90

Goldziher :*Vorlesungen*= I Goldziher :*Vorlesungen uber den Islam*, Heidelburg 1910.

Goldziher:Vorlesungen^2=2nd ed., Heidelberg 1925.

Goldziher: Dogme= *Le dogme et la loi del Islam*, tr. F. Amin, Paris 1920.

Hammer-Purgstall: GOR=J.von Hammer (purgstall) : *Geschichte des Osmanischen Reiches*, Pest 1828-35.

Hammer-Purgstall:*GOR*^{2}=the same, 2nd ed., Pest 1840.

Hammer-Purgstall,:*Histoire*=the same, trans by J.J. Hellert, 18 vol., Bellizard (etc.), Paris (etc.)

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

1835-43.

Hammer-Purgstall: *Staatsverfassung*=J. von Hammer: *Des Osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*, 2 vols., Vienna 1815.

Houtsma: *Recueil*= M.Th. Houtsma: *Recueil des texes relatifs a l'histoire des Seldjoucides*. Leiden 1886-1902.

Juynboll: Handbuch=Th. W. Juynboll: *Handbuch des islamischen Gesetzes*, Leiden 1910.

Juynboll: *Handleiding*= *Handleiding tot de kennis der mohammedaansche wet*, 3rd ed., Leiden 1925.

Lane=E.W. Lane: *An Arabic-English Lexicon*, London 1863-93 (Reprint, New York 1955-56).

Lane-Poole: *Cat*=S. Lane-Poole: *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum*, 1877-90.

Lavoix: Cat.=H. Lavoix: *catalogue des Monnaies Musulmanes de la Bibliotheque Nationale*, Paris 1887-96.

Le Strange=G Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate* 2ne ed., Cambridge 1930 (Reprint, 1966).

Le Strange: *Baghdad*=G. Le Strange: *Baghdad during the Abbasid Caliphate*. Oxford 1924.

Le Strange: Palestine=G. Le Strange: *Palestine under the Moslems*, London 1890 (Reprint, 1965).

Levi-Provencal: Hist. Esp. Mus.=E.Levi-Provencal: *Histoire de l' Espagne Musulmane*, nouv. ed., Leiden-Paris 1950-53, 3 vols.

Levi-Provencal: Hist.Chorfa=E. Levi-Provencal: Les *Historiens des Chorfa*, Paris 1922.

Maspero-Wiet: *Materiaux*=J Maspero et G. Wiet: *Materiaux pour servir a la Geographie de l'Egypte*. Le Caire 1914 (Mifao, XXXVI).

Mayer: Architects= L.A. Mayer: *Islamic Architects. and their Works*, Geneva 1958.

Mayer: Astrolabists=L.A. Mayer: *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1956.

Mayer: Metalworkers=L.A. Mayer: *Islamic Astrolabists and their Works*, Geneva 1959.

Mayer: Woodcarvers=L.A. Mayer: *Islamic Woodcarvers and their Works*, Geneva 1958.

Mez: Renaissance= A. Mez: *Die Renaissance des Islams*, Heidelberg 1922, (Spanish Translation by s. vila, Madrid- Granadal 1936).

Mez: *Renaissance*, Eng. tr.=the same, English translation by Salahuddin Khuda Bukhsh and D.S Margoliouth Londen 1937.

Nallino: Scritti=C.A. Nallino: *Raccolta di Scritti editi e inediri*, Roma 1939-48.

Pakahn=Mehmet Zeki Pakahn: *Osmanli Tarih Deyimleri ve Terimleri Sozlugu*, 3 vols., Istanbul 1946 ff.

Pauly-Wissowa=*Realenzyklopaedie* des klassischen Altertums.

Pearson=J.D. Pearson: *Index Islamicus*, Cambridge 1958.

Pons Boigues=*Ensayo bio-bibliografico sobre los historiadores y geografos arabio-espanole*, Madrid 1898.

Rypka, *Hist of Iramican litteratuare*= J.Rypka et alii, *History of Iramian literature*, Dordrecht 1968.

Santillana: *Istituzioni*=D. Santillana: *Istituzioni di diritto musulmano malichita*, Roma 1926-38.

Schlimmer=John L. Schlimmer: *Terminologie medico-Pharmaceutique et Anthropologique*, Tehran 1874.

Schwarz: *Iran*=P. Schwarz: *Iran im Mittelalter nach den arabischen Geographen*, Leipzig 1896.

Smith=W.=Smith: *A Classical Dictionary of Biography, Mythology and Geography*

Hurgronje: *Verspr. Ged Geography*, London

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

1853.

Snouck Hurgronje: *Verspr. Geschr.*=C. Snouck Hurgronje: *Verspreide Geschriften* Bonn Leipzig-Leiden 1923-27.

Sources ined=Comte Henri de Castries: *Les Sources inedites de l' Histoire du Maroc*, Paris 1905, 1922.

Spuler: *Horde*= B. Spuler: *Die Golaene Horde* eipzig 1943.

Spuler: Iran=B.Spuler: *Iran in fruh-Islamischer Zeit*, Wiesbaden 1952.

Spuler: Mongolenz=B. Spuler: *Die Mongolen in Iran*, 2nd. ed. Berlin 1955.

SNR=Stephan and Naudy Ronart: *Concise Encyclopaedia of Arabic Civilization*, Djambatân Amsterdam 1959.

Storey=C.A. Storey: *Persian Litrerature: a biobibliographical survey*, London 1927.

Survey of Persian Art = ed.by A.U.Pope, Oxford 1938.

Suter=H.Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke*, Leipzig 1900.

Taeschner: *Wegenetz*=F.Taeschner: *Die Verkehrsiage und den Wegenetz Anatoliens im Wandel der Zeiten*, Gotha 1926.

Tomaschek=W.Tomaschek: *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter*, Vienna 1891.

Wensinck: *Handbook*=A.J. Wensinck: *A Hand book of Early Muhammadan Tradition*, Leiden 1927.

Wiel: *Chalifen*=G.Weil: *Geschichte der Chalifen, Mannheim*-Stuttgart 1846-82.

Zambaur=E.de Zambaur: *Manual de de genealogie et de chronologie pour l'histoire de l'Islam*. Hanover 1927 (anastatic reprint, Bad Pyrmont 1955).

Zinkeisen=J. Zinkeisen: *Geschichte des Osmanischen Reiches in Europa*, Gotha 1840-83.

Zubaid Ahmad=*The Contribution of India to Arabic Literature*, Allahbad 1946 (reprint, Lahore 1968).

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

(ج)

مجلات، سلسلہ ہائے کتب، وغیرہ، جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

AB=Archives Berbers.

Abh. G. W. Gott=*Abhandlungen der Gesellschaft der Wissenschaften zu Gottingen.*

Abh. K.M.=*Abhandlungen f.d. Kunde des Morgenlandes.*

Abh. Pr. AK. W.= Abhandiungen d. preuss. Akad. d. Wiss.

Afr. Fr.=Bulletin du Comite de l'Afrique francaise.

Afr. Fr. RC=Bulletin du Com. de l' Afr. franc., Renseignements Coloniaux.

AIEO Alger=Annales de l' Institute d' Etudes Orientales de l' Universite d' Alger.

AIUON=Annali dell' Instituto Univ. Orient, di Napoli.

AM=Archives Marocaines.

And=Al-Andalus.

Anth=Anthropos.

Anz. wien=Anzeiger der philos-histor. Ki. d. Ak. der Wiss. Wien.

AO=Acta Orientalia.

Arab.=Arabica

ArO=Archiv Orientalni

ARW=Archiv fur Religionswissenschaft.

ASI=Archaelogical Survey of India.

ASI. NIS=the same, New Imperial Series.

ASI. AR=the same, Annual Reports.

AUDTCFD=Ankara Universitesi Dil ve arihcografya Fakultesi Dergisi.

As. Fr. B= Bulletin du Comite de l' Asie Francaise.

BAH=Bibliotheca Arabico-Hispana.

BASOR=Bulletin of the American School of Oriental Research.

Bell=Turk Tarih Kurumu Belleten.

BFac. Ar. = Bulletin of the Faculty of the Egyptian University.

BEt. Or. = Bulletin d' Etudes Orientales de l'Institut Francaise Damas.

BGA=Bibliotheca geographorum arabicorum.

BIE=Bulletin de l' Instutut Egyptien.

BIFAO=Bulletin de l' Institut Francais J' Arachcologie Orientale du Caire.

BIS=Bibliotheca Indica series.

BRAH=Boletin de la Real Academia de la Historia de Espana.

BSE=Bolshaya Sovetskaya Entsiklopediya (Large Soviet Encyclopaedia), Ist ed.

BSE^2=the Same, 2nd ed.

BSL(P)=Bulletin de la Societe de Linguisttq (de Paris).

BSO(A)S=Bulletin of the School of Oriental (and African) Studies.

BTLV=Bijdragen tot de Taal, Land-en Volkenkunde (van Ned-Indie).

BZ=Byzantinische Zeitschrift.

COC=Cahiers de l' Orient Contemporain.

CT=Cahiers deTunisie.

EI^1=Encyclopaedia of Islam, 1st edition.

EI^2=Encyclopaedia of Islam, 2nd edition.

EIM=Epigraphia Indo-Moslemica.

ERE=Encyclopaedia of Religion and Ethics.

GGA=Gottinger Gelehrte Anzeigen.

GJ=Geogra phical Journal.

GMS=Gibb Memorial Series.

Gr. I. ph=Grundriss der Iranischen Philologie.

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

GSAI=Giornale della Soc. Asiatica Italiana.

Hesp.=Hesperis.

IA=Islam Ansiklopedisi (Turkish).

IBLA=Revue de l'Institut des Belles Letters Arabes, Tunis.

IC=Islamic Culture.

IFD=Ilahiyat Fakultesi.

IG=Indische Gids.

IHQ=Indian Historical Quarterly.

IQ=The Islamic Quarterly.

IRM=International Review of Missions.

Isl.=Der Islam.

JA=Journal Asiatique.

JAfr. S.=Journal of the African Society.

JAOS=Journal of the American Oriental Society.

JAnthr. I=Journal of the Anthropological Institute.

JBBRAS=Journal of the Bombay Branch of the Royal Asiatic Society.

JE.=Jewish Encyclopaedia.

JESHO=Journal of the Economic and Social History of the Orient.

JNES=Journal of Near Eastern Studies.

JPak.HS=Journal of the Pakistan Historical Society.

JPHS=Journal of the Punjab Historical Society.

JQR=Jewish Quarterly Review.

JRAS=Journal of the Royal Asiatic Society.

J(R)ASB=Journal and Proceedings of the (Royal) Asiatic Society of Bengal.

J(R)Num.S=Journal of the (Royal) Numismatic Society.

JRGeog.S=Journal of the Royal Geographical Society.

JSFO=Journal de la Societe Finno-ougreine.

JSS=Journal of Semetic studies.

KCA=Korosi Csoma Archivum.

KS=Keleti Szemle (Revue Orientale).

KSIE=Kratkie Soobshceniya Instituta Etnografiy (Short Communications of the Institute of Ethnography).

LE=Literaturnaya Entsiklopediya (Literary Encyclopaedia).

Mash.=Al-Mashrik.

MDOG=Mitteilungen der Deutschen Orient- Gesells chaft.

MDVP= Mitteilungen und Nachr. des. Deutschen Palistina- vereins.

MEA=Middle Eastern Affairs.

MEJ=Middle East Journal.

MFOB=Melanges de la Faculte Orientale de Beyrouth.

MGG Wien=Mitteilungen der geographischen Gesellschaft in Wien.

MGMN=Mitt. Geschichte der Medizin und der naturwissenshaften.

MGWJ=Monatsschrift f. d. Geschichte u. Wissen schaft des Judentums.

MI=Mir Islama.

MIDEO=Melanges de l' Institut Dominicain d' Etudes Orintales du Caire.

MIE=Memoires de l' Institut d' Egyptien.

MIFAO=Memories publies par les members de l' Inst. Franc d' Aracheologie Orientale du Caire.

MMAF=Memoires de la Mission Archeologique Franc au Caire.

MMIA=Madjallat al-Madjmaal-ilmi al Arabi Damascus.

MO=Le Monde oriental.

MOG=Mitteilungen zur osmanischen Geschichte.

MSE=Malaya Sovetskaya Entsiklopediya-(Small Soviet Encyclopaedia).

MSFO=Memoires de la Societe Finno-ougrienne.

MSL=Memoires de la Societe Linguistique de Paris.

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

MSOS Afr.=Mitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Afr. Studien.

MSOS As.= fitteilungen des Sem. fur Oriental. Sprachen Westasiatische Studien.

MTM=Mili Taebbuler medjmuast.

MVAG=Mitteilungen der Vorderasiatisch -agyptischen Gesellschaft.

MW=The Muslim World.

NC=Numismatic Chronicle.

NGW Gott.=Nachrichten von d. Gesellschaft d. Wiss. zu Gottingen.

OA=Orientalisches Archiv.

OC=Oriens Christianus.

OCM=Oriental College Magazine, Lahore.

OCMD=Oriental College Magazine, Damima, Lahore

OLZ=Orientalistische Literaturzeitung.

OM=Oriente Moderno.

Or.=Orions.

PEFQS=Palestine Exploration Fund Quarterly Statement.

PELOV=Publications de l' Ecole des langues orientales vivantes.

Pet.Mitt.=Petermanns Mitteilungen.

PRGS=Proceedings of the R. Geographical Society.

QDAP=Quarterly Statement of the Department of Antiquities of Palestine.

RAfr.=Revue Africaine.

RCEA=Repertoire Chronologique d'Epigrapie arabe.

REI=Revue des Etudes Islamiques.

REJ=Revue des Etudes Juives.

Rend. Lin.=Rendiconti della Reale Accad. dei Lincei, Cl. di sc. mor., stor. e filol.

RHR=Revue de l' Histoire des Religions.

RI=Revue Indigene.

RIMA=Revue de l' Institut des manuscrits Arabes.

RMM=Revue du Monde Musulman.

RO=Rocznik Orientalistyczny.

ROC=Revue de l' Orient Chretien.

ROL=Revue de l' Orient Latin.

RRAH=Rev. de la R. Academia de la Histoira, Madrid.

RSO=Rivista degli Studi Orientali.

RT=Revue Tunistenne.

SBAK. Heid.=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Heidelberg.

SBAK. Wien=Sitzungsberichte der AK. der Wiss. zu Wien.

SBBayr. AK.=Sitzungsberichte der Bayrischen Akademie der Wissenschaften.

SBPMS Erlg.=Sitzungsberichte d. Phys. medizin. Sozietat in Erlangen.

SBPr. AK. W.=Sitzungsberichte der preuss. AK. der wiss. zu Berlin.

SE=Sovetskaya Etnografiya (Soviet Ethnography).

SI=Studai Islamica.

SO=Sovetkoe Vostokovedenie (Soviet Orientalism).

Stud. Isl.= Studia Islamica.

S.Ya.=Sovetskoe Yazikoznanie (Soviet Linguistics).

SYB=The Statesman's Year Book.

TBG=Tijdschrift van het Bataviaasch Genootschap van Kunsten en Wetenschappen.

TD=Tarih Dergisi.

TIE=Trudi instituta Etnografih (Works of the Institute of Ethnography).

TM=Turkiyat Mecmuasi

TOEM=Tarikh i Othmani (Turk Tarikhi) Endjumeni medjmu ast.

TTLV=Tijdschrift. v. Indische Taal, Land en Volkenkunde.

Verh. Ak. Amst.=Verhandelingen der Koninklijke

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Akademie van Westenschappen te Amsterdam.

Versl.Med. AK. Amst = Verslagen en Mededeelingen der Koninklijke Akademie van wetenschappen te Amsterdam.

VI=Voprosi Istority (Historical problems).

WI=Die Welt des Islams.

WI.NS=the same, New Series.

Wiss. Veroff. DOG = Wissenschaftliche Veroffentlichungen der Deutschen Orient-Gesellschaft.

WMG=World Muslim Gazetteer, Karachi.

WZKM=Wiener Zeitschrift fur die Kunde des Morgenlandes.

ZA=Zeltschrift fur Assyriologie.

Zap.=Zapiski.

ZATW=Zeitschrift fur die alttestamentliche Wissenschaft.

ZDMG=Zeitschrift der Deutschen Morgenlandischen Gesellschaft.

ZDPV=Zeitschrift des Deutschen Palasatinavereins.

ZGErdk. Berl.=Zeitschrift der Gesellschaft fur Erdkunde in Berlin.

ZK=Zeitschrift fur Klonialsprachen.

ZOEG=Zeitschrift f. Osteuropaische Geschichte.

ZS=Zeitschrift fur Semitistik.

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

علامات و رموز و اعراب

(۱)

علامات

※ مقالہ، ترجمہ از آ، لائیڈن

⊗ جدید مقالہ، برائے اردو دائرہ معارف اسلامیہ

[] اضافہ، از ادارہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ

(۲)

رموز

ترجمہ کرتے وقت انگریزی رموز کے مندرجہ ذیل اردو متبادل اختیار کیے گئے ہیں:

f.,ff.,sq.,sqq.	=	بعد	
s. v.	=	بذیل مادّہ (یا کلمہ)	
see; s.	=	دیکھیے: کسی کتاب کے حوالے کے لیے	
q.v.	=	رک بہ (رجوع کنید بہ) یا رک بآں (رجوع کنید بآں): آ آ کے کسی مقالے کے حوالے کے لیے	
passim.	=	بمواضع کثیرہ	
op.cit.	=	کتاب مذکور	
cf.	=	دیکھیے لغوی مفہوم (قارب یا قابل)	
B.C.	=	ق۔م (قبل مسیح)	
d.	=	م (متوفی)	
loc. cit.	=	محل مذکور	
ibid.	=	کتاب مذکور	
idem.	=	وہی مصنف	
A.H.	=	ھ (سنہ ہجری)	
A.D.	=	ء (سنہ عیسوی)	

(۳)

اعراب

(ا)

Vowels

فتحہ (ـَ)	=	a	
کسرہ (ـِ)	=	i	
ضمہ (ـُ)	=	u	

(ب)

Long Vowels

ا، آ	=	ā	(آج کل: ājkal)
ی	=	ī	(رحیم: Sim)
و	=	u	(ہارون الرشید: Harūn al-Rashīd)
اے	=	ai	(سیر: Sair)

(ج)

ـِـ	=	e آواز کو ظاہر کرتی ہے (پن: pen)
ـُـ	=	o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (مول: mole)
ـُـ	=	u کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (تورکیہ: Turkiya)
ـُو	=	o کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (کورل: kol)
ـَـ	=	ä کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (اُرَجّب: ärädjäb؛ رَجّب: rädjäb)
ـْـ	=	علامت سکون یا جزم (بِسْمِل: bismil)

www.besturdubooks.wordpress.com

متبادل اردو عربی حروف

ب	=	b	ح	=	ḥ	س	=	s	گ	=	g
بھ	=	bh	خ	=	Kh	ش	=	sh، ch	گھ	=	gh
پ	=	p	د	=	d	ص	=	ṣ	ل	=	l
پھ	=	ph	دھ	=	dh	ض	=	ḍ	لھ	=	lh
ت	=	t	ڈ	=	d̄	ط	=	ṭ	م	=	m
تھ	=	th	ڈھ	=	dh	ظ	=	ẓ	مھ	=	mh
ٹ	=	t	ڑھ	=	dh	ع	=	،	ن	=	n
ٹھ	=	ṭh	ر	=	r	غ	=	gh	نھ	=	nh
ث	=	th	رھ	=	rh	ف	=	f	و	=	w
ج	=	dj	ڑ	=	ṛ	ق	=	ḳ	ہ	=	h
جھ	=	djh	ڑھ	=	ṛh	ک	=	k	ء	=	ۂ
چ	=	č	ز	=	z	کھ	=	kh	ی	=	y
چھ	=	ch	ژ	=	ž, zh						

besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ک

* **ک :** (کاف)؛ مروجہ عربی حروف تہجی کا بائیسواں، فارسی کا پچیسواں اور اردو کا اڑتیسواں حرف (ابجد کے لحاظ سے اس کے عدد ۲۰ ہوتے ہیں : دیکھیے مقالۂ ابجد) ۔ ک کا تلفظ ایک ایسے جنگی زوردار (explosive) حرف کی مانند ہے جس کی حلقی آواز نہیں ہوتی ۔ سیبویہ کے زمانے سے اب تک یہ علمی حلقوں کی بول چال میں اسی طرح پایا جاتا ہے ۔ آج کل کی مروجہ زبان میں ہمیں اس کی بعض مختلف شکلیں ملتی ہیں (علاوہ ک کے) بالخصوص رگڑدار (affricate) (چ č) (جس سے c′ اور پھر اس سے k′ بنا ہے) دیکھیے مقالۂ عرب، عربی بولیاں اور Schaade: *Sibawaih's Lautlehre* اشاریہ .

(A. SCHAADE)

* **کابُل :** (۱) افغانستان کے ایک دریا کا نام؛ (۲) افغانستان کا دارالسلطنت، دریاے کابل ۳۴°-۲۱′ عرض بلد شمالی اور ۶۸°-۲۰′ طول بلد مشرقی پردرہ آنئی کے قریب سے نکل کر شہر کابل میں سے گزرتا ہے ۔ تھوڑی ہی دور جنوب کی طرف سے اس میں دریاے لوگر اور شمال کی طرف سے دریاے پنج شیر آ ملتے ہیں ۔ یہ دریا سطح مرتفع کابل سے نکل کر پہاڑی درون میں سے بہتا ہوا جلال آباد کی زیریں وادی میں داخل ہوتا ہے جہاں اس میں جنوب کی طرف سے دریاے سرخاب اور شمال کی طرف سے دریاے کُنر شامل ہو جاتے ہیں ۔ اس کے بعد یہ مُہمند کی پہاڑیوں میں ایک گھاٹی سے گزرتا ہوا مچنی کے قریب پاکستان کے ضلع پشاور میں داخل ہوتا ہے ۔ یہاں پہنچ کر اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں ۔ شمالی شاخ میں دریاے سوات آ ملتا ہے اور آگے چل کر یہ دونوں شاخیں پھر آپس میں مل جاتی ہیں ۔ دریاے کابل ۳۱۶ میل لمبے علاقے میں سے بہتا ہوا اٹک کے قریب دریاے سندھ میں جا گرتا ہے .

دریاے کابل بہت قدیم زمانے سے بہتا آ رہا ہے ۔ کبھی اسے کُبھا ندی کہا جاتا تھا ۔ قدیمی مؤرخین Arrian اور Strabo نے اسے "کوپھین" Kōphen اور "کوپھیس" Kōphes اور بطلمیوس نے "کوآ" Kōa لکھا ہے ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ کُبھا ان سات دریاؤں میں سے ایک تھا جن کا رگ وید میں ذکر آیا ہے ۔ عرب جغرافیہ دانوں نے اس دریا کے مختلف نام بتائے ہیں ۔ البیرونی نے دریاے غوروند کا ذکر کیا ہے جو قندھار (یعنی گندھارا) کے دارالحکومت وَیْہَنْد سے نیچے بہتا ہوا دریاے سندھ میں جا گرتا ہے ۔ یہ نام اسے "درۂ غور بند" کی نسبت سے دیا گیا ہے جس کے قریب سے دریاے "پنج شیر" نکلتا ہے ۔ المسعودی لکھتا ہے کہ "پنجاب کا چوتھا دریا شہر کابل اور اس کے پہاڑوں سے آتا ہے، جو "السند کی سرحد کا کام دیتے ہیں ۔" پشتو میں اس دریا کا جدید نام "سِیند" ہے (جو "دریا" کے لیے عام اصطلاح کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے) ۔ بابر نے دریاے سند کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک پہاڑ سے نکلتا ہے جو کابل کے مغرب میں واقع ہے؛ بلاشبہہ یہاں اس کی مراد دریاے کابل سے ہے، اگرچہ کسی دوسری جگہ وہ دریاے سندھ کے لیے سندھی کا نام استعمال کرتا ہے ۔ الفنسٹن نے اس کا نام "کامہ" لکھا ہے (دریاؤں کے متعلق ضمیمہ)، لیکن

www.besturdubooks.wordpress.com

معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس نے غلط نام استعمال کیا ہے کیونکہ کابہ محض اس کے ایک معاون کا نام ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کابل کے شہر اور ضلع کا نام دریا کے نام پر رکھا گیا ہے ۔

(۲) ایک اہم شہر، آج کل افغانستان کا دارالحکومت، ۳۴°-۳۰′ طول بلد شمالی اور ۶۹°-۱۳′ عرض بلد مشرقی پر سطح سمندر سے ۵۷۸۰ فٹ بلند، ایک زرخیز سطح مرتفع پر واقع ہے جہاں آبپاشی خوب ہوتی ہے، آبادی تقریباً ۱۵ لاکھ ہے ۔

اگرچہ قدیم ترین زمانے سے دریاے کابل کا ذکر مختلف ناموں سے ملتا ہے، لیکن ایسے کسی شہر کا حال معلوم نہیں ہوتا جسے کابل کی جگہ تصور کیا جائے ۔ بعض لوگوں نے بطلمیوس کے "کروره" Karaura کو "کَبُورہ" Kaboura فرض کیا ہے اور جن لوگوں کو اس نے بولِتائی Bolitai کے نام سے یاد کیا ہے، ان کا نام اس کے خیال میں کابُلِتای Kābolitai تھا، یعنی کابل کے باشندے، لیکن ان مفروضوں کی بنیاد کسی شہادت پر نہیں، غالباً "کوپھینی" پوری وادی کا نام ہے جو دریاے کوپھین سے ماخوذ ہے ۔

اس علاقے پر رومی بادشاہ دیمتریوس Demetrios نے دوبارہ قبضہ کیا اور یہاں ایک یونانی سلطنت قائم ہوئی جو سنۂ عیسوی کے زمانۂ آغاز کے لگ بھگ تک قائم رہی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کچھ عرصے کے لیے پارتھیا (خراسان) کے بادشاہ گوندوفیرس Gondophares کا قبضہ رہا اور پھر پہلی صدی عیسوی میں کوشانی حملہ آور اس پر قابض رہے ۔ کابل کے قریب وَرْدَک کے مقام سے ایک چینی کا برتن برآمد ہوا ہے جس پر ہُوِشکا کا ایک کتبہ کندہ ہے ۔ اس زمانے میں بدھ مت سرکاری مذہب تھا ۔ کچھ عرصے کے لیے ہپتالیوں = "افتالیوں" Ephthalites نے کوشانیوں کا تختہ الٹ دیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کوشانی نسل کے لوگ آگے چل کر ایک بار پھر بر سر اقتدار آ گئے ۔ جب ۶۵۷ء میں چینی سیاح ہیئون سانگ کا ادھر سے گزر ہوا، اس وقت انھیں کی حکومت تھی ۔ اس نے کابل کے لیے "کوفو" Kao-fu کا نام استعمال کیا ہے ۔ رفتہ رفتہ برھمنی دھرم نے بدھ مت کی جگہ لے لی، چنانچہ آخری کوشانی فرمانرواؤں کا جو "شاھی" کے لقب سے مشہور تھے، یہی مذہب تھا اور جنھیں بقول البیرونی غالباً ابتدائی اسلامی حملوں کے زمانے کے لگ بھگ ان کے برھمن وزیروں نے معزول کیا ۔ غالباً ابتدائی حملوں کے وقت گندھارا کی ہندو سلطنت پر اس کے صدر مقام اُدَبھنْڈہ (یا وَیہند) سے حکومت کی جاتی تھی جو دریاے سندھ کے کنارے واقع تھا اور یہ سلطنت ان پہاڑوں کے دامن تک پھیلی ہوئی تھی جو جلال آباد کے مغرب میں ہیں، لیکن خاص کابل اس میں شامل نہیں تھا ۔ یہاں ایک علٰحدہ ریاست قائم تھی جہاں کا حکمران الگ تھا ۔ سبکتگین کے زمانے تک یہ ریاست کبھی تو مسلمانوں کے زیر اثر رہی اور کبھی خود مختار ہوئی ۔ قدیم ترین عرب وقائع نگاروں کے مطابق یہ ملک بحیثیت مجموعی قندھار یعنی گندھارا کے نام سے مشہور تھا جسے بسا اوقات غلطی سے شہر قندھار سمجھ لیا جاتا ہے، چنانچہ الطبری بتاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں عاصم بن عمرو اور عبداللہ بن عُمیر ۲۳ھ میں سیستان سے ہوتے ہوے ہندوستان کی سرحد اور قندھار تک بڑھتے چلے گئے ۔ کابل کے شہر کا ذکر واضح طور پر نہیں کیا گیا ۔ وادی کابل اور اس کے ساتھ ہندوکش کے دروں تک کے کوھستان کو کابل شاہ کا ملک بتایا ہے اور دارالحکومت کے بارے میں یہ کہا ہے کہ یہ ایک ناقابل تسخیر پہاڑی قلعہ ہے جس کا نام یقینی طور پر معلوم نہیں (Le Strange نے اسے جُروس پڑھا ہے) الیعقوبی لکھتا ہے کہ اسے خلافت عثمانی کے دوران میں عبدالرحمٰن بن سمرة نے فتح کیا، لیکن جب اس نے یہ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

لکھا تھا اس وقت اس کا حال صرف کابلی ھلیلہ کی برآمد کی بدولت معلوم ھوا ۔ ایک اور مہم (امیر) معاویہؓ کے زمانے میں بھیجی گئی۔ ۱۷۶ھ/۷۹۳ء میں ھارون الرشید کے ماتحت ایک فوج نے بلخ سے چل کر شمالی جانب سے درۂ بامیان کے راستے وادی پر حملہ کیا ۔ مامون الرشید کے زمانے میں ایک اور حملہ ھوا جس کے نتیجے میں کابل شاہ نے اطاعت اختیار کرکے دین اسلام قبول کر لیا ۔ اور یہاں کے لوگ بھی حلقہ بگوش اسلام ھو گئے ، لیکن ۲۵۷ھ/۸۷۱ء میں یعنی ایران کی صفّاری حکومت سے قبل یہاں صحیح معنوں میں قبضہ نہیں ھو سکا ۔ اس میں شک نہیں کہ چاندی کی کانوں کے باعث "پنج ھیر" میں بے حد کشش تھی اور یعقوب بن لیث صفاری نے سکے بھی ضرب کرائے تھے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کا ل کا نام کسی خاص شہر کے لیے کہیں استعمال ھوا ھو۔ بہرحال یہ کوئی اھم مرکزی شہر نہیں تھا ۔ یہ امر بھی قابل توجہ ھے کہ یعقوب بن لیث نے زیادہ سیدھے راستے یعنی سجستان سے وادی ارغنداب اور غزنہ سے ھوکر حملہ کرنے کے بجائے شمال سے ھندوکش کے دروں کے راستے حملہ کیا تھا ۔ بتایا جاتا ھے کہ اس زمانے میں کابل کا فرمانروا نسلاً ترک اور مذھباً بدھ تھا اور یہ امر قرین قیاس ھے کہ وہ آخری کوشانی بادشاھوں کا وارث ھو [رک بہ افغانستان] .

مغل شہنشاھوں کے زمانے سے قبل یہ کبھی دارالضرب نہیں رھا ۔ سب سے پہلے یہاں بابر نے سکے ضرب کروائے [رک بہ مادّۂ بابر] ۔ غزنوی [رک بہ غزنویہ] اور غوری [رک بآں] باشاھوں کے تمام تر دور حکومت میں دارالسلطنت غزنہ ھی رھا ۔ الادریسی نے کابل کا ذکر کرتے ھوے لکھا ھے کہ یہ طخارستان کی سرحد پر ایک بڑا ھندی شہر ھے اور یہ بھی بتاتا ھے کہ کوئی فرمانروا کابل میں اپنی بادشاھت کا باضابطہ آغاز کرنے سے قبل "شاہ" کا لقب اختیار نہیں کر سکتا تھا ۔ غالباً اس نے اپنی معلومات ان مآخذ سے حاصل کیں جو اس سے بہت پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتی تھیں کیونکہ اس کے اپنے زمانے میں تو "شاھوں" کی بادشاھت کو ختم ھوے ایک عرصہ گزر چکا تھا .

یہ امر قرین قیاس معلوم ھوتا ھے کہ غزنہ پر بارہا تباھی آنے کے باعث کابل زیادہ آباد ھوتا گیا اور آخر اسے عروج حاصل ھوا ۔ تیمور کے زمانے کے بعد یہ ایک ریاست کا مرکز بن گیا جس پر اس کے خاندان کے بعض افراد حکمران ھوے ۔ ابوسعید [رک بآں] کے وفات پانے کے بعد کابل اس کے بیٹے الغ بیگ کے قبضے میں آ گیا اور وہ یہاں تا دم مرگ حکومت کرتا رھا ۔ اس کے بیٹے کو ذوالنون بیگ ارغون کے ایک بیٹے مقیم نے حکومت سے علیٰحدہ کر دیا اور پھر خود اسے ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں بابر نے نکال باھر کیا ۔ اس نے بابر کی سلطنت ھند کے لیے بنیاد کا کام دیا، حتّٰی کہ جب اس کے بیٹے ھمایوں کو ھندوستان سے نکلنا پڑا تو کابل اس خاندان کے ھاتھ سے نہیں نکلا اور اس پر پہلے کامران اور پھر خود ھمایوں قابض رھا تا آنکہ ھمایوں نے ھندوستان دوبارہ فتح کر لیا ۔ بابر کو کابل بہت پسند تھا؛ اس نے بڑے پُرجوش انداز سے اس کی آب و ھوا ، اس کی ندیوں اور اس کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ھے ۔ آگرے میں وفات پانے کے بعد اس کی میت کابل لے جائی گئی جہاں شہر کے نزدیک ایک باغ میں جس کا نقشہ خود اس نے تیار کیا تھا، اسے دفن کیا گیا ۔ اس کا مقبرہ آج تک موجود ھے ۔ اس زمانے سے کابل کی تاریخ ھندوستان کی مغل سلطنت سے وابستہ ھو گئی ۔ یہاں سونے چاندی اور تانبے کے سکوں کی ٹکسال قائم ھوئی ۔ عہد محمد شاھی تک کے اکثر و بیشتر بادشاھوں کے سکے یہاں سے دستیاب ھوے ھیں ۔ ۱۷۳۸ء میں یہاں نادر شاہ کا قبضہ ھو گیا ۔ نادر شاہ

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کے انتقال کے بعد اگرچہ شہنشاہ عالمگیر ثانی کا ایک روپیہ یہاں ڈھالا گیا، لیکن اس کے بعد یہ شہر کبھی مغل سلطنت میں شامل نہ ہوا اور بہت جلد اس پر احمد شاہ درانی [رک بآں] کی حکومت قائم ہوگئی۔ کچھ ہی عرصے میں اس نے درانی مقبوضات کے دارالحکومت کی حیثیت سے قندھار کی جگہ لے لی اور اس کی یہ حیثیت سدوزئیوں اور بارک زئیوں کے ماتحت آج تک بدستور قائم ہے [رک بہ مادّۂ افغانستان]۔ اگرچہ مختلف لڑائیوں خصوصاً جو ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء تک سدوزئی اور بارک زئی قبیلوں کے درمیان ہوئیں اور جن میں قبضہ مخالفانہ کرنے والی برطانوی فوج نے حصہ لیا تھا اور پھر شیر علی اور اس کے بھائیوں کے درمیان خانہ جنگی کے باعث اسے بہت نقصان اٹھانا پڑا تاہم ایک اہم سلطنت کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے شہر کی رونق اور خوشحالی میں اضافہ ہوتا رہا۔ عبدالرحمٰن خان [رک بآں] اور حبیب اللہ کے عہد میں شہر کی حالت بہتر ہوگئی اور اچھی اچھی سڑکیں اور بازار تعمیر ہوئے۔ بالاحصار یا پہاڑی پر بنے ہوئے قدیم سکونتی قلعے کی مورچہ بندیاں توڑ دی گئیں اور اس کے بالائی حصے میں سلاح خانہ بنا دیا گیا۔ عبدالرحمٰن نے ایک نیا مستحکم قصر جو "ارک" کے نام سے مشہور ہے، شہر سے باہر شیر پور اور عالم گنج کے درمیان تعمیر کرایا۔

بابر کے مقبرے کے علاوہ جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، تیمور شاہ درانی کا مقبرہ بھی کابل کے نزدیک واقع ہے۔

کابل اس صوبے کا نام بھی ہے جس میں دارالحکومت کابل واقع ہے۔ اس کے شمال میں افغانی ترکستان، مغرب میں ہرات، جنوب میں قندھار اور مشرق میں جلال آباد واقع ہیں۔ اس کے شمال مغرب میں کوہستان پغمان اور جنوب مغرب میں ہزارہ جات شامل ہیں۔ کابل اور جلال آباد کی سرحد جگدلک پر واقع ہے۔ نسبۃً جدید زمانے کے کابل کے لیے رک بہ افغانستان۔

مآخذ: (۱) Elphiustone : *Caubul*، لنڈن ۱۸۳۹ تا ۱۸۴۲ء؛ (۲) Burnes : *Cabool*، لنڈن ۱۸۴۲ء؛ (۳) *The Babur-nama in English (Memoirs of Babur)* ترجمہ A.S.Beveridge، لنڈن ۱۹۲۲ء ۱: ۱۹۹ ببعد و دیکھیے اشاریہ؛ (۴) Yate : *Northern Afghanistan*، لنڈن ۱۸۸۸ء؛ (۵) Gray : *At the court of the Amir*، لنڈن ۱۸۹۵ء؛ (۶) Holdich : *Indian Borderland*، لنڈن ۱۹۰۱ء؛ (۷) Martin : *Under the absolute Amir*، لنڈن ۱۹۰۷ء نیز رک بہ *Imperial Gazetteer of India*، اوکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ج ۱۴؛ (۸) Zotenberg : *Chronique de Tabari* پیرس ۱۸۷۱ء ۳: ۵۱۷ ببعد؛ (۹) J. Mar-quart : *Eransahr (=Abhandl. der. Kön Gesellsch. der wiss zu Gottingen* philol-hist. Cl. Neue Eolge بند ۳، عدد ۲) برلن ۱۹۰۱ء، رک بہ اشاریہ؛ (۱۰) ایضاً *Osteuropäische und Ostasiatische Streifzüge*، ص ۴۷۶؛ (۱۱) G. Le Strange : *The Lands of Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، تاریخی تصنیفات کے لیے رک بہ تحت مادّۂ افغانستان۔

(M. Longworth Dames)

کاتب: محرر یا لکھنے والا، یہ لفظ ک ت ب مادّے سے مشتق ہے اور آگے چل کر ان دونوں لفظوں سے فعل کَتَبَ (اس نے لکھا) بنا۔ عربوں کو یہ لفظ فن تحریر کے ساتھ ساتھ غالباً اپنے شمالی آرامی ہمسایوں سے ملا ہوگا۔ ہمارے پاس قدیم شاعری کے جو نمونے محفوظ ہیں، ان میں یہ لفظ صرف عربی رسم الخط لکھنے والوں کے لیے ہی استعمال نہیں ہوا بلکہ شعرائے قدیم نے حمیری کاتبوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگرچہ زمانۂ قبل از اسلام میں فن تحریر کا وجود عرب کے ہر حصے میں ملتا تھا، لیکن اسے پوری طرح جاننے والے چند ایک ہی تھے، چنانچہ طبقات ابن سعد میں ہر دور کے صحابہ کے ذکر میں یہ خاص طور پر

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

لکھا ہے کہ فلاں صحابی لکھنا جانتے تھے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بہت کم لوگ فن تحریر سے واقف تھے ۔ مدینے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے صرف دس اصحاب کو کاتب بیان کیا گیا ہے [بعض مآخذ (مثلاً تاریخ دمشق اور الاستیعاب) کی رُو سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے کاتبوں کی تعداد تیئیس اور پچیس تک پہنچتی ہے (جوامع السیرۃ، ص ۲۶، حاشیہ ۳)]یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مکے کے کئی ممتاز افراد بھی کاتب تھے اور اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاہانِ الحیرۃ کے کاتبوں (مثلاً عدی بن زَید) کی خدمات نیک چلنی کی تحریروں یعنی حلف ناموں (جن کا ذکر طفیل الغنوی نے کیا ہے) کے سلسلے میں حاصل کی گئی تھیں اور جن کے حوالے نقائض اور الحارث بن حِلِّزۃ کے مُعلّقہ میں ملتے ہیں اور جو عربی میں لکھے گئے تھے ۔ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ کاتب بہت زیادہ اہمیت کے مالک ہیں جو آنحضرتؐ کی وحی لکھنے پر مأمور تھے ۔ یہ کاتب الوحی کے نام سے مشہور ہیں ۔ ابیؓ بن کعب اور زیدؓ بن ثابت ایسے ہی حضرات تھے ۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اسلام قبول کرنے کے لیے جو متعدد دعوت نامے عمائدین عرب کو ارسال فرمائے تھے، ان کے لکھوانے کے لیے بھی انھیں اصحاب کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا تھا ۔ کاتب کا عہدہ بہت باعزت اور بلند پایہ سمجھا جاتا تھا اور آگے چل کر اس عہدے کے حامل وزیر کہلانے لگے ۔ سارے خلفاے راشدین اور بنو امیہ کے عہد میں اس عہدے پر جس شخص کو مأمور کیا جاتا تھا، اسے محض کاتب ہی کہتے تھے ۔ خلیفہ ابو العباس کے عہد میں پہلی بار اس کے لیے وزیر کا لقب استعمال ہونے لگا ۔ اس زمانے میں ایرانی نظم و نسق کے طرز پر سرکاری دفاتر کا ایک پیچیدہ نظام نشو و نما پا چکا تھا ۔ کاتبِ اعلیٰ کا لقب کاتب السِّر یعنی "پرائیویٹ سیکرٹری" تھا ۔ دوسرے کاتبوں کو جو کسی دفتری دستاویز کا ابتدائی مسودہ لکھتے تھے، کاتب الانشاء کہا جاتا تھا ۔ فوج کا نظم و نسق اور لشکریوں کی تنخواہ دینے کے فرائض کاتب الجیش کے سپرد تھے، جسے ہم "وزیر جنگ" کے برابر کا عہدہ قرار دے سکتے ہیں ۔ دوسرے کاتب بادشاہ وقت کی جائداد اراضی کی دیکھ بھال پر مأمور ہوتے تھے ۔ کاتبوں کے اس پورے نظام کا نام دیوان [رکِ بآں] تھا ۔ ساری قوت و اقتدار اسی طبقے کے ہاتھ میں تھی اور حکومت کے اعلیٰ ترین عہدے دار انھیں میں سے منتخب کیے جاتے تھے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ طبقہ دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں سے بالکل الگ تھلگ رہتا تھا ؛ چنانچہ محدثین اور ائمۂ دین کی طویل فہرست میں ان کا نام بہت کم نظر آتا ہے، البتہ دیگر اصناف علم و ادب کے مصنفین اور شعرا میں ان کا ذکر مل جاتا ہے ۔ چونکہ ان لوگوں کے لیے تقریباً ہر مضمون کے مبسری علم سے واقف ہونا ضروری تھا، اس لیے ابتدائی زمانے ہی سے مصنفین اس طبقے کے استفادے کے لیے کتابیں لکھنے لگے اور چونکہ انھوں نے اپنے عہدے کی اہمیت برقرار رکھی تھی لہٰذا ان کے مفید مطلب کتابوں کی متعدد نقول ہم تک پہنچی ہیں ۔ کاتب کی تعلیم و تربیت کے لیے جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے بڑی بڑی یہ ہیں : ابن قتیبۃ [رکِ بآں] ادب الکاتب؛ ابن درستویہ : کتاب الکتّاب، الصولی : ادب الکاتب اور بالخصوص القلقشندی کی ضخیم تصنیف ۔ جہاں اوّل الذکر تین کتابوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ ایک اچھے کاتب کی ضروریات کیا ہیں وہاں القلقشندی کی صبح الاعشٰی میں علمی طور پر اس موضوع کے متعلق وہ سب باتیں موجود ہیں جنھیں جاننا ضروری ہے ۔ ہمیں عربی ادب کی انشا میں وہ سارے اثرات نظر آتے ہیں جو شروع سے لے کر آخر تک کاتب نے اس پر ڈالے ۔ ابتدائی زمانے کے سادے اور واضح رسائل کے بعد عہد مابعد کی

www.besturdubooks.wordpress.com

مغلق عبارات تک پہنچتے ہیں جن کے ادق اور مشکل الفاظ کی وجہ سے اکثر اوقات ان دستاویزات کا مقصد و موضوع تلاش کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے ۔ اس "بیماری" کا سبب یہ تھا کہ ہر کاتب عبارت آرائی اور خیال آرائی میں اپنے معاصرین اور پیش روؤں سے گوے سبقت لے جانے میں کوشاں رہتا تھا ۔ ہم کئی تصنیفات کے لیے ان کے مصنفین کی اس خواہش کے مرہون منت ہیں کہ کاتبوں کے لیے ان کی دستاویزات کا مواد بہم پہنچایا جائے ، لیکن چونکہ پرشکوہ الفاظ کی تلاش اور ان کا استعمال ہمیشہ ان کے مدنظر رہتا تھا اس لیے مغربی ذوق مشرقی ادب کو بہ آسانی اخذ نہیں کر سکتا ۔ ایرانی، ترکی اور ہندوستانی کاتبوں نے اسے مبالغے کی حد تک پہنچا دیا ۔ جب وہ الفاظ کی بھول بھلیوں کا مطلب حل کر لیتے تھے تو فخر محسوس کرتے تھے ۔ اس ذہنیت کی ایک جھلک ہمیں اس وقت نظر آتی ہے جب صاحب اسمٰعیل عبّاد جیسا شہرۂ آفاق کاتب ایک خط پر صرف اس وجہ سے اعتراض کرتا ہے کہ اس کے الفاظ بالکل واضح طور پر لکھے ہوے ہیں اور ان پر اعراب دیے ہوے ہیں، کیونکہ اس کے خیال میں ایسا کرنے سے اس کے علم و فضل کی توہین کی گئی ہے ۔ اگرچہ کاتب بڑے اونچے اونچے عہدوں تک پہنچے، مگر ان کا سارا طبقہ کچھ بزدل سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ سوا سازشوں کے اور کسی کام کے اہل نہیں تھے اور مجھے یقین ہے کہ کوئی کاتب بھی تخت سلطنت پر نہیں بیٹھا، حالانکہ گزشتہ بارہ صدیوں میں کئی جواں مرد اور بلند حوصلہ لوگ تخت و تاج حاصل کرنے میں کامیاب ہوے ہیں .

مآخذ : (۱) ابن قُتَیْبَہ : ادب الکاتب ، طبع Grünert اور کئی مشرق طباعتیں، خصوصًا شرح البَطَلْیُوسی بعنوان الاقتضاب ؛ (۲) ابن دُرُسْتَوَیْہ : کتاب الکُتّاب ، طبع شیخو ؛ (۳) الصُّولی : ادب الکاتب ، طبع بیروت ؛ (۴) القَلْقَشَنْدی : صبح الاعشٰی ، طبع قاہرہ ، ۱۴ جلدوں میں اور آخرالذکر کا ملخص بعنوان الضوء .

(F. KRENKOW)

کاتب چلبی : رک بہ حاجی خلیفہ . *

کاتب رُومی : رک بہ علی بن حسین . *

کاتبی : شمس الدین محمد بن عبداللہ، ایک فارسی * شاعر ، خراسان میں تُرشِیز کے ایک گاؤں طَرَق وراوش میں پیدا ہوا ۔ نیشاپور میں تعلیم پائی ۔ تیموری بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہونے کے لیے ہرات گیا، لیکن امید کے برخلاف اسے وہاں باریابی نہ ہو سکی اور وہ ایک طویل عرصے تک شیروان میں مقیم رہا جہاں شہزادۂ مرزا شیخ ابراہیم (م ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء) نے اس کی سرپرستی قبول کر لی تھی ۔ بعد ازاں اس نے آذربَیْجان میں سکونت اختیار کر لی جہاں اسکندر بن قرہ یوسف نے اس کی ۔ قدر دانی نہیں کی پھر اصفہان میں، جہاں وہ تصوف کے مطالعے میں منہمک ہوگیا اور ۸۳۸ھ/۱۴۳۴ء اور ۸۳۹ھ/۱۴۳۶ء کے درمیان بعارضۂ طاعون استر آباد میں رحلت کر گیا - اسی آخرالذکر شہر میں اس نے نظامی اور امیر خسرو کی تقلید میں خَمْسہ لکھنا شروع کیا، لیکن صرف گلشن ابرار اور لیلٰی مجنوں ہی پایۂ تکمیل کو پہنچا سکا جس کے صرف ایک قلمی نسخے کا ہمیں علم ہے اور وہ سینٹ پیٹرزبرگ میں ہے ۔ اخلاق اور موعظانہ شاعری کے میدان میں اس نے ایک کتاب دہ باب یا تجنیسات لکھی۔ اس نے ایک دیوان بھی چھوڑا ہے جس کی دس غزلیں مع ترجمہ Bland نے *Century* ص ، ۱۸ تا ۲۱، میں طبع کرائی ہیں ۔ علٰی ہٰذا سی نامہ، جس میں عشق حقیقی کا بیان ہے اور مثنویوں میں مجمع البحرین جس میں ایک تمثیلی اور رزمیہ داستان ہے ۔ یہ ایک ذوقافیتین نظم ہے اور اسے دو مختلف بحروں میں پڑھا جا سکتا ہے اور اس میں دو اشخاص ناظر اور منظور کے عشق حقیقی کا قصہ بیان کیا گیا ہے ، نیز دل ربای

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

جو یمن کے بادشاہ قباد اور اس کے چالباز وزیر کی تمثیلی داستان ہے ۔ اس کے تخلص کاتبی کی وجہ تسمیہ غالباً یہ ہے کہ وہ ایک کاتب تھا ۔ اس نے یہ فن نیشاپور میں مولانا سیمی سے سیکھا تھا جن سے بعد میں جھگڑا ہو گیا ۔ اس نے اپنی ساری زندگی غربت اور افلاس میں بسر کی کیونکہ اس کا اسراف حماقت کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور اسے اپنے سرپرستوں کے ہاں سے جو شاہانہ انعام و اکرام ملتے انہیں وہ چند ہی روز میں خرچ کر ڈالتا تھا ۔

مآخذ : (۱) دولت شاہ : تَذْکِرَۃ الشُّعَراء ، طبع براؤن ، لنڈن و لائیڈن ۱۹۰۱ء، ص ۳۸۱ تا ۳۹۱ ؛ (۲) لطف علی بیگ : آتش کدہ ، بمبئی ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) ، ص ۷۰ ؛ (۳) رضا قلی خان : مَجْمَع الْفُصَحَاء، تہران ۱۲۹۴ھ، ۲ : ۲۸ ؛ (۴) J. Von Hammer : *Schone Redekünste Persiens*، وی انا ۱۸۱۸ء، ص ۲۸۱ (۵) H. Ethé، در *Grundriss der iran. Philologi*، ۲: ۲۴۵ تا ۲۴۶، ۲۹۷ تا ۲۹۹ ، ۳۰۱ ؛ (۶) Cl. Huart : *Calligraphes et minlaturistes*، پیرس ۱۹۰۸ء ، ص ۲۱۴ ؛ (۷) E. G. Browne : *A Literary History of Persia Under Tartar Dominion*، کیمبرج ۱۹۲۰ء، ص ۴۸۴ تا ۴۹۵؛ (۸) *Cat. of the Persian and Arabic Manuscr . . . at Bankipore*، ۲ : ۱۶ ببعد .

(CL. HUART)

* **الکاتبی** : (دبیران) نجم الدین علی بن عمر القزوینی ، (م ۶۷۵ھ/۱۲۷۶ء اور بعض روایات کے مطابق ۶۹۳ھ/۱۲۹۴ء) ایک ایرانی فلسفی جس نے عربی زبان میں کتابیں تصنیف کیں ۔ اس کی سوانح حیات سے متعلق اس کے سوا کہ وہ نصیر الدین الطوسی [رک بآں] کا شاگرد تھا اور کچھ معلوم نہیں ۔ اس نے اپنے استاد طوسی سے جو خط و کتابت "واجب الوجود" کے مسئلے پر قدما کے دلائل سے متعلق کی وہ موزۂ بریطانیہ میں تاحال ایک مخطوطے کی شکل میں [رسالۃ فی اثبات واجب الوجود] محفوظ ہے (فہرست، عدد ۴۲۹، سطور ۱ تا ۳) اور اسکوریال میں (Derenbourg : *Les mss. ar. de l'Esc.*، عدد ۳۰۷، سطر ۸) ۔

اس کی سب سے بڑی تصنیف "جامع الدقائق فی کشف الحقائق" ہے جو منطق ، طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کے مسائل کی تشریح ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بہت زیادہ مقبول نہیں ہوئی ۔ اس کے مخطوطات پیرس (de Slane، عدد ۲۳۷۰) میں اور قاہرہ (فہرست، بار اول، ۷ : ۶۴۷) میں موجود ہیں۔ انہیں مسائل کی تشریح میں اس کی دیگر دو کتب نے زیادہ شہرت حاصل کی ، جو اس نے یکے بعد دیگرے لکھیں : (۱) "عین القواعد فی المنطق و الحکمۃ" (مخطوطات در لائیڈن ، فہرست، عدد ۱۵۲۵ اور دراسکوریال Derenbourg ، عدد ۶۶۸) جس کے ساتھ مصنف ہی کی شرح "بحر الفوائد" بھی ہے (لائیڈن = کتاب مذکور، عدد ۱۵۲۶، Esc.، کتاب مذکور، عدد ۶۶۵) اور (۲) کتاب حکمۃ العین، طبیعیات اور مافوق الطبیعیات میں جو بہت سے مخطوطات کی صورت میں تاحال موجود ہے ۔ آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں میرک شمس الدین محمد بن مبارک شاہ البخاری نے اس کتاب کی شرح لکھی ۔ یہ شرح مع تعلیقات از محمد الجُرجانی (م ۸۱۶ھ / ۱۴۱۳ء)، و قطب الدین محمود بن مسعود الشیرازی (م ۷۱۰ / ۱۳۱۱ء)، و حبیب اللہ میرزا جان (م ۹۹۴ھ / ۱۵۸۶ء) ، و المحقق الباغندی دو جلدوں میں ۱۳۱۹ء و ۱۳۲۴ء میں قازان سے شائع ہوئی ۔ ۱۸۴۵ء میں کلکتے سے صرف جُرجانی کی تعلیقات شائع ہوئیں ۔

اس کی شہرت کی بڑی وجہ علم منطق میں اس کا رسالہ موسوم بہ "الرسالۃ الشمسیہ فی القواعد المنطقیہ" ہے ۔ یہ رسالہ اس نے شمس الدین محمد بن بہاء الدین محمد الجُوَینی کی فرمائش پر لکھا جو معول بادشاہوں ہلاگو ، اباقہ اور احمد (م ۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء) قب

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۱-۱ ج ۱ بذیل مادّہ کا صاحب دیوان تھا - یہ کتاب کلکتے میں ۱۸۱۶ء و ۱۸۲۷ء؛ استانبول میں ۱۲۶۳ھ؛ لکھنؤ میں ۱۸۹۱ء کشاف اصطلاحات الفنون طبع A. Sprenger کے ضمیمہ ۱ کے طور پر کلکتے میں ۱۸۵۴ء میں طبع ہوئی - شمسیہ کی کثیر التعداد شروح میں سے مشہور ترین وہ شرح ہے جو اس کے حصۂ اول (قسم التصورات) کی قطب الدین محمد بن محمد الرازی التحتانی (م ۷۶۶ھ / ۱۳۶۴ء) نے "تحریر القواعد المنطقیہ" کے نام سے لکھی اور وہ کلکتے میں ۱۸۱۵ء/۱۲۵۹ھ" کانپور میں ۱۲۸۸ھ؛ لکھنؤ میں ۱۲۶۳ھ، ۱۲۷۹ھ، ۱۸۷۶ء، ۱۸۸۶ء اور قاہرہ میں ۱۲۹۳ھ، ۱۳۰۷ھ میں طبع ہوئی - اس کے برابر کی شہرت السید الجُرجانی کے اس کتاب پر حواشی کو حاصل ہے جو کلکتے میں الکوچک کے نام سے ۱۲۴۰ھ، ۱۲۶۱ھ؛ دہلی میں ۱۳۰۹ھ، ۱۳۲۶ھ، لکھنؤ میں ۱۸۹۵ء؛ قازان میں ۱۸۸۸ء؛ استانبول میں ۱۲۶۶ھ؛ قاہرہ میں ۱۳۲۳ - ۱۳۲۷ھ، اور بعنوان حاشیۃ الجرجانی علی التصورات استانبول میں ۱۲۹۳ھ طبع ہوئی - سید الجرجانی کی تعلیقات پر عبدالحکیم السیالکوٹی (سیالکوٹی، م ۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۷ء) نے حواشی لکھے؛ طبع دہلی ۱۸۷۰ء؛ لکھنؤ ۱۸۷۸ء، ۱۳۰۸ھ؛ استانبول ۱۲۵۹ھ، ۱۳۱۰ھ، عصام الدین الاسفرائینی (م ۹۴۴ھ / ۱۵۳۷ء) کے حواشی سنگی طباعت میں، بمقام نامعلوم، ۱۲۷۵ھ میں چھپے - سعد الدین التفتازانی (م ۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء) کی شرح التحتانی کے حاشیے پر مع حواشی از رونق علی لکھنؤ میں ۱۹۰۵ء طبع ہو کر شائع ہوئی - یہ کتاب بالخصوص ہندوستان میں دور حاضر تک نہایت اشتیاق کے ساتھ پڑھی پڑھائی جاتی رہی - میر محمد زاہد الہروی (م ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۸۹ء) نے اس پر تعلیقات لکھیں اور یہ تعلیقات کانپور میں ۱۲۸۷ھ؛ لکھنؤ میں ۱۳۰۲ھ میں مع حواشی غلام یحیی البہوائی اور ان حواشی بر حواشی از عبدالحی لکھنوی طبع ہوئیں، نیز ایک مجہول الاسم محشی کے حاشیے کے ساتھ ہندوستان میں ۱۲۸۷ھ طبع ہوئی - "تعلیقات" مصنفۂ علی لکھنوی ۱۲۹۲ھ میں لکھنؤ سے شائع ہوئی - عبدالحلیم لکھنوی نے دوسری اور تیسری فصل پر شرح المختلطات، طبع لکھنؤ ۱۸۶۲ء لکھی - محمد السنجانی مفتی زادہ نے ایک حصے یعنی فصل التصدیق پر حواشی لکھے، طبع استانبول ۱۲۵۴ھ اور فصل التصورات کتاب مذکور پر بھی حواشی لکھے، طبع ۱۲۵۴ھ، ۱۲۵۹ھ - "شمسیہ" کی ایک تلخیص "میزان المنطق" جس کا مصنف معلوم نہیں، مجموعۂ منطق "کانپور ۱۸۸۱ء، ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی اور عبداللہ بن الحداد العثمانی التلنبی نے بعنوان "بدیع المیزان" اس کی شرح لکھی، طبع کانپور ۱۸۷۷ء؛ لکھنؤ ۱۳۱۱ھ - میزان خاص کی ایک شرح محمد فضل الامام الخیر آبادی نے لکھی طبع Tamasgand ۱۲۸۶ھ، اس کی ایک شرح فارسی میں بنعوان "الکلام الفائق" احمد حسین اَرّاکانی نے لکھی طبع کانپور ۱۳۱۷ھ.

بالآخر الکاتبی نے فخر الدین الرازی (م ۶۰۶ھ/ ۱۲۰۹ء) کے فلسفے کے دو رسالوں المحصل اور الملخص کی شرحیں بھی لکھیں جن میں سے پہلی کا نام "المفصل" اور دوسری کا نام المنصّص ہے.

مآخذ: (۱) القزوینی: تاریخ گزیدہ، ص ۸۴۵؛ (۲) خواند امیر: حبیب السیر، بمبئی ۱۸۵۷ء جلد ۳، ص ۶۱؛ (۳) C. Brockelmann: *GAL*، ۱: ۴۶۷، ۵۰۷؛ [تکملہ، ۱: ۸۴۵ ببعد].

(C. BROCKELMANN)

کَاثْ: خوارزم موجودہ خیوا کا قدیم دارالحکومت۔ * یاقوت (معجم، طبع وسٹنفلڈ، ۴: ۲۲۲) کی رو سے اہل خوارزم کی زبان میں اس نام کے معنی تھے صحرا میں ایک دیوار (حائط)، چاہے اس کے اندر کوئی عمارت نہ بھی ہو - فیل یا فیر کے قدیم شہر یا قلعے کے بارے

www.besturdubooks.wordpress.com

میں مفصل ترین بیانات، جسے آمودریا (جیحون) بتدریج بہا لے گیا تھا (اس کے آخری نشانات، بعض بیانات کے مطابق ۳۸۴ھ/۹۹۴ء میں صفحۂ ہستی سے معدوم ہوے تھے) البیرونی [رک بآں] کی کتاب الآثارالباقیة، ص ۳۵، میں ملتے ہیں اور انھیں پر E. Sachau کی کتاب *Zur Geschichte una Chronologie von Khwarizm* (*Sitzungsber. der phil.-hist. cl. d. k. k. Akad.*) *der Wiss.*، ج ۷۳، وی انا، ۱۸۷۳ء، خصوصاً ص ۴۸۹ ببعد پر مبنی ہے۔ چوتھی (دسویں) صدی کے جغرافیہ نگاروں نے اس شہر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کے لیے قب G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate* کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۴۴۶ ببعد، W. Barthold : *Turkestan w epokhu mongolskago nashestwiya* ج ۲، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۰ء، ص ۱۴۳ ببعد۔ اس کے بارے میں مکمل ترین حالات المقدسی، طبع ڈخویہ، بار دوم، ۱۹۰۶ء، ص ۲۸۷ ببعد، میں ملتے ہیں۔ جب ۳۸۵ھ/۹۹۵ء میں گرگانج کے فرمانروا ابوالعباس مامون بن محمد کے ہاتھوں پہلے خوارزم شاهی خاندان کا تختہ الٹا تو اس شہر کی سیاسی اهمیت جاتی رهی، دیکھیے W. Barthold : *Turkestan etc.*، ۲ : ۲۷۵ ببعد، کاث کا ذکر کرتے ہوے ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ (وہ اسے الکات لکھتا ہے، دیکھیے طبع Defrémery and Sanguinetti، ۳ : ۲۰) کہ یہ خوارزم اور اُرگنج (قدیم گرگانج) کے درمیان واحد آباد مقام ہے۔ خوارزم میں مقامی حکمران خاندان کے برسر اقتدار آنے سے قبل آٹھویں ہجری (چودھویں مسیح) صدی میں خیوا کے ساتھ کاث بھی سلطنت چغتائی میں شامل تھا (ظفر نامہ، کلکتہ ۱۸۸۷ء، ۱ : ۲۳۲)۔ مثال کے طور پر یہ امر ۱۳۳۱ء کے چین کے نقشے Bretschneider : *Mediaeval Researches from Eastern Asiatic Sources*، ۱۸۸۸ء، ۲ : ۶۳) سے بھی ظاہر ہوتا ہے ۱۳۷۲ء میں کاث پر تیمور کی یلغار کے بارے میں دیکھیے ظفر نامہ، ۱ : ۲۳۷ ببعد، P. Lerch : *Khiwa oder kh warizm*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۷۳ء، ص ۲۱) کے اس دعوے کے متعلق متن میں کوئی سند نہیں ملتی کہ فوج نے سہ پایہ اور کاث کے درمیان آمودریا کو عبور کیا تھا، جس کا مطلب اس نے یہ نکالا تھا کہ کاث اس زمانے میں دریا کے بائیں کنارے پر واقع تھا۔ گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی) میں کاث ایک خشک نہر کے کنارے آباد، تھا لہٰذا خیوا کے خان انوشہ (۱۶۶۳ تا ۱۶۸۷ء) نے اصل ندی کے مغرب میں نہر یارمشی کے کنارے جسے اس نے خود کھدوایا تھا، ایک نیا کاث آباد کیا W. Barthold : *Kistoric orosheniya Turkestana*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۴ء، ص ۹۵، از مخطوطۂ ایشیاٹک میوزیم ob ۵۹۰، تاریخ خیوا، ورق ۳۳ الف) قدیم کاث کے کھنڈر جو آمودریا کے مشرق میں واقع ہیں، آجکل دور اسلامی کے ابتدائی ایام کے ایک بزرگ شیخ عباس ولی کے روضے کے نام سے موسوم ہیں۔ ۱۸۷۳ء میں A. Kuhn یہاں پہنچا تھا، اس نے یہاں کے حالات قلمبند کیے ہیں (Materiali dlya statistiki Turk. Kraya، ۴ : ۲۵۲)۔ ولی موصوف کے مقبرے کے علاوہ جو روغنی اینٹوں سے آراستہ یہاں کی واحد عمارت ہے، A. Kuhn نے ایک نیم منہدم مینار اور فصیل شہر کے بچے کچھے آثار کا ذکر کیا ہے۔ ان سب کی تعمیر میں پکی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔ موجودہ گاؤں (۲۰۰ مکانات، ۱۵ دکانیں، ۲ مسجدیں مع مکاتب) قدیم محل وقوع کے صرف ٹھوڑے سے حصے پر آباد ہے اور موجودہ قلعہ قدیم قلعے کے صرف چوتھائی رقبے پر مشتمل ہے۔ بقول V. Masalskiy : *Turkestankiy Kray*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۳ء، ص ۴۹۷) یہ کھنڈر پیٹروالگزنڈروسک Petroalexdrovsk (جو انقلاب کے بعد سے ترتکل Turtkul کے نام سے مشہور ہے) سے ۳۱ ورسٹ Verst (روسی میل = ۳/۲ میل

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

انگریزی) اور آمودریا کے موجودہ دائیں کنارے سے ۷ ورسٹ کے فاصلے پر واقع ہیں .

(W. BARTHOLD)

* **کارتہ** : سینیگال Senegal فرانسیسی سوڈان کا ایک علاقہ ہے جو ۲۱ ہزار مربع میل تک پھیلا ہوا ہے اور سینیگال کے بالائی سمندر اور صحرائے اعظم کے درمیان واقع ہے ۔ اس کے شمال کی جانب دریش موروں کا ملک اور ہوذ کا علاقہ ہے ۔ مغرب میں سینیگال، مشرق میں بُخنُو اور جنوب میں بلدگُو اور فُلدگُو ۔ (سطح کے اعتبار سے یہ ایک وسیع سطح مرتفع ہے جس میں قدیم زمانے کا Schistose زیادہ ہے اور Mesozoic اور Teritiary طبقات ارضی بھی زیادہ ہیں، اس میدان مرتفع کا نشیب جنوب مشرق کی طرف ہے، چنانچہ اس علاقے کے تقریباً سب دریا سینیگال ہی کی جانب بہتے ہیں .

آب و ہوا ہلکی خشک ہے، اوسط درجۂ حرارت عام طور پر ۸۰ درجے (ف) رہتا ہے سالانہ اوسط حرارت کی تدریجی حد ۲۲ء۵ درجے (ف) ہے، ماہانہ حرارت ۸۵ درجے (ف) ہے، سالانہ حرارت کا درجۂ اوسط حرارت مئی اور ستمبر میں دگنے تک پہنچ جاتا ہے ۔ یہاں بارش عموماً موسم گرما میں جنوب مغربی ہواؤں سے ہوتی ہے جو خلیج گنی کے گرم سمندر کے اوپر سے گذر کر آتی ہیں ۔ سالانہ بارش تقریباً ۲۵ انچ ہوتی ہے، جس کے ساتھ بادلوں کی گرج بھی ضرور سنائی دیتی ہے ۔ صحرا کی طرف سے جو گرم اور غبار آلود آندھیاں آتی ہیں، ان کی وجہ سے موسم اکثر خراب ہو جاتا ہے ۔ مختصراً کارتہ کی آب و ہوا کی خصوصیات یہ ہیں : درجۂ حرارت بہت زیادہ، موسم گرما میں چند روزہ خفیف بارش اور اس کے بعد طویل خشک سالی اور ہوا میں نمی کی کمی .

اس علاقے میں دریا بہت کم ہیں اس لیے بستیاں زیادہ تر کنوؤں کے ارد گرد بس گئی ہیں، پانی کی سطح بہت نیچی ہے لیکن پانی کا دباؤ بہت زیادہ ہے، جہاں کہیں زمین دوز کنویں بنائے جاتے ہیں، پانی بہت جلد اوپر ابھر آتا ہے .

اپنی خصوصیات کے اعتبار سے یہ علاقہ سرسبز میدانی ہے ۔ دور دور تک وسیع گھاس کے خشک میدان ہیں جن میں جا بجا ایسے درخت ہیں جن پر خشک سالی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ سال کے بڑے حصے میں خشک نظر آتے ہیں، مثال کے طور پر کیکر ۔ کارتہ جہاں کہیں آبپاشی کے وسائل مہیا ہوں، زراعت کے لیے موزوں ہے ۔ دریاؤں کے کناروں کے علاقے زرخیز ہیں اور ان میں یہاں کی مخصوص خوراک چاول کی کاشت ہوتی ہے ۔ دوسرے ریتلے اور مرطوب علاقوں میں کپاس، پھلیوں اور باجرے کی کاشت ہوتی ہے، اقتصادی زندگی کی بنیاد زیادہ تر تیل کے بیجوں اور پھلوں پر ہے، جن کا یہاں کی تجارت میں آدھا حصہ ہے ۔ دوسری پیداوار جس کی اہمیت رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے ، کپاس ہے ۔ اس علاقے میں کپاس کی ان مختلف اقسام کی کاشت کو رائج کیا گیا ہے جو مختلف طرح کی آب و ہوا کی شدت کو برداشت کر سکیں ۔ کپاس کا بیج کاشتکاروں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور مقامی کپاس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے ۔ اس بات کے وسیع امکانات موجود ہیں کہ یہاں بھیڑیں پال کر آمدنی کے ذرائع کو بڑھایا جا سکے ۔ حال ہی میں یہاں مہرینو قسم کی بھیڑیں پالنے کا تجربہ کیا گیا تھا جو زیادہ ناکام نہیں رہا .

یہاں کی آبادی بہت کم ہے، یعنی کوئی پانچ چھے کس فی مربع میل ۔ جو لوگ یہاں آباد ہیں زیادہ تر سوننکی اور بمبرہ قوم کے لوگ ہیں ۔ مخلوط آبادی میں خسونکے Khassonke پیوھل Peuhl اور مور شامل ہیں، بمبرہ قوم کے سوا باقی سب مسلمان ہیں کارتہ کے مختلف حصوں کی تفصیل یہ ہے : (۱) Diafunu (تمبرکہ) اور Diomboko (کونیاکری) جو سینیگال کے دائیں کنارے پر واقع ہیں؛ (۲) Giudiumé (نیو گومبرہ) Diafun کے شمال میں واقع ہے؛ (۳)

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

Tomoo (دیالہ) وسط میں واقع ہے؛ (۴) بگھے Baghe اور کارتہ بنے Kaarta-Bine، فلدگو Fuladugu کے شمال میں واقع ہے؛ (۵) دیان غرتہ مشرق میں؛ (۶) کنگوی (نیورا) مُوروں کی سرحد پر Luniakori اس علاقے کا پایے تخت ہے جہاں کی آبادی پانچ ہزار ہے۔ نیورا جو شمال میں واقع ہے جہاں کی آبادی بھی پانچ ہزار کے لگ بھگ ہے، ایک اچھا تجارتی مرکز ہے۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں اس علاقے کی تحقیقات ہاٹن Houghton اور منگو پارک Mungo Park (۱۷۹۵ء نے اور پھر ڈوراٹن Duranton (۱۸۲۸)، ریفنل Raffenel (۱۸۴۶)، Mage & Quintin (۱۸۶۳) اور Lenz (۱۸۸۰) نے کی۔

تاریخ: سترھویں صدی کے اختتام پر سلطنت مَلّی کو زوال آیا، قوم بمبرہ مساسی Bambara Massassi کے لوگوں نے جو سیگو سے آئے تھے، سونسہ Sunsa نامی سردار کی سرکردگی میں کارتہ کو فتح کر لیا اس کے جانشینوں کو سیگو کے بمبرہ کے خلاف جنگ کرنی پڑی، اٹھارھویں صدی کے آخر میں سیگو کے بمبرہ نے مساسیوں کو مغلوب کر لیا لیکن مساسیوں کے ایک شہزادے موسی گرابو نے اپنی قوت بڑھا کر نہ صرف تمام مفتوحہ علاقے واپس لے لیے بلکہ کونیا کاری کا علاقہ بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ کودیہ Kaudia نے جو اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا، نیورو اور دیاورہ کے علاقے بھی فتح کر لیے اور اس طرح کارتہ ایک زبردست اور طاقتور سلطنت بن گئی جو مشرق سے مغرب تک ۱۹۰ میل اور شمال تا جنوب ۱۱۰ میل لمبی تھی۔ اقتدار و اختیار ایک سردار کُلوبر Kulubar کا تھا جس کا لقب فامہ Fama تھا۔

کارتہ کی سلطنت کو تکولر Tuculor نے مطیع و مغلوب کر لیا۔ کارتہ قتل کر دیا گیا اور فامہ کو اطاعت قبول کرنی پڑی۔ اب کارتہ کا علاقہ تکولر کی سلطنت سے ملحق ہو گیا اور اس پر ۱۸۹۴ء تک ایک وائسرائے حکومت کرتا رہا۔ ۱۸۹۰ء میں کرنل Gallieni کی فوجیں کارتہ میں داخل ہو گئیں، انھوں نے کونیا کاری پر بھی قبضہ کر لیا، یکم جنوری ۱۸۹۱ء کو انھوں نے نیوود پر بھی قبضہ کرکے سارے ملک کو مطیع کر لیا اور کارتہ کو مملکت فرانس میں شامل کر لیا گیا اور اس کو انتظامیہ طور پر تین مختلف اضلاع نیورو، کتہ Kita اور کیز Kayes میں تقسیم کر دیا۔

مآخذ: (۱) Raffenel: *Nouvean voyage au pays*، پیرس ۱۸۵۶ء ج ۲؛ (۲) Mage: *Du Sénégal au Niger*، پیرس ۱۸۶۷ء؛ (۳) Gallién: *Veyage au Soudon Francais*، پیرس ۱۸۵۸ء، ص ۵۸۹-۶۰۵؛ (۴) Pietri: *Les Français au Niger*، پیرس ۱۸۸۵ء، ص۶۳؛ (۵) Lenz: *Voyage au Sénégal et au Maroc*، ج ۲، پیرس ۱۸۸۶ء؛ (۶) Gatelet: *Histoire de la conquste du Soudon Français*، پیرس ۱۹۰۱ء ص۱۷۹، ۱۹۳؛ (۷) M. Delafosse: *"Hant Senegal, Niger"*، پیرس ۱۹۱۲ء، ج ۱۱؛ (۸) Suggatels: *Africa*؛ (۹) Walter Fitzgerald: *Africa*؛ (۱۰) *Arid zone*؛ (۱۱) Hydvology: *Q. U. N. E. S. C. O. Fullicatriv*؛ The Columbia Lippivcott Gazetteer of the World.

(G. YVER)

کارتھیج: رک بہ قرطاجنہ۔ *

کاروان: (قدیم شکل "کار۔ بان"، وہ شخص جو * تجارت کی حفاظت کرتا ہے)، انگریزی میں اس لفظ کی صورت Caravan ہو گئی ہے۔ فارسی میں اس کے معنی ہیں سوداگروں کی ایک جماعت جو ڈاکوؤں اور رہزنوں کے مقابلے میں اپنے جان و مال کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو منظم کرتی ہے، (عربی قافلہ)۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ سامان لانے لے جانے کے لیے اونٹ، گھوڑے اور خچر استعمال ہوتے ہیں، اونٹوں کو سات سات کی قطار میں ترتیب دیا جاتا ہے۔ شتربان گدھے پر سوار ہو کر

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

قافلے کے آگے آگے چلتا ہے ۔ کاروان چلانے والے سست رو ہوتے ہیں اور عجلت سے کام نہیں لیتے، لیکن ان کا کام بڑا سخت اور تھکا دینے والا ہوتا ہے؛ ایک آدمی کو اکثر دس بارہ اونٹوں کی دیکھ بھال اور رہبری کرنا پڑتی ہے ۔ بعض اوقات تیس چالیس اونٹ صرف تین آدمیوں کے سپرد ہوتے ہیں ۔ ان شتربانوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ ہر منزل پر پہنچ کر اپنے جانوروں کا مال اتاریں، انہیں چارہ دیں اور ان کی دیکھ بھال کریں ۔ ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد کہیں وہ اپنے کھانے پینے کے متعلق سوچتے ہیں ۔ ازمنۂ وسطیٰ میں کوچ کا اشارہ ڈھول (کوس) بجا کر دیا جاتا تھا ۔

صحرائی علاقوں میں قافلہ ان خیموں میں ٹھیرتا ہے جو وہ ساتھ لاتے ہیں، لیکن بادشاہوں اور مخیر لوگوں نے منزل بمنزل اور ایسے مقامات پر جہاں کاروان سستانے کے لیے رکتے ہیں، عمارتیں بنوا دی ہیں جنھیں کاروان سرائیں کہتے ہیں ۔ ان عمارتوں کا نقشہ عموماً ایک سا ہوتا ہے ۔ یعنی ایک مربع صحن، اس کے چاروں طرف دیواریں جن میں ایسی کوئی کھڑکی نہیں ہوتی جو باہر کی طرف کھلتی ہو ۔ ان کے ساتھ ساتھ کمروں کا ایک سلسلہ چلا جاتا ہے؛ ہر کمرے میں ایک دروازہ اور ایک کھڑکی ہوتی ہے ۔ بعض اوقات ان کاروانسراؤں میں کمروں کے بجائے بغیر چھت کی جھونپڑیاں بھی ہوتی ہیں ۔ ان کی تعمیر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سوداگر وہاں رات بھر ٹھیر سکیں اور اپنا سامان رکھ سکیں ۔ بار برداری کے جانوروں کو بندھن باندھ کر صحن میں چھوڑ دیتے ہیں، ان کاروان سراؤں میں جہاں تک ممکن ہو پانی کی بہم رسانی کے لیے کہیں سے آب رواں لایا جاتا ہے یا کم از کم وہاں ایک کنواں بنوا دیا جاتا ہے ۔ ایران میں اکثر ایسی عمارتیں جو اب تک موجود ہیں، صفویوں کے عہد سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی تعمیر شاہ عباس اعظم سے منسوب کی جاتی ہے ۔ ان کاروانسراؤں میں اب صرف خالی چار دیواری کے سوا اور کچھ نہیں ۔ ضروری استعمال کی چیزیں مثلاً بستر، قالین اور کھانا پکانے کے برتن وغیرہ مسافر اپنے ساتھ لاتے ہیں، تاہم شہروں میں خصوصاً کاروانسرائے کے قریب ایک نانبائی ہوتا ہے جس کے ہاں اہل مشرق کے پسندیدہ کھانے ہر وقت تیار ملتے ہیں ۔

شیعیوں کے نزدیک نجف میں ضریح حضرت علیؓ (مشہد علی) اور کربلا میں ضریح امام حسینؓ (مشہد حسین) کے قریب دفن ہونا ایک با برکت عمل سمجھا جاتا ہے ۔ یہ دونوں مقامات پہلے سلطنت عثمانیہ کی حدود میں تھے، اب مملکت عراق میں ہیں ۔ اس مقصد کے لیے لوگ ہزاروں کی تعداد میں نعشوں کو لے کر ایران کے بعید ترین گوشوں سے میت کے قافلے بنا کر یہاں آتے ہیں ۔ نعشوں کو لکڑی کے تابوتوں میں یا قالینوں اور چٹائیوں میں لپیٹ کر دو دو، تین تین یا چار چار کی تعداد میں گھوڑوں کی پشت پر باندھ دیا جاتا ہے ۔ ہر منزل پر ان میتوں کو بالکل اسی طرح اتارا اور لادا جاتا ہے جس طرح سامان کے گٹھوں کو ۔ چونکہ اس سفر میں کئی ہفتے لگ جاتے ہیں ۔ اس لیے ان قافلوں میں ناقابل برداشت تعفن پیدا ہو جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی گاؤں کے قریب قیام کرتے وقت وہ وہاں سے تین یا چار میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالتے ہیں ۔

مآخذ : G. A. Olivier : *Voyage dans l' empire othoman*، ۳ : ۴۵۵ تا ۴۵۸؛ (۲) H. Binder : *Au Kurdistan*، ص ۳۱۹، ۳۳۰؛ (۳) E. G. Browne : *A year amongst the Persians*، ص ۷۲؛ (۴) J. E. Polak : *Persien*، ii : ۵۵ .

(CL. HUART)

کاروان سرائے : رک بہ فندق .

کارو مَنْڈل : رک بہ معبر .

کارُون : جنوبی ایران کا سب سے بڑا دریا ،

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

یہ ضلع عربستان (جسے پہلے خوزستان کہتے تھے) کے شمال مشرقی حصے میں ۳۲° عرض بلد شمالی سے ذرا اوپر زردہ کوہ سے نکلتا ہے (کوہ زرد، جس کا پندرھویں صدی عیسوی ہی میں حمد اللہ مستوفی کے یہاں ذکر ملتا ہے (دیکھیے مآخذ) اس کا تعلق سلسلۂ کوہ بختیاری سے ہے اور اگر زیادہ صحت سے کام لیں تو کہنا چاہیے کہ یہ اس پہاڑ سے نکلتا ہے جس کا نام کوہ رنگ ہے اور جو جنوب مغربی ایران کے بلند ترین پہاڑوں میں شمار ہوتا ہے (تخمیناً ۱۳۰۰۰ فٹ) Sawyer (رک بہ مآخذ؛ در آخر ترجمۂ کتاب جس کا نام وہاں درج ہے ص ۴۸۶، مع ایک تصویر) کے قول کے مطابق اس دریا کا اصل منبع چشمۂ کرنگ (کرنگ (کرن) کا بڑا منبع) نامی مقام سے ۱۰ میل اوپر کی طرف واقع ہے، "زائندہ" یا "زینده رود" بھی جسے اصفہان رُود بھی کہتے ہیں اسی طرح زردہ کوہ سے نکلتا اور مشرق میں اصفہان کی جانب بہتا ہے .... [تفصیل کے لیے دیکھیے لائیڈن بار دوم و بار اول بذیل مادّہ].

مآخذ: (۱) *B G A*، بمواضع کثیرہ، خصوصاً اشاریہ بذیل مادّہ (نہر) دُجیل و (نہر) مسرُقان؛ (۲) ابن سرپین، طبع DeGoeje در *JRAS*، ۱۸۹۵ء، ص ۳۰، سطر ۵ تا ۹؛ ۳۲۱ ببعد (متن) اور ص ۳۰۷ تا ۳۱۳ (ترجمہ و حواشی؛ (۳) یاقوت: معجم، طبع Wüstenfeld، ۲: ۵۵۵، ۲۰ ببعد؛ ۴: ۵۲۷: ۱۱ ببعد؛ (۴) حمد اللہ مستوفی: نزھة القلوب، طبع Le Strange، ص ۱۹۵، سطر ۱۹، ۲۱۵، سطر ۳؛ (۵) ابن بطوطہ، طبع Sanguinetti و Defrémery، ۲: ۲۳ تا ۲۴؛ (۶) G. Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ۲۰۷، ۲۳۲ تا ۲۳۷؛ (۷) P. Schwarz: *Iran in Mittelalter nach den arab. Geograph*، ج ۴، لائپزگ ۱۹۲۱ء، ص ۲۹۵ تا ۳۰۸، ۳۱۰ تا ۳۱۱؛ (۸) J. M. Kinneir: *A Geogr. Memoire of the Persian Empire*، لنڈن ۱۸۱۳ء، ص ۸۷ تا ۹۰، ۹۶ تا ۹۹، ۱۰۲ تا ۱۰۵؛ (۹) H. C. Rawlinson، در *JRGS*، لنڈن ۱۸۳۹ء، ۹: ۶۴ ببعد ۷۳ تا ۷۸، ۸۱، ۸۸ ببعد؛ (۱۰) Selby، وہی کتاب ۱۸۴۴ء، ۱۴: ۲۱۹، ۲۴۱؛ (۱۱) Layard، وہی کتاب ۱۸۴۶ء، ۱۶: ۲۷ تا ۲۸، ۴۴، ۵۰ تا ۶۵؛ (۱۲) Ritter: *Erdkunde*، ۹: ۴۶، ۱۶۲ تا ۲۰۴، ۲۱۹ تا ۲۲۰، ۲۲۵ تا ۲۲۷؛ ۱۰: ۲۶، ۲۸، ۳۱؛ ۱۱: ۱۰۲۴ تا ۱۰۲۵، ۱۰۲۸ تا ۱۰۳۰؛ (۱۳) C. A. von Bode: *Travels in Luristan and Arabistan*، لنڈن ۱۸۴۵ء، ۲ بمواضع کثیرہ (خصوصاً ص ۱۶۲، ببعد ۱۹۳، ۲۷۳ ببعد)؛ (۱۴) W. K. Loftus: *Travels and Research. in Chaldaea and Susiana*، لنڈن ۱۸۵۷ء، ص ۲۸۹ تا ۲۹۳، ۲۹۸ تا ۳۰۰، ۳۲۹، ۳۴۳، ۳۴۶، ۴۲۳ تا ۴۳۱؛ (۱۵) Fr. Spiegel: *Eranische Altertumskunde*، ۱، لائپزگ ۱۸۷۱ء، ص ۱۰۸ تا ۱۱۱؛ (۱۶) A. Arnold: *Through Persia by Caravan*، لنڈن ۱۸۷۷ء، ۲: ۳۹ ببعد؛ (۱۷) H. Schindler در *Z.G. Erdk. Berl.*، ۱۸۷۹ء، ۱۴: ۳۸ ببعد ۱۸۸۱ء، ۱۶، ۳۰۷ ببعد؛ (۱۸) H. L. Wells در *PRGS*، ج ۵، لنڈن ۱۸۸۳ء، ص ۱۳۸ ببعد، ۱۴۴ ببعد، ۱۵۳ ببعد؛ (۱۹) Bateman Champain، وہی کتاب، ۱۸۸۳ء، ۵: ۱۲۱ تا ۱۳۸، ۱۴۶ تا ۱۴۹، ۱۵۲ (مع حواشی Fr. Goldsmid و Mackenzie)؛ (۲۰) Stolze و Andreas در *Petermanns Geogr Mitteil*، تکملہ حصہ عدد ۷۷، ص ۴۸، ۵۶، ۱۸۸۵ Gotha؛ (۲۱) J. Dieulafoy: *Le Perse, la Chaldée et la Susiane*، پیرس ۱۸۸۷ء؛ (۲۲) W. Fr. Anisworth: *A Personal Narrative of the Euphrates Expedition*، لنڈن ۱۸۸۸ء، ۲: ۱۶۸ تا ۱۸۹، ۲۰۵ ببعد ۲۱۹ تا ۲۳۲؛ (۲۳) W. F. Ainsworth: *The River Karun*، لنڈن ۱۸۹۰ء؛ (۲۴) H. B. Lynch: *Karun Valley*، در *PRGS*، ۱۸۹۰ء، ۱۲؛ (۲۵) Tomaschek: *Kustenfhart Nearchs*، در *S. B. Ak. Wien*، جلد ۱۲۱: Abh. ۸: ص ۷۳ تا ۸۴ (۱۸۹۰ء)؛

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

(۲۶) G. N. Curzon : *The Karun River*، در *P.R.G.S*، ۱۲ : ۵۰۹ تا ۵۳۲ ؛ (۲۷) Curzon : *Persia and the Persian Question*، لنڈن ۱۸۹۲ء، بمواضع کثیرہ (دیکھیے اشاریہ؛ خصوصاً ۲ : ۳۱۴ ببعد، ۳۳۰ ببعد، ۳۳۶)؛ (۲۸) Mrs. Bishop : *Journeys iu Persia and Kurdistan*، لنڈن ۱۸۹۲ء ؛ (۲۹) H. A. Sawyer در *The Geographical Journal*، ج ۴، لنڈن ۱۸۹۴ء، ص ۴۸۱ تا ۵۰۱ (مع حواشی از Lynch, Mackenzie، ص ۵۰۲ ببعد)؛ (۳۰) Th. E. Gordon : *Persia Revisited*، لنڈن ۱۸۹۶ء، ص ۱۰۰ ببعد؛ (۳۱) *The Persian Gulf Pilot* (ابتداءً مرتبۂ Constable و Stiffe) لنڈن ۱۸۹۸ء، ص ۲۸۴ تا ۲۹۳، ۲۹۶ تا ۲۹۹ ؛ (۳۲) Billerbeck، در *Mitt. VAG*، ۳ حصہ ۲ : ص ۲۹ تا ۳۴، ۴۶ تا ۵۰ (۱۸۹۸ء)؛ (۳۳) Graadt von Roggen، در *Mém de la Délégation en Perse*، ۷، پیرس ۱۹۰۵ء، ص ۱۶۷ تا ۲۰۷؛ (۳۴) E. Herzfeld در *Petermann's Geogr. Mitteil*، ج ۵۳ Gotha ۱۹۰۷ء، ص ۷۳ تا ۷۹، مع الواح ۶ و ۷، هر راستے کا نقشہ (کارون کی گزرگاہ شستر سے اَھواز - ناصریہ تک)؛ (۳۵) W. Schweer : *Das türkischpersische Erdölvorkommen*، ہمبرک ۱۹۱۹ء = *Abh. des Hamburg. Kolonialinstituts*، جلد ۳۰ : ۲۲، ۵۷ تا ۷۲، ۱۱۰ تا ۱۱۷، ۱۳۰ تا ۱۴۲، ۱۷۷ تا ۲۱۹، مع نقشہ ۳ (وادی کارون) اس سلسلے میں مطالعے کے لیے مزید تصنیفات اور نقشوں کا حوالہ Schweer نے ص ۱۵۳ ببعد اور ۱۶۵ ببعد پر دیا ہے .

(تلخیص از ادارہ) M. Streck

* **کَازِرُون** : ایران کا ایک شہر جو صوبۂ فارس میں، سمندر اور شیراز کے درمیان ۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور شیراز سے ۵۵ میل کے فاصلے پر ہے .

مآخذ : (۱) یاقوت، طبع وُسٹنفلڈ، ۴ : ۲۲۵؛ (۲) Barbier de Meynard : *Dictionnaire de la Perse*، ص ۴۷۲ و حاشیہ ؛ (۳) G. le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ۲۶۶ ؛ (۴) J. P. Morier : *Second Journey*، لنڈن ۱۸۱۸ء ؛ (۵) E. S. Waring : *A tour to Sheeraz*، لنڈن ۱۸۰۷ء ص ۲۲ .

(تلخیص از ادارہ) Cl. Huart

کازرُونی : شیخ مرشد ابو اسحٰق ابراہیم بن * شہر یار - ناحیۂ کازرون کے بزرگ علما و عرفا میں سے تھے اور درویشوں کے ایک سلسلے کے بانی جو ان کے نام کی نسبت سے اسحٰقیہ یا "کازرونیّہ" کہلاتا ہے - کازرون (ولایت قشطائی) میں ۳۵۳ھ سے ۴۲۶ھ (۹۶۳ء تا ۱۰۳۴ء) تک بقید حیات تھے اور اسی شہر میں اپنی خانقاہ میں مدفون ہیں - مستوفی کے زمانے میں ان کا مزار "حریم" تصور ہوتا تھا (نزھۃ القلوب ص ۱۲۵) وہ آتش پرستوں کے خاندان سے تھے اور اس خاندان میں ان کا باپ ہی پہلا شخص تھا جو مشرف باسلام ہوا، شیخ کی ولادت ان کے باپ کے اسلام لانے کے بعد ہوئی - (جامی - نفحات الانس طبع کلکتہ ص ۲۸۶، لامعی کا ترکی ترجمہ استانبول، تاریخ طباعت ندارد، ص ۲۹۷) لیکن باوجود اس کے وہ اسلام کے ایک سرگرم مبلغ تھے اور بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے چوبیس ہزار آتش پرستوں اور یہودیوں کو مشرف باسلام کیا اور لاکھ مسلمانوں نے توبہ کرکے ان سے بیعت کی - (فرید الدین عطار : تذکرۃ الاولیاء مرتبۂ نکلسن ۲ : ۲۹۶ ، خزینۃ الاصفیا، طبع لاہور ۱۲۸۳ء، ص ۸۷۸) - ان کے سلسلے کے ارکان ہمیشہ سرگرم مبلغ رہے جو کفار کے خلاف جہاد اور غزاء کی تلقین کیا کرتے تھے - اسحٰقیّہ سلسلہ ایران سے ہوتا ہوا ہندوستان اور چین تک پھیل گیا، جہاں انھوں نے اپنی شاخیں قائم کیں ؛ بالخصوص بندرگاہوں پر (مثلاً کالی کٹ اور زیتون میں) دیکھیے ابن بطوطہ طبع ڈیفریری و سنگینٹی Sanguinetti, Defrémery ۲ : ۶۴، ۸۸ تا ۹۲، ۳ : ۲۴۴ تا ۲۴۸، ۴ : ۱۰۳) یہ سلسلہ آناطولی تک بھی پہنچا، جہاں بیان کیا جاتا ہے کہ

www.besturdubooks.wordpress.com

بانی سلسلہ نے اپنی زندگی ھی میں اپنے پیروؤں کو جہاد کے لیے روانہ کیا تھا ۔ لیکن اس علاقے میں اس سلسلے کی موجودگی کا پورا ثبوت چودھویں صدی ھی سے ملتا ھے (W. Caskel : در *ISL*، ۱۹ : ۲۸۴ ببعد) اپنے مجاھدانہ تبلیغی جوش و خروش کی وجہ سے "اسحٰقیّہ" سلسلے نے پندرھویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں لازمی طور پر نمایاں حصہ لیا ھوگا ۔ Spandugino (سولھویں صدی کی ابتدا) نے اپنے ایک رسالے میں (در سانسووی‌نو Sansovino وینس ۱۶۵۴ ص ۱۲۹) اس سلسلے کو چار بڑے سلسلوں میں شمار کیا ھے ۔ قدرتی طور پر اس کا نفوذ روم ایلی میں بھی ھوا (ادرنہ کے تکیۂ حضرت ابو اسحٰق کازرونی کا ذکر اولیا چلبی ج ۳، ص ۴۵۴ میں موجود ھے) آناطولی سے یہ سلسلہ حلب پہنچا ۔ بروسہ، قونیہ اور ارزروم میں ان کے ادارے (ابو اسحٰق خانے موجود) تھے ، Caskel : کتاب مذکور) ۔ چودھویں صدی میں اس سلسلے کی تنظیم یقینا اعلیٰ درجے کی ھوگی کیونکہ زاویۂ شیخ کے خادم شیخ کی مہر لگا کر ضرورت مندوں کو ان لوگوں کے نام =چیک Cheque دیا کرتے تھے جنھوں نے کازرونی سلسلے کا حلف اٹھایا ھوتا تھا، وصولی کے بعد وصول کنندہ امر کے پیچھے رسید درج کرتا تھا ۔ شیخ کی تربت کو "تریاک اکبر" کہتے تھے، اس لیے کہ آپ کی خاک مزار کے متعلق معتقدین (بالخصوص ملاحوں اور عطار) کا عقیدہ تھا کہ وہ حیرت انگیز نتائج پیدا کرتی ھے، سلطان شاھرخ بن تیمور نے ۸۱۸ھ (۱۴۱۵-۱۴۱۶ء) میں مزار شیخ کی زیارت نہایت عقیدت کے ساتھ کی (مطلع سعد بن، جلد ۲، ص ۳۴۴) ۔ ترکی میں سترھویں صدی کے دوران میں "اسحٰقیّہ" نے اپنے آپ کو ایک نسبۃً متأخّر سلسلے میں مدغم کر دیا ۔ لیکن عوام میں کازرونی سے عقیدت کے مظاھرے اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آتے ھیں ۔

مآخذ : (۱) ماسینیون Massignon : *La passion d'al-Halladj*، ۱ : ۴۱۰ ببعد ؛ (۲) کوپریلو زادہ محمد فواد Köprülüzade Mehmed Fu'ad (اور میرے اضافے) : در *ISL*، ۱۹ : ۱۸ ببعد) اس مقالے میں ناموں کے حوالے بھی ھیں جن کو ابھی تک استعمال نہیں کیا گیا تھا مناقب ؛ (۳) Meier : *Die Vita des Scheik Abu Ishaq al-Kazaruni*، لائپزگ ۱۹۴۸ء؛ (۴) بستان السیاحۃ، ۲ : ص ۴۶۰ ؛ (۵) فارس نامۂ ناصری ، ۲ : ۲۴۹) (به زیادات) .

(P. WITTEK)

کازموف : رک بہ قاسموف . *

کاسا بلانکا : (Casa Blanca) : رک بہ * دارالبَیْضاء .

اَلْکَاسَانی : ابوبکربن مَسْعُود بن احمد علاءالدین ملک العُلَماء، حنفی فقیہ، جنھیں غلطی سے "الکاشانی" بھی کہا جاتا ھے ؛ ان کی نسبت "کاسان" سے ھے جو "الشّاش سے پرے ھے" (قُرَشی، ابن دُقْماق)، یعنی فرغانہ میں [دریای] سَیْحُون کے جانب شمال، دیکھیے المُسْتَوفی : نزھۃ القلوب، ص ۲۴۶ ؛ السَّمعانی، ص ۴۱۷ ؛ یاقوت، ۴ : ص ۲۲۷؛ وہ علاءالدین محمد بن احمد بن ابی احمد السمرقندی (۵۳۹ھ/۱۱۴۴ء) کے شاگرد تھے ۔ انھوں نے اپنے استاد کی دختر فاطمہ سے جو فقیہہ کہلاتی تھیں شادی کی اور تحفۂ عروسی کے طور پر اپنے استاد کی تصنیف "تحفۃ" پر اپنی شرح پیش کی ۔ ابتدا میں وہ سلجوقی دربار سے وابستہ تھے، لیکن ایک بحث کے دوران میں وہ دست درازی پر اتر آئے اور انھیں دربار سے اپنا تعلق منقطع کرنا پڑا ۔ اس واقعے کے بعد سلجوقی حکمران نے اپنے وزیر کے مشورے سے انھیں حلب میں نورالدین بن زنگی کے دربار میں سفیر بنا کر بھیج دیا، جہاں ان کا بڑی تعظیم و تکریم سے خیر مقدم کیا گیا (۵۴۱ھ اور ۵۴۴ھ کے درمیان) ۔ بعد ازآں نور الدین نے انھیں علمائے حلب کی درخواست پر رضی الدین السَّرَخسی (۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء-۱۱۵۰ء) کے

www.besturdubooks.wordpress.com

بجاے "مدرسة الحلاویه" (قائم شدۂ ۵۴۳ھ) میں معلم کی حیثیت سے مامور کر دیا، کیونکہ طلبہ السَّرَخسی سے قوت بیان میں ایک نقص کی وجہ سے بہت غیر مطمئن تھے ("ابن قُطْلُوبُغا" اور طاش کوپروزادہ کا یہ بیان کہ انھیں یہ منصب السَّرَخسی کی وفات کے بعد ملا غلطی پر مبنی ہے - دیکھیے علاوہ ازیں ابن العدیم : تاریخ حلب، ترجمہ Blochet در ROL، ج ۳ (۱۸۹۵ء) ص ۵۱۹ - وہ ایک نہایت ثقہ اور صحیح العقیدہ عالم تھے اور معتزلہ اور اہل البدعة کا اکثر ردّ کرتے رہتے تھے - دمشق میں ایک دفعہ ان کا شافعی علما سے مناظرہ ہوا، جس میں انھوں نے شافعیوں کے ہر ایک سوال کے جواب میں کسی حنفی مستند عالم کی سند پیش کی - ان کا انتقال حلب میں بتاریخ ۱۰ رجب ۵۸۷ھ/۳ اگست ۱۱۹۱ء اتوار کے روز ہوا اور انھیں حلب سے باہر مقام ابراہیم الخلیل میں ان کی اہلیہ کی قبر کے نزدیک دفن کیا گیا - ایوبی سلطان الظاہر غازی نے ان کے بیٹے کی تعلیم کا اہتمام اپنے ذمے لے لیا .

ان کی اہم ترین تصنیف کتاب "بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع" (۷ جلد، قاہرہ ۱۳۱۷-۱۳۱۸ھ) فقہ سے متعلق ہے - یہ کتاب ان کے سیرت نگاروں کے بیان کے مطابق ان کے استاد علاءالدین السمرقندی کی تصنیف "التحفہ" مبنی بر "قُدُوری" کی شرح ہے (حاجی خلیفہ، ۲ : ۲۳۵، نے بھی یہی لکھا ہے) مگر یہ تصنیف "شرح" کی معمولی خصوصیات کی حامل نہیں اور خود کتاب میں اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ السمرقندی کی کتاب کی تقلید میں لکھی گئی ہے - غالباً یہ سب سے پہلی اور اپنی نوع کی واحد حنفی فقہ کی کتاب ہے جو الغزالی کی "الوجیز" اور ابن رشد کی "البدایة" کی مانند چھوٹی سے چھوٹی جزئیات تک پوری باقاعدگی کے ساتھ مرتب کی گئی ہے - مصنف خود کتاب کی تمہید میں اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ وہ سختی سے ایک منتظم طریقے (الترتیب الصنائعی) کی پابندی کرے گا - اس نے ایک اور کتاب بھی لکھی تھی جو اب موجود نہیں، یعنی السلطان المبین فی اصول الدین (القرشی؛ ابن قُطْلُوبُغا، حاجی خلیفہ، عدد ۷۲۱۵) - براکلمان اس کی ایک تفسیر قرآن کتاب التاویلات کا ذکر کرتا ہے جو بشکل مخطوطہ محفوظ ہے .

مآخذ : بڑا ماخذ (۱) ابن العدیم : تاریخ حلب، اکثر حصہ غیر مطبوعہ - مندرجۂ ذیل نے اس سے استفادہ کیا ہے : (۲) القرشی : الجواہر المضیئة، ۲ : ۲۴۴، ۲۴۶ ؛ (دیکھیے ۲ : ۱۲۹ و ۲۷۸) ؛ (۳) ابن دقماق : نظم الجمان فی طبقات اصحاب النّعمان، مخطوطۂ برلن، پیٹرزبرگ، جلد ۲، ص ۲۴، ورق ۱۴ تا ۱۵ ب؛ (۴) ابن قُطْلُوبُغا : تاج التراجم، طبع Flügel، شمارہ ۲۶۲ ؛ (۵) طاش کوپرو زادہ : مفتاح السّعادة، حیدر آباد ۱۳۲۹ھ، ۲ : ۱۳۵ ؛ (۶) الکَفَوی : طبقات الحنفیّہ، مخطوطۂ برلن، Sprenger، شمارہ ۳۰۱، ورق ۱۰۴ (اقتباس از لکھنوی : الفوائد البہیّہ، قاہرہ ۱۳۲۴ھ ص ۵۳)؛ (۷) G. Flügel : *Die Classen der Hanafit Rechtsgelehrten*، لائپزگ ۱۸۶۰ء، ص ۳۰۶ ؛ (۸) Brockelmann : *GAL*، ۱، ص ۳۷۵) ؛ (۹) Sarkis : *Dictionnaire de Bibliogra-phie Arabe*، قاہرہ ۱۹۲۸ء، عمود ۱۵۴ .

(HEFFENING)

کاسٹیوم : Costume رک بہ لباس .

کاشان : (عرب مصنفین کے یہاں اکثر قاشان) عراق عجمی (الجبال، میڈیا) کا ایک شہر جو اصفہان سے تین روز کی مسافت اور قم سے ۱۲ فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے - یہ ایک قدیم شہر ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ نے اسے از سرنو آباد کیا تھا .

مآخذ : (۱) اصطخری، ص ۱۹۷، ۲۰۱؛ (۲) ابن حوقل، ص ۲۵۹، سطر ۱۶ تا ۱۷ ص ۲۶۴ ؛ (۳)

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

المقدسی، ص ۳۹۰، ۳۹۲، بلا تاریخ؛ (۴) یاقوت: معجم، طبع Wüstenfeld، ۱۱: ۱۵؛ (۵) حمد اللہ مستوفی: نزھة القلوب، سلسلۂ یادگار گب، ۲۳: ۶۷، ۶۸ (ترجمہ ص ۷۱، ۷۲؛ (۶) Barbier de Meynard: *Dict. de la Perse*، ص ۳۳۴، ۳۳۵؛ (۷) Schefer: *Chrest Persane*، ۲: ۱۲۹؛ (۸) Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۲۰۹؛ (۹) Olivier: *Voyage etc*، پیرس ۱۸۰۷ء، ۳: ۹۶ تا ۹۷؛ (۱۰) Morier: *A second Journey through Persia*، ۱۸۱۸ء، ص ۱۶۱، ۱۹۲؛ (۱۱) W. Ousley: *Travels* لنڈن ۱۸۱۹ء، ۳: ۸۶ تا ۹۴؛ (۱۲) Mme Dieulafoy: *La Perse etc*، پیرس ۱۸۸۷ء، ص ۱۹۴ تا ۲۱۲؛ (۱۳) R. Binning: *Journey of two years travel*، لنڈن ۱۸۵۷ء، ۲: ۱۸۶ ببعد؛ (۱۴) E. Aubin: *musulman Rev. du Monde*، ۱۹۰۷ء، ۲: ۴۶۱ تا ۴۶۴؛ (۱۵) Chardin: *Voyages*، طبع Langles، پیرس ۱۸۱۱ء، ۲: ۴۶۱ تا ۴۶۳، ۳: ۱ تا ۱۱۰.

(Cl. Huart) [تلخیص از ادارہ]

* **کاشانی**: رک بہ عبدالرزّاق.

* **کاشانی**: حاجی میرزا جانی، بابی مؤرخ، کاشان کا ایک تاجر جو اپنے تین بھائیوں میں سے دو یعنی حاجی میرزا اسمٰعیل ذبیح اور حاجی میرزا احمد کے ساتھ میرزا علی محمد باب کے اوّلین پیروؤں میں سے تھا۔ جب ۱۸۴۷ء میں باب کو اصفہان سے ماکو کے زندان میں بھیجا جا رہا تھا تو ان بھائیوں نے اس کے نگران دستے کو رشوت دے کر اسے دو دن اور دو رات کے لیے اپنے ہاں بطور مہمان رہنے پر آمادہ کر لیا۔ ایک سال بعد کاشانی نے بہاء اللہ، صُبح ازل اور باب کے دوسرے ممتاز مریدوں کے ساتھ مل کر مازندران میں بار فُروش کے مقام پر شیخ طَبَرسی کے باغیوں میں شامل ہونے کی کوشش کی، لیکن شاہی فوجوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر کچھ عرصے کے لیے آمل میں قید رہا، تاآنکہ کاشان کے دو تاجروں نے فدیہ دے کر اسے رہائی دلائی۔ "وہ ہمیں ہمیشہ ایک خاص مذہبی جوش و جذبے سے سرشار نظر آتا ہے، کبھی بار فُروش میں، کبھی مشہد میں اور کبھی تہران میں" باب کو ۹ جولائی ۱۸۵۰ء کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کے بعد کے دو سال کاشانی بابی تحریک کی تاریخ لکھنے میں منہمک رہا۔ اور وہ اس کام کے لیے موزوں بھی تھا، کیونکہ وہ نہ صرف باب سے بلکہ صُبح ازل، بہاء اللہ اور بابی مذہب کے تقریباً تمام اوّلین قائدوں سے ذاتی طور پر شناسا تھا اور اس تحریک کے ابتدائی آٹھ سال میں جتنے بھی واقعات پیش آئے، ان کے بارے میں اسے مفصل اور صحیح معلومات حاصل تھیں۔ اس کی تاریخ میں (جس کا نام اس نے کسی متصوفانہ بنیاد پر جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی، نقطة الکاف رکھا تھا) سب حالات صحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں لیکن اس میں اس نے اپنے ممدوح کے لیے حد سے زائد اور تقریباً بت پرستانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے اور اس پر جبر و تشدد کرنے والوں کے خلاف جو دشنام طرازی کی ہے، اس سے یہ کتاب مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ جب ناصر الدین شاہ قاجار نے اس لئے مذہب کے پیرووں پر ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا تو کاشانی کو شاہ عبدالعظیم کی خانقاہ سے جو تہران سے چھے میل جنوب میں واقع ہے اور جہاں اس نے پناہ لے لی تھی جبراً نکال کر قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ یہاں اسے بہاء اللہ کے ساتھ ایک ہی کوٹھڑی میں جگہ ملی۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۵۲ء کو اسے تہران میں اس کے ۱۷ ہم مذہبوں کے ساتھ سزائے موت دی گئی۔ حکمت عملی کے تقاضے سے شاہ نے انہیں سزائے موت دینے کے لیے مختلف جماعتوں کے سپرد کر دیا تھا تاکہ وہ خود اور اس کا وزیر ہدف انتقام نہ بن سکیں، چنانچہ کاشانی کو آقا مہدی ملک التجّار کے حوالے کیا گیا۔ ایک بیان کی رو سے اسے کمان کی تانت سے گلا گھونٹ کر

www.besturdubooks.wordpress.com

مارا گیا اور ایک دوسرے بیان کے مطابق شہر کے تاجروں اور دکانداروں نے اسے اتنے زخم لگائے کہ بالآخر اس نے دم توڑ دیا۔

اس کے بھائیوں میں سے اسمٰعیل نے تہران میں وفات پائی اور احمد، جس نے باب کی موت کے بعد صبح ازل کو اس کا جانشین تسلیم کر لیا تھا، بغداد میں چند بھائیوں کے ہاتھوں جو بہاء اللہ کے پیرو تھے، مارا گیا۔

مآخذ: (۱) حاجی میرزا جانی: نُقطَةُ الکاف طبع E.G. Browne در سلسلۂ یادگار گب (*Gibb Memorial Series*)؛ (۲) Browne: *A Traveller's Narrative Written to illustrate the Episode of the Bab*، کیمبرج ۱۸۹۱ء؛ (۳) وہی مصنف: *The Ta'rikh-i-Jadid, or 'New History of Mirzā 'Alī Muhammad the Bāb* کیمبرج ۱۸۹۳ء۔

(T. W. HAIG)

* **کَاشغَر:** [عوامی جمہوریۂ چین کے صوبۂ سنکیانگ کا] ایک شہر، جس کا ذکر قدیم ترین چینی مآخذ میں سُولے Su-le (یا سُولو، شولو) کے نام سے ملتا ہے۔ تانگ شو *T'ang-Shu* میں یہ نام اپنے چینی املا کئوچہ Kiu-cha کے ساتھ مذکور ہے (E. Chavannes: *Documents sur les Tou-Kine (Turcs) Occidetaux*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۳ء، ص ۱۲۱ ببعد)، [کاشغر دو الفاظ "کا ش" (بمعنی رنگا رنگ) اور "غر" (بمعنی خشتی مکان) سے مرکب ہے اور دراصل دو شہروں کا مجموعہ ہے، یعنی چینی شہر لائی ننگ Lai-ning (یعنی شولو) اور اس کے مغرب میں اس سے کہیں بڑا اویغوری شہر شُوفُو (یا سُوفُو)۔ ہن اور تانگ حکمرانوں کے ادوار میں یہاں شولو سلطنت قائم تھی۔ تیسری صدی قبل مسیح ایک انڈوسیتھین قوم یوہ چی Yueh Chi کنسوہ کے علاقے سے آ کر اس پر قابض ہو گئی۔ پہلی صدی قبل مسیح میں چینیوں نے کاشغر سمیت پورا چینی ترکستان فتح کر لیا اور کہا جاتا ہے کہ مشہور چینی سپہ سالار پان چاؤ Pan Chao کاشغر ہی میں مدفون ہے۔ اس کے بعد یہ چی نے ایک بار پھر کاشغر فتح کر لیا اور انھیں کی بدولت یہاں بدھ مت کی اشاعت ہوئی]۔ زمانۂ قبل از اسلام کے کاشغر اور اس کے مضافات میں بدھ عمارات کے لیے دیکھیے A.Stein: *Ancient Khotan* آکسفرڈ ۱۹۲۱ء، ص ۸۰ ببعد؛ وہی مصنف: *Serindia*، آکسفرڈ ۱۹۲۱ء، ص ۸۰ ببعد۔

[ابن الأثیر، ابن خلدون اور دوسرے مسلمان مؤرخین کے مطابق خلیفہ ولید بن عبدالملک کے نامور سپہ سالار مسلم بن قتیبہ نے کاشغر فتح کیا (۹۶ھ/ ۷۱۵ء)، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ مستقل طور پر اسلامی سلطنت میں شامل نہیں کیا گیا (دیکھیے H. A. R. Gibb، در *Bull. of the School of Or. Stud.*، ۲ : ۶۷۴ ببعد)۔ آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں چینیوں کی فوج متعین تھی، لیکن وہ مغرب سے آنے والے ترکوں کا مقابلہ نہ کر سکی]۔ کاشغر کے پہلے مسلمان خان کی حیثیت سے ہمیں سُتُق بُغرا خان (م ۳۴۴ھ/۹۵۵ء) کا نام ملتا ہے (جمال قرشی، در Barthold: *Turkestan etc.*، سینٹ پیٹرز برگ، ۱ : ۱۳۰ ببعد)، جس کا مقبرہ کاشغر کے شمال میں ارتوج (موجودہ ارتش) کے مقام پر آج بھی موجود ہے۔

دور ایلک خانیہ [رک بآں] میں کاشغر سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے چینی ترکستان کا اہم ترین شہر تھا۔ پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی میں اس شہر کی ایک تاریخ عربی زبان میں لکھی جا چکی تھی (السمعانی: کتاب الانساب، طبع Margoliouth، لائیڈن و لنڈن ۱۹۱۲ء، ورق ۴۷۰ الف تا ۴۷۲ الف؛ جمال قرشی، در Barthlod، ۱ : ۱۲۳)۔ فرمانرواؤں کو تومن Tumen کے کنارے ایک مخصوص مقبرے (الجنبذة الخاقانیه) میں دفن کیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے فرمانروا نے، جسے وہاں دفن کیا گیا تھا، محرم

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۴۲۴ھ/دسمبر ۱۰۳۲ء میں اور آخری نے رجب ۶۰۱ھ/مارچ ۱۲۰۵ء میں وفات پائی تھی ۔ عہد مغول میں مسعود بیگ [رک بہ بخارا] نے کاشغر میں ایک مدرسہ بنوایا تھا ۔ اس کے کتاب خانے میں الجوہری کی صحاح کا وہ نسخہ موجود تھا جسے جمال قرشی نے ترجمہ لکھتے وقت استعمال کیا تھا ۔ E. Sachau و Ethe : *Cat. of the Persian . . . Mss of the Bodleian Library*، اوکسفرڈ ۱۸۸۹ء، عمود ۹۸۳) ۔

[۱۲۱۹ء میں چنگیز خان نے کاشغر کا ضلع اپنی حدود سلطنت میں شامل کر لیا ۔ قبلای خان کے عہد میں مارکوپولو یہاں آیا تھا (۱۲۷۵ء) ۔ چودھویں صدی عیسوی میں امیر تیمور کے لشکر نے اسے تاخت و تاراج کیا] ۔ آگے چل کر کاشغر پر امرائے دُوغلات [رک بآں] کی حکومت قائم ہو گئی ۔ ان میں سے آخری امیر ابوبکر (م ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء) جدید شہر کا بانی تھا ۔ اس نے پرانا قلعہ منہدم کرکے دریائے تومن کے دوسرے کنارے ایک نیا قلعہ تعمیر کرایا (تاریخ رشیدی، انگریزی ترجمہ، ص ۲۵۳، ۲۸۶ ببعد، ۲۹۵، ۳۲۶) ۔

[۱۷۵۵ء میں چینیوں نے ایک بار پھر کاشغر فتح کر لیا، جو تنگن بغاوت (۱۸۶۲ء) تک انھیں کے ماتحت رہا ۔ ۱۸۶۴ء میں ایک مسلمان سپہ سالار یعقوب بیگ نے کاشغر کے امیر کو معزول کرکے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی] ۔ مغول خوانین کے زمانے سے کاشغر اس علاقے کا صدر مقام نہ رہا تھا ، اس کی جگہ یارقند نے لے لی تھی ۔ ۱۸۷۷ء میں چینیوں کا دوبارہ قبضہ ہو جانے کے بعد کاشغر کو پھر اہمیت حاصل ہو گئی کیونکہ اسے تاؤتای Tao-tai کا صدر مقام بنا دیا گیا، جس کے ماتحت چینی ترکستان کے مغربی اور جنوبی حصے چرچن کے نخلستان تک شامل ہیں ۔ یہاں روسی اور انگریز قونصل رہنے لگے ۔ ۱۸۷۳ء میں کاشغر کے حالات کے لیے دیکھیے H. W. Bollow، در *Mission to Jarkand in 1873*. : Sir J.D. Fonsyth، لنڈن ۱۸۷۵ء، جدید شہر کے لیے دیکھیے Kornilow : *Kashghariya*، تاشکنت ۱۹۰۳ء، مع نقشہ (ص ۲۶۸)؛ M. Hartmann : *Chinsisch-Turkestan*، Halle ۱۹۰۸ء، ص ۴۵ ببعد ۸۹۷ ببعد ۔ کاشغر اور مضافات کی سب سے اہم عمارت گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے مشہور ولی حضرت اپاق کا مقبرہ ہے ۔ [۱۹۵۸ء میں یہاں کی آبادی ایک لاکھ تھی ۔ کاشغر سنکیانگ کے کپاس پیدا کرنے والے علاقے کا مرکز ہے ۔ ۱۹۴۰ء میں شہر کے شمال مغرب میں واقع پہاڑوں میں تانبے کی کانیں دریافت ہوئی ہیں] ۔

مآخذ : متن مقالہ میں دے دیے گئے ہیں ؛ [نیز دیکھیے *Encyclopaedia Britannica*، طبع ۱۹۶۹ء، ۱۳ : ۲۴۳، ۲۴۴] ۔

(W. Barthold [و ادارہ])

* **کاشف** : محمد شریف بن شمس الدین المتخلص بہ کاشف کُمَیت، گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کا ایک ایرانی مصنف ۔ ہمیں اس کی زندگی کے جو تھوڑے بہت حالات معلوم ہیں، وہ زیادہ تر اس کی کتاب خزان و بہار کے خاتمے سے ماخوذ ہیں ۔ مصنف کی پیدائش کے وقت اس کا باپ شمس الدین محمد المعروف بہ شمسائے شیرازی کربلا میں رہتا تھا ۔ وہ ۱۰۰۶ھ/۱۵۹۷-۱۵۹۸ء میں وہاں سے اصفہان چلا گیا ۔ اس وقت اس کے بیٹے محمد کا سن تین برس کا تھا، جو ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۴-۱۵۹۵ء میں پیدا ہوا تھا ۔ ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹-۱۶۰۰ء میں شمس الدین مشہد گیا اور سات ماہ بعد اصفہان لوٹ آیا ۔ Rieu کی *Catalogue* کی رو سے یہ تاریخیں برٹش میوزیم کے قلمی نسخے میں دی گئی ہیں ۔ سینٹ پیٹرز برگ کے قلمی نسخے کا جو حال Rosen نے قلمبند کیا ہے، اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف ۱۰۰۶ھ میں پانچ برس کا تھا اور مشہد کا سفر ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱-

www.besturdubooks.wordpress.com

۱۶۰۲ء میں پیش آیا تھا - ۲۳ برس اصفہان میں بسر کرنے کے بعد یہ خاندان رے چلا گیا جہاں کاشف کے باپ نے ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵-۱۶۲۶ء میں وفات پائی - خود محمد شریف پندرہ سال تک رے کا قاضی رہا .

تذکرۂ نصیرآبادی (ملخص در Sprenger : *Catal. of the . . . . . manuscripts of the Libraries of the King of Oudh*، ۱ : ۸۸ ببعد) میں کاشف اور اس کے دو بھائیوں اسمٰعیل مُنصف اور مُقیما کا ذکر ملتا ہے - مصنف موصوف کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی، لیکن اس نے لازماً ۱۰۶۳ھ/۱۶۵۲-۱۶۵۳ء کے بعد انتقال کیا ہو گا - خزان و بہار کا جو قلمی نسخہ لنڈن میں موجود ہے اس کے خاتمے پر جو مادّۂ تاریخ درج ہے، اس سے اس تصنیف کی تکمیل کی یہی تاریخ نکلتی ہے - خاتمے میں مصنف نے اپنی دوسری تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ اس وقت تک لکھی جا چکی تھیں، لہٰذا خزان و بہار اس کی آخری کتاب ہے .

تصنیفات : جیسا کہ خود کاشف بتاتا ہے اس کی باقاعدہ علمی و ادبی تربیت ہوئی تھی اور اس نے تحصیل علم میں کافی مدت صرف کی تھی - اس نے نظم و نثر دونوں صنفوں میں لکھا ہے - کاشف نے تین مثنویاں لکھیں جن میں سے دو (لیلٰی مجنوں اور ہفت پیکر) زمانۂ متأخر کی بیشتر مثنویوں ہی کی مانند ہیں اور ان کا موضوع وہی ہے جو نظامی کے زمانے سے بہت مقبول ہو چکا تھا - تیسری کا نام عباس نامہ ہے - یہ غالباً شاہ عباس دوم (؟) صفوی کی مدح میں لکھی گئی تھی - علاوہ ازیں اس کی کئی ایک مختصر نظمیں، قصائد اور رباعیات بھی ہیں - نثر میں اس کی کتابیں حسب ذیل ہیں : سراج المُنیر، یہ کتاب گلستان سعدی سے متأثر ہو کر لکھی گئی تھی - اس کا اسلوب مرصّع ہے اور اس میں جا بجا اشعار بھی آ گئے ہیں - متن ۲۰ حصوں (لمعات) میں منقسم ہے - ان میں مختلف محاسن اور مکارم اخلاق کا بیان ہے اور ان کی تشریح حکایات کے ذریعے کی گئی ہے - مخطوطۂ لنڈن میں اس کی تاریخ تکمیل ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۰-۱۶۲۱ء دی گئی ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ وہ سن ہو جس میں اس قلمی نسخے کو نقل کیا گیا تھا اور اصل کتاب اس سے چند سال قبل لکھی جا چکی ہو - اس کی آخری کتاب خزان و بہار بھی مرصع نثر میں ہے - یہ ایک مجموعۂ حکایات ہے جسے لکھنے کی اس کے چھوٹے بھائی منصف نے فرمائش کی تھی - اکثر حکایات ایک پرانی کتاب الفَرج بعد الشدّۃ مصنفۂ حسین الدہستانی سے لی گئی ہیں، لیکن تفصیلات کا اضافہ اس نے خود کیا ہے، چنانچہ مثال کے طور پر اس نے ایک واقعہ ایسا بھی درج کیا ہے جو اس کے باپ شمس الدولہ کو پیش آیا تھا - یہ کتاب ایک مقدمے، ۱۴ حصوں (اساس) اور خاتمے پر مشتمل ہے (طبع سنگی، تبریز ۱۹۲۴ء)، یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نثر میں اس نے دو کتابیں اور بھی لکھی تھیں یعنی دُرِّ مکنون اور حواس باطن .

مآخذ : Rieu : *Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum*، ص ۸۶۱، تکملہ، ص ۲۵۰ ببعد؛ (۲) Rosen : *Les manuscrits persane de l'Institut des langues orientales*، ص ۲۸۵ ببعد؛ (۳) Ethé: در *Grundr. der Ir. Phil.*، ۲ : ۲۴۶، ۲۴۸، ۳۳۰ .

(V. F. Buchner)

کاشفی : حسین واعظ، ایک بسیار نویس مصنف * جسے ہرات میں (سلطان حسین میرزا کے عہد میں [رک بآں]) بڑا عروج نصیب ہوا - اس نے ۹۱۰ھ/۱۵۰۵ء میں وفات پائی - اس کی مشہور ترین تصنیفات حسب ذیل ہیں : (۱) اخلاقیات پر ایک کتاب بعنوان اخلاق مُحسنی جو سلطان حسین میرزا کے ایک بیٹے ابوالمحسن کے نام سے منتسب کی گئی اور ۹۰۰ھ/۱۴۹۵ء میں مکمل ہوئی - یہ پہلی بار ۱۸۰۹ء میں کلکتے سے اور اس کے بعد کئی بار شائع ہوئی؛ (۲) نصراللہ بن محمد

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

بن الحمید[رک بآں] نے قبل ازیں کلیلہ و دمنہ کا جو فارسی ترجمہ کیا تھا، اس کا کاشفی نے جدید فارسی میں ترجمہ کیا ۔ اس نے نظام الدین شیخ احمد السہیلی (م ۹۰۷ھ/ ۱۵۰۱ تا ۱۵۰۳ء) کے کہنے پر اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اپنی کتاب کا نام انوار سہیلی رکھا ۔ اس کا اسلوب بڑا پر تکلف ہے اور اس میں صنائع و بدائع بکثرت استعمال کیے گئے ہیں ۔ اسی وجہ سے مشرق میں اس کتاب کو بہت سراہا جاتا ہے ۔ اس کے قلمی نسخے عام ہیں اور یہ کئی بار طبع ہو چکی ہے ۔ پہلی بار یہ ۱۸۰۴ء میں کلکتے سے شائع ہوئی تھی ۔ اس کی دیگر تصنیفات یہ ہیں : جواہر التفسیر لتحفۃ الامیر، فارسی میں قرآن مجید کی تفسیر، ۸۹۹ھ میں علی شیر کی درخواست پر لکھی گئی، لیکن وہ اپنی مجوزہ چار جلدوں میں سے صرف ایک جلد مکمل کر سکا کیونکہ اسے اپنے سرپرست کے لیے ایک مختصر تفسیر لکھنے کی خاطر اس سے ہاتھ اٹھانا پڑا ۔ اس مختصر تفسیر کا نام مواہب علیہ رکھا گیا تھا لیکن عام طور پر یہ تفسیر حسینی کے نام سے مشہور ہے، روضۃ الشہداء، حضرت علیؓ اور ان کے خاندان کی شہادت کی تاریخ (اس کے ملخص دو مجلس اور منتخب روضۃ الشہدا کے نام سے موجود ہیں)، بدائع الافکار فی صنائع الاشعار، ایک رسالہ مخزن الانشاء اصناف کلام، صنائع و بدائع نیز معائب سخن پر (۹۰۷ھ میں تحریر ہوا اور حسین میرزا کے نام سے منتسب کیا گیا) اور بعد ازاں صحیفۂ شاہی، دونوں کتابیں خطوط نویسی اور انشا پر ہیں، قصص و آثار حاتم طائی (یا رسالۂ حاتمیہ) ۸۹۱ھ میں مکمل ہوئی ۔ اس میں حاتم طائی [رک بآں] کی کہانی بیان کی گئی ہے ۔ تحفۃ الصلوات، ۔۔۔ رسالۃ العلیۃ فی الاحادیث النبویۃ، ۔۔۔۔۔ جلال الدین رومی کی مثنوی کا انتخاب بعنوان لباب معنوی، اس کے اقتباسات کے مختصر مجموعے لب لباب کے نام سے مرتب کیے گئے ۔ مذکورۂ بالا تصنیفات میں سے کئی ایک کا ترجمہ ترکی میں اور اول الذکر دو کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے ۔

مآخذ : (۱) Schefer : *Chrest. Pers.*، ۱: ۱۹۰ ببعد؛ (۲) Ethé : *Grundriss. d. Iranischen Philologie*، ۵ : اشاریہ ، بذیل مادۂ حسین واعظ ؛ (۳) وہی مصنف : *Cat. Pers. Mss., India office*، اعداد ۲۱۸۸، ۲۶۸۰ ۔

(T. W. ARNOLD)

کاشی : (یاقوت میں قاشانی، قاشی ؛ ابن بطوطہ میں قشانی)، یہ نام جو ایران کے شہر کاشان [رک بآں] سے نکلا ہے، چینی Faience کی ان مربع یا مسدس تختیوں کو دیا جاتا ہے جو عمارتوں کی بیرونی یا اندرونی دیواروں کی آرائش میں استعمال ہوتی ہیں ۔

کاشی سازی کا شمار ایشیائے قریب کے قدیم ترین فنون میں ہوتا ہے (جس سے آشوری اور ان کے بعد ہخامنشی بھی واقف تھے) اور جو ایران میں ازمنۂ وسطیٰ تک اور جیسا کہ معلوم ہوتا ہے خاص طور پر شہر کاشان میں باقی رہا ۔ شاہان صفویہ کے زمانے سے لے کر عصر حاضر تک کی جدید ایران کی یادگار عمارتیں (جن میں سے نسبۃً پرانی عمارتیں کھنڈر ہو چکی ہیں) چینی کی ان تختیوں سے مزیّن ہیں ۔ ان میں رواجی بیل بوٹے نقش کیے گئے ہیں (کاشی کاری) جن میں زیادہ تر نیلا، فیروزی اور سبز رنگ استعمال ہوا ہے اور سرخ اور زرد رنگ ان سے کم تر ۔ ایسی تختیاں بہت کمیاب ہیں جن میں مختلف تصویروں کی مینت کاری کی گئی ہو اور اسی لیے ان کی سب سے زیادہ قدر کی جاتی ہے ۔

جب ایرانی کاریگر، جو شاید عیسائی تھے (بعض تختیوں یا چوکوں پر سریانی زبان کے کتبے کندہ ہیں) اس صنعت کو شہر دمشق میں لائے ، تو شامی ان چوکوں کو قاشانی (عربی املا = قاشان سے) کہنے لگے ۔ غالبًا اب سے صدی قبل یہ فن بالکل معدوم ہو گیا ۔ جس کارخانے میں یہ تیار ہوتے تھے، اس کے کھنڈر آج بھی باب شرق کے باہر نظر آتے ہیں ۔ ترکی میں ان

www.besturdubooks.wordpress.com

تختیوں کی نقل ازنیق اور کوتاھیہ میں کی گئی - حال ھی میں کارخانۂ مذکور کو دوبارہ جاری کرنے کی کوشش کی گئی تھی ، لیکن موجودہ زمانے کا کام قدیم فن پاروں کے حسن کی کسی طرح بھی برابری نہیں کر سکتا - ایران میں بھی یہی حال ھے؛ وھاں آج کل قدیم زمانے کے خوبصورت نمونوں کی نقلیں تیار کی جاتی ھیں .

مآخذ : (۱) یاقوت : معجم ، طبع وُسٹنفلڈ ، ۴ : ۱۵؛ (۲) ابن بطّوطہ، طبع پیرس، ۱ : ۱۵۴ ، ۲ : ۳۶ ، ۱۳۰ ، ۲۲۵ ، ۲۹۷ ؛ ۳ : ۷۹ ؛ (۳) Chardin : *Voyage*، ایمسٹرڈم ۱۷۳۵ ؛ ۳ : ۴ ؛ (۴) Pétis de la Croix : *Journal*، طبع Langlès : *Relation de Dourry-Effendi*, پیرس ۱۸۱۰ء ، ص ۱۳۴ ؛ (۵) Morier : *Deuxième Voyage* ، ص ۲۵ ؛ (۶) A. von Kremer : *Topographie von Damascus* ج ۲ (*Denkscher . d. K. Akad* . d. Wiss، وی انا ۱۸۵۵ء ، ۶ : ۹) .

(CL . HUART)

* **الکاشی :** جمشید بن مسعود بن محمود بن غیاث الدین، ایک ایرانی جو سمرقند میں الغ بیگ کی رصدگاہ کا پہلا ناظم تھا اور جب اس فرمانروا نے جداول ھیئت [زیج] تیار کیں تو وہ اس کا شریک کار تھا - علم ھیئت اور ریاضی میں تحقیقات کرنے کے علاوہ اس نے طب کا مطالعہ بھی کیا تھا - اس نے تقریباً ۸۴۰ھ/۱۴۳۶-۱۴۳۷ء میں وفات پائی ھوگی - اس کی تصنیفات میں حسب ذیل باقی بچی ھیں : (۱) زیج خاقانی (خاقانی کی جداول)، فارسی میں قسطنطینیہ (ایاصوفیا) میں قلمی نسخہ موجود ھے - یہ زیج ایلخانی (تیار کردۂ نصیرالدین الطوسی) کا تکملہ ھے؛ (۲) مفتاح الحساب، برلن، لائیڈن، برٹش میوزیم، انڈیا آفس وغیرہ میں موجود ھے - اس کے دیباچے کا ترجمہ F. Woepoke نے کیا ھے (رک بہ مآخذ)؛ (۳) الرسالۃ الکمالیّۃ نیز المعروف بہ سُلّم السماء (آسمان کا زینہ)، اجسام فلکی کے حجم اور درمیانی فاصلے کے بارے میں ھے، اوکسفرڈ، لائیڈن، انڈیا آفس میں موجود ھے؛ (۴) رسالۃ فی استخراج جیب درجۃ واحدۃ، وغیرہ (کسی درجے کے جیب زاویے کے تخمینے پر ایک مقالہ) قاھرہ میں موجود ھے - اس میں الکاشی نے تیسرے درجے کی ایک مساوات (equation) تخمینے کے ایک نہایت دلچسپ عمل سے حل کی ھے (دیکھیے نیچے Hankel کی تصنیف).

مآخذ : (۱) دیباچۂ مفتاح الحساب ، مخطوطۂ برلن دیکھیے؛ (۲) Ahlwardt : *Verzeichn*، ۵ : ۳۴۴ ؛ (۳) H. Hankel : *Zur Gesch. der Mathematic im Altertum u. Mittelalter*، لائپزگ ۱۸۷۴ء، ص ۲۸۹ ببعد؛ (۴) F. Woepcke : *Passages relat. á des sommes de séries de cubes*، روم ۱۸۶۴ء؛ (۵) H. Suter در *Abhandl. z. Gesch. der mathem. wissensch* : ۱۰ ، ۱۷۳ .

(H. SUTER)

کَاظِم خان شیدا : رک بہ پشتو. ⊗

کاظمی : وہ نام جو ٹیپو سلطان، فرمانروائے میسور ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۲ء تا ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ نے چاندی کے بنے ھوئے روپے کے سولھویں حصے (ایک آنہ) کو دیا تھا؛ یہ نام ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظمؒ کی یادگار کے طور پر رکھا گیا تھا . *

(J. ALLAN)

کاظِمَیْن : عراق کے چار شہر مزارات ائمہ کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت رکھتے ھیں، نجف جہاں حضرت امیرالمؤمنین علیؓ بن ابو طالب کا روضہ ھے اور جو شیعوں کا علمی مرکز ھے؛ دوسرا کربلا جہاں حضرت امام حسینؓ اور حضرت عباسؓ کے روضے اور بعض شہدائے کربلا کے مزارات ھیں؛ تیسرا شہر سامّرہ ھے جس میں امام علی النقی اور امام حسین العسکری [رک بآں] کے روضے ھیں؛ چوتھا کاظمین ھے جو اس مضمون میں زیر نظر ھے . ⊗

وجہ تسمیہ : اس شہر میں دو اماموں کے مزار یکجا ھیں - ایک امام موسیٰ الکاظمؓ م ۱۸۶ھ/۸۰۲ء

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

بن جعفرؑ دوسرے امام الجواد محمد م ۲۱۹ھ/۸۳۴ء بن علی بن موسیٰ - چنانچہ اس شہر کا نام "کاظمین" دو کاظم یا "الجوادین" دو جواد ہو گیا، جیسے ظہرین، مغربین وغیرہ - دراصل یہ نام روضے کا تھا، لیکن اب شہر کا یہی نام پڑ چکا ہے اور شہر کے سٹیشن کا نام "الجوادین" رکھا گیا ہے۔ اسی طرح اندرون حرم کتب خانہ ہبۃ الدین شہرستانی کا نام بھی "مکتبۃ الجوادین" ہے - یہ شہر آبادی کے بعد مشہد الکاظم، کاظمیہ اور پھر کاظمین کہلایا - بغداد سے شمال مغرب کی طرف کم و بیش دس کیلومیٹر اور دریاے دجلہ کے دائیں کنارے سے پانچ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے (عماد الدین : مجموعۂ زندگانی چہاردہ معصوم، ج ۲، ص ۳۷۷) دجلے کا پل "کرخ" عبور کرتے ہی کاظمین کی حد شروع ہو جاتی ہے - یہاں کھجوروں کے باغ، مختلف پھلوں کے درخت اور خوشنما سبزہ زار ہیں موسم یہاں کا خوش گوار ہے - عراق کا مشہور دریا قریب ہے - اس کی ایک نہر شہر کی زرخیز زمین کو سیراب کرتی ہے - زیارت گاہ ہونے کی وجہ سے آبادی بہت زیادہ ہے - بڑے بڑے بازار، اچھے اچھے مکان، مسافر خانے، مہمان خانے، ہوٹل، چاے خانے دکانیں اور ہر قسم کا سامان تجارت فراوانی سے ملتا ہے - بغداد کے راستے آنے والے قافلے اور زائرین پہلے کاظمین آتے ہیں پھر یہاں سے کربلا اور نجف کا رخ کرتے ہیں - یہاں ہمیشہ زائرین کا مجمع رہتا ہے - لیکن خصوصیت سے محرم، صفر، رجب، ۱۵ شعبان، رمضان، عیدالفطر، عیدالاضحی میں خاص خاص دن اور اصطلاحاً "مخصوصی" کے دنوں میں یہاں لاکھ دو لاکھ زائر جمع ہوتے ہیں اور قیام کے لیے جگہ ملنا مشکل ہوتی ہے .

پاکستانیوں کے بعض مخصوص مہمان خانے بھی ہیں - اسی طرح کویت، بحرین، حجاز، لبنان، شام، پاکستان، ہندوستان، افغانستان اور افریقہ کے لوگوں نے بھی کچھ نہ کچھ مکانات مخصوص کر رکھے ہیں - عموماً یہاں کے خدام مہمان داری کے فرائض انجام دیتے ہیں - لیکن سب سے زیادہ اہمیت عراقیوں اور ایرانیوں کو حاصل ہے، عراق یہاں کے قدیم باشندے ہیں اور ایرانی قرب مکانی اور صدیوں پرانے مسلسل روابط دینی کی وجہ سے یہاں رہتے ہیں، ان کے مکانات و آثار بھی سب سے زیادہ ہیں - بلکہ درحقیقت یہ روضہ تو صرف انہیں کی عقیدت و دولت کا تعمیر کردہ ہے .

تاریخی نقطۂ نظر سے کاظمین کی آبادی کا واقعہ عجیب ہے، جب خلیفہ ابو جعفر المنصور نے بغداد تعمیر کرایا اور دارالخلافہ یہاں منتقل ہوا تو ۱۵۰ھ میں پہلی موت خلیفہ کے بڑے لڑکے جعفر کی ہوئی - اس وقت دریا پار ایک قریہ شونیز یا شونیزی صغیر یہاں آباد تھا - اس قریے کا قبرستان شہزادے کے لیے پسند کیا گیا اور مسجد کے قریب اسے دفن کیا گیا - قبر پر موزوں عمارت و قبہ بنا، مقبرے کی دیکھ بھال، قرآن خوانی اور دوسرے امور خیر کے لیے کچھ ملازم بھی رکھے گئے - قبر پر فاتحہ کے لیے شاہی خاندان اور متوسلین کی آمد و رفت شروع ہو گئی (عمادالدین : مجموعۂ زندگی چہاردہ معصوم، ص ۳۷۸؛ میرزا عباس فیض : تاریخ کاظمین، ص ۱۸ .

جعفر کی قبر کے بعد دوسرے مشاہیر بھی مرنے کے بعد یہاں دفن کیے گئے، خاندان نوفل کے سردار عیسیٰ بن عبداللہ اور مشہور عالم ابن الماحسون، ابو عبداللہ عبدالعزیز بن عبداللہ (م ۱۶۴ھ) (تاریخ کاظمین، ص ۱۸) لیکن قبرستان شونیزی کی عظمت کا دن وہ تھا جب ۱۸۳ھ میں امام الکاظم موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی السجاد علیہم السلام کا تابوت جسے بغداد سے ہارون الرشید کے چچا سلیمان بن ابی جعفر المنصور نے اپنے قبضے میں لیا اور شاہانہ احترام کے ساتھ وہ تابوت بغداد سے یہاں لا کر امام کو مسجد کے قریب سپرد لحد کیا (مجموعۂ زندگانی چہاردہ معصوم، ص ۳۸، نیز رک بہ موسیٰ الکاظم) - سلیمان سلطنت کا نامور رکن،

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

بنی عباس کا بزرگ مرتبہ شہزادہ تھا، وہ دمشق و بصرہ کا والی رہ چکا تھا، اس کے بڑھاپے اور اعزاز کے دن تھے (سلیمان ۱۹۹ھ میں فوت ہوا) ۔ اس نے امام کی قبر پر عمارت اور عمارات پر قبہ تعمیر کرایا (باقر شریف القرشی: حیاۃ الامام موسی بن جعفر، ج ۲، ص ۴۸۵) امام کے وہ عقیدت مند جو بغداد میں رہتے تھے اسی وقت سے زیارت کو آنے لگے ۔

امام علی رضاؑ اور ان کے بعد امام محمد تقیؑ بھی لوگوں سے زیارت مزار امام موسی الکاظمؑ کی فضیلت بیان کرتے رہے ۔ عموماً لوگ زیارت مدینہ، نجف اور کربلا کے لیے آتے جاتے تھے۔ ائمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور دوسرے ائمۂ معصومین کی زیارت کے آداب بتائے تھے۔ اب اس مزار کی زیارت کے ثواب و آداب بھی بتائے جانے لگے اور لوگ دور دراز سے یہاں حاضر ہونے لگے ۔ زیارت و آداب زیارت کے لیے دیکھیے، مجلسی: تحفۃ الزائر، ص ۳۶۳؛ عباس قمی: مفاتیح الجنان، ص ۴۷۵ ۔

امام علیہ السلام کے مزار کی وجہ سے اس قبرستان کا نام "مقابر قریش" پھر مشہد الکاظم اور اس کے بعد کاظمیہ ہوگیا (تاریخ کاظمین، ص ۱۹) سنہ ۱۹۸ھ/۸۱۳ء میں محمد امین بھی مقابر قریش میں دفن ہوا ۔ اس کا مقبرہ بھی تعمیر ہوا ۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ۲۱۶ھ/۸۳۱ء میں مامون کی والدہ زبیدہ بھی یہاں سپرد لحد ہوئی (بحث کے لیے وہی کتاب، ص ۱۹) ۔

۲۲۰ھ/۸۳۵ء میں امام موسی الکاظم کے پوتے امام الجواد، محمد بن علی الرضا علیہ السلام [رک بآں] یہیں دفن ہوئے اور ام الفضل بنت مامون الرشید نے اس مزار پر عمارت و قبہ بنوایا (تاریخ کاظمین، ص ۲۱) نویں امام کے لیے بھی سادات و علویین و دوستداران اہل بیت کا آنا جانا بڑھا۔ ان کے زیارت مشہد کے ثواب بھی حدیثوں میں بیان کیے گئے (تحفۃ الزائر، ص ۳۶۳؛ مفاتیح الجنان، ص ۴۷۵) ۔ کچھ عرصے تک تو اس جگہ کو بھی مقابر قریش یا مشہد الکاظم ہی کہا جاتا رہا، لیکن آہستہ آہستہ دونوں اماموں کی اہمیت کے پیش نظر دونوں کے ناموں کی ترکیب سے نام پڑا ۔ چونکہ امام الکاظمؑ بزرگ تھے، ان کی لحد بھی پہلے بنی تھی، لہٰذا کاظمین کہنا اچھا معلوم ہوا ۔

مشہد الکاظم والجواد یا کاظمین کی تعمیر: تاریخ و کتب زیارات و احادیث ائمۂ اہل بیت (کتاب المزار از ابن قولویہ اور جامع الاخبار و بحار الانوار) سے دونوں اماموں کے دو الگ الگ مزاروں کا اندازہ ہوتا ہے ۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ۔ چونکہ امام موسی کاظمؑ، امام محمد الجوادؑ کے جد بزرگوار تھے اس لیے رسماً لوگ پہلے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور دعائیں کرتے تھے اور دعاؤں کی مقبولیت کے چرچے ہونے لگے ۔ قاضی ابو محمد حسن بن الحسین الجلال کی روایت ہے کہ مجھے جب بھی کوئی مشکل پیش آئی ہے، میں امام موسی بن جعفر علیہما السلام کے آستانے پر جا کر ان سے توسل اختیار کرکے خدا سے دعا کرتا ہوں؛ میری مشکل آسان ہو جاتی ہے (ابن الخطیب: تاریخ بغداد، ج ۱، ص ۱۳۰؛ مفاتیح الجنان ۴۷۵، تاریخ کاظمین، ص ۲۴) اس کے علاوہ اور بہت سے واقعات ہیں ۔ جن کی وجہ سے عراق میں امام موسی کاظمؑ کا لقب ہی "باب الحوائج" زبان زد ہے ۔ یہ شہرت و عظمت شروع ہی سے ہو گئی تھی ۔ اس لیے حاجت مند بکثرت آتے اور روضے پر مجمع روز بروز بڑھتا رہتا تھا ۔

تیسری صدی ہجری میں بغداد کے ایک طالع آزما خاندان "آل نو بخت" نے عروج حاصل کر لیا ۔ یہ لوگ اماموں سے خاص عقیدت رکھتے تھے لہٰذا مشہد الکاظم و مشہد الجواد کی تعمیر و تزئین میں دوسرا حصہ ان لوگوں کا ہے (تاریخ کاظمین، ص ۳۰) ان کے بعد بویہی خاندان نے اقتدار حاصل کیا، ان میں معزالدولہ اور عضدالدولہ نہ صرف شیعہ تھے، بلکہ انہیں تعمیرات

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

سے خاص شغف تھا ۔ ان کی عقیدت نے مدینۂ منورہ کی تعمیر کروائی (عمدۃ الاخبار فی مدینۃ المختار، ص ۱۸۴، قاہرہ)، کربلا و نجف کے مزاروں کو از سرنو بنوایا اور وقف کرائے [رک بہ کربلا] نیز تاریخ النجف ماضیہا و حاضرہا) ۔

۳۵۳ھ میں بغداد کی مسجدوں کو رونق دی ۔ عاشور کے روز ماتم سید الشہداء کے لیے جلوس نکلوائے ۔ ظاہر ہے کہ ان جلوسوں کا ایک مرکز کاظمیہ قرار پا گیا ۔ عضدالدولہ نے ۳۷۲ھ کے بعد کربلا و نجف کی زیارت کی اور وہاں کے روضوں کی از سرنو تعمیر کا حکم دیا ۔ تعمیر کے بعد قیمتی ہدیوں اور اوقاف کی خدمت بجا لایا (محمد حسن : مدینۃ الحسین، ص ۱۰۶، نیز رک بہ کربلا) ۔ اس کی ان خدمتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بغداد سے قریب کاظمین کی تعمیر و آرائش و نگہداشت سے غفلت نہ برتی ہوگی ۔ ۳۶۹ھ میں بغداد کے عظیم المرتبت عالم اور شیخ مفید کے استاد جناب ابوالقاسم ابن قولویہ نے رحلت کی تو انہیں مشہد الکاظم میں دفن کیا گیا ۔

۴۰۰ھ سلطان الدولہ بویہی کا وزیر کربلا کی زیارت سے مشرف ہوا اور اس نے وہاں قابل ذکر تعمیرات کا اہتمام کیا ۔ ممکن ہے وہ کاظمین بھی آیا ہو اور یہاں کی تعمیرات کی اصلاح کرائی ہو ۔ ۴۱۳ھ میں شیخ مفید کے انتقال پر بویہیوں نے اپنے مذہبی عالم کا جنازہ بڑی شان سے اٹھایا اور انہیں مشہد الکاظم میں دفن کیا ۔ ۴۲۳ھ میں قم کا ایک اہم قافلہ زیارات مزارات ائمہ کے لیے آیا ۔ ۴۳۱ھ میں جلال الدولہ بویہی بغداد سے کربلا و نجف کی زیارت کو گیا، بلاشبہہ اس نے کاظمین میں بھی حاضری دی ہوگی ۔ اس دور میں بویہیوں کے زوال اور سلجوقیوں کے عروج، فرقہ وارانہ فسادات وغیرہ کا تذکرہ ابن الاثیر نے قلم بند کیا ہے ۔ ان حالات نے کرخ و کاظمین کے لوگوں کو ترک وطن پر مجبور کیا اور شیخ مفید و سید مرتضی کے جانشین محدث و فقیہ بزرگ شیخ ابو جعفر محمد بن حسن الطوسی نے ۴۴۸ھ میں نجف کی طرف ہجرت کی ۔ اس سے فرقۂ امامیہ کا مرکز علم و تدریس بغداد سے منتقل ہو گیا ۔

سلجوقیوں کے تسلط اور بغداد میں امن کی بحالی ہوئی تو کاظمین بھی رفتہ رفتہ زائرین کے مجمع سے آباد ہونے لگا ۔ کہتے ہیں کہ ۴۶۶ھ میں شرف الدولہ نے ایک ہزار دینار کے خرچ سے شہر پناہ اور دوسری عمارتیں بنوائیں (ابن الاثیر، سال ۴۶۶ھ) ۔

۴۷۹ھ میں ملک شاہ سلجوقی نے زیارات ائمہ کے لیے سفر کیا اور مزاروں کی ترمیم و تجدید کے احکام دیے (رک بہ کربلا؛ نیز مدینۃ الحسین، ص ۱۱۴، ۱۲۰) ۔

خلیفۂ عباسی کی اہم تعمیریں: بویہیوں کے بعد ناصر لدین اللہ الخلیفہ اور ابن علقمی نے کاظمین کی ترقی و تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ۔ شہر پناہ کے علاوہ عمارت مشہدین، مہمان خانہ ۶۰۴ھ میں اور ۶۰۸ھ میں شیعہ سنی علوم و عقائد کا بڑا مدرسہ اور ایک یتیم خانہ بنوا کر کاظمین کو نئی زندگی بخشی، لیکن پانچ سال بعد دجلے نے اس رونق پر پانی پھیر دیا ۔ اس مرتبہ سیلاب کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ امام احمد بن حنبلؒ کا مزار دریا برد ہو گیا اور کاظمین کی تمام عمارتیں منہدم ہو گئیں ۔ پانی اترتے ہی ابن علقمی نے پھر تعمیرات کا کام شروع کر دیا اور ۶۱۴ھ میں شہر اور مزار پھر تیار ہو گیا ۔

۶۲۲ھ میں شہر کو آگ نے گھیر لیا ۔ کتب خانے اور مدرسے، روضوں کی عمارتیں اور اس کا سامان ضائع ہوا اور ناصر لدین اللہ کا قیمتی صندوق بھی زد میں آیا ۔ اس نقصان کی تلافی کے لیے الظاہر باللہ نے حکم جاری کر دیا اور مؤید الدین علقمی نے پھر تعمیرات کا آغاز کیا ۔ الظاہر باللہ نے رحلت کی تو مستنصر باللہ

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

اخراجات کا کفیل ہوا ۔ اب کی مرتبہ دجلے کا پل اور شہر کا بند بھی نیا بنایا گیا ۔ روضوں کی عمارتیں بھی مستحکم ہوئیں اور غالباً ۶۲۴ھ میں یہ کام ختم ہوا کیونکہ اب تک قیمتی لکڑی کا وہ نفیس منبت و طلا کار صندوق کاظمین میں موجود ہے جس پر خطِ کوفی جلی میں یہ عبارت تحریر ہے :

صندوق خاتم : بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ، ھٰذا ضریح الامام ابی الحسن، موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی بن ابی عبداللہ الحسین بن علی بن ابیطالب علیھم السلام .

پھر اسی خوبصورت نقش و نگار اور طلائی حاشیوں پر خط ثلث میں سونے سے لکھا ہے :

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا [الآیہ] ھذا ماتقرب الی اللہ تعالی بعملہٗ، خلیفتہ فی ارضہ ونائبہ فی خلقہ سیدنا و مولانا امام المسلمین المفروض الطاعۃ علی الخلق اجمعین ابوجعفر المنصور المستنصر باللہ امیرالمومنین ثبت اللہ دعوتہ ۔ فی سنۃ ستمائۃ و اربع و عشرون .

فارسی اصطلاح میں اس ساخت کے بکس کو "صندوق خاتم" کہتے ہیں ۔ تعویذ قبر پر صندوق خاتم تھا، اس کے گرد شمعدان ۔ زمین پر قیمتی فرش، دیواروں پر حریر و دیبا کے پردے، بالائے سقف مخروطی گنبد و مینار تھا جیسے زمرد خاتون اور زبیدہ خاتون کے مقبروں کے آثار سے اندازہ لگایا گیا ہے ۔ امام موسیٰ کاظم کے روضے کے قریب امام محمد الجواد کا مزار بھی اسی شان سے تعمیر ہوا تھا ۔ ان مزاروں کے ادھر ادھر مسجد، مدرسے، علما کے گھر، سادات کے مکان، متولیوں اور خادموں کے مسکن اور مسافروں کے لیے سرائیں تھیں ۔ سلاطین، خلفا ، امرا زیارت کو آتے تو درھم و دینار کے انبار ساتھ لاتے اور نذرو ھدیہ و امور خیر میں صرف کرتے، سونے چاندی کی قندیلیں اور نادر و نایاب آلات روضوں پر رکھتے (رک بہ، کربلا) ۔ نقیب الاشراف ان تمام معاملات کا نگران اعلیٰ ہوتا تھا.

کاظمین میں عباسی خلیفہ کی حاضری : کاظمین بغداد سے قریب تھا لہٰذا خلفا و وزرا کی آمد و رفت کوئی خاص بات نہ تھی ۔ مؤرخ بھی اسے عام بات سمجھ کر نہ لکھ سکے ۔ اتفاق سے دو ایک خلفا کے بارے میں کچھ تذکرے قلم بند ہو گئے ہیں ، مثلاً خود المستنصر باللہ ۳ رجب ۶۳۴ھ کو شاھانہ تزک و احتشام کے ساتھ آیا، مزاروں کی تعمیر کا معائنہ کیا، زیارت کی، نذرانہ چڑھایا اور نقیب الاشراف ابو عبداللہ حسین القاسمی کو شاھی نوازشات سے مفتخر کیا اور تین ہزار دینار کاظمین و نجف کے علوّیین کی خدمت کے لیے پیش کر کے واپس گیا (تاریخ کاظمین، ص ۱۱۳).

۶۴۱ھ میں المستعصم باللہ خلیفہ ہوا تو مؤیدالدین ابن علقمی کے ساتھ بغداد سے زیارت کاظمین کے لیے آیا ۔ راستے میں سخت بارش ہوئی لیکن شاھی جلوس نہ رکا اور بھیگتا ہوا قافلہ مشہد الکاظم پر حاضر ہوا .

۶۴۶ھ میں سیلاب نے پھر کاظمین کا رخ کیا ۔ ۶۴۷ھ میں المستعصم نے شہر و مشہد کو پھر نیا کر دیا اور ۱۱ ذی القعدہ کو تکمیل تعمیر کے ساتھ دونوں قبّوں پر بنی عباس کا شاھی اعزازی نشان نصب کیا گیا (تاریخ بغداد، ص ۱۱۸) .

کاظمین کی تعمیر میں بنی عباس کا یہ آخری حصہ تھا ۔ اس تعمیر کا چشم دید بیان وہ ہے جسے مشہور ادیب و مصنف یعنی نور الدین علی بن موسیٰ بن سعید المغربی (م ۶۷۳ھ) مؤلف کنوز المطالب فی اخبار آل ابی طالب، نے لکھا ہے "وَلَمَّا وصلنا اِلٰی باب مشہد موسیٰ ابن جعفر تلقانا من خُدَّامہ من اَنْزَلنا علٰی بعد و وجدنا فی الطریق الیہ قبرا مُتَطَمِّساً یُدَاسُ فسئلنا عنہ، فقیل ھذا قبر الحسن بن الحجاج الشاعر، اوصی ان یدفن فی طریق ھٰذا المشہد لِیُدَاسَ باقدام زوارہ.

فَلَمَّا وصلنا الی الباب تلقانا الزُّوار من ولد الکاظم، فامرونا بنزع الاخفاف .

www.besturdubooks.wordpress.com

فلمّا دخلنا رأینا من الجمع المحتفل و اوانی الذهب و الفضة والستور و الطیب ملک ابصارنا و لما حللنا بالروضة التی فیها قبرالکاظم رأینا قبرا آخر ذکروا انه قبر حفیده محمد الجواد بن علی الرضا ابن موسی الکاظم و فی ذلک المشهد مایطول ذکره و یهول امره"۔

اور جب هم "شهر مشهد موسیٰ ابن جعفر" میں پهنچے تو خدام نے همارا استقبال کیا اور هدیں دور هی سے سواریوں سے اتار لیا، هم نے راستےمیں ایک بےنشان سی قبر دیکهی جو پیروں تلےروندی جاتی تهی، پوچهنے پر معلوم هوا که یه حسین ابن الحجاج شاعر(م ۳۹۱ھ) کی قبر هے جس نے وصیت کی تهی که اسے اس بارگاه کے راستے میں دفن کیا جائے تاکه زائرین کے قدم اس پر پڑیں۔

هم دروازۂ مزار پر پهنچے تو سادات کاظمی نے همارا استقبال کیا اور هم سے جوتے اتارنے کی فرمائش کی۔ هم اندر داخل هوے تو بهت بڑا مجمع وهاں موجود تها، سونے چاندی کے آلات، پردے اور عطر و خوشبو نے همارے حواس پر غلبه کر لیا۔ هم نے روضے میں امام موسی الکاظم کی قبر کے علاوه ان کے پوتے امام محمد الجواد کی قبر بهی دیکهی۔ اس مزار میں جو کچھ پایا جاتا هے اس کی تفصیل طویل اور اهم هے (تاریخ کاظمی، ص ۱۱۴)۔

اس بیان سے کاظمین کے خدام، زائرین، آداب زیارت اور شان عمارت کا بڑی حد تک نقشه سامنے آ جاتا هے۔ اسی زمانے کے ایک علوی عالم رضی الدین علی بن موسیٰ بن طاؤس (م ۶۶۴ھ) حلے سے کاظمین آئے اور یهاں قیام کیا۔ ان کے اصل الفاظ هیں "وتوجهت الی مشهد مولانا الکاظم واقمت به" (کشف المحجة، ص ۲۱۱)۔

کاظمین کا دوسرا دور: ۶۵۶ھ میں هلاگو نے بغداد پر حمله کیا تو اس طوفان میں کاظمین بهی تاراج هوا، لیکن امن امان قائم هوتے هی علاء الدین جوینی و نصیر الدین طوسی نے شهر و مزار، قبه و بارگاه کی گزشته شان و شوکت کو بحال کیا اور جب یه دونوں فوت هوے تو حسب خواهش اسی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

خواجه علاءالدین جوینی نے ۱۴ ذی الحجة ۶۷۱ھ کو رحلت کی ان کا مقبره غربی رواق میں اب تک موجود هے (تاریخ کاظمین، ص ۱۱۹)۔

خواجه نصیر الدین الطوسی نے ۲۸ ذی الحجة ۶۷۲ھ کو رحلت کی اور کاظمین میں دفن هوے۔ ان کی قبر بهی موجود و معلوم هے۔

یاقوت نےمعجم البلدان میں ۶۵۶ھ کے بعد کاظمین کو بڑا آباد شهر اور فصیل بند لکها هے۔ ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) نے احوال امام موسیٰ الکاظم میں لکها هے "و قبره هناک مشهور یزار و علیه مشهد عظیم فیه من قنادیل الذهب و الفضة و انواع الآلات و الفرش مالا یحد و هو فی جانب الغربی "وهاں ان کی قبر مشهور هے، زیارت کی جاتی هے اس پر عظیم الشان روضه بنا هوا هے، جس میں سونے، چاندی کی قندیلیں اور طرح طرح کے سامان اور فرش و فروش کی عظمت کا اندازه نهیں لگایا جا سکتا۔ یه مزار شهر کے مغربی حصّے میں هے"۔

۷۲۵ھ/۱۳۲۶ء کے سیلاب کے ایک سال بعد سلطان ابو سعید بهادر خان ابن خدا بنده نے اس نقصان کی تلافی کی۔ اسی زمانے میں ابن بطوطه نے کاظمین کی زیارت کی اور اس کے دو نقره کوب صندوقوں کا خاص طور پر ذکر لکها (مجموعۂ زندگانیِ چهارده معصوم، ص ۳۸۷)۔ ۷۳۶ھ میں صلاح الدین خلیل ابن ایبک نے لکها که "شهر باقاعده چهار دیواری کے اندر هے اور تمام ضروریات زندگی دستیاب هیں" (تاریخ کاظمین، ص ۱۲۰)۔

۷۶۹ھ میں خواجه مرجان نے کربلا و نجف کے ساتھ کاظمین کی اصلاح و تعمیر کے علاوه ایک مدرسے کی بهی تاسیس کی جس کے آثار اب تک باقی هیں۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

سلطان حسن بن ادریس جلائری (م ۷۵۷ھ) نے دونوں مزاروں پر دو نفیس صندوق، اور عمارت پر دو گنبد اور دو مینار بنوائے (تاریخ کاظمین، ص ۱۲۱؛ مدینۃ الحسین، ص ۱۳۴)۔

ساتویں صدی سے نویں صدی کے آخر تک کاظمین کی شان و شوکت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ پہلے یہ عمارت عراقی طرز کی تھی اب اس میں ترکوں کے فن تعمیر کی نمود ہوئی۔

کاظمین کا تیسرا دور: دسویں صدی کے ربع اول میں شاہ اسمٰعیل صفوی نے بغداد کو فتح کیا اور ۹۲۶ھ/ ۱۵۱۹ء میں کاظمین کی خستگی کے پیش نظر تمام عمارت کی نئے نقشے پر تعمیر کا حکم دیا، جس میں وسطی ایوان، ایوان کے گرد رواق، بڑی بڑی محرابیں، مقرنس چھتیں، رنگین نقشی کاشی کاری اینٹیں، آیات و احادیث، اسمائے الٰہیہ، چہاردہ معصوم کے نام، اشعار، تاریخیں اور آئینہ کاری، سامان آرائش، قالین اور دوسرے لوازم مہیا کیے۔ عمارت پر دو کاشی کار گنبد، دو مینار بنائے، بلند و بالا دیواریں اور شاندار نقرہ پوش دروازے نصب کیے۔ اندرون ایوان قبر پر اس عمارت کے کچھ حصے محفوظ ہیں اور ان پر ۹۲۶ھ و ۹۳۵ھ سنین اور شاہ اسمٰعیل و شاہ خدا بندۂ صفوی کے نام درج ہیں۔

جامع صفوی کاظمین: شاہ خدا بندہ نے نذر و نیاز کے علاوہ، روضے کی کہنہ مسجد کی جگہ بڑی شاندار ۷۲ ستونوں کی بلند و بالا، کاشی کار اور کتبوں سے آراستہ مسجد و محراب بنوائی۔

منبر سلیمانی عثمانی: ۹۴۰ھ میں بغداد پر صفویوں کا قبضہ ختم ہوا اور عثمانی خلیفہ سلطان سلیمان کربلا و نجف و کاظمین و سامرے کی زیارت کے لیے آئے۔ انھوں نے ہر روضے کی خدمت کی۔ کاظمین کی جامع مسجد کا خشتی منبر بنوایا جس کی تاریخ تکمیل کاشی رنگ و روغن میں ۹۴۱ھ تحریر ہے۔ ترکی طرز کا یہ منبر اسی انداز کا ہے جیسے مسجد الحرام میں سنگ مرمر کا۔ مینار اسی بادشاہ نے نذر کیا تھا، جس کے دروازے کی پیشانی پر "انہ من سلیمان و انہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھا ہوا ہے۔

مینار سلیمی: ترکی کے سلطان سلیم ثانی کے عہد میں والی بغداد سلیمان پاشا نے تعمیر و اصلاح عمارت کے ساتھ شمال شرقی زاویے کا مینار کو چھت کی سطح سے بلند تر کیا جس کی تاریخ اب تک درج ہے (۹۷۸ھ)۔

جہاں تک مینار کا تعلق ہے اس کی تعمیر ۱۰۴۵ھ میں شاہ صفی صفوی نے کرائی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس نے نہ صرف میناروں کو بلند کیا بلکہ عمارت کے چاروں گوشوں پر چار مینار بنوائے۔ (تاریخ ص ۱۲۳)۔ ۱۲۱۱ھ میں محمد شاہ قاجار نے ان میناروں کو خوبصورت کیا، ان کے بالائی حصے کو چاندی سونے کی اینٹوں سے نقرئی و طلائی کر دیا۔ اب یہ مینار گول ہو کر بلند ہوتے اور بالائی حصے میں محراب دار چھوٹے چھوٹے مدور حلقے میں برج نما صورت اختیار کر لیتے ہیں جو اوپر سے مسقف، پھر ذرا پتلا ہوتا ہے اور تقریباً تین فٹ کی اونچائی پر کمر کھی ٹوپی اور کلس پر ختم ہوتا ہے۔ اس کلس اور گمزی میناروں کے پورے گلدستوں پر ۱۲۱۱ھ میں پہلے قاجار بادشاہ نے طلائی چادریں چڑھوا دیں۔

گنبد: یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس روضے کی خصوصیت ہمیشہ سے یہ چلی آتی ہے کہ میناروں کے درمیان۔ چھت کے اوپر دو گنبد تھے، جو اب تک کاشی کار تھے، ان کے کلس اب سنہری ہو گئے اور محمد شاہ قاجار نے دونوں گنبدوں اور کلسوں کو طلائی کر دیا۔

ضریح: صدیوں سے ائمہ کی قبروں پر قیمتی لکڑی کے خوبصورت اور منقش صندوق رکھے جاتے تھے، جو شمعوں کے گرنے یا بخور کی انگیٹھیوں کی آگ سے متاثر ہو جایا کرتے تھے۔ ۱۰۳۳ھ میں جب شاہ عباس بزرگ دوسری مرتبہ زیارت کے لیے نجف سے کربلا اور کربلا سے کاظمین پیدل حاضر ہوئے انھوں نے بہت

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

سے ھدایا و انتظامات کے ساتھ ساتھ دو نفیس لکڑی کے "صندوق خاتم" پرانے صندوق مستنصری کے اوپر رکھے۔ اور ان کی حفاظت کے لیے، جالی دار، نقرئی وطلائی نقش و نگار سے آراستہ چوکور فولادی جنگلا نصب کیا یہ جنگلا ضریح کے نام سے یاد کیا جاتا ھے۔ یہ ضریح طول میں چھے میٹر اور عرض میں تقریباً چار میٹر ھے اور اب تک موجود ھے (مجموعۂ زندگانی چہار دہ معصوم، ۲ : ۳۸۳)۔

۱۳۸۳ھ میں ناصر الدین شاہ قاجار نے فولادی ضریح کے گرد ایک اس سے بڑی نقرئی منقش ضریح نصب کی۔

طلا کاری: اب تک کاظمین کے در و دیوار اور سقف و ایوان پر عموماً طلائی نقش و نگار ھوا کرتے تھے یا زیادہ سے زیادہ کلس پر سونے کا پانی چڑھا دیا جاتا تھا، صفوی، افشاری اور قاجار بادشاھوں نے جہاں قیمتی کاشی کاری کی طرف خاص توجہ دی، اسی طرح عمارت کے نمایاں حصوں پر سونے کا پانی چڑھایا۔ میناروں، گنبدوں، دروازوں اور ایوانوں پر سیکڑوں سیر سونے کے پترے اور اینٹیں لگوا دیں۔

۱۲۱۱ھ میں محمد شاہ قاجار نے دونوں بڑے بڑے گنبدوں کو از اول تا آخر سونے کے پتروں سے مطلا کرکے عمارت کی نئی شان اجاگر کی، ان گنبدوں کی کرسی پر طلائی حرفوں میں آیات، احادیث، سلام، اشعار اور تاریخ بڑی خوبصورتی سے تحریر ھے۔ محمد شاہ نے اندرون ایوان کے خشتی فرش کی جگہ سنگ مرمر کی سلیں لگائیں اور دیواروں کے زیریں حصوں پر بھی مرمر کی موٹی موٹی سلیں چاروں طرف لگوائیں۔ صحن کا جنوب مغربی حصہ کچھ تنگ تھا، اس نے ملحقہ مکان بڑی بڑی قیمتیں ادا کرکے خریدے اور صحن کو وسعت دی۔ فرش کی مزید مرمت و اضافہ ۱۲۸۰ھ میں ناصرالدین شاہ قاجار نے کرایا۔ اس کے فوراً بعد والیِ بغداد مدحت پاشا نے اندرونی حصے میں طلا کاری کروائی۔ پھر کچھ رؤسا و تجار نے سونے کے پترے چڑھائے۔

ایوان طلا: ۱۲۸۵ھ میں ناصرالدین شاہ قاجار نے برآمدے کے اندر ایوان کے داخلے والے در قبلہ کے بیرونی حصے پر بہت اونچا اور چوڑا در بنوایا اور اس کے اندر اور باھر نصف بالائی حصے اور روکار اور اندرونی دروازے کے بالائی حصے پر سونے کا نفیس پانی چڑھوایا۔ ایوان طلائی، دونوں گنبدوں چاروں میناروں اور دو ساعتی میناروں کی گمزیان دن کی دھوپ اور رات کو بجلی کی روشنی میں چکا چوند پیدا کرتی ھیں اور عجب نظر افروز جلوے پھیلاتی ھیں۔ یوں تو نجف، کربلا اور مشہد ھر جگہ گنبد و مینار اور طلائی ایوان ھیں مگر طلا کاری کا جو منظر کاظمین میں ھے وہ کہیں نہیں۔

آئینہ کاری: گزشتہ صدیوں میں کاظمین کے سقف اور در و دیوار پر مقرنس کاری، رنگا رنگی اور آئینہ بندی تھی، مگر آئینے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ھندسی ترکیبوں سے شہد کے چھتوں کے مانند بناوٹ اور عجیب قسم کی سجاوٹ سے چسپاں کرنے کی صنعت نے ایوان، سقف اور در و بام کو نئی آب و تاب بخشی ھے۔ ۱۲۳۱ھ میں فتح علی شاہ قاجار نے شاہ اسمٰعیل صفوی کی کاشی کاری کے بجائے بڑے پیمانے پر اندرون ایوان اور بالائی حصوں کو آئینہ کاری سے مزین کیا۔ ۱۲۸۰ھ میں ناصرالدین شاہ قاجار نے اور زیادہ آئینہ کاری کرائی۔ پھر فرھاد میرزا اور دوسرے مخیر عقیدت مندوں نے اس میں اضافے کیے اور اس وقت ایوان میں جب قمقمے، ٹیوب اور مرکری بلب روشن ھوتے ھیں اور جھاڑ فانوسوں کے رنگین فانوس چمک کر ان آئینوں میں عکس ڈالتے ھیں تو فضا میں ستارے ھی ستارے دکھائی دیتے ھیں اور بام و در چاندی، سونے اور رنگین روغنی اینٹوں سے آب و تاب پیدا کرتے ھیں۔

کاظمین کی موجودہ تعمیر: ۱۲۹۸ھ میں، اعتماد الدولہ فرھاد میرزا ابن عباس میرزا (م ۱۳۰۵ھ)

www.besturdubooks.wordpress.com

نے بڑے جذب و شوق سے عمارت کا نیا نقشہ بنوایا، بوسیدہ عمارتوں کو گرا کر نئی بنیادوں کو استوار کیا، پختہ تعمیرات کو کاشی، آئینہ، سونا، چاندی، آیات و احادیث و اشعار سے مزین کیا، پانچ سال تک شہزادہ دن رات کام کی نگرانی میں مصروف رہا۔ یہ پوری عمارت اب تک بھی نئی تعمیر نظر آتی ہے۔ یہ تعمیر نجف و کربلا و مشہد اور دوسرے عتبات عالیات کے بعد ہوئی تھی اس لیے اس کا صحن و ایوان، غلام گردش اور دالان، برآمدے اور رواق، حرم اور مزار سب سے زیادہ کشادہ، روشن، وسیع اور ہندسی ہیں۔

کم و بیش میل دو میل سے چاروں مینار اور ان کے وسط میں متناسب گول لمبی گردنی بلندی کے یکساں دو پیازی گنبد ان پر بڑے بڑے کاس نظر آتے ہیں۔ شارع کاظمین ایک گول باغیچے پر ختم ہوتی ہے، سامنے باب القبلہ جس کے منقش چوبی دروازے کی چوکھٹ بازو، بالائی محراب و در اور اوپر مربع مینار پر چار رخوں والی گھڑی، اس کے اوپر چھوٹی سی طلائی گول گمزی اور کلغی ہے۔ دروازے پر آئیے تو سامنے صحن، ایوان طلا، رواق کا بھاری بھرکم سنہری روپہلی دروازہ اور اندرونی ایوان کے وسط میں بڑی سی جالی دار چاندی سونے کی ضریح ہے۔

تازہ ترین صورت حال: راقم مقالہ نے ۱۹۶۹ء میں کاظمین کی زیارت کی۔ اس عمارت کی قدیم تصویر تاریخ آل امجاد میں اور نئی تصویریں متعدد کتابوں اور اخباروں میں دیکھی تھیں، خود تاریخ کاظمین کے مطالعے سے عمارت کا نقشہ ذہن میں پہلے سے موجود تھا، مگر کاظمین پہنچ کر محسوس ہوا کہ یہ عمارت جو انجنیئرنگ، جمالیات، تعمیر و تزئین کے لحاظ سے بہت عمدہ عمارت ہے، اب خاصی بدل چکی ہے۔ اب شہر کاظمین کی شہر پناہ غائب ہو چکی ہے۔ بلند و بالا جدید طرز کی عمارتوں کا سلسلہ بغداد و دجلہ سے جا ملا ہے اور شہر کے تقریباً وسط میں روضۂ مبارک ہے، صدیوں کی شکست و ریخت نے شہر کی آبادی اور سڑکیں بلند کر دی ہیں، لیکن روضہ کی خوشنما بلند اور چمک دار دیواریں، دیواروں کے بالائی حاشیے اور آٹھ دروازوں کی قوسوں اور پیشانیوں کے نفیس کتبے اور نصراللہ المشہدی کی خطاطی ۱۲۹۸ اور ۱۳۰۱ھ کے فن کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جن سے عمارت کا جلال و جمال نمایاں ہے۔

دروازے: طویل و عریض روضے کے بیرونی حصے کی چار دیواری آٹھ دروازوں کے ذریعے صحن میں راستہ دیتی ہے۔

۱- باب القبلہ، ایوان طلا کے بالمقابل ہے، عموماً زائرین اسی دروازے سے صحن میں داخل ہوتے ہیں۔ اس دروازے کے اوپر چوکور مینار پر چو رخی گھڑی ہے۔ گھڑی کے اوپر مخروطی مینار، گمزی اور کاس پر ختم ہوتا ہے اس پر سونا چڑھا ہوا ہے۔

۲- باب المراد، مشرق میں واقع ہے، اس پر بھی باب القبلہ کی طرح مینار الساعۃ بنا ہے۔ یہ بھی طلا پوش ہے۔ یہ دروازہ بہت قدیم راستہ ہے۔

۳- باب صاحب الزمان، غربی سمت میں ہے۔

۴- باب فرہاد، حاجی فرہاد میرزا کا بنا کردہ دروازہ شرقی شمالی سمت میں ہے۔

۵- باب قاضی الحاجات، شمالی مشرقی سمت میں ہے۔

۶- باب قریش، شمالی غربی سمت میں ہے۔

۷- باب صافی، غربی و جنوبی سمت کی حد پر واقع ہے۔

۸- باب جدید، جنوب مشرقی سمت میں ہے۔ یہ دروازہ آیۃ اللہ ہبۃ الدین شہرستانی نے ۱۳۵۹ھ میں تعمیر کروایا تھا، اس میں داخل ہو کر بائیں طرف کے بڑے حجرے میں مکتبۃ الجوادین یا کتب خانۂ شہرستانی ہے۔

دروازوں سے صحن میں آتے ہیں۔ بیرونی دیوار

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کے اندرونی حصے میں حجروں کی خوبصورت قطار ہے، یہ بڑے بڑے حجرے اور ہر حجرے کے سامنے چبوترے اور در بنے ہیں ۔ حجروں کے اندر امرا و علما کی قبریں ہیں ۔ قالین و آلات زیبائش سے آراستہ کمروں میں سے باب المراد کے شمالی حجرے میں فرہاد میرزا کی قبر ہے، یہ حجرے پورے دروں کے ستر اور نیم دروں کے سولہ ہیں ۔

صحن میں تین طرف تعمیرات و بیوتات ہے، شمالی سمت میں مسجد جامع صفوی اور جنوب مشرق میں مقبرۂ امام زادگان ابراہیم و موسیٰ ہے ۔ جس کی تعمیر عثمانی وضع کی ہے ۔

صحن شمالاً جنوباً طول میں ۱۳۵ میٹر اور عرض میں ۱۳۰ میٹر ہے (تاریخ کاظمین، ص ۱۲۹)۔ چار دیواری سمیت پورا رقبہ تقریباً چھبیس ہزار میٹر ہے ۔

صحن کے تقریباً وسط میں عمارت روضہ ہے جس کے سامنے کے تین رخوں پر بلند ستونوں اور پہلو کے نسبۃً چھوٹے ستونوں پر برآمدے ہیں، ایک جنوب میں، ایک مشرق میں اور ایک مغرب میں ۔ ہر برآمدے کے وسطی حصے کے دونوں طرف "کفش کنی" کے کھلے مسقف کمرے ہیں ۔ ہزاروں زائر یہاں جوتے اتارتے ہیں اور خدام انتہائی چابک دستی سے ایک لکڑی کی مدد سے انہیں اٹھا کر دیواری خولوں میں رکھ کر ایک نمبر آنے والوں کو دیتے ہیں ۔ کتنا ہی بڑا مجمع اور کیسے ہی اجنبی آدمی ہوں جوتا ہمیشہ اصل آدمی کو واپس ملے گا ۔ کفش کنی سے مسقف برآمدے میں آتے ہیں ، یہاں قالین کا فرش ہے اور سامنے دروازۂ رواق باب قبلہ کی محراب و دیوار پر سونا چڑھا ہے ۔ دوسرے دروازوں پر آئینہ کاری ، کاشی کاری ، نقش اور کتبے ہیں ۔ ہر دروازہ چاندی کا ہے ۔ دروازے کے دونوں پہلوؤں میں بڑے فریموں میں "دعاے اذن" لکھی ہے اسے پڑھ کر رواق میں داخل ہوتے ہیں ۔ یہ رواق کشادہ ہیں اور جھاڑ فانوس، آئینہ کاری، کتبات، پنکھوں اور ٹیوبوں سے آراستہ ہیں ۔

اہم قبریں : مغربی رواق میں پائے مزار کی طرف شیخ العلامہ ابوالقاسم جعفر بن محمد بن قولویہ (م ۳۶۹ھ) کی قبر ہے جسے ایک محراب اور سامنے پیتل کے جنگلے اور کتبے سے ممتاز کیا گیا ہے ۔ ابن قولویہ کامل الزیارات کے مؤلف اور شیخ مفید کے استاد تھے ۔

دوسری قبر جو اسی سے متصل ہے اور کتبے اور جنگلے سے مزین ہے، اس کے احاطے میں شیخ المفید، محمد بن محمد بن نعمان تلعکبری البغدادی (م ۴۱۳ھ) مؤلف الارشاد وغیرہ محو خواب ہیں ۔ تیسری اہم قبر، خواجہ نصیر الدین محمد بن حسن الطوسی (م ۶۷۲ھ) کی ہے جو وسیع محراب ، بڑے برنجی جنگلے اور بڑے کتبے سے آراستہ ہے ۔

رواق سے ہو کر ایوان خاص جاتے ہیں، اس کے دروازے بھی نقرئی ہیں اور ایرانی کاریگروں کی صنعت کے عمدہ نمونے ہیں ۔ اس کے پہلوؤں میں بھی فریموں کے اندر زیارت امامین عربی و مروی طریقے پر لکھی ہے ۔ اسے پڑھ کر اندر جاتے ہیں ۔ اندر نقرئی ضریح اور اس کے ارد گرد قیمتی قالینوں کا فرش ہے ۔ موٹے موٹے ستونوں پر قالب دار مقرنس چھت ہے جس کے قالب میں آئینہ کاری و طلا کاری اور نفیس کتبات ہیں، اسماے حسنیٰ الٰہیہ، اسماے رسول و ائمہ، آیات و احادیث، طغرے اور تاریخیں ہیں، جن جس میں قدیم تاریخ ۹۲۶ھ ہے ۔ چھت میں بھاری اور بڑے بڑے جھاڑ ہیں، وسط میں زردوز شامیانہ، اس کے نیچے مخملی چھت کی مستطیل وزنی ، شاندار اور نقرئی ضریح ہے، جس کے بالائی حاشیے پر عربی اشعار تحریر ہیں ۔ پھر محرابیں اور جالی ہے ۔ اندر جانے کا ایک دروازہ ہے جس میں قفل لگا ہے، یہاں ایک خادم ہر وقت موجود رہتا ہے ۔ ضریح پر سنہری کنگرے اور بیل بوٹے، ستون اور حاشیے فنی نفاستوں کے آئینہ دار ہیں ۔ ضریح کے چاروں طرف زیارت پڑھنے اور دعائیں کرنے والوں کا ہر وقت مجمع رہتا ہے ۔ ارد گرد

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کے کشادہ پہلوؤں میں نماز، تلاوت قرآن، دعا کی گونج اور صلوٰۃ کی صداؤں سے ایوان گونجتا رہتا ہے ۔ یہاں دو اماموں کی قبریں ہیں اس لیے دو زیارتیں پڑھی جاتی ہیں (رک بہ مفاتیح الجنان و زاد المعاد وغیرہ) نماز کے حرم میں اذان دی جاتی ہے پانچوں وقت ہزاروں نمازی نماز با جماعت ادا کرتے ہیں ۔ امامت کے فرائض شہر کے نامور اور مقدس علما ادا کرتے ہیں ۔

تولیت : اوقاف و مشہد کی تولیت عظمٰی خانۂ کعبہ کے ہزار برس پرانے کلید بردار خاندان بنی شیبہ کی ایک شاخ "البوشیخ" کے ذمے ہے؛ یہ حجازی خاندان تقریباً چار سو برس سے کاظمین کا متولی ہے دیکھیے (مجموعۂ زندگانی چہاردہ معصوم، ج ۲، ص ۳۸۶) ۔

دکن، دہلی، اودھ، لاہور کے سلاطین اور امرا و نوابین نے اس کی مرمت و تزئین وغیرہ میں بڑی بڑی خدمات انجام دیں ۔ کاظمین کی عمارت کے علاوہ وہاں مدارس، کتب خانے اور علما کے مقبرے بہت ہیں۔

مآخذ : (۱) میرزا عباس قمی: تاریخ کاظمین و بغداد، ۱۳۲۷ ش؛ (۲) عمادالدین حسین اصفہانی : مجموعۂ زندگانی چہاردہ معصوم، ج ۲، طہران ۳۳۱ ش ؛ (۳) محمد حسن مصطفٰی : مدینۃ الحسین، طہران ۱۳۶۸ھ ؛ (۴) محمد عباس شروانی : تاریخ آل امجاد، دہلی ۱۳۱۲ھ؛ (۵) علامۂ مجلسی : تحفۃ الزائر، تبریز ؛ (۶) غلام علی احسن : رہبر زائران، آگرہ، ۱۳۵۳ھ؛ (۷) محمد ہاشم خراسانی : منتخب التواریخ، طہران ۱۳۴۷ھ ؛ (۸) مرتضٰی حسین فاضل : سفرنامۂ حج و زیارات، خطی ۱۳۹۱ھ؛ (۹) شیخ عباس قمی : مفاتیح الجنان، طہران ۱۳۲۹ھ ۔

(سید مرتضٰی حسین فاضل)

* **کاغَد** : کاغِد (فارسی لفظ کاغذ سے ماخوذ، شاید اصل کے اعتبار سے چینی) اسلامی ثقافت کے ارتقا کے زمانۂ آغاز میں اہل مشرق کے پاس صرف قرطاس (اوراق بردی، Papyrus) ہی ایک ایسی چیز تھی جس پر لکھا جا سکے؛ تالاس کے قریب اطلخ کی لڑائی میں چین کے جو جنگی قیدی اسیر بنا کر سمرقند لائے گئے تھے، پہلے پہل انھوں نے ۱۳۴ھ/۷۵۱ء میں چین میں مروجہ طریقے کے مطابق کتان اور سن کے چیتھڑوں اور ریشوں سے کاغذ بنانے کی صنعت رائج کی ۔ اس زمانے میں کاغذ کی جو مختلف قسمیں تیار کی جاتی تھیں، وہ حسب ذیل ہیں ۱۔ فرعونی : تہ وہ قسم تھی جو قرطاس (Papyrus) سے اس کے اپنے ملک (مصر) میں مقابلہ کرتی تھی ۔ عربی تحریر کا سب سے پرانا کاغذ جو مصر میں دستیاب ہوا ہے، ۱۸۰ھ تا ۲۰۰ھ/۷۹۶ء تا ۸۱۵ء ہے ؛ سلیمانی سلیمان بن رشید کے نام سے موسوم ہے جو ہارون الرشید کے عہد میں خراسان کا خازن تھا ؛ جعفری : جعفر البرمکی کے نام سے مشہور ہے ؛ طلحی، طاہریہ خاندان کے دوسرے فرمانروا طلحہ بن طاہر کے نام پر مشہور ہے ؛ طاہری، اسی خاندان کے بادشاہ طاہر دوم کے نام پر، نوحی : اس میں سامانی بادشاہ نوح اول کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے ۔

سمرقند کے کارخانوں کے نمونے پر دوسرے مقامات پر بھی کاغذ بنانے کے کارخانے قائم ہوئے ۔ جعفر البرمکی کے بھائی الفضل نے جو ۱۷۸ھ/۷۹۴ء میں خراسان کا عامل تھا، غالباً بغداد کے محلے دار القز میں کاغذ کا کارخانہ قائم کیا ۔ تھوڑے ہی عرصے میں نہامہ، یمن اور مصر میں کارخانے بن گئے جہاں کاغذ نے آخر کار قرطاس (اوراق بردی Papyrus) کا استعمال ختم کر دیا ۔ اسی طرح دمشق، طرابلس، حما، منبج، طبریہ، المغرب، ہسپانیا، (بمقام شاطبہ Xatiua)، ایران اور ہندوستان میں بھی کاغذ بننے لگا ۔ آذربیجان میں زنجان سے دو دن کی مسافت پر خونج یا خونا کے باشندوں نے اس وجہ سے کاغذ کنان کا نام اختیار کر لیا تھا کہ وہاں بہترین کاغذ تیار ہوتا تھا ۔ مغلوں نے یہ مقام بالکل تباہ کر دیا تاہم انھوں نے وہاں ایک نو آبادی مغلیہ کے نام سے قائم کی (Barbier de Meynard : *Dict. de la Perse*، ص ۲۱۹ ؛ (۲) حاجی خلیفہ :

www.besturdubooks.wordpress.com

جہان نما، قسطنطنیہ ۱۱۴۵ھ، ص ۲۹۸، و مترجمۂ Norberg، ۱ : ۳۶۵)۔

کاغذ بنانے اور اسے رنگنے کے مختلف طریقوں کے متعلق J. V. Karabaček نے *Neue Quellen z. Papiergeschichte* میں بڑی دلچسپ تفصیلات دی ہیں، (در *Mitt. aus der Samml. der Papyrus Erzh.* Rainer، ۴ : ۷۵ ببعد)۔

المقریزی (الخطط، طبع Wiet، ۲ : ۳۴) کے ایک بیان کے مطابق جعفر البرمکی نے سرکاری دفاتر میں رق (parchment) کی جگہ کاغذ کو رائج کیا۔

[جنگ عظیم سے قبل] مشرق ممالک میں جو کاغذ استعمال ہوتا تھا وہ تقریباً سارے کا سارا یورپ سے بن کر آتا تھا، [لیکن اب ان ممالک میں کاغذ کے کارخانے قائم ہو گئے ہیں]۔ ایران میں ایک چینی کاغذ بہت تھوڑی مقدار میں ملتا تھا جسے خان بالیق (پیکنگ کا ترکی نام) کہتے تھے۔ دیرپا ہونے کی وجہ سے اس کی بڑی مانگ رہتی تھی۔ قاہرہ کے مطابع زرد رنگ کا ایک مضبوط کاغذ "نباتی" پسند کرتے ہیں (فارسی نبات : مصری)۔

قسطنطنیہ میں "آبہای شیریں یورپ" (The Sweet Waters of Europe) کی عام سیر گاہ اور شاہی کوشک کاغذ کے ایک کارخانے (کاغذ خانہ، عوامی تلفظ کت خانہ) کے نام سے منسوب ہے جو مدت گزری تباہ ہوچکا ہے۔

مآخذ : (۱) الفہرست، طبع Flügel، ص ۲۱؛ (۲) القلقشندی : ضوء الصبح، ۱ : ۴۱۲؛ (۳) وہی مصنف : صبح الاعشی، ۱ : ۴۷۴، ۴۷۶؛ (۴) Karabacek : *Mitt. aus der Samml. der Papyrus Erzh. Rainer*، ۳/۲ : ۸۷ تا ۱۷۸؛ (۵) Chavannes : *Doc. sur les Tou-Kiue Occidentaux*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۳ء، ص ۲۹۷؛ (۶) Cl. Huart : *Les calligraphes et les miniaturistes de l'orient musulman*، ص ۸ تا ۱۱؛ (۷) J. E. Polak : *Persien*، لائپزگ ۱۸۶۵ء، ۱ : ۲۶۸؛ (۸) Jouannin و Van Gaver : *Turquie*، ص ۴۵۷؛ (۹) d' Ohsson : *Tableau de l'empire othoman*، ۳ : ۱۵۵۔

(Cl. Huart)

الکاف : (al-kef)، تونس کا ایک شہر۔ یہ تونس سے ۱۱۰ میل جنوب مغرب میں اور الجیریا کی سرحد سے تقریباً ۲۰ میل کے فاصلے پر ۳۶ درجے ۱۱ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۸ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد مشرق میں واقع ہے۔

مآخذ : (۱) کتاب الاستبصار، طبع von Kremer، وی انا ۱۸۵۲ء، ص ۵۱ تا ۵۲ و مترجمۂ Fagnan : *L'Afrique Septentrionale*، قسطنطنیہ، ص ۹۴ تا ۹۵؛ (۲) *Récit d'un voyage de Tunis au Kef exécuté en 1744*، طبع G. Dupont؛ (۳) Peyssonnel و Desfontaines : *Voyages dans les Régences de Tunis et d'Alger*، طبع Dureau de la Malle، پیرس ۱۸۳۸ء؛ (۴) Borbrügger : *Itinéraires archéologiques en Tunisie*، در *Rev. Afr.*، ۱۸۵۷ء؛ (۵) Guérin : *Voyage archéol. dans la Régence de Tunis*، پیرس ۱۸۶۲ء، ۲ : ۵۳ تا ۷۲؛ (۶) G. Musset : *Reveue de l'Afrique française*، ۱۸۸۸ء؛ (۷) A. de la Berve : *En Tunisie*، پیرس ۱۸۸۱ء، ص ۳۱ تا ۴۴؛ (۸) Espérandieu : *Etude sur le Kef*، پیرس ۱۸۸۹ء؛ (۹) Cagnat و Saladin : *Voyage en Tunisie*، پیرس ۱۸۹۴ء؛ (۱۰) C. Monchi-court : *La Région du Haut-Tell en Tunisie*، پیرس ۱۹۱۳ء؛ نیز دیکھیے مآخذ مقالۂ تونس۔

(G. Yver) [تلخیص از ادارہ]

کافر : (ع؛ جمع: کُفّار)؛ اس کا مادّہ ک ف ر ہے، جس کے لفظی معنی ہیں چھپانا، ڈھانکنا۔ اسی لیے لغت میں لفظ "کافر" کا اطلاق رات، سمندر، عظیم وادی، بڑے دریا، سیاہ بادل اور زرہ کے لیے بھی ہوتا ہے (الفیروز آبادی : القاموس المحیط، قاہرہ ۱۳۵۷ھ، ۲ : ۱۲۸، بذیل مادّۂ کفر)۔ اسی طرح کاشتکار کو بھی لغت میں "کافر" کہہ دیتے ہیں، کیونکہ وہ دانہ زمین میں

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

چھپاتا ہے، بلکہ آیت قرآنی اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ (۵۷ [الحدید] : ۲۰) کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ اس آیت میں کفار سے مراد کاشتکار ہیں ۔ اسی مناسبت سے کُفُور اور کُفْران کے معنی نا شکری کرنے کے ہیں اور قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہی معنی مراد ہیں (مثلاً ۱۱ [ہود] : ۹ ؛ ۲۲ [الحج] : ۶۶ ؛ ۷۶ [الدھر] : ۳، ۲۴ وغیرہ) ۔ پھر کفر کا زیادہ تر استعمال دین حق کے بجائے کسی اور دین کا پیرو ہونے کے لیے ہونے لگا اور کافر کا لفظ "غیر مسلم" کا مرادف ہو گیا؛ چنانچہ قرآن مجید کی اکثر آیات میں یہی معنی مراد ہیں ۔

"کفر" کی جو اصطلاحی تعریف علمائے فقہ و کلام میں مشہور اور متفق علیہ ہے وہ یہ ہے : ھُوَ جُحُوْدُ کُلِّ مَاثَبَتَ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ادِّعَاؤُہٗ ضَرُوْرَۃً (ابن الہمام : المسایرہ، دیوبند ۱۳۷۷ھ ص ۱۴۹، ۱۵۰) ۔ یہی تعریف معمولی لفظی فرق سے ابن نجیم کی البحر الرائق (مطبوعۂ قاہرہ، ۵ : ۱۲۹) میں بھی موجود ہے، یعنی کسی بھی ایسی چیز کا انکار کفر ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے بداھۃً یہ ثابت ہو کہ آپ نے اس کا دعوٰی فرمایا تھا، مثلاً توحید، آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت، آپ پر سلسلۂ نبوت کا ختم ہو جانا، آخرت کی زندگی، پانچوں نمازوں، زکوٰۃ، حج اور رمضان کے روزوں کی فرضیت، شراب اور زنا کی حرمت وغیرہ ۔ یہ سب چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے یقینی اور بدیہی طور پر ثابت ہیں ۔ اس قسم کی جس چیز کا بھی انکار کیا جائے وہ کفر ہے اور ایسا انکار کرنے والے کو کافر کہتے ہیں ۔

جمہور اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ اصولاً "کفر" کا تعلق اعتقاد سے ہے ۔ اگر ایک شخص عمل میں کمزور ہو، مگر اسلام کے اساسی عقائد پر ایمان رکھتا ہو تو وہ کافر نہیں ہوگا ۔ اسے بے عمل، فاسق، فاجر اور اسی طرح کے کسی اور لفظ سے یاد کیا جائے گا ۔ انکار (عقیدہ) سے کفر لازم آتا ہے ۔ سستی عمل یا کسی بد عملی یا گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوتا، ہاں فاسق [رک بآں] ہو جاتا ہے (ابو منصور الماتریدی : شرح الفقہ الاکبر، ص ۴۰ ؛ حیدر آباد، دکن ۱۳۲۱ھ) ۔ [یہ اس لیے ہے کہ انکار کے بعد نیک عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن انکار نہ کرنے کی صورت میں نیک عمل کی توقع رکھی جا سکتی ہے] ۔ بایں ہمہ یہ مد نظر رہے کہ اس نقطۂ نظر کے سلسلے میں جمہور امت کے خلاف بعض قدیم فرقوں نے اس سے اختلاف کر کے افراط یا تفریط کا راستہ اختیار کیا ہے ؛ چنانچہ فرقۂ کرّامیہ کا کہنا یہ تھا کہ ایمان صرف شہادتَیْن کے زبانی اقرار کا نام ہے، لہٰذا جو شخص زبان سے صرف یہ اقرار کر لے [شہادتَیْن کے ذریعے] وہ کفر سے محفوظ ہے، خواہ اس کا قلبی اعتقاد اور عملی زندگی اس کے اقرار کے خلاف ہو (الفرہاری : النبراس علی شرح العقائد، ملتان ۱۳۱۸ھ، ص ۳۹۹) ۔ دوسری طرف بعض خوارج کا کہنا یہ تھا کہ ہر طاعت جزو ایمان ہے، خواہ فرض ہو یا نفل، لہٰذا ایک طاعت کو چھوڑ دینے سے بھی انسان کافر ہو جاتا ہے، لیکن اکثر خوارج گناہ صغیرہ کے بجائے صرف گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر کفر کا اطلاق کرتے تھے (الآلوسی : روح المعانی، مطبوعۂ لاہور، ۱ : ۱۱۱) ۔ معتزلہ میں سے عبدالجبار اور ابوالہذیل وغیرہ کی طرف منسوب ہے کہ وہ کسی بھی فرض یا مستحب کے ترک یا گناہ صغیرہ تک کے ارتکاب کی بنا پر انسان کو ایمان سے خارج قرار دے دیتے تھے، اگرچہ ان کے نزدیک وہ کفر میں داخل نہیں ہوتا تھا ؛ البتہ اکثر معتزلہ کے نزدیک کسی نفلی عبادت کے ترک یا گناہ صغیرہ کے ارتکاب سے انسان ایمان سے خارج نہیں ہوتا ؛ ہاں اگر کوئی فریضہ چھوڑ دے یا کسی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر لے تو اس سے وہ ان کے نزدیک ایمان اور کفر کے درمیان معلق ہو جاتا ہے، یوں کہ نہ اسے مومن کہا جا سکتا ہے نہ کافر ۔ اس نظریے کو

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

منزلۃٌ بین المنزلتین کا عقیدہ کہتے ہیں (اس بحث کی تفصیلات کے لیے دیکھیے العینی: عمدۃ القاری، استانبول ۱۳۰۸ھ، ۱: ۱۲۱، ۱۲۲ ببعد؛ نیز فخر الدین الرازی: التفسیر الکبیر، مطبوعۂ قاہرہ، ۱: ۱۶۳ ببعد).

قرآن مجید میں کفار کے چھے گروہوں کا بطور خاص ذکر آیا ہے: (۱) مشرکین مکّہ، جو بت پرست تھے؛ مثلاً قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ (۱۰۹ [الکٰفرون]: ۱) میں یہی گروہ براہ راست مخاطب ہے؛ (۲) نصرانی یا عیسائی (تثلیث پرست)؛ چنانچہ ارشاد ہے: لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (۵ [المائدۃ]: ۷۳)=وہ لوگ کافر ہو گئے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے؛ (۳) یہودی، [حضرت عزیر ؑ کو ابن اللہ کہنے والے]۔ قرآن مجید (۵ [النسآء]: ۱۵۵، ۱۵۶) میں ان پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے؛ (۴) صابیٔ (۲ [البقرۃ]: ۶۲؛ ۵ [المائدۃ]: ۶۹؛ ۲۲ [الحج]: ۱۷)، یعنی ستارہ پرست (ابن کثیر: التفسیر، قاہرہ ۱۳۵۶ھ، ۱: ۱۰۴)؛ (۵) مجوسی، یعنی آتش پرست (۲۲ [الحج]: ۱۷)؛ (۶) منافقین، یعنی وہ لوگ جو زبان سے اپنے آپ کو مؤمن کہتے، لیکن دل سے کافر تھے (۶۳ [المنٰفقون]: ۱).

قرآن مجید نے بتایا ہے کہ تمام کافروں کا انجام آخرت میں جہنم ہے (۲ [البقرۃ]: ۳۹؛ ۳ [اٰل عمرٰن]: ۱۰ وغیرہ)، البتہ دنیوی احکام کے لحاظ سے کافروں کی متعدد قسمیں ہیں:

(۱) ذمّی [رک بہ ذمّہ]: ان کافروں کو کہتے ہیں جو کسی اسلامی حکومت میں حکومت کی اجازت سے مقیم ہوں۔ ان سے ایک معمولی ٹیکس (جزیہ) وصول کیا جاتا ہے اور ان کی جان، مال اور آبرو مسلمانوں کی طرح محفوظ ہوتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دے تو (حنفی مسلک کے مطابق) اس سے قصاص لیا جائے گا اور اس کے مال اور آبرو کی حفاظت سے متعلق بھی جملہ قوانین وہی ہیں جو مسلمانوں سے متعلق ہیں (ابن نجیم: البحرالرائق، مطبوعۂ قاہرہ، ۵: ۱۸۱؛ [نیز ابن القیم: احکام اھل الذمۃ]).

(۲) کافر مستأمن: اس کافر کو کہتے ہیں جو اسلامی مملکت میں حکومت سے اجازت لے کر زیادہ سے زیادہ ایک سال کے لیے آیا ہو۔ اس مدت میں اس سے جزیہ وصول نہیں کیا جائے گا اور اکثر احکام میں ایسا شخص بھی ذمّی ہی کی طرح ہوگا؛ مسلمانوں کے لیے اس کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت واجب ہے (الشّامی: ردّ المحتار، مطبوعۂ استانبول، ۳: ۳۴۴).

(۳) کافر حربی: وہ کافر ہے جو کسی [غیر معاہد] غیر مسلم حکومت کا باشندہ ہو۔ اگر اس غیر مسلم حکومت سے صلح کا کوئی معاہدہ ہے تو اس معاہدے کی شرائط کے مطابق عمل ہوگا اور اگر کوئی معاہدہ نہیں ہے تو ایسے کافروں کے جان و مال کی کوئی ذمے داری مسلمانوں پر نہیں ہے؛ ہاں مسلمانوں کے لیے ان سے غدر و خیانت اور دھوکا فریب جائز نہیں (ابن نجیم: البحرالرائق، ۵: ۱۰۷)؛ نیز حالت جنگ میں بھی غیر محارب عورتوں، بچوں، بوڑھوں، اپاہجوں، پاگلوں اور راہبوں کا قتل کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح جو لوگ دوران جنگ میں اسیر ہو کر آئے ہوں ان کا مُثلہ کرنا (کسی عضو کو کاٹ ڈالنا) یا انھیں آگ میں جلانا جائز نہیں (الشّامی: ردّ المحتار، ۳: ۳۰۹).

(۴) مُرتد [رک بآں]: وہ شخص ہے جو پہلے مسلمان ہو، پھر کافر ہو گیا ہو۔ دارالاسلام میں رہتے ہوئے ایسا کرنا بنصّ حدیث سزائے قتل کا مستوجب ہے (البخاری، کتاب استتابۃ المرتدین، دہلی ۱۳۵۷ھ، ۲: ۱۰۲۳)؛ لیکن اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسے دوبارہ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جائے گی اور اگر اس کے دل میں کچھ اعتراضات و شبہات پیدا ہو گئے ہوں تو انھیں دور کیا جائے گا۔ اگر وہ پھر بھی اسلام نہ لائے تو تین دن تک اسے قید میں رکھ کر مہلت دی جائے گی؛ اس کے بعد قتل کر دیا جائے گا (ابن نجیم:

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

البحرالرائق، ۵ : ۱۳۵) - [دور جدید کے بعض مبصرین کی رائے یہ ہے کہ قتل مرتد کا حکم قرآن مجید میں موجود نہیں اور ایسا کرنا نص لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (۲ [البقرۃ] : ۲۵۶) کے منافی سمجھتے ہیں، لیکن علما کی غالب اکثریت قتل مرتد کی قائل ہے] .

(۵) زِندیق : اس کافر کو کہتے ہیں جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی نبوت کا اعتراف کرتا ہو، لیکن اس کے دوسرے عقائد کافرانہ ہوں (التہانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، ۱۸۶۱ء، ۳ : ۱۲۵۲) .

جہاں تک کافروں کے ساتھ معاشرتی تعلقات کا معاملہ ہے، اس کے بارے میں قرآن مجید، حدیث اور فقہ میں وسیع احکام ملتے ہیں، مثلاً کافروں کے معبودوں کو گالی دینے سے منع کیا گیا ہے (۶ [الانعام] : ۱۰۸) اور کافر پر ظلم کر کے اس کی بد دعا لینے سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے (احمد بن حنبل : المسند، مطبوعۂ بیروت، ۳ : ۱۱۵۳) - اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ کافر کا بدن محض کفر کی وجہ سے ناپاک نہیں ہوتا؛ لہٰذا اس سے مصافحہ وغیرہ نہ کرنا محض شدت ہے، جس کے لیے کوئی سند نہیں (قاضی ثنا اللہ : تفسیر مظہری، دہلی ۱۳۸۰ھ، ۴: ۱۷۶) - [غیر مسلموں کے ساتھ معاشرتی سطح پر رواداری اور حسن معاملت کی تاکید ہے (البابرتی : العنایۃ مع فتح القدیر، مطبوعۂ قاہرہ، ۱ : ۷۵؛ ابن رشد : بدایۃ المجتہد، قاہرہ ۱۳۷۹ھ، ۱ : ۲۸۴)] - اگر کافروں کے برتنوں کے بارے میں یہ علم نہ ہو کہ وہ پاک ہیں یا ناپاک، تو [بغرض احتیاط طہارت] انہیں دھوئے بغیر کھانے پینے میں استعمال کرنا پسندیدہ نہیں؛ [یہ حکم عام ہے - خود مسلمانوں میں سے فساق و فجار کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے]، لیکن اگر کوئی [یہ سمجھ کر کہ یہ پاک ہیں] استعمال کر لے تو جائز ہے - اسی طرح ان کی بیمار پرسی کرنا، ان کی دعوت کرنا اور دعوت قبول کرنا، ان کو ہدیہ دینا یا ان کا ہدیہ قبول کرنا، اگر کسی دینی مصلحت کے خلاف نہ ہو تو جائز ہے - کسی یہودی یا مجوسی کو "اے کافر" کہہ کر پکارنا بھی مناسب نہیں، کیونکہ یہ اس کو گراں گزرے گا اور یہ دل آزاری ناجائز ہے؛ لیکن کافر کو "السَّلامُ عَلَیْکُم" کہنا یا لکھنا درست نہیں [کیونکہ السلام علیکم شعائر اسلام میں سے ہے اور اس سے مات کی انفرادیت متعین ہوتی ہے] - اس کے بجائے السلام علٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی لکھنا چاہیے (یہ اور اس جیسے بہت سے احکام فتاوٰی عالمگیری، بولاق - قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ۵ : ۳۴۶ تا ۳۴۸ میں مذکور ہیں) .

[اسی معاشرتی انفرادیت اور تشخص کی خاطر] اہل کتاب کے سوا غیر مسلموں سے نہ شادی بیاہ کا تعلق قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے، لیکن ذبیحہ کے سوا ان کے ہاتھوں کے تیار کیے ہوئے دوسرے کھانے مسلمانوں کے لیے جائز ہیں، بشرطیکہ ان میں کوئی حرام چیز نہ ہو - اہل کتاب (یہود و نصارٰی) کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے اور ان کی عورتوں سے نکاح بھی جائز ہے (۵ [المائدۃ] : ۵) .

تصوف کی اصطلاح میں "کفر" اور "کافر" کے کچھ اور معانی بھی بیان کیے گئے ہیں، [لیکن وہ مجازی و اصطلاحی ہیں]، (دیکھیے التہانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، ۱۸۶۳ء، ۳: ۱۲۵۲).

مآخذ : متن مقالہ میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ دیکھیے (۱) ابن منظور : لسان العرب، بولاق ۱۳۰۰ھ، ۶ : ۴۵۹ تا ۴۶۷ ؛ (۲) الجوہری : الصحاح، قاہرہ ۱۳۷۵ھ، ۲ : ۸۰۷؛ (۳) وینسنک : المعجم المفہرس، لائیڈن ۱۹۶۷ء، ۶: ۳۰، بذیل مادّہ؛ (۴) انورشاہ کشمیری : اکفار الملحدین، کراچی ۱۳۸۷ھ، (نیز اردو ترجمہ از مولانا محمد ادریس میرٹھی، مطبوعۂ کراچی)؛ (۶) مفتی محمد شفیع : ایمان اور کفر قرآن کی روشنی میں، کراچی ۱۳۹۳ھ؛ [(۷) مفتاح کنوز السنۃ، بذیل مادّۃ الکافر] .

(محمد تقی عثمانی)

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

* **کافرستان** : ایک پہاڑی علاقہ، جو ہندوکش میں ۳۵ اور ۳۶ درجے عرض بلد شمالی اور ۷۰ اور ۷۱ درجے طول بلد مشرق کے درمیان واقع ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ۵ ہزار مربع میل ہے۔ اس کا کچھ حصہ مملکت افغانستان میں شامل ہے، جسے نورستان کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے؛ اور کچھ پاکستان کے ضلع چترال میں ہے۔ اس کی شمالی سرحد بڑی حد تک وہ فاصل آب ہے جو دریاے جیحوں اور دریاے سندھ کے معاون ندی نالوں سے سیراب ہونے والے علاقوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے اور جس کے شمال کی وادیاں قبیلۂ غلچہ (رک بآں) کے قبضے میں ہیں۔ کوہ ہندوکش کا وہ سلسلہ کافرستان کی مغربی سرحد سمجھا جاتا ہے جو درۂ خاوک کے قرب و جوار سے جنوب کی طرف چلا گیا ہے اور اسے پنج شیر اور نجراؤ کی وادیوں سے جدا کرتا ہے۔ مشرق میں کنر اور بشگل کی وادیوں کا درمیانی سلسلۂ کوہ اور جنوب میں کُنَر اور کابل کی وادیوں کے شمال کا سلسلۂ کوہ اس کی سرحدیں متعین کرتا ہے۔ یہ ملک متعدد وادیوں پر مشتمل ہے، جنھیں ایک دوسرے سے بلند پہاڑ جدا کرتے ہیں۔ اس کے بڑے بڑے دریاؤں کا فالتو پانی دریاے کابل یا دریاے کنر میں جا گرتا ہے، لہٰذا ان کا تعلق دریاے سندھ کے طاس سے ہے۔ مشہور دریا یہ ہیں: النگار یا کاؤ مع اپنے معاون الشنگ کے؛ پیچ (کامہ یا پریسن) اور بشگل۔ یہاں کے باشندے اپنے شرک اور تاریک خیالی پر سختی سے جمے رہنے کے باعث بہت مدت سے کافر کے نام سے مشہور ہیں اور انھیں سے ملک کا نام کافرستان نکلا ہے۔ قدیم زمانے ہی سے سیاہ پوش کا نام بھی مستعمل ہے، لیکن دراصل یہ صرف ان کے ایک حصے کا نام ہے (باقی سب کو مجموعی طور پر سفید پوش کہتے ہیں).

اس میں شک نہیں کہ سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں یہ علاقہ سلطنت کشان میں شامل تھا اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کپیسہ (Kapisa) کا کوہستانی ملک یہی تھا۔ تیمور نے اس ملک اور اس کے حکمران قبیلے کے لیے کتور کا نام استعمال کیا ہے۔ یہ نام چترال کے ہمسایہ ملک کے حکمرانوں کے لقب کے مماثل ہے اور بلاشبہہ موجودہ زمانے کے سب سے بڑے قبیلے کا نام کتیر، دراصل کتور ہی ہے۔ یہ امر بہت حد تک قرین قیاس ہے کہ یہ نام کشان فرمانرواؤں کے لقب کدارہ سے نکلا ہو۔ Wodd اور Yule نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مارکو پولو کسم (Casem، یعنی کشم، وادی کوکچہ میں) کے نزدیک جن شراب نوش قبیلوں سے ملا تھا وہ یہی کافر تھے، جو غالباً اس زمانے میں ہندوکش کی شمالی وادیوں تک پھیلے ہوے تھے؛ تاہم ان کا تذکرہ قطعی طور پر پہلی بار شہنشاہ تیمور کی توزک میں ملتا ہے۔ ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر چڑھائی کرتے وقت تیمور درۂ خاوک کے راستے ان کے ملک میں داخل ہوا تاکہ انھیں اندراب پر حملے کرنے کی سزا دے۔ وہ انھیں کتور اور سیاہ پوش کے نام سے یاد کرتا ہے۔ باوجودیکہ تیمور فتح کا دعوٰی کرتا ہے، لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ دشمن نے تاک لگا کر اس کی فوج کا بڑا حصہ تباہ کر دیا تھا اور اسے کوئی مستقل کامیابی حاصل کیے بغیر خاوک کی سمت لوٹنا پڑا تھا۔ بابر نے اپنی توزک میں اس ملک اور یہاں کے باشندوں کا بڑا صحیح صحیح حال بیان کیا ہے۔ اس نے کئی دریاؤں اور اضلاع کے وہی نام لکھے ہیں جو آج تک مستعمل ہیں۔ موجودہ زمانے میں الفنسٹن Elphinstone (۱۸۰۹ء) نے اپنے مشاہدات سے اور میسن Masson (۱۸۲۶ء) اور بڈلف Biddulph (۱۸۸۰ء) نے ملک میں داخل ہوے بغیر ان تمام معلومات کو جمع کر دیا جو اس کے بارے میں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ ان میں سے الفنسٹن کا بیان خاص طور پر بہت قابل قدر ہے۔ لاک ہارٹ Lockhart پہلا یورپین تھا جو ۱۸۸۵ء کافرستان میں داخل ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۸۹ - ۱۸۹۰ء میں رابرٹسن Robertson پہنچا، جس نے ہندوکش کے کافروں پر اپنی تصنیف میں اس

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ملک اور اس کے باشندوں ان کی رسوم، عقائد اور تنظیم کے بارے میں بہترین حال قلمبند کیا ہے۔

۱۸۹۳ء میں حکومت ہند اور افغانستان کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کی رو سے کافرستان کا علاقہ قطعی طور پر انگریزی سرحد سے خارج قرار دیا گیا؛ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں امیر عبدالرحمٰن اس سارے علاقے کو فتح کرنے اور یہاں کے باشندوں میں تبلیغ اِسلام کے لیے روانہ ہوا۔ قبیلۂ رام گلی نے جو کتیر کی شاخ تھا سب سے آخر میں اطاعت قبول کی۔ رابرٹسن نے انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے؛ (۱) سیاہ پوش قبیلے، جن کا ایک دوسرے سے بہت نزدیکی تعلق ہے (ان میں سب سے بڑا قبیلہ کتیر تھا)؛ (۲) متفرق قبائل، جن میں کوئی رابطۂ نسلی موجود نہیں۔ انھیں وہ سفید پوش کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ان میں سے بڑے بڑے قبیلے ویگلی (اور اشگن، جو اس کا قرابت دار ہے) اور پریسنگلی یا ویرون ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام قبیلے آریائی نسل کی ایک قدیم قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی زبانیں پساچہ زبان کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ کوھن Kuhn اور گرئیرسن Grierson کے نزدیک ان میں ایک ایسی زبان کی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ہندی زبانوں کے جدا ہونے کے بعد لیکن ایرانی زبانوں کے تشخص سے پہلے بولی جاتی تھی۔ یہاں کی خالص بولیاں بشگلی، وای الا (Wai-ala) اور ویرون ہیں، جو ملک کے وسطی حصے میں مستعمل ہیں۔ گوربتی، کلاشا اور پشائی بیرونی زبانیں ہیں۔ پشائی فی الحقیقت کافرستان کی حدود سے باہر جلال آباد میں بولی جاتی ہے۔ ایک اور زبان اَشْکُنْد ہے، لیکن اس کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک یہاں جس قسم کی جاہلیت رائج تھی؛ اس میں مظاہر پرستی کے بہت سے عقائد شامل تھے، لیکن بعض بڑے بڑے دیوتا بھی عام طور پر مانے جاتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے دیوتا یہ تھے: امرا (خالق)، جس کا بڑا مندر پریسنگل میں تھا؛ مونی (پیغمبر)؛ گیش اور دیزانے (جنگ کا دیوتا اور دیوی)۔ افغانوں کے فتح پانے سے پہلے ہی سرحدی علاقے کے بہت سے اضلاع مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ یہ نومسلم شیخ کے نام سے مشہور تھے؛ بکروں کی قربانیاں اور مذہبی ناچ عام تھے۔

یہاں کا معاشرتی نظام یکسر قبائلی ہے۔ ہر قبیلہ متعدد خیلوں اور کنبوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ قبائلی حکومت کا انتظام ایک مجلس کرتی ہے، جو زیادہ تر سرداروں یعنی جَسْت پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ سردار مختلف برادریوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ قبیلے کی اصل حکومت چلانے کے لیے ہر سال اُررووں، یعنی مجسٹریٹوں کا انتخاب ہوتا ہے۔ مکان بہت اچھے بنائے جاتے ہیں اور ان سے بڑے مستحکم گاؤں بنتے ہیں۔ عام طور پر کافر ذکی اور چالاک، لیکن جھوٹے، سازشی اور خود پسند ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ مہمان نواز ہیں۔ کافر عموماً ظالم نہیں ہوتے۔ وہ بہادر ہیں اور آزادی کے دلدادہ اور اپنے ملک میں بڑے وقار سے کام کرتے ہیں۔ وہ بہت جھگڑالو ہیں، لیکن دوسروں کے جھگڑے طے کرانے پر ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں۔ ان کے ہاں چوری اور قتل قابل سزا جرائم نہیں سمجھے جاتے۔ غلامی کا رواج عام ہے۔ کچھ غلام تو موروثی ہوتے ہیں اور کچھ قبائلی لڑائیوں میں پکڑ کر بنائے جاتے ہیں، یا خریدے جاتے ہیں۔

مآخذ: (۱) ملفوظات تیموری، در Dowson و Elliot : *Hist. of India*، لنڈن ۱۸۷۱ء، جلد ۳؛ (۲) بابر نامہ، مترجمۂ A. S.Beveridge : *Memoirs of Babur*، لنڈن ۱۹۲۲ء؛ (۳) *The Book of Ser Marco Polo*، مترجمۂ Yule و Cordier، لنڈن ۱۹۰۳ء، ۱ : ۵۵، ۱۶۵؛ (۴) Elphinstone : *Caubul*، بار دوم، لنڈن ۱۸۳۹ء - ۱۸۴۲ء؛ (۵) Biddulph : *Tribes of the Hindoo Koosh*، کلکتہ ۱۸۸۰ء؛ (۶) Masson :

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Travels in Afghanistan، لنڈن ۱۸۴۴ء؛ (۷) G. S. Robertson : *The Kafirs of the Hindu-Kush*، بار دوم، لنڈن ۱۹۰۰ء؛ [(۸) محمود دانشور : کافرستان (اردو ترجمہ از خلیل احمد)، لاہور ۱۹۵۳ء].

(M. Longworth Dames)

* **کافُور** (نیز قافُور، قَفُور؛ قب لسان العرب، بذیل مادّۂ ق ـ ف ـ ر اور ک ـ ف ـ ر؛ سنسکرت میں کرپورا؛ پراکرت میں کَپُورا، کَاپُورا؛ ملائی میں کَپُور)، انگریزی میں Camphor، جو *Laurus Camphora* اور *Dryobalanops aromatica* کی رال ہے ۔ قدیم ایرانیوں کے عہد سے اس کی تجارت ہندوستان سے ہوتی آئی ہے ۔ جب مدائن فتح ہوا تو عرب فاتحین کو وہاں کافور کا بہت بڑا ذخیرہ ملا ۔ یہ لوگ اس کا استعمال نہیں جانتے تھے ۔ انھوں نے اسے نمک سمجھا (البلاذری، طبع de Goeje، ص ۲۶۴؛ ابن الاثیر، طبع Tornberg، ۲ : ۱۰۴) ۔ [یہ روایت ناقابل قبول ہے، کیونکہ کافور کا ذکر بلکہ اس کا استعمال قرآن مجید (۷۶ [الدھر]: ۵) ۔ میں مذکور ہے مقالہ نگار نے آگے خود اس کا حوالہ دیا ہے ۔ علاوہ ازیں احادیث میں غسل میت کے تحت یہ حکم وارد ہوا ہے کہ کافور کا بھی استعمال کیا جائے (الترمذی : جامع، ج ۱، ابواب الجنائز : باب ماجاء فی غسل المیت) ۔ ابن بیطار نے مختلف قسم کے کافوروں کا ذکر کیا ہے، جن میں سے فَنْصُوری اور ریاحی بہترین سمجھے جاتے تھے ۔ یہ سب قسم کے کافور استعمال سے پہلے صاف کر لیے جاتے تھے ۔ بقول مارکوپولو (طبع Soc. de Geogr.، پیرس ۱۸۶۵ء، ۱ : ۴۴۷؛ مترجمۂ Yule، بتصحیح H. Cordier، لنڈن ۱۹۰۳ء، ۲ : ۲۹۹، نیز تعلیقہ ۳، ص ۳۰۲ تا ۳۰۴) سب سے اچھا اور قیمتی کافور فَنْصُور کا ہوتا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سونے کے بھاؤ فروخت ہوتا تھا ۔ فَنْصُور غالباً بارُس Barus کا قدیم نام ہے (قب *Tijdschr. van het Kon. Nederl. Aardrijkskundig Genootschap*، سلسلۂ دوم، ۱۷ (۱۹۰۰ء) : ۱۸ تا ۲۲، ۲۷ تا ۲۹؛ *Encycl. van Nederl. - Indië*، بار دوم، ۱ : ۱۷۲ ببعد)، جو سماٹرا کے مغربی ساحل پر واقع ہے (ٹپنولی کی ریزیڈنسی) اور جہاں سے کافور فنصوری (Kapur Barus) آیا کرتا تھا ۔ عرب مصنفین فنصور کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں ۔ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے نصف اول سے ہمیں تاریخی اور جغرافیائی کتابوں میں اس جگہ کا ذکر ملتا ہے کہ یہیں سے بہترین کافور حاصل کیا جاتا تھا ۔

اس گوند کا نام قرآن مجید (۷۶ [الدّھر] : ۵) میں بھی پایا جاتا ہے [اِنَّ الاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاسٍ کَانَ مِزَاجُھَا کَافُوْرًا] : "بے شک نیک لوگ پییں گے اس پیالے سے جس کی ملونی کافور ہے" ۔ مفسرین کے نزدیک یا تو یہاں کافور سے مشروب کی خوشبو مراد ہے، یا پھر جنت میں اس نام کا کوئی چشمہ ہے (الطَّبَری : التفسیر، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ۲۹ : ۱۱۱ ببعد) ۔ آخر الذکر تفسیر کی بنیاد یہ ہے کہ آیہ ۶ کے شروع میں عَیْن (چشمہ) کا ذکر آیا ہے ۔

مآخذ : (۱) ابن بَیْطار : الجامع لمُفْرَدات الادْویۃ، قاہرہ ۱۲۰۱ھ، ۴ : ۴۲ تا ۴۴، فرانسیسی ترجمہ از Leclerc، ۳ : ۱۲۷؛ (۲) المَسْعُودی : مُرُوج، مطبوعۂ پیرس، ۱ : ۳۳۸، ۳۴۰ ببعد؛ (۳) القَزْوِینی : آثار البلاد، طبع Wüstenfeld، ص ۶۸؛ (۴) ابن بطّوطہ، مطبوعۂ پیرس، ۴ : ۱۴۱؛ G. Ferrand : *Textes géographiques*، ۱۹۱۳ء، ۱ : ۲، نیز بمدد اشاریہ، بذیل مادّۂ Camphre؛ (۶) Yule و Burnell : *Hobson-Jobson*، طبع جدید، از W. Crooke، لنڈن ۱۹۰۳ء، بذیل مادّۂ Camphor؛ (۷) W. Heyd : *Hist. du Commerce du Levant du Moyen-Age*، لائپزگ ۱۸۸۵ - ۱۸۸۶ء، ۱ : ۱۶۵، ۱۷۴، ۲ : ۳۷۹، ۱۵۱، ۵۰۰، ۵۹۰ ببعد.

(Cl. Huart)

* **کافُور** : ابوالمِسْک الاخْشیدی (المتنبّی نے ایک

www.besturdubooks.wordpress.com

قصیدے میں اسے حبشہ کے ایک مقام کی نسبت سے اللابی بھی لکھا ہے) ، چوتھی صدی ہجری میں شام اور مصر کا حکمران تھا، جس کی پیدائش نوبیہ یا حبشہ میں ۲۹۱ھ/۹۰۳ء اور ۳۰۸ھ/۹۲۰ء] کے درمیانی برسوں میں ہوئی (سال پیدائش کے بارے میں مؤرخین کے بیانات میں اختلاف ہے) ۔ وہ ایک انتہائی بدصورت غلام کے درجے سے ترقی کرکے شام اور مصر کا حکمران ہوگیا ۔ اس نے علما کی سرپرستی کی ۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور ترین شاعر المتنبّی (رک بآں) کا دوست تھا ۔ ان وجوہات کی بنا پر عرب مؤرخین نے اس کے حالات نہایت ذوق و شوق سے لکھے ہیں اور استحقاق سے زیادہ اسے شہرت دی ہے ۔ چونکہ وہ علما اور شعرا کا مربی و قدردان تھا، اس لیے سوانح نگاروں نے اسے وفاداری اور نمک حلالی کا اعلیٰ نمونہ بنا کر پیش کیا ہے، اگرچہ وہ اخشیدیوں [رک بآں] سے یہ وفاداری نہ نباہ سکا ۔ اس کے سوانح اس کے معمولی حسب و نسب، اس کے عروج اور المتنبّی کے ساتھ اس کی رفاقت کے بارے میں لطائف و ظرائف سے مزیّن ہیں ۔ تاریخ میں اس کی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اس نے المغرب میں فاطمیوں [رک بآں] اور شمالی شام میں عرب خانوادوں کی پیش قدمی کو روکے رکھا اور اپنی لیاقت و صلاحیت سے اخشیدیوں کی مملکت کو، جس کی تاسیس ۳۲۳ھ/۹۳۵ء میں ہوئی تھی، بیس برس تک تھامے رکھا ۔ اس کی وفات کے بعد یہ مملکت زوال پذیر ہوگئی ۔ جب وہ نو عمر غلام تھا تو اس نے اپنے ایک ساتھی سے، جسے باورچی بننے کا شوق تھا تاکہ وہ اپنے تنور شکم کو اچھی طرح روٹی سے بھر سکے، مصر کا حکمران بننے کا اشتیاق ظاہر کیا تھا ۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ والی مصر محمد الاخشید (۳۲۳ھ/۹۳۵ء تا ۳۳۴ھ/۹۴۶ء) نے اسے خرید لیا ۔ مؤرخین کا یہ بیان کہ اسے جلدی بیماری کی وجہ سے واپس کرکے دوبارہ خرید لیا گیا، محض ملمع سازی ہے تاکہ وہ اس کی پستی کا اس کے حیرت انگیز عروج سے موازنہ کر سکیں ۔ ایک دوسرے راوی کا بیان ہے کہ اس کے سابق آقا نے رقم سمیت اسے والی الاخشید کے پاس واپس بھیج دیا، لیکن مؤخرالذکر نے رقم واپس کر دی اور کافور کو رکھ لیا ۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب کافور کے دوسرے رفقا ہاتھی دیکھنے کے لیے اپنے آقا کو کمرے میں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تو وہ اپنی جگہ پر قائم رہا ۔ دونوں حکایتوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے آقا کا منظور نظر غلام بن گیا تھا ۔ والی نے اس کی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے ہوے اسے اپنا معتمد علیہ بنا لیا تھا اور اس کی مکروہ صورت کے باوجود اسے اپنے بچوں کا اتالیق اور سپہ سالار مقرر کر دیا تھا ۔ اس کی فوجی صلاحیتیں ۳۲۹ھ/۹۴۰ء میں حلب کے قریب ایک جنگ میں ظاہر ہوئیں اور اس نے حاب فتح کر لیا ۔ ۳۳۴ھ/اواخر جولائی ۹۴۶ء میں جب الاخشید کو یہ محسوس ہوا کہ اب اس کی موت کا وقت قریب ہے تو اس نے کافور کو اپنے چھوٹے بیٹے انوجور کا سرپرست مقرر کر دیا، جسے اس نے اس سے پیشتر اپنے باپ کے ساتھ مشترک حکمران مقرر کیا تھا ۔ انوجور کی بلوغت کے بعد بھی حقیقی اقتدار کافور ہی کے ہاتھ میں رہا ۔ ۳۳۸ھ / ۹۴۹ء میں اس نے انوجور کے بھائی علی بن الاخشید کو مشترک حاکم اور جانشین تسلیم کرا کے اخشیدی خاندان کو تباہی سے بچایا ۔ بعد ازاں ۳۴۳ھ/۹۵۴ء میں بعض دوستوں کے ایما پر انوجور نے کافور کی اتالیقی سے اپنا دامن چھڑانا چاہا کیونکہ اس کی آزادی عمل محدود تھی اور اس کے اخراجات پر بھی قدغن تھی ۔ اسے کافور کے گران بہا محاصل سے صرف چار لاکھ درہم ملا کرتے تھے ۔ وہ فلسطین میں رملہ چلا گیا تاکہ وہاں سے شام اور مصر پر آزادی سے حکومت کر سکے، لیکن یہ منصوبہ بروے کار نہ آ سکا ۔ اس کی والدہ اور کافور کو اس امر کی بروقت اطلاع مل گئی اور انھوں نے انوجور کو راضی کر لیا ۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

انوجور نے ذوالقعدہ ۳۴۹ھ/دسمبر ۹۶۰ء میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس سال کے خاتمے پر کافور نے خلیفہ سے علی بن الاخشید کی حکمرانی کی توثیق کرا لی۔ علی اس وقت چوبیس برس کا ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی کافور کی سرپرستی میں تھا اور اسے چار لاکھ درہم کی رقم ملتی تھی۔ مصر کی فرمانروائی دوبارہ شام پر قائم ہو گئی اور حلب سے لے کر شمال میں طرسوس تک تمام مساجد میں جمعے کے خطبوں میں خلیفہ کے ساتھ علی کا نام لیا جانے لگا۔ جب علی نے چھے برس بعد ۳۵۵ھ/۹۶۶ء میں انتقال کیا تو کافور نے حکومت کی زمام کار خود سنبھال لی اور خلیفہ نے بھی اس کے تقرر کی توثیق کر دی کیونکہ اس وقت علی کا بیٹا احمد صرف نو برس کا تھا۔ کافور اپنی آزادی اور خود مختاری سے زیادہ دیر تک متمتع نہ ہو سکا۔ اس نے ۳۵۷ھ/۹۶۸ء میں وفات پائی۔ اس کا جانشین احمد ہوا جس کے اختیارات اس نے خود سنبھال رکھے تھے۔

کافور نے شام اور مصر میں امن و امان قائم رکھا۔ الاخشید کی وفات کے بعد اس نے حلب کے فرمانروا سیف الدولہ سے دمشق چھین لیا جس پر مؤخرالذکر نے قبضہ کر لیا تھا۔ کافور نے بیدار مغزی سے خلیفۂ بغداد اور شمالی افریقیہ کے فاطمی حکمران سے یکساں تعلقات رکھے۔ کافور کے مال و دولت کی بڑی شہرت تھی اور اس کی ریاست میں سونے کے بجائے فنون لطیفہ کے بہترین خزائن تھے۔ وہ شان و شوکت کا دلدادہ تھا۔ سیف الدولہ کی طرح وہ علما اور شعرا پر دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ اس کا دربار مقبول عام تھا اور ارباب علم اس کی قدردانی کے جویا رہتے تھے۔ جب المتنبّی سیف الدولہ سے کبیدہ خاطر ہو گیا تو کافور نے اسے قاہرہ بلا لیا جہاں المتنبّی نے چند سال قیام کیا۔ قیام کے ابتدائی دور میں اس نے کافور کی مدح میں مشہور قصائد لکھے۔ یہ رفاقت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ کافور نے وعدے کے مطابق اسے کوئی انتظامیہ عہدہ نہ دیا۔ کافور کا عذر یہ تھا کہ وہ اس شخص پر کیسے اعتماد کر سکتا ہے جو نبوت کا دعوے دار ہو۔ کافور علم و ادب کا شائق تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتا تھا۔ اس کے دامن دولت سے بہت سے علما و فضلا وابستہ تھے۔ ان میں مشہورترین الکندی ہے جس نے اس کے لیے تاریخ مصر لکھی تھی۔

مآخذ: (۱) ابن سعید: کتاب المُغرِب فی حلی المغرب، جلد چہارم، جسے الکندی کی تاریخ مصر سے اقتباس سمیت Kn-L-Tallquist نے طبع کیا ہے۔ اس میں کافور کی مفصل سوانح کی ابتدا میں مآخذ بھی مندرج ہیں (ص ۷۸ تا ۸۶، عربی متن ص ۳۶ تا ۴۸)؛ (۲) الحلبی، در Wüstenfeld: *Die Statthalter Von Aegypten Zur Zeit der Chalifen*، ۳: ص ۳۷ تا ۵۰، ص ۵۹ تا ۶۱ (*D. K. Abh. Ges d. Wiss. Zu Göttingen*) ۲۱ (۱۸۷۶ء)؛ (۳) ابن خلّکان، طبع Wüstenfeld، عدد ۵۵۶ نیز بمدد اشاریہ؛ (۴) المقریزی: الخطط، بولاق ۱۲۷۰ھ، ۲: ص ۲۶ ببعد؛ (۵) ابوالمحاسن ابن تغری بردی: النجوم، ۲: ص ۳۷۳ تا ۳۹۵ بمواضع کثیرہ؛ (۶) المتنبّی: دیوان، (طبع دیتریسی) الکافوریات، ص ۶۲۳ ببعد اور مزید مآخذ منقولہ، در Tallquist: [(۷) Sadrud Din: *Saif-al-Dawla and his times*، مطبوعۂ لاہور؛ (۸) جلیل الرحمٰن اعظمی: ابو الطیب المتنبّی، ص ۱۴۱ تا ۱۶۴، مطبوعۂ کراچی)].

(M. SOBER NHEIM [و ادارہ])

کاکاصاحب: شیخ رحمکار (۹۸۳ تا * ۱۰۶۳ھ)، صوبۂ سرحد کے مشاہیر اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ کرامات اور خوارق عادات کی وجہ سے "قطب حقیقی" مشہور ہوئے اور تجلّی ذات سے متجلی ہونے کی شہرت پائی۔ صوبۂ سرحد، کابل اور افغانستان میں ان کے مریدوں کی تعداد ہزاروں [بلکہ لاکھوں] تک پہنچتی ہے [اور ان کے مزار پر زائرین کا ہجوم صوبۂ سرحد کے دیگر تمام مزارات سے زیادہ ہوتا ہے]۔

www.besturdubooks.wordpress.com

صوبۂ سرحد کا قبیلۂ کاکا خلیل ان کی نسل سے ہے۔ پشتو زبان میں ان کا اصلی نام "کستیرگل" تھا جو ایک خوشبودار پھول [یا زعفران] کا نام ہے، لیکن انھوں نے اپنے مریدوں میں "کاکا صاحب" اور "شیخ رحمکار" کے القاب سے شہرت پائی۔ وہ یکم رمضان ۹۸۳ھ بروزجمعہ صبح صادق کے وقت کاکا صاحب کی موجودہ زیارت سے چھے میل جانب جنوب و غرب، جو نوشہرے کے جنوب میں چھے میل کے فاصلے پر واقع ہے، ایک گاؤں میں "بختی" نامی ایک نیک بخت بی‌بی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ان کے اصل و نسب کے متعلق دو قول مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ آپ حسینی سادات کی نسل سے ہیں جو ۲۴ پشت میں حضرت امام حسین تک پہنچتی ہے۔ ان کے اجداد عراق، مشہد، بخارا، پشین (بلوچستان)، غزنی اور خوست میں مدفون ہیں۔ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں سید آدم [علاقۂ] کوہاٹ آئے۔ ان کا مزار موضع کربوغہ میں ہے۔ بعدازاں [ان کے بیٹے] سید غالب نوشہرے کے علاقے میں وارد ہوئے۔ ان کا مزار کوہ چراٹ کے دامن میں ہے۔ ان کے بیٹے سید نادر مست بابا کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے [بیٹے] بہادر دار مست نے ایک صاحب کے نام سے بہت شہرت پائی۔ [مست بابا] اور ایک صاحب خٹک نوشہرہ کے علاقے میں [باہم دو میل کے فاصلے پر] مدفون ہیں۔ حضرت کاکا صاحب انھیں ایک صاحب کے فرزند تھے۔ اس روایت کا مأخذ عبدالحلیم بن کاکا صاحب کی تالیف مقامات قطبیہ [کے ناشر نے کتاب بطور ضمیمہ درج کی ہے] جو بعد کے مؤلفین نے بھی نقل کی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کاکا صاحب خٹک قوم کے افغان تھے۔ *Central Asia*، ۲ : ص ۷۸، طبع ۱۸۷۳ء، قاموس قبائل، ۲ : ص ۹۳۴ء، طبع ۱۹۱۱ء، گزیٹیر صوبۂ سرحد، ۲ : ص ۹۰۹، تاریخ پشاور، ص ۳۲۳ میں کاکا خیل کو خٹک قوم میں شمار کیا ہے۔ بہر صورت کاکا خیل [اور ان کے آبا و اجداد] کئی نسلوں اور کئی صدیوں سے خٹک قوم میں زندگانی بسر کر رہے ہیں اور ان کی زبان اور ان کے آداب و رسوم کو پوری طرح اپنا چکے ہیں۔

کاکا صاحب نے خٹک کے علاقے میں [شیخ اخ‌الدین المعروف بہ] اخون دین صاحب [جن کا مزار اکوڑہ میں ہے] اور اپنے [والد] ایک صاحب سے تعلیم حاصل کی اور [بعض روایات کے مطابق] والد ہی سے سلسلۂ چشتیہ [یا سہروردیہ یا ہر دو] کی اجازت پائی، لیکن وہ اپنے طریقے کو اویسی ظاہر فرمایا کرتے تھے۔ ایک ہزار ہجری کے قریب ان کی شہرت کا آوازہ تمام سرحد اور افغانستان میں دور دور تک پھیل گیا۔ ان کے زہد و ریاضت، کرامات و تبلیغ دین، اخلاق و احکام دین کا بہت چرچا ہونے لگا۔ انھوں نے اخوند پنجو [رک بآں] اور سید آدم بنوری خلیفۂ حضرت مجددؒ سرہندی سے [بھی] روحانی فیض پایا اور عمر کا خاصا حصہ ریاضت و عبادت [زہد و تقوٰی] اور لوگوں کی ہدایت میں صرف کیا۔ [حضرت کاکا صاحب کے فیوض و برکات سے علاقے کے لوگ متعدد طریقوں سے مستفیض ہوئے۔ بہت باکمال بزرگوں نے ان سے روحانی کسب فیض کیا اور خرقۂ خلافت حاصل کیا، مثلاً خواجہ شمس الدین ہروی، کمال الدین بلخی، فقیر جمیل بیگ، (برادر خوشحال خان)، خواجہ شیخ بابر، شیخ دریا خان چمکنی اور حضرت مرزا گل بابا۔ قاضی عبدالحلیم اثر نے ان کے علاوہ تیس سے زائد مشہور خلفا کے نام تحریر کیے ہیں۔

عام مسلمانوں نے ان کے وعظ و نصیحت اور ارکان اسلام کی تلقین، تزکیہ و تربیت، درس و تعلیم اور جاری کردہ مدارس سے دینی فائدہ اٹھایا۔ ان کی مقبول دعاؤں، مخلوق خدا کی خیر خواہی، ان کو مفید مشورے دینے اور مسلمانوں کے آپس میں صلح و آشتی قائم رکھنے کی بدولت علاقے کے لوگوں کو عمومی فائدہ پہنچا۔ روحانی برکات کا فیض اس پر

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

مستزاد ہے ۔ انھوں نے انتہائی سادہ زندگی گزاری، خودداری ، حلم و بردباری ، شفقت و ہمدردی اور بے انتہا جود و سخا ان کے اخلاقی کمالات کے نمایاں جوہر تھے] ۔ جمعہ ۲۴ رجب ۱۰۶۳ھ / ۲۱ جون ۱۶۵۲ء کو اسّی سال [یا بقول بعض ۸۲ سال] کی عمر میں وفات پائی اور اس مقام پر دفن ہوے جو [تحصیل] نوشہرہ میں زیارت کاکا صاحب کے نام سے مشہور ہے ۔ [ان کے صاحبزادے شیخ عبدالحلیم نے ۱۰۸۱ھ میں ہندوستان سے معمار بلا کر ان کے مزار پر گنبد تعمیر کرایا جو اس علاقے میں مغلیہ فن تعمیر کا واحد شاہکار ہے] خوشحال خان خٹک ان کے مریدوں میں سے تھا .

کاکا صاحب کے بیٹوں کے نام : (۱) شیخ ضیاء الدین شہید [معروف بہ شہید بابا، کاکا صاحب کے گنبد کے پاس ایک دوسرے گنبد میں ان کا مزار ہے]؛ (۲) شیخ گل محمد معروف بہ حاجی بابا [ان کی قبر کاکا صاحب کی قبر سے متصل جانب مشرق ہے]؛ (۳) شیخ خلیل گل معروف بہ مزری بابا [مزار موضع کوٹ مالا کنڈ ایجنسی میں ہے]؛ (۴) شیخ عبدالحلیم صاحب معروف بہ حلیم گل بابا مؤلف مقامات قطبیہ [و شمس العارفین م-۱۰۹۶ھ، مزار زیارت کاکا صاحب میں ہے]، کاکا صاحب کے یہ چاروں فرزند صاحب نسبت بزرگ تھے ۔ خصوصاً شیخ عبدالحلیمؒ جن کے خاندان کو خصوصی تقدس حاصل ہے]؛ (۵) نجم الدین جو بچپن میں فوت ہوے .

[کاکا صاحب کی سکونت وفات کے وقت تک موجودہ قصبے سے، ایک میل جنوب مغرب کی طرف دامن کوہ میں ایک کچے مکان میں تھی ۔ یہ مقام اب "میلہ" (گھر) کے نام سے مشہور ہے ۔ ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد اور دیگر متعلقین نے مزار کے قریب سکونت اختیار کی ۔ رفتہ رفتہ یہاں موجودہ قصبہ زیارت کاکا صاحب کے نام سے آباد ہوا ۔ آج کل اس کی آبادی تقریباً سات ہزار ہے ۔ اکثریت کاکا صاحب کی اولاد کی ہے ۔ سکونت پذیر لوگوں میں دوسرا مشہور خاندان (خاندان قضاۃ) کاکا صاحب کے استاد شیخ اخ الدین کی اولاد کا ہے ۔ جو اسی زمانے سے یہاں مقیم ہے] .

[کاکا صاحب کی اولاد کاکا خیل کہلاتی ہے ۔ یہ علاقۂ پشاور کی ایک با اثر قوم ہے اور قصبے کے علاوہ دوسرے مقامات میں بھی پھیلی ہوئی ہے ۔ عوام میں ان کا روحانی اثر و نفوذ مسلم ہے ۔ قوم کاکا خیل میں بہت سے افراد صاحب شہرت گزرے ہیں، مثلاً خان بہادر میاں رحیم شاہ (جنھوں نے اسلامیہ کالج کی بنا اور ترقی میں حصہ لیا اسلامیہ کالج پشاور)، فخر قوم میاں حمید گل، مولوی سید میرانجان (تحریک خلافت کے زعما)، مولانا عزیز گل، اسیر مالٹا خلیفۂ شیخ الہند] .

مآخذ : [حضرت کاکا صاحب کے تفصیلی حالات کے لیے مستند مآخذ کم ملتے ہیں ۔ شیخ عبد الحلیمؒ اور فقیر جمیل بیگؒ کی کتابیں مستند مگر تشنگی دور کرنے کے لیے ناکافی ہیں ۔ دوسرے معاصر اصحاب اور خلفا کے تذکرے جو اب مخطوطوں کی شکل میں بمشکل دستیاب ہوتے ہیں، عموماً مناقب اور کرامات پر مشتمل ہیں ۔ موجودہ صدی میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں عموماً کسی خاص نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر قیاس آرائیاں شامل کی گئی ہیں اور ان کو حقائق کا رنگ دیا گیا ہے ۔ اس لیے معروضی مطالعے کے لیے ان سے استفادے میں احتیاط کی ضرورت ہے] : (۱) شیخ عبدالحلیم بن کاکا صاحب : مقامات قطبیہ ، تصنیف ۱۰۶۶ھ دہلی ۱۳۱۸ھ؛ (۲) سیاح الدین کاکا خیل : تذکرۂ شیخ رحمکار ، (اردو) لاہور ۱۹۵۱ء؛ (۳) نصراللہ نصر : کاکا صاحب رحمکار (پشتو)، پشاور ۱۹۵۱ء؛ (۴) Mac. Gregah : *Gazetteer of the Frontier Province*، طبع ۱۸۸۷ء؛ (۵) *Central Asie*، طبع ۱۸۷۳ء، ج ۲؛ (۶) *Glossary of the tribes of the Punjab and North West Frontier*، ج ۲، طبع ۱۹۱۱ء؛ (۷) گوپال داس : تاریخ پشاور ، [اردو] لاہور ۱۸۷۰ء؛ (۸) میر احمد شاہ رضوانی : تحفۃ الاولیاء، لاہور ۱۳۲۱ھ؛

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

(۹) سید عبداللہ شاہ بخاری: مجمع البرکات [فارسی]، تالیف ۱۸۸۵ء، مخطوطۂ [مملوکۂ میاں فجر من اللہ کاکاخیل]؛ (۱۰) محمد امجد: تاریخ زیارت کاکا صاحب، از حکیم محمد امجد مطبوعہ لاہور؛ (۱۱) شمس الدین ہروی: اسرار المسالکین ای مناقب کاکا صاحب، مخطوطۂ مقالہ نگار؛ (۱۲) جمال الدین: مناقب کاکا صاحب، مخطوطۂ مقالہ نگار؛ (۱۳) شیخ اسمٰعیل: مناقب کاکا صاحب، مخطوطۂ مقالہ نگار؛ (۱۴) گل نور ننگر ہاری: مناقب شیخ رحمکار، مخطوطۂ مقالہ نگار؛ (۱۵) میاں محمد مبین: مناقب منظوم کاکا صاحب، مخطوعۂ مقالہ نگار؛ (۱۶) غلام احمد نوشہروی: مناقب کاکا صاحب مع شجرہ، لاہور ۱۹۰۸ء؛ (۱۸) فقیر جمیل بیگ دل: تذکرۃ الاولیاء، مخطوطہ، در پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی؛ (۱۹) عبدالحلیم اثر: روحانی رابطہ، پشاور ۱۹۶۵ء، ص ۵۷۳ تا ۵۹۳؛ (۲۰) اعجاز الحق قدوسی: تذکرۂ صوفیاے سرحد، مرکزی ادبی بورڈ ۱۹۶۶ء، ص ۲۶۸ تا ۳۱۸.

(عبدالحی حبیبی و محمد عبدالقدوس)

* **کاکَوَیْہ (بنو)**: ایک شاہی خاندان جس نے ۳۹۸ھ/۱۰۰۷ء سے ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء تک اصفہان اور ہمذان کے صوبوں پر حکومت کی۔ یہ خاندان دشمنز یار رستم بن المرزبان کی نسل سے تھا جو دیلم کا رہنے والا تھا۔ اس کے پاس شہریار کی جاگیر تھی اور آل بویہ کے فرمانروا مجد الدولہ نے اسے اسپہبذ کا خطاب دیا ہوا تھا (دیکھیے ابن اسفندیار: تاریخ طبرستان، مترجمۂ براؤن، ص ۲۴۸، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۹؛ ظہیرالدین: تاریخ طبرستان، طبع Dorn، ص ۱۹۵، ۲۰۹؛ میرخواند: روضۃ الصفاء، ۴: ص ۲۶).

کاکویہ دیلم کی مقامی بولی میں کاکو (مامون) کا اسم تصغیر ہے (دیکھیے J. de Morgan: *Mission Scientifique en Perse*، ۵: ص ۲۱۶، شمارہ ۳۶۳؛ رضا قلی خان: فرہنگ [انجمن آرای] ناصری، بذیل مادّہ)۔ مؤسس خاندان [ابو جعفر] کو ابن کاکویہ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا کیونکہ وہ مجدالدولہ کے ماموں کا بیٹا تھا۔ مجدالدولہ کی ماں [ابو جعفر ابن کاکویہ] کے والد دشمنزیار، جو مجدالدولہ کا سرپرست تھا، کی بہن تھی (ابن الأثیر، ۹: ص ۲۰۷، جہاں صفحہ ۱۴۶ کی بہ نسبت بہتر تشریح دی ہوئی ہے).

سکون پر دشمنزیار کے بجاے دشمنزار نام لکھا ہے (F. Justi: *Iranisches Namenbuach*، ص ۸۸؛ شجرۂ نسب، ص ۴۴۵)۔ اس خاندان میں پانچ بادشاہ گزرے ہیں:

۱۔ علاءالدولہ ابو جعفر محمد بن دشمنزیار الملقب بہ ابن کاکویہ جس نے ۳۹۸ھ/۱۰۰۷ء کے فوراً بعد اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے میں سبقت کی آل بویہ کے فرمانروا فخرالدولہ [رکن بآں] کی بیوی یعنی مجدالدولہ (جس نے اسے اصفہان کا عامل مقرر کر دیا تھا) کی ماں کا چچا زاد بھائی تھا۔ اس نے ہمذان پر ۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء، رے پر ۴۱۹ھ/۱۰۲۸ء اور اصفہان پر ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں قبضہ کیا۔ کردوں، طبرستان کے اسپہبذوں اور غزوں سے مسلسل جنگوں کے باعث وہ امن چین کے ساتھ ان مقبوضات پر حکومت نہ کر سکا۔ ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں سلطان مسعود نے جو اپنے باپ کے بعد تخت نشین ہوا تھا، اس کے لیے اصفہان کی ولایت کی توثیق کر دی۔ ۴۲۵ھ/۱۰۳۴ء میں اس نے بغاوت کی اور دو بار شکست کھا کر اصفہان کھو بیٹھا۔ دو سال بعد اس نے اسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش شروع کی اور بالآخر کچھ مدت بعد اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاج الدولہ بویہی کی ملازمت سے برخاست ہونے کے بعد طبیب و حکیم ابن سینا [رکن بآں] نے اسی کے دربار میں قلمدان وزارت سنبھالا تھا (ابن خلّکان، طبع Wüstenfeld عدد ۱۸۹، مترجمۂ de Slane، ۱: ۴۴۲)؛ ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء میں اپنے انتقال کے وقت بھی وہ وزیر ہی تھا۔ علاءالدین نے ۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء میں اپنے دارالحکومت کے گرد

www.besturdubooks.wordpress.com

فصیل بنوائی اور اس کے بعد ۴۳۳ھ/۱۰۴۲ء میں اس کی وفات ہو گئی۔

۲۔ ظہیرالدین ابو منصور فرامرز، علاء الدولہ کا سب سے بڑا بیٹا، اصفہان میں اس کا جانشین قرار پایا۔ اس نے اپنے بھائی ابوحرب کے خلاف جنگ کی۔ ابوحرب نے غز سلجوقوں سے اعانت طلب کی جن کا مستقر رے تھا۔ لڑائی میں مؤخرالذکر نے شکست کھائی۔ ظہیر نے ابو کالیجار بن سلطان الدولہ بویہی [رک بآں] کے ہاں پناہ لی اور اس بویہی سلطان کو اصفہان کا محاصرہ کرنے پر اکسایا۔ دونوں بھائیوں کے درمیان یہ لڑائی، جو ۴۳۵ھ/۱۰۴۴ء تک جاری رہی، بالآخر ایک معاہدے کے ذریعے ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ظہیر نے کرمان کے دو قلعوں پر قبضہ کر لیا جو ابو کالیجار کے علاقے میں تھے۔ انھیں واپس لینے کے لیے ابو کالیجار نے ابرقوہ فتح کیا اور اصفہانی فوج کو شکست دے دی۔ ۴۳۸ھ/۱۰۴۷ء میں طغرل بیگ نے اسے اس کے دارالحکومت اصفہان میں محصور کر لیا اور اسے اس شرط پر اپنی جاگیر پر قابض رہنے دیا کہ وہ اطاعت گزار بن کر رہے گا۔ یہ صورت حال ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء تک قائم رہی کیونکہ سلجوق فرمانروا نے ایک طویل محاصرے کے بعد اس سال اصفہان کو فتح کر لیا اور اسی کو اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ یہ کہتے ہوے اس کی فصیلیں منہدم کرا دیں کہ حفاظت کے لیے دیواروں کی ضرورت فقط اس بادشاہ کو ہوتی ہے جو کمزور ہو۔ ابو منصور کو بطور جاگیر دو اضلاع یزد اور ابرقوہ ملے۔ جب ۴۵۵ھ/۱۰۶۳ء میں، طغرل بیگ خلیفہ القائم کی بیٹی سے شادی کرنے بغداد گیا تو ظہیر اس کا ہم رکاب تھا۔

۳۔ ابو کالیجار گرشاسپ، سابق الذکر کا بھائی تھا اور جب ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں غزوں نے ہمذان کا محاصرہ کیا تو اس شہر کا حاکم تھا۔ اس نے ان کے سردار گوکتاش سے صلح کرکے اس کی بیٹی سے شادی کر لی، لیکن رے کی تسخیر کے بعد غزوں نے دوبارہ حملے شروع کر دیے اور اسے کنکور کے قلعے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ یہ ترک ہمذان میں ۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء میں داخل ہوے۔ جب اس طرح ترک اپنے تعاقب میں ابو کالیجار کو باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو انھوں نے اس پر حملہ کر دیا، لیکن وہ بچ نکلا۔ اس واقعے کے فوراً بعد اس کے باپ علاءالدولہ نے ترکوں پر اچانک حملہ کرکے انھیں شکست دی۔ علاءالدولہ کی وفات کے بعد گرشاسپ نہاوند میں اقامت پذیر ہو گیا۔ فرامرز نے ہمذان فتح کرکے اسے اس شرط پر اپنے بھائی کو بطور جاگیر عطا کر دیا کہ وہاں خطبہ اسی (فرامرز) کے نام کا پڑھا جائے گا۔ ۴۳۴ھ/۱۰۴۲ء میں طغرل بیگ نے ہمذان فتح کر لیا اور گرشاسپ سے مطالبہ کیا کہ کنکور اس کے حوالے کر دے، لیکن اس کے محافظوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ ۴۳۶ھ/۱۰۴۴ء میں گرشاسپ نے ہمذان دوبارہ حاصل کر لیا اور ابو کالیجار بویہی کے باجگزار ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس سے اگلے سال طغرل بیگ نے اپنے بھائی ینّال کو اس شہر پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا جہاں سے وہاں کا فرمانروا فرار ہو کر جوزقان کے کردوں کے ہاں پناہ گزین تھا۔ ینّال نے ۴۳۹ھ/۱۰۴۳ء میں کنکور فتح کر لیا جس کا فرمانروا گرشاسپ کا ایک عامل عقبر بن فارس تھا اور اس نے اپنے لیے ہتیار ڈالنے کی مفید مطلب شرائط منوانے کے لیے یہ ظاہر کر رکھا تھا کہ ابھی اس کے پاس کافی سامان اور رسد موجود ہے۔ اپنے مقبوضات سے محروم ہونے کے بعد گرشاسپ نے ابو کالیجار بویہی کے ہاں پناہ لی۔ ۴۴۱ھ/۱۰۴۹ء میں وہ اصفہان میں موجود تھا جہاں اس نے مودود غزنوی کی تجاویز کو بخوشی منظور کیا جو سلاجقہ کے مقابلے کے لیے مدد کا طالب تھا، لیکن صحرا میں اس کے بہت سے سپاہی ضائع ہو گئے اور خود بیمار پڑ گیا

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

اور اس کی وجہ سے اسے واپس آنا پڑا - ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء میں اھواز کے مقام پر وفات پا گیا .

۴- علی بن فرامرز، اس نے ۴۶۹ھ/۱۰۷۶ء میں سلجوق داؤد کی بیٹی ارسلان خاتون سے شادی کی، جو سلطان ملک شاہ کی پھپی تھی - جب اس نے کرمان میں پناہ لی تو اسے یزد کی جاگیر عطا کر دی گئی (*Rec. de Textes rel. a l'hist. des Seljoucides*، ۱: ۲۶) - وہ ۴۸۸ھ/۱۰۹۰ء میں تُتش کی طرف سے لڑتا ہوا مارا گیا (ابن الاثیر، ۱۰ : ۳۱۲) .

۵- علاءالدولہ ابو کالیجار گرشاسپ بن علی، یزد کا شاہزادہ ہونے کی وجہ سے وہ شاہان سلجوق کے حلقۂ ملازمت میں شامل تھا - اس نے سلطان محمد اور سنجر کی بہن سے شادی کی تھی - اپنی جاگیر سے محروم ہونے کے بعد، جو سلطان محمود نے اپنے ساق قرجہ کو عطا کر دی تھی، علاءالدولہ نے سنجر کے سائے میں پناہ لی - وہ اس جنگ میں شریک تھا جس میں سنجر نے اپنے بھتیجے کو شکست دی تھی (۵۱۳ھ/ ۱۱۱۹ء) - وہ فرزین کے قلعے سے جہاں محمود نے اسے قید کر رکھا تھا، فرار ہو گیا تھا (*Rec. de textes rel. à l'hist. des Seljoucides*، ۲ : ۱۳۳) .

مآخذ : (۱) ابن الاثیر، طبع Tornberg، جلد ۹، ۱۰، بذیل مادۂ دشمنز یار، فرامرز، گرشاسپ، علی بن ابی منصور؛ (۲) *Rec. de textes rel. á l'hist. des Seljoucides*، طبع Houtsma، ۲ : ۱۹، ۲۵، ۵۲، ۱۳۳، ۱۵۱؛ (۳) منجم باشی : تاریخ، طبع ۱۲۸۵ء، ۲ : ۵۰۳ تا ۵۰۴؛ (۴) Edw. G. Browne : *Rare. Ms. history of Isfahân*، در *Journ. Roy. As. Soc.*، ۱۹۰۱ء، ص ۳۳۳؛ (۵) D. Tornberg : *Revue de la numismatique belge*، سلسلۂ سوم، ۲ : (برسلز ۱۸۰۸ء)؛ (۶) H. Sauvaire : وہی کتاب، سلسلۂ سوم، جلد ۶، ۱۸۶۲ء؛ (۷) J. G. Stickel، در *Zeitschr. d. Deutsch. Morg. Gesellsch*، ۱۸ : ۲۹۷ ببعد، ۳۹ : ۷۱؛ (۸) P. Horn، در *Grun-driss der iran. Philologie*، ۲ : ۵۶۵ .

(Cl. Huart)

کالی کٹ : (یا کالی گوڈ = قلعۂ مرغ)، احاطۂ * مدراس (کیرالا) کے ضلع مالا بار میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر واقع ایک بندرگاہ - [۱۹۷۱ء کی مردم شماری کی رو سے باشندوں کی تعداد چار لاکھ کے لگ بھگ ہے جن میں مسلمان خاصی تعداد میں ہیں، جو موپلا [رَک باں] کہلاتے ہیں] - یہ عرب مہاجرین کی اولاد سے ہیں جنھوں نے ہندو عورتوں سے شادیاں کر لی تھیں - زمانۂ قدیم سے کالی کٹ بحری تجارت کا مرکز رہا ہے - یہاں ابن بطوطہ (۱۳۴۵ء) اور عبدالرزاق (۱۴۴۲ء) سیاحت کرتے ہوئے آئے تھے - دونوں ہندو راجہ زمورن کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جس نے ملک میں امن و امان قائم کرکے تجارت کی حفاظت کا سامان کر دیا تھا - راجہ زمورن کے اخلاف ابھی تک زندہ ہیں - کالی کٹ، پہلا ہندوستانی مقام ہے جہاں واسکوڈی گاما ۱۴۹۸ء میں آیا تھا - یہاں چالیس مساجد ہیں - ان میں شیک کندہ پلی کی بھی جامع مسجد ہے، جو شیخ مأمون کویا کے مزار پر تعمیر ہوئی ہے - یہ عرب تھے اور سولھویں صدی عیسوی میں مصر سے آئے تھے - ان کی نیکی و پارسائی کی بڑی شہرت تھی .

موپلوں کے دیوانی مقدمات اور دیگر تنازعات کا تصفیہ بھی اسی جامع مسجد میں ہوتا ہے - کالی کٹ Calicot سے (چھینٹ = چھپا ہوا کپڑا) نکلا ہے - [کالی کٹ کیرالا کے مسلمانوں کا علمی و ثقافتی مرکز ہے - ایک اسلامیہ کالج کے علاوہ عربی کے کئی مدارس ہیں - یہاں سے ناریل، چائے اور قہوہ دساور جاتے ہیں - شہر میں سوتی کپڑا بننے، ناریل کا تیل نکالنے اور صابن بنانے کے کئی کارخانے ہیں] .

مآخذ : (۱) *Madras District Gazetteers*، مالا بار (مدارس ۱۹۰۸ء)؛ (۲) *Encyclopaedia Brit-*

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

tannica، ج ۴ بذیل مادّہ].

(J. S. Cotton و [ادارہ])

* **کامران** : بحیرۂ قلزم میں ایک چھوٹا سا جزیرہ جو تہامہ کے ساحل پر زبید کے مقابل واقع ہے۔ کامران کا مورچہ بند شہر ہمیشہ سے تہامہ کے فرمانرواؤں کے زیر نگین رہا ہے۔ المقدسی کے زمانے میں یہاں شاہ یمن کے جیل خانے تھے اور میٹھے پانی کا ایک چشمہ تھا جسے العقد کہتے تھے۔ یہاں محصول اور چنگیاں وصول کی جاتی تھیں۔

مشہور فقیہ محمد بن عبدوبۃ، جو ابواسحٰق الشیرازی کا شاگرد اور اصول الفقہ کی چند کتابوں کا مصنف تھا، کامران کا باشندہ تھا اور یہیں مدفون بھی ہے۔ جب کبھی طوفان اٹھتا ہے اور جہازوں کے لیے خطرہ نظر آتا ہے تو لوگ اس کی قبر کی مٹی سمندر میں پھینکتے ہیں کیونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ ایسا کرنے سے طوفان ٹل جاتا ہے۔

آج کل کامران حاجیوں کے قرنطینے کا مستقر بن گیا ہے؛ اس موضوع پر دیکھیے Snouck Hurgronje: *Mekka*، ۲: ۲۹۹ حاشیہ ۱؛ وہی مصنف: *Verspreide Geschriften* (بون و لائپزگ ۱۹۲۳ء ببعد)، ۳: ۲۷، ۳۲۔

مآخذ : (۱) المقدسی (طبع de Goeje)، در *BGA*، ۳: ۱۰۳؛ (۲) یاقوت: معجم (طبع Wüstenfeld)، ۳: ۸۰۔

(V. Vacca)

* **کامران شاہ دُرّانی** : افغانستان کے سدوزئی خاندان کا آخری فرمانروا، جس نے ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں اپنے باپ محمود شاہ سے ہرات کی محدود بادشاہت ورثے میں پائی اور اس پر ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء تک حکومت کرتا رہا۔ تیمور شاہ کے بیٹوں، یعنی شہزادگان زمان، شجاع الملک اور محمود کے درمیان جو خانہ جنگیاں ہوئیں ان میں شہزادۂ کامران نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک بہادر سپاہی ہے۔ ۱۲۲۱ھ میں اس نے شجاع الملک سے قندھار چھین لیا، لیکن چند ہی روز بعد یہ اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء میں اس نے ان حوادث میں بڑا نمایاں حصہ لیا جن کے نتیجے کے طور پر درّانی سلطنت کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ اس نے دوست محمد سے اپنی بہن کی توہین کا یہ بدلہ لیا کہ (دوست محمد کے باپ) فتح خان بارک زئی وزیر کی، جس کی بدولت محمود شاہ کو بادشاہت ملی تھی، آنکھیں نکلوا کر اس کا سر قلم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبۂ ہرات کے سوا باقی سارا ملک ہاتھ سے نکل گیا۔ کامران آخر عمر میں عیاش اور آرام طلب ہو گیا لیکن اپنے لائق اور بے باک وزیر یار محمد الکزئی کی کوششوں سے وہ ہرات پر قابض و متصرف رہا۔ اس کے عہد کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۳۷ تا ۱۸۳۹ء میں ایران کے قاجاری بادشاہ نے ہرات کا محاصرہ کیا۔ اس محاصرے کے اہم اسباب میں سے ایک سبب انگلستان اور روس کی باہمی رقابت تھی۔ ایرانیوں کے مشیر کار روسی افسر تھے۔ اس کے برعکس دفاع کا روح و روان ایک نوجوان انگریز افسر لفٹیننٹ ای۔ پوٹنجر (E. Pottinger) تھا۔ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں یار محمد نے، جو ایرانیوں کے ساتھ ملا ہوا تھا، کامران شاہ کو قتل کر دیا اور ہرات پر خود قابض ہو گیا۔ کامران نے ہرات میں اپنے سکّے ضرب کر کے چلائے۔

مآخذ : (۱) Elphinstone: *Caubul*، بار دوم، لنڈن ۱۸۳۹ - ۱۸۴۲ء؛ (۲) Ferrier: *History of the Afghans*، لنڈن ۱۸۵۸ء؛ (۳) Kaye: *History of the War in Afghanistan*، لنڈن ۱۸۴۴ء؛ (۴) Mohan Lal: *Life of Dost Muhammed*، لنڈن ۱۸۴۶ء۔

(M. Longwohth Dames)

* **کامران میرزا** : بابر کا دوسرا بیٹا اور ہمایوں کا سوتیلا بھائی۔ اس کی ماں کا نام گلرخ بیگم تھا۔ ۹۰۱۵ء کے لگ بھگ وہ شہر کابل میں پیدا ہوا، شاعرانہ طبیعت پائی تھی؛ لیکن بے حد ظالم اور بدخصال

www.besturdubooks.wordpress.com

تھا اور ہمیشہ نئی نئی چالیں سوچتا رہتا تھا ۔ اس نے ہمایوں کے خلاف بار بار علم بغاوت بلند کیا ۔ آخر اواخر ۱۵۵۳ء میں سرداروں نے ہمایوں کو مجبور کر دیا کہ وہ کامران کو بصارت سے محروم کرکے اس کی ضرر رسانی سے نجات حاصل کرے ۔ ۱۵۵۴ء میں کامران مکۂ معظمہ چلا گیا اور اکتوبر ۱۵۵۷ء میں اس نے وہیں وفات پائی ۔ اس کے بارے میں سب سے دلچسپ بات اس کی بیوی ماہ چیچک بیگم ارغون کی وفاداری ہے جو سندھ کے فرمانروا شاہ حسن کی بیٹی تھی ۔ ماہ چیچک بیگم نے اپنے باپ کے روکنے کے باوجود شوہر کے ساتھ جہاز پر بیٹھ کر مکۂ معظمہ جانے پر اصرار کیا اور اس کے باپ نے جو اعتراضات کیے تھے ان کے جواب میں یہ کہا کہ آپ نے کامران کے عروج کے دنوں (۱۵۴۶ء) میں مجھے اس کے حوالے کیا تھا ، اب مصیبت کے وقت میں اس کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتی ہوں ۔ اس نے اپنے خاوند کی وفات کے چند ماہ بعد مکۂ معظمہ میں وفات پائی ۔

کامران کو بابر نے قندھار کی حکومت سپرد کی تھی ۔ ہمایوں کے ابتدائے عہد میں وہ پنجاب کا صوبیدار مقرر ہوا ۔ جن دنوں تخت سلطنت خالی تھا اور ہمایوں ترک وطن کرکے ایران گیا ہوا تھا، کامران اور اس کا چھوٹا بھائی عسکری افغانستان پر حکومت کر رہے تھے ۔ کامران نے اپنے پیچھے ایک لڑکا اور تین لڑکیاں چھوڑیں ۔ لڑکے کو جس کا نام ابوالقاسم تھا اور جس نے شاعری اپنے باپ سے ورثے میں پائی تھی، اکبر نے ۱۵۵۷ء میں گوالیار میں قید کر دیا اور چند سال بعد اسے ایک خطرناک حریف سمجھتے ہوئے موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ تینوں لڑکیاں بیاہی گئیں ۔ ان میں سے ایک لڑکی نے جس کا نام گلرخ تھا مردانہ ہمت پائی تھی ۔ اس کی شادی ابراہیم حسین سلطان سے ہوئی اور وہ اور اس کا بیٹا اکبر کے پہلو میں ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے (فرشتہ، طبع سنگی، ص ۲۲۱ و محمد حسین آزاد : دربار اکبری) .

مآخذ : (۱) ابوالفضل : اکبر نامہ ، جلد ۱؛ (۲) محمد حیدر : تاریخ رشیدی انگریزی مترجمۂ N. Elias و E. Denison Ross؛ (۳) جوہر آفتابچی : *Memoirs of the Emperor Humāyūn* ، مترجمۂ Major Stewart (O.T.F. ۱۸۳۲ء) ؛ (۴) توزک بابری ؛ (۵) Erskine : *Memoirs of Baber* ؛ (۶) گلبدن بیگم : ہمایوں نامہ، (*O.T.F.*) لنڈن ۱۹۰۲ء؛ (۷) بدایونی : منتخب التواریخ، ۱ : ۴۵۱ ببعد ؛ (۸) Elliot Dowson ، ۴ : ۴۹۸ ، جلد ۵ و ۶؛ [(۹) کامران : دیوان، مطبوعۂ اعظم گڑھ]؛ مخطوطۂ بانکی پور (*Cat.*، ۲، ۱۴۵، ۲۱۵) میں کامران کے سوانح حیات دیے گئے ہیں .

(H. BEVERIDGE)

کام رُوپ : [بھارت کے صوبۂ آسام کا ایک ضلع، جس کا موجودہ رقبہ ۳۸۰۴ مربع میل اور آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۰۶۲۵۷۲ ہے ۔ ۴۰۰ء کے قریب کامروپ کی ریاست کی حدود بھوٹان سے خلیج بنگالہ تک پھیلی ہوئی تھیں اور پراگ جیوتش پور (موجودہ گوہاٹی) اس کی راجدھانی تھا ۔ ہندوؤں کے تنتری فرقے کا آغاز اسی علاقے سے ہوا ہے]۔ محمد بختیار خلجی اور اس کے بعد بنگالے کے دوسرے حاکموں نے کامروپ کو اسلامی حکومت میں شامل کرنے کے سلسلے میں جو کوششیں کیں وہ یہاں کے گھنے جنگلات اور مرطوب [اور مضر صحت] آب و ہوا کے باعث بار آور نہ ہوئیں ۔ ۱۲۵۶ء میں اختیارالدین یُوزبک طغرل خان نے کامروپ پر حملہ کیا اور اپنی فتوحات کی یادگار میں ایک مسجد بھی یہاں بنائی [لیکن یہاں مستقل حکومت قائم نہ ہو سکی]۔ ۱۶۳۸ء میں کہیں جا کر مسلمانوں کو کام روپ میں قدم جمانے کا موقع نصیب ہوا اور یوں گوہاٹی مسلم حاکموں کا صدر مقام بنا، [لیکن جب شاہجہان کے بیٹوں کے درمیان جنگ تخت نشینی شروع ہوئی (۱۶۵۸ء) اور

www.besturdubooks.wordpress.com

مغل لشکر اس میں حصہ لینے کے لیے یہاں سے نکل گیا تو اہوم راجا نے، جس کی ریاست کامروپ کے پڑوس میں واقع تھی، کامروپ پر قبضہ کرکے پورے علاقے میں لوٹ مار شروع کر دی ۔ عالمگیر [رک بآں] نے زمام حکومت سنبھالنے کے بعد میر جملہ کو بنگالے کا صوبیدار مقرر کیا، جس نے کوچ بہار کو مغلیہ سلطنت میں شامل کرنے کے بعد آسام کی طرف پیش قدمی کی (جنوری ۱۶۶۲ء) ۔ اہوم فوجیں پسپا ہوتے ہوتے برہم پتر کے کنارے تک پہنچ گئیں ۔ ۱۳ مارچ کو ایک بحری لڑائی میں میر جملہ نے دشمن کا بیڑا بھی تباہ و برباد کر دیا اور ۱۷ مارچ کو وہ اس کے صدر مقام گڑھ گاؤں میں داخل ہوگیا، جہاں کثیر مال غنیمت اس کے ہاتھ لگا ۔ راجا اپنے ساتھیوں سمیت پہاڑوں میں جا چھپا، تاہم موسم برسات کا آغاز ہوتے ہی اس نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں اور کئی چوکیوں پر قبضہ کر لیا ۔ اسی دوران میں مغل لشکر میں وبا پھوٹ پڑی، جس سے بہت سے فوجی ہلاک ہوگئے ۔ میر جملہ نے ان مشکلات کا بڑی ہمت اور استقلال سے مقابلہ کیا اور برسات ختم ہونے پر دوبارہ دشمن پر حملہ کر دیا ۔ اہوم راجا اور اس کے امرا نے ایک بار پھر پہاڑوں میں پناہ لی اور بالآخر اس نے بیس ہزار تولے سونا، سوا چار لاکھ تولے چاندی، ۱۱۰ ہاتھی اور حرم شاہی کے لیے اپنی بیٹی پیش کرکے صلح کی درخواست کی ۔ آسام کے یہ علاقے چار سال تک مغلوں کے قبضے میں رہے ۔ ۱۶۶۷ء میں اہوم راجا نے پھر لڑائی چھیڑ دی اور تمام چھنے ہوئے علاقوں کی بازیابی کے علاوہ گوہاٹی پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا ۔ اس کے بعد کامروپ پر دوبارہ مسلمانوں کی حکومت قائم نہ ہو سکی ۔ ۱۸۲۶ء میں یہ علاقہ برطانوی حکومت کی حدود میں شامل ہو گیا [اور اب بھارت کا حصہ ہے] ۔

مآخذ : (۱) H. Blochmann : *Koch Bihár, Koch Háje, and Asám, in the 16th and 17th centuries, according to the Akbarnámah, the Pádisháhnámah, and the Fathiya i, Ibriyah.*، JASB، جلد ۴۱، حصہ ۱ (۱۸۹۲ء)، ص ۲۷۹ ببعد؛ (۲) E.A. Gait : *The Koch Kings of Kamarupa*، در JASB، ۱/۶۲ (۱۸۹۳ء) : ۲۷۹ ببعد؛ (۳) B. C. Allen : *Gazetteer of Kamrup*، الٰہ آباد، ۱۹۰۳ء، ص ۲۷ ببعد؛ [(۴) *Encyclopaodia Britannica*، طبع ۱۹۶۹ء، ۱۳ : ۲۰۱؛ (۵) *The Cambridge History of India*، ۴ (۱۹۶۳ء) : ۲۳۳، ۲۳۶؛ (۶) Majumdar : *An Advanced History of India*، بمدد اشاریہ؛ (۷) سید ہاشمی فرید آبادی : تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، مطبوعۂ کراچی، ۱ : ۵۵۴ ببعد] .

(ا آ، لائیڈن، بار اول [و ادارہ])

کامل : عربی علم عروض کی پانچویں بحر، * سالم بحر کے ہر مصرع میں مُتَفَاعِلُنْ تین بار ہوتا ہے ۔ اس کے تین عروض اور نو ضربیں ہیں :

پہلا عروض مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ

ضربیں :
مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ
مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ
مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ
مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلْ
مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ
مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَا

دوسرا عروض مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَا

ضربیں :
مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَا
مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَا
مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَا
مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَا

تیسرا عروض مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلَاتُنْ

ضربیں :
مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلَانْ
مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ
مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلْ

مُتَفَا اور مُتَفَا کے علاوہ تمام ارکان میں دوسرے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

حرف کی حرکت کو متفاعلن میں ساکن کیا جا سکتا ہے (مُتَفَاعِلُنْ) یا دوسرا حرف صحیح مع حرکت کے گرا دیا جا سکتا ہے ۔ (مَفَاعِلُنْ) یا مُتَفَاعِلُنْ میں دوسری حرکت صحیح کے ساتھ والا حرف مد گرا دیا جا سکتا ہے (مُتَفْعِلُنْ) لیکن یہ بہت ہی شاذ و نادر ہے ۔

ان زحافات کے نتیجے کے طور پر مُتَفَاعِلُنْ کا رکن مُتَفَاعِلُنْ (= پر غلط ہے) (مُسْتَفْعِلُنْ ہونا چاہیے ؟) مَفَاعِلُنْ (= مُتَفَاعِلُنْ)، مُتْفَعِلُنْ (= مُفْتَعِلُنْ) بن جائے گا ایسا کرنے سے (یعنی مُتَفَاعِلُنْ کی تا کو اضمار سے ساکن کر دینے سے) اگر تمام قصیدے کے اندر کہیں بھی سالم مُتَفَاعِلُنْ نہ آئے تو پھر بحر رجز بن جائے گی ۔

(MOH. BEN CHENEB)

⊛ **تعلیقہ :** علم عروض کی بحر کامل بھی وافر کی طرح عربی سے مخصوص کی جاتی ہے اور وافر ہی کے ارکان کے اجزا کو مقدم مؤخر کرکے مستخرج ہوتی ہے، یعنی مَفَاعِلَتُنْ کو عِلَتُنْ مَفَا بنا کے مُتَفَاعِلُنْ سے بدل لیتے ہیں، لیکن یہ فارسی اور اردو میں بھی رائج ہے اور اس کے بعض اوزان فارسی اور اردو میں بہت دلپذیر اور مقبول عام ہیں ۔

اس کے عروض : (۱) مُتَفَاعِلُنْ (سالم)، (۲) مُتْفَاعِلُنْ = مُسْتَفْعِلُنْ (مضمر)؛ (۳) مُتْفَاعِلُتْنْ = مُسْتَفْعِلَاتُنْ (مضمر مرفّل)؛ (۴) مُتَفَا = فَعِلُنْ (احذ)؛ (۵) مُتَاعِلُنْ = مَفَاعِلُنْ (موقوص)؛ (۶) مُتْفَعِلُنْ = مُفْتَعِلُنْ (مخزول) چھے قسم کے آئے ہیں ۔

اس کی ضربیں : (۱) مُتَفَاعِلُنْ (سالم) (۲) مُتْفَاعِلُنْ = مُسْتَفْعِلُنْ (مضمر ؛ (۳) مُتْفَاعِلُتْنْ = مُتَفَاعِلَاتُنْ (مرفّل)؛ (۴) مُتَفَاعِلَانْ (مذال)؛ (۵) مُتَفَالُنْ = فَعِلَاتُنْ (مقطوع)؛ (۶) مُتَفَا = فَعِلُنْ (احذ)؛ (۷) مُتْفَعِلُنْ = مُفْتَعِلُنْ (مخزول) ؛ (۸) مُتْفَاعِلُتْنْ = مُسْتَفْعِلَاتُنْ (مضمر مرفّل)؛ (۹) مُتْفَاعِلَانْ = مُسْتَفْعِلَانْ (مضمر مذال)؛ (۱۰) مُتْفَا = فَعِلُنْ (مضمر احذ)؛ (۱۱) مُتَاعِلُنْ = مَفَاعِلُنْ (موقوص)؛ (۱۲) مُتْفَعِلَاتُنْ = مُفْتَعِلَاتُنْ (مخزول مرفّل) ؛ (۱۳) مَفَاعِلُتْنْ = مَفَاعِلَاتُنْ (مرفّل موقوص)؛ (۱۴) مُتَفَالُنْ = مَفْعُولُنْ (مضمر مقطوع)؛ (۱۵) مُتْفَعِلَانْ = مُفْتَعِلَانْ (مخزول مذال) ؛ (۱۶) مُتَاعِلَانْ = مَفَاعِلَانْ (موقوص مذال) سولہ قسم کی آئی ہیں ۔

عربی میں بحر کامل مسدس الاصل ہے ۔ اسے وافی و مجزو دو طریقوں سے استعمال کیا گیا ہے ۔ دونوں کو ملا کر چوبیس وزن آئے ہیں ۔

وافی : (۱) مسدس، سالم ۔ مُتَفَاعِلُنْ چھے بار؛ (۲) مسدس، صرف ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ فَعِلَاتُنْ؛ (۳) مسدس، صرف ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ فَعْلُنْ ۔ بسکون عین ؛ (۴) مسدس، عروض و ضرب احذ، باقی ارکان سالم ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ فَعِلُنْ ۔ بحرکت عین ۔ دو بار ؛ (۵) مسدس، عروض احذ، ضرب احذ مضمر باقی ارکان سالم ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ فَعِلُنْ ۔ بحرکت عین ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ فَعِلُنْ ۔ بسکون عین؛ (۶) مسدس، صرف ضرب احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ فَعِلُنْ ۔ بحرکت عین؛ (۷) مسدس، سب ارکان مضمر مُسْتَفْعِلُنْ چھے بار؛ (۸) مسدس، سب ارکان موقوص ۔ مَفَاعِلُنْ چھے بار اس وزن کو ہزج مقبوض شمار کرنا اولی ہے، اس لیے کہ ہزج میں صرف ایک عمل سے یہ وزن حاصل ہو جاتا ہے اور کامل میں تین مرتبہ عمل کرنا پڑتا ہے ؛ (۹) مسدس، سب ارکان مخزول ۔ مُفْتَعِلُنْ چھے بار ؛ (۱۰) مسدس، ابتدا مضمر، ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ ۔ مُسْتَفْعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ ۔ مَفْعُولُنْ ؛ (۱۱) مسدس ، عروض و ضرب مضمر مرفّل باقی ارکان مضمر ۔ مُسْتَفْعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ مُسْتَفْعِلَاتُنْ ۔ دوبار؛ (۱۲) مسدس، صدر، ابتدا و حشو دوم مضمر، ضرب مذال باقی ارکان سالم ۔ مُسْتَفْعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ مُتَفَاعِلُنْ ۔ مُسْتَفْعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ مُتَفَاعِلَانْ ؛ (۱۳) پانچ ارکان کا پورا شعر ۔ پہلا، دوسرا سالم ، تیسرا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

چوتھا مضمر اور پانچواں رکن احذ مضمر ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ فَعْلُنْ ۔ بسکون عین ۔ یہ تیرھواں وزن پانچ رکن کا معقّد آیا ہے اور وافی ہی میں شامل ہے ۔

مجزو : (۱) مربع ، صرف ضرب مرفّل باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلاتُنْ؛ (۲) مربع، صرف ضرب مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلان؛ (۳) مربع، سالم، مُتَفاعِلُنْ چار بار؛ (۴) مربع، صرف ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ فَعِلاتُنْ؛ (۵) مربع، صرف ضرب مضمر مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ مَفْعُولُنْ؛ (۶) مربع، صرف ضرب مرفّل مضمر باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ مُسْتَفْعِلاتُنْ؛ (۷) مربع، صرف ضرب مضمر مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ مُسْتَفْعِلان؛ (۸) مربع، صرف ضرب موقوص مرفّل باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ ۔ مَفاعِلاتن؛ (۹) مربع، صرف ضرب مخزول مرفّل باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ مُفْتَعِلاتُنْ؛ (۱۰) مربع، صرف ضرب موقوص مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ مَفاعِلان؛ (۱۱) مربع، صرف ضرب مخزول مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ مُفْتَعِلان؛ یہاں تک عربی کے چوبیس اوزان ختم ہو گئے ۔

فارسی اور اردو میں یہ بحر از روے اصل دائرہ مثمن ہے ۔ وافی کے نو، مجزو کے تیرہ اور مشطور کے دس کل بتّیس اوزان رائج ہیں ۔

وافی : مثمن سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ آٹھ بار؛ (۲) مثمن، عروض و ضرب مذال باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلان ۔ دو بار؛ (۳) مثمن، بے در بے ایک رکن سالم ایک مضمر ۔ مُتَفاعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ ۔ دو بار؛ (۴) مثمن، عروض و ضرب مذال، صدر و ابتدا مضمر ، دونوں مصرعوں کے پہلے حشو سالم دوسرے مضمر ۔ مُسْتَفْعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ دو بار؛ (۵) مثمن، ہر رکن موقوص ۔ مَفاعِلُنْ آٹھ بار ۔ ہمارے نزدیک اس وزن کو ہزج مقبوض شمار کرنا اولیٰ ہے، اس لیے کہ ہزج میں صرف ایک عمل سے یہ وزن حاصل ہو جاتا ہے اور کامل میں تین بار عمل کرنا پڑتا ہے؛ (۶) مثمن، ترتیب وار ایک رکن سالم ایک موقوص ۔ مُتَفاعِلُنْ مَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مَفاعِلُنْ ۔ دو بار؛ (۷) مثمن، عروض و ضرب موقوص مذال باقی ترتیب وار ایک رکن سالم ایک موقوص ۔ مُتَفاعِلُنْ مَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مَفاعِلان ۔ دو بار؛ (۸) مثمن، صدر سے ضرب تک ایک رکن سالم ایک مخزول ۔ مُتَفاعِلُنْ مُفْتَعِلُنْ چار بار؛ مثمن، عروض و ضرب مضمر مقطوع، حشو اول و سوم مخزول مسکن باقی ارکان سالم ، مُتَفاعِلُنْ مُفْعُولُنْ مُتَفاعِلُنْ مُفْعُولُنْ ۔ دو بار.

مَجْزُو : (۱) مسدس، ہر رکن سالم، مُتَفاعِلُنْ چھے بار؛ (۲) مسدس ، عروض و ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ فَعِلاتُنْ ۔ دو بار؛ (۳) مسدس، عروض و ضرب سالم، دونوں حشو موقوص، صدر و ابتدا مضمر ۔ مُسْتَفْعِلُنْ مَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ دو بار؛ (۴) مسدس، عروض و ضرب مضمر مذال، دونوں حشو مضمر باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُسْتَفْعِلُنْ مُسْتَفْعِلان ۔ دو بار؛ (۵) مسدس، صرف ضرب مقطوع باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ فعلاتن؛ (۶) مسدس، عروض و ضرب مضمر مقطوع ، دونوں حشو موقوص باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مَفاعِلُنْ مَفْعُولُنْ ۔ دو بار؛ (۷) مسدس، صرف ضرب احذ باقی سب ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ فَعِلن ۔ بحرکت عین؛ (۸) مسدس، صرف ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ فَعْلُنْ ۔ بسکون عین ؛ (۹) مسدس ، عروض مقطوع ، ضرب احذ باقی ارکان سالم ۔ مُتَناعِلُنْ مُتَناعِلُنْ فَعِلاتُنْ ۔ مُتَفاعِلُنْ مُتَفاعِلُنْ فَعِلُنْ ۔ بحرکت عین؛

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

(۱۰) مسدس، عروض مقطوع، ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلاتُن - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعْلُن - بسکون عین؛ (۱۱) مسدس، عروض و ضرب احذ باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلُن - بحرکت عین دو بار؛ (۱۲) مسدس، عروض احذ، ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعِلُن - بحرکت عین - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعْلُن - بسکون عین؛ (۱۳) مسدس، عروض و ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن فَعْلُن - بسکون عین - دو بار.

مَشْطُور: (۱) مربع، هر رکن سالم - مُتَفاعِلُن چار بار؛ (۲) مربع، عروض و ضرب مُرفّل باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلاتُن - دو بار؛ (۳) مربع، عروض و ضرب احذ باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن فَعِلُن - بحرکت عین - دو بار؛ (۴) مربع، صرف ضرب مرفّل باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن - مُتَفاعِلن مُتَفاعِلاتُن؛ (۵) مربع، صرف ضرب مذال باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلان؛ (۶) مربع، عروض مذال، ضرب مرفل باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلان - مُتَفاعِلُن - مُتَفاعِلاتُن؛ (۷) مربع عروض و ضرب مذال باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلان - دو بار؛ (۸) مربع، صرف ضرب مقطوع باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن - مُتَفاعِلُن فَعِلاتُن؛ (۹) مربع، عروض و ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن فَعْلُن - بسکون عین - دو بار؛ (۱۰) مربع، عروض احذ، ضرب مضمر احذ باقی ارکان سالم - مُتَفاعِلُن فَعِلُن - بحرکت عین - مُتَفاعِلُن فَعْلُن - بسکون عین.

مآخذ: (۱) السّکاکی: مفتاح العلوم؛ (۲) محقق طوسی: معیار الاشعار؛ (۳) مظفر علی اسیر: زر کامل العیار؛ (۴) مرزا محمد جعفر اوج: مقیاس الاشعار؛ (۵) مظفر علی اسیر: شجرة العروض؛ (۶) قدر بلگرامی: قواعد العروض؛ (۷) میزان الافکار شرح معیار الاشعار؛ (۷) میر شمس الدین فقیر: حدائق البلاغت؛ (۸) صہبائی: معیار البلاغت؛ (۹) فان دک: محیط الدائرہ.

(مرزا ہادی علی بیگ)

الکامل: رک بہ الملک الکامل. *

کانسُو: [یا کَنسُو؛ عوامی جمہوریۂ چین کا * ایک صوبہ، جس کے شمال میں چینی منگولیا، جنوب میں چن گھائی اور سزچُوان، مشرق میں نِنگسیَہ ہُوی اور شِنسی اور مغرب میں سن کیانگ، اویغور کے صوبے واقع ہیں - سن کیانگ یا چینی ترکستان کا علاقہ پہلے کانسو ہی میں شامل تھا، لیکن ۱۸۸۴ء میں اسے علٰحدہ کر دیا گیا - صوبۂ کانسو کا رقبہ ۳۶۵۰۰ مربع میل اور آبادی ایک کروڑ تیس لاکھ (۱۹۷۱ء میں) ہے] - یہ صوبہ سب سے پہلے شہنشاہ قبلای کے عہد میں ۱۲۸۲ء میں قائم ہوا تھا - کہا جاتا ہے کہ اس کا نام انتہائی شمال مغربی علاقے کے دو شہروں کانچوفو Kaučou-fu اور سچاؤ Sučou پر رکھا گیا تھا - ان دونوں شہروں کا ذکر حدود العالم اور گردیزی (قب Barthold: *Otčet o poiezdke v Irednyuyn Aziyu*، ص ۹۲) میں پہلے ہی آ چکا ہے، اوّل الذکر کا بشکل خامچو Khamčū (مغلوں کے عہد میں قَمْچُو Kamčū یا قَمْچی Kamči) اور ثانی الذکر کا بشکل سَخْچو Sakhčū (بعد ازاں شُکْچُو Shukčū یا سُوکچی Sūkči).

تیرھویں صدی عیسوی تک اس علاقے پر ترک (اویغور Uigur) یا تبتی (تنگوت Tangut) نسل کے غیر ملکیوں کی حکومت رہی - مغلوں کی فتح سے فوراً پہلے یہاں ایک تنگوت [تنگ قُوت] سلطنت قائم تھی، جس پر ہیا Hia یا سی ہیا Si-hia خاندان (۱۰۳۲ تا ۱۲۲۷ء) حکمران تھا اور اس کا دارالحکومت نِنگ ہیا Ning-hia تھا - رشیدالدین (طبع Blochet، ص ۴۸۴ ببعد) نے بارہ صوبوں (شینک shînk، چینی: شِن shin) کی جو فہرست دی ہے اس میں دو صوبوں کو، جن کے صدر مقام علی الترتیب کین

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

چان فو Kinčanfū (موجودہ سیان فو Sian-fū، شنسی کا دارالحکومت) اور قمچو Kamčū (کانچو Kančou) تھے، تنگوت (تنگ قوت) کی سلطنت میں شمار کیا ہے۔ در حقیقت قمچو Kamču اس زمانے میں کانسو کا صدر مقام تھا۔ کانسو اور شنسی دونوں ایک ہی حاکم کے ماتحت تھے، لیکن یہ حاکم کانسو کے نہیں بلکہ شنسی کے صدر مقام میں رہا کرتا تھا۔ کانسو اور شنسی کے درمیان دریاے ہوانگ ہو Hoang-ho حد فاصل کا کام دیتا تھا، چنانچہ کانسو کا موجودہ صدر مقام لن‌چاؤ فو Lanchou-fu اس زمانے میں شنسی میں شامل تھا۔ کِین چان فو Kinčainfū کے ضمن میں مارکوپولو (طبع Yule و Cordier، ۲ : ۲۴) نے منگلای Mangalai (م ۱۲۸۰ء، جسے رشیدالدین نے مینگ قالا Mingkāla لکھا ہے) کا ذکر کیا ہے کہ وہ قبلای Kūbilai کا تیسرا بیٹا اور تنگوت کا حکمران تھا۔ اس کے برخلاف رشیدالدین (ص ۴۹۵ ببعد) کے نزدیک اس مرتبے پر اس کا بیٹا اننده Ananda فائز تھا۔ رشید الدین لکھتا ہے کہ اس علاقے میں اسلام کے غلبے کا باعث اننده تھا۔ وہ ۱۲۷۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا (آٹھویں / چودھویں صدی کے اوائل میں اس کی عمر تیس سال تھی، وہی کتاب ص، ۳۶۰، س ۶) اور اس نے اپنے مسلمان رضاعی والدین کے ہاں پرورش پائی تھی۔ اس نے اپنے اسلام لانے کا کھلم کھلا اعلان اس وقت کیا جب ایران میں سلطان غازان مسلمان ہوگیا (یعنی تقریباً ۱۲۹۵ء میں؛ [رک بہ غازان]؛ نیز دیکھیے رشید الدین، ص ۶۰۲)۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی فوج ڈیڑھ لاکھ افراد پر مشتمل تھی اور ان میں سے اکثر نے اسلام قبول کر لیا تھا (کتاب مذکورہ، ص ۶۰۰)۔ اسی طرح کسانوں کو چھوڑ کر تنگوت کے باقی باشندے بھی مسلمان ہو گئے (وہی کتاب، ص ۵۹۹)۔ اس کے چچا زاد بھائی اور قبلای کے جانشین تیمور (۱۲۹۴ تا ۱۳۰۷ء) نے اس تبدیلی مذہب پر اس سے مؤاخذہ کیا، لیکن اننده بدستور اسلام پر قائم رہا اور کچھ مدت تک معطل رہنے کے بعد پھر اپنے مقبوضات پر بحال کر دیا گیا۔ ۱۳۰۷ء میں ایک گروہ نے اسے تخت نشیں کرنے کی کوشش کی؛ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ایک اور مدعی سلطنت، یعنی تیمور کا بھتیجا خَیْشان (۱۳۰۷ تا ۱۳۱۱ء) تخت نشین ہو گیا تو اننده کو قتل کر دیا گیا (d'Ohsson: *Histoire des Mongols*، ۲ : ۵۲۵ ببعد) کہیں ۱۳۲۳ء میں اننده کے بیٹے اورک تیمور کو تنگوت کا حاکم بنایا گیا (Blochet، در رشید الدین، ص ۳۶۲، حاشیہ c)۔

جیسا کہ مارکوپولو (طبع Yule و Cordier، ۱ : ۲۰۳، ۲۱۹) نے لکھا ہے، اننده سے پہلے بھی کانسو میں مسلمان موجود تھے۔ دوسری طرف وہ ہوانگ ہو کے جنوب میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کوئی ذکر نہیں کرتا (لاؔ، انگریزی، مادۂ چین، ۱ : ۸۵۱، میں غلطی سے *Mission d'Ollone*، ص ۴۳۵، کی پیروی کرتے ہوے مارکوپولو سے یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ صرف صوبۂ یُنّان Yünan ہی میں مسلمان موجود ہیں)۔ کہا جاتا ہے کہ ترکی بولنے والے سَلَر Salar جو آج کل ہوانگ ہو کے جنوبی کنارے پر آباد ہیں، منگ خاندان کے عہد (۱۳۶۸ تا ۱۶۴۴ء) ہی سے وہاں رہتے چلے آ رہے ہیں اور ان کو سرکش رعایا بتایا گیا ہے (W. W. Rockhill: *The Land of the Lamas*، لنڈن ۱۸۹۱ء، ص ۴۰)، اگرچہ اس زمانے میں مسلمانوں کی کسی بغاوت کا ذکر نہیں ملتا۔ ۱۳۹۸ء کے قریب تیمور کی سر زمین تک یہ قصہ پہنچا کہ منگ خاندان کے بانی نے تقریباً ایک لاکھ مسلمان قتل کر ڈالے اور اپنی سلطنت سے اسلام کا نام و نشان مٹا ڈالا ہے (نظام الدین شامی و عبدالرزاق سمرقندی، در Barthold: *Uluglek*، پیٹروگراڈ ۱۹۱۸ء، ص ۴۲ ببعد، حاشیہ ۶)، لیکن اس کی تصدیق چینی مآخذ سے نہیں ہوتی۔ ہاں مانچو عہد (از ۱۶۴۴ء)

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

میں کانسو کے مسلمانوں کی بغاوتوں کا ذکر ملتا ہے، جو ۱۶۴۶ء میں رونما ہوئیں اور پھر اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں کئی بار ان کا اعادہ ہوا۔

زمانۂ حال میں جتنے مسلمان کانسو میں ہیں اتنے یقیناً دوسرے صوبوں میں نہیں ہیں (ان کی تعداد کے اندازے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے)۔ اب سے کچھ پہلے تک اسلامی تہذیب و تمدن اور سرگرمیوں کا اہم ترین مرکز اِلوچاؤ Iločou (دارالحکومت لِن‌چاؤفو کے جنوب مغرب میں) تھا، جسے "چینی مکہ" کہتے تھے۔ اس سے پہلے بھی اِلوچاؤ کو خاص اسلامی شہر سمجھا جاتا تھا، (آبادی تقریباً ۳۰۰۰۰)؛ ۱۸۸۴ء میں سیاح G. Potanin (*Tangustko-Tibetskaya Okraine Kitaya*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۳ء، ۱ : ۱۶۹) کو بتایا گیا تھا کہ اب وہاں ایک مسلمان بھی باقی نہیں۔ آگے چل کر مسلمانوں کو فقط اتنی اجازت تھی کہ وہ وہاں علٰحدہ بیرونی بستیاں بنا کر رہیں (*Mission d'Ollone*، ص ۲۳۵)۔ کانسو میں مسلمانوں کا علاقہ دو علٰحدہ علٰحدہ حصوں میں منقسم ہے، یعنی جنوب مغرب میں اِلوچاؤ سِنِنگ Iločou-Sining اور شمال مشرق میں نِنگھیہ کِنت سِپئو Ninghia-Kintsip'u؛ درمیانی علاقے میں چینیوں نے پہاڑی قلعے تعمیر کر لیے ہیں (کتاب مذکور، ص ۲۵۳)۔ کِنت سِپئو کو، جسے بعض اوقات "چینی مدینہ" کہا گیا ہے، سب سے پہلے مشہور مصلح دین اور ایک بغاوت کے قائد ماھُوا لُنگ Ma Hua-Lung نے بسایا تھا۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں بھی کانسو کی بہ‌نسبت شِنسی میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے (Dabry de Thiersant : *Le Mhométisme en Chine*، ۱ : ۱۴۱، ۱۵۶)۔ ان کی زبان اور لباس بھی چینیوں سے مختلف تھا (کتاب مذکور، ص ۱۵۵)۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ عصر حاضر کے دُنگن Dungans یا تُنگن Tungans نے اس زمانے کے کہیں بعد چینی زبان اختیار کی ہوگی۔

یہاں کی بغاوتیں مقامی نوعیت کی تھیں اور انھیں اسلام کے جھنڈے تلے عام بغاوت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کانسو کی بڑی بغاوت میں، جو ۱۸۷۱ء میں شروع ہوئی تھی، شنسی میں مکمل امن و امان رہا (Dabry کتاب مذکور، ۱ : ۱۵۹)۔ شنسی میں جس بغاوت کا آغاز ۱۸۶۱ یا ۱۸۶۲ء میں ہوا تھا وہ کانسو میں اس وقت جا کر پھیلی جب شنسی سے نکالے ہوئے باغی وہاں پہنچے۔ کانسو میں شنسی سے کہیں زیادہ شدت سے یہ جنگ جاری رہی، جس کا وہاں کے مسلمان باشندوں پر، نیز صوبے کی عام معاشی خوشحالی پر تباہ کن اثر پڑا۔ جس طرح اس سے کچھ پہلے شنسی سے کانسو میں باغیوں کے اخراج کی وجہ سے شنسی کے مسلمانوں کی تعداد میں خاصی کمی ہو گئی تھی، اسی طرح اب (از ۱۸۷۲ء) کانسو سے بہت سے مسلمان اپنے دلیر رہنما بوَیان اَخُون Boyan-akhūn کے زیر قیادت مغرب کی جانب ترک وطن کر گئے۔ بویان اخون (اسے چینی میں بویان ہو Bo-yan-ho یا پای ین ہو Pai-yen-ho بھی لکھا جاتا ہے؛ اس (اسلامی نام محمد ایوب تھا) کی جائے ولادت کے متعلق مختلف بیانات ملتے ہیں۔ وہ مدت تک پیکنگ میں رہ چکا تھا اور بغاوت سے کچھ ہی دن پہلے کانسو میں آیا تھا۔ دسمبر ۱۸۷۷ء میں بویان اخون اپنی باقی ماندہ فوج کے ساتھ روسی سرحد عبور کر کے سِمِرہ چیہ Semirečye میں داخل ہو گیا۔ چینی حکام نے مطالبہ کیا (جو ظاہر بات ہے کہ منظور نہیں ہوا) کہ اسے ان کے حوالے کر دیا جائے۔ ۱۸۸۳ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد سِمِرہ چیہ میں مقیم دنگنوں نے اسے بطل قوم کی حیثیت دے دی اور اس کی شان میں گیت لکھے گئے۔ اس امر کا پتا نہیں چل سکا کہ کانسو میں بھی اس کی یاد احترام و عقیدت کے ساتھ منائی جاتی ہے یا نہیں۔ آخری بغاوت کا آغاز (۱۸۹۵-۱۸۹۶ء) سُلَر نے کیا اور کہا جاتا ہے کہ اس کا باعث ان کے حاکم کا

www.besturdubooks.wordpress.com

ایک فرمان تھا، جس کی رو سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ آئندہ ایک چینی قدر و قیمت کے لحاظ سے دس مسلمانوں کے برابر سمجھا جائے۔ موجودہ جمہوری حکومت کے خلاف کانسو میں کسی قسم کی تحریک نظر نہیں آتی۔

[چین کے مسلمانوں کی مجموعی آبادی بدرالدین (چینی مسلمان) کی رائے کے مطابق کروڑوں تک پہنچی ہے، لیکن مصدقہ اطلاعات میسر نہیں۔ بہرحال ۱۹۵۵ء میں ایک کروڑ کے قریب بتائی گئی تھی اور ان میں ہوی، اویغور، قازق، خَلْخَہ، تاجیک، تاتاری، لاریک، چنگ سیانگ، سَلَس اور پاوآن شامل تھے۔ زیادہ تر مسلمان چین کے شمال مغرب میں سنکیانگ، کانسو اور چنگ ہای کے صوبوں میں پائے جاتے ہیں، لیکن ہوی، چین کے اور حصوں میں بھی موجود ہیں۔ جمہوریۂ چین کے قیام (۱۹۴۹ء) کے بعد سے مسلمانوں پر سے پابندیوں کو ختم کرکے انھیں دوسرے چینیوں کے مساوی حقوق مل گئے ہیں اور انھیں شخصی قانون کی حد تک مذہبی آزادی حاصل ہے۔ چین میں مسجدیں موجود ہیں اور ان میں سے اکثر کے ساتھ مذہبی تعلیم کے مدارس بھی ہیں۔ کانسو کے صوبے میں لینسیا Linsia کی جامع مسجد میں عیدالفطر کے موقع پر بیس ہزار سے زائد لوگوں نے نماز ادا کی (دیکھیے مرقع تصاویر، المسلمون فی الصین، مطبوعۂ حکومت چین ۱۹۵۵ء)۔ مزید تفصیلات کے لیے رک بہ الصین].

مآخذ: (۱) P. Darby de Thiersant: *Le Mohamétisme en Chine*، ۲ جلد، پیرس ۱۸۷۸ء؛ (۲) وہی مصنف: *De l'insurrection mohametane dans la Chine occidentale*، در *Journ. As.*، ۱۸۷۴ء، سلسلۂ ہفتم، ۳: ۱۷ تا ۴۵؛ (۳) بغاوت ۱۸۷۱ء کے متعلق ایک معاصر کا بیان، در *Mémoires concernants les Chinois*، ۹: ۳۲۲ ببعد؛ (۴) W. Wassiljew: *Der Mohammedanismus in China*، جرمن ترجمہ: *Der Erschliessung Chinas*، از Dr. R. Hübe، مع اضافات از A. Conrady، لائپزگ ۱۹۰۹ء، ص ۸۰ تا ۱۱۰، ۲۲۰ تا ۲۳۶؛ (۵) *Mission d'Ollone 1906-1909*، پیرس ۱۹۱۱ء اور اس میں مندرج تصنیفات، نیز اس تصنیف کے بارے میں روسی رسالوں میں شائع شدہ مضامین، خصوصاً (۶) F. Payarkow: *Postliedniy epizod dunganskago vozstaniya (Pamyatnaya Kinizku Semir. Ohlasti) na 1901 god*، نیز علٰحدہ شکل میں، ۷۵ صفحات)؛ جو زیادہ تر دنگنی مآخذ سے لیا گیا ہے اور اس میں ایک دستاویز بھی شامل ہے (ایک مختصر سی روداد، جو مصنف کی درخواست پر دنگن طبیب لکوکنی Likokni نے لکھی اور جس کا M. Stashkow نے روسی میں ترجمہ کیا)؛ سَلَر اور ان کی زبان (فہرست الفاظ) کے بارے میں (۷) P. Potanin: *Tangutsko-Tibetskaya okraina Kitaya*، سینٹ پیٹرز برگ، ۱۸۹۳ء، ۱: ۱۶۹ ببعد، ۲: ۴۲۶ تا ۴۳۴؛ (۸) F. Poyarkon، در V. Ladigin: *Salari*، در *Etnograf. Obozrieniye*، ۱۸۹۳ء، شمارہ ۱، ص ۱ تا ۴۳۔

(W. BARTHOLD)

کانگو: افریقہ کے ایک ملک اور ایک دریا کا نام۔ دریا وسطی افریقہ کے عظیم طاس کے پانی کا تنہا نکاس ہے۔ یہ طاس مشرق میں "جوف عظیم" (The Great Rift) کے مغربی کناروں، شمال میں کوہستان مونگا Monga، مغرب میں کرسٹل Cristal کے سلسلۂ کوہ اور جنوب میں سطح مرتفع لنڈا Lunda سے گھرا ہوا ہے۔ چونکہ اس دریا کے معاون، خط استوا کے شمالی اور جنوبی دونوں حصوں کا پانی اس میں لا کر ڈالتے ہیں، اس لیے دوسرے دریاؤں کے مقابلے میں یہ متواتر جاری رہتا ہے۔ اس دریا کے راستے میں جا بجا آبشار واقع ہیں، خصوصاً اس علاقے میں جو سٹینلے پول Stanley Pool اور سمندر کے درمیان واقع ہیں؛ لیکن اس کے باوجود دریا میں اس طرح کے طویل ٹکڑے موجود ہیں جن میں جہاز آسانی سے چل سکتا ہے اور

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

یوں ایک قطعی ناقابل عبور جنگلی علاقے میں آدمیوں اور سامان تجارت کی تھوڑی بہت نقل و حرکت ممکن رہی ہے ۔ ان گھنے جنگلوں کے اندرونی علاقوں میں افریقہ کے قدیم ترین باشندے، جو "بونے" (Pygmies) ہیں، اب بھی اپنے مخصوص اور امتیازی انداز میں شکار کھیل کر اور درختوں کے پھل کھا کر زندگی بسر کرتے ہیں ۔ دریاؤں کے کناروں پر یا دریاؤں کے قریب کے علاقوں میں اور آج کل زیادہ تعداد میں ان سڑکوں کے کنارے جو جنگلی علاقوں کو قطع کرکے بنائی جا رہی ہیں، وہ حبشی قبیلے آباد ہیں جن میں سے اکثر "بنتو" زبانیں بولتے ہیں ۔ یہ لوگ آہنی آلات استعمال کرتے ہیں اور تھوڑی بہت زراعت کرنے کے علاوہ شکار کرکے اور مچھلیاں پکڑ کر بسر اوقات کرتے ہیں ۔ یہ جنگلی قبیلے "بنتو" نسل کے لوگوں میں سب سے زیادہ پس ماندہ ہیں اور اس کی وجہ بلاشبہہ یہ ہے کہ کسی کا ان تک پہنچنا بہت دشوار ہے ۔

لیکن کانگو کی وادی کے صرف درمیانی حصے میں گھنے جنگل ہیں ۔ اس کے آس پاس کے مرتفع گھیرے کو "نباتاتی جھاڑیوں" (Ochard Bush) کا علاقہ کہتے ہیں اور اس میں جھاڑیوں کو کاٹ چھانٹ اور جلا کر غلے کی کاشت کی جا سکتی ہے ۔ مشرق اور مغرب کی طرف گھاس کے وسیع میدان ہیں، جہاں مویشی پالے جا سکتے ہیں ۔ گرد و پیش کے ان علاقوں پر ہجرت اور فتح کے اثرات کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مقامی باشندوں نے انھیں علاقوں میں سیاسی جماعتیں قائم کر لی ہیں ۔ نیل اور کانگو کے پن دھارے میں واقع جنگل کے شمال میں Zande کی متعدد ریاستوں کا وجود سترھویں صدی ہجری اور اٹھارھویں صدی عیسوی کی اس نو آبادکاری اور فتوحات کا نتیجہ ہے جن کا آغاز سوڈان کے جنوبی کناروں کی طرف سے ہوا تھا ۔ جنگل کے مشرقی جانب، مغربی وادی کی سطح مرتفع میں رواندا Ruanda اوروندی Urunde کی حکومتیں اور ان کی متعلقہ ریاستیں ان فاتحین کی یادگار ہیں، جو سوڈان یا جنوب مغربی حبش کی طرف سے یہاں آئے تھے اور جن کی چودھویں یا پندرھویں صدی عیسوی میں اس علاقے میں موجودگی کی شہادتیں ملی ہیں ۔ جنگل کی مغربی جانب، ہلکی جھاڑیوں کی سطح مرتفع اور گھاس کے اس کھلے میدان میں جو کانگو کی وادی کو اطلانتک کی ساحلی سطح مرتفع سے جدا کرتا ہے، بکانگو کی بہت بڑی حکومت بھی ان تھوڑے سے مہاجروں نے قائم کی جو شاید جھیل چاڈ Chad کی طرف سے یہاں آئے تھے ۔ اس حکومت سے پرتگالیوں نے پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں تعلقات قائم کر لیے اور پھر اس کا اثر و رسوخ غابون Gaboon سے انگولا Angola تک پھیل گیا ۔ جنوب کی طرف کانگو کی حکومت کی بہت سی شاخیں تھیں جن میں سے ایک یقیناً کسائی Kasai کے بالائی علاقے کی ریاست باکوبہ Bakuba ہے ۔ لوبا کنڈا Luba-Kunda کی ریاستیں بھی، جو کانگو زمبزی Congo-ZambaZi کی درمیانی بلند سرزمین پر واقع ہیں، مہاجروں ہی کی قائم کی ہوئی ہیں، لیکن ابھی یہ بات تحقیق طلب ہے کہ یہ لوگ مغرب کی طرف سے یہاں آئے یا مشرق کی طرف سے ۔

لوگوں کی آمد و رفت سے جو خیالات مغربی بنتو افریقہ میں پھیلے وہ بنیادی طور پر وادی نیل کی قدیم دنیا کے باقیات تھے ۔ یہ خیالات یہاں سوڈان کے ان جنوبی اطراف سے آئے جو اس وقت تک اسلام کے زیر اثر نہیں آئے تھے ۔ اسی اثنا میں تقریباً چار صدیوں تک، یعنی پندرھویں صدی کے آخر سے انیسویں صدی کے وسط تک کانگو کی وادی پر، جس کے باشندے ہنوز کافر اور فطرت پرست تھے، یورپ دور ہی سے اپنا اثر ڈالتا رہا ۔ اس علاقے میں یورپ کا زیادہ تر مفاد غلاموں کی تجارت سے وابستہ تھا جس نے عیسائیوں کی ابتدائی تبلیغی کوششوں کو سخت نقصان

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

پہنچایا اور بالآخر ان کا گلا گھونٹ دیا ۔ پرتگال کے مخلوط النسل سوداگروں نے، جو Pombeiros کہلاتے تھے، سترھویں اور اٹھارھویں صدی ہجری میں لونڈا اور انگولا کی دوسری بندرگاہوں سے اپنی سرگرمیاں شروع کیں اور کانگو کی وادی کے جنوبی کناروں سے دور تک پھیلتے چلے گئے ۔ غالب گمان یہ ہے کہ تانبے کی کانوں والے Katanga کے علاقے میں کبھی ان کی مڈبھیڑ مشرقی افریقہ کے سمندری ساحل کی سواحلی بندرگاہوں کے سوداگروں سے ہوئی ہو جو ایسے ہی کچے مسلمان تھے، جیسے کچے عیسائی Pombieros تھے ۔ درحقیقت بعض آثار سے پتا چلتا ہے کہ جو تجارت انیسویں صدی سے پہلے بنتو افریقہ کے دور دراز علاقے میں ہوتی تھی اس میں زیادہ تر افریقہ کے نیام وزی (Nyamwezi) اور بسا (Bisa) جیسے قبائل کی کارفرمائی تھی اور ساحلی لوگوں کا خواہ عرب ہوں یا سواحلی، اس تجارت میں زیادہ ہاتھ نہ تھا ۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کہیں انیسویں صدی میں جا کر جب مصر سے غلاموں اور ہاتھی دانت کے تاجر جنوبی سوڈان میں داخل ہوئے یا اس سے بھی بڑھ کر، جب زنجبار کے ابوسعیدی خاندان کی رعایا مشرقی افریقہ میں داخل ہوئی تو مسلمانوں کی کچھ تعداد وادی کانگو کے اطراف میں پہنچنی شروع ہوئی ۔ اجیجی (Ujiji) کی عرب نوآبادی کی بنیاد ۱۸۴۰ء کے چند سال بعد پڑی اور یوں ایک مستول والے جہاز سمندر پار کرکے تانگا نیکا کی جھیل کے کناروں پر پہنچنے شروع ہوئے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وادی کانگو کے مشرق اور وسطی علاقوں میں عرب مسلمانوں اور سواحلیوں نے کاروبار پر مکمل قبضہ کرلیا تھا تاآنکہ انیسویں صدی کے نویں عشرے کے اواخر اور دسویں عشرے کے اوائل میں بڑی طاقتوں نے استوائی افریقہ کے علاقے پر قبضہ کرکے اس کے حصے بخرے کر لیے ۔ جب بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ دوم نے کانگو کی خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی تو غلاموں کی تجارت کا خاتمہ ہوا اور عرب اور سواحلی جنگجو جن کی سرگرمیوں کا حال لونگ سٹون، اسٹینلی اور دوسرے سیاحوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، نابود ہو گئے ۔ بہت سے عرب اور ان کے مشرقی افریقیہ کے ہم مذہب، جدید نوآبادیاتی نظام حکومت کے تحت مستقل طور پر کانگو میں آباد ہو گئے ۔ افریقیہ کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی لوٹ مار کے بجائے ایک پُرامن تجارتی زندگی شروع ہو گئی اور اس کے بعد سے اسلام کی تبلیغ میں بھی باقاعدگی اور تیزی پیدا ہوگئی ۔

کانگو کے مسلمانوں کی موجودہ تعداد تقریباً دو لاکھ ہے اور ان کی عظیم اکثریت شافعی مذہب کی پیرو ہے اور طریقۂ قادریہ سے تعلق رکھتی ہے ۔ ان میں خوجے [رک بآں] بھی ہیں، جو زیادہ تر روانڈا ۔ اروندی اور صوبۂ کیوو کے مشرقی حصے میں آباد ہیں اور کچھ سٹینلے وِل (Staneley-ville) اور کسنگو (Kasongo) میں رہتے ہیں ۔ یہ لوگ سرگرم تاجر ہیں اور خاصے منظم ہونے کے علاوہ تعلیم یافتہ بھی ہیں ۔ احمدیوں [رک بآں] کی تعداد صرف چند درجن ہے، لیکن وہ کتابوں اور رسالوں کی تقسیم کے ذریعے اپنے مسلک کی تبلیغ کا کام بڑے انہماک سے کر رہے ہیں ۔

صوبۂ مشرق، صوبۂ کیوو اور روانڈا ۔ اروندی میں کم سے کم ۱۷۵ منظور شدہ مسجدیں ہیں ۔ رومنگوے (Rumungwe)، جھیل نیانزا (Lake Nyanza)، سٹینلے ویلے، پونتھیر ویلے، کرنڈو (Kirundu) اور کنڈو (Kindu) میں قرآنی مکاتب ہیں، لیکن کشش اور توجہ کا سب سے بڑا مرکز اجیجی (Ujiji) ہے، جہاں ایک بڑا مدرسہ ہے، جس میں بچوں کو عربی پڑھائی جاتی ہے ۔

مسلمانوں کے ہر ایک گاؤں میں ایک مسجد ایک (Drapeau de confrerie) لواء الاخوۃ (اسلامی

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

برادری کا جھنڈا)، ایک معلم اور ایک امام ہوتا ہے۔ زنجبار کے برخلاف، مشرقی کانگو کے مسلمانوں میں تعلیم کم ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو الدمیری یا السیوطی کی کتابیں پڑھتے ہیں، لیکن عموماً ان کی تعلیم قادریہ اشغال کی چند عام کتابوں تک محدود ہے۔ طریقے میں داخل ہونے کا دستور جسے مریدی کہتے ہیں، سینیغال (Senegal) میں بھی بہت عام ہے اور زنگیوں میں بڑی عزت و وقعت رکھتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس کے حصول سے عزت اور مرتبہ دونوں چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ مسجدیں جو ایک خاص نقشے کے مطابق بنی ہوئی ہیں زنجبار کے نمونے کی ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر کی حیثیت ایک بڑے جھونپڑے سے زیادہ نہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں سے صرف تھوڑے ہی سے ایسے ہیں جو عربی جانتے ہیں۔ یہاں کی عام بولی کسواھلی (Kiswahili) ہے، جو حقیقت میں ایسی بنتو ہے، جو عربی سے متأثر ہے۔ یہی زبان ساحل زنجبار کے باشندوں کی مادری زبان ہے۔ زنگی مسلمان جنھوں نے شمال سے جمہوریۂ وسطی کانگو اور چاڈ سے مغربی کانگو میں داخل ہونا شروع کر دیا ہے، ثقافتی اعتبار سے بہت اونچا معیار رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر سوداگر ہیں، جو عبادات سے متعلق کتابیں اور عربی میں لکھے ہوئے تعویذ فروخت کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی جو عام عدالتیں یہاں قائم ہیں روز بروز شافعی مسلک اختیار کرتی جا رہی ہیں۔

عام طور سے زنگی مسلمانوں کی تعلیم بڑی محدود ہوتی ہے اور انھیں اتنی عربی اور سواحلی بھی نہیں آتی کہ اسلام کی تبلیغ کا جو پروگرام ریڈیو سے نشر ہوتا ہے وہ اسے بھی اچھی طرح سمجھ سکیں۔ جو کتابیں عام طور سے مقبول ہیں، ان میں قرآن حکیم کے علاوہ زنجبار کے ایک شیخ حسن بن امیر الشیرازی کی تصنیف، المعراج الدردیر، العقد العقیان علی مولد الجیلانی، دلائل الخیرات، جس میں اور بہت سے متون، مثلاً شاذلی کی حزب البر، حزب البحر اور حزب النصر شامل ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ قرآن مجید کے مکمل یا نامکمل ترجمے بھی سواحلی زبان میں موجود ہیں۔ سواحلی میں سورۂ یٰسٓ کا ترجمہ، میراث پر شیخ الشیرازی کا رسالہ اور نماز پر ایک بہت ہی مقبول عام رسالہ جس کا نام "Sula na Manrisho Yake" ہے، بھی قابل ذکر ہیں۔

مآخذ:

(۱) J. B. Labat: *Relation historique de l'Ethiopie occidentale, contenant la description des royaumes du Congo, Angolla et Matamba*، پیرس ۱۷۵۳ء؛ (۲) Abbé Proyart: *Histoire du Loango, Kakongo et autres royaumes d'Afrique*، پیرس ۱۷۷۸ء؛ (۳) R. Avelot: *Les grands mouvements de peuples en Afrique, Jaga et Zimba*، پیرس ۱۹۱۲ء؛ (۴) Delaisse et Poutrin: *Enquête colonisale*. . . . پیرس ۱۹۳۰ء؛ (۵) P. Marty: *Études sur L'Islam au Sénégal, au Soudan, en Guinee Sural Côte d'Lvoire an Dahoney*، پیرس ۱۹۱۷ تا ۱۹۲۶ء؛ (۶) A. Gouilly: *L'Islam en A O F.*، پیرس ۱۹۲۶ء، *Notes et Études Docmentaires*، عدد ۱۹۵۲ (۱۹۴۷ء)، عدد ۱۶۴۲ (۱۹۵۲ء)؛ (۷) Lieut. L. Nekkech: *Le Mouridisme depuis 1912 st. Louis du Senegal*، برسلز ۱۹۵۲ء؛ (۸) J. Maes and Boone: *Les Peuplades du Congo Belge*، برسلز ۱۹۳۱ء؛ (۹) وہی مصنف: *Bibliographie du Musée du Congo Belge sous le titre: Bibliographie éthnographique du Congo Belge*، برسلز ۱۹۳۲ء؛ (۱۰) Foureau: *D'Alger au Congo par le Tchad*، پیرس ۱۹۰۲ء؛ (۱۱) Casati: *Dieci anni in Equatoria*، میلان ۱۸۹۱ء؛ (۱۲) R. P. Sacleux: *Dictionnaire Swahili-Français*، (مع عربی اشتقاقات)، پیرس ۱۹۳۹ تا ۱۹۴۱ء؛ (۱۳) R. P. Vanden Eynde: *Grammarire Swahili*، برسلز بلا تاریخ؛ (۱۴) Cornet:

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Le Congo physique، برسلز ۱۹۳۸ء؛ (۱۵) G. Hardy: *Vue génerale de l'Histoire d'Afrique*، بارچہارم پیرس ۱۹۴۲ء؛ (۱۶) Deschamps: *Les religions de l'Afique*، پیرس بلاتاریخ؛ (۱۷) H. Baumann and Westermann: *Les Peuples et les civilisations d l'Afrique*، مترجمۂ Hamburger، پیرس ۱۹۵۱ء؛ (۱۸) V.L. Grottanelli: *I. Bantu (Le Razze e i Popoli della Terra di R. Biasutti)*، ۳: ۴۴۵ تا ۴۶۳، Turin، بلاتاریخ ۱۹۵۵ء؛ (۱۹) *Revue de l'Université de Bruxelles*، ۱۹۵۴ء، ص ۵ تا ۱۶ اور ۱۹۵۷ء، ص ۲ تا ۳، مسائل کانگو کے لیے مخصوص ہے؛ (۲۰) P. Ceulemans: *La Qustion Arabe et le Congo* برسلز ۱۹۵۹ء؛ (۲۱) H.M. Stanley: *Through the dark continent*، ۲ جلد، لنڈن ۱۸۷۸ء؛ (۲۲) مصنف مذکور: *Twenty-five years' progress in Equatorial Africa*، لنڈن ۱۸۹۷ء؛ (۲۳) مصنف مذکور: *In darkest Africa*، لنڈن ۱۹۰۴ء؛ (۲۴) R. P. Henri Neyrand: *L'Evolution religieuse de L'AEF.* در *E'tudes Américaines, L'AEF.*، پیرس بلا تاریخ: ۱۷؛ (۲۵) G. Eichtal: *De l'état actuel et de l'avenir de l' Islamisme dans l'Afrique centrale*، پیرس ۱۸۴۱ء؛ D. Westermann(۲۵): *Geschichte Afrikas*، Wiem... ۱۹۵۲ء؛ (۲۵) A. Abel: *Documents concernant le Bahr al Ghazal (1893-1894)*، در *Bulletin de l'Aca-démie Royale des Sciences coloniales*، ۱۹۵۴ء، ۱۳۸۵ تا ۱۴۰۹؛ (۲۶) مصنف مذکور: *Les masulmans noirs du Manié'ma et de la Province Orientale*، Coll. de l'Institut de Sociologie Solovay، برسلز ۱۹۵۹ء؛ (۲۷) *Annuaire du Monde Musulam*۔ (مقالے کی بنیاد ان معلومات پر ہے جو A. Abel و R. A. Oliver نے مہیا کی ہیں)۔

(ادارہ، ؤؤ، لائیڈن بار دوم)

* **کانم**: وسط سوڈان میں ایک علاقہ جو جھیل چاڈ Tchad کے مشرق اور شمال مشرق میں واقع ہے۔ چند برس قبل کانم کے متعلق ہماری معلومات صرف Bath، جس نے ۱۸۵۱ء میں اس کے کچھ حصے کا سفر کیا تھا اور Nachtigal جو بورکو (Borku) جاتے ہوئے یہاں سے گزرا تھا، کے بیانات تک محدود تھیں۔ ۱۹۰۰ء کے بعد علمی وفود اور ان افسروں اور اہلکاروں کے اکتشافات سے جنھیں چاڈ کے فوجی علاقے کا نظم و نسق سپرد تھا، اس امر کا امکان پیدا ہوگیا ہے کہ مذکورۂ بالا دونوں سیاحوں کی ابتدائی معلومات کی تصدیق و تکمیل کی جا سکے۔

اگر کانم کے نام کے وسیع ترین مفہوم کو پیش نظر رکھا جائے تو Nachtigal کی رائے میں اس کا اطلاق اس علاقے پر ہوتا ہے جس کے شمال میں کور (Kawar) سے جھیل چاڈ کو جانے والی تجارتی شاہراہ گزرتی ہے، جنوب میں بحر الغزال [رک بآں]، مشرق میں ایگوئی (Eguei) کا نشیبی حصہ اور مغرب میں جھیل ہے اور یہ ۱۴ سے ۱۶ عرض بلد شمالی اور ۱۲ سے ۱۴ طول بلد مشرق (گرینوچ) کے درمیان واقع ہے۔ اس کے رقبے کا اندازہ ۲۷۰۰۰ سے ۳۰۰۰۰ مربع میل تک لگایا جا سکتا ہے۔ محدود معنوں میں کانم اس وسیع رقبے کے صرف ایک حصے پر مشتمل ہے جس کے مغرب میں جھیل چاڈ، جنوب میں بحرالغزال اور مشرق میں منگہ Mnaga کا پہاڑی علاقہ ہے جو اسے ایگوئی سے جدا کرتا ہے۔

مآخذ: H. Barth: *Travels and Discoveries in North and Central Africa*، لنڈن ۱۸۵۷ تا ۱۸۵۸ء جلد ۵، اشاریہ، بذیل مادّۂ *Kánemhú, Kánem*؛ (۲) Nachtigal: *Sahara und Sudan*، لائپزگ و برلن ۱۸۷۹ تا ۱۸۸۹ء، جلد ۲، فصل ۵؛ (۳) H. Carbou: *La région du Tchad et du Ouadaï* (*Publications de l'Ecole des Lettres d'Alger*، پیرس ۱۹۱۲ء، جلد ۳۷ و ۳۸)؛ (۴) Cornet: *Au Tchad*، پیرس ۱۹۱۰ء؛ (۵) G. Destenave:

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Le lac Tchad Rev. Générale des Sciences ، ۱۹۰۳ء؛ (۶) Fouques : *Le Kanem, Revue, des troupes coloniales,* ۱۹۰۶ء؛ (۷) F. Foureau : *D'Alger au Congo par le Tchad* ، پیرس ۱۹۰۲ء؛ (۸) Mission : *Documents scientifiques* ، پیرس ۱۹۰۲ء؛ (۹) A. Foureau : *Deux annees dans le région du Tchad, Bull. du Comité de l'Afrique française, Renseignements coloniaux* ، ۱۹۰۳ء؛ (۱۰) Hartmann : *Der Islamische Orient* جلد ۱)؛ (۱۱) Cl, Huart : *Le Tchad et ses habitants, La Géographie* ، ۱۹۰۴ء؛ (۱۲) P. Joalland : *De Zinder au Tchad et conquéte du Kanem, La Geographie* ، ۱۹۰۱ء؛ (۱۳) Labatut : *Le territoire militaire du Tchad Bull. de la Soc. de géogr. D'Alger et de, l'Afrique du Nord* ، ۱۹۱۱ء؛ (۱۴) C. Largeau : *Situation des pays et protectorats du Tchad au point de vue économique Revue Coloniale* ، ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۴ء؛ (۱۵) Marquart : *Die Benin Sammlung* ص ۸۱ تا ۸۸؛ (۱۶) Becker : *Zur Gesch. des Östlichen Sudan* (*Der Islam* ۱ : ۱۵۳ ببعد)؛ (۱۷) S. Passarge : *Zur Oberflächenges-taltung von Kanem, Petermann's Mitteil* ، ۱۹۰۴ء؛ (۱۸) H. A. MacMichael : *The Arabs in the Sudan* کیمبرج، ۱۹۲۲ء؛ (۱۹) G. J. Lethem : *Colloquial Arabic of the Shuwa Dialect* لنڈن ۱۹۲۰؛ (۲۰) O. Temple : *Notes on the Tribes etc, of Northern Nigeria* ، طبع دوم لاگوس ۱۹۲۲ء ص ۲۴۵ ببعد؛ (۲۱) نیز رک بہ ماخذ تحت مادّہ ہائے بورنو وادی۔

(G. YVER) [تلخیص از ادارہ]

⊛ **کانم، بورنو**: کانم کے متعلق قدیم ترین حوالہ مسعودی کی مروج الذہب و معدن الجواہر میں ملتا ہے جو ۳۳۲ھ/۹۴۳ء میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کے تینتیسویں باب میں وہ بنو کشم (حبشیوں) کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ان میں سے نوبیہ، بجہ اور زنج کے قبائل تو المغرب کی جانب جا کر آباد ہو گئے۔ یہ علاقہ زغاوہ، کانم، مرکہ اور غانہ کے اطراف میں ہے۔ اس کے علاوہ وہ ممالک حبش کے دوسرے علاقوں اور دمدمہ میں بھی آباد ہیں (مسعودی : مروج، طبع de Meynard و Courteille ، پیرس ۱۸۶۴ء، ۳ : ۱ و ۲)۔

اندلسی جغرافیہ نویس ابو عبیداللہ البکری، کتاب المسالک و الممالک (طبع Slane ، الجزائر، ۱۹۱۱ء)، میں طرابلس کے جنوب مغرب میں ایک زویلہ کا ذکر کرتے ہوے لکھتا ہے کہ زویلہ کے صحرا سے پرے اور اس شہر سے چالیس روز کے فاصلے پر کانم کا ملک واقع ہے جہاں حبشی بت پرستوں کی ایک نسل آباد ہے اور ان تک پہنچنا بہت مشکل ہے (ص ۱۱)۔

المقریزی (م ۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء) نوبیہ کے حالات کا ذکر کرتے ہوے لکھتا ہے: "نیل کے ایک پہلو پر ایک ملک ہے جس کا نام کانم ہے اور وہاں کا بادشاہ مسلمان ہے۔ یہ ملک ملی (مالی) سے بہت دور ہے۔ اس کے صدر مقام کو الجمی (الجمع) کہتے ہیں۔ اس ملک کا پہلا شہر جو مصر کی جانب ہے، زلہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس شہر اور ککہ (کاکا) کے درمیان جہاں سے دوسری حد شروع ہوتی ہے، پورے تین ماہ کا سفر ہے۔ یہ سلطنت جو افریقیہ اور برقہ کے درمیان واقع ہے، جنوب کی جانب تک غرب الاوسط کے متوازی پھیلتی چلی گئی ہے۔ یہاں کی زمین خشک، پتھریلی اور بنجر ہے" (اقتباس در Quartremere : *Memoires*، ۲ : ۲۷ و ۲۸)۔ عرب مصنفین نیل کا نام نائیجر کو دیتے رہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ نیل ابیض سوڈان کے جنوب میں پہنچ کر نائیجر سے جا ملتا ہے اور "الکانم وہ بہت بڑا علاقہ ہے جسے نیل مبارک خوب سیراب کرتا ہے

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

اور الجمع اور التاجو کی حکومت کا درمیانی فاصلہ دس منزلوں کے برابر ہے" (اقتباس، در Hamker : *Spec. Cat.*، ص ۲۰۶) اور ان (اہل نوبیہ) کے نزدیک الکانم ہے - یہ ایک بڑی قوم ہے جس میں زیادہ تر مسلمان ہیں - ان کا شہر الجمہ (الجمع) ہے (کتاب مذکور، ص ۲۰۵)- المقریزی کے زمانے میں کانم کا بادشاہ الحاج ابراہیم بن آل سیف بن ذویزن تھا اور یہاں کا بڑا شہر کانم تھا جو بورنو کا صدر مقام تھا (کتاب مذکور، ص ۲۰۷)- ظاہر ہے کہ صدر مقام کا نام اس ملک کے نام سے ملتبس ہو جاتا ہے .

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء سے کچھ پہلے سلطنت کانم یا بورنو میں جس کا بڑا شہر الجمہ (جمی Njimye درکانم) تھا، ایک بادشاہ ہیوم Hume نامی حکومت کرتا تھا - وہ مسلمان تھا جس نے ایک نئے شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی تھی - وہ نسلاً بربری اور بردوعہ کے قبیلے سے تھا - وہاں کے باشندے آہستہ آہستہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے تھے - H. Barthotd (*Travels and Discoveries in North and Central Africa*، انگریزی ترجمہ ۱۸۵۷-۱۸۵۸، ص ۲۶۴ و ۲۶۵، حاشیہ) اہالی بورنو کی ایک عام روایت کے حوالے سے لکھتا ہے کہ سیفوہ Séfuwa نے اس وقت اسلام قبول کیا جب وہ مصر ہی میں آباد تھے اور ان کو اسلام کی تبلیغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک خاص ایلچی نے کی تھی - اس کے لیے کوئی سند موجود نہیں اور صرف یہ سمجھ لینا ہی کافی ہے کہ یہ ایک عام روایتی بیان ہے جو بورنو میں زبان زد خلائق ہے - Mischlich : *Contributions to the History of the Hausa States*، در *Journ Afr. Socy.*، ۳ (۱۹۰۴ - ۱۹۰۵: ص ۴۵۵ تا ۴۷۹) میں یہ روایت ذرا اختلاف سے بیان ہوئی ہے - اس روایت کے مطابق بورنو کے ایک بادشاہ دلمی نامی نے اسلام کی ترقی کا حال سنا اور اس نے اپنا ایک نمائندہ مکۂ معظمہ میں اس غرض سے بھیجا کہ وہاں سے ایک مبلّغ بورنو بھی بھجوایا جائے - اس درخواست کی تعمیل میں خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ نے (۱۳ھ تا ۲۳ھ) عمرو بن العاصؓ کو چند صحابیوں کے ساتھ وہاں بھیج دیا - ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور بورنو کے تمام لوگ [اسلام کے اصولوں اور اچھائیوں سے متأثر ہو کر بہت جلد مسلمان ہو گئے] - البکری کے بیانات کہ اس کے زمانے میں اہالی بورنو بت پرست تھے اور ان کے ہاں جانا کوئی آسان کام نہ تھا، [محل نظر ہیں].

المقریزی کے زمانے میں جو مسلم خاندان وہاں حکومت کرتا تھا، اس کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ وہ تین صدیوں سے زیادہ عرصے سے وہاں حکومت کر رہا تھا - وہ بیان کرتا ہے کہ اس ملک میں سب سے پہلا مبلّغ اسلام ایک شخص حاجی ہادی العثمانی پہنچا، جو اپنے آپ کو حضرت عثمانؓ کی اولاد میں سے بتاتا تھا - اس کے بعد اس ملک کی حکومت قبیلۂ یزنی میں منتقل ہو گئی جو سعید بن ذویزن کی اولاد میں سے ہیں - یہ لوگ امام مالکؒ کے پیرو ہیں اور مذہبی عقائد و فرائض کے پورے پابند ہیں - شہر فسطاط (قاہرۂ قدیم) میں انھوں نے ۶۴۰ھ/۱۲۴۲ء میں مالکی فقہ کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کیا اور یہ مدرسہ ابن راشق کے نام سے موسوم تھا - یہ وہی مدرسہ ہے جس میں ان کے سفیر آ کر ٹھیرا کرتے تھے (المقریزی نیز Quatremere : *Memoires*، ۲ : ۲۸)- ہادی کے متعلق، جو ویسے تو ایک غیر معروف شخص ہے، یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کے خاندان سے تھا جس کی تصدیق اس کے نام کی ترکیب سے ہوتی ہے ، لیکن اس کا براہ راست حضرت عمرؓ کی اولاد سے ہونا ظاہر نہیں ہوتا - حضرت عثمانؓ قبیلۂ قریش کے اموی خاندان سے تھے - اس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ یہ اور قسم کی روایت ہو اور کسی بعد کے زمانے میں اموی خاندان کے کچھ پناہ گزینوں نے یا ان کے حلیفوں نے

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

افریقیہ کے کسی دور دراز مقام میں جا کر پناہ لے لی ہو۔ المقریزی اپنی تصنیف میں کسی دوسری جگہ اپنے زمانے میں یہ لکھتا ہے کہ کانم میں بنو سیف حکومت کرتے تھے (مذکورۂ بالا) اور اس بات کی تصدیق تاریخ بورنو (*Chronicle of Bornu*) سے بھی ہوتی ہے جو دسویں صدی ہجری کی ایک تصنیف ہے اور اس کے اقتباسات لائپزگ اوریئنٹل سوسائٹی (۱۸۵۲ء، ص ۳۰۵ ببعد) کے "جرنل" میں M. Blau کے ترجمے اور حواشی کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کی رو سے بھی بورنو کے مسلم حکمران خاندان کا سلسلۂ نسب سیف بن ذویسع تک پہنچتا ہے جس کی وجہ سے وہ "سیفوہ" یا "یزنی" کہلانے لگے۔ سیفوہ یا سفوہ کے نام سے، جو اس خاندان نے اختیار کیا تھا، اب بورنو میں کوئی بھی واقف نہیں (*Doc. scient. de la Mission Tilho*، پیرس ۱۹۱۱ء، ص ۳۵۲)۔ قدیم زمانے کے حکمرانوں کو تُبَّع کہتے تھے اور یہ نام یمن کے قدیم حکمرانوں کے لیے استعمال ہوا کرتا تھا۔ سلاطین کانم و بورنو کی فہرست کے مطابق (کتاب مذکور، ص ۳۴۲ تا ۳۵۱) مورث اعلیٰ سیف بن ایسّتہ Aissata تھا جسے مکّتہ (مکّی) کہہ کر پکارتے تھے۔ اس طرح یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ عربی نسل سے تھے۔ کوئھوں کی اصل بھی وہی تھی جو تبّعون کی تھی۔ تبّعون کی طرح وہ بھی رفتہ رفتہ یمن سے کانم آئے تھے اور سفر میں غریب طلبہ کی طرح بسر اوقات کرتے تھے۔ یمن سے کانم تک کے سفر کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا ہوگا۔ وہ دائرویہ Dieraoua کے علاقے میں سترھویں صدی ہجری کے نصف میں آباد ہونے لگے۔ اس زمانے میں تبع کزرسومو Kazer Soumo یں حکومت کرتے تھے اور انھوں نے سارے ملک پر اپنا تسلط جما لیا تھا اور ان کی مملکت کی حدود چاڈ سے لے کر نائیجر تک وسیع ہو گئی تھیں (کتاب مذکور، ص ۲۹۶)۔ یہ کوئی مستند تاریخی بات نہیں بلکہ محض زبانی روایت ہے اور غالباً بعد کے زمانے میں وضع ہوئی کہ سفوہ یا تبع یمنی یا مکّی الاصل تھے۔ عبدالرحمن بن عبداللہ بن عمران بن عامر جو سیدی ٹمبکٹو کے لقب سے مشہور ہیں، اپنی تصنیف تاریخ السودان (طبع و مترجمۂ O. Houdas، پیرس ج ۱، متن ۱۸۹۸ء، ج ۲، ترجمہ ۱۹۰۰ء) میں لکھتے ہیں کہ حکمران خاندان یمن سے آیا تھا، لیکن یہ تاریخ سترھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی اور اس اعتبار سے صرف مروّجہ روایات ہی کی حامل ہو سکتی ہے۔ بقول المقریزی اسلام کے بعد پہلا بادشاہ محمد بن جبل بن عبداللہ بن عثمان بن محمد (Hamaker : *Spec. Cat.*، ص ۲۰۵) تھا، لیکن فہرست (مذکورۂ بالا) میں اس کا نام ہیوم Hume درج ہے جو دگ یا دک کی اولاد میں سے تھا۔ قدیم کافر خاندان دگوہ یا آل دگ کے نام سے مشہور تھا اور بعد کا مسلم خاندان آل ہیوم کہلاتا تھا۔ Barth کے اعداد و شمار کے مطابق عہد ہیوم ۹۷۰ھ تا ۱۰۹۱ھ کے لگ بھگ ہے، نختیگل Nachtigal ۱۰۶۰ھ تا ۱۰۵۲ھ کے زمانے کو ترجیح دیتا ہے اور مشن تلہو Mission Tilho کی رائے میں یہ زمانہ ۱۰۶۳ھ تا ۱۰۸۶ھ کے درمیان کا ہے (*Doc. scient de la. Miss. Tilho*، ص ۳۴۸ تا ۳۴۹)۔ زیادہ معقول بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ کانم کے مسلم حکمرانوں کا عہد حکومت پانچویں صدی ہجری کے آخری حصے سے شمار کیا جائے اور المقریزی کے اس بیان سے کہ "اس کے بعد (ہادی العثمانی) حکومت یزنیوں میں منتقل ہو گئی" (مذکورۂ بالا) یہ مراد لی جائے گی کہ ہادی پہلا شخص ہے جس نے اسی صدی کے پہلے حصے میں اس ملک میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی۔

پانچویں صدی سے کانم کے مسلمانوں اور مسلمان بادشاہوں کے متعلق تو بہت حوالے ملتے ہیں، لیکن اس سے پہلے زمانے کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں احیاے دین کے جذبے

www.besturdubooks.wordpress.com

سے سرشار ہو کر مسلمان شمال کی جانب سے مغربی سوڈان میں آہستہ آہستہ داخل ہو رہے تھے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کانم میں اسلام شمال کی جانب سے آیا؟ آرنلڈ *Preaching of Islam*، ص ۳۲۰ میں لکھتا ہے کہ اسلام کی نشر و اشاعت اس ملک میں مصر کی جانب سے ہوئی، لیکن اپنے اس بیان کی تائید میں وہ کوئی سند پیش نہیں کرتا۔ غالباً اس استدلال کی وجہ یہ ہے کہ ایک قدیم راستہ جبل النری J. en-Nari سے ہوتا ہوا ایک نخلستان میں سے گزرتا تھا، جو اب غیر آباد ہے اور وہاں سے مشرق شمال مشرق کی جانب مصر جا پہنچتا تھا۔ اس راستے کے قدیم آثار ابھی باقی ہیں۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی علم ہے کہ بورنو کے علاقے کے حاجی پہلے زمانے میں بھی اور اب بھی اکثر اوقات مصر کے راستے ہی مکۂ معظمہ آتے جاتے ہیں۔

تاریخ بورنو (مذکورۂ بالا) میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو صنہاجہ بربریوں (*Jour. Leipz. Or. Soc*، ص ۳۰۵ ببعد) سے منسوب کیا گیا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ ہوسہ زبان میں بربریون کے نام سے "بورنو قوم" مراد لی ہے۔

اسلامی دنیا میں بورنو کے تعلقات رسل و رسائل تین اطراف سے قائم تھے، شمال مشرق بذریعۂ مصر بالائی، شمال بذریعۂ طرابلس اور شمال مغرب بذریعۂ المغرب (تونس، الجیریا، مراکو)۔ مشرق کی طرف کو نظر انداز کر دینا چاہیے کیونکہ سولھویں صدی عیسوی تک اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ جب اسلام پہلے پہل کوردوفان Kordofan اور دارفور کے علاقوں میں پھیلا تو اس وقت اس جانب سے کوئی اسلامی یا عرب اثر اس ملک پر پڑا ہو۔ اس وقت تک نوبیہ اور حبشہ (ای سینیا) کی وجہ سے راستوں میں رکاوٹ تھی لیکن جب نوبیہ میں نصرانی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تو آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

۷۸۸ھ/۱۳۸۸ء میں حکمران خاندان بورنو کو ملک سے خارج کرکے اس بات پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ بلالہ Bulala کے رستے مغرب کی طرف چلے جائیں۔ اس کے بعد مائی علی غجدنی Mai 'Ali Ghejideni نے برنی یا بورنو جدید کی حکومت قائم کی۔ ۱۸۰۸ء میں حکومت فلہ نے بورنو پر حملہ کیا اور اس سے اگلے سال اسی حکومت نے بورنو قدیم کو تباہ کر دیا۔

۱۸۹۳ء کے لگ بھگ ربہ حبشی نے جو زبیر پاشا کا غلام تھا، بجرمی Bagermi کی جانب پیش قدمی کی اور بورنو پر حملہ کر دیا۔ احسم Ahsem شاہ بورنو نے راہ فرار اختیار کی اور ربہ نے شہر میں داخل ہوکر اسے پوری طرح تباہ کرکے دکوہ Dikwa میں نیا صدر مقام بنا لیا۔ ربہ ۱۹۰۰ء میں مارا گیا اور اس کے دو سال بعد انگریزوں نے Shehu Garbai کو کہ Kuka میں تخت نشین کر دیا۔

(DE LACY O'LEARY [و تلخیص از ادارہ])

کانو (الحوصۃ کی زبان میں کانُو): وسط سوڈان * کا ایک شہر جو قوقہ (قاموس الاعلام، ۵: ۳۷۵۱) سے ۳۰۰ میل مغرب اور سکوتو Sokoto سے ۲۹۰ میل مشرق جنوب مشرق میں، سطح سمندر سے ۱۲۰۰ فٹ کی بلندی اور ۱۲ درجے ۲۷ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۸ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد مشرقی (گرینچ) پر واقع ہے۔ کانو ایک دلدلی میدان کے وسط میں آباد ہے جس پر گورون دُچی Goron Duchi اور دَلَہ کی منفصل خشک چٹان والی پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی ہیں۔

مآخذ: (۱) Leo Africanus، طبع R. Brown، لنڈن (Hakluyt Society)، ۱۸۹۶ء، ۳: ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۸-۸۴۹؛ (۲) *Description de l'Afrique*، ج ۷، طبع Schefer، ۳: ۳۰۵؛ (۳) O. Temple: *Notes on the Tribes etc. of Northern Nigeria*، ۱۹۲۲ء، ص ۳۶۳ تا ۳۸۶؛ (۴) H. Barth: *Travels and Discoveries in North and Central Africa*، ۱۸۵۶-۱۸۵۸ء،

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۲ : ۹۷، ۱۰۷، ۱۲۱ تا ۱۲۵، ۱۴۳، ۵ : ۳۵۸ ؛ (۵) Schön : *Dictionary of the Hausa Language*، لنڈن ۱۸۷۶ء بذیل مادّۂ قانو، ص ۱۰۳، ۱۰۴ (۶) *Nigerian Magána Hausa* : Schön (۷) ؛ *District. Gazetteers*، لنڈن ۱۹۱۸ء، ص ۲۶۳ تا ۲۶۵ (۸) Harris : *Hausa Stories*، Weston Super Mare تاریخ ندارد، ص ۸۲ تا ۸۹ ؛ (۹) P. L. Monteil : *De Saint Louis à Tripoli par le Tchad*، پیرس ۱۸۹۳ء، باب ۱۰ ؛ (۱۰) C. H. Robinson : *Hausaland*، لنڈن ۱۸۹۶ء، باب ۸ ؛ (۱۱) C. P. Lucas : *Historical Geography of the British Colonies*، ج ۳، ۱۹۱۳ء ؛ (۱۲) *Le Commerce des caravanes tripolitaines dans la région du lac Tchad et le Sokoto.* — *Bulletin du Comité de l'Afrique Française*، ۱۸۹۸ء، *Renseigrements coloniaux* ؛ (۱۳) Marquart : *Die Benin-Sammlung*، ص xcix تا cxxii ؛ (۱۴) Mischlich و Lippert : *Beiträge zur Geschichte der Haussasta-aten Mitth. d. Sem. f. Or. Sprachen*، سلسلۂ ششم، ۳ : ۵ تا ۷ ؛ (۱۵) Paul Staudinger : *Im Herzen der Haussaländer*، لائپزگ ۱۸۹۱ء نیز رک بہ مآخذ بذیل مادّۂ هوسه (Hausa).

(تلخیص از ادارہ) G. Yver]

* **کانَ و کانَ** : جدید عربی نظم کی ایک قسم ہے۔ یہ اہل بغداد کی ایجاد ہے اور اس کا یہ نام اس لیے پڑا کہ قصہ گو اپنے قصے کے شروع میں کَان و کَان کہا کرتے تھے، جس کا مطلب ہے "ایک زمانے میں ایسا ہوا"۔ ابتدا میں "کان و کان" قصے کہانیوں کو کہتے تھے جن کی عبارت میں قافیہ بندی کا اہتمام کیا جاتا تھا، بعد میں دیگر مواضع کے لیے اور بالخصوص اخلاقی رجحان رکھنے والے مواضع کے لیے یہ طرز بیان استعمال کرنے لگے۔ عامی زبان میں اس کا استعمال صرف مشرق میں ہوتا تھا، خاص کر بغداد میں جہاں یہ اسلوب ایجاد ہوا۔ "کان و کان" ایک قسم کی نظم ہے جس میں دو ابیات کا ایک بند ہوتا ہے۔ اس کا وزن ماہرین عروض یہ بتاتے ہیں:

مستفعلن فاعلاتن مستفعلن مستفعلان
" " " فعلان

لیکن راقم مقالہ نے جو ۴۲ نمونے اس قسم کی نظم کے دیکھے ہیں، ان میں پہلے مصرع کا آخر رکن مستفعلن ہوتا ہے، مستفعلان نہیں، لہٰذا ہر بند کے دوسرے بیت کا آخری مصرع ہم قافیہ ہوگا۔ اس کے اہم ترین زحافات یہ ہیں: مستفعلن سے س یا ف گر جاتی ہے اور فعلان کو اکثر فاعلان کر لیتے ہیں۔ الابشیہی: المستطرف، بولاق ۱۲۹۲ھ، ۲ : ۲۷۳ ببعد؛ ابوالفداء: تاریخ، قسطنطنیہ ۱۲۸۶ھ)، ۴ : ۱۵۸؛ اور بالخصوص حریفیش: الروض الفائق، قاہرہ ۱۳۱۱ھ ص ۲۳، ۲۶، ۲۹، ۳۳، ۳۴، ۴۲، ۵۳، ۵۵، ۷۱، ۷۴، ۷۷، ۸۰، ۸۶، ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۴۴، ۱۶۹، ۱۸۱، ۱۹۱، ۲۰۴، ۲۱۷ میں کان و کان کے نمونے دیے ہیں۔

مآخذ : ان مآخذ کے علاوہ جن کا ذکر مقالۂ عروض میں آیا ہے، دیکھیے (۱) الخفاجی: شفاء الغلیل، قاہرہ ۱۳۲۵ ص ۹؛ (۲) المحبّی: خلاصة الاثر، قاہرہ ۱۲۸۴ھ، ۱ : ۱۰۹؛ (۳) الابشیہی: المستطرف، بولاق ۱۲۹۲ھ، ۲ : ۲۵۲ تا ۲۷۷؛ (۴) محمد طلعت: غایة الارب فی صناعات شعرالعرب، قاہرہ ۱۳۱۶ھ، ص ۹۲ تا ۱۱۰؛ (۵) محمد زیات: تاریخ آداب اللغة العربیه، قاہرہ (بلا تاریخ)، ۱ : ۱۲۹ تا ۱۵۰؛ (۶) H. Gies : *al-Funūn-al-Sab'a.-Ein Beitrag z. rennin. sieben neuerer arab. Versarten*، مقالہ، لائپزگ ۱۸۷۹ء، ص ۵۳ تا ۶۲.

(Moh. Ben Cheneb)

* **کانون** : ایک مہینے کا نام جو تَدْمُر (Palmyra) کے قدیم کتبوں میں بھی ملتا ہے (دیکھیے S. A. Cook: *A Glossary of Aramaic Inscriptions*، بذیل مادّہ) اور مَرْحیشوان کا مرادف ہے۔ بعد کے زمانے میں یہ مہینوں

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کے سریانی ناموں میں (دیکھیے Payne Smith : *Thesau-rus Syr.*، ذیل مادّہ) کانون قدم (kᵉdēm) یا قدمایا (kaḏmāyā) اور کانون حرای ḥrāy یا حرایا ḥrāyā کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ۔ یہ یہاں دونوں کانون بالترتیب نواں اور دسواں مہینا ہیں ۔ البیرونی اپنی کتاب الآثارالباقیہ، (طبع Sachau، ص ۶۰) میں سریانی ناموں کو صحیح طور پر کانون قدیم اور کانون حرای کی شکل میں نقل کرتا ہے ۔ عربی اصطلاح میں یہ مہینے کانون الاوّل اور کانون الآخر کہلاتے ہیں ۔ ان میں سے پہلے کا ذکر حدیث میں ایک قابل لحاظ عنوان سے آیا ہے ۔ مسلم: صحیح، کتاب الاشربۃ، حدیث ۹۹، میں پانی کے برتنوں کو ڈھانپ کر رکھنے کے قاعدے کے ضمن میں جس کا ذکر دوسرے مقامات پر بھی آیا ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ ''سال میں ایک رات ایسی بھی آتی ہے جس میں وبا کسی بے ڈھکے برتن کو نہیں چھوڑتی'' ۔ اسی حدیث کی ایک اور روایت میں یہ اضافہ کیا گیا ہے : ''ہمارے درمیان رہنے والے باہر کے لوگ (اعاجم) اس کا خدشہ کانون الاوّل میں ظاہر کیا کرتے تھے''۔

(A. J. WENSINCK)

* **کانی ابوبکر** : دور عثمانیہ میں قدیم دبستان ادب کا ایک قابل ذکر شاعر اور ایک صاحب طرز نثر نگار، ایشیائے کوچک میں توقاد Tokad کے مقام پر ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں پیدا ہوا ۔ ابھی نوجوان ہی تھا کہ اس نے اپنے آبائی شہر میں ایک صاحب طرز ادیب اور شاعر کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کر لی ۔ وہ سلسلۂ مولویہ سے وابستہ تھا اور اسے توقاد کی خانقاہ مولویہ کے شیخ کی خدمت تفویض کی گئی تھی ۔ اس کی زندگی کا ایک اہم انقلاب انگیز واقعہ یہ ہے کہ ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴-۱۷۵۵ء میں حکیم اوغلو علی پاشا کا توقاد سے گزر ہوا، جسے طربزون Trebizond سے قسطنطنیہ تیسری بار صدر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کے لیے لایا گیا تھا ۔ کانی نے اس کی خدمت میں ایک قصیدۂ استقبالیہ اور ایک مادّۂ تاریخ پیش کیا، جس سے وہ سن رسیدہ سیاست دان اس قدر متأثر ہوا کہ اس کے شیخ طریقت سے اجازت لے کر کانی کو اسی وقت اپنے ساتھ قسطنطنیہ لے گیا اور دیوان شاہی میں ایک عہدہ عطا کر دیا ۔ اس طرح کانی کے سامنے اعلیٰ سرکاری عہدے حاصل کرنے کا راستہ کھل گیا، لیکن جاہ طلبی کا مادّہ اس کی فطرت ہی میں نہیں تھا: اسے تو وہی بے نیازی کی اور ایک حد تک پابندیوں سے آزاد زندگی پسند تھی جو وہ اپنے آبائی شہر میں بسر کرتا رہا تھا ۔ وہ ایک سست ہمت شخص تھا اور اپنی طویل عمر کے آخری ایام میں کہیں جا کر اس نے اپنے طریقے کی سالکانہ زندگی کی طرف رجوع کیا تھا، چنانچہ اس نے اپنے سرپرست کی معزولی سے جو صرف دو ماہ تک عہدہ سنبھالنے کے بعد پیش آئی، یہ فائدہ اٹھایا کہ قسطنطنیہ کی ملازمت ترک کر دی ۔ اس کے بعد اس کی سرگرمیاں صرف صوبوں، یعنی سلستره (Silistria)، افلاق (Wallachia) اور بخارسٹ Bucharest، تک محدود رہیں ۔ وہ خاصے عرصے تک گورنر الیگزنڈر کے ہاں معتمد دیوان رہا ۔ سنایہ Sinaya کے عجائب گھر میں ایک تصویر ہے، جس میں یہ دونوں اکھٹے نظر آتے ہیں ۔ بالآخر جب یکن محمد پاشا، جو پیشتر ازیں کانی کا بہت گہرا دوست رہا تھا، صدارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوا (۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء) تو اس نے کانی کو قسطنطنیہ بلا لیا، لیکن اس طلبی سے بدبختی کے سوا کانی کے ہاتھ کچھ نہ آیا ۔ کانی نے رسوم و آداب کا مطلقاً خیال نہ کیا اور صدر اعظم سے پرانے زمانے کی طرح، جب ان دونوں کے مرتبے میں کوئی فرق نہیں تھا، بے تکلفی سے پیش آتا رہا ۔ اس کے علاوہ اس نے بے پروائی سے کچھ ایسی باتیں بھی منہ سے نکال

www.besturdubooks.wordpress.com

دیں جنھیں پوشیدہ رکھنا ضروری تھا ۔ یکن پاشا نے اس کی ان حرکات سے برافروختہ ہو کر اس کے لیے سزاے موت کا حکم صادر کر دیا، جسے بڑی مشکل سے لمنوس Lemnos میں جلاوطنی کی سزا میں تبدیل کرایا گیا ۔ اس کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی، چنانچہ اب اسے غربت کے مصائب کا بھی سامنا کرنا پڑا ۔ اس نے ربیع الآخر ١٢٠٦ھ/جنوری ۔ فروری ١٧٩٢ء میں وفات پائی اور [قبرستان] ایوب میں دفن ہوا ۔ سروری اور سنبل زادہ نے اس کی وفات کی تاریخیں لکھیں ۔

کانی عثمانی ادب کے اس زمانے کی ایک اہم شخصیت ہے جب کلاسیکی طرز نگارش کے بعد رومانی دور شروع ہوا، جس کے دوران میں ایرانی اثرات ختم ہو گئے اور ان کی جگہ زیادہ تر جذبۂ قومیت نے لے لی ۔ کانی بحیثیت شاعر کچھ ایسا ممتاز نہیں، بلکہ اس میں عثمانی شعرا کی بنیادی خصوصیات، یعنی زبان کی سلاست اور صفائی کا بھی فقدان پایا جاتا ہے ۔ اس کے کلام میں بہت سی ناهمواریاں اور زبان کی درشتی پائی جاتی ہے، جس کا تعلق اس کے عام طرز عمل سے بہت گہرا ہے ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ہر واقعے اور موقع پر فی البدیہہ شعر کہہ دیتا تھا ۔ یہاں یہ ذکر بھی کر دینا چاہیے کہ کانی نے خود نہ تو کبھی اپنے کلام کو جمع یا مرتب کیا اور نہ اپنے دیوان پر نظرثانی کی ۔ یہ محض رئیس الکتاب محمّد راشد افندی کی تحریک تھی کہ نوری نے اس کا وہ تمام کلام جو اس وقت دستیاب ہو سکا، جمع کر لیا اور دیوان شائع ہوگیا ۔ اس کے کلام کا ایک حصہ ضائع ہو چکا ہے ۔ اس نے ترکی کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے ۔

اس کی منظومات میں متعدد حمدیہ نظمیں، نظیرے، تخمیسات، قصائد، تاریخی مادّے اور سیکڑوں غزلیات موجود ہیں ۔ جو چیز کانی کے کلام کو دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی بذلہ سنجی، مزاح اور اس کا ظریفانہ اسلوب بیان ہے، ورنہ اس سے پہلے قدیم ترکی شعرا کے ہاں ظرافت کا فقدان نظر آتا ہے ۔

ایک نثرنگار کی حیثیت سے کانی کو اس کی منشئات کی بنا پر بہت بلند مرتبہ دینا چاہیے ۔ اس کے بارے میں ابوالضیا توفیق کی بہت اعلیٰ راے تھی : ''جہاں تک اس کے اسلوب نگارش کا تعلق ہے کسی قوم میں اس مرتبے کے نثر نگار پانچ یا چھے سے زیادہ نہیں ہوا کرتے'' ۔ کانی اپنے مکتوبات میں اپنی طبیعت کی شوخی و ظرافت کا بڑی آزادی سے مظاہرہ کرتا ہے اور نہایت عجیب و غریب شگفتہ آرائشی جملے لکھتا ہے ۔ اس کا مقابلہ [ایک مشہور فرانسیسی مصنّف] Rabelais [م ١٥٥٣ء] سے کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے کئی ظریفانہ اقوال اور حکایات محفوظ ہیں ۔ وہ اپنی خوش باش طبیعت اور ظرافت کی بدولت بے حد ہردلعزیز ہو گیا اور اس کے خطوط (جن میں سے صرف ١٢٠ موجود ہیں) اور منظومات پر سامعین اور قارئین اس طرح داد دینے لگے کہ موجودہ زمانے کے مذاق اور فکر کو پیش نظر رکھتے ہوے اس کا اندازہ پوری طرح لگانا محال ہے ۔ اس کی تصنیفات کو خاص طور پر اہمیت اس کے اسلوب بیان کی بدولت حاصل ہے کیونکہ وہ بسا اوقات ایسے عام پسند جملے استعمال کر جاتا ہے جو ادبی زبان میں نہیں ملتے اور ایسی باتیں کہ جاتا ہے جو غیر متوقع بھی ہوتی ہیں اور غیر معمولی بھی ۔

مآخذ : (١) احمد رفعت : لغات تاریخیہ و جغرافیہ، قسطنطنیہ، ١٣٠٠ھ، ٦ : ٧٠؛ (٢) نوری : منشئات عزیزیّہ، قسطنطنیہ، ١٣٠٣ھ، ص ٦٢ تا ٦٤؛ (٣) ابوالضیا توفیق : نمونۂ ادبیات عثمانیہ، قسطنطنیہ، ١٣٠٨ھ، ص ٤٣ تا ٦١؛

www.besturdubooks.wordpress.com

(۴) معلم ناجی، اُسامی، قسطنطینیه، ۱۳۰۸ھ، ص ۲۶۱ تا ۲۶۳؛ (۵) جودت : تاریخ، قسطنطینیه، ۱۳۰۹ھ، ۵ : ۲۳۴ تا ۲۳۵؛ (۶) سامی : قاموس الاعلام، قسطنطینیه، ۱۳۰۶ تا ۱۳۱۴ھ، ۵ : ۲۸۱۹؛ (۷) ثریا : سجلِّ عثمانی، قسطنطینیه، ۱۳۱۵ھ، ۴ : ۷۴؛ (۸) شهاب الدین سلیمان : تاریخ ادبیّاتِ عثمانیه، قسطنطینیه ۱۳۲۸ھ، ص ۲۳۱ تا ۲۳۹؛ (۹) v. Hammer : *Gesch. d. Osman. Dichtkunst*، ۴ : ۳۶۶ تا ۳۶۷؛ (۱۰) Gibb : *A History of Ottoman Poetry*، ۴ : ۱۵۹ تا ۱۷۴.

(TH. MENZEL)

* **کاوِین [کابین]** : مہر؛ رک به مهر و نکاح .

* **کاهن**: رک به الکُهّان .

* **الکاهِنة** : اس کا نام (دَمْیَة یا دهیه) مشکوک ہے، کیونکہ کاهنه صرف ایک لقب ہے ۔ ابن خَلْدون کے بیان کے مطابق اس کا تعلّق اَوْراس [رک بآن] کے ایک یہودی (؟) قبیلے جَرْوَه سے تھا ۔ بربروں کے ان شیوخ کا تعلق امی قبیلے سے تھا جو الابتر کی نسل سے تھے۔ جب حسّان بن النّعمان [رک بآن] نے بوزنطیوں پر فتح پائی تو وہ اَوْراس کی طرف بڑھا، جہاں کاهنه حکومت کرتی تھی ۔ کاهنه نے اسے مِسْکیانَة (عَیْن بَیْضاء اور تِبِسّة کے درمیان—موجودہ ضلع قسنطینه میں) کے مقام پر اور بعض دوسرے مآخذ کی رو سے قابِس (Gabes) کے علاقے یا نِنی (Nini) کے نخلستان میں شکست فاش دی اور افریقیه کی حدود سے باہر نکال دیا ۔ چونکه خلیفه عبدالملک ان دنوں مشرقی ممالک میں اپنی جنگوں کی وجه سے مشکلات میں گرفتار تھا، اس لیے کمک بھیجنے میں دیر ہو گئی ۔ کہا جاتا ہے که اس زمانے میں کاهنه نے سارے ملک کو اپنے حلقۂ اقتدار میں شامل کر لیا اور عربوں کے نئے حملوں کو روکنے کے لیے کئی شہر تباہ کر دیے، جنگل کاٹ دیے اور ملک کو ویران کر ڈالا ۔ کہتے ہیں که اسی زمانے میں کاهنه نے ایک قیدی خالد بن یزید القَیْسی کو، جس کے ساتھ اسے رضاعی قرابت کا دعوٰی تھا، اپنا متبنّٰی بنا لیا، لیکن یه حسن سلوک اس متبنّٰی کو اس سے بے وفائی کرنے سے باز نه رکھ سکا ۔ ملک کو تاخت و تاراج کر دینے کے باعث رعایا کاهنه سے کشیده خاطر ہو گئی؛ چنانچه پانچ سال بعد جب حسّان بن النّعمان کمک لے کر واپس آیا تو طَبْرَقه کے مقام پر ایک خونریز جنگ (۸۲ یا ۸۴ھ/۷۰۱ یا ۷۰۳ء) میں کاهنه کو شکست ہوئی، اور وہ اَوْراس میں اس جگه ماری گئی جو بیرالکاهنه کے نام سے مشہور ہے ۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے کاهنه کے مشورے سے اس کے دو بیٹے عربوں سے جا ملے تھے اور انھیں اسلامی فوج میں، جس نے بربروں کے خلاف جنگ جاری رکھی، عہدے بھی دے دیے گئے تھے ۔ حقیقت یه ہے که ہمیں وثوق سے اتنا بھی معلوم نہیں که کاهنه کوئی ملکه تھی یا فاطمه کی طرح، جو لله ۱۸۵۷ء میں فرانسیسیوں کے خلاف القبائل کی مدافعت کی روح و رواں لله فاطمه کی طرح اس کے بارے میں بھی جو کچھ بیان کیا جاتا ہے، (مثلاً جان بوجھ کر شمالی افریقه کو تاخت و تاراج کرنا، قلعة الجم (Thysdrus کی مدور تماشاگاہ) میں اس کی مدافعانه جنگ، اور اس کی موت سے متعلّق حالات و واقعات) وہ تقریباً سب افسانوی باتیں ہیں ۔ ایک بربر ماہر الانساب هانی بن بکور تو یہاں تک کہتا ہے که اس نے ۶۵ سال حکومت کی اور ۱۲۷ سال کی عمر پائی .

مآخذ : (۱) ابن خَلْدون : العِبَر، ۷ : ۸ ببعد، جزوی فرانسیسی ترجمه از de Slane : *Histoire des Berbéres*، ۱ : ۲۱۳ تا ۲۱۵؛ ۳ : ۱۹۳ ببعد؛ (۲) البَلاذُری : فتوحُ البُلْدان، طبع de Goeje، ص ۲۲۹؛ (۳) ابن عذاری :

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

البیان المغرب، طبع Dozy، ۱ : ۲۰ تا ۲۴؛ (۴) البکری : المسالک و الممالک، جزوی طبع از de Slane : *Descrip-tion de l'Afrique septentrionale*، ص ۷ ببعد، ۳۱؛ (۵) التجانی: الرحلة، مترجمهٔ روسو Rousseau، ص ۶۴ تا ۶۹؛ (۶) النویری، در *Histoire des Berbères*، ۱ : ۳۴۰ تا ۳۴۲ (ضمیمه ۲)؛ (۷) ابن النّاجی : معالم الایمان (تونس ۱۳۲۰ھ، ۴ جلد)، ۱ : ۵۶ تا ۶۱؛ (۸) محمود بن سعید مقدش السفاقصی : نزهة الانظار (تونس ۱۳۲۱ھ، ۲ جلد)، ۱ : ۶۷ تا ۸۰؛ (۹) ابن ابی دینار القیروانی : کتاب المؤنس، تونس ۱۲۸۶ھ، ص ۳۱ ببعد؛ (۱۰) مولیٰ احمد : رحلة، مطبوعهٔ فاس، ص ۴۸ تا ۵۱ و مترجمهٔ Feilrugger : *Voyages dans. le sud de l' Algérie*، در *Explor. scient. de l' Algerie*، پیرس ۱۸۴۶ء، ۹ : ۲۳۴ تا ۲۴۱؛ (۱۱) الأرثلانی: نزهة الانظار، الجزائر ۱۳۲۶ھ، ص ۱۰۱ تا ۱۰۴؛ (۱۲) Mercier : *Histoire de l' Afrique septentrion-als*، ۱ : ۲۱۲ تا ۲۱۸؛ (۱۳) Fournel : *Les Berbers*، ۱ : ۲۲۴ تا ۲۲۸؛ (۱۴) Faure-Biguet : *Histoire de l' Afrique septentrionale*، مطبوعهٔ پیرس، ص ۲۵ تا ۲۷؛ (۱۵) Masqueray : *Traditions de l' Auras*، در *Bulletin de Correspondance Africaine*، *Oriental* ۱۸۸۵ء (حصه ۱ و ۲)، ص ۸۰ تا ۸۳ (جہاں اسے جمعه کا نام دیا گیا ہے)؛ (۱۶) De Lartigues : *Monographie de l' Aurés*، قسنطینه ۱۹۰۴ء، ص ۱۸۲.

[RENE BASSET]

⊗ **کائتانی :** (Leone Caetani) اٹلی کا ایک مشہور اور ممتاز مستشرق، جسے اسلامی تاریخ کے مطالعے اور تصنیف و تالیف کے ساتھ شغف جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا ۔ وہ تیانو Teano کی ریاست کا رئیس تھا اور اپنی ریاست کی آمدنی کا خاصا حصہ اپنے علمی شوق کی تسکین میں صرف کرتا تھا ۔ اسی دھن میں اس نے اپنے محل میں ایک وسیع کتاب خانہ قائم کر رکھا تھا، جس میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ بہت سے مخطوطات بھی تھے، جو اس نے مشرقی ملکوں میں اپنے خاص گماشتے بھیج کر حاصل کیے تھے .

کائتانی کی سب سے مشہور تصنیف *Annali de ll'Islam* ہے ۔ یہ کتاب عہد رسالت اور خلافت راشدہ کی مفصل تاریخ ہے اور جس تفصیل سے یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کی دس ضخیم جلدیں ہیں، جن کے صفحات کی مجموعی تعداد آٹھ ہزار کے قریب ہے ۔ اس تاریخ کی اشاعت میں بیس سال صرف ہوئے، جو ۱۹۲۶ء میں تکمیل کو پہنچی ۔ پرنس کائتانی نے کئی بار مشرقی ملکوں کا سفر کیا اور وہاں کے تاریخی مقامات خصوصاً میدان ہائے جنگ کے فوٹو لیے، جو اس کی کتاب میں شامل ہیں.

راقم مقالہ نے پرنس کائتانی اور اس کی تصنیف کو اردو دان طبقے سے روشناس کرایا ۔ مصنف نے اپنی تاریخ کی ابتدا میں ایک دیباچہ لکھ کر اس میں اپنے اغراض و مقاصد اور طرز تالیف کی وضاحت کی تھی ۔ مقالہ نگار نے اس دیباچے کا اردو ترجمہ کیا، جو ۱۹۲۸ء میں معارف (اعظم گڑھ) کے کئی شماروں میں بالاقساط شائع ہوتا رہا .

کائتانی کی دوسری اہم کتاب *Chronographia Islamica* ہے، جس میں ۱ھ سے لے کر ۱۳۲ھ تک کے واقعات اختصار کے ساتھ درج کیے گئے ہیں، گویا اس میں عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے علاوہ اموی عہد بھی شامل ہے ۔ ہر واقعے کے اندراج کے بعد اس کے مآخذ دے دیے گئے ہیں اور ان میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ قلمی نسخوں کے حوالے بھی شامل ہیں ۔ ہر سال کے اختتام پر وفیات کی فہرست ہے، یعنی جن مشاہیر نے کسی خاص سال میں وفات پائی، ان کے اسما

www.besturdubooks.wordpress.com

کو حوالۂ کتاب کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی ضخامت ۱۷۱۶ صفحات ہے۔

پرنس کائتانی اٹلی کی پارلیمنٹ کا رکن تھا اور اپنی ریاست کے انتظام کے علاوہ سیاسی معاملات میں بھی حصہ لیتا تھا۔ عمر کے آخری حصے میں وہ ترک وطن کر کے کینیڈا چلا گیا اور وہیں ۱۹۳۵ء میں وفات پائی۔

پرنس کائتانی نے جو کتب خانہ جمع کیا تھا وہ ایک وقف کی صورت میں La Fondazione Caetani کے نام سے شہر روم میں اب تک محفوظ ہے۔

مآخذ: (۱) نجیب العقیقی: المستشرقون، ۱: ۳۷۲ تا ۳۷۳؛ (۲) T. Fück: *Die Arabische Studien in Europa, Isp.*، لائپزگ ۱۹۵۵ء۔

(شیخ عنایت اللہ)

⊗ **کَبائِر:** [ع]؛ کبیرۃ کی جمع؛ اس کی ضد صغیرۃ ہے جس کی جمع صغائر آتی ہے؛ لغوی معنی: بڑی چیز، بڑی بات [مفردات]؛ شرعی اصطلاح کے مطابق کبیرۃ اس (بڑے کام یا) بڑے گناہ کو کہتے ہیں جو حرام محض ہو اور شریعت نے اس کے مرتکب کے لیے نصِّ قطعی کے ذریعے دنیا و آخرت میں کوئی سزا تجویز کی ہو۔ علامہ دوّانی (شرح العقائد العضدیہ، مخطوطۂ پنجاب یونیورسٹی، ورق ۶۶) کہتے ہیں: کبیرۃ کی تعریف میں علما کا اختلاف ہے، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کبیرۃ ایسا کام ہے جس کے ارتکاب کی کوئی حد (سزا) مقرر کی گئی ہو؛ کچھ علما کی رائے میں کبیرہ وہ ہے، جس کے لیے کتاب و سنت کی نص کے مطابق حد یا تعزیر یا وعید مقرر ہو، یا یہ معلوم ہو جائے کہ اس کام کا فساد اس قسم کا ہے جس کے مطابق تینوں سزاؤں میں سے کوئی ایک دی جا سکتی ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ کبیرہ ہر وہ گناہ ہے، جس کے نتیجے کے طور پر دوزخ یا اللہ کا غضب یا اس کی طرف سے لعنت یا کسی اور عذاب کا تعین کیا گیا ہو (التفسیر المظہری، ج ۲، سورۃ النساء، بذیل آیۃ ۳۱)۔ ابن سیرین کے نزدیک اس کام کا ارتکاب، جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے، کبیرہ ہے اور امام حسن بصری، سعید بن جبیر اور ضحاک وغیرہم کا کہنا ہے کہ ہر وہ کام کبیرہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں وعید کے ساتھ آتا ہے (ملاعلی القاری: شرح الفقہ الاکبر، ص ۶۸)۔

کبیرۃ کا لفظ قرآن مجید میں تین مقامات پر آتا ہے: (البقرۃ: ۲۱۹ و ۲۲۳؛ الکہف: ۴۹، مگر تینوں آیتوں میں کبیرۃ سے مراد "بڑی چیز" یا "بوجھل چیز" ہے؛ البتہ قرآن مجید میں برے "کاموں" یا "گناہوں" کے لیے (کبیرۃ کی جمع) کبائر کا لفظ استعمال ہوا ہے اور وہ حسب ذیل تین مقامات ہیں: ۴ [النساء]: ۳۱؛ ۴۲ [الشوریٰ]: ۳۷؛ ۵۳ [النجم]: ۳۲۔

تفاسیر اور احادیث نبویہ میں مختلف اعمال سَیِّئَہ کا "کبائر" میں ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے فرمایا: "سات مہلک چیزوں سے بچو اور وہ یہ ہیں: شرک باللہ، جادو، بغیر حق کسی کا قتل، اکلِ سود، اکلِ مالِ یتیم، جہاد کے وقت میدان جنگ سے فرار، پاکباز مؤمن خواتین پر بدکاری کا الزام"۔ عبید بن عمیر کی روایت میں بشمول مسلمان والدین کی نافرمانی اور بیت اللہ کی ہتک، نو مہلکات کا ذکر ہے (ابو داؤد، کتاب الوصایا، حدیث ۲۸۷۴، ۲۸۷۵)۔ ایک اور روایت کے مطابق کسی نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا: "کیا کبائر کی تعداد سات ہے؟" آپ نے جواب دیا: "کبائر سات سو کے قریب ہیں، مگر یاد رکھو کہ توبہ و استغفار کی صورت میں کوئی گناہ کبیرہ باقی

www.besturdubooks.wordpress.com

نہیں رہتا اور اصرار کرنے سے کوئی گناہ صغیرہ نہیں رہتا" ۔ شرح عقائد عضدیہ میں حسب ذیل امور کو کبائر کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے : قتلِ نفس بغیرالحق، زنا، لواطت، شراب نوشی، کسی کا مال (کم از کم ایک دینار) کا چھین لینا، قذف (زنا وغیرہ کی تہمت)، ہر ایسی مُسکِر چیز کا استعمال جس کا انجام شربِ خمر کی طرح ہو، جھوٹی گواہی، سود خوری، رمضان میں دن کے وقت (بلا عذر) روزہ توڑنا، جھوٹی قسم، قطعِ رحم، والدین کی نافرمانی، دشمن کے مقابلے میں پیٹھ دکھانا، یتیم کا مال کھانا، ناپ اور تول میں خیانت، بلا عذر نماز کا وقت سے پہلے یا وقت گزرنے کے بعد ادا کرنا، کسی مسلمان کو بغیر حق مار ڈالنا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے بارے میں جان بوجھ کر غلط بات کہنا، صحابہؓ کو گالی دینا، بلا عذر گواہی کا چھپانا، رشوت لینا، عورتوں اور مردوں میں فواحش کے لیے دلالی کا کام انجام دینا، حاکم کے پاس چغلی کھانا، زکوٰۃ نہ دینا، استطاعت کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دینا، قرآن مجید کا علم حاصل کر کے بھلا دینا، کسی حیوان کو آگ میں زندہ جلانا، بلا سبب بیوی کا خاوند سے دور رہنا، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامیدی اور تدبیر (مکر) کے ذریعے اس سے اپنے آپ کو مأمون سمجھنا، اہل علم اور حاملین قرآن مجید کی اہانت، ظہار (بیوی کو ماں کہہ دینا) اور خنزیر کا گوشت کھانا ۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے لکھا ہے کہ کبائر کے تین مراتب ہیں :

۱ ۔ اکبر الکبائر : یعنی شرک باللہ؛ حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعود کا قول ہے کہ الاشتراک باللہ، الامنِ مِن مکر اللہ، القنوط مِن رحمۃ اللہ اور الیاس مِن روح اللہ، اکبر الکبائر ہیں ۔

۲ ۔ وہ کبائر جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے؛ ان میں کسی مسلمان کے خون، مال اور عزت پر ناجائز طور پر ہاتھ ڈالنا شامل ہے؛ نیز قتلِ اولاد (اس سبب سے کہ وہ بھی رزق کھانے میں شریک ہو جائے گی)، ہمسائے کی بیوی سے بدکاری اور سبُّ الوالدین (کسی کے باپ یا ماں کو گالی دی جائے اور وہ جواباً گالی دینے والے کے ماں یا باپ کو گالی دے) اس کے تحت آتے ہیں ۔

۳ ۔ وہ کبائر جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، جیسے زنا، شراب خوری، لواطت، ڈاکہ، وغیرہ ۔

ارتکاب کبائر کے سلسلے میں علما کے درمیان یہ اہم اختلاف چلا آ رہا ہے کہ ان کا مرتکب شریعت کی نظر میں کیسا ہے ؟

خوارج کے نزدیک صغیرۃ و کبیرۃ دونوں کا مرتکب کافر ہے؛ اگر وہ مرنے سے پیشتر توبہ نہیں کر لیتا تو خلود فی النار کا مستحق ہوگا اور اللہ اسے معاف نہیں کرے گا ۔

معتزلہ کے نزدیک مرتکب کبیرہ ایمان سے نکل جاتا ہے، لیکن کفر میں داخل نہیں ہوتا ۔ واصل بن عطاء کا یہی مذہب تھا؛ وہ مرتکب کبیرہ کے لیے منزلۃ بین المنزلتین کا قائل تھا ۔

مرجئہ کا کہنا ہے کہ مؤمن کو بحالتِ ایمان کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچاتا جیسا کہ کفر کے لیے بحالت کفر کوئی طاعت نفع بخش نہیں ہوتی ۔

ازارقہ [خوارج کا ایک گروہ] مرتکب کبیرہ کو مشرک کہتے ہیں اور زیدیہ کا قول ہے کہ وہ شخص اللہ کی نعمتوں کا مُنکر ہے ۔ امام حسن بصری نے ایسے شخص کو منافق قرار دیا ہے ۔

علمائے اہل السنۃ والجماعۃ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ بسبب بقائے تصدیق دائرۂ ایمان سے خارج نہیں ہوتا، شرح المواقف میں بیان کیا گیا ہے : اِنَّ مرتکبَ الکبیرۃ مِن اھلِ الصَّلاۃِ ای مِن

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

اهل القبلة مؤمن (جملۂ ثانی، ورق ۹۷ م)۔ عقائد نسفی (صفحہ ۸) میں ہے : والکبیرة تخرج المؤمن من الایمان ولا تدخله فی الکفر.

اہل السنت کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ اگر کوئی گنہگار توبہ کے بغیر مر جائے تو وہ اللہ کی مشیت کے تابع اور اس کے رحم و کرم پر ہے ۔ اللہ چاہے تو اسے معاف کر دے اور جنت میں داخل کر دے اور چاہے تو اسے اس کے گناہوں کے مطابق عذاب دے .

امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول بھی موجود ہے: "ہم کسی مسلمان کی تکفیر اس کے گناہوں کے سبب نہیں کرتے، اگرچہ وہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہوں، بلکہ اس شرط سے کرتے ہیں کہ وہ اس ارتکاب گناہ کو حلال جانتا ہو، کیونکہ معصیت کو حلال سمجھنا بدلیل قطعی اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی تکذیب کرنا ہے اور ایسا انسان کافر ہو جاتا ہے" (المغنیساوی: شرح الفقه الاکبر، ص ۲۷)۔ اس سلسلے میں ملا علی القاری نے مزید لکھا ہے کہ فرض اور واجب کا بلا عذر ترک کرنا، اگرچہ ایک مرتبہ ہی کیوں نہ ہو، گناہ کبیرہ ہے اور اسی طرح ترک سنت، ارتکاب مکروہ پر اصرار بھی کبائر میں شامل ہے (شرح الفقه الاکبر، ص ۶۸)؛ نیز دیکھیے شاہ ولی اللہ دہلوی : حجة الله البالغة .

مآخذ : (۱) الجرجانی : شرح المواقف، ج ۲، مخطوطۂ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور؛ (۲) امام ابوحنیفہ؛ الفقه الاکبر نیز اس کی شرح از؛ (۳) ملا علی القاری، دہلی؛ و (۴) ابومنصور الماتریدی، حیدرآباد دکن ۱۳۲۱ھ؛ اور (۵) ابوالمنتہٰی احمد بن محمد المغنیساوی، حیدرآباد دکن ۱۳۲۱ھ؛ (۶) الرازی : محصل افکار المتقدمین و المتأخرین من العلماء والحکماء و المتکلمین، قاهره (۷) الرازی : کتاب الأربعین، حیدر آباد دکن ۱۳۵۳ھ ؛ (۸) الدوّانی : شرح العقائد العضدیة، مخطوطۂ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور ؛ (۹) البغدادی، عبدالقاهر : اصول الدین، جلد اول، استانبول ۱۳۴۶ھ : (۱۰) الشهرستانی : الملل والنحل (الجزءالاول)، قاهره ۱۳۶۸ء؛ (۱۱) الشهرستانی: نهایة الاقدام فی علم الکلام (مع انگریزی ترجمہ از A. Guellaume، لنڈن ۱۹۳۴ء ؛ (۱۲) التفتازانی : شرح العقائد النسفیه، قاهره ۱۳۳۰ھ؛ (۱۳) ابن حزم : الفصل فی الملل والأهواء والنحل (الجزء الثالث) ؛ (۱۴) النّسفی ابوالبرکات : عمدة عقیدة اهل السنة والجماعة، لنڈن ۱۸۴۳ء (مع نجم الدین النسفی : عقائد)؛ (۱۵) E.E. Elder : *A Commentry of the Creed of Islam*؛ نیویارک ۱۹۵۰ء؛ (۱۶) شاہ ولی اللہ دہلوی : الخیر الکثیر، بجنور ۱۳۵۲ھ ؛ (۱۷) ابن منظور : لسان العرب ؛ (۱۸) محمد طاہر پٹنی: مجمع بحار الانوار، مطبع نول کشور، لکھنؤ؛ (۱۹) قاضی عبدالنبی : دستور العلماء (جزو ثالث)، بار اول، حیدر آباد دکن ؛ (۲۰) ابن الأثیر : النهایة فی غریب الحدیث، المطبعة الخیریة، قاهره ؛ (۲۱) E.W. Lane : *Arabic-English Lexicon*؛ (۲۲) الراغب الاصفہانی : مفردات القرآن، بذیل مادّہ (نیز دیکھیے اس کا اردو ترجمہ، از محمد عبداللہ الفلاح، لاہور ۱۳۸۳ھ)؛ (۲۳) الزمخشری : الکشّاف (الجزء الاول)، دارالکتاب العربی، بیروت ؛ (۲۴) ملاجیون جونپوری : التفسیرات الأحمدیة، بمبئی ۱۲۲۷ھ ؛ (۲۵) قاضی ثناء اللہ پانی پتی : التفسیر المظهری، ج ۲، جید برق پریس دہلی ؛ (۲۶) Hughes : *Dictionary of Islam*، لاہور ۱۹۶۴ء ؛ (۲۷) محمد فؤاد الباقی : مفتاح کنوزالسنّة، لاہور ۱۳۹۱ھ ؛ (۲۸) ابن حجر المکّی: الزواجر عن اقتراف الکبائر (تین جلدیں)، قاهره ۱۳۸۴ء .

(امین اللہ وثیر)

کَبْتاش : رک بہ استانبول .

کبد : (لغات نویسوں کے قول کے مطابق* صحیح شکل صرف یہی ہے)، یا کَبْد، کِبْد، بمعنی جگر (کلیجا، کلیجی) .

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۱ - جگر کے نام اور ان پر معنویاتی بحث : دوسرے لوگوں کی طرح مسلمان بھی بدن انسانی کے اندرونی اعضا کو پہچانتے اور انھیں جانوروں کے متماثل اعضا سے مطابقت دیتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے مشاہدات کی بنا پر ان اعضا سے کوئی نہ کوئی جسمانی یا نفسی جسمی (Psychosomatic) فعل بھی منسوب کرتے اور اس کی تعبیر ہر شخص کی ذہنی ساخت کی رو سے کرتے تھے، جسے ہم صرف جزوی طور پر سمجھ سکتے ہیں .

خود زبان سے بھی ان ابتدائی مطابقتوں کی شہادت ملتی ہے، جیسا کہ E. Bargheer نے کہا ہے : "یہ ایسی اہم خصوصیتیں ہیں جو بسا اوقات لوگوں کی تصوراتی دنیا میں کسی عضو کو ایک نمایاں مقام دے دیتی ہیں؛ چنانچہ دل میں یہ خصوصیت اس کی دھڑکن یا متوازن حرکت ہے، پھیپھڑوں میں سانس لینا اور جگر میں اس کی مرکزیت ، دیگر اعضا کے مقابلے میں اس کا غیر معمولی حجم، اس کی قابل تغیر شکل اور اس کا خوردنی ہونا ہے" (*Handwörterbuch des deutschen Aberglaubens*، طبع von. E. Hoffmannkrayer، برلن ۱۹۲۷ تا ۱۹۴۲ء، ج ۵، عمود ۹۷۶، بذیل مادۂ Leber) - عربی میں جگر کا کلاسیکی نام کَبِد ہے، لیکن عربی بولیوں میں اس کی متبادل شکلیں کَبْد اور کِبْد بھی، جو عام طور پر مستعمل ہیں، بہت قدیم زمانے سے دیکھنے میں آتی ہیں (*Wörterbuch der Klassischen Arabischen Sprache*، ویزباڈن ۱۹۷۰ء، ۱ : ۱۸) - دوسری سامی زبانوں کی طرح عربی میں بھی جگر کی طرف توجہ اس کے بڑے وزن کی وجہ سے مبذول ہوئی - جگر کے لیے جو اسم تمام سامی زبانوں میں مشترک ہے اس کا مادہ ک ب د یا ک ب ت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ب کی مناسبت سے اکادی ت کو مغربی سامی د میں تبدیل کر دیا گیا ہے (کَبَتّو، بعد ازآں کَبِتّو، شعر میں کَبْتَتو، جو خیال کیا جاتا ہے کہ اصلی یا ابتدائی شکل تھی (براکلمان : *Grundriss der vergleichen-den Grammatik d. semit. Sprachen*، برلن ۱۹۰۸ - ۱۹۱۳ء، ۱ : ۱۵۲) - ہمیں اکادی میں کَبِدّو، کَبِدّو بھی ملتے ہیں، جو غالباً مغربی سامی سے مستعار ہیں - یہ واضح ہے کہ یہ اسم صفت "بھاری" سے مجازاً مشتق ہیں (اکادی: کَبتو، مؤنث: کَبَتّو، کَبِتّو ؛ عبرانی : کَبید ؛ اوغر: کبد ؛ گیئز : کِبود وغیرہ)۔ یہی صورت متعلقہ فعل کی ہے، یعنی عربی : کابَدَ = جھیلنا، سہارنا (H. Holma : *Die Namen der Körperteil im Assyrisch-Babylonischen*، لائپزگ ۱۹۱۱ء، ص ۷۸ ؛ P. Fronzaroli: *Studi sul lessico comune semitico*، سلسلہ ۸، ج ۱۹، کراسہ ۵ تا ۶، ۱۹۶۴ء، ص ۳۲ ببعد، ۴۷، ۵۴) - جگر کا ذکر کرنے کے لیے اس استعارے کا استعمال ("سب سے وزنی اور سب سے موٹا برتن"، Galen : *De usu partium*، ۶ : ۱۷ = طبع C.G.Kühn، ۳ : ۴۹۵ و طبع G. Helmreich، ۱ : ۳۶۰، ص ۱۹ ببعد) ایک سامی جدّت ہے؛ اس کے مقابلے میں 'حامی - سامی' زبانوں میں اس کے لیے متعدد مختلف نام ہیں - جیسا کہ A. Cuny کا خیال ہے، یہ امر مشتبہ ہے کہ یہ لفظ انڈو - یورپی زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے "*nostratique*" (*Recherches sur le vocalisme...en*، پیرس ۱۹۴۳ء، ص ۶۸ ببعد) - انڈو- یورپی زبانوں میں جو لفظ سب سے زیادہ مستعمل ہے (مأخوذ از مادۂ یکورت) اس کا تعلق گو مڑے، گلٹی یا رسولی کے مفہوم سے ہے (J. Pokorny : *Indo-germanisches Etymologisches Wörterbuch*، برن - میونخ ۱۹۴۸ - ۱۹۵۹ء، ۱ : ۵۰۴) - ہمارے موضوع بحث میں اس کی نمائندگی زیادہ تر فارسی لفظ "جگر" کرتا ہے (لاطینی : iecur ؛ یونانی ηπαρ،

www.besturdubooks.wordpress.com

وغیرہ) جسے ترکان عثمانی نے بھی اختیار کر لیا (اور سربی کروٹ زبانوں میں جانوروں کے جگر کے لیے) .

۳ جگر کے لیے ترکی مترادف کی سب سے زیادہ مروجہ شکل باغر ہے (جس کی شہادت ینی سای Yenisei کے قدیم Runiform کتبوں سے بھی ملتی ہے، دیکھیے V.G. Egorov: *Etimologiceskiy slovar' cuvasskog Yazika*، چبق ساری ۱۹۶۴ء، ص ۱۵۵، جس نے اس لفظ کی ترکی زبانوں میں سب شکلیں دی ہیں) اور غالباً اس کا تعلق گرہ، پلندے، بوری، جیب کے مفہوم سے ہے (دیکھیے ترکی اسم باغ اور فعل باغلامق؛ لیکن L. Bazin کا خیال ہے کہ اس تعلق میں بعض صوتی دشواریاں پیش آتی ہیں) .

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مذکورۂ بالا الفاظ بہت شروع کے زمانے سے ایک "معیاری" یا "مرکزی" مفہوم کے مطابق پوری طرح مروج ہوچکے تھے (L. Bloomfield: *Language*، بار دوم، لنڈن ۱۹۳۵ء، ص ۱۴۹)، جس سے مراد وہ عضو تھا جسے ہم جگر کہتے ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی شبہہ نہیں کہ اتنے ہی قدیم زمانے سے معنویاتی طور پر ان کا تعلق ضمنی یا مجازی اقدار پر مشتمل مفاہیم سے رہا ہے، جسے ہم "انتقالات معنی" کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں .

معنوں کے اتصال کے باعث ان میں سے بعض "انتقالات" (S. Ullmann: *The Principles of semantics*، گلاسگو ۱۹۵۷ء، ص ۲۳۰ ببعد) کے ذریعے زیر بحث الفاظ بدن کے ان حصوں کے لیے بھی استعمال ہونے لگے جو جگر کے قریب ہیں؛ چنانچہ کلاسیکی عربی میں کبد سے مراد بدن کی ان سطحات کے علاوہ جو کم و بیش جگر کے نزدیک ہیں، سینہ بلکہ پیٹ بھی ہے، مثلاً کسی عورت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کَبِدٌ مُلْسَاءُ = اس کا جگر چکنا ہے، یعنی پیٹ نرم و نازک ہے (الاعشٰی: دیوان، طبع R. Geyar، لنڈن ۱۹۲۸ء، ص ۷۷، شعر ۱۵ الف = طرفہ: دیوان، در W. Ahlwardt: *The divans of the six ancient Arabic Poets*، لنڈن ۱۸۷۰ء، ص ۱۱ شعر ۶ - الف) وغیرہ؛ مزید حوالوں کے لیے دیکھیے *Wörter buch der klassischen Arabischen Sprache*، ویزباڈن ۱۹۷۰ء، ۱ : ۱۸ تا ۲۰) - اسی طرح اویغور میں کہا جاتا ہے: "باغرغہ باصمق" = سینے یا دل سے لگا لینا؛ "باغری یوغان پیلوان" = ایک بہادر (یا ورزشی) آدمی، جس کا سینہ زبردست ہو (E. N. Nadzip: *Uygursko-russkiys slovar'*، ماسکو ۱۸۹۸ء، ص ۲۲۶) - علٰی ہٰذا آذری میں "باغرینہ باصمق" کے معنی ہوتے ہیں گلے لگانا بغل گیر ہونا، اپنے سینے سے چمٹا لینا (H. A. Azizbekov: *Azerbaydzanskoyrusskiy solvar'*، باکو ۱۹۶۵ء، ص ۴۷) .

فارسی میں مرکّب لفظ جگر بند، یعنی جگر مع متعلقات (جس کی شہادت مثلاً سعدی اور شمس تبریزی کے ہاں ملتی ہے) سے مراد ہمت و حوصلہ اور باعتبار مجموعی سینے کے اندرونی اعضا، یعنی پھیپھڑے، دل اور جگر ہوتی ہے - ترکی زبانوں نے اسی زمانے میں لفظ جگر کو اپنا لیا تھا جب سیف سرای نے مصر میں گلستان کا ترکی ترجمہ (۱۳۹۱ء) تیار کیا تھا، نیز دیکھیے É. Fazylov: *Starouzbek-skiy Yazik*، تاشقند ۱۹۶۲ء تا ۱۹۷۱ء، ۱ : ۳۷۰)، لیکن اسی مفہوم کے حامل ایک اور لفظ (باغر، وغیرہ) کی موجودگی، نیز غالباً جگر کے مذکورۂ بالا معنوں میں استعمال کی وجہ سے خود جگر کے معنوں کو وسعت دے کر ایک صدری عضو، یعنی پھیپھڑے کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا حالانکہ اس کے لیے ایک ترکی لفظ (اوقفہ، اوپقہ، اووقہ،

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

اوقبہ، وغیرہ) پہلے سے موجود تھا، جس کے مجازی معنی، یعنی غصہ، رنج، بے اطمینانی، مصیبت، کا ذکر قدیم زمانے میں بھی ملتا ہے (دیکھیے Egorov : *Étim Slovar'*، ص ۲۸۰ ببعد) اور جو اب مروّجہ عثمانی ترکی میں لاطینی لفظ اوفقہ Ofke کا تنہا مفہوم رہ گیا ہے اور جس کے ساتھ عوامی بولی کی اصلاح اویغان (= پھیپھڑا) بھی مستعمل ہے ؛ لہٰذا یہ ضروری ہو گیا کہ ''سیاہ جگر'' (آذری : گرہ جیار ؛ عثمانی ترکی : قرہ جگر ؛ لاطینی رسم الخط میں Kara ciger) — یعنی خود جگر — اور ''سفید جگر'' (آذری : آغ جیار ؛ عثمانی ترکی : آق جگر ؛ لاطینی رسم خط میں ak ciger)، یعنی پھیپھڑے کے مابین تمیز کرنے کے لیے کسی اسم صفت سے کام لیا جائے۔ سلطنت عثمانیہ کے حلقۂ اثر میں بولی جانے والی دوسری زبانوں نے بھی معنوں کے اس فرق کو قبول کر لیا، مثلاً بلغاری (جس میں صفت تمیزی سلاوی لفظ drob کے ساتھ لگائی جاتی تھی نہ کہ لفظ مستعار dziger ۱ = پھیپھڑے اور جگر) کے ساتھ؛ دیکھیے *Bal gariski etimonologicen Recnik*، صوفیا ۱۹۰۶ء، ۵ : ۳۶۲)، یا سربی کروٹ زبان (Crna Dzigerica = ''جگر''؛ Bijela Dzigerica = پھیپھڑا؛ دیکھیے Abdullah Skaljic : *Turcizmi u Srpskohrvatskom jeziku*، سراجیو ۱۹۶۵ء، ص ۲۴۰ ببعد)، بحالیکہ انڈو یورپی لفظ Jetra علم تشریح الابدان کے ایک اصطلاحی مفہوم کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ ''سفید جگر'' کی اصطلاح (کبود بیض) عربی میں بھی، کم از کم بعض موقعوں پر، غالباً پھیپھڑوں کے لیے استعمال ہوتی تھی (ابن جزلہ : منہاج البیان، بذیل مادّۂ کبد، مخطوطۂ کتاب خانۂ ملّی، پیرس، عدد Ar. ۲۹۴۹، ورق ۱۵۹-ب، وغیرہ)۔

اتصال کی بنا پر انتقال معنی کے عمل نے اس تغییر معانی (Semantic) کے میدان کو، جس پر لفظ جگر محتوی تھا، نہ صرف صدری اعضا تک وسعت دے دی بلکہ بدن کے سب اندرونی اعضا بھی اس میں شامل ہو گئے۔ مزید برآں بحیثیت مجموعی ان سب اعضا کا ذکر، ایک کم و بیش مبہم اور محدود طریقے سے لفظ ''جگر'' کے اسم جمع سے کیا جانے لگا ؛ چنانچہ الطبری کے فارسی ترجمے (چوتھی/دسویں صدی) میں لفظ ''جگران'' سے مراد آنتیں ہیں (G. Lazard : *La langue des plus anciens monuments de la prose persane*، پیرس ۱۹۶۳ء، ص ۱۹۵)؛ تاہم ترکی میں خود لفظ باغر (یا ایک لاحقے کے ساتھ باغرسکا) اور اس کی مختلف اشکال) سے مراد ہے پیٹ، توند، نیز آنتیں (حوالوں کے لیے دیکھیے *Drevnetyurskiy slovar'*، لینن گراڈ ۱۹۶۹ء، ص ۷۷، ۷۸)۔ اسی سے مثال کے طور پر اویغوری لفظ باغریماق ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں رینگنا، اپنے کو پیٹ کے بل گھسیٹنا۔ حبشہ کی جدید زبانوں میں بھی ''گیز کبد''، یعنی جگر، کے مرادف قدیم حبشی لفظ، پیٹ، دل، اندرون، آنتوں، توند کے معنی لیے جانے لگے ہیں (تگرہ : کبد ؛ تگرینا : کبدی) اور امہری زبان میں ''ہود'' (از ''کبد''، دیکھیے براکلمان : *Gundriss*، ۱ : ۲۰۴) کے صرف یہی معنی رہ گئے ہیں؛ لہٰذا جگر کے لیے اس زبان میں ایک اور لفظ (Gubbät) استعمال کرنا پڑا۔

معنوں کے اس ہیر پھیر سے ان الفاظ کو کسی چیز کے درمیانی حصے، مرکز، اندرونی حصے (اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قلب) کے لیے استعمال ہونے کی توجیہ ہو جاتی ہے، مثلاً عربی میں کہتے ہیں : فی کَبِدِ جَبَلٍ (= کسی پہاڑ کے قلب میں) ؛ علی کَبِدِ الْبَحْرِ (= کسی سمندر کے قلب میں)، وغیرہ (حوالوں کے لیے دیکھیے *Wörterbuch*، ص ۲۰)۔

www.besturdubooks.wordpress.com

قدیم ترکی میں باغری (= کسی کمان کا جگر) کمان کے مرکزی خم کے لیے استعمال ہوتا ہے (محمود کاشغری : دیوان لغات الترک، استانبول ۱۳۳۳ تا ۱۳۳۵ھ، ۱ : ۳۰۱ ؛ C. Brockelmann : *Mittel turklscher Wörtschatz*، بوڈاپسٹ ۱۹۲۸ء، ص ۲۸)۔ کَبِدُالْقَوس (F. W. Schwarzlose : *Die Waffen der alten Araber*، لائپزگ ۱۸۸۶ء، ص ۲۶۰، ۲۶۵ ببعد؛ A. Boudot-Lamottee : *Contrbuton à l'étu le de l' archerie musulmane*، دمشق ۱۹۶۸ء، ص ۱۶۴، نیز دیکھیے اشاریہ، ص ۱۷۹ و لوحہ ۳) کی بھی یہی صورت ہے۔ تاتاری میں یورال باوری سے مراد ہے کوہستان یورال کا مرکز (*Tatar' sko-russkiy slovar'*، ماسکو ۱۹۶۶ء، ص ۵۱)۔ اسی طرح مثلاً فارسی میں ہے جگر گِل (= ''امعائے زمین، "قبر") ۔ مکان سے زمان کی طرف رجوع کرتے ہوئے ہمیں فی کبدِ لیل" (= رات کے وسط یا قلب میں) کی سی اصطلاحیں ملتی ہیں (ابن سعد : طبقات، ۳/۱ : ۲۰۵ س ۲۲)۔

ترکی میں ان عام معنوں کے اندر بسا اوقات آگے، پیش اور پہلو کا مفہوم بھی شامل ہو جاتا تھا ۔ مثال کے طور پر اوزبک میں طوغ باغریدہ کے معنی "پہاڑ کے پہلو پر" کے ہوتے ہیں (A. K. Borovkov : *Uzbekso-russkiy slovar'*، ماسکو ۱۹۵۹ء، ص ۵۸) ۔ آلتائی کی شور بولی میں لفظ پاغرینده (= بجانب) میں اس کا مفہوم ایک حرف جار کا سا بھی ہو جاتا ہے (W. Radloff : *Versuch einer Wörterbuch der Türk-Dialacte*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۳ تا ۱۹۱۱ء، ج ۴، عمود ۱۱۳۴)۔

۲ ۔ جگر کا قدیم اور مقبول عام نفسی جسمی مفہوم (psycho physiology) : جگر کے لیے (عربی) لفظ کے اعضا اور بدن یا دنیا کے مختلف حصوں کو ظاہر کرنے کے لیے جو بھی ضمنی معنی بنتے گئے، ان سے قطع نظر، قبل نظریاتی دور ہی سے، ایک نہ ایک جسمانی یا نفسیاتی وظیفہ بھی اس عضو سے منسوب رہا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ قلب کے ساتھ جگر کو بھی عام طور پر نفسیاتی زندگی کا مرکز (یا مرکزوں میں سے ایک) یا دوسرے الفاظ میں روح انسانی (یا کسی بھی روح) کا ایک سہارا سمجھا جاتا تھا (W. Wundt : *Völke rpsychologie*، بارسوم، لائپزگ ۱۹۲۰ء، ۴ : ۱۰۵ ببعد؛ A. Merx : *Le rôle du foie dans la littérature des peuples semitques*، در *Florilegium ... Melchior de Vogue*، پیرس ۱۹۰۹ء، ص ۴۲۷ تا ۴۴۴؛ M. Jastrow : *The liver as the seat of the soul* در *Studies in the History of Religion, presented to C. H. Toy*، نیویارک ۱۹۱۲ء، ص ۱۴۳ تا ۱۶۸؛ E. Clements : *Primitive Concepts of Disease*، یکے از مطبوعات جامعۂ کیلیفورنیا، در بارۂ آثار قدیمہ و نسایات امریکہ، ۲/۳۳ (۱۹۳۲ء) : ۲۳۲ ببعد؛ Bargheer : *Leber Eingeweide, Lebens-u. Seelenkräfte des Leibensinneren*، برلن و لائپزگ ۱۹۳۱ء، ص ۹۳؛ W. D. Wallis : *ERE*، ۱۰ : ۳۷۳ ببعد) ۔ چونکہ جگر کو یہ اہمیت حاصل تھی کہ وہ بعض ایسی صفات کا مسکن ہے جن میں ساحرانہ خصائل مضمر ہیں، اسی لیے غالباً سامی زبانوں میں اسے اکثر مؤنث مانا جاتا ہے ؛ چنانچہ یہ سریانی ہی میں نہیں بلکہ عام روایت کے برخلاف قدیم عبرانی میں بھی مؤنث ہے (G. R. Driver، در *JRAS*، ۱۹۴۸ء، ص ۱۷۵، حاشیہ ۲) اور سب سے زیادہ عربی میں؛ اگرچہ عربی میں یہ مذکر بھی ہو سکتا ہے اور نحوی عام طور پر دونوں جنسوں میں شمار کرتے ہیں (A. J. Wensinck : *Some Aspects of Gender in the*

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Semitic Languages، ایمسٹرڈم ۱۹۲۷ء [Verh. Ak. Amst.، ج ۲۶/۳]، ص ۳۰، نیز ص ۳۶ ببعد؛ M. Feghali و A. Cuny : *Der genre grammatical en semitique*، پیرس ۱۹۲۴ء، ص ۵۵).

زیادہ تجزیاتی طریقے پر، اندرونی اعضا سے عام طور پر ایک ایسا متحرک عمل منسوب کیا جاتا ہے جس سے احساسات، جذبات اور خواہشیں پیدا ہوتی ہیں (یہ ایک ایسا تصور ہے جسے یکسر غلط نہیں کہا جا سکتا)؛ لہٰذا میسوپوٹامیا کے لوگوں اور شاید ایک حد تک عبرانیوں کے نزدیک بھی، جگر نہ صرف خوشی کا مسکن تھا (جب یہ صحت و تندرستی کی حالت میں "منور" ہو جاتا ہے) بلکہ رنج و غم (جب یہ "بیمار"، یا دکھتا ہوا ہو) غصّے (جب یہ جل جائے)، سکون (جب یہ خود پرسکون ہو) اور آخر میں قلب کے ساتھ ساتھ خواہش کا بھی (دیکھیے E. Dhorme : *L' emploi métaphorique des noms des parties du corps en hébreu et en akkadien* پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۱۲۸ ببعد؛ Merx : *Le role du foie*، ص ۴۳۶ ببعد، ۴۳۹ ببعد) ۔ عربوں کے نزدیک دل سے منسوب ہونے والے غموں، یعنی آلام عشق سے جگر زخمی ہو جاتا ہے ۔ شرمیلے عاشق یا اسی طرح کا رنج اٹھانے والے کسی شخص کا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے (صدع، فطر، فلق)، ٹوٹ جاتا ہے (کبد مرضوضہ، الحریری : مقامات، طبع Silvestre de Sacy، بار دوم، پیرس ۱۸۴۷ تا ۱۸۵۳ء، ص ۵۷)، گھل جاتا ہے، پیاسا، بوجھل اور سوختہ ہو جاتا ہے ۔ کسی کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "عشق کا رنج و الم اسے کھائے جا رہا ہے" ۔ پتلا اور نازک جگر ایک نرم طبیعت اور حساس دل کی علامت ہے ۔ نیک آدمی کا جسم سیاہ ہو سکتا ہے، لیکن اس کا جگر سفید ہوتا ہے (ابن جبیر، ص ۲۴۰)، یعنی روح پاک و صاف ہوتی ہے (یہ ایک بہت عام استعارہ ہے، جو زمبیا Zambia کے ندمبو باشندوں کے ہاں بھی پایا جاتا ہے (دیکھیے V. W. Turner : *The Drums of Affliction*، اوکسفرڈ ۱۹۶۸ء، ص ۴۸، ۲۸۳؛ نیز Bargheer : *Leber*، ص ۹۷۹ ؛ وہی مصنف: *Eingeweide*، ص ۹۵ ببعد) ۔ جگر کھانا یا اس پر ضرب لگانا سے مراد بہت رنج دینا ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ جگر کو جسم کا ایک خاص طور پر بیش قیمت حصہ سمجھا جاتا ہے اور محبوب لوگوں کا مسکن جگر میں مانا جاتا ہے یا انھیں اس کے ٹکڑوں سے مشابہ قرار دیا جاتا ہے ۔ بچہ جگر کے گہرے خون (مہجہ) کی طرح ہے ۔ کسی عزیز دوست یا محترم انسان کی جگہ جگر اور غشائے جگر کے مابین ہوتی ہے۔ زیادہ عام طور پر جو لوگ کسی کو عزیز ہوں وہ جگر کے ٹکڑے (قطعات) ہیں (حوالوں کے لیے دیکھیے *Wörterbuch*، ص ۱۹ ببعد؛ A. Merx : *Le rôle du foie*، ص ۴۲۹ تا ۴۳۳) ۔ یہ آخرالذکر تعبیر ابھی تک رائج ہے، مثلاً تونس کے گاؤں تکرونہ میں (W. Marçais : *Textes arabes de Takrouna*، پیرس ۱۹۲۵ء، ۱ : ۸۰، ۸۱، ۲۷۲، ۲۹۲، حاشیہ ۴۲، جہاں قدیم متون سے مأخوذ معلومات دی گئی ہیں اور جن میں چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی کا ایک مذارب Mozarab وثاق بھی شامل ہے، جو عیسائیوں کے مابین ہوا تھا) ۔ اس گاؤں میں لفظ جگر سے مراد محض کوئی محبوب ہستی ہوتی ہے یا بالخصوص کوئی بچہ : "یاکبدی" = میرے محبوب (W. Marçais : کتاب مذکور، پیرس ۱۹۶۰ء، ۲/۷ : ۳۳۵۴ تا ۳۳۵۶) ۔ قسنطینہ کے علاقے میں بچوں کو کباد (اکباد) یعنی اپنے ماں باپ کے جگر کہا جاتا ہے (M. S. Belguedj: *La médecine traditionelle dans le Constantinois*، سٹراسبرگ ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۱)؛ [دیکھیے الحماسۃ : آنما اولادنافی بیننا

www.besturdubooks.wordpress.com

اکبادنا تمشی علی الارض] .

بالکل اسی طرح کی تعبیریں فارسی ادب میں بھی پائی جاتی ہیں، جنہیں Merx عربی سے براہ راست ماخوذ سمجھتا ہے (مثال کے طور پر ان تعبیروں کے لیے دیکھیے Merx : *Le role du foie*، ص ۴۳۴ تا ۴۳۵؛ فرہنگ زبان تاجیکی، ماسکو ۱۹۶۹ء، ص ۷۷۹؛ نیز متفرق کتب لغات) ۔ باپ کے لیے اس کا بیٹا اس کے خون جگر کی طرح ہے، اس کی مثال فردوسی : شاہنامہ (طبع Mohl، ۱: ۲۵۶) میں بھی موجود ہے۔ اسی طرح پیارے اور لاڈلے بچے کے لیے جگر پارہ اور جگر گوشہ کے الفاظ آج بھی عام طور پر رائج ہیں .

یہی تصور بعض مذہبی رسوم کی تہ میں بھی مضمر ہے، مثلاً کسی بچے کا نام رکھنے کی تقریب پر باقاعدہ جگر کا کھانا ۔ مراکش میں اس موقع پر ایک بھیڑ قربان کی جاتی ہے اور اس کا جگر خاندان کے افراد میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کے دلوں میں بچے کے لیے الفت و محبت پیدا ہو جائے (J. Jouin : *Hespéris*، ۴۴ (۱۹۵۷ء) : ۳۰۸؛ Legey : *Essai de folklore moracain*، پیرس ۱۹۲۶ء، ص ۹۵؛ E. Westermarck : *Ritual and Belief in Morocco*، لنڈن ۱۹۲۶ء، ۲ : ۳۹۰) ۔ مراکش میں جگر کا تعلق ازدواجی محبت سے بھی سمجھا جاتا ہے؛ بعض قبائل میں دولہا اور دلہن اپنے ایک وقت کے ساتھ کھانے میں اس بھیڑ کا جگر کھاتے ہیں جسے ان کی شادی کے موقع پر ذبح کیا گیا ہو (E. Westermarck : *Marriage ceremonies in Morocco*، لنڈن ۱۹۱۴ء، ۱۰۱؛ یورپ میں اسی قسم کی مثالوں کے لیے دیکھیے Bargheer : *Leber*، ص ۹۷۸ ببعد؛ وہی مصنف : *Eingeweide*، ص ۲۱۶) .

علم الابدان کے ان نظریات میں جو عوام میں رائج ہیں، جگر کو ان [مائعات] کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے جنہیں انسان پیتا ہے یا اپنے بدن سے خارج کرتا ہے ۔ یہ خیال، جسے تیرھویں صدی عیسوی میں Hildegerd، باشندۂ Bingen، نے بہت واضح طور پر بیان کیا تھا (*Causae et curae*، ص ۹۸، ۱۱۰) اور جس کا اظہار اکثر رائج الوقت جرمن محاوروں میں ہوتا ہے (Bargheer : *Leber*، ص ۹۸۴؛ وہی مصنف : *Eingeweide*، ص ۳۸۷)، اسلامی دنیا میں بھی پایا جاتا تھا؛ اس کی شہادت رسائل اخوان الصفا (۲ : ۱۶۲) میں ملتی ہے، جہاں جگر کا فعل مائی غذا پر اثرانداز ہونا بتایا گیا ہے ("بیت الشّراب") .

۳ ۔ سائنسی علم اور عالمانہ نظریات : مسلمان مصنّفین نے علم و فکر کی روشنی میں جگر سے متعلق جو مطالعات کیے ہیں وہ ان اقسام پر مشتمل ہیں : اس عضو کی جسمانی ساخت کا بیان؛ اس کا جسمی نفسی عمل (جو فلسفیوں کے لیے بھی ایسا ہی دلچسپ ہے جیسا کہ ماہرین علم الابدان اور طبیبوں کے لیے)؛ اس کی بیماریوں کی نوعیت، ان کے اسباب اور علاج؛ دواسازی میں جانوروں کے جگر کا استعمال .

طب کے عام رسائل میں بالالتزام جگر کے بارے میں بڑی تفصیل سے بحث ملتی ہے کیونکہ جالینوس کے علم الابدان (Physiology) میں، جسے مسلم سائنس دانوں نے اختیار کر لیا تھا، اس عضو کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ مثال کے طور پر Rufus، باشندۂ Ephesus، اور Philagrius کے تصنیف کردہ یونانی رسائل کی طرز میں قُسطا بن لُوقا اور محمد بن زکریا الرازی نے جگر کے متعلق مخصوص رسالے مرتب کیے تھے (F. Sezgin : *Geschichte des arabischen schrifttums*، لائیڈن ۱۹۷۰ء، ۳ : ۶۸، ۱۵۶، ۲۷۳، ۲۹۲)، اگرچہ ممکن ہے کہ یہ رسالے ان کی عام طبّی تصانیف کے باب ہوں .

جہاں تک جگر کی جسمانی ساخت کا تعلق ہے،

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

مسلم مصنّفین نے، جنھیں بیشتر یونانی مصنفین کی طرح چیر پھاڑ کرنے کی ممانعت تھی، جالینوس کے ان بیانات سے کام چلایا ہے جو اس نے جگر کے بارے میں دیے ہیں - خود جالینوس نے Herophilos، باشندۂ Chalcedon (تیسری صدی قبل مسیح)، کا تتبع کیا تھا، جس نے اسکندریہ میں مردہ لاشوں کی چیر پھاڑ کرنے کے علاوہ جگر کا مطالعہ کیا تھا، لیکن جس نے بظاہر غیر صحت مند انسانی جگروں اور حیوانی جگروں کے مشاہدات کو بھی تندرست جگر کے مطالعے میں شامل کر دیا تھا - بندروں کی چیر پھاڑ سے اس معاملے میں Herophilos پر جالینوس کے اعتماد کی تصدیق ہو گئی ہے (دیکھیے Ch. Daremberg : *Oeuvres anatomiques, physiologiques et médicales de Galien*، پیرس ۱۸۵۴ تا ۱۸۵۶ء، ۱: ۲۹۳، حاشیہ ۱؛ Max Simon : *Sieben Bücher Anatamie des Galen*، لائپزگ ۱۹۰۶ء، ۲: xxxiv ببعد)۔ اس کی پیروی کرتے ہوے مسلمان طبیبوں نے یہ بتایا کہ جگر کے بعض اوقات دو یا تین کونے (اطراف)، یا زائد حصے (زوائد) ہوتے ہیں اور زیادہ تر چار یا پانچ، جو معدے کے گردا گرد ہوتے ہیں۔ جگر کے بارے میں اس قسم کے بیانات محمّد بن زکریا الرازی : منصوری اور علی بن عباس : ملکی میں پائے جاتے ہیں (دیکھیے طبع P. de Koning : *Trois Traités d'anatomie arabe* ..... لائیڈن ۱۹۰۳ء، ص ۶۸ تا ۷۱، ۳۷۴ تا ۳۷۹)، جس میں عربی متن کے بالمقابل فرانسیسی ترجمہ درج ہے - اسی طرح ابن سینا : قانون، کتاب ۳، فن ۱۴، باب اول، کے فرانسیسی ترجمے میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے (وہی کتاب، ص ۶۰۷ تا ۷۱۵ و روم ۱۵۹۳ء، ص ۴۵۵ - ۴۵۶ و لاطینی ترجمہ، وینس ۱۵۶۴ء، ص ۷۴۰ تا ۷۴۲)، جس میں یونانی مصنفین کے متوازی متون بھی شامل ہیں۔

جگر کے جسمی نفسی فعل سے متعلق عربوں کے خیالات ابتداءً اخلاط (humours) کے اس جسمانی نظام سے مأخوذ ہیں جو جالینوس نے قدیم ترکتابوں کی مدد سے مرتب کیا تھا - یہ وہ نظام تھا جو عربوں کے مفتوحہ ممالک اور مغربی یورپ میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا (دیکھیے اس معاملے میں Luis Garcia Ballester کا ایک نہایت عمدہ اور تازہ بیان، جو P. Lain Entralgo : *Historia Universal de la Medicina*، برشلونہ ۱۹۷۲ء، ۲ : ۲۰۹ تا ۲۶۸، میں دیا ہے؛ نیز دیکھیے وہی مصنف : *Galeno en la sociedad y en la ciencia de su tiempo*، میڈرڈ ۱۹۷۲ و سہل تلخیص، از G. Sarton : *Galen of Pergamon*، لارنس [کینساس] ۱۹۵۴ء؛ تولید و تقسیم خون کے نقشے کے لیے دیکھیے *Historia Universal*، ص ۲۴۴ و A. C. Crombie : *Augustine to Galileo. A. D. 400-1695*، لنڈن، ۱۹۵۲ء، ۱: ۱۳۲)۔ اس نظام میں جگر کو اولیں اہمیت حاصل ہے: ''سب اعضا اسی کی مدد سے کام کرتے ہیں، لیکن یہ اپنا کام بغیر کسی کی مدد کے کرتا ہے'' (ابن سینا : ارجوزۃ فی الطب، شعر ۴۱۷، طبع و مترجمۂ H. Jahier و A. Noureddine، پیرس ۱۹۵۶ء، ص ۴۰) - خون اس غذا کے تصفیے اور اجتماع کے ذریعے، جو پہلے سے معدے میں ہضم ہو کر کِیلوس (Chyle) یا کِیموس (Chyme) کی شکل میں تبدیل ہو چکی ہو، جگر ہی میں بنتا ہے (کِیلُوس اور کِیمُوس کو بعض اوقات کَیلوس اور کَیمُوس بھی لکھتے ہیں اور یہ دونوں لفظ اسی طرح باہم وارد ہوتے ہیں جیسے یونانی Χυλος اور Χυμος؛ دیکھیے الخوارزمی : مفاتیح العلوم، طبع G. van Vloten، لائیڈن ۱۸۹۵ء، ص ۱۸۱ و قاہرہ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء، ص ۱۰۷)۔ ہاضمے کا ایک اور ابتدائی عمل تنضیج (Coction) ممکن ہے

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ماسارِیْق یا مسارِیْق (mesenteric veins؛ یونانی: φλεβες μεσραιχαι؛ لاطینی: mesaraicae) میں ہوچکا ہو، جن میں جگرکی خاصیت موجود ہوتی ہے اور جو کیلوس کو جزوی طور پر خون میں تبدیل کر دیتی ہیں (ابن سینا: قانون، ج ۳، فن ۱۴، مقالہ ۱، شروع میں؛ جالینوس کو اس امر میں جو شبہات تھے ان کے لیے دیکھیے Mani، ۱: ۶۸، جن کی وجہ سے قرون وسطی اور دور احیاے علوم میں مناقشات پیدا ہوتے رہے) ۔ تنضیج ہضم جگر کے ابتدائی اثر کے تحت پہلے ہی واقع ہو چکی تھی، جو حرارت کا منبع ہے اور جس کی اطراف کے بارے میں خیال تھا کہ وہ انگلیوں کی طرح معدے کو گھیرے ہوے ہیں .

کیلوس، جو پہلے ہی ایک حد تک تبدیل ہو چکتا ہے، جگر تک العِرق الأسطوانی (vena porta؛ یونانی: πυλη φλεψ ηεπ) کے ذریعے پہنچتا ہے (Simon: *Sieben Bücher*...، ۳: ۱۴۶؛ اسے بعد میں الباب بھی کہنے لگے تھے)، جس میں ماساریق جاکر گرتی ہیں ۔ وہاں وہ خون صالح میں تبدیل ہوجاتا ہے، جو بدن کی غذا کے لیے موزوں ہوتا ہے (انیسویں صدی عیسوی تک یہ کہاوت مستند مانی جاتی تھی : sanguificatic est chyli in sanguinem mutatio = "تولید خون کیلوس (chyle) کے خون میں تبدیل ہونے کا نام ہے"، دیکھیے Mani، ۱: ۵۹) ۔ اس خون کا ایک حصہ جگر کا جزو بن جاتا ہے، جسے عَلَق (= منجمد خون) کہا جا سکتا ہے (ابن سینا: قانون، ج ۱، فن ۱، تعلیم ۳، فصل ۲؛ وہی کتاب، ج ۳، فن ۱۴، مقالہ ۱) اور جگر کی یہ ترکیب کم از کم قپادوقیہ Cappadocia کے Aretaios کے زمانے (دوسری صدی؛ Mani، ۱: ۵۸، نیز ص ۶۴) سے بیان کی جاتی رہی ہے ۔ صحیح خون بننے کے عضو کی حیثیت سے جگر کو وہ مقام سمجھا جا سکتا ہے جہاں چاروں اخلاط (homours) پیدا ہوتے ہیں (منشاء الاخلاط؛ ابن سینا: اُرجوزہ، شعر ۱۶۴؛ دیکھیے قانون، ج ۱، فن ۱، تعلیم ۴، فصل ۲) ۔ ان چار میں سے دو فوراً ہی پیدا ہو جاتی ہیں، یعنی ایک تو وہ بھاری تل چھٹ جن پر السِمرّ السّوداء (کالا پِتّا؛ Atrabile؛ یونانی: χολη μελαινα؛ لاطینی: Atra bilis) مشتمل ہوتا ہے اور دوسری دقیق، یعنی ہلکے اجزا یا ایک قسم کا جھاگ، جو المرّة الصّفراء (زرد پِتّا؛ یونانی: χολμΕανθη؛ لاطینی Cholera) کہلاتا ہے ۔ ان دونوں کو زیادہ تر دو ظرف (وعاء) کھینچتے ہیں، جو کم و بیش گردنوں کی طرح (بمنزلة العنق، در جالینوس) ہوتے ہیں اور تلی اور پتے دونوں سے جگر کو ملاتے ہیں (الرازی: منصوری، در Koning: *Troités*، ص ۶۷ ببعد؛ علی بن العباس، ملکی، در کتاب مذکور، ص ۱۷۷، ۳۷۸ ببعد؛ ابن سینا: قانون، در کتاب مذکور، ص ۶۰۷، جس کے بالمقابل متوازی یونانی متون ہیں؛ سب سے پہلے جالینوس: *De usu partium*، ۴: ۴، جس پر ایک نہایت مفید شرح کے لیے دیکھیے Deremberg : *Oeuvres.....de Galien*، ۱: ۲۸۲، حاشیہ ۱).

خون، جس میں ابھی دیگر عناصر کی آلائش موجود ہوتی ہے، جگر سے شروع ہو کر رگوں کے نظام کے ذریعے تقسیم ہوتا ہے (یہ صحیح معنوں میں دوران خون نہیں ہوتا بلکہ مد و جزر ہوتا ہے، جس کے ساتھ آہستہ آہستہ تجدید خون بھی ہوتی رہتی ہے) ۔ سب رگیں (veins؛ عَورِدَة) یا العُروق السّواکن جگر ہی سے شروع ہوتی ہیں جب کہ دل وہ مقام ہے جہاں سے العُروق المتحرکة (arteries) کے نظام کا آغاز ہوتا ہے ۔ رگیں العِرق الأسطوانی (vena porta) سے ادھر ادھر پھیلتی ہیں، جو جوف جگر سے چلتی ہے اور اسی طرح العرق الاجوف (vena cava) سے، جو جگر کے

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

محدّب پہلو سے شروع ہوتی ہے (قانون، ج ۱، فن ۱، تعلیم ۵، جملہ ۵) .

جن نظریات کی رو سے مختلف سطحات پر پائے جانے والے عناصر کائنات کے مابین تعلق بیان قائم کیا جاتا ہے، ان میں زرد پتّے کو اور اس کے ساتھ اس آتشیں عنصر کو جس کا وہاں غلبہ ہے، نیز مزاج (χρασις) کو جگر کے ساتھ ایک خاص رشتے میں منسلک کرتے ہیں؛ لیکن ایک مختلف نظریہ جگر کا تعلق خون سے، جس میں ہوا کا غلبہ ہوتا ہے، اور اس طرح قدرتی طور پر دموی (Sanguine) مزاج سے قائم کرتا ہے (دیکھیے شکل، در M. Ullmann : *Die Medizin im Islam*، لائیڈن و کولون ۱۹۷۰ء، ص ۹۹، نیز R. Herrlinger کی وہ رنگین شکل جس میں بقراط کی تصنیف کے زمانے سے لے کر ارتقا دکھایا گیا ہے اور جو E. Schöner : *Das Viererschema in der antiken Humoral-pathologie*، ویزباڈن ۱۹۶۴ء، کے آخر میں درج ہے؛ موجودہ زمانے کی مروّجہ شکل کے لیے، جو مقبول عام مجلّات سے ماخوذ ہے، دیکھیے T. Canaan : *Aberglaube und Volksmedizin im Lande der Bibel*، ہامبورگ ۱۹۱۴ء، ص ۳۳) .

جالینوس نے روحانی تعلیم کے اصولوں کو اخلاط کے نظریے سے جس طرح منسلک کیا تھا، مسلمان اطبا نے بھی قدرتی طور پر اس کا تتبع کیا ہے، جس کی ابتدا ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ بعض ارواح (spirits؛ یونانی: πνεύματα)، یعنی غیر مرئی ابخرات، جسم میں کارفرما ہوتے ہیں اور خیال ہے کہ انھیں سے اعضاے رئیسہ کے کام کی توجیہ ہوسکتی ہے ۔ مسلم طب کی رو سے ان میں سے ایک، یعنی طبعی روح (الروح الطبیعی یا الطبیعیہ؛ یونانی : πνεύματα φυσικον) کا مقام جگر ہے ۔ یہاں جالینوس کی، جسے کچھ شبہات تھے اور جو اس معاملے میں متذبذب تھا، اس حد تک پیروی نہیں کی گئی جتنی کہ اسکندریہ اور شام کے اطبا کی، جنھوں نے ایک سادہ اور آسان پیرائے میں اس کے نظریات کو منظم کر دیا تھا ۔ اس "روح" کو اسی سطح پر رکھا جاتا ہے جس پر روح حیوانی اور روح انسانی کو، جن کا مقام علی الترتیب دل اور دماغ ہے (قدیم بیان، از حُنَین بن اسحٰق : المَدْخَل فی الطبّ؛ Temkin : *On Galen's Gesnerus Pharmacology* (*Aarau*)، ۸ (۱۹۵۱ء) : ۱۸۰ تا ۱۸۹) ۔ یہ خون کے ساتھ رگوں کے ذریعے تقسیم ہوتی ہے .

ان میں سے ہر ایک روح، جالینوس کے نظریے ہی سے، ایک بڑی قوۃ (Faculty) یا قوٰی (یونانی؛ δυναμεις؛ لاطینی: virtutes) کے ایک گروہ سے مطابقت رکھتی ہے اور ان کے افعال سے جسمانی اور نفسیاتی مظاہر منسوب کیے جاتے ہیں؛ چنانچہ اطبّا کا دعوٰی ہے کہ "طبعی" قوۃ یا قوٰی کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے : ایک وہ جن کا فعل یہ ہے کہ کسی فرد کو محفوظ رکھیں اور اس کی شخصیت قائم کریں۔ یہ قوۃ غذا کی دیکھ بھال کرتی ہے اور اس کا مقام جگر ہے؛ دوسری قوۃ وہ ہے جو نوع کی حفاظت کرتی ہے اور جو اعضاے تناسل میں رہتی ہے ۔ ارسطو کی پیروی کرتے ہوے ابن سینا اور بہت سے اور لوگ اس نظریے سے کسی حد تک اختلاف کرتے ہیں اور دل کے قوٰی ہی کو اصلی بنیاد اور بڑا سرچشمہ قرار دیتے ہیں (دیکھیے Mani، ۲:۳۱) ۔ قوۃ تغذیہ دل سے جگر کی طرف پھیلتی ہے (ابن سینا : شفاء، طبیعیات، فن ۶، مقالہ ۵، فصل ۸، طبع J. Bakos: *Psyeholgie d' Ibn Sīnā...*، پراگ ۱۹۵۶ء، ص ۲۶۵؛ قانون ج ۱، فن ۱، تعلیم ۶) ۔ زیادہ صحیح معنوں میں خالص پیروان ارسطو نے جالینوس سے اس لیے اختلاف کیا کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ غذا یا تغذیے کا اصول دل میں رہتا ہے نہ کہ جگر

www.besturdubooks.wordpress.com

میں (کلیات، ج ۲، باب ۹، نیز دیکھیے J. C. Bürgel : *Averroes "contra Galenum"*، در *NG W, Gott.*، ج ۱، ۱۹۶۷ء، غدد ۹، ص ۲۹۲ ببعد) - قوی کی مختلف فہرستیں دی جاتی ہیں اور ان کے بارے میں تصور یہ ہے کہ وہ یکساں طور پر دوسرے اعضا پر اثرانداز ہوتے ہیں.

ہم یہاں مسلم اطبا کے علم اسباب امراض یا علم معالجات سے بحث نہیں کریں گے - ان کی ایک واضح اور سیدھی سادی بحث ایک قدیم ترین کتاب، یعنی علی بن سہل الطبری : فردوس الحکمۃ (طبع محمد زبیر صدیقی، برلن ۱۹۲۸ء، ص ۴۰ ببعد، ۲۱۸ ببعد) میں مل سکتی ہے اور ایک بہت مفصل بیان، جسے کلاسیکی حیثیت حاصل ہے، ابن سینا : القانون (فن ۱۴، کتاب ۳، روم ۱۵۹۳ء، ص ۴۵۵ تا ۴۷۹ و تہران ۱۲۹۵ھ، ص ۱۷۹ تا ۲۰۴ و لاطینی ترجمہ، وینس ۱۵۶۴ء، ص ۴۰۷ تا ۴۸۱) میں موجود ہے، اس کا پہلا مقالہ کبد (دیکھیے اوپر) کی ساخت سے متعلق ہے - تشریح الابدان کی کتابوں میں جگر کے ماؤف ہو جانے کی حالت میں اسے داغنے کا ذکر کیا گیا ہے (دیکھیے M. D. Grmek و P. Huard : *Le premier manuscrit chirurgical turc*، پیرس ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۹، ۱۱۳، ۱۲۱، شکل ۲۷، ۳۱؛ زمانۂ حال میں اسے داغنے کے سلسلے میں دیکھیے M. S. Belguedj : *La médecine tradition alle...* ص ۱۴۸).

القانون میں جگر کے بارے میں متعدد منتشر معلومات بھی دی گئی ہیں، جو اس کے لاطینی ترجمے (وینس ۱۵۶۴ء) میں نہایت احتیاط سے مرتب کی گئی ہیں، اور اشاریے کی بدولت بآسانی مل سکتی ہیں - کتاب ۲ میں مفردات کے بارے میں ایک طویل رسالے (روم ۱۵۹۳ء، ۱ : ۲۴۹ تا ۳۴۷؛ نیز ترجمہ وینس ۱۵۶۴ء، ۱ : ۱۲۴ تا ۲۸۰ء، جہاں یہ لاطینی حروف ہجا کی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے) اور کتاب ۵ کے باب ادویہ میں ان جڑی بوٹیوں اور غذاؤں، نیز مفرد اور مرکب دواؤں پر کئی حواشی موجود ہیں، جن کے بارے میں معلوم ہے کہ ان کا جگر پر کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے - ان مرکب دواؤں کی فہرست کا خلاصہ کتاب ۵، جملہ ۱، مقالہ ۱۲، میں موجود ہے (روم ۱۵۹۳ء، ۲ : ۲۴۳ و لاطینی ترجمہ، وینس ۱۵۶۴ء، ۲ : ۳۰۵ - ۳۰۶) اور ان دواؤں کو ان بیماریوں کے مطابق مرتب کیا گیا ہے جن میں انھیں استعمال کیا جاتا ہے .

القانون، کتاب ۲، میں دواؤں سے متعلق ایک باب میں حیوانوں کے جگر سے بحث کی گئی ہے (طبع مذکور، ۱ : ۱۹۶ و ترجمۂ مذکور، ۱ : ۲۹۹) ابن سینا کے اکتشافات بھی ان چیزوں میں شامل ہیں جنھیں غذائی نقطۂ نظر سے مزید تفصیل کے ساتھ ابن جزلہ کے معروف رسالۂ اغذیہ منہاج البیان میں بیان کیا گیا ہے (مخطوطہ، در کتاب خانۂ ملی، پیرس، عدد Ar ۲۹۴۹، ورق ۱۵۹-ب، عدد ۲۹۵۰، ورق ۲۷۹-الف، عدد ۲۹۵۲، ورق ۲۳۱- الف و ب) - جگر کھانے کا ایک عام نقصان یہ ہے کہ ہاضمے کے فعل کے دوران میں اس سے ایسا گاڑھا خون پیدا ہوتا ہے جو شریانوں میں بہت سستی سے حرکت کرتا ہے اس کا مداوا یہ ہے کہ اسے سومور شراب یا تیل کے ساتھ کھایا جائے - چوپایوں کے جگر سے بالعموم اجتناب کرنا چاہیے - موٹی بطخ یا مرغی کا جگر سب سے اچھا ہوتا ہے - پلی ہوئی بڑی بطخ کا جگر بھی بہت عمدہ ہوتا ہے، بالخصوص اگر اسے گاڑھے دودھ کے ساتھ کھایا جائے - اس کے ساتھ نمک اور تیل شامل کر لینا چاہیے تاکہ معدے پر بوجھ نہ پڑے - بھیڑ کا تلا ہوا جگر اسہال کے لیے فائدہ مند ہے - بکری

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

(خصوصاً بکرے) کا جگر مرگی کی جانچ کے لیے کارآمد ہے کیونکہ اس سے دورہ پڑ جاتا ہے ۔ اسے کھانا یا اس کی دھونی دینا آنکھ کی صفائی کے لیے بہت مفید ہے ۔ آنکھ کے پردے کی خرابیوں کے لیے بھی یہ فائدہ مند ہے (اسی طرح کے ایک علاج کے لیے، جو آج کل حضر موت میں مستعمل ہے، دیکھیے R. B. Serjeant، در *BSOAS*، ج ۱۸، ۱۹۵۶ء، ص ۷) ۔ تیتر کا خشک اور چورا کیا ہوا جگر بھی، جس کا خمیرہ بنا لیا جائے، مرگی کے لیے مفید ہے ۔ اسی طرح گدھے کا بھنا ہوا جگر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اسے خالی پیٹ کھایا جائے ۔ بھیڑیے کا جگر بھی جگر کی شکایتوں کے لیے مؤثر ہوتا ہے ۔ وَزَغہ (ایک قسم کی بڑی چھپکلی، نیز مینڈک کا جگر دانت کے درد میں کمی کرتا ہے ۔ دیوانے کتے کے جگر سے سگ گزیدہ کو شفا ہو جاتی ہے، بالخصوص اگر یہ اسی کتے کا ہو جس نے اسے کاٹا ہو ۔ یہ علاج، جس کا پلینوس (Pliny) نے بھی ذکر کیا ہے (۲۹ : ۳۲) اور جو یورپ میں انیسویں صدی تک عام طور پر رائج تھا (دیکھیے Bargheer : *Eingeweide*، ورق ۲۸۳) غالباً بیسویں صدی کے شروع میں یروشلم میں بھی معلوم تھا، کیونکہ اس کا ذکر S. Y. Agnon کے ناول *Tmōl Shilshōm*، ۴: ۱۸، (فرانسیسی ترجمہ : *Le Chien Balak*، پیرس ۱۹۷۱ء، ص ۵۶۵ ببعد) میں آیا ہے ۔

۴ ۔ جادو، مذہب اور داستانوں میں : مقبول عام علم نفسیات و الابدان کے پہلو بہ پہلو، جس میں علم نفسیات اور علم الابدان کی طرح جسم میں جگر کے فعل سے بحث کی گئی ہے اور علم سائنسی تشخیص الامراض، علم الاغذیہ اور علم الادویہ کی روشنی میں، جن سے (اصولاً) امراض کے علاج مأخوذ ہیں، جگر کی بطور غذا یا دوا قدر و قیمت متعین کی جاتی ہے، بنیادی طور پر بعض علامتی اور ساحرانہ عقائد کے ابتدائی عناصر بھی موجود رہے ہیں، جن کی نشو و نما ان کے عملی استعمال کے ذریعے ہوتی ہے ۔ بعض اوقات یہ سائنسی رسائل میں بھی نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی وہاں ان کا اضافہ بھی کر دیا جاتا ہے ۔

جالینوس کے تتبع میں ابن سینا، اگرچہ کسی قدر شبہے کے ساتھ، کہتا ہے کہ کسی جانور کے جگر کا حجم اس کی حرص و آز اور اس کے شرمیلے پن کے مطابق ہوتا ہے (دیکھیے P. de Koning: کتاب مذکور، ص ۷۰۸، ۷۱۱) ۔ مثل بالمثل کا ساحرانہ اصول استعمال کرتے ہوے، یہ سمجھا جاتا تھا کہ بھیڑ کا جگر، کھانے سے انسان کے جگر کو تقویت ملتی ہے (داود الانطاکی : تذکرہ، قاہرہ ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء، ۱ : ۲۰۷) ۔

جگر کے متعلق علما کے ہاں یہ بھی تصور ملتا ہے کہ جگر (کہا جا سکتا ہے کہ بروے علم جنین منجمد خون سے بنتا ہے ۔ اسے یا تو لفظی معنوں میں لیا جاتا ہے یا اسے ایک عوامی تصور سے وابستہ کر دیا جاتا ہے، چنانچہ ایک حدیث ملتی ہے، جس میں خون کھانے کی عام تحریم سے جگر اور تلی کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے : "ہمارے لیے دو خون (جگر اور تلی) حلال ہیں" (دیکھیے ابن ماجہ، ۲۹ : ۳۱ ؛ احمد بن حنبل، ۲ : ۹۷) ۔

جگر کی خرابیوں کی صورت میں تعویذ استعمال کیے جاتے ہیں؛ چنانچہ علم الکیمیا کے ایک مجموعے ذخائر الاسکندر میں، جسے یونانی الاصل خیال کیا جاتا ہے، ایک تعویذ کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو جگر کی شکل کے ایک سرخ پتھر کا بنا ہوا تھا اور جس پر پہاڑی بکرے کی تصویر اور ایک طلسماتی کتبہ نقش تھا ۔ یہ درد جگر کے لیے ایک مفید علاج ہے J. Ruska : *Tabula Smaragdina*، ہائیڈل برگ ۱۹۲۶ء، ص ۹۸ ببعد) ۔ عملی علاج پر

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کتابوں میں بہت سے ایسے نسخے شامل ہیں جن میں تجرباتی مشاہدے، ساحرانہ استخراج (مثلاً بھیڑیے کے تیل میں پسے ہوئے جگر کا استعمال) نیم حکیمانہ علاج (اونٹ کا پیشاب) اور دھلے ہوئے تعویذ، وغیرہ کا امتزاج ہے (مثال کے طور پر دیکھیے نام نہاد جلال الدین السیوطی، یعنی محمد الصنوبری، م ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء: الرحمۃ فی الطب والحکمۃ، قاہرہ ۱۳۵۷ھ، ص ۱۰۶، باب ۱۰۲) مراکش میں ناگ پھنی کے جگر کی شکل میں کیے ہوئے ٹکڑے کسی مرابط خانقاہ کی بیرونی دیواروں پر لٹکا دیے جاتے ہیں اور عقیدہ یہ ہے کہ وہ خشک ہو کر بیماروں کو شفا بخشتے ہیں (E. Westermarck: *Ritual and belief in Morocco*، لنڈن ۱۹۲۶ء، ۱: ۲۰۲) مراکش میں ایک اور دستور یہ ہے کہ کسی چھت پر بھیڑ کے جگر اور گردے کو بیمار آدمی کے جوتے کے تلے کی شکل میں کاٹ کر اور ان پر کئی بار چاقو سے کچوکے لگا کر اور ناگ پھنی کے ٹکڑے میں پرو کر خشک کیا جاتا ہے (A.R de Lens: *Pratiques des harems marocains*)، پیرس ۱۹۲۵ء، ص ۱۲) - وسطی عرب کے بدوی ناشتے کے وقت دارچینی کھاتے ہیں جسے قرف الکبود = جگر کے چھلکے) بھی کہتے ہیں اور یہ جگر کی شکایتوں کا علاج سمجھی جاتی ہے (J.-J. Hess: *Von den Beduinen des Innern Arabiens*، زیورخ و لائپزگ ۱۹۳۸ء، ص ۱۴۸ ببعد).

جگر کے ذریعے کہانت کا عمل ("کبدیت"، hepatoscopy)، جو قدیم میسوپوٹامیا اور ایتروریا Etrruria میں بہت اہمیت رکھتا تھا، لیکن جسے تیسری صدی ھی میں عرب کی ملکہ زنوبیا نے ترک کر دیا تھا (Zosimus، ۱: ۵۹)، عربوں کے ہاں رائج نہ تھا (دیکھیے T. Fohd: *La divination arabe*، لائیڈن ۱۹۶۶ء، ص ۳۹۷، ۵۲۷)، تاہم کہانت کے طریقوں کی ایک عام فہرست میں ابن خلدون (مقدمہ، ۱: ۱۹۱، ۱۹۴، طبع Quatremère، ۱: ۳۶۹، ۳۷۱) کے علاوہ اس کا ذکر ایک شخص ربی لیوی Rabbi Levi نے بھی کیا ہے، جس کا زمانہ غیر یقینی ہے - اس نے بابل کے بادشاہ کے عمل "کبدیت" کو، جو Ezekid، ۲۱: ۲۶، میں مذکور ہے، عربوں کے ایک ایسے طریقے سے تشبیہ دی ہے جس میں بھیڑ کو ذبح کر کے اس کے جگر کا مطالعہ کیا جاتا ہے "Midrash Rabba to Eccles تا Eccles، ۱۲: ۷ وغیرہ، در *Monumenta Talmudica*، ج ۵: *Geschichte* لائپزگ ۱۹۱۴ء، ص ۴۸، فصل ۸۴).

عوامی کہانیوں میں جگر ایک ادنیٰ کردار ادا کرتا ہے اور وہ بھی زیادہ تر ایک دوا کے طور پر - ترکی کہانیوں میں ایک دیوانی شہزادی کا واحد علاج کسی شہزادے کا جگر بتایا گیا ہے (W. Eberhard و P. N. Boratv: *Typen Türkischer Volksmärchen* ویزباڈن ۱۹۵۳ء، ص ۳۰۲) - ایک جوان لڑکی کسی جانور کا جگر ایک بوسے کے عوض فروخت کرتی ہے (کتاب مذکور، ص ۲۲۴) اور ایک مردم خور انسانی جگر کھاتا ہے (کتاب مذکور، ص ۱۷۲) - جادوئی پرندے کا دل ایک عالمگیر موضوع ہے (A. Aarne و S. Tompson: *The Types of the Folktate*، بار دوم، ہلسنکی ۱۹۶۴ء، ص ۲۰۸، نوع ۵۶۷) - اس سلسلے کی ایک روایت میں دل کی جگہ جگر مذکور ہے - اس کی جگہ بعض اوقات گردون، پوٹے، یا پھر دل کا ذکر ہوتا ہے (Eberhard و Boratav: *Typen*...، ص ۱۹۶ تا ۱۹۸) - اداکال Adakale کی ایک کہانی میں ایک کنجوس کا ذکر ہے جو کفایت کے خیال سے جگر کھاتا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کہانی زمانۂ حال کی تصنیف ہے (کتاب مذکور، ص ۸۸؛ نیز

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

دیکھیے نیچے) .

کسی جسمانی عضو کے ذریعے شفا حاصل ہونے اور اس کے ساتھ ہی عجیب و غریب ہستیوں کی غیر معمولی طاقتوں کا موضوع شاہنامہ کے اس بیان کی تہ میں ملتا ہے جس میں کیکاؤس اور ان ایرانیوں کے علاج کا ذکر ہے جنھیں مازندران پر حملے کے دوران میں سفید دیو نے جادو سے اندھا کر دیا تھا (رک بہ دیو) ۔ اس سفید دیو کے جگر کے خون سے، جسے رستم نے شکست دینے کے بعد اس کے سینے سے کھینچ کر نکال دیا تھا، ان لوگوں کی بینائی عود کر آئی تھی (طبع J. Mohl، پیرس ۱۸۳۸ تا ۱۸۷۶، کیکاوس، شعر ۶۵۲ ببعد و طبع E. E. Bertels، ماسکو ۱۹۶۲ء، ص ۱۰۹، مازندران، شعر ۶۱۳، ببعد و مترجمۂ J. Mohl، پیرس ۱۸۷۶، ص ۴۲۸ ببعد) ۔ اس موقع پر اندھے پن کے لیے جگر کی نفع بخش خاصیت تاؤ (Taoist) کے ساحرانہ علم حیوانات و نباتات کے ایک اصول سے بہت قریب آگئی ہے (J. C. Coyajee، در *Journal and Proceedings of the Asiatic Society of Bengal*، سلسلۂ جدید، ج ۲۴، ۱۹۲۸ء، ص ۱۸۷ ببعد)، لیکن جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، بکری کے جگر کا آنکھ کی شکایتوں کے لیے استعمال ابن سینا کی سائنسی طب میں نظر آتا ہے اور اسی طرح توبت Tobit کی کتاب میں مچھلی کا جگر، دل اور پتّا جن بھوت کو نکال باہر کرنے میں مدد دیتے ہیں (Tobit، ۶: ۵، ۸: ۲) ۔ اسی وجہ سے بلا شبہہ جگر کو عوامی امراض چشم میں اکثر استعمال کیا جاتا تھا (Eingeweide: Bargheer، ص ۲۸۴ ببعد) .

جسم میں جگر کی اوّلیں اہمیت سے بلا شبہہ ساحرانہ استخراج کے ذریعے متعدد طور طریقوں کی توجیہ کی جا سکتی ہے ۔ کسی دشمن کا جگر چبانے یا کم از کم اس پر دانت لگانے سے بظاہر فنا کر دینے یا بڑی سے بڑی لعنت بھیجنے کا مفہوم نکلتا ہے ۔ جنگ احد کے موقع پر ہندہ کی یہی حرکت، یعنی (حضرت) حمزہؓ کے جگر کو دانتوں سے چبانا (ابن ہشام، ص ۵۸۱) امیر معاویہ کے تحقیری لقب ابن آکلۃ الاکباد (= جگر کھانے والی کا بیٹا) کا باعث تھی (المسعودی: مروج، ۴: ۴۳۹ و فرانسیسی ترجمہ از Pellat، پیرا ۱۷۴۲، جعلی (؟) المسعودی: کتاب اثبات الوصیۃ الامام علی، جس کا حوالہ Ch. Pellat: *Le Shiisme imamite*، پیرس ۱۹۷۰ء، ص ۸۵، میں ملتا ہے) ۔ جزیرہ نماے سینا کے بدویوں کا عقیدہ ہے کہ دروز مسلمانوں کا جگر کھاتے ہیں (W. P. Zenner، در *Middle Eastern Studies*، ج ۸، عدد ۳، اکتوبر ۱۹۷۲ء، ص ۴۱۱) ۔ اس کے متوازی مثالوں کے لیے دیکھیے Bargheer، Leber ص ۹۷۷؛ وہی مصنف: *Eingeweide*، ص ۹۳، ۲۱۶؛ W.D. Wallis، در *ERE*: ۱۰: ۳۷۳، ببعد .

عید الاضحی کی قربانی کے موقع پر ذبح کردہ جانور کا جگر پہلے کھانا ضروری ہے، جو المغرب کے ایک بخوبی مصدقہ دستور کی پیروی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تائید بعض فقہا نے بھی کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے بھی ہوتی ہے (E.Doutté: *Magie et religion dans l' Afrique du Nord*، الجزائر ۱۹۰۹ء، ص ۳۷۴؛ J. Desparment: *Coutumes, institutions, croyances der indigénes Algèrte*، الجزائر ۱۹۳۹ء، ۱: ۲۷۵؛ E. Westermarck: *Ritual and Belief in Morocco*، لنڈن، ۱۹۲۹ء، ۱: ۲۳۴ ببعد، ۲: ۱۲۰ ببعد؛ J. Chelhod: *Le sacrifice chez les Arabes*، پیرس ۱۹۵۵ء، ص ۱۱۳ ببعد؛ J. Jouin: *Hesperis*، (۱۹۵۷ء)، ۴۴: ۳۲۰؛ A. M. Goichon: *La vie feminine an Mzab*، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۲۶۴) .

www.besturdubooks.wordpress.com

مراکش کے بعض قبائل میں دولھا اپنے بن بیاھے دوستوں کو تحفۃً ایک بیل دیتا ھے ۔ اس کا جگر، جسے سب سے پہلے کھانا ضروری ھوتا ھے، باعث برکت سمجھا جاتا ھے ۔ اسے ان سب لوگوں میں تقسیم کرنا ھوتا ھے جو حاضر ھوں، لیکن عورتوں میں نہیں (E. Westermarck: *Marriage Ceremanies in Morocco*، لنڈن ۱۹۱۴ء، ص ۱۲۶) ۔

۵ ۔ جانوروں کا جگر بطور خوراک: جگر سے، جسے اکثر بیکار گوشت اور اوجھڑی کی ذیل میں شمار کیا جاتا ھے، نفرت کی جاتی تھی اور اسے مفلس و قلاش لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا؛ چنانچہ جنوبی لیبیا میں ایک کہاوت ھے: ''مثل النوار علی الکبد''، یعنی مفلس لوگ کسی چیز پر اس طرح تیزی سے ھاتھ مارتے ھیں، جس طرح نوار (= خانہ بدوش) جگر پر (F. J. Abela: *Proverbes populaires, adages et locutions proverbiales du Liban-Sud*، زیرطبع)، لیکن بعض اور علاقوں میں جگر اور دل کو بہت لذیذ غذا سمجھا جاتا ھے، جیسے کہ حضر موت میں (F. Stark: *The Southern Gates of Arabia* ۱۹۴۵ء، ص ۷۸) ۔ عدن میں آج کل بیکار گوشت سمالی لینڈ سے درآمد کیا جاتا ھے، جہاں (بقول یوسف طالب) لوگ اسے نہیں کھاتے ۔ کچا جگر بھی بعض اوقات ایک عمدہ غذا سمجھا جاتا ھے، جیسے لبنان اور اردن میں (A. Jaussen: *Coutumes des Arabes au pays de Moab*، پیرس ۱۹۰۸ء، ص ۶۵)۔ صحرا میں جو جانور شکار میں مارا جاتا ھے، اس کا پیٹ جلدی سے چاک کر لیا جاتا ھے اور جگر، دل اور پھیپھڑے دہکتے ھوے کوئلوں پر رکھ دیے جاتے ھیں اور فوراً یا دوسرے دن کھا لئے جاتے ھیں (M. Gast: *Alimentation des populations de l' Ahagger*، پیرس ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۶) ۔

قرون وسطیٰ میں عرب کی منڈیوں میں ھمیشہ کبودی (جگر فروش) موجود ھوتے تھے، جو لہسن کے ساتھ پکایا ھوا یا سیخوں پر لگا کر بھنا ھوا جگر ان لوگوں کے ھاتھ بیچتے تھے جو بازار میں کھانا کھاتے تھے ۔ رسائل حِسْبہ میں بکری یا گائے بھینس کے جگر کو بھیڑ کے جگر کے ساتھ ملانے کی ممانعت کی گئی ھے ۔ ان میں بہت تفصیل سے ان اجزا کی کیفیت بیان کی گئی ھے جو ملانے چاھییں (''ابن الاُخُوّۃ : معالم القربۃ، طبع R. Levy، لنڈن ۱۹۳۸ء و عربی متن، ص ۹۵ ببعد) ۔ اس قسم کی غذا میں اکثر ملاوٹ کی جاتی تھی ۔ رسالۂ کیمیاء الطبائخ کو، جس میں ان لوگوں کو برا بھلا کہا گیا ھے ''جو کہنے کو تو جگر بیچتے ھیں، لیکن دراصل وہ جگر نہیں ھوتا،'' فلسفی یعقوب الکندی (تیسری صدی ھجری/نویں صدی عیسوی) سے منسوب کیا جاتا ھے (الشّیزری : نہایۃ الرتبہ، در ابن الاخوۃ : کتاب مذکور، ص ۱۰۸، حاشیہ ۸ ؛ ابن بَسّام : نہایۃ الرتبہ، در مشرق، ۱۹۰۷ء، ۳۳ : ۱۰۸۱) ۔ دوسری طرف خشک یا بھنے ھوے اور کوبیدہ جگر کی کھرچن کو نقلی مشک کی طرح استعمال کیا جاتا تھا (سقطی : *Un manuel hispanique de hisba*، طبع G. S. Colin و E. Levi-Provençal، پیرس ۱۹۳۱ء، ۱ : ۳۶ و ترجمہ از P. Chalmeta-Gendron : الکتاب فی آداب الحِسْبَۃ، میڈرڈ ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۶ = الاندلس، ۱۹۶۸ء، ۳۳ : ۱۹۳) اور ھسپانیہ اور مراکش کا بلاجہ (ایک قسم کا سموسہ، جو گوشت اور چھیچھڑوں سے تیار کیا جاتا ھے) میں خراب شدہ جگر نیز کچھ روٹیوں اور گرم مسالوں وغیرہ، کی ملاوٹ بھی کر دی جاتی ھے (کتاب مذکور، متن : ص ۳۹ س ۱۳ و ترجمہ : ص ۱۸۰) ۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

قرون وسطیٰ کی کھانا پکانے سے متعلق کتابوں میں جس طرح کے پرتکلف کھانوں کا ذکر ہوتا ہے ان میں جگر کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے ۔ اس قسم کے کثیر التعداد مشرقی رسائل میں سے صرف الوُصلۃ میں جگر پکانے کی ترکیبیں دی گئی ہیں ۔ ایک ترکیب کی رو سے ابلے ہوئے جگر کو جھلّی (caul) میں لپیٹ کر سیخوں پر بھونا جاتا ہے (شرائح کُرجیّہ کے طریقے پر، جو مرغابی کے ان بیکار اعضا سے تیار کیا جاتا ہے جنھیں پکانے سے پہلے الگ کر دیتے ہیں اور ان میں جگر بھی شامل ہوتا ہے)؛ دوسری ترکیب کی رو سے جگر کو ابال کر اس میں سالم یا کوبیدہ گرم مسالا بھر دیتے ہیں (اَلْوُصْلَۃ، مخطوطہ A، ورق ۹۵-الف و ب؛ نیز دیکھیے Rodinson: *Recherches...*، ص ۱۳۵) ۔ علاوہ ازیں جگر کا ذکر، "مصنوعی دماغ" کے ضمن میں دنبے کی چکتی (اَلِیَہ) کے ساتھ ملا کر قیمہ کرنے کے طور پر بھی آیا ہے (اَلْوُصْلَۃ، دیکھیے Rodinson: کتاب مذکور، ص ۱۵۸) اور تل کے تیل میں مرغی کے اندرونی حصوں یا بھیڑ کے گوشت کے ٹکڑوں کے ہمراہ اتنے تلے ہوئے جگر کا بھی کہ اس کا رنگ سیاہ ہو جائے اور اس سے ایک قسم کی چٹنی بن جائے جو مختلف کھانوں میں استعمال ہوتی ہے (اَلْوُصْلَۃ؛ دیکھیے Rodnsion: کتاب مذکور، ص ۱۳۳ حاشیہ، ص ۱۵۶) ۔ شمس الدین محمّد ابن الحسن البغدادی کی بغدادی کھانوں کی کتاب (ساتویں/تیرھویں صدی) میں جگر پکانے کی کوئی حقیقی ترکیب نہیں دی گئی اور نہ اسی زمانے کی اندلس اور المغرب کے کھانوں کی اس کتاب میں جسے A. Huici Miranda نے طبع و ترجمہ کیا ہے .

لبنان میں آج کل بکری یا گائے کا جگر پکانے کی ترکیبیں ملتی ہیں، جنھیں عام طور پر سیخوں پر چڑھا کر انگیٹھی میں سینک لیا جاتا ہے ۔ انھیں "معلق" کہتے ہیں، یعنی صحیح معنوں میں "بدن کے اوپر کے حصے کے اعضا، دل، جگر وغیرہ" (M. K. Khayat و M. C Keating: *Food from the Arab World*، بیروت ۱۹۶۱ء، ص ۳۲ ببعد؛ P. Bazantay: *Enquête sur l'artisanat a Antioche*، بیروت ۱۹۳۶ء، ص ۴۷؛ سرکے میں تلے ہوئے جگر کے ایک نسخے کے لیے دیکھیے Claudia Roden: *A Book of Middle Eastern Food* لنڈن ۱۹۶۸ء، ص ۱۸۰)۔ ہلکی آگ پر تلے ہوئے جگر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے گرم یا ٹھنڈے ہونے کے بعد چٹپٹی چیز کے طور پر کسی اشتہا افزا مشروب کے ساتھ کھانے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں (Roden، ص ۳۳) ۔ المغرب میں جگر اور دل کے کباب، جو کسی زمانے میں غربا کا کھانا تھا، زمانۂ حال میں ایک وضعدار کھانا بن گیا ہے ۔ ان ٹکڑوں کو جھلی میں لپیٹ دینے کی وجہ سے "ملفوف کہتے ہیں" (M. Beaussie: *Dictionaire pratique arabe.—francais*، بار دوم، الجزائر ۱۹۳۱ء، ص ۹۰۴ ب؛ M. Gast: *Alimentation des populations de l' Ahaggar*، پیرس ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۴، ۱۳۵، حاشیہ ۲) اور مراکش میں "بولفاف" (L. Brunot: *Textes arabes de Rabat*، پیرس ۱۹۵۲ء، ۲ : ۴۴۷؛ Z. Guinaudeau: *Fès ve par sa cuisine*، رباط ۱۹۵۷ء، ص ۳۹) ۔ جب جگر کے ٹکڑوں کے بیچ میں بکری کی چربی کے قتلے رکھ دیے جاتے ہیں تو اس کھانے کو مراکش میں "کواح" (= اوجھڑی، جگر، دل وغیرہ) کہتے ہیں (Z. Guinaudeau، : کتاب مذکور، ص ۴۱؛ نیز H. Mercier: *Dictionnair arabe-francais*، رباط ۱۹۵۱ء، ص ۱۰۱) ۔ انگیٹھی پر سینکے ہوئے اس کھانے کا خاص باورچی "کویحی" کہلاتا ہے (کتاب مذکور) .

مصر میں مختلف قسم کی مرغیوں کو اکثر ان میں جگر اور پوٹوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ملا کر اور ان میں کوبیدہ کچا گیہوں یا گوشت کا قیمہ بھر کر کھایا جاتا ہے (C. Wissa Wassef : *Pratiques rituelles et alimentaires des-Coptes*، قاہرہ ۱۹۷۱ء، ص ۳۸۱)۔

ایران میں بھیڑ یا مرغی کا بیکار گوشت کئی کھانوں میں استعمال ہوتا ہے، لیکن جگر کا ذکر صرف کھانا پکانے کی ایک جامع کتاب میں آیا ہے، جسے غالباً شاہ کے باورچی نے مرتب کیا تھا اور جو ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء میں طبع ہوئی۔ یہ ذکر کبابوں اور ایک قسم کے سالن کے ضمن میں، جسے حسرۃالملوک (= بادشاہوں کی تمنا) کہتے ہیں، ملتا ہے (علی اکبر بن مہدی کاشانی : سفرۂ اطعمہ، مجموعۂ مخطوطات P. Ikowski، طبع و مترجمۂ م۔ قوام نجاد، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ، پیرس ۱۹۶۷ء، ص ۲۶، ۲۷؛ پہلی ترکیب کچھ بعد کے زمانے میں Josophine Richard الملقب بہ نشاط الدولۃ : طباخی نشاط، تہران، بلا تاریخ، ص ۲۲ و بدر الملوک بامداد : راہنمای طباخی، بار ششم، تہران، بلا تاریخ، ص ۳۶، میں بھی ملتا ہے)۔

ترکیہ میں زمانۂ حال تک جگر نہیں کھایا جاتا تھا اور قصاب اسے کتوں اور بلیوں کو ڈال دیتے تھے، تاہم جگر اور پھیپڑوں (جنھیں طاقم یعنی پورا کہتے ہیں) اور اسی طرح دل، پھیپڑوں وغیرہ اور اوجھڑی کے کھانے کا دستور حال ہی میں کسی قدر ہو گیا ہے اور انھیں پکانے میں چلتے پھرتے البانوی سوداگروں کو، جنھیں سَکَتْچی (اوجھڑی بیچنے والے) کہتے ہیں، خاص مہارت حاصل ہے (یہ بیان P. Boratav کا ہے؛ دیکھیے P. N. Boratav و W. Eberhard : *Typen türkischer Volksmarchen*، ویزباڈن ۱۹۵۳ء، ص ۸۸)۔ پلاؤ پکانے کی ایسی ترکیبیں جن میں جگر استعمال ہوتا ہے، آج کل کی کھانا پکانے کی کتابوں میں ملتی ہیں (فوزلو پلاؤ کے لیے دیکھیے I. Orga : *Turkish cooking*، لنڈن ۱۹۵۸ء، ص ۱۲۵؛ بطخ یا مرغی کے جگر والے ایچ پلاؤ کے لیے C. Roden: کتاب مذکور، ص ۲۴۸)۔ یہ ترکی کے ایک نسلیاتی جائزے کے دوران میں برسہ میں فراہم کی گئی تھیں (H. Z. Kosay اور A. Ulkucan انادولو یمکلری و ترک متفقی، انقرہ ۱۹۶۱ء، ص ۱۰۱؛ نیز دیکھیے جگر کے تکے کباب کے لیے، جنھیں یوغورت میں لپیٹ دیا جاتا ہے، I. Orga : *Cooking with yoghurt*، لنڈن ۱۹۵۶ء، ص ۴۰)۔

اوزبکستان میں بھی "جگر کباب" تیار کیے جاتے ہیں اور بعض دفعہ، جیسے کہ سوویٹ آذربیجان میں بھی ہوتا ہے، جگر کے ٹکڑوں کے بیچ بیچ میں دنبے کی چکتی کے ٹکڑے بھی رکھ دیے جاتے ہیں (دنبہ کباب)؛ جگر کو انگیٹھی پر بھون کر اس میں کچھ بھر بھی دیتے ہیں (قوورلغان جگر) (K. Mahmudov : *Uzbekshie bljuda*، تاشقند ۱۹۶۲ء، ص ۹۸، ۱۰۲؛ N. K. Alhazov : *Azerbajdzanska)a kulinariya*، باکو ۱۹۶۳ء، ص ۴۳)۔

مآخذ : متن مقالہ میں مذکور ہیں؛ نیز دیکھیے Nikolaus Mani : *Die historischen Grundlagen der Leberforschung*، ۲ جلدیں، Basle ۱۹۵۹ تا ۱۹۶۷ء۔

(M. RODINSON)

کَبَرد : قفقاز کا ایک مسلمان قبیلہ۔ روسی * زبان میں انھیں کَبَردنتسی Kabardintsi اور ترکی میں کَبَرتایلر کہتے ہیں؛ ایک اور نام قازق Käsäg ہے۔ کبردوں کا ذکر سب سے پہلے heuerthei کے نام سے Barbaro کے ہاں ملتا ہے، جس نے ۱۴۳۶ء میں قفقاز کی سیاحت کی تھی۔ اس کا اشتقاق ابھی تک غیر یقینی ہے۔

کبردی زبان اَدیغہ (چرکس) لسانی گروہ میں سے ہے، جسے "ادیغۂ بلند" بھی کہا جاتا ہے۔

www.besturdubooks.wordpress.com

۱۹۲۶ء کی سوویت مردم شماری کے مطابق کبردوں کی تعداد نسلی اعتبار سے ۱۳۹۹۲۵ اور لسانی اعتبار سے ۱۳۸۹۲۵ تھی - ۱۹۳۹ء کی مردم شماری کی رو سے کبردوں کی تعداد ۱۶۴۰۰۰ تھی .

کبرد دریاے ترک کے بالائی حصے اور اس کے بعض معاونوں کے طاس میں آباد اور دو گروہوں میں منقسم ہیں: ایک گروہ، جو کبردۂ عظیم کے قبائل پر مشتمل ہے، دریاے ترک کے مغرب میں دریاے ترک اور دریاے ملکہ کے مابین آباد ہے؛ دوسرا، جو کبردۂ صغیر کہلاتا ہے دریاے ترک کے مشرق میں دریاے سنجہ اور ترک کے درمیان آباد ہے .

کبرد اپنے اصلی وطن سے، جو زیادہ مغرب کی جانب تھا، تیرھویں صدی عیسوی میں اپنے موجودہ علاقے میں اس وقت آئے جب الان مغول کے حملوں کی وجہ سے کمزور ہو چکے تھے - آلتون اردو کے زوال کے بعد سے انھوں نے قفقاز کی تاریخ میں ایک نمایاں کردار ادا کرنا شروع کر دیا - سولھویں صدی عیسوی میں کبرد حکمرانوں کے ماسکو کے فرمانرواؤں سے دوستانہ تعلقات قائم تھے؛ چنانچہ ایوان Ivan چہارم کی دوسری بیوی میری Marie بنت تمروک Temrük ایک کبرد شہزادی تھی - سترھویں صدی میں کبردوں نے قالموقوں کے خلاف قفقازی باشندوں کے وفاق کی قیادت کی - چونکہ انھوں نے وسطی قفقاز میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا اور وہ درۂ دریال Daryal کے قریب آباد تھے، اس لیے انیسویں صدی میں وہی سب سے پہلے روسی اقتدار کے ماتحت آئے اور اسے انھوں نے بغیر کسی خاص مزاحمت کے قبول کر لیا - روسی فتح کے زمانے میں بعض کبرد بالائی کوبان Kuban اور زیلن چک Zelenchuk کے درمیان جا بسے اور مہاجر یا پناہ گیر کبرد کہلانے لگے - ۱۸۶۴ء کے بعد مہاجر گروہ کے کچھ کبرد ہجرت کر کے سلطنت عثمانیہ میں آ گئے .

سولھویں صدی کے نصف آخر میں قریم (کریمیا) کے تاتاریوں نے کبردوں میں عیسائیت کے مقابلے میں اہلسنت کے حنفی مذہب کی ترویج کی اور سترھویں صدی کے آخر تک وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے .

کبردوں کی معیشت کا انحصار روایتی طور پر گھوڑوں کی پرورش، زراعت، باغبانی، شہد کی مکھیوں کی پرورش اور گھریلو صنعتوں پر تھا - روایتی کبردی معاشرے کا ڈھانچا بڑا پیچیدہ سا تھا اور گیارہ طبقوں پر مشتمل تھا، جنھیں دو بڑی شاخوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا : طبقۂ امرا یا آزاد گروہ اور ''پشتلی''، یعنی غیر آزاد گروہ - معاشرے کی صف اوّل میں شہزادے تھے اور والی، یعنی کبردوں کا سربراہ، بھی انھیں میں سے ہوتا تھا - ان کے بعد امرا اورک یا اورخ کا درجہ آتا تھا اور یہ ان حقوق و فرائض کی بنا پر جو انھیں شہزادوں سے وابستہ کیے ہوے تھے، چار طبقوں میں منقسم تھے - امرا کے بعد آزاد مزارعین تفو خوتل تھے- غیر آزاد گروہ حسب ذیل پر مشتمل تھا : آزاد (Azat، یعنی آزاد شدہ کسان، جو ایک حد تک اپنے سابق آقاؤں کی خدمت گزاری کے پابند تھے) ؛ اوگ Og (وابستۂ زمین مزارعین Serfs)؛ لوکا ناپت Loganaput (اوگ اور غلاموں کے مابین) اور اونات Unaut (غلام) .

انیسویں صدی میں K.Atazkun نے ایک ادبی زبان تخلیق کرنے کی کوشش کی اور ۱۸۶۵ء میں اس نے سریلی Cyrillie رسم الخط پر مبنی کبردی ابجد شائع کی - بایں ہمہ کبردی زبان کو ۱۹۲۴ء سے پہلے ایک ادبی زبان کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی - کبرد عظیم کی بولی کو

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

ھی اس ادبی زبان کی بنیاد قرار دیاگیا، چنانچہ یہ زبان خودمختارسوویت اشتراکیۂ کبرد و بالکار(Kabardo-Balkar A.S.S.R.) اور خود مختار علاقۂ قرہ چای چرکس(Karacay-Cerkes A. R.) میں سرکاری طور پر مستعمل ھے ۔کبردی زبان میں پہلا اخبار قرہ خلق کے نام سے ۱۹۲۴ء میں شائع ھوا ۔ *Letopis' Periodiceskikh izdanij S.S.S.R* کے بیان کے مطابق ۱۹۶۰ء میں دو کبردی اخبار اور دو رسالے شائع ھوتے تھے ۔

کبردوں کی پہلی بار اپنے خود مختار علاقے میں تنظیم یکم ستمبر ۱۹۲۱ء کو عمل میں آئی ۔ ۱۶ جنوری ۱۹۲۲ء کو انھیں قومی ضلع بالکار میں شامل کر دیا گیا، جو ۵ دسمبر ۱۹۳۶ء کو کبردو بالکارخود مختار خود مختار علاقہ بن گیا ۔ ۱۹۴۴ء میں سوویت جمہوریۂ اشتراکیۂ کبرد کا اعلان ھوا، جو ۹ فروری ۱۹۵۷ء کو سوویت جمہوریۂ اشتراکیۂ کبرد و بالکار میں تبدیل ھو گئی ۔ اس جمہوریہ کا علاقہ ۱۲۴۰۰ مربع کیلومیٹر پر مشتمل ھے ۔ ۱۹۵۹ء میں اس جمہوریہ کی آبادی ۴۲۰۱۱۵ تھی، جس میں ۴۵ فی صد کبرد، ۸۱ فی صد بالکار، ۳۸٫۷ فی صد روسی اور باقی قفقاز کے دیگر گروہ تھے۔

مآخذ : (۱) B. Geiger، T. Halasi-Kun، *Peoples and languages of the Caucasus* ھیگ ۱۹۵۸ء؛ (۲) A. Kuipers و K. Menges : *Istoriya kabardino Balkarskoya A. S. S. R.* ماسکو ۱۹۶۷ء؛ (۳) B. Kalmikov : *Ocerki revolutsionnogo dvizeniya v.Kabarde* Nolchik ۱۹۴۶ء؛ (۴) A.Kuipers : *Introduction to Morpheme and phoneme in kabardian* ھیگ ۱۹۶۰ء؛ (۵) Sh. B. Nogmov : *Istoriya Adigeyskogo Naroda Sostavlennaya po predaniyam* بار پنجم، Nalchik ۱۹۵۲ء؛ (۶) *Kabardintsev. Sbornik* Nalchik، ۱۹۵۷ء؛ نیز رک بہ آبازہ ؛ چرکس ؛ القبق .

(HÜLYA SALIHOĞLU)

الکِبْرِیْت : (گندھک) : القزوینی اسے * سیماب، مختلف قسم کے تارکول، نفت اور خاکستری عنبر کے ساتھ روغنی چیزوں میں شمار کرتا ھے ۔ دوسرے مصنفین اسے اثیروں، اڑ جانے والی اشیا، زرنیخ کی دو قسموں (ھڑتال اور مینڈھل)، نوشادر اور پارے میں شامل کرتے ھیں ۔

عربوں اور ان سے بھی پہلے ارسطو[؟] نے گندھک کی تین مختلف قسمیں قرار دی تھیں : عمدہ قسم کی سرخ گندھک (الجید الجوھر)، خالص زرد گندھک اور سفید گندھک ۔ مؤخرالذکر سے گندھک کی وہ قسم مراد ھے جو عرف عام میں ''Bath-Sulphur'' کہلاتی ھے ۔ اس میں سے گندھک ملی ھائیڈروجن کی سی بو آتی ھے ۔ سرخ گندھک کے متعلق، جو غالباً بالکل فرضی چیز ھے، کہا جاتا ھے کہ یہ مغرب میں سمندر کے قریب پائی جاتی ھے اور بہت کمیاب ھے ۔ اسی وجہ سے جو شخص خوبیوں میں بے مثل ھو اسے استعارۃً ''کبریت احمر'' کہتے ھیں ۔ ''گردگوگرد'' یا آنولاسار گندھک، فیرس سلفائیڈ کو بھون کر تیار کی جاتی ھے ۔ گندھک سے آتش بازی، بھک سے اڑنے والی چیزوں کی تیاری اور دھاتوں کو رنگ دینے کا کام لیا جاتا ھے ۔ بعض دھاتوں مثلاً سیسے اور چاندی کو گندھک سیاہ کر دیتی ھے ۔ کبریتی چاندی نقرئی ظروف پر سیاہ رنگ کی میناکاری (Niello Inlaying) میں استعمال کی جاتی ھے ۔ سیماب بھی پہلے سیاہ ھو جاتا ھے، لیکن گرم کرنے پر سرخ (شنگرف) بن جاتا ھے ۔ گندھک دواؤں میں بھی بہت کام آتی ھے (دیکھیے ابن البیطار، القزوینی وغیرہ) .

طبعی حالت میں گندھک تین شکلوں میں پائی

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

جاتی ہے اور عربوں کو ان تینوں کا علم تھا :-

۱ - جپسم اور کھریا کے طبقات وغیرہ میں گندھک کے ڈلے پائے جاتے ہیں - دریاے اردن کے علاقے میں الغور، یعنی بحیرۂ مردار وغیرہ کے پست علاقوں سے یہ اسی شکل میں برآمد کی جاتی تھی (المقدّسی، ص ۱۸۴) - ایران، بلوچستان اور صقلیہ میں بھی یہ اسی شکل میں پائی جاتی تھی ؛

۲ - فعال اور غیرفعال آتش فشاں پہاڑوں، مثلاً کوہِ ایٹنا Etna اور کوہِ دماوند وغیرہ میں بھی یہ پائی جاتی ہے .

۳ - یہ گندھک کے چشموں سے بھی حاصل ہوتی ہے، مثلاً خوزستان کے علاقے میں دورق الفرس کے مقام پر گندھک کے گرم چشمے موجود ہیں، جہاں سے زرد گندھک دستیاب ہوتی ہے (Guy Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ۱۹۰۵ء، ص ۲۴۲ - مشرقی علاقوں میں گندھک کی موجودگی کے متعلق معلومات کے لیے دیکھیے C. Hintze : *Handbuch der Mineralogie*، حصہ ۱، ۱۹۰۴ء، ص ۸۰، ۸۷؛ B. Dammer و O. Tietze : *Die nutzbaren Mineralien*، حصہ ۱، ۱۹۱۳ء، ص ۹۳؛ O. Stutzer : *Die wichtigsten Lagerstätten der "Nichht-Erze"*، ۱۹۱۱ء، ۱ : ۲۵۱).

کیمیا گروں کے ہاں گندھک کے بہت سے صفاتی نام رائج ہو گئے تھے (دیکھیے J. Ruska و E. Wiedemann : *Alchemistische Beitr.*، lvii، در *S. B. P. M. S.*، ۵۶ (۱۹۲۴ء): *Decknamen*، ۱۷ تا ۳۶) - یہ زرد، سرخ یا سفید عروس یا موم کے ناموں سے موسوم تھی - رنگ اور خواص کی وجہ سے اسے "الروح الصابغ" بھی کہتے تھے - جلتی ہوئی گندھک کی گلوگیر بو کے باعث اس کا نام الخنّاق پڑ گیا تھا - اسے قید الآبق (نکل بھاگنے والے کی زنجیر) یعنی سیماب کی زنجیر بھی کہتے تھے، کیونکہ وہ گندھک کے ساتھ کیمیائی طور پر مل کر ٹھوس شنگرف بن جاتا ہے - اس کے بعض اور نام شمس الدین الدمشقی (کتاب مذکور) نے لکھے ہیں، مثلاً اعراف الدیکہ (مرغ کی کلغی)، طائر البحر (سمندری پرندہ)، حبّ الرّمانہ (دانۂ انار، انار دانہ) الیاقوت الدائب (یاقوت مائع) وغیرہ؛ دیکھیے M. Berthelot : *La chimie au Moyenage*، ج ۲؛ الطغرائی، در کتاب الجوھر النضیر فی صناعۃ الاکسیر (مخطوطہ، عدد ۱۸۳۶۱، در Ahlwardts: فہرست کتاب خانۂ برلن .

ماہرین علوم طبیعیہ کی راے میں گندھک پانی، ہوا اور مٹی کے اجزا (Atoms) سے پیدا ہوتی ہے - یہ اجزا آمیزش پر تیز حرارت کے زیر اثر باہم پیوست ہو جاتے اور تیل کی سی شکل اختیار کر لیتے ہیں، جو سرد ہو کر ٹھوس بن جاتے ہیں .

کیمیاگروں کی یہ راے ہے کہ گندھک اور سیماب کا بہت سی مختلف اشیا، بالخصوص دھاتوں کی بناوٹ میں، بہت اہم حصہ ہے، لیکن یہاں گندھک اور سیماب کے الفاظ صرف عام اصطلاحات کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں اور ان کا معمولی گندھک یا سیماب سے کوئی تعلق نہیں ہے .

مآخذ : (۱) القزوینی : کتاب عجائب المخلوقات، طبع وسٹنفلڈ، ص ۲۴۳؛ (۲) J. Ruska : *Das Stein buch aus der Kosmographie etc.*، در *Jahresbericht der Oberrealsschule Heidelberg 1895/96*، ص ۴۲؛ (۳) ابن البیطار : جامع المفردات، جس میں الکبریت کے زیر عنوان اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے؛ (۴) شمس الدین الدمشقی . نخبۃ الدھر فی عجائب البرّ والبحر، ص ۵۸ و مترجمۂ Mehren، ص ۶۲ ببعد؛ (۵) J. Ruska : *Das Steinbuch des Aristoteles*، ص ۱۰۱، ہائیڈلبرگ ۱۹۱۲ء؛ (۶) E. Wiedemann : *Beiträge*، ۱ :

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

SBPMS در *Beiträge zur Geschichte der Chemie*، ۳۴ (۱۹۰۲ء): ۵۵ تا ۵۸؛ (۷) وہی مصنف: *Beiträge zur geschichte der chemie, ebenda*، ۳۴، ۴۳؛ (۸) E. von Lippmann: *Entstehung und Ausbreitung der Alchemie*، برلن ۱۹۱۹ء؛ نیز مادّۃ الکیمیا کے زیر عنوان دیگر تصانیف۔

(E. WIEDEMANN)

کَبَکْچی اوغلو مصطفٰی: اس بغاوت کا قائد جس کے نتیجے میں سلطان سلیم ثالث کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ وہ دراصل شمال مغربی آناطولی کے ایک شہر قَسْطَمُونی کا باشندہ تھا۔ باسفورس کے کنارے پر واقع قلعۂ روم ایلی کاواک کے یاماقوں (یعنی فاضل ینی چریوں) نے، جنھوں نے ۱۷ ربیع الاول ۱۲۲۲ھ/۲۵ مئی ۱۸۰۷ء کو صدر اعظم کے قائم مقام کوسہ موسٰی پاشا اور شیخ الاسلام عطاءاللہ افندی کی انگیخت پر بغاوت کردی تھی، اسے اپنا قائد منتخب کیا تھا۔ اس نے بغاوت کا کام منظم طریقے پر انجام دیا، نظام جدید [رکِ بان] کے بڑے بڑے منتظموں کو قتل کر دیا اور سلطان مصطفٰی رابع [رکِ بان] کی تخت نشینی (۲۱ ربیع الاول/۲۹ مئی) کے لیے راہ ہموار کرنے کی غرض سے بغاوت برپا کرنے والوں کے مقاصد پورے کیے۔ اسے روم ایلی کی جانب باسفورس پر واقع قلعوں کا کماندار مقرر کر کے ''تورنہ جی باشی'' کا منصب دے دیا گیا۔ پہلے شیخ الاسلام کی معاونت سے، بعد ازاں محمود طیّار پاشا کی، جسے شعبان/اکتوبر میں قائم مقام نامزد کر دیا گیا تھا، اور پھر دوبارہ شیخ الاسلام کی معاونت سے وہ امور سلطنت پر اثر انداز ہوتا رہا۔ اسے پینار حصار کے ''اعیان'' علی آغا نے ۱۹ جمادی الاولٰی ۱۲۲۳ھ/۱۳ جولائی ۱۸۰۸ء کو روم ایلی پینار میں قتل کر دیا گیا۔ وہاں علی آغا کو مصطفٰی پاشا بیرقدار [رک بان] نے اس زمانے میں ایک دستۂ فوج دے کر بھیجا تھا جب وہ خود استانبول کی طرف سلطان سلیم ثالث [رکِ بان] کو تخت پر بحال کرنے کی غرض سے بڑھ رہا تھا۔ اگرچہ کبکچی اوغلو مصطفٰی ناخواندہ تھا، تاہم اس نے بغاوت کی قیادت میں نمایاں صلاحیت کا ثبوت دیا، لیکن اس کے خلاف یہ اعتراض حق بجانب ہے کہ اس نے اس اصلاحی تحریک کو کچلنے کی کوشش کی، جس پر سلطان سلیم ثالث کے عہد میں عمل ہو رہا تھا۔

مآخذ: (۱) سجلِّ عثمانی، ۴: ۴۵۹ ببعد؛ (۲) *Révolution de*: A.D. Juchereau de Saint-Denis *Coastantinople en 1807 et 1808*، پیرس ۱۸۱۹ء، ۲: ۱۱۳ تا ۱۷۱؛ (۳) عاصم: تاریخ، مطبوعۂ استانبول، ج ۲، بمواضع کثیرہ؛ (۴) احمد جودت: تاریخ، استانبول ۱۳۰۹ھ، ۸: ۱۵۷ تا ۲۹۷؛ (۵) مصطفٰی نوری: نتائج الوقوعات، استانبول ۱۲۹۴ تا ۱۳۲۷ھ، ۴: ۴۸ تا ۵۵؛ (۶) اسمٰعیل حقی اوزون چارشیلی: مشہور روم ایلی اعیان لرندن علمدار مصطفٰی پاشا، استانبول ۱۹۴۲ء، بمدد اشاریہ؛ (۷) وہی مصنف: کبکچی مصطفٰی عصیانینہ دائر یا یزلمش بر تاریخچہ، در *Belleten*، ج ۶ (۱۹۴۲): ۲۵۳ تا ۲۶۷؛ (۸) وہی مصنف: کبکچی وقعہ عصینہ دائر بر مکتوب، در *Belletin*، ۲۹ (۱۹۶۵): ۵۹۹ تا ۶۰۴؛ (۹) Zinkeisen، ۷: ۴۶۳ تا ۴۷۱، ۵۵۲ تا ۵۵۷؛ (۱۰) N.Jorga: *Geschichte des Osmanischen Reiches*، گوتھا ۱۹۱۰ء، ج ۵، بمدد اشاریہ؛ (۱۱) A. F. Miller: *Mustafa Pasha Bayraktar*، ماسکو و لینن گراڈ ۱۹۴۷ء؛ (۱۲) S. I. Shaw: *Between old and new: the Ottoman Empire under Salim III (1789-1807)*، کیمبرج (میسا چوسٹس) ۱۹۷۱ء؛ (۱۳) H.D.Andreasyan (ترجمہ): جارج اوغلوقیانگ روزنامہ سی، ۱۸۰۶ تا ۱۸۱۰ عصیانلری، ۳: سلیم رابع مصطفٰی ثانی و علمدار مصطفٰی پاشا، استانبول ۱۹۷۲ء؛ (۱۴) احمد رفیق: کبکچی مصطفٰی، استانبول ۱۳۳۱ھ۔

(E. KURAN)

www.besturdubooks.wordpress.com

* **کُبُو** : [جمہوریۂ انڈونیشیا کے صوبۂ مغربی کالی منتان کا ایک ضلع]، جو دریاے کپواس Kapuas کے ڈیلٹا کے جنوبی حصے میں واقع ہے ۔ ولندیزی دور حکومت میں اسے حکومت خود مختاری حاصل تھی اور انتظامی لحاظ سے یہ بورنیو کے مغربی حصے کی ریزیڈنسی (Westerafdeeling von Boaneo) کی قسمت پونتیانک Pontianak [رک بآں] کے ماتحت تھا ۔ شمال میں کپواس کا طویل و عریض دریا اسے ریاست پونتیانک سے جدا کرتا ہے، مشرق میں تیان Tayan اور سمپانگ Simpang کے اضلاع ہیں اور جنوب اور مغرب میں بحیرۂ چین ۔ ریاست کبو کی بنیاد ۱۷۸۰ء کے لگ بھگ ایک عرب سید عیدروس العیدروس نے رکھی تھی، جو دریاے ترنتانگ Terentang کے دہانے کے قریب اپنے چند عرب، بوگنی Bugniese اور ملائی پیروؤں کے ہمراہ مقیم ہوگیا تھا (اس سے تھوڑی ہی مدت بعد ایک اور مہم جو عرب شریف عبدالرحمن القادری نے، جو اس کا برادر نسبتی تھا، ریاست پونتیانک کی بنیاد رکھی)۔ ریاست کبو اور اس کے صدر مقام کا نام ایک خندق (ملائی : کبو) سے منسوب ہے، جو بحری لٹیروں کے حملوں سے بچنے کے لیے کھودی گئی تھی ۔ العیدروس نے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر حفاظت آنا قبول کیا اور کمپنی نے اسے توان (Tuwan = حاکم) کے خطاب کے ساتھ یہاں کا حکمران تسلیم کر لیا ۔ زمین کے اعتبار سے اس ضلع کی اہمیت بہت کم ہے ۔ بیشتر علاقہ جنگلوں سے پٹی ہوئی دلدلوں پر مشتمل ہے، جنھیں کہیں کہیں (زیادہ تر شمال مغربی ضلع امباونگ Ambawang میں) پانی نکال کر خشک کردیا گیا ہے ۔ یہ اراضی نہایت قدیم طرز کی کاشتکاری اور ناریل پیدا کرنے ہی کے لیے موزوں ہے ۔ آبادی زیادہ نہیں اور جو ہے وہ بکھری ہوئی ہے۔ یہاں تقریباً سب کے سب تارکین وطن ہی آباد ہیں ۔ مخلوط النسل عربوں اور قلیل التعداد چینیوں کو چھوڑ کر باقی آبادی زیادہ تر بوگنیوں پر مشتمل ہے ۔ ڈیاک Dayaks تعداد میں بہت ہی کم ہیں ۔ اکثریت اسلام کی پیرو ہے ۔ ریاست کے حکمران کا صدر مقام ایک معمولی سی بستی تھی اور وہ تین وکیلوں کی مدد سے حکومت کرتا تھا ۔ یہ وکیل اس کے اپنے خاندان کے رکن ہوتے تھے، جنھیں گزر اوقات کے لیے کچھ زمین دے دی جاتی تھی ۔ [۱۹۵۰ء میں جب ولندیزیوں کا وفاقی نظام ختم کر دیا گیا اور اس کے بجاے وحدانی طرز حکومت کا نفاذ ہوا تو بورنیو کی ریاستیں بھی جمہوریۂ انڈونیشیا کی متحدہ مملکت میں شامل ہوگئیں ۔ مزید تفصیلات کے لیے رک بہ انڈونیشیا؛ پونتیانک] .

مآخذ : (۱) P. J. Veth : *Borneo's Wester-afdeeling* ۲ جلد، Zaltbommel ۱۸۵۴-۱۸۵۶ء؛ (۲) H. von Dewall : *Matan, Simpang, Soekadana, de karimata-eilanden en Koeboe*، در *TBGKW*، ج ۱۱/۱ (۱۸۶۲ء)؛ (۳) J. J. K. Enthoven : *Bijdrgen tot de geographie van Borneo's Westerafdeeling*، لائیڈن ۱۹۰۳ء ۲ : ۸۶۹؛ (۴) *Encyclopaedie van Neder-landsch Indie* بار دوم، ۲ (۱۹۱۸ء) : ۳۵۷ (بذیل مادّۂ KOEBOE)؛ [(۵) شاھد حسین رزاقی : انڈونیشیا، لاھور ۱۹۶۳ء؛ مزید مآخذ کے لیے رک بہ انڈونیشیا].

(W. H. Rassers [و ادارہ])

* **کبیر** ۔ پندرھویں صدی کا ایک ہندوستانی صوفی، جس کے بارے میں ہندو اور مسلمان دونوں نے دعوٰی کیا کہ وہ ان کے مذہب کا پیرو تھا ۔ اس سے ہندی دوھوں کی ایک کثیر تعداد منسوب کی جاتی ہے، لیکن ان کا مستند ہونا مشتبہ ہے ۔ اسی طرح اس کے حالات زندگی کے بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اصل

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

حقیقت افسانوی روایات کے نیچے دب کر رہ گئی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مسلمان جلاہے کا بیٹا یا متبنّٰی تھا اور ویشنو مت کے ایک مصلح رامانند کا چیلا بن گیا تھا ۔ وہ بنارس میں رامانند کے چرنوں میں بیٹھتا اور ان مذہبی اور فلسفیانہ مباحث میں حصہ لیتا رہا، جن میں اس کا گرو برھمنوں اور صوفیوں کے ساتھ حصہ لیا کرتا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بافندگی اس کی گزر اوقات کا ذریعہ تھی ۔ اس نے شادی بھی کی تھی اور اس کے بچے بھی ہوئے ۔ وہ جہاں یوگیوں کی پیشہ ورانہ رہبانیت کو حقارت سے دیکھتا تھا وہاں کٹر مذہبی لوگوں کے عقائد و ضوابط سے بھی بے پروا تھا، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ۔ اس نے اپنے صوفیانہ عقیدے کے مطابق توحید الٰہی کے گیت گائے، جس کے باعث اسے جبر و تشدد کا ہدف بھی بننا پڑا ۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۴۹۵ء میں، جب اس کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی، اسے بنارس سے نکال دیا گیا ۔ اس نے بالآخر ۱۵۱۵ء میں مگھر (ضلع بستی) میں وفات پائی ۔ مشہور ہے کہ اس کی میّت کی آخری رسوم ادا کرنے کے سلسلے میں اس کے ہندو اور مسلمان چیلوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا کیونکہ ہندو اسے جلانا اور مسلمان دفن کرنا چاہتے تھے ۔ جب انھوں نے وہ کپڑا اٹھایا جس سے لاش ڈھکی ہوئی تھی تو کیا دیکھتے ہیں کہ میت کے بجائے پھولوں کا ایک ڈھیر پڑا ہے ۔ ان میں سے نصف پھول ہندوؤں نے بنارس میں نذر آتش کر دیے اور باقی نصف مسلمانوں نے مگھر میں سپرد خاک کیے، جہاں ان کی خانقاہ مسلمان کبیر پنتھیوں کے زیر نگرانی آج تک موجود ہے ۔ کبیر کے معاصرین کی طرح عصر حاضر کے علما میں بھی یہ اختلاف رائے موجود ہے کہ وہ ان دو متخالف مذہبوں میں سے کس کا پیرو تھا ۔ ایچ ۔ ایچ ۔ ولسن H. H. Wilson (ص ۶۹، ۷۴) اور آر ۔ جی ۔ بھنڈارکر (ص ۶۹) اسے ہندو مانتے ہیں، اور جی ۔ ایچ ۔ ویسٹ کوٹ G. H. Westcott (ص ۲۹ ببعد) مسلمان ۔ گریرسن G. H. Grierson کا نظریہ (*JRAS*، ۱۹۰۷ء، ص ۳۲۵، ۴۹۲) کہ اس نے اپنے خیالات عیسائی ماخذ سے حاصل کیے تھے، ایک بے بنیاد خوش فہمی ہے اور اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے کلام کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اسے کسی منظم مذہب سے منسلک ہونے کی کوئی خواہش نہیں تھی:

[''اپنے بچار اسواری کیجیے
سہج کے پائڈے پاو جب دیجیے
جن کبیر ایسا اسوارا
بید کتیب دوہوں تھے نیارا

(کبیر گرنتھاولی، بتصحیح شیام سندر داس، بار چہارم، سمت ۲۰۰۸/۱۹۵۱ء، ص۹۶)]، یعنی مجھ بچارے کو اپنی زین بنانے دو اور عشق الٰہی کی رکاب میں پاؤں رکھنے دو ۔ کبیر کہتا ہے کہ اچھے سوار وہی ہیں جو ویدوں اور قرآن مجید سے دور رہتے ہیں''۔ ایسے ہی اس نے اپنے کسی مذہبی یا فلسفیانہ نظام کو تشکیل دینے کی بھی کوشش نہیں کی ۔ بایں ہمہ اس نے کسی خاص اوتار سے تعلق قائم کیے بغیر اپنے زمانے کی ویشنو دھرم کی تعلیمات کو عام کیا اور آزادانہ طور پر خدا کو رام، ہری، علی، یا اللہ کے نام سے پکارا ۔ اس نے ہندو دھرم کے ظواہر، مثلاً جنیو، ذات پات کی تمیز اور مندروں میں پوجا پاٹ کی رسوم کو رد کر دیا؛ اسی طرح اسلامی اسناد و تاسیسات (مثلاً قرآن مجید، ختنہ، حج، ملّا، قاضی، وغیرہ) کے بارے میں اس نے جو اشارے کیے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اسے انھیں تسلیم کرنے سے انکار تھا ۔ اس کے نزدیک خدا ایک ایسی حقیقت

www.besturdubooks.wordpress.com

ہے جو ہر جگہ موجود ہے ۔ اس کے ساتھ ہی وہ روح انسانی کی جداگانہ انفرادیت کا قائل تھا، جسے وصال الٰہی کسی علم یا رسمی عبادت کے ذریعے سے نہیں، بلکہ عشق کے ذریعے سے حاصل ہوسکتا ہے ۔ اس نے سادہ مثالوں اور روز مرہ کی زندگی سے گہرے تعلق کی مدد سے اپنے عقائد ایسی شکل میں پیش کیے کہ ان پڑھ لوگوں نے، جن پر اس کے پیروؤں کی اکثریت مشتمل نظر آتی ہے، انھیں بلا تامل قبول کر لیا۔

مآخذ : (۱) دبستان مذاہب، کلکتہ، ۱۸۰۹ء، ص ۲۴۶ تا ۲۴۸ و مترجمۂ Shea و Troyer، پیرس ۱۸۴۳ء، ۲ : ۱۸۶ تا ۱۹۱؛ (۲) H. H. Wilson : *Essays on the Religion of the Hindus*، لنڈن ۱۸۶۲ء، ۱ : ۶۸ ببعد)؛ (۳) *Gli scritti de Padre Marco Della Tomba*، طبع Gubernatis (Firenze ۱۸۷۸ء)، ص ۱۹۱ ببعد، ۲۰۵ ببعد؛ (۴) E. Trumpp : *Bermerkungen über den indischen Reformator Kabir*، در *Atti del iv. Congresso internat. deg li Orientalisti* Firenze، ۱۸۸۰ تا ۱۸۸۱ء، ۲ : ۱۵۹ ببعد؛ (۵) کبیر چرتر، طبع پنڈت والجی بچر، سورت ۱۸۸۱ء؛ (۶) G. H. Westcott : *Kabir and the Kabir Panth*، کانپور ۱۹۰۷ء؛ (۷) M. A. Macauliffe : *The Sikh Religion*، (اوکسفرڈ ۱۹۰۹ء، ۶ : ۱۲۲ ببعد؛ (۸) *One Hundred Poems of Kabir*، مترجمۂ رابندر ناتھ ٹیگور بہ اعانت Evelyn Underhill، لنڈن ۱۹۱۴ء (۹) رام چندر بوس *Hindu Heterodoxy*، کلکتہ، ۱۸۸۷ء، باب ۱۰؛ (۱۰) Sir. R. G. Bhandarkar : *Vaisnavism, Saivism, and Minor religious Systems*، در Strassburg *Encyclopaedia of Indo-Aryan Research*، ۱۹۱۳ء، ۳/۶ : ۶۷ تا ۷۳؛ (۱۱) *The Bijak of Kabir*، مترجمۂ پادری احمد شاہ، ہمیر پور ۱۹۱۷ء؛ (۱۲) G N. Farquhar : *An Outline of the Religious Literature of India*، اوکسفرڈ ۱۹۲۰ء، ص ۳۳۱ تا ۳۳۵؛ [(۱۳) پنڈت منوہر لال زتشی : کبیر صاحب، الٰہ آباد، ۱۹۳۰ء، جس کے آخر میں رجوع کرنے کے لیے کتابوں کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے] ۔ کبیر سے منسوب تصنیفات کا کوئی تنقیدی نسخہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ۔ ان کی فہرست کے لیے دیکھیے Westcott : کتاب مذکور، ص ۷۳، ۷۴، ۱۶۹ تا ۱۷۲ ۔

(T. W. ARNOLD)

الکبیر : باری تعالیٰ کا ایک نام، رک بہ * اللہ ؛ الاسماء الحسنیٰ .

کبیر پنتھی : (ہندی میں پنتھ کے معنی ہیں * طریقہ، مذہبی فرقہ) ۔ کبیر کی تعلیم کی اس خصوصیت کے باوجود کہ وہ فرقہ بندی کے خلاف تھی، آج کل اس کے پیروؤں کا ایک مخصوص فرقہ ملتا ہے، جس کی غالب اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے ۔ کبیر پنتھیوں کی تنظیم کے بارے میں بہترین بیان Westcott : *Kabir and Kabir Panth*، کانپور ۱۹۰۷ء، باب ۵، ۶، میں ملتا ہے ۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد صوبجات متوسطہ میں ۱۹۹۷۵۹ اور صوبجات متحدہ میں ۹۶۰۵ تھی ۔ دوسرے صوبوں میں وہ یا تو ہیں ہی نہیں اور اگر ہیں تو بہت کم .

مآخذ : (۱) W. Crooke : *Tribes and Castes of the North-Western Provinces and Oudh*، کلکتہ ۱۸۹۶ء، ۳ : ۷۳ تا ۷۷ ؛ (۲) R. V. Russell : *Tribes and Castes of the Central Provinces of India*، لنڈن ۱۹۱۶ء، ۱ : ۲۳۲ ببعد؛ (۳) *Gazetteer of the United Provinces*، الٰہ آباد ۱۹۰۷ء، ۳۲ : ۲۲۵، ۲۲۶؛ (۴) *Central Provinces Gazetteer : Bilaspur District*، الٰہ آباد ۱۹۱۰ء، ص ۷۸ تا ۸۰ .

(I. W. ARNOLD)

کتاب . (ع؛ جمع : کُتُب) عربوں نے لکھے *

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کا فن اپنے سامی النسل شمالی پڑوسیوں سے سیکھا اور انھیں سے کتاب اور کتابت سے متعلق اصطلاحیں اخذ کیں ۔ ان کی ابتدائی عبارتوں میں ہر تحریر شدہ چیز ''کتاب'' کہلاتی تھی ۔ یہ ضروری نہ تھا کہ وہ واقعی ''کتاب'' ہی ہو اور سچ تو یہ ہے کہ خط اور مراسلے تک کو محض ''کتاب'' ہی کہتے ہیں ۔ چونکہ ہمارے سامنے قرآن مجید سے پہلے کی کوئی کتاب نہیں اور پتھروں پر کندہ بعض تحریروں کے علاوہ اگر کوئی اور چیز باقی ہے تو پرانے زمانے کے شعرا کی چند نظمیں ہیں جن کے ساتھ ہم ان قصوں (رک بہ قصّہ) کا اضافہ کر سکتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظمیں کن مواقع پر کہی گئی تھیں، لہٰذا ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس سے پہلے کتابوں کا وجود تھا یا نہیں ۔ قرآن مجید میں لفظ ''کتاب'' اکثر جگہ مختلف معانی میں آیا ہے، لیکن اپنے نمایاں ترین مفہوم میں ''کتاب'' عبارت ہے اس مقدس نوشتے سے جو وحی الٰہی پر مشتمل ہو اور اللہ نے اپنے بندوں کے لیے اسے نازل کیا ہو؛ لہٰذا اُن تین مذاہب کے پیرو، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے زمانے کے نصاریٰ، یہود اور مجوسی ''اہل الکتاب'' کہلائے [مجوسی اہل کتاب نہیں، البتہ ان کی عورتوں سے نکاح کے علاوہ باقی امور میں ان سے اہل کتاب کا سا برتاؤ کرنے کا حکم حضرت عمر فاروقؓ نے دیا تھا] ۔ نصاریٰ کی کتاب سے مراد ''انجیل'' یعنی عہد نامۂ جدید اور یہود کی کتاب سے مراد غالباً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ''اسفار الخمسۃ (Pentateuch)''، نیز مزامیر ہیں ۔ مجوسیوں کی کسی کتاب کا ذکر نہیں، البتہ قرآن مجید میں ایک اور ''کتاب'' [یعنی ''لوح محفوظ''] کا ذکر ملتا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی تقدیر لکھ دی ہے اور کوئی شخص اپنی زندگی میں جو بھی اچھے برے کام کرتا ہے وہ برابر اس میں لکھ دیے جاتے ہیں تاکہ بطور شہادت پیش ہو سکیں اور قیامت کے دن اسی کے مطابق جزا اور سزا ملے ۔

بہر حال سب سے ارفع و اعلیٰ کتاب [= الکتاب] قرآن مجید ہے ۔ یہ وحی من جانب اللہ ہے، جو تمام ایسی تحریفات سے مبرّا و منزہ ہے جو بد نیتی یا انسانی سہو و نسیان کا نتیجہ ہوں ۔ خود اس کا اپنا دعوی ہے کہ دنیا میں کوئی کتاب اس کی ہمسری نہیں کر سکتی اور نہ آئندہ کر سکے گی، اس لیے کہ وہ اللہ کا سچا کلام ہے ۔ چونکہ ''الکتاب'' اللہ کا کلام ہے اس لیے قرآن مجید میں یہ لفظ ''حکم خداوندی'' کے مفہوم میں بھی آیا ہے، یا اس سے مراد وہ ''نقش'' بھی ہے جو اللہ آدمی کے دل پر لگا دیتا ہے ۔ پھر چونکہ جو چیز لکھ دی جائے وہ باقی رہتی ہے، اس لیے اللہ نے اپنی طرف سے یہ ''لکھ دیا''، یعنی اپنے اوپر واجب کر لیا کہ وہ اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا ۔ آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کتاب کے معنی ایک معمولی خط یا اس پیغام کے بھی ہیں جو کسی دور افتادہ شخص کو لکھا جائے ۔

اگر ہم عہد جاہلیت کے عرب شعرا کے کلام میں اس لفظ کے معنی تلاش کریں، تو مذکورۂ بالا تمام معنی میں اس لفظ کا مستعمل ہونا پایا جاتا ہے، لیکن اگر وحی الٰہی کے معنوں میں اس کا استعمال کہیں نظر آئے تو پھر ہمیں اسے شک کی نگاہ سے دیکھنا ہوگا ۔ عَدِی بن زید ایک نصرانی شاعر تھا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے کچھ ہی پہلے گزرا ہے ۔ اس کے متعلق اگرچہ یہ کہا گیا ہے کہ اس نے فعل ''کتب'' تنقید کے معنوں میں استعمال کیا ہے (جَمْهَرَةُ الأَشْعَارِ النَّصرانيّة، طبع شیخو Cheikho، ص ۱۹۲ ببعد)، لیکن ہو سکتا ہے کہ بعد کے زمانے کے کسی

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

جعلساز نے یہ نظم اس سے منسوب کر دی ہو ۔ بہر حال اعتماد کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن مجید میں جن معنوں کا اظہار کیا گیا ہے ان کے بارے میں اگر ایسے قدیم شواہد ملیں تو لازمی طور پر وہ جھوٹے ہی ہوں گے ۔ پرانی نظموں میں غیر زبانوں کے رسم الخط میں لکھی ہوئی تحریروں کے حوالے زیادہ کثرت سے ملتے ہیں اور اس کی کافی شہادت موجود ہے کہ قدیم شعرا کم از کم ایسی قلمی کتابوں کی ظاہری شکل و صورت سے بخوبی آشنا تھے جنھیں مطلاّ و مذہب سرورقوں سے مزّین کیا گیا ہو ۔ شاعر طفیل الغَنَوی (۵/۱۰ : ۳) نے اپنے ایک شعر میں ''پروانۂ راھداری'' کو ''کتاب'' لکھا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی یہ لفظ کتاب کے معنوں میں بحیثیت ایک ادبی تالیف یا تخلیق کے ملتا ہے اور اگرچہ مجھے یقین ہے کہ بعض منظومات ابتدائی زمانے ہی میں ضبط تحریر میں آ چکی تھیں، تاہم کوئی تصنیف یا تالیف اس وقت تک کاغذ یا رَقّ (Parchment) پر نہیں لکھی گئی جب تک کہ قرآن مجید کے ضبط تحریر میں آنے کے بعد کچھ مدت نہیں گزر چکی تھی ۔ اسی طرح یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا کہ عربی میں کون سی تالیف یا تصنیف پہلی مرتبہ کتاب کی شکل میں لکھی گئی ۔ جامعین احادیث نبویہ عرصۂ دراز تک حدیث کی زبانی روایت پر مصر رہے ۔ غالباً یہی صورت حضرت ابن عبّاسؓ کی تفسیر قرآن کی رہی ۔ یہ تفسیر خاصی مبسوط ہو گی کیونکہ البَغوی نے معالِم التّنزیل میں بیان کیا ہے کہ یہ کتاب انھیں تین مختلف واسطوں سے ملی تھی ۔ مغازی یا سیرت نبوی کے متعلق کتابیں بھی بہت شروع زمانے میں تحریری شکل میں آ گئی تھیں۔ چونکہ تمام قدیم تصانیف و تالیفات آج ناپید ہیں اور ان کے صرف اقتباسات باقی ہیں، اس لیے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ واقعی وہ ''کتابیں'' تھیں ۔ بہر حال ایک بات یقینی ہے کہ شاعر لَبِید کے دیوان کے چند قلمی نسخے پہلی صدی ہجری میں موجود تھے، جس کی شہادت الفرزدق کے ایک شعر سے ملتی ہے (نقائض، طبع Bevan، ۱ : ۲۰۱ س ۶) ۔ اس شعر میں الفرزدق نے بیان کیا ہے کہ اس کے پاس لبید کے اشعار کی پوری کتاب ہے ۔ اس کے بعد ممالک اسلامیہ میں نہایت سرگرمی سے کتابیں لکھی جانے لگیں ۔ اس کی تصدیق مختلف تذکروں سے ہوتی ہے جن میں ہزارہا ایسی کتابوں کے نام ملتے ہیں جو ضائع ہو چکی ہیں ۔ آخر میں یہ ذکر کر دینا مناسب ہو گا کہ ایک اور کتاب کو بھی محض ''الکتاب'' کہلوانے کا امتیاز حاصل ہوا اور وہ ہے سیبَوَیہ البصری کی قواعد نحو پر عظیم تالیف ۔ اوائل اسلام کی یہی وہ نہایت مبسوط تالیف ہے جو ہم تک پہنچی ہے ۔

عربی لغویوں نے کوشش کی ہے کہ عربی زبان میں اس مادّے کے دیگر مشتقات سے، جو مختلف معانی رکھتے ہیں، اس لفظ کے مفہوم کا استخراج کریں ۔ ان معانی کے متعلق لغت کی کتابوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک ایسا لفظ جو فن کتابت کے ساتھ شمال سے آیا ہو اس کا کوئی اشتقاق وہاں تلاش کرنا لا حاصل ہو گا ۔

(F. KRENKOW)

کتاب الأسْطُقُص : (Tabula Samaragdina)*

ہرمیس تریسمجیست Hermes Trismegistos سے منسوب کیمیا گری کی تعلیمات ۔ اگرچہ یورپ اس کتاب کے ترجمے سے بارھویں صدی عیسوی کے وسط سے واقف تھا، لیکن اصل کتاب کی دستیابی آج تک علم الکیمیا کی تاریخ کا لاینحل مسئلہ رہا ہے [دیکھیے ابن القفطی: تاریخ الحکماء،

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ص ۱۲۹، "کتاب الاُسْطُقُصّات (= الاُسْطُقُسات) نقل حنین"، در حالات جالینوس] ۔ بیکن کی تصانیف کی اشاعت (۱۹۲۰ء) میں R. Steele نے ثابت کیا ہے کہ *Tabula* کا متن نام نہاد ارسطا طالیس کی تصنیف سرالاسرار کے عربی اور لاطینی ترجمے میں محفوظ ہے ۔ ۱۹۲۳ء میں E. J. Holmyard نے جابر بن حیان کی کتاب الاسطقص الثانی کی صورت میں ایک قدیم تر متن کا پتا چلایا ہے ۔ J. Ruska نے بھی ثابت کیا ہے کہ کتاب کے بعض ژولیدہ مقامات کا مأخذ سرّالخلیقہ کا خاتمہ ہے، جو Hermes کی تالیف ہے اور بلینوس کو ہرمس کی قبر سے ملی تھی ۔ شاید اس کے مطالعے سے *Tabula* کی تاریخ کے بعض مقامات پر Hugo Sartelliensis کے زمانے سے عصر حاضر تک روشنی پڑ سکے ۔ وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جابر بن حیان بلینوس (Appollonius) کی کتاب سے پہلے سے متعارف تھا اور یہ بات یقینی ہے کہ کتاب باطنی حلقوں کی پیداوار ہے ۔

مآخذ: R. Steele: *Opera hactenus inedita Rogeri Baconi*، اوکسفرڈ ۱۹۲۰ء، ج ۵؛ (۲) E. J. Holmyard: *The Emerald Table*، در *Nature*، ۱۹۲۳ء، ۲: ۵۲۵؛ (۳) J. Ruska: *Tabula Smaragdina*، ہائڈلبرگ ۱۹۲۶ء؛ (۴) M. Plessner: *Neue Materialien zur Geschichte der Tabula Smaragdina*، در *ISL*، ۱۹۲۷ء، ص ۷۷ ببعد؛ (۵) J. Ruska: *Die siebzig Bücher des Ǧabir ibn Ḥajjan*، در *Studien zur Gesch. d. Chemie, Festschrift für E. O. V. Lippmann*، برلن ۱۹۶۷ء، ص ۴۴؛ [(۶) ابن ابی اصیبعة: عیون الانباء، ص ۱۵۵] ۔

(J. RUSKA)

* **کتابُ اللہ**: رک بہ قرآن ۔

* **کتاب الجِلْوَہ**: فرقۂ یزیدیہ [رک بآں] کی دو مقدس کتابوں میں سے ایک کتاب؛ اس میں اور مُصْحَف راش میں ان کے مذہب کی بنیادی چیزیں دی گئی ہیں ۔ چونکہ یزیدیوں کی مذہبی زبان کردی ہے اور ان کی جن دعاؤں کا ہمیں علم ہے وہ سب بھی کردی زبان میں ہیں (مثلاً سب سے بڑی یعنی صبح کی دعا، اصطباغ اور ختنے کے وقت پڑھے جانے والے کلمات، مجلس سنجاق میں کیے جانے والا اعلان؛ مُصْحَف راش کے مشکوک الصحة بیانات کے سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خود خدا بھی کردی زبان بولتا ہے) ۔ عجیب بات ہے کہ یزیدیوں کی دونوں مقدس کتابیں، جن کا وجود مدتوں سے معلوم ہے اور جن کے اصل نسخے یورپیوں کے قبضے میں آ چکے ہیں، عربی میں ہیں، یعنی (۱) کتاب الجلوۃ (کِتِیْبِ جَلْوَۃ) یا "کتاب الوحی" (شرف الدّین نے ان مخطوطات کی بنا پر جو اس کی دسترس میں تھے اس لفظ کو جُلْو لکھا ہے، مگر یہ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے)؛ (۲) مُصْحَف راش (= "سیاہ کتاب") : ظاہر ہے یہاں سیاہ سے مراد کوئی مقدس چیز ہے، مثلاً یہ کہ خدا "سیاہ پہاڑ" پر اترتا ہے (مُصْحَف، عدد ۱۶)۔ نام کی یہ تشریح کہ ممنوعہ کلمات کی نسبت چونکہ کہا جاتا ہے کہ انھیں سیاہ موم سے ڈھانک دیتے ہیں، اس لیے اس کتاب کا یہ نام ہوا، غلط ہے، کیونکہ یہاں قرآن مجید کا ذکر یزیدیوں کی مقدس کتاب کے متبادل کے طور پر کیا گیا ہے ۔

پادری انستاس ماری (Father Anstase Marie) البغدادی پہلا شخص ہے جو ۱۹۰۴ تا ۱۹۰۶ء میں سِنْجار کے ناظر کتب کو رشوت دے کر ان دو مقدس کتابوں کے مزعومہ اصل نسخوں کے چربے لینے میں کامیاب ہوا جو رقّ پر لکھے ہوئے ہیں ۔ یہ کتابیں مخفی رسم الخط میں اس قدیم کردی میں لکھی گئی ہیں، جو ارمنی زبان کی

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

یاد تازہ کرتی ہے ۔ اس مخفی رسم الخط میں لکھے ہوئے متن سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اسے جس اصل نسخے سے نقل کیا گیا وہ عربی میں تھا ۔ بایں‌ہمہ جعل سازی کے امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً اس لیے کہ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یورپی فضلا کو یزیدی مذہب میں دلچسپی ہے تو موصل میں کئی دھوکے باز نئے متون دریافت کرنے کی کوشش میں رہنے لگے ۔ منگانا Mingana نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دیرالکوش (Alkosh) کے ایک سابق نسطوری راہب شماس ایریمیا شامر Shammas Eremia Shamir (م ۱۹۰۶ء) نے، جو استقفیۂ کرکوک کا باشندہ تھا، ان تمام متون کی جعلسازی کی تھی جنھیں Chabot، Giamil، Isya Joseph اور Browne نے شائع کیا تھا؛ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ Maxim Bittner نے اس موضوع پر اپنے تحقیقی مقالے *Die heiligen Bücher der Yeziden oder Teufelsan-better*، مع *Nachtrag*، در *Denkschriften d. Wiener Ak. d. Wiss*، میں تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کرکے اس کردی متن کو مستند ثابت کر دیا ہے ۔ اس متن میں کردی زبان کی ایک حقیقی متروک شکل ملتی ہے، جو اب بولی نہیں جاتی اور جس کا مُکری Mukri بولی سے، جو سنجاق سلیمانیہ کے بیبہ Bebe کردوں کی زبان ہے، قریبی تعلق ہے؛ لہٰذا کسی مشرقی جعل ساز کے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ وہ اپنے محدود ذرائع سے اسے از سر نو ترتیب دے سکے ۔ ان کتابوں کی زبان وہ نہیں ہے جو یزیدی آج کل بولتے ہیں ۔

بہر حال یہ سوال ابھی حل طلب ہے کہ آیا کردی نسخہ اپنی قدیم زبان کے باوجود عربی نسخے سے در حقیقت قدیم تر ہے، یا جیسا کہ بعض لسانی خصوصیات غمازی کرتی ہیں (مثلاً ضلع جگت کا استعمال جو کردی زبان میں نا قابل فہم ہے) محض عربی سے دوبارہ کردی زبان میں ترجمہ ہے، جو قدیم زمانے میں کیا گیا ۔

ہو سکتا ہے کہ در اصل کتاب الجلوہ کردی زبان میں لکھی گئی ہو کیونکہ کئی مقامات پر عربی متن کے مقابلے میں کردی متن کی عبارت زیادہ واضح اور مربوط ہے ۔ اس کے برعکس مصحف راش کا عربی متن کردی متن سے بہتر ہے ۔ بقول شرف الدّین کتاب الجلوہ اپنی موجودہ شکل میں کسی عرب کی لکھی ہوئی نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ اس کی زبان جدید ہے؛ بہت سی تعبیرات ایسی ہیں جنھیں کلاسیکی عربی میں استعمال ہی نہیں کیا جاتا تھا، یا ان کا استعمال بہت بعد کے زمانے میں ہونے لگا تھا ۔ کئی ایک مقامات پر جملوں کی ساخت بھی غیر عربی ہے ۔ مصحف راش کی عربی اس سے بھی زیادہ جدید ہے کیونکہ اس میں عثمانی ترکی کے اثرات ناقابل انکار طور پر پائے جاتے ہیں ۔

اب تک ہمیں ان دو مقدس کتابوں کے کم از کم چار نسخوں کا علم ہے : ان میں سے ایک ۱۸۹۵ء میں O. Parry کی ملکیت تھا؛ دوسرا نسخہ Isya Joseph کے پاس ہے، جسے *Amer. Journ. of Sem. Lang.*، ج ۲۵، میں شائع کیا گیا تھا ؛ اس کے علاوہ اس کے پاس اس کتاب کے دو اور نسخے بھی ہیں ۔ یہ دو نسخے Father Anastase Marie نے حاصل کیے تھے جن میں سے ایک کو سنجاری نسخہ کہا جاتا ہے، جسے ۱۸۹۹ء میں ایک یزیدی مرتد کے لیے کسی سنجاری یزیدی نے نقل کیا تھا، بحالیکہ دوسرا خود انستاس نے ایک موصلی کے اصل نسخے سے ۱۹۰۴ء میں نقل کیا تھا ۔

کتیب جلوہ، جس کی اصل بقول Joseph ۱۸۹۲ء میں بھی ملا حیدر کے مکان، واقع

www.besturdubooks.wordpress.com

باعدّریہ، میں تھی اور جسے سال میں دو بار شیخ عدی کے مزار پر لے جایا جاتا تھا، بہت مختصر ہے ۔ کتابی صورت میں اس کے آٹھ صفحے بنتے ہیں اور اس کی ۱۰۹ سطریں ہیں ۔ اسے اس مذہب کے مشہور بانی شیخ عَدِی [رکک بآن] (م ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء یا ۵۵۷ھ/۱۱۶۲ء) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے یہ کتاب شیخ فخر الدّین کو املا کرائی تھی ۔

چونکہ کتاب الجلوہ کا ذکر الردّ علی الرّافضة والیزیدیة المخالفین للملّة الاسلامیّة المحمّدیه میں نہیں آیا، جسے ابن جمیل (أبو فراس عبید اللہ) جیسے باخبر مصنّف نے، جو رستاق فرات کا رہنے والا تھا، ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء میں تصنیف کیا تھا اور نہ المقریزی ہی نے اس کا کوئی ذکر ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء میں شیخ عَدِی کے مزار کی تباہی اور اس کی ہڈیوں کو جلانے کی کیفیت لکھتے وقت کیا ہے؛ لہٰذا شرف الدّین اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس کتاب کی تاریخ تالیف ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء یا ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء سے پہلے متعین نہیں کی جا سکتی ۔ چونکہ اولیا چلبی نے بھی اس کتاب کا ذکر نہیں کیا، اس لیے اس کتاب کی تاریخ تالیف کو اور پیچھے، یعنی ۱۶۵۵ء تک، لانا ہوگا.

بہرحال مذکورۂ بالا حقائق سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یزیدیوں کو اس کتاب کا راز مخفی رکھنے میں بڑی کامیابی ہوئی ہے ۔ باوجود ان فوائد کے جو انہیں اہل الکتاب کی حیثیت سے حاصل ہو سکتے تھے انہوں نے اپنی مقدس کتابوں کے وجود سے انکار کرنے کو ترجیح دی ۔ [اسلام میں ہر صاحب کتاب قوم کو اہل کتاب نہیں کہا گیا ۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں اہل الکتاب کہا گیا ہے اس سے مراد خصوصاً یہودی اور عیسائی ہی ہیں] ۔

صرف شیخ میران اسمٰعیل بک عَبْدی بک اوغلو نازلی رحانی یزید کی مسائل آموز (Catechism) کتاب میں، جو اس نے روسی یزیدیوں کے لیے لکھی تھی، "شاندار جلوہ" (Gyliazim) کا حوالہ یزیدی روایت کے ایک مأخذ کی حیثیت سے دیا گیا ہے ۔

کِتیبِ جَلوہ کے محتویات، جن کی ہیئت اور متن دونوں اس کے بلند مقاصد کے مطابق ہیں، مندرجۂ ذیل ہیں: ملک طاؤس نے، جو تمام کائنات سے پہلے موجود تھا، عبطاؤس (= عبد طاؤس = شیخ عدی) کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ اس کے برگزیدہ بندوں یعنی یزیدیوں کو زبانی طور پر اور بعد ازاں کتیب جلوہ کے ذریعے ہدایت دے، جسے پڑھنے کی کسی غیر یزیدی کو اجازت نہیں (دیباچہ) ۔ اس کے بعد وہ صیغۂ متکلم میں اپنے ازلی اور ابدی ہونے، تمام دیگر خالقوں اور دیوتاؤں (نہ کہ مخلوقات، جیسا کہ عربی متن میں ہے) پر قدرت مطلق رکھنے اور اپنے حاضر و ناظر اور رزّاق ہونے کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمام دیگر کتب مقدسہ غلط ہیں؛ خیر و شر واضح طور پر قابل ادراک ہیں؛ دنیا پر اسی کی فرمانروائی ہے اور اس کے نا قابل فہم حکم کی رو سے ہر دور میں ایک بڑا آدمی ہماری ہدایت کے لیے دنیا میں بھیجا جاتا ہے (باب اوّل) ۔ اس کے بعد وہ اپنے جزا و سزا دینے کے اختیار کا ذکر کرتا ہے، جس سے نا اہل لوگوں کو بھی فوائد سے محروم نہیں کیا جاتا ۔ پھر ایک سچے یزیدی کی موت اور تناسخ ارواح کا ذکر کرتا ہے (باب ۲) ۔ وہ کہتا ہے کہ صرف اسی کو مخلوقات اور کائنات کو فنا کرنے کی قدرت حاصل ہے (باب ۳) ۔ وہ لوگوں کو ان اجنبی تعلیمات کے بارے میں خبردار کرتا ہے جو اس کی اپنی تعلیمات کی نقیض ہیں؛ علاوہ ازیں وہ تین ایسی چیزوں کے خلاف بھی تنبیہ کرتا ہے جن

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

کا نام نہیں دیا گیا؛ نیز اپنے متبعین کے لیے اپنی پرقوت حفاظت و نگہداشت کا وعدہ کرتا ہے، بشرطیکہ وہ متحد رہیں (باب ۴) - وہ ان سے خواہش کرتا ہے کہ وہ اس کے مذہب اور اس کے خادموں کے احکام کی اطاعت کریں (باب ۵) .

مصحف راش زیادہ جامع اور یزیدی کردی زبان میں ہے - اصل کتاب طومار کی شکل میں ہے اور مخفی رسم الخط میں لکھی گئی ہے اور اس میں ۱۵۲ سطریں ہیں - یہ کتیب جلوہ کے مقابلے میں زیادہ دنیادارانہ، پیش پا افتادہ اور اس سے کم مربوط ہے، تضادات سے پر ہے اور یکایک ختم ہو جاتی ہے - روایت کے مطابق اس کتاب کو شیخ عدی کی وفات (تقریباً ۴۳۷ھ/۱۳۴۲ء) کے دو سو سال بعد عظیم المرتبت بزرگ حسن البصریؒ [رک بآں] نے تالیف کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک وقت میں اصل کتاب سملی Semali کے قریب، جو دریائے دجلہ پر ہے، قصر عز الدین میں کہا یا [کذا، کہیا] علی کے گھر میں تھی؛ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب کتیب جلوہ کی طرح یہ کتاب بھی سنجار میں ہے .

نظریۂ خلق عالم : مصحف راش میں تخلیق عالم کا ذکر تین متضاد نسخوں میں، ابواب میں تقسیم کیے بغیر، پراگندہ اور ملتبس طریقے سے کیا گیا ہے - اس کہانی کے مطابق، جو تخلیق عالم کے متعلق تسبۃً زیادہ اصلی معلوم ہوتی ہے، خدا نے خلق عالم کو تنہا مکمل کیا - اس نے ایک سفید موتی بنا کر اسے ایک پرندے اَنْقَر (بہت سے مخطوطات میں اَنْغَر) کی پشت پر رکھ دیا، جسے اس نے پیدا کیا تھا اور اسی پر چالیس ہزار سال تک تخت نشین رہا - اس کے بعد اس نے سات خدائی فرشتے پیدا کیے، جنھیں صوفی شیوخ کا مرادف قرار دیا جاتا ہے .

خدا نے یک شنبے کو عَزْرائیل (ازازیل، زَزَائیل)، یعنی ملک طاؤس کو پیدا کیا، جو ہرشے سے برتر ہے؛ دو شنبے کو ملک دَرْدَائیل شیخ حسن (البصری) کو۔ [ان کے نام کا] یزیدی تلفظ شیخوسن (Shekhüsin) ہے، جیسا کہ یزیدیوں کی سب سے بڑی دعا سے ثابت ہے (سِیْجَدِن شِیْخِیْسِن، یعنی سجّاد الدین شیخ حسن؛ ایک مزعومہ شیخ سِنّ کا چاند دیوتا سن سے مقابلہ کر کے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں، ان کے لیے دیکھیے ماسینیوں Massignon : *Essai sur les origines du lexique technique* ، پیرس ۱۹۲۲ء، ص ۱۷۸-الف، لیکن یہ بالکل غلط ہیں) ؛ سہ شنبے کو خدا نے ملک اِسْرَافائیل (اسرافیل)، یعنی شیخ شمس (الدّین) کو پیدا کیا؛ چہار شنبے کو ملک میکائیل، یعنی شیخ ابوبکر کو؛ پنج شنبے کو ملک جِبْرائیل، یعنی سجّادین (سجا دین، سجّاد الدّین) کو؛ جمعے کو ملک شَمْنائیل (شَتْمائیل، سَمَنْسائیل)، یعنی ناصر الدّین کو اور شنبے کو ملک طُورَائیل (نورائیل)، یعنی فخر الدّین کو .

اس کے بعد اس نے سات آسمانوں، زمین، سورج اور چاند کو پیدا کیا اور پھر آخرالذکر خدائی فرشتے فخر الدّین نے تخلیق کا باقی کام اپنے ذمّے لے کر انسانوں اور حیوانوں کو پیدا کیا .

اب خدا فرشتوں کو لے کر موتی میں سے باہر نکلا اور ایک زور دار چیخ سے اس نے اس کے چار ٹکڑے کر دیے - اس موتی میں سے پانی کے بہنے سے جو سمندر بنا اس پر خدا اپنے پیدا کیے ہوئے ایک جہاز میں تیس ہزار سال تک چلتا رہا۔ جبرائیل نے، جو ایک پرندے کی شکل میں پیدا کیا گیا تھا، اس موتی کے ٹکڑوں سے سورج، چاند اور ستارے، پہاڑ، پودے، پھلدار درخت اور آسمان بنائے .

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

اس تصور کے ساتھ ساتھ سات خداؤں کا ایک قدرے مختلف تصور بھی ہے جو بذریعۂ صدور پیدا ہوے اور بعینہٖ اسی طرح نور الٰہی کا نور ہیں جس طرح چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے، اور ان میں سب سے بڑے معبود خدا کا ذکر محض اپنے امثال میں اولین کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔

وہ بیانات جو فرقۂ عزرائیل (ملک طاؤس) یعنی یزیدیوں کے متعلق دیے گئے ہیں جن کی طرف خدا نے شام سے لالیش کی جانب شیخ عدی کو مبعوث کیا، ناقص ہیں اور اس طرح وہ بیانات بھی جو بنی نوع انسان کے آبا و اجداد یعنی آدم اور حوّاء کے بیٹوں شہر بن سَفَر کی اولاد کے متعلق ہیں۔ جب تیس ہزار نئے تخلیق شدہ فرشتے چالیس ہزار سال تک اللہ کی عبادت کر چکے، تو اللہ نے جبرائیل کی عملی اعانت سے آدم کو عناصر اربعہ سے پیدا کیا اور اسے جنت میں جگہ دے کر حکم دیا کہ گندم کے سوا دنیا کے تمام پھل کھا سکتا ہے (ایک یزیدی روایت کے مطابق یہ ممانعت انگوروں کے بارے میں تھی)۔

جب ایک سو سال کے بعد ملک طاؤس نے خدا کو یاد دلایا کہ آدم کی نسل میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا تو خدا نے اسے وہ سب کچھ کرنے کی اجازت دے دی جسے وہ مناسب سمجھے۔ ملک طاؤس نے آدم کو ممنوعہ گندم کے کھانے پر اکسایا۔ اس پر ملک طاؤس نے آدم کو جس کے جسم میں اس وقت تک بول و براز کی کوئی راہ نہ تھی جنت سے نکال دیا۔ آدم کو بہت تکلیف محسوس ہوئی تاآنکہ خدا نے ایک پرندے کو بھیج کر اس کے جسم میں سوراخ کروا دیا۔ اس کے اور سو سال بعد خدا نے جبرائیل کو بھیج کر آدم کی بائیں بغل کے زیریں حصے سے حوّاء کو پیدا کیا۔

مصحف راش میں خلق عالم کے متعلق ایک دوسری کہانی یوں دی ہے کہ خدا نے جو اپنے پیدا کردہ جہاز پر سمندر کے اوپر سیر کر رہا تھا، ایک موتی پیدا کیا، لیکن چالیس سال بعد اسے توڑ دیا۔ اس کی دردناک چیخ سے پہاڑ پیدا ہوے، شور سے پہاڑیاں، اور بخارات سے آسمان پیدا ہوے۔ اس کے بعد خدا نے اپنے نور سے بذریعۂ صدور چھے اور دیوتا پیدا کیے۔ پھر ان چھے دیوتاؤں نے اپنی اپنی باری پر کچھ نہ کچھ پیدا کیا: پہلے دیوتا نے آسمان خلق کیے، دوسرا سورج بن گیا، تیسرا چاند، چوتھے نے آفاق پیدا کیے، پانچویں نے ستارۂ صبح اور چھٹے نے کرۂ ہوا پیدا کیا۔

اس سے آگے مصحف میں یزیدیوں کی بہت ہی ابتدائی تاریخ کے متعلق کچھ پراگندہ و مخلوط بیانات ہیں جن میں سے محض چند باتیں قابل توجہ ہیں: جب ملک طاؤس نے حواء کو آدم کی مصاحبت میں دے دیا تو وہ زمین پر اتر کر یزیدیوں کی طرف آیا جو محض آدم کی نسل میں سے تھے اور اس لیے باقی انسانوں اور ان کے درمیان کوئی مشترک بات نہ تھی۔ اس نے ان کے اور آشوریوں کے لیے جو قدیم ترین زمانے سے موجود تھے، مندرجۂ ذیل حکمران مقرر کیے: نَسْرُوح (نَسروخ، آشوری: Nisroch) = ناصر الدّین، جَمْبُوش (کاموش Kamos) = ملک فخر الدّین اور اِرتیمُش (ارتیموس Artemis) = ملک شمس الدّین۔ ان کے بعد شابور (شاپور) اوّل اور ثانی نے ایک سو پچاس سال حکومت کی۔ ان کی تمام نامور شخصیتیں بالخصوص یزیدی شہزادوں کا خاندان اسی کی نسل سے ہوا۔ یزیدیوں کے چار حکمران ہوے ہیں جن کے نام بالصراحۃ نہیں دیے گئے۔ ان کے ایک بادشاہ آحاب نے حکم دیا کہ انھیں ان کے اپنے نام دیے جائیں (جس کی تصریح نہیں کی گئی)۔ اِلٰہ آحاب

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

(یعنی بَعْل زبوب) کو اب پیر بوب کہتے ہیں - دیگر یزیدی حکمرانوں میں یہ لوگ تھے: بخت نصّر (Nebucchadnezzar) بابل میں، اَخَشْ ویروش (Akhashperosh) ایران میں، اور اغْرِن قالوس (Aghrikalus) قسطنطنیہ میں .

اس کے علاوہ مصحف میں بعض نواہی بھی مذکور ہیں - حرام اشیاے خوردنی میں کاھو یا سلاد (یزیدی زبان میں کاھو، عربی = خَسْ) شامل ہے - اس کے کھانے سے اس لیے منع کیا گیا کہ اس کا نام نَبِیّہ خاسیہ سے مشابہ تھا، اس کے علاوہ لوبیا، مچھلی (ماسی = ماھی، پغمبر یونان = [حضرت] یونس[ع] کی وجہ سے)، ہرن (آسِک) بھی ممنوع ہیں - شیخ اور اس کے مریدوں کے لیے مرغیوں (کلاشیر Käläshir) کا گوشت اور کدو (Külükä) کا کھانا حرام تھا .

صابیوں کی طرح یزیدیوں کے ہاں بھی گہرا نیلا رنگ ممنوع تھا - مندرجۂ ذیل باتیں بھی واضح طور پر ممنوع ہیں : کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، بیٹھ کر کپڑے پہننا، بیت الخلا کا استعمال اور غسل خانے میں نہانا (غسل خانے اور بیت الخلا کو ارواح خبیثہ کا مسکن خیال کیا جاتا ہے) - مندرجۂ ذیل الفاظ کا بولنا بھی منع ہے : شیطان ("ان کے خدا کا نام") قیطان (پھندا)، شَطّ (ندی)، شرّ (بدی)، ملعون، لعنۃ اور نَعْل .

اگرچہ اس کا مصحف میں کہیں ذکر نہیں لیکن روایتی طور پر وہ لفظ جو شین سے شروع ہوتے ہیں ان کا بولنا بھی منع ہے، نیز سرطان (کیکڑا)، حِیْطان (باڑھیں)، بستان (سبزیوں کا باغ) بَطّ، نَطّ (کودنا) وغیرہ: پڑھنا اور لکھنا، ڈاڑھی مونڈنا اور مونچھوں کا صفایا کر دینا بھی منع ہے اس طرح دوسروں کی کنگھی اور استرا استعمال کرنا، مقدس جنگلوں سے لکڑی لینا، اولادالزّنا کا کا پرورش کرنا اور قلقل کرنے والے برتنوں سے پانی پینا منع ہے .

مآخذ : دیکھیے مآخذ متعلقہ مادّۂ یزیدی و (۱) اسمٰعیل بیگ چول : الیزیدیّہ قدیماً و حدیثاً . . . (قدیم اور موجودہ یزیدی) طبع Dr. Konstantin Zuraik، بیروت کی امریکی یونیورسٹی، سلسلۂ شرق، عدد ۶، بیروت ۱۹۳۴ء اس پر دیکھیے (۲) R. Strothmann در *Isl.*، ج ۲۲، ۱۹۳۵ء ص ۳۲۳ تا ۳۲۴ .

(TH. MENZEL)

کِتاب خانہ : کتاب خانہ، بمعنی لائبریری ایک * فارسی لفظ ہے جس کا عربی مترادف لفظ مکتبہ بھی استعمال ہوتا ہے - اس کا اطلاق ان عام کتاب خانوں پر ہوتا ہے جو متعلمین کے فائدے کے لیے سلاطین نے یا عام افراد نے قائم کرکے وقف کیے - بعض اوقات یہ کتاب خانے کسی خاص فرقے یا کسی خاص علم کے مطالعے کے لیے مخصوص ہوتے تھے - عہد فتوحات کے بعد جب لوگوں میں علم و ادب کا ذوق و شوق پیدا ہوا اور کتابوں کی تصنیف و تالیف میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا تو ادبی ذوق رکھنے والے اصحاب نے کتابیں جمع کر کے بڑے اچھے اچھے ذاتی کتاب خانے قائم کر لیے اور کوفی ماہر لسانیات ابو عَمْرو الشّیبانی کی مثال سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مصنفین کا یہ دستور تھا کہ وہ حوالے کے لیے اپنی تصنیفات کی نقول اپنے شہر یا محلّے کی مسجد میں رکھوا دیتے تھے - جہاں تک عام کتب خانوں کا تعلق ہے، اس قسم کے قدیم ترین کتاب خانے کا ذکر ہمیں خالد بن یزید بن معاویہ رض کے حال میں ملتا ہے، جس نے اپنی زندگی یونانی علوم، بالخصوص کیمیا اور طبّ کی تحصیل کے لیے وقف کر دی تھی - ہمیں پتا چلتا ہے کہ اس نے اس قسم کی کتابیں ترجمہ کرائیں اور جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کے

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

آغاز عہد میں ایک وبا پھیلی تو حکم دیا کہ تمام کتابیں کتاب خانے (خزانہ) سے باہر نکال لی جائیں، تاکہ عام لوگوں کی ان تک رسائی ہو سکے۔ بہر حال بڑے پیمانے پر سب سے پہلا عام کتاب خانہ دارالحکمۃ تھا جسے عباسی خلیفہ المأمون نے بغداد میں قائم کیا۔ اس کتاب خانے کو حتی الامکان جامع بنانے کے لیے اس نے کئی قیمتی یونانی مخطوطات بوزنطی سلطنت میں سے خریدے اور عربی میں ان کے ترجمے ایسے علما سے کرائے جو اس کام کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کتاب خانے میں ان تمام علوم کی کتابیں جمع کر دی گئی تھیں جنھیں عربوں نے فروغ دیا تھا۔ یہ کتاب خانہ بدستور ترقی کرتا رہا تا آنکہ ۶۵۶ھ میں مغلوں نے بغداد کو فتح کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ مصر کے فاطمی خلفا نے قاہرہ میں جو کتاب خانہ قائم کیا تھا وہ بھی ایسا ہی اہم تھا۔ اس میں بے اندازہ علمی خزینے جمع تھے اور ہمیں پتا چلتا ہے کہ ۴۳۵ھ/۱۰۴۳-۱۰۴۴ء میں وزیر ابوالقاسم علی بن احمد الجَرْجَرائی نے یہ ہدایات جاری کی تھیں کہ کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور ان کی نئے سرے سے جلدیں باندھی جائیں۔ اس کام کی نگرانی کے لیے اس نے ابو خَلَف القضاعی اور ابن خَلَف الورّاق کو مقرر کیا۔ یہ کتاب خانہ آخری فاطمی خلیفہ العاضد کی وفات تک بجنسہٖ محفوظ رہا، اس کی بیشتر کتابیں قاضی الفاضل [رک بآں] نے خرید لیں اور اپنے قائم کردہ فاضلیۃ مدرسے کے کتاب خانے میں جمع کرا دیں، لیکن تھوڑی ہی مدّت بعد یہ بے پروائی کا شکار ہو گئیں، چنانچہ القلقشندی کے زمانے تک ان میں سے بیشتر کتابیں غائب ہو چکی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب خانے میں ۶۵۰۰ کتابیں صرف علوم عقلیہ، مثلاً ریاضی، علم ہیئت وغیرہ پر ہی تھیں۔ اس کے خزائن میں تانبے کا ایک کرہ تھا جس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسے بطلیموس [رک بآں] نے تیار کیا تھا اور اس پر ایک تحریر کندہ تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ اسے خالد بن یزید بن مُعاویۃؓ نے حاصل کیا تھا۔ تیسرا بڑا کتاب خانہ قرطبہ کے اموی خلفا کا تھا۔ اس کی کتابیں بھی پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں المرابطون کی فتح اندلس کے بعد منتشر ہو گئیں۔ چھوٹے کتاب خانوں میں سے ایک تو سلطان مسعود غزنوی نے قائم کیا تھا جس کے بیشتر خزائن آگے چل کر بخارا میں منتقل ہو گئے۔ ہمیں اکثر ایسے قیمتی نجی کتاب خانوں کا بھی ذکر ملتا ہے جو علما کو استعمال کے لیے دے دیے جاتے تھے۔ مثلاً الصُولی [رک بآں] کے سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس ایک بڑا ذخیرۂ کتب موجود تھا اور ان کتابوں کی سرخ اور زرد رنگ کے چمڑے کی بڑی خوشنما جلدیں بندھی ہوئی تھیں۔ الصَّفَدی [رک بآں] نے غَرْس النِعمۃ الصّابی، [=محمد بن ہلال (م ۴۸۰ھ/۱۰۸۷ء)، بغداد کا مؤرخ اور ادیب، عیون التواریخ اور الھفوات کا مصنف] کے سوانح حیات میں لکھا ہے کہ اس نے بغداد میں ایک کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں طلبہ کے استعمال کے لیے [چار ہزار] کتابیں رکھی گئی تھیں لیکن اس سے بھی پہلے ہم ابو تمّام کے کے متعلق پڑھتے ہیں کہ اسے موسم سرما کے باعث ہمدان میں رکنا پڑا، جہاں اس نے اپنے مشہور و معروف مجموعۂ اشعار الحَماسۃ، کا مواد ان کتابوں سے منتخب کیا جو اسے وہاں کے کتاب خانوں میں ملی تھیں۔ جب سلطان ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک نے تعلیم عامّہ کے لیے نیشا پور، بغداد اور دیگر مقامات میں مدارس کھولے تو کتاب خانوں کے قیام کو بہت زیادہ تحریک ملی۔ صرف ان مدارس کے اساتذہ کی تنخواہ ہی کے لیے نہیں بلکہ

www.besturdubooks.wordpress.com

یہاں جن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی ان کی کتابوں کے بیش قیمت مخطوطات کے لیے بھی رقوم وقف کی جاتی تھیں ۔ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں جب مغول سارے ایران پر چھا گئے تو جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے نہ صرف انسانی جانوں کا نقصان ہوا اور قیمتی جائدادوں پر تباہی آئی، بلکہ ان گنت اور انمول کتابیں بھی بے دردی سے برباد کر دی گئیں ۔ مصر اور شام کے ایوبی امرا نے قیام مدارس کے سلسلے میں جلیل القدر سلجوقی وزیر کی مثال پر عمل کیا، لیکن القَلْقَشَنْدی کی ایک تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود ان کے اور ان مدارس کے منتظمین کے ذہن میں بڑے بڑے عام کتاب خانوں کی قدر و قیمت کا کوئی صحیح تصوّر موجود نہیں تھا (صبح الاَعشٰی، ۱ : ۴۶۷) ۔ اس کے بعد کئی صدیوں تک ہمیں ایسے علما و فضلا کا ذکر ملتا ہے جنھوں نے مساجد اور مدارس کو اپنی کتابوں کے عطیات دیے ۔ یہ عطیات بطور وَقْف یعنی نا قابل انتقال جائداد دیے جاتے تھے، لیکن ان کے نگران اپنی نا قابل اعتبار حد تک پہنچی ہوئی بد دیانتی کے باعث اکثر اوقات نہ صرف ان قیمتی کتابوں کے ضائع ہونے کی روک تھام نہیں کرتے تھے، بلکہ اس سے چشم پوشی کر جاتے تھے ۔ ایسے کتنے ہی مخطوطات ہیں، جنھیں ان کتاب خانوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رکھا گیا تھا، لیکن وہ مختلف لوگوں کے ذاتی قبضے میں آ گئے یا یورپ کے بڑے بڑے کتاب خانوں میں جا پہنچے ۔ علاوہ ازیں بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کوئی کتاب خانہ معرض وجود میں آنے کے فوراً بعد ہی بے پروائی کا شکار ہو جاتا تھا اور یہاں کی کتابیں طلبہ کے علم میں اضافہ کرنے کے بجائے حشرات الارض کی خوراک بننے لگتی تھیں ۔ چونکہ کتاب خانوں کے محافظین کی قرار واقعی نگرانی نہیں کی جاتی تھی، اس لیے جو کتابیں ان کی تحویل میں دی جاتیں وہ بسا اوقات اس حال کو پہنچ جاتیں کہ پڑھنے کے لیے اٹھایا اور اوراق ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ۔ اس کی ایک واضح اور بین مثال وہ کتابیں ہیں جو کسی زمانے میں دہلی کے شاہی کتاب خانے کی زینت تھیں اور آج کل لنڈن کے انڈیا آفس میں موجود ہیں ۔ خواہ یہ کتابیں کیسی ہی قابل قدر تصنیفات ہی کیوں نہ ہوں دیمک اور عرصۂ دراز کی بے پروائی نے ان کی یہ حالت کر دی ہے کہ مہتمم کتب خانہ طلبہ کو کتابیں مہیا کرنے سے مایوس ہو کر رہ جاتا ہے، موجودہ زمانے میں صورت حال بہتر ہو گئی ہے ۔ کتاب خانۂ خدیویہ (اب سرکاری) نے ایک بار پھر ان علمی خزائن کو جمع کرنے کا کام شروع کر دیا ہے جو صدیوں کی بے پروائی سے بچ رہے ہیں ۔ جو طلبہ قاہرہ جانے کی استطاعت رکھتے ہیں وہ ان خزینوں سے مستفید ہو سکتے ہیں ۔ قسطنطینیہ کے متعدد کتاب خانوں میں قیمتی کتابوں کی صورت میں بڑے بے بہا خزانے محفوظ ہیں، جن کی فہرستیں چھپ چکی ہیں، اگرچہ ان میں بہت سی کتابوں کے بارے میں غلط معلومات درج ہو گئی ہیں ۔ مدینۂ منورہ اور عراق میں بھی متعدد بیش قیمت کتاب خانے ہیں ۔ ان ممالک میں جن لوگوں کے مسلمان دوست موجود ہیں، وہ بعض اوقات وہاں کے نادر مخطوطات کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتے ہیں ۔ دمشق کے کتاب خانۂ ظاہریہ اور فاس اور تونس کی جامع مساجد کے کتاب خانوں کی نا مکمل فہرستیں بھی ملتی ہیں، لیکن تاحال یورپی طلبہ کے لیے ان کتاب خانوں کے خزانوں سے استفادہ کرنا بہت مشکل ہے ۔ برصغیر پاکستان و ہندوستان میں بھی ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے ۔ اس کی تصدیق اس احتیاط سے ہوتی ہے جو حیدر آباد کے کتاب خانۂ آصفیہ، بانکی پور کے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کتاب خانۂ خدا بخش، رام پور کی رضا لائبریری اور بمبئی کے کتاب خانۂ ملا فیروز میں برتی جاتی ہے ۔ اب صنعاء (یمن) کے کتاب خانوں تک بھی شائقین کی دسترس ہونے لگی ہے ۔ کربلا اور نجف میں شیعیوں کی زیارت گاہوں میں بھی قیمتی کتاب خانے ہیں، لیکن اس امید کے پورا ہونے میں شاید ابھی بہت عرصہ باقی ہے کہ انھیں اور عراق کے دوسرے مراکز کے مخطوطات کو یکجا کر کے ایک مرکزی سرکاری کتاب خانے میں رکھوا دیا جائے ۔ یہ واقعہ کہ بلاد مشرق سے قیمتی اور قدیم مخطوطات برابر یورپ میں چلے آ رہے ہیں، اس بات کا ثبوت ہے کہ صدیوں کی بے پروائی کے باوجود قدیم زمانے کے نسخے ابھی تک اس سے بہت زیادہ تعداد میں محفوظ ہیں جتنی کہ توقع کی جا سکتی تھی، لیکن پرانے زمانے میں کتابت کے لیے جو بہترین قسم کا کاغذ اور سیاہی استعمال ہوتی تھی، اس کی وجہ سے کئی ایسی کتابیں محفوظ ہو گئیں جو بصورت دیگر مٹ جاتیں ۔ علاوہ بریں یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ بڑے بڑے کتاب خانوں کے ختم ہونے پر یہ کتابیں لوگوں کی ذاتی ملکیت بن گئیں اور اب وہاں سے نکل کر دوبارہ منظر عام پر آ رہی ہیں ۔ اس کی شہادت اس امر سے بھی ملتی ہے کہ مشرقی ممالک میں قدیم مخطوطات کے کئی قیمتی نجی کتاب خانے موجود ہیں، مثلاً بغداد میں سیّد صدر الدّین کا اور قاہرہ میں احمد تیمور پاشا کا کتاب خانہ ۔ ان کے علاوہ بھی ہمیں بعض کتاب خانوں کا حال معلوم ہے ۔ بدقسمتی سے بیشتر کتاب خانوں کے مالک اپنی مقبوضہ کتابوں کے متعلق معلومات مہیا کرنے میں بہت بخل سے کام لیتے ہیں، البتہ اس سلسلے میں مذکورۂ بالا دونوں کتاب خانے مستثنیٰ ہیں ۔ جوں جوں لوگوں میں یہ احساس بڑھتا چلا جا رہا ہے کہ قدیم ادب کی یادگاروں تک، خواہ وہ عربی میں ہوں یا فارسی میں، عوام کی رسائی ہونی چاہیے، ان کے مالک بعض نسبۃً نادر تصنیفات کو طبع کر کے منظرِ عام پر لانے لگے ہیں ۔ جب ان کی قدر و قیمت کا پورا اندازہ ہو جائے گا تو ہمیں امید ہے کہ جو مواد اس وقت مشرقی ممالک کے کتاب خانوں میں چھپا پڑا ہے، اس کا بیشتر حصّہ آئندہ پچاس برس کے اندر اندر طلبہ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا ۔

(F. KRENKOW)

کتاب خانوں کی ترتیب، انتظام اور استعمال : چوتھی/دسویں صدی میں بھی ایسی عمارتیں موجود تھیں جو محض کتاب خانوں کے لیے مخصوص تھیں اور خاص طور سے اسی مقصد کے لیے تعمیر کی گئی تھیں؛ مثلاً ۳۸۱ھ/۹۹۱ء میں بہاء الدّولۃ کے وزیر سابور بن اَرْدشیر نے بغداد کے محلۂ کَرْخ میں ایک دارالکتب بنوایا جس میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں موجود تھیں (ابن الأثیر : الکامل، ۹ : ۲۴۶؛ یاقوت : المعجم، ۱ : ۷۹۹) ۔ مشہور جغرافیہ نویس المقدسی (ص ۴۴۹) نے شیراز میں ایک عظیم الشان کتاب خانہ دیکھا تھا، جسے عضدالدّولہ بویہی (۳۳۸/۹۴۹ تا ۳۷۲ھ/۹۸۲ء) نے قائم کیا تھا ۔ اس کتاب خانے کی ایک علٰحدہ عمارت تھی جس میں ایک وسیع و عریض دالان تھا اور یہ ایک طویل مضبوط محرابی چھت کی عمارت تھی جس کے تین طرف حجروں (خزائن) کی قطار چلی گئی تھی ۔ محرابی چھت والے مرکزی کمرے اور بغلی کمروں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ تین ہاتھ (ell = ۴۵") اونچی اور تین ہاتھ چوڑی چوبی الماریاں نصب تھیں ۔ ان الماریوں پر منبّت کاری کی گئی تھی اور ان کے کواڑ اوپر سے نیچے کھلتے تھے ۔ کتابیں ان کے خانوں میں اوپر تلے رکھی جاتی تھیں ۔ قاہرہ کے فاطمی

www.besturdubooks.wordpress.com

کتاب خانے میں جو الماریاں استعمال کی جاتی تھیں وہ ان سے کچھ مختلف تھیں (المقریزی : الخطط، قاہرہ ۱۲۷۰ھ، ۱ : ۴۰۹) ۔ کتابوں کی الماریوں (رُفوف) میں تختوں کے ذریعے علٰحدہ علٰحدہ خانے (حاجز) بنائے گئے تھے ۔ ہر خانے کے جُدا جُدا کواڑ تھے اور ان کواڑوں میں قلابے اور تالے لگے ہوئے تھے ۔ کھلی الماریوں میں بھی چھوٹے چھوٹے خانے ہوتے تھے۔ اس قسم کی الماریوں کو ایک چھوٹی سی تصویر میں دکھایا گیا ہے جسے یحییٰ بن محمود نے ۶۳۴ھ/۱۲۳۷ء میں بنایا تھا اور جو الحریری کے ایک قلمی نسخے موجودۂ پیرس (عربی مخطوطات عدد ۵۸۴۷) میں ہے ۔ اس تصویر میں بصرے کا ایک کتاب خانہ دکھایا گیا ہے (Blochet : *Les enlumineurs des Mss. orientaux*، پیرس ۱۹۲۶ء، لوحہ ۱۰) ۔ ہمارے دستور کے خلاف چھوٹے چھوٹے خانوں میں اُوپر تلے دھری ہیں اور بلادِ مشرق میں یہ رواج ابھی تک چلا آتا ہے۔ اس سے اس بات کی بھی توضیح ہو جاتی ہے کہ تصنیفات کے بالائی یا زیریں کنارے پر ان کا مختصر نام کیوں لکھا جاتا ہے (یہ بات کبھی کبھی مغربی ممالک میں بھی دیکھنے میں آتی ہے) ۔

کتابیں بڑی باقاعدگی سے ترتیب دی جاتی تھیں اور علوم کے مختلف شعبوں کے اعتبار سے انھیں تقسیم کیا جاتا تھا ۔ قرآن مجید کے نسخوں کے لیے عام طور پر ایک خاص جگہ مقرر ہوتی تھی، مثلاً فاطمی کتاب خانے میں انھیں دوسری کتابوں کی نسبت بلند تر مقام پر رکھا جاتا تھا ۔ بہت سی کتابوں کے اکثر اوقات کئی کئی نسخے ہوتے تھے ۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوتا تھا کہ ایک ہی کتاب کا مطالعہ بیک وقت متعدد اشخاص کر سکتے تھے بلکہ قاری کسی غلط عبارت کو دوسرے نسخے کی مدد سے فوراً پڑھ سکتا تھا ۔ مثال کے طور پر قاہرہ کے کتاب خانۂ فاطمیہ میں خلیل کی کتاب العَین کے تیس نسخے، تاریخ الطبری کے بیس نسخے اور اگر غلط نہیں تو ابن دُرَید کی الجَمہرۃ کے ایک سو نسخے موجود تھے۔

فہرستیں یا تو کئی کئی جلدوں میں ہوتی تھیں، جن میں (غالباً مختلف اصناف علم کے اعتبار سے) کتابوں کے نام ترتیب وار درج ہوتے تھے اور یا کتاب خانۂ فاطمیہ کی طرح ہر کمرے کے دروازے کے اندر کی طرف وہاں کی کتابوں کی فہرست چپکا دی جاتی تھی ۔

عموماً کتاب خانوں کا ایک مہتمم (صاحب) اور کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے ایک یا ایک سے زیادہ لائبریرین (خازن)، نیز کاتب (ناسخ) اور چپراسی (فرّاش) ہوتے تھے ۔ ہمیں پتا چلتا ہے کہ بعض مشہور و معروف علما خازن تھے: چنانچہ مؤرخ ابن مسکویہ، رَے میں وزیر ابوالفضل بن العَمید، کا خازن تھا (ابن مسکویہ : تجارب الامم، طبع Amedroz و Morgoliouth، اوکسفرڈ ۱۹۲۱ء، متن ۲ : ۲۲۴، ترجمہ ۵ : ۲۳۷) اور الشابشتی م ۳۹۰ھ/۹۹۹ء) جس نے عیسائی خانقاہوں کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی، العزیز کے عہد میں قاہرہ کے کتاب خانۂ فاطمیہ کا خازن تھا (ابن خلکان : وفیات، ۱ : ۳۳۸) ۔

کتابیں کچھ تو خرید لی جاتی تھیں اور کچھ کاتب جو کتاب خانوں میں ملازم ہوتے تھے، قلمی نسخوں سے نقل کر لیتے تھے ۔ المقریزی نے ایک کتاب خانے کا میزانیہ قلمبند کیا ہے (۱ : ۴۵۹) ۔ اس کی رو سے خلیفہ الحاکم [بامر اللہ] ۳۸۶ تا ۴۱۱ھ/۹۹۶ تا ۱۰۲۰ء) ہر سال اپنے قائم کردہ دارالعلم پر ۲۵۷ دینار (تقریباً ۱۵۰ پونڈ) خرچ کیا کرتا تھا ۔ یہ رقم حسب ذیل طریق سے خرچ ہوتی تھی ۔

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

عبّادان سے آئی ہوئی چٹائیاں وغیرہ	= ۱۰ دینار
کاتبوں کے لیے کاغذ	= ۹۰ دینار
خازن کی تنخواہ	= ۴۸ دینار
پینے کا پانی	= ۱۰ دینار
فراشوں کی اجرت	= ۱۵ دینار
کاغذ، دوات، قلم رکھنے والے کی اُجرت	= ۱۲ دینار
دروازوں کے پردوں کی مرمت	= ۱ دینار
کتابوں کی مرمت	= ۱۲ دینار
موسم سرما کے لیے نمدے کے فرش	= ۵ دینار
موسم سرما کے لیے کمبل	= ۴ دینار

کتاب خانے ہر شخص کے لیے کھلے رہتے تھے اور کسی سے کوئی چندہ وغیرہ نہیں لیا جاتا تھا ۔ کاغذ، دوات، اور قلم منتظمین کی طرف سے مہیا کیے جاتے تھے۔ بعض نجی کتاب خانوں میں تو دور دراز سے آئے ہوئے متعلمین کو گزارے کے لیے مالی مدد بھی دی جاتی تھی ۔ کتاب خانے کی عمارت سے باہر کتابیں لے جانے کی صورت میں کچھ رقم جمع کرانی پڑتی تھی۔ یاقوت (م ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء) مَرو کے کتاب خانوں سے متعلق فراخ دلی کی بڑی تعریف کرتا ہے (معجم، ۴ : ۵۰۹ ببعد)، جہاں سے وہ بغیر رقم جمع کرائے دو سو دینار کی مالیت کی دو سو بلکہ اس سے بھی زیادہ کتابیں لے کر ہمیشہ اپنے گھر میں رکھا کرتا تھا ۔ اس سلسلے میں ۲۱ صفر ۷۹۹ھ/۲۴ نومبر ۱۳۹۶ء کا لکھا ہوا وہ وقف نامہ بھی پر از معلومات ہے جس کی رو سے ابن خلدون نے اپنی کتاب العبر، فاس کی جامع القرویین کے کتاب خانے کو عطا کی تھی ۔ اس کے مطابق یہ مخطوطہ ایک اچھی خاصی رقم جمع کرانے کے بعد صرف کسی قابل اعتبار شخص کو زیادہ سے زیادہ دو ماہ کے لیے دیا جا سکتا تھا ، کیونکہ یہ عرصہ مستعار لی ہوئی کتاب کو نقل کرنے یا پڑھنے کے لیے کافی ہوتا تھا ۔ مہتمم کتاب خانہ کو ہدایت تھی کہ وہ اس قاعدے پر عمل درآمد کرائے (Levi-Provençal در JA، ج، ۲۰۳ (۱۹۲۳ء) ص ۱۶۴) .

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلامی ملکوں میں ایسے کتاب خانے بھی تھے جہاں لوگ صرف مطالعہ کر سکتے تھے ۔ مدرسۃ المحمودیہ کا کتاب خانہ جو ۷۹۷ھ/۱۳۹۵ء میں قاہرہ میں کھولا گیا تھا، اسی ذیل میں آتا ہے ۔ اس کے بانی اُستادار جمال الدّین محمود بن علی (م ۷۹۹ھ/ ۱۳۹۷ء) کی وصیت کی رو سے کوئی کتاب مدرسے کے کمروں سے باہر نہیں نکالی جا سکتی تھی ۔ ابن مسکویہ کی تجارب الامم کا قلمی نسخہ جس کا کائتانی Caetani نے ایک عکسی نسخہ شائع کیا ہے (سلسلۂ یادگار گب، ۷/۶) اسی کتاب خانے کی ملکیت تھا ۔ اس مخطوطے کے پہلے صفحے پر ۱۵ شعبان ۷۹۷ھ/۵ جون ۱۳۹۵ء کی تحریر کردہ دستاویز وقف درج ہے ۔ اس میں لکھا ہے کہ ”مذکورۂ بالا معطی کی طرف سے یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ پوری کتاب یا اس کی کوئی جلد کتب خانے سے مستعار نہیں دی جا سکتی، خواہ اس کے لیے کوئی رقم جمع کرا دی جائے“ ۔ بایں ہمہ جب ۸۲۶ھ/۱۴۲۳ء میں کتابوں کی جانچ پڑتال کی گئی، تو پتا چلا کہ کل تعداد کا دسواں حصہ یعنی چار سو کتابیں غائب ہیں ۔ اس پر مسجد کے منتظم وقت کو برخاست کر دیا گیا (دیکھیے ۔ ابن حَجَر العَسْقَلانی در Quatremere : کتاب مذکور ص ۶۴، ۷۰؛ المقریزی : الخطط، ۲ : ۳۹۵).

اگر ہم مندرجۂ بالا بیانات کو پیش نظر رکھیں جو چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کی بھی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں تو ہم بڑے اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی کتاب خانے ہر لحاظ سے یورپ کے کتاب خانوں سے

www.besturdubooks.wordpress.com

صدیوں آگے تھے اور مغرب سے بہت عرصہ پہلے اسلامی ملکوں نے عوامی کتاب خانوں کی عام ضرورت کو محسوس کر لیا تھا ۔

مآخذ : (۱) Quatremère : *Mémoire sur le gout des livres chez les Orientaux* در *J A*، ۱۸۳۸ء، سلسلہ ۳، ۶ : ۳۵ تا ۷۸؛ اور (۲) اضافی حاشیے از Hammer Purgstall در *JA*، ۱۸۴۸ء، سلسلہ ۴، ۱۱ : ۱۸۷ تا ۱۹۸؛ (۳) von Kremer : *Renaissance des Islâms*، ہائیڈل برگ ۱۹۲۲ء، ص ۱۶۴ ببعد؛ (۴) Ribera : *Bibliofilos y bibliotécas en la España musulmana*، سَرَقُسطہ ۱۸۹۶ء (میں اس کا مطالعہ نہیں کر سکا)؛ (۵) Grohmann : *Bibliotheken und Bibliophilen im islamischen Orient*، در *Festschrift der Nationalbibliothek in Wien*، وی‌انا ۱۹۲۶ء، ص ۳۳۱ تا ۳۴۲؛ (۶) M. Hartmann : *Das Bibliothekswesen in den islamischen Ländern* در *Centralblatt f. Bibliothekswesen*، ۱۸۹۹ء، ۱۶ : ۱۸۶ ببعد؛ (۷) وہی مصنف : *Zur litterarischen Bewegung und zum Buch-u-Bibliothekswesen in den islamischen Ländern*، در فہرست عدد ۴ از Halle, Buchhandlung Rudolf Haupt ۱۹۰۵ء؛ مغربی ممالک کے کتاب خانوں سے مقابلے کے لیے دیکھیے (۸) Milkau : *Die Bibliotheken der Gegenwart*، ۱/۱ : بار دوم، ۱۹۱۲ء، ص ۵۸۷ ببعد.

(HEFFENING)

⊗ **کتاب الفہرست** : رک بہ الندیم .

⊗ **کتابیات**: اس مقالے میں یہ لفظ کتابوں کی اس باقاعدہ مدون فہرست کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو ان لوگوں کے فائدے کے لیے مرتب کی گئی ہو جو کسی خاص موضوع پر لکھے ہوئے مواد کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں .

ممالک اسلامیہ میں طباعت کے رواج سے پہلے اسلامی کتابیات میں جو سب سے نمایاں کارنامہ انجام دیا گیا، وہ کتاب الفہرست کی تدوین ہے ۔ اس کا مصنف ابن الندیم [رک بہ الندیم] بغداد کا ایک کتب فروش (وراق) تھا ۔ اُس نے یہ کتاب ۳۷۷ھ/۹۸۷-۹۸۸ء میں علم ادب کی کتابیاتی تاریخ کے طور پر دس ابواب میں تالیف کی ۔ ان میں سے پہلے چھے "اسلامی تصنیفات" (قرآن مجید، صرف و نحو، تاریخ، شعر، کلام، اور قانون) سے تعلق رکھتے ہیں ۔ باقی چار فلسفے، سائنس، قصص و حکایات ملَل و نحل اور الکیمیا سے متعلق ہیں ۔ ہر باب میں موضوع زیر بحث کے مطالعے کے آغاز اور نشو و نما کے بیان، اس پر جو کتابیں قابل حصول ہیں ان سب کی فہرست اور ان کتابوں کے مصنفوں کی کتابیاتی تفصیلات قدیم ترین زمانے سے دی گئی ہیں .

اسلامی کتابیات میں سے ایک اور اہم تالیف کشف الظنون عن اسماء الکتب الفنون ہے، جس کے لیے مواد جمع کرنے میں عثمانی عالم متبحر حاجی خلیفہ نے بیس سال کے قریب صرف کیے۔ اس کی پہلی جلد ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء-۱۶۵۴ء میں الفہرست سے کوئی ۶۵۰ سال بعد مکمل ہوئی ۔ ایک مقدمے کے بعد جس میں مختلف علوم کی ماہیت، قدر و قیمت، اقسام اور تاریخ بالتفصیل درج ہے، مصنف نے ان سب کتابوں کے ناموں کی ردیف وار فہرست دی ہے جو عربی فارسی اور ترکی میں ان علوم پر لکھی گئیں اور جنھیں مصنف نے خود دیکھا یا جن کا نام اسے معلوم ہوا ۔ ہر تصنیف سے متعلق وہ اس کے مصنف، سال تصنیف، اس کے حصص و ابواب کی تقسیم کا اصول اور اس کی مختلف شرحوں، فرہنگوں اور تردیدات و تنقیدات کی تفصیلات بیان کرتا ہے ۔ اس نے ان تمام کتابوں کا جو اس نے دیکھیں، پہلا جملہ لکھ دیا ہے تاکہ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

نامعلوم کتابوں کے پہنچاننے میں آسانی ہو ۔ بعد کے لوگوں نے اس کتاب کے متعدد ضمیمے مرتب کیے ۔ ان میں سے آخری ضمیمہ [ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون کے نام سے] اسمٰعیل پاشا البغدادی (م ۱۹۲۰ء) کا ہے، جس میں ۱۸۰۰۰ کے قریب عنوانات دیے گئے ہیں ۔ [یہ کتاب دو جلدوں میں استانبول سے (۱۹۴۵ - ۱۹۴۷ء) سے شائع ہو چکی ہے] ۔

باقی ماندہ کتابیاتی تصانیف کے متعلق، جو اس وقت تک موجود ہیں، کچھ زیادہ کہنا ضروری نہیں ۔ ابن خیر الاشبیلی (۵۰۲ تا ۵۷۲ھ) نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اندلس میں مشائی طالب علم کی حیثیت سے گزارا تھا ۔ اس نے ایک فہرست (طبع Codera و Ribera، در *BAH*، ج ۹ و ۱۰، سرقسطہ ۱۸۹۴ء) مرتب کی تھی، جس میں اس نے عربی کی کوئی ۱۴۰۰ ایسی کتابوں کے نام درج کیے ہیں جو ہسپانیہ اور مشرق میں لکھی گئیں اور جن کو اس نے خود پڑھا یا ان کا نام سنا؛ اس میں ہر کتاب کے راویوں کا سلسلہ اس کے اصل مصنف تک پہنچایا گیا ہے ۔ انفرادی مصنفین کی تصنیفات کی فہرستیں بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً الرازی کی تصنیفات کی فہرست (مؤلفۂ البیرونی، طبع کراؤز P. Kraus، پیرس ۱۹۳۶ء)، جالینوس کے تراجم کی فہرست (تالیف حسین بن اسحٰق، طبع Bergstrasser، لائپزگ ۱۹۲۵ء و ۱۹۳۳ء) اور سیوطی کی خود نوشت کتابیات (براکلمان، ۲: ۱۵۴ و تکملہ، ۲: ۱۷۹)؛ [نیز امام غزالی کی تصانیف کی فہرست، مؤلفہ محمد رضا]۔ شیعیوں نے اپنے فرقے کے مصنفین کی کتابیات کی ترتیب میں بہت انہماک سے کام لیا ہے ۔ سب سے پہلی فہرست محمد بن الحسن الطّوسی (م ۴۶۰ھ) نے لکھی اور شپرینگر Sprenger، عبدالحق اور غلام قادر نے *Bibliotheca Indica* کے لیے اس کی تدوین کی ۔ اس اشاعت کے دیباچے میں کتابیات کی اسی قسم کی تین اور تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اس سے قریب تر زمانے میں اعجاز حسین (۱۲۴۰ تا ۱۲۸۶ھ) کی کتاب کشف الحجب و الاستار عن اسماء الکتب و الاسفار میں ۳۴۱۴ شیعی کتابوں کی کیفیت ردیف وار درج ہے ۔ آغا بزرگ الطّہرانی کی کتاب الذّریعہ الی تصانیف الشّیعہ بھی قابل ذکر ہے ۔

علوم اسلام کے مغربی فضلا اور طلبہ کی تصنیفات کی فہرست پہلے پہل Schnurrer نے مرتب کی ۔ اس کی *Bibliotheca Arabica* کی طبع دوم ۱۸۱۱ء میں شائع ہوئی ۔ اس میں موضوعات کی ترتیب کے مطابق کتب مطبوعہ کی فہرست قدیم زمانے سے ۱۸۱۰ء تک دی گئی ہے اور تاریخ وار اشاریہ بھی اس کے ساتھ ہے ۔ Zenker کی *Bibliotheca Orientalis* (لائپزگ ۱۸۴۰ء، ۱۸۴۶ء، بار دیگر ۱۸۶۱ء)، جس کا مقصد طباعت کی ایجاد سے لے کر اس وقت تک کی عام عربی، فارسی اور ترکی مطبوعات کے نام جمع کرنا تھا، توقع کے مطابق ثابت نہیں ہوئی ۔ شوفن Chauvin نے Schnurrer کا کام زیادہ مہارت سے جاری رکھا اور اس نے Bibliotheca Arabica کے ساتھ ضمناً مصنفین کا اشاریہ بھی لگا دیا ۔ اس کی کتاب *Bibliographie des ouvrages arabes on relatifs aux Arabes publies dans l' Europe chretienne de 1810 a 1885* کی کل بارہ جلدیں ۱۸۹۲ء سے ۱۹۲۲ء تک طبع ہوئیں اور اس تصنیف کے باقی ماندہ حصے کے لیے مواد مخطوطات کی صورت میں Liege یونیورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے ۔ شوفن Chauvin کا ارادہ یہ تھا کہ Schnurrer اور *Orientalische Bibliography* کے مابین جو خلا رہ گیا ہے اسے پُر

www.besturdubooks.wordpress.com

کیا جائے ۔ آخرالذکر کی طباعت ۱۸۸۷ء میں شروع ہوئی تھی اور یہ اسلامی موضوعات، نیز مشرقی علوم کی تحقیق کے تمام شعبوں کے متعلق ۱۹۱۱ء تک شائع ہونے والی جملہ مطبوعات کی، ایک نہایت مکمل فہرست مہیا کرتی تھی۔

اگر شوفن کی کتاب پوری طبع ہو جاتی تو دنیا کے ہاتھ میں شروع سے لے کر ۱۹۱۱ء تک کی اسلامی موضوعات پر تمام مغربی مطبوعہ کتب کا خاصا مکمل مجموعہ تینوں فہرستہائے کتب Schnurrer، شوفن اور *Orientalische Bibliography* کو ملا کر استعمال کے لیے موجود ہوتا ۔ اس وقت سے اسلامی علوم کے متعلق تحقیق کے روز افزوں کام اور اس وجہ سے مطبوعات کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اس بات کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے کہ ایک خاص مدت کے اندر کی تمام مطبوعات کی تفصیل ایک ہی کتاب میں جمع کر دی جائے؛ اس لیے ۱۹۱۱ء کے بعد سے جو مطبوعات وجود میں آئیں انھیں معلوم کرنے کے لیے علما کو تمام انواع کی کتابیات کی ایک بڑی تعداد کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، جن کا بالتفصیل ذکر یہاں ممکن نہیں ۔ Pfannmüller نے اپنی کتاب *Handbuch der Islamliterature* (برلن و لائپزگ ۱۹۲۳ء) میں اس موضوع پر ایک مفید دیباچہ اور ہدایات قلم بند کی ہیں، لیکن اس کا مقصد اس کی مکمل کتابیات مرتب کرنا نہ تھا) ۔ بڑے بڑے رسالوں کے ذریعے بھی اس مسئلے کے حل کی کوشش کی گئی ہے ۔ یہاں صرف اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ *Kritische Bibliographe* وقتاً فوقتاً، ۱۹۱۳ سے ۱۹۳۳ء تک، *Der Islam* میں شائع ہوتی رہی ہے اور *Abstracta Islamica* ۱۹۳۷ء سے *Revue des études Islamiques* کا مستقل طور پر ایک خاص حصہ رہا ہے ۔ پیرسن Pearson نے یہ کوشش کی ہے کہ *Index Islamicus* (کیمبرج ۱۹۵۸ء) میں رسالوں میں چھپنے والے، نیز ۱۹۰۶ سے ۱۹۵۵ء تک پچاس سال میں لکھے گئے مقالات کی فہرست مہیا کی جائے۔

کتابیاتی تواریخ ادبیات کی ترتیب کے ضمن میں جو روایت ابن النّدیم اور حاجی خلیفہ نے قائم کی تھی، اس کو ہمارے زمانے میں براکلمان اور سٹوری Storey نے علی الترتیب عربی اور فارسی ادبیات کے متعلق اپنی یادگار تصانیف سے جاری رکھا ہے ۔ ان دونوں مؤلفوں نے مصنفین کی سیرت کے متعلق مواد کے علاوہ مخطوطات کی تاحدِ امکان مکمل فہرست مہیا کی ہے اور تمام کتاب خانوں کے مجموعوں کی مطبوعہ فہرستوں، نیز انفرادی مصنفین کی کتابوں کی خاص خاص طباعتوں، ترجموں اور تاریخ یا تنقید کی تصانیف کی کیفیت یکجا کر دی ہے ۔ براکلمان نے اپنے مواد کو تاریخ وار ترتیب دی ہے اور سٹوری نے اس کو موضوعات کی بنیاد پر مرتب کیا ہے ۔ یہ دونوں عربی اور فارسی ادبیات کے طالب علموں اور عربی اور فارسی کتابوں کی فہرستیں تیار کرنے والوں کے لیے ناگزیر ہیں ۔ [فؤاد سزگین نے براکلمان کی تاریخ ادب عربی کے تکملے کے طور پر تین جلدیں جرمن زبان میں تالیف کی ہیں، جن کا عربی ترجمہ تاریخ التراث العربی (جلد اول) شائع ہو چکا ہے ۔ فؤاد سزگین کی یہ کتاب بھی کتابیات کے سلسلے میں بڑی مفید اور اہم ہے] ۔ ایک اسی قسم کی تصنیف *Geschichts schreiber der Osmanen*، لائپزگ ۱۹۲۷ء، جس کا احاطہ نظر محدود تر ہے، Babinger نے تیار کی ہے۔

عربی میں عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابیں ایک علٰحدہ موضوع ہے، جس پر G. Graf : *Gessch de. christlichen arabt ite*، ۵ جلدیں Vatican

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

City ۱۹۴۴-۱۹۵۳ء اور M. Steinschneider : *Arab.Lit. der Juden*، فرینکفرٹ ۱۹۰۲ء، لکھی جا چکی ہیں۔

زمانۂ حال میں خود اسلامی ممالک نے اپنی کتابیات مرتب کرنے میں بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں یوسف الیان سرکیس نے اپنی کتاب معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ شائع کی ۔ اس میں تمام عربی مطبوعہ کتب کے نام، طباعت کے شروع ہونے سے لے کر ۱۹۱۹ء کے آخر تک، مصنف کے معروف ترین نام کے اعتبار سے (خواہ وہ اسم ہو یا لقب، کنیت ہو یا نسبت) حروف تہجی کے لحاظ سے درج ہیں ۔ اس کتاب میں تصنیفات کے نام کا اشاریہ بھی شامل ہے ۔ مصر میں السجل الثقافی کی متعدد جلدیں شائع ہوئی ہیں، جو علمی لحاظ سے درحقیقت قومی کتابیات مقصود ہو سکتی ہیں ۔ ایک فارسی قومی کتابیات، مرتبۂ ڈاکٹر ایرج افشار، فرہنگ ایران زمین میں ۱۹۵۴ء سے شائع ہو رہی ہے ۔ فارسی کی مطبوعہ کتب کی ایک فہرست کی پہلی جلد، مرتبۂ خان بابا مشار، ۱۳۳۶ شمسی/۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی تھی ۔ برسلی محمد طاہر کی عثمانلی مؤلفلری عثمانی مصنفین کی سیرت اور کتابیات کی معجم ہے، جو تذکروں کی طرز پر لکھی گئی ہے ۔ یہ ترکی ثقافت کے تمام طلبہ کے لیے بڑی قابل قدر کتاب ہے، اگرچہ کتابیاتی تفصیل میں صحت کے لیے مشہور نہیں ۔ بقول Babinger اس کے اشاریے میں کسی نام کا ڈھونڈھ نکالنا اکثر قسمت کی یاوری پر منحصر اور بڑے صبر و تحمل کا متقاضی ہوتا ہے ۔ تورک بیلیو گرافیاسی میں ۱۹۲۸ء سے ترکی کی تمام مطبوعات درج ہیں ۔ کتاب خانۂ ملّی نے اس تجویز کا اعلان کیا ہے کہ ترکی کی تمام مطبوعہ کتب کی فہرست اٹھارھویں صدی سے جبکہ اس ملک میں طباعت کا آغاز ہوا، شائع کی جائے گی ۔ تورکیہ مقالہ لر بیلیو گرافیاسی، ترکی رسالوں میں چھپنے والے مقالات کا اشاریہ ہے، جو ۱۹۵۲ء سے باقاعدہ شائع ہو رہا ہے۔

مآخذ : ابن النّدیم کی فہرست فلوگل نے مرتب کی اور اس کی وفات کے بعد J. Roediger اور A. Mueller نے شائع کی (۲ جلدیں، لائپزگ ۱۸۷۱-۱۸۷۲ء؛ بار دوم قاہرہ ۱۳۴۸ھ)؛ ایک نیا نسخہ J. Fuck نے مرتب کیا ہے ۔ اس کے مضامین کا فلوگل نے *ZDMG*، ۱۳ : ۵۵۹ تا ۶۵۰ میں بالتفصیل تجزیہ کیا اور براؤن نے اپنی کتاب (۱ : ۳۸۳ تا ۳۸۷) میں اسے بشکل جدول مرتب کیا؛ نیز دیکھیے حوالے، در پیرسن (Pearson) : *Index Islamicus*، شمارہ ۲۳۲۸۱ تا ۲۳۸۲۷، ۲۳۷۳ (بہ استثنائے ۲۳۲۸۵)؛ حاجی خلیفہ کے لیے دیکھیے Babinger : *G. O.*، ۱۹۵ تا ۲۰۳ ۔ کشف الظنون کی فلوگل نے تدوین کی (مطبوعۂ Oriental Translation Fund، ۷ جلدیں، لائپزگ ۱۸۳۵ : ۱۸۵۸ء؛ نیز بولاق، ۱۸۵۸ء، استانبول ۱۳۱۰-۱۳۱۱ھ و ۱۹۴۱-۱۹۴۳ء) ۔ اسمٰعیل پاشا بغدادی کی ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون استانبول میں ۱۹۴۵-۱۹۴۷ء میں طبع ہوئی؛ علم ہیئت پر : نلینو (Nallino) : *Ilm al-Falak*، ص ۴۷ اور اطالوی ترجمہ، *Storia dell astronomia presso gli Arabi* در *Raccolta dei Scritti*، ص ۱۴۳ تا ۱۵۰؛ شیعی کتابیات کے لیے دیکھیے براؤن، جلد ۴، باب ۸، خصوصاً ص ۳۵۵ تا ۳۵۸؛ G. Gabrieli : *Manuale di bibliografia musulmana* (روم ۱۹۱۶ء) اپنی نوع کی منفرد کتاب ہے اور عام کتابیاتی تصانیف کے متعلق اپنی فہرستوں کی وجہ سے بہت ہی قابل قدر ہے (افسوس ہے کہ اس کا صرف پہلا ہی حصہ شائع ہو سکا ہے)؛ Schnurrer اور Zenker کی تصانیف کے لیے دیکھیے شوفن : *Biblio-graphie des ouvrages arabes*، دیباچہ، خصوصاً ص xx تا xxx۔ شوفن کی *Bibliographie* کے غیر مطبوعہ حصوں کے لیے دیکھیے J. Gobeaux - Thoret : *Notes from the Liege*

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Library on Victor Chauvin and on Ibn Butlan، در *Unity and variety in Muslim civilisation*، طبع Grunebaum، ۱۹۵۵ء، ص ۳۶۳-۳۶۴: Schnurrer کا اشاریہ ص cxvii تا cxli پر مشتمل ہے۔ براکلمان: *Geschichte der arabischen literatur*، ۲ جلدیں، وائیمر و برلن ۱۸۹۸ء—۱۹۰۲ء، و Supp.، ۳ جلدیں، لائیڈن ۱۹۳۷—۱۹۴۲ء: سٹوری: *Persian Literature*، لنڈن ۱۹۲۷ء وما بعد۔

(J. D. PEARSON)

* **کُتامہ**: (یا کُتَیمہ Kotaıma)، بربروں کے عظیم خاندانوں میں سے ایک۔ جب اسلام شمالی افریقہ میں پہنچا تو اس وقت یہ خاندان موجودہ زمانے کے ضلع قُسَنْطِیْنَہ (Constantine) کے سارے شمالی علاقے پر [قاموس الاعلام]، جو اَوْراس (رکّ بآن) اور سمندر کے درمیان واقع ہے، پھیلا ہوا تھا، یا دوسرے الفاظ میں اس علاقے پر جس میں اِیْکِجَان سطیف، باغایہ، نقاوس، تکسْت، میلہ، قسنطینہ (ابن خَلْدُون، ۶: ۱۴۹)، سکیکدہ (Philippe-ville)، اَلقُل (Collo)، جِجلی [= جیجل] اور بِلِزمہ کے شہروں کے علاوہ الجزائر کا علاقۂ قبائلیہ، یعنی ود (وادی سہل Wed Sahel) اور سیبن Seban کے درمیان کا علاقہ شامل ہے۔ ایک افسانے کی رو سے، جس سے ان کے افتخار قومی کو بڑھاوا ملتا ہے، وہ اِن حِمْیَریوں کی اولاد ہیں جنھیں اَفْرِیْقُوس یہاں لایا تھا۔ کُتامہ، جس کے نام سے یہ قبیلہ موسوم ہوا، برنس کا بیٹا بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے دو بیٹے تھے، غرسین اور اِسْوَدہ؛ کُتامہ کے تمام قبائل انھیں کی اولاد سے ہیں (معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان خانہ جنگیوں اور مذہبی لڑائیوں میں کوئی حصہ نہیں لیا جو عُقْبہ کے زمانے سے لے کر بنو اَغْلَب کے عہد تک شمالی افریقہ کو ویران کرتی رہیں۔ ان کے خوارج میں شامل ہونے کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔ جب عُبَید اللہ نے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کیا تو اس کے داعیوں کی کتامہ کے بعض حاجیوں سے عرب میں ملاقات ہوئی۔ ان داعیوں نے انھیں اسمٰعیلی عقائد کا معتقد بنا لیا۔ اسمٰعیلی مذہب قبول کرنے والے ان نئے لوگوں میں سب سے ممتاز شخص جَیلہ کی شاخ سُکَیان کا رئیس موسیٰ تھا، جس کا نام ایک قصبے کے نام میں آج تک باقی ہے۔ ابو عبد اللہ الشّیعی [رکّ بآن] نامی داعی نے ایکجان میں سکونت اختیار کر لی اور بنو اغلب کی انسدادی کوششوں کے باوجود اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ یہاں سے اس نے اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے اور المہدی کو، جو سِجِلْماسہ میں مقید تھا، چھڑانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد بنو کتامہ کی اعانت سے فاطمی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔ یہی لوگ اس سلطنت کی سب سے بڑی طاقت تھے اور مصر فتح کرنے کے وسائل بھی انھیں کی بدولت مہیا ہوئے؛ لیکن اس مسلسل جدوجہد نے انھیں مضمحل کر دیا۔ جیسا کہ ابن خَلْدون نے لکھا ہے، جو لوگ المعزّ کے مصر چلے جانے کے بعد المغرب میں باقی رہ گئے تھے انھیں مقامی حکمرانوں کی اطاعت تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہمارے زمانے میں کتامہ کے بڑے نمائندے جُرْجُرہ کے زواوۃ اور وہ لوگ ہیں جو جیجل اور قبائلیہ خرد کے گرد و نواح میں آباد ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان کے اسمٰعیلی عقائد کب محو ہوئے، لیکن اس مذہب سے منسلک ہونے کے بہت عرصے بعد تک انھیں مورد ملامت سمجھا جاتا رہا اور یہی وجہ تھی کہ سِدوِیکش کے طاقتور قبیلے نے، جو کتامہ کی نسل سے تھا، اس خاندان سے اپنے آپ کو بالکل علٰحدہ کر لیا۔ آج کل اس خطّے کے تمام بربر سنّی المذہب ہیں۔

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

مآخذ : (۱) ابن خلدون : کتاب العبر، ۴ : ۳۲ ببعد و ۶ : ۱۴۸ تا ۱۵۲؛ (۲) *Hist. des Berbères*، مترجمہ de Slanes، ۱ : ۲۹۱ تا ۲۹۹ و ۲ : ۵۱۰ ببعد؛ (۳) Fournel : *Les Berbers*، ۲ : ۵۱ ببعد، نیز وہ مصنفین جن کا حوالہ دیا گیا ہے۔

(RENÉ BASSET)

⊗ **کُتُب سَماویہ** : رک بہ انجیل؛ تورات؛ زبور؛ صحیفہ؛ قرآن۔

⊗ **الکُتُبی** : رک بہ ابن شاکر الکُتُبی۔

* **الکَتّانی**، محمّد بن جعفر بن ادریس، [۱۲۷۴-۱۳۴۵ھ] جس کا تعلق کتّانیین کے مشہور گھرانے سے ہے اور وہ نسلاً اشراف میں سے ہے : عصر حاضر کا ایک مرّاکشی ادیب (وہ ۱۳۱۴ھ میں بھی تصنیف و تالیف میں مصروف تھا)؛ بہت سی کتابوں کا مصنف ہے، جن میں سے ایک کتاب اس نے اپنے جد امجد ادریس کے اعزاز و احترام میں لکھی ہے، یعنی الأزْهار العَاطِرة الأنْفاس فاس ۱۳۱۴ھ۔ اس کی اہم ترین تصنیف سَلوة الأنْفاس و محادثة الأكْياس بِمَنْ أقْبرَ من العُلَمَاء و الصُلَحَاء بفاس (۳ جلدیں، فاس ۱۳۱۶/۱۸۹۸-۱۸۹۹ء) ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ ان فوائد کے بیان کے لیے مخصوص ہے جو زاویوں میں اور اولیاے کرام کے مقبروں پر حاضر ہونے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے محلّہ وار ان مشہور و معروف ہستیوں کا ذکر کیا ہے جو فاس میں رہتے تھے یا وہاں دفن ہوے، کتاب کے اس حصے میں شہر کے تاریخی مقامی جغرافیے سے متعلق بڑی قیمتی معلومات موجود ہیں۔ اس نے متعدد کتابوں سے استفادہ کیا ہے، جن کی ایک فہرست اس کتاب کی تیسری جلد کے آخر میں درج ہے۔ [اس کی تصنیف الرسالة المستطرفة بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس خاندان میں بہت سے اہل علم اور صاحب تصنیف بزرگ ہوے ہیں دیکھیے الزرکلی: الاعلام، بذیل مادۂ الکتانی و محمد بن جعفر الکتانی مع مآخذ]۔

مآخذ : (۱) R. Basset : *Recherches biblio-graphiques sur les sources de la Salouat al-Anfās*، الجزائر ۱۹۰۵ء؛ (۲) Codera y Zaidin : *Consi-derable numero de libros antiquos y modernos existentes in Marruecos, Actes du XIVe Congrés international des Orientalistes (Algiers)*، پیرس ۱۹۰۸ء، ۲/۳ : ۵۸۷ تا ۵۹۰۔

(RENE BASSET)

* **کَتْخُدا** : (ف : کدخدا، "کد" بمعنی گھر، "خُدا" بمعنی مالک، آقا)، دراصل اس کا مطلب تھا مالک خانہ یا بزرگِ خاندان؛ بعد ازاں ایران میں یہ نام دیہات میں مقدم یا سرکاری کارندے کے لیے اور شہروں میں حلقے کے "صاحب عُشر" (dixenier" de quartier"، دیکھیے Chardin : *Voyages*، ۱۸۱۱ء، ۴ : ۷۷) کے لیے استعمال ہونے لگا، جو ایک قسم کا عہدیدار پولیس تھا، اور جس کا فرض تھا کہ اپنے حلقے کا معائنہ کرے۔ وہ "کلانتر" [رک بآں] کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ جنگ عظیم سے پہلے ایران میں جو انتظامی اصلاحات نافذ کی گئیں اُن کا مقصد یہ تھا کہ کتخدا کو قریہ (گاؤں) میں، جو انتظامی اعتبار سے مملکت کی سب سے چھوٹی وحدت ہوتی ہے، عوامی حکومت کا نمائندہ (یعنی میربلدیہ = mayor) بنا دیا جائے۔ بد قسمتی سے یہ عہدیدار، جن کے فرائض پیشتر ازیں محاصل وصول کرنے تک محدود تھے، بڑے بڑے زمینداروں کے سامنے بالکل بے دست و پا تھے (*RMM*، ۱۹۱۴ء، ۲۷ : ۱۹۴) کیونکہ وہ انھیں کے کارندے ہوتے تھے اور انھیں وہی مقرر کرتے تھے۔ باین ہمہ بعض ایسے دیہات بھی ہیں جہاں یہ نمائندے

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

والی صوبه کی طرف سے مقرر کیے جاتے یا وهاں باشندے هی خود انهیں منتخب کرتے تھے.

یه لفظ عثمانی ترکی زبان میں داخل هوا هے، جهاں یه بگڑ کر کهیا یا کیایا هو گیا هے، جس کا مطلب هے گهر کا داروغه - "اصناف کیا یا سی" مزدوروں کی انجمن کے رکن یا صدر کو کهتے هیں - "کیا کدن" محل کی سب سے معزز خاتون، یعنی گهریلو انتظامات اور ملازمین کی مهتمم هوتی هے - "کپو کیایا" وه نمائنده یا گماشته هوتا هے جو صوبوں کے والیوں کی طرف سے باب عالی میں مقرر کیا جاتا هے - "دولت کیایاسی" کا نام اس عهدیدار کے لیے استعمال هوا کرتا تھا جس کے فرائض جدید حکومتوں کے وزیر داخله سے ملتے جلتے تھے - "قل کیایاسی" یعنی چری فوج کا ناظر اور آغا کا نائب اور اس کے ذاتی عملے کا سردار هوتا تھا، جسے اوجق [= اوجاق] کے تمام افراد کی منظوری هی سے برطرف کیا جا سکتا تھا - خود اس کا ایک نائب، آغا کے ساتھ رهتا تھا، جو سردار کے احکام قلعوں کے سپه سالاروں کے پاس پهنچاتا تھا اور "کیایایری" یعنی نائب ناظر کهلاتا تھا.

مآخذ: (۱) Barbier de Meynard : *Diction-naire turc-français*، ۲: ۶۱۲؛ (۲) G. Demorgny : *Essai sur l' administration de la Perse*، پیرس ۱۹۱۳ء، ص ۵۰، ۵۵.

(CL. HUART)

* **کِتْمان** : رک به تَقِیَّة

* **کَتَنگَه** : [جمهوریهٔ زائر، یعنی سابق] بلجین کانگو کا ایک صوبه.

تاریخ و جغرافیه : کتنگه [جمهوریهٔ زائر کا] انتهائی جنوبی، زرخیز ترین اور بهت کم آباد صوبه هے - یه ۵ درجے اور ۱۳ درجے ۳۰ دقیقے عرض بلد جنوبی اور ۲۱ درجے تیس دقیقے اور ۳۰ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد مشرقی کے درمیان واقع هے - اس کے شمال میں مشرقی صوبه اور صوبهٔ کانگو کسائی واقع هیں، مشرق میں خلیج تانگا نیکا اسے سابق جرمن مشرقی افریقه اور شمالی رهوڈیشیا سے جداکرتی هے، جنوب میں شمالی رهوڈیشیا اور [جمهوریهٔ] انگولا اور مغرب میں انگولا اور صوبهٔ کانگو کسائی هیں - صوبهٔ کتنگه کا رقبه دو لاکھ مربع میل هے، جو سارے ملک کے چوتھائی کے برابر هے - [۱۹۷۰ء کی مردم شماری کی رو سے صوبه کی آبادی ستائیس لاکھ نفوس پر مشتمل هے جس میں اکثریت بنتو قبائل کی هے - سفید فام باشندوں میں بلجمی، ولندیزی اور انگریز هیں - بهارتی اور پاکستانی باشندے بهی پائے جاتے هیں] - کتنگه کا صوبه چار اضلاع: بالائی لواپولا، لومامی، لولوا اور تانگا نیکا موئیرو پر مشتمل هے - معاشی آسودگی کی بدولت یهاں بهت سے شهر آباد هوگئے هیں، مثلاً الزبتھ ویل Elisabethville، لکاسی Likasi، البرٹ ویل Albertville، کانگولو Kongolo، کبنڈا Kabinda، سنڈورا Sandora اور کمبووه Kambove وغیره.

کتنگه کی آب و هوا عام طور پر معتدل هے، بالخصوص دس درجے عرض بلد کے جنوب میں، جهاں سطح سمندر سے بلندی ساڑھے تین هزار سے ساڑھے پانچ هزار فٹ کے درمیان هے - اسے لوالبه Lualaba (دریائے کانگو کی بالائی شاخ) جیسی عظیم الشان ندیاں سیراب کرتی هیں - یه دریا اور ندیاں جنوب سے شمال کو بهتی هیں - ان میں بهت سی معاون ندیاں بهی آ کر مل جاتی هیں، جن کا منبع خلیج تانگا نیکا هے - کتنگه کی سرزمین جهاڑیوں سے ڈهکی هوئی هے - یه دوسرے صوبوں کی طرح زرخیز نهیں اور نه سیاحوں کے لیے هی فرحت بخش هے، البته یه معدنیات کی بے اندازه دولت سے مالا مال هے - بلجیم سے آمده آباد کاروں

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کی معاشی حکمت عملی کا رخ بھی معدنیات سے استفادے کی طرف رہا ہے۔

ٹیسن کے بکثرت ذخائر لوالبہ اور خلیج تانگا نیکا کے درمیانی علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ البرٹ ویل اور لیونہ Leuna میں دو اہم کانوں سے کوئلا نکالا جا رہا ہے۔ بعض مقامات سے سونے، لوہے اور ہیروں کے ذخیرے بھی ملے ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں انجمن کان کنی (Mining Union) کو شیوکولوبیوہ Shiukolobiwe میں یورینیم کے قیمتی ذخائر بھی ملے تھے۔ حکومت بلجیم کتنگہ سے یورینیم درآمد کرکے ریڈیم بناتی رہی ہے۔

کتنگہ کی ثروت کا اصل وسیلہ تانبے کی کانیں ہیں۔ یہاں یہ دھات وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔ اہل بلجیم کی آمد سے قبل ہی ملکی باشندے ان سے تانبا نکالتے رہے ہیں۔ کچا تانبا کثرت سے چودہ درجے کی گہرائی تک پایا جاتا ہے اور ہر سال لاکھوں ٹن برآمد کیا جاتا ہے۔ برقی قوت کے استعمال سے معدنی صنعت نے بے حد فروغ پایا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط تک اہلِ یورپ اس سرزمین سے قطعاً نا آشنا تھے۔ جب ۱۸۷۷ء میں مشہور سیاح سٹینلے Stanley دریائے کانگو کے دہانے تک جا پہنچا تو بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ ثانی کو اس علاقے کی اہمیت اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لا محدود امکانات کا احساس ہوا۔ "کانگو فری سٹیٹ" کا قیام عمل میں آیا اور برلن کانفرنس (۱۸۸۴-۱۸۸۵ء) میں لیوپولڈ کو اس کا سربراہ تسلیم کر لیا گیا۔ ۲۸ نومبر ۱۹۰۷ء کے معاہدے کی رو سے اس ریاست کا بلجیم کے ساتھ با ضابطہ الحاق کر لیا گیا۔

[بالآخر کانگو ۳۰ جون ۱۹۶۰ء کو آزاد ہوگیا اور آزادی کے بعد ملک کا نام جمہوریۂ کانگو قرار پایا۔ ملک کی آزادی کے بعد اباکو پارٹی کے صدر جوزف کاساووبو Goseph Kasavubs اور کانگو کی قومی تحریک آزادی کے قائد پیٹرک لومبا Patrice Lumumba علی الترتیب صدر اور وزیر اعظم منتخب ہوئے، لیکن ملک میں سیاسی استحکام نہ پیدا ہو سکا۔ قبائلی اور علاقائی عصبیتیں ابھرنے لگیں، جن کے نتیجے میں کتنگہ وزیر اعظم شومبے کی سرکردگی میں ملک سے علٰحدہ ہوگیا۔ جولائی ۱۹۶۰ء میں جمہوریہ کی فوجوں نے بغاوت کر کے تمام بلجمی افسروں کو ملک سے باہر نکال دیا۔ لومبا نے اقوام متحدہ اور روس سے امداد کی درخواست کی۔ اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری نے بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج روانہ کی۔ فروری ۱۹۶۱ء میں کتنگہ کے قبائل نے لومبا کو اغوا کر کے قتل کر دیا۔ ستمبر ۱۹۶۱ء میں اقوام متحدہ کی افواج نے کتنگہ پر حملہ کر کے جنوری ۱۹۶۳ء تک کتنگہ کے تمام مرکزی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں صدر کاساووبو نے وزیر اعظم شومبے کو برخاست کردیا۔ اس کے بعد کمانڈر انچیف جوزف مابوٹو Goseph Mabuto نے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ملک کا انتظام و انصرام خود سنبھال لیا۔ جون ۱۹۶۷ء میں ملک میں استصواب عام کی رو سے ایک نیا دستور وضع کیا گیا، جس کے نتیجے میں ملک میں صدارتی طرز کی جمہوریہ قائم کر دی گئی اور کتنگہ اس کا ایک صوبہ قرار پایا۔ ۱۹۷۱ء میں ملک کا نام جمہوریۂ زائرے Zaire رکھا گیا۔ ۱۹۷۰ء کی مردم شماری کی رو سے کتنگہ کی آبادی ستائیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں کتنگہ نے صنعتی اعتبار سے خاصی ترقی کی ہے۔ تانبے اور ہیرے کی کانیں حکومت نے ۱۹۶۷ء سے قومی تحویل میں لے لی ہیں۔ ان سے ملک کو کثیر زر مبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ لوبمباشی Lubumbashi (سابق الزبتھ ویل) میں ایک

www.besturdubooks.wordpress.com

یونیورسٹی بھی قائم ہے]۔

مسلمانوں کی آمد : تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی ہجرت سے پیشتر ہی بحیرۂ قلزم اور خلیج فارس کا درمیانی سمندر عربوں کے جہازوں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا ۔ اسلامی فتوحات کے بعد جب صحابۂ کرامؓ اور عام مسلمان جوق در جوق شمالی افریقہ میں چلے آئے تو عربوں کو بحر ہند کے اردگرد کے ممالک کی باقاعدہ تسخیر کرنے اور وہاں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرنے کا خیال دامن گیر ہوا ۔ ان میں سوفالہ اور زنجبار ایسی بڑی سلطنتیں بھی تھیں جن پر عروج و اقتدار کے مختلف ادوار گزرے ہیں ۔

یہ سیاسی اقتدار جلد ہی مائل بہ تنزل ہوگیا اور اس کی جگہ تاجروں اور پیداواری وسائل سے منفعت اٹھانے والوں نے لے لی ۔ بقول Privelle یہ تاجر اور نفع خور اپنے استحصال کے لیے معاشرے کی عام اور طبعی حالت کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

اسی زمانے میں عرب سردار مشرقی افریقہ کے اندرونی حصے میں راہ پانے لگے ۔ ملکی باشندے ان کی مزاحمت نہ کر سکے ۔ اندرون ملک ان سرداروں کو ہاتھی دانت کے بیش بہا ذخیرے اور غلاموں کی بڑی تعداد ملی، جنھیں وہ مسلمان تاجروں اور امریکی آبادکاروں کے ہاتھ مہنگے داموں فروخت کر دیا کرتے تھے۔

زنجبار اور ساحل موزمبیق سے نکل کر مسلم آباد کار انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں خلیج تانگا نیکا تک پہنچ گئے ۔ وہ خلیج متوآ M'Toa سے ہوتے ہوئے کتنگہ تک پھیل گئے اور مڑک کے راستے مشرقی صوبے میں کابمبیر Kabambare اور کاسونگو Kasongo تک جا پہنچے ۔ ایک سردار تپوتپ Tippo-Tip اور اس کے بھتیجے رشید کی سرکردگی میں تانگانیکا کے کناروں سے سٹینلے ویل Stanleyville تک ایک عرب ریاست قائم ہو گئی۔

عربوں کی یلغار (جس کی تفصیلات سٹینلے اور لِونگ سٹون Livingstone نے اپنے سفرناموں میں بیان کی ہیں)، ان کی مفروضہ زیادتیوں اور ملکی باشندوں کے معاشرے کے تنزل اور مسلسل جنگوں کے باعث ان کی اندرون ملک نقل مکانی کی بنا پر یورپ میں زبردست رد عمل ہوا ۔ Cardinal de Lavigerie نے عربوں کے خلاف جنگ کی تبلیغ شروع کر دی ۔ لیوپولڈ ثانی کی درخواست پر یورپ کی "مہذب قوموں" کا اجتماع ۱۸۸۹ء میں غلامی کی روک تھام کے لیے ہوا اور (اس کے بہانے) رشید، سیفو اور کمالیزا وغیرہ عرب سرداروں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا ۔ Dhanis نے کانگو کے جنوب میں اور کمانڈار جیکوئیز Jacques اور اس کے نائبوں نے خلیج تانگا نیکا، البرٹ ویل اور مپالا وغیرہ مقامات پر عربوں کے خلاف گھمسان کی جنگیں لڑیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علاقے ہمیشہ کے لیے عربوں کے اقتدار سے آزاد ہو گئے ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں کی تبلیغی کوششوں کا کتنگہ کے بنتو قبائل پر کیا اثر پڑا ؟ خلیج تانگا نیکا سے لے کر آبشار سٹینلے تک آج بھی زنگی ملتے ہیں، جو اسلام کے حلقہ بگوش ہیں اور انھیں ونگوانہ عرب کہتے ہیں ۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ عرب ہمیشہ سے تبلیغ اسلام کے لیے کوشاں رہے ہیں اور یہ بھی یقینی ہے کہ اسلام [اپنی تعلیمات کی بنا پر اور غلامی کی مخالفت کے باعث ہمیشہ سے] افریقہ کے ملکی باشندوں کے لیے کشش کا باعث رہا ہے۔

مشرقی صوبے میں یہ اثر نمایاں ہے، لیکن کتنگہ میں خلیج تانگانیکا کے کنارے اور قدیم عرب شاہراہوں پر بھی زنگی ملتے ہیں، جنھوں نے عربوں کے طور طریقے اپنا لیے ہیں ۔ ان کی دینی تعلیم اگرچہ ابتدائی درجے تک محدود ہے، لیکن

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

دوسرے زنگیوں پر اپنی برتری کا نقش قائم کرنے کے لیے یہ مسلم زنگی سفید لباس پہنتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور رمضان میں روزے بھی رکھتے ہیں۔ زنگی مشرف باسلام ہو کر غیر مسلموں اور ان کے اقتدار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور دیگر مسلمان بھی ان جذبات کی پرورش میں لگے رہتے ہیں۔

کتنگہ کے مسلم زنگیوں کے ساتھ عرب بھی آباد ہیں، جن میں ہندوستانی [اور پاکستانی] مسلمان بھی آ ملے ہیں۔ ان کی بڑی بڑی دکانیں ہیں اور وہ آسودہ حال ہو گئے ہیں۔

[۱۹۷۱ء کی مردم شماری کی رو سے کتنگہ میں عربوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ ہے اور ان کی سیاسی اہمیت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا]۔

مآخذ: (۱) *Travaux du groupe d'etudes coloniales, Le Katanga* : A de Bauw (۲) ؛ *Le Katanga*، برسلز ۱۹۲۰ء؛ (۳) O Meynier : *L' Afrique noire*، پیرس ۱۹۱۴ء؛ (۴) A de Préville : *Les Sociétés africaines*، پیرس ۱۸۹۴ء؛ (۵) P. Daye : *L' empire colonial belge*، ۱۹۲۳ء؛ (۶) E. Van der Straeten : *Bulletin de la Société belge d'études coloniales*، ۱۹۲۴ء؛ (۷) Sidney Langford-Hinde : *La chute de la domination des Arabes du Congo* بلجیمی کانگو *Societe belge d' études Coloniales*، کا دستور العمل، مطبوعہ امارت بحریہ، لنڈن ۱۹۱۹؛ (۸) *Statesman's year Book* 1974/1975ء.]

(E. VAN DER STRAETEN [و ادارہ])

* **کُتَی:** (Kutai)، مشرقی بورنیو Borneo کی ایک خود مختار ریاست، جو [ولندیزی عہد حکومت میں] بورنیو ریزیڈنسی (Zuider-en Oosterafdeeling van Borneo) کی قسمت سمارندہ Samarinde میں شامل تھی؛ [آج کل انڈونیشیا کے صوبۂ مشرقی کالی منتان کا ضلع، جو] زیادہ تر دریائے مَہَکم Mahakam کی وادی پر مشتمل اور موارہ مجب Muara Mujub تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک بہت اہم دریا ہے اور اس کا بڑا حصہ جہاز رانی کے قابل ہے۔ مَکّسر سے آنے والی سڑک اس کی مشرقی سرحد معیّن کرتی ہے۔ ولندیزی نائب ریزیڈنٹ مَہَکم کے کنارے سمارندہ میں رہتا تھا۔ سلطان کا دارالحکومت، تَنگَرنگ Tenggarung، دریا کے بالائی جانب ذرا فاصلے پر واقع تھا۔ ملک خوشحال ہے، یہاں کی زمین میں عمدہ قسم کا کوئلا اور پٹرولیم کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اگر حالات حسب معمول ہوں تو جنگل کی پیداوار اور خشک اور نمکین مچھلی کی تجارت زوروں پر ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس سلطنت کا نام مشتق ہے یُوپَ کوٹی سے (سنسکرت: کوٹی = الجام، نقطہ)، جو ہندوستان کی کتب جغرافیہ میں مذکور ہے۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ پانچویں صدی عیسوی سے قبل یہاں ہندوؤں نے جاوا کے راستے سے نہیں بلکہ براہ راست ایک نو آبادی قائم کر لی تھی۔ کسی زمانے میں یہاں مُولَوَرمَن نامی ایک راجا کے ماتحت ہندوؤں کی ایک خوشحال سلطنت موجود تھی۔ اس کا ثبوت پتھر کی چار اھدائی (dedicative) لاٹھوں پر خالص سنسکرت میں لکھے ہوئے کتبوں سے ملتا ہے، جو کُتَی میں دستیاب ہوئی ہیں۔ ممکن ہے دیگر قدیم نوادر، بالخصوص کوہ کومبنگ Kombeng کے ایک غار سے دستیاب ہونے والے برہمنی دیوتاؤں کے بتوں کا تعلق بھی اسی سلطنت سے ہو۔ بورنیو میں زمانۂ مابعد کی جس ہندو تہذیب کے آثار نظر آتے ہیں وہ درحقیقت جاوا سے یہاں آئی تھی۔ چودھویں صدی عیسوی میں کُتَی مجاپاہت کی جاوی سلطنت کے علاقوں میں شامل تھا۔ ریاست کُتَی کی ابتدا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

اور اس کے حکمران خاندان کے سلسلۂ نسب کے بارے میں ایک مقامی روایت کا پتا ایک ملائی مسودے سے چلتا ہے، جو سلطان تنگرنگ کے قبضے میں تھا (اس کی ایک اور نقل برلن میں موجود ہے)۔ اس سلسلۂ نسب (''سلسلہ'') کی رو سے، جس کا پہلا حصہ بہت حد تک اساطیری ہے اور ولندیزی ترجمے کے ساتھ چھپ چکا ہے، یہاں اسلام ۱۶۰۰ء کے لگ بھگ، راجا مکوئتہ Mokoeta کے عہد میں، سلاویسی (Celebes) سے پہنچا تھا۔

یہاں کی آبادی بہت مخلوط نوعیت کی ہے۔ ملک کے اصل باشندے دیاک Dayakes ہیں، جو ابھی تک زیادہ تر اصنام پرست ہیں۔ اب فی الواقع مہکم کے کنارے ان کی کوئی بستی باقی نہیں رہی۔ دوسرے لوگ جو یہاں آباد ہو رہے ہیں، وہ انھیں روز بروز تیزی سے اندرونی علاقوں کی طرف دھکیلتے جا رہے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تنجنگ دیاکوں کے سردار کتی کے حکمران خاندان کے رشتے دار ہیں۔ مذکورۂ بالا ''سلسلہ'' کی رو سے تنجنگ کے شہزادے کرن (Kerna) نے ۱۴۵۰ء کے قریب اس وقت کے حکمران راجا پتیری Poteri کی ایک بہن سے شادی کی تھی۔ دور افتادہ اندرونی علاقوں میں ابھی تک چند خانہ بدوش قبائل ملتے ہیں۔ یہاں کی دوسری قومیں کتینی، بگنی، بنجری اور بجو، سب مسلمان ہیں۔ کتینی، جن پر یہاں کی آبادی کا زیادہ تر حصہ مشتمل ہے، غالباً قدیم مختلف النسل ملائی نو آبادکاروں کی اولاد ہیں۔ یہ لوگ سارے ملک میں پائے جاتے ہیں۔ بگنی کی نوآبادیوں کے آغاز کا پتا بھی ہمیں ایک مقامی روایت سے چلتا ہے، جو ایک کتاب *Salasila Bugis* میں محفوظ ہے۔ یہ لوگ غالباً ۱۶۸۶ء کے آغاز میں یہاں آباد ہونا شروع ہوئے تھے اور وجو Wadjo سے آئے تھے۔ ان کے آنے کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ شروع شروع میں بگنی تمام تر سمارندہ میں رہتے تھے اور وہاں کی آبادی میں ان کی خاصی معقول تعداد تھی۔ یہ لوگ عملی طور پر سلطان کتی کی حکومت سے آزاد تھے اور ان پر ان کا اپنا سردار (پؤا اَدو) حکومت کرتا تھا، جسے مختلف خاندانوں اور گھرانوں کے بزرگ منتخب کرتے تھے۔ [آگے چل کر] کتی میں یہ بگنی جمہوریہ باقی نہیں رہی اور بگنی بھی یہاں کے دوسرے باشندوں ہی کی طرح سلطان کے ماتحت آ گئے۔ وہ سارے ملک میں آباد ہو چکے ہیں اور زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں۔ بنجری آباد کار بھی، جو بورنیو کے جنوب سے آئے ہیں، روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ ان کا بڑا پیشہ جنگل کی پیداواروں کا جمع کرنا ہے۔ بجو جزائر سلو سے آئے تھے۔ پہلے یہ لوگ بحری قزاق تھے، لیکن اب وہ مہکم کے دہانے پر مستقلاً آباد ہو گئے ہیں اور ماہی گیری پر گزر اوقات کرتے ہیں۔ آبادی کے مختلف النسل ہونے کا اثر زبان پر بھی نمایاں ہے، جو ملائی کی ایک مبدّل شکل ہے اس پر ابھی تحقیق ہونا باقی ہے، البتہ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جاوی زبان کے الفاظ بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ کتی کو ولندیزیوں سے پہلی بار سابقہ ۱۶۳۵ء میں پڑا، جب ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہاں کے حکمران سے پہلا معاہدہ ہوا۔ ۱۸۲۵ء اور ۱۸۴۴ء کے معاہدوں کی رو سے سلطان نے ولندیزی سیادت تسلیم کر لی۔ یہ بھی طے پایا کہ سلطان چار سربرآوردہ اشخاص کی اعانت سے حکومت کرے گا، دیاک اپنے اپنے حکمرانوں کے ماتحت رہیں گے اور جن حکمرانوں کا عہدہ موروثی ہوگا سلطان اس کی توثیق کرے گا۔

مآخذ: (۱) J. H. Moore: *Notices of the Indian archipelago and adjacent conntries*، سنگاپور ۱۸۳۷ء؛ (۲) A. L. Weddik: *Overzigt van hetrijk van Koetei*، در *Indisch Archief*، ۱۸۴۹ء، ج ۱؛ (۳)

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

John Dalton en zijne xxx berigten over Koeti en den majoor Müller در *Tijdschrift voor Neder-landsch Indië*، ۱۸۵۶ء، ۱۸ : ۲۷۳؛ (۳) J.G.A. *Korte aanteekeningen, gehouden gedurende eene reis langs de Oostkust van Borneo* : Gallois در *BTLV*، ۱۸۵۶ء، ۴ : ۲۲۰؛ (۵) : J. Zwager *Het rijk van Koetei op de Oostkust van Borneo, in het jaar 1853* در *Tijdschrift voor Nederlandsch Indië*، ۱۸۶۶ء، سلسلۂ جدید، ۴ : ۲۳۱؛ (۶) :P. J. Veth *Het Koeteische vorstenhuis* در *Tidjschrift voor Nederlandsch Indië*، ۱۸۷۰ء، سلسلۂ سوم، ۴ : ۳۵۳؛ (۷) *Verslag van het verhandelde tot regeling der betrekkingen tusschen de Maleische en Boegineesche nederzettingen aan de Koetei-rivier onder den vorigen Sultan van Koeti, vertaald uit het oorspronkelijke Maleische* در *TBGKW*، ۱۸۷۷ء، ۲۴ : ۲۱۲؛ (۸) *Reis in Oost-en Zuid-Borneo* : Carl Bock 's-Gravenhage *von Koetei naar Banjarmassin* ۱۸۸۱ و ۱۸۸۲ء، ۲ جلد؛ (۹) *Over de Opschriften uit Koetei in Verband met de geschiedenis van het schrift in den Indischen Archipel* در *Verspreide Geschriften*، ۱۹۱۷ء، ۷ : ۵۵؛ (۱۰) J. van *Exploitatie door Nederlanders van de Noordoost-kust van Borneo* : Nieuwkuyke در *Tijdschrift voor Nederlandsch Indië*، ۱۸۸۲ء، سلسلۂ جدید، ۱۱ : ۴۰۱؛ (۱۱) *Eenige mededeelingen omtrent de Boegineezen van Koetei* : S.W. Tromp در *BTLV*، ۱۸۸۷ء، ۳۶ : ۱۶۷؛ (۱۲) وهی مصنف : *Uit de Salasila van Koetei* در *BTLV*، ۱۸۸۸ء، ۳۷ : ۱؛ (۱۳) C. Snouck *Nog iets over de Salasila van Koetei* : Hurgronje در مجلۂ مذکور، ص ۱۰۹ (منقول در *Gesammelte Schriften*، ۱۹۲۵ء، ۵ : ۱۴۵)؛ (۱۴) : S. W. Tromp *Een reis naar de bovenlanden van Koetei* در *TBGKW*، ۱۸۸۹ء، ۳۲ : ۲۷۳؛ (۱۵) وهی مصنف : *Mededeelingen uit Borneo* در *Tijdschrift van het Kon. Ned. Aardrijkskundig Genootschap*، ۱۸۹۰ء، سلسلہ ۲، ۷ : ۲۲۸؛ (۱۶) *Quer durch Borneo* لائیڈن ۱۹۰۳ و ۱۹۰۷ء، ۲ جلد؛ (۱۷) *Beschrijving van de onderafdeeling Koetei* : S. C. Knappert در *BTLV*، ۱۹۰۵ء، ۵۸ : ۵۷۵؛ (۱۸) *Een bezoek aan eenige oudheden in Koetei* : H. Witkamp در *Tijdschrift van het Kon. Ned. Aardrijkskundig Genootschap*، ۱۹۱۳ء، سلسلہ ۲، ۳۰ : ۵۸۷؛ (۱۹) *Reischerinneringen uit Noord-Koetei, bewesten de Sangkoelirangbaai* : M. L. R. Rutten در مجلۂ مذکور، ۳۴ : ۱۱۷؛ (۲۰) *Encyclopaedie van Nederlandsch Indië*، بار دوم، ۱۹۱۸ء، ۲ : ۲۷۳، بذیل مادّۂ Koetei؛ (۲۱) J. Ph. Vogel *The Yupa inscriptions of King Mulavarman, from Koetei (East Broneo)* در *BTLV*، ۱۹۱۸ء، ۷۳ : ۱۶۷.

(W. H. RASSERS)

* **کَٹَک** : (Cuttack)، ایک ضلع، جو بھارت کے صوبۂ اُڑیسہ [رک بان] میں واقع ہے.

* **کَثَای** : (خِطای)، رک بہ الصین.

* **کُثَیِّر عَزَّہ** : ابو صَخْر کثیر بن عبدالرحمٰن الخزاعی، جسے اس کے نانا کی طرف منسوب کر کے ابن ابی جُمْعَۃ بھی کہتے ہیں، عہد بنی امیہ کے بڑے نام آور شعراء میں سے ہے ۔ اس کی محبوبہ عَزَّۃ کی وجہ سے، جس کی مدح و ثنا میں اس نے بہت کچھ لکھا ہے، اسے کُثَیِّر عَزَّۃ کہتے تھے ۔

اس کی مستقل سکونت تو مدینے ہی میں تھی لیکن ویسے وہ حجاز کے اور مقامات میں بھی رہتا رہا تھا ۔ اس کا شمار خزاعہ میں ہے، لیکن اسے

www.besturdubooks.wordpress.com

اپنا تعلق الصَّلْت بن النَضْر بن کِنانَہ سے جوڑنے کا شوق تھا ۔ یہ، بقول الیعقوبی، ایک گروہ تھا، جو خزاعہ میں شامل ہوگیا تھا ۔ کچھ لوگ اس وجہ سے اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پھر اس کا کریہ المنظر ٹھنگنا ڈیل ڈول بھی کچھ ایسا تھا کہ دیکھتے ہی ہنسی آتی تھی ۔ کہتے ہیں کہ اس کی حماقت اور غباوت کی وجہ سے بھی لوگ اسے خواہ مخواہ چھیڑا کرتے تھے.

عقائد کے لحاظ سے وہ غالی شیعہ تھا اور اپنے شاعر دوست خِنِدِف (الاسدی) کے زیر اثر وہ غیبۃ (رک بآں) کے بعد دوبارہ دنیا میں لوٹ آنے (رَجعۃ، رک بآں) اور تناسخ کا بھی قائل تھا.

بایں ہمہ کُثیر کے یہ اعتقادات اس بات سے مانع نہیں ہوئے کہ وہ بنو مروان کی شان میں مدحیہ قصیدے لکھے ۔ خلیفہ عبدالملک اس کے اشعار کی بہت قدر کرتا تھا، چنانچہ اس نے کئی بار کُثیِّر کو وافر انعام دیے ۔ اس خلیفہ کی وفات کے بعد کُثیِّر نے اس کا خاص طور پر مرثیہ لکھا ۔ ایک مدت انتظار کرنے کے بعد جب شاعروں کو خلیفہ عمر بن عبدالعزیز (عمر ثانیؒ) کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت ملی تو ان کے ساتھ کُثیِّر بھی باریاب ہوا اور اس نے انہیں نہایت برمحل اشعار سنا کر داد و تحسین وصول کی ۔ کُثیِّر کو بنو مہلب کی سرپرستی بھی حاصل رہی.

کُثیِّر کا عَزَّۃ کے ساتھ، جس کا ذکر وہ اپنے بہت سے اشعار میں کرتا ہے، کیا علاقہ تھا ؟ اس کی بابت بہت سی متضاد حکایات موجود ہیں ۔ ناقدین ادب وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ جمیل [رک بآں] کے عشق کے مقابلے میں اگر دیکھا جائے تو کُثیِّر کا عشق حقیقی نہیں، بلکہ مجازی تھا ۔ کُثیِّر جمیل کے اشعار کی روایت کرنے والا (راوِیَۃ) تھا ۔ وہ جمیل کو سب شعرا سے افضل مانتا تھا اور اس کی کی تقلید کیا کرتا تھا ۔ خود کُثیِّر کا راویۃ سائب ابن ذَکْوان تھا (مثلاً دیکھیے الاغانی، ۱۱ : ۱۸ س ۳ و ۱۱ ؛ ۱۴ : ۱۵۵ س ۵ ؛ نیز دیکھیے ۱۱ : ۵۰ حصۂ زیریں : السائب بن الحکیم السدوسی).

کُثیِّر نے بعہد یزید ثانی ۱۰۵ھ/۷۲۳ء میں وفات پائی ۔ اکثر مصنفین نے لکھا ہے کہ اسی روز مشہور عالم دین عِکْرِمہ کی وفات ہوئی تھی (دیکھیے ابن حجر : تہذیب التہذیب، حیدر آباد ۱۳۲۵ - ۱۳۲۷ھ، ۷ : ۲۷۱) ۔ دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے بعض فضلا کی رائے میں کُثیِّر زمانۂ اسلام کا سب سے بڑا شاعر ہے ۔ ابن سَلّام الجُمَحی رقم طراز ہے کہ اہل حجاز کُثیِّر کو سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں، لیکن اہل عراق اس کے اتنے قائل نہیں ۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا کمال مدیح میں ظاہر ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ قصیدے کی نسیب میں امر کا جوہر کھلتا ہے؛ تاہم بیشتر نقاد نسیب کے میدان میں جمیل کو متقدم مانتے ہیں (الموازنۃ، ص ۴ ببعد) ۔ کُثیِّر کی بہت سی نظمیں موسیقی میں ڈھالی اور گائی گئی ہیں.

کُثیِّر کی بابت معلومات الزُّبَیر بن بَکّار اور اسحٰق بن ابراہیم الموصِلی نے جمع کی ہیں (اخبار کُثیِّر، ابن الندیم : الفہرست، ص ۱۱۱ س ۱۰، ص ۱۴۲ س ۲۰) ۔ ایک اور تالیف کتاب کُثیِّر و عَزّہ بھی متداول تھی (الفہرست ص ۳۰۶ س ۱۱) ۔ دیوان کُثیِّر کا ذکر القالی نے کیا ہے کہ کامل دو جزء میں تھا اور ابن دُرَید سے اس نے پڑھا تھا (ابن خیر : فہرست، ج ۱ [Bibl Arabico Hispana، ج ۹]، ص ۳۹۶ س ۴)۔ اس کا ذکر حاجی خلیفہ : کشف الظنون (طبع Flugel، ۳ : ۳۰۳، عدد ۵۶۳۰) میں بھی موجود ہے، مگر اس وقت یہ مخطوطے

www.besturdubooks.wordpress.com

نا پید ہیں - مخطوطۂ اسکوریال، عدد ۹۰۴ (H. Derenbourg: Les manuscrits arabes de l' Escurial، پیرس ۱۸۸۴ء، ۱ : ۲۷۳) میں دیوان موجود نہیں ہے بلکہ اس میں فقط ایک قصیدہ ہے (دیکھیے P. Schwarz: *Studien Zur Arab. litratur-und Sprachkunde*، Stuttgart، ۱۹۲۲ء، ۱: ۱ تا ۱۷)، چند قلمی قصیدے برلن میں موجود ہیں (Ahlwardt: *Verzeichn*، عدد ۷۵۲۴، ۲ : ۸۲۵۵، ۴۱؛ ۸۴۷۱، ۶) دیوان مع شرح عربی طبع H. Peres، ۱ و ۲ (الجزائر-پیرس ۱۹۲۸ و ۱۹۳۰ء (Bibl. Arabe) مجموعۂ مقطوعات).

مآخذ : (۱) ابن سلّام الجُمحی : طبقات الشعراء، طبع Hell، ص ۱۲۱، س ۸ ببعد، ۱۲۲ - ۱۲۵؛ (۲) ابن قتیبہ : الشعر و الشعراء، طبع ڈخویہ : ص ۳۱۶ تا ۳۲۹، دیکھیے ص ۱۸، س ۸ ببعد، ص ۵۹ س ۱۱ ببعد، ص ۶۲، س ۹ ببعد، ۲۶۱ تا ۲۶۳ : (۳) المبرد : الکامل، طبع Wright، ص ۳۲۰ ببعد، ۴۱۶ س ۹، ۴۹۷، س ۹ ببعد، ص ۵۵۴، س ۶ ببعد؛ (۴) القالی : الامالی، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۱: ۴۶ ببعد، ۶۵ ببعد، ۱۷۸، ۲: ۵، ۵۶، ۶۲ تا ۷۰، ۱۰۷ تا ۱۱۰، ۱۲۹؛ ۳ : ۶۷، ۱۱۹ ببعد، ۲۲۰ ببعد؛ (۴ الف) الاغانی، ۸ (بولاق) : ۲۷ تا ۴۴ : ۱۱ (بولاق) : ۴۶ تا ۵۲ و مواضع کثیرہ؛ (۵) البلاذری : انساب الاشراف، طبع Ahlwardt، Greifswald، ۱۸۸۳ء، ۱۱: ۲۱۱ ببعد، ۲۳۵، ۲۶۶، س ۱ : (۶) ابن واضح الیعقوبی : تاریخ، طبع Houtsma، ۲ : ۳۶۶؛ (۷) الطبری : تاریخ، طبع ڈخویہ، ۳ : ۲۴۸۴ ببعد؛ (۸) المسعودی : مروج الذہب، پیرس ۱۸۷۷ - ۱۸۶۱ء، ۵ : ۱۷۶ ببعد، ۱۸۱ ببعد ۴۵۵؛ ۶ : ۴۲۶؛ (۹) وہی مصنف : التنبیہ والاشراف، *B.G.A.*، ۸ : ۳۱۰؛ (۱۰) ابن خلّکان : وفیات الاعیان، قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ۱: ۳۳۳ - ۳۵۰؛ (۱۱) یاقوت : معجم البلدان، طبع Wüstenfeld، بمدد اشاریہ؛ (۱۲) عبدالقادر البغدادی : خزانۃ الادب، بولاق ۱۲۹۹ھ، ۲ : ۳۷۷ تا ۳۸۳؛ (۱۳) جرجی زیدان : تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، قاہرہ، ۱۹۲۴ء، ج ۱؛ طبع دوم : ۲۹۱ ببعد؛ (۱۴) Brockelmann : *G A L.*، ۱ : ۴۸، و [(۱۵) تکملہ، ۱ : ۷۹ تعریب، ۱ : ۱۹۵، ۱۹۶]. (۱۶) المرزبانی : الموشح، ۱۴۳، ۱۵۸ مطبوعۂ قاہرہ؛ (۱۷) وہی مصنف؛ معجم الشعراء، ص ۲۵۰، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۱۸) السیوطی : شرح شواہد المغنی، ص ۲۴، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۱۹) طہ حسین : حدیث الاربعاء، ۲ : ۱۱۶ تا ۱۲۶، قاہرہ].

(C. VAN ARENDONK)

کَچھ : (بعض اوقات کَچ؛ البلاذری اور الیعقوبی : قصّہ؛ البیرونی: کچ؛ یاقوت، طبع وُسٹنفلڈ، ۴ : ۱۲۶ سطر ۱ : القصّہ، لیکن ۱ : ۵۰۵، سطر ۲۲، ۴ : ۹۴، سطر ۱۰ : القَص، انگریزی : "کچھ" Cutch؛ [اس کا چ ڈیلٹ اور کنجرکوٹ کا علاقہ پاکستان میں شامل ہے] کل رقبہ ۸۴۶۱ مربع میل اور آبادی تقریباً آٹھ لاکھ ہے - اس کے جنوب مغرب میں بحیرۂ عرب، جنوب میں خلیج کچھ اور شمال میں صحرائے تھر ہے - نمک کی عظیم دلدلیں جنھیں رن آو کچھ کہتے ہیں، اسے سندھ کی اصل زمین (پاکستان) اور سوراشٹر (بھارت) سے علٰحدہ کرتی ہیں اور اس طرح یہ قطعۂ زمین ایک قسم کے جزیرے کی صورت اختیار کر لیتا ہے - یہ سارا علاقہ بنجر ہے، جہاں کوئی درخت نظر نہیں آتا؛ جنوب میں کچھ پہاڑیاں ہیں، جن پر سبزی مائل آتشیں مادّہ ہے جو آتش فشاں پہاڑوں کی آتش فشانی کے زمانے کا لاوا ہے - یہاں زلزلے اکثر آئے ہیں؛ چنانچہ ۱۸۱۹ء کے زلزلے میں تو سب کچھ تباہ ہو گیا تھا.

لوگوں کا عام مقبول روزگار زراعت ہے، خاص خاص فصلیں بگی گندم، جَو اور کپاس ہیں -

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

کنو کے علاقے میں رن کے نمک کے ذخیروں میں سے نمک بھی حاصل کیا جاتا ہے اور یہاں کے لوگوں کا اہم روزگار ہے ۔ منڈوی اور کَودلہ یہاں کی دو بڑی بندرگاہیں ہیں ۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ رن کچھ کسی زمانے میں سمندر ہی کا ایک بازو ہو گا اور غالباً یہ وہی جگہ ہے جسے Arrian نے ایک بڑی جھیل کے نام سے تعبیر کیا ہے اور دہانۂ سندھ کے قریب یہاں سے سکندر اعظم بھی گزرا ہے ۔ V. de St. Martin، Watters Sgulien اور V. Smith کا خیال ہے کہ چینی سیاح ہوان سانگ نے جس علاقے کو کچ لکھا ہے وہ یہی علاقہ ہے ۔ اس کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ یہ ملک "وَلّہ" بھی راجاؤں کے ماتحت ہے، لیکن یہ بات مشکوک ہے کیونکہ جس صوبے کا ہوان سانگ ذکر کرتا ہے وہ سمندر کے قریب نہیں ہے۔

البلاذری قصہ کے ایک بادشاہ کا ذکر کرتا ہے جسے راسک (راسک) کہتر تھا اور جو خلیفہ الولید اول (۸۶ تا ۹۶ھ/۷۰۵ تا ۷۱۵ء) کا ہم عصر تھا ۔ نویں صدی عیسوی میں بھی خلیج کچھ میں سرستہ (سوراشٹر) کا شہر آباد تھا ۔ یہاں سَید لوگ رہا کرتے تھے جو مشہور بحری قزّاق تھے ۔ بقول البلاذری خلیفہ ہشام (۱۰۵ تا ۱۲۵ھ/۷۲۳ تا ۷۴۳ء) کے زمانے میں خلیج کَچھ کے باشندے مسلمان تھے ۔ جب علاقۂ سندھ میں مسلمانوں کی قوت کو زوال ہوا تو انھوں نے اپنے آپ کو علاقۂ "قَصّہ" میں برقرار رکھنے کی کوشش کی (الیعقوبی) ۔ البیرونی بیان کرتا ہے کہ دریائے سندھ کی مشرقی شاخ مہران اُس مقام پر سمندر میں جا گرتی تھی جسے کچھ میں سندھ ساگر کہتے تھے اور صاف ظاہر ہے کہ یہ رن آو کچھ (Rann of Kacch) ہی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۰۰۰ء تک یہ رن سمندر ہی کا ایک بازو بنا رہا اور دریائے سندھ کی ایک شاخ اس میں سے بہتی رہی ۔ البیرونی نے بھی کچھ کے متعلق لکھا ہے کہ بحری قزّاقوں کا گھر تھا ۔ (بَوارج) سمّہ راجپوت حکمرانانِ سندھ نے اس علاقے کو غالباً چودھویں صدی عیسوی میں فتح کر لیا ۔ ان میں سے اکثر نے اسلام قبول کر لیا، لیکن جھریجہ خاندان نے جس کا اقتدار منڈوی (۱۲۷۰ تا ۱۲۹۸ء) میں قائم تھا ایک ایسا ہندو مذہب اختیار کر لیا جو عام ہندو مت سے ذرا مختلف تھا ۔ وہ اس ملک میں برابر حکومت کرتے رہے ۔ پہلے وہ گجرات کے بادشاہوں کے ماتحت تھے، اس کے بعد مغلوں کے اور سب سے آخر میں انگریز برسر اقتدار آ گئے ۔ سندھ کے کلہوڑا خاندان نے اٹھارھویں صدی عیسوی (۱۷۶۲/۵ء) میں کچھ پر حملہ کیا ۔ ابتدائی زمانے میں علاقۂ کچھ بحری ڈاکوؤں کی جائے پناہ ہونے کی وجہ سے بے حد بد نام تھا، انگریز آئے تو پھر وہی حالت ہو گئی ؛ چنانچہ ۱۸۱۹ء میں انھوں نے اس پر قبضہ کر لیا ۔ جھریجہ خاندان کے حکمران راؤ کے لقب سے کوئی ایک صدی تک یہاں حکومت کرتے رہے ۔ ۱۸۴۸ء میں ہندوستانی ریاستوں کا الحاق برطانوی ہند سے ہو گیا ۔ [نیز رک بہ پاکستان، ۵ : ۴۵۱]۔

کچھی زبان اس صوبے کی خاص بولی ہے ۔ یہ زبان مغربی ہند کی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور عام طور پر اسے گجراتی زبان کی ایک بولی شمار کیا جاتا ہے، گو بقول گریرسن اسے زیادہ تر سندھی زبان کی ایک بولی سمجھنا چاہیے ۔ اپنے جغرافیائی محل وقوع کی بنا پر یہ زبان دونوں زبانوں کے درمیان ایک رابطے کا کام دیتی ہے۔

مآخذ : (۱) البلاذری، طبع ڈخویہ، ص ۴۳۸، س ۹، ص ۴۴۰، س ۱۱ تا ۱۳، ص ۴۴۴، س ۲ ؛ (۲) الیعقوبی، طبع Houtsma، ۲ : ۳۸۰، س ۱۲ ببعد ؛ (۳) البیرونی : کتاب الھند، طبع زخاؤ، ص ۱۰۲، س ۹ و ۱۱، ص

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۱۳۰؛ ص ۶ و ۱۲؛ ترجمہ ص ۲۰۸ و ۲۶۰؛ (۴) Reinaud : *Mem.....sur l' Inde Mem de l'Acad. des Inscr. et Belles Lettres, XVIII* 2و)، ص ۱۸۷ تا ۱۸۸؛ (۵) V. Smith : *Early Histroy of India*، طبع سوم، آکسفرڈ ۱۹۱۵ء؛ (۶) Sivewright : *Cutch and the Rann* (Geogr. Journal ۱۹۰۷ء)؛ (۷) J. Burnes : *Narrative of a visit to the court of Sinde*؛ (۸) *A sketch of the History of Cutch*؛ لندن ۱۸۳۱ء، ضمیمہ ص ۱۳۵ ببعد؛ (۹) Pertsch : در *Zeitschr. der Dtsch. Morg. Cesellsch.*، ۲۵ : ۶۱۱ تا ۶۱۳ (سکّوں پر)؛ (۱۰) D.P. Khakhar : *Arch. Survey of Western India* (صوبۂ کچھ)، عدد ۱۵۲، بمبئی ۱۸۶۸ء۔

(M. LONGWORTH DAMES)

*® **کچھی** : یا کچھ گنداوہ؛ پاکستانی بلوچستان کا مثلث نما چپٹا علاقہ جو ۲۷ درجہ، ۵۳ دقیقہ تا ۲۹ درجے ۳۵ دقیقے شمال میں اور ۶۷ درجے ۱۱ دقیقے تا ۶۸ درجے ۲۸ دقیقے مشرق میں واقع ہے [اس کا رقبہ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیر کے مطابق ۵۳۱۰ مربع میل ہے] ۔ اس کے شمال مشرق میں کوہ سلیمان کا سلسلہ ہے اور مغرب میں کرتھار کی پہاڑیاں ۔ جنوبی گوشہ خالی ہے اور شمالی سندھ کا میدان اس طرف حدبندی کرتا ہے ۔

اس علاقے کی تاریخ بلوچستان کی نسبت سندھ سے زیادہ قدیمی تعلق رکھتی ہے ۔ [ابن حوقل اس کا صدر مقام قندابیل لکھتا ہے جو آج کل گنداوہ کہلاتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں برہمن راجہ چچ نے اس پر قبضہ کیا تھا ۔ عرب وارد ہوئے تو ان کے زیر تصرف آ گیا ۔ بعد میں سندھ کے سومرہ اور سمّہ خاندانوں کے قبضہ میں چلا گیا ۔ بلوچ نویں صدی ہجری، پندرھویں صدی عیسوی میں آئے، لیکن وہ کبھی بھی مضبوط سیاسی قوت کے مالک نہ بنے، اس لیے اس علاقے کا اقتدار پہلے ارغون خاندان کے ہاتھ میں چلا گیا اور بعد میں مغلوں کے ہاتھ میں ۔ انجام کار سندھ کے کلہوڑے اس کے مالک بنے ۔ ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں میر عبداللہ احمد زئی خان قلات کو کلہوڑوں نے قتل کر دیا اور نادر شاہ نے یہ علاقہ تلافی کے لیے بروہیوں کے حوالے کر دیا ۔ پاکستان کے قیام سے قبل یہ علاقہ ریاست قلات [رک بآں] کا حصہ تھا ۔ کچھی کے مشرقی نصف علاقے میں جو قبائل آباد ہیں، یعنی ڈومبکی، اَمرانی اور کھیڑی وہ برائے نام خانِ قلات کے ماتحت سمجھے جاتے تھے ۔ یہ قبائل اس ریلوے لائن کے مشرق میں ہیں جو جیکب آباد سے کوئٹہ کو جاتی ہے اور سارے صوبے میں سے جنوباً شمالاً گزرتی ہے ۔ لائن کے مغرب میں بھی زیادہ تر بلوچ قبائل ہی آباد ہیں، سوا اس علاقے کے جو شمال میں دھادھر کے قریب ہے، جہاں ایک خانہ بدوش قبیلہ بروہی آباد ہے ۔ یہاں ہر جگہ جاٹ [رک بآں] لوگوں کی بڑی تعداد میں بستیاں ہیں ۔ بڑے بڑے قصبے بالکل نہیں ۔ گنداوہ، شوران، دھادھر، سبی، لاہری [بھاگ اور جھل] اہم مقامات ہیں ۔ [بلوچی [رک بآں] اور بَرَاہوئی [رک بآں] زبانیں بولی جاتی ہیں، سندھی کا دخل بھی ہے ۔ خانہ بدوش لوگوں کی زبان پشتو ہے ۔ باہمی گفتگو کے لیے اردو استعمال ہوتی ہے] ۔

[آب و ہوا سخت گرم ہے اور بارش کم اور شاذ و نادر ہوتی ہے] ۔ کاشتکاری کے لیے ندیوں اور پہاڑی نالوں سے پانی حاصل کیا جاتا ہے ۔ ناری اور بولان شمال میں، مُولا اور سُکلیجی مغرب میں، اور لاہری اور چھتر مشرق میں بہنے والے دریا ہیں ۔ مُولا، بولان اور ناری کی وادیاں ان دروں کا کام دیتی ہیں، جن کے ذریعے بالائی علاقوں سے رسل و رسائل اور نقل و حمل کا سلسلہ قدیم الایام سے قائم ہے ۔ اول الذکر دو وادیوں

www.besturdubooks.wordpress.com

میں سے ریل گزرتی ہے، جو بولان اور ہرنائی کے علاقوں میں سے ہوتی ہوئی کوئٹے اور پشین کو جاتی ہے ۔ آبادی منتشر ہے لیکن بلوچستان کے اکثر حصوں کی نسبت زیادہ گنجان ہے ۔

[پاکستان بننے کے بعد علاقے کی پیش رفت کے لیے نئے بند تعمیر ہوئے ہیں، مثلاً دھادھر کے جنوب میں بند اللہ یار شاہ، صرف اسی بند سے سالانہ چونتیس ہزار ایکڑ سیراب ہوتے ہیں ۔ دریائے سندھ سے بھی آبپاشی کا انتظام ہے ۔ ان تمام منصوبوں کی وجہ سے قابل کاشت رقبے اور پیداوار میں اضافہ ہوا ہے ۔ گندم، جو اور کپاس کی کاشت ہوتی ہے ۔ کپاس کی کاشت ۱۹۳۲ء میں نہر کرتھار کے کھلنے سے شروع ہوئی تھی ۔ خواندگی بڑھانے کے لیے بالخصوص ۱۹۷۱ء کے بعد بلوچستان بھر میں نئے پرائمری، مڈل اور ہائی سکول کھولے گئے ہیں ۔ اس سے کچھی کا علاقہ بھی مستفید ہوا ہے ۔ دھادھر اور بھاگ میں ہائی سکول تو ۱۹۵۴ء میں کھل گئے تھے ۔ آمد و رفت کے لیے پختہ سڑک ہے ۔ بسیں دیہات تک بھی جاتی ہیں ۔ خبررسانی کے لیے ریڈیو سیٹ ہیں ۔ بھاگ میں سول ہسپتال ہے اور مختلف مقامات پر ڈسپنسریاں ہیں ۔ سفری ڈسپنسریاں اور صحت کے دیہاتی مراکز بھی ہیں ۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی ذاتی توجہ کے باعث ترقیات جاری ہیں، سرداری نظام کی منسوخی سے استبداد کا خاتمہ ہو گیا ہے] ۔

مآخذ : (۱) *Census of India 1901 and 1911*، بلوچستان؛ (۲) *Imperial Gazetteer of India*، ۱۹۰۸، بذیل مادۂ کچھی؛ [(۳) *Encyclopaedia Britannica*، مطبوعۂ نیویارک ۱۹۷۴ء؛ (۴) *Baluchistan District Gazetteer Series*، ساراوان، کچھی و جھلاوان، بمبئی ۱۹۰۷ء؛ (۵) *Census of Pakistan*، جلد ۳، مغربی پاکستان مردم شماری ۱۹۶۱ء؛ (۶) میر احمد یار خاں بلوچ، خان اعظم : *Inside Baluchistan*، کراچی ۳، ۱۹۷۵ء؛ (۷) *Bench-Mark Survey, Kachhi and Harnai 'Development Areas, Quetta and Kalat Region* سلسلہ نمبر ۴، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۰ء؛ (۸) *District Census Report* قلات ۱۹۶۱ء ؛ نیز [رک بہ بلوچستان، سندھ]] .

(M. LONGWORTH DAMES و [ادارہ])

اِلْکُحل : اول تو ایک دھات، یعنی کبریت * آمیز سرمے ("stibnite") اور دوسرے کبریتی سیسے (lead sulphide) کا نام؛ ان دونوں کے لیے اِثْمِد کا لفظ بھی مستعمل ہے ۔ اِثْمِد یونانی لفظ στίκκι سے نکلا ہے اور J. Ruska کے بیان کے مطابق antimony اور bismuth کے الفاظ اِثْمِد سے مشتق ہیں ۔ فارسی میں الکحل کو اس جگہ کے نام پر جہاں سے یہ آتا ہے، سرمہ کہا جاتا ہے ۔ عربی میں اس کے مرادفات النحاس المُحَرَّق (جلا ہوا تانبا)، الاصفہانی، کُحل جِلاء، کُحل سلیمان، کُحل اسود، وغیرہ ہیں .

اگرچہ صاحب مَفَاتیح العُلُوم (طبع van Vloten، ص ۲۶۲) کُحل کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ اُسْرُب، یعنی سیسے کا جوہر ہے اور ارسطو کی *Petrology* (= حجریات) میں بھی یہ لکھا ہے کہ اثمد میں اسرب پایا جاتا ہے، لیکن بقول E. Seidel (*Mechithar*، عدد ۲۱۵، ص ۱۸۵) وہ اثمد جو کُحل کا مرادف ہے ہمیشہ سرمے کا مرکب (antimonite) ہوتا ہے ۔ اسی وجہ سے قدرتی طور پر التباسات پیدا ہو گئے ہیں ۔ M. Meyerhof کے بیان کے مطابق الکُحل خالص سرمہ (antimony) ہے .

حَمْدُ اللہ المُستوفی نے نُزْھَۃ القلوب (طبع Le Strange: سلسلۂ یادگارگب، ۲۳/۲: ۱۹۷) میں ان جگہوں کا ذکر کیا ہے جہاں الکُحل پایا جاتا ہے، یعنی اصفہان میں، دماوند پر اور اندلس میں ۔ کہا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

جاتا ہے کہ اندلس میں ہر مہینے کے دوسرے ہفتے میں اس دھات کی خاص طور پر فراوانی ہوتی ہے۔ اب بھی ایران اور اندلس میں کحل یا کبریت آمیز سرمہ پایا جاتا ہے۔ ایران میں کچھ پہاڑ ہیں جنھیں کوہ سرمہ کہا جاتا ہے؛ چنانچہ القزوینی بَسْطَہ کے قریب ایک جَبَلُ الکحل کا ذکر کرتا ہے (متن، ص ۱۷۱)۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سرمے کو کوٹ کر سیسے کی نسبت زیادہ باریک سفوف بنایا جا سکتا ہے کیونکہ وہ سیسے کے مقابلے میں بہت زیادہ نرم دھات ہے۔ چونکہ کحل سے زیادہ تر سنگار کا کام لیا جاتا تھا، لہٰذا اس سے سنگار کی جو چیز بنی، وہ پہلے اسی نام سے موسوم ہوئی اور پھر اس سے آرائش کی سب چیزیں مراد لی جانے لگیں۔ چونکہ یہ نہایت باریک پیسا جاتا ہے، لہٰذا عام طور پر اسے بہت باریک سفوف کے معنوں میں بھی بولنے لگے۔

عورتیں الکحل کو دوسری اشیا سے ملا کر کوٹنے کے بعد اپنی آنکھوں کی زینت کے لیے، نیز ابرو، پلکوں اور پپوٹوں کے کناروں کو سیاہ کرنے کے لیے خاص طور پر استعمال کرتی ہیں۔ غالباً عربوں نے یہ رسم قدیم مصریوں سے لی ہوگی کیونکہ ان کی اشیاے زینت میں کبریت آمیز سرمہ اکثر پایا گیا ہے (X. Fischer: *Archiv für pharma kologie*، ۲۳۰ (۱۸۹۲ء):۹): لیکن مصریوں کی زینت کی اشیا عام طور پر پسے ہوے کحل الحجر (galena) سے بنائی جاتی ہیں، جس میں اور چیزیں بھی ملی ہوتی ہیں۔ (M. Meyerhof *Der Bazar der Drogen etc. in Kairo*، *Archiv für Wirtschafts for schung im orient* ۱۹۱۸ء، ۳/۴:۲۱) کے بیان کے مطابق کبریتی سرمہ یا سیسہ (جسے کحل کہتے ہیں) آنکھوں کو خوبصورت بنانے کے لیے بعینہٖ اسی طرح اب بھی قاہرہ میں بکتا ہے جس طرح قدیم زمانے میں بکتا تھا۔ بہترین سرمہ اب بھی ایران سے آتا ہے (الاصفہانی)۔ وہ سرمہ جسے حاجی لاتے ہیں، بہت مقبول ہے (المکّی اور الحجازی)۔ تہران میں بھی سرمہ سنگار کے طور پر مستعمل ہے۔ آرائش کی نقلی اشیا میں کحل الحجر اور اَنْزروت (isinglass) شامل ہوتے ہیں۔ کحل الحجر کے بجاے پنسل کا سرمہ (graphite)، کاجل (بالخصوص جو سستی قسم کے لوبان سے حاصل کیا جاتا ہے) اور قشر بادام سوختہ وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں۔

مذکورۂ بالا سیاہ مادوں کے علاوہ کچھ اور رنگ بھی کحل کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔ الموفق اپنے "اصول قرابا دین" میں ایک گہرے سیاہ اور ایک ہلکے سیاہ، ایک سیاہ بنفشی، ایک پیازی، ایک بالکل سفید اور ایک زرد رنگ کے کحل کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس طرح اسم صفت "کحلی" صرف سیاہ رنگ ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام گہرے رنگوں کے مثلاً گہرے نیلے، ارغوانی اور گہرے سرخ رنگوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

الکحل سرمے کے طور پر ایک چھوٹی سی سلائی (میل یا مِروند) سے لگایا جاتا ہے، جس کا سرا بعض اوقات گلاب سے تر کر لیتے ہیں۔ سرمہ ایک مُکْحُلہ (=سرمے دانی) میں رکھا جاتا ہے۔ لین Lane نے اس کی جو تصویر دی ہے وہ گلاب پاش (bear glass) سے مشابہ ہے۔ مُکْحُلہ دھوپ گھڑی اور اس مخروطی شکل کو بھی کہتے ہیں جس کا سر کٹا ہوا ہو (دیکھیے E. W. Lane: *Manners and Customs of the Modern Egyptions*، ص ۲۹ ببعد، ۳۰۴؛ E. Wiedemann و J. Würschmidt: *Über eine arabische Kegelförmige Sonnenuhr*، *Archiv. f. Gesch. der Naturwissensch. und Technik*، ۱۹۱۶ء، ۷: ۳۵۹)۔

www.besturdubooks.wordpress.com

الکحل کا استعمال آنکھوں کی دوا کے طور پر بکثرت ہوتا ہے۔ ابن البیطار اور دیگر مصنفین نے اس موضوع پر بالتفصیل لکھا ہے۔

الجوہری کی کتاب المختار فی کشف الاسرار کے باب "کشف اسرار الکحّالین" میں کئی نقلی کحلوں کا ذکر ملتا ہے؛ اس جگہ الکحل کا لفظ سرمے کے بجائے آنکھوں کی دوا کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

شعرا ان عورتوں کی خاص طور پر تعریف کرتے ہیں جن کی آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا ہو یا جو قدرتی طور پر سرمگیں ہوں اور انھیں سرمے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ E. von Lippmann نے اس سلسلے میں المتنبی، حافظ اور فردوسی کے اشعار نقل کیے ہیں۔

Paracelsus نے محض خودرائی سے کام لیتے ہوئے لفظ الکحل کو کوفتہ و بیختہ اور نہایت باریک اور لطیف سفوف کے معنوں میں، جو ہر شراب کے مفہوم میں استعمال کیا، غالباً اس لیے کہ شراب کا بہترین جزو ترکیبی الکحل ہے؛ چنانچہ بعد ازاں یہ نام شراب کے لیے بتدریج استعمال ہونے لگا۔

تقریباً تیرھویں صدی سے پہلے مسلمان روح شراب (= الکحل Alcohol) کو عمل تقطیر سے حاصل نہیں کرسکے تھے کیونکہ مناسب آلات کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان بخارات کو جو الکحل کے محلول سے خارج ہوتے تھے، منجمد نہیں کر سکتے تھے۔ الکحل سب سے پہلے غالباً بارھویں صدی میں مغربی یورپ میں بنائی گئی (دیکھیے E. von Lippmann کی تحقیقات، در *Beiträge zur Geschichte der Naturwissenschaften und der Technik*، برلن ۱۹۲۳ء، ص ۵۶ تا ۱۲۷)۔

زمانۂ مابعد (یعنی سولھویں صدی کے نصف آخر) میں مغل شہنشاہ اکبر کے زمانے سے "عرق" تیار کرنے کی تحریری تفصیل موجود ہے (ابوالفضل علامی: آئین اکبری، مترجمۂ H. Blochmann و J. Jarret، ۱۷۹۳ء، ۱: ۶۹؛ نیز دیکھیے E. Wiedemann، در *Beiträge zur Geschichte des Zuckers*، *Die deutsche Zuckerindustrie Aie*، ۱۹۱۲ء، ص ۳۰۳؛ E. von Lippmann: کتاب مذکور، ص ۱۲۴)۔

الکحل سے لفظ الکحّال بمعنی، معالج چشم، نکلا ہے۔ اس کے لیے M. Meyerhof کے متعدد مقالوں کے علاوہ دیکھیے J. Hirschberg کا اس موضوع پر مکمل اور جامع بیان، در *Geschichte der Augenheilkunde*، کتاب ثانی: *Gesch. d Augenheil Kunde im Mittelalter* جسے Graefen Saemisch: *Handbuch der allgemeinen Augenheil Kunde*، ج ۱۳، لائپزگ ۱۹۰۸ء، میں شامل کر دیا گیا ہے۔ J. Hirschberg کا خلاصہ یہ ہے:

عرب کحّالین نے جو کام انجام دیا، اس کی اہمیّت کے متعلق مختلف اندازے ہیں۔ ان کی تصانیف کے متعلق ناواقفیت کی وجہ سے اکثر حلقوں میں ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکا، لیکن بہت پہلے یعنی ۱۳۹۰ء ہی میں پیڈوا Padua کے پروفیسر A. Beneditti نے کہا تھا کہ "آج کل کے نہایت ذہین کحّال ایشیا، یعنی شام اور عراق عجم (Media) میں ہیں؛ دیگر ممالک میں، جن میں اٹلی بھی شامل ہے، ایسے نامور اہل کمال کی تعداد بہت ہی کم ہے"۔ پھر تاریخ معالجۂ چشم کا سب سے مستند عالم J. Hirschberg اسی سلسلے میں لکھتا ہے کہ عربوں کا نام امراض چشم کی ادویہ اور جراحی کی تحقیقات کی تاریخ سے کبھی محو نہ ہوگا (کتاب مذکور، ص ۲۴۳)۔

مآخذ: متن میں مذکور ہیں۔

(E. WIEDEMANN)

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

* **کَخْتا** : (یا کِیَخْتَہ Kiakhta یا کختہ؛ بعض اوقات الکختا)؛ ایک مقام، جو دریاے فرات کے ایک معاون کختا صُو کے کنارے مَلَطِیہ سے ۴۰ میل جنوب مشرق میں واقع ہے ۔ یہ ایک قائم مقام کی سکونت گاہ تھی اور اسی نام کی قضا کا، جو تین ناحیوں (گرگر، شیرو اور میردیس) پر مشتمل تھی، صدر مقام تھا ۔ اس کی کل آبادی چھیالیس ہزار کے لگ بھگ تھی (جس میں بقول Cuinet زیادہ تر کرد تھے اور ان کے علاوہ چار ہزار سے زیادہ ارمن تھے) ۔ کختا صوبۂ مَعْمُورۃ العزیز (خرپوت) کے لواے مَلَطِیہ میں شامل تھا ۔ آج کل کختا میں صرف چند سو جھونپڑیاں نظر آتی ہیں، جہاں ایک ہزار کے قریب باشندے آباد ہیں، جو تقریباً سب کے سب کرد ہیں ۔ ازمنۂ وسطیٰ میں یہ مقام اپنے انتہائی مستحکم قلعے کی وجہ سے بہت مشہور تھا، جو ایک بلند ڈھلواں چٹان پر بنا ہوا تھا ۔ یہ قلعۂ سُمیساط سے ملطیہ جانے والی مشرقی سڑک کی نگہبانی کرتا تھا اور بلاد اسلامیہ کے سرحدی قلعوں (ثُغُور) میں سے تھا ۔ عصر حاضر میں اس نے پھر نئے سرے سے شہرت حاصل کی ہے کیونکہ یہاں نمرود طاغ کے قریب ہی Commagene کے Antiochus اوّل کے آثار برآمد ہوے ہیں، جن کا تعلق پہلی صدی ق ۔ م سے ہے ۔ سب سے پہلے اس کا نام ہمیں صلیبی محاربات کے مشرقی مؤرخین کے بیان میں ملتا ہے ۔ Michael Syrus کے ہاں اسے گختہ لکھا ہے ۔ [ابن العبری : مختصر الدول، بیروت ۱۹۵۸ء، ص ۲۵۰، حاشیہ، میں کاختا درج ہے، متن کے 'کاختین' کا واحد] ۔ اس کے قدیم اور بوزنطی نام معلوم نہیں ہو سکے، لیکن کختا میں ۲۰۰ء کے قریب، Septimius Severus کے عہد میں، بولام صُو پر جو پل بنایا گیا تھا اس سے اور قلعے میں بوزنطی عمارات کے بچے کھچے آثار سے یہ پتا چلتا ہے کہ عہد قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ کے ابتدائی ایام میں بھی یہ مقام ایک اہم سرحدی مستقر تھا ۔ Ainsworth کا یہ مفروضہ قابل قبول نہیں کہ کختا وہی پرانا شہر Claudias ہے جسے عرب قَلُوْذِیَہ (رک بآں) کہتے تھے ۔

۱۹ اگست ۱۰۷۱ء کو مَلَا زجِرْد کی لڑائی ہوئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ سرحدی اضلاع ہمیشہ کے لیے بوزنطی سلطنت سے نکل گئے اور ملطیہ کے دانشمند اوغلو، روم کے سلجوق اور خرپوت کے ارتقی فرمانرواؤں (جو کختا پر قابض ہونے کے لیے باہم دست و گریبان تھے) اور صلیبیوں (جو اَلرُّھا اور مَرْعَش کے حکمران تھے) کے درمیان گوے بازی بن کر رہ گئے ۔ اسی زمانے میں ارمنوں نے، جو گیارھویں صدی کے نصف آخر تک کافی تعداد میں ان علاقوں میں نقل مکانی کر آئے تھے، مَلَطِیہ، حِصْن مَنْصُور، گرگر اور کختا جیسے مستحکم مقامات میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا (Michael Syrus، طبع Chabot، ۳ : ۱۵۸ ببعد، ۱۹۸، ۲۰۵ ببعد) اور قرب و جوار کے مسلمان فرمانرواؤں کے مقابلے میں ڈٹے رہے ۔ کختا کے قلعے کا ایک کتبہ، جو ۵۲۵ھ/۱۱۳۰-۱۱۳۱ء میں لکھا گیا تھا، اسی زمانے کا ہے ۔ اس میں ایک شخص ملک المنصور کا ذکر ہے کہ اس نے دفاعی مورچوں کو دوبارہ بنوایا تھا (O. Hamdy Bey : *Le Tumulus de Nemroud Dagh*، ص ۲ ببعد)؛ [لیکن Cl. Cahen نے اس کی تردید کرتے ہوے بتایا ہے کہ یہ کتبہ دراصل ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء کا ہے (*Journal Asiatique*، لائیڈن، بار دوم، ۴ : ۳۶۴)] ۔

مرعش کا فرمانروا (Count) بالڈوِن Baldwin اور اس کا جانشین رینالڈ Reinaud یکے بعد دیگرے تھوڑے ہی عرصے میں نورالدّین سے برسرپیکار ہو کر جان گنوا بیٹھے تو اَلرُّھا کے جنگجو حکمران

www.besturdubooks.wordpress.com

جوسلین Joscelin نے ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا، جن میں گرگر اور کختا بھی شامل تھے۔ مئی ۱۱۵۰ء میں وہ بھی نورالدین کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور کختا اور اس کے قرب و جوار کے قلعے، مثلاً گرگر، حصن منصور، وغیرہ خرپوت کے قرا ارسلان کے ہاتھ لگے۔ کختا کے آخری ارمن فرمانروا کرکور (Krikor) کو فاتح نے ایک اور ضلع عطا کر دیا (Michael Syrus، ۳ : ۲۹۴ ببعد؛ Chalaudan : *Les Comnène*، ۲ : ۴۲۱، ۴۲۳)۔ اس طرح ان علاقوں میں عیسائی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

۲۵۔ اکتوبر ۱۱۷۷ء کو سلطان قِلِیْج اَرْسَلان نے ملطیہ فتح کیا اور آخری دانشمند اوغلو حکمران کو نکال باہر کیا، جو خرپوت کی جانب بھاگ گیا (Michael Syrus، ۳ : ۲۷۳)؛ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک سرحدی قلعوں، مثلاً حصن منصور، کختا، وغیرہ پر سلاجقہ کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔

۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء میں علاء الدین کیقباد [رک بہ کیقباد اوّل] اور آمد اور ماردین کے اُرتقی فرمانروا مسعود سے لڑائی چھڑ گئی۔ اسی سال شوّال کے مہینے میں مسعود اور اس کے حلیفوں نے کختا کے مقام پر شکست فاش کھائی اور یہ قلعہ، جو اب تک مسعود کے زیرنگیں تھا، فاتح کے ہاتھ آ گیا (ابن الاثیر : طبع Tornberg، ۱۲ : ۳۰۰؛ ابوالفداء : تاریخ، مطبوعۂ قسطنطنیہ، ۳ : ۱۴۴؛ Houtsma : *Recueil etc.*، ۳ : ۲۸۰ و ۴ : ۱۱۸ ببعد)۔ اس کے بعد یہ سلاجقۂ روم کے قبضے میں رہا حتّٰی کہ اس زمانے میں بھی جب، وہ ایلخانیوں کے باجگزار بن چکے تھے۔ بابا رسول اللہ کی بغاوت (۶۳۸ھ/۱۲۴۰-۱۲۴۱ء) کے دوران میں اس جنونی شخص کے مریدوں نے کختا اور اس کے گردو نواح کے علاقے کو خوب لوٹا (Bar Hebraeus : *Ketābā de Makt'bānūt Zabnè*، طبع Bedjan، ص ۴۷۳؛ *Chronik*، طبع Bruns و Kirsch، ۲ : ۵۱۷ = تاریخ مختصر الدول، طبع صالحانی، بیروت ۱۸۹۰ء، ص ۴۳۹)۔ اس سے چند سال قبل روم سے نکالے ہوئے خوارزمی یہاں تاخت و تاراج کر چکے تھے (Bar Hebraeus : تاریخ وغیرہ، ص ۴۳۷ ببعد)؛ بعد ازاں کیکاؤس دوم کے عہد میں وقتاً فوقتاً جلا وطنی کی سزا پانے والوں کو یہاں بھیجا جاتا رہا (Houtsma : *Recueil*، وغیرہ، ۴ : ۲۵۹، ۲۶۲)۔ علاوہ ازیں اس کا ذکر اور سلسلوں میں بھی ملتا ہے (Bar-Hebraeus : کتاب مذکور، ص ۴۹۹، س ۱۴ = تاریخ وغیرہ، ص ۴۶۷ ببعد، بذیل ۱۲۵۷ء)۔ بقول منجم باشی (تاریخ، ۳ : ۲۷۱) قونیہ کے آخری علاء الدین نے عثمان کے ایک بیٹے اور ارطغرل کے پوتے کو کختا کے قریب پیْغی اِلی میں ایک جاگیر عطا کی تھی اور اِرتِنَہ، جو ایشیائے کوچک میں ایلخانیوں کے عامل کی حیثیت سے (۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء تا ۷۵۳ھ/۱۳۵۲ء) اپنی خود مختاری کا اعلان کر چکا تھا، ملطیہ کے علاقے پر حکومت کرتا تھا (ارتنہ کے بارے میں دیکھیے M. Von Berchem و Halil Edhem : *Matériaux pour un Corpus Inscr. Arabicarum*، قاہرہ ۱۹۱۰ء، ص ۴۱ ببعد)۔ مغول کے خلاف مصر کے مملوک سلاطین کی مہمات کے دوران میں کختا کا ذکر بار بار آتا ہے (المقریزی : السلوک لمعرفۃ دول الملوک؛ فرانسیسی، ترجمہ از Quatrèmere : *Hist. des Sultans Mamelouks*، ۱/۲ : ۶۱)۔

۶۸۲ھ/۱۲۸۳-۱۲۸۴ء میں حلب کے مصری عامل قَراسُنْقُر نے شہر پر قبضہ کر لیا اور یہاں از سر نو بڑی مستحکم مورچہ بندی کی (المقریزی : کتاب مذکور؛ ابوالفداء : تاریخ، ۴ : ۱۸)۔ یہی وجہ ہے کہ یکم ربیع الآخر ۶۸۴ء کو آرمینیای کوچک کے بادشاہ لیون Leon سے معاہدے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا کہ یہ سلطان قلاوون کے علاقے میں شامل ہے (المقریزی: کتاب مذکور، ۲/۱: ۱۶۸)؛ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ چند دوسرے مقامات کے ساتھ کختا عارضی طور پر اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۷۱۵ھ/۱۳۱۵-۱۳۱۶ء میں مغول کے خلاف مصری مہم کے سلسلے میں، جس کے دوران میں مملوکوں نے ملطیہ فتح کرکے اسے تباہ و برباد کیا، کہا جاتا ہے کہ قَلْعَۃُ الرُّوم، بہسنا، کختا اور گرگر کے باشندے مسلمانوں کے علاقے میں دھاوے مارا کرتے تھے (ابوالفداء: کتاب مذکور، ۴: ۷۷)۔ آگے چل کر یہ علاقہ ترکوں کی پہلی فتح کے زمانے تک ضرور مرعش کے ذوالقدر اوغلو کے ماتحت رہا ہوگا، جو مملوک سلاطین کے باجگزار تھے۔ جب بایزید اوّل نے ۸۰۱ھ/۱۳۹۷-۱۳۹۸ء میں (مصری ماخذ کی رو سے ۸۰۰ھ میں، دیکھیے Weil: *Gesch. der Chalifen*، ۵: ۷۰، ۷۴؛ نشری، در *Zeitschr.d. Deutsch.Morgenl.Gesellsch.*، ۱۵: ۴۵۲؛ قدیم عثمانی وقائع نگاروں کی رو سے ۷۹۸ھ میں دیکھیے Leunclavius: *Histor. Musulm*، عمود ۳۳۷ س ۲۴ ببعد، ۳۳۸، س ۱۷ ببعد و طبع Giese، ص ۳۴ ببعد؛ نیز عاشق پاشا زادہ: تاریخ، ص ۴۷) مصر کے خلاف جنگ و جدل کا آغاز کیا تو اس نے سب سے پہلے ملطیہ پر قبضہ کرکے وہاں سے ترکمانوں، یعنی ذوالقدر اوغلو کو، جو اب تک وہاں حکومت کر رہا تھا، نکال دیا۔ ۸۰۳ھ/۱۴۰۰-۱۴۰۱ء کے ابتدائی مہینوں میں امیر تیمور نے شام پر لشکر کشی کے دوران میں ملطیہ اور گرد کا سارا علاقہ کختا تک فتح کر لیا، بایزید کی متعینہ فوج کو نکال باہر کیا اور "ترکمان" قرہ عثمان کو یہاں مامور کر دیا (شرف الدّین علی یزدی: ظفر نامہ، مطبوعۂ کلکتہ، ۲: ۲۷۱ ببعد، ۲۷۸؛ Weil: کتاب مذکور، ۵: ۸۲)۔ تیمور کی واپسی کے بعد مملوک سلاطین پھر اس علاقے میں داخل ہوگئے اور برابر اس پر قابض رہے تاآنکہ سلطان سلیم اوّل نے ان کا سارا اقتدار ملیا میٹ کر دیا۔ اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ انھوں نے ۸۲۰ھ/۱۴۱۷-۱۴۱۸ء میں کختا فتح کیا (المقریزی: کتاب مذکور، ۲/۱: ۶۱ حاشیہ؛ Weil، ص ۱۳۹)۔ ابن ایاس: بدائع الظہور، قاہرہ ۱۳۱۱ھ، ۲: ۱۴۱، میں لکھا ہے کہ ۸۷۷ھ/۱۴۷۲-۱۴۷۳ء میں اوزون حسن نے یہ قلعہ تسخیر کیا۔ حلب کے بارے میں اپنے فتح نامہ (آخر ماہ رجب ۹۲۲ھ) میں سلیم اوّل خاص طور پر گرگر اور کختا کی فتح کا ذکر کرتا ہے۔ ترکوں کی حکومت میں سرحدی قلعے کی حیثیت سے کختا کی وہ اہمیت نہ رہی جو اسے ازمنۂ وسطیٰ میں حاصل تھی اور جس کا تذکرہ ابوالفداء (تقویم، طبع Reinaud، ص ۲۶۲ ببعد) اور الدمشقی (طبع Mehren، ص ۲۰۶) خاص طور پر کرتے ہیں۔ جلال زادہ نے (سولھویں صدی کے وسط میں) سلطنت عثمانیہ کا ذکر کرتے ہوئے گرگر اور کختا کے اضلاع کے بیان میں اس کے لیے ایک پورا باب مخصوص کیا ہے (von Hammer: *Des Osm. Reiches Staats-verf*، ۲: ۴۴۹)؛ اولیا کے یہاں بھی اس کا کہیں کہیں ذکر ملتا ہے (سیاحت نامہ، ۴: ۲۲)، لیکن سترھویں صدی کی بلند پایہ تصنیفات جغرافیہ (یعنی محمّد عاشق: مناظر العوالم ورق ۱۷۶، مخطوطۂ وی انا؛ کاتب چلبی: جہان نما، قسطنطینیہ ۱۱۴۵ھ، ص ۶۰۰ ببعد) سے پتا چلتا ہے کہ کختا کے بارے میں ان کی معلومات صرف ابوالفداء تک محدود ہیں، جس کے بیانات کا انھوں نے لفظ بلفظ ترجمہ کر دیا ہے۔ آناطولی کی قضاؤں میں کختا کو ساتویں درجے کی بیرونی چوکیوں میں رکھا گیا ہے (v. Hammer: *Gesch. d. Osm. Reiches*، ۹: ۸، شمارہ ۴۷۰)۔ گزشتہ تین صدیوں میں ان دُور افتادہ اور ناقابل گزر اضلاع

www.besturdubooks.wordpress.com

میں کرد آباد ہوگئے ہیں۔ کاتب چلبی (کتاب مذکور) ان کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ رھزن ڈاکوؤں کی ایک باغی، شورش پسند اور ناکارہ جماعت ہے۔ وہ صرف اپنے سرداروں (بای بیگلری) کے اطاعت گزار ہیں اور جن علاقوں میں وہ آباد تھے وھاں باب عالی کا اقتدار قائم رکھنے کے لیے گزشتہ صدی میں بار بار فوجی مہمیں بھیجنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ ان لڑائیوں میں کختا کے قلعے نے بھی حصہ لیا کیونکہ ایک کُرد بے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں حصار بند ہوکر بیٹھ رہا تھا۔ ۱۸۳۸ء میں ترکی دستوں نے اس پر یلغار کی اور اسی واقعے نے Ainsworth اور v. Moltke کی روئدادوں کے ذریعے اسے سارے یورپ میں مشہور کر دیا (دیکھیے C. Ritter : *Erdkunde*، ۱۰: ۸۷۰، ۸۷۴، ۸۸۳ ببعد)۔ ابھی قلعے کے آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام باقی ہے۔ ۱۸۸۳ء کی ترکی مہم کے بارے میں حمدی بے کی تصنیف کے اندر مختصر سا ذکر ملتا ہے۔ اس نے اسلامی کتبات کی جانب خاص طور پر توجہ کی ہے (یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں)۔ خرپوت کے سالنامے میں اس کے بیانات بالتفصیل بطور تتمہ درج کیے گئے ہیں۔ عظیم الشان آھنی دروازہ، جس کا ذکر ۱۲۳۶ء میں سلجوقوں کی فتح کے سلسلے میں بھی ملتا ہے، ۱۸۸۲ء میں قلعۂ گرگر کے دروازے کے ساتھ دیاربکر میں لایا گیا [مزید معلومات کے لیے دیکھیے (۱)، لائیڈن، بار دوم، بذیل مادّہ]۔

مآخذ: (مندرجۂ ذیل کا ذکر اوپر نہیں آیا):

(۱) W. F. Ainsworth : *Travels and Researches in Asia Minor, Mesopotamia*، لنڈن ۱۸۴۲ء، ۱: ۲۵۶ ببعد؛ (۲) O. Hamdy Bey و Osgan Efendi : *Le Tumulus de Nemroud-Dagh*، قسطنطنیہ ۱۸۸۳ء، مع فوٹو گراف؛ (۳) Humann و Puchstein : *Reisen in Kleinasien und Nordsyrien*، برلن ۱۸۹۰ء، مع تصاویر؛ (۴) Vincent W. Yorke : *Geographical Journal*، ج ۸ (۱۸۹۶ء)؛ (۵) سالنامہ، ولایت معمورۃ العزیز، بابت ۱۳۰۵ھ؛ (۶) Cuinet : *La Turquie d' Asie*، ۲: ۳۷۹ ببعد؛ (۷) F. Chalandon : *Les Comnène*، ج ۲، پیرس ۱۹۱۲ء، بمواضع کثیرہ: (۸) J. Laurent : *Byzance et les Turcs Seldjoucides dans l' Asie Occidentale Jusqu'en 1081*، پیرس - نینسی ۱۹۱۳ء، بمواضع کثیرہ؛ [(۹) ابن الأثیر، ۱۲: ۴۵۸؛ (۱۰) ابن بی بی، مترجمۂ H. Duda، ص ۱۲۲ ببعد، ۲۴۸ ببعد؛ (۱۱) ابن تغری بردی، مترجمۂ Popper، ۶: ۳۶۷ ببعد، ۵۹۴؛ (۱۲) ابن ایاس، مترجمۂ Wiet، ۱: ۲۶۷؛ (۱۳) اولیا چلبی، ۴: ۲۲].

(J. H. MORDTMANN)

(۲) ایک شہر جو ماورائے بیکال (Trans-baikalia) کے علاقے میں، ۳۰ درجے ۱۹ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۱۰۶ درجے ۴۰ دقیقے طول بلد جنوبی پر سطح سمندر، سے ۲۵۵۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ ایک پچاس گز چوڑا آزاد غیر جانبدار علاقہ کختا کو میمچن (Dai Oergö) سے جدا کرتا ہے اور تقریباً ساڑھے تین ورسٹ (verst) لمبی اس ضلع کی واحد شاھراہ اسے Trioskosawsk سے ملاتی ہے۔ کختا ندی (مغولی: ککتو گورخون) کے کنارے اور پہاڑوں (بَرگُلتی Burgultei = کوہ عقاب) سے گھرا ہوا شہر کختا ایک روسی سرحدی چوکی سے ظہور میں آیا ہے، جو کختا ندی کے جنوب میں رورو (Roro) ندی پر واقع تھی۔ یہ ندی سرحد کا کام دیتی ہے اور اسے اس وجہ سے شہرت نصیب ہوئی کہ یہاں ۱۰ اگست ۱۷۲۷ء کو معاھدۂ کختا پر دستخط ہوے تھے۔ چینیوں نے روس اور چین کے درمیان تجارت کے لیے اس جگہ کو مرکز بنایا اور چینیوں نے یہاں میمچن (تجارتی سرحد) اور روسیوں نے کختا کی سرحدی چوکی قائم کی۔ اس

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

زمانے سے کختا منگولیا اور چین میں علوم، سیاست، تجارت (چاے کی تجارت) اور باهمی راہ و رسم کے داخل ہونے اور ان ممالک کے بارے میں تحقیق و تفتیش کرنے کے لیے ایک "غلام گردش" کا کام دیتا ہے۔ مضبوط کٹہروں کے ذریعے محفوظ کیا ہوا یہ مقام آج تک سوداگروں کی ایک چھوٹی سی اپنی مملکت ہے، جس کے اندر اپنا ٹیکس (چاے کا ٹیکس) ہے، اپنے رسم و رواج ہیں اور اپنا نظام حکومت ہے، اپنے ممتاز نمائندوں کی مشاورتی مجلس ہے، آگ بجھانے کا انجن ہے اور گرجا ہے۔ پتھر کے بنے ہوے مکانوں کے علاوہ کختا میں چوبی عمارتیں اور بڑی بڑی تجارتی عمارات ہیں، جن میں قافلوں کے لیے وسیع صحن بنے ہوے ہیں، لیکن دکان کوئی نہیں ہے۔ روس کے ساتھ تھوک تجارت کے علاوہ مغولوں اور چینیوں کے درمیان چھوٹی تجارت بھی ہوتی ہے۔ ۱۷۲۷ء سے دسمبر کا مشہور میلا ہر سال کختا میں منعقد ہوتا ہے۔ قافلے کی چاے کے نام سے جو چاے مشہور ہے اس کا سب سے بڑا گودام اور اس کی برآمد کا مرکز کختا ہے۔ ایک زمانے میں یہاں سے ریوند چینی کی ناجائز طریقے سے روس میں درآمد ہوتی تھی۔ آج کل چین میں سونا چوری چھپے لے جایا جاتا ہے۔ معاهدۂ پیکن (۱۸۹۸ء) ہو جانے اور سائبیریا کی مشہور ریل کے چلنے کی وجہ سے چاے، ریشم اور سوتی سامان کی درآمد کافی گھٹ گئی ہے، البتہ کپڑے سمور اور چمڑے کی تجارت نسبتہً زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں ایک صحرائی ڈاک خانہ اور تار گھر قائم ہے اور اُرگہ (Urga) کے راستے پیکن کو خطوط اور تار بھیجے جا سکتے ہیں۔

مآخذ: (۱) *Meng-Ku-Yu Mu-Ki*، مترجمۂ P. S. Popow، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۵ء، ص ۶۸، ۳۳۶، ۳۵۳ تا ۳۵۵، ۳۵۹؛ (۲) Pallas: *Reise d. verschiedene Provinzen d. Russ.' Reichs*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۷۷۲-۱۷۷۳ء، ۳: ۱۰۹ تا ۱۱۲؛ (۳) Ritter: *Asien*، برلن ۱۸۳۲ء، حصہ ۲/کتاب ۲: ۱۰۲ تا ۱۱۱ (قدیم سفر ناموں کی تفصیل)، ۱۲۰؛ (۴) Jakynth: *Zapiski o Mongolii*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۲۸ء، ص ۱۲۳ تا ۱۲۵؛ (۵) Timkowski: *Reise n. China*، لائپزگ ۱۸۲۵ء، ۱: ۱۹ تا ۲۰ و ۳: ۱۴۳؛ (۶) *Inscription de l' Expèdition Finnoise 1890*: *Orkhon*، هلسنگفورس ۱۸۹۲ء، ص iii؛ (۷) W. Obrutschew: *Aus China*، لائپزگ ۱۸۹۶ء، ص ۱۲ تا ۱۷؛ (۸) Wenyukow: *Die russ.-asiat. Grenz-lande*، لائپزگ ۱۸۷۴ء، ص ۱۸۰ ببعد، ۲۰۰ ببعد، ۲۱۰؛ (۹) Wilda: *Von Hongkong nach Moskau*، Altenburg ۱۹۰۲ء، ص ۲۸۶ تا ۲۹۶؛ (۱۰) Consten: *Weideplätze d. Mongolen*، برلن ۱۹۱۹-۱۹۲۰ء؛ (۱۱) Perry: *With the Russians in Mongolia*، لنڈن ۱۹۱۳ء، بمدد اشاریہ، ص ۳۳۵؛ (۱۲) Prschewalski: *Mongolia i strana Tangutow*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۵ء، ۱: ۱ تا ۵؛ (۱۳) وهی مصنف: *Reisen in der Mongolei*، Jena ۱۸۷۷ء، ص ۱ تا ۶، xxx؛ (۱۴) وهی مصنف: *Ot K'iachty na istok' rieki*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۸ء، ص ۷۰ تا ۷۳؛ (۱۵) Bogolepow: *Očerki Russko-Mongolskoi Torgowli*، Tomsk ۱۹۱۰ء، ص ۱۱۵؛ (۱۶) وهی مصنف: *Moskowskaya Torgowaya ekspediciya w Mongoliyu*، ماسکو ۱۹۱۲ء؛ (۱۷) H. P. Lw'ecnikow: *Russkiye w Mongolii*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۲ء، ص ۱۸، ۳۲، ۳۳، ۴۵ تا ۵۰؛ (۱۸) J. Maiski: *Sororennaya Mongoliya*، Irkutsk ۱۹۲۳ء، ص ۱۹۹ تا ۲۰۶؛ (۱۹) A. Palladiya: *Dorozhniya Zamyetki na puti po Mongolii 1847 i 1859*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۲ء، ص ۸۰

(H. CONSTEN)

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

* **کُدُمُّل** : ایک چھوٹا سا آتش فشانی جزیرہ، جو بحیرۂ قلزم میں ۱۷ درجے ۵۲ دقیقے عرض بلد شمالی پر واقع ہے ۔ انگریزی وزارت بحریہ کے نقشوں میں اس کا نام Kotumble کی شکل میں درج ہے ۔ اس جزیرے میں قسم قسم کے پھول پودے کثرت سے پائے جاتے ہیں، جن کا مطالعہ ماہر نباتات اہرن برگ Ehrenberg نے کیا ہے ۔ یہ جزیرہ اپنی لوہے کی کانوں کے لیے بھی قابل ذکر ہے، جن کا ذکر ابن المُجَاور (م ۶۳۰ھ) تک کے قدیم عہد میں بھی ملتا ہے ۔ کُدُمّل کا یہ سنگلاخ جزیرہ ساحل عرب پر حَمِدَہ کے قریب واقع ہے اور کسی زمانے میں سر زمین کنانۃ اور یمن کے مابین سرحد کی نشان دہی کرتا تھا ۔

مآخذ : (۱) الہَمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع D. H. Müller، لائیڈن ۱۸۸۴ تا ۱۸۹۱ء، ص ۵۱؛ (۲) C. Ritter : *Die Erdkunde von Asien*، برلن ۱۸۴۶ء، ۱/۸ : ۱۰۲۳؛ (۳) A. Sprenger : *Die Post-und Reiserouten des Orients*، در Abhandl. f. d. *Kunde des Morgenlandes*، لائپزگ ۱۸۶۴ء، ۳/۳ : ۱۳۳؛ (۴) وہی مصنف: *Die alte Geograph. Arabiens*، برن ۱۸۷۵ء، ص ۳۲؛ (۵) A. Grohmann : *Südarabien als Wirtschaftsgebiet*، ج ۱ : *Osten und Orient*، طبع R. Geyer و H. übersberger، Forschungen، I. Reihe، Bd. ۴، Wien ۱۹۲۲ء، ص ۱۶۸ .

(ADOLF GROHMANN)

* **کُر** : روسی میں کُرہ Kura، عرب جغرافیہ نویسوں کے ہاں قفقاز کا سب سے طویل دریا، جس کی لمبائی ۶۰۰ میل سے زیادہ اور بقول حَمْد اللہ القَزْوِینی (نُزْھَۃُ الْقُلُوب (سلسلۂ یادگار گب)، ۱ : ۲۱۸) ۲۰۰ فرسخ ہے ۔ الاصْطَخْری، (در *BGA*، ۱ : ۱۸۹) بیان کرتا ہے کہ یہاں کشتی رانی ہو سکتی ہے اور اس میں بکثرت مچھلیاں ہیں ۔ آج بھی اس دریا میں مِنگچَور Mingecaur (اَلْاَزَن Alazan کے دہانے سے ذرا نیچے) سے بحیرۂ خَزَر تک جدید دخانی جہاز چلانے کے لیے صرف تھوڑی سی کمی پوری کرنے کی حاجت ہوگی ۔ دریائے سیحُوں کو، جو قدیم زمانے میں ایک علٰحدہ دریا متصور ہوتا تھا اسلامی مآخذ میں ہمیشہ کُر کا معاون دکھایا گیا ہے ۔ بقول حَمْد اللہ القَزْوِینی (کتاب مذکور) اُن دنوں بحیرۂ خزر میں کُر کے دہانے کے علاوہ اس کی ایک شاخ باہر نکل کر بحیرۂ شَمَکُور میں جا گرتی تھی: یہ بیان (جو محض یہیں ملتا ہے) لازمی طور پر کسی غلط فہمی پر مبنی ہوگا ۔ حَمْد اللہ القزوینی کے ہاں ہمیں کسی ایسے بحیرے کا ذکر نہیں ملتا ۔ اس نے صرف ایک قصبہ شَمْکُور (روسی : شَمْخور) کا ذکر کیا ہے، جو گنجہ سے تفلس جانے والی سڑک سے دو فرسخ کے فاصلے پر واقع تھا (کتاب مذکور، ص ۱۸۱ ببعد) اور جو آج کی طرح اس کے زمانے میں بھی کھنڈر ہو چکا تھا ۔ کُر میں جہاز رانی سے سیاسی تاریخ میں صرف ایک ہی دفعہ کام لیا گیا، یعنی جب ۳۳۲ھ/۹۴۳-۹۴۴ء میں روسیوں نے بَرْذَعہ کے قصبے کو تباہ و برباد کیا تھا (رک بہ برذعہ؛ نیز دیکھیے (۱) D.S. Margoliouth : *The Russian Seizure of Bardha'a in 943 A.D.*، در *Bull. of the School of Oriental Studies*، ۱۹۱۸ء، ص ۸۲ ببعد؛ (۲) A. Yakubovskiy : *Ibn Miska-veikh o pokhode Rusov v Berdaa v 332g. = 943/4g*، یعنی *Vremennik*، ۱۹۲۳-۱۹۲۶ء، ۲۴ : ۶۳ ببعد).

مآخذ : (۱) G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۱۷۹؛ (۲) E. Weidenbaum : *Putevoditel' po Kavkazu*، تفلس ۱۸۸۸ء، ص ۱۳ ببعد؛

(W. BARTHOLD)

* **الکَرَبِیسی** : یعنی بزّاز؛ متعدد عرب مصنفین کی نسبت جن کے نام یہ ہیں : (۱) ریاضی دان

www.besturdubooks.wordpress.com

احمد بن عمر، جس کی تاریخ وفات معلوم نہیں اور جس کی تصنیفات میں اقلیدس کے ترجمے کی ایک شرح خاص طور پر مشہور ہے (دیکھیے الفہرست، ص ۲۶۵ س ۲۵، ص ۲۸۲ س ۳؛ ابن القفطی: تاریخ الحکماء، قاہرہ ۱۳۲۶ھ، ص ۵۷ س ۵).

اس کی صرف ایک تصنیف ہم تک پہنچی ہے، یعنی کتاب مساحۃ الحلق (آکسفرڈ و قاہرہ میں مخطوطات، دیکھیے Bibl. Bodl. Codd. Mss. Or.، ج ۱، عدد ۹۱۳؛ اور فہرسۃ الکتب العربیۃ فی کتبخانۃ الخدیویۃ، ۵ : ۲۰۴).

(۲) محدث اور فقیہ ابو علی الحسین بن علی بن یزید المُہَلَّبی، جس کا شروع میں اہل الرّائے سے تعلق تھا، لیکن جب امام شافعیؒ بغداد میں آئے تو ان سے وابستہ ہوگیا - بایں ہمہ وہ عقیدۂ جبر کا پورا حامی بھی رہا - رجال حدیث اور فقہ کی تنقید پر اس کی تصانیف میں سے کوئی چیز باقی نہیں بچی - اس نے ۲۴۵ھ/۸۵۹ء میں اور بعض کے نزدیک ۲۴۸ھ/۸۶۲ء میں وفات پائی.

مآخذ: (۱) [ابن ندیم]: الفہرست، طبع فلوگل، ص ۱۸۱ س ۴؛ (۲) السمعانی: الانساب، طبع عکسی از Margoliouth، سلسلۂ یادگار گب، جلد ۲۰، ۱۹۱۲ء، ورق ۴۷۶ ب؛ (۳) ابن خلّکان، طبع Wüstenfeld، عدد ۱۸۰ و قاہرہ ۱۲۹۹ھ، ۱ : ۱۸۱؛ (۴) الشّہرستانی: الملل، طبع Cureton، ص ۹۶؛ (۵) النّووی: تہذیب، طبع Wüstenfeld، ص ۴۷۷؛ (۶) السّبکی: طبقات، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۱ : ۲۵۱ تا ۲۵۶؛ (۷) ابن الأثیر: الکامل، قاہرہ ۱۳۰۳ھ، ۷: ۲۹؛ (۸) ابوالفداء: تاریخ، قسطنطنیہ ۱۲۸۷ھ، ۲: ۴۳۹ و طبع Reiske-Adler، ۲ : ۲۰۴؛ (۹) ابن تَغْری بُردی، طبع Juynboll، ۱ : ۷۵۳، ۷۶۳.

(۳) حنفی فقیہ اَسْعَد بن محمّد (م ۵۷۰ھ/۱۱۷۴ء)؛ اس کی کتاب الفُروق فی الفروع کا، جسے حاجی خلیفۃ (کَشْف الظّنون، طبع فلوگل، ۴ : ۴۱۹، عدد ۹۰۴۱) نے المحبوبی کی تَلْقِیح العُقول (براکلمان، ۱ : ۳۸۰، عدد ۳۴) سے ملتبس کر دیا ہے، ایک نسخہ قاہرہ میں محفوظ ہے - (دیکھیے فہرسۃ الکتب العربیۃ فی الکتب خانۃ الخدیویۃ، ۳ : ۹۶).

(C. BROCKELMANN)

کراچی: [پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور ⊗ بہترین بندرگاہ، جو دریاے سندھ کے ڈیلٹا کے عین شمال مغرب میں بحیرۂ عرب کے کنارے ۲۴ درجے ۵۱ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۶۷ درجے ۴ دقیقے طول بلد مشرق پر واقع ہے - یہ صوبۂ سندھ کے اسی نام کے ضلع اور قسمت کا صدر مقام اور ملک کا تجارتی و صنعتی مرکز اور بین الاقوامی فضائی مستقر ہے - خاص شہر کا رقبہ ۲۲۸ مربع میل اور عظیم کراچی کا رقبہ ۵۶۰ مربع میل ہوگا - ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے اس کی آبادی ۱۰۶۸۴۵۹ تھی، جو ۱۹۶۱ء میں بڑھ کر ۱۹۱۳۵۹۸ ہوگئی - اب یہ تیس لاکھ سے متجاوز ہوچکی ہے].

کراچی کے نام کا تعلق زیادہ قدیم زمانے سے نہیں ہے - شہر کے لوگوں میں یہ روایت مشہور ہے کہ کوئی دو سو برس ہوے یہ صرف ماہی گیروں کی ایک بستی تھی، جہاں کُلاچی نامی ایک عورت حکمران تھی اور یہ بستی اسی کے نام سے موسوم تھی - یہ نام بعد میں "کراچی" کی صورت میں بدل گیا؛ لیکن دراصل نام کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہاں بلوچوں کا ایک قبیلہ، جسے کُلاچی کہتے تھے، آباد ہوگیا تھا - یہ لوگ اصل میں راجپوت تھے، (دیکھیے Glossary of Punjab Castes، لاہور ۱۹۱۱ء)؛ صوبۂ سرحد کے ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ایک قصبے کُلاچی کی وجہ تسمیہ بھی غالباً یہی ہے - سندھی زبان کے عام دستور کے مطابق کُلاچی کا لام، رے میں تبدیل ہو کر "کراچی" بن گیا (دیکھیے پنجابی: کوٹلی، اور سندھی: کوٹری).

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

تاریخی پس منظر : [ایک عام روایت یہ بھی ہے کہ کراچی وہی مقام ہے جو محمّد بن قاسم کی آمد کے وقت دیبل کے نام سے مشہور تھا ۔ دیبل کے معنی ہیں مندر اور یہ شہر اس مندر کے باعث دیبل کہلاتا تھا جو آج بھی منوڑا میں واقع ہے ۔ سیٹھ ناؤ مل ہوت چند کا بیان ہے کہ کراچی سے ۱۶ میل مغرب میں دریائے ہب کے دوسرے کنارے پر ایک بندرگاہ کھڑک بندر واقع تھی، جہاں اٹھارھویں صدی کے اوائل میں سیٹھ ناؤ مل کے دادا سیٹھ بھوجو مل کا شمار بڑے تاجروں میں ہوتا تھا ۔ جب یہ بندرگاہ ریت سے اٹ جانے کے باعث ناکارہ ہوگئی تو سیٹھ بھوجو مل اور اس کے ساتھی نئی بندرگاہ کی تلاش میں نکلے اور ماہی گیروں کی اس بستی میں منتقل ہو گئے جو ان دنوں "کلاچی جو گوٹھ" کہلاتی تھی ۔ تاجروں کی آمد سے یہ بندرگاہ ترقی کرنے لگی اور جب ایک اور نواحی بندرگاہ شاہ بندر میں بھی کیچڑ آ گئی تو وہاں کے لوگ بھی یہاں چلے آئے اور اس مقام کی رونق میں اور بھی اضافہ ہو گیا ۔ مانک پتھو والا کو اس سے اختلاف ہے ۔ کیونکہ] کھڑک خلیج فارس میں ایک جزیرہ ہے، جس پر ولندیزی ۱۷۴۸ سے لے کر ۱۷۶۵ء تک قابض رہے اور یہ کسی طرح کراچی پر اثرانداز نہ ہو سکتا تھا ۔ رہا شاہ بندر، تو وہ تو سندھ ڈیلٹا کی مشرقی جانب سے اتنا دور ہے کہ اس کا کوئی اثر کراچی پر پڑ ہی نہیں سکتا ۔ اصلی سبب یہ تھا کہ دیول اور سندی (مشمولہ طور پر دیول سندی بھی مذکور ہے) کی دونوں بندرگاہیں، جو دریائے سندھ کے مغربی دہانے پر واقع تھیں آہستہ آہستہ بیکار ہو رہی تھیں ۔ یہ بندرگاہیں Thevenot (*Travels in India*، ۱۶۷۸ء) کے وقت میں بھی استعمال ہوا کرتی تھیں اور منوچی Manucci ۱۶۵۵ء میں ہندوستان جاتے وقت سندی میں بھی آیا تھا ۔ اٹھارھویں صدی میں خشکی کا حصہ بڑھ جانے کی وجہ سے ان بندرگاہوں کا تعلق سمندر سے منقطع ہوگیا، لیکن کراچی، جو ڈیلٹا سے کہیں باہر مغرب کی طرف واقع تھی، ریت اور گاد کی تیز تر بھرائی سے محفوظ تھی ۔ اس طرح جنوب مغربی سندھ کے بڑے شہر ٹھٹھہ کی جگہ بھی کراچی نے لے لی ۔

[۱۷۸۲ء میں بھوجومل کی موت کے وقت یہاں خاصی آبادی ہوچکی تھی ۔ کئی سال تک یہاں کا نظم و نسق بنیوں اور سیٹھوں کے ہاتھ میں رہا ۔ لیکن جلد ہی اس پر کلہوروں نے قبضہ کر لیا ۔ بعد ازاں خان قلات سے جنگ کے بعد کلہوروں نے اس کے بھائیوں کے قصاص کے طور پر کراچی کو خان قلات کے حوالے کر دیا ۔ کلہورہ خاندان کے زوال کے بعد امیر فتح علی خان تالپور نے اسے چھیننے کے لیے دوبارہ چڑھائی کی، مگر ناکام رہا، تاہم تیسری بار ۱۷۹۵-۱۷۹۷ء میں اس کا کراچی پر قبضہ ہوگیا ۔ ۱۷۹۷ء میں] اس نے بندرگاہ کی حفاظت کے لیے منوڑا کے مقام پر ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا ۔ اس وقت سے تجارتی کاروبار زیادہ بڑھ گیا ۔ ۱۸۰۸ء میں بوٹنجر نے یہاں کی سیاحت کی تو اس کی آبادی نو ہزار تھی اور اس کا شمار سندھ کے خوشحال شہروں میں ہوتا تھا ۔ ۱۸۳۱ء میں برنز (Burnes) کی تحقیقات کے مطابق یہاں کی آبادی پندرہ ہزار ہو چکی تھی ۔

۱۸۴۱ء میں سرچارلس نیپیئر نے یہاں آ کر لنگر ڈال دیے اور ۱۸۴۳ء میں سندھ کے الحاق [تفصیل کے لیے رک بہ سندھ] کے بعد وہ اس کی ترقی اور خوشحالی کی طرف متوجہ ہوا تاکہ اسے فوجی اور انتظامی مرکز کے علاوہ ایک اہم بندرگاہ بھی بنا دے، جو پنجاب اور سندھ کے تجارتی کاروبار کو ہاتھ میں لے سکے ۔

اپنی صحیح رائے اور پیش بینی کی بدولت وہ

www.besturdubooks.wordpress.com

اس ترقی کی بنیادیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا جو زمانۂ حال میں ہو رہی ہے۔ ۱۸۵۴ء میں سر بارٹل فریئر (Bartle Frere) نے نیپیئر مول (Mole = مصنوعی بندرگاہ) کی تعمیر سے، جو جزیرۂ کیماڑی کو برعظیم سے ملا دیتی ہے، اس بندرگاہ کی اصلاح اور درستی کی۔ ۱۸۶۹ تا ۱۸۷۳ء میں منوڑا کا بند تعمیر ہوا اور بندرگاہ کے رقبے کو رفتہ رفتہ محدود کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس رقبے کو زیادہ گہرا کرنے اور کارآمد بنانے کا کام بھی جاری رہا۔ ۱۸۸۳ء میں دریائے ملیر سے کافی مقدار میں پانی لایا گیا۔

جنرل ہیگ [دیکھیے ماخذ] نے لکھا ہے کہ کراچی وہی مقام ہے جو سکندر اعظم کے زمانے میں ہیون Haven کے نام سے مشہور ہوا اور جہاں نیارکس Nearchus دریائے سندھ کے مغربی دہانے کے مغرب کی جانب سفر کرتا ہوا پہنچا تھا۔ چونکہ اس مقام پر اصلی ڈیلٹے کی نسبت کچھ زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی اس لیے یہاں بعض موقعوں کی شناخت ممکن ہے۔ بیکتہ Bibakta کا ٹاپو غالباً وہی ہے جو آج کل منوڑا پائنٹ (Manora Point) ہے اور ایروس Eiros وہ سطح مرتفع ہے جو کیوورا Kiovra کی بندرگاہ کے مشرق میں ہے۔ Clifton کا مقام ہمیشہ ایک جائے پناہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہوگا۔ موجودہ زمانے میں اس مقام کی زبردست ترقی کی وجہ یہ ہے کہ یہ پاکستان کی واحد بندرگاہ ہے، جہاں سے پاکستان کے علاوہ افغانستان اور [کسی حد تک] ایران کا مال، یعنی گندم، کپاس، روغنی تخم، کھالیں اور کھیل کود کا سامان باہر کے ملکوں میں جاتا ہے۔

[کراچی کا موسم سال کے زیادہ تر حصے میں خوشگوار رہتا ہے]۔ یہاں نہ تو جنوب مغربی مون سون ہوائیں پہنچتی ہیں اور نہ جنوب مشرقی؛ اس لیے یہاں صرف دو موسم ہی ممکن ہیں۔ سردی کا موسم ماہ نومبر میں شروع ہوتا ہے اور ماہ مارچ میں ختم ہو جاتا ہے [کم سے کم درجۂ حرارت ۵۶ درجے فارن ہائیٹ/۱۳ درجے سینٹی گریڈ؛ بعض اوقات تیز سرد ہوائیں چلنے سے درجۂ حرارت ۴۰ درجے فارن ہائیٹ/۴ درجے سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہے]۔ موسم گرما اپریل سے لے کر اکتوبر تک رہتا ہے [زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت ۵۳ درجے فارن ہائیٹ/۳۴ درجے سینٹی گریڈ، جو بعض اوقات ۱۰۵ درجے فارن ہائیٹ/۴۱ درجے سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے]۔ برسات کا موسم زیادہ تر جون، جولائی اور اگست تک محدود رہتا ہے اور اس عرصے میں کوئی ۸ انچ کے قریب بارش ہو جاتی ہے۔ ہواؤں کی رفتار بھی مختلف ہے؛ ۲۵ میل فی گھنٹے سے زیادہ رفتار کی ہوائیں تو موسمی ہواؤں کے زمانے میں چلتی ہیں، لیکن عام طور پر موسم گرما میں مغربی اور جنوب مغربی ہوائیں چلتی ہیں اور موسم سرما میں شمال مشرقی اور شمال مغربی ہواؤں کا زور ہوتا ہے۔ دسمبر کا مہینا سب سے زیادہ خشک ہوتا ہے اس وقت درجۂ رطوبت صرف ۵۰ فیصد کے قریب ہوتا ہے؛ سب سے زیادہ مرطوب مہینا اگست کا ہوتا ہے، جب کہ کراچی میں درجۂ رطوبت ۸۴ فیصد کے قریب ہو جاتا ہے۔

زمانۂ حال کی ترقی اور توسیع: [قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) کے بعد کراچی ملک کا دارالحکومت مقرر ہوا تو یہ طے پایا] کہ کراچی کو زیادہ وسیع کیا جائے اور اسے ایک مرکزی شہر کی شکل میں تبدیل کر کے بیس ہزار ایکڑ کے رقبے میں پھیلا دیا جائے تاکہ اس علاقے میں ایک ایسا بڑا اور عظیم الشان شہر آباد ہو جائے جو اس سب سے بڑی اسلامی حکومت کے شایان شان ہو۔ اس شہر کو اپنی شان اور زندگی کی بالیدگی حاصل ہو چکی ہے۔ بندر روڈ کے دونوں طرف، جو کراچی کی سب سے زیادہ بارونق

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

اور اہم شارع عام ہے، ایک مستزاد حاشیے کی صورت میں نئی آبادیاں قائم ہوچکی ہیں۔ دوسری بڑی بڑی سڑکوں کے ذریعے ایک نو وارد کراچی کے ان مضافات اور قصبات تک پہنچ جاتا ہے جو زیر تعمیر عظیم کراچی کا جزو لاینفک بن رہے ہیں۔ [۱۹۵۹ء میں ملک کا دارالحکومت راولپنڈی۔ اسلام آباد میں منتقل کر دیا گیا اور کراچی محض صوبۂ سندھ کا صدر مقام رہ گیا۔ پھر صوبۂ سندھ کا صدر مقام بھی حیدرآباد قرار پایا۔ بایں ہمہ کراچی کی توسیع و ترقی کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی]۔

کراچی کی آبادی ۱۸۸۳ء میں دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی؛ ۱۹۴۱ء میں یہ تعداد پچھتر ہزار ہوگئی اور ۱۹۵۱ء میں گیارہ لاکھ [اور ۱۹۶۱ء میں انیس لاکھ] سے متجاوز ہوگئی۔ تقریباً ۹۵ فیصد مسلمانوں کی آبادی ہے۔ ان میں سے کم از کم تین چوتھائی آبادی [قیام پاکستان کے بعد بھارت یا ملک کے دوسرے صوبوں سے آنے والے مہاجرین یا نوواردوں کی ہے۔ جہاں تک دوسری قوموں کا تعلق ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے ان کی تعداد یہ ہے: ۱۰۴۹۷ ہندو، ۶۷۸۶ پسماندہ اقوام، ۳۵۱۶۵ عیسائی اور ۶۲۶۶ پارسی وغیرہ]۔ آبادی میں ان انقلاب آمیز اور اچانک تبدیلیوں کے باوجود کراچی کی وہی مخلوط شان اب تک باقی ہے۔ مختلف قوموں نے اس شہر کی ترقی اور بہبود میں برابر کا حصہ لیا ہے۔ [قیام پاکستان کے بعد] مسلمانوں نے ہر میدان میں ترقی کی ہے اور اس شہر میں انگریز آبادکاروں اور ہندوؤں کی جگہ لے کر صنعت و حرفت کو بھی کافی فروغ دیا ہے۔

[کراچی شہر کا نقشہ: کراچی ایک نہایت خوبصورت قدرتی بندرگاہ ہے، جو جزیرۂ منوڑا، جزیرۂ کیماڑی اور آئسٹر راکس Oyster Rocks کے باعث بحری طوفانوں اور حملوں سے محفوظ ہے۔ بندرگاہ کے ساتھ ساتھ ایک طویل ساحلی پٹی چلی گئی ہے۔ اس کے شمال اور مشرق میں سطح زمین بتدریج ۵ سے ۱۲۰ فٹ تک بلند ہوتی چلی گئی ہے اور اس وسیع میدان میں کراچی آباد ہے۔ شمال اور مشرق میں چند پہاڑیاں بھی ہیں، جن میں سے بلند ترین منگھو پیر (۵۸۵ فٹ) ہے۔ دو برساتی ندیاں، ملیر اور لیاری، علی الترتیب شہر کے مشرق اور شمالی حصے میں سے ہوکر گزرتی ہیں۔ کراچی کے نقشے میں خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ اس کی چار بڑی سڑکیں، یعنی لارنس روڈ، بندر روڈ، فریئر روڈ اور میکلوڈ روڈ، میری ویدر ٹاور Mereweather Tower سے شروع ہوکر ایک دوسرے کے متوازی غرباً شرقاً چلی گئی ہیں اور انہیں مختلف مقامات پر متعدد سڑکیں، مثلاً نیپئر روڈ، کچہری روڈ اور گارڈن روڈ، شمالاً جنوباً قطع کرتی ہیں۔ مرکزی شہر انہیں سڑکوں کے اردگرد آباد ہے۔ پرانا شہر بندر روڈ کے شمال میں بندرگاہ کے قریب واقع ہے اور تقریباً ایک میل تک بے قاعدہ طور پر پھیلتا چلا گیا ہے۔ اس کے مشرق میں ڈرگ چھاؤنی، سول لائن اور صدر بازار کے علاقے ہیں، جو یورپی طرز پر تعمیر ہوئے ہیں۔ ان سے آگے کئی سڑکیں نکل کر مضافات کی نئی بستیوں، مثلاً ناظم آباد، دہلی کالونی، سندھی ہاؤسنگ سوسائٹی، حیدرآباد کالونی، پیر الٰہی بخش کالونی، کورنگی کی طرف چلی جاتی ہیں۔ نقشے پر کراچی شہر کچھ اس طرح نظر آتا ہے جیسے ایک بڑی سی مکڑی اپنی ٹانگیں چاروں طرف پھیلائے بیٹھی ہو (*Ency. Brit.*)]۔

حمل و نقل: کراچی، جو ہمیشہ سے دنیا بھر کے لوگوں کا شہر سمجھا جاتا رہا ہے، اب ایسی بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس کی نظیر اس مقام کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس شہر میں خشکی، تری اور ہوائی راستوں کے ذریعے آجاسکنے

www.besturdubooks.wordpress.com

ہیں۔ [پشاور جانے والی شاہراہ اعظم اسے اندرون ملک سے اور زاہدان جانے والی سڑک ایران اور مشرق وسطیٰ سے ملاتی ہے۔ شہر کے وسطی علاقوں میں سڑکوں کی لمبائی تقریباً چار سو میل اور مضافات میں ۱۶۰۰ میل سے زیادہ ہے۔ کراچی پاکستان ریلوے کا آخری سٹیشن ہے]۔ یہ ریلوے، جو وادی سندھ کے بیچ میں سے ہو کر گزرتی ہے، سمندر کے عقبی علاقے کی تمام پیداوار اس کے دروازے پر لا پھینکتی ہے اور درآمد شدہ مال اندرون ملک پہنچاتی ہے۔ کوئی درجن بھر مال گاڑیاں یہاں روزانہ پہنچتی اور اتنی ہی تعداد میں یہاں سے روانہ ہوتی ہیں۔ مال کے نقل و حمل میں ٹرک بھی بڑی تعداد میں استعمال ہوتے ہیں۔

دنیا کے مختلف حصوں سے جو جہاز اب آتے ہیں وہ کیماڑی میں آ کر لنگر انداز ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بعض ایسے سمندری راستوں کے مرکز میں واقع ہے جن پر بہت زیادہ آمد و رفت رہتی ہے۔ کراچی بحری تجارت کے لیے ایک مرکزی مقام ہے، خصوصاً وہ تجارت جو ایک طرف تو خلیج فارس، نہر سویز اور راس امید وغیرہ کے درمیان ہوتی ہے اور دوسری طرف لنکا، برما، جاپان، انڈونیشیا (ہند چینی) اور آسٹریلیا تک پھیلی ہوئی ہے۔ الغرض کراچی سے ہر طرف بہتیرے بحری راستے پھوٹتے ہیں۔ یہاں کی بندرگاہ ہر قسم کے جہازوں کے لیے ہر موسم میں محفوظ ہے کیونکہ منوڑا ٹاپو، جو بندر گاہ کے جنوب مغرب میں ہے، غیر معمولی محل وقوع کا حامل ہے۔ آج کل کراچی کی بحری تجارت کی مجموعی مقدار لاکھوں ٹن تک پہنچ چکی ہے۔ [۱۹۷۰-۱۹۷۱ء میں یہاں کی بیس سے زیادہ گودیوں میں ۶۳ لاکھ ٹن مال اتارا اور تقریباً ۳۲ لاکھ ٹن مال لادا گیا۔ یہاں سترہ سو سے زیادہ جہاز سالانہ لنگر انداز ہوتے ہیں]۔ اس کے علاوہ ہمسایہ ملکوں کے ساتھ ساحلی تجارتی کاروبار بھی مقامی طور پر بڑے پیمانے پر ہوتا رہتا ہے۔

[کراچی ایک بین الاقوامی فضائی مستقر ہے، جہاں روز و شب یورپ، مشرق بعید، مشرق وسطیٰ، آسٹریلیا اور امریکہ کے درمیان ہوائی جہازوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے]۔ ہوائی جہازوں کے اترنے کے لیے غیر معمولی طور پر عمدہ زمین موجود ہے، جو ایک وسیع کف دست چٹیل میدان کی صورت میں پھیلی چلی گئی ہے۔ سال بھر میں زیادہ عرصے کے لیے آب و ہوا بھی عموماً خشک ہی رہتی ہے، اس لیے کراچی کے دونوں ہوائی اڈے، ڈرگ روڈ (سول) اور ماڑی پور (فوجی) پوری رونق پر رہتے ہیں۔ متعدد بین الاقوامی اور بین المملکتی کمپنیوں کے کاروبار کی وجہ سے یہاں شب و روز بڑی چہل پہل رہتی ہے۔ ہزاروں مسافر، بھاری ڈاک اور تجارتی مال وغیرہ کی آمد و رفت اور نقل و حرکت ہر مہینے متواتر ہوتی رہتی ہے۔ رات کے وقت پرواز کرنے کے لیے ضروری ساز و سامان مہیا ہے اور اس بات کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے کہ جیٹ قسم کے طیارے اور بھاری بھرکم ہوائی جہاز یہاں اتر سکیں۔

[صنعت و تجارت: کراچی پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی اور تجارتی مرکز ہے۔ یہاں تین ہزار سے زیادہ کارخانے چل رہے ہیں، جن میں لاکھوں مزدور کام کرتے ہیں۔ پارچہ بافی اور کفش سازی کی صنعتوں پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ تیل صاف کرنے کا ایک بہت بڑا کارخانہ قائم ہے۔ مشینیں، ادویات، ظروف، فرنیچر، کاغذ، بجلی کا سامان، چمڑے کی چیزیں وغیرہ بھی بڑی مقدار میں تیار ہوتی ہیں۔ فولاد کا کارخانہ لگ جانے کے بعد اس کی صنعت و حرفت میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا۔

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

یہاں تقریباً تیس بڑے بنکوں کے مرکزی دفاتر اوران کی شاخیں کام کر رہی ہیں ۔ دو درجن سے زیادہ بیمہ کمپنیاں ہیں اور ملک سب سے بڑا سٹاک ایکسچینج بھی یہاں قائم ہے ۔

عظیم کراچی کا نظم و نسق پانچ ادارے چلا رہے ہیں، یعنی کراچی میونسپل کارپوریشن، کورنگی لانڈھی میونسپل کمیٹی، ڈرگ ملیر میونسپل کمیٹی، کراچی کنٹونمنٹ بورڈ اور کراچی پورٹ ٹرسٹ ۔ کراچی میں آب رسانی کے مندرجۂ ذیل وسائل ہیں : (۱) جھیل ہالیجی سے، جو کراچی سے ۵۵ میل کے فاصلے پر ہے اور اس میں دریاے سندھ کا پانی آتا ہے؛ (۲) دریاے ملیر کی خشک تلیٹی میں کھودے ہوے کنووں سے؛ (۳) یہاں سے ۶۰ میل دور جھیل کالری سے ۔ شہر میں تقریباً دس کروڑ گیلن پانی روزانہ استعمال ہوتا ہے ۔ اس کے باوجود اس کے بعض حصوں، بالخصوص لانڈھی، ملیر اور ماڑی پور کی مضافاتی بستیوں میں قلت کی شکایت ہے ۔

کراچی تعلیمی مرکز بھی ہے، یہاں یونیورسٹی کے علاوہ ثانوی، اعلیٰ اور صنعتی تعلیم دینے کے متعدد ادارے قائم ہیں] ۔

کراچی کا مستقبل نہایت درخشاں ہے ۔ بحرعرب کے ساحل پر یہ شہر اور اس کی بندرگاہ بے مثال ہے ۔ زمانۂ گزشتہ میں اس کی ترقی عظیم الشان رہی ہے اور اگر صحیح طریقے سے اس کی دیکھ بھال اور توسیع ہوتی رہی تو اس کی آبادی میں بھی کسی حد تک بڑھنے کے علاوہ یہاں کی دولت اور صحت میں بھی معتد بہ اضافہ ہو سکتا ہے ۔

مآخذ : (۱) Pithawalla و Kaye : *Geology and Geography of Karachi and its Neighbourhood*، دو حصے، کراچی ۱۹۴۶ء؛ (۲) مانک پیٹھا والا و خان محمّد شمشاد : *Climate of Karachi and how to live in it*؛ (۳) A. W. Hughes : *Gazetteer of the Province of Sind*، ۱۸۷۶ء؛ (۴) James Evans : *Memoires of Seth Naomal Hotchand, C.S.I.—1804 to 1879*، ۱۹۱۵ء؛ (۵) *Karachi District Gazetteer*، ۱۹۲۷ء؛ (۶) Postans : *Personal Observations on Sindh*، لنڈن ۱۸۴۳ء؛ (۷) Burton : *Sindh Revisited*، لنڈن ۱۸۹۷ء؛ (۸) عبدالحمید خان : *Towns of Pakistan*، ۱۹۵۰ء؛ [(۹) *District Census Repot, Karachi*، ۱۹۶۱ء؛ (۱۰) نذیر احمد : *Survey of Shelterless People in Karachi*، ۱۹۵۹ء؛ (۱۱) *The Great Karachi Resettlement Housing Programme*، مطبوعۂ کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی، ۱۹۶۱ء؛ (۱۲) A. F. Balie : *Kurrachee—Past, Present and Future*، ۱۸۹۰ء؛ (۱۳) H. Feldman : *Karachi Through A Hundred Years*، ۱۹۶۰ء؛ (۱۴) G. Rains : *Indus-trial Efficiency and Economic Growth : A Case Study of Karachi*، ۱۹۶۱ء؛ (۱۵) امتیاز الدّین حسین، محمّد افضل و امجد علی بہادر رضوی : *The Social Characteristics of the People of Karachi*، ۱۹۶۵ء؛ (۱۶) *Encyclopaedia Britannica*، ۱۹۷۴ء، ج ۱۰؛ (۱۷) *Pakistan Year Book, 1971*؛ (۱۸) *The States-man Year Book 1974-75*؛ (۱۹) کیمی مارپوا : آج کا پاکستان (مترجمۂ محمّد حسن رایع)، لاہور ۱۹۶۶ء ۔

(MANECK B. PITHAWALLA [و ادارہ])

کَرَامَۃ : [ع]؛ دراصل کَرُمَ (= کریم یا "نیک" ہونا، وسیع ترین معنی میں) کا مصدر، لیکن استعمال میں یہ ایک اسم ہے، جس کے معنی وہی ہیں جو اِکْرَام اور تَکْرِیم کے ہیں، یعنی کسی کے سامنے اپنے آپ کو نیک خو ثابت کرنا (لسان، ۱۵ : ۴۵۶ س ۳ ببعد) ۔ اگرچہ کریم کا لفظ بکثرت اللہ اور اس کے کاموں کے لیے قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے (راغب الاصفہانی : المفردات، بذیل مادّہ)، لیکن

www.besturdubooks.wordpress.com

کرامہ کا لفظ کہیں نہیں آیا، لہٰذا اسلام کی دینی زبان میں اس کے معنی ہوے: اللہ کا اپنے احسان و انعام، حفظ و نصر کا کسی بندے پر مبذول فرمانا، مثال کے طور پر دیکھیے البیضاوی: تفسیر القرآن، بذیل ۱۰ [یونس]: ۶۳ (طبع Fleischer، ۱: ۴۱۹ آخر صفحہ) جو اولیاء اللہ کی بابت معتبر ترین بیان ہے؟ اور کرامات اس بذل کی جزئی صورتوں کو کہتے ہیں؛ چنانچہ کرامات کے مخصوص معنے ہوے ایک خارق عادت انعام و اکرام جس کو اللہ اپنے اولیا کے حفظ و حمایت کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید میں کرامات کا پتا ان آیات میں لگایا گیا ہے: ۳ [آل عمرٰن]: ۳۷ جس میں حضرت مریم[۴] کے پاس مُقفّل محراب میں خرق عادت کے طور پر آپ ہی آپ خوراک پہنچ جانے کا ذکر ہے اور وہ آیات جن میں تخت بلقیس کو ایک مصاحب سلیمان کے، جس کا نام نہیں لیا گیا، آن کی آن میں یمن سے شام پہنچا دینے کا ذکر ہے (۲۷ [النمل]: ۴۰)۔ چونکہ نہ تو حضرت مریم[۴] پیغمبر تھیں اور نہ بے نام ساتھی پیغمبر تھا اس لیے اس خرق عادت کو دونوں صورتوں میں معجزہ نہیں کہہ سکتے۔ اس کی پوری بحث کے لیے دیکھیے شرح تفتازانی بر عقائد نسفی، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ص ۱۳۴ ببعد؛ لیکن حقیقت میں ان کی اصل سیر اولیاء میں ہے جن میں ان کے بے شمار خارق عادت کارنامے درج ہیں جو ان کی باطنی زندگی کے ناقابل شک احوال و مواجید کے مبالغہ آمیز اور محرف خیالی بیانات ہیں۔ ان واقعات یا کارناموں کی تہ میں جو حقیقت واقعیّہ کارفرما ہے اس کو تمام راسخ العقیدہ مسلمان، تسلیم کرتے ہیں، یہاں تک کہ ابن خلدون (طبع Quatremere)، ۱: ۱۶۹، ۱۹۹، مترجمۂ دیسلان، ۱: ۱۹۰، ۲۲۷) جیسا فلسفی مؤرخ اور ابن سینا جیسا مَشّائی فلسفی تک بھی مانتے ہیں (اشارات، طبع Farget، ص ۲۰۹، ۲۱۹، ۲۲۱ ببعد)۔ ظاہر یہی ہے کہ یہ لوگ واقعات کے دباؤ کی وجہ سے اس مفروضے کی پناہ لینے پر مجبور ہوگئے کہ کائنات میں ابھی تک ایسے بہت سے راز پوشیدہ ہیں جو حل نہیں ہوے (دیکھیے Goldziher: *Die Richtungen desislamischen Koranauslegung*، لائیڈن ۱۹۲۰ء، ص ۱۳۹ حاشیہ ۳)۔ صرف معتزلہ نے جنھیں اس بات کا یقین تھا کہ کائنات میں ایسے راز نہیں ہیں جو ان سے پوشیدہ رکھ چھوڑے ہیں، لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے دینی مسائل کی تحقیق کے لیے فقط عقل کو رہنما بنائیں، اس کے خلاف احتجاج کیا اور خود قرآن مجید میں اپنے احتجاج کی اصل بھی ڈھونڈ لی (دیکھیے الزمخشری: الکشاف، طبع Nassau Lees، ۲: ۱۵۳۹ بذیل ۷۲ [الجن]: ۲۶، ۲۷)، اور اس مسئلے کی پوری تفصیل کے لیے دیکھیے Goldziher: کتاب مذکور، ص ۱۴۴ ببعد۔ لفظ کرامات اور قدیم مسیحی مذہب (I cor. xii) کے لفظ χαρίσματα (قرنتیان اول باب ۱۳) تلفظ، اشتقاق اور معنی میں باہمی توافق عجیب ترین امر ہے اور اس کا اتفاق ہونا مشکل سے باور کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کے مذہبی مظاہر ایک جیسے ہیں، لیکن لفظی تعلق واضح نہیں، شام کے عیسائی χαρίσματα کو محض "تحفے" *Mauhᵉbhāthā* کہا کرتے تھے جس کی عربی مواہب ہے اور یہ لفظ سچ مچ کرامات کے لیے استعمال بھی ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یونانی لفظ جب سریانی میں منتقل ہوا تو اس نے عربی زبان بولنے والوں کو ان کا اپنا لفظ کرامات سمجھا دیا ہو۔ اصطلاحاً کرامت بمفہوم بالا خارق العادۃ "عادت یا معمول کو توڑنے والوں" میں داخل ہے کیونکہ راسخ الاعتقاد اسلام میں Nature کوئی شے نہیں، اگر ہے تو فقط یا زیادہ سے زیادہ

www.besturdubooks.wordpress.com

اللہ کی ایک مقرر کی ہوئی عادت یا رسم ہے جس کے مطابق امور عالم عموماً ظہور پذیر ہوتے ہیں (Goldziher: *Vorlesungen*، ص ۱۳۰)۔ کرامت اور معجزہ (دلیل نبوت) میں فرق یہ ہے کہ کرامت کسی نبی سے اپنی نبوت کے ثبوت میں اللہ کی طرف سے صادر نہیں ہوتی اور اس کے ساتھ نبوت کا دعوٰی نہیں ہوتا نہ مخالفوں کو مقابلے کی دعوت دی جاتی ہے۔

معونت (مدد) اور کرامت میں یہ فرق ہے کہ معونت حاصل کرنے والا گو مسلم ہوتا ہے، لیکن اس پر کوئی دینی (باطنی) حال طاری نہیں ہوتا اور نہ اسے مذہبی تجربہ ہوتا ہے۔ یہ ارہاص سے بھی علٰحدہ ہے جو اس غیر معمولی واقعے کو کہتے ہیں جو کسی نبی کی بعثت سے پہلے اس کے لیے میدان تیار کرنے کے لیے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کرامت استدراج اور اہانہ سے بھی مختلف ہے کیونکہ استدراج اور اہانہ کفار کی خاطر ظہور پذیر ہوتے ہیں تاکہ انہیں گمراہ اور شرمندہ کیا جائے (کشاف اصطلاحات الفنون، ۱ : ۴۴۴ ببعد، النسفی: عقائد، محل مذکور مع اس کی شروح کے)۔ ولی کو اپنی کرامتیں چھپانی چاہییں حالانکہ نبی کے لیے ان کا اظہار ضروری ہے۔ ولی کو اپنی کرامات سے باخبر ہونا ضروری نہیں، لیکن نبی کو لا محالہ ان کا علم ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے، کہ ولی کی کرامت کو اس نبی کا معجزہ سمجھا جائے گا جس کا وہ پیرو ہے اور آخری بات یہ ہے کہ ولی کو جہاں تک ہو سکے اپنی کرامات کو نظر انداز کرنا چاہیے اور اسے بجائے عنایات ربّانی سمجھنے کے ذرائع ابتلا سمجھنا چاہیے۔

مآخذ: (۱) القشیری: الرسالہ، بولاق ۱۲۹۰ھ، مع شروح، ۴ : ۱۴۶ ببعد (دیکھیے Richard Hartman: *Das Ṣûfîtum nach al-ḳuschairi*): (۲) Goldziher: *Muhammed. Studien*، ۲ : ۳۷۲ ببعد؛ (۳) الایجی: المواقف، بولاق ۱۲۶۶ھ، مع شرح الجرجانی، ص ۵۷۸ ببعد، ۵۸۷ ببعد؛ (۴) ہجویری: کشف المحجوب، مترجمۂ آر۔ اے نکلسن، بمدد اشاریہ؛ (۵) الشعرانی: الطبقات الکبرٰی، بمواضع کثیرہ؛ (۶) یوسف النبہانی: جامع کرامات الاولیاء، قاہرہ ۱۳۲۹ھ، (حکایات کا بہت بڑا مجموعہ ہے)؛ (۷) ابن بطوطہ: تحفۃ النظّار، بمواضع کثیرہ؛ (۸) D. B. Macdonald: *Religious Attitude and Life in Islam*، لیکچر، ۳ تا ۷، ۹۔

(D. B. MACDONALD)

کرامت علی: جونپور [رکّ باں] کے ایک * شیخ گھرانے میں پیدا ہوئے (صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں غالباً انیسویں صدی کے اوائل میں) جس کے افراد اسلامی دور حکومت میں خطیب کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ کرامت علی کے والد کلکٹر جونپور کے دفتر میں سررشتہ دار تھے، انہوں نے دینیات اور دیگر علوم اسلامی کی تحصیل اپنے زمانے کے مشہور و معروف علما، خصوصاً شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی سے کی جو پہلے سید احمدؒ بریلوی کے استاد تھے اور جنھوں نے بعد میں ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ ۱۸۲۰ اور ۱۸۲۴ء کے درمیان سید احمدؒ نے بنگال اور شمالی ہند کا دورہ کیا اور پیروؤں کی ایک جماعت فراہم کر لی۔ کرامت علی ان کے مخلص ترین نوجوان پیروؤں میں سے تھے، لیکن بظاہر انھوں نے اس جہاد میں شرکت نہیں کی جو سید احمدؒ نے سکھوں [رکّ باں] کے خلاف کیا اور نہ وہ افغانستان کے اس سرحدی علاقے میں کبھی گئے جہاں ۱۸۳۱ء کی جنگ میں سید احمدؒ نے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ سید موصوف کی شہادت کے بعد ان کے معمر استاد شاہ عبدالعزیزؒ ان کے خلیفہ ہوئے اور بہار و بنگال میں تجدید اسلام کی تحریک بڑی سرگرمی سے شروع ہوئی۔ اس پر امن تحریک

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

میں کرامت علی بھی بدل و جان شامل ہوے اور انھیں اس تحریک کا سب سے کامیاب حامی اور داعی کہا جاسکتا ہے اور یقیناً وہ اس کے لائق ترین نمائندے تھے۔ انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشرات کے دوران میں مشرقی بنگال میں کئی ایک چھوٹی چھوٹی اصلاحی تحریکیں چلیں، لیکن ان کے قائد ایسے لوگ تھے جن میں بہ نسبت علم و فضل کے جوش اور سرگرمی زیادہ تھی، مثلاً حاجی شریعت اللہ [رک بہ فرائضی]، جنھوں نے ۱۲۵۲ھ/ ۱۸۳۶ - ۱۸۳۷ء میں کرامت علی سے کلکتے میں ملاقات کی۔ ۱۸۵۵ء تک دو مختلف الخیال گروہوں کے درمیان مصالحت کی کوششیں کسی حد تک کامیاب ہوچکی تھیں؛ چنانچہ ایک جلسے میں، جو باریسال میں منعقد ہوا، کرامت علی دوسرے گروہ کے نمائندے مولوی عبدالجبّار سے کئی ایک مسائل پر متفق ہوگئے، لیکن برطانوی ہند میں جمعے اور عید کی نمازوں کے شرعی جواز کے مسئلے پر مولوی عبدالجبّار کی شدید مخالفت پر غالب نہ آسکے اور مولوی عبدالجبّار کے متبعین کو خوش کرنے کے لیے ظریفانہ انداز میں کہا کہ ان کے رہنما نے ملخ (ٹڈیوں) کو (جو حلال ہیں) غلطی سے گھاس کے ٹڈے (جو حرام ہیں) سمجھ لیا ہے (حجّت قاطعہ، ص ۲۹ تا ۳۲)۔

اپنی دعوت کے سلسلے میں کرامت علی کو دُہری کشمکش سے پالا پڑا۔ ایک طرف تو انھیں ان ہندوانہ رسوم اور توہمات کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا جو مشرقی بنگال کے مسلمانوں کی شرعی زندگی میں داخل ہوچکی تھیں (چنانچہ انھوں نے اپنی تمام تصنیفات میں ان پر رد و قدح کرنے کے علاوہ ایک کتاب ردّ البدعۃ خاص اسی موضوع پر لکھی) اور دوسری طرف ان کی یہ کوشش تھی کہ راہ راست سے ہٹے ہوے سب فرقوں کو، جن کے خلاف انھوں نے کامیابی سے مسلسل جنگ کی تھی، سنت قائمہ کے دائرے میں لایا جائے۔ ان کی ضخیم کتابوں میں ان جہلا کا صراحۃً و کنایۃً بار بار ذکر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اسی موضوع پر انھوں نے ایک اور مخصوص کتاب ہدایۃ الرّافضیّین تصنیف کی۔ وہ بنگال کے مسلم عوام کے ساتھ ہمیشہ ربط ضبط رکھتے تھے اور تمام نذرانے، جو انھیں وصول ہوتے تھے، حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ وہ ایک مشاق قاری اور ماہر فن خوشنویس تھے۔

گارساں دتاسی Garcin de Tassy (کتاب مذکور، ۲ : ۱۶۲) لکھتا ہے کہ Sir Charles Trevelyan نے اعلان کیا تھا کہ یورپ کی جدید نہضۃ علمیہ پر یونان اور عرب کے اثر کے موضوع پر جو ہندوستانی بہترین مقالہ لکھے گا اسے انعام دیا جائے گا۔ اس مقابلے میں کرامت علی نے بھی حصہ لیا تھا، لیکن انگریزی ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے، جس کا ساتھ ہونا شرائط کی رو سے ضروری تھا، ان کا مقالہ مقابلے میں شامل نہ کیا جا سکا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اکثر ہم عصر ہندوستانی مولویوں کے برعکس اس بات کے قائل تھے کہ بیرونی دنیا کے عام مسائل سے اسلام کا بھی تعلق ہے اور اس موضوع میں دلچسپی لیتے تھے۔ کرامت علی نے ۳ ربیع الآخر ۱۲۹۰ھ/ ۳۱ مئی ۱۸۷۳ء کو وفات پائی اور رنگ پور میں مدفون ہوے (تجلّی نور، ۲ : ۱۳۶)؛ گویا وفات کے بعد بھی وہ اسی صوبے میں رہے جہاں زندگی بھر احیاے اسلام کی کوشش میں مصروف رہے تھے۔ ان کے بعد یہ کام ان کے بیٹے مولوی حافظ احمد (م ۱۸۹۸ء) اور بھتیجے محمد محسن نے سنبھالا۔ کرامت علی کے متبعین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ بنگال میں بمشکل کوئی ایسا گاؤں ہوگا جہاں ان کے شاگرد نہ ہوں۔ اس صوبے کے بعض اضلاع میں آج

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

تک ان کا اثر زندہ و پائندہ ہے۔

ان کی تصنیفات زیادہ تر اردو میں ہیں۔ رحمٰن علی (کتاب مذکور، ص ۱۷۱، ۱۷۲) نے ان کی ۴۶ کتابوں کی فہرست دی ہے اور یہ دعوٰی نہیں کیا کہ یہ فہرست جامع اور مکمل ہے۔ ان کی ایک کتاب مِفْتاحُ الجَنّة بار بار طبع ہوکر شائع ہوچکی ہے اور یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ اس کتاب میں اسلامی قواعد و مسائل کا بالکل درست اور صحیح بیان ہے۔ ان کی تصنیفات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: (۱) عام تصنیفات، مثلاً مفتاح الجنّة؛ (۲) قرآن مجید کی قراءت، اس کی لفظی تفسیر اور نماز و طہارت کے مسائل پر تصنیفات؛ (۳) پیری مریدی کے مسئلے پر تصنیفات، جو پاک و ہند کے اہل السنت و الجماعة مسلمانوں کے ہاں خاصا اہم ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت تسلیم کر لینے سے کرامت علی وہابی فرقے سے صاف طور پر جدا نظر آتے ہیں اور غیرمحسوس طور پر زمرۂ متصوفین سے جا ملتے ہیں اور انھیں اہل السنة کے مستند فرقوں سے مربوط و منسلک کرتے ہیں؛ (۴) شریعت اللہ، دودو میاں اور وہابیوں کے بارے میں مناظرانہ تصنیفات۔

عام طور پر جو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کرامت علی وہابی تھے، اس کی تردید ان کے اپنے عقائد کے بارے میں اس مشرح و مبسوط بیان سے ہوتی ہے جو انھوں نے اپنی کتاب مکا شفات رحمت میں دیا ہے۔ انھوں نے وہابیوں کی کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا، لیکن ان کی بابت زبانی استفسارات ضرور کیے تھے۔ کرامت علی اور ان کے پیروؤں نے بڑی احتیاط سے شرک اور بدعت میں فرق بتایا ہے۔ شرک کا مطلب سرے سے نفی اسلام ہے اور بدعت کا مطلب فقط کسی جزوی مسئلے یا عقیدے میں غلط فہمی ہے (ص ۳۹)۔ انھوں نے حجت قاطعہ میں فاسق (گنہگار) اور کافر میں فرق واضح کیا ہے اور ان لوگوں پر سخت لعن طعن کی ہے جو ایسے لوگوں کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیتے ہیں جنھوں نے زندگی میں نماز نہیں پڑھی بلکہ فقط کلمہ ہی پڑھ کر بیٹھے رہے (ص ۲۱) اور یہ بھی بتایا ہے کہ اگر کسی اسلامی ملک کو غیر مسلم فتح کر لیں تو ان کے ماتحت ملک میں نماز جمعہ و عیدین [رک بآں] شرعی اعتبار سے نہ فقط جائز بلکہ واجب ہے (ص ۱۳، دو بار)۔ انھوں نے اجازت روایت اور سند پر، جو مستند اساتذہ اپنے شاگردوں کو عطا کرتے ہیں، بڑا زور دیا ہے۔ انھوں نے اپنے اصولی مسائل کی بنیاد حنفی المذہب راسخ العقیدہ سنی مسلمانوں کی کتابوں پر رکھی ہے (مکا شفات رحمت، ص ۳۷)۔ صحاح ستّہ، تفاسیر، اصول فقہ، مسالک تصوف اور پیری مریدی کے سلسلے ان کے نزدیک مسلّم تھے (ص ۳۸، ۳۵)، حتٰی کہ سید احمدؒ کی تحریک بھی ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث پر مبنی ہونا ثابت کرتے تھے (ص ۳۲)۔ وہ مانتے تھے کہ ہر صدی میں احیاے دین کے لیے ایک مجدد پیدا ہوتا ہے۔ سید احمدؒ تیرھویں صدی ہجری کے ایک ایسے ہی مجدد تھے اور ان کی پیروی لازم ہے، تاآنکہ چودھویں صدی میں کوئی اور مجدد پیدا ہو جائے (ص ۳۴)۔ ان کی "اصلاح" فقط یہیں تک محدود تھی کہ ہندوانہ رسم و رواج کو مٹایا جائے یا ان باتوں کی بیخ کنی کی جائے جو لاعلمی کی وجہ سے مسلمانوں میں رواج پا گئی ہیں (ص ۳۶) اور مسلمہ مذاہب اہل السّنة کے مطابق اسلام کو رواج دیا جائے (ص ۵۰)۔ سیّد احمدؒ کی زندگی کے سیاسی اثرات نے ان کے متبعین کو ارباب حکومت سے متصادم کر دیا تھا، لیکن جماعت کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاست یا عقیدے کے اعتبار سے ان کا اس فرقے سے کوئی تعلق نہیں تھا جس کی بنیاد محمّد بن عبدالوہاب

www.besturdubooks.wordpress.com

[رکّ بان] نے عرب میں رکھی تھی .

مآخذ : کرامت علی کے جو حالات یورپی مصنفین کے ہاں ملتے ہیں وہ غیر تسلی بخش ہیں، کیونکہ یہ بیانات سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں اور یہ مصنفین اس اصلاحی فرقے اور وہابیت کے درمیان تمیز نہیں کر سکے بلکہ انھوں نے بعض جگہ مادّۂ مندرجۂ بالا کے کرامت علی کو مولوی سید کرامت علی جونپوری (۱۷۹۶ تا ۱۸۷۶ء) سے ملتبس کر دیا ہے، جنھوں نے ۱۸۳۲ سے ۱۸۳۵ء تک کابل میں امیر دوست محمّد خان کے دربار میں برطانوی حکومت کی سفارت کی تھی اور ۱۸۳۷ تا ۱۸۷۶ء ہگلی کے امام باڑے کے متولی رہے تھے (*Nineteenth Century*، سنی ۱۹۰۵ء، ص ۷۸۰ تا ۷۸۲) - نیز دیکھیے (۱) W.W. Hunter: *The Indian Musalmans*، ص۱۱۴؛ (۲) C. E. Buckland: *Dictionary of Indian Biography*، ص ۲۲۹؛ (۳) نور الدّین زیدی : تجلی نور، ۲ : ۱۳۹؛ (۴) *Census of India* (۱۹۰۱ء)، ۱/۶ (بنگال) : ۷۴ (کلکتہ ۱۹۰۲ء)؛ (۵) *Journal Asiatic Society of Bengal*، ۳/۶۳ : ۵۴ تا ۵۶ (کلکتہ ۱۸۹۴ء)؛ (۶) Garcin de Tassy: *Hist. de la litterature Hindouie et Hindoustanie*، پیرس ۱۸۷۰ء، ۲ : ۱۶۲ (یہ امر مشکوک ہے کہ کیا معجزۂ رشک مسیحا، دہلی ۱۸۶۸ء جس کا ذکر اس میں آیا ہے، زیر بحث کرامت علی ہی کی تصنیف ہے)؛ (۷) سیّد نور الدّین زیدی : تجلّی نور (جونپور کے مشہور لوگوں کے حالات زندگی)، جونپور ۱۹۰۰ء، ص ۱۳۵ و ۱۳۶ .

کرامت علی کے اعتقادات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ان کی اپنی تصنیفات کے مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے، جن میں سب سے اہم مندرجۂ ذیل ہیں : (۱) مفتاح الجنّۃ، کلکتہ ۱۲۴۳ھ، (بارہا طبع ہوئی)؛ (۲) کوکبِ دُرّی، کلکتہ ۱۲۵۳ھ (اس میں ان لوگوں کے فائدے کے لیے جو عربی کا محض واجبی علم ہی رکھتے ہیں عبارات قرآنی کا ترجمہ دیا گیا ہے)؛ (۳) بیعت توبہ، کلکتہ ۱۲۵۴ھ (اس میں پیر کے ہاتھ پر بیعت توبہ اور دیگر اشغال مسالک دینیہ کا شرعی جواز پیش کیا گیا ہے)؛ (۴) زینۃ القاری، کلکتہ ۱۲۶۴ھ (قراءت قرآن مجید کے صحیح اصول و قواعد کے بارے میں)؛ (۵) فیض عام، کلکتہ ۱۲۸۲ھ (تفکر دینی پر ایک رسالہ، جس میں شیخ احمد سرہندیؒ کے نظریات کی تشریح پیش کی گئی ہے)؛ (۶) حجّت قاطعہ، کلکتہ ۱۲۸۲ھ (ایک مناظرانہ رسالہ، جو شریعت اللہ اور ان کے بیٹے دُودّو میاں [عام طور پر اس کا تلفظ دودّھو میاں کہا جاتا ہے، مگر کرامت علی اسے ہمیشہ اسی طرح لکھتے ہیں] کے خلاف لکھا گیا ہے)؛ (۷) نور الہُدیٰ، کلکتہ ۱۲۸۶ھ (عقائد تصوف اور مجددیہ مذہب کے بارے میں، جس سے بظاہر سید احمدؒ بریلوی کا نیا مذہب مراد ہے)؛ (۸) مکاشفات رحمت، کلکتہ ۱۲۸۶ھ (اس میں سید احمدؒ بریلوی کی زندگی اور کارناموں کے حالات ملتے ہیں اور وہابیوں کو زیر بحث لا کر ان سے اپنی بے تعلقی ظاہر کی ہے)؛ (۹) زینۃ المُصَلّی، کلکتہ ۱۲۵۹ھ (وضو اور نماز وغیرہ کے متعلق ہدایات)؛ (۱۰) زاد التّقوٰی، کلکتہ ۱۲۸۷ھ، (اسلامی عقائد و اعمال اور تصوف کے بیان میں - اس میں نقشبندیہ تعلیم کو قبول کیا گیا ہے)؛ کرامت علی کی تصنیفات کی ایک نامکمل فہرست کے لیے دیکھیے (۱۱) رحمٰن علی : تذکرۂ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۸۹۴ء، ص ۱۷۱، جس میں ۴۶ مختلف کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے .

(عبداللہ یوسف علی)

کَرَامَرْس : (J. H. Kramers)، بیسویں صدی ⊗ کا ایک ولندیزی مستشرق، ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۵۱ء میں وفات پائی - کرامرس نے لائیڈن یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی - فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس نے استانبول کے ولندیزی سفارت خانے میں ترجمان کے فرائض ادا کیے (۱۹۱۵ تا ۱۹۲۲ء) - بعد ازاں وہ لائیڈن یونیورسٹی میں ترکی اور فارسی زبانوں کا استاد اور ۱۹۳۹ء

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

میں پروفیسر ونسنک Wensinck کی وفات پر اس کی جگہ عربی کا پروفیسر مقرر ہوا اور تا دم مرگ اسی عہدے پر فائز رہا۔

کرامرس نے ترکوں کے فن تاریخ پر ایک کتاب تالیف کی، جو ۱۹۲۲ء میں طبع ہوئی۔ اس نے ابن حوقل کی کتاب المسالک و الممالک کو بھی از سرنو، مرتب کیا، جو لائیڈن میں ۱۹۳۸ء میں طبع ہوئی۔ اس نے *Encyclopaedia of Islam* میں متعدد مقالے لکھے، جو اس کے علم و فضل پر دلالت کرتے ہیں۔ اس نے پروفیسر ہملٹن گب H. Gibb کے ساتھ مل کر *Encyclopaedia of Islam* کا ایک مختصر اڈیشن مرتب کیا اور اس میں صرف ان مقالوں کو شامل کیا جو مذہبی حیثیت رکھتے تھے اور چند ایک نئے مقالوں کا بھی اضافہ کیا۔ یہ منتخب اڈیشن ۱۹۵۳ء میں *Shorter Encyclopaedia of Islam* کے نام سے شائع ہوا۔ اسی طرح کرامرس نے پروفیسر ونسنک کے ساتھ مل کر اسی انسائیکلوپیڈیا کے جرمن اڈیشن کا ایک اختصار بھی مرتب کیا اور اس میں صرف ان مقالوں کو شامل کیا جو براہ راست دین اسلام کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ یہ مختصر جرمن اڈیشن ۱۹۴۱ء میں لائیڈن میں طبع ہوا۔ اس میں بعض مقالوں میں جزوی ترمیم کی گئی ہے، بعض کو مختصر کر دیا گیا ہے اور بعض نئے مقالے شامل کیے گئے ہیں۔

جب ۱۹۳۱ء میں پروفیسر آرنلڈ T. Arnold اور پروفیسر گیوم A. Guillaume نے مل کر *The Legacy of Islam* کو شائع کیا تو کرامرس نے بھی اس کتاب میں ایک باب Geography and Commerce کے موضوع پر لکھا، جو قیمتی معلومات سے بھرپور ہے۔

کرامرس کی ایک قابل ذکر علمی خدمت یہ ہے کہ اس نے قرآن مجید کا ولندیزی زبان میں ترجمہ کیا، جو ایمسٹرڈم سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس ترجمے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں قرآن مجید کے مضامین کا ایک مفصل اشاریہ بھی شامل ہے۔

اس نے ولندیزی میں سامی زبانوں پر ایک مختصر کتاب بھی لکھی تھی، جو لائیڈن میں ۱۹۴۹ء میں طبع ہوئی۔

مآخذ: (۱) نجیب العقیقی: المستشرقون، ۲: ۶۷۰؛ (۲) مقالہ نگار کی ذاتی معلومات۔

(شیخ عنایت اللہ)

کَرْبَلاء: (کربلائے معلّٰی) عراق کا ایک ⊗ مشہور شہر، جو حضرت امام حسینؓ، حضرت عبّاسؓ، حُرّؓ بن یزید الرّیاحی اور حبیبؓ بن مُظاہر کے مزاروں اور واقعۂ عاشورا کی وجہ سے زیارت گاہ و مرکز عقیدت ہے۔

تاریخ قدیم میں کربلاء کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے، مثلاً غاضِریّہ، نینوٰی (غالباً حائر کے جنوب مشرق میں ایک قریہ، جسے اب ایک محلے کی شکل حاصل ہوگئی ہے؛ تاریخ کربلاء و حائر الحسین، ص ۹۸)، عَمّورا، شاطیء الفرات، شطّ الفُرات، طَفّ الفرات، طَفّ ماریہ، نَواوِیس، صَفّورا، حائر۔

آثار قدیمہ کے ماہر گزشتہ ہزار برس کی تاریخ اور نام و نشان پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (۱) کربلا کُور بابل ہے، یعنی بابل کے قریے؛ (۲) کربلا اشوری نام ہے، جو "کرب" و "ایلا" سے مرکب ہے اور اس کے معنی ہیں "حرم اللہ"؛ (۳) کربلاء مشرق سے جنوب تک پھیلے ہوئے ٹیلوں کا نام ہے اور اسی مناسبت سے اس آبادی کو کربلاء کہا گیا۔

لغت نگاروں اور عوامی روایات کے مطابق اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے: (۱) کربلا: پاؤں کی نرم روی کو کہتے ہیں۔ یہ زمین چونکہ نرم و کشادہ تھی اس لیے کربلا نام پایا؛ (۲) کَرْبَلَتِ الحِنطَۃَ:

www.besturdubooks.wordpress.com

گیہوں چھانے اور پھٹکے گئے ۔ چونکہ یہ زمین کنکروں سے خالی ہے، لہٰذا کربلاء کہلائی ۔

(۳) کَرْبَل : ایک کڑوی جنگلی گھاس کا نام ہے ، جو اس میدان میں بھی اُگتی تھی ۔

یہ ایک آشوری نام (کرب وایلا سے مرکب) ہے، اس خیال کی تائیداس سے ہوتی ہے کہ عراق اور اس کے مضافات میں مختلف بستیوں کے نام میں "کَر" موجود ہے، جیسے کَرکُوک اور کَرخ ۔ توفیق وہبی کے نزدیک آشوری میں کار کے معنی ہیں قلعہ یا چاردیواری سے گھرا ہوا قریہ (اصل اسم کرکوک، در مجلّۃ العِرفان، بیروت، رجب ۱۳۹۱ھ) ۔

دریاے فرات اپنے کناروں کی زرخیزی کی وجہ سے صدیوں سے آباد چلا آ رہا ہے ۔ عراق کی قدیم تاریخ میں کلدانی، تنوخی، لخمی اور مناذرہ سلطنتیں مشہور تھیں ۔ اس زمانے میں شہر حیرہ حکومت کا صدر مقام اور عین التّمر یہاں کا مشہور تجارتی مرکز تھا ۔ کربلاء ان دونوں شہروں کے درمیان آباد تھا ۔

عرب نسل کی شاخیں بنو فارم، ایاد اور عرب قبائل کے چند ایک خاندان قدیم زمانے سے ان علاقوں میں آباد چلے آتے ہیں ۔ موجودہ شہر کربلاء کے گرد دور تک پھیلے ہوے ٹیلے ہزار دو ہزار صدی قبل مسیح کے برباد شدہ شہروں کے آثار ہیں ۔ ٹیلوں کے نیچے آشوری ، بابلی ، ساسانی، اموی اور غزنوی، عہد کی تہذیبیں دفن ہیں ۔ سیّد محمّد حسن مصطفٰی کلیدار نے مدینۃ الحسین میں چوالیس ٹیلوں کے نام دیے ہیں ، جن میں خیط نینوی الکاظمی، سلسلہ تُلول نینوٰی السّاقیات بھی ہیں ۔ قریب قریب بستیوں کے آثار اور ناموں کی شہرت کے سبب تاریخ واقعۂ کربلاء کے آغاز میں جب امام حسین رضی اللہ عنہ کی آمد سے متعلق روایات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ہمیں متعدد نام ملتے ہیں ۔ حقائق سے بے خبر شخص ان ناموں کو سن کر روایات میں تضاد محسوس کرتا ہے، حالانکہ اس کی مثال یوں سمجھی جا سکتی ہے جیسے کوئی دہلی کو ہستناپور، تغلق آباد، دلّی اور شاھجہان آباد کے ناموں سے یاد کرے ۔

کربلاء کا میدان فرات کی موجودگی پر بھی قحط آب کے لیے مشہور تھا، اس لیے پرانے بادشاہوں نے نہریں کھدوائی تھیں ۔ سابور ذوالاَکتاف (۳۰۹ تا ۳۷۹ء) نے تو ایک بہت بڑا نہری سلسلہ قائم کیا تھا، جس کے مٹے ہوے آثار اب بھی ملتے ہیں ۔ اس کے بعد ایک اور نہری نظام بنا، جس کی ایک نہر ایک شخص علقمہ سے منسوب ہے ۔ یہ نہریں زمین کی نرمی، خاک کی باریکی اور دریائی مٹی کی آمد سے اٹ جاتی تھیں اور حکومتوں کی افراتفری کی وجہ سے بے آب ہو کر لوگوں کی پریشانی کا سبب بنتی تھیں ۔ لوگ کنویں کھودتے تھے، لیکن وہ بھی زیادہ کارآمد نہ تھے ۔ اس سلسلے میں احتیاطی تدبیریں کیا ہوتی تھیں اور نہروں کی صفائی کب سے ختم ہوئی ؟ اس کا پتا تاریخ سے نہیں چلتا ۔ کہتے ہیں کہ غازان خان ایلخانی نے فرات سے حِلّہ و کربلاء کے لیے نہر کھدوائی تھی اور ۷۰۳ھ میں جب وہ زیارت مشہد حسینی کے لیے آیا تو اہل کربلاء کو غلے اور خوراک کی وافر امداد دی ۔ تاریخ قدیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ میدان فرات کا کربلائی علاقہ بے آبی کی وجہ سے مشہور تھا اور تاریخ کے بعض خطرناک واقعات کی بنا پر خاص نظر سے دیکھا جاتا تھا ۔

کربلاء عہد اسلام میں : امام حسینؓ کی شہادت کا تذکرہ اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاک کربلا ملاحظہ فرمانا اور اسے سونگھنا ، نیز کربلاء کی مٹی کا حضرت ام المؤمنین ام سلمہؓ کو بطور امانت دینا، متعدد

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

شیعی مآخذ میں مذکور ہے (الصّواعق المحرقہ، قاہرہ ۱۳۱۲ھ، ص ۱۱۵ و ۱۳۸۵ھ، ص ۱۹۲) - ۳۹ھ میں جب حضرت علیؓ جنگ صفین کے زمانے میں اس طرف تشریف لائے تو کربلاء کا نام سن کر زار و قطار رونے لگے - لوگوں نے پوچھا کہ اس قدر رونے کا کیا سبب ہے؟ فرمایا: "ایک دن میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خدمت میں حاضر تھا - آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا کہ جبریلؑ نے مجھے بتایا ہے کہ حسینؓ شاطی الفرات میں کربلاء نامی جگہ شہید ہوں گے - آپؐ نے مٹھی میں خاک کربلاء لے کر مجھے سونگھنے کو دی تھی، اسی لیے مجھے رونا آ گیا" (الذّہبی: سیر اعلام النبلاء، ۳: ۱۹۴، ۱۹۵) - ایک روایت کے مطابق حضرت علیؓ مقام کربلا سے گزرتے ہوئے ایک جگہ رکے، نماز پڑھی اور فرمایا: "ھٰھنا مناخ رکابھم و ھٰھنا موضع رحالھم و ھٰھنا مُھْراق دمائھم فتیۃٌ من آل محمّد یُقْتَلُون بھذہ العرصۃ تبکی علیھم، السّماء والارض" یعنی یہاں ان کے اونٹ بیٹھیں گے، یہاں ان کے کجاوے رکھے جائیں گے اور یہاں ان کے خون بہائے جائیں گے، آل محمد کے کچھ جوانمرد یہاں قتل ہوں گے اور ان پر زمین و آسمان روئیں گے (الصّواعق المحرقہ، طبع ۱۳۸۵ھ، ص ۱۹۲؛ کمال الدّین و تمام النعمۃ، تہران ۱۳۹۱ھ، ص ۵۳۳؛ کتاب الصّفّین، ص ۱۴۰، ۱۴۲)۔

محرم ۶۱ھ کی دوسری تاریخ کو امام حسینؓ کربلاء میں خیمہ زن ہوئے - انھوں نے یہاں زمین خریدی (المقرّم: مقتل الحسین، ص ۲۳۵) اور ۱۰ محرم ۶۱ھ کو انھوں نے اسی زمین پر اپنی دائمی منزل بنائی - ان کی قبر مبارک ایک نشیب میں تھی، جس کے گرد کچھ اونچے ٹیلے تھے - اسی لیے اس مقام کو شروع شروع میں "الحائر" کہا گیا (مراصدُ الاطلاع، ایران ۱۳۱۵ھ، ص ۱۲۶؛ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے ڈاکٹر عبد الجواد: تاریخ کربلاء و حائرالحسین، ص ۱۷ ببعد)۔

صفر ۶۲ھ/۶۸۲ء میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری کربلا آئے تھے اور اہل بیت بھی شام سے رہائی حاصل ہونے کے بعد یہاں آئے (المقرّم: مقتل الحسین، ص ۳۶۷) - اس زیارت کی یاد میں اب تک ۲۰ صفر کو کربلا میں خاص دن منایا جاتا ہے۔

شعبان ۶۵ھ/۶۸۵ء تک کربلا کی آبادی کا باعث یا تو زائرین تھے یا غاضریہ اور لینوا کے باشندے - ۶۵ھ میں ابو اسحٰق مختار بن ابی عبید الثقفی نے بنو امیّہ کے خلاف بغاوت کی اور اسی زمانے میں مزار امام حسینؓ پر ایک چھوٹی سی عمارت بنوائی، جس کا ایک دروازہ مشرق کی طرف تھا اور ایک مغرب کی جانب - ایک مسجد بھی تعمیر ہوئی - اس سے قبل وہاں ایک بیری کا درخت تھا جسے باقی رکھا گیا - اس عمارت اور درخت کو ہارون الرشید نے ختم کر دیا - المأمون نے اپنے دور میں دوبارہ یہ عمارت بنوائی، لیکن المتوکل نے اسے گرا دیا (الطبری، ۱۱: ۴۴؛ تاریخ الرّوضۃ الحسینیہ، ص ۹؛ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مقالہ کربلا، تاریخ و تعمیر، در رضا کار، لاہور، محرم ۱۳۹۱ھ) - اس کے بعد تاریخ وار تعمیر و تجدید کا خلاصہ یہ ہے:

المنتصر باللہ (۲۴۷ھ/۸۵۹ء ببعد) نے نئے سرے سے روضہ بنوایا اور راستے میں نشان راہ نصب کیے - ۲۷۳ھ/۸۸۵ء میں یہ عمارت عرفے کے دن منہدم ہوگئی (محمّد حسن: تاریخ کربلاء، ص ۸۹)۔

۲۸۳ھ/۸۹۶ء میں محمّد بن محمّد بن زید، حاکم طبرستان، نے ایران سے پتھر بھیج کر شاندار عمارت تیار کرائی۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

بقول ابن حوقل (طبع ڈخویه، ص ۱۶۶) - ۳۶۱ھ/۹۷۷ء میں یہاں ایک وسیع گنبد دار عمارت موجود تھی اور زائرین کثیر تعداد میں آتے تھے - کچھ عرصے بعد ضبّہ بن محمد الاسدی نے، جو عین التمر کے متعدد قبائل کا سردار تھا، مشہد الحائر اور دیگر عمارات کو منہدم کرا دیا، جس پر ۳۶۹ھ/۹۷۹ء میں اس کے خلاف ایک مہم بھیجی گئی اور وہ صحرا کی طرف بھاگ گیا (ابن مسکویه، در *The Eclipse of the Abbasid Caliphate*، ۲ : ۳۳۸، ۴۱۴) - اسی سال عضد الدّولہ بویہی نے مشہد، نجف اور مشہد کربلاء کی نگرانی اپنے ذمّے لے لی (ابن الأثیر، ۸ : ۵۱۸ ؛ المستوفی، محل مذکور] اور عمران بن شاهین نے روضے کی تجدید کی .

۳۷۰ھ/۹۸۰ء میں عضد الدّولہ بویہی نے زیارت کے لیے حاضری دی اور دو شاندار کشادہ حرم اور ضریح کے ایوان پر بڑا گنبد تعمیر کرنے کے علاوہ اندرونِ حرم آرائش و زیبائش، روشنی اور آبادی کا انتظام کیا .

۴۰۲ھ میں بہاء الدّولہ کے وزیر نے قیمتی ہدیے نذر کیے - ۴۰۷ یا ۴۰۸ھ میں حسن بن فضل وزیر نے آتش زنی کے بعد از سر نو روضے کی رونق بحال کی .

۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء میں ملک شاہ سلجوقی زیارت سے مشرف ہوا - اسی نے شہر پناہ کی تعمیر اور تجدید عمارت کا فریضہ انجام دیا - ۶۲۰ھ/۱۲۲۳ء میں ناصرالدّین اللہ نے تزئین کرائی - ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں سلطان ابوسعید بہادر خاں بن خدا بندہ کے عہد میں ابن بَطُّوطہ زیارت کے لیے آیا - اس کا بیان ہے : "یہ چھوٹا سا شہر کھجور کے باغوں سے گھرا ہوا ہے - فرات کا پانی زمین سیراب کرتا ہے - وسط شہر میں روضہ ہے - اس میں ایک بہت بڑا مدرسہ اور مہمان خانہ [زاویہ] ہے، جہاں مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے - روضے کے دروازے پر حاجب و دربان ہیں، جن کی اجازت کے بغیر اندر جانا ممکن نہیں - آستانۂ مقدس کا دروازہ چاندی کا ہے ؛ [ضریح مبارک پر سونے اور چاندی کی قندیلیں آویزاں ہیں] اور دروازوں پر ریشم کے پردے ہیں" (تُحْفَۃُ النُّظّار، [قاہرہ ۱۲۸۸ھ، ۱ : ۱۳۲]) .

۷۴۰ سے ۸۲۷ھ تک ایلخانی امرا اور آل جلائر کی بغداد پر حکمرانی رہی، جنھوں نے روضے کی نگہداشت کی - حسن [الجلائری] ۷۵۷ھ میں فوت ہوا تو نجف اشرف میں دفن کیا گیا - مرجان نے، جو اس کے فرزند اُویس کی طرف سے بغداد کا نائب مقرر تھا، بغاوت کر کے کربلاء میں پناہ لی اور اپنی تمام املاک روضے کے لیے وقف کر دیں - اس نے صحن کے شمال مشرق میں ایک شاندار عمارت بنوائی، حرم میں مینار بنوائے اور ان پر سونا چڑھوایا (۷۶۷ھ) ؛ مَرْجان کا مینار اور کچھ اور آثار ۱۳۵۲ھ میں منہدم کرا دیے گئے (تاریخ کربلاء، ص ۱۱۴) - اس کے بعد دو تین سو برس میں کربلاء زیارت گاہ عام اور ایک آباد و با رونق شہر ہو گیا - (مدینة الحسین، ص ۱۰۵ ببعد) .

دسویں صدی کے آغاز میں صفویوں نے عراق کا رخ کیا - [۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء تک] شاہ اسمٰعیل عراق اور الجزیرہ وغیرہ پر قابض ہو گیا اور روضۂ امام حسینؓ پر حاضری دی - اس نے شاہانہ حوصلے سے روضے کی تجدید کی اور ایک چاندی کی ضریح نذر کی - [سلطان سلیمان قانونی کے عہد میں عراق ایک بار پھر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا - ۹۴۲ھ/۱۵۳۴ء میں سلطان زیارت کے لیے آیا اور نہر الحسینیہ کی مرمت کرانے کے علاوہ ویران اراضی پر باغات لگوائے - ۹۸۲ھ/۱۵۸۴ء میں منارۃ العبد (قبل ازیں موسوم بہ انگشت یار) تعمیر ہوا - ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء میں سلطان مراد ثالث کے حکم سے بغداد کے والی]

www.besturdubooks.wordpress.com

علی پاشا نے گنبد اور عمارت کو دوبارہ بنوایا ۔ ۱۰۳۲ھ میں شاہ عباس اوّل نے قبر کو سادہ دیکھ کر فولادی ضریح نصب کروائی اور ایوان میں کاشی کاری اور فرش کے لیے قالین کا انتظام کیا ۔ ۱۰۴۷ھ میں سلطان مراد رابع نے گنبد کی مرمت اور بورق سفید سے پوری عمارت پر استر کاری کروائی ۔

۱۱۳۵ھ میں نادر شاہ افشار کی ملکہ نے بڑے پیمانے پر تمام عمارتوں کو بنوایا اور بہت بڑا وقف قائم کیا ۔ ۱۱۵۵ھ میں نادر شاہ خود حاضر ہوا اور حرم میں از سر نو کاشی کاری، آئینہ کاری، اور سونے چاندی کا کام کروایا ، بیش بہا ہدیے پیش کیے اور انتہائی آب و تاب بخشی (بیان واقع، مطبوعۂ لاہور، ص ۱۳۱) ۔

۱۲۱۱ھ میں محمّد شاہ قاجار نے گنبد اور میناروں پر سونا چڑھوایا ۔

۱۸ ذوالحجہ ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۲ء میں [محمّد بن] عبدالوہّاب نجدی کے متبعین نے کربلاء پر حملہ کیا، قتل و غارت گری کے علاوہ ان لوگوں نے کربلاء کے روضے لوٹ لیے اور تمام اسباب لے گئے (اَعْیَان الشیعہ، ۴/۱ : ۴۰۴) ۔ فتح علی شاہ قاجار نے اس نقصان عظیم کی شاندار تلافی کی ۔ اب کی مرتبہ کربلاء کی تاریخی تعمیر و آرائش ہوئی اور ۱۲۲۷ھ میں روضۂ انور از سرنو مطلاّ کیا گیا ۔ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء میں اسی بادشاہ نے حضرت امام حسینؓ اور حضرت عباسؓ کے روضوں کے گنبدوں پر سونا چڑھوایا ۔ ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۵۹ء میں ناصر الدّین شاہ قاجار نے دوبارہ زرکثیر خرچ کرکے طلا کاری کرائی ۔ ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء میں وہ خود زیارت کے لیے حاضر ہوا اور بہت سے مکانات خرید کر حرم کی توسیع کی اور اوقاف قائم کیے ۔

اس کے بعد سے اب تک کم و بیش کربلاء اور اس کے مقدس مزارات مسلسل دیکھ بھال کی وجہ سے محفوظ ہیں ۔ اہل دل حسب حیثیت خدمت کرتے رہتے ہیں، مثلاً ۱۳۴۱ھ میں سیّد محمّد خزینہ نے مشرقی دروازے پر گھڑی نصب کی ؛ ۱۳۵۸ھ میں بوہروں کے داعی اعظم مُلّا طاہر سیف الدین نے کئی لاکھ روپے کے صرف سے گنگا جمنی ضریح نذر کی، جو قبر اقدس پر موجود ہے ؛ ۱۳۸۶ھ میں ایک ایرانی تاجر قنبر رحیمی نے سبز رنگ کا بہترین ایرانی سنگ مرمر بھیجا تاکہ از سر نو ایوان تیار کیا جائے ۔ اسی انداز پر روضۂ حضرت عباس [اور دوسرے بزرگوں کے مقابر] کی تعمیر و تزئین ہوتی رہی ۔

راقم الحروف نے ۱۳۸۹ھ میں زیارت کے موقع پر پورا شہر، سرسبز و شاداب، صاف و شفاف اور حضرت امام حسینؓ اور حضرت عباسؓ کے روضوں کو انتہائی شان و شوکت کے عالم میں دیکھا تھا ۔ ۲۰ صفر کو دنیا بھر کے زائر شہر میں جمع ہوتے ہیں اور دن رات شدید ماتم ہوتا ہے ۔ اس دن کو "اربعین" کی مخصوصی کہتے ہیں ۔ دوسرا اہم اجتماع ۹ ذوالحجّہ کو ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ رجب، شعبان اور محرم کے دس دن کربلاء میں دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں ۔

برصغیر پاک و ہند کے سلاطین ، امرا ، تجار ، اور اہل خیر حضرات بھی صدیوں سے ان روضوں کی خدمت کرتے چلے آ رہے ہیں ، سلاطین ہند میں سے محمّد بن تغلق (م ۷۵۲ھ) نے بُغْدَن نامی امیر کے ہاتھ ایک کروڑ تنکے (تقریباً ڈھائی لاکھ روپے) عراق کے مقامات مقدسہ کے لیے بھیجے (خلیق احمد : سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، دہلی، ص ۳۸۰) ۔ سلاطین دکن نے بھی ہدیے بھیجے ۔ کچھ بعید نہیں کہ عہد تیموریان ہند میں بھی کچھ خدمتیں انجام دی گئی ہوں ۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

سلطان ٹیپو کے ترکی وفد کا ذکر کرتے ہوے احمد جودت پاشا (تاریخ دولت علیہ، استانبول ۱۲۹۸ھ) نے لکھا ہے: "سید غلام علی شاہ، نور اللہ خان، وغیرہ نے ۲۱ ربیع الآخر ۱۲۰۱ھ میں رئیس الکُتّاب سلیمان فیضی افندی سے ملاقات کی اور مختلف مسائل کے علاوہ یہ بھی کہا کہ ٹیپو سلطان التماس کرتے ہیں کہ مکّۂ مکرّمہ، مدینۂ منوّرہ، نجف اشرف، کربلاے معلّٰی، مشہد امام علی المرتضٰی (شاید علی نقی، یعنی کاظمین) اور خانقاہ پیر عبدالقادر جیلانی میں چاندی کے دروازے نصب کرنے اور ان سب کے ساتھ ایک ایک مسافر خانہ اور اس کے اوپر ایک ایک نوبت خانہ، جہاں طبل و کوس بجایا جائے گا، تعمیر کرنے کے لیے اجازت شاہانہ دی جائے (شریف الحسن: در مجلۂ اردو، کراچی، جون ۱۹۷۰ء، ص ۵)۔ اسی طرح آصف الدّولہ نواب اودھ (م ۱۲۱۲ھ) نے کربلاء اور نجف میں متعدد عمارتیں بنوائیں؛ نجف کی نہر آصفی آج تک اسی کے نام سے منسوب ہے (نجم الغنی، ۲: ۲۴۵؛ ماضی النجف و حاضرها، ص ۱۳۱)۔ [اودھ کی] نواب بہو بیگم صاحبہ نے اپنے وقف نامے میں ایک لاکھ روپیہ سالانہ کربلا و نجف کے لیے وقف کیا (طوطا رام: طلسم ہند، ص ۳۷۵)۔ محمّد علی شاہ کی اہلیہ نواب ملکۂ جہاں (م ۹ جولائی ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء) جب زیارت کو گئیں تو اپنے مرحوم شوہر کا تاج اور شمشیر مرصع روضۂ حضرت علیؓ کی نذر کرکے لاکھوں روپے اہل کربلاء و نجف پر خرچ کرکے آئیں (حکیم محمّد نقی: منہاجُ الزائرین، لکھنؤ ۱۳۳۱ھ، ص ۵۰) اور بہت بڑی املاک وقف کی۔

نوابان اودھ کے بعد ریاست ہاے رام پور، محمود آباد اور خیرآباد کے فرمانرواؤں اور لاہور کے قزلباش خاندان نے بھی بڑی دریا دلی سے کربلاء کی خدمت کی۔ ان کے اوقاف اور مقابر و عمارات اب تک کربلاے معلّٰی میں باقی ہیں۔

[کربلا جمہوریۂ عراق میں اسی نام کے ایک صوبے کا صدر مقام ہے۔ ۱۹۷۰ء میں یہاں کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ تھی]۔ بغداد سے کربلاء تک بہت اچھی سڑک جاتی ہے، جس پر اعلٰی درجے کی بسیں اور ٹیکسیاں چلتی ہیں۔ کئی میل دور سے فضا میں چمکتے ہوے چار سنہری مینار اور دو طلائی گنبد نظر آتے ہیں۔ اس خوبصورت اور نو تعمیر شہر میں حضرت عباسؓ اور حضرت امام حسینؓ کے روضے فن تعمیر و تزئین کے اعلٰی نمونے ہیں، جہاں شب و روز ہزاروں زائرین نماز و تلاوت قرآن، زیارت اور دعا کرتے نظر آتے ہیں۔

مآخذ: متن مقالہ میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ دیکھیے (۱) ڈاکٹر عبدالجواد الکلیدار: تاریخ کربلاء و حائر الحسین علیہ السلام، بغداد ۱۳۶۸ھ؛ (۲) سیّد محمّد حسن مصطفٰی آل کلیدار: مدینۃ الحسین اور مختصر تاریخ کربلاء، ایران ۱۳۶۸ھ؛ (۳) عبدالحمید الخیّاط: تاریخ الرّوضۃ الحسینیہ، المصور، بغداد ۱۳۷۶ھ؛ (۴) سیّد غلام علی احسن: رہبر زائران، آگرہ ۱۳۵۳ھ؛ (۵) سیّد طیب آغا الجزائری: تاریخ کربلاء و نجف، لاہور ۱۹۶۲ء؛ (۶) مرتضٰی حسین فاضل: تاریخ کربلاء، تاریخ و تعمیر، در ہفت روزۂ رضا کار، لاہور محرم ۱۳۹۱ھ؛ (۷) وہی مصنف: تاریخ روضۂ حضرت عبّاس، در ہفت روزۂ شیعہ، لاہور، محرم ۱۳۹۱ھ۔

(مرتضٰی حسین فاضل [و ادارہ])

کَرْت: ایک شاہی خاندان، جس نے [۶۴۳ھ/] ۱۲۴۵ء سے [۷۹۱ھ/] ۱۳۸۹ء تک ہرات پر حکومت کی۔ اس کی بنیاد شمس الدّین محمّد اوّل کَرْت نے رکھی تھی جو غور کے شَنْسَبانی گھرانے سے تھا۔ یہ گھرانا وہی ہے جس کے افراد میں غیاث الدّین محمّد اور معزّالدّین محمّد بن سام دونوں بھائی شامل ہیں۔ *

www.besturdubooks.wordpress.com

چنگیز خان کی فوجوں کی تاخت و تاراج کے بعد جب ہرات کی حالت کچھ سدھر گئی تو شمس الدّین نے رفتہ رفتہ اقتدار حاصل کر لیا اور ۱۲۴۵ء تک یہاں اس کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس نے بالآخر مَلِک کا خطاب اختیار کیا، جسے اس کے جانشین بھی استعمال کرتے رہے۔ ۱۲۵۱ء میں جب خان اعظم مَنْگو [قاآن] اپنی سلطنت کا نظم و نسق درست کر رہا تھا تو اس نے شمس الدّین کرت کو ہرات، سیستان، بَلخ اور اس علاقے کا والی برقرار رکھا جو ان صوبوں اور ہندوستان کی سرحد کے درمیان تھا۔ شمس الدّین کے عہد کے آخری ایام میں اس کا بیٹا رکن الدین کاروبار حکومت میں اس کا شریک رہا، لیکن ۱۲۸۳ء میں وہ باپ کی زندگی ہی میں وفات پا گیا۔ ۱۲۸۵ء میں شمس الدین کا انتقال ہوا تو رکن الدّین کا بیٹا فخر الدّین اس کا جانشین ہوا۔ جس وقت ایران کے ایلخانی مغول بادشاہوں کی طاقت زوال پذیر تھی، ہرات کے کرت ملوک کا اقتدار بڑھ رہا تھا۔ فخر الدین نے اس زمانے کے طاقتور امیر چوبان سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے، جو چودھویں ایلخانی بادشاہ ابوسعید بہادر خان کی کمسنی کے دوران میں ایران کا نائب السلطنت رہ چکا تھا [دیکھیے ذیل جامع رشیدی، ص ۶۹]۔ جب ابوسعید بہادر نے چوبان کے خاندان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف ہو کر اس پر حملہ کیا تو امیر چوبان نے غیاث الدّین کے ہاں پناہ لی۔ غیاث الدّین نے اسے پناہ تو دے دی، لیکن ۱۳۲۷ء میں اسے اور اس کے بیٹے جَلَو خان کو غداری سے قتل کر ڈالا [دیکھیے ذیل جامع رشیدی، ص ۱۳۲ ببعد]۔ خود غیاث الدّین ۱۳۲۸ء میں فوت ہو گیا اور اس کے دو بڑے بیٹے شمس الدّین ثانی اور حافظ، جو یکے بعد دیگرے اس کے جانشین قرار پائے تھے، علی الترتیب ۱۳۲۹ء اور ۱۳۳۱ء میں وفات پا گئے۔ حَمْداللہ المستوفی مؤرخ کا کہنا ہے کہ اتنے مختصر وقفوں سے ان باپ بیٹوں کا لقمۂ اجل ہو جانا قہر خداوندی کا نتیجہ تھا، جو ان پر امیر چوبان سے غیاث الدین کی غداری کی وجہ سے ٹوٹا۔

حافظ کے بعد اس کا تیسرا بھائی معز الدین تخت نشین ہوا۔ اس نے کرمان کے ملک قطب الدین کی مدد کے لیے جسے امیر مبارز الدّین نے اس کے دارلسلطنت سے نکال باہر کیا تھا، فوج روانہ کی، لیکن فوج نے ہزیمت اٹھائی۔ پھر قطب الدّین کی اعانت کے لیے ایک اور لشکر بھیجا گیا جو کرمان میں محصور ہو گیا اور بالآخر ۱۳۴۰ء کے اواخر میں اسے ہتیار ڈالنے پڑے۔ معزّ الدّین کا انتقال ۱۳۷۰ء میں ہوا۔ اس نے دو بیٹے چھوڑے: محمّد، جو سَرخْس کا والی تھا، باپ کی وفات کے بعد بدستور وہاں کا والی رہا اور دوسرا بیٹا غیاث الدّین پیر علی ہرات میں معزّ الدّین کا جانشیں قرار پایا۔ ۱۳۸۰ء میں امیر تیمور نے ایک قاصد ہرات بھیجا تاکہ [آغاز بہار میں جب امرا اور بڑے بڑے نواب "قور لتای" کے لیے جمع ہوں تو] وہ بھی ایک دستۂ فوج کے ساتھ حاضر ہو، لیکن غیاث الدّین پیر علی نے قاصد کو لطائف الحیل سے روکے رکھا اور اس دوران میں شہر کے اندر ضروری سامان خوراک جمع کر کے اس کے دفاعی استحکامات مکمل کر لیے۔ قاصد کو ناچار اپنی سفارت کی ناکامی کی اطلاع دینے کے لیے سمرقند لوٹنا پڑا [ظفرنامۂ یزدی، ۱: ۳۰۳]۔ ۱۳۸۱ء کے موسم بہار میں امیر تیمور نے ہرات کی جانب یلغار کی اور چند روز کے محاصرے کے بعد شہر پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے والی اور اس کے سب سے بڑے بیٹے پیر محمّد کو گرفتار کر لیا، ہرات کے بعض ممتاز شہریوں کو شہر سبز میں جلا وطن کر دیا گیا، تمام استحکامات مسمار کر دیے گئے [اور ہرات کے آہنیں دروازے جنھیں نقوش اور

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

کتبوں سے آراستہ کیا گیا تھا سمرقند منتقل کر دیے گئے] ۔ مَلِک اور اس کے دو بیٹوں کو معاف کر دیا ۔ ان میں سے چھوٹے بیٹے (امیر غوری) کو اشکلچہ کا مستحکم قلعہ حوالے کر دینے پر آمادہ کر لیا گیا تھا ۔ غیاث الدّین پیر علی کو تیمور کے باج گزار کی حیثیت سے ہرات پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی گئی، تاآنکہ ۱۳۸۹ء میں اس خاندان کا چراغ گل ہوگیا ۔

مآخذ : (۱) الجُوَیْنی : تاریخ جہان گشای؛ (۲) حَمْد اللہ المُسْتوفی القزوینی : تاریخ گزیدہ، یہ دونوں کتابیں سلسلۂ یادگار گب میں شامل ہیں؛ (۳) کرت نامہ صدرالدّین خطیب بوشنجی جو اب ناپید ہے، مگر تاریخ نامۂ ہرات کے مختلف مقامات میں بقول مصحح کتاب مذکور اس کے ۲۵۰ بیت نقل ہوے ہیں)؛ (۴) مولانا شرف الدّین علی یزدی : ظفر نامہ، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے سلسلۂ مطبوعات میں؛ (۵) شہاب الدّین احمد بن عرب شاہ : عجائب المقدور فی اخبار تیمور، طبع کبیر الدّین احمد، کلکتہ ۱۸۸۲ء؛ (۶) سیف بن محمّد الہروی : تاریخ نامۂ ہرات طبع محمّد زبیر صدیقی، کلکتہ ۱۹۴۳ء، ص ۱۴۱ تا ۷۸۶؛ (۷) حافظ ابرو : تاریخ و نسب ملوک کرت، دیکھیے فہرست مخطوطات تاریخی، در کتاب خانہ ہاے استانبول؛ (۸) حافظ ابرو : ذیل جامع التّواریخ رشیدی، طبع دکترخان بابا بیانی، تہران ۱۳۱۷ھ، ص ۱۸ ببعد و بمواضع دیگر بمدد اشاریہ خصوصًا بذیل فخر الدّین ملک، غیاث الدّین ملک و امیر چوبان؛ (۹) معین الدّین اسفزاری : رَوْضات الجَنّات فی تاریخ ہرات، نسخۂ دانش گاہ پنجاب، ورق ۹۷ تا ۱۶۱]؛ (۱۰) Stanley Lane Pool : *The Mohammadan Dynasties*، لنڈن ۱۸۹۴ء ۔

(T. W. Haig)

* **الکُرَۃ** :(ع؛ گلوب، Sphere)؛ عربوں نے کُرے کے خواص کا اقلیدس، آرشمیدس اور تھیوڈوسیس کے تتبع میں مطالعہ کیا تھا ۔ انھوں نے علمِ مثلث کروی کے بعض ایسے اصولوں سے بھی بحث کی تھی جو نظریۂ علم ہیئت کے بنیادی اصول ہیں، یعنی "شکل القطاع" (Transversal) کا اصول، چار مقادیر کا اصول (شکل المُغْنِی) اور سائے یعنی Tangent کے اصول سے (الشّکل الظِلّی)، مینلاس Menelaus اور بطلمیوس کے تتبع میں (ترجموں کے بارے میں دیکھیے M. Steinschneider، در *ZDMG*، ۱۸۹۶ء، ۱ : ۱۶۱ ببعد؛ ریاضیات کے اصولوں سے H. Bürger و K. Kohl نے بحث کی ہے : *Axel Bjornbo Thabits Werk über den Transversalensatz*، در *Abhandl. zur Gesch. Der Naturwissenschaft und Medizin*، ۱۹۲۴ء، جزو ۷، ص ۱ تا ۹۱، وہاں قدیم ترکتابوں کے حوالے بھی دیے گئے ہیں ۔

۲۔ الکرۃ ذات الکرسی (گولا مع محور axe کے) دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے :

(الف) آسمانوں یا افلاک کا کرہ (کرہ کے بدلے ہم اسی مفہوم میں لفظ البیضۃ (=انڈا) بھی پاتے ہیں جیسے مثلًا در مفاتیح العلوم؛ ص ۲۳۵؛ البتانی : *Opus Astronomicun*، طبع C. A. Nallino، ۱۹۱۳ء، ۱ : ۱۳۸؛ E. Wiedemann : *Beitr*، ج ۳، *SBPMS*، *Erlg*، ۱۹۰۵ء، ۳۷ : ۲۳۹ ببعد) ۔ مجموعۂ نجوم (Constellations) کو کرے پر نقش کیا جاتا ہے ۔ اسے ایک چوڑی (ring) میں رکھ دیا جاتا ہے جو تین یا چار پایوں پر نصب ہوتی ہے ۔ ایسے کرے شاید ہپارکس Hipparchus نے بھی اپنے زمانے میں تیار کیے تھے اور ان کا بیان لکھا تھا، اور بہرحال بطلمیوس نے تو یہ کرے بنائے تھے ۔ بطلمیوس کا بیان المجسطی کے عربی ترجموں اور بعض علٰحدہ رسالوں میں دیا گیا ہے ۔ ثانیے کا ایک کرہ، جو غلط طریقے پر بطلمیوس سے منسوب کیا جاتا ہے، ابن السندبدی [=ابن السنبدی] نے ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء ۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۱۰۴۴ء میں قاہرہ میں دیکھا تھا (دیکھیے ابن القفطی، ص ۴۴۰ [جہاں چاندی کے ایک بڑے وزنی کرے کا بھی ذکر ہے جو صوفی ابو الحسین نے عضد الدّولہ کے لیے بنایا تھا])۔ کچھ کرے لکڑی کے بنائے جاتے تھے اور ان پر کاغذ یا مختلف دھاتوں کا خول چڑھا دیا جاتا تھا۔ دھات کے کھوکھلے کرے بھی بنائے جاتے تھے اور انھیں پھر لکڑی کے کروں سے باندھ دیا جاتا تھا۔ عَلَم الدّین قیصر التعاسیف ایک لکڑی کا کرہ استعمال کرتا تھا جس پر سنہری ملمع تھا (ابو الفداء، طبع Reiske، ۴: ۴۷۹، H. Suter، عدد ۳۵۸)۔ ان کروں کی تیاری اور ان غلطیوں سے جو ان میں واقع ہوتی ہیں، البیرونی نے تفصیلی بحث کی ہے (*Beiträge zur Gesch. der Mathematik.* وغیرہ، در *Abhandl. zur Gesch. der Naturwiss. und Medizin.*، جزو ۴، ۱۹۲۲ء، ص ۷۹ تا ۹۳)۔

وہ آلۂ ہیئت جو الادریسی نے (صقلیہ کے) شاہ روجر Roger کے لیے تیار کیا تھا، بظاہر ایک چوڑی دار کرہ تھا۔

(ب) "الکرۃ ذات الکرسی" ایک ایسا آلہ بھی ہے جس سے افلاک کی حرکتوں کا پتا چلتا ہے۔ افقی چوڑی کا رخ افق کی جانب رکھا جاتا ہے۔ اس میں دو متقابل نقطوں پر زاویۂ قائمہ بناتے ہوئے دو کھانچے بنائے جاتے ہیں۔ ان کھانچوں میں دائرۂ نصف النہار (meridian) کی چوڑی رکھی جاتی ہے اور اسے ایک نالی (groove) میں اپنی سب سے نیچے کی جگہ پر جانے دیا جاتا ہے۔ خود کرہ ایک محور کے گرد گھومتا ہے جسے نصف النہار کی چوڑی میں دو متقابل نقطوں پر گول سوراخوں میں رکھ دیا جاتا ہے۔ افقی اور نصف النہار کی چوڑیوں پر تقسیم کے نشانات بنا دیے جاتے ہیں۔ نصف النہار کی چوڑی کو اس کے کھانچوں میں گھمانے سے کرے کے محور کو حسب مرضی افق کی جانب جھکایا جا سکتا ہے اور اس طرح یہ آلہ سب اعراض البلد (latitudes) کے لیے استعمال ہوسکتا ہے۔ ایک ربع دائرۂ زاویہ پیما (quadrant) کے ذریعے جس پر تقسیم کے نشانات ہوتے ہیں اور جسے کرے پر ٹکا سکتے ہیں کئی اقسام کی پیمائشیں کی جا سکتی ہیں۔ اس کرے سے ہیئت کی اہم مقادیر، الطالع، المطالع، زمین کے سہاروں (props.) وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

اس موضوع پر قدیم ترین عربی تصنیف قُسطا بن لوقا [رک بآں] کی ہے، مثلاً طبع المرّاکشی۔ ممکن ہے کہ اس کا تعلق اصل کلاسیکی تصانیف سے ہو، جو ان تعلقات کی بنا پر جو مصنف کے یونانیوں سے تھے، اغلب معلوم ہوتا ہے۔ اس کا لاطینی میں ترجمہ بھی ہوا تھا اور اسپانوی زبان میں قشتالہ کے الفانسو Alfonso نے بھی کیا تھا (*Libros del Saber*، ج ۱)۔

اگر کرے کو خارج کر دیا جائے اور افقی اور نصف النہار کی چوڑیوں میں کئی ایسی چوڑیوں کا اضافہ کر دیا جائے، جو دوائر افلاک کے مطابق ہوں تو یہ چوڑی دار (armillary) کرہ بن جاتا ہے (آلۃ ذات الحَلَق)، یعنی وہ چوڑی دار آلہ جس پر قدیم لوگوں، عربوں اور بالخصوص قشتالہ کے الفانسو نے بہت محنت اور توجہ سے کام کیا ہے۔

مآخذ: (۱) B. Dorn: *Drei astrononische Instrumente*، در *Mém. de l' Acad. impériale des Sciences de St. Petersbourg.*، سلسلہ ۷، ج ۹، عدد ۱، ص ۳۱؛ (۲) L. Am. Sedillot: *Mém. sur les instruments astronomiques des Arabes*، در *Memoires présentes par divers savants 'a l' Acad. R. des inscriptions,*، پیرس ۱۸۴۴ء، سلسلہ ۱، ۱: ۱ تا ۲۲۹؛ (۳) F. Nolte: *Über die Armillarsphäre*

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

abhandl. zur gesch. Natuwissensch، وغیرہ ۲ : ۱ تا ۵۰، Nolte نے قدیم تر کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

۳۔ الکرۃ المحرّقہ : جلانے والا کرہ، قدیم لوگوں کو بھی بلور اور شیشے کے بنے ہوئے کروں کی یہ خاصیت معلوم تھی کہ وہ سورج کی اس روشنی کو جو ان پر پڑتی ہے ایک نقطے پر مرتکز کر دیتے ہیں اور وہاں جو جلنے کے قابل چیز ہو اسے جلا دیتے ہیں، لیکن ہمیں ایسی کچھ علامات نظر نہیں آتیں کہ کسی قدیم عالم نے اس مظہر کے نظریے سے بحث کی ہو۔ ابن الہیثم اور کمال الدّین الفارسی نے اس نظریے کا بہت قابلیت سے مطالعہ کیا۔ ابن الہیثم اپنی بحث کی ابتدا اور روشنی کی کسی ایسی شعاع کے، جو شیشے کی صاف اور چکنی سطح پر پڑتی ہے، زاویۂ وقوع، زاویۂ انحراف اور زاویۂ انتشار کی اقدار سے کرتا ہے، جنھیں بطلمیوس کی ایک جدول میں بیان کیا گیا ہے اور جنھیں اس نے خود بھی جمع کیا تھا۔ وہ اس راستے کی تحقیق کرتا ہے جو شعاعیں اس وقت اختیار کرتی ہیں جب وہ محور سے، جسے سورج اور کرے کے درمیان کھینچا گیا ہو، کرے کی سطح پر مختلف فاصلوں سے آ کر گرتی ہیں۔ ان تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انتشار کے بعد یہ سب شعاعیں کرے کی بالمقابل سطح پر ایک چھوٹی سی جگہ (Section) میں باہم مل جاتی ہیں اور وہاں سے وہ پھر اس طرح باہر نکلتی ہیں کہ ان کی سمت بدل جاتی ہے اور وہ محور کو کرے سے مختلف فاصلوں پر قطع کرتی ہیں؛ تاہم ان میں سے پیشتر ایک نقطے پر مل جاتی ہیں جو کرے کے نصف قطر سے کم فاصلے پر ہوتا ہے اور یہی جلانے کا نقطہ ہوتا ہے۔ اگر شعاعوں کی اس مخروط (cone) میں جو اس نقطے سے نکلتی ہوئی شعاعوں سے بنتی ہے، کچھ اشکال یا تصاویر (drawings.) رکھ دی جاتی ہیں، مثلاً ایک مدور سرخ سطح جس پر ایک سیاہ چوڑی ہو اور انھیں کرے کے سامنے سے دیکھا جائے تو عجیب و غریب شکلیں نظر آئیں گی۔ ابن الہیثم اور کمال الدّین نے ان سے بھی بہت مفصل بحث کی تھی اور وہ اسی زمانے میں ان نتائج تک پہنچ گئے تھے جن تک ان کے بعد کے زمانے میں Sehellbach پہنچا۔

مآخذ (۱) J. Wurschmidt : *Die Brennkugal*، در *Monatschefte für den naturwissenschaftl unterricht*، ۱۹۱۱ء، ۴ : ۹۸ تا ۱۱۳؛ (۲) E. Wiedemann : *Beitr.*، ج ۹، *Über die Brechung des Lichtes in kugeln nach Ibn al-Haitam una Kamal al Din al-Farisi*، در *Erlg. SBPMS*، ۱۹۱۰ء، ۴۲ : ۱۵ تا ۲۸، نیز دیکھیے حوالے، در مقالات قوس، قزح، کمال الدّین الفارسی۔

(E. WIEDEMANN)

کرْج : (گرجستان) (روسی = گرزجہ Gruzija؛ * فارسی اور ترکی = گُرْدُسْتان اور گُرْجِسْتان اور گرجستانی = Sakharthvello) وسیع تر مفہوم میں مغربی اور وسطی ماوراے قفقاز (Transcaucasia) کا وہ علاقہ جس میں خسر تویلی (Khartwelian) زبان بولنے والے لوگ بستے ہیں اور جو بحیرۂ اسود سے لے کر تفلس کے شمال مشرق میں ۶۰ میل سے زیادہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سے محدود تر معنوں میں مراد عملی طور پر تفلس کا ضلع یا صوبہ (gouverne-ment) ہے۔ جغرافیے کے نقطۂ نظر سے جو اب بھی کسی حد تک درست سمجھا جاتا ہے، گرجستان کختھیا Kakhethia کے صوبوں اور ضلعوں نیز تھشتھیا Thushethia، پشویا Pshawia و خوسریا Khewsuria، کرتھلیا Karthlia، امرتھیا Imerethia، گُریا Guria، مِنگرلیا Mingrelia اور مشْخیا Meskhia

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کے کوهستانی اضلاع پر مشتمل هے ۔ خرتویلی (Kharthwelion) زبانوں میں گرجستانی، منگرل، لیسی (Lasian) (آخرالذکر زبان صرف ترکی سرحد کے انتہائی جنوب مشرقی گوشوں میں بولی جاتی هے بحالیکہ لیْسیْ Lases جنھیں Ts' ans تشْنَن بھی کہا جاتا هے ترکی میں رهتے هیں) اور سوانی (Swanian) زبانیں شامل هیں ۔ مؤخرالذکر زبان سَوَنتھیا Swanethia میں اور منگرل زبان منگرلیا میں بولی جاتی هے ۔ بیشتر خرتویلی (Kharthwel) لوگ عیسائی هیں اور قدیم یونانی کلیسا سے تعلق رکھتے هیں ۔ صرف بعض مقامات پر انھوں نے اسلام قبول کر لیا هے، جیسے انتہائی مشرقی علاقے میں، سَکتھَل Sakathal کے ضلع میں اِنگلوس Engiloes نے (گرجستانی زبان) نیز سارے جنوب مشرقی علاقے اور باطوم کے ضلع میں Adjars اجر نے (لَیْسیْ Lases بھی مسلمان هیں) ۔ گرجستان میں ضلع چُروچ Čoroch میں اور کُوْرَہ نْدی کے بالائی مجرٰی، یعنی ضلع اردگن Ardagan اور اضلاع اَخْلَچِخْ Akhalcikh [رک بآں] اور اَخَلْخَلْخی Akhalkhalakhi میں بہت سے لوگ گرجستانی زبان ترک کر چکے هیں حالانکہ ان علاقوں میں آج سے دو سو سال پہلے تک گرجستانی زبان بولی جاتی تھی، لیکن اب اس کی جگہ ترکی زبان نے لے لی هے ۔ یہ لوگ اپنی زبان اور اصل کو فراموش کر چکے هیں اور اپنے آپ کو ترک کہتے هیں ۔

گرجستان کی تاریخ کے ابتدائی ادوار تاریکی کے پردے میں پوشیدہ هیں ۔ کرتھلیا Karthlia اور کخیتھیا Kakhethia کے علاقے ایک نئی ریاست کا مرکز تھے ۔ شروع زمانے هی میں خرتھول Kharthwel کا مغربی حصہ بوزنطی حکومت کے ماتحت هوگیا تھا اور یہیں سے عیسائی مذهب، جو مشرقی رومی کلیسا کی شکل میں تھا، سارے مغربی ماورائے قفقاز میں پھیلا ۔ خیال کیا جاتا هے کہ سینٹ نینو Nino نے یہاں کے لوگوں کو عیسائیت سے روشناس کیا ۔ روایت هے کہ چوتھی صدی عیسوی میں (تاریخوں میں اختلاف هے) اس خاتون کی دعوت پر شاہ مریاں Mirian نے عیسائی مذهب قبول کیا ۔ ۶۸۰ء میں قسطنطینیہ میں عیسائیوں کے چھٹے اجتماع میں گرجستانی کلیسا کو آزادی عطا کی گئی ۔

چونکہ گرجستان ایک ایسے حلقے کے مرکز میں واقع هے، جس کے اطراف میں بہت سی طاقتور حکومتیں قائم هوتی رهی هیں، اس لیے ۱۸۰۱ء تک، یعنی جب تک اسے سلطنت روس میں شامل نہیں کر لیا گیا، یہ ملک خوفناک انقلابات سے دوچار رها ۔ ساتویں صدی عیسوی تک بوزنطی اور ایرانی اس پر قبضہ کرنے کے لیے باهم لڑتے رهے ۔ ۶۲۷ء (ساسانیوں پر هرقل (Heracleus) کی فتح) کے بعد تھوڑا هی عرصہ گزرا تھا کہ عربوں نے گرجستان پر چڑھائی کر دی ۔ آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر سے (بوزنطیوں کی اعانت سے) جنوبی گرجستان میں بگرتیوں (Bagratids) کی طاقت بڑھنے لگی ۔ گیارهویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ آل سلجوق نے فتح کر لیا ۔ جب صلیبی جنگجو بیت المقدس میں داخل هوگئے تو "داؤد المجدد" (David the Renovator) ۱۱۰۰ء میں ترکوں کو یہاں سے نکالنے میں کامیاب هوگیا ۔ اس بادشاہ کے عہد میں (۱۰۸۹ تا ۱۱۲۵ء) گرجستان میں خوش حالی کا دور شروع هوا، جو تھمر Thamar (۱۱۸۴ تا ۱۲۱۲ء) کی موت کے بعد تک جاری رها ۔ تیرهویں سے سولهویں صدی عیسوی تک اس نے بہت سے انقلاب دیکھے ۔ تاتاری حملوں نے ملک پر نہایت تباہ کن اثرات چھوڑے (صرف تیمور هی نے ۱۲۰۳ء کے درمیان اس ملک پر چھے بار حملے کیے) ۔ بگرتیوں کی قیادت میں ملک ابھی مشکل سے متحد هونے پایا تھا کہ پندرهویں

www.besturdubooks.wordpress.com

صدی عیسوی میں یہ تین بادشاہتوں، یعنی کرتھلیا Karthlia، کختھیا Kakhethia اور اِمرتھیا Imerethia کی تین مملکتوں اور دیگر پانچ ریاستوں میں منقسم ہو گیا۔ اس کے بعد سے اس کی تاریخ صرف ایک ملک کی تاریخ نہیں رہی۔ بوزنطی سلطنت کے زوال کے بعد گرجستان کا کوئی محافظ باقی نہ رہا اور اب تاتاریوں، ترکوں، ایرانیوں اور لسغیون Lesghia کے حملے جلد جلد ہونے لگے۔ ایرانی اثر خاص طور پر بہت بڑھ گیا، حتّٰی کہ سترھویں صدی عیسوی میں کرتھلیا اور کختھیا کے بادشاہ کی حیثیت صرف شاہ ایران کے ایک والی کی سی رہ گئی۔

گرجستان کی امیدوں کا واحد مرکز روس تھا اور قدیم زمانے میں گرجستان نے امداد کے لیے اس کی طرف رجوع کیا تھا۔ ۱۵۵۸ء میں کختھیا کے بادشاہ لیون دوم (Lewan II) نے ایرانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے زار ایوان چہارم (Iwan IV) کی اعانت طلب کی۔ اسی طرح شاہ عباس اعظم کے زمانے میں الیگزنڈر نے بورس فیوڈ وروویچ گوڈونوف Boris Feodorowitch Godunow سے مدد مانگی۔ ۱۶۱۹ء میں تیموراز Teimuraz نے خاندان رومانوف (Romanow) کے پہلے زار مائیکل فیو ڈوروویچ Micahil Feodorowitch کے پاس ایک سفیر بھیجا، لیکن تا حال روس کو گرجستان میں اپنا کوئی مفاد نظر نہیں آتا تھا، اس لیے وہاں صورت حال جوں کی توں قائم رہی۔ کہیں اٹھارھویں صدی عیسوی میں جا کر گرجستان نے شاہ وختنگ Wakhtang ششم کے دور حکومت میں ایک بار پھر قوت حاصل کی۔ ہرقل (Heraclur) دوم (۱۷۶۲ تا ۱۷۹۸ء) نے ایک بار پھر ترکوں، ایرانیوں اور لسغیوں کے حملوں کا میلاب کامیابی سے روکا، لیکن جب وہ فوت ہو گیا تو ملک اندرونی مصائب (۱۷۷۰ء میں طاعون کی وبا، ۱۷۹۵ء میں آغا محمّد خان ایرانی کے ہاتھوں تفلس کی تباہی) اور دیگر اسباب سے اس قدر کمزور ہو چکا تھا، کہ ہرقل کے جانشین جارج George دوازدھم نے اپنا ملک روس کی حفاظت میں دے دینے کا ارادہ کر لیا۔ چند سال بعد (۱۸۰۴ء میں) اِمرتھیا بھی روسی صوبہ بن گیا۔ اس سے ایک سال پہلے منگریلیا بھی روسی سلطنت میں شامل ہو چکا تھا اور ترکوں اور ایرانیوں کی آخری جنگ کے بعد کرتھولز Kharthwels، کا غزمان Kaghizman، اردگان Ardgan، اولٹی Olty، ارْتون Artwin، باطوم (اور کرس [قارص]) کے جنوب مغربی اسلامی اضلاع پر بھی روس کا قبضہ ہو گیا [رک بہ آرمینیا]۔

مآخذ : (۱) دیکھیے Brosset کی تصانیف خصوصاً *Histoire de la Géorgie*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۸ء؛ (۲) *Skizzen oüs der Geschichte* : W. E. Romanowskij (Russisch) *Georgiens*، تفلس ۱۹۰۲ء؛ (۳) Arth. Leist : *Das Georgische Volk*، *Dresden* ۱۹۰۳ء؛ (۴) J. Marquart : *Osteurop. und ostasiat. Streifzüge*، ص ۱۷۷ تا ۱۸۸ و ۳۹۱ تا ۴۳۶ [۱۹۳۹ء سے گرجستان Georgian Soviet Socialist Republic کے نام سے USSR کی ایک جمہوری ریاست ہے؛ جس کا رقبہ ۶۹۷۰۰ مربع میل ہے اور آبادی جنوری ۱۹۷۱ء میں پچاس لاکھ دس ہزار تھی، دارلحکومت تفلس (Thilesi) ہے]۔

(A. Dirr)

کِرچ : Kertch جزیرۂ قریم (کریمیا) کا ایک * قصبہ اور قلعہ؛ [۱۹۶۷ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی پچاس ہزار تھی]۔ قدیم زمانے میں یہاں Pantikapaion کی یونانی نو آبادی تھی جو آگے چل کر بوس پروس Bosporos کے نام سے مشہور ہوئی اور اسی نام کی سلطنت کا دارالحکومت بنی۔ سترھویں صدی عیسوی کے آخری ایام سے یہاں قریم کے مشرقی حصے کے خزروں کے امیر

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

(جس کا لقب تُدُن تھا) کا صدر مقام رہا (مغربی حصہ جس کا دارالحکومت خرسونوس Khersonesos تھا ان دنوں بوزنطی سلطنت ہی میں شامل تھا) ۔ کرچ کا نام سب سے پہلے اسلامی مآخذ میں آیا ہے، جہاں اسے مختلف شکلوں میں لکھا گیا ہے (کرز اور الکرش کے بارے میں) جو حوالے J. Marquart : *Osteuropaische und ostasiatische Streifzüge*، لائپزگ ۱۹۰۳ء، ص ۵۰۶ میں ہیں، ان میں رکن الدّین بیبرس، در W.Tiesenhausen : *Sbornik Materialov, otnosyashchikhsya k istori Zolotio Ordi*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۸۴ء ص ۸۹، ۵ (جہاں کرچ لکھا ہے) کا اضافہ کر لیجیے ۔ Marquart کتاب مذکور میں بعض روسی محققین (Wassilyewski، Bruun، Harkavy Kunik) نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ نام یونانی لفظ Κόρτξος یا Κυρτξος سے نکلا ہے، جو کرچ کے قریب ایک خانقاہ کا نام ہے (قدیم روسی مآخذ میں اس قصبے کا نام کورچو Korčew لکھا ہے، مثلاً اس مشہور کتبے میں جو ۶۵۷۶ (۱۰۶۸ء میں لکھا گیا ہے اور جسے Karamzin نے *Istoriya gosudarstva Rossiyskago* ج ۲، حاشیہ ۱۲۰ میں نقل کیا ہے) ۔

روسیوں اور بوزنطیوں کی متحدہ فوجوں کے ہاتھوں سلطنت خزر کی آخری تباہی کے بعد ۱۰۱۶ء کے قریب قریم کا مشرقی حصہ جس میں کرچ بھی شامل تھا، ایک روسی ریاست T'mutarakan کے قبضے میں آ گیا ۔ اس ریاست کا اسی نام کا صدر مقام جزیرہ نمائے تَمَن Taman میں کرچ کے بالمقابل واقع تھا ۔ تقریباً ایک صدی بعد اس ریاست کے چٹیل میدانوں پر قپچاق یا کومن Koman قابض ہو گئے اور بندرگاہیں بوزنطی سلطنت کے قبضے میں آ گئیں جیسا کہ Yu. Kulakowski (*Proshloye Tavridi*، بار دوم، کیف ۱۹۱۲ء، ص ۹۳، میں Miklosich و Müller = *Acta et dipl. gr. medi aevi*، ۳ : ۲۵ کی سند پر) خیال ظاہر کیا ہے ۔ Ρωσία کے شہر کو جس کا شہنشاہ مینول گومننوس Manuel Komnenos اور جمہوریۂ جینوآ کے درمیان ۱۱۶۹ء ایک معاہدے کے سلسلے میں ذکر آیا ہے، روسی کورچو Korcew ہی سمجھنا چاہیے ۔ تیرھویں صدی عیسوی کے بعد جزیرہ نمائے قدیم التون اردو کی تاتاری حکومت میں شامل کر لیا گیا ۔ ۶۹۸ھ/ اکتوبر ۱۲۹۸ء تا ستمبر ۱۲۹۹ء میں نوغای نے اپنے پوتے کا انتقام لینے کے لیے جو کَفَہ میں مارا گیا تھا، کرچ اور اس کے ساتھ کریمیا کے چند دوسرے شہروں کو تباہ و برباد کر دیا (Tiesenhausen : کتاب مذکور) ۔ پندرھویں صدی عیسوی میں کرچ پر عثمانی ترکوں کا قبضہ ہوگیا ۔ ازوف Azov کی فتح کے بعد ۱۶۹۸ء میں پیٹر اعظم نے وی انا میں اپنے قیام کے دوران میں جب کہ ترکوں سے صلح کی گفت وشنید ہونے والی تھی، یہ مطالبہ کیا کہ کرچ کا الحاق روس کے ساتھ ہو جائے، لیکن یہ مطالبہ منظور نہیں کیا گیا ۔ اسی سال صلح نامہ قارلووچ Carlowicz طے پایا تو کرچ بدستور ترکوں کے قبضے میں رہا (J. Von Hammer : *Geschichte des Osmān-ischen Reiches*، بار دوم، ۳ : ۹۰۹؛ S. Solowyew : *Istoriya rosii, izd. tovar. Obshčestv. Pol'za*، ۳ : ۱۱۷۱) ۔ روسی حملے کا خطرہ محسوس کر کے سلطان مصطفٰی ثانی نے ۱۷۰۲ء میں کرچ کے قریب ہی ایک نیا قلعہ تعمیر کرایا (جسے اب یِنی قلعہ کہتے ہیں، V. Hammer : کتاب مذکورہ، ۴ : ۴۷) ۔ ۱۷۷۱ء میں کرچ اور یِنی قلعہ پر روسی بغیر مزاحمت قابض ہو گئے ۔ ابازہ پاشا کو جسے یِنی قلعہ کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا تھا، اپنی فوجیں مقابلے پر لانے کی ایک بار بھی جرأت نہ ہوئی اور وہ سینوب Sinope واپس چلا گیا (کتاب مذکور، ۴ : ۶۲۲؛

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Solovjew، کتاب مذکور، ۶ : ۳۸۷) - بخارسٹ میں صلح کی گفت و شنید کے دوران میں (۱۷۷۳ ء) کرچ کے الحاق کے روسی مطالبے کو ترک برابر نامنظور کرتے رہے (v. Hammer، کتاب مذکور، ۴ : ۶۳۸)، لیکن بالآخر عہد نامۂ کوچوک قینارجہ (۱۷۷۴ء) میں انھیں یہ مطالبہ ماننا ہی پڑا - اس کے بعد کرچ کو ایک دوسرے درجے کے روسی قلعے کی حیثیت حاصل رہی - جنگ قریم (کریمیا) کے دوران میں اس پر مئی ۱۸۵۵ء میں اتحادی فوجوں کا قبضہ ہوگیا تھا .

اس بستی میں یونانی، رومی اور ابتدائی مسیحی ادوار کی یادگار عمارتیں موجود ہیں اور ان کی بنا پر یہ دنیا میں مشہور ہے، لیکن چونکہ اسلامی دور حکومت میں اسے یہ اہمیت حاصل نہ رہی، لہٰذا یہاں کوئی لائق ذکر اسلامی عمارت نظر نہیں آتی .

(W. BARTHOLD)

* **الکَرْخ** : قدیم بغداد کے ایک مشہور محلے کا نام - کرخ آرامی لفظ کرکا Karkā سے نکلا ہے - یونانی اور رومی مصنفین اسے کرچہ (Carcha)، چرچہ (Charcha) اور چرسہ (Charase) لکھتے ہیں (دیکھیے Pauly Wissowa : *Realenzykl. d. klass. Altertumswiss*، تکملہ، ۱ : ۲۷۵، ۲۸۳) اور اس کے معنی ہیں قصبہ (دیکھیے یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۴ : ۲۵۲ س ۱۸ ؛ Streck، ص ۹۲، ۱۸۶ ؛ G. Le. Strange : *Baghdad*، ص ۶۳) - مسلمانوں کے زمانے میں بھی آرامی تمدن سے متأثر علاقوں، یعنی عراق، خوزستان اور الجزیرہ میں متعدد قصبے یا قصبوں کے محلے اس نام سے موسوم تھے - انھیں ایک دوسرے سے یوں متمیز کیا جاتا تھا کہ ان کے ساتھ کسی جغرافیائی نام (مثلاً میسان، سامرا) کا اضافہ کر دیا جاتا تھا - یاقوت (۴ : ۲۵۲ تا ۲۵۷) کے ہاں ایسے مقامات کا ذکر ملتا ہے؛ نیز دیکھیے الطبری (طبع ڈخویہ، بمدد اشاریہ، ص ۲۶۲) - زیربحث کرخ کو صحیح لفظوں میں عموماً کرخ بغداد کہا جاتا ہے .

جیسا کہ اس کے آرامی نام سے ظاہر ہوتا ہے، الکرخ کا محلہ اس سے پیشتر موجود تھا جب المنصور نے بغداد شہر کی بنیاد رکھی (۱۴۵ھ/۷۶۲ء) - ان دنوں یہ ایک چھوٹا سا خود مختار قصبہ تھا، جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اسے ساسانی بادشاہ شاپور ثانی (۳۰۹ تا ۳۷۹ء) نے بسایا تھا - دوسری قدیم بستیوں کی طرح، جو اس مقام پر واقع تھیں جہاں خلفا کا آئندہ دارالحکومت آباد ہونا تھا، یہاں کی آبادی بھی زیادہ تر آرامی عیسائیوں پر مشتمل تھی (دیکھیے سطور بالا، ۱ : ۵۴۲) - اسلام سے پہلے کے قصبۂ کرخ کو خلیفہ المنصور نے تجارتی مرکز بنانے کے لیے منتخب کیا اور تھوڑی ہی مدت میں یہ اپنی تجارتی حیثیت کے باعث شہر کا سب سے پررونق محلہ بن گیا - شروع شروع میں الکرخ ایک بالکل علٰحدہ آبادی تھی، جو المنصور کے مدوّر شہر سے خاصے فاصلے پر شمال مشرق میں واقع تھی، لیکن شہر کے اردگرد بسرعت نئی سڑکیں اور چوک تعمیر ہوگئے اور یہ بھی اس عظیم الشان دارالخلافہ کی عمارتوں میں مدغم ہوگیا .

الکرخ میں پانی کی بہم رسانی نہر عیسٰی اور اس کی شاخوں نہر صراۃ اور نہر کرخایا سے ہوتی تھی - نہر عیسٰی عراق کے انتہائی شمالی علاقوں میں فرات کی بڑی نہر ہے - نہر کرخایا (دیکھیے Frankel : *Die aram. Fremdw. im Arab.*، لائیڈن ۱۸۸۶ء، ص ۲) جو قصبہ المحوّل سے نیچے موضع البراثا (دیکھیے ۱ : ۶۵۵) کے قریب نہر عیسٰی سے نکلتی ہے، بغداد کے مغربی نصف علاقے کے جنوبی حصے، یعنی تجارتی مرکز اور اس کے گرد و

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

نواح کو پانی بہم پہنچاتی ہے ۔ اس کی معاون شاخیں بعض مقامات پر زمین کے نیچے نیچے بہتی تھیں ۔ اس کے اوپر متعدد پل تھے، جن پر بڑی آمد و رفت رہا کرتی تھی ۔ نہر کرخایا اور اس کے نہری نظام کے بارے میں دیکھیے ابن سیرپین Ibn Serapion، طبع G.Le Strange، در *JRAS*، ۱۸۹۵ء، ص ۲۴ س ۱۷ تا ۲۶ و ص ۲۸۶ تا ۲۸۸، ۲۹۲ تا ۲۹۳؛ الخطیب البغدادی، طبع Salmon، ص ۶۶ تا ۶۸، ۱۵۴، ۱۵۵؛ یاقوت، ۴ : ۲۵۲؛ Streck، ص ۸۵ تا ۹۰؛ G. Le Strange : *Baghdad*، ص ۵۲ تا ۵۶، ۶۳ تا ۸۰؛ Herzfeld، در Sarre-Herzfeld، ۲ : ۱۱۰ ۔

الکرخ کا، جسے شیعیوں کا مرکز سمجھا جاتا تھا، بغداد کی شہری تاریخ، خصوصاً بویہی دور کی تاریخ (دسویں سے گیارھویں صدی عیسوی تک) میں بار بار ذکر آتا ہے (رک بہ بغداد) ۔ عہد آل بویہ میں، جن کی ہمدردیاں علویوں کے ساتھ تھیں، دارالحکومت کے شیعہ سنی تنازعات اور مناقشات، جو پہلے بھی اکثر ہوتے رہتے تھے، بہت زور پکڑ گئے ۔ ان متخالف فرقوں کے درمیان گلی کوچوں میں خونریز جھڑپیں گویا روز مرہ کا معمول ہو گیا تھا، جن میں اکثر لوٹ مار اور آتش زنی بھی ہوتی تھی ۔ ان خانہ جنگیوں اور باہمی فساد میں عموماً کرخ ہی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی تھی ۔ یہاں کے باشندے آس پاس کے محلوں (باب البصرہ وغیرہ) میں رہنے والے سنیوں کے خلاف ہمیشہ شمشیر بکف رہتے تھے ۔ سلطان جلال الدّولہ (۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء تا ۴۳۵ھ/۱۰۴۴ء) کے عہد میں صورت حال حد سے زیادہ بگڑ گئی تھی؛ چنانچہ ایک بار (۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء) خود اس کی ایسی گت بنی کہ اسے بھاگ کر اپنے ہم مذہب شیعیوں کے پاس کرخ میں پناہ لینی پڑی ۔ ان فسادات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۴۵ھ/۱۰۵۳ء میں الکرخ کا بڑا حصہ جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا ۔ اس سے قبل خلیفہ الواثق کے عہد (۲۲۷ھ/۸۴۲ء تا ۲۳۲ھ/۸۴۷ء) میں بھی کرخ ایک زبردست آگ لگنے سے تباہ ہو گیا تھا، لیکن بہت جلد اس تباہی کی تلافی کر دی گئی ۔

الکرخ زیادہ وسیع معنوں میں دریائے دجلہ کے مغرب میں بغداد کے سارے جنوبی علاقے کا نام تھا ۔ مرور زمانہ سے یہاں متعدد مسجدیں اور مقبرے تعمیر ہوئے ۔ سب سے زیادہ مشہور مقبرہ، جس کے ساتھ مسجد بھی ہے، یہاں کے ایک مقامی ولی معروف بن الفیزران الکرخی (م ۲۰۰ھ/۸۱۶ء) کا ہے ۔ اس سے کوئی ۳۰۰ گز جنوب میں وہ مقبرہ ہے جو ہارون الرّشید کی بیوی زبیدہ کا بتایا جاتا ہے ۔ یہ دونوں مقبرے (نیز رک بہ بغداد) آج بھی موجود ہیں اور قدیم بغداد کے مکانوں اور عمارات کا مطالعہ کرنے کے لیے یہ اہم عمارتیں نقطۂ آغاز کا کام دے سکتی ہیں ۔ موجودہ شکل میں ان کی تجدید و ترمیم خلیفہ الناصر (۵۷۵ھ/۱۱۸۰ء تا ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء) نے کی تھی، لیکن اس وقت سے اب تک بارہا ان کی اصلاح اور درستی ہوتی رہی ہے ۔ الکرخی کی قبر نویں صدی ہجری ہی میں بغداد کی مشہور ترین زیارت گاہ بن چکی تھی اور آج بھی اسی طرح ایک عظیم الشان قبرستان میں موجود ہے جس طرح کہ عہد عباسیہ میں تھی ۔ اس سے متعلق دیکھیے Streck، ص ۱۵۹؛ G. Le Strange : کتاب مذکور، ص ۱۰، ۸۹، ۳۵۰؛ Massignon، ص ۱۰۸ ببعد؛ Herzfeld، ص ۱۷۳ ۔ بغداد کے مغربی جانب جو دیگر مساجد اور مقبرے واقع ہیں ان کے حالات کے لیے دیکھیے Herzfled، ص ۶۴ ببعد یا ۹۴ ببعد ۔

الکرخ بغداد کے مغربی نصف حصے کا نہ فقط

www.besturdubooks.wordpress.com

سب سے بڑا محلہ تھا بلکہ یہ ایک طویل عرصے تک آباد بھی رہا، بحالیکہ آس پاس کے محلے کھنڈر بن گئے؛ مثلاً یاقوت کے وقت (تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل) میں یہ ایک علٰحدہ قصبے کی صورت میں بدستور موجود تھا، بالکل اسی طرح جیسے بغداد کی بنیاد پڑنے کے بعد قدیم ترین زمانے میں تھا۔ ان دنوں یہ باب البصرہ کے محلے (المنصور کے قدیم مدور شہر کے جنوب مشرق میں) سے، جو اس وقت تک آباد تھا، کوئی ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ازمنۂ وسطٰی کے آخری ایام میں (دیکھیے مثال کے طور پر ابن بطوطہ، چودھویں صدی عیسوی میں) محلہ باب البصرہ کا نام مغربی بغداد کے ان تمام محلوں کے لیے اکثر استعمال ہونے لگا تھا جو ابھی تک آباد تھے؛ چنانچہ الکرخ بھی انھیں میں شامل تھا دیکھیے G. Le Strange : کتاب مذکور، ص ۳۳۶؛ Herzfeld، ۲ : ۱۱۴ ببعد۔ یہاں اس امر کی طرف توجہ دلا دینی چاہیے کہ الکرخ اور اس کے مضافات کے جو جغرافیائی حالات یاقوت نے پیش کیے ہیں وہ دوسرے مآخذ سے پوری طرح نہیں ملتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ معجم البلدان لکھتے وقت مصنف کی اس مقام کے بارے میں معلومات زیادہ معتبر نہیں رہی تھیں (دیکھیے G. Le Strange، ص ۸۴، ۱۵۹)۔

الکرخ ایک ایسے دارالضرب کی حیثیت سے بھی مشہور ہے جہاں کبھی کبھار سکّے ڈھالے جاتے تھے۔ عباسی خلفا المقتدر، القاہر اور الراضی کے عہد کے سکّے ملتے ہیں، جو ۳۰۸، ۳۱۵، ۳۱۸، ۳۲۱ اور ۳۲۵ھ کے ہیں (دیکھیے *Numismatische Zeitschrift*، وی انا ۱۸۹۳ء، ۳۴ : ۳۲۱؛ Lavoix : *Cat. des Monn. Mus. de la Bib. Nat.*، ۱ : ۲۸۵؛ *Numismatic Chronicle*، ۱۹۰۲ء، ص ۲۷۲ و ۱۹۰۹ء، ص ۱۹۷)۔ الکرخ کی شراب کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ عہد عباسیہ کے پہلے دور کے قصائد (مثلاً ابو نواس، ابن معتز) میں اس کا اکثر ذکر ملتا ہے (دیکھیے G. Jacob : *Oriental Studien*، در *Th. Noldeke .... Gewidmet*، Giessen ۱۹۰۶ء، ص ۱۰۶۵)۔

آج کل بغداد کا وہ حصہ جو دریاے دجلہ کے دائیں کنارے پر واقع ہے اور شہر کے مجموعی رقبے کا بمشکل تیسرا حصہ ہے قرشیا کہ کہلاتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ (ترکی) قرشی یقا (= دوسری جانب) ہے (کیونکہ (یہ اصل شہر کے، جو مشرقی کنارے ہے، بالکل مقابل واقع ہے) اور ایک عامی عربی لفظ "حاذک الجانب" کی دوسری صورت ہے؛ لہٰذا اس نام کا کرخ سے کوئی تعلق نہیں۔ لیسٹرینج : کتاب مذکور، ص ۶۶، میں اس کے خلاف نظریہ اختیار کیا گیا ہے۔ مدت تک قرشیا نواح شہر کا ایک حقیر سا حصہ رہا، لیکن حال میں اس کی اہمیت کچھ بڑھ گئی ہے اور یقیناً اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا کیونکہ بغداد کا ریلوے سٹیشن یہیں بنا ہے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے بنو عقیل (عوگیل، عگیل) کے عرب یہاں آباد ہیں اور آج کل اس مغربی شہر کی خاصی آبادی ان عربوں اور دوسرے تجارت پیشہ لوگوں پر مشتمل ہے (اس سلسلے میں Cernik کی تفتیشی مہم کے لیے دیکھیے *Petermans Geograph. Mitteil. تکملہ*، حصہ ۴۴، Gotha ۱۸۷۵ء، ص ۲۸، ۳۰؛ v. Oppenheim : *Vom Mittelmeer zum Persischen Golf*، برلن ۱۹۰۰ء، ۲ : ۷۴، ۲۳۸؛ Gl. Huart : *His. de Bagdad dans les temps modernes*، پیرس ۱۹۰۱ء، ص ۱۱ ببعد، ۱۸۸ ببعد؛ Massignon، ص ۹۹)۔

مآخذ : (۱) *Bibliotheca Geographorum Arabicorum*، بمدد اشاریہ؛ (۲) الطبری، طبع ڈخویہ، بمدد اشاریہ، ص ۲۶۷؛ (۳) الخطیب البغدادی، طبع Selmon

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

(دیکھیے Selmon : *Introduct. topograph. à l'hist. de Bagdad*، پیرس ۱۹۰۴ء، ص ۲۰ تا ۲۳، ۹۸ تا ۱۰۲؛ (۴) یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۴ : ۲۵۴ ببعد؛ (۵) ابن الأثیر : الکامل، طبع Tornberg، ۱۳ : ۹۳، بمدد اشاریہ؛ (۶) القزوینی : آثار البلاد، طبع Wüstenfeld، ص ۲۹۸؛ (۷) Streck : *Babylonien nach den arab. Geographen*، لائیڈن ۱۹۰۰ء، ۱ : ۹۲ تا ۹۷؛ (۸) G. Le Strange : *Baghdad during the Abbasid Caliphate*، آکسفرڈ ۱۹۲۴ء، ص ۶۳ تا ۸۰ و بمواضع کثیرہ (بمدد اشاریہ)؛ (۹) وہی مصنف : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۳۱؛ (۱۰) L. Masignon (1907-8) : *Mission en Mésopotamie*، ج ۳۱، پیرس ۱۹۱۲ء، ۲ : ۴۹، ۹۹، ۱۰۸؛ (۱۱) E. Herzfeld، در Serre Herzfeld : *Archäol Reise im Euphrat und Tigrisgebeit*، برلن ۱۹۲۰ء، ۲ : ۱۰۵، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۴ ببعد؛ بغداد کے نقشوں کے لیے دیکھیے G. Le Strange : *Baghdad*، نقشہ ۳ و ۷؛ نیز Herzfeld، جو الکرخ کے ٹھیک ٹھیک محل وقوع کے متعلق G. Le Strange کی رائے سے کسی قدر اظہار اختلاف کرتا ہے اور غالباً وہ حق بجانب ہے۔

(M. STRECK)

* **کرخا** : Kerkha، خوزستان کا ایک دریا، جس کا منبع عراق میں نہاوند کے مشرق و جنوب میں واقع ہے۔ چشمہ کاظم کو اس کا اصل سرچشمہ سمجھا جاتا ہے اور یہ کوہ چہل نبلغان سے نکلتا ہے۔ نقشے میں یہاں ایک چھوٹی سی ندی سرہ کنج نظر آتی ہے، جس میں مشرق سے کرسرہ ندی آ کر مل جاتی ہے۔ پھر نہاوند کے قریب مشرق ہی کی جانب سے آب کلن آ ملتا ہے، جو کوہ فروزان سے نکلتا ہے۔ اس کے بعد دولت آباد سے سیروان رود اس میں آ گرتی ہے۔ اس علاقے میں یہ دریا گمساب کے نام سے مشہور ہے جس کا صحیح تلفظ گمسیاب (اور بگڑی ہوئی شکل گرسیاب) ہے۔

دریا کا رخ شروع شروع میں شمال مغرب کی سمت ہے، لیکن پھر بتدریج مغرب کی جانب مڑ جاتا ہے۔ بیستون تک پہنچنے سے پہلے اس میں شاجو رود مل گئی ہے، جو کنگر شاہ کے مل جانے سے اور بڑی ہو گئی ہے۔ اس کے بعد کرخا جنوب کی طرف مڑ جاتا ہے اور اس میں کرمان شاہان کا دریا قرہ سو آ ملتا ہے۔ آگے چل کر آب کرند بھی شامل ہو جاتا ہے، جس کے اپنے کئی اہم معاون ہیں۔ اب تک جتنے معاونوں کا ذکر ہوا ہے، وہ سب کے سب اس میں دائیں طرف سے آ کر ملتے ہیں۔ ان کے برعکس کشکن رود بائیں جانب سے آتی ہے، جس کے معاون یہ ہیں : مدین رود دائیں طرف سے اور رود خرم آباد مع رود کول کو بائیں طرف سے۔ اس کے بعد دائیں جانب ہی سے لیلم رود اور آب زال آتے ہیں۔ اب دریاے کرخا کا رخ کچھ دور تک جنوب سے مغرب اور پھر جنوب کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے میں دریا کو کرخہ (کرخہ) کہتے ہیں۔ لیلم رود اور آب زال کے درمیان کچھ فاصلے کے لیے اس کا نام آب صیمرہ ہو جاتا ہے۔ یہ قصبۂ صیمرہ [رک بآں] کے نام پر ہے، جو دریا کے مغرب میں کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ آب زال کے ساتھ مل جانے کے بعد دریا ایک بار پھر جنوب کی طرف مڑ جاتا ہے۔ پای پل کے علاقے میں پہنچتے ہی اس میں سے کئی نہریں نکلتی ہیں۔ ان نہروں سے اس کا اتصال آب دز اور اس کے معاونین نہر تبل خن اور نہر دغ دری سے ہو جاتا ہے۔ سوس کے کھنڈر اس کی ایک مشرقی گزرگاہ آب کے کنارے واقع ہیں، جسے آگے چل کر دریاے شور کے نام سے یاد کیا۔

www.besturdubooks.wordpress.com

جاتا ہے۔ کرخا کا بہاؤ نہر ہاشم کے جنوبی علاقے میں آ کر ختم ہو جاتا ہے، جہاں اس میں شطّ الجَمز کا پانی آ ملتا ہے۔ ایک مدت پہلے دریا یہاں سے شمال مغرب کو حَوِیزَہ (حُوَیْزہ) تک بہتا تھا۔

اس دریا کی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ مختلف اوقات میں جو سڑکیں جاتی تھیں، ان میں وہ شاہراہ قابل ذکر ہے جو علاقہ بیستون میں ہمذان اور عراق کو ملاتی ہے، نیز وہ سڑک جو حُلوان سے صَیْمَرہ کو جاتی ہے۔

قدیم جغرافیہ نویس اس دریا کو Choaspes کہتے تھے۔ کرخا کا نام عرب جغرافیہ نویسوں کے ہاں نہیں ملتا۔ بقول Rawlinson یہ پہلی بار چودھویں صدی عیسوی کے ایک فارسی نسخے میں آیا ہے۔ بہرکیف یہ لفظ کچھ پرانا ہی ہوگا۔ ابن الأثیر نے ۵۵۳ھ/۱۱۵۸ء کے ذیل میں ایک کَرْخَانا کا ذکر کیا ہے۔ اگر اس سے یہ دریا ہی مراد ہو تو اس کا نام ضرور بارھویں صدی عیسوی میں موجود تھا۔ ابن الأثیر عموماً جغرافیائی تفصیلات دینے سے حتی الامکان پرہیز کرتا ہے؛ اس نے ضرور یہ نام کسی قدیم مآخذ سے لیا ہوگا۔ کرخانا لازمی طور پر آرامی لفظ ہوگا جس کا مطلب ہے "کرخا کا (دریا)" یعنی کرخا دہ لیدن Karkha de Lēdan.

عرب جغرافیہ نویسوں نے اس دریا کا ذکر دو بار یقیناً کیا ہے، اگرچہ اس کا نام نہیں لیا۔ ابن الفقیہ کے بیان کی رو سے نہاوند کے قریب اس کے کنارے سے ایک اعلیٰ قسم کی سیاہ رنگ کی مہر لگانے کی چکنی مٹی نکلتی ہے۔ ابن رُسْتہ نے بیستون کے قریب جس "بڑے دریا" کا ذکر ہے، وہ بھی لازماً گَمَسی آب ہوگا۔ صَیْمَرہ اور طَرْحان کے درمیان اس پل کو بھی جسے فن تعمیر کا شاہکار سمجھا جاتا تھا، پل خسرو ہی سمجھ سکتے ہیں، جو کرخا پر بنا ہوا ہے۔ کرخا کو عام طور پر "دریائے سُوس" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، مثلاً بہت پہلے ابن خرّاذابہ کے وقت میں یہ نام آیا ہے۔ اس کے منبعوں کے بارے میں جغرافیہ نویسوں کو قابل اعتماد معلومات حاصل نہیں تھیں۔ ابن خرّداذبہ کہتا ہے کہ یہ دِیْنَوَر سے نکلتا ہے اور ابن واضح کا کہنا ہے کہ ہَمذان سے۔ کم از کم گَمَسی آب کے معاونین کے بارے میں یہ رائے ہے، بشرطیکہ ہم یہ تسلیم کر لیں کہ یہاں دِیْنَوَر اور ہَمَذان کے شہر نہیں بلکہ صوبے مراد ہیں۔ عرب جغرافیہ نویسوں کے قول کے مطابق یہ دریا اہواز کے دُجَیل میں جا گرتا ہے۔ یہ واقعہ بھی مذکور ہے کہ پانی چڑھنے کے وقت، سوس کے مقام پر اس دریا کا پاٹ دو میل کے قریب ہو جاتا ہے۔ ابن واضح کے بیان کی رو سے یہ دریا ہِندُوان کے نام سے مشہور تھا۔ غالباً بَصنّا کی ندی یا "دجلۂ بَصنّا" جس کے پانی سے سات پن چکّیاں چلتی تھیں اور جو شہر بَصنّا سے ایک پرتاب تیر کے فاصلے پر بہتا تھا اور جس کا ذکر المقدسی اور یاقوت کے ہاں ملتا ہے، وہ اور کرخا ایک ہی دریا ہیں۔

مآخذ: (۱) Rawlinson در *JRGS*، ۹: ۸۹؛ (۲) Ritter: *Erdkunde*، ج ۹؛ (۳) Reclus: *Nouvelle Goegraph. Univ.*، ۹: ۲۹۰، ۳۰۶؛ (۴) Graadt von Ruggen (در Morgan: *Délégation en Perse*، ج ۷)، ص ۱۶۸، ۱۹۰؛ (۵) Herzfeld: *Petermanns Mittei-lungen*، ۵۳: ۴۹، ۶۰، ۶۳؛ (۶) G. le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۲۳۳، ۲۴۰؛ (۷) Schawrz: *Iran in M. A.*، ۳: ۳۰۴ ببعد، ۳۶۴ ببعد، ۳۹۳، ۵: ۳۵۳، ۴۷۲، ۴۸۸، ۵۰۱.

(P. SCHWARZ)

الکرخی: ابوبکر بن الحسن (یا الحسین) *

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

ریاضی دان وہ اپنے آپ کو الحاسب (حساب دان) بھی کہتا تھا ۔ اس کا قیام بغداد میں رہا ۔ سلطان بہاء الدولہ [رک بآں] کے وزیر ابو غالب محمد بن خلف فخرالملک اور اس کے بیٹے سلطان الدولہ ابو شجاع کے زمانے میں ۔ تاریخ وفات معلوم نہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۴۱۰ھ/۱۰۱۹ اور ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ کے درمیان ہوگی ۔ ریاضی میں کرخی کی صرف دو تصنیفیں باقی رہ گئی ہیں : الکافی فی الحساب (حساب کے لیے کافی) اور الفخری (معنون بہ وزیر فخر الملک) ۔ پہلی تصنیف کا ایک مخطوطہ جو اپنی جگہ پر لاجواب ہے، گوتھا میں موجود ہے، دوسری کا پیرس، آکسفرڈ اور قاہرہ میں ۔ عربی متن ابھی تک کسی کا بھی شائع نہیں ہوا البتہ اوّل الذّکر کا تین حصوں میں ایک جرمن ترجمہ موجود ہے : A. Hochheim : *Kāfī fil Hisāb des Abu Bèkr Muh. b. Alhussain Al Karkhi* Halle ۱۸۷۸-۱۸۷۰ء ؛ اور دوسری کی ایک تلخیص فرانسیسی میں، F. Woepcke : *Extrait du Fakhrī*، پیرس ۱۸۵۳ء ۔ الخیّامی کے جبر اور مقابلے کے بعد ریاضی کی اس شاخ میں الفخری اہم ترین کتاب ہے، جس میں الکرخی نے اسکندریہ کے یونانی ریاضی دان ڈیوفانٹوس Diophantus کا تتبع کیا ہے؛ چنانچہ یہ پہلا موقع تھا جب عربوں نے اس کتاب میں غیر معین مساوات سے بحث کی اور ان کا حل یونانی طریق میں پیش کیا البتہ اس امر کا تصفیہ مشکل ہے کہ الکرخی نے قصداً ہندی طریقوں کو نظر انداز کر دیا یا وہ ان سے بے خبر تھا ۔ اپنے رسالہ حساب میں مشرق کے تقریباً سب عرب ریاضی دانوں کی طرح (مگر علی بن احمد النسوی (۹۸۰ تا ۱۰۴۰ء کے سوا) وہ ہندی اعداد استعمال نہیں کرتا بلکہ سب رقمیں الفاظ میں لکھتا ہے ۔

مآخذ : اب تک کی مطبوعہ عرب سوانحی تصانیف میں کسی میں بھی الکرخی پر کوئی علٰحدہ مقالہ نہیں ۔ اس کا ذکر (۱) ابن خلکان، قاہرہ، ۱۳۱۰ھ، ۲ : ۶۵ میں کہیں کہیں ہے؛ مترجمہ de Slane، ۳ : ۲۷۹؛ نیز دیکھیے (۲) M. Cantor : *Vorlesungen uber Gesch. d. Mathem*، بار دوم، ۱ : ۷۱۸ تا ۷۲۹؛ (۳) H.Suter، *Abhandl z. Gesch. d. mathem. Wissensch.*، ۱ : ۸۳ ۔

(H. SUTER)

کِرد : رک بہ اقریطش (Crete) . *

کُرد : مشرق قریب کی ایک ایرانی قوم جو * ایران، ماوراے قفقاز ترکی اور العراق [رک بہ کردستان] میں آباد ہے ۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے ان کردوں کی تعداد کا، جو مجتمع یا الگ الگ بستیوں میں آباد تھے (خراسان، ایشیاے کوچک، کیلیکیا (سلیشیا) جنوبی شام) اندازہ بیس تیس لاکھ کے قریب کیا گیا تھا .

اگرچہ بہت سے سیاح کردستان سے ہو کر گزرے ہیں اور کردوں کے بارے میں لسانی، تاریخی، نسلیاتی اور سیاسی اعتبار سے کثیر تعداد میں تصنیفات بھی ملتی ہیں، لیکن ابھی تک ہم کسی عام تحقیقی مقالے سے محروم ہیں جو خاص اسی قوم سے متعلق ہو ۔ ایسی تصنیف کی تیاری میں مشکلات کا سامنا اس لیے ہے کہ ہماری معلومات جزوی ہیں اور منتشر، اور پھر یہ کہ جن مصنفوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے ان کے طریق کار میں اختلاف پایا جاتا ہے .

(الف) اصل و نسل

کردوں کی ایرانیوں میں شمولیت زیادہ تر لسانی اور تاریخی مواد کی بنیاد پر کی جاتی ہے، لیکن اس سے اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ ان میں مختلف النّسل عناصر جمع ہو گئے ہیں ۔ ان مؤخر الذّکر عناصر کی نوعیت عیاناً جابجا مختلف ہے ۔ ممکن ہے کہ کرد عناصر کی افزائش کا رخ مشرق (مغربی ایران) سے مغرب (وسطی کردستان)

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کی جانب ہوا ہو، لیکن ایسی کسی قوم کا وجود تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں جو کردوں کی آمد سے قبل وسطی کردستان میں رہتی تھی، یعنی نسلاً ان سے مختلف اور اسماً مشابہ (قَرْدو) اور جو آگے چل کر ایرانی کردوں میں مدغم ہوگئی۔

تقریباً ۲۰۰۰ ق م - دو سمیری کتبوں میں Theureau Dangin (*Revue d'Assiyriologie*، ۵ : ۹۹؛ ۶ : ۶۷) نے کردوں کے ایک علاقے "کَرْدَہ کہ" نامی کا ذکر دیکھا تھا (مرتب نے مجھے نجی طور پر بتایا ہے کہ اس میں پہلا حرف ک ہے، ق نہیں اور جزو کہ کا مفہوم غیر یقینی ہے) - یہ ملک "اہل سو" (دیکھیے *ZA*، ۳۵ : ۲۳۰، حاشیہ ۳) کے علاقے سے متصل تھا جس کا محل وقوع ڈرائیور Driver نے بحیرۂ وان کے جنوب میں بتایا ہے - علاقۂ بِدْلِیس میں ایک قدیم قلعہ سُوی موجود ہے (شرف نامہ، ۱ : ۳۶۱)- ایک ہزار سال بعد تگلتہ پلیسر Tiglath Pilesar نے آزو کے پہاڑوں میں بسنے والی قوم قرطی (Kur-ṭi-e) کے خلاف جنگ کی تھی - Driver (کتاب مذکور، ص ۴۰۰) نے اسے وہی پہاڑ قرار دیا ہے جو آج کل حَزو (سَسُن Sasun) کہلاتا ہے - قرطی کی قراءت غیر یقینی ہے۔

پانچویں صدی میں Herodotos نے ایسے کسی نام کا ذکر نہیں کیا، لیکن بقول اس کے (۳ : ۹۳) ہخامنشی سلطنت کے تیرھویں نوم (Nome صوبہ) میں جو آرمینیوں کے بعد آتا تھا ایک علاقہ Παχτυικὴ نامی شامل تھا جس کے نام کا رشتہ Nöldeke (*Gramm. d. neusyrischen Spr.*، لائپزگ ۱۸۶۸، ص ۱۸) اور Kiepert (*Alt. Geogr.*، پیرا ۸۱) نے بُخْتان (= بُہْتان) سے جوڑا ہے۔

دس ہزار [کے عسکر] کی پسپائی نے جس کا حال Xenophon (۴۰۱ - ۴۰۰ ق-م) نے بیان کیا ہے کَرْدُکون (Καρδοῦχοι) کے نام کو شہرت بخشی، جن کا ملک کنتر تیس Kentritēs (بہتان) کے مشرق میں واقع تھا - اس زمانے سے یہ نام ہمیں تسلسل کے ساتھ دریاے دجلہ کے بائیں کنارے پر کوہ جودی [رک بآں] کے قریب ملتا ہے اور کلاسیکی مصنفوں کے ہاں اس ملک کا نام کردوئن Corduene ہوگیا - (اس نام کی متعدد شکلوں کے بارے میں جو سامی حرف ق کو ادا کرنے میں مشکل کے باعث وجود میں آئیں، دیکھیے Driver، کتاب مذکور)- آرامی میں یہ ضلع بث قَرْدُو (Beth-Kardū) کہلاتا تھا اور موجودہ شہر جزیرۃ ابن عمر قردُو کا گزرتا کہلاتا تھا - آرمینی اسے کوردذ کہتے تھے اور عرب (البَلاذُری، ص ۱۷۶؛ الطّبری، ۳ : ۶۱۰) بَقَرْدَا (قَرْدَی)- یاقوت (۴ : ۵۶) نے ابن الأثیر کی سند پر اعتماد کرکے بیان کیا ہے کہ ضلع بَاقَرْدا، جزیرۃ ابن عمر کا ایک حصہ تھا - اس میں دو سو گاؤں (الثّمانین، جودی، فیروز شابور) شامل تھے اور یہ دجلے کے بائیں کنارے پر بازندا کے بالمقابل آباد تھا، جو دجلے کے دائیں کنارے پر واقع تھا (متون کے مفصل تجزیہ کے لیے دیکھیے M. Hartmann : *Bohtan*، ص ۳۳ تا ۳۵) - یہ نام جس کا اطلاق صرف ضلع پر ہوتا تھا، آگے چل کر مسلمانوں کی کتابوں سے ناپید ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ جزیرۃ ابن عمر، بہتان وغیرہ لے لیتے ہیں - ارمینیوں اور عربوں کے نزدیک علاقہ قَرْدُو کا اطلاق صحیح معنوں میں ایک بہت محدود سے علاقے پر ہوتا تھا - ہمیں Corduene کی صحیح صحیح سرحدوں کا علم نہیں - اس کے تین قصبے سریسہ Sareisa سَتَلکا Satalka اور پِنَکا Pinaka (فِنیق) دریاے دجلہ کے کنارے واقع تھے، لیکن اس سلسلے میں Strabo کا بیان (۹ : ۱۲، س ۴) قابل توجہ ہے، جس کی رو سے Γορδυαῖα ὄρη کی اصطلاح کا اطلاق بعض اوقات ان پہاڑوں پر ہوتا تھا جو موجودہ دیار بکر اور مُوش کے درمیان واقع ہیں۔

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ Καρδοῦχοι کون تھے جن کا نام بلاشبہہ اسمائے مابعد میں بھی قائم رہا (آخری جزو -χοι کو لازماً ارمینی صیغۂ جمع کی خ کا مترادف سمجھنا چاہیے ۔ غالباً اس کی توجیہ یہ ہو سکے گی کہ یہ نام یونانیوں نے کسی ارمنی سے سیکھا ہوگا) ؟ بقول زینوفون (۴ : ۳، س ۱) Karduchoi نہ تو شاہ Artaxerxes کی حکومت تسلیم کرتے تھے نہ آرمینیا کی ۔ جب پہلی صدی قبل مسیح میں Tigranes ثانی نے Corduene کو فتح کیا تو اس نے وہاں کے بادشاہ Zarbienus کو مر واڈالا ۔ Corduene کے بادشاہ کو ۱۱۵ء میں Manisarus کہتے تھے ۔ بقول Hübschmann (*Die altarm. Ortsnamen*، ص ۲۳۹ و *Arm. Gramm.*، ۱۸۹۷ء، ۱/۲ : ۵۱۸ تا ۵۲۰) صوبۂ کردوئن نے آرمینیا کا بڑا سطحی سا اثر قبول کیا تھا ۔

یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ Xenophon کے زمانے میں دریاے دجلہ کے شمال میں ایک ایرانی قبیلہ آباد تھا ، لیکن ہمارے پاس کرد چوی Karduchoi کی نسل کے بارے میں اس کے نام کے سوا کوئی دوسری شہادت موجود نہیں ۔ سامی زبانوں میں اس نام کے مماثل اور بھی نام ہیں (عکّادی، آشوری: قَرْدُو، مضبوط، سورما، قَرادُو، "مضبوط ہونا")۔ دوسری طرف اس کی صوتی مماثلت ایک قوم خَلْدِی کے نام سے بھی پائی جاتی ہے جس کا آشوری تلفظ اُرَرْطُو ارشطو زیادہ مشہور ہے اور جسے عبرانی میں اَرَرَطْ (آراراط ، ارارات ، جبل الحارث) اور یونانیوں کے ہاں Αλαρόδιοι, Χάλδοι کہتے ہیں اور بعض اوقات Χαλδαῖοι ، یہ قوم آرمینیا میں نویں صدی قبل مسیح کے اواخر میں نمودار ہوئی تھی اور بعد ازاں اس نے بحیرۂ وان کے علاقے میں ایک طاقت ور سلطنت قائم کر لی تھی ۔ یہ سلطنت چھٹی صدی کے اوائل تک باقی رہی ۔ Lehmann-Haupt : *Meyer. z. älter Gesch. Armeniens* ، گوٹنگن ۱۹۰۷ء، ص ۱۲۳، کی نظر میں خلدی تارکین وطن ہیں جو مغرب سے آئے تھے ۔ E. Mayer : *Gesch. des Altertums* ۱/۲ (۱۹۱۳ء)، فصل ۴۷۴ کا خیال ہے کہ ان کا اصلی وطن وسطی Araxes کے کنارے تھا ۔ ساتویں صدی کے قریب ارمنیوں کے آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلدی منتشر ہو گئے اور پہاڑوں کی جانب دھکیل دیے گئے (*Cyropaedia*، ۳ : ۱ تا ۳)، لیکن ان کا نام ان مقامات کے ناموں کی شکل میں زندہ رہا جو بحیرۂ وان کے شمالی علاقے میں ہیں (بوزنطی صوبۂ Χαλδία میں طربزون کے قریب قصبۂ خِلاط، اَخْلاط وغیرہ، دیکھیے Belck و Lehmann : *ZA* ۱۸۹۴ء، ۹ : ۸۴ ؛ de Goeje : کتاب مذکور، ۱۰ : ۱۰۰ ؛ Streck : کتاب مذکور، ۱۴ : ۱۱۲) ۔ خَلْدی سے مشابہ نام قفقاز کے دوسری طرف بھی پائے گئے ہیں ۔ گرجیوں کو خرتھوالی، خرتھولی Kharth-veli-Kharth-ul-i کہا گیا ہے (سوانی میں خیَرد ؛ منگرلی میں خورتُو) دیکھیے Adontz : *Armenia v epokhu Iustiniana* ، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۸ء، ص ۳۹۸ ۔

ہم قَرْدُو کو خواہ سامی سمجھیں یا مقامی لوگ کم از کم ایک بات یقینی ہے کہ قدیم کرد چوی Karduchoi کی سر زمین آج کل کردوں کے اہم مراکز میں سے ہے، لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ کردچوی ہی کرد تھے اور یہی نظریہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک بھی بدیہی سمجھا جاتا تھا، دیکھیے Grundriss : *d. Iran. Phil*، ۲ : ۴۶۴ ۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کردوں کا تعلق براہ راست Χάλδοι سے ملا دیا جاتا تھا ۔

Reiske نے *De Ceremoniis*، کتاب ۱۳، ص ۷۱۳، س ۱۱، میں Constantine Porphyro-

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

gene'os کی شرح میں لکھا ہے: "Chaldi et Kordi vel. Curti, Gordyai iidem [= خلدی اور کوردی یا کرتی اور گوردیائی ایک ہی ہیں] - اسی قسم کی رائے Lerch کی تصنیف (۱۸۵۶ء) کے عنوان *Récherches sur les Kurdes Iraniens et sur leurs Ancêtres, les Chaldéens Septentrionaux* میں بھی ظاہر کی گئی ہے۔

اس مسئلے کا ایک نیا پہلو Nöldeke M. Hartmann اور Weissbach کی تحقیقات سے سامنے آیا، جنھوں نے کُرد اور قَرْدو کی اصل کا لسانی اعتبار سے فرق پیش نظر رکھنے کی ضرورت ظاہر کی - علاوہ ازیں ان علما نے یہ تجویز پیش کی کہ کرد کو Κύρτιοι تسلیم کیا جائے، یعنی سیرتی Cyrtii، جن کا ذکر کلاسیکی مصنفوں نے میڈیا اور ایران میں کیا ہے (Strabo، ۱۱ : ۱۳، س ۳ و ۱۵ : ۳، س ۱) - اس مفروضے کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ ساسانیوں کے عہد میں کردوں کے متعدد قبیلے فارس میں موجود تھے (دیکھیے کارنامۂ اردشیرِ بابکان، مترجمۂ Nöldeke، گوٹنجن ۱۸۷۹ء، ص ۳۷، ۴۸؛ نیز عرب مصنفین کی شہادتیں)۔

کُرد اور قَرْدو کے ناموں میں قابل قبول امتیاز کے باوجود یہ اہم مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا کہ سیرتیوں (Cyrtii = ایرانی کردوں) نے اپنی نو آبادیاں ان علاقوں میں کیسے بنائیں جو زغروس Zagros کے مغرب میں واقع ہیں، یعنی قدیم قَرْدو کا ملک اور مقابل تاوروس (Anti-Taurus) کے پہاڑ، جو شمالی شام تک پھیلے ہوے ہیں - اس مسئلے پر ابھی بڑی احتیاط سے تحقیق کی ضرورت ہے - پہلی بات تو یہ ہے کہ میڈیا اور ایران کی فتوحات کے دوران میں ایرانی اقوام بہت حد تک جگہ سے بے جگہ ہوئی ہوں گی - اس کی ایک مثال ہمیں سگرتیوں (Asagartiya) کے ایک گروہ کے ترک وطن میں ملتی ہے، جن کا اصل وطن سیستان تھا - آشوری عہد میں ان سگرتیوں Sagartians کو ہم میڈیا (ذِکِرتو Zikirtu یا ذَکُرتی Zakruti؛ دیکھیے Streck، *ZA*، ۱۴ : ۱۴۶) میں پاتے ہیں - دارا Darius کے زمانے میں (بیستون، کتبہ ۲ س ۹۰) ان کا دارالحکومت دشت آشوری میں اربلہ Arbela کے مقام پر قائم ہو چکا تھا، جہاں دارا نے ان کے سردار چِتْرَنْتَخْمَہ Citrantakhma کو قتل کیا، جس کی اس تصویر سے جو بیستون کی چٹان پر کھدی ہوئی ہے، کردی وضع قطع ظاہر ہوتی ہے (L.W. King: *The Sculptures of Behistan*، لنڈن ۱۹۰۷ء) - یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سیرتیوں کی اجیر فوج نے ۲۲۰ ق - م اور ۱۷۱ ق - م کے مابین روم، سلوقیوں (Seleucids) اور شاہان پرگمہ (Pergamon) کے درمیان لڑائیوں میں حصہ لیا تھا (Livy، ۴۲ : ۵۸ س ۱۳ و ۳۷ : ۴۰ س ۹؛ Polybius، ۵ : ۵۲ س ۵؛ نیز دیکھیے Weissbach، در Pauly-Wissowa، بار دوم، بذیل مادّۂ Cyrtii؛ A. J. Reinach: *Les Mercenaires de Pergame*، *Revue Archéologique*، ۱۹۰۹ء، ص ۱۱۵ تا ۱۱۹) - ساتویں صدی عیسوی میں ارمینیہ کے جغرافیے میں صوبۂ کورچیخ Korcēkh کے سلسلے میں بڑے دلچسپ تغیر و تبدل کا حال معلوم ہوتا ہے (بقول Adontz: *Armenia*، ص ۴۱۸، کورچیخ دراصل کورتچ ایخ Kortič-aikh سے بنا ہے جس میں کورتچ Kortič سے مراد کرد ہے، جیسے Atrpatic سے مراد Atropatene کا باشندہ ہے) - فوسطوس بوزنطینوس Faustus Byzantinus کے زمانے (چوتھی صدی) میں کورچیخ سَلْماس [رک بآں] کے قریب محض ایک ضلع تھا: کورچیخ بحیثیت ایک صوبے کے جُولا مرگ سے جزیرۃ ابن عمر تک پھیلا ہوا تھا اور اس میں حسب ذیل اضلاع شامل تھے: کوردِخ، تین کوردرخ (کوردِخ)، اَیْتُونخ، اَیْگرخ، موتھو لاؤخ (اوتھولنخ)

www.besturdubooks.wordpress.com

اورسروخ (اورسنخ)، کرتھنخ (سرپونخ)، چھک اور کوچک البک (Hartmann[n] : *Bohtan*، ص ۹۳؛ Hübschmann : *Die altarm. Ortsnamen*، ص ۲۵۵ تا ۲۵۹).

ہمیں ان تغیرات کا بھی پتا چلتا ہے جو یہاں بتدریج رونما ہوتے رہے۔ کوردخ، کوردخ اور تمورخ (جس کا ذکر فوسطوس Faustus نے قدیم Corduene کی جگہ کیا ہے) کے تین اضلاع میں سے کوردخ کورچیخ کا محض ایک ضلع بن گیا تھا، اور تمورخ بالکل محو ہوگیا تھا۔ اس سے کوردرخ (کوردخ) کو پورا فائدہ پہنچا، جسے صرف بالائی وسطی اور زیریں اضلاع میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

Hübschmann (موضوع مذکور، ص ۳۸۵) نے صرف کوردرخ اور کوردخ کے درمیان فرق واضح کرنے پر اکتفا کیا ہے، لیکن عموماً M. Hartmann اور Nöldeke نے جو لسانی فرق قائم کیا تھا اس سے مخلوط یا مسخ شدہ شکلوں کا وجود خارج از امکان نہیں ہوتا (M. Hartmann، موضع مذکور، ص ۹۲: "es gingen wohl schon früh die Namen durcheinander" [= بہت ممکن ہے کہ ان ناموں میں خاصی مدت پہلے التباس واقع ہو چکا تھا])۔ Nöldeke نے تو اسما کا ایک تیسرا گروہ بھی علٰحدہ قائم کیا ہے، یعنی آرامی قرتواید Kartewāyē (عربی قرتاویۃ ؟) جس کا مطلب ہے اصل کرد؛ دیکھیے Hoffmann : *Auszüge* وغیرہ، ص ۲۰۷، حاشیہ ۱۶۳۹.

اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عرب فتوحات کے زمانے کے قریب ایرانی یا ایرانی نما قبائل پر مشتمل ایک ملی جلی قوم کے لیے صرف ایک نسلی اصطلاح کرد (جمع: اکراد) استعمال ہونے لگی تھی۔ مؤخرالذکر قبائل میں سے بعض تو یہاں کے اصلی قدیمی باشندے تھے (قردو، تمورخ Tmorikh یا طمورایہ Tamurāyē اس ضلع میں جس کا صدر مقام التی (Elk) تھا)۔ الخوثیہ (Χοθαῖται) ساسون کے ضلع خوئت Khoit میں، اورطایہ Ortāyē (= الارطان) فرات کے موڑ پر؛ بعض سامی تھے (دیکھیے کرد قبائل کے معروف شجرہ ہائے نسب) اور بعض غالباً ارمن تھے (کہا جاتا ہے کہ قبیلۂ مَمْکان مَمْکونی النسل ہے).

بیسویں صدی میں یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ ایک غیر کرد ایرانی عنصر کردوں میں شامل ہو چکا تھا (یعنی گوران زا زا گروہ)۔ متعدد اضلاع میں ایک طرح کی معاشرتی طبقہ بندی ہوگئی تھی، جس کی بنیاد نوواردوں کے سیاسی غلبے پر قائم تھی، یعنی سلیمانیہ [رک بآں] میں، ساوج بلاق [رک بآں] میں اور کوتور میں، جہاں شقاق کے زیر تسلط بچے کھچے کورہ سنلی (؟) ملتے ہیں۔ اگر باقاعدہ تحقیق کی جائے تو ممکن ہے کہ ایسی قدیم اقوام کے آثار کا پتا چل سکے جن پر کرد عنصر کے چھا جانے سے ایک واحد قوم کی شکل بن گئی.

شجرہ ہائے نسب اور معروف اشتقاقات: کردوں کی ابتدا کے مسئلے کے بارے میں اسلامی مآخذ اور کردی روایات سے ہمیں کوئی مدد نہیں ملتی۔ المسعودی نے بتایا ہے کہ وہ ان ایرانیوں کی نسل سے ہیں جو ظالم بادشاہ ضحاک [تازی] کے پنجے سے نکل کر یہاں چلے آئے تھے۔ (مروج، طبع Barbier de Meynard، ۳: ۲۵۱)۔ اس روایت کی بہترین تفصیل شاھنامہ (طبع Macan، ۱: ۲۷ تا ۲۸؛ طبع Mahl، ۱: ۷۱؛ طبع Vullers، ۱: ۳۶ اشعار ۲۹ تا ۳۸) میں ملتی ہے۔ ۱۸۱۲ء میں Morier (*Second Journey*، ص ۳۵۷) نے دماوند میں (۲۱ اگست کو) ایک تہوار کا ذکر کیا ہے، جو ضحاک کے استبداد سے ایران کے نجات پانے کی یاد میں منایا جاتا تھا اور اسے عید کردی کہتے تھے۔ دوسری طرف کردوں نے اپنا سلسلۂ نسب عربوں سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ بعض (مروج، ۳: ۲۵۳) کا دعوٰی تھا کہ ربیعۃ بن نزار بن معد ان

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کا جد امجد ہے اور بعض مُضر بن نزار کی نسل سے ہونے کے مدعی تھے؛ چنانچہ ان دونوں کے نام پر دیار ربیعۃ (موصل) اور دیار مضر (رَقّۃ) کے اضلاع کے نام رکھے گئے تھے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ غسّانیوں کے خلاف لڑائیوں کے باعث اپنے عرب خاندان سے علٰحدہ ہو گئے اور پہاڑوں میں پناہ لینے اور اجنبیوں کے ساتھ خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے اپنی مادری زبان بھول گئے۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ اسلاف کے ناموں کا وہ سلسلہ ہے جس میں ہمیں کُرد بن مَرْد (دیکھیے Μαρδοί، کردوں کے ہمسائے) بن صَعْصَعَۃ بن حَرْب بن ہوازن (المسعودی : کتاب مذکور؛ نیز التنبیہ، ص ۸۸ تا ۹۱ : کرد بن اَسْفندیاذ بن منو شہر؛ ابن حَوقل، ص ۱۸۵ تا ۱۸۷ : کُرد بن مَرْد بن عَمرو) کے نام ملتے ہیں۔ ان تمام شجرہ ہائے نسب میں تاریخی حقیقت کا بھی کچھ شائبہ ہوسکتا ہے (مثلاً سامیوں کا ایرانی رنگ قبول کرلینا اور زغروس Zagros اور فارس کے قبائل کا باہمی امتزاج)۔

عوام پسند اشتقاقات کی بھی کوئی کمی نہیں۔ کوشش کی گئی ہے (مُروج، ۳ : ۲۴۹) کہ اس نام کا سلسلہ عربی مادّۂ کَرَّ سے ملایا جائے؛ اس اعتبار سے کُرد نوجوان کنیزوں اور جَسَد نامی دیو (جسے حضرت سلیمانؑ نے نکال باہر کیا تھا) کی اولاد ٹھیرتے ہیں۔ بسا اوقات (دیکھیے Driver، در *JRAS*، ۱۹۲۳ء، ص ۳۰۴) اسم کرد کا رشتہ فارسی لفظ گُرد (= قہرمان: بطل) سے جوڑا جاتا ہے، اگرچہ پہلوی زبان میں اس مادّے میں دراصل "گ" تھا اور اس کا تعلق مادّۂ "ور" (بمعنی حفاظت کرنا) سے ہے (Horn : *Neuper. Etymol.*، ص ۲۰۰)۔

زمانۂ مابعد میں قبائل کے ناموں کی توضیح اکثر ان ناموں سے کی جاتی تھی جن کی طرف وہ منسوب ہوتے تھے؛ شرف نامہ (۱ : ۱۵۸) کی رو سے تمام کرد (بَجْنَوی اور بُخْتی قبائل) بَجَن اور بُخْت سے آئے تھے۔ ان میں سے اوّل الذکر کا سلسلہ بسناو Basn-āw سے قائم کیا جاسکتا ہے، جو دریائے دجلہ کا ایک معاون ہے (Andreas، در Hartmann، ص ۱۳۱) اور آخر الذّکر سے ہیروڈوٹس Herodotos کے Παχτυικὴ یا شاہ اژدر (کُرد؟) ہفتان بُخت کی یاد تازہ ہوتی ہے، جسے اردشیر بابکان نے ہلاک کیا تھا (دیکھیے Nöldeke : *Tabari*، ص ۱۱)۔ ایک اور داستان کے مطابق، جو شمال اور مغرب میں بالخصوص مقبول ہے، ایک زمانے میں کرد دو شاخوں میں منقسم تھے: ہِلان اور زِلان؛ پہلی شاخ عرب سے آئی تھی اور دوسری مشرق سے۔ زلان کو کمتر درجے کی نسل شمار کیا جاتا تھا (دیکھیے M. Sykes، در *Jour. R. Anthrop. Inst.*، ۱۹۰۸ء، ۳۸ : ۴۷۰)۔

مآخذ : (۱) F. Justi : *Kurdische Grammatik*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۰ء، ص ۲۲؛ (۲) W.Tomaschek : *Sasun und d. Quellengebiet d. Tigris*، در *S. Ak. Wien*، ۱۸۹۵ء، ج ۱۳۳/۴؛ (۳) M. Hartmann : *Bohtan*، در *Mitt. d. Vorderasiat. Gesell.*، ۱۸۹۶ء/۲، ۱۸۹۷ء/۱، ص ۹۰ تا ۱۰۳؛ (۴) Nöldeke : *Kardu und Kurden*، در *Festschrift f. H. Kiepert*، برلن ۱۸۹۸ء، ص ۷۳ تا ۸۱؛ (۵) Hübschmann : *Die altarmen. Orts-namen*، در *Indogerm. Forsch.*، ۱۹۰۴ء، ۱۶ : ۲۵۵ تا ۲۵۹؛ (۶) Weissbach، در Pauly-Wissowa : *Real-Encyclopädie*، بذیل مادّۂ Καρδοῦχοι و Κύρτιοι؛ (۷) Driver : *The name Kurd and its philological connexions*، در *JRAS*، ۱۹۲۳ء، ص ۳۹۲ تا ۴۰۳۔

ب۔ تاریخ

عربوں کی فتح کے بعد کے زمانے سے ہمیں کردوں کی بابت بڑے مفصل حالات ملتے ہیں۔ سن ہجری کی پہلی پانچ صدیوں میں پیش آنے والے واقعات میں کردوں کا خاصا حصہ تھا، بلکہ

www.besturdubooks.wordpress.com

اکثر واقعات کے سلسلے میں کرد ہی پیش پیش نظر آتے ہیں ۔ اس زمانے میں کردوں کے بہت سے شاہی خاندان منظر عام پر آئے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی سے دسویں صدی ہجری تک ترک اور مغل حملہ آوروں کی یورشوں سے کرد دبے دبے رہے، لیکن سلاطین عثمانیہ اور شاہان صفوی کے درمیان جنگوں کے زمانے میں کردستان میں ایسے حالات پیدا ہوگئے جو وہاں جاگیردارانہ نظام کی نشوونما کے لیے ساز گار تھے ۔ اس کی ایک صحیح تصویر ہمیں شرف نامہ (۱۰۰۳ھ/۱۵۹۶ء) میں ملتی ہے ۔ ترکیہ اور ایران کی سرحد آہستہ آہستہ مستحکم ہوگئی اور ایرانی کوہ زغروس اور اس کی شمالی شاخوں کے پیچھے ہٹ آئے ۔ اب ترکیہ نے اپنے مشرقی صوبوں میں مرکزی حکومت کے اقتدار کو مضبوط کرنے کا کام شروع کر دیا ۔ انیسویں صدی کے اواخر میں بچی کھچی کرد ریاستیں بھی مملکت ترکیہ (هَکّاری، بِدْلیس، سلیمانیہ) اور ایران (اَرْدَلان) میں مدغم ہو کر نیست و نابود ہوگئیں، لیکن بڑے بڑے کُرد قبائل کا وجود اب تک باقی ہے اور ان کی اندرونی تشکیل کُرد قوم اور اس کی معاشری و نسلی خصوصیات کی بقا کی ضامن ہے ۔ ایران تو شاید ہی کبھی کرد قبائل کے داخلی مسائل میں دخل اندازی کرتا مگر ترکیہ کی کوشش ہوتی کہ کردوں کو اپنے مرکزی اقتدار کا سہارا قرار دے اور اسی حیثیت سے ان سے کام لے ۔ بعض اوقات تو یہ کُرد انعام و اکرام کے بوجھ تلے دبے رہتے اور کبھی انھیں اپنی قدیم خود مختاری کے بچے کچھے آثار کو دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لیے مزاحمت کرنا پڑتی ۔ انیسویں صدی میں کردوں نے متعدد بار علم بغاوت بلند کیا ۔ بیسویں صدی میں ایک کردی تحریک کا آغاز ہوا، جس سے اس شورش پسندی میں اضافہ ہو گیا جو ترکی سلطنت کے اندر موجود تھی ۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب نے کردوں کو سیاست کے میدان میں کھینچ لیا ۔ کردوں کے اخباروں، رسالوں اور جماعتوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا ۔ عالمی جنگ (۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء) میں پہلی بار بڑی طاقتوں نے ایک خود مختار کردستان کا تصور پیدا کیا، لیکن اس تجویز کو ابھی تک صرف جزوی طور پر عملی جامہ پہنایا جا سکا ہے اور اس کا محل وقوع محض موصل کی قدیم ولایت کے ایک حصے تک، جو عراق کی نئی مملکت میں شامل ہے، محدود ہے ۔

کُرد عرب فتوحات کے بعد: بہتر ہوگا کہ ہم اپنے بیان کا آغاز ان معلومات سے کریں جو عرب مصنفین نے کرد قبائل کی تعیین و تعداد کے بارے میں جمع کی ہیں ۔

چونکہ عہد سلاجقہ سے قبل کردستان کے نام سے کوئی آشنا نہ تھا، لہٰذا عرب مصنفین کردوں کا ذکر عموماً زَوْزَان، خِلاط، اَرْمینیہ، آذربیجان، جبال، فارس وغیرہ کے عنوانات کی ذیل میں کرتے ہیں (دیکھیے Driver: *Dispersion of the Kurds in Ancient Times*، در *JRAS*، اکتوبر ۱۹۲۶ء، ص ۵۶۳ تا ۵۷۲) ۔

المَسْعودی (تقریباً ۳۳۲ھ/۹۴۳ء) اور الاِصْطَخْری (۳۴۰ھ/۹۵۱ء) پہلے مصنف ہیں جنھوں نے کردوں کے بارے میں باقاعدہ معلومات مہیا کی ہیں ۔ مُروج الذَّہَب (۳ : ۲۵۳) میں المَسْعودی نے حسب ذیل قبائل شمار کیے ہیں: دِیْنَوَر اور هَمَذَان میں شُہْجَان: کَنْگَوَر میں ماجِردان؛ آذربیجان (متن میں تصحیح فرما لیجیے) میں هَذْبانی اور سَرَاة (غالباً شُرَاة = خوارج [رک بآں]؛ دیکھیے (داستان دَیْسَم نیچے)؛ جبال میں شَادَنْجان، لَزْبَة (لُرّی ؟)، مَادَنْجان، مَزْدانکان، بارسَان، خَالی (جلالی)، جابارق، جَاوانی، مُسْتَکان؛ شام میں دَبَابِلة، وغیرہ؛ موصل اور جودی میں عیسائی کرد، یعنی الیَعْقُوبِیّة

www.besturdubooks.wordpress.com

(Jacobite) اور جُرْقان (جُرْغان) ۔ اس فہرست میں اسی مصنف کی دوسری کتاب التّنبیہ (ص ۸۸ تا ۹۱) سے صرف بازنجان (دیکھیے الاصطخری، ص ۱۱۵)، نَشْوَرہ، بوذیکان اور کیکان (جو آج کل مَرْغَش کے قریب ملتے ہیں) کا اضافہ ہوتا ہے، لیکن اس نے ان مقامات، یعنی رُمُوم (زُموم؟) کی ایک فہرست دی ہے، جہاں کرد مقیم تھے: فارس، کرمان، سجستان، خراسان (الاصطخری، ص ۲۸۲: ضلع اسد آباد میں ایک کرد گاؤں)، اصفہان (قبیلۂ بَازَنْجان کا ایک حصہ اور ایک بارونق قصبہ جسے کرد بیان کیا گیا ہے؛ دیکھیے الیعقوبی، ص ۲۷۵؛ الاصْطَخری، ص ۱۲۵)، جبال، بالخصوص ماہ کوفہ، ماہ بصرہ، ماہ سَبَذان (ماَ سَبَذان) اور دو اِیْغار (یعنی کَرَج ابن دُلَف اور بُرْج)، ہَمذان، شہر زُور، جس میں اس کی دونوں ماتحت ریاستیں دَرآباد اور صَمْغان (زَمْکان) شامل ہیں، آذربیجان، ارمینیہ (دریاے جیحوں کے کنارے کُرد دَوِین کے مقام پر گارے اور پتھر کے بنے ہوے مکانوں میں رہتے تھے، المقدسی، ص ۲۷۷)، اَرّان (بَرْدَعة کا ایک دروازہ "باب الاکراد" کہلاتا تھا۔ ابن مُسکَوَیہ کا بیان ہے کہ ۳۳۲/۳۳۲ ۱۰۴۳ء میں روس کے حملے کے وقت یہاں کے مقامی حاکم کے ماتحت کرد سپاہی تھے)، بَیْلَقان، باب الاَبْواب (دَربَند)، الجزیرہ، شام اور الثُّغور، (یعنی کیلیکیا (Cilicia) کی سرحد پر قلعوں کی قطار)۔

الاِصْطَخری نے ص ۹۸ پر بالخصوص فارس میں پانچ رُمُوم کا ذکر کیا ہے جو ان اضلاع کو کہا جاتا تھا جن میں کرد پھیلے ہوے تھے۔ ڈخویہ (*BGA*، ۴: ۲۵۰) کے بیان کے باوجود ہم اس لفظ کا املا بصورت 'رَمْ رُمُوم' (فارسی لفظ رَم [رمہ] سے مشتق بمعنی ریوڑ، بھیڑ) کو ترجیح دیں گے، کیونکہ زُومہ سے صیغۂ جمع زُموم بنانا قرین قیاس نہیں۔ ہر رَمّ کا اپنا قصبہ اور ایک اپنا کرد سردار ہوتا تھا، جس پر خراج اور عوام کی حفاظت کی ذمّےداری عائد ہوتی تھی۔ یہ رُموم حسب ذیل تھے: (۱) جِلُویہ، یا رَامِجان، جس کی سرحدوں پر اصفہان اور خوزستان واقع تھے؛ (۲) لَوَالِجان، شیراز اور خلیج فارس کے درمیان؛ (۳) دیوان، کورۂ سَابُور میں؛ (۴) کارِیان، کرمان کی سمت میں؛ (۵) شاہریار، اصفہان کے نزدیک، جسے وہاں کے بڑے قبیلے کے نام پر بَازَنْجان بھی کہتے تھے۔ اس قبیلے کا ایک حصہ صوبۂ اصفہان میں نقل مکانی کر گیا تھا۔ رموم کی فہرست کے ضمیمے کے طور پر الاصْطَخری نے فارس کے ۳۳ خانہ بدوش قبائل (حیّ؛ جمع: اَحْیا) کی فہرست بھی دی ہے، جو دیوان الصّدقات کے بیانات پر مبنی ہے اور جسے ابن حَوْقَل (ص ۱۸۵ تا ۱۸۷) اور المُقَدّسی (ص ۴۳۶) نے بھی نقل کیا ہے: کرمانی، رامانی، مُدَثّر، محمّد بن بَشَر، بُقَیلی (المُقَدّسی: الثَّعلبی)، بُنداد مَہْری، محمّد بن اسحٰق، سباحی، اسحٰقی، اَذْرَکانی، شَہْرَکی، طُہَمادہنی، زِبادی، شَہْرَوی، بُنَدادکی، خُسْرَوی، زَنْجی، صَفَری، شَہْیاری، مُہرکی، مُبارکی، اُشْتام ہَری، شاہونی، فُراتی، سَلْمونی، سیری، آزاد دوختی، بَراز دوختی، مُطّلبی، مَمالی، شاہکانی، کَجْتی، جَلِیلی؛ یہ کل پانچ لاکھ گھرانے تھے، جو خیموں میں رہتے تھے۔

فارس نامہ (تقریباً ۵۰۰ھ/۱۱۰۷ء) میں لکھا ہے (ص ۱۶۸) کہ فارس کی قدیم فوج کا بہترین حصہ جِلُویہ، ذِیْوان، لَوالِجان، کارِیان اور بَازَنْجان کے پرانے اور وسیع رموم کے کردوں پر مشتمل تھا۔ یہ سب ان جنگوں میں ہلاک ہو گئے جو اسلام کی آمد پر لڑی گئیں؛ صرف ایک عَلَک باقی بچا، جو مسلمان ہو گیا اور اس کی نسل جاری رہی۔ باقی کردوں کو عضد الدّولہ نے اصفہان سے فارس میں منتقل کر دیا۔ یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ کردوں کے پانچ لاکھ (؟) گھرانے بالکل نیست و نابود

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ہو گئے؛ البتہ یہ امکان قابل قبول ہے کہ فارس کے کرد قبیلے آپس میں مل جل گئے ہوں اور ان کے از سر نو نئے قبیلے بن گئے ہوں اور انھوں نے اپنی پرانی قومیت کو ترک کردیا ہو۔ آج کل جلُویہ کے قدیم رَمّ (کوہ گلُو) میں اب لُر آباد ہیں۔ ہمیں یہ علم نہیں کہ وہ کب سے وہاں آباد ہیں، تاہم الاصْطَخری کی فہرست میں فارس کے کردوں میں ایک قبیلے لُرّیہ (یا لَزْبَہ ؟) کا ذکر آیا ہے۔ دوسری جانب فارس نامہ میں کردوں اور شَبان کارہ [رک بآں] قبائل کے درمیان امتیاز کیا گیا ہے۔ آل بُوَیہ کے آخری بادشاہوں کے عہد میں یہ شَبان کارہ قبائل فارس میں بے حد قوت حاصل کر چکے تھے۔ العُمَری : مَسالِکُ الاَبْصار میں شَبان کارہ کا ذکر ایک جداگانہ عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔ شرف نامہ میں ان کا ذکر کرد خانوادوں کی ذیل میں نہیں ملتا؛ ہاں ان کا ایک قبیلہ (رامانی) ایسا ہے جس کا نام الاِصْطَخری کی کرد قبائل کی فہرست میں موجود ہے۔ ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فارس کے کرد کردستان کے قبائل سے بہت کچھ مختلف تھے [رک بہ شُول اور لُر]۔

اصطلاح الزَّوزَان کا جو ایک حد تک وسطی کردستان کے مرادف ہے (کردی زبان میں اس کا مفہوم موسم گرما کی چراگاہیں ہے) مفہوم واضح نہیں۔ بقول ابن حَوْقل (ص ۲۵۰) زَوْزان کا بادشاہ الدَّیْرانی کہلاتا تھا (= دِرَنِک، وَسپُرکان کا ارمنی بادشاہ)۔ المُقَدّسی (ص ۱۳۷) زوزان کو جزیرۃ ابن عمر کا ایک ناحیۃ قرار دیتا ہے۔ اس علاقے میں کردوں اور عیسائیوں کی مخلوط آبادی تھی اور آگے چل کر اس کی حدود وسیع ہو گئیں۔ ابن الأثیر (در یاقوت : ۲ : ۲۵۷) کے بیان کے مطابق الزّوزان کا علاقہ موصل سے دو روزہ مسافت کے بعد شروع ہوتا تھا اور وہ خِلاط کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا؛ آذربیجان کی طرف یہ علاقہ سَلْماس تک پہنچتا تھا۔ بہت سے مستحکم مقامات بَشْنَوی اور بوختی کردوں کے قبضے میں تھے۔ اوّل الذّکر کے پاس بَرْقا، بَشیر [اور فَنَک] تھے؛ آخر الذّکر کے پاس جرذقیل (گُرگیل)، یعنی ان کے مَلِک اتَل (شرف نامہ، ۱ : ۱۱۷ : نَش آتِل ؟) کے صدر مقام کے علاوہ عَلُّوس اور باز اَلْحمرا تھے؛ فرمانروایان موصل (زَنگی) کے قبضے میں حسب ذیل مقامات تھے : اَلْتی (= الک)، اَرْوَخ، بَخوخَۃ (= بکوکی، در بَرْواری)، برخو، کَنْگَور(؟)، نُیْرَوَۃ (عَکْر؟ کے مشرق میں؟) اور خَوْشَب۔ یاقوت کا متن زیادہ قابل وثوق نہیں ہے۔ بہرحال یہ ان کرد قلعوں کے نام ہو سکتے ہیں جو آہستہ آہستہ حَمدانی اور زنگی فرمانرواؤں نے اپنی قلمروؤں میں شامل کر لیے۔

کرد خلفائے بنو عباس اور آل بویہ کے عہد میں : المسعودی (مروج، ۳ : ۲۴۹) نے عہد جاہلیت کی وہ روایات محفوظ کر دی ہیں جن میں غسّانی عرب [رک بہ غسّان] حکمرانوں اور کردوں کے مابین جنگوں کا ذکر ہے۔ عرب مسلمانوں کے ۱۶ھ/۶۳۷ء میں تَکْریت اور حُلْوان پر قبضہ کر لینے کے بعد ان کا کردوں سے واسطہ پڑا۔ سَعْد بن ابی وقّاص نے موصل پر چڑھائی کی، جس سے وہ اضلاع قبضے میں آ گئے جہاں کرد آباد تھے (اَلْمَرْج با نُہَذرا، با عَذْرا، حِبْتُون، داسن، وغیرہ) دیکھیے ابن الأثیر : الکامل، طبع Tornberg، ۲ : ۴۰۸۔ اس علاقے کی فتح عِیاض بن غَنَم اور العُتْبۃ کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچی (البَلاذُری: فتوح البلدان، طبع de Goeje، ص ۳۳۱)۔ ۱۹ھ/۶۴۰ء میں الزّوزان کے بطریق نے خراج ادا کرنا منظور کرکے اپنے اقتدار کی توثیق کر لی (فُتوح، ص ۱۷۶) - ۱۸ھ/۶۳۹ء میں عربوں کی کردوں سے سوسہ (Susiana) میں لڑائی ہوئی کیونکہ کردوں نے اہواز کے ایرانی حاکم الہُرْمُزان کی

www.besturdubooks.wordpress.com

حمایت کا اعلان کر دیا تھا (الکامل، ۲ : ۴۲۵) ۔ اسی طرح فارس میں کردوں نے ۲۳ھ/۶۴۲ء میں فَسا اور دَاراب جُرد کے دفاع کے سلسلے میں ایرانیوں کا ساتھ دیا (کتاب مذکور، ۳ : ۳۲)۔ حضرت عمرؓ نے اھواز کے کردوں کے مقابلے کے لیے کئی بار فوج بھیجی (فتوح، ص۳۸۲، ۳۸۹؛ الکامل ۳: ۳۷)۔ دوسری طرف حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں کردوں نے وسطی کَرْخا کے علاقے (صَیْمَرہ، ماسَبَذان) پر حملہ کیا جہاں الیعقوبی کے زمانے تک فارسی زبان ہی بولی جاتی تھی (BGA، ۷ : ۲۳۶) ۔ قبل از اسلام یوں تو عرب شہرزُور تک پہنچ چکے تھے (ابن الفقیہ، ص ۱۳۰)، لیکن شہرزور، دَار باذ اور صَمْغان پر فیصلہ کن قبضہ ۲۲ھ/۶۴۳ء میں ایک خونریز جنگ کے بعد ہی ہو سکا (فتوح، ص ۳۳۴؛ الکامل، ۳ : ۲۹) ۔ جنوب میں ۲۵ھ/۶۴۵ء میں بصرے کے عامل ابو موسیٰ کو بِیْروذ اور بَلْسجان میں کردوں کی بغاوتوں کو فرو کرنا پڑا۔ لیکن کُرد جنھوں نے اسلام قبول تو کر لیا تھا، لیکن بعد میں بڑی تعداد میں مرتد ہوگئے (الکامل، ۲ : ۶۶، ۷۶)۔ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں کردوں نے ایرانیوں اور عیسائیوں کے دوش بدوش اھواز کے قریب الخِرِّیت اور فارس کی بغاوتوں میں شرکت کی، لیکن ان کے سردار کو رام ہرمز کے مقام پر شکست ہوئی (کتاب مذکور، ۳ : ۳۰۹) ۔

اموی خلیفہ عبدالملک کے عہد میں المختار نے ارمینیہ اور آذربیجان پر قبضہ کر لیا ۔ اس نے ۶۶ھ/۶۸۵ء میں حلوان میں ایک عامل مقرر کیا جس کے ذمّے یہ کام تھا کہ کردوں کے خلاف جنگ کرے (الکامل، ۴: ۱۸۷)، لیکن المختار کی وفات کے باعث یہ تجویز عمل میں نہ آ سکی ۔ اسی خلیفہ کے عہد میں باغی عبدالرحمٰن نے فارس میں سابور کے کردوں سے ۸۳ھ/۷۰۲ء میں ساز باز کر لی (کتاب مذکور، ۴ : ۳۵۲) ۔ ۹۰ھ/۷۰۸ء میں کردوں نے فارس کو تاراج کیا اور الحجّاج نے انھیں سزا دی ۔ ۱۲۹ھ/۷۴۶ء میں سابور کے کردوں نے خارجیوں کے حلیف سلیمان کا مقابلہ کیا جس نے خلیفہ مَروان ثانی سے باغی ہوکر سابور کا محاصرہ کر لیا تھا (کتاب مذکور، ۴ : ۳۸۷، ۳۴۱؛ ۵ : ۲۸۳) ۔ خلیفہ مروان خود ایک کرد کنیز کے بطن سے تھا (الطبری، ج ۳، ۱ : ۵۱) اور نیلی آنکھیں اور گورا رنگ اسی سے ورثے میں پایا تھا (The Caliphate : Sir W. Muir، لنڈن ۱۸۹۱ء، ص ۴۲۹) ۔

عباسی خلیفہ المنصور کے عہد میں جب خزاروں نے ۱۴۷ھ/۷۶۴ء میں ارمینیہ پر حملہ کیا تو متعدد بغاوتیں برپا ہوئیں ۔ اس سے چند سال بعد کردوں کا ذکر (انتشار الاکراد) پھر اس شورش کے سلسلے میں ملتا ہے جو موصل میں ہوئی اور جس کی صدائے بازگشت ہمدان میں بھی سنائی دی (الکامل، ۵ : ۴۴۸ و ۶ : ۹) ۔ المنصور کے بیٹے جعفر کی ماں بھی ایک کرد کنیز تھی (الطبری، ۳ : ۴۴۲) ۔

المستعصم کے زمانے میں ۲۲۵ھ/۸۳۹ء کے حالات کے تحت ایک کرد بغاوت کا ذکر آتا ہے جو موصل کے ضلع میں ہوئی ۔ اس بغاوت کا ذمّے دار ایک اعلیٰ کرد خاندان کا نو عمر رکن جعفر بن فَہر تھا ۔ بادغیس میں شکست کھانے کے بعد جعفر نے داسِن کے پہاڑوں میں پناہ لی اور یہاں اس نے خلیفہ کے لشکر کو شکست دی ۔ ترک سردار آیتاخ کے ماتحت ایک نئی فوج ترتیب دی گئی جس نے اس بغاوت کو فرو کیا (الکامل، ۶ : ۳۶۰، ۳۶۱) ۔ ۲۳۱ھ/۸۴۵ء میں کردوں کی ایک اور بغاوت اصفہان، جبال اور فارس کے علاقوں میں رونما ہوئی، لیکن اسے ترک سپہ‌سالار وَصِیف نے جلد ہی فرو کر دیا ۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

۲۵۲ھ/۸۶۶ء میں موصل کے کرد مُساوِر خارجی کے ساتھ مل گئے جس نے موصل پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۲۶۲ھ/۸۷۵ء میں انھوں نے زنجی غلاموں کی شورش میں خاصا حصہ لیا (دیکھیے Nöldeke : *Sketches from Eastern History* لنڈن، ص ۱۴۶ تا ۱۷۵ : *A Servile war in the East*)، جن کی قیادت ایک علوی خارجی (؟) علی محمّد المعروف بہ الخَبیث کے ہاتھ میں تھی، نیز خاندان صفّاریہ [رک بآں] کے بانی یعقوب الصفّار کی بغاوت میں بھی انھوں نے اچھا خاصا حصہ لیا۔ یعقوب نے اھواز میں اپنا ایک کرد نائب محمّد عبیداللہ بن ہزار مَرْد مقرر کیا۔ اس کے ارادے بہت بلند تھے، چنانچہ وہ الخبیث سے خفیہ نامہ و پیام کرنے لگا۔ الخَبیث کی مرسلہ کمک لے کر محمّد نے سوس پر چڑھائی کی، لیکن احمد لَیْثویہ کے ہاتھوں شکست کھائی۔ احمد بن لَیْثویہ خود ایک کرد تھا اور اس کرد امدادی فوج کا سپہ سالار تھا جو خلیفہ نے یعقوب کی بغاوت کچلنے کے لیے بھیجی تھی (ابن خلکان : وَفیات، طبع de Slane، ۴ : ۳۰۴ تا ۳۰۸)۔ جب احمد وہاں سے رخصت ہوگیا تو محمّد نے الخبیث سے مزید کمک حاصل کرکے، جس کا کچھ حصہ کردوں پر مشتمل تھا، شوستر پر قبضہ کر لیا۔ یہاں اگرچہ یہ طے پا چکا تھا کہ الخبیث کے نام کا خطبہ پڑھا جائے گا، پھر بھی اس کی جگہ اس نے خلیفہ المعتمد اور اس کے حریف یعقوب الصفّار کے نام کا خطبہ پڑھ دیا۔ اس پر محمّد کے زنجی حلیفوں نے اس سے قطع تعلق کرلیا اور شوستر پر دوبارہ ابن لَیْثویہ کا قبضہ ہوگیا۔ محمّد نے رام ہُرمز میں پناہ لی، لیکن الخبیث کے سپہ سالاروں نے اسے وہاں سے نکال دیا۔ محمّد کو جب 'دارنان کردوں' کی جانب سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے الخبیث سے پھر مدد چاہی۔ الخبیث نے اسے کچھ فوج بھیجی جسے اس نے فوراً میدان جنگ میں بھیج دیا اور جب اس فوج کے سپاہی گھر گئے تو اس نے دفعۃً ان پر حملہ کر دیا، لیکن محمّد، الخبیث سے ترک تعلق نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے وہ اسے خلیفہ تسلیم کر لینے پر رضامند ہوگیا۔ یعقوب کی وفات (۲۶۵ھ/۸۷۹ء) اور الخبیث کی وفات (۲۷۰ھ/۸۸۳ء) سے ان مہمات کا خاتمہ ہوگیا (الکامل، ۷ : ۲۶۴)۔

جب تقریباً ۲۸۱ھ/۸۹۴ء میں ایک عرب حَمْدان بن حَمْدُون نے موصل میں اپنی حکومت قائم کی تو کرد اس کے حامیوں میں شامل تھے۔ ۲۸۴ھ/۸۹۷ء میں ابولیلی نے کُردوں کی ایک بغاوت برپا کی جو زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکی (کتاب مذکور، ۷ : ۳۲۵، ۳۳۷)۔ ۲۹۳ھ/۹۰۶ء میں ہَذبانی کردوں نے اپنے شیخ محمّد بن بلال کی قیادت میں نینوا کے علاقے کو تاخت و تاراج کیا۔ موصل کے نئے عامل عبداللہ بن حمدان نے ان کا تعاقب کیا، لیکن اسے مَعْطوبۃ کے مقام پر ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اگلے سال اس نے خلیفہ کی ارسال کردہ کمک ساتھ لے کر پانچ ہزار ہذبانی گھرانوں کا تعاقب پھر شروع کیا۔ کردوں نے مہلت حاصل کرنے کے لیے نامہ و پیام شروع کیا اور آذربیجان میں ہٹ آئے۔ عبداللہ نے موصل واپس آکر نئی فوج ساتھ لی اور ایک بار پھر ہذبانیوں پر چڑھائی کر دی جو جبل السِّلّق (غالباً لاھِجان، دیکھیے ساوج بولاک) میں خندقیں کھود کر محصور ہو بیٹھے تھے۔ ہذبانی ہتیار ڈالنے پر مجبور کر دیے گئے اور ان کے بعد حُمَیدی قبیلے اور جبل داسن کے باشندوں کی شورشیں فرو ہوگئیں (کتاب مذکور ۷ : ۳۷۱)۔ خلیفہ المقتدر کے عہد میں کردوں نے موصل کے مضافات میں لوٹ مار کی، لیکن حمدانی حکومت کے ہاتھوں سزا پائی۔ قبیلۂ جلالی نے بالخصوص شدید مقاومت کی۔ ۳۳۷ھ/۹۴۳ء کے احوال میں ابن

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

مہ کویہ (: تجارب الامم، ۶: ۱۰۵) ایک فوج کشی کا ذکر کرتا ہے جو حسین حمدانی نے آذربیجان پر کی تھی۔ اس موقع پر اس کا ایک حلیف ہذبانی قبیلے کا شیخ جعفر بن شکویہ تھا جو سلماس میں سکونت پذیر تھا۔

تقریباً اسی زمانے میں دیسم بن ابراہیم تاریخ کے صفحات پر نمودار ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کے دلیرانہ کارناموں کا کردوں سے بڑا قریبی تعلق رہا۔ وہ خود ایک عرب باپ اور کرد ماں کا بیٹا تھا اور دیلمیوں کے ایک مختصر گروہ کے سوا اس کے تمام پیرو کرد تھے۔ دیسم خارجی تھا۔ اس نے یوسف بن ابی الساج کے بعد آذربیجان پر قبضہ کر لیا اور ۳۲۷ھ/۹۳۸ء میں لشکاری بن مرزی کو ملک سے نکال دینے کے لیے اپنے کردوں سے کام لیا جو وشمگیر زیاری کے عاملوں میں سے تھا۔ ایک مشہور شیعی مسافری مرزبان دیسم سے آذربیجان چھین لینے میں کامیاب ہو گیا۔ دیسم نے اپنے دوست حاجیک بن الدیرانی (وسپرکن کا ارمنی بادشاہ خچک گجک بن درنک) کے ہاں پناہ لی۔ اب اہل تبریز نے دیسم سے مدد کی التجا کی، لیکن یہاں پھر اس نے ہزیمت اٹھائی اور پسپا ہو کر مسافریون کی رضامندی سے طرم چلا گیا۔ ۳۳۷ھ میں رکن الدولہ بویہی نے مرزبان کو قید کر لیا اور آذربیجان میں اپنا ایک نائب بھیج دیا۔ اس وقت مرزبان کے بھائی وہسودان کو دیسم کا خیال آیا جس کے کرد سپاہی ابھی تک اس کے وفادار تھے۔ اس نے دیسم کو رکن الدولہ کے نائب کے مقابلے میں روانہ کیا۔ دیسم کو شکست ہوئی، لیکن وہ اردبیل اور برذعہ میں ڈٹا رہا۔ جب مرزبان قید سے رہا ہو کر لوٹا تو دیسم کو پہلے ارمینیہ میں اور پھر بغداد میں پناہ لینی پڑی جہاں معزالدولہ بویہی نے اس سے بہت فیاضانہ سلوک کیا۔ اس کے دوست اسے آذربیجان واپس جانے پر اکسا رہے تھے، اس لیے وہ موصل اور شام کے حمدانی فرمانرواؤں کے پاس اعانت حاصل کرنے کے لیے گیا۔ ۳۴۴ھ میں دیسم مرزبان کی عدم موجودگی میں سلماس واپس آیا اور وہاں سیف الدولہ فرمانروائے شام کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ لیکن مرزبان نے دیسم کو پھر وہاں سے نکال دیا اور اس نے اپنے ارمنی دوستوں سے پناہ دینے کی درخواست کی۔ ابن الدیرانی (درنک بن خچک) کو اسے بجبر و اکراہ مرزبان کے حوالے کرنا پڑا۔ دیسم کی آنکھیں نکلوا دی گئیں۔ بالآخر اس نے ۳۴۵ھ میں قید خانے میں وفات پائی (تجارب، طبع Amedroz، ۱: ۳۴۵؛ ۲: ۱۴۸ تا ۱۵۱؛ الکامل، ۸: ۲۸۹، ۳۶۱، ۳۷۵ تا ۳۷۷)۔

جن دنوں مرزبان رے میں اسیر تھا، ایران کے شمال مغرب میں کئی صوبیدار خود مختار ہو گئے۔ ان میں سے ایک (تقریباً ۳۴۰ھ/۹۵۱ء) محمد شداد بن قرطو تھا جو قبیلۂ روادی سے تھا اور جس کی نسل سے آگے چل کر آل ایوب کا عظیم خاندان وجود میں آیا۔ آل شداد کی بڑی جاگیریں دبیل اور گنجہ تھیں اور وہ بوزنطیوں اور سلاجقہ کے حلیف تھے۔ ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء میں ابوسوار نے اپنے نو عمر بیٹے منوچہ کے لیے شہر انی خرید لیا۔ اس وقت سے یہ خاندان دو شاخوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک شاخ گنجہ کی تھی، دوسری انی کی۔ ۱۱۲۴ء میں انی پر گرجستانی قابض ہو گئے، لیکن ۵۲۰ھ/۱۱۲۶ اور ۵۵۷ھ/۱۱۶۱ء کے مابین اور پھر ۱۱۶۵ سے ۱۱۷۴ء تک اس پر آل شداد کا قبضہ رہا۔ آل شداد بڑے روشن خیال فرما نروا تھے، انھوں نے بہت سی قابل توجہ عمارتیں بطور یادگار چھوڑیں [رک بہ دوین، گنجہ، شداد]؛ ارمنی مآخذ در Lynch: *Armenia*، ۱: ۳۶۳ تا ۳۶۷؛ دیکھیے نیز Barthold، اس کے Lane-Poole کی

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Muham. Dynasties کے روسی ترجمے کے ضمیمے میں، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۹ء، ص ۲۹۴؛ Barthold : Aniyskaya 'Pers. nadpis na.....meceti Manuce Esce o slove "celebi" :N. Marr ۵؛ Seriya، شمارہ ۵؛ Zapiski، ۱۹۱۱ء، ۲۰ : ۱۲۰؛ E. D. Ross : Asia Major. on Three Muhammadan Dynasties، ۲/۲(۱۹۲۵ء) : ۲۱۵ .

۳۴۹ھ/۹۶۰ء میں آذربیجان میں ایک مدّعی حکومت پیدا ہوا جو اسحٰق بن عیسٰی کے نام سے مشہور تھا اور جسے قحطانی (؟) کردوں کے سردار فضل کی تائید و حمایت حاصل تھی ۔ اس کے مقابلے میں اس کے حریف جَسْتان بن مَرْزُبان مسافری کو هَذْبانیوں کی امداد پر بھروسا تھا ۔ اسحٰق کو بہت جلد ٹھکانے لگا دیا گیا (تجارب، ۲: ۱۷۹)۔ کردوں اور دیلمیوں نے ان لڑائیوں میں بھی خاصا حصہ لیا جو جَسْتان اور اس کے بھائی ناصر الدّولہ اور ابراهیم بن مَرْزُبان اور اس کے چچا زاد بھائی اسمٰعیل بن وَهْسودان کے درمیان ہوئیں (تجارب، ۲ : ۲۱۹، ۲۲۹؛ الکامل، ۸ : ۴۲۰ تا ۴۲۳) .

۳۴۸ھ/۹۵۹ء کے قریب الجبال میں کردوں کا دوسرا شاهی خاندان ظہور میں آیا (Lane. Poole : Mohamm. Dynasties ، شمارہ ۵۷)، جس کی بنیاد قبیلۂ بَرْزِیکانی (بَرْزِینی) کے شیخ حَسْنَوَیه (حَسْنُوَیه) بن حسن [رَک بآں] نے رکھی تھی (دیکھیے نیز شرف نامه، ۱ : ۲۰ تا ۲۳) اور جس نے خراسان پر لشکر کشی کے موقع پر رکن الدّولہ بوَیْہی کی مدد کی تھی ۔ رکن الدّولہ نے کردوں سے بڑی روا داری کا سلوک کیا اور جب کبھی کوئی اس سے ان کی زیادتیوں کی شکایت کرتا تو وہ یہی جواب دیتا تھا کہ آخر کردوں کو بھی زندہ رهنا ہے (تجارب، ۲ : ۲۸۱) ۔ ابن الأثیر (۸ : ۵۱۹) نے حَسَنَوَیه کے اعلٰی کردار، اس کی دانشمندانہ حکمت عملی اور پاکیزہ اخلاق کی تعریف کی ہے۔ جب ۳۶۹ھ/۹۷۹ء میں حسنویہ نے اپنے دارالحکومت سرماج (بیستون کے جنوب) میں وفات پائی تو عَضُد الدّولہ نے اس کے مقبوضات (هَمَدان، دِیْنَور، نِہاوند) پر قبضہ کر لیا تاکہ انہیں اپنی مملکت میں شامل کر لے، لیکن انجام کار اس نے بَدْر بن حسنَوَیه (۳۶۹ھ/۹۷۹ء تا ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء) [رَک بآں] کے نام فرمان مسند نشینی جاری کر دیا ۔ بدر نہ صرف ہمیشہ عَضُد الدّولہ کا وفادار رہا، بلکہ اپنے بھائیوں کے خلاف معرکہ آرا بھی ہوا، کیونکہ وہ باغی فَخر الدّولہ سے جا ملے تھے ۔ خلیفہ نے بدر کو ناصر الدّین والدّولۃ کا خطاب عطا کیا ۔ مؤرخین نے بدر کی انتہائی تعریف و توصیف کی ہے اس نے اپنے قبیلے میں تعلیم پھیلائی، محصول مقرر کرنے میں عدل و انصاف سے کام لیا اور کسانوں کے حقوق کی حفاظت کی [ابوشجاع] : تجارب، ص ۲۸۷ تا ۲۹۹، ۳۲۷؛ (ابن مُحَسِّن) ص ۴۲۹، ۴۴۹ تا ۴۵۴؛ العتبی : کتاب یمینی، مترجمۂ Reynolds، ص ۴۲۴)۔ بدر کا جانشین ظاہر (طاہر ؟) صرف ایک سال تک حکومت کر سکا اور ۴۰۶ھ/۱۰۱۵ء میں شمس الدّولہ بویہی نے اسے نکال باہر کیا ۔ حَسَنویه کا چچا وَنْدَاد جو اسی قبیلے کی ایک شاخ عَیْشیۃ کا رئیس تھا، ۳۴۹ھ/۹۶۰ء میں فوت ہوا، اس کا بھائی ابو الغَنائم ۳۵۰ھ/۹۶۱ء میں چل بسا ۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے بیٹے ابو سالم دَیْسم کو جو اس ہم جَد شاخ کا آخری حکمران تھا، اس کے قلعوں (قَسَان یا قَسْنان [قَسْلان ؟ نزد بابا یادگار، ذُهاب کے کنارے]، غانم آباد وغیرہ) سے محروم کر دیا گیا .

عَضُد الدّولہ کو کئی موقعوں پر کردوں سے سابقہ پڑا، لیکن وہ ان کے ساتھ اپنے باپ رکن الدّولہ کی نسبت کہیں زیادہ متشدّد تھا ۔ ۳۶۸ھ/۹۷۸ء میں ایک کرد ابن بادُوَیه نے ابو تَغْلب الحمدانی کی

www.besturdubooks.wordpress.com

مدد سے اَرْدَمُشت (کَواشِی، نزد جبلِ جُودی، یاقوت ۱ : ۹۹) میں خود مختار حکومت قائم کر لی، لیکن کچھ ہی دن بعد وہ عَضُدُ الدّولہ کے بہکانے میں آ گیا ۔ ۳۶۹ھ/۹۷۹ء میں عَضُدُ الدّولہ نے شہرِ زُور کے کردوں کے خلاف ایک فوجی مہم روانہ کی ۔ وہ چاہتا تھا کہ انھیں بنو شَیْبان کے بدویوں سے علٰحدہ کر دے جن سے ان کے تجارتی اور ازدواجی روابط تھے ۔ شہرِ زُور کا قصبہ فتح ہو گیا اور عرب صحرا کو واپس چلے گئے (تجارب، ۲ : ۳۹۸، الکامل، ۸ : ۵۱۶) ۔

ایک اور مہم ۳۷۰ھ/۹۸۰ء میں ہَکّاری کردوں کے خلاف بھیجی گئی اور انھیں محصور کر لیا گیا، انھوں نے اس وعدے پر بھروسا کرتے ہوئے ہتیار ڈال دیے کہ ان کی جانوں سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا، لیکن اس مہم کے قائد نے انھیں مَعَلْسایا اور موصل کے درمیان سڑک کے کنارے کنارے پانچ فرسخ تک سولیوں پر چڑھا دیا (الکامل، ۸ : ۵۲۱) ۔

عَضُد الدّولہ کی زندگی ہی میں حُمَیْدی سردار ابو عبداللہ حسین بن دُشَنج (یا ابو شجاع باذ بن دُسْتاک) المعروف بہ باذ بہت کچھ بد نام ہو چکا تھا ۔ ابتدا میں وہ ایک گڈریا تھا، لیکن آہستہ آہستہ اَرْجِیش، آمِد اور میّافارِقین کا والی بن بیٹھا ۔ نَصِیبِیْن کی ایک شورش کے دوران میں اس کا اور صمصام الدّولہ کا مقابلہ ہو گیا ۔ باذ نے صمصام الدّولہ کی فوجوں کو باجَلائیا (خابُور الحسینیہ کے کنارے ضلع کَواشی = اردَمُشت میں) کے مقام پر شکست دی اور موصل پر قبضہ کر لیا ۔ وہ ابھی یہ منصوبہ بنا ہی رہا تھا کہ بغداد پر چڑھائی کر کے بویہی سلطنت کو ختم کر دے، کہ اتنے میں صمصام الدّولہ کے ہاتھوں اسے شکست ہوئی ۔ وہ میّافارِقین میں ہٹ آیا اور اس کے مقابلے میں بھیجی ہوئی فوج کے سالار سے بات چیت کر کے دیار بکر اور تُرعابِدِین کے مغربی حصے کا قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ باذ موصل پر قبضہ کرنے کے خیال سے ابھی دستبردار نہیں ہوا تھا ۔ چنانچہ ۳۷۹ھ/۹۹۰ء میں بُشْنَوی کردوں کی ایک کثیر جماعت جمع کر کے اس نے اس شہر کی فصیلوں کے ساتھ ہی چھاؤنی ڈال دی اور وہاں کے باشندوں سے گفت و شنید میں مصروف ہو گیا، لیکن حَمدانی فرمانرواؤں نے جنھیں حال ہی میں اپنی موروثی جاگیر پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی تھی، بنو عُقَیل کے عربوں سے اعانت طلب کی اور حملہ آوروں پر دھاوا بول دیا ۔ باذ ایک ناگہانی حادثے کی وجہ سے سخت مجروح ہو گیا اور بالآخر قتل کر دیا گیا ۔ اس کی لاش سولی پر لٹکائی گئی، لیکن اہل موصل نے اسے حاصل کر کے تمام رسوم کے ساتھ اس کی تجہیز و تکفین کی، کیونکہ وہ کفّار کے خلاف لڑ چکا تھا (الکامل، ۹ : ۲۵، ۲۷، ۳۸، ۴۹؛ [ابو شجاع] : تجارب، ص ۸۳، ۸۴، ۱۷۶ تا ۱۷۸؛ ابوالفرج : مختصر الدول، طبع Pococke، ص ۳۲۱ تا ۳۲۳) ۔

۳۸۰ سے ۳۹۰ء تک صمصام الدّولہ نے اپنی حالت کو زیادہ مستحکم کرنے کی کوشش کی اور اس غرض سے اس نے فُولاد بن مُنْذِر سے اتحاد کر لیا جسے شیراز میں بھرتی کیے ہوئے کرد رسالے کی اعانت حاصل تھی ۔ اس اقدام میں بھی اسے ناکامی ہوئی تو اس نے کردوں سے پناہ کی درخواست کی، لیکن انھوں نے اسے دھوکا دیا اور وہ فخرالدّولہ کے ہاں پناہ گزین ہو گیا جو کردوں سے نفرت کرنے میں نام پیدا کر چکا تھا، ([ابو شجاع] : تجارب، ص ۱۸۴؛ ابن فُولاد کے لیے دیکھیے العُتبی، محل مذکور، ص ۴۲۴، ۴۲۵) ۔

بنو مروان کے کرد خاندان (Lane-Poole، شمارہ ۴۷) کا باذ سے قریبی تعلق تھا ۔ موصل میں

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

شکست کھانے کے بعد اس کا بھانجا اور حلیف ابوعلی بن مروان بن دُسْتَاک، حِصْن کَیْفَا [رک بآں] چلا آیا، جہاں باذ کی دَیلمی بیوی رہتی تھی ۔ اس نے اس سے شادی کر لی اور باذ کے مقبوضہ قلعوں میں سے ایک پر قبضہ کر لیا ۔ اس نے دو بار ابو عبداللہ الحمدانی کو، جس نے باذ کو شکست دی تھی، گرفتار کرلیا، لیکن اس سے فیاضانہ سلوک کیا ۔ ابن مروان نے دیار بکر میں اپنی حکومت قائم کر لی اور اس کے صلح جویانہ رویے کے باعث وہاں کے باشندے اس کے حامی ہوگئے ۔ بنو مروان نے ۳۸۰ھ/۹۹۰ء سے ۴۸۹ھ/۱۰۹۶ء تک حکومت کی ۔ ان کی قلمرو میں صرف دیاربکر (آمِد، اَرْزَن، مَیّافارِقین، حِصْن کَیْفا) ہی نہیں بلکہ خِلاط، ملاز گِرد، اَرْجیش اور جھیل وان کے شمال مشرق کا علاقہ بھی شامل تھا ۔ مغرب میں کچھ عرصے تک اُرْفَہ بھی ان کے قبضے میں رہا ۔ ۳۸۱ھ/۹۹۱ء میں ابو علی حسن نے شام پر حملہ کیا اور اسے بوزنطی بادشاہ باسل Basil دوم سے چھین لیا ۔ وہ ۳۸۷ھ/۹۹۷ء میں دیار بکر کے لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا جنھوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی تھی ۔ اس کا بھائی ابو منصور مُمَہّد الدّولہ جس نے باذ کی وفات پر مَیّافارِقین پر قبضہ کر لیا تھا، وہاں ۴۰۲ھ/۱۰۱۱ء تک حکومت کرتا رہا (ابو الفداء: *Annales Moslemici*، طبع *Reiske*، ۲ : ۵۶۹) ۔ اس کا جانشین اس کا بھائی ابونصراحمد (ابن خَلِّکان، ۱ : ۱۵۷، ۱۵۸) ہوا جس نے ۴۰۲ھ سے ۴۵۳ھ تک حکومت کی ۔ ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء میں اس نے اُرْفَہ فتح کرلیا، لیکن ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء میں بوزنطیوں نے وہاں پھر اپنی حکومت قائم کر لی (ابو الفرج، ص ۳۴۲) ۔ اگرچہ اس کا میلان طبع عیاشی کی طرف تھا، لیکن اسے ایک عادل، روشن خیال اور قابل حکمران کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی ۔ ۴۴۲ھ/۱۰۵۰ء میں ابو نَصْر کو سلجوق بادشاہ طُغْرِل کے سامنے سر اطاعت خم کرنا پڑا ۔ اس کے بیٹے اور جانشین ابو القاسم نَصْر المعروف بہ نظام الدّولہ (۴۵۳ تا ۴۷۲ھ) کی حکومت میں اس کا بھائی سعید (م ۴۵۷ھ) شریک تھا ۔ اس نے اپنی مملکت میں حرّان، سُوَیْدَا وغیرہ کا اضافہ کیا ۔ اس کا جانشین منصور ابن سعید ہوا جو ۴۷۲ سے ۴۸۹ھ تک برائے نام حکومت کرتا رہا، لیکن ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء تک سلجوق سپہ سالار فخرالدّولہ بن جَہِیر اس کے تقریباً تمام علاقوں پر قابض ہو چکا تھا، جنھیں اتابک موصل (ابو الفِداء، ۳ : ۷۷ تا ۷۹، ۸۷، ۱۲۱، ۱۲۵، ۲۴۹) کے ماتحت کر دیا گیا ۔ آل مروان کے بارے میں دیکھیے خصوصی مطالعہ از Amedroz، *JRAS*، ۱۹۰۳ء، ص ۱۲۳ تا ۱۵۴ ۔

ترکوں کے حملے سے کچھ دن پہلے ہمیں کردوں کی متعدد مہمات اور کارناموں کا ذکر ملتا ہے ۔ القادر کے عہد (۳۸۱ تا ۴۲۲ھ) میں مؤرخین نے ایک کرد احمد بن الضّحّاک کا یہ کارنامہ بیان کیا ہے کہ اس نے باسل Basil دوم کے سپہ سالار کو ہلاک کر دیا اور اس طرح بوزنطیوں کی پیش قدمی روک دی ۔ ([ابو شجاع]: تجارب، ص ۲۴۷) ۔ ۳۶۶ اور ۳۸۸ھ کے مابین کردوں نے آل بویہ اور آل زِیَار کی باہمی کشمکش میں حصہ لیا جو جُرجان پر قبضہ کرنے کے لیے جاری تھی (العتبی، ص ۲۹۸ تا ۳۰۲؛ ابن اسفندیار، *GMS*، ص ۲۲۶ تا ۲۲۸) ۔ اس کے چند سال بعد ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ محمود غزنوی نے قرہ خانیوں کے خلاف کردوں کو استعمال کیا (العتبی، ص ۳۳۶) ۔

کردوں نے آل بویہ کی خانہ جنگیوں میں اور موصل پر قابض ہونے کے لیے بنو عُقَیل کی جِدّو جہد میں حصہ لیا ۔ ۴۱۱ھ/۱۰۲۰ء میں وہ ان ترک دستوں سے نبرد آزما ہوئے جنھوں نے حمدان

www.besturdubooks.wordpress.com

[کذا، همدان؟] میں بغاوت کر دی تھی۔ ۴۱۵ھ سے ۴۲۰ھ تک وہ آل بویہ کے آخری فرمانروا ابو کالیجار کے خلاف فارس اور خوزستان میں لڑتے رہے (الکامل، ۹ : ۱۰۰، ۱۳۴، ۲۲۶، ۲۳۲، ۲۳۹، ۲۴۷، ۲۴۹، ۲۵۴، ۲۶۵؛ [ابن محسن :] تجارب، ص ۳۴۸، ۳۷۶، ۳۸۱)۔ اس طرح جنگوں میں مسلسل حصہ لیتے ہوئے کرد قوم رفتہ رفتہ کمزور ہوتی رہی، یہاں تک کہ ترک عساکر یہاں آپہنچے، جن کے مقدر میں نسلی اعتبار سے مشرق قریب میں ایک انقلابی تغیر پیدا کرنا تھا۔

ترکوں کی فتوحات : ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں سلاجقہ کے پیشرو غز رے میں پہنچے تو غزنویوں کا ترک سپہ سالار تاش فراش تین ہزار سوار لے کر مقابلے کے لیے نکلا، جن میں کردوں کی بھی ایک جماعت شامل تھی۔ کردوں کے سردار کو غزوں نے گرفتار کر لیا تو اس نے اپنے آدمیوں کو پیغام بھیجا کہ لڑائی بند کردو۔ اس سے شور و شغب پھیل گیا اور تاش مارا گیا (الکامل، ۹ : ۲۶۸)۔ اسی سال غز میرا پہنچ گئے اور متعدد هذبانی کردوں کو تہ تیغ کردیا۔ کردوں نے آذربیجان کے فرمانروا (وہسودان دوم) سے معاهدہ کرلیا اور غز پسپا ہونے پر مجبور ہوگئے۔ غزوں کی ایک دوسری جماعت ارمینیہ پر یورش کرنے کے بعد ارمیہ اور ابو الہیجاء هذبانی کے علاقے میں پھر آدھمکی۔ کردوں نے اس پر حملہ کیا، مگر شکست کھائی۔ ۴۳۲ھ/۱۰۴۱ء میں آل مسافر کے فرمانروا وہسودان دوم بن ملکان نے تبریز میں غزوں کی ایک بڑی جماعت کو قتل کردیا۔ ارمیہ کے غز هکاری چلے گئے، جو موصل کے ماتحت ایک ریاست تھی اور ملک میں تاخت و تاراج کا بازار گرم کر دیا، لیکن جن دنوں وہ پہاڑوں میں پھنسے ہوئے تھے، کردوں نے ان پر حملہ کر دیا ور ان کے ڈیرہ ہزار آدمی مار ڈالے اور بہت سے قیدی اور بیش بہا مال غنیمت اپنے ساتھ لے گئے (الکامل، ص ۲۷۰ تا ۲۷۲)۔

طغرل بیگ کے دستوں کی آمد پر غز دهشت زدہ ہو کر آگے بڑھتے چلے گئے اور ان کے قائدین انھیں الزوزان کے راستے الجزیرہ میں لے گئے۔ غزوں کی ایک جماعت تو منصور بن غز اوغلی کی ماتحتی میں الجزیرہ کے مشرق کی جانب ٹھیر گئی اور دوسری بوقا کے ماتحت دیار بکر کی طرف بڑھتی گئی۔ اس نے راستے میں قردو، بازبدا، حسینیہ (یاقوت، ۲ : ۲۷۰، موصل اور الجزیرہ کے درمیان ایک قصبہ) اور نیشابور کے اضلاع میں خوب لوٹ مار کی۔ الجزیرہ کے فرمانروا سلیمان بن نصرالدولہ مروانی نے غزوں کو ترغیب دی کہ وہ شام میں بسے ہوئے غزوں سے جا ملنے کے لیے بہار کے موسم تک انتظار کریں اور اس سے پہلے اس غرض کے لیے اس کی مملکت سے نہ گزریں۔ اس کے بعد اس نے مکر و فریب سے منصور کو گرفتار کر لیا اور فنیک کے بشنوی کردوں کی مدد سے غزوں کا پیچھا کیا، لیکن وہ اپنی غارتگری سے باز نہ آئے۔ انھوں نے ضلع دیار بکر کو لوٹا کھسوٹا اور موصل پر قبضہ کر لیا (الکامل، ۹ : ۲۷۲ تا ۲۷۳)۔

اس دوران میں آل حسنویہ پر زوال آ چکا تھا اور جبال کی حکومت ایک نئے خاندان بنو عناز (دیکھیے Sachau : *Ein Verezeichnis Muham. Dynastien*، ص ۱۹؛ شرف نامہ، ۱ : ۲۲ : عیار) کے ہاتھ میں جا چکی تھی، جسے اکثر ابو الشوق بھی کہتے ہیں۔ قبل ازیں ۳۴۰ھ/۹۵۱ء میں ہمدان میں ترکوں کی ایک بغاوت کے دوران میں معز الدولہ بویہی کو حلوان کے شبل ابن ابی الشوق کی خدمات سے فائدہ اٹھانا پڑا تھا (تجارب، ۲ : ۲)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کا اصل مؤسس ابو الفتح محمد بن عناز (الکامل، ۹ : ۱۵۸) تھا، جس نے ۳۸۰ سے

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۱۰۴۰ھ تک حکومت کی ۔ اس کے بیٹے ابو الشّوق نے ۴۰۶ھ میں آل حَسَنویہ کے آخری فرمانروا ظاہر (طاہر) کو موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ بنو عَنّاز کے مقبوضات میں شہرزور، کرمان شاہ (۴۳۱ھ میں قبضہ ہوا، الکامل، ۹ : ۳۰۰، ۳۱۶)، بیلوار، صَمْغان دَقُوقہ، خُفْتِذکان شامل تھے ۔ ۴۳۷ھ میں طُغرل نے اپنے بھائی ابراہیم ینال [کذا، اینال ؟] کو جبال میں امن و امان قائم کرنے کے لیے بھیجا، جس نے گرشاسپ بُویہی کو ہَمدان سے نکال باہر کیا اور اس نے جوزقان کردوں کے ہاں پناہ لی۔ کرمان شاہ میں ابوالشوّق کا ایک حفاظتی دستہ مقیم تھا، جو دیلمیوں اور شاجَنجانی کردوں پر مشتمل تھا ۔ کرمان شاہ فتح ہوگیا اور ابو الشّوق نے ۴۳۸ھ/۱۰۴۶ء میں سیروان میں وفات پائی ۔ ابراہیم نے صَمیران (شَمران ؟ صَیمَرہ ؟) پر قبضہ کرکے جوزقان کو زیر کر لیا ۔ سعدی بن ابو الشّوق نے سلاجقہ کی اطاعت قبول کر لی ۔ اس خاندان کی حکومت ۵۲۰ھ/۱۱۱۶ء تک قائم رہی (منجّم باشی، حوالہ در Sachau، محل مذکور)۔

مَلازْ گرد میں شنہشاہ رومانوس Romanus چہارم کو شکست ہوئی (۴۶۳ھ/۱۰۷۱ء) اور سارے ارمینیہ پر آلپ آرسلان کا قبضہ ہوگیا ۔ سلاجقہ کے عظیم خاندان کے دوران حکومت میں شَبانکارہ [رکک بان] کا شورش پسند خاندان فارس میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس خاندان کی کیفیت احوال کا پتا ۴۲۱ سے ۷۵۶ھ تک چلایا جا سکتا ہے، لیکن یہ بات مشکوک ہے کہ یہ خاندان واقعی کرد تھا یا نہیں (دیکھیے اوپر) ۔ دوسری جانب کردوں کے چھوٹے چھوٹے خاندان بڑی بیدردی سے مٹا دیے گئے اور ان کی جگہ ترکوں کو آباد کر دیا گیا ۔ ۴۹۳ھ/۱۱۰۰ء میں آخری مروانی فرمانروا خلاط کے علاقے میں سے نکل گیا اور وہاں ایک ترک سُقمان قُطبی نے خاندانِ شاہ ارمن کی بنیاد رکھی ۔ یہ خاندان ایک صدی تک، یعنی آل ایّوب کی آمد تک حکومت کرتا رہا ۔ ۴۹۵ھ/۱۱۰۱ء کے ذیل میں ابن الأثیر (۱۰ : ۲۳۸) نے سَلْغُور قَرہ بُولی کے ترکمانوں کے ہاتھوں بنو عَنّاز کی ایک شاخ سَرخاب بن بدر کے دو ہزار کردوں کے مارے جانے کا ذکر کیا ہے ۔ آگے چل کر دوسرے ترکمانوں نے شَہْرزُور، دَقُوقہ اور خُفْتِذکان کے سوا سَرخاب کا سارا علاقہ لے لیا ۔ ان کچل دینے والی ضربوں کے باوجود گیارھویں اور بارھویں صدی میں کردوں کا ذکر اکثر آتا ہے۔ ملک شاہ نے قاورد، حاکم کرمان، کے خلاف لڑائی کے دوران میں کرد اور عرب فوجوں سے کام لیا اور اس کے صلے میں انھیں بعد ازاں کرمان میں جاگیریں عطا کیں (الکامل، ۱۰ : ۵۳)، جہاں کردوں کی آبادیاں پہلے سے موجود تھیں (دیکھیے المسعودی : التنبیہ، ص ۸۸؛ ابن خلّکان، ۱ : ۵۱۶) ۔ ۴۹۶، ۴۹۸ اور ۵۰۳ھ میں کردوں نے دُجَیل، ماردین، وغیرہ پر یلغاریں کیں ۔ ۵۰۴ھ/۱۱۱۰ء میں محمّد بن ملک شاہ کی شام پر لشکر کشی میں احمدایل بن وَھسودان، حاکم مَراغہ، جو قبیلۂ رَوّادی کا کرد تھا (دیکھیے الکامل، ۱۰ : ۳۹۱) اور سُقمان، شاہ ارمینیہ، نے حصہ لیا ۔ اس لشکر کشی کا نتیجہ ناکامی رہا اور کردوں کو ترکوں [کے قلعے] سُقمان کا محاصرہ کرنے کا موقع مل گیا (*Recueil des Hist. des Croisades Docum Orientaux*، ۳ : ۵۴۲، ۵۹۹)۔

اس زمانے میں ہمیں شام میں کردوں کا ذکر اکثر ملتا ہے؛ یہیں ان کا فرنگیوں سے سابقہ پڑا تھا (دیکھیے Derenbourg : اُسامہ بن مُنقذ) ۔ سنجر کے عہد میں جبال کے مغربی حصے کو صوبۂ کردستان بنا دیا گیا اور سنجر کا بھتیجا سلیمان یہاں کا والی مقرر ہوا ۔ اس نے بَہار (ہَمدان کے شمال مشرق میں) کو اپنا صدر مقام بنایا ۔ صوبے میں

www.besturdubooks.wordpress.com

خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ سنجر ھی کے زمانے میں کردوں نے ۵۱۳ھ کی شورشوں میں حصہ لیا۔ ۵۱۶ھ میں ایک تادیبی فوج نے ھکّاری، زوزان اور بَشْنَوی کے اضلاع کا دورہ کیا (الکامل، ۱۰ : ۳۷۴، ۳۷۷، ۴۲۶)، لیکن تھوڑی ھی مدت بعد کردوں نے طُور عابِدین کے مسیحی اُسقف کے قلعے پر قبضہ کر لیا (Assemani : *Bibl. Or.*، ۲ : ۲۲۱)۔

موصل کے اتابک : یہ اتابک وسطی کردستان کے ھمسائے تھے، جہاں انھوں نے بڑے نمایاں کام انجام دیے۔ عماد الدّین زنگی نے کئی بار کردوں کے علاقے پر حملے کیے۔ ۵۲۸ھ/۱۱۳۴ء میں اس نے طَنْزہ (بُختان کے بائیں کنارے پر) پر قبضہ کر لیا اور حُمَیدی حکمران کو، جس نے موصل کے محاصرے کے وقت خلیفہ المسترشد کی مدد کی تھی، سزا دینے کے لیے اس کے قلعے العَقر، شُوش، وغیرہ چھین لیے (شمس الدّین، در *Recueil*، ۳ : ۶۶۶، ۶۶۷؛ ابن الأثیر : الاتابکیہ، در کتاب مذکور، ۲ : ۸۷)۔ ابو الھَیْجا والی اِرْبیل و آشِب وغیرہ نے زنگی کی اطاعت قبول کر لی (یہ ابو الھَیْجا ضرور ھکّاری ھوگا ؟ یہ قبیلہ ان دنوں اس علاقے کے جنوب میں رھتا تھا، جو اب اس کے نام سے منسوب ھے؛ دیکھیے Hoffman : *Auszüge*، ص ۲۰۳)۔ ابو الھیجا کی وفات کے بعد زنگی نے اس کے جانشینوں کے جھگڑوں میں دخل اندازی کرکے آشِب پر قبضہ کر لیا اور اس کے استحکامات منہدم کرا دیے؛ قلعۂ جَلاب کا نام عَمادیّہ (عِمادیّہ، عماد الدّین کے اعزاز میں) رکھا گیا۔ ۵۳۴ھ/۱۱۳۹ء میں زنگی نے قِفْجاق بن آرسلان تاش ترکمان سے شَہْرزور چھین لیا۔ ۵۳۷ھ/۱۱۴۲ء میں اس نے ھکّاری پر چڑھائی کی اور قلعۂ شَعْبانی (= آشب ؟) فتح کر لیا اور اسے از سر نو تعمیر کرایا۔ ۵۳۸ھ میں اس نے اِرْبِل اور خیزان پر قبضہ کر لیا (شمس الدّین، در *Recueil*، ۳ : ۶۸۵)۔ رابیہ (دیکھیے شرف نامہ، ۱ : ۲۸۴)، فَرَح اور عَلْتا (Elk) کا فرمانروا علی اپنی مرضی سے زنگی سے مل گیا۔ زنگی کی آخری فوجی مہم فَنَک (فِنک) کے بِشنویوں پر چڑھائی تھی، لیکن ۵۴۱ھ/۱۱۴۶ء میں اتابک کی وفات پر شہر کا محاصرہ اٹھا لیا گیا (ابن الأثیر : الاتابکیہ، در *Recueil*، ۲ : ۸۶، ۱۱۴، ۱۲۹، ۱۸۸)۔ قَراجَہ تاجنہ مُقْطَع (؟) ھکّاری، جسے ۵۴۷ھ میں اتابک موصل نے اتابک آذربیجان کے مقابلے میں بھیجا تھا، ترک معلوم ھوتا ھے اور اس کا اس قبیلے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔

آگے چل کر صلاح الدّین کی وفات (۵۸۹ھ) کے بعد زنگیوں نے وسطی کردستان میں اپنی حیثیت مستحکم کر لی۔ ۶۰۷ھ/۱۲۱۱ء میں آرسلان شاہ زنگی کے ایک چھوٹے بیٹے عماد الدّین کو حُمَیدی کے قلعے (عَقَر اور شُوش) جاگیر میں دیے گئے۔ ۶۱۵ھ/۱۲۱۸ء میں اسی حکمران نے عمادیّہ اور ھکّاری اور زوزان کے باقی ماندہ قلعے بھی قبضے میں کر لیے، جو مظفرالدّین کوک بوری، والیِ اربیل، نے اس کے حوالے کیے تھے (ابو الفَرج، ص ۴۳۳، ۴۳۸)۔ یقیناً انھیں حوادث نے ھکّاری کو زاب کلاں کے منبعوں کے علاقوں کی طرف دھکیل دیا ھوگا۔

دیار بکر کے اُرْتُقی اتابکوں کی کُردوں سے کئی بار لڑائیاں چھڑیں (ابوالفِداء، ۳ : ۵۸۳؛ اسامۃ، ۱ : ۳۲۱)۔ عباسی خلفا نے اپنے محافظوں کی سرپرستی سے پیچھا چھڑا کر کردوں سے نامہ و پیام شروع کیا (دیکھیے ۵۲۸ھ میں عیسیٰ حُمَیدی کا واقعہ اور الکامل، ۱۱ : ۷، ۱۸۸) اور ترکوں کی قوت توڑنے کی کوشش کی۔ ۵۸۱ھ میں خلیفہ النّاصر کے عہد میں ایک معمولی سے واقعے سے کردوں اور ترکمانوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی (الکامل، ۳ : ۳۴۲)، جو ایک وسیع علاقے (شام،

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

دیار بکر، الجزیرہ، موصل، شہرزور، خلاط اور آذربیجان) میں پھیل گئی - دو سال بعد ان دونوں حریفوں نے جنگ بند کر دی تاکہ متحد ہو کر ارمینیہ، آشوریا، میسوپوٹیمیا (عراق عجم)، شام اور قپادوقیہ Cappadocia کے عیسائیوں کا مقابلہ کریں، لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد کردوں اور ترکمانوں کے درمیان نئے جھگڑے پیدا ہو گئے - بہت سی خونریز لڑائیوں کے بعد کرد کیلیکیا (Cilicia) واپس آ گئے - ترکوں نے عملی طور پر کیلیکیا اور شام کے کردوں کو ختم کر دیا - کرد اپنے پرانے گھروں کو چھوڑتے وقت اپنا سامان عیسائی ہمسایوں کے سپرد کر آئے تھے اور عیسائیوں نے کچھ کردوں کو اپنے ہاں چھپا رکھا تھا، اس لیے ترک بالآخر تل مَـزن (؟) اور اَرَب تِـل (= اَرَبگُر ؟) کے عیسائیوں پر ٹوٹ پڑے (میخال Michael شامی، در *Recueil Doc. Armen*، ص ۳۹۵) .

آل ایّوب : یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ یہ ممتاز خاندان کردی الاصل تھا (شرف نامہ، ۱ : ۵۵ تا ۸۲) - ارمنی مؤرخ ہیٹن Hayton (Hethum) اس سلسلے میں لکھتا ہے : Postea vero Saraceni amiserunt dominium Egipti et Medi, qui Cordins vulgariter dicebantur, regni Egipti dominium Occupaverunt، در *Recueil Doc. Arm.*، ۲ : ۲۲۵، ۳۴۳) - صلاح الدّین کا دادا شاذی بن مروان دَوین [رَک بآں] کا ایک رَوادی (رَاوَدی، رَوَنْدَہ، ہَذْبانی کی ایک شاخ) کرد تھا .

اہم بات یہ ہے کہ شدّادی خاندان دوین ہی سے آیا تھا، جس کے تذکرے شاذی کے زمانے میں بھی ہوتے ہوں گے - ایّوب [رَک بآں] اور شیرکوہ [رَک بآں] بن شاذی اپنے پرانے وطن (موضع اَجْدَنْکان) میں پیدا ہوئے تھے - صلاح الدّین [رَک بآں] کی ولادت تکریت میں ہوئی، لیکن وہ یقیناً اپنے والد اور چچا کے ذریعے کرد روایات سے آشنا تھا - یہ بات کہ خاندان ایوبی میں ہمیشہ ایرانی نام رکھے جاتے تھے، معنی خیز ہے، تاہم اس خاندان کے نمایاں کارناموں کے میدان زیادہ تر مصر اور شام تھے - قدیم سلجوق اتابکوں کے خاندان آل ایّوب کے باجگزار ہونے کے بعد بھی دیار بکر (اُرتقی)، موصل (زنگی) اور اَرْبیل (بکتگینی، جو ابتدا میں زنگیوں کے نائب تھے) میں حکومت کرتے رہے - ۵۸۵ھ/ ۱۱۸۷ء میں عزّالدّین زنگی سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے صلاح الدّین نے صرف حلب اور شہرزور کا الحاق کیا تھا (ابن الأثیر : الآتابکیہ، در *Recueil*، ۲ : ۳۳۴؛ الکامل، ۱۱ : ۳۴۰؛ بہاء الدّین، در *Recueil*، ۳ : ۸۵) - ۵۸۵ھ میں صلاح الدّین نے شہرزور اپنے مملوک کش توغدی (؟) کو عطا کردیا، جو یعقوب بن قِفْجاق کا رشتے دار تھا - آل ایّوب صرف خلاط ہی کے راستے سے کردستان میں آزادانہ طور پر داخل ہوئے - یہ ضلع پہلے پہل تقی الدّین نے ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں فتح کیا تھا (الکامل، ۱۲ : ۴۰)، لیکن باقاعدہ طور پر وہاں حکومت کی باگ ڈور صلاح الدّین کی وفات کے بعد اس کے بھتیجے اوحد ایّوب نے ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں سنبھالی؛ بعدازاں خلاط اس کے بھائی اشرف کے قبضے میں آ گیا، جس نے شاہ ارمن کا لقب اختیار کیا اور بالآخر تیسرے بھائی مظفر کے ہاتھ لگا، جو وہاں ۶۴۲ھ/ ۱۲۴۴ء تک حکومت کرتا رہا - گرجستانیوں، خوارزمشاہوں اور مغول کے حملوں کی وجہ سے اس جاگیر کا امن و امان کئی بار غارت ہوا - اس زمانے میں جو گرجستانی دستے خلاط کے گرد و نواح میں مصروف پیکار تھے، ان کی قیادت ارمن حکمرانوں ذَکَرہ Zakare اور آئیوین Iwane کے ہاتھوں میں

www.besturdubooks.wordpress.com

تھی. ان حمکرانوں کے شجرۂ نسب سے پتا چلتا ہے کہ وہ خِل بِرَکن، یعنی بابِیْرَکان نامی کرد قبیلے کی نسل سے تھے (دیکھیے Marr، در *Zap*، ۱۹۱۱ء، ۲۰ : ۱۲۰).

ایّوبی لشکر زیادہ تر ترکوں پر مشتمل تھا، لیکن اس میں کردوں کی تعداد بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھی - ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں صلاح الدّین نے بالائی دجلے کے کردوں کو دعوت جہاد دی - ۵۸۴ھ/۱۱۸۸ء میں الجزیرۃ کی فوجوں کو خدمت سے سبکدوش کر دیا گیا، لیکن دیار بکر کے دستوں اور مخصوص قبیلوں کا ذکر اکثر ملتا ہے - بعض اوقات ان کردوں کے تعلقات ترکمانوں سے ناخوشگوار رہے (بہاء الدّین، *Recueil*، ۳ : ۸۶، ۳۱۳، ۳۸۱).

عہد ایّوبی میں کرد بہت سی فوجی اور شہری ملازمتوں پر مامور تھے، لیکن اکثر اوقات وہ اس خاندان کے مفاد کے منافی کام کرتے تھے، چنانچہ شیر کوہ کی وفات پر صلاح الدّین کی جانشینی کی مخالفت کردوں ہی نے کی تھی (ابن خَلّکان، ۴ : ۴۹۳).

اَرْبیل (؟) کے موروثی شیخ ابو الہَیْجا (ہَذْبانی) کے خاندان نے بڑا اہم کام انجام دیا - اس نے صلیبی جنگجوؤں کے مقابلے میں عکّا کی حفاظت کا اہتمام کیا اور وہ فوج کا سپہ سالار اور بیت المقدس کا حاکم مقرر ہوگیا - ۱۱۹۶ء میں اسے بغداد میں منتقل کر دیا گیا - اس نے ہَمَدان پر حملہ کرنے والی فوج کی قیادت کی اور دَقُوقہ میں وفات پائی - اس کے بھتیجے قطب الدّین نے قاہرہ میں مدرسۂ قطبیہ تعمیر کیا - ایک اور کرد سیف الدّین بن احمد اَلْمَشْطُوب، جو قبیلۂ ھکّاری سے تعلق رکھتا تھا، عکّا میں ابو الہَیْجا کا جانشین مقرر ہوا - اس کے اخلاف نے بڑی ہنگامہ خیز زندگی بسر کی - اس کے بیٹے احمد نے حرّان کے زندان میں دم توڑا اور پوتے قاضی عماد الدّین کو الکامل کے خلاف سازش کرنے کی بنا پر جلا وطن ہونا پڑا.

خوارزمشاہ جلال الدّین: ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء میں زغروس Zagros کے کردوں نے خوارزمشاہ کے ان فوجی دستوں کو شکست دی جو ہمدان سے بغداد بھیجے گئے تھے - خِلاط پر خوارزمشاہ کے حملے (۶۲۳ تا ۶۲۶ھ) نے ملک بھر میں ابتری ڈال دی اور قحط کی وجہ سے کردوں کی ایک بڑی تعداد ہلاک ہوگئی (الکامل، ۱۲ : ۲۰۷، ۳۰۸) - جب مغول نے جلال الدّین کو شکست دے کر اس کا تعاقب کیا تو اس نے دیار بکر کے کردوں کے ہاں پناہ لی اور ۶۲۸ھ/۱۲۳۱ء میں غالباً انھیں میں سے کسی کے ہاتھوں مارا گیا (الجُوَیْنی، طبع محمّد القزوینی، ۲ : ۱۹۰؛ الکامل، ۱۲ : ۳۲۵؛ d'Ohsson: *Histoire des Mongols*، ۳ : ۶۲) - ۶۳۴ھ/۱۲۳۷ء میں باقی ماندہ خوارزمی لشکر نے پھر علاقۂ خَرْپوت کے طول و عرض میں لوٹ مار کی (ابو الفرج: کتاب مذکور، ص ۴۷۷) - جلال الدّین کی وفات کے بعد مغول نے دیار بکر اور خِلاط کا علاقہ تباہ و برباد کر دیا - ایک اور گروہ مراغہ سے اَرْبیل میں وارد ہوا - اس علاقے پر تین بار حملہ ہوا - ۶۴۵ھ/۱۲۴۵ء میں شَہْرِ زور اور ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء میں دیار بکر تباہ و برباد کیے گئے.

ایلخانی مغول: ایلخانی عہد میں کردوں کا ذکر بہت کم ملتا ہے - یہ فرمانروا پہلے اصنام پرست تھے اور بعد ازاں حلقہ بگوش اسلام ہوئے - ان کے تعلقات عیسائیوں سے خوشگوار تھے اور عیسائیوں کو اپنے مسلمان پڑوسیوں سے خاصی شکایات تھیں، اس لیے کردوں کو، جو تھوڑا ہی عرصہ پہلے آل ایوب کے ساتھ صلیبی جنگوں میں شرکت کرتے رہے تھے، اپنے پہاڑوں کے اندر

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

بند ہونا پڑا اور وہیں وہ مغول کے دشمنوں کی کامیابی کی دعائیں مانگتے رہے۔

عہد سلاجقہ میں "کردستان" کا جو صوبہ تشکیل کیا گیا تھا، اس کا دارالحکومت بہار (نزد ہمدان) تھا۔ یہ صوبہ مشہور و معروف امیر چوبان کے والد ملک بن تودان نے فتح کیا۔ ۶۵۵ھ میں ہلاگو ہمدان سے بغداد کی طرف بڑھا؛ کرمانشاہ میں مغول نے قتل و غارت کا آغاز کر دیا (رشیدالدین، طبع Quatremère، ص ۲۲۵، ۲۵۵، ۲۶۷)۔ بغداد پر قبضہ کرنے سے قبل ہلاگو نے اربیل فتح کرنے کے لیے فوجیں بھیجیں۔ اس قلعے کے حاکم تاج الدین صلابہ (دیکھیے رشید الدین، طبع Blochet، ص ۲۶۱) نے مغول کی اطاعت قبول کر لی، لیکن کردوں کے حفاظتی دستے نے اس کی تقلید کرنے سے انکار کر دیا۔ بدر الدین لؤلؤ، اتابک موصل، کی مدد سے اربیل فتح ہوا (d' Ohsson: ۳: ۲۵۶)۔ بغداد پر قبضے کا نتیجہ شہرزور [رک بآں] کی ویرانی کی شکل میں نمودار ہوا اور بقول شہاب الدین العمری یہاں کے کرد باشندے شام و مصر میں ہجرت کر گئے (دیکھیے d' Ohsson، کتاب مذکور، ۳: ۳۰۹، ۳۳۰، ۳۳۷)۔ ان واقعات کی ایک یادگار الجزائر میں دو کرد قبیلوں لویٰن اور بنیٰن کا وجود ہے (ابن خلدون: *Hist. des Berbères*، مترجمۂ de Slane، ۲: ۴۶۱ و ۳: ۴۱۳)۔

آذربیجان واپس آ کر ۶۵۷ھ میں ہلاگو نے شام کی جانب کوچ کیا۔ مملکت ہکّاری میں مغول کو جو کرد نظر آیا اسے تہ تیغ کر دیا گیا (رشید الدین، طبع Quatremère، ص ۳۲۸)۔ الجزیرہ دیار بکر، میّا فارقین (جو ملک الکامل ایوبی کے پاس تھا) اور ماردین، یکے بعد دیگرے فتح ہو گئے۔ اتابک بدر الدین لؤلؤ کی وفات کے بعد، جو ہمیشہ ہلاگو کا وفادار رہا تھا، اس کا بیٹا صالح مصر کے سلطان بیبرس سے مل گیا اور اس سے اپنی حکومت کے بارے میں فرمان توثیق حاصل کر لیا۔ موصل کے گرد و نواح کے کرد فوراً عیسائیوں پر ٹوٹ پڑے۔ موصل کے حفاظتی دستے نے، جو کردوں، ترکمانوں اور شولوں پر مشتمل تھا، بڑی جرأت سے مغول کے حملے کو روکا۔

شام میں بھی کرد مملوکوں کے حلیف ہوگئے۔ خان برقای کے نام ایک خط میں بیبرس نے اپنی فوجوں کی تعداد پر فخر کا اظہار کیا ہے، جن میں ترک، کرد اور عرب تھے (d' Ohsson، ۳: ۳۸۵)۔ ارمن مؤرخ ہیٹن نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ اباقا کے زمانے میں مصری فوجوں کے ایک حملے کے بعد (۶۷۷ھ/۱۲۷۸ء سے قبل) کردوں نے شمالی شام میں رہنے والے پانچ ہزار کردوں (Gordins) کے گھروں پر قبضہ کر لیا تھا (*Recueil, Doc. Armén.*، ۲: ۱۷۹)، لیکن ۶۸۰ھ/۱۲۸۱ء میں مغول کی شکست کے بعد اسلامی فوج کے ایک دستے نے، جو ترکمانوں اور کردوں پر مشتمل تھا، کیلیکیا (Cilicia) کو تباہ کر دیا۔ ایسے شاذ و نادر واقعے جن میں کرد، مغول کے حلیف نظر آتے ہیں، عموماً فارس کے دور دراز علاقے میں پیش آئے۔ الجایتو کے عہد میں جن دستوں نے ۷۰۶ھ میں گیلان پر حملہ کیا، ان میں کرد بھی شامل تھے۔ کچھ مدت کے بعد موسیٰ نامی ایک کرد کو، جس نے شیعیوں کے مہدی ہونے کا اعلان کیا تھا، الجایتو نے سزائے موت دی۔ ۷۱۲ھ میں رجبہ کے کرد حاکم بدر الدین نے مغول کا مقابلہ کیا۔

کردوں کے صوبوں میں مغول امرا کی حکومت تھی۔ اربیل میں جنگ کبھی بند نہ ہوئی۔ قیاچی عیسائی کوہستانیوں نے، جو مغول فوج ہی کا ایک حصہ تھے، اپنے سپہ سالار زین الدین بالو پر ایک الزام

www.besturdubooks.wordpress.com

لگا کر کردوں سے جنگ چھیڑ دی اور عربوں نے کردوں کا ساتھ دیا۔ ان حوادث کا آغاز ۱۲۹۷ء میں ہوا، لیکن ۱۳۱۰ء میں صورت حال زیادہ بگڑ گئی۔ مغول نے مشکل سے عیسائیوں کو قلعے سے باہر نکالا۔ مغول نے محاصرے میں امداد دینے کے لیے کردوں کو طلب کیا تھا، لیکن ان کے امراء، جو عیسائیوں کے ساتھ دوستانہ روابط رکھتے تھے، چاہتے تھے کہ عربوں کے ہاتھوں عیسائیوں کا قتل عام روکنے کے سلسلے میں کردوں سے کام لیں۔ قتل عام تو ہوا، لیکن اس میں کردوں نے کوئی حصہ نہ لیا (*Histoire de Mar Jabalaha III*، مترجمۂ Chabot، پیرس ۱۸۹۵ء، ص ۱۵۲ تا ۱۸۸)۔

مراغہ اور اربیل کا درمیانی علاقہ مغول فوجوں کے لیے ایک طرح کی شاہراہ کا کام دیتا تھا۔ اس زمانے تک بھی جھیل ارمیہ کے جنوب کا بیشتر علاقہ ترکوں اور مغول کے قبضے میں تھا [رک بہ ساوج بلاق]۔

الجایتو کے عہد میں صوبۂ "کردستان" کا دارالحکومت بہار سے سلطان آباد (چمچمال) میں منتقل کر دیا گیا۔ اس صوبے کو جس حد تک مصائب کا سامنا کرنا پڑا، اس کا اندازہ نزھۃ القلوب (ص ۱۰۷) کے ایک بیان سے ہو سکتا ہے، جس کی رو سے یہاں کا مالیانہ عہد سلاجقہ کے مالیانے کا دسواں حصہ رہ گیا تھا۔

جب ایلخانی میدان سے غائب ہو گئے تو سُلدُوز [رک بآں] اور جلائر [رک بآں] قبائل کے مغول امرا کے دو گھرانے حکومت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ جب جاگیروں کی تقسیم (۷۳۸ھ/۱۳۳۸ء میں) "حسن" نام کے دو اشخاص میں ہوئی، تو (ایرانی) کردستان اور خوزستان کے علاقے امیر اکرنج یا اکرش (؟) کے بچوں کو واپس مل گئے۔ ۷۸۴ تا ۷۸۵ھ میں بایزید جلائری نے ایرانی کردستان اور عراق عجم کے کچھ علاقوں پر قبضہ کرکے اپنے لیے ایک جاگیر بنا لی (Lane-poole : کتاب مذکور، شمارہ ۸۶؛ d'Ohsson، ۴ : ۷۴۷)۔

مملوک سلاطین کے عہد میں کرد قبائل کی فہرست : مغول کی فتوحات کی وجہ سے کرد قبائل کی سیاسی سرگرمیاں بالکل ماند پڑ گئی تھیں، لیکن مصر میں، جہاں مملوک سلاطین ایلخانیوں کے خلاف خفیہ طور پر تجاویز سوچ رہے تھے، اس وقت اس مسلمان عنصر کے معاملات کی طرف بہت دلچسپی ظاہر کی گئی۔ شہاب الدین العمری (م ۷۴۹ھ/ ۱۳۴۸ء) کی کتاب مسالک الابصار سے پتا چلتا ہے کہ مملوک سلاطین کے دیوانِ وزرات کو کردوں کے حالات کا کیسا صحیح علم تھا۔ بقول العمری کرد عراق اور دیار عرب کے نزدیک اور شام اور یمن میں آباد تھے۔ کردوں سے آباد پہاڑی علاقہ (الجبال) ہمدان سے شروع ہو کر کیلیکیا (بلاد التکفور) تک ختم ہوتا تھا۔ دریاے دجلہ کے مغرب میں الجزیرہ اور ماردین کے کردوں کا اپنے تمام پڑوسیوں کے رحم و کرم پر دار و مدار تھا، البتہ ماردین میں کچھ عرصہ قبل ایک شخص ابراھیم العرس بالو (؟) نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا اور خاصی طاقت حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد مصنف مذکور نے ہمدان اور الجزیرہ کے اس حصے میں آباد بیس قبائل کی ایک فہرست دی ہے جو موصل اور کوار کے درمیان واقع ہے (دیکھیے کیُور، در شرف نامہ) : (۱) گورانی جو جنگجو اور زراعت پیشہ (جندو رعیۃ) تھے؛ (۲) گلالی (دیکھیے ایک پہاڑ، جسے گلالۂ سُہران کہتے ہیں، شرف نامہ، ۱ : ۲۸۶؛ Narrative: Rich، ۱ : ۱۲۳ : Ghellali)۔ اس قبیلے کا ایک گروہ ہجرت کرکے شام چلا گیا۔ ان کا حکمران شرف الدین

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

مغول کے ماتحت اربیل کا گورنر تھا اور ایک مغول ہی کے ہاتھ سے مارا گیا تھا؛ (۳) زنگلی (= زنگنۃ؟)؛ (۴) شہر زور [رک بآں] کے کومسہ اور مبر (؟)، جو مصر و شام کو ہجرت کر گئے تھے؛ (۵) سبولی (ستونی؟)، جو شہرزور اور اشنو میں رہتے تھے۔ ان کے قریب قرتاوی (؟ دیکھیے Hoffmann : *Auszüge*، ص ۲۰۷) آباد تھے؛ (۶) حسنانی (خشناوی؟) ان کی تعداد کئی ہزار تھی اور تین شاخوں میں منقسم تھے۔ ایک شاخ قرتاوی (؟) کے ساتھ ساتھ کرکار میں آباد تھی اور درۂ در بند قرہ بولی (زاب کوچک کی تنگ گھاٹی، دیکھیے Hoffmann : کتاب مذکور، ص ۲۶۳) سے آمد و رفت کا محصول وصول کرتی تھی؛ (۷) کرحین (= کرکوک؟) اور دقوق کے قریب ۷۰۰ افراد کا ایک قبیلہ آباد تھا؛ (۸) علاقۂ اربیل میں "دو پہاڑوں کے درمیان" (بین الجبلین) ایک قبیلہ رہتا تھا، جو موسم سرما میں مغول سے مراعات کا طالب ہوتا تھا اور گرمیوں میں مصری حملہ آور فوجوں کی اعانت کرتا تھا؛ (۹) مازنجان(؟)، جس کے افراد کی تعداد ۵۰۰ تک تھی اور یہ قبیلہ اربیل اور مازنجان، نیروہ اور بیخمہ کے قریب آباد تھا (مؤخر الذکر دو اضلاع زاب کلاں کے کنارے عقر کے مشرق میں واقع ہیں)۔ مازنجان کے شیوخ اپنے رشتے دار قبیلۂ حمیدی (جس کے افراد کی تعداد ۱۰۰۰ تھی) پر بھی حکومت کرتے تھے۔ مازنجان کے شیخ کو، جو کک کہلاتا تھا، خلفاے عباسیہ کی طرف سے مبارز الدین کا خطاب ملا تھا۔ مغول نے اس مملکت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور کک بدستور اربیل کا نائب رہا۔ ارغون کے عہد میں اسے کچھ عرصے کے لیے معزول کیا گیا تھا، لیکن صبح الاعشی کی رو سے اس کے بیٹوں اور پوتوں کی جاگیریں (عقر اور شوش) برقرار رہیں؛ (۱۰) تل حفتون کے قریب کثیر التعداد سہری قبیلہ (سہران) کا علاقہ تھا؛ (۱۱) ان کے ہمسائے زرزاری (یعنی اولاد زر) تھے۔ یہ ملاز گرد (= روبار براز گرد) اور رستاق (شمدینان کے جنوبی حصے) پر بھی قابض تھے؛ (۱۲) جولا مرگ، اموی النسل قبیلہ تھا اور اس کے افراد کی تعداد تین ہزار تھی؛ (۱۳) ضلع مرکوان (جسے مرگور پڑھنا چاہیے) کے کرد اپنے جولا مرگی اور زرزاری پڑوسیوں کے حلیف تھے؛ (۱۴) جولا مرگ کے قریب گوار کا علاقہ واقع تھا؛ (۱۵) جولا مرگ کے نزدیک عقر اور عمادیہ کے پہلو میں زباری کا علاقہ تھا، جس میں ۵۰۰ افراد آباد تھے۔ (۱۶) ہکاری عمادیہ کے قریب آباد تھے اور ان کی تعداد ۴۰۰۰ تھی؛ (۱۷) قبیلۂ ہکاری کے قریب مرج کے پہلو میں جبل العمرانی اور کہف داؤد کا غار تھا، جہاں بسیتکی (؟) آباد تھے؛ (۱۸) جولا مرگ کے نزدیک موصل کی جانب بختی رہتے تھے، جو قبیلۂ حمیدی کے حریف تھے؛ (۱۹) داسنی کی تعداد بہت تھی، لیکن ان کا سردار بدر الدین ایک ایسے علاقے میں اتر آیا جہاں تک رسائی بہت آسان تھی؛ چنانچہ صوبۂ موصل میں داسنی کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ ۵۰۰ داسنی عقر میں آباد تھے؛ (۲۰) دمبولی (؟) بلند پہاڑوں میں آباد تھے۔

مسالک کی ان معلومات میں صبح الاعشی سے ۲۵ کرد سرداروں کی ایک فہرست کا اضافہ کیا جا سکتا ہے، جو کتاب التثقیف، مؤلفۂ تقی الدین (۷۴۸/۱۳۴۷ء کے لگ بھگ) پر مبنی ہے۔ یہ وہ شیوخ تھے جن کے ساتھ قاہرہ کے دیوانِ وزارت کی خط و کتابت رہتی تھی۔

تیمور اور ترکمان خانوادے: مغول کے بعد ان کے حریف ترکمان خانوادوں نے اپنا اقتدار کردستان میں قائم کر لیا۔ ہمیں اس زمانے کے بارے میں بہت کم صحیح معلومات حاصل ہیں،

www.besturdubooks.wordpress.com

لیکن کردوں کے لیے یہ خاصا بڑا اہم دور تھا۔ قرہ قویونلو خاندان کے افراد کردستان کے مرکز تک پہنچ گئے، کرد قبائل کو سیاسی اور مذہبی الجھنوں میں پھنسا دیا (دیکھیے قرہ قویونلو کے غالی شیعہ) اور آبادی کی خاصی تعداد کو نقل مکانی کے لیے مجبور کر دیا: اسی زمانے میں مکری کردوں نے جھیل ارمیہ کا جنوبی علاقہ فتح کیا [رک بہ ساوج بلاق]۔ اس کے مقابلے میں تیمور کی فتح جس نے عارضی طور پر قرہ قویونلو کا خاتمہ کر دیا تھا، وقتی حیثیت رکھتی تھی۔

۷۹۶ سے ۸۹۷ھ تک (۱۳۹۳ تا ۱۴۹۱ء) حصن کیفا اور الجزیرہ کی تاریخ میں جو متعدد واقعات پیش آئے، ان کا حال سریانی وقائع (مکتوبہ، در هیتهم Haitham) طبع Behnsch: *Rerum seculo XV*، در *Mesopotamia gestarum liber*، برسلو ۱۸۳۸ء، میں محفوظ ہے۔ تیمور کو اپنی ۷۹۶ اور ۸۰۳ھ کی مہموں میں کردوں سے واسطہ پڑا۔ بغداد اور دیار بکر کو پامال کرنے کے بعد تیمور نے الجزیرہ پر حملہ کیا اور اسے تہس نہس کر دیا۔ علی ہذا الجزیرہ کی ماتحت ریاستوں کو بھی فتح کر لیا۔ اس کے بعد تیمور نے ان پہاڑوں کو عبور کیا جو دیار بکر کو موش سے علیحدہ کرتے ہیں اور شرف الدین حاکم بدلیس سے جو "سارے کردستان میں اپنے عدل و کرم کے باعث شہرت رکھتا تھا" حسن سلوک سے پیش آیا۔ ۸۰۳ھ میں تیمور بغداد سے آذربیجان کو لوٹا اور راستے میں اس پر کردوں کا حملہ ہوا۔

تیمور کی وفات کے بعد قرہ یوسف قرہ قویونلو کردستان واپس آ گیا اور پہلے شمس الدین حاکم بدلیس کے ہاں پناہ لی۔ شمس الدین نے اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی اور دوبارہ حکومت قائم کرنے میں اسے مدد دی۔ ۸۲۰ھ میں قرہ یوسف نے ایک "نشان" عطا کر کے فرمانروایانِ بدلیس کو ان کے مقبوضات پر حاکم قرار دیا۔ جب ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء میں تیمور کا بیٹا شاہرخ ارمینیہ پہنچا تو شمس الدین حاکم بدلیس، ملک محمد هکّاری، ملک خلیل حاکم حصن کیفا، امرائے خزان وغیرہ نے اس کے سامنے اقرار اطاعت کیا۔ خوی کے کرد بھی شاہ رخ کے حاکم کے وفادار رہے (مطلع السعدین، *N. E.*، ۱۴ : ۱۵۳)۔

آق قویونلو (خاندان بیئندر) نے جن کا اہم ترین مرکز دیار بکر میں تھا، بڑے بڑے کرد گھرانوں کو فنا کرنے کے منصوبے کو باقاعدہ طور پر عملی جامہ پہنانا شروع کیا (شرف نامہ، ۱ : ۱۶۴: "استیصال خانوادہ هاے کردستان") اور عام طور سے ان تمام قبائل کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جو چمشگزک کے عظیم قبیلے کی طرح قرہ قویونلو کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ صوفی خلیل اور عرب شاہ نے جو اوزون حسن کے سپہ سالار تھے، هکّاری کو فتح کیا جسے آگے چل کر ایک مختصر عرصے کے لیے قبیلۂ دمبلی نے قبیلۂ بوهتان سے چھین لیا تھا۔ ۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء میں (دیکھیے Behnsch: کتاب مذکورہ، ص ۱۴) سارے الجزیرہ پر آق قویونلو کا قبضہ ہو گیا اور وہاں انھوں نے خود اپنا گورنر چلبی بیگ مقرر کیا جس کے محاسن کا اعتراف شرف نامہ (۱ : ۱۲۳) تک میں کیا گیا ہے۔ آق قویونلو کے سپہ سالار سلیمان بن بیژن نے ابراهیم کر بدلیس سے باهر نکال دیا جو بعد ازاں یعقوب بن اوزون حسن کے هاتھوں مارا گیا۔

شاهان صفویہ اور سلاطین عثمانیہ: شاہ اسمٰعیل نے آق قویونلو سے جنگ کے آغاز هی میں ارمینیہ پر حملہ کر دیا تھا۔ جنگ شرور، ۹۰۷ھ/۱۵۰۲ء کے بعد بغداد اور مرعش کا سارا درمیانی علاقہ اس کے قبضے میں آ گیا۔ کردوں کے ساتھ اسمٰعیل کا

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

طرزعمل آق قویونلو سے مختلف نہ تھا ۔ آق قویونلو کی طرح شاہ کو بھی ترکمانوں پر زیادہ بھروسہ تھا ۔ علاوہ ازیں ایک پرجوش انتہا پسند شیعہ (دیکھیے خطائی) ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں سنی کردوں کے خلاف اور بھی زیادہ تعصب تھا ۔ جب خوی میں گیارہ کرد سردار اظہار اطاعت کے لیے حاضر ہوے تو اسمٰعیل نے ان میں سے اکثر کو قید کر دیا اور ان کی جگہ قزلباش قبائل سے حاکم چن کر مقرر کر دیے ۔

تقریباً تین صدی تک کردستان سلاطین عثمانیہ اور شاہان صفویہ کی لڑائیوں کا اکھاڑا بنا رہا ۔ چلدران کے مقام پر شکست (۱۵۱۴ء) ایران کے اس نئے شاہی خاندان پر ایک کاری ضرب تھی ۔ شاہ اسمٰعیل کے جانشینوں نے کچھ عارضی کامیابیاں حاصل کیں ، لیکن یہ سب اس کی ابتدائی فتوحات کا درجہ حاصل نہ کر سکیں اور ایرانی حکومت زاگروس کے مغرب میں آہستہ آہستہ ختم ہوگئی ۔ شاہ اسمٰعیل کی یہ کوشش کہ کردوں پر ایرانی حاکم مسلط کیے جائیں، حکومت عثمانیہ کے اس طرز عمل کے بالکل برعکس تھی، جسے حکیم ادریس نے اختیار کیا ۔ حکیم ادریس بڑا عقلمند شخص تھا اور خود بھی کرد تھا ۔ اس نے کردستان میں ایک ایسا جاگیردارانہ نظام قائم کرنے کی کوشش کی جس میں کرد امرا کو فوقیت حاصل رہے ۔

جنگ چلدارن کا کردستان پر بڑا گہرا اثر پڑا ۔ حصن کیفا کے معزول حاکم ملک خلیل (شرف نامہ، ۱ : ۱۵۵) نے سِعرد پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا اور اپنی موروثی جاگیر حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ محمّد بیگ حاکم صاصون ایرانیوں سے جنگ آزما تھا ۔ احمد بیگ حاکم میافارقین، قاسم بیگ حاکم اگیل، جمشید بیگ حاکم پالو نے حکومت عثمانیہ کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا ۔ الجزیرہ کا حاکم موصل کے ایرانیوں کو پسپا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا ۔ سعید بیگ سُہران نے اربیل اور کرکوک پر قبضہ کر لیا تھا ۔ تقریباً بیس دیگر سرداروں کی ایرانیوں سے وفاداری متزلزل ہو رہی تھی ۔ ادریس بذات خود ان سرداروں کے پاس گیا اور ان میں سے پچیس سلطان کے ساتھ مل گئے ۔

جب سلیم تبریز سے رخصت ہوگیا تو اسمٰعیل نے دیار بکر اور حصن کیفا میں کمک بھیجی ۔ ادریس نے اپنے جھنڈے تلے کرد فوجوں کو جمع کیا اور کرد بیگ کو جو کردستان کا ایک سابق ایرانی حاکم تھا، شکست دی ۔ دیار بکر کے کرد ایرانیوں کے مقابلے میں ڈٹے رہے حتّٰی کہ بیقلی محمّد پاشا کی جانب سے مدد پہنچ گئی ۔ بیقلی اور ادریس حصن کیفا کے مقام پر مل گئے اور ایرانیوں کو شکست دی ۔ اس کے بعد (عمادیہ سے سے آئے ہوے ؟) ۵۰۰۰ کردوں کی کمک حاصل کرکے انھوں نے دیار بکر کو ایرانیوں سے نجات دلائی اور ماردین فتح کیا ۔ صرف وہاں کا قلعہ ایرانیوں کے قبضے میں رہ گیا ۔ ایرانی سپہ‌سالار نے حریف کو مغالطے میں ڈالنے کی ایک کامیاب چال چلی اور بغداد اور کرکوک کے راستے موقع پر آ پہنچا ۔ اہل ماردین نے کردوں کو باہر نکال دیا اور ایرانیوں کو شہر پر دوبارہ قابض ہو جانے کی دعوت دی ۔ نصیبین سے ارفہ جانے والی سڑک پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا ۔ ایرانیوں کو شکست ہوئی اور بیقلی نے سلیمان خان کو، جو ابھی تک ماردین میں تھا، ہتیار ڈالنے پر مجبور کر دیا ۔ اس کے بعد نصیبین، دارا، میافارقین، دیار بکر اور سنجر پر قبضہ ہو گیا اور ادریس نے اس سنجق کے کل انتظامی امور مکمل کر لیے ۔ صوبۂ دیار بکر کی ۱۱ سنجقوں کو ترک افسروں اور ۸ کو کردوں

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

(اکراد بیلیگی) کے ماتحت رکھا گیا ۔ والی نئے بیگوں کی مسند نشینی کی توثیق کرتے تھے، لیکن یہ بیگ ہمیشہ ایک ہی خاندان سے لیے جاتے تھے ۔ پانچ موروثی حکومتوں (کرد حکومتی) میں پرانے خاندان برقرار رہے اور حکومت براہ راست باپ بیٹے کو منتقل ہوتی رہی (دیکھیے Tischendorf : *Das Lehnwesen in d. moslem. Staaten*، لائپزگ ۱۸۷۲ء باب ۲ و ۴، جس میں عین علی مؤذن زادہ سے اقتباس کیا گیا ہے جس نے گیارھویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اپنی کتاب لکھی) ۔ اسی قسم کا نظام آگے چل کر سارے کردستان میں ملاطیہ سے بایزید اور شہر زور تک رائج کیا گیا (دیکھیے در سطور ذیل شرف نامہ، اور اولیاء چلبی (۴ : ۱۷۶ تا ۱۸۰ و ۲۷۱ تا ۳۱۶) کے نہایت دلچسپ ملاحظات : ان ۳۷ سنجقوں کے بارے میں جو سلیمان اول کے قانون کی رو سے وان سے ملحق ہوئیں اور مقامی فوج کو کوچ کا حکم ملا) ۔ صرف کرمان شاہ کا صوبہ ایرانیوں کے قبضے میں رہا ۔ ادریس کو بیش بہا انعامات سے نوازا گیا اور اسے فرمان ہائے عطا و توثیق بھیجے گئے، جن میں وصول کنندوں کے نام کی جگہ اس کے اپنے ہاتھ سے بھرنے کے لیے خالی چھوڑ دی گئی تھی (Von Hammer : *G O R*، بار دوم، ۱ : ۴۹۷) ۔

۹۳۶ھ/۱۵۳۰ء میں شاہ طہماسپ نے قبیلۂ موصلو (موصلو ؟) کے ایک کرد ذوالفقار سے بغداد دوبارہ چھین لیا اور لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ پھر شروع ہو گیا ۔ سلطان سلیمان نے ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۴۸، ۱۵۵۳، اور ۱۵۵۴ء میں ایران پر لشکر کشی کی ۔ ۱۵۵۴ء میں بغداد کے فوجی دستوں نے بلقاس اور شہر زور کے کردوں کو مغلوب کر لیا جبکہ ایرانی گرجستان میں مصروف تھے (Von Hammer : کتاب مذکور، ۲ : ۲۳۶) ۔

۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء کے صلح نامے کی رو سے عباس اول کو مغربی صوبے جن میں آذربیجان شہر زور اور لرستان شامل تھے، ترکوں کے حوالے کرنے پڑے (کتاب مذکور، ۲ : ۵۵۹)، لیکن ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں پھر لڑائی چھڑ گئی اور صلح نامہ ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء کی رو سے شہر زور کے علاوہ تمام کھوئے ہوئے صوبے ایران کو واپس مل گئے (کتاب مذکور، ۲ : ۷۴۵) ۔ شاہ عباس نے پندرہ ہزار کردوں کو خراسان کی سرحد پر منتقل کر دیا تاکہ ترکمانوں کے مقابل کام دے سکیں ۔

شاہ عباس کی حکومت کے آخری دنوں میں ترکی حکومت کی تمام کوششیں بغداد پر مرکوز ہو گئیں ۔ حافظ پاشا کی اولین مہم کے دوران میں (۱۶۲۳ء) اس کی فوج میں کرد دستے بھی شامل تھے ۔ کرد بڑی بہادری سے لڑے ۔ ایرانیوں نے حملہ آوروں کو شکست دینے کے بعد تادیبی دستے ماردین میں بھیجے ۔ شاہ عباس کے انتقال کے بعد وزیراعظم خسرو پاشا نے ۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء میں بغداد کی طرف پیش قدمی کی ۔ سید خان حاکم عمادیہ، میرہ بیگ سہران اور باجلان کے کرد و عرب مخلوط قبیلے نے خسرو پاشا کا ساتھ دیا جبکہ ترکی فوج کے ایک پہلو کو احمد خان اردلان کے حملے کا خطرہ تھا ۔ خسرو پاشا سنہ [رک بآں] اور ہمدان تک بڑھتا چلا گیا ۔ واپسی پر ترکوں نے چمچمال اور در تنگ کے مقامات پر ایک ایرانی فوج کو شکست دی ۔ بغداد کی فوجیں بدستور جمی رہیں اور جب خسرو پاشا واپس چلا گیا تو احمد خان اردلان نے شہر زور پر دوبارہ قبضہ کر لیا (Von Hammer : کتاب مذکور، ۳ : ۱۷، ۲۳، ۴۹، ۸۶، ۹۳) ۔ ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کہیں جا کر مراد چہارم نے بالآخر بغداد فتح کیا اور اگلے سال ایران کے ساتھ Grosso Modo معاہدے پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے انیسویں صدی عیسوی تک ترکی اور ایران کی سرحد متعین رہی (تاریخ نعیمی، ۱ : ۶۸۶) ایران کی حدود اب پوری طرح زاگروس(Zagros) سلسلۂ کوہ کے پیچھے آ گئیں۔

صفویوں اور عثمانیوں کی باہمدگر عظیم کشمکش کے باعث کردوں کو اپنی سیاسی اہمیت کا احساس ہوگیا۔ شرف نامہ میں ہمیں کرد قبائل کے جاگیردارانہ نظام و معاشرت اور ان کی ریاستوں کی ایک صحیح تصویر ملتی ہے جب کہ ۱۰۰۵ھ/ ۱۵۹۶ء کے قریب ان کی ترقی اوج کمال کو پہنچ چکی تھی۔

شرف نامہ، شیخ شرف الدّین بدلیسی [رک بہ بدلیس] کی تصنیف ہے جو ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ کردوں کی تاریخ کے ماخذ میں یہ ممتاز ترین درجہ رکھتی ہے۔ کردوں کی یہ تاریخ، صحیح معنوں میں (ج ۱، طبع Veliaminof Zernof) چار حصوں (صحیفہ) میں منقسم ہے۔ ان میں سے پہلے حصے میں ان کرد خاندانوں کے حالات ہیں جو واقعی اقتدار شاہانہ (سلطنت) کے مالک تھے، دوسرے میں ان خانوادوں کا ذکر ہے جن کے افراد نے مختلف اوقات میں اپنے نام کے سکے ضرب کرائے اور خطبے پڑھوائے، تیسرے میں موروثی حکام کے خانوادوں کا ذکر ہے اور چوتھے میں صرف بدلیس کے رؤسا کی مفصل تاریخ ہے۔ حصۂ اوّل میں پانچ خاندانوں کے حالات ہیں: دیار بکر اور الجزیرہ کا خاندان مروانیہ [رک بہ مروان، آل]؛ دینور اور شہرزور کا خاندان حسنویہ [رک بآں]؛ لرکلان کا خاندان فضلویہ (رک بآں)؛ لرکوچک کے بادشاہ اور آل ایوب [رک بہ ایوبیہ]۔

چونکہ دوسرے اور تیسرے گروہ کے حاکموں میں بڑا باریک فرق پایا جاتا ہے اور شرف الدّین نے ان خاندانوں کو کسی اصول کے مدنظر رکھے بغیر ترتیب دیا ہے، اس لیے بہتر ہوگا کہ ان خاندانوں کو ان کی جاگیروں کے جغرافیائی محل وقوع کو مدنظر رکھ کر ترتیب دین اور اس سلسلے میں جزیرہ ابن عمر کو مرکز مان لیا جائے۔ اس فہرست کے بعد ان کرد قبائل کی فہرست درج کی جائے گی جو ایران میں آباد ہیں۔ دوسرے گروہ کی جاگیروں پر (جن میں بدلیس شامل ہے) ستارے کا نشان بنا دیا جائے گا۔

شرف الدّین نے جہاں تک ہو سکتا ہے قبائل اور ان کے رؤسا کے گھرانوں کے درمیان امتیاز قائم رکھا ہے اور یہ ضروری ہے کہ کردستان میں جاگیردارانہ نظام کی اساس کو ہمیشہ ذہن میں رکھا جائے۔ مختلف النسل رؤسا کردوں، کردوں سے متأثر لوگوں اور مسیحی قبائل پر جنگجو کرد قبائل (عشیرۃ) کی مدد سے حکومت کرتے ہیں۔ یہ قبائل بعض اوقات مستقل طور پر کسی جگہ سکونت رکھتے اور بعض اوقات بدوی یا نیم بدوی ہوتے ہیں۔

فریق۔ الف، الجزیرۃ اور در سیم کے درمیان

(۱) الجزیرۃ کے رؤسا اموی النسل ہونے کا دعوی کرتے تھے، لیکن خالد بن ولیدؓ کو اپنا جد امجد کہتے تھے۔ اس قسم کے ملتبس شجرہ ہائے نسب میں امویوں کے کرد موالی اور مشہور سپہ سالار خالد بن ولیدؓ [رک بآں] کے قابل التعظیم مقامی اخلاف کا تذکرہ ہے، جن کے مقبرے سعرد کے قریب بتائے جاتے ہیں(Hartmann: بوھتان، ۱۹، ۱۲۴)۔ یہ رؤسا پہلے یزیدی مسلک کے پیرو تھے۔ کٹرسنی عقائد انھوں نے کہیں بعد میں جا کر اختیار کیے۔ سلیمان بن خالد کی وفات کے بعد اس کے تین بیٹوں نے اپنی مقبوضات اس طرح تقسیم کیں: الجزیرۃ میر عبدالعزیز کے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

پاس آیا، گرگیل میر حاجی بیگ کے ہاتھ لگا اور فنیک میرابدال کے حصے میں آیا ۔ یہ تینوں شاخیں آگے چل کر اپنی جاگیروں پر قبضہ کیے رہیں۔

شرف نامہ میں اس گھرانے کے مقبوضات کا ذکر "ولایت بوختی" کے نام سے آیا ہے (۱ : ۳۲۰) اور اس اہم جاگیر کے ۱۴ نواحی (مواضع) کی فہرست بڑی تفصیل سے، لیکن کسی نظم و ترتیب کے بغیر، درج کی گئی ہے: گرگیل، اروخ، پروز، بادان اور طنزی (کاہوک)، جن پر کارسی قبیلے کا قبضہ تھا؛ فنیک، تُور، ہیتم (ہیتھم) اور شاخ میں عیسائی آباد تھے؛ نِیش اتل، ارمشات، جہاں کا قبیلہ (براسپی)، قبائل بوخت میں سب سے بڑا ہے؛ کیور یا قمیز (؟)، دیردہ جو طنزی کے قبضے میں تھا ۔ M. Hartmann کے دقیق مطالعہ: *Bohtan, Mitteil. d. Vorderstat. Gesell.*، ۱۸۹۶ء، ۲ و ۱۸۹۷ء، ۱، ص ۱ تا ۱۶۳، کے باوجود ان میں سے بعض مقامات کے محل وقوع پورے وثوق کے ساتھ معلوم نہیں۔

جزیرۃ ابن عمر کی جاگیر بوختان کے دائیں کنارے اور دجلہ کے درمیان واقع تھی ۔ اس میں بوختان کے منابع شامل نہیں تھے ۔ مشرقی جانب سندیان [رک بہ عمادیہ] بوختی کے ہمسائے تھے اور خابُور کے کنارے آباد تھے۔

(۲) خیزان، اسبایرد (سپرھت، اسپرت، اولیاء چلبی کے ہاں: اسبعرد) اور مُکس (مُکس) کے فرمانرواؤں کے اجداد تین بھائی تھے، جو عہد سلاجقہ میں بلیجان (خنس) سے آئے تھے (شرف نامہ، ۱ : ۲۱۷)، مرکزی جاگیر پر قبیلۂ نمیرن قابض تھا اور یہ جاگیر بوختان کے دائیں کنارے کے معاونین کے ساتھ ساتھ مروانان تک پھیلی ہوئی تھی۔

(۳) شیروان (بوختان کے دائیں کنارے پر خیزان کے نیچے اور سِعرد کے شمال مشرق میں) ۔ "شیروی" رؤسا کے اجداد آل ایّوب کی ملازمت میں تھے اور اسی زمانے میں شیروان آئے جب ملکان "حصن کیفا" آئے تھے بلکہ شیرویوں نے ملکان کے وزیروں کے فرائض بھی انجام دیے (کتاب مذکور، ۱ : ۱۵۵) ۔ شیروان کا صدر مقام کُفرا تھا ۔ دوسری ماتحت ریاستیں اویل، شبستان (نیز المعروف بہ گرنی = کِرنک) اور ایڑون تھیں۔

(۴) بدلیس ۔ کہا جاتا ہے کہ قبیلۂ رُوزکی (رُوزگی) کا یہ نام اس لیے پڑا کہ ایک روز ۲۴ قبائل موضع طاب، ضلع خوئت (آج کل بدلیس کے مغرب میں 'مود کی' قضا) میں جمع ہوئے اور باہم وفاق کی بنیاد ڈالی جو آگے چل کر دو فریقوں میں یعنی بلباسی اور قوالیسی میں منقسم ہو گئی ۔ شرف الدّین (۱ : ۳۶۱) نے روزگی کے ۲۴ (۲۵ پڑھیے) قبائل کی فہرست دی ہے، جن میں سے ۵ یہاں قدیم سے آباد چلے آتے تھے اور باقی نووارد تھے: بلباسی (۱۰) قبیلے اور قوالیسی (۱۰) قبیلے۔

روزگی نے گرجستان کے بادشاہ تاویت (David، ص ۹۸۴ تا ۱۰۰۱ ؟) سے بدلیس اور حازو (صاصون) لے لیے ۔ بعد ازاں اختلاط سے وہ ساسانی نسل کے دو بھائیوں کو لے آئے جن میں سے ایک بدلیس کا اور دوسرا صاصون کا والی بنا دیا گیا ۔ ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء تک ضیاء الدین کی نسل سے ۱۸ فرمانرواؤں نے بدلیس پر حکومت کی ۔ صرف عہد سلاجقہ (۴۳۵ تا ۵۷۶ھ)، عہد آق قویونلو (۸۷۱ تا ۹۰۰ھ)، عہد شاہ اسمٰعیل (۹۱۳ تا ۹۲۰ھ) میں اور ۹۴۱ سے ۹۸۶ھ تک وہ حکومت سے محروم رہے ۔ ۹۸۶ھ میں سلطان سلیمان نے ملاطیہ کا امیر شمس الدین کی موروثی جاگیر سے تبادلہ کرنا چاہا ۔ شمس الدّین کو بدلیس چھوڑنا پڑا، لیکن نئی سازشوں سے بچنے کے لیے شاہ طہماسپ کے

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

دربار میں چلا گیا جس نے اس سے بڑا فراخدلانہ سلوک کیا ۔ شمس الدّین نے ۹۶۵ھ میں ایران میں وفات پائی ۔ اس کا بیٹا شرف الدّین ۹۴۰ھ میں جلاوطنی کی حالت میں پیدا ہوا اور اسے دربار شاہی میں اعلیٰ تعلیم دلائی گئی (شاہ نے اس کو نقاشی تک کی تعلیم دلوائی تھی) ۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی ایرانی صوبوں پر حکومت کی اور تمام ایرانی کردوں کی سرداری کے منصب پر فائز ہوا ۔ اسمٰعیل دوم کے تخت نشین ہونے پر شرف الدّین کو شک و شبہہ سے دیکھا جانے لگا اور اسے نخجوان بھیج دیا گیا ۔ یہاں سے وہ وان پہنچنے میں کامیاب ہوگیا اور مراد اوّل سے بدلیس کی حکومت کا فرمان حاصل کر لیا، جس میں ۹۹۱ھ میں موش کا اضافہ ہوا ۔ ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۵ء میں بدلیس کی حالت کا اولیا چلبی (۴ : ۸۱ تا ۱۲۱) نے مفصل تذکرہ کیا ہے ۔ ۱۸۴۹ء میں بدلیس کے آخری فرمانروا شرف بیگ کو ترکوں نے معزول کر دیا (Lynch : *Armenia*، ۲ : ۱۴۹) ۔

(۵) صاصون (حاذو) کے فرمانروا اپنے جد، یعنی عزّالدّین جو بدلیس کے ضیاء الدّین کا بھائی تھا، کے نام پر عزّین کہلاتے تھے ۔ صاصون کے عشائر (قرابت دار) پہلے شیروی، بابوسی، سوسانی اور طموق تھے ۔ روزگی [رک بہ بدلیس] یہاں بعد میں آئے ۔ آگے چل کر ارزن کے الحاق کے بعد اس ضلع کے قبائل : خالدی، دیرٌ مغانی، عزیزان، جو پہلے حصن کیفا میں رہتے تھے، صاصون کے قبائل کے ساتھ مل کر رہنے کے لیے یہاں چلے آئے ۔

(۶) سوَیدی رؤسا برامکہ کی اولاد ہونے کے مدعی ہیں ۔ ان کے اجداد کو قبیلۂ سُوَیْدی نے اپنے اندر شامل کر لیا تھا ۔ سُوَیْدی کی موروثی جاگیر گنج (اسے کیخ کی جگہ جو Véliamenof-Zernof، ۱ : ۲۶۰ میں لکھا ہے، یوں پڑھنا چاہیے) تھی ۔

(۷) پازو کے قبیلہ جسے شرف الدّین نے ایران کے قبائل میں شمار کیا ہے (۱ : ۳۲۸)، کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سُوَیْدی الاصل تھا ۔ شرف نامہ (۱ : ۳۲۸) کی رو سے اس کا کوئی خاص مذہب نہیں تھا اور اس کے ہاں عقائد فاسدہ (رفض والحاد) کی علامات بھی ظاہر تھیں ۔ یہ قبیلہ دو شاخوں میں منقسم تھا : خالد بیگلو اور شکر بیگلو، اور جن میں سے ایک امرائے بِدْلیس کے ماتحت تھی ۔ خالد کو جاگیر میں خِنِس، ملازگرد اور مَوش کا ضلع اُحکان (؟) ملے تھے ۔ وہ کچھ ایسے اترائے کہ خود مختاری کا اعلان کر بیٹھے ۔ جنگ چَلْدِران کے بعد سُوَیْدی قبیلے نے پازوکی کو ان کی بہت سی جاگیروں سے نکال دیا (کتاب مذکور، ۱ : ۲۵۷) ۔ شاہ طہماسپ کے عہد میں قلیج بیگ کو جسے پازوکی کا سردار مقرر کیا گیا تھا، زَگَم (نزد تفلس) مل گیا ۔ بعد ازاں پازوکی کو اَلْشکرت میں منتقل کر دیا گیا جہاں یہ قبیلہ خوب پھلا پھولا ۔

(۸) مرداسی رؤسا (سلیم نامہ میں اسے مِرْدیسی لکھا ہے) بنو عبّاس کی نسل سے ہونے کے دعویدار تھے ۔ ان کا جد اعلیٰ ایک دیندار شخص تھا جو ہکّاری سے اَگِل آیا تھا اور مرداسی اس کے مرید ہو گئے تھے ۔ خود قبیلے والوں کا دعوٰی تھا کہ وہ عربی النسل ہیں اور بنو کلاب سے ہیں، جو حلب کے گرد و نواح میں آباد تھے اور ۴۲۰ھ میں فاطمیوں کے ستانے کے باعث ہجرت کرکے چلے آئے تھے (دیکھیے Lane-Poole : *The Muham. Dynasties*، عدد ۴۵ : حلب کے بنو مرداس) ۔ اس کی تین شاخوں میں سے بڑی اور اہم شاخ بُلْدقانی اَگِل میں آباد تھی ۔ اس کے آق قویونلو سے خوشگوار تعلقات تھے، لیکن

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

شاہ اسمٰعیل کے عہد میں اگیل پر ایران نے قبضہ کر لیا۔ مرداسی قبیلے کی باقی دو شاخوں میں سے ایک پالو، باغن (کیغی کے نیچے) اور خرپوت میں حکومت کرتی تھی اور دوسری نے پہلے بردنج میں اور بعد ازاں جرموک (ارغنہ معدن کے جنوب میں) میں حکومت کی۔

(۹) چمشگزک کے فرمانروا آل عبّاس سے ہونے کا دعوٰی کرتے تھے، لیکن ان کے نام بیشتر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ترکی النسل (سلجوق) تھے۔ ان کا عشیرہ (خانوادہ) ملکیشی (ملک شاہی ؟) کہلاتا تھا۔ ملکیشی کے تقریباً ایک ہزار گھرانے ایرانی حکومت کی ملازمت میں (ایران میں؟) تھے۔ ملکیشی کے علاقے اتنے کثیرالتعداد تھے کہ کردستان کا نام چمشگزک کا مترادف ہو کر رہ گیا تھا (شرف نامہ، ۱ : ۱۶۳)۔ مغول عہد حکومت میں تیمور اور قرہ یوسف کے تحت یہ ان پر قابض رہے، لیکن آق قویونلو نے ان تمام قبائل کو کمزور کرنے کی ہر ممکن سعی کی، جو قرہ قویونلو کی وفاداری کا دم بھرتے تھے، چنانچہ انھوں نے چمشگزک کے مقابلے کے لیے ترک قبیلہ خربندلو کو بھیجا۔ شیخ حسن نے خربندلو کو نکال دیا اور شاہ اسمٰعیل کی اطاعت قبول کر لی۔ شاہ اسمٰعیل نے اس کی جگہ ایک ایرانی حاکم مقرر کر دیا۔ سلیم اوّل نے یہ علاقہ وہاں کے موروثی امیر پیر حسین کو واگزار کر دیا۔

فریق ب۔ الجزیرۃ اور کلیس کے درمیان

(۱۰) حسن کیف [رک بہ حصن کیفا]۔ یہاں کے مقامی رؤسا (ملکان) ایوبیوں کے اخلاف ہونے کے مدعی تھے جو بہت اغلب معلوم ہوتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے جد اعلٰی نے حصن کیفا کی جاگیر فرمانروائے ماردین سے پائی تھی۔ اس خاندان کا پہلا رئیس، جس کا ذکر شرف نامہ میں آیا ہے، ملک سلیمان ہے جس نے ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء میں وفات پائی۔ آق قویونلو نے حصن کیفا پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن بعد ازاں ملک خلیل نے جو حمّاۃ میں پناہ گزیں ہو گیا تھا، اپنی جاگیر پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ زمانۂ مابعد میں حکومت عثمانیہ نے ملک خلیل کے بیٹوں کو معزول کر دیا۔ صاحب شرف نامہ نے حصن کیفا کی ماتحت ریاستوں میں سے سعرد، بشیری، طور (جسے بعض اوقات مقبوضات الجزیرۃ میں بھی شمار کیا جاتا ہے، دیکھیے کتاب مذکور : ص ۱۱۷، ۱۲۷، ۱۵۷) اور ارزن کا ذکر کیا ہے۔

(۱۱) سلیمانی، مروانی النّسل (اموی) فرمانروا، انھوں نے پہلے تو خوخ میں حکومت قائم کی، جو ضلع غزالی (قلب اور بطمان صو کے درمیان، ان کے سنگھم سے اوپر) میں واقع ہے اور پھر آہستہ آہستہ بہت سے قلعے اور علاقے دجلہ تک فتح کر لیے۔ وہ قبائل کے ایک طاقتور وفاق پر حکومت کرتے تھے، جن میں سے اکثر بدوی تھے اور موسم گرما میں الہطاغ (Niphates) کی طرف منتقل ہو جاتے تھے۔ ان میں سے سب سے بڑا قبیلہ بانوکی تھا، لیکن بسیان ان میں سب سے زیادہ منچلا تھا۔ اس کے ایک ہزار گھرانے اپنے شیخ شاھسوار کے زیر قیادت بایزید میں ہجرت کر گئے۔ ان میں سے چند قبائل یزیدی عقائد کے پیرو تھے۔ سلیمانی قبیلے کے تعلقات اپنے پڑوسیوں، یعنی صاصون والوں سے بہت خراب تھے۔ ان کی دو شاخیں تھیں : ایک قلپ اور بطمان کی اور دوسری میّافارقین کی۔

(۱۲) زرقی (موجودہ تلفظ مصدقہ از Addai Scher، *JA*، ۱۹۱۰ء، ص ۱۱۹ تا ۱۳۹)، بقول شرف الدّین، زرقی عربی لفظ ازرق کا مخفف ہے۔ اس گھرانے کے جدّ اعلٰی ایک عرب بزرگ تھے جو علوی النّسل تھے اور اورتوق (م ۵۱۶ھ/۱۱۲۲ء؛

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ابوالفرج : مختصر، ص ۳۷۹) کے عہد میں ماردین آئے تھے۔ اس خاندان نے ارتقیوں اور بعد ازاں آق قویونلو سے ازدواجی تعلقات قائم کر لیے ۔ زرق کی چار شاخیں تھیں : بڑی شاخیں ترجیل (بطمان صو کے مغرب میں) اور عَتّاق تھیں؛ باقی دو شاخیں دَرْ زینی (ایک قدیم مسیحی خانقاہ دی زیر ؟) اور کُرد کان (دیار بکر اور میّافارقین کے درمیان) تھیں ۔ آخری شاخ ایک زرق رئیس اور اس کی خانہ بدوش بیوی (دختر کابلی) کی اولاد میں سے تھی ۔

(۱۳) کِیس کے حکمران خاندان کا عقیدہ تھا کہ وہ ہکّاری اور عَمادیّہ کے حکمران خاندانوں کے قرابتدار ہیں ۔ ان کے جد اعلیٰ مَنْد (مَنْتَشا) نے شاہان ایوبیہ کی خدمات انجام دی تھیں جس پر انھوں نے اسے ضلع قُصَیر (نزد انطاکیا) عطا کیا تھا ۔ اس نے اپنے عہد میں قُصَیر کے یزیدیوں اور حماۃ اور مَرْعَش کے درمیان بسنے والے لوگوں، نیز جوم اور کِیس کے کردوں کو متحد کیا ۔ مملوک سلاطین اور سیلم اوّل کے عہد میں یزیدیوں (شیخ عزّالدّین) اور خاندان مند کے درمیان جھگڑے اٹھ کھڑے ہوے جن کا فیصلہ مند کے حق میں ہوا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شمالی شام کی اس جاگیر کے موروثی حقوق کی بنیاد کچھ بہت زیادہ مضبوط نہیں تھی ۔

فریق ج ۔ الجزیرۃ اور خوی کے درمیان

(۱۴) [رک بہ ہکّاری؛ شَمْدینان] ۔ معلوم ہوتا ہے کہ شرف الدّین کو عَمادیّہ کے قریب اس قبیلے کی قدیم جاے سکونت کا علم نہ تھا، جہاں سے زنگی اتابکوں نے انھیں شمال کی طرف دھکیل دیا تھا ۔ اس کے امرا عباسی ہونے کا دعوٰی کرتے تھے ۔ عزّ الدّین شیر (یزدان شیر نام کا معرب) پہلا امیر ہے جس کا ذکر شرف نامہ میں آیا ہے اور جو ۷۸۹ھ/ ۱۳۸۷ء میں تیمور کے مقابلے میں وان کے قلعے میں ڈٹا رہا تھا ۔ آق قویونلو کے عہد میں (الجزیرۃ کے) قبیلۂ دُمْبُلی نے ہکّاری کے مقبوضات چھین لیے، لیکن دز کے عیسائی (آشوری = نسطوری) اس خاندان کے ایک نو عمر رکن اسد الدّین زرّیں چنگ (سنہرے پنجے والا) کو واپس لانے کے لیے مصر گئے ۔ بحال شدہ خاندان کو شَمْبُو کا نام ملا (M. Garzoni : *Grammatica dellal ingua kurda*، روم ۱۷۸۷ء، ص ۴ : *Sciambo*) ۔ اسمٰعیل اوّل کے عہد میں شَمْبُو کے رؤسا قلعہ بای (شَمدینان میں) میں رہتے تھے ۔ اس خاندان کا ایک فرد ووستان پر (وان کے جنوب مغرب میں) حکومت کرتا تھا، لیکن ووستان کے مغرب میں کواش کے ناحیے کے قبضے کے بارے روزکی کا ہکّاری سے جھگڑا تھا ۔ ہکّاری کی حکومت شمال میں اَلْباق تک پھیل گئی تھی ۔ حکومت عثمانیہ نے بوختان کے بدر خان بیگ کی بغاوت کے بعد خاندان ہکّاری کے آخری نمائندے نور اللہ بیگ کو معزول کر دیا اور ۱۸۴۵ء میں حلیمہ خانم نے باش قلعہ ترکوں کے حوالے کر دیا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قبیلہ پِنْیانِش (کتاب مذکور، ۱ : ۹۷، ۱۰۰) جو آج بھی موجود ہے، ہکّاری کے قریب آباد تھا ۔

(۱۵) محمودی جاگیر ہکّاری کے شمال میں ان دریاؤں کے کنارے تھی جو وان اور اَرْچک کی جھیلوں میں گرتے ہیں ۔ یہاں کے فرمانروا (بوختان کے عباسی یا مروانی) جو ابتداءً یزیدی عقیدے کے پیرو ہونے کے مدعی تھے (شرف نامہ، ۱ : ۳۰۷) قرہ قویونلو کے عہد میں یہاں آباد ہوے اور چند ہی دنوں میں ان کی ہکّاری اور دمبلی سے جنگ چھڑ گئی ۔

(۱۶) دُمْبُلی بوختان کے ایک قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں (شرف نامہ، ۱ : ۱۱۸، ۳۱۰ :

www.besturdubooks.wordpress.com

دُمبُلی بوخت، جو مدت تک یزیدی رہا) ۔ دُمبُلی بعد میں آذربیجان آ گئے، جہاں انھیں خوی (اب : زورَوا) کے شمال مغرب میں سگمن آباد (Sögmanabad) جاگیر میں مل گیا ۔ آق قویونلو کے عہد میں دُمبُلی نے بای کا قلعہ (شَمْدِینان میں) اور هکّاری کا ایک حصہ فتح کر لیا تھا (کتاب مذکور، ۱:۱۹۳) ۔ سگمن آباد میں ان کے اوجاق میں شاہ طہماسپ نے خوی کا اضافہ کر دیا ۔ سلطان سلیمان کے عہد میں دُمبُلی کو قُطر [رک بآں] اور بارگیری مل گئے اور بعد ازاں انھوں نے اَلْبَغا، سلیمان سرای (موجودہ سرای) اور چِلْدران کا بھی الحاق کر لیا ۔ زین العابدین شیروانی اپنی کتاب بستان السیاحۃ (انیسویں صدی عیسوی کے اوائل) میں لکھتا ہے کہ تمام دُمبُلی شیعی ہیں (دیکھیے اس کا ضمنی ذکر، شرف نامہ، ۱ : ۳۲۱) اور ترکی بولتے ہیں ۔

(۱۷) برادوست ۔ اس کا حکمران خاندان گُورانی یا حَسَنُویہی [رک بہ حَسَنُویہ] نسل سے تھا ۔ اس کے مقبوضات اُرمیہ کے مغرب میں واقع تھے ۔ ایک شاخ کی حکومت صُومای [رک بآں] میں تھی اور ایک اور شاخ کی تِرگُور اور قلعۂ داؤد میں ۔ برادوست کے بچے کھچے افراد اب شَمْدِینان کے جنوب میں رود بار برادوست (زاب کلاں کا ایک معاون جس کا منبع اُشْنُو کے مغرب میں واقع ہے) کے کنارے آباد ہیں ۔

(۱۸) اُستُونی ۔ قلمی نسخوں میں جو باب ناپید ہے، وہ یقیناً شَمْدِینان کے پہلے حکمران خاندان کے بارے میں ہوگا، جس کا صدر مقام هَرکی کے ناحیے میں ستُونی تھا (دیکھیے شَمْدِینان)

(۱۹ زَرْزا ۔ (دیکھیے زَرْزُری، شہاب الدّین العمری کے مطابق) کی تاریخ جس کا ذکر شرف نامہ کے مقدمے میں کیا گیا ہے، متن میں موجود نہیں ۔

(۲۰) ترزا ۔ قلمی نسخوں میں متعلقہ عبارت محذوف ہے اور ہمیں اس قبیلے کے بارے میں کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں ۔

فریق د ۔ هکّاری کے جنوب میں

(۲۱) عَمادیہ [رک بآں] ۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ عَمادیہ کا قصبہ ایک قدیم قلعے کے محل وقوع پر عماد الدّین زنگی (۵۲۱ تا ۵۴۱ھ) کے حکم سے بسایا گیا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بَہْدِینان کا مقامی خاندان جس کا ذکر شرف نامہ میں آیا ہے، اس ملک میں زنگیوں کے عہد کے اختتام پر (ساتویں/آٹھویں صدی میں) آباد ہوا ہوگا ۔ عمادیہ کے سردار اپنے علوم دینی میں شغف کی وجہ سے مشہور تھے ۔ شرف نامہ میں ان شیوخ کے نام درج ہیں جو تیموری عہد میں تھے ۔ بعد ازاں (اسمٰعیل اوّل کے عہد میں) بَہْدِینان نے ضلع زاخو کو جس میں سِندی اور سلیمانی آباد تھے، اپنی مملکت میں شامل کر لیا، اس ضلع کو کسی زمانے میں ایک علٰحدہ جاگیر (ولایت سِندیان) کی حیثیت حاصل تھی ۔ اس طرح بَہْدِینان کی ولایت میں اس پہاڑی علاقے کا پیشتر حصہ شامل ہوگیا تھا جو موصل کے شمال میں واقع ہے (کوہ گارہ، وغیرہ) ۔

(۲۲) طاسِنی (داسِنی) : قلمی نسخوں میں اس اہم یزیدی قبیلے سے متعلقہ باب موجود نہیں، البتہ متن کے اندر عبارات میں ضمناً یہ ذکر ملتا ہے کہ امرائے عَمادیہ نے سنجاق تاسنی میں سے دُہوک چھین لیا (۱ : ۱۰۹) اور یہ کہ ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء میں سلطان سلیم اوّل نے سنجاق اُربیل اور سُہْران کی پوری ولایت ایک یزیدی سردار، حسین بیگ داسِنی کو عطا کر دی تھی جس سے سُہْران سے ایک خونریز جنگ کا آغاز ہو گیا (۱ : ۲۷۳ تا ۲۷۷) ۔ اس جنگ کا خاتمہ یوں ہوا کہ سُہْران اپنی آبائی جاگیر دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور حسین بیگ کو قسطنطنیہ میں سزائے موت دی گئی ۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

جو علاقہ داسین کے نام سے مشہور تھا، اس کے بارے میں دیکھیے Hoffmann : *Auszüge*، ص ۲۰۲ تا ۲۰۷ .

(۲۳) سُہران (سرخے) : بغداد کے ایک عرب چرواہے کُلوس کی اولاد تھے جو آوان کے ناحیے (علاقۂ سُہران) کے ایک گاؤں ہودیان میں بھاگ آیا تھا ۔ اس کا بیٹا بَلَکان (روان دز کے مشرق میں) کا امیر بن بیٹھا اور اس نے آوان کے قلعے پر قبضہ کر لیا ۔ سُہران کا صدر مقام حریر (روان دز کے نیچے، زاب کلاں کے معاون دریا پر) تھا جسے کو ان کی عمارات نے شاندار اور مزیّن کر رکھا تھا (Rich : *Narrative*، ۱ : ۱۵۷) ۔ تقریباً ۱۰۰۵ھ تک بھی سُہران ایک طاقتور قبیلہ تھا، لیکن آگے چل کر اپنے پڑوسیوں کے حملوں کا شکار ہو گیا اور اس کے زوال سے بابان نے فائدہ اٹھایا (*Narrative*، ۱ : ۱۵۷) .

(۲۴) بابان : اس نام کا اطلاق درحقیقت کئی خاندانوں پر ہوتا ہے جو یکے بعد دیگرے برسراقتدار آئے ۔ ان کی بڑی جاگیر زاب کوچک کے جنوب میں واقع تھی اور اس کا صدر مقام شارِ باڑیر تھا، لیکن ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء میں بابان نے ایک نیا دارالحکومت سلیمانیہ [رک بآں] تعمیر کیا .

(۲۵) مُکری : جو جھیل اُرمیہ کے جنوبی علاقے پر قابض ہیں [تفصیل کے لیے رک بہ ساوج بُولاق] قبیلۂ بابان سے ٹوٹ کر الگ ہو گئے تھے .

(۲۶) بانہ : سرداران اختیار الدّین نے لقب اختیار الدّین اس لیے پسند کیا تھا کہ وہ اپنی مرضی (اختیار) سے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے [تفصیل کے لیے رک بہ ساوج بُولاق] .

(۲۷) اَرْدَلان [رک بہ اَرْدَلان، شہرزُور، سِنّہ، سِیسَر] .

(۲۸) کَلْ باغی : (شرف نامہ، ۲ : ۲ (ضمیمہ) ۳۶ تا ۴۵، ضمیمہ کا اضافہ ۱۰۹۲ھ میں کیا گیا) ۔ ان کے سردار عباس آغا کو جو ترک قبیلے اُستاجلو میں سے تھا، بیگہ بیگ اَرْدَلان (۹۰۰ تا ۹۴۲ھ) نے مَریوان [رک بہ سِنّہ] میں "پانی کا ایک چشمہ" عطا کیا ۔ بعد ازاں عباس آغا نے کُلْہُر کی ایک سابقہ جاگیر بِیلاور میں سکونت اختیار کر لی ۔ اس کی جماعت مختلف قبائل میں سے بھرتی کی گئی تھی ۔ شاہ طہماسپ نے بیلاور اور "دوازدہ اویماق" پر اس کی حکومت کی توثیق کر دی .

بعد ازاں باب عالی خان کَلْباغی کو کِرِنْد، شَیْخان، چَکران (؟)، خور خورہ اور زند وغیرہ پر مشتمل سنجاق عطا کی اور یار اللہ کو اَرکلہ (؟)، رَنْگرزان اور سَہْبانان (؟) کی تیمار ملی .

کُلْہُر (کُلْہُر) : یہاں کے سردار گودرز بن گیو کی نسل سے ہونے کے دعویدار تھے جس کا ذکر ایران کے رزمنامے [فردوسی : شاہ نامہ] میں آیا ہے ۔ عشیرت کلہر کو گوران کہتے تھے (۱ : ۳۱۷)، لیکن بعض قلمی نسخوں میں "کُلہر و گوران" بھی آیا ہے (شرف نامہ، ۲؛ (ضمیمہ) : ۶) ۔ کلہر کی تین شاخیں تھیں، یعنی پَلَنگان [رک بہ سنّہ]، درتنگ (رک بہ زُہاب) اور ماہی دشت [رک بہ کرمان شاہ] کی .

درنہ اور درتنگ (آج کل ریجاب، ضلع زہاب میں) کے سرداروں کے مقبوضات اور قدیم حلوان [رک بآں] بقول شرف الدّین، ۱ : ۳۱۹، آپس میں مطابقت رکھتے تھے ۔ ۱۰۰۵ھ کے قریب قَباد بیگ کا اقتدار دِینَور اور بیلاور سے بغداد تک پھیل گیا ۔ کُلْہُر کی تیسری شاخ کی آبائی جاگیر (اوجاق) ماہی دشت اور بیلاور (درہ مَرواری کے جنوب میں) پر مشتمل تھی ۔ ماہی دشت شاخ خانہ بدوش تھی ۔ ان تمام امور سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

رشید الدّین کی مہیا کردہ معلومات کیوں ناکافی ہیں ۔ آج کل گوران اپنی آبائی جاگیر پر قابض ہیں، لیکن قبیلۂ کلہر کے قبضے میں وہ علاقہ ہے جو بغداد سے کرمان شاہ جانے والی شاہراہ کے جنوب میں واقع ہے ۔

فریق ۵ ۔ ایرانی کرد

شرف نامہ میں اس فرقے کا بیان جو ایران کے کردوں سے متعلق ہے، کچھ زیادہ واضح نہیں ۔ مصنف اسے اس زمانے میں قلمبند کر رہا تھا جب ایرانی، ترکی سرحد متعین نہیں ہوئی تھی ۔

ایران کے بڑے قبیلوں کی تعداد تین تھی : سیاہ منصور، چگنی اور زنگنہ ۔ ان کے نام ان تین بھائیوں کے نام سے ماخوذ ہیں جو لرستان یا "گوران و اردلان" سے آئے تھے ۔ ان قبائل کے علاوہ اور خرد تر قبائل کے جن کا ذکر شرف الدّین نے کیا ہے، قرہ باغ (ماوراے قفقاز میں) کے ۲۴ (یگرمی ذات) قبیلے اور تھے جن کے افراد کی تعداد تیس ہزار تھی اور وہ سب ایک فرمانروا کے ماتحت تھے، اور خراسان کا ایک قبیلہ گیل تھا، بعض اور قبیلے بھی تھے جن کی کچھ اہمیت نہیں تھی ۔

قبیلۂ سیاہ منصور : شاہ طہماسپ کے عہد میں اس کا شیخ ایران کے تمام کردوں کا (جو ۲۴ قبائل سے زیادہ تھے) امیر الامرا بن گیا تھا ۔

چگنی کا ایک حصہ غرچستان میں ہجرت کر

قبیلۂ زنگنہ (زنگنہ) نے العراق اور خراسان میں ناموری حاصل کی ۔ ۱۶۵۰ سے ۱۷۳۰ء تک شرف الدّین نے جسے کردستان عظیم کہا ہے (اور جس کا تصور یہ ہے کہ وہ خود مختار کرد ریاستوں کے ایک سلسلے پر مشتمل تھا) اس کی وسعت میں وان اور دیار بکر کی سنجاقوں میں ترکی حکومت قائم ہونے کی وجہ سے، پہلے ہی کمی آ چکی تھی ۔ صرف ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء کے معاہدے ہی سے ایرانی حکومت کی مغرب کی جانب مزید توسیع ختم نہیں ہوئی بلکہ ترکی نے صفوی [بادشاہ صفی اوّل (م ۱۶۴۲)] کے عہد میں ایران کے مغربی صوبوں نیز ماوراے قفقاز پر دوبارہ قبضہ کر لیا (von. Hammer : *G.O.R*، طبع دوم، ۴ : ۲۳۵) ۔ اس طرح حکومت عثمانیہ کے ماتحت عملی طور پر تمام کرد یکجا ہوگئے ۔ اب چونکہ ایرانیوں سے کسی قسم کا خدشہ نہ رہا تھا، اس لیے ترکوں نے بڑے قاعدے سے سب کو ایک مرکز کے گرد اکٹھا کرنے کا کام شروع کر دیا ۔

سب سے پہلے مراد چہارم کے عہد میں ہمیں ملک احمد پاشا کا ذکر ملتا ہے جسے ۱۶۳۸ء میں دیار بکر کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا ۔ اس نے سنجار کے یزیدیوں پر چڑھائی کی ۔ بعد ازاں (۱۰۶۵ھ/۱۶۵۵ء) میں اسی پاشا نے وان میں اپنے تبادلے کے بعد اس علاقے کے تمام کردوں کو مطیع کیا ۔

۱۶۶۶ء میں ایک کرد نے جو کسی شیخ کا بیٹا تھا، اپنے [امام] مہدی ہونے کا اعلان کر دیا، لیکن موصل اور عمادیہ کے حاکموں نے اسے گرفتار کر لیا ۔ سلطان محمد چہارم نے اس خود ساختہ مہدی کو اپنی ذاتی ملازمت میں لے کر اس معاملے کو بغیر کسی جنگ و جدال کے نمٹا دیا (v. Hammer، ۳ : ۵۸۹) ۔

شاہ حسین کے عہد میں جو ایک کمزور بادشاہ تھا، العراق کے کردوں نے ۱۷۱۹ء میں ہمدان کا محاصرہ کر لیا اور لوٹ مار کرتے ہوے دارالحکومت تک پہنچ گئے ۔ ۱۷۲۲ء میں شاہ طہماسپ دوم کے حکم سے ایک کرد شیخ فندن (فریدون ؟) نے اصفہان کو جس پر افغانوں کا قبضہ

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ہو چکا تھا، دوبارہ لے لینے کی کوشش کی، لیکن یہ کوشش ارمنی محلے پر ایک حملے تک محدود رہی۔ افغانوں نے قندھار کو پسپا کردیا اور اس نے واپس اپنے علاقے میں جا کر ترکوں کی اطاعت قبول کر لی (Hanway: *A Historical Account of the British Trade*، ۱۷۵۳ء، ج ۳) ۔ قسمت نے صفویوں کا ساتھ چھوڑ دیا چنانچہ عباس قلی خان اردلان تک نے حسن پاشا کی اطاعت قبول کر لی (v. Hammer، ۴ : ۲۱۱، نیز دیکھیے *RMM*، ۴۹ : ۸۷) ۔ جوان رود، دَرْنہ، جاف، ہرسین کے سرداروں نے اور بالآخر سپہ سالار علی مردان بختیاری (فیلی ؟) نے اس کی مثال کی تقلید کی (v. Hammer، ۴ : ۲۲۷) ۔

افغان، اصفہان میں : افغان حکومت کے خونریز اور عبوری دور میں اشرف نے ترکوں کو شکست دی (جنگ گلنابد، ۱۷۲۶ء میں) جن کی صفوں میں بیک سلیمان اوغلو (سلیمان پاپان) کے ماتحت ۲۰ ہزار کرد تھے ۔ ترکوں نے اس شکست کی ذمے داری کردوں کے طرز عمل پر ڈالی، جنھیں اشرف نے بڑے بڑے وعدوں سے سبز باغ دکھائے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ شکست سے کچھ ہی دیر پہلے بعض کرد، افغانوں سے جا ملے تھے۔ اپنی ابتدائی کامیابی کے باوجود اشرف نے اگلے ہی سال، یعنی ۱۱۴۰ھ/ ۱۷۲۷ء میں مغربی ایران جس میں کرد اور لُر اضلاع بھی شامل تھے، ترکوں کے حوالے کر دیے اور اس کے عوض حقوق بادشاہی دوبارہ حاصل کر لیے ۔

نادر شاہ سلطان احمد ثالث کے عہد کے اواخر ایام میں صورت حال میں انقلاب آنے لگا ۔ معاہدہ ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۲ء کی رو سے ایرانیوں کو مغربی صوبے واپس مل گئے اور چند ہی دن میں نادر نے ترکی مملکت پر حملہ کر دیا اور بغداد کے دروازوں تک جا پہنچا ۔ ترکوں نے کرد دستوں کی مدد سے اس کی پیش قدمی روکنے کی ناکام کوشش کی، تا آنکہ ۱۷۳۳ء میں طوپال عثمان پاشا کرد امدادی فوجیں لے کر، جنھیں اس نے موصل میں بھرتی کیا تھا، میدان میں نکلا ۔ نادر نے شکست کھائی ۔ ۱۷۳۴ء میں اسے قفقاز کے معرکوں میں کامیابی ہوئی اور اس نے تفلس پر قبضہ کر لیا جہاں ۶ ہزار کردوں پر مشتمل ایک حفاظتی دستہ متعین تھا ۔ ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء کے صلح نامے کی رو ۱۰۴۹ھ/۱۶۲۹ء کی قدیم سرحدیں دوبارہ قائم ہو گئیں ۔ ۱۷۴۳ء میں نادر نے دوبارہ ترکی علاقے پر حملہ کیا، لیکن کردوں اور عربوں کی امداد کے باوجود اسے سِنّہ تک پسپا کر دیا گیا جہاں اسے بالآخر شکست ہوئی (کتاب مذکور، ۴ : ۳۱۷، ۳۹۸ تا ۳۹۹) ۔

نادر کردوں میں مقبول نہیں تھا، اگرچہ اس کی طوپال عثمان پاشا سے لڑائی کے بارے میں گورانی بولی میں ایک رزمیہ نظم ملتی ہے ۔ نادر نے اردلان کے سردار سبحان وردی خان کی جگہ اس کے بھائی کو مقرر کر دیا تھا جس کے باعث ایک عوامی شورش برپا ہوئی (*RMM*، ۴۹ : ۸۸) ۔ ۱۷۴۷ء میں ترکمانوں کی ایک بغاوت کے دوران میں خراسان کے کردوں (جَمْشِیگزک، قرہ چولی) نے نادر کو مدد دینے سے انکار کر دیا جس پر نادر نے انھیں سزا دی اور انھیں مشہد میں منتقل کر دیا ۔ ۱۷۴۷ء میں نادر خراسان کے باغی کردوں کو پھر سزا دینے جا رہا تھا کہ راستے میں قتل ہو گیا (Jones: *Histoire de Nadir*، لنڈن ۱۷۷۰ء، ص ۱۱۸ تا ۱۲۰) ۔ نادر کی وفات کے بعد جو طوائف الملوکی پھیلی، اس میں کردوں (دُمبلی وغیرہ) نے بھی حصہ لیا، لیکن باب عالی نے اس میں دخل دینے سے احتراز کیا ۔

خاندان زند : نادر شاہ کے انتقال کے بعد

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کریم خان زَنْد [رَک بآں] نے جس کا شمار ایران کے بہترین فرمانرواؤں میں ہوتا ہے، ملک کے بیشتر حصے پر حکومت کی ۔ زَنْد ایک کرد قبیلہ تھا جسے ثانوی اہمیت حاصل تھی (شرف نامہ، ۱ : ۳۲۳) ۔ یہ قبیلہ ہمدان اور مَلایِر کے درمیان اس ضلع میں آباد تھا جس کا نام پہلے اِیغار تھا ۔ نادر کے عہد میں یہ لوگ خراسان میں منتقل کر دیے گئے تھے، لیکن اس کی موت پر وہ اپنے آبائی وطن میں واپس چلے آئے (تاریخ زَندیہ : طبع Beer ؛ ص Xviii 'Xi) ۔ ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں لطف علی خان کی وفات کے ساتھ اس خاندان کا خاتمہ ہوگیا ۔ در حقیقت زند قبیلہ اتنا کمزور تھا کہ وہ اس خاندان کو کچھ زیادہ مدد نہیں دے سکتا تھا، لیکن کریم خان نے اپنے پیش رووں کی مثال پر عمل کرتے ہوے کئی کرد قبائل کردستان سے شیراز میں بلوا لیے تھے (احمد آوند : *R M M*، ج ۳۸، کورونی : جو شیراز کے ایک مخصوص محلے میں رہتے تھے، O.Mann : *Die Tajik Mundarten d. Provinz Fars*، برلن ۱۹۰۹ء، ج ۲۹) .

خالدان قاجار : آغا محمّد شاہ قاجار کی وفات (۱۲۱۱ھ/۱۷۹۷ء) پر صادق خان شقاقی نے تاج شاہی کے جواہرات پر قبضہ کر لیا اور کچھ مدت تک تخت حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا (*The Dynasty of the Kajars*، مترجمۂ Harford Jones Brydges، لنڈن ۱۸۳۳ء، ۲۰، ۲۷ تا ۳۲، ۳۷، ۵۰، ۷۸، ۱۰۶ ؛ R. G. Watson : *A History of Persia*، لنڈن ۱۸۶۶ء، ص ۱۰۷، ۱۱۵، ۱۲۵) ۔ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۵ء میں ایرانیوں نے سُلَیْمانیہ [رَک بآں] کے عبدالرّحمٰن پاشا کی حمایت میں حصہ لیا تھا (Rich : *Narrative*، ۱ : ۳۸۴ ؛ Watson، کتاب مذکور، ص ۱۵۵ اور مُکری کرد گیت، در مجموعۂ مرتبۂ O. Mann، شمارہ ۱۶) ۔ ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۱ء میں کرد قبائل حیدرانلو اور سپکان کی شورشوں سے جو حالات پیدا ہوگئے تھے ان کی وجہ سے ایرانیوں نے ترکی مملکت پر حملہ کیا اور بدلیس اور مُوش تک بڑھ گئے اور اسی زمانے میں کرمان شاہ کی شاہراہ پر شِرَابان تک، جو بغداد کے نزدیک واقع ہے، بڑھ آئے ۔ ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء میں ارزروم میں صلح نامے پر دستخط ہوے جس کی رو سے ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء کی سرحدیں دوبارہ قائم ہوئیں، لیکن ایرانیوں نے ضلع زھاب کے (جہاں کرد آباد تھے) چھوڑ دینے سے انکار کر دیا ۔ سلیمانیہ کی قسمت کا فیصلہ معلق رہا ۔ ۱۸۴۲ء میں ایک نئی لڑائی چھڑنے ہی والی تھی کہ برطانیۂ عظمیٰ اور روس بیچ بچاؤ کرانے کے لیے سامنے آگئے اور ۱۲۴۶ھ/۱۸۴۷ء میں ارزروم کے مقام پر ایک نیا معاہدہ طے پایا جس کی رو سے زھاب دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اس کے بدلے ایران ترکی کے حق میں سلیمانیہ پر اپنے تمام حقوق سے دست بردار ہوگیا ۔ ۱۸۴۸ سے ۱۸۵۲ء تک چار طاقتوں پر مشتمل ایک کمیشن نے سرحدوں کا دورہ کیا، لیکن ترکی نمائندے درویش پاشا کے رویّے کے باعث کوئی معاہدہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا ۔ درویش پاشا نے نہ صرف قُطور کے ضلع پر اپنے سپاہیوں کا قبضہ کرایا، بلکہ ایک خفیہ یادداشت میں (جو ۱۲۸۶ھ اور ۱۳۲۱ھ میں قسطنطینیہ سے شائع ہوئی) یہ نظریہ پیش کیا کہ جھیل اُرمیہ کے جنوب اور مغرب میں جتنے کرد اضلاع ہیں، ان پر ترکی کا حق ہے .

ترکی انیسویں صدی میں : ۱۸۲۶ء میں رشید محمّد پاشا والی سیواس کو یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ کردوں کے درمیان امن و امان قائم کرے اور کردستان میں ترکی حاکم مقرر کرے ۔ ۱۸۳۰ء کے قریب کئی مقامات پر کردوں نے زبردست بغاوت کر دی ۔ اس بغاوت کے سرغنہ بدر خان اور

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

سعید بیگ، اسمٰعیل بیگ اور محمّد پاشا والی روان دز تھے۔ ۱۸۲۰ء (۱۸۲۰ء؟) کے لگ بھگ محمّد پاشا نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور خُشناؤ کے قبائل پر حملہ کیا، ۱۸۳۱ء میں اس نے اَربیل آلتون کُوپرو، کوی سنجاق اور رانیہ پر قبضہ کر لیا۔ اگلے سال اس نے اپنی فوج موصل کی جانب بڑھائی۔ بعد ازاں اس نے عَکرہ، زِیبا اور عَمادیہ فتح کیے۔ ۱۸۳۳ء میں روان دُز کے فوجی دستے اندرون ملک میں زاخو اور الجزیرہ تک بڑھتے چلے گئے تاکہ وہاں دوبارہ بدر خان کی حکومت قائم کی جا سکے۔ کئی موقعوں پر یزیدیوں کو بڑی سخت سزائیں دی گئیں اور قویون جق کی پہاڑی پر یزیدیوں کی ایک پوری جماعت کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ ۱۸۳۵ء میں بغداد، موصل اور سیواس سے ترک فوجیں محمّد پاشا کے مقابلے میں بھیجی گئیں اور ۱۸۳۶ء میں روان دز کا امیر ایک حیلے سے گرفتار کر لیا گیا۔ ان بغاوتوں اور ان کے فرو کرنے کا سلسلہ اس کے بعد بھی کئی سال تک جاری رہا (دیکھیے Poujoulat : *Voyages*، ۱ : ۳۷۳؛ Moltke : *Briefe*، برلن ۱۸۴۱، ص ۲۵۹ تا ۲۸۴)۔

جب نِزیب کے مقام پر مصریوں نے ترکوں کو شکست دی (۱۸۳۹ء) تو کردستان میں نئے سرے سے شورشیں ہونے لگیں۔ ۱۸۴۳ء میں ہکّاری کے نورالله بیگ اور الجزیرہ کے بدر خان کی بغاوت کا آغاز ہوا۔ ہکّاری کے نسطوریوں نے نور الله بیگ کے جبر و تشدد کے خلاف موصل میں اپنی شکایت پیش کر رکھی تھی۔ اس کے جواب میں نور الله بیگ نے بَرْواری کے نسطوری ضلع کو تاخت و تاراج کیا۔ کئی سال تک قتل عام جاری رہا اور کہا جاتا ہے کہ مقتولین کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ [مغربی] طاقتوں کے نمائندوں نے قسطنطنیہ میں عرضداشت پیش کی اور ۱۸۴۷ء میں عثمان پاشا کے ماتحت ایک بہت بڑی فوج نے کردوں پر حملہ کیا۔ بدر خان اور نور الله نے کئی مقامات پر شکست کھا کر ہتیار ڈال دیے اور کردستان سے جلاوطن کر دیے گئے (دیکھیے Layard : *Nineveh*، باب ۷، *Revue de L' Orient Chrétien*، ۱۹۰۰ء، ۵ : ۶۴۹ تا ۶۵۳؛ Addai Scher، در *JA*، ۱۹۱۰ء، محل مذکور؛ کردوں اور نسطوریوں کے عام حالات و واقعات کے بارے میں، دیکھیے Grant : *The Nestorians*، لیویارک ۱۸۴۱ء؛ Badger : *The Nestarians*، لنڈن ۱۸۵۲ء؛ Perkins : *A residence of 8 yrears .... among the Nestorian Christians*، لیویارک ۱۸۵۲ء؛ Sandreezki : *Reise nach Mosul* Stuttgart ۱۸۵۷ء؛ Riley : *Christians and Kurds*، در *Contemporary Review*، ستمبر ۱۸۸۹ء؛ Heazell : *Kurds and Christians*، لنڈن ۱۹۱۳ء؛ Wigram : *The cradle of mankind*، لنڈن ۱۹۱۴ء؛ Rockwell : *The Pitiful Plight of the Assyrian Christians*، لیویارک ۱۹۰۶ء؛ H. Luke : *Mosul and its minorities*، لنڈن ۱۹۲۵ء)۔

روس اور ترکی کی جنگیں: ۱۸۰۴ تا ۱۸۰۵ء میں روسیوں کے کردوں سے روابط قائم ہوئے اور جلد ہی اس کا اثر نمودار ہونے لگا۔ ۱۸۲۸ سے ۱۸۲۹ء تک، ۱۸۵۳ سے ۱۸۵۸ء تک اور ۱۸۷۷ سے ۱۸۷۸ء تک روسیوں اور ترکوں کے درمیان لڑائیاں ہوئیں اور ہر ایک کے اثرات کردستان پر بڑے دور رس ثابت ہوئے (اس مسئلے کا خصوصی مطالعہ، Averianov : *Kurdi v. voinakh Rossii*، تفلس ۱۹۰۰ء)۔ ۱۸۲۹ء ہی میں روسیوں نے ایک کرد رجمنٹ بھرتی کر لی تھی۔ عیسائیوں کے جلاوطن کر دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑائی کے بعد کرد شمال اور مغرب کی طرف خاصی

www.besturdubooks.wordpress.com

دور تک پھیلنے لگے ۔ جنگ قریم (کریمیا) کے دوران میں روسیوں نے کردوں کی دو رجمنٹیں بنائیں ۔ دوسری طرف، جب ترک شمال کی طرف روانہ ہوگئے تو بوھتان میں ایک خاصی شدید بغاوت رونما ہوگئی جس کی قیادت بدر خان کے سابق حریف اور اس کے ہر دلعزیز بھتیجے یزدان شیر کے ہاتھ میں تھی ۔

جنگ ۱۸۷۷ تا ۱۸۷۸ء کے فوراً بعد بَہْدِینان اور بوھتان کے ہکاری کردوں کی بغاوت رونما ہوئی جس کی رھنمائی اوّل بدر خان کے بیٹوں کے ہاتھ میں رھی اور پھر یہ بغاوت شیخ عبیداللہ نقشبندی کی بغاوت میں مدغم ہوگئی ۔ ۱۸۸۰ء میں کرد حملہ آوروں نے ایرانی اضلاع، اُرمیہ، ساوج بُلاق، مِیْنْدوآب اور مَراغہ میں غارتگری کی اور خود تبریز کو خطرہ لاحق ہوگیا ۔ اس کا وبال زیادہ تر شیعیوں پر پڑا ۔ روس نے سرحد سر دریا (Araxes) کی حفاظت کے لیے اپنی فوج کا ایک دستہ بھیج دیا ۔ ایران نے بڑی تعداد میں فوجیں بھرتی کیں جن میں ماکو [رَکَ بان] کا رسالہ بھی شامل تھا ۔ ترکی نے جو اس وقت روس کے خلاف جنگ سے بمشکل فارغ ہوا تھا، کوشش کی کہ کسی قسم کی الجھنوں میں نہ پھنسے ۔ بالآخر شیخ شَمْدینان واپس آ گیا اور وھاں سے اسے زیر حراست قسطنطنیہ بھیج دیا گیا ۔ وہ دارالخلافہ سے تھوڑے ھی دن میں فرار ہوگیا اور قفقاز کے راستے شَمْدینان لوٹ آیا، لیکن دوبارہ پکڑا گیا اور اس نے ۱۸۳۳ء میں مکۂ معظمہ میں وفات پائی ۔

حمیدیہ دستے : ۱۸۷۸ء کے بعد ترکی کی حکومت کمزور ہوگئی ۔ معاھدۂ برلن کی شق ۶۱ کی رو سے آرمینیا میں اصلاحات اور کردوں اور چرکسوں سے اس کی حفاظت کی ذمّے داری کی قرار داد طے پائی، حکومت ترکی کی طرف سے اصلاحات کے خلاف بڑے شدید رد عمل کا اظہار ہوا، اور ۱۸۸۵ء سے ارمنی انقلابی تحریک کی نشو و نما شروع ہوئی اور اس کی شاخیں روس، سوئٹزر لینڈ اور لنڈن میں قائم ہوگئیں ۔ ان تمام امور کی بنا پر کردوں اور ارمنیوں کے تعلقات پیچیدہ اور کشیدہ ہونے لگے جو قبل ازیں کم سے کم اس لحاظ سے پر امن ہو چکے تھے کہ ارمنیوں نے کرد جاگیرداروں کی سیادت کے سامنے سر تسلیم خم کر رکھا تھا ۔ ۱۸۹۱ء کے لگ بھگ شاکر پاشا کے، جسے بعد ازاں آناطولی میں اصلاحات بروے کار لانے کا کام سونپا گیا، دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ روسی قزاقوں (Cossacks) کی طرح کردوں کی بے قاعدہ رجمنٹیں بنائی جائیں ۔ اس اصلاحی تجویز کی غرض و غایت یہ تھی کہ کردوں کی تربیت کی جائے اور انھیں حکومت عثمانیہ سے وابستہ کر دیا جائے ۔ اس کوشش کو اطمینان بخش خیال نہ کیا گیا کیونکہ آگے جاکر حمیدیہ دستے باقاعدہ فوج (خفیف سواری) میں تبدیل کر دیے گئے ۔ بہر حال حمیدیہ کی تشکیل میں کردوں کو جو حصہ ملا اور ان سے جو توقعات پیدا ہوئیں، اس سے خاصا جوش پیدا ہوگیا؛ یہاں تک کہ قبائل کے درمیان خونریز جھگڑے بھی رو نما ہوئے ۔

ارمنی کرد تعلقات : اسی زمانے میں ارمنیوں اور کردوں (یورپی سفارت خانوں کی ایک اصطلاح کی رو سے "خشکی تری کے دو بھائی") کے درمیان تعلقات بد سے بدتر ہو رھے تھے ۔ ۱۸۹۴ء کا موسم گرما صاصُون کے مقام پر خونریز جھڑپوں کے لیے مشہور ہے ۔ ان کا خاتمہ پانچ دیہات اور تلوری (Dalvorikh) کے پورے ضلع کی تباھی پر ہوا جہاں ارمنی آباد تھے ۔ صاصون کے ان واقعات سے ارمنیوں کے مظاھروں اور انھیں خونریز جنگوں کے ذریعے فرو کرنے کے ایک طویل سلسلے کا آغاز ہوا

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

جس میں کردوں نے عملاً حصہ لیا ۔ ۱۸۹۵ء میں ہکّاری کردوں کے درمیان ایک شورش برپا کرنے کی کوشش ہوئی، لیکن اسے بہت جلد دبا دیا گیا ۔ اس شورش کا نشانہ عیسائی نہیں تھے ۔ بیسویں صدی کے آغاز سے جنگ عظیم تک ارمنیوں اور کردوں کے باہمی تعلقات خاصے پر امن نظر آتے ہیں ۔ اس مسئلے پر عام معلومات کے لیے دیکھیے Abowian : *Kurdi*، در جریدۂ *Kawkaz*، تفلس ۱۸۴۸ء، شمارہ ۴۶، ۴۷، ۴۹، ۵۰، ۵۱ (جہاں "بابائے ادب ارمنی" نے کرد کردار کی بڑی دل نشین تصویر پیش کی ہے) ۔

مآخذ : (۱) Creagh : *Armenians, Koords and Turks*، لندن ۱۸۸۰ء؛ (۲) A. S. Zelenoy : *Zapiska k karte raspredeleniya armiansk. naseleniya, Zapis. Kawkaz. Otd. Geogr. Obshc.*، تفلس ۱۸۹۵ء، ج ۱۸؛ (۳) Vambery : *Armenier u. Kurden*، (۱۸۹۰ء) *Deutsche Rundschau*، ۸۶ : ۲۱۶ تا ۲۳۱؛ (۴) Rohrbach : *Armenier u. Kurden, Verhand d. Gesell f. Erdkunde*، برلن ۱۹۰۰ء، ص ۱۲۸ تا ۱۳۳؛ (۵) Contenson : *Chrétiens et Musulmans*، پیرس ۱۹۰۱ء؛ (۶) Lynch : *Armenia*، بمواضع کثیرہ؛ (۷) Mayewski : *Opisaniye Wanskago i Bitils Wila-yetow*، تفلس ۱۹۰۴ء (مستند کتاب)؛ (۸) N. Marr : *Yeshce o Slove "Celebi" Zap.*، ۱۹۱۰ء، ج ۲۰؛ (۹) Zarzecki (متصل فرانس متعینۂ وان) : *La question kurdo-armenienne* و *La Revue de Paris*، شمارہ ۱۵، اپریل ۱۹۱۴ء؛ اور (۱۰) سفارتی خط و کتابت، طبع در "Livres jaunes"؛ (۱۱) پارلیمنٹ کی رپورٹیں (Blue Books) اور Russian Orange Book بابت ۱۹۱۴ء ۔

بیسویں صدی : بیسویں صدی کے آغاز میں کردوں کے افق پر ایک نئی شخصیت کا ظہور ہوا جس کا کردوں کے عام مراکز عمل سے کوئی تعلق نہ تھا : یہ ابراہیم پاشا بن محمود بن تموّی بن ایّوب ضلع شیرویران (دیار بکر اور حلب کے درمیان) کے قبیلۂ بلّی (بلان) کا سردار تھا ۔ ابراہیم پاشا نے قریب قریب اپنی ایک خود مختارانہ حیثیت قائم کر لی تھی ۔ جب ۱۹۰۸ء کے دستور کا اعلان ہوا تو اس نے کھلم کھلا بغاوت کر دی اور کوہستان عبدالعزیز میں چلا گیا اور وہاں مارا گیا (*Ibrahim Pascha's Glück* : M. Wiedemann، *Asien und Ende*، ۱۹۰۰ء، ۸ : ۳۴ تا ۳۷، ۵۲ تا ۵۴ اور *The Caliph's Last Heritage* : M. Sykes، ص ۳۱۷ تا ۳۲۷) ۔

جب ترکی اور ایران کی سرحد کا مسئلہ دوبارہ زیر بحث آیا تو کردوں میں خاصی ہلچل مچ گئی ۔ مشرق بعید میں روسیوں کی روک تھام (جنگ روس و جاپان) کے بعد ۱۹۰۵ء میں ترکی نے اُرمیہ اور ساوج بلاق کے متنازع فیہ اضلاع پر جہاں کرد آباد تھے، قبضہ کر لیا ۔ اس سے کرد ایک بڑی پیچیدہ سیاسی چال میں پھنس گئے ۔ ترکوں کا قبضہ جنگ بلقان کے شروع ہونے پر (اکتوبر ۱۹۱۲ء میں) ختم ہوا ۔ لیکن فوراً ان کی جگہ روسی دستے خوی اور اُرمیہ کے اضلاع میں گھس آئے ۔ کرد قبائل کے معزز نوجوان روس میں سیر و سیاحت کرنے لگے ۔ ۱۷ نومبر ۱۹۱۳ء کو قسطنطنیہ میں حد بندی کی ایک دستاویز پر دستخط ہوئے اور جنگ عالمگیر کے آغاز سے کچھ ہی دن قبل چار طاقتوں (ترکی، ایران، انگلستان اور روس) کے ایک کمیشن نے سرحد کا جھگڑا طے کرنے میں کامیابی حاصل کی اس صورت سے کہ عموماً وہی سرحدیں دوبارہ قائم کر دیں جو انیسویں صدی کے آغاز میں تھیں (دیکھیے Minorsky : *Turetsko-persidsk. razgranicenive, Izvestia Russ. Geogr. Obsh.*، پیٹروگراڈ ۱۹۱۶ء، ۵۲ : ۳۵۱ تا ۳۹۲) ۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

جنگ ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء: اس جنگ کے دوران میں کرد دو طرف سے زد میں آ گئے۔ اسمٰعیل آغا سِمکو کی کارروائیوں کے بارے میں [رک بہ شکاک] ... کردستان کے بارے میں اتحادیوں کی تجاویز (مارچ ۱۹۱۶ء) کے لیے دیکھیے دستاویزات، در *Razdel Aziatskoi Turtsii*، ماسکو ۱۹۲۴ء، ص ۱۸۵ تا ۱۸۷، ۲۲۵۔

۱۹۱۷ تا ۱۹۱۸ء کے بعد صورت حال میں ایک اساسی تغیر رونما ہوا۔ کردوں کی جمعیتیں ہر جگہ قائم ہو گئیں (دیکھیے Driver : *Report on Kurdistan*، Mount Carmel، فلسطین ۱۹۱۹ء، یہ کتاب برٹش میوزیم میں ہے)۔ شریف پاشا نے پیرس میں کرد نمائندے کے فرائض انجام دیے اور ۲۲ مارچ ۱۹۱۹ء اور یکم مارچ ۱۹۲۰ء کو مجلس مصالحت کے سامنے کردوں کے دعاوی کی بابت دوبارہ یاد داشتیں، "متحدہ کردستان" کے ایک نقشے سمیت پیش کیں (دیکھیے *L' Asie Française*، ۱۹۱۹ء، شمارہ ۱۷۵، ص ۱۹۲، ۱۹۳)۔ اسی زمانے میں ۲۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو شریف پاشا اور ارمنی نمائندوں کے مابین مفاہمت ہوگئی اور دونوں فریقوں نے کانفرنس میں متحدہ مطالبات پیش کر دیے (دیکھیے مفاہمت کا متن، در جریدۂ پیام صباح، قسطنطنیہ، ۲۴ فروری ۱۹۲۰ء؛ نیز دیکھیے *Le Temps*، پیرس، ۱۰ مارچ ۱۹۲۰ء)۔ ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو عہد نامۂ سیورے (*Sèvres*) کی رو سے چار ولایتوں (طربزون، ارزروم، وان اور بِدلیس) پر مشتمل مملکت ارمینیہ وجود میں آئی (دفعہ ۸۸ تا ۹۳) اور دفعہ ۶۲ تا ۶۴ میں قرار پایا کہ فرات کے مشرق کی جانب کے علاقے میں جو سرحد ارمینیہ کے جنوب اور ترکی کی شامی اور عراق سرحد کے شمال میں واقع ہے اور جس میں کردوں کو اکثریت حاصل ہے، ایک آزاد مقامی حکومت قائم کر دی جائے۔ علاوہ بریں اگر مذکورہ حدود میں بسنے والی کرد آبادی اقوام متحدہ کی کونسل کے روبرو ثابت کر دے کہ "ان علاقوں کی آبادی کی اکثریت ترکی سے آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے اور کونسل اس وقت یہ محسوس کرے کہ وہ آزادی کے اہل ہیں" تو ترکی اس پر رضامند ہے کہ اس سفارش کو منظور کر لے اور اس صورت میں دول متحدہ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا، اگر ولایت موصل کے کرد اپنا الحاق "آزاد کرد ریاست" سے کر لیں۔ بعد کے واقعات کی بنا پر کردوں کا مسئلہ محض ولایت موصل کے کردوں سے مستقبل تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ترکی کے نمائندوں نے اصرار کیا کہ "کرد کسی اعتبار سے بھی ترکوں سے مختلف نہیں اور مختلف زبانیں بولنے کے باوجود یہ دونوں قومیں نسلی، مذہبی اور معاشری اعتبار سے ایک وحدت کی حامل ہیں" (لوزان کانفرنس میں ۲۳ جون ۱۹۲۳ء کے اجلاس میں عصمت پاشا کی تقریر)۔ اقوام متحدہ کی کونسل کے ۱۶ دسمبر ۱۹۲۵ء کے فیصلے کے مطابق ولایت موصل عراق میں شامل کر دی گئی اور شرط یہ ٹھیری کہ کردوں کے مطالبات کو پورا کیا جائے گا، بالخصوص یہ کہ ان کے ملک میں حکومت کا کاروبار اور عدالتی نظام چلانے اور مدرسوں میں تعلیم دینے کے لیے کرد ملازمین کو مامور کیا جائے گا اور ان تمام محکموں کی سرکاری زبان کردی ہوگی۔

موصل کے بارے میں طویل گفتگو کے دوران میں شیخ سعید نقشبندی کی بغاوت کے باعث خَرپوت اور دیار بکر کے علاقوں میں خطرناک شورشیں برپا ہوئیں۔ ۱۶ اپریل ۱۹۲۵ء کو شیخ سعید کی گرفتاری عمل میں آئی اور اسے دیار بکر میں موت کی سزا دی گئی۔ موصل کا مسئلہ طے ہو جانے کے بعد سے حکومت انقرہ کے طرز عمل کا رجحان کردستان میں

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

جاگیرداری اور قبائلی اثرات ختم کر دینے کی طرف ہے (دیکھیے Gentizon : *L' insurrection Kurde*، *La Revue de Paris*، ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء).

مآخذ: مقالہ نگار کو ان کے ایک ہم عصر - جی۔ آر۔ ڈرائیور سے بہت سا تاریخی مواد حاصل ہوا جس کا انھوں نے شکر گزاری کے ساتھ اعتراف کیا ہے - کردوں کی تاریخ کا ایک خاکہ اوپر دے دیا گیا ہے، لیکن اس سلسلے میں بہت سے ابتدائی کام اردو، عربی، فارسی، ارمنی اور آرامی زبانوں کے مآخذ کے بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت ہے سلیم ادریس اور اس کے بیٹے ابو الفضل کی تصنیف سلیم ادریس اور تاریخ عالم آرای عباسی کی باقاعدہ چھان بین سے بہت عمدہ نتائج برآمد ہوں گے - کرد تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات شرف نامہ پر مبنی ہیں (۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء تک) - اس کا متن (جو زیادہ تر اس قلمی نسخے پر مبنی ہے جس کا مقابلہ مرتب نے خود کیا تھا (طبع Veliaminof-Zernof : *Scheref-nameh*، ج ۱ (کردوں کی تاریخ)، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۰ء، ج ۲ (ج ۱ کے مختلف نسخے اور سلطنت عثمانیہ کے آغاز سے ۱۰۰۵ھ/ ۱۵۹۶ء تک ایران اور ترکی کی عمومی تاریخ، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۲ء)، فرانسیسی ترجمہ از F. Charmoy : *Cheref-nâmah* یا *Fastes de la nation kurde*، دو جلدوں اور چار حصوں میں، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۸ تا ۱۸۷۵ء، مشتمل بر حواشی (اس میں حاجی خلیفہ : جہان نما کے متعلقہ ابواب کا ترجمہ بھی شامل ہے)، لیکن اب یہ کئی اعتبارات سے فرسودہ ہو چکا ہے اور اس میں اشاریہ بھی موجود نہیں - ان کے علاوہ دیکھیے (۱) H. Barb : *Geschichtliche Skizze de. 33 verschiedenen kurdischen Fürstenges-chlechter*؛ *Über die Kurden Chronik von Scheref Geschichte Kurden-Dynastien*، ج ۵؛ (۲) *Gesch v. weiteren Kurden—Dynastien*؛ *Geschichte d. kurdischen Fürstenherrschaft in Bidlis*؛ جو علی الترتیب A. W. Wien، ۱۰ (۱۸۵۳ء) : ۲۵۸ تا ۲۷۶ و ۲۲ (۱۸۵۷ء) : ۳ تا ۲۸ و ۲۸ (۱۸۵۸ء) : ۳ تا ۵۴ و ۳۰/۱ (۱۸۵۹ء) و ۳۲ (۱۸۵۹ء): ۱۴۵ تا ۲۵۰ میں شائع ہوئیں؛ (۳) گم شدہ تاریخ کردستان مصنفۂ محمد افندی شہر زوری (م ۱۰۷۳ھ/ ۱۶۶۲ء، بمقام مدینہ، دیکھیے تاج العروس، بذیل مادۂ کرد) ابھی تک (۱۹۲۷ء) دوبارہ منظر عام پر نہیں آئی؛ (۴) خاندان اردلان کی تواریخ کے لیے رک بہ سنہ، جہاں خسرو بن محمد بن منوچہر کی تاریخ (۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء تک) کا اضافہ کر لیجیے؛ نیز دیکھیے (۵) Blochet : *Catalogue des manuscrits persans de la Bibl. Nationale* : ۱، ۳۰۵، شمارہ ۴۹۸؛ (۶) رسالۃ السباب الاکراد، ایشیاٹک میوزیم، پیٹرو گراڈ، کے سلسلے میں دیکھیے Romaskewič، در *Mélanges Asiatique*، سلسلۂ جدید، پیٹرو گراڈ ۱۹۱۸ء، ص ۳۹۲؛ (۷) جریدۂ زارکرمان جی (روان دز) نے کردی میں ایک مختصر تاریخ غنچۂ بہارستان کے نام سے شائع کی ہے (۱۹۲۶ء) اور زین العابدین بیگ : تاریخ کردان کی جلد ہی اشاعت کا اعلان کیا ہے۔ کردوں کی تاریخ کے بارے میں عام معلومات حسب ذیل کتابوں میں بھی مل جائیں گی؛ (۸) G. Campanille : *Storia della regione di Kurdistan e delle sette di religione ivi existenti*، نیپلز ۱۸۱۸ء؛ (۹) Quatremère : *Notice sur le Masâlik al-Absâr*، NE، ج ۱۳ (۱۸۳۸ء)؛ (۱۰) Rich : *Narrative* (دیکھیے سلیمانیہ)؛ (۱۱) Charmoy دیباچہ ترجمۂ شرف نامہ؛ (۱۲) Lerch : *Izsledowaniya ob iranskikh Kurdakh*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۵۶ء، ۱ : ۲۰ تا ۳۳؛ (۱۳) Hoffmann : *Auszüge aus Syrisch. Akten*، ۱۸۸۰ء؛ (۱۴) Tomaschek : *Sasun Sitzh.*، *AWW*، ص ۱۳۳ و ۱۳۴، ۱۸۹۵ء؛ (۱۵) Bittner : *Der Kurden gau Uschnuje*، *Sitzb. A.W.Wien*، ص ۱۳۳، ۱۸۹۵ء؛ (۱۶) Rawlinson و Wilson : در *Encyclop. Britannica*، ۱۹۱۱ء، ۱۵ : ۹۳۹ تا ۹۵۱؛ (۱۷) Addai Scher : *Episodes de l' histoire*

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

J.A. du Kurdistan، ۱۹۱۰ء، ۱۵: ۱۱۹ تا ۱۴۰، واقعات بذیل سال ۱۲۰۲ء، ۱۵۰۸ء، ۱۵۱۰ تا ۱۵۱۲ء (الجزیرۃ)، ۱۵۲۳ء، ۱۶۸۹ء، ۱۷۱۲ء (عمادیہ)، ۱۸۲۰ تا ۱۸۳۶ء (روان دز)؛ (۱۸) Soane: To Mespotamia.....In disguise، لنڈن ۱۹۱۲ء، باب ۱۶؛ (۱۹) Minorsky: Kurdi، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۵ء؛ (۲۰) Driver: Studies in Kurdish History، در Bull. School of Orient Studies، لنڈن ۱۹۲۲ء، ۲/۳: ۴۹۱ تا ۵۱۳... نومبر ۱۹۲۶ء میں Cl. Huart نے کردوں کی تاریخ کے بارے میں Institute des Inscriptions کو متعدد مراسلات بھیجے تھے، لیکن مصنف کی وفات کے باعث ان کی اشاعت میں تعویق ہو گئی۔

ج ۔ علم الانسان، عمرانیات، علم الاقوام

ملّی (عرب)، گِردی (مُکری)، کُوچْکری (عہد قدیم کے یہودی)، شَمْدِینان ("نسطوری" اور "ہکّاری") کردوں کی عکسی تصاویر جو Mark Sykes: The Caliph's Last Heritage، ص ۳۲۱، ۳۴۳، ۳۷۳، ۴۲۵ تا ۴۲۹ پر درج ہیں، یا Lynch: Armenia، ج ۲، مشکل ۱۰۹ ("ترکمانی") اور مشکل ۱۴ (اصلی اور بہت ممتاز) میں شمالی کردوں کی شکلوں کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ "کردی" شکل کا معیار قائم کرنے کے لیے کسی ایسی خاص معین طرز کا ڈھونڈھ نکالنا جو سب میں مشترک ہو، ایک موہوم بات ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انتہائی محتاط محققین نے بھی اس سلسلے میں جو کلیات قائم کیے ہیں، انہیں ہم محض ان کی ذاتی آرا کے طور پر پیش کر سکتے ہیں جیسے (۱) Duhoussett: Etudes sur les Populations de la Perse، پیرس ۱۸۶۳ء، ص ۱۲ تا ۱۶؛ (۲) Khanikoff: Memoire sur l'ethnogr. de la Perse، پیرس ۱۸۶۶ء، ص ۷۰؛ (۳) Chantre: Apercu sur les caracteres ethniques des Ansaries et des Kurdes، Bull. Soc. Anthrop. de Lyon، ۱۸۸۲ء، ۱: ۱۶۲؛ (۴) v. Luschan: Early inhabitants of Western Asia، Smithsonian Ins. کی سالانہ روئداد بابت ۱۹۱۳ء، ص ۵۶۱ و ۵۶۲؛ (۵) وہی مصنف: Die Wandervolker Kleinasiens، Verh. d. Ges. f. Anthrop، Völker، Rassen، Sprachen اور ۱۸۸۶ء، برلن ۱۹۲۲ء؛ (۶) Das. Volk d. Kurden Globus، ج ۵۷، عدد ۲۵، ص ۳۵۵ تا ۳۶۳؛ (۷) Pisson: Races des hautes vallees du Tigre et de l'Euphrate، Revue Scient.، ۱۸۹۲ء، ۴۹: ۵۵۷ تا ۵۶۰، ۵۸۱ تا ۵۸۸۔

یہ تمام خصوصیات اپنے تضادات سمیت، ظاہر ہے کہ ان افراد سے متعلق ہیں جنہیں ان مصنفین نے دیکھا تھا۔ کسی نے سارے کرد قبائل کا کبھی مشاہدہ نہیں کیا۔ صحیح علمی اندازہ لگانے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے، دیکھیے Duhaussett: O. L.، جدول ۷ و ۸؛ Khanikoff: کتاب مذکور، ص ۱۳۸ اور روسی تصانیف از Dr. Eliseyew: Anthropol. exkursiya Izw. Geogr. Obsh.، ج ۲۳ اور Po belu Svetu، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۶ء، ۳: ۳۱۹، ۳۳۲، از Dr. Danilow، 'A. A. Iwanowski (Yezidi، در Russki Anthrop. Jonrnal، ۱۹۰۰ء، شمارہ ۳ مع روسی ماخذ) اور Dr. Pantukhow (دیکھیے C. H.: Einige Notizen über die Kurden und Karapapachen nach pantjuchow Ausland، ۳۶: ۷۱۹۔

اس وقت ہمارے پاس کرد قبائل کے ناموں کی خاصی مکمل فہرست اور ان کی تخمینی تقسیم کے بارے میں خاصی مکمل معلومات موجود ہیں لیکن ایک مکمل جائزے کے لیے جس میں امور تاریخی کو پیش نظر رکھا جائے اور جو ایک ہی اصول اور قاعدے کے مطابق حاصل کردہ معلومات پر

www.besturdubooks.wordpress.com

مبنی ہو، بڑے وسیع بنیادی کام کی ضرورت ہے۔ ۱۸۵۶ء میں ہمارے پاس جتنا بھی مواد موجود تھا، اس کے بارے میں بڑی دقیق تحقیق Lerch : *Izsledovaniya ob iranskikh Kurdakh*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۵۶ء، ص ۵۹ تا ۱۲۱ میں کی گئی ہے (Lerch کی کتاب کا یہ حصہ اس کے جرمن ترجمے، *Forschungen über die Kurden*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۵۷ - ۱۸۵۸ء میں شامل نہیں کیا گیا) - بعد کی تالیفات میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں: (۱) Jaba : *Recueil de notices et recits kourdes*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۶۰ء، ص ۱ تا ۷؛ (۲) Spiegel : *Eranische Altertumskunde*، لائپزگ ۱۸۷۱ء، ج ۱؛ (۳) Col. Kartsew : *Zametki o Kurdakh*، در *Zap. Kawk. Otd. Geog. Obsh*، تفلس ۱۸۹۷ء، ۱۹ : ۳۳۹ تا ۳۶۸ (مع نقشہ) اور (۴) سب سے زیادہ مفصل (۵۰۳ نام) از Sir Mark Sykes : *The Kurdish Tribes of the Ottoman Empire*، *J. R. Anthrop. Inst. of Gr. Brit.* ۱۹۰۸ء، ص ۴۵۱ تا ۴۸۰ (مع ایک نقشہ)، بار دوم، در (۵) مصنف مذکور : *The Caliph's Last Heritage*، لنڈن ۱۹۱۵ء، ص ۵۵۳ تا ۵۹۲؛ (۶) Driver : *Report on Kurdistan*، مؤلفہ کارمل ۱۹۱۹ء، ص ۱۹ تا ۴۷ - ایرانی قبائل کے لیے رک بہ کرمان شاہ؛ لک؛ ماکو؛ ساوج بلاق؛ سنّہ اور ارمیہ؛ ماورائے قفقاز کے کردوں کے لیے دیکھیے E. Kondratenko : *Ethnogr. Kartl Zakawkazya Zap. Kawk. Otd. Geogr. Obsh.*، تفلیس ۱۸۹۶ء، ضمیمہ ج ۱۸ .

کردوں کے طرز معاشرت میں تین باتیں ان کے ساتھ مخصوص ہیں: (۱) کردوں میں تاریخی طور پر یہ رجحان کہ وہ علاقائی جاگیروں میں اپنے سردار کے مقبوضہ قلعوں کے اردگرد گروہوں کی صورت میں مجتمع ہو جاتے ہیں اور یہ سردار بسا اوقات مقامی قبیلے سے نہیں بلکہ نسلی اعتبار سے غیر ملکی ہوتے ہیں؛ (۲) ایک جنگی جماعت کا وجود جو سردار کے لیے معاون ہو اور مختلف نسلوں کے اجتماع کو محفوظ رکھے؛ (۳) کردوں میں چرواہوں (خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش) اور کاشتکاروں (مقیم اور نیم مقیم) کی پہلو بہ پہلو موجودگی .

ایسے مکمل خانہ بدوش قبائل کی تعداد بہت کم ہے جو سارے سال خیموں میں زندگی بسر کرتے ہوں اور سردیوں کا موسم عراق کے گرم میدانوں میں عربوں کے پڑوس میں گزاریں (دیکھیے Sir Mark Sykes کی دی ہوئی فہرست) - کردوں کی اکثریت نیم خانہ بدوش یا مقیم ہے - نیم خانہ بدوش قبیلے ملک کے موسمی حالات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں - وہ سال بھر میں پانچ سے آٹھ ماہ تک دیہات میں رہتے ہیں اور گرمی میں فصلوں کی کٹائی کے بعد پہاڑوں میں چلے جاتے ہیں، جہاں انھوں نے پوری حد بندی کے ساتھ اپنے لیے علاقے متعین کر رکھے ہیں حتّٰی کہ جاف [رک بہ سنّہ] جیسے قبائل کے ہاں بھی نقل مکانی کی حدود کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے - اکثر اوقات اس طبقے کے کرد اپنے دیہات کی قریبی بلندیوں پر (جنھیں علاقہ ساوج بوق میں "سران" کہتے ہیں) چڑھ جانے پر ہی اکتفا کرتے ہیں .

"مقیم" کرد اکثر صورتوں میں اس قدیم آبادی کی یادگار معلوم ہوتے ہیں جنھیں "عشیرت" سپاہیوں نے مغلوب کر لیا تھا یا اس نے اپنے پڑوسیوں سے محفوظ رہنے کے لیے ان کی اطاعت قبول کر لی تھی [رک بہ ساوج بوق] - Strabo، ۱۶ : ۳، ۱، نے فارس کے سرتیوں (Cyrtee) میں زراعت پیشہ افراد بھی پائے - ایک زمانے میں موش کے خانہ بدوش قبیلے موسم سرما میں

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

ارمنی دیہات کے مسطح میدانوں میں پناہ لیا کرتے تھے، لیکن بتدریج (۱۸۴۲ء سے) ارمنی دیہات کے پہلو بہ پہلو خالص کرد دیہات بھی پیدا ہو گئے، دیکھیے *Correspondence respecting the condition of population in Asia Minor and Syria*، روئداد پالیمنٹ، ترکی ۱۸۷۹ء، شمارہ ۱۰، ۱۸۸۰ء، شمارہ ۴ و ۲۳؛ ۱۸۸۱ء، شمارہ ۶ (Trotter کی رپورٹیں روسی میں *Izw. Kawk. Otd. Geogr. Obsh.*، تفلیس ۱۸۸۲ء، ج ۷ کے ضمیمے میں ترجمہ ہوئیں)؛ Lynch: *Armenia*، ۱۹۰۱ء، ۲: ۴۲۳؛ Mayewski: *Wanskii i Bitlis. Wilayeti*، تفلس ۱۹۰۴ء (ارمنی اور کرد دیہات کی فہرستیں)۔ کردوں کا عام رجحان کسی مقام پر باقاعدہ سکونت پذیر ہو جانے کی طرف ہے۔ شمالی عراق میں کرد خاصے ہوشیار کاشت کار ثابت ہوئے ہیں اور اس وجہ سے انھیں بدوی عربوں پر فوقیت حاصل ہے، دیکھیے *Handbook* (شمارہ ۵۷) "*Turkey in Asia*"، مطبوعۂ محکمۂ خارجہ، ص ۱۰۴: "معلوم ہوتا ہے کہ شمالی عراق کی قسمت میں ایک کرد ملک بننا لکھا ہے"۔

کردستان کے ہر قبیلے کی قومی خصوصیات (لباس، پیشے، کھیل وغیرہ) کے بارے میں بیانات بختلف ہیں۔ ان سے قبل از وقت کلیات کا اخذ کرنا غلط راستے پر ڈال سکتا ہے۔ صرف اربیوان کے کرد (جو بڑے بڑے کرد مراکز سے دور رہتے ہیں) ایک مکمل مقالۂ خصوصی کا موضوع قرار دیے گئے ہیں، جو Eginzarov (ایک پروفیسر قالدون جو بچپن ہی سے کردی زبان بولتا تھا) نے لکھا ہے: *Kratkii ethnogr. ocerk. kurdow Erlwan. gubernii*، *Zap. Kawk. Otd. Georgr. obsh.*، تفلس ۱۸۹۱ء، ج ۱۳/۲؛ لیز دیکھیے Khacaturaw: *Kurdi, certi yikh Kharaktera i bita, Sborn. mater. po Kawkaz*، تفلس ۱۸۹۴ء، ج ۲۰/۱، ص ۶۴ تا ۹۰۔

سلیمانیہ کے کردوں کے لیے دیکھیے Rich: *Narrative of a residence in Koordistan and Soane: To Mesopotamia and Kurdistan in disguise*، باب ۱۶؛ علاقۂ مکری و ارمیہ کے لیے: (۱) Arakelian: *Kurdi v Persii Izw. Otd. Geogr. Obsh.*، ج ۱۷/۱، ۱۹۰۴ء؛ (۲) de Morgan: *Mission Scientifique*؛ (۳) Nikitine: *Quelques Etudes geogr.*، ج ۲؛ (۴) *La vie domestique Kurde*، *Revue ethnogr. et des traditions populaires*، ۱۹۲۳ء، ص ۳۳۴ تا ۳۴۴۔

کردوں کی معاشرت میں عورتوں کو جو حیثیت حاصل ہے اس کی عجیب و غریب خصوصیات کا شرف نامہ (۱: ۹۸، ۱۳۱، ۱۷۳ و ۱۷۴، ۳۸۱؛ ۲ (تکملہ): ۴۴) سے پتا چلتا ہے۔ انھیں ترکمان عورتوں کے مقابلے میں نسبۃً کم آزادی حاصل تھی، لیکن وہ عمومی مسائل میں بڑی سرگرمی سے دخل دیتی تھیں، حتیٰ کہ کُلہر میں قبائل پر حکمرانی کرتی تھیں۔ ہکاری کی حلیمہ خالم کے بارے میں دیکھیے Cuinet: *La Turquie d' Asie*، ۲: ۷۱۷؛ اَلبَجہ کی عادلہ خالم (م ۱۹۲۴ء جسے حکومت برطانیہ نے "خان بہادر" کا خطاب دے رکھا تھا) کے لیے دیکھیے Soane: *To Mesopotamia*، بار دوم، ۱۹۲۶ء اور Minorsky: *Kurdi*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۵ء، ص ۳۷؛ نیز دیکھیے Rich: *Narrative*، ۲: ۲۸۵ و بمواضع کثیرہ؛ Jubn: *Recueil*، ص ۸۹، ۹۹؛ Hyvernat: *Du Caucase au Golfe Persique*، ۱۸۹۲ء، ص ۱۷۴۔

مآخذ: کردوں کی زندگی کے بارے میں دیگر مقالات: (۱) de Morgan: *La féodalité en perse Revue*،

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

d'ethnogr. et de social، پیرس ۱۹۱۲ء، ص ۱۸۰ تا ۱۸۲؛ (۲) Nikitine: *La féodalité kurde*، *RMM*، ۶۰: ۱ تا ۲۷؛ (۳) *Kurdische Textil-und Bekleid.-Industrie*، *Osterr. Monatsschrift' f. d. Orient*، ۱۸۷۶ء، ص ۱۲۶ تا ۱۲۷؛ (۴) V. Luschan: *Zwei mit Menschenhaaren besetzte Teppiche*، *Zeitschr. Ethnol.*، ۲۰/۶؛ (۵) *Kustarn. promish.na kawkaze* (۱۸۸۸ء): ۴۳۹؛ *Kowrow. promish. kurdow. Erïwan. gubernii*، تفلس ۱۹۰۳ء (اربوان کے کردی قالین)؛ (۶) Berliner و Borchart: *Silberschmiedarbeiten aus Kurdistan*، ۱۹۲۲ء؛ (۷) Volland: *Beitrage z. Ethnogr. d. Bewohner v. Armenien und Kurdistan*، *Arch. f. Anthrop.*، ۳۶ (۱۹۰۹ء): ۱۸۳ تا ۱۹۶؛ (۸) مرزا محمد جواد القاضی: *Studien aus dem Rechtsleben in kurdistan*، *Zeitschr. f. vergl. Rechtswiss.*، ۲۲ (۱۹۰۹ء): ۳۲۱ تا ۳۴۷؛ (۹) وہی مصنف: *Der Kurdenstamm*، *Globus*، *Manggur*، ۹۸: ۲۱۳ تا ۲۱۵؛ (۱۰) E. Noel: *The Character of the Kurds as illustrated by their proverbs and popular Sayings*، *Bull. School of Orient Stud.*، ۱/۴ (۱۹۲۱ء): ۷۹ تا ۹۰۔

د۔ مذہب

خود کردوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کے اجداد مجوسی (زرتشتی) تھے، دیکھیے M. Sykes: *The Caliph's Last Heritage*، ص ۴۲۵ اور ممکن ہے کہ بَہْدِیْنان (عَمادیہ) کا نام مزدک کی اصطلاحات کی یادگار ہو (بِہْدین: "راسخ العقیدہ، عامی")، لیکن آرامی زبان کے مسیحی مآخذ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ابتداءً کرد بت پرست تھے۔ تیسری صدی میں اُرفہ کے مار ماری (م ۔ ۲۲۶ء) نے شاہ گِرت (شہر گِرت، ذقوقا اور اربیل کے درمیان، دیکھیے Hoffmann: *Auszüge*، ص ۲۷۰) میں بادشاہ اور رعایا کو عیسائی بنایا۔ یہ لوگ پہلے "درختوں کو پوجتے تھے اور ایک تالاب کے بت کے سامنے قربانیاں دیتے تھے" (Raabe: *Mar Mari*، ص ۲۶)۔ ایشوعیہ Ishōyabh نے ثمانین (لزد جزیرۃ ابن عمر) کے قریب اس مقام پر ایک خانقاہ تعمیر کی "جہاں کرد شیاطین کے سامنے قربانی دیا کرتے تھے"۔ جن کردوں کو مار ساَبْہا (م ۔ ۴۸۵ء) نے عیسائی کیا وہ آفتاب پرست تھے (دیکھیے Hoffmann: *Auszüge*، ص ۷۵)۔

کردوں کو عیسائی بنانے کی جو کوششیں ہوئیں ان کے بارے میں بہت ہی کم حالات ملتے ہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بقول المسعودی (مُروج، ۳: ۲۵۴) کردوں میں موصل اور جبل الجُودی کے قریب الیعقوبیۃ اور جُورقان عیسائی موجود تھے (دیکھیے مارکوہولو، باب ۲۴)۔ حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد کرد اکثر خارجی تحریک کی حمایت کرتے رہے (علاقۂ بصرہ میں زنجی غلاموں کی اور آذربیجان میں دیسم کی بغاوت (المسعودی: کتاب مذکور، ۵: ۲۳۱، آذربیجان میں منتشر کرد شُراۃ = خوراج کہلاتے ہیں)۔ ایسے کرد بھی تھے جنھوں نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی خلافت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا (المسعودی: وہی کتاب، ۳: ۲۳۳)۔ شرف نامہ (۱: ۱۴) کی رو سے سارے مسلمان کرد شافعی سنی مسلک کے پیرو تھے (اولیاء چلبی، ۴: ۷۵، کا بھی یہی بیان ہے)۔ بہرحال یہ باب شک و شبہہ سے بالا ہے کہ ایرانی عہد حکومت میں کردوں میں شیعہ بھی موجود تھے۔ الجایتو کے عہد میں تو کردوں میں ایک مہدی بھی پیدا ہوا۔ شقاق [رک بآں] جو شاہ سیون ترکوں میں رہتے تھے، شیعہ بھی ہو گئے، لیز شرف نامہ (۱: ۳۱۶) کی شہادت دیکھیے جہاں شیعی مسلک ماننے والے دُمبلی کا ذکر ہے (اسی

www.besturdubooks.wordpress.com

مصنف نے (۱ : ۱۱۷) الجزیرہ کے چار قبیلوں کو تین یزیدی قبائل کے مقابلے میں حسینی کہا ہے، لیکن یہ واضح نہیں کہ حسینی سے کیا مراد ہے) .

دوسری جانب کردوں میں یزیدی عقائد کی نشر و اشاعت کے بارے میں شرف نامہ (۱ : ۱۴) کی شہادت بہت حد تک قابل یقین ہے (داسنی، خالدی، نسیان قبائل اور بختی، محمودی اور دمبلی قبائل کے کچھ حصوں میں، علاوہ سنجار کے جس کا ذکر شرف نامہ میں نہیں آیا) [= رک بہ یزیدی] .

قبیلۂ پازوکی کے بارے میں شرف نامہ (۱ : ۳۲۸) کا بیان ہے کہ اس کا کوئی مخصوص مذہب نہیں ہے ۔ ان کے صفویوں سے بہت گہرے روابط ہونے کی بنا پر ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ وہ انتہا پسند شیعی مسلک کے پیرو تھے .

زمانۂ حال میں کردوں کی غالب اکثریت ابھی تک شافعی سنّی ہے ۔ سنّہ تک میں صرف ولی اردلان کا سابق حکمران خاندان شیعی تھا ۔ صوبجات کرمان شاہ کے شیعی قبائل میں سے اکثر انتہا پسند ہیں (Minorsky : *Notes Sur Les Ahli-Hakk.*، *RMM*، ۱۹۲۰ء، ۱۱ : ۴۹)؛ ضلع موصل کے بارے میں رک بہ شبک ۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ انتہا پسند جو عموماً شیعی مذہب کے ہوتے ہیں، زیادہ تر کردستان کے ایرانی قبائل میں پائے جاتے ہیں جو خالص کرد نہیں ہیں (گوران، زازا) ۔ دوسری جانب کرد زیادہ تر متعدد سنّی سلسلوں کے شیوخ کے زیر اثر ہیں (بالخصوص نقشبندیہ اور قادریہ، جن کے مراکز اورامان، سلیمانیہ مکری، شمدینان، خرپوت، وغیرہ میں ہیں) ۔ ان کا اثر بدر خان (دیکھیے Layard : *Discoveries*، لنڈن ۱۸۵۳ء، ص ۳۷۵)، عبیداللہ (۱۸۸۰ء)، شیخ سعید (۱۹۲۰ء) وغیرہ کی شورشوں میں نمایاں تھا ۔

رک بہ شمدینان اور Nikitine کے مقالے جن کا اس میں ذکر ہے .

مآخذ : مذکورہ تصانیف کے علاوہ، دیکھیے: (۱) N. Marr : "celebi" *Yeshce o Slove*، *Zap*، ۱۹۱۰ء، ج ۲۰ (کردوں کی ایشیائے قریب کی ثقافت میں جو حصہ ہے، مصنف نے اس پر روشنی ڈالی ہے اور اس کا خیال ہے کہ کردوں (یزیدی؟) میں مشرکانہ عقائد کا سراغ لگایا جا سکتا ہے، [رک بہ چلبی]؛ (۲) S. Reinach : *Charme pour obtenir la pluie*، (در کردستان) *L'Anthropologie*، ۱۹۰۶ء، ۱۷ : ۶۳۳؛ (۳) Volland : *Aberglauben in Armenien und Kurdistan*، *Globus*، ۱۹۰۷ء، ج ۹۱، شمارہ ۲۲، ص ۳۴۱ تا ۳۴۴ (ان پیالوں کے بارے میں جن پر کلمات سحر منقش ہیں)؛ (۴) Driver : *The religion of the Kurds*، *Bull. School of Orient. Studies*، ۱۹۲۲ء، ۲/۲ : ۱۹۷ تا ۲۱۵؛ (۵) Nikitine : *Les Kurdes et le Christianisme*، *RHR*، ۱۹۲۲ء .

۵۔ کردی زبان

فارسی کی طرح کردی بھی مغربی ایرانی زبان ہے، لیکن اس کی اصل فارسی سے مختلف ہے ۔ مغربی ایرانی کے شمالی اور جنوبی شاخوں میں تقسیم ہو جانے کی تاریخ کا ذیل کے مصنفین نے پتا لگایا ہے : Andreas، Salemann، O. Mann (*Die Tajik Mundarten d. Provinz Fars*، برلن ۱۹۰۹ء، ص i تا ۲۶)؛ Meillet : *MSL*، ۱۹۱۱، ۱۹۱۲ء، ج ۱۷؛ Lentz : *Die nordiranischen Elemente in d. neupers. Literatursprache bei Firdosi*، *Z.fur Indologie und Iranistik*، ۱۹۲۶ء، ج ۴، لیکن P.Tedesco نے اپنی تصنیف *Dialektologie d. westiranischen Turfantexte*، *le Monde Oriental*، ۱۹۲۱ء، ج ۱۵، کراسہ ۱ تا ۳، میں بتایا ہے کہ "مغربی" ایرانی کا (جو "مشرقی" ایرانی : سغدی، ساکا، سے مختلف ہے) اپنی شمالی اور جنوبی شاخوں سے بہت حد

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

تک امتزاج ہوگیا ہے اور اس نتیجے کی تصدیق W. Lentz، کی مذکورۂ بالا تصنیف سے ہو جاتی ہے۔

جدید زبانوں میں اس خلط ملط اور اجنبی عناصر کے پہلو بہ پہلو راہ پائے جانے کے باوجود کردی زبان کا بحیثیت مجموعی ایک اپنا مزاج ہے جو اسے فارسی سے واضح طور پر ممتاز کر دیتا ہے۔ یہ امر اور بھی زیادہ واضح ہوتا اگر ہماری کردی دستاویزات اس متأخر زمانے سے متعلق نہ ہوتیں جب فارسی ادبی زبان اپنی فوقیت ثابت کر چکی تھی۔ اگر کردی کا فارسی سے موازنہ کیا جائے تو اس کے اہم خصائص حسب ذیل ہوں گے۔

(الف) اس کا مخصوص تلفظ، سامی حروف ع اور ح کی افراط، ایرانی الفاظ میں بھی، مثلاً عسپ (گھوڑا = اسپ)، حَوْت (سات = ہفت) مفخّم "ل" (جو سلاوی اور ترکی سے تھوڑا سا مختلف ہے)، ثقیل (ڑ) جو ر سے متمیز ہے، دو ہونٹوں سے ادا کیا جانے والا "و"، دو حروف صحیحہ کا استعمال لفظ کے آغاز میں جائز سمجھنا (مثلاً برا brā، شتیک Shtek)، اور جہری حروف "ن" اور "ر" میں حروف علت کی خصوصیت کا پیدا ہو جانا (تقریباً ب ء ن، ک ء ر ت)۔

(ب) صوتی اعتبار سے متبادل ایرانی الفاظ میں جو بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے، وہ ذیل کی مثالوں سے واضح ہو جائے گا:

فارسی	کردی
دِل	زِرد
آذر (آتش)	آہِر اور آگِر
ماهی	ماسی
نماز	نُویز

(ج) صرفی اختلافات: حالت نصبی کا باقی نہ رہنا، آکا (ākā) میں توصیفی لاحقہ مختلف ضمائر کی تصریف: اسم ضمیر، غائب، کا ی/یا ن کے ساتھ، اسم ضمیر حاضر کی جمع، یعنی صیغۂ متکلم: این، حاضر و غائب اِن، ت (—د) سے اضافت کا اظہار (خصوصاً صیغۂ جمع میں) (دیکھیے قفقازی صیغۂ جمع تا ta میں)، مثلاً یارِ ت، تیرا دوست "یارِ دْت" تیرے دوست"، یا کے ساتھ ماضی مجہول کی قدیم صورت (Zum : Salemann *mittelpers. Passive*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۰ء، *Grammaire du vieux Perse* : Meillet، ص ۲۰۱) اور "ر" میں ماضی مجہول کی ایک شکل۔

(د) نحوی اختلافات: ماضی مطلق کے صیغوں میں افعال متعدی کا بصیغہ مجہول باقی رہنا، خصوصاً یہ صورت ان افعال میں زیادہ گنجلک ہو جاتی ہے جو حروف صلہ سے مرکب ہوں (کوئستالیاں لی بروین: "انھوں نے ہمیں کوہستان سے منقطع کر دیا ہے" اور لفظی ترجمہ یوں ہوگا: پہاڑ/ان کے ہاتھوں/ہم سے منقطع کر دیے گئے")۔

(ہ) لغوی اختلافات: شمال مغربی علاقوں کی اکثر بولیوں کی طرح کردی زبان میں بھی نہ صرف کَرْ - کَپ - (اور واچ -) کے الفاظ علی الترتیب جنوب مغربی بولی کے کُن - اُفت - (اور گو -) کے مقابلے میں آتے ہیں، بلکہ اس میں آمد کی جگہ هات، آورد کی جگہ آنی، شنید کی جگہ بیست، فرستاد کی جگہ نارد وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔ کردی اور فارسی دونوں زبانوں نے ادبی عربی سے، بہت سے الفاظ لیے ہیں، لیکن کردی زبان میں عامی عربی، عثمانی ترکی، آرامی اور ارمنی زبانوں سے بھی الفاظ مستعار لیے گئے ہیں۔ علاوہ بریں کردی اور ارمنی میں بھی انھیں ملکی مآخذ سے الفاظ مستعار لیے گئے ہوں گے جن کا تاحال پوری طرح تعین نہیں ہو سکا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو شمال مغربی اور

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

جنوب مغربی ایرانی بولیوں کے درمیان کوئی ناقابل عبور خلیج حائل نہیں، لیکن کردی زبان کی اپنی ایک واضح اور معینہ شکل ہے جو اسے جدید فارسی ہی سے نہیں بلکہ شمال مغرب کی تمام بولیوں (سَمْنانی، "مرکزی" بولیاں وغیرہ) سے ممتاز کرتی ہے۔

علاوہ بریں کردی زبان بہت سے مختلف لہجوں اور بولیوں پر مشتمل ہے۔ اکثر کردی بولیاں اصطلاح کُرمانجی کے تحت آ جاتی ہیں۔ از روے شرف نامہ کرد قوم چار گروہوں پر مشتمل ہے: کُرمانج، لُر، کَلْہُر اور گُوران۔ ان قبائل میں سے لُر، جہاں تک ان کی جسمانی ساخت اور زبان کا تعلق ہے جنوب مغربی گروہ سے مماثل ہیں (O. Mann: *Die Mundarten der Lur-Stamme*، برلن ۱۹۱۰ء) اور ایک جداگانہ وحدت کی تشکیل کرتے ہیں۔ گُوران اپنے قرابت داروں، یعنی اورامی [رَکَ بہ سِنّہ]، زازا وغیرہ کی طرح شمال مغربی علاقے کی بولی بولتے ہیں جو کردی سے خاصی مختلف ہے (دیکھیے "تین" گورانی میں: پری؛ زازا میں: هِریه، جو سَمْنانی: هیره کے مماثل ہے۔ حالانکہ کردی میں سِی کہتے ہیں)، بقول Andreas (جیسے Christiansen نے قلمبند کیا ہے) زازا قدیم دیلمیوں کے رشتے دار تھے اور اس مفروضے کی تائید ان روایات سے ہو جاتی ہے جو آج بھی اورامی کے ہاں پائی جاتی ہیں (E. Soane: *In Disguise to . . . . Kurdistan*، ص ۳۷۷)۔

شرف نامہ کی رو سے کَلْہُر، سِنّہ، کِرمان شاہ اور زُہاب کے درمیانی علاقے میں آباد تھے۔ لہٰذا لفظ کَلْہُر شرف نامہ (ص ۱۳) کے کرد گروہ "غیر کُرمانجی" کے مماثل معلوم ہوتا ہے جو سِنّہ اور کرمان شاہ کے اضلاع میں رہتے تھے۔ O. Mann نے ان بولیوں کا مطالعہ کیا ہے، لیکن اس کی کلیات معلومات کا یہ حصہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔ اس کی کتاب *Kurdisch-Persische forschungen* (جس کی اشاعت کا بیڑا K. Hadank نے اٹھایا ہے) کے کتابچۂ کیفیت کی رو سے صوبۂ کرمان شاہ کی جنوبی بولیاں: کرمان شاہی، کَلْہُری، لَکّی، پَہْرَوَندی، نَانَکَلی اور کُلیانی ایک جلد میں شامل ہوں گی۔ ان میں سے مؤخرالذکر ضلع سُنْقُر [رَکَ بآں] میں بولی جاتی ہے، ایک اور جلد صوبۂ کردستان [رَکَ بہ سِنّہ] اور صوبۂ کِرند اور گُروس (جسے بیجار بھی کہتے ہیں اور جو سِنّہ کے مشرق میں ہے) کی بولیوں کے لیے وقف ہوگی۔ جو لوگ یہ بولیاں بولتے ہیں وہ اپنے آپ کو کردی یا اس سے متعلقہ قبیلے کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ لُرستان (لَکستان میں) کی سرحدوں پر جنوبی کردی بولیاں لَکّی کے نام سے مشہور ہیں (دیکھیے O. Mann: *Kurze Skizze der Luridialecte*، *SBAW*، ۱۹۰۴ء، ج ۳۹؛ Cirikow: *Putewoi Journal*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۵ء، ص ۲۲۷)۔ سَلْماس [رَکَ بآں] اور صوبۂ فارس میں لَک موجود ہیں (لیکن کَلُون اَبْدُو کی کردی بولی جس کا ذکر O. Mann: *Die Tajik Mundarten*، ص ۱۳۵، میں ہے، لَکّی نہیں)۔ مغربی ایران کی جنوبی کردی بولیاں کردی کی اہم خصوصیات سے محروم ہو چکی ہیں (مثلاً افعال متعدی کا صیغۂ ماضی مجہول)۔ ان غیر کُرمانجی بولیوں کا وجود قَردو کے مسئلے کو سلجھانے کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ اہم ثابت ہو سکتا ہے۔

ہمیں لفظ کُرمانج کی اصل معلوم نہیں۔ کیا یہ لفظ کرد کو میڈیا کے کسی اور قبیلے کے نام سے ملا کر بنایا گیا ہے؟ جس علاقے کو ہم صحیح طور پر کُرمان جی کہتے ہیں، وہاں بولیوں کے دو گروہ ایک دوسرے سے ممتاز ہیں: مشرقی (یا زیادہ صحیح طور پر جنوب مشرقی) گروہ اور مغربی گروہ۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

ان کی صحیح صحیح حدود ابھی تک معین نہیں ہو سکیں ۔ مشرقی کرمانجی مُکری [رک بہ ساوج بُلاق] اور دجلے کے معاونیں زاب کوچک، عَضَیم [رک بآں] اور دیالی [رک بآں]، کے علاقوں میں بولی جاتی ہے ۔ یہ بڑی خالص بولی ہے اور تصریف الفاظ کے تنوع سے مالا مال ہے ۔ مغربی شاخ، باقیماندہ کرمانجی بولیوں اور ان کی مقامی خصوصیات پر مشتمل ہے (دیار بکر، ماردین، بُختان بَہْدِیْنان، ہکّاری، اُرمیہ، اِریوان، ارزروم اور ایشیائے کوچک اور خراسان کی کرد نو آبادیاں) ۔ معلوم ہوتا ہے کہ شمالی شام کے کرد ایسی متعدد بولیاں بولتے ہیں جن میں مستعار ترکی الفاظ کی کثرت ہے (دیکھیے Le Coq کا مجموعہ) ۔

اولیا چلبی (۴ : ۷۵) نے پندرہ کردی بولیاں (لسان) گنوائی ہیں ۔ Garzoni : *Grammatica*، میں حمادیہ کی بولی میں اور بِدلیس جولامِرگ، بُختان اور سلیمانیہ کی بولیوں میں امتیاز کرتا ہے ۔ نیز دیکھیے وہ نقشۂ تقسیم جو Soane : *Grammar of the Kurmanjii* میں ہے ۔

مآخذ: ۱۷۸۳ء سے لے کر اب تک کرد زبان کے بارے میں تمام تر تحقیقات، در (۱) Lerch : *Izledovaniya*، ۳ : i تا xxxi؛ اور (۲) *Grundriss d. iran. philol.*، ۲/۱ : ۲۵۳ و ۲۵۴ ۔ کردی زبان کی صرف یہ محقق تصانیف ہیں؛ (۳) Justi : *Kurdische Grammatik*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۰ء؛ اور (۴) Socin : *Die Sprache d. Kurden*، در *Grundr d. iran. Phil.*، ۲/۱ : ۲۴۹ تا ۲۸۶ ۔ ان دونوں کتابوں میں زیادہ تر مغربی کرمانجی سے بحث کی گئی ہے ۔ مشرقی کرمانجی کے بارے میں بنیادی کتاب : (۵) O. Mann : *Die Mundart der Mukri - Kurden*، برلن ۱۹۰۹ء، ۱ : xxxiii تا cvi؛ (۶) *Grammatische Skizze*؛ نیز دیکھیے (۷) Soane : *Notes on the Phonology of Southern Kurmanji*، *JRAS*، ۱۹۲۲ء، ۱۹۹ تا ۲۲۶؛ واحد کردی لغت جو آج موجود ہے وہ : (۸) F. Justi و A. Jaba : *Dictionnaire kurde-française*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۹ء ہے ۔ اس میں وہ تمام مواد موجود ہے جو اس سے قبل شائع ہوا تھا (ضمیمہ از H. Schindler، *ZDMG*، ج ۱/۳۸ میں شائع ہوا)؛ لیکن یہ عملی ضروریات کے لیے کافی نہیں ۔ E. B. Soane کی مرتب کردہ ضخیم کردی لغت کے قلمی نسخے مملوکۂ سکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے بارے میں دیکھیے (۹) E. D. Ross، در *The Times*، ۱۹ فروری ۱۹۲۶ء ۔

کردی بولیوں کے جو نمونے اب تک مہیا ہو سکے ہیں، ان کی ایک فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے :

۱- فارسی گروہ : (الف) سِنّہ ۔ کرمان شاہ : (۱) Lerch : *Forschungen über die Kurden*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۵۷-۱۸۵۸ء، ماخذ، سِنّہ کی بولی میں لکھا ہوا گلستان کا ایک جزو؛ (۲) H. Schindler : *Beitrage z. Kurdischen Wörtschatze*، *ZDMG*، ۱۸۸۳ء، ج ۳۸، زَنگنہ اور کَلہُرِی کے الفاظ و محاورات؛ (۳) وہی مصنف : *Weitere Beitrage*، *ZDMG*، ۱۸۸۸ء، ۴۲ : ۷۳ تا ۷۹، سِنّائی الفاظ کا تجزیہ؛ (۴) Soane : *Southern Kurdish Folk - Song in Kermānshāhi*، *JARS*، ۱۹۰۹ء، ص ۳۵؛ دیکھیے جائزہ از : (۵) O. Mann، در *Die Mundart d. Mukri - Kurden*، ۱ : xxi .

(ب) منتشر بولیاں : (۱) A. Querry : *La dialecte guerrouci*، *MSL*، ۱۸۹۵ء، ۹ : ۱ تا ۲۳، مازندران کے علاقۂ خُجاوَند کی گُروسی بولی؛ (۲) O. Mann : *Die Tajik Mundarten*، برلن ۱۹۰۹ء، ص ۱۳۵ تا ۱۵۵، فارس میں کَاون آبْدُو کی کردی بولی؛ (۳) W. Iwanow : *Khurasani Kurdish*، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات میں چھپے گی : یہ بولی ارزروم کی کُرمانجی کے قریب تر ہے، نیز دیکھیے؛ (۴) Berezine : *Études*،

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

خراسانی کردی کے محاورات؛ (۵) H. Schindler: ZDMG، ج ۳۸/۱، خراسان میں آمرلو بولی اور متعدد کتب سیاحت؛ (۶) Burgsch: Relse d. preussischen Gesandschaft ۱۸۶۳ء، ۲: ۳۹۶ تا ۴۹۸، تہران کے مضافات کے کرد۔

۲- مشرقی کرمانجی: (۱) Chodzko: Études philologiques sur la langue kurde، JA ۱۸۵۷ء ص ۲۹۷ تا ۳۵۶، سلیمانیہ کی بولی، پیرس میں مرتب کی گئی؛ (۲) O. Mann: Die Mundart der Mukri - Kurden، برلن ۱۹۰۶ء، ج ۱، مکمل کتاب صرف و نحو، متن، برلن، ۱۹۰۹ء، ج ۲، ترجمے، مشرقی کردوں کے منظوم قصوں پر مقالہ؛ (۳) E. B. Soane: Notes on a Kurdish dialect (Sulaimania)، JRAS ۱۹۱۲ء، ص ۸۹۱ تا ۹۳۰؛ (۴) وہی مصنف: Grammar of the Kurmanji Language، لنڈن ۱۹۱۳ء، ۱۶: ۲۸۹؛ (۵) Denksch. Wien Akad.، Die heiligen Bucher d. Jeziden و ج ۵۵/۴، ۱۹۱۳ء؛ (۶) Soane: Elementary Kurmanji Grammar، بغداد ۱۹۱۹ء، ۱۹۴ صفحات؛ (۷) وہی مصنف: کتاب اول امینی قرأت کردی، بغداد ۱۹۲۰ء؛ (۸) L. O. Fossum: A Practical Kurdish Grammar، (مکری)، منی پولس ۱۹۱۹ء؛ نیز دیکھیے؛ (۹) Bérézine: Recherches sur les dialectes musulmans، قازان ۱۸۵۳ء؛ (۱۰) H. Schindler: ZDMG، ۱۸۸۴ء، ج ۳۸؛ (۱۱) de Morgan: Mission Scientifique V، ۱۹۰۴ء؛ (۱۲) Von le Coq: Kurdische Texte، ج ۲، بذیل بابا = بابان۔

۳- شمالی اور مغربی کرمانجی - اریوان: (۱) S. A. Egiazarow: Kratkii etnograficeskii Ocerk Kurdow، Zap. Kawkaz. otd. Geogr. Obschestwa، ۱۳/۱، تفلس ۱۸۹۱ء، مکمل ترجمہ WZKM، ۶: ۱۷۸؛ (۲) Khacaturow: Kurdskie Teksti Sbornik materialow dlia opisaniya Kawkaza، تفلس ۱۸۹۴ء، ۲۰: ۱ تا ۱۶، کوہ ارارات کے قریب برکلی کردوں کی زبان؛ (۳) Adjarian: Recueil de mots Kurdes en dialecte de Novo - Bayazet، MSL ۱۹۱۱ء، ۱۶: ۳۴۹ تا ۳۸۳؛ ارزروم - بایزید؛ (۴) Jaba: Recueil des notice et extraits Kurdes، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۰ء؛ (۵) Jaba - Justi: Dictionnaire Kurde français، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۹ء، جو بنیادی طور پر بایزید کے متن پر مبنی ہے، لیکن جس میں تمام فراہم شدہ مواد سے فائدہ اٹھایا گیا ہے؛ (۶) Jaba: Dialogues Kurde - français، مسودۂ مملوکۂ راقم، ارمیہ ہکّاری، شمدینان؛ (۷) F. Müller: Kurdisches und syriches Worterverzeichniss و Orient und Occident، مطبوعۂ Benfey، ۳: ۱۰۴؛ (۸) S. Rhea: Brief Grammar and vocabulary of the Kurdish Language of the Hakkari district، JAOS ۱۸۷۲ء، ۱۰: ۱۱۸ تا ۱۵۵؛ (۹) Makas: Kurdische Studien، ہائیڈل برگ ۱۹۰۰ء، ص ۱۶ تا ۱۸؛ (۱۰) Ein Gedicht aus Gawar، گور سے دیگر مواد کے بارے میں، دیکھیے؛ (۱۱) M. Hartmann، در Bull. Acad.، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۰ء؛ (۱۲) Nikitine: Kratkii russko-kurdskii voyennii perevodcik، ارمیہ ۱۹۱۶ء؛ (۱۳) Noel: The Character of the Kurds as illustrated by their proverbs، (ہکّاری)، Bull School Orient Studies، ۱/۴ (۱۹۲۱ء): ۷۹ تا ۹۰؛ (۱۴) Agha Petros Ellow: Assyrian, Kurdish and Yezidi، بغداد ۱۹۲۰ء، ۸۷ صفحات؛ (۱۵) Soane و Nikitine: The Tale of Suto und Tato Bull. School of Oriental Studies، ۱۹۲۳ء، ۱/۳: ۶۹ تا ۱۰۶؛ (۱۶) Nikitine: Kurdish Storis، کتاب مذکور، ۱۹۲۶ء، ۴/۱: ۱۲۱ تا ۱۳۸، شمدینان - ہوشتان: (۱۷) M. Garzoni: Grammatica e vocabolario della lingua kurda، روم ۱۷۸۷ء، مواد عمادیہ میں جمع کیا گیا؛ اس بولی کی ممتاز خصوصیات کے بارے میں

www.besturdubooks.wordpress.com

دیکھیے - (۱۸) شرف نامہ، ۱ : ۱۰۷؛ (۱۹) A. Socin : *Kurdische Sammlungen*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۰ء، ج ۲، الف و ب، متن و ترجمہ بوھتان بولی میں، جو زاخو میں مرتب ہوا؛ (۲۰) Jardine : *Bahdinan Kurmanji*، بغداد ۱۹۲۲ء، مواد زاخو میں جمع ہوا اور "قسمت موصل اور کردستان کے گرد و نواح کے اضلاع کے کردوں کی کرمانجی" کے طور پر پیش کیا گیا؛ (۲۱) Dufresne : *Un comte Kurde de la region de Sord*، *JA*، ۱۹۱۰ء، ص ۱۰۷ تا ۱۱۸، بوھتان کی بولی میں، لیکن اسے ایک شخص مسمی "سعید ھکّاری افندی" نے لکھوایا؛ (۲۲) یوسف ضیاء الدّین پاشا الخالدی : الھدیۃ حل عمیدیۃ فی اللغۃ الکردیۃ، استانبول ۱۳۱۰ھ، مصنف موتکی (موذکی) میں قائم مقام کے عہدے پر فائز تھا، دیکھیے مکمل ترجمہ *JA*، سلسلۂ ۹، ۲ : ۵۴۵ اور M. Hartman : بوھتان؛ (۲۳) P. Beidar : *Grammaire Kurde*، پیرس ۱۹۲۶ء، زاخو - الجزیرۃ کی بولی - طور عبدین - دیار بکر : (۲۴) P. Lerch : *Forschungen über die Kurden*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۷ - ۱۸۵۸ء، اس کا متن Roslawl کے مقام پر ان جنگی قیدیوں سے جمع کیا گیا جو دیار بکر کے نواح کے باشندے تھے؛ (۲۵) Prym و Socin : *Kurdische Sammlungen*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۷ء، ج ۱ (أ) و (ب)، متن و تراجم، طور عبدین کی بولی؛ (۲۶) Makas : *Kurdische Studien*، ھائیڈل برگ ۱۹۰۰ء، ص ۱ تا ۱۶ : *Eine Probe des Dialektes v. Diyarbakir*؛ (۲۷) وھبی مصنف : *Kurdische Texte*، سینٹ پیٹرز برگ - لینن گراڈ، ۱۸۹۷ - ۱۹۲۶ء، مرتبہ بمقام بوڈا پسٹ، ماردین کی بولی : شمالی شام : (۲۸) Von Le Coq : *Kurdische Texte*، برلن ۱۹۰۳ء، قابل فروخت نہیں، ۱ : ۱ تا ۸۱، متون مرتبہ بمقام زلجیرلی، ص ۱ تا ۹۲، لوہار اور مولدی لبی کے اوٹوٹائپ، ۲ : ۱ تا ۱۱۵، ج ۱ کے متون کی نقل اور زا زا، اولو (؟) اور بابا = سکری کے محاورات - لیز دیکھیے (۲۹) Berezine : *Etudes sur les dialectes musulmans*، قازان ۱۸۵۳ء؛ (۳۰) Soane : *The Shadi branch of Kurmanji*، *JRAS*، ۱۹۰۹ء، ص ۸۹۵؛ (۳۱) Soane : *Grammar of the Kurmanji* ۱۹۱۳ء.

عوامی خیالات، ادب اور اخبارات

کردی کہانیوں کے جو مجموعے Jaba، Lerch، Prym-Socin، von le Coq، O. Mann، Makas اور Nikitine نے مرتب کیے ہیں، ان سے کردوں کے انداز قصہ گوئی کا خاصا علم ہو جاتا ہے - ان کے موضوعات اکثر ان عوامی خیالات سے لیے جاتے ہیں جو مشرق قریب میں عام ہیں (اخلاقی قصے، جن و پری کی کہانیاں، بیوقوفوں کی حکایتیں، دیکھیے مرزا محمّد جاوید القاضی : *Ein Kurdisches Märchen Globus*، ۹۶ : ص ۱۸۷)، کثیر التعداد اور زیادہ دلچسپ وہ کہانیاں ہیں جو عوامی نامور لوگوں کے عشق یا قبیلوں کی باھمی جنگوں وغیرہ کے بارے میں ہیں - اس قسم کی کہانیوں کے موضوع و مواد کے بارے میں Prym-Socin اور Makas نے مفصل ایضاحات قلمبند کیے ہیں - O. Mann نے عباس اول کے وقائع کی سرکاری تاریخ کی شہادت کی بنا پر ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء کے دمدم قلعے کے منظوم قصے کی شرح کی ہے - بہت سے مقبول عام موضوعات پر نظم اور نثر دونوں میں طبع آزمائی کی گئی ہے - بعض واقعات کے گرد تصنیفات کا حلقہ جنھیں مختلف مصنفین نے اپنی اپنی طرز میں لکھا ہے باقاعدہ رزمیات کی صورت اختیار کر گیا ہے، مثلاً میم و زین، یعنی امیر بوھتان کے دربار کے دو عاشق و معشوق کا قصہ جس کی بابت احمد خانی تصنیف اور دیگر شاعروں کی مقبول عام تصانیف بھی ہمارے پاس موجود ہیں : (۱) Lerch : *Melanges Asiatiques*، ۳ : ۲۴۲ تا ۲۵۵؛ (۲) Prym-Socin، شمارہ ۳۱؛ (۳) Mann، شمارہ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

۲؛ (م) Makas، شمارہ ۱ - نیز دیکھیے (۵) B. Chalatianz: *Kurdische Sagen Zeitsch. d' Verlens of Volkerkund*، ۱۵ (۱۹۰۵ء): ۳۲۲ تا ۳۳۰؛ ۱۶ (۱۹۰۶ء): ۳۵ تا ۴۶ و ۴۰۲ تا ۴۱۴؛ ۱۷ (۱۹۰۷ء): ۷۶ تا ۸۰.

Jaba کے اطلاع دہندہ نے اسے نو کرد شاعروں کی ایک فہرست تیار کرکے دی تھی، لیکن اس کی بتائی ہوئی باتوں کو کسی قدر احتیاط سے قبول کرنا چاہیے۔ یہ شعرا حسب ذیل ہیں:

علی حریر (شمدینان میں)، جو ۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء تا ۴۷۱ھ/۱۰۷۸ء میں گزرا ہے۔ وہ ایک کردی دیوانچہ کا مصنف ہے۔

شیخ احمد ملائی جزری، الجزیرۃ کا باشندہ تھا جہاں اس کا مقبرہ آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۵۴۰ھ/۱۱۴۵ء اور ۵۵۶ھ/۱۱۶۰ء کے مابین ایک امیر عماد الدین کے وقت میں اسے عروج نصیب ہوا۔ ملائی جزری کے دیوان میں جسے عکسی ٹائپ میں M. Hartmann نے *Das Kurdische Diwan des Schech Ahmed*، (برلن ۱۹۰۴ء) کے نام سے شائع کیا، فارسی شاعر جامی کا نام مذکور ہے (ورق ۲۲۱) جو ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء میں فوت ہوا تھا۔ اس لیے ملائی جزری پندرھویں صدی کے اواخر سے قبل نہیں ہو سکتا۔ ایک قصیدہ خان خانان کی مدح میں ہے جو شاہ کردستان ہے (ورق ۱۷۱)۔ تبریز پر حکومت کرتا ہے اور شاہ خراسان سے بڑا ہے (ورق ۱۷۷)۔ بہ ظاہر یہ آق قویونلو [رک بآں] خاندان کا کوئی فرمانروا ہوگا۔

فتی طیران (۷۰۷ھ/۱۳۰۲ء تا ۷۷۷ھ/۱۳۷۵ء) مکس میں پیدا ہوا اور وہیں مدفون ہوا۔ در اصل محمد کے نام سے معروف تھا اور میم، حے، تخلص کرتا تھا۔ اس نے حکایت شیخ سنالہ (صنعان)، حکایات برسیسہ، قول شیخ وش (مقولات اسپ ۱۱ پیغمبرؐ) اور دیگر نظمیں لکھیں۔

ملائی بتی (ملا احمد) ہکاری کے ایک گاؤں بتی میں پیدا ہوا اور وہیں دفن ہوا۔ ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء تا ۹۰۰ھ/۱۴۹۴ء) ایک دیوان اور ایک مولد کا مصنف ہے۔ مؤخرالذکر کی عکسی طباعت H. Von Le Coq نے کرائی (*Kurd Texte*، ۱: ۴۹ تا ۹۶).

احمد خان ہکاری - ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء اور ۱۰۶۳ھ/۱۶۵۲ء کے مابین ہوا۔ بایزید میں اس مسجد کے قریب دفن کیا گیا جو اس کے نام سے منسوب ہے۔ اس نے نظم میم و زین لکھی، Jaba-Lerch نے *Melanges Asiatiques*، ۳: ۲۴۲ تا ۲۵۵، میں اس کی تشریح کی اور اصل کتاب کو ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء میں قسطنطنیہ سے اخبار زین کے ناشرین نے شائع کیا۔ اس کے مشکل الفاظ کی مفتی عربی کردی فرہنگ موسوم بہ نوبار (لیا پھل) یوسف ضیاء الدین نے جو اس کی تاریخ تصنیف ۱۰۹۴ھ بتاتا ہے (الہدیۃ الحمیدیۃ، ص ۲۷۹ تا ۲۹۷) شائع کی، اور Le Coq ۱: ۱ تا ۴۷، نے اس کی عکسی نقل شائع کی۔ احمد خانی نے کردی، عربی اور ترکی میں متعدد نظمیں لکھیں.

اسمٰعیل بایزیدی، احمد خانی کا ایک پیرو (۱۰۶۵ھ/۱۶۵۴ء تا ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء) میں ہوا۔ وہ ایک کرمانجی، عربی، ایرانی فرہنگ گلزار اور متعدد غزلیات و منظومات کا مصنف ہے۔ شریف خان جو جولامرگ میں پیدا ہوا اور وہیں مدفون ہوا (۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) امرائے ہکاری کے خاندان سے تھا۔ اس نے کرمانجی اور فارسی زبانوں میں کثیر التعداد نظمیں لکھی ہیں۔ مراد خان بایزیدی (۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء تا ۱۱۹۰ھ/۱۷۸۴ء) غزل گو تھا.

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

سینٹ پیٹرزبرگ کے ایشیاٹک میوزیم میں کرد شاعری کے جو مجموعے موجود ہیں ان کے بارے میں، دیکھیے Lerch : *Isledovaniya* ، ۳ : xxvi؛ ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں قاہرہ سے کر دی زادہ احمد رامز کی مولد النبی باللغة الکردیة، شائع ہوئی۔ کرد اخبار (دیکھیے سطور ذیل) میں ہمیں حسب ذیل شعرا کی زندگی کے بارے میں معلومات اور ان کا نمونۂ کلام ملتا ہے : شاہ پرتو ہکّاری، جس کا دیوان ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں مکمل ہوا؛ نالی، جو مشرقی کرمانجی کے علاقے میں بہت مقبول ہے، انیسویں صدی کے وسط کا شاعر ہے۔ اس کی نظموں کا ایک انتخاب قسطنطنیہ سے منتخب نظموں کے ایک مجموعے میں شائع ہوا جس کا نام شعاعات (از امین فیضی) ہے؛ حاجی قادر کوئی، اسے اپنی کرد قومیت کا شدید احساس تھا (انیسویں صدی)؛ عبداللہ بیگ مصباح الدیوان (ادب)، جنگ عالمگیر کے دوران میں بمقام ساوج بلاق فوت ہوا؛ شیخ رزائی (رضا) خاندان طالبانی (سیروان کے کنارے) سے تعلق رکھتا تھا، م۔ تقریباً ۱۹۱۰ء؛ طاہر بے جاف ابن عثمان پاشا، اَلْبَجہ کا باشندہ (م۔حدود ۱۹۲۰ء)؛ ہمارے ہم عصر شعرا مندرجۂ ذیل ہیں : علی کامل باشندۂ سلیمانیہ، عبدالقادر زہاوی باشندۂ بغداد، احمد بیگ فتّاح صاحبقران باشندۂ سلیمانیہ، مصطفیٰ بے جاف (ایک طنز گو شاعر)، احمد بیگ جاف ابن عادلہ خانم کرکوکی (اثیر)۔ دیگر شعرا جن کے نام اخبارات میں ملتے ہیں، یہ ہیں : شیخ نوری بابا علی، عملی بیگ سالار سعید، ملا رحیم مکری (وفائی)، کاکہ مینی (= امین) مکری، کاک مصطفیٰ ایرانی (= مرشد کامل)، عبدالخالق، سالم وغیرہ۔

Jaba کی مستند کتاب (*Recueil*، ص ۱۲) میں کردی زبان میں درسی نصاب کی کتابوں کے کئی مصنفوں کا ذکر ہے (علی ترماخ نے ۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۱ء کے بعد کردی میں ایک عربی صرف ونحو کی کتاب لکھی اور ملّا یونس حَلْقَطِینی نے تصریف، ظروف اور ترکیب پر صرف و نحو کی تین کتابیں تصنیف کیں)۔ اسی طبقے میں "مسلمانوں کی شرعی نماز" جو ۱۷۸۳ء کے قریب لکھی گئی (طبع C. Huart در *JA*، ۱۸۹۵ء، شمارہ ۱، ص ۸۶ تا ۱۰۹) اور احمد خانی وغیرہ کی مذکورۂ بالا تصنیفات بھی شامل ہیں۔ لیکن عام دستور یہ ہے کہ کرد مصنفین عمومی موضوعات پر قلم اٹھاتے وقت عربی، فارسی یا ترکی کو ترجیح دیتے ہیں۔

عربی میں لکھنے والوں کے اندر مندرجۂ ذیل مشہور فقہا اور علمائے دین شامل ہیں : عیسیٰ ہکّاری (م۔ ۵۸۵ھ/۱۱۸۹ء)، تقی الدّین شہرزوری (م۔ ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء بمقام دمشق)(ابن خلکان : وفیات، ۲ : ۱۸۸، ۴۳۰)، سِنجار کا عبداللہ الکردی (ابن بطوطہ، ۲ : ۱۴۲) ۔ ایوبی شہزادہ ابوالفداء، مؤرخ اور جغرافیہ نگار، کے بارے میں رک بہ مادّۂ ابوالفداء؛ ابن الأثیر (۹ : ۴۹) نے حسین بِشْنَوی کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے جو شاہان مروانیہ کا درباری شاعر تھا اور بتایا ہے (۱۱ : ۷، ۸) کہ کردوں میں ایسے اشخاص موجود ہیں جو مقامی روایات کے ماہر ہیں۔ مصنف شرف نامہ (۱ : ۳۴۱، ۳۴۲) نے اہل بِدْلیس میں سے مولانا عبدالرّحیم، مولانا محمّد بَرْقَلْعی اور شیخ عمّار یاسر (دیکھیے لفحات الانس، طبع Nassau-Lees، ص ۴۷۹) کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ عمادیہ میں علما و فضلا موجود ہیں۔ موجودہ زمانے کے کرد علمائے دین کے بارے میں رک بہ مجلّۂ روژا کرد، شمارہ ۲، ص ۲۳)۔

کردوں نے فارسی زبان میں بہت سی تاریخی کتابیں لکھی ہیں (دیکھیے اوپر)۔ کرد شاعرہ ماہ شرف خانم (م۔ ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۷ء [رک بہ

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

سنّہ] کا دیوان اس کے مختصر حالات زندگی کے ساتھ ۱۹۲۶ء میں تہران سے شائع ہوا تھا۔

ترکی زبان میں لکھنے والے کردی الاصل مصنفین میں سے نامور شاعر فضولی [رک بآں] بغدادی (م - ۹۶۸ھ/۱۵۵۶ء) کو مانا جاتا تھا، لیکن کوپرولو زادہ محمد فؤاد اپنی فضولی، حیاتی و اثری، استانبول ۱۹۲۴ء، ص ۱۳ و ۱۴، میں رقمطراز ہے کہ فضولی قبیلۂ بیاط کا ترک تھا۔ بیاطی یقیناً ترک ہیں، لیکن یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ خورشید افندی نے سیاحت نامۂ حدود، روسی ترجمہ، ص ۱۹۳ و ۱۹۴، کفری کے فرقۂ بیاط اور تزخرمتو کو کردوں میں شمار کیا ہے۔ زمانۂ حال کے ترکی ادب میں متعدد کردی الاصل مصنفین نظر آتے ہیں (دیکھیے J. Deny، ضیاء گوک الپ عمرانی (عالم علم العمران) کے نسب کے بارے میں، *RMM*، ۱۹۲۵ء، ۶۱ : ۳)۔

عیسائی مبلغین کی مطبوعات کے کردی ادب کی ایک خاص صنف وجود میں آئی ہے۔ کتاب مقدس کا متعدد بولیوں میں ترجمہ ہوا ہے: کرمان شاہی ترجمہ لنڈن میں ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا تھا۔ مکری میں مرقس کی انجیل ۱۹۰۹ء میں فلپو پواس سے شائع ہوئی۔ M. Fossum نے مکری میں پروٹسٹنٹ مذہب سے متعلق ایک سوال و جواب نامہ شائع کیا ہے اور اپنی کتاب صرف و نحو میں "بڑھے چلو مسیحی سپاہیو" کا مقفّی ترجمہ مقامی حالات کے مطابق بنا کر پیش کیا۔ ان میں سے کئی مطبوعات ارمنی حروف میں چھپی ہیں (Justi: *Kurd. Gramm*، ص xxix) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ (دیار بکر کے) ان ارمنیوں کے لیے ہیں جن کی روز مرہ کی زبان کردی ہے۔ اپریل ۱۹۱۴ء میں ارمیہ کے پروٹسٹنٹ مبلغین نے (مکری میں) مجلّۂ کردستان کا پہلا شمارہ شائع کیا۔

جہاں تک علم ہے پہلا کرد جریدہ کردستان ہے جو عبدالرحمٰن بیگ بن بدر خان بیگ بوتانی نے یکے بعد دیگرے قاہرہ، لنڈن اور نوکس ٹاؤن سے شائع کیا۔ *Preussische Staatsbiblisthek* میں اس کے شمارے ۱ تا ۳۱، بابت ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۲ء تا ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) موجود ہیں، دیکھیے *WZKM*، ۱۲ : ۱۱۲ و Makas : *Kurd. Stud.*، ص ۱۹ - نوجوان ترکوں کے انقلاب کے بعد کرد طالب علموں (طلّاب) نے جو کہ هیوی (اتحاد) کے نام سے ایک جماعت قائم کر چکے تھے، ایک ماہنامہ روژا کرد (یوم کرد) جاری کیا جس کے پہلے دو شمارے صلاح الدّین اور کریم خان زند کی تصاویر سے مزین ہو کر استانبول سے ۶ جون اور ۶ جولائی ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۲ء کو عبدالکریم سلیمانیوی کی ادارت میں شائع ہوئے۔ آگے چل کر اس رسالے کا نام هتاوی کرد (کرد آفتاب) ہو گیا۔ ارمیہ کے عیسائی مبلغین کے شائع کردہ مجلۂ کردستان کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ جنگ ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء کے بعد کردوں کی سرگرمیاں از سرنو جاری ہوئیں جس کی نشانی یہ تھی کہ قسطنطنیہ، مصر اور کردستان (دیار بکر وغیرہ) میں ان کے کئی اخبارات نکلنے لگے۔ ان میں سب سے پہلا ہفت روزہ زین (="زندگی") تھا جس کی بنیاد ۱۹۱۹ء میں رکھی گئی۔ یہ اگرچہ قسطنطنیہ سے ترکی زبان میں نکلتا تھا، لیکن یہ اس فکر کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وقف تھا کہ "کردستان کردوں کے لیے ہے"۔ شمارہ ۳۲ جمادی الاولٰی ۱۳۳۸ھ/۲۳ جون ۱۹۲۰ء کو شائع ہوا۔ کردی اخبارات کی کوئی مکمل فہرست موجود نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہم حسب ذیل اخبارات کا ذکر کر سکتے ہیں: کردستان، پندرہ روزہ، جسے احمد عزیزی (بدر خان کے قبیلے کا) قاہرہ سے شائع کرتا تھا، شمارہ ۲ پیر ۱۵ ذوالحجہ

www.besturdubooks.wordpress.com

۱۳۳۵ھ اور شمارہ ۱۱ بہ ۱۵ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ تاریخ درج ہے۔ سلیمانیہ میں شائع ہونے والا پہلا اخبار پیشکوتن ("ترقی") تھا۔ جس کی جگہ بعد میں بانگ کردستان آ گیا۔ انگریزوں کے اخلاء سے قبل اس کا مدیر حاجی مصطفیٰ پاشا تھا۔ (۲ اگست اور اکتوبر ۱۹۲۲ء کے درمیان ۱۳ شمارے)، روژ کردستان، "شاہ کردستان" (محمود اول = شیخ محمود) کی آرا کا ترجمان تھا جسے محمّد نوری سلیمانیہ سے نکالتا تھا۔ پہلا شمارہ ۱۵ ستمبر ۱۹۲۲ء اور پندرھواں ۸ مارچ ۱۹۲۳ء کو شائع ہوا؛ بانگ حق، جسے شیخ محمود نے فرار ہونے کے بعد شائع کیا (شمارہ ۱ تا ۸، ج ۳، شمارہ ۳ تا ۱۲، ج ۴، ۱۹۲۳ء)، دیکھیے Edmonds : *A Kurdish Newspaper Journal Centr As. Soc.*، ۱۹۲۵ء، ۱ : ۸۳ تا ۹۰؛ ژیانوی ("رستخیز")، سلیمانیہ کا سرکاری (حکوماتی) ہفت روزہ تھا (شمارہ ۱ تا ۱۸، ج ۸، ۱۹۲۴ء؛ دیاری کردستان ("تحفۂ کردستان") ایک ہفت روزہ انتقادی مجلہ تین زبانوں میں جو بغداد سے صاحبقران زادہ اور رشید شوقی شائع کرتے تھے، شمارہ ۱ تا ۱۱ مارچ ۱۹۲۵ء؛ زار کرمانجی، ایک ہفت روزہ انتقادی مجلہ جسے سید حسین مُکری اور عبدالرّحیم گیو رواندز سے، شائع کرتے تھے، اس کی بنیاد ۱۲ ذوالقعدہ ۱۳۴۴ھ کو رکھی گئی تھی۔

(V. MINORSKY)

⊗ ایرانی کرد

رضا شاہ پہلوی کے عہد میں بھی کردوں کی شورشیں جاری رہیں۔ ان آئے دن کی شورشوں سے تنگ آ کر ایران نے سخت قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ کرد قبائل کے سرکردہ سرداروں کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں اور انھیں تہران لا کر نظربند کر لیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ تا ۱۹۴۵ء) میں شمالی ایران پر روسیوں اور جنوبی ایران پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا، لیکن کردستان ان دونوں طاقتوں کے عمل دخل سے آزاد رہا۔ اس اثنا میں روس نے ایران میں کمیونزم کی اشاعت کی کوششیں زور شور سے جاری رکھیں۔ اس خلفشار سے فائدہ اٹھا کر کردوں نے ایک سیاسی جماعت Komala قائم کر لی اور ۲۲ جنوری ۱۹۴۶ء کو صوبۂ آذربیجان میں مہا باد کے مقام پر کرد جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا۔ جمہوریہ کا سربراہ قاضی محمّد اور سپہ سالار مُلّا مصطفیٰ برزانی قرار پائے۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی محمّد کمیونسٹ نہ تھا بلکہ وہ ایران میں کردوں کے لیے داخلی آزادی کا طلب گار تھا۔ اس نے کردستان میں زراعت اور صنعت کو فروغ دیا اور جگہ جگہ سکول اور ہسپتال قائم کر دیے (Thomas Bais : *The Kurds*، ص ۴۸ تا ۱۴۹، بیروت ۱۹۶۶ء)۔

یکم جنوری ۱۹۴۶ء کو انگریزوں کی فوجیں ایران سے چلی آئیں، لیکن روسیوں نے اپنی فوجیں نکالنے سے انکار کر دیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ ایران میں ایسی حکومت قائم کر جائیں، جو سوویٹ روس کے زیر اثر ہو۔ حکومت ایران نے سلامتی کونسل سے شکایت کی، لیکن روس نے ایران خالی کرنے کے لیے یہ شرط لگا دی کہ ایران کے شمالی علاقوں میں اسے تیل نکالنے کی مراعات عطا کی جائیں اور کرد جمہوریہ کو تسلیم کر لیا جائے۔ بالآخر طویل گفت و شنید کے بعد ۹ مئی ۱۹۴۶ء کو روسی فوجوں نے ایرانی علاقے خالی کر دیے۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں رضا شاہ پہلوی نے کرد جمہوریہ کے خلاف ایرانی افواج کو یلغار کا حکم دیا۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۴۶ء کو قاضی محمّد صدر اور دیگر عہدیداران جمہوریہ نے ہتیار ڈال دیے اور ۳۱

www.besturdubooks.wordpress.com

مارچ ۱۹۴۷ء کو انھیں بغاوت کے الزام میں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا، لیکن مُلّا مصطفٰی برزانی کسی طرح بچ کر روس پہنچ گیا ۔ روس کے ارباب اقتدار نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، اس کی ہر ممکن خاطر و تواضع کی اور اسے آزاد کردستان کے قیام کا سراب دکھاتے رہے، لیکن وہ کمیونسٹ نہ بن سکا ۔ وہ گیارہ برس تک روس میں مقیم رہا اور جمہوریۂ کردستان کی تأسیس کا خواب دیکھتا رہا، لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا (*The Kurds*: Hassan Arfa، لنڈن ۱۹۶۶ء، ص ۷۸ تا ۱۰۲) ۔ جمہوریۂ کردستان کے خاتمے کے بعد ایرانی کردوں کی کمر ہمت ٹوٹ گئی اور انھوں نے مجبور ہو کر اپنی قسمت ایران سے وابستہ کر لی ۔ ۱۹۵۰ اور ۱۹۵۴ء میں کرمان شاہ کے کردوں میں پھر بے چینی پیدا ہونے لگی اور انھوں نے ٹیکس کی ادائی سے انکار کر دیا، لیکن ایرانی افواج نے کردوں کی شورش کو سختی سے کچل دیا ۔ ان شورشوں کے بعد حکومت ایران نے کردوں کی معاشی حالت سدھارنے پر خصوصی توجہ دی ہے اور ان کی اصلاح و فلاح کے لیے بہت سے منصوبے عمل میں لائے گئے ہیں ۔

عراق کرد

عراق میں شیخ محمود البرزانی (۱۸۸۰ تا ۱۹۵۶ء) حکمرانی کا خواب دیکھ رہا تھا ۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں اس نے عراق کردستان کی آزادی کا اعلان کر دیا، لیکن اس کے اپنے ہمراہیوں کی نا اتفاقی کی وجہ سے اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ۔ ۱۹۳۰ء میں برطانوی انقلاب کا خاتمہ ہوا تو امیر فیصل کی حکومت کو کردوں اور آشوریوں کی بغاوت سے نمٹنا پڑا ۔ کردوں کو شکایت تھی کہ ان کے حقوق بلا وجہ غصب کیے جا رہے ہیں اور کردی زبان کو کرد علاقوں کے سرکاری دفاتر سے نکالا جا رہا ہے ۔ شیخ محمود جو ایران میں پناہ گزیں تھا، عراق چلا آیا اور بغاوت کی زمام کار خود سنبھال لی اور عراق کردستان کی آزادی کا مطالبہ پیش کر دیا ۔ عراقی حکومت کی مدد رائل ایرفورس نے کی اور اس طرح یہ بغاوت بڑی خونریزی کے بعد دبا دی گئی ۔ جولائی ۱۹۳۱ء میں شیخ احمد برزانی نے بغاوت کر دی ۔ ۱۹۳۲ء میں اس نے دوبارہ شورش پیدا کی، بالآخر اسے کرکوک اور پھر سلیمانیہ جلاوطن کر دیا گیا، جہاں وہ ۱۹۴۵ء تک مقیم رہا ۔ ۱۹۴۱ء میں رشید علی گیلانی کی ناکام بغاوت کے بعد انگریزوں نے عراق میں اپنا اقتدار دوبارہ مضبوط کر لیا؛ انھوں نے کردوں کو اپنے ساتھ ملانے کی پوری کوشش کی اور بہت سے ترکوں کو فوج میں بھرتی کر لیا ۔

۱۹۴۳ء میں شیخ احمد البرزانی کے بھائی ملا مصطفٰی نے علم بغاوت بلند کر دیا، صلح کے لیے اس کی یہ شرائط تھیں: (۱) کرد علاقوں میں عربی کے علاوہ کردی زبان کو بطور سرکاری زبان تسلیم کیا جائے؛ (۲) کرد علاقوں میں نہ صرف مزید مدارس قائم کیے جائیں، بلکہ ایک یونیورسٹی کا قیام بھی عمل میں لایا جائے؛ (۳) کرد علاقوں میں کرد عہدیدار مقرر کیے جائیں ۔ نوری السعید نے تو یہ شرائط مان لیں، لیکن امیر عبد الالٰہ نے یہ شرائط نامنظور کر دیں ۔ ۱۹۴۵ء کے موسم بہار میں بغاوت پوری طرح پھوٹ پڑی؛ تمام کرد حکومت عراق کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور عراقی افواج کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا ۔ اس دفعہ رائل ایئر فورس پھر حکومت عراق کی مدد کو آئی اور بڑے کشت و خون کے بعد کردوں کی یہ بغاوت فرو کر دی گئی ۔ مُلّا مصطفٰی برزانی ایران چلا آیا اور ایرانی کردوں میں تحریک آزادی چلائی ۔ عراقی کردوں نے بھی ہمت نہ ہاری اور کردستان کے قیام کے لیے خفیہ تحریک جاری رکھی ۔ اس مقصد کے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

لیے انھوں نے Kusrdish Democratic Party قائم کی، جو بائیں بازو کے خیالات کی حامی تھی۔ آزادی اور رزگاری اس کے رسالے تھے۔ روسیوں نے ملا مصطفٰی برزانی کے ہمراہیوں کی مدد سے کاکیشیا (قفقاز) کے علاقے میں ایک ریڈیو سٹیشن قائم کر رکھا تھا، جو کردی زبان کی نشریات میں کردوں کو بغاوت کے لیے ابھارتا رہتا تھا۔ ملا مصطفٰی کے بعض معتمد برابر عراق آتے جاتے رہتے تھے اور واپس جا کر اسے تمام معاملات سے آگاہ کرتے تھے۔

۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کو عراقی فوج نے ہاشمی سلطنت کا تختہ الٹ کر جنرل عبدالکریم قاسم کو نئی حکومت کا سربراہ منتخب کر لیا۔ یہ نئی حکومت روس سے ہمدردی رکھتی تھی، اس لیے مُلّا مصطفٰی کو معافی دے دی گئی اور اسے عراق آنے کی اجازت مل گئی۔ عبدالکریم قاسم کی جمال عبدالناصر سے نبھ نہ سکی اور فریقین ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی کرتے رہے۔ جولائی ۱۹۶۱ء میں مُلّا مصطفٰی اور PDF نے حکومت عراق کو عرضداشت پیش کی جس میں یہ مطالبات پیش کیے گئے: (۱) عراق میں کردوں کی آزاد مملکت قائم کی جائے جس کی سرکاری زبان کردی ہو؛ (۲) کرد علاقوں کی پولیس کردی ہو؛ (۳) خارجہ تعلقات اور دفاعی معاملات کو چھوڑ کر جمہوریۂ کردیہ کو داخلی آزادی حاصل ہو؛ (۴) موصل کرکوک کے تیل کے چشموں سے حاصل شدہ آمدنی کا معتدبہ حصہ کرد علاقوں کی تعمیر و ترقی پر خرچ کیا جائے؛ (۵) کردی فوج کرد جمہوریہ کی مرضی کے بغیر کردستان سے باہر نہ بھیجی جائے (Hassan Arfa: *The Kurds*، لنڈن ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۴)۔ عراق کونسل نے ان تجاویز پر غور کیا اور بالآخر انھیں نامنظور کر دیا، مُلّا مصطفٰی برزانی نے برافروختہ ہو کر علم بغاوت بلند کر دیا، لیکن عراقی فضائیہ نے کرد علاقوں پر بم باری کر کے تباہی مچا دی، جس کی وجہ سے کردوں کو بھاری جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ (دسمبر ۱۹۶۱ - ۱۹۶۲ء کے موسم بہار میں کردوں اور عراقی فوج میں دوبارہ جھڑپیں ہوئیں۔ اس دفعہ کردوں کا پلہ بھاری رہا اور تین ہزار عراقی سپاہی مارے گئے۔

۹ فروری ۱۹۶۳ء کو عبدالکریم قاسم کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور بعث پارٹی برسراقتدار آ گئی۔ جولائی ۱۹۶۳ء میں کردوں اور عراقی فوج میں دوبارہ جنگ شروع ہوگئی، جو بعث پارٹی کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ بعث پارٹی کے بعد عبدالسلام عارف برسراقتدار آیا (فروری ۱۹۶۳ء)۔ اس دفعہ مصر نے کردوں کو صبر اور حوصلے کی تلقین کی، لیکن ساتھ ہی حکومت عراق کو یہ مشورہ دیا کہ کردوں کے جائز مطالبات مان لیے جائیں۔ کرد اپنے تمام مطالبات کی منظوری پر اڑے رہے، جس کی وجہ سے جنگ دوبارہ شروع ہوگئی۔ عراقی فوج نے بم باری کر کے کردوں کو سخت جانی نقصان پہنچایا۔ اس خانہ جنگی کی بازگشت جنرل اسمبلی میں سنی گئی اور روس نے الزام لگایا کہ استعماری طاقتیں عراق کی مدد کر کے کردوں کو نیست و نابود کر رہی ہیں (Hassan Arfa: *The Kurds*، لنڈن ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۶)۔ ۱۰ فروری ۱۹۶۴ء کو فریقین جنگ بندی پر متفق ہوگئے اور عراقی باشندوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ حکومت عراق نے شمالی عراق، جو جنگ سے تباہ ہو چکا تھا، کی اقتصادی ترقی کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا، لیکن اشتراکیوں اور بعثیوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے یہ منصوبہ بروے کار نہ آسکا۔ اس کے بعد کردوں کے نمائندے قاہرہ جا کر جمال عبدالناصر سے ملتے رہے کہ وہ عراقی صدر عبدالسلام عارف

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کو ان کے مطالبات تسلیم کرنے پر آمادہ کر سکیں، لیکن جمال عبدالناصر نے صرف یہ جواب دیا کہ وہ حکومت عراق کو اس مسئلے کی اہمیت پر توجہ دلائے گا۔ عبدالسلام عارف کردوں کے بعض مطالبات سے متفق تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ قضیہ حل ہو جائے، لیکن عملی طور پر کچھ بھی نہ ہو سکا۔ ۱۹۶۶ء میں عبدالسلام عارف کے انتقال کے بعد اس کا بھائی عبدالرحمٰن محمد عارف برسراقتدار آیا۔ اس دوران میں کرد اندرونی آزادی کا مطالبہ کرتے رہے اور عراقی فوجوں سے ان کی جھڑپیں بھی جاری رہیں۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں کرد خاموش رہے۔ ۱۹۶۸ء میں بعث پارٹی نے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا اور کردوں کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے مختلف تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ بالآخر مارچ ۱۹۷۰ء میں کردوں اور عراقی حکومت میں مفاہمت ہوگئی اور کردوں کے بعض مطالبات منظور کر لیے گئے (عبدالوحید: الاکراد و بلادھم، لاہور ۱۹۷۰ء)، ص ۱۹۱) اور سلیمانیہ میں یونیورسٹی قائم کر دی گئی۔ ۱۹۷۴ء میں ایران اور عراق کے درمیان شط العرب کے مسئلے پر مفاہمت ہوگئی تو عراقی کردوں کی رہی سہی مزاحمت بھی ختم ہوگئی اور مُلّا مصطفٰی برزانی اور اس کے بہت سے ہمراہی ایران چلے آئے۔

مآخذ: عبدالوحید: الاکراد و بلادھم، لاہور ۱۹۷۰ء؛ (۲) Majid Khadduri: *Independent Iraq, 1932-1958*؛ (۳) Urial Dann: *Iraq Under Qassem*، مطبوعۂ نیویارک؛ (۴) Hassan Arfa: *The Kurds*، لنڈن ۱۹۶۶ء؛ (۵) Thomas Osis: *The Kurds*، بیروت ۱۹۶۶ء؛ (۶) David Adamson: *The Kurdish War*، لنڈن ۱۹۶۴ء؛ (۷) *The Statesman's Year Book 1974-75*، مطبوعۂ لنڈن۔

(نذیر حسین)

کُرْدِستان: "کردوں کا ملک" اس نام کو * تاریخی اور نسلی دو حیثیتوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

(۱) تاریخی نقطۂ نظر سے کردستان کی اصطلاح بظاہر سلجوقوں نے اس صوبے کے نام کے طور پر وضع کی تھی، جس میں آذربیجان اور لرستان کے درمیان کے علاقے (سِنّہ، دِینَوَر، ہَمَدان، کِرمانشاہ وغیرہ) نیز زاگروس (Zagros) کے مغرب میں بعض ملحقہ علاقے (شِہْر زُور، خُفْتِیَان = کوئی سَنْجَق ؟) شامل تھے۔ کردستان کے صوبے کا صدر مقام شروع میں بَہَار تھا (ہَمَدان کے شمال مشرق میں واقع) اور بعد میں کَمْچَمال (Camčamāl) کا سلطان آباد (بِیسْتُون کے قریب) حَمْدُاللہ المُسْتَوفی نے نُزْہَۃُ القُلُوب میں اس کے سولہ اضلاع درج کیے ہیں (طبع Le Strange، ص ۱۰۸)۔

یہ مصنف مغربی کردستان کا ذکر "ولایت اَرْمَن و جزیرہ" (بشمول اَرْبِیل و عَمادیہ در مؤخرالذکر) کے نام سے بھی کرتا ہے۔ منگول عہد میں بالعموم اس پہاڑی خطے کے بارے میں جس میں ہکّاری بوھتان اور ارمنی Anti-Taurus واقع ہیں، ہمیں چندان معلومات حاصل نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ شروع میں کردستان کی اصطلاح دَرْسِیم کے علاقے کے لیے استعمال ہوتی ہو، کیونکہ شرف نامہ (۱ : ۱۶۳) کے مطابق سرکاری کاغذات (پروانجات و فرامین) میں، نیز خود کردوں کے یہاں کردستان کی اصطلاح خاص طور پر چِمِشْگَزَک کی جاگیر کے لیے مستعمل تھی، لیکن تیمور کے عہد میں آکر ظفر نامہ، (۱ : ۶۸۶) میں بِدْلِیس کے امیر کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ بلاد کردستان میں سب سے زیادہ اہم آدمی تھا۔ سلیم اوّل کی تاریخ میں (سلیم نامہ، قلمی نسخہ، Pers. Bibl.Nat: شمارہ ۲۸۵، ورق ۱۰۹)۔ اس کے مصنف کلیم ادریس نے لکھا ہے کہ تبریز سے واپسی پر

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

سلطان سلیم نے اسے "کردوں کے علاقے (بلاد اکراد) یعنی اُرمیہ اور اشتو سے لے کر آمد اور مَلاطیہ تک" سارے ملک کا دورہ کرنے کا حکم دیا، تاکہ سر زمین کردستان کے امرا اور حکام کی تالیف قلوب کی جائے اور ان سے جو معاہدے ہوے تھے اور انھیں جو امان دی گئی تھی اس کی تصدیق و توثیق کر دی جائے اس طرح یہ نام زیادہ تر استعمال ہونے لگا اور ترکی اور ایران میں یکساں طور پر اس کا اطلاق نظام جاگیرداری کے تحت میں کردوں کی جاگیروں پر کیا جانے لگا، دیکھیے نقشہ، در ظفر نامہ؛ اولیا چلبی: رحلۃ (Travels)، ۴: ۷۴-۷۵، کردستان دیاری - رفتہ رفتہ دیار بکر، وان، بغداد، ارز روم وغیرہ کے پاشا کردستان کے معاملات کو انجام دینے لگے (دیکھیے سامی بے: قاموس اعلام ۵: ۳۸۴) - انیسویں صدی کے وسط کے قریب انتظام حکومت سے متعلق اصطلاح "ولایت کردستان" لوای دیار بکر، مُش اور دُرسیم کے لیے استعمال ہونے لگی، لیکن عام طور پر ترکی سرکاری نام صدر مقامات کے ناموں پر مبنی رہے اور نسلی یا قومی حدود سے متعلق اصطلاحات کو نظر انداز کیا جاتا رہا (یَنی ترک، ۱۹۲۵ء، نمبر ۲۱ میں اصطلاح کردستان کے دائرۂ اطلاق پر مُکرمین خلیل بے کے مقالے سے راقم الحروف استفادہ نہیں کر سکا).

جہاں تک شروع کے یورپین نقشوں کا تعلق ہے، یہ بظاہر جہان نما، اور قدیم صوبۂ Corduene کی روایات اور شاید کورچیخ (Korčkaikh) کے متعلق ارمنی بیانات پر مبنی ہیں (دیکھیے ان کے نمونے Q' khanzadian : *Rapport sur l' Unité géographique de l' Armenie Atlas Histoirque* پیرس ۱۹۲۰ء؛ اور جغرافیائی تجزیہ، در Report : *of the Commission of Enquiry by the Leaque of Nations*, C, ۷، ۱۹۲۵ء، ۱۴۷ m، ۳۰۰، ۲۳ تا ۲۸، اور نقشہ نمبر ۳) [رک بہ کرد، "منشا و مولد"].

۲- اصطلاح کردستان کا جغرافیائی اطلاق خواہ کچھ بھی رہا ہو، یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ اس کا کرد قوم کے واقعی انتشار سے کوئی بھی تعلق نہیں - لفظ کردستان کا رائج العام مفہوم محض وہ علاقے ہیں جہاں کرد آباد ہیں، دیکھیے ایرانی اصطلاح "کردستان خراسان" جس سے مراد خراسان میں واقع کرد آبادیاں ہیں - حقیقت یہ ہے کہ جس سر زمین میں کردوں کی مستقل آبادی ہے وہ جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف پھیلا ہوا ایک خطۂ ارض ہے جس کی لمبائی تقریباً چھ سو میل (از لرستان تا مَلاطیہ) ہے اور چوڑائی جو اوسطاً ایک سو بیس سے ایک سو پچاس میل تک ہے، سب سے زیادہ (۲۵۰ میل) خط موصل وآرارات پر ہے (دیکھیے جہان نما، ص ۴۴۵ تا ۴۴۹).

۱۹۱۴ء سے پہلے کرد، ترکی، روس اور ایران کے مابین منقسم تھے - ماسکو اور ارزروم کے درمیان طے شدہ ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء کے معاہدے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ماوارے قفقاز کے کردوں کی اکثریت اب ترکی علاقے میں ہے - اس کے برعکس مسئلۂ موصل کے آخری تصفیے کی رو سے اس ولایت کے کرد ترکی سے جدا ہو گئے ہیں اور اب حدود عراق میں آباد ہیں، چنانچہ صورت حال اب یہ ہے.

(الف) ایران میں جہاں کے کوائف سب سے اچھی طرح معلوم ہیں، کرد نسل کے لوگ کرمانشاہ [رک بآں] اور سنّہ Senna [رک بآں] کے صوبوں لیز، آذربیجان کے جنوبی حصوں [رک بہ ساوج بُوق] اور بیجان کے ضلع میں آباد ہیں، علاوہ ازیں اضلاع اُرمیہ (خاص طور پر اشنو، مرگور، دشت، ترگور اور برادوست کے اضلاع)، سلماس [رک بآں] (ضلع سومائی اور ضلع چاہ ریق)، خوئی (ضلع قوتور، الند) اور

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ماکو (جہاں وہ آرارات کی ڈھلانوں پر رہتے ہیں) میں بھی کرد آباد ہیں۔ خراسان (قوچان، بجنورد اور درگز کے خوانین کے علاقے)، کرمان، فارس، شمالی لرستان، پشت کوہ، ورامین (نزد تہران؛ دیکھیے Brugsch : *Reise*، ۲ : ۹۶ء)، قزوین، منجیل (دیکھیے Rabino : *RRM* ؛ ۲۷ : ۲۵۹) وغیرہ میں کردوں کی نو آبادیات پائی جاتی ہیں۔ ایرانی کردوں کی مجموعی تعداد کا اندازہ پانچ لاکھ سے زائد نہیں۔

(ب) ترکی میں صورت حال یہ ہے کہ موجودہ زمانے (۱۹۲۷ء) میں یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ مختلف لوگوں کی جغرافیائی تقسیم پر جنگ کے مابعد اثرات کیا ہوئے، مثلاً روسی فوج کے مقابلے کردوں کا فرار، ارمنی آبادی کا وطن سے اخراج، جولائی مرگ کے نسطوریوں کا عراق کی سمت نقل وطن، درسیم، (۱۹۲۱ء) اور خرپوت و دیار بکر (۱۹۲۵ء) کے خلاف ترکوں کی تادیبی مہمات۔ Sir Mark Sykes نے جو نقشہ درج کیا ہے (*The Caliph's Last Heritage*، ص ۵۳۳)، جنگ سے پہلے ترکی میں کردوں کی تقسیم کا تقریباً صحیح منظر پیش کرتا ہے۔ کردوں کے بڑے مرکز عین "ترکی-ایرانی" سرحد کے ساتھ ساتھ واقع ہیں (بایزید، برگری، محمودیہ، الشق، گور اور شمدینان کے اضلاع)، عیسائیوں کے ساتھ ملے جلے کرد جھیل وان کے ارد گرد اور اس کے جنوب کے علاقے میں دریائے دجلہ تک آباد ہیں۔ دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے مابین ہم کردوں کو زیادہ تر اس خط کے شمال میں پاتے ہیں جو نیشابور (جزیرۂ ابن عمر کے نیچے) کو سمیساط (بالائے برچک) سے ملاتا ہے۔ مغرب کی جانب کرد خاصی تعداد میں دریائے فرات کے پار پائے جاتے ہیں (Ritter، ۱۱ : ۴۴)۔ بقول Trotter (۱۸۷۸ء) یہ جنوب اور مغرب میں خط دورگی۔ ارزروم۔ قارص (اریوان) تک آباد تھے۔ بدلیس کے جنوب اور مغرب کے علاقے میں، دیار بکر کو مشن سے جدا کرنے والے پہاڑوں میں اور اس دو شاخے میں جو دریائے فرات کے دونوں سر چشموں سے بنا ہے، کرد خاص طور پر بڑی تعداد میں موجود ہیں؛ تاہم اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ارزنجان اور دیار بکر کے درمیان بعض جگہ کرد اور بعض جگہ زازا آباد ہیں جو ایرانی نسل کے ہیں، لیکن ان کی جسمانی ساخت، زبان اور مذہب ان کو کردوں میں براہِ راست جذب نہیں ہونے دیتے۔ ارز روم کی بلند سطح مرتفع پر کہیں کرد اور کہیں ترک اور قفقاز سے آئے ہوئے مسلمان (چرکس، اوسیتہ (Ossetes) وغیرہ) بستے ہیں۔ یہ لوگ خاص طور پر ارزروم کے جنوب اور جنوب مغرب میں پائے جاتے ہیں۔ ان علاقوں میں جن کا الحاق زمانۂ حال میں ترکی سے ہوا ہے، کرد آرارات کی مغربی ڈھلانوں پر (سرسلی اور کغزمان کے ضلعوں میں) آباد ہیں۔ کرد نو آبادیاں مغرب کی سمت اقصائے کیلیکیا (Cilicia)، سیواس کے ضلع میں (قنگال، کوچ حصار، زرہ اور دورگی کی قضاؤں میں جہاں جنگ سے پہلے بیس ہزار کرد رہتے تھے)، انقرہ کے جنوب تک پائی جاتی ہیں (G. Perrot : *Les Kurdes* ؛ *de l'Haimanch Revue des Deux mondes*، ۲/۱ (۱۸۶۵ء) : ۶۰۷ تا ۶۳۱)؛ Alboltin : *Nowi Wostok*، ماسکو ۱۹۲۵ء، ۷ : ۱۱۶ میں مندرجہ اعداد و شمار کے مطابق ترکی میں کردوں کی تعداد پندرہ لاکھ ہے۔ ترکی مآخذ بظاہر (بادیہ نشین ؟) کردوں کے خیموں کا اندازہ ۹۶۰۰۰ کرتے ہیں، قبائل کی دیکھ بھال کے لیے جو محکمہ ہے (عشائر مدیریتی) اس کی مطبوعات ابھی تک مغربی یورپ میں دستیاب نہیں

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ہو سکیں .

(ج) العراق کے کرد (موصل کی سابق ولایت میں) موجودہ مردم شماری کے مطابق دس لاکھ کے لگ بھگ ہیں ۔ وہ لواے سلیمانیہ کے پورے علاقے میں آباد ہیں ۔ اربیل کی لواء میں ان کی خاصی اکثریت ہے اور کرکوک میں نمایاں اکثریت ۔ مجلس اقوام (League of Nations) کے تحقیقاتی کمیشن کے تیار کردہ نقشوں نمبر ۶ و ۸ میں نسلی کیفیت اور قبائل کی مہاجرت کا خاکہ پیش کیا گیا ہے (سی ۴۰۰، ایم ۱۴۷، ۱۹۲۵ء، ج ۷) .

(د) روسی ماوراے قفقاز میں اریوان اور قارص کے کردوں کی تعداد ۱۹۱۰ء میں سوا لاکھ تھی جس میں پچیس ہزار یزیدی بھی شامل تھے ۔ کردوں (یعنی کردی زبان بولنے والوں) میں سے صرف ایک قلیل تعداد ارمینیا کی سوویٹ جمہوریہ میں شامل ہے ۔ اس کے برعکس قدیم روسی مردم شماری میں Eliza Vetpol (= گنجہ) کی عملداری میں زنگزور، جوانشیر، جبرئیل اور آزیش کے کردوں کو جدا جدا شمار نہیں کیا جاتا تھا ۔ گنجہ کے یہ کرد (دیکھیے آران کردوں کی موجودگی کے بارے میں عرب مصنفین کی شہادت) اب آذربیجان کی سوویٹ جمہوریہ میں ایک الگ ضلع (Canton) میں مقیم ہیں جو ایزد Uyezd کہلاتا ہے، لیکن بظاہر ان کی زبان آذربیجان کی عام ترکی ہے (دیکھیے Cursin : *Azerbaidjanskiye Kurdi*، در *Izv. Kavk. Istor. Arkheol Instituta*، تفلس ۱۹۲۵ء، ج ۳) .

(ہ) جہاں تک شمالی شام کا تعلق ہے، جو کرد ولایت حلب (خاص طور پر کلیس میں) بہت عرصے سے آباد تھے، ان کی تعداد جنگ سے پہلے روسی سفیر Zimmermann کے بیان کے مطابق ایک لاکھ پچیس ہزار تھی (نیز دیکھیے Cuinet : ۳ : ۱۲۴؛ Hartmann : *Das Liwa Halab*، برلن ۱۸۹۴ء، ص ۸۳، ۹۲، ۹۵ تا ۹۶، ۹۸ تا ۱۰۰، اور ۱۰۵) ۔ *RMM* (۵۳ : ۳۱۷) کے مطابق فرانسیسی انتداب کے زمانے میں شام میں بیس ہزار کرد تھے (علویوں کے شمال اور بیلان میں) ۔ دمشق میں بھی کردوں کا ایک محلہ ہے ۔ سنجار کے کردوں کی نسبت جہاں کی انتظامی حالت پورے طور پر واضح نہیں ہے، [رک بہ یزیدی] .

(و) کرد مغرب [کذا، مشرق ؟] کی سمت بھی دور تک چلے گئے تھے، بلوچستان [رک بآں] میں ایک ممتاز کرد قبیلہ براہوئی مقامی باشندوں کے مابین آباد ہے اور اس قبیلے کے لوگ براہوئی زبان بولتے ہیں ۔ زمانۂ حال کی تحقیقات (Tedesco) نے کردی اور بلوچی زبانوں کے مابین ایک گونہ مناسبت کا پتا چلایا ہے ۔ افغانستان کے ضمن میں شرف نامہ (۱ : ۳۲۷) میں چگنی قبیلے کے بعض افراد کے غرجستان چلے جانے کا ذکر موجود ہے ۔ Morgenstierne : *Report on a Linguistic Mission to Afghanistan*، اوسلو، ۱۹۲۶ء، ص ۵ کے نزدیک ہرات کے مغرب میں کردی زبان بولنے والے کچھ لوگوں کی موجودگی (مغرب) کا امکان ہے .

مآخذ : [رک بہ ارمینیا؛ ساوج بلاق ؛ سنہ، شہرزور ؛ شکاک ، شمدینان اور سلیمانیہ] ۔ Lerch کی تصنیف *Izsledovania* (سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۶ء، ۱ : ۵ تا ۱۹) میں کردستان سے متعلق ۱۸۵۶ء تک کے ماخذ کی ایک بہت عمدہ فہرست درج ہے (جرمن ترجمے میں یہ فہرست شامل نہیں ہے) .

ان تمام ملکوں کا عام بیان جہاں ترک آباد ہیں، صرف Ritter کی قابل یادگار تصنیف *Erdkunde* میں موجود ہے، ۸ (۱۸۳۸ء) : ۳۹۲ تا ۴۰۰ (خراسانی کرد) ؛ ۹

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

(۱۸۴۰ء) : ۳۱۲ تا ۷۶۲، ۱۰۰۹ تا ۱۰۴۸ (ایرانی کردستان)، ۱۰ (۱۸۴۳ء): ۶۹۰ تا ۷۳۴، ۷۶۹، ۱۰۰۸ (دجلہ و فرات کے سرچشمے)، ۱۱ (۱۸۴۴ء): ۱۲۸ تا ۱۴۶ (مغربی کرد)، ۹۰۷، ۷۴۹، ۱۰۰۷، ۱۰۲۶ وغیرہ۔

ان دیگر تصانیف میں سے جو ۱۸۵۷ء کے بعد شائع ہوئی ہیں اور جو اوپر مذکور نہیں ہوئیں، ہم مندرجۂ ذیل کا ذکر کر سکتے ہیں، (۱) Sandreczki : *Reise nach* ، Stuttgart ، ۱۸۵۷ء؛ (۲) F. Jones : *Memoirs .....on the Journey to the Frontier of Turkey and Persia*، بمبئی ۱۸۵۷ء؛ (۳) O. Blau : *Die Stämme des n. o. Kurdistans*، *ZDMG.*، ج ۱۲ (۱۸۵۸ء)؛ (۴) Bianchi : *Viaggi in Armenia*، میلان ۱۸۶۳ء؛ (۵) Strecker : *Das obere Zab-Ala Gebiet*، *Peterm. Mitt.*، ۱۸۶۳ء، ص ۲۵۷ تا ۲۶۲؛ (۶) Blau : *Vom Urmia-See nach d. Wan-See*، *Pet. Mitt.*، ۱۸۶۳ء؛ (۷) Auriema : *Reise routen in kurdistan*، *Pet. Mitt.*، ۱۸۶۳ء؛ (۸) Schaefli : *Beitrage z. Ethnographie Kurdistans*، *Pet. Mitt.*، ۱۸۶۳ء؛ (۹) Taylor : *Travels in Kurdistan*، *J.R.G.S.*، ۱۸۶۵ء، ۳۵ : ۲۱ تا ۵۵؛ (۱۰) Taylor : *Journal of a Tour*، *JRGS.*، ۱۸۶۸ء، ۳۸ : ۲۸۱ تا ۳۶۱؛ (۱۱) Marsh : *The Tenessean* (S.A. Rhea) *in Persia and Kurdistan*، فلاڈلفیا ۱۸۶۹ء؛ (۱۲) Millingen : *Wild Life among the Koords*، لنڈن ۱۸۷۰ء؛ (۱۳) Lyclama a Nijehold : *Voyage en Russie, etc.*، پیرس ۱۸۷۲ تا ۱۸۷۵ء؛ (۱۴) Cirikow : *Putewoi dnewnik Zap. Kawk. Otd. Geogr. Obshc*، ج ۹، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۵ء؛ (۱۵) Thielmann : *Streifzüge im Kaukasus*، لائپزگ ۱۸۷۵ء؛ (۱۶) Cernik : در *Pet. Mitt.*، ۱۸۷۶ء ضمیمہ، عدد ۴۵؛ (۱۷) خورشید آفندی : سیاحت نامۂ حدود، قسطنطنیہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء)؛ روسی ترجمہ بہ پیٹرزبرگ ۱۸۷۷ء؛ (۱۸) Col. Carr : *The Kurdistan Mountain Ranges*، *Journ. R. United Service Institution*، ۱۸۷۹ء، ج ۲۲، ص ۱۳۵ تا ۱۸۴؛ (۱۹) Mac-Coan : *Our New Protectorate*، لنڈن ۱۸۷۹ء؛ (۲۰) Tozer : *Turkish Armenia*، لنڈن ۱۸۸۱ء؛ (۲۱) Ellis : *On a Raft through the Desert*، لنڈن ۱۸۸۱ء؛ (۲۲) H. Schindler : *Reisen in n-w. Persien*، *Zeit. Gesell. Erd. Berl*، ۱۸۸۲ء؛ (۲۳) Wünsch : *Reise in Armenien*، *Mitt. Geogr. Gesell. Wien*، ۱۸۸۳ء، ۲۶ : ۳۰۹ تا ۳۱۲، ۳۸۷ تا ۳۹۶، ۵۱۳ تا ۵۲۰؛ (۲۴) Puchstein : *Reise in Kurdistan*، *Sitzb. Berl. Akad.*، ۱۸۸۳ء؛ (۲۵) Clayton : *The Mountains of Kurdista*، (*Alpine Journ.*) لنڈن ۱۸۸۷ء، ج ۱۳؛ (۲۶) Binder : *Au Kurdistan*، پیرس ۱۸۸۷ء؛ (۲۷) Schulze : *Eine Reise n. Kurdistan*، *Das Ausland*، Stuttgart، ۱۸۸۸ء، ج ۶۱؛ (۲۸) M. S. Bell : *Reconnaissances in Mesopotamia*، شملہ ۱۸۸۹ء؛ (۲۹) Wünsch : *Die Quelle d. westl. Tigrisarmes*، *Mitt. Geogr. Gesell Wien*، ۱۸۸۵ء، ج ۲۸؛ (۳۰) Wünsch : *Das Quelle ngebiet d. ostl. Tigrisarmes*، *Pet. Mitt.*، ۱۸۸۹ء، ص ۱۱۵ تا ۱۱۹، ۱۳۹ تا ۱۴۱؛ (۳۱) Wunsch : *Die Landschaften Schirwan Chisan und Tatik*، *Mitt. Geor. Gesell. wien*، ۱۸۹۰ء؛ (۳۲) Bishop : *Journey in Persia*، لنڈن ۱۸۹۱ء؛ (۳۳) Cuinet : *La Turquie d' Asie*، پیرس ۱۸۹۱ء، ج ۲؛ (۳۴) *Pissons Reise in Persisch-Kurdistan*، *Globus*، ج ۶۱، عدد ۸، ص ۱۲۲؛ (۳۵) Muller-Simonis : *Du Caucase au Golfe Persique*، Hyvernat، پیرس ۱۸۹۲ء؛ (۳۶) Curzon : *Persia*، لنڈن ۱۸۹۲ء؛ (۳۷) D. Butyka : *Das enemalige Wilayet* اشاریہ؛ (۳۸) Maunsell : *Dersim Mitt. Geogr. Gesell. Wien*، ۱۸۹۲ء، ج ۳۵ : ۱ تا ۸۰؛ (۳۹) Maunsell : *Kurdistan Geogr. Journ.*، ۱۸۹۴ء؛ *Geography of*

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

(۴۰) Al dershot ،*Eastern Turkey in Asia* ۱۸۹۴ء؛ (۴۱) Sir Charles Wilson : *Hand-book for Travellers in Asia Minor*، لنڈن ۱۸۹۵ء؛ (۴۲) Morgan : *Mission Scient. en Perse Etudes géogr*، پیرس ۱۸۹۵ء، ج ۲ (اور ایرانی کردستان کے وسطی حصے کا نقشہ)؛ (۴۳) S. G. Wilson: *Persian life and customs*، نیویارک ۱۸۹۹ء؛ (۴۴) Maunsell: *Eastern Turkey in Asia, Scot. Geog. Mag.*، ۱۲ : ۲۲۵ تا ۲۴۱؛ (۴۵) Morgan : *Mission Scient. Recherches archéol.*، ۱۸۹۶ء، ج ۱ و ۱۸۹۷ء، ج ۲؛ (۴۵) Lord Warkworth : *Notes from a Diary* لنڈن ۱۸۹۸ء؛ (۴۶) Oppenheim : *in Asiat. Turkey Vom Mittelmeer, etc.*، برلن ۱۸۹۹ تا ۱۹۰۰ء، اشاریہ؛ (۴۷) Earl Percy : *Highlands of Asiat. Turkey* لنڈن ۱۹۰۱ء؛ (۴۸) Lynch : *Armenia*، لنڈن ۱۹۰۱ء، اشاریہ؛ (۴۹) Maunsell : *Central Kurdistan* ،*Geogr. Journ.* ۱۹۰۱ء؛ (۵۰) K. N. Smirnow : *Poyezdka, v severn. Kurdistan Izw. Kawk, Otd. Geogr. Obshe*، تفلس ۱۹۰۳ء، ج ۱۷، عدد ۳؛ (۵۱) Lipman : *Kurdistan ،The Jewish Encycl.*، ۱۹۰۳ء، ۷ : ۵۸۵ تا ۵۸۶؛ (۵۲) Grenard : *Kurdistan et Arménie la Géogr.* ۱۹۰۳ء، ۹ : ۳۸۳؛ (۵۳) Sir Mark Sykes : *Dar-ul-Islam*، لنڈن ۱۹۰۴ء؛ (۵۴) Wiedemann : *Die Kurden in Nord-Mesopot., Asien* ۱۹۰۴ء، ۳ : ۶ تا ۹؛ (۵۵) Mayewski : *Voyenno- Statist. opis. Wan. i Bitlis Wilyaet*، تفلس ۱۹۰۴ء، پیرس ،*La Perse d' aujourd' hui* : Aubin (۵۶) *Poyezda v Maku,* : Minorsky (۵۷)؛ ۱۹۰۸ء، ص ۳۳۳؛ *Mater. po Wostoku* ،سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۹ء، ۱ : ۱۸ تا ۲۴، ۵۱ تا ۵۳؛ (۵۸) Dickson : *Journeys in Kurdistan Geogr. journ.*، اپریل ۱۹۱۰ء، ص ۳۵۷ تا ۳۷۹؛ (۵۹) Grothe : *Wanderungen in Persien*، برلن ۱۹۱۰ء؛ (۶۰) Price : *A Journey through Turk. Arm. and Pers Kurd., J. Manchester G. Soc.*، ۱۹۱۴ء، ۳۰ : ۴۵ تا ۴۶؛ (۶۱) Wigram : *The Cradle of Mankind*، لنڈن ۱۹۱۴ء؛ (۶۲) *Materiali po Wostoku*، سینٹ پیٹرز برگ، ۱۹۱۵ء، (*Minorski* و *Orlow* وغیرہ کے سفر نامے)؛ (۶۳) Sir Mark Sykes : *The Caliph's Last Heritage*، لنڈن ۱۹۱۵ء، ص ۲۹۸ تا ۳۸۸؛ (۶۴) Minorsky : *Kurdi*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۵ء؛ (۶۵) Iyas : *Poyezkda po Sewer.* ،سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۵ء؛ (۶۶) *Kurdistanu Turets Kôpers razgran. Izw. Russ.* : V. Minorsky : *Geogr. Obshe.*، ۱۹۱۶ء، ص ۵۲؛ (۶۷) Hubbard : *From the Gulf to Ararat*، لنڈن ۱۹۱۶ء؛ (۶۸) *The case of Kurdistan* : A. Moore، اخبار ٹائمز بابت نومبر ۱۵، ۱۷، ۱۸، ۱۹۱۹ء؛ (۶۹) Kenneth Mason : *Central Kurdistan Geogr. Journ.*، دسمبر ۱۹۱۹ء؛ (۷۰) *The Road from Boghdad to Baku* : Napier، اخبار مذکور، جنوری ۱۹۱۹ء؛ (۷۱) Miss Stevens : *By Tigris and Euphrates*، لنڈن ۱۹۲۳ء؛ (۷۲) لاہوتی خان : *Kurdistan i Kurdi Nowu Wostok*، ماسکو ۱۹۲۳ء، ۳ : ۵۸ تا ۷۱؛ (۷۳) Hay : *Two years in Kurdistan*، لنڈن ۱۹۲۴ء؛ (۷۴) Ryder : *The demarcation of the Turco-Persian Boundary* در *Geogr. Jurn.*، ستمبر ۱۹۲۵ء، ص ۲۲۷ تا ۲۴۲؛ (۷۵) Klötzel : *Die Strasse d. Zehntausend*، برلن ۱۹۲۶ء۔

(V. MINORSKY)

الکُرّاز : (=دُورک، دُورک؛ سپینی و پُرتگالی Alcarazas، Alcarrazas)، تنگ گلے کا مٹی کا برتن یا گھڑا جس میں پانی ٹھنڈا رکھا جاتا ہے۔ *

(C.F. SEYBOLD)

کَرّامیہ : ایک فرقہ جو ابو عبداللہ محمّد بن کَرّام (یا کِرام یا کِرّام) کے نام سے منسوب ہے، *

www.besturdubooks.wordpress.com

(دیکھیے میزان الاعتدال، ۳: ۱۲۷ اور ان کے دور تر اسلاف کے لیے ملاحظہ ہو ابن الاثیر: الکامل، ۷: ۱۴۹) - السجستانی کے خاصے مفصل حالات السمعانی (الانساب، ۴۷۶ ب تا ۴۷۷ الف) میں ملتے ہیں - اس کے بیان کے مطابق یہ بنو نزار سے تھا، موضع زرنج میں پیدا ہوا، سجستان میں پرورش پائی، اس کے بعد خراسان چلا گیا، جہاں مشہور زاہد احمد بن حرب (م - ۲۳۴ھ) کے درس میں شریک ہوا - بلخ میں اس نے ابراہیم بن یوسف الماکیانی (م ۲۵۷ھ)، مرو میں علی حجر (م ۲۴۴ھ) سے اور ہرات میں عبداللہ بن مالک بن سلیمان سے استفادہ کیا - وہ احمد بن عبداللہ جوباری (م ۲۴۷ھ) اور محمد بن تمیم فریانانی کے واسطے سے بہت سی احادیث روایت کرتا تھا - یہ دونوں روایت حدیث میں متہم تھے - مکے میں پانچ سال بسر کرنے کے بعد ابن کرام سجستان واپس آیا اور یہاں اس نے اپنی ساری املاک فروخت کر دیں - یہاں سے وہ نیشاپور چلا گیا جہاں کے عامل محمد بن طاہر بن عبداللہ نے اسے (تاج العروس کی رو سے دو موقعوں پر) قید کر دیا - ۲۵۱ھ میں جب اسے رہائی نصیب ہوئی تو وہ نیشاپور چھوڑ کر بیت المقدس روانہ ہوگیا، جہاں اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کرکے ۲۵۵ھ میں وفات پائی - وہاں اس کے پیروؤں کی قیام گاہ کا، جو "خانقاہ" کہلاتی ہے، ذکر ایک سو سال بعد مطہر بن طاہر (البدء و التاریخ، طبع Huart، ۵: ۱۴۹) اور المقدسی نے کیا ہے۔

(۲) عقائد: ابن کرام کے اقوال و افکار ایک کتاب میں مذکور تھے جس کا نام عذاب القبر تھا - ان میں سے بعض اقوال الفرق بین الفرق، ص ۲۰۲ تا ۲۱۴، میں دیے گئے ہیں - اس میں اس فرقے کا جس کے پیروؤں سے مصنف کے مناظرے ہوئے تھے، تفصیلی ذکر ملتا ہے - اس کا سب سے بڑا دینی عقیدہ جس کے باعث اس کے فرقے کا شمار مشبہہ میں ہونے لگا، یہ تھا کہ ذات الٰہ ایک جوہر ہے - اس کے بعض پیروؤں نے جوہر کے بدلے جسم ہی کہ دیا، گو ان کے نزدیک یہ جسم اعضائے انسانی پر مشتمل نہیں اور عرش سے ملا ہوا (مماسۃ، جس کے بدلے بعد میں زیادہ نرم لفظ ملاقات مستعمل ہو گیا) ہے جو "فضا (Space) میں واقع ہے - بظاہر یہ عقیدہ قرآنی الفاظ "عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی" سے مستنبط ہے - درحقیقت ابن کرام کے بقیہ اعتقادی مسائل میں یہی سعی کار فرما نظر آتی ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات اور ارسطاطالیسی فلسفے کے بعض مسائل میں تطبیق دی جائے، خصوصاً وہ مسائل جن کی بنا مسئلۂ امتیاز جوہر و عرض اور امتیاز حرکت و قوۃ پر ہے - اس طرح اس کے پیرو اس نظریے پر قائم رہ سکے تھے کہ خدا کلام کرنے سے قبل متکلم تھا اور عبادت کرنے والوں کے معرض وجود میں آنے سے قبل بھی اس کی عبادت کی جا سکتی تھی - مسئلۂ قدم عالم کو قرآن کے مسئلۂ خلق کے مطابق ثابت کرنے کے لیے دقیق اور غامض دلائل کام میں لائے گئے - ابن کرام یہ مانتا تھا کہ خدا بعض اعراض کا مورد ہے، مثلاً ارادہ، ادراک، کلام، مماسۃ وغیرہ - ان اعراض پر اسے قدرت حاصل ہے، لیکن اسے عالم اور موجودات عالم پر قدرت نہیں ہے، کیونکہ وہ اس کے ارادے سے نہیں بلکہ لفظ کُنْ سے خلق ہوئے ہیں - اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ کُنْ فَیَکُوْن میں امر و مضارع کے صیغے اپنے اصلی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔

ان کا ایک اور عقیدہ جس کا حوالہ اکثر کتب کلام میں ملتا ہے، یہ ہے کہ ایمان کا مطلب شہادتین کو ایک بار زبان سے ادا کرنا ہے

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

اور اس میں نہ تصدیق قلبی کو دخل ہے اور نہ عمل کو۔ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ جو مرجئہ کے بنیادی عقیدے سے ملتا جلتا ہے، ابن کرام سے قبل کسی نے پیش نہیں کیا تھا (ابن تیمیہ: کتاب الایمان، قاہرہ ۱۳۲۵ھ، ص ۵۷، جہاں اس عقیدے کا ابطال کیا گیا ہے)۔ اس کے بقیہ افکار و نظریات جو الفرق میں دیے گئے ہیں، مائل بہ اعتدال نظر آتے ہیں، چنانچہ عصمت انبیا کے لیے بعض حدود متعین کی گئیں ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے (کسی حد تک ابن طفیل کے انداز میں) کہ جن لوگوں تک پیام نبوت نہیں پہنچا، انہیں بھی ارشادات نبوی پر ایمان لانا چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ ایک ہی زمانے میں دو امام بھی ہو سکتے ہیں اور ہر ایک کا حق ہے کہ اس کے متبعین اس کی اطاعت کریں، خواہ ان دونوں اماموں میں اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔ فروع کے بارے میں اس کی بدعتیں کچھ اس قسم کی تھیں کہ ان سے قانون شریعت میں زیادہ لچک پیدا ہو گئی۔

(۳) فرقۂ کرامیہ کی تاریخ: معلوم ہوتا ہے کہ کرامی عقیدہ زیادہ تر خراسان میں پھیلا اور ۳۷۰ھ میں الفرق کے مصنف نے سامانی سپہ سالار محمد بن ابراہیم بن سمجور کے سامنے اس فرقے کے ایک رکن سے مناظرہ کیا۔ اس فرقے کو سبکتگین شاہ غزنہ کی حمایت حاصل تھی، کیونکہ وہ ابو بکر اسحٰق بن محمشاذ (م ۳۸۳ھ) کا، جو اس کے زمانے میں کرامیوں کا امیر تھا۔ اس کے زہد و تقوٰی کی وجہ سے بہت احترام کرتا تھا۔ اسی ابو بکر کی بابت کہا گیا ہے کہ اس نے پانچ ہزار ذمیوں کو مشرف باسلام کیا تھا۔ اسی کے بیٹے محمد نے محمود بن سبکتگین کو باطنیوں پر سختی اور تشدد کرنے پر اکسایا۔ اس واقعے کی صدائے بازگشت صوفی ابو سعید کی سوانح حیات (ص ۳۵۷ تا ۴۰۰، طبع Jhukowski ۱۸۹۹ء، ۱: ۸۴ تا ۹۱) میں سنائی دیتی ہے، جہاں بیان کیا گیا ہے کہ اسحٰق بن محمشاذ نے قاضی سعید (حنفی) سے مل کر صوفی موصوف کے خلاف متحدہ محاذ بنایا تھا۔ اس وقت نیشاپور میں کرامیوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔ بہرحال ۴۰۳ھ میں قاضی مذکور نے جو حج کر آیا تھا اور جس پر خلیفہ القادر کی نگاہ التفات تھی، غزنہ میں محمود کے سامنے کرامیہ کے الحاد کی شکایت کی۔ محمد بن اسحٰق کرامیہ عقائد سے منکر ہو گیا اور جو لوگ اسے علی الاعلان مانتے تھے انہیں سزا دی گئی۔ پھر بھی نیشاپور میں بہت سے لوگ اس پر قائم رہے۔ ابن الأثیر کے ہاں ہمیں ایک عوامی جنگ کا ذکر ملتا ہے جو ۴۸۸ھ میں شہر نیشاپور میں ہوئی تھی۔ اس میں ایک طرف کرامی تھے اور دوسری طرف حنفیوں اور شافعیوں کی متحدہ طاقتیں۔ ان جماعتوں کے رہنما محمود کے زمانے کے شیوخ کی اولاد میں سے تھے۔ یاقوت نے (بذیل مادۂ بجستان) ایک کرامی مبلغ کا ذکر کیا ہے، جس نے چوٹی صدی ہجری کے وسط میں نیشاپور کے لوگوں میں بڑا رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (م ۵۶۱ھ؛ غنیۃ، قاہرہ ۱۲۸۸ھ، ۱: ۸۱) نے لکھا ہے کہ ان کے زمانے میں بھی کرامیہ کی ایک بڑی تعداد خراسان میں موجود تھی۔ فخرالدین الرازی (م ۶۰۶ھ؛ اساس التقدیس، قاہرہ ۱۳۲۸ھ، ص ۹۶ تا ۹۸) کا بظاہر یہ خیال ہے کہ وہ اس کے زمانے تک موجود تھے، تاہم قرین قیاس یہ ہے کہ جب چنگیز خان کے فوجی سرداروں نے خراسان کے باشندوں کا قتل عام کیا تو اس فرقے کی بھی درحقیقت جڑ کٹ گئی۔ جب زمانۂ مابعد کے مصنفین ان کے عقائد کا حوالہ دیتے ہیں (مثلاً ابن تیمیہ اور مواقف کا مصنف) تو غالباً وہ

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

اپنی معلومات گزشتہ زمانے کی تصنیفات سے اخذ کرتے ہیں .

(۴) اس فرقے سے متعلق تصنیفات : الفرق میں لکھا ہے کہ یہ فرقہ تین شاخوں میں منقسم تھا، لیکن ان کے درمیان باہمی روا داری تھی - یہ شاخیں حقّاقیہ، طرائقیّہ اور اسحاقیّہ کے نام سے مشہور تھیں۔ الشہرستانی نے ان کے بارہ ضمنی فرقوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے چھے کا اس نے نام لیا ہے، یعنی اسحاقیّہ (مذکورۂ بالا) عبدیّۃ، نونیّۃ، زُرَیبیۃ، واحدیۃ اور ہیصمیّۃ۔ ان میں سے پہلا تو بلاشبہہ اسحٰق سے منسوب ہے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے اور آخری ایک شخص محمّد بن الہیصم سے جسے المیزان میں اس فرقے کا متکلم کہا گیا ہے . معلوم ہوتا ہے کہ ان ضمنی فرقوں کے بانیوں نے جن تصنیفات میں اپنے نظریات پیش کیے تھے، وہ عوام میں زیادہ پھیل نہ سکیں - بیان الادیان کا مصنف (م - ۴۸۵ھ؛ Schefer : *Chrestomathie Persane*، ۱ : ۱۵۲ متن)، اگرچہ غزنہ میں رہتا تھا، لیکن وہ محض مرکزی فرقے کے نام ہی سے واقف تھا اور عبدالقادر (محل مذکور) نے کرّامی مصنفین کا نام پیش کرتے ہوئے ہر جگہ غلط نام لکھا ہے - بانی فرقہ کی تصنیف عذاب القبر کا پتا بھی صرف ان اقوال سے چلتا ہے جو الفرق میں درج ہیں .

مآخذ : تصنیفات مذکورۂ بالا کے علاوہ دیکھیے: (۱) تاریخ یمینی، دہلی ۱۸۴۷ء، ص ۴۲۹ ببعد، قاہرہ ۱۳۸۶ھ، ۲ : ۳۱۵ ببعد؛ (۲) المقریزی : الخطط، ۲ : ۳۵۷؛ (۳) Van Vloten، در *Actes du II^e Congres int. d. Orientalistes*، پیرس ۱۸۹۹ء، فصل ۳، ص ۱۱۴؛ (۴) Horten : *Die philos. Systeme*، ص ۳۴۰ ببعد؛ (۵) Barthold : *Tü kestan*، ص ۳۰۶ .

(D. S. MARGOLIOUTH)

کرسون : (قدیم Cerasus) نقشوں میں Kerassounde؛ ایک قصبہ اور بندرگاہ جو ایشیائے کوچک میں بحیرۂ اسود کے کنارے واقع ہے - کرسون طریزون کی سنجاق اور ولایت کی ایک قضا کا صدر مقام ہے اور شہر طریزون سے ۷۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے - کل آبادی بارہ ہزار ہے (نصف مسلمان اور نصف یونانی کلیسائے قدیم کے پیرو اور ارمنی ہیں) - یہ قصبہ ایک پہاڑی راس کے سرے پر آباد ہے - ماہر نباتات Tournefort کے بیان کے مطابق ابھی تک وہاں شاہ دانہ (Cherries) کے درختوں کا ایک جنگل ہے جس کی وجہ سے یہ قصبہ اس نام سے موسوم ہوا تھا کیونکہ یہیں سے Lucullus نے شاہ دانہ یورپ میں درآمد کیا تھا - اس ذریعۂ آمدنی کی جگہ اب گری‌دار میووں (nuts) (ساٹھ لاکھ پونڈ سالانہ پیداوار) اور پھلیوں (Beans) (دس لاکھ اوقہ = اٹھائیس لاکھ پچیس ہزار پونڈ سالانہ) کی برآمد نے لے لی ہے - قدیم زمانے کی فصیل، نیز ایک قلعے اور شہر کے ایک دروازے کے کھنڈر موجود ہیں - کچھ فاصلے پر مدور تماشا گاہ (ایمفی تھیٹر) کے بقیہ آثار نظر آتے ہیں - قصبے کے شمال میں ایک بحری پشتے (Mole) کے کھنڈر ہیں، جنھیں بالکل معمولی خرچ سے صاف کروا کے یہ جگہ بندرگاہ بنائی جا سکتی ہے، جس کے اندرون ملک کے علاقوں کی پیداوار کو برآمد کرنے میں آسانی ہو جائے گی - اس قصبے میں ۱۱ مسجدیں، ایک تکیہ ۹ یونانی گرجا اور ۲ ارمنی گرجا موجود ہیں - اس میں سپاہیوں کے لیے بارکیں اور ایک اسلحہ خانہ بھی ہے - Xenophon نے جس Kerasos کا ذکر کیا ہے وہ کرسون درے کی وادی میں واقع تھا - موجودہ قصبہ اس شہر کے محل وقوع پر آباد ہے جسے Pontus کے بادشاہ Mithradates ہفتم کے دادا فارنے سس Pharnaces اوّل نے بنایا تھا اور اس کا نام اپنے نام پر فرنیشیا Pharnaceia رکھا تھا .

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کرسون کی قضا میں ۱۳۸ گاؤں اور ۴ ناحیے ہیں؛ یہاں معتدل بحری موسم رہتا ہے۔ اس کے پہاڑ جو اصلاً آتش فشاں ہیں، اس ضلع کے تقریباً نصف حصے پر پھیلے ہوئے ہیں اور اب ان پر جنگل چھا گئے ہیں۔ یہاں کے ساحلی باشندوں کا پیشہ ماہی گیری ہے اور اندرون ملک کے رہنے والے کان کنی کرتے ہیں (کانوں سے نقرہ دار سیسا (Argentiferous Lead) لوہا، تانبا، اور سرمہ نکلتا ہے)، اس قضا کی کل آبادی اسی ہزار (ساٹھ ہزار مسلمان، بیس ہزار یونانی کیساے قدیم کے پیرو) نفوس پر مشتمل ہے۔

مآخذ : (۱) علی جواد : جغرافیہ لغاتی، ص ۶۵۸؛ (۲) V. Cuinet : *Turquie d' Asie*، ۱ : ۷۳ ببعد؛ (۳) Ch. Texier : *Asie Mineure*، ص ۶۱۹، عمود ۱.

(Cl. HUART)

کُرسی : ایک معروف عربی لفظ؛ (اس کی آرامی شکل : کُرسِیا بمعنی تخت (اور عبرانی : کِسّہ؛ Nöldeke : *Mandäische Grammetik*، ص ۱۲۸؛ S. Fraenkel : *Die Vocabulis Peregrinis*، ص ۲۲)، یہ لفظ قرآن مجید میں صرف دو دفعہ آیا ہے (۲ [البقرۃ] : ۲۵۵؛ ۳۸ [ص] : ۳۴) - پہلی جگہ جس آیت میں یہ لفظ وارد ہوا ہے اس کا نام آیۃ الکرسی ہو گیا ہے۔ اس میں اشارہ خدائے تعالیٰ کے تخت کی طرف ہے جس کی وسعت آسمان اور زمین پر حاوی ہے۔ [کرسی سے مراد علم الٰہی لی گئی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہی معنی منقول ہیں اور متعدد صحابہ نے ان کی پیروی کی ہے۔ کرسی کے دوسرے معنی قدرت و حکومت کے بھی ہیں (الکشاف)] - دوسری عبارت میں حضرت سلیمانؑ کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تخت کے لیے دو لفظوں، عرش اور کرسی، کے استعمال کے بارے میں مفسرین میں اختلاف رائے رہا ہے۔ بعض کے خیال میں کرسی وہ چوکی ہے جو تخت کے آگے بچھی ہوتی ہے جس پر بادشاہ اپنے پاؤں رکھتا ہے۔ دیکھیے الطبری : التفسیر، ۵ : ۳۹۸، ۳۹۹، مطبوعہ دارالمعارف، قاہرہ) بحالیکہ بعض نے اس کو محض عرش کا مرادف تصور کیا ہے (الحسن البصری، در کتاب مذکور) - دوسری آیت میں جس طرح اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے، یعنی "ایک تخت جو بیٹھنے کے کام آتا ہے" - اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں یہ عرش کا مرادف ہے۔

ایک مربع شکل کی بلند چیز کا تصور (جو لفظ عرش کا بھی اصلی مفہوم ہے) ان سب مختلف معانی میں مضمر ہے جو اس لفظ نے اختیار کیے ہیں؛ چنانچہ کسی مستطیل کی چار اطراف کو جن کا مقصد کسی لفظ کے حروف یا کچھ کلمات کا احاطہ کرنا ہوتا ہے اس نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فارسی میں ان چار اطراف کو خطوط کرسی کہا جاتا ہے اور خود اس مستطیل کو کرسی بندی (Huart : *Calligraphes*، ص ۳۵۲) - ایرانی اس لفظ کو ایسے چوکھٹے کے لیے استعمال کرتے ہیں جس پر اون یا نمدے کا ایک قالین تان دیا جاتا ہے اور اس کے نیچے ایک انگیٹھی رکھ دی جاتی ہے۔ جاڑے کے موسم میں ٹانگوں کو گرمائی پہنچانے کے لیے انھیں اندر کی طرف قالین کے نیچے پھیلا دیتے ہیں (ترکوں کا "تَنْدِر" Polak : *Persin*، ۱ : ۶۵؛ Fraser، ۲ : ۱۸۸) - عرب اس نام کا اطلاق مندرجۂ ذیل اشیا پر کرتے ہیں : مکّے میں ایک قسم کی سیڑھی یا صندلی، یعنی چار (آج کل چھے) پہیوں کا ایک متحرک زینہ جس میں نو سیڑھیاں ہوتی تھیں اور جسے کعبے کی دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا جاتا تھا اس طرح کہ اس کا اوپر کا سرا کعبے کی چوکھٹ کے برابر آ جاتا تھا (ابن جبیر : الرحلۃ، ص ۹۱؛ ابن بطوطہ، ۱ : ۳۰۹؛

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Dozy : *Supplement*، ۲ : ۴۵۵)؛ رحل، جس پر قرآن مجید رکھا جاتا ہے (المقری، ۱ : ۴۰۴)؛ اصطرلاب کا ایستادہ (اسٹینڈ)؛ منجنیق کی گاڑی؛ تین یا چار آدمیوں کے لیے ایک پشت دار نشست؛ ایک میز؛ جس پر کوئی کھانے کا برتن رکھ دیا جاتا ہے (Lane : *Modern Egyptians*، ۱ : ۱۹۵)؛ ایک ایستادہ، جس پر رات کے وقت عمامہ اتار کر رکھ دیا جاتا ہے (کرسیّ العمامہ، Dozy : *Vetements*، ص ۳۴۳، عدد ۱؛ Lane : *Modern Egyptians*، ۱ : ۵۰، ۲۲۱)؛ ایک ہولڈر، جس میں کسی لوک دار چیز کا نیچے کا سرا لگا دیا جاتا ہے (*J.A.*، ۱۸۵۰ء، ۱ : ۲۵۱)؛ طنبور بجانے کی مضراب (*Description de l' Egypte*، ۱۳ : ۲۵۱)۔

مراکش کے لوگ چوکور یا تکونی چاندی کی ڈبیوں (لاکٹ) کو، جنھیں وہ ہار میں آویزاں کرکے گلے میں پہنتے ہیں، ان کی شکل کی مناسبت کی بنا پر اس نام سے پکارتے ہیں (Dozy و Engelmann : *Glossaire des mots espagnole*، بذیل مادّہ؛ Beaussier، ص ۵۸۴)۔ چقماق سے چلنے والی بندوق کے گھوڑے کی ٹوپی اور رنجک دان کے سہارے کو بھی کرسی کہا جاتا ہے؛ نیز انگوٹھی کا وہ حصہ جس میں نگ جڑا جاتا ہے؛ جہاز رانی کی اصطلاح میں وہ نشست جہاں سے جہاز کی رہنمائی کی جاتی ہے (Breaussier، محل مذکور)؛ ایک خاص شکل کی نشست جس پر وضع حمل کے وقت عورت بیٹھ جاتی ہے (کرسی الولادۃ) (Lane، ۲ : ۲۷۵)۔ مجازاً یہ لفظ کسی سلطنت کے پائے تخت، بادشاہی محل، کسی بطریق یا اسقف کی جائے قیام کے لیے استعمال ہوتا ہے (Dozy : *Supplement*، ۲ : ۴۵۶؛ Cuche : *Dict. ar. franc*، بذیل مادّہ)۔

(Cl. Huart)

* کُرْشُس : رک بہ کُرُچ۔

کَرْشُونی : ایک اصطلاح، جس کی اصلیت ابھی تک معلوم نہیں ہوئی؛ اس کا اطلاق سریانی زبان کے ان حروف تہجی پر کیا جاتا ہے جن کو بعد از تصرف عربی زبان کے مطابق بنا لیا گیا ہے۔ طُرْسُوس کے اسقف اعظم یوسف دُرْیان نے حال میں اس نام کے بارے میں ایک مقالہ لکھا ہے (المشرق، ۷ (۱۹۰۴ء): ۷۸۵ تا ۷۹۰)، لیکن اس نے اس نام کا اشتقاق ایک غیر معروف سریانی لفظ کرکونی Karkūnē سے بتایا ہے، جو کَرْکا Karka کا مصغر ہے؛ اس کی رو سے ان حروف ہجا کی تعریف "چھوٹے" یا "گول" ٹھیرتی ہے، جو بالکل غیر اغلب ہے۔ جس طرح یہودی اپنے نہ صرف اِخفا کی غرض سے بلکہ اپنی قومیت کی علامت کے طور پر بھی اپنے حروف ہجا کو ان ملکوں کی زبان نقل کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے جہاں وہ پناہ گزیں ہوتے تھے، اسی طرح اہل شام نے بھی جب روزمرہ کے استعمال کے لیے فاتحین کی زبان، یعنی عربی اختیار کی تو اسے لکھنے کے لیے لازماً اپنے حروف ہجا سے کام لیا ہوگا۔ جو حروف سریانی میں مفقود تھے ان کی جگہ پہلے سے موجود حروف پر نقطے لگا کر پیدا کر دی گئی، لیکن ایسا کرنے میں عربی حروف کی شکل کے مقابلے میں ان کی آواز پر زیادہ توجہ مبذول کی گئی۔ مثال کے طور پر خاء کو بالعموم سریانی کاف اور غین کو کاخا کے ساتھ کامل سے ادا کیا جاتا ہے۔ جیم کو یعقوبی (Jacobites) عموماً اس حرف میں ایک نقطہ لگا کر ادا کرتے ہیں اور نسطوری (Nestorians) اس کے نیچے ایک قلّابہ (hook) بنا کر۔ زاء اور ضاد کو عربی طریقے کے مطابق طیت (Têth) اور صادی (Ṣādai) کے اوپر نقطوں کے ساتھ لکھتے ہیں، لیکن یعقوبیوں کے ہاں انھیں اکثر طیث (Têth) کے اندر ایک نقطہ لگا کر لکھا جاتا ہے، کیونکہ یہ دونوں تلفظ میں

www.besturdubooks.wordpress.com

یکساں ہوگئے تھے۔ آخر کلمے کی علامت تانیث کو بالعموم ھی He سے ظاہر کیا جاتا ہے، جس کے اوپر عربی دستور کے مطابق دو نقطے ہوتے ہیں۔ اعراب کی ترتیب بعض دفعہ سریانی اور بعض دفعہ عربی طریقے سے ہوتی ہے، لیکن واو معروف (ū) اور یای معروف (ī) کی آوازیں تقریباً ہمیشہ ضمے اور کسرے سے ظاہر کی جاتی ہیں۔ مختلف وقتوں اور جگہوں میں اس بارے میں جو مختلف قواعد رائج تھے رہے ان کا اندازہ صرف اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب متعلقہ مخطوطات کی صحیح طور پر چھان بین کر لی جائے، لیکن اب تک اس قسم کا کوئی اقدام عمل میں نہیں آیا۔

(C. BROCKELMANN)

* **کَرْشی** : اویغور زبان کا ایک لفظ، جو قلعہ اور محل کے معنوں میں آتا ہے؛ یہ غالباً مشرقی ترکستان کی کسی مقامی زبان سے مستعار لیا گیا اور بعد ازاں مغول نے اسے اختیار کر لیا۔ شہر نَخْشَب [رک بآں] یا نَسَف کا موجودہ نام کَرْشی اس محل کی وجہ سے ہوگیا جو خان کَبَک (۱۳۱۸ تا ۱۳۲۶ء؛ رک بہ چغتای خانیہ) کے لیے شہر سے دو فرسخ دور بنوایا گیا تھا اور جس کا نشان مدت ہوئی بالکل مٹ چکا ہے (دیکھیے شرف الدّین یزدی : ظفر نامہ، طبع محمّد الٰہ داد، کلکتہ ۱۸۸۷ - ۱۸۸۸ء، ۱ : ۱۱۱؛ Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۴۷۰ ببعد؛ سامی بک : [قاموس الاعلام، ۵ : ۳۸۴۵].

(W. BARTHOLD)

* **کَرَک** : رک بہ حِصْن الأکْراد.

اَلْکَرَک : ایک قلعہ، جو بحیرۂ مردار کے مشرق میں قدیم موآب (Moab) میں واقع ہے۔ لفظ الکرک آرامی لفظ کَرْخا (= شہر) سے نکلا ہے، جسے "ترگوم" میں موآب کے مقامات کے ناموں، مثلاً قیر موآب (اشعیا، ۱۵ : ۱) اور قیر حارس (یا حارسۃ؛ اشعیا، ۱۶ : ۷، ۱۱؛ ارمیا، ۴۸ : ۳۱، ۳۶) میں لفظ قیر کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ بطلمیوس (۵ : ۱۶، ۴) کے ہاں، ماذبہ کے پچی کاری سے بنے ہوئے نقشے میں اور استفانوس بوزنطینوس وغیرہ میں یہ لفظ Χαρχμωβα کی صورت میں ملتا ہے۔ اس کا محل و قوع پہاڑ کی ایک الگ تھلگ تقریباً عمودی تیز کنارہ ڈھلواں شاخ پر ہے، جس کو بڑی پہاڑی سے فقط ایک ابھروان اونچا ٹیلا (جسے مصنوعی طور پر کھود کر گہرا کیا گیا ہے) ملاتا ہے۔ اس محل و قوع کی بدولت الکرک غیر معمولی طور پر ایک مستحکم قلعہ بن گیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ شرق اردن کی اسلامی فتوحات کے سلسلے میں، یا اس کے بعد کی صدیوں میں، اس کا ذکر نہیں آتا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں جب شاہ فُلکو Fulco کے سابق ساقی پیان Payan نے اس کی مورچہ بندی کی تو وہ اپنا تاریخی کردار انجام دینے لگا اور یہ کردار بہت نمایاں تھا۔ اس زمانے کے عیسائی، جو جغرافیے سے اچھی طرح واقف نہیں تھے، یہ سمجھے کہ قدیم پِترہ Petra یہیں واقع تھا؛ چنانچہ وہ اسے پِترہ صحرائی (Petra deserti) کہنے لگے۔ چونکہ دمشق سے جانے والے حاجیوں کا راستہ اور شام اور مصر کے درمیان آنے جانے والے قافلوں کی شاہراہیں اس کے سامنے سے گزرتی تھیں، اس لیے اس قلعے کی وجہ سے مسلمانوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نور الدّین اور صلاح الدّین نے ۵۶۵ھ/۱۱۷۰ء سے شروع کرکے کئی بار اس کا محاصرہ کیا، لیکن ہر بار ناکام رہے۔ آخر کار قلعے کی فوجیں بھوک پیاس سے تنگ آکر ۵۸۴ھ/۱۱۸۸ء میں صلاح الدّین کے بھائی ملک العادل کے سامنے ہتیار ڈالنے پر مجبور ہوگئیں اور صلاح الدّین کی وفات کے بعد یہ قلعہ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ملک العادل ہی کے حصے میں آیا ۔ اس کے بعد کئی سال تک اس پر مختلف ایوبی فرمانروا قابض رہے، حتّٰی کہ جب اس خاندان کے بیشتر بادشاہوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی تب بھی المغیث العمر بدستور الکرک میں حکمران تھا ۔ بالآخر بیبرس نے دھوکے سے قلعے پر قبضہ کر لیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا (۶۶۱ھ/ ۱۲۶۳ء) ۔

ایک حقیقۃً مستحکم حکومت قائم کرنے کے لیے جب مملوک سلطان ناصر ۷۰۸ھ/۱۳۰۹ء میں قاہرہ سے فرار ہوا تو اسے اسی قلعے کی مستحکم چار دیواری کے اندر پناہ ملی ۔ اس زمانے میں الکرک ان "مملکات" میں سے ایک کا صدر مقام تھا جس میں شام اور فلسطین منقسم تھے ۔ الکرک کے زیر حکومت علاقہ زیادہ تر اس کے جنوب میں واقع تھا ۔ یہ قلعہ، جس کی بیشتر آبادی اس وقت تک عیسائی تھی، اس زمانے میں کس قدر مستحکم تھا اس کا اندازہ الدمشقی، یاقوت العمری اور خلیل الظاہری کے بیانات سے ہو سکتا ہے ۔ ترکوں کے عہد میں اس کی اہمیت جاتی رہی تاآنکہ عثمانی حکومت نے الکرک کے اندر ایک مضبوط حفاظتی دستہ متعین کرکے اس کو ایک علٰحدہ انتظامی ضلع کا صدر مقام بنا دیا ۔ اس کی فصیل کا زیادہ حصہ از منۂ وسطٰی کا بنا ہوا ہے اور اس کے زیریں حصے کا تعلق اس سے بھی قدیم زمانے سے ہے ۔

مآخذ : (۱) P. Thomsen : *Loca sancta*، ص ۱۱۴؛ (۲) الدمشقی، طبع Mehren، ص ۲۱۳؛ (۳) یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۴ : ۲۶۲؛ (۴) ابو الفداء، طبع Reinaud و de Slane، ص ۲۴۷؛ (۵) R. Hartmann : *Die geogr. Nachrichten* ، در خلیل الظاہری : زبدۃ الکشف الممالک، Kirchhain ۱۹۰۷ء، ص ۴۴ ببعد؛ (۶) *Zeitschr. d. Deutsch. Morgenl. Ges.* ۷۰ : ۱۸؛ (۷) ابن الأثیر، طبع Tornberg، ۱۱ : ۲۳۲ و بمواضع کثیرہ، نیز ۱۲ : ۱۲، ۶۲ ببعد، ۲۱۴، ۲۳۰، ۳۱۶؛ (۸) Wilken : *Gesch. der Kreuzzüge*، ۲ : ۶۱۶ و ۳ : ۲، ۱۵۰، ۲۴۵، ۲۹۸؛ (۹) Tristram : *Land of Moab.*، ص ۷۰ ببعد، ۱۰۵ ببعد؛ (۱۰) Duc de Luynes : *Voyage d' exploration à la Mer morte*، ۱ : ۹۹ ببعد و ۲ : ۱۰۶ ببعد؛ (۱۱) A. Musil : *Arabia Petrae a*، ۱ : ۴۵ تا ۶۲ (مع تصاویر و اقتباسات)؛ (۱۲) R. Hartmann : *Ztschr. d. Deutsch. Palästina-Vereins* ، ۳۶ : *Mitt. u. Nachr. des Deutsch. Palästina-Vereins* ، ۱۸۹۵ء، ص ۶۸ ببعد و ۱۸۹۶ء، ص ۴۵ ۔

(Fr. Buhl)

کَرْکَرَہلی : قازقوں کا ایک گاؤں، جو علاقۂ * سمی پلاتنسک Semiplatinsk میں ایک ضلع کا صدر مقام اور ۴۹ درجے ۲ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۶ درجے ۷ دقیقے طول بلد مشرق کے درمیان واقع ہے ۔ [۱۹۲۵ء میں] اس کی کل آبادی ۳۰۰۰ تھی، جس میں دو تہائی مسلمان تھے ۔

(W. Barthold)

کَرْکُور : (یہ لفظ قاموس اور تاج میں نہیں * ملا اور نہ المنجد وغیرہ لغات مختصرہ میں، جو یہاں موجود ہیں)، پتھروں کا، بالخصوص مقدس پتھروں کا ڈھیر ۔ پتھروں کے ڈھیر کی تقدیس کا مسلک نہایت قدیم زمانے سے چلا آتا ہے اور تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے ۔ اس کی بنیاد صحیح طور پر پتھروں کی عبادت پر نہیں بلکہ ایک رسم پر ہے جسے کسی بلا کے ٹالنے یا منتقل کرنے کے لیے ادا کیا جاتا تھا ۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص ایک پتھر ہاتھ میں اٹھا کر اس اپنی بلا کو، خواہ وہ کسی قسم کی ہو اس پتھر کی طرف منتقل کر دیتا (چاہے سستی اور تھکن ہو، کوئی

www.besturdubooks.wordpress.com

جسمانی یا قلبی تکلیف ہو، گناہ ہو، کوئی خطرناک دیو یا بھوت ہو جو بعض مقدس مقامات کے قرب و جوار میں انسان کو چمٹ جاتا ہے یا یہ سب کی سب بلائیں اکھٹی ہوں)؛ اس پتھر میں منتقل کر دیتا اور پھر اس پتھر کو اپنی بلا سمیت دور پھینک کر یا کسی ایسی جگہ میں ڈال کر جو اس پتھر میں سے اس بلا کو چوس لے، اس سے نجات حاصل کر لیتا تھا۔ بلا سے چھڑانے والے ان پتھروں کے جمع ہو جانے سے پتھروں کے وہ مقدس ڈھیر بن جاتے تھے جو سڑکوں کے کنارے کنارے، دشوار گزار دروں اور مقدس جگہوں کے دروازوں پر پڑے دکھائی دیتے تھے۔ ان ڈھیروں کے اوپر ویسا پتھر لا کر ڈالنا یا رکھنا یا پتھروں کا چھوٹا سا مخروطی مینار بنانا زائرین کے ضروری مناسک میں شمار ہونے لگا اور جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے قدیم رسم اپنی اصل صورت کھو بیٹھی اور اب اس رسم ہی کو اصل عبادت رسم سمجھا ہے (دیکھیے R. Dussaud : *La Matérialisation de la prière en Orient* در *Bull. et Mém de la Soc. d' Anthr. de Paris*، ۱۹۰۶ء، ص ۲۱۳ تا ۲۲۰)۔ کُرکور اکثر ایسی جگہوں پر بنے ملتے ہیں جہاں کوئی قتل کیا ہوا شخص مدفون ہو۔ کہتے ہیں کہ اس کی تہ میں یہ خواہش مضمر ہے کہ پتھر ڈال کر اس کی قبر کو اور زیادہ دبا دیا جائے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی روح کو قبر سے باہر آ کر بدلہ لینے کی سوجھ جائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان پتھروں کے جمع کرنے سے مردے کا احترام مدنظر ہے، لیکن یہ وجہ دل کو زیادہ نہیں لگتی۔ ان پتھروں کے پھینکنے کی مناسب تر توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ دفع بلا کی رسم کا ایک حصہ ہے [کہ پتھر ایسی جگہ پھینکے جائیں جو خطرناک ہو، مثلاً قبر، جہاں سے بلا کو موت بآسانی لے لے، یا جہاں ساحرانہ قوتوں کا قرب ہو]۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کرکور کی تہ میں رسوم تطہیر پوشیدہ ہیں۔

عرب کے دورِ جاہلیت میں پتھر اٹھا کر ڈالنے اور مقدس پتھروں کے ڈھیروں کی رسم پائی جاتی تھی۔ [لیکن منیٰ کی رمی جمار (کنکریاں مارنا) کا اس رسم سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ مناسک حج میں رمی جمار نہ تو کسی مدفون شخص کی قبر پر کیا جاتا ہے اور نہ وہاں ڈھیر جمع رہتے ہیں] [دیگر توجیہات کے لیے رک بہ حج]۔ G. Demombynes (*Le Pèlerinage à la Mekka*، باب ۱) نے بتایا ہے کہ جس طرح پتھروں کے نشانات مواقیت پر حرم مکہ کی حدود بتاتے ہیں اسی طرح کے نشانات وسط ایشیا سے لے کر شمالی افریقہ تک سڑکوں کے ساتھ ساتھ ان جگہوں پر ملتے ہیں جہاں سے مقدس مقامات قریب آنے لگتے ہیں۔ عیسائی ملکوں میں بھی اس امر کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

مسلمانوں نے پتھر کے ڈھیروں کی عبادت اپنے تمام مفتوحہ ملکوں میں پائی۔ بعض علاقوں میں کرکور خاص طور پر بکثرت پائے جاتے ہیں، مثلاً شام میں، لیکن پوجا کا یہ طریقہ کہیں بھی اس قدر پرجوش نہیں، جتنا کہ شمالی افریقہ میں بالخصوص مراکش کے جنوب میں، جہاں رہ کر ای ڈاوٹے E. Doutté نے خاص طور پر اس کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں ایسا کوئی درہ، گھاٹی یا چوراہا نہیں، جہاں پتھروں کا کوئی چھوٹا سا مینار نہ ہو، یا کوئی بڑا کرکور نہ ہو جس میں ہر کوئی وہاں سے گزرنے والا اپنی کنکری کا اضافہ نہ کرتا ہو اور کوئی دیہاتی خانقاہ ایسی نہیں جہاں پتھروں کا مقدس ڈھیر نہ ہو [اگر اس کی تہ میں شرک یا کفر کا کوئی شائبہ ہے تو حقیقی اسلام اس سے بالکلیہ براءت کا اظہار کرتا ہے]۔ یوں پتھر

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

راستے کی علامت یا فاصلے کی تعیین یا جگہ کے تقرر کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔

مآخذ : اس موضوع کے مآخذ بہت وسیع ہیں۔ عام نظریے سے اہم مآخذ کا ذکر فریزر نے *Golden Bough*، بار سوم، حصۂ ۶ : *The Scape-goat*، ص ۸ تا ۳۰ میں کر دیا ہے جہاں چند مسلم ممالک کا حوالہ بھی دیا ہے۔ مسلمانوں کے نظریے سے Doutté : *Merrakech*، پیرس ۱۹۰۵ء، ص ۵۸ تا ۱۰۸، ۲۱) وہی مصنف : *Magie et religion dans l' Afrique du Nord*، الجزائر ۱۹۰۸ء، باب ۱۰ میں ذکر ہے۔ مؤخرالذکر کتاب کے شائع ہونے کے بعد E. Westermark : *The Moorish Conception of Holiness (Baraka)*، Helsingfors، ۱۹۱۶ء، ص ۲۶ ببعد (مراکش پر) ملاحظہ ہو۔

(HENRI BASSET)

* **کرکُوک** : عراق کا ایک قصبہ جو ۴۴ درجے ۲۵ دقیقے طول بلد مشرق اور ۳۵ درجے ۲۵ دقیقے عرض بلد شمالی پر واقع ہے۔ یہ اس ضلع کا سب سے بڑا قصبہ ہے جو شمال مغرب میں الزاب الصغیر، جنوب مغرب میں جبل حمرین، جنوب مشرق میں دیالا اور شمال مشرق میں زاگروس Zogros کے سلسلے سے گھرا ہوا ہے۔ یہ علاقہ جو قدیم سلطنت بابل، بلکہ اس کے بعد اشوری سلطنت کے زمانے میں بھی شمال مشرق کے کوہستانیوں کے حملوں کا اکثر نشانہ بنا رہتا تھا، ساسانیوں کے عہد میں یہ گمرکان کے نام سے مشہور تھا (موسیٰ سکنہ خرنہ) اور سریانی مآخذ میں اس کا نام بیتھ گرمہ ملتا ہے۔ اس شناخت کا ثبوت G. Hoffman نے پیش کیا تھا (*Auszüge aus syrischen Akten Persischer Mürtyrer, Abh. für die Kunde des Morgenlandes*، ج ۷، شمارہ ۳، ص ۱۶۷ ببعد)۔ اس قصبے کے شہدا کی تاریخ (کتاب مذکور، ص ۴۳ ببعد) میں بیان کیا گیا ہے کہ اشوری بادشاہ سردنا نے اسے میڈیا والوں کے خلاف بطور ایک فصیل کے تعمیر کرایا تھا۔ آگے چل کر سلیوکس نے قلعے میں ایک برج بنوایا جس کے بعد سے قصبے کا نام سلیوکس (سلوخ) پڑ گیا، لیکن قلعہ سربوی یا سربوگ کے نام سے مشہور ہو گیا (دیکھیے Marquart : *Eransahr*، ص ۲۱)۔ عہد ساسانیان میں یہ قصبہ نسطوریوں کا ایک مشہور و معروف مرکز بن گیا۔ بیتھ گرمہ کا صدر اسقف یہیں رہتا تھا اور یہیں یزد گرد ثانی کے دور حکومت (۴۳۸ تا ۴۵۷ء) میں عیسائیوں پر وہ جبر و تشدد ہوا جس کا حال مذکورۂ بالا تاریخ شہدا میں بیان کیا گیا ہے۔

عیسائی تو اس قصبے کو بدستور پرانے سریانی نام یا عربی میں الکرخ سے یاد کرتے رہے (ایلیا دمشقی، در Assemani : *Bib. Or*، ۳/۲ : ۴۲۶؛ دیکھیے Hoffman : کتاب مذکور، ص ۲۷۲)، لیکن اس امر کا صاف صاف پتا نہیں چلا کہ عربوں نے اسے کیا نام دیا تھا۔ ہمیں خرداذبہ کے یہاں (ص ۹۴؛ البلاذری، ص ۲۶۵؛ یاقوت، ۴ : ۶۸۳) باجرمی کا نام ملتا ہے جس کے بارے میں اس کا بیان ہے کہ یہ صوبہ الموصل کا ایک کورہ ہے، لیکن جتنی بستیوں کے نام گنوائے گئے ہیں، ان میں سے کسی کی بھی کرکوک کے ساتھ مطابقت نہیں ہو سکتی۔ ابن خرداذبہ (محل مذکور) باجرمی کے ایک قصبے خنیا سابور کا نام لیتا ہے (ڈخویہ کے قیاس کا اطلاق طبری، ۱ : ۸۴۰، پر بھی ہو سکتا ہے)۔ Hoffmann (محل مذکور) اس کا تعلق قصبۂ کرخینا سے بتلاتا ہے جس کا ذکر یاقوت (۴ : ۲۵۷) نے کیا ہے۔ اس کے نام کی شناخت اس وجہ سے کچھ اور مشکل ہو جاتی ہے کہ عرب جغرافیہ نویسوں نے ہمیشہ بغداد سے الموصل جانے والی سڑک کا دریائے دجلہ کے ساتھ ساتھ جانا بیان کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کفری تئوق، کرکوک اور اربل سے ہو کر جانے والی قدیم شاہراہ پر جو موجودہ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

زمانے میں بھی استعمال ہوتی ہے، عہد اسلامی کی ابتدائی صدیوں میں زیادہ سفر نہیں کیا جاتا تھا۔

بارھویں صدی عیسوی میں علاقۂ کرکوک پر خانوادۂ بکتگین حکومت کرتا تھا جس کا صدر مقام اربل [رک بآں] تھا۔ ۱۲۳۲ء میں مظفر الدین قوق بوری Kökbüri کی وفات کے بعد یہ علاقہ اس خاندان کے ہاتھ سے نکل کر خلفاے بنی عباس کے پاس آ گیا تھا، مگر چند ہی دن بعد منگولوں نے اسے فتح کر لیا۔ کرکوک کا نام پہلی بار شرف الدین علی یزدی کے ظفر نامہ (ترجمہ Pétis de Ia Croix، ۱۷۲۳ء، ۲ : ۲۵۹) میں ملتا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ فتح عراق کے بعد تیمور دیار بکر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا راستہ تئوق (عربوں کے ہاں دقوقا)، کرکوک Carcouc اور التون قوپرو Altoun Cüprü سے ہو کر جاتا تھا، جہاں سے وہ ۲۰ دسمبر ۱۴۰۳ء کو رخصت ہوا۔ اس کے بعد آق قویونلو کی حکومت کا دور آتا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں شاہ اسمٰعیل اول نے عراق فتح کر لیا۔ جب ترکی۔ ایرانی معاہدے کی رو سے، جو اماسیہ کے مقام پر بتاریخ ۲۹ مئی ۱۵۵۵ء طے پایا تھا، عراق پر بالآخر عثمانی سلطان سلیم اول اور سلیمان اول کا قبضہ ہو گیا تو کرکوک پہلے کی طرح ایک بار پھر مشرق سے آنے والے حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک اہم پشت پناہ بن گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے سے دریاے دجلہ کے کناروں کا علاقہ غیر آباد اور اجاڑ ہو جانے کے باعث بغداد کو الموصل سے ملانے والی قدیم تجارتی اور عسکری شاہراہ آباد ہونے لگی تھی (تاہم اولیا چلبی نے دریاے دجلہ والا راستہ ہی اختیار کیا تھا (سیاحت نامہ، ۵ : ۶)۔ ۱۶۲۳ء میں سقوط بغداد کے بعد کرکوک ایک بار پھر ایرانیوں کے ہاتھ لگا، لیکن ۱۶۳۰ء میں خسرو پاشا [رک بآں] نے اسے دوبارہ فتح کر لیا۔ ۱۶۳۸ء میں سلطان مراد چہارم بغداد کی دوبارہ تسخیر کے لیے جاتے ہوے کرکوک سے گزرا تھا، مگر اس علاقے کے اصل حکمران صوبۂ اردلان کے کرد سردار ہی تھے (حاجی خلیفہ : جہان نما، ص ۴۳۵)۔ رفتہ رفتہ ایالت شہر زور [رک بآں] یا (شہرِ زول) کے پاشاؤں کی ہمت اور کوشش سے آل عثمان کی حکومت مضبوط ہو گئی۔ یہ ایالت بتیس سنجاقوں پر مشتمل تھی جن میں سے ایک سنجاقوں کرکوک تھی۔ شہر زور کا قصبہ تباہ ہو گیا تو وہاں کے پاشا کا صدر مقام بھی کرکوک قرار پایا (جہان نما، محل مذکور)۔

۱۷۳۲ء میں نادر قلی نے (جو آگے چل کر نادر شاہ کے نام سے مشہور ہوا) اس شہر کا محاصرہ کیا، مگر ناکام رہا۔ اگلے سال کرکوک کے قریب بڑی خونریز لڑائی ہوئی جس میں ترکوں کو شکست فاش ہوئی۔ ترک فوجیں وزیراعظم توپل عثمان پاشا کی کمان میں تھیں اور وہ خود جنگ میں کام آیا۔ ۱۷۴۳ء میں کرکوک پر پھر ایرانیوں کا قبضہ ہو گیا، لیکن ۱۷۴۶ء کے صلح نامے کی رو سے ترکی کو واپس مل گیا۔ ۱۹۱۸ء تک شہر ترکوں کی سلطنت میں رہا۔ ترکی کے جدید نظام حکومت کے ماتحت یہ صوبۂ الموصل میں سنجاق شہر زور کا صدر مقام بن گیا (اگرچہ وہ جگہ جہاں پرانا شہر زور آباد تھا اب سنجاق سلیمانیہ میں شامل ہو چکی تھی)۔ کرکوک پر انگریزی فوجوں کا قبضہ ہوا ہی تھا کہ ۱۹۱۸ء کی عارضی صلح کا اعلان ہو گیا۔ انگریز اس پر بدستور قابض رہے، تاآنکہ ۱۹۲۰ء میں اسے عراق میں شامل کر دیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں جب برطانیہ اور ترکی کے درمیان موصل کے قدیم صوبے کی قسمت کا فیصلہ ہوا تو اس وقت کہیں سلطنت عراق سے اس کا قطعی الحاق ہوا۔

موجودہ شہر ۱۲۰ فٹ بلند قلعے کے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

چاروں طرف آباد ہے۔ یہ قلعہ بجائے خود ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جنوب اور مشرق کی جانب میدان میں ایک بڑا محلہ آباد ہے۔ ان دو نوں محلوں کو مغرب کے ایک اور محلے سے "خاصہ چے" نامی ندی جدا کرتی ہے۔ یہ ندی شمال مشرق سے آتی ہے اور جنوب مغرب کی جانب بہتی ہوئی سامرے کے نیچے دریائے دجلہ سے مل جاتی ہے۔ یہاں یہ ندی صو کے نام سے مشہور ہے۔ آج کل کرکوک کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے، جس میں ترکوں کا عنصر غالب ہے۔ ایشیائے کوچک کے ترکوں سے انھیں متمیز کیا جائے تو انھیں ترکمان کہیں گے۔ غالباً یہ ترکی آبادی سلاطین عثمانیہ کی فتح سے بہت قبل، یہاں آباد ہو چکی تھی، لیکن یہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتایا جا سکتا کہ آیا ان کا سلسلۂ نسب اس ترک فوجی دستے سے ملتا ہے، جسے نویں صدی میں خلفا نے یہاں متعین کیا تھا، یا ان کا تعلق اس نقل مکانی سے ہے جو عہد سلاجقہ یا بنو بکتگین کے زمانے میں ہوئی تھی۔ بہرحال یہ شہر ہمیشہ سے سلطنت عثمانیہ کا ایک مضبوط گڑھ اور اس کے تمدن کا مرکز بنا رہا (دیکھیے *Türk Yurdu*، ۱۹۱۵ء) ترکی میں اس شہر کے نام کا تلفظ کِرکوک کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کی صحیح سرکاری صورت کَرکوک ہے (سامی: قاموس الاعلام، ۵: ۳۸۴۶) - عیسائی پانچ سو کنبوں پر مشتمل ہیں (*Rapport de la Commission de Mosul*، در *Bibliography*، ص ۵۲) - یہ بھی ترکی بولتے اور اسے سریانی رسم الخط میں لکھتے ہیں - عیسائی سب کے سب قلعے میں رہتے ہیں؛ مذہبا "کلدانی" کتھولک (کرکوک ایک اسقف اعظم یا مطران کا صدر مقام ہے) اور قدیم نسطوریوں کی نسل سے ہیں اگرچہ ان کی اپنی روایت یہ ہے کہ وہ عہد سلاجقہ میں نقل مکانی کرکے یہاں آئے تھے - ۱۹۰۶ء میں انھوں نے ایک بڑا کلیسا بھی بنایا - عربی زیادہ تر یہاں کے یہودی باشندے بولتے ہیں، جن کی اچھی خاصی تعداد ہے [اسرائیل کے قیام کے بعد بیشتر یہودی وہاں جا کر آباد ہو گئے ہیں] یہاں کی آبادی میں کردوں کا ایک مضبوط عنصر بھی شامل ہے۔ ایک زمانے میں قلعہ ایک فصیل سے گھرا ہوا تھا۔ اس کے اندر ایک مسجد الجامع، ایک قدیم گرجا اور پہاڑ کی ڈھلان پر مار دانیال نامی مسجد ہے۔ حال ہی میں آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام پہاڑی میں شروع ہوا ہے اور توقع ہے کہ اس سے ہمیں سلطنت بابل کے زمانے میں اس شہر کی تاریخ کے متعلق معلومات دستیاب ہو جائیں گی۔ ایک اور مسیحی یادگار مار تہمزگرد شہید کا مقبرہ ہے، جس کا ذکر مذکورۂ بالا کتاب الشہدا میں ملتا ہے۔ یہ مقبرہ شہر کے مشرق میں واقع ہے۔

کرکوک کی کچھ تجارتی اہمیت بھی ہے۔ یہ اناج اور مویشیوں کی، جو گرد و نواح کے علاقے میں پالے جاتے ہیں، منڈی ہے۔ اس کی اہم ترین سڑکیں بغداد (براہ تئوق و کِفری) اور موصل (براہ التون قوپرو واربل) کو جاتی ہیں۔ ایک ریلوے لائن بھی اس راستے کے ساتھ ساتھ بنائی جا رہی ہے۔ کرکوک اور سلیمانیہ کے درمیان ہموند کردوں کا علاقہ ہے، جو ترکوں کے عہد میں خطرناک ڈاکو تھے۔ کرکوک کے گرد و نواح کا علاقہ تھوڑا بہت پہاڑی ہی ہے، لیکن مغرب میں تھوڑے سے فاصلے پر عراق کے صحرائی اقطاع شروع ہو جاتے ہیں جہاں زیادہ تر عرب آباد ہیں۔ شہر سے بالکل ملحقہ زمینوں میں پھل کثرت سے ہوتا ہے۔ یہاں ہمیں عراق کے انتہائے شمال کی کھجور بھی ملتی ہے۔

کرکوک کے پورے ضلع میں گندھک، نفط [نفت، مٹی کا تیل] اور نفطی پیداواریں پائی جاتی ہیں جو قدیم زمانے ہی سے نکالی اور استعمال میں لائی جاتی رہی ہیں۔ نفط کے چشمے خاص طور پر

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

مشہور ہیں [اب کرکوک میں نفط صاف کرنے کے کارخانے قائم ہو گئے ہیں، جن کی وجہ سے کرکوک کی اہمیت بڑھ گئی ہے] .

مآخذ : (۱) V. Cuinet : *La Turqui d' Asie*، ۲ (پیرس ۱۸۹۲ء) : ۸۴۶، ۸۵۴ ببعد؛ (۲) C. Ritter : *Erdkunde*، ۹ (برلن ۱۸۴۰ء) : ۵۵۲ ببعد؛ (Ritter نے مختلف سیاحوں، Niebuhr، Shiel، Ker Porter اور Ainsworth کے مشاہدات پر اعتبار کیا ہے) ؛ (۳) H. Petermann : *Reisen im Orient*، لائپزگ ۱۸۶۱ء؛ (۴) Sarre.-Herzfeld : *Archäologische Reise im Euphrat-und Tigrisgebiest*، ۲ (برلن ۱۹۲۰ء) : ۳۲۹ ببعد؛ (۵) E. B. Soane : *To Mesopotania and Kurdistan in disguise*، بار دوم، لندن ۱۹۲۶ء، ص ۱۱۹ تا ۱۳۹؛ (۶) H. C. Lukas : *Mosul and its Minorities*، لندن ۱۹۲۵ء؛ (۷) League of Nations : *Question de la Frontière entre la Turquie et l' Irak*، ۷ : ۳۸؛ (۸) J. Labourt : *Le Christianisme dans l' Empire Perse*، پیرس ۱۹۰۴ء .

(J. H, KRAMERS)

* **کَرم** : (بنو الکَرم)، ایک خاندان جس کی دو شاخوں بنو مسعود اور بنو عبّاس ابی الزرَیع نے پہلے ۴۷۶ھ/۱۰۸۳ء سے ۵۳۳ / ۱۱۳۸ء تک صَنعاء کے صُلَیحیَة کے نائبین کی حیثیت سے مشترکہ طور پر عدن میں اسمٰعیلی حکومت قائم کی، جن میں سے صرف ایک شاخ نے ۵۳۳ھ/۱۱۳۸ء سے ۵۶۹ھ/ ۱۱۷۳ء تک حکومت کی ۔ مؤخرالذّکر شاخ بنو زُرَیع جسے بنو ذُئب بھی کہتے ہیں، اس آزاد سلطنت کی مالک تھی، جو صرف خلافت فاطمیہ کو تسلیم کرتی تھی .

بنو الکَرَم کا تعلق بنو ہَمْدان کے قبیلۂ یام کی ایک شاخ جُشَم سے تھا اور صُلیحیہ [رک بہ صلیحی] سے ان کی قریبی رشتے داری تھی ۔ اسی بنا پر وہ اس خاندان کے بانی ، یعنی اسمٰعیلی ، فاطمی داعی، علی بن محمّد اور اس کے بیٹے اور جانشین المُکَرّم کے بہت بڑے حامی تھے ۔ بنو مَعْن نے جنہیں داعی نے باجگزاروں کی حیثیت سے عدن میں رہنے کی اجازت دے دی تھی ، ۴۳۹ھ / ۱۰۴۷ء میں بغاوت کی، تو المکرّم اور اس کی بیوی سلطانہ سَیّدہ حُرّہ نے جسے عَدَن جہیز میں ملا تھا، ۴۷۶ھ/ ۱۰۸۳ء میں بنو مَعْن کے بجائے دو بھائیوں مسعود اور عباس کو جو الکَرَم کے بیٹے تھے، یہاں کا عامل مقرر کر دیا ۔ اوّل الذّکر کو قلعۃ الخضراء ملا اور ساحلی علاقوں کی آمدنی، اور مؤخر الذّکر کو الدرون ملک کا مالیانہ وصول کرنے کا حق ملا اور التَعْکِر کا قلعہ جو اندرون ملک کے لیے دروازے کا کام دیتا تھا (اسے اسی نام کے اس قلعے سے ملتبس نہیں کرنا چاہیے جو جُبْلَة کے اوپر جَنَد سے یَرِیم کو جانے والی شاہراہ کے قریب ہی واقع تھا) ان کا مجموعی سالانہ خراج ایک لاکھ دینار تھا۔ مسعود اور الزُرَیع، عباس کا بیٹا اور جانشین، سیّدہ کے نائب السلطنت (major-domo) المفضل ابی البرکات کے زیر قیادت فوجی خدمت کرتے ہوئے زبید کی دیواروں کے سامنے لڑتے ہوئے مارے گئے ۔ ان کے علاقے کی دو حصوں میں تقسیم وقتی طور پر برقرار رہی ۔ مسعود کے بعد یکے بعد دیگرے اس کا بیٹا ابن ابوالغرات اور مؤخرالذّکر کے دو بیٹے محمّد اور علی حکمران ہوئے؛ ادھر الزُرَیع کے جانشین اس کا بیٹا ابو مَسعود اور پھر اس کا بیٹا سَبَا ہوئے، لیکن جس طریقے سے اس علاقے کو تقسیم کیا گیا تھا، اس سے مؤخر الذّکر شاخ شروع ہی سے فائدے میں رہی کیونکہ اسے اندرون ملک میں حدود حکومت کی توسیع اور ان قلعوں کے دفاع کی زیادہ سہولتیں حاصل تھیں جنہیں ان دونوں خاندانوں نے فتح

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کر لیا تھا۔ در حقیقت یہ مسئلہ ضلع مَعافِر کے شمال میں واقع پہاڑوں کا تھا۔ یہ بات خاصی اہم ثابت ہوئی کہ الزُّرَیع نے ۴۸۰ھ/۱۰۸۷ء میں جبل السِّلْو کے ایک قلعے دُمْلُوَة پر قبضہ کر لیا تھا جو جند سے آنے والی سڑک کے مشرق سرے پر اس موڑ کے اوپر واقع تھا جہاں یہ پہاڑ کے گرد چکر کاٹتی ہوئی گزرتی ہے۔ اگر اس سے قبل نہیں تو کم از کم سَبَا کے عہد میں، جو ایک باہمت حکمراں تھا، نہ صرف ان کے علاقوں میں معتدبہ اضافہ ہوگیا، بلکہ ذُبْحان پر بھی قبضہ کر لیا گیا، جو عدن سے مغرب شمال مغرب کی سمت میں تقریباً ایک سو میل کے فاصلے پر موخا اور زبید کو جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ سَبَا کے والد اور ابوالغرات کی کوشش سے پہلے خراج کی رقم نصف اور بعدازاں چوتھائی ہوگئی تھی کیونکہ انھوں نے سیّدہ کو اس سے زیادہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور وہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکی تھی۔ جب اس سیدہ کی مشکلات میں اضافہ ہوا تو سَبَا نے یہ خراج ادا کرنا بالکل بند کر دیا۔ جب حالات میں تبدیلی ہوئی تو خلافت قاہرہ کی توجّہ بھی اس طرف مبذول ہوئی۔ گیارھویں فاطمی خلیفہ الحافظ عبدالمجید نے ۵۲۵ھ/۱۱۳۱ء میں مسند خلافت پر بیٹھتے ہی سَبَا کو داعی کی حیثیت دے کر اسمٰعیلی سلسلے میں شامل کر لیا۔ دُمْلُوَة بدستور دارالحکومت رہا۔ وادی لَہْج میں دو سال کی جنگ کے بعد دونوں بھائیوں کے خاندانوں میں فیصلہ ہو گیا۔ پہلے علی بن ابی الغرات نے روپیہ دے کر بہت سے جنگجوؤں کی اعانت حاصل کر لی۔ جب وہ اپنا وار کر چکا تو سَبَا نے اپنی کثیر دولت اور تین لاکھ دینار کی مستعار رقم داؤ پر لگا کر بازی جیت لی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اسی روز آخری فتح حاصل کی جس روز عدن میں اس کے حلیف بلال ابن جریر نے الخضراء پر دھاوا بول کر اسے فتح کر لیا تھا۔

اس کے بعد بنو الزُّرَیع نے بلا شرکت غیرے حکومت کی، لیکن سَبَا ۵۳۳ھ/۱۱۳۸ء میں عدن میں داخل ہونے کے چھے ماہ بعد فوت ہوگیا۔ وہ قلعہ التَّعْکر کے سائے میں مدفون ہے۔ اگلے ہی سال اس کا بیٹا اور جانشین علی الْاَعَزّ بعارضۂ دق وفات پاگیا۔ اس نے اپنے کمسن بیٹوں کو، جو دُمْلُوَة میں تھے، اپنا جانشین اور ان کے اتالیق انیس اور وزیر یحیی بن علی کو ان کا ولی نامزد کیا تھا۔ بایں ہمہ بلال نے، جو معزول و معتوب ہونے کے بعد اس وقت عدن ہی میں تھا، اپنے مرحوم آقا سبا کے ایک اور بیٹے محمّد نامی کے سر پر تاج رکھ دیا، جس نے اپنے باپ کی وفات کے بعد الْاَعَزّ کے خوف سے بھاگ کر مذکورۂ بالا نائب اَلْمُفَضَّل کے بیٹے منصور کے پاس پناہ لے رکھی تھی۔ محمّد بن سَبَا نے ۵۳۴ھ/۱۱۳۹ء سے ۵۴۸ھ/۱۱۵۳ء یا ۵۵۰ھ/۱۱۵۵ء تک حکومت کی اور یہ بنی الزُّرَیع کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اس نے ۵۴۵ھ/۱۱۵۰-۱۱۵۱ء میں بنو مسعود کے آخری حکمران علی بن الغرات کو، جو شکست کھانے کے بعد ابھی تک اپنے خاندان کے چند ایک افراد اور کچھ وفادار ساتھیوں کے ساتھ چند پہاڑی قلعوں (مثلاً لَہج کے شمال میں جَبَل مَنِیف) پر قابض تھا، موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ۵۴۷ھ/۱۱۵۲-۱۱۵۳ء میں اس نے اپنے پناہ دہندہ اور سیّدہ کے وارث منصور سے ۲۸ شہر اور قلعے خرید لیے، جن میں التَّعْکر، جِبْلَہ اور اِبّ شمال مشرق میں اور اَشْرَق جنوب مشرق میں شامل تھے۔ اسے برسر حکومت آتے ہی داعی کا رتبہ مل گیا تھا، کیونکہ جس قاضی کو یہ منصب الاَعَزّ کو دینے کے لیے قاہرہ سے بھیجا گیا تھا جب وہ یہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ محمّد پہلے ہی برسر اقتدار

www.besturdubooks.wordpress.com

آ چکا ہے ۔ بنو الزُّرَیع کی تاریخ کے بارے میں ہماری زیادہ تر معلومات اسی حکمران کی مرہون منت ہیں، کیونکہ وہ مذکورۂ بالا انیس اور بلال جیسے چند لوگوں کے علاوہ، جن سے پوری طرح حالات معلوم نہیں کیے جا سکتے تھے، عمارۃ کی تاریخ الیمن میں اس خاندان سے متعلق حصے کا سب سے مستند مأخذ تھا ۔ عُمارۃ نے بذات خود اس سے ملاقات کی تھی اور دوسری تمام تواریخ، مثلاً الجَنَادی، الخَزْرجی اور ابن خَلْدُون کی تصانیف اسی کے بیان پر مبنی ہیں ۔ وہ محمّد کی بے حد تعریف و توصیف کرتا ہے، خصوصًا اس لیے کہ وہ ادب و ہنر کا بڑا قدر دان تھا؛ لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک پُرجوش اسمٰعیلی ہونے کی وجہ سے اس کا میلان طبع اپنے ہم‌مذہب فرمانرواؤں کی جانب ہوگا ۔ باقی رہی یہ بات کہ محمّد مذہبی مفہوم میں ایک داعی کی حیثیت سے اپنے فرائض صحیح معنوں میں ادا کرتا تھا یا نہیں، اس کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں اور نہ ہم یہی بتا سکتے ہیں کہ مہدی خاندان کے بانی علی بن المہدی نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے، محمّد سے ایک ملاقات کے دوران میں زبید کے خلاف مدد کی جو درخواست عمارہ کی موجودگی میں کی تھی وہ محض سیاسی اور فوجی وجوہ کی بنا پر رد کر دی گئی تھی یا اس میں مذہبی وجوہ کو بھی دخل تھا ۔ اس کے بیٹے اور جانشین عِمران کو مذہبی امور سے زیادہ دلچسپی تھی، چنانچہ اس کے عہد میں حقیقی اقتدار بلال کے وزیر خاندان کے ہاتھوں میں آ گیا ۔ محمّد کے عہد میں خود بلال کا بھی حکومت میں حصہ رہا تھا اور محمد کو تخت دلوانے کی بنا پر وہ اس کا مستحق بھی تھا ، لیکن وہ حکومت میں اس تبدیلی سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے یا اس کے فورًا ہی بعد وفات پا گیا اور اس نے ورثے میں ایک بہت بڑی جاگیر چھوڑی ۔ اس کا جانشین پہلے اس کا بیٹا مدافع ہوا، جو جلد ہی فوت ہو گیا ۔ اس کے بعد بلال کا دوسرا بیٹا یاسر اس عہدے پر فائز ہوا ، جو بالکل خود مختارانہ حکومت کرتا رہا ۔ جب ۵۶۰ھ/۱۱۶۴ء میں عِمران کا انتقال ہو گیا اور اسے اس کی خواہش کے مطابق مکّے میں دفن کر دیا گیا تو یاسر نے اپنے تینوں بیٹوں کو، جو ابھی خرد سال تھے، ابو الدُّرّ جوہر المُعظّمی کی نگرانی میں دُمْلُوہ میں قید کر دیا، تاہم بنو زُرَیع اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں تخت و تاج سے قطعی طور پر محروم ہو جانے کے انجام سے بچ گئے ۔ ان پر آخری وار باہر سے ہوا ۔ ۵۶۹ھ/۱۱۷۳-۱۱۷۴ء میں صلاح الدّین کے بھائی تُوران شاہ نے عدن اور یمن کے باقی علاقے کو فتح کر لیا ۔ اگلے سال جوہر نے ایک معاہدے کی رو سے دُمْلُوہ کا قلعہ بھی اس کے حوالے کر دیا اور ایک سال بعد تُوران شاہ نے یاسر کو، جس کی پناہ گاہ کے بارے میں مخبری ہو گئی تھی، قتل کروا دیا ۔

مآخذ (۱) وہ مصنفین جن کا ذکر H. C. Kay : *Yamen, its early Mediaeval History*، لندن ۱۸۹۲ء، کے متن میں آیا ہے : (۲) B. L. Playfair : *A History of Arabia Felix Or Yemen*، بمبئی ۱۸۵۹ء، ص ۸۵ تا ۸۸ ؛ (۳) J. W. Redhouse : *The Pearlstrings of 'al-Khazrejiyy.....by.....*، ج ۱ سلسلۂ یادگار گب، ۱/۳ (۱۹۰۶ء) : ۱۵، ۱۸ ببعد ؛ (۴) S. Lane Poole : *The Mohammadan Dynasties*، Westminister ۱۸۹۴ء، ص ۹۷ ۔

(R. STROTHMANN)

کِرماسْتی : آنا طولی کی اسی نام کی ایک قضا * کا صدر مقام جو میخالیج سے پندرہ میل جنوب مشرق میں (دیکھیے J. H. Mordtmann، در *ZDMG*، ۶۵ (۱۹۱۱ء) : ۱۰۱) اور برسہ سے چالیس میل جنوب

www.besturdubooks.wordpress.com

مشرق میں واقع ہے۔ [۱۹۲۷ء میں] اس کی کل آبادی پانچ ہزار تھی، جس میں تین ہزار مسلمان تھے۔ شہر چودہ محلّوں پر مشتمل ہے، جن میں آٹھ سو مکانات تھے۔ یہ دریاے اطرا نوس (Rhyndacus) کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ اس نام کی اصل، جسے اکثر اوقات غلطی سے کَرماسلی لکھتے ہیں اور جس کا تعلق ایک یونانی نام Κρεμαστη* یا Κρεμαστη* سے معلوم ہوتا ہے، یقینی طور پر معلوم نہیں۔ اسی طرح یہ بھی معلوم نہیں کہ یہاں کونسا قدیم شہر آباد تھا۔ غالباً اس کا تعلق Troas میں واقع شہر Kremastis (دیکھیے Pauly-Wissowa، ۲ : ۷۴۳) سے قائم کیا جا سکتا ہے، جس کا ذکر Xen. : *Hist.*، ۴ : ۸، میں آیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بوزنطی عہد میں یہاں اورتہ Aorata آباد تھا، جہاں ۱۱۱۳ء میں Kamytzes کے زیر قیادت کومنیوس Alexius Comnenus کی فوجوں نے سلجوقوں سے شکست کھائی تھی (دیکھیے Anna Comn.، ۲ : ۲۷۹ ببعد)۔ بہر صورت کرماستی کے نزدیک ہی ایک بوزنطی قلعے کے کھنڈر موجود ہیں جو اس قلعے سے ملتا جلتا ہے جو یہاں سے چھے میل آگے دریاے اطرانوس (اِدّرہ نوس چای) کے کنارے کِستِرلک کے مقام پر واقع ہے اور جس کا مقصد اولوباد (Lapadium) اور بروسہ میں اسی نوع کے استحکامات کی طرح کا تھا کہ ترکوں کی پیش قدمی کو روکا جا سکے۔ شہر میں چھے جامع مسجدیں ہیں، جن میں سے ایک کافی بڑی اور بہت پرانی ہے اور اس کے ساتھ ایک مقبرہ (تربہ) بھی ہے۔ اس کے علاوہ چودہ دوسری مساجد اور متعدد آثار قدیمہ (پتھر کے تابوت، دیواروں پر کتبات اور آرائش و زیبائش) ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تاحال مطالعہ نہیں کیا گیا۔ ترکوں کے عہد میں کرماستی کی تاریخ تاریکی میں ہے کیونکہ اس سے متعلق کوئی بیان محفوظ نہیں۔ اولیا چلبی (۵ : ۲۹۰) اور یورپی سیاحوں (دیکھیے W. Hamilton : *Reseascher in Asia Minor*، لنڈن ۱۸۴۲ء، ۱ : ۷۷ و ۲ : ۹۳) نے اس ضمن میں کوئی بھی مفید مطلب بات نہیں لکھی۔ اسلامی کتبات کے مطالعے اور ترتیب کا کام ابھی باقی ہے۔ کرماستی کو یونانی قبضے کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ۱۹۲۵ء میں صدر جمہوریۂ ترکیہ کے اعزاز میں اس کا نام بدل کر مصطفٰی کمال پاشا رکھ دیا گیا۔ کرماستی مشہور مؤرخ عاشق پاشا زادہ (دیکھیے طاش کوپرو زادہ مجدی : شقائق النعمانیہ، ص ۳۵۲، س ۱۳) کے داماد سید ولایت (م ۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء، در استانبول) کا مولد ہے، جو مناقب تاج العارفین (یعنی شیخ ابو الوفا) کے ذریعے معروف ہوا (دیکھیے Pertsch : *Türk. Hss. Gotha*، ص ۱۳۷، شمارہ ۱۶۶؛ Tornberg : *Catal. Uppsal*، ص ۲۱۱، شمارہ ۳۰۷)۔

کرماستی سے دو گھنٹے کی مسافت پر گرم پانی کے دو معدنی چشمے ہیں، جو دمبلدک اور اقرجہ کے نام سے مشہور ہیں۔

مآخذ : متن میں مندرجہ حوالوں کے علاوہ دیکھیے : (۱) Cuinet : *Türquie d' Asie*، ۶ : ۱۵۵ ببعد؛ (۲) حاجی خلیفہ : جہان نما، ص ۶۵۶ س ۱۷؛ ص ۶۶ س ۱؛ (۳) اولیا : سیاحت نامہ، ۵ : ۲۹۰؛ (۴) W. M. Ramsay : *Historical Geography of Asia Minor*، ص ۱۵۵، ۴۳۷۔

(FRANZ BABINGER)

کرمان : ایران کے ایک صوبے اور اس کے * موجودہ صدر مقام کا نام۔ شہر کا نام بعد کے زمانے میں صوبے کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اس کا تلفظ بالعموم کِرمان کیا جاتا ہے، لیکن اگر عربی کے علما کی روایت کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کا زیادہ صحیح تلفظ کَرمان ہوگا (یاقوت، ۴ :

www.besturdubooks.wordpress.com

۲۶۳)۔ بہرحال یہ نام لفظ کرمنیہ (Carmania) سے ماخوذ ہے، جو Strabo (۱۵ : ۲، ۱۴) کے یہاں ملتا ہے؛ خود کرمنیہ بھی ایک قدیم دارالحکومت کے نام کرمنہ سے مشتق بتایا جاتا ہے (Ptolemy : *Geography*، ۶ : ۸؛ Ammianus Marcellinus، ۲۳ : ۶، ۴۸)۔ بقول Marquart (*Ērānšahr*، ص ۳۰) کرمنیہ کے نام نے یوتیہ کی جگہ لے لی تھی، جو ہخامنشی کتبات (*Beh.*، ۳ : ۲۳) میں ملتا اور *Outiol* کے مطابق ہے جس کا شمار ہیروڈوٹس Herodotus ۳ : ۹۳ نے (سلطنت ایران کی) چودھویں ولایت میں کیا ہے۔ پہلوی میں اس کے ہجے ک ر م ء ن ملتے ہیں۔ عربی قصص و روایات کی تاریخ (ابن الکلبی) میں بتایا جاتا ہے کہ کرمان دراصل کرمان بن قَلوج کے نام سے نکلا ہے، جو یافث (Japhet) کی نسل سے تھا اور کہتے ہیں کہ اس علاقے میں آباد ہو گیا تھا۔ زمانۂ مابعد کی مقبول عام اشتقاقیات میں اس کا تعلق اسم کِرم سے بتایا گیا، جس کے معنی ہیں کیڑا یا اژدھا اور اس کا اشتقاق قصۂ ہفتان بخت اور کرمان کے اس اژدھے سے کیا گیا ہے جس کا ذکر اردشیر کے افسانے میں ملتا ہے (دیکھیے Browne : *Lit. Hist. of Persia*، ۱ : ۱۴۵)۔

(۱) صوبہ : اگر جغرافیائی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مجموعی اعتبار سے کرمان کی حدود بڑی معین ہیں۔ یہ صوبہ ایران کے وسطی صحرائے اعظم (دشت لوط، یا ازمنۂ وسطی میں مفازۂ خراسان) کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس کے مشرق میں لق و دق میدان اور وہ پہاڑ ہیں جو اسے مکران سے جدا کرتے ہیں۔ یزد کی جانب سے شمال مغرب کی طرف اور فارس سے مغرب کی طرف بھی یہ صحرا اور غیر مزروعہ اراضی سے گھرا ہوا ہے۔ جو خاص بات کرمان کو فارس سے ممیز کرتی ہے وہ، جیسا کہ اصطخری (ص ۱۶۳) نے بھی بیان کیا ہے، یہ ہے کہ فارس کا مزروعہ علاقہ غیر منقطع چلا جاتا ہے، لیکن کرمان کا حال یہ ہے کہ اس میں کچھ تعداد سرسبز اور مزروعہ قطعات کی موجود ہے جنھیں صحراؤں نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے اور ان میں دیہات بکھرے پڑے ہیں۔ اس کے جغرافیائی محل وقوع سے فائدہ اٹھا کر اس کی پانچ اضلاع میں بالکل قدرتی تقسیم کر دی گئی ہے، یعنی شمال میں کرمان (قدیم زمانے میں بَردسیر)، مغرب میں سیرجان، وسط میں جیرفت اور مشرق میں بم اور نرمسیر (المقدسی، ص ۴۶۰)۔ جنوب میں کرمان سمندر سے گھرا ہوا ہے، لیکن صوبے میں اس علاقے کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے یہاں کی واحد اہم بندرگاہ ہرمز [رک بآں] ہے اور اسے بھی کبھی کرمان میں اور کبھی فارس کے علاقے میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس بندرگاہ پر اکثر عقبی علاقے کے مختلف لوگ قبضہ جماتے رہے ہیں۔ کرمان کے فرمانرواؤں نے تاریخ میں صرف ایک بار بالمقابل کے ساحل عمان پر اپنے اقتدار کا جھنڈا گاڑا ہے۔ صوبے بھر میں شمال مغرب سے جنوب مغرب کی طرف پہاڑوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ شمال میں بلند ترین سلسلۂ کوہ ملتا ہے، جو کوہ رود کا ایک حصہ ہے اور اس میں کوہ ہزار جیسی چوٹیاں بھی ہیں۔ یہ چوٹی بم کے شمال مغرب میں ہے اور اس کی بلندی قریب قریب پندرہ ہزار فٹ ہے۔ یہ سلسلہ ضلع کرمان کو سیرجان سے علٰحدہ کرتا ہے۔ اس سلسلے کے جو پہاڑ جنوب مشرق کی طرف بڑھتے چلے گئے ہیں، وہ جبل پارز یا بارز کے نام سے مشہور ہیں۔ ان سے آگے جنوب مغرب میں کچھ اور سلسلہ ہائے کوہ بھی ان کے متوازی پھیلے ہوئے ہیں۔ ازمنۂ وسطی میں بلوص [رک بہ بلوچستان] اور قفس جیسے وحشی قبائل ان پہاڑوں میں رہتے تھے۔ قفس ان پہاڑوں میں آباد تھے جو مکران کی جانب ساحل کے ساتھ ساتھ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

جیرفت کے جنوب میں واقع ہیں۔ کرمان میں کوئی بڑا دریا نہیں ملتا۔ مزروعہ علاقوں کے لیے پانی پہاڑوں سے آتا ہے۔ ان ندیوں میں سے اہم ترین خلیل رود (قبل ازیں دیورود) ہے اور جیرفت کے پار گزرتی ہے، لیکن سمندر تک نہیں پہنچ پاتی۔ لہٰذا کرمان میں وہ تمام جغرافیائی خصوصیات موجود ہیں جن کے لیے سارا ایران ممتاز ہے۔

عرب جغرافیہ نویس، جن میں سب سے پہلا نام الیعقوبی کا آتا ہے، کرمان کو ایک آزاد جغرافیائی اقلیم قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اس کے تین چوتھائی علاقے کی درجہ بندی گرم خطوں (جروم) میں کی ہے۔ سرد علاقے (صرود) زیادہ تر سیرجان کے آس پاس پائے جاتے ہیں (الاصطخری، ص ۱۶۵)۔

اب آمد و رفت کے اعتبار سے دیکھیے تو کرمان فارس سے سیستان، خراسان اور ہندوستان جانے والی شاہراہوں پر واقع ہے۔ تجارتی اور حجاج کے قافلوں کا وہ راستہ بھی یہیں سے گزرتا ہے جو سمندر (ہرمز اور آگے چل کر بندر عباس) سے ایران کے شمال مشرق اور پھر اس سے بھی آگے چلا گیا ہے۔ یہ محل وقوع کچھ اس قسم کا ہے کہ اس صوبے کی تاریخ میں اس پر چاروں طرف سے حملہ آور فوج کشی کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی حکومت بار بار ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے قبضے میں جاتی رہی اور اسی باعث اس کی خوشحالی اور ترقی پر بری طرح متاثر ہوتی رہی۔

زمانۂ قدیم کی بہ نسبت آج کل کرمان کے صحرائی علاقے زیادہ وسیع ہو گئے ہیں۔ عہد اسلامی کی ابتدائی صدیوں میں ابھی یہاں جنگلات پائے جاتے تھے، اور جیرفت کے گرد و نواح میں شیر گھومتے پھرتے تھے (حمد اللہ المستوفی: نزھۃ القلوب، ص ۱۴)۔ اب یہاں مشکل ہی سے کوئی درخت نظر آتا ہے، البتہ دیہات اور قصبوں کے آس پاس کھجور کے پیڑ بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ آب پاشی زیر زمین قنات سے کی جاتی ہے، جو بڑا محنت طلب کام ہے۔ یہاں کی بڑی زرعی پیداوار اناج، جو اور افیون ہے۔ سطح سمندر سے زیادہ بلند علاقوں میں فصل خریف کی پیداوار باجرا، کپاس اور چقندر ہے۔ جروم یا گرمسیر میں چاول اور مکئی کی موسم گرما میں کاشت ہوتی ہے اور بم اور خبیص کے مضافات میں حنا پیدا ہوتی ہے۔ یہاں ہر قسم کے پھل بافراط ہوتے ہیں اور یہاں کی کھجوریں مشہور ہیں۔ مویشیوں سے حاصل ہونے والی چیزوں میں سب سے زیادہ اہم اون اور بکری کی کھالیں (کرک) ہیں، جو یہاں کی مشہور شالیں تیار کرنے میں استعمال ہوتی ہیں۔ کرمان کی معدنی دولت سے ازمنۂ وسطیٰ میں بھی فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ مارکوپولو نے فیروزوں کا ذکر کیا ہے، لیکن اب ان کی کانیں ختم ہو چکی ہیں۔ پہاڑوں میں لوہا بھی پایا جاتا ہے، جو پچھلے زمانے میں اسلحہ سازوں کے کام آتا تھا۔ جیرفت کے مغرب میں چاندی نکلتی تھی۔ کبنان کے قریب جو معدنیات برآمد ہوتی تھیں ان سے توتیا تیار کیا جاتا تھا۔ (المقدسی (ص ۴۵۹، ۴۷۰) نے التوتیا المرازبی کا ذکر کیا ہے، دیکھیے de Goeje، در BGA، ۴: ۲۴۶)۔ القزوینی (۱: ۱۷۲) نے بظاہر معدنی کوئلے (anthracite) کی موجودگی کے متعلق بھی اشارہ دیا ہے۔

تاریخ: عہد ساسانیاں میں صوبۂ کرمان پر ایک والی حکومت کرتا تھا، جس کا خطاب شاہ ہوتا تھا (ابن خرداذبہ، ص ۱۷)۔ یہی وجہ ہے کہ بہرام پنجم تخت نشین ہونے سے قبل کرمان شاہ [رک بآں] کے نام سے مشہور تھا۔ شاہنامہ کی نیم افسانوی روایت میں بھی شاہ کیخسرو کے عہد کے ایک شاہ کرمان کا ذکر ملتا ہے (طبع Vullers، ۳: ۱۲۷۹)۔ اس کے برعکس البلاذری کرمان کے ایک

www.besturdubooks.wordpress.com

مَرْزُبان کا ذکر کرتا ہے (ص ۳۹۱)۔ اسلامی فتوحات سے پہلے ہی عرب کرمان میں نقل مکانی کر آئے تھے اور بقول الطبری (Nöldeke: *Gesch. der Perser u. Araber*، ص ۵۷) شاپور اوّل نے عربوں پر فوج کشی کے بعد قبیلۂ بَکْر بن وَائِل کے لوگوں کو جبراً یہاں سے نکال دیا تھا۔ نولدکے Nöldeke اس واقعے کو تاریخی اعتبار سے ایک حد تک درست تسلیم کرتا ہے، لیکن اس کی رائے میں زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ عرب زمانۂ قبل از اسلام میں نقل مکانی کرکے کرمان میں چلے آئے تھے۔ عہد ساسانیاں کے خاتمے کے وقت اس صوبے کا صدر مقام شِیْرَجَان (سِیْرجان) تھا۔

۶۴۰ سے ۶۵۰ء تک: جیسا کہ البلاذری (طبع de Goeje، ص ۳۱۵، ۳۹۱ ببعد) نے لکھا ہے، عربوں کی کرمان کی فتح کا آغاز الرَّبِیْع بن زیاد نے کیا تھا۔ انھیں ابو موسیٰ الاشعریؓ نے بھیجا تھا، جو حضرت عمرؓ کے عہد میں ۶۳۸ء سے بصرے کے والی مقرر ہوئے تھے۔ الرَّبِیْع نے شِیْرَجَان فتح کیا اور بَم اور اَرْمَغَار سے عہد و پیمان کر لیا۔ اسی زمانے میں عربوں کا ایک اور حملہ ہوا۔ یہ عثمان بن العاص الثَّقَفی، والی بحرین، نے کیا تھا۔ جزیرۂ اَبَرْکَوان میں (اگرچہ وہ ولایت فارس میں شامل تھا) کرمان کا مرزبان ان کے ہاتھ سے مارا گیا، لیکن کرمان کی یہ تسخیر پوری طرح قابل اطمینان ثابت نہ ہوئی۔ ۲۹ھ/ ۶۴۹ - ۶۵۰ء میں یَزْدگرد اصفہان سے بھاگ کر کرمان پہنچا، جہاں کے باشندوں کی اکثریت ابھی تک اس کی وفادار تھی۔ اس پر عبداللہ بن عامر بن کُرَیْز نے اس کا تعاقب کرنے کے لیے مُجَاشِع بن مسعود السُّلَمی کو ایک اور سپہ سالار کے ساتھ روانہ کیا۔ یہ عرب فوج شِیْرَجان پہنچنے سے پہلے ہی بَیْمَنْد کے مقام پر برف باری سے تباہ ہوگئی اور یزدگرد خراسان تک بھاگ جانے میں کامیاب ہوگیا، لیکن وہاں موت نے اس کا خاتمہ کر دیا (شاھنامہ، طبع Vullers ۳: ۱۹۷۵ء، میں میں شاہ دارا کے انجام کا قصہ غالباً یزدگرد کے فرار سے متأثر ہوکر ہی لکھا گیا ہے کہ دارا فرار ہوا اور کرمان میں مارا گیا)۔ مُجَاشِع نے، جسے ابن عامر نے کرمان کا عامل مقرر کر دیا تھا، بالآخر کوہ قُفُص تک کے تمام بڑے بڑے شہر دوبارہ فتح کر لیے۔ ہرمز سے ایرانیوں نے ایک جوابی حملہ کیا، مگر شکست کھائی۔ اس زمانے کی فتوحات کے بارے میں جو تاریخی مواد دستیاب ہوتا ہے وہ قطعی طور پر غیر یقینی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ مزید معلومات الیعقوبی (کتاب البُلْدان، ص ۲۸۶) کے ہاں ملتی ہیں۔ فتح کے بعد بہت سے باشندے سیستان یا خراسان بھاگ گئے، یا پہاڑوں میں چھپ گئے، جہاں وہ مدت تک اپنے زردشتی عقائد پر قائم رہے۔ خود کوہستانیوں نے مزید تین سو سال تک اپنی خود مختاری برقرار رکھی۔ چونکہ یہ صوبہ مرکز سے کافی فاصلے پر واقع تھا، اس لیے یہ بہت جلد خوارج کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ کچھ باشندے ان اَزْرَقِ خوارج کے ساتھ بحیثیت موالی شریک ہوگئے جنھوں نے ۶۹۳ء کے قریب قَطَرِیّ ابن الفُجَاءَۃ [رَکَ بآں] کی قیادت میں فارس اور کرمان فتح کر لیا تھا۔ جِیْرُفت ان کا مرکز تھا۔ یہاں ان کا اقتدار تقریباً ۶۹۹ء تک رہا جبکہ عرب خوارج اور مَوَالی کے درمیان علیحدگی ہو جانے کے باعث ان کی طاقت کمزور ہوگئی تھی اور سپہ سالار مُہَلَّب نے انھیں شکست دے دی۔ اگلی صدی میں کرمان بغاوتوں کا گھر اور باغیوں کے لیے بہت اچھی جائے پناہ بنا رہا، چنانچہ الحجاج کے حریف عبدالرحمٰن بن الاَشْعَثْ نے شکست کھانے (۷۰۱ء) کے بعد کچھ مدت کے لیے یہاں پناہ لی تھی۔ بیس برس کے بعد کرمان کا شمار ان صوبوں

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

میں ہوتا تھا جس پر غاصب یزیدبن مُہلّب [رک بآں] نے قبضہ جما لیا تھا ۔ اس کی حکومت کا خاتمہ ۱۰۲ھ/۷۲۰ء میں ہو گیا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بنوامیّہ نے، جن کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ ان کے متعدد سکّے کرمان میں ضرب کیے گئے تھے، صوبۂ کرمان میں اپنا اقتدار بخوبی قائم کر لیا تھا ۔ اس وقت یہ صوبہ جنگوں کے باعث نڈھال ہو چکا تھا ۔ بنی امیہ کے اقتدار کی دلیل یہ ہے کہ ان کی آخری فوج بنو عباس کے حامیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے، جن کی کمان قَحْطَبہ کے ہاتھ میں تھی، یہیں سے روانہ ہوئی تھی ۔ اس زمانے کے بڑے بڑے مآخذ البَلاذُری، الطَبْری، الیَعْقوبی اور المَسْعودی ہیں ۔

۷۵۰ سے ۱۰۴۱ء تک : بنو عباس کے پہلے خلفا کے عہد میں کرمان میں کچھ خاص اہم واقعات پیش نہیں آئے ۔ اس زمانے میں زُطّ کی تاخت کے باعث، جو ہندوستان سے آئے تھے، ان صوبوں کو بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑا، حتّٰی کہ المُستَعْصِم کے عہد میں انھیں باہر نکال دیا گیا۔ ۱۶۵ اور ۱۶۷ھ میں عباسی سکّے کرمان میں ضرب کیے گئے۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد اس صوبے نے ایران کی مختلف تحریکوں میں، جنھوں نے کئی فرمانروا خانوادوں کو جنم دیا، حصہ لینا شروع کر دیا، تاہم اس کا حصہ زیادہ تر انفعالی قسم کا تھا ۔ ان میں سے پہلا خاندان صَفّاریہ تھا ۔ یعقوب بن لَیْث نے ۲۵۳ھ/۸۶۲ء میں والی خراسان محمّد بن طاہر سے کرمان کی ولایت حاصل کر لی تھی ۔ یعقوب کو جِیرُفت کے آس پاس کے کوہستانیوں کی مخالفت کو فرو کرنا پڑا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اور اس کے بھائی عَمْرو نے اس صوبے میں خوشگوار اثر چھوڑا (Sykes : *History of Persia* ، ۲ : ۱۶ ، بروے وقائع افضل الدین) ، لیکن ان کی حکومت کا دور اتنا مختصر تھا کہ یہاں ان کے آثار دیرپا نہیں رہے ۔ ۸۷۹ء میں عَمْرو اپنے بھائی کی جگہ مسند نشین ہوا اور ۹۰۲ء میں اس کی وفات کے بعد کرمان میں عباسیوں کی حکومت کا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ طوائف الملوکی کا، دور پھر شروع ہو گیا ۔ ۳۱۵ھ/۹۲۸ء میں ابو علی بن اِلْیاس [رک بآں] کی صورت میں کرمان کو ایک نیا حکمران ملا ۔ یہ شخص پہلے ڈاکو تھا ۔ وہ خراسان کا رہنے والا تھا اور سامانی بادشاہوں کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتا تھا (المقدسی، ص ۴۷۲) ۔ اسے بہت جلد آل بُوَیْہ کے حکمران احمد مُعِزالدولہ کا سامنا کرنا پڑا، جس نے ۹۳۵ء میں کرمان پر حملہ کر کے شیرجان پر قبضہ کر لیا ۔ ابن الیاس نے اپنے صدر مقام کے لیے بَرْدَسِیر (موجودہ شہر کرمان) کو منتخب کیا تھا اور اس نے خود ہی اپنے آپ کو آل بویہ کے ماتحت اس علاقے کا حاکم مقرر کرا لیا ۔ دس بیس سال بعد جب ابن الیاس اور اس کے بیٹے یاسع کے درمیان جھگڑا ہوا تو ان دونوں پر تباہی آئی اور ۳۵۷ھ(۹۶۸ء) میں صوبے پر آل بویہ کا قبضہ ہو گیا ۔ کچھ ہی عرصے بعد عَضُد الدولہ کے اخلاف نے صوبہ حاصل کرنے کے لیے آپس میں لڑنا شروع کر دیا ۔ اب انتہائی انتشار کے دور کا آغاز ہوا، جس کے دوران میں کچھ عرصے کے لیے شاہان غزنویہ تک بھی کرمان کے مالک بنے (مسعود اوّل نے ۱۰۳۲ء میں اسے فتح کیا؛ [نیز رک بہ ابو کالیجار]) ۔ سب سے پہلے آل بویہ ہی نے قُفس اور بَلُوص کے کوہستانی قبائل سے مستعدی سے جنگ کی ۔ اس دور کے مآخذ الطَبَری، الیَعْقوبی، ابن الأثیر، ابن مِسْکَوَیْہ اور حَمْدُاللہ المُسْتَوْفی (تاریخ گُزیدہ) ہیں ۔

۱۰۴۱ سے ۱۲۲۲ء تک : ۱۰۴۱ء میں جب سلاجقہ کی ایک شاخ نے یہاں ایک فرمانروا خاندان کی بنیاد رکھی تو اس صوبے نے اطمینان

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کا سالس لیا ۔ یہ خاندان ۱۱۸۷ء تک حکومت کرتا رہا ۔اس کے افراد کی تاریخ کے لیے رک بہ سلجوق ۔ اس کا بانی چغری بیگ کا بیٹا قاورد قرا ارسلان بیگ تھا ۔ اس نے ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ - ۱۰۴۹ء میں دارالحکومت بردسیر پر قبضہ کر لیا اور قفس اور شبانکارہ [رک بآں] کے کوھستانیوں کو مطیع کیا ۔ مؤخرالذکر جنوب مغرب کا ایک کرد قبیلہ تھا، جس نے کچھ عرصے سے کرمان کے گرمسیر میں دھشت پھیلا رکھی تھی ۔ قاورد نے بالآخر عمان کا علاقہ فتح کر لیا، جو خلیج فارس کے دوسرے کنارے پر واقع تھا ۔ اس نے سلاجقہ کے جلیل القدر بادشاھوں الپ ارسلان اور ملک شاہ کے حملوں کو روکنے کی دو بار کوشش کی ۔ دوسری کوشش میں اسے اپنی جان سے بھی ھاتھ دھونے پڑے (۴۶۶ھ/ ۱۰۷۴ء) اور اس کے خاندان کی حکومت کا قریب قریب خاتمہ ھو گیا ۔ کرمان کو سب سے زیادہ خوشحالی ارسلان شاہ کے طویل دور حکومت (۱۱۰۱ء تا ۱۱۴۲ء) میں نصیب ھوئی، جو فارس کا بھی حکمران تھا ۔ یہ صورت حال اس کے بیٹے محمد شاہ کے عہد (۱۱۴۲ تا ۱۱۵۶ء) میں بھی جاری رھی ۔ کرمان کے آخری سلجوق بادشاھوں کے عہد میں ایک بار پھر طوائف الملوکی پھیل گئی، تا آنکہ غز [رک بآں] ، جو خراسان سے آئے تھے، اسے پوری طرح ویران کرنے لگے ۔ غز کا ایک سردار ملک دینار ۵۸۱ھ / ۱۱۸۵ء میں کرمان کا فرمانروا بن بیٹھا ۔ اس کا صدر مقام زرند تھا ۔ جلد ھی قبیلۂ شبان کارہ کا بھی ستارہ چمکا ۔ ان کے سرداروں قطب الدین اور نظام الدین نے ۵۹۷ھ / ۱۲۰۰ء میں بردسیر فتح کر لیا، جس پر وھاں کے باشندوں نے بڑی خوشیاں منائیں ، لیکن چونکہ ملک دینار کے بیٹے عجم شاہ کی زیر قیادت غز بدستور مدافعت کر رھے تھے اس لیے چند سال تک ابتری پھیلی رھی ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۶۰۰ھ / ۱۲۰۳ء میں فارس کے اتابک سعد بن زنگی نے کرمان پر قبضہ کر لیا ۔ ۶۰۷ھ/ ۱۲۱۰ء میں خوارزم شاہ کے نام پر اس صوبے کو فتح کیا گیا ۔ ۶۲۰ء میں شجاع الدین زوزنی کرمان کا لیم خود مختار والی تھا، جس نے خوارزم شاہ محمد کی شکست کے بعد اس کے بیٹے غیاث الدین کو ، جو چنگیزی مغول کے آگے آگے بھاگا جا رھا تھا، اپنے علاقے میں داخل ھونے کی اجازت نہیں دی ۔ اس عہد کے مآخذ ابن الاثیر، ابن ابراھیم، افضل الدین (دیکھیے مآخذ)، ابن البلخی (فارس نامہ)، جوینی (جہان گشا)، حمد اللہ المستوفی (تاریخ گزیدہ)، راوندی (راحۃ الصدور) ھیں ۔

۱۲۲۲ء سے ۱۵۰۲ء تک : اس کے فوراً بعد ۶۱۹ھ / ۱۲۲۲ء میں مشہور براق حاجب [رک بآں] نے، جو قرہ ختای نسل سے تھا اور اس زمانے میں مذکورۂ بالا غیاث الدین کا وزیر تھا، شجاع الدین کو بزور نکال باھر کیا اور اس کے بعد سیاسی کھیل میں اس نے پہلے غیاث الدین، پھر جلال الدین خوارزم شاہ اور سب سے آخر میں مغول کے خلاف کچھ ایسی چالاکی سے چالیں چلیں کہ اس نے اپنا اقتدار بھی قائم رکھا اور کرمان بھی مغول فوجوں کے وحشیانہ ظلم و ستم سے آخر تک محفوظ رھا ۔ اس طرح براق حاجب نے، جسے دربار خلافت سے قتلغ خان کا اعزازی خطاب ملا تھا، ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھی جو قتلغ خانیہ کے نام سے مشہور ھوا ۔ یہ خاندان ۱۳۰۳ء تک مغول کے زیر سیادت رھا ۔ اس خاندان کی ایک قابل ذکر شخصیت ترکان خاتون ھے جو براق حاجب کی بیٹی تھی ۔ اس نے ۱۲۵۸ سے ۱۲۸۲ء تک حکومت کی اور اس نے آب پاشی کے لیے قناتیں کھود کر ملک کی خوشحالی میں اضافہ کیا ۔ اسی کے عہد میں مارکوپولو "سلطنت" کرمان میں آیا تھا ۔ اس کے بیان سے یہ

www.besturdubooks.wordpress.com

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہرمز کا فرمانروا سلطان کرمان کا باجگزار تھا ۔ اس خاندان کا خاتمہ آخری قُتْلُغ خان کی ایک نافرمانی کے باعث عمل میں آیا (۱۳۰۳ء) ۔ صوبے میں متعدد مغول والی ہوے تا آنکہ ۱۳۴۰ء میں آخری قتلغ خان کے داماد مبارز الدّین محمّد نے کرمان پر قبضہ کر لیا ۔ اس نے ۱۳۵۴ء میں شیراز فتح کیا اور خاندان مُظَفّریہ کی بنیاد رکھی ۔ ۱۳۶۳ء میں اس کا بھائی عماد الدین کرمان میں اس کا جانشین ہوا ۔ اس کی بعض عمارتیں ابھی تک موجود ہیں (کرمان میں پامِنار مسجد) ۔ ابھی کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ صوبے بھر میں اس خاندان کے درمیان لڑائی جھگڑے ہونے لگے جن کا ۱۳۹۳ء میں تیمور نے ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا ۔ آل تیمور کے بعد جنھیں مختلف اوقات میں یہاں کے باغی والیوں کو کچلنا پڑتا تھا (۱۴۰۸ء میں شیخ اُوَیس) کرمان کی فرمانروائی قرہ قویونْلُو کے ہاتھ آئی (تقریباً ۱۴۳۵ء) جنھیں بہت جلد آق قویونْلُو کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی ۔ دراصل اس زمانے سے کرمان کو فارس کے ساتھ متحد کر دیا گیا اور اُزُون حسن کا ایک رشتہ دار یہاں کا والی مقرر ہوا ۔

مآخذ (۱) جُوَیْنی : تاریخ جہانگشای؛ (۲) ناصر الدّین : سمط العُلیٰ؛ (۳) حمد اللہ المستوفی : تاریخ گزیدہ؛ (۴) علی یزدی : شرف نامہ؛ (۵) عبد الرزاق سمرقندی : مطلع سعدین؛ (۶) میر خواند : روضۃ الصفا؛ (۷) خواند میر : حبیب السیر ۔

۱۵۰۲ سے ۱۷۹۴ء تک : آق قویونْلُو خاندان کے آخری حکمران ابوالفتح بیگ بایْنْدری کا عہد تھا جب شاہ اسمٰعیل نے صوبۂ کرمان فتح کیا (حدود ۱۵۰۲ء) اور اس وقت سے یہ صفوی خاندان [رک بہ صَفَویّہ] کے قبضے میں آ گیا ۔ ۱۵۰۹ء میں اسے ازبکوں کے حملے کا سامنا کرنا پڑا لیکن، عہد صفویہ کے خاتمے تک کرمان میں امن و امان کا دورہ رہا ۔ سارے ایران کی طرح یہاں کے باشندوں کی اکثریت بھی سرکاری مذہب اختیار کرکے اِثناعَشَریہ شیعہ ہو گئی ۔ کرمان کا ایک مشہور ترین صفوی والی گنج علی خان (۱۵۹۶ تا ۱۶۲۱ء) تھا جس نے کئی کارواں سرائیں اور بازار تعمیر کیے ۔ ۱۷۲۰ء میں محمود خان کے زیر قیادت افغانوں نے جب اصفہان کی جانب اپنی پیش قدمی کا آغاز کیا تو وہ کرمان سے گزرے جس نے صفویوں کا انتزاع کر دیا ۔ اس کے بعد نادر شاہ کی حکومت (۱۷۳۵ تا ۱۷۴۷ء) آئی ۔ پھر طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا ۔ افغان خانہ بدوش اور بلوچ ملک کو تاراج کرتے رہے ۔ ۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۸ء میں کریم خان زَنْد نے کرمان پر زبردستی قبضہ کر لیا ۔ اس نے جس خاندان کی بنیاد رکھی اس کا تختہ الٹنے سے صوبے اور خصوصاً دارالحکومت پر ایسی ہولناک تباہی نازل ہوئی کہ اس کی مثال کرمان کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی ۔ کریم خان کا بیٹا لُطف علی خان [رک بآں] آغا محمّد خان قاجار کے سامنے سے بھاگا اور ۱۷۹۴ء میں کرمان میں پناہ گزیں ہوا جہاں کے کچھ باشندے اس کے وفادار تھے، مگر اسی سال دارالحکومت کو ہتیار ڈالنے پڑے اور اگرچہ لطف علی خان بَم کی جانب فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا، لیکن بعد ازاں اس کے ساتھ بے وفائی کی گئی اور اسے آغا محمّد کے حوالے کر دیا گیا ۔ قاجار نے بڑا ہولناک انتقام لیا ۔ مستند مآخذ کی رو سے اس نے ۲۰ ہزار عورتیں اور بچے غلام بنا کر فروخت کیے اور وہاں کے ۳۵ ہزار مردوں کو الدھا کر دیا ۔ اس فعل نے صوبے کی ساری طاقت اور خوشحالی کا خاتمہ کر دیا اور ایک سو سال تک اس کی حالت نہ سدھر سکی ۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

مآخذ : خواند میر اور صفویہ و مابعد کے خاندانوں کی فارسی تواریخ (دیکھیے Grundriss der Iran. Phil.، ۲ : ۵۸۶ ببعد، ۵۹۲، ۵۹۴) .

۱۷۹۴ء سے شاہان قاجار [رک بآں] کرمان پر والیوں کے ذریعے حکومت کرتے تھے۔ جو عموماً ان کے خاندان ہی کے افراد ہوتے تھے۔ ۱۸۳۹ سے ۱۸۴۱ء کے دوران میں ایک شخص آغا خان نامی نے صوبے کو قاجاریوں کے پنجے سے آزاد کرانے کی متعدد ناکام کوششیں کیں۔ اس زمانے سے اس صوبے کی تاریخ میں کوئی قابل ذکر واقعہ رونما نہیں ہوا۔ سیاسیات عالم میں جس طرح ایران کو ایک اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہوتی گئی اگرچہ وہ خود بے اختیار تھا، اس نسبت سے کرمان آہستہ آہستہ برطانیہ کے حلقۂ اثر میں آتا گیا۔ اس صورت کا اظہار ۱۹۰۷ء کے انگریزی روسی معاہدے سے ہو گیا .

بڑے بڑے شہر اور اضلاع : کرمان کا صوبہ آج کل انیس اضلاع میں منقسم ہے۔ مقدسی نے جن پانچ بڑے شہروں کا ذکر کیا ہے (دیکھیے نیچے) ان میں سے تین، یعنی سیرجان، جیرفت اور نرماسیر کا اب وجود نہیں رہا۔ اب صرف ان ناموں کے اضلاع موجود ہیں۔ جغرافیے کی قدیم کتابوں میں ایسے کئی شہروں اور دیہات کے نام ملتے ہیں جو معدوم ہو چکے ہیں یا ابھی ان کا تعین نہیں کیا جا سکا .

شمالی حصے میں دارالحکومت کرمان [رک بآں] واقع ہے۔ کرمان سے یزد جانے والی سڑک پر زرند اور بافق ابھی تک باقی ہیں۔ اس سڑک کے شمال مشرق میں صحرا کے کنارے کوہ بنان (جسے مارکوپولو نے Cobinan لکھا ہے) اور راور بھی موجود ہیں۔ خبیص ایک تاریخی مقام ہے اور کرمان کے مشرق جانب کافی نشیبی علاقے میں واقع ہے۔ یہاں کی کھجور بہت مشہور ہے۔ دارالحکومت سے جنوب مشرق میں ماہان (موجود ماہون) صوفی سید نعمت اللہ (م ۔ ۱۴۳۱ء) کی خانقاہ کی وجہ سے مشہور ہے جو شاہ عباس کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی۔ المقدسی کے زمانے سے ماہان میں عرب آباد ہیں .

مغرب میں مرکزی شہر دارالحکومت سیرجان (اکثر شیرجان) ہے۔ یہ صوبۂ فارس سے بہت نزدیک واقع ہے۔ المقدسی کے زمانے میں یہ شہر شیراز سے بڑا تھا، لیکن ۱۳۹۶ء میں تیمور کی فوجوں کا ایک عرصے تک مقابلہ کرنے کے بعد تباہ ہو گیا۔ اب اس کا محل وقوع چونے کے پتھر کی ایک چٹان سے معلوم ہوتا ہے جو ہموار میدان میں ۳۰۰ فٹ بلند کھڑی ہے اور قلعۂ سنگ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ چٹان پرانے زمانے کے قلعے کی نشانی ہے اور اس کا حال Sykes نے بیان کیا ہے (10,000 Miles, etc، ص ۴۳۱ ببعد)۔ اسے یہاں کچھ کتبات بھی ملے تھے۔ اس کے قریب ہی موضع سعید آباد واقع ہے۔ یہ میدان کرمان سے زیادہ زرخیز ہے اور اس میں کئی گاؤں ہیں .

بم [رک بآں] جو صوبے کے مشرقی حصے میں ہے ابھی تک قائم ہے۔ سیرجان سے بم جانے والی سڑک رَیْن اور دَرْزِیْن سے گزرتی ہے۔ درزین سے ایک سڑک جیرفت کو جاتی تھی (اور اب بھی جاتی ہے)۔ نَرْمَا سِیْر (نیز نَرْمَا شِیْر) بم سے کچھ تھوڑے ہی سے فاصلے پر جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ قبل ازیں یہ ہندوستان سے تجارت کی ایک اہم منڈی تھی۔ فی زماننا اس نام کا صرف ایک ضلع موجود ہے۔ موضع فَہْلِج جو اسی ضلع میں واقع ہے، عہد الغانہ میں ایک قلعہ تھا .

کرمان کے جنوبی حصے کا پرانا صدر مقام جِیْرَفْت اس جگہ واقع تھا جسے آج کل ہم شہر دَقیانوس کہتے ہیں۔ مارکوپولو کے زمانے ہی میں اس شہر کی جگہ اسی کے ایک سابقہ محلے کُمادِن

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

نے لے لی تھی جسے یہ وینسی سیاح Camadi لکھتا ہے ۔ یہ ایک اہم منڈی تھی ۔ الادریسی (مترجمۂ Reinaud، ص ۳۲۳) کی ایک عبارت پر اپنے قیاس کی بنیاد رکھتے ہوئے Sykes (کتاب مذکور، ص ۴۴۵) لکھتا ہے کہ قدیم ترین دارالحکومت کَرْمَنَہ کی تلاش جِیْرُفْت اور نَہْاج کے درمیان کرنی چاہیے ۔ وَلاشْگرد یا گلاشْگرد جِیْرُفْت سے ہرمز جانے والی سڑک پر واقع ہیں ۔ اس نام کا ایک گاؤں ابھی تک موجود ہے ۔

آبادی : بیان کیا جاتا ہے کہ عام طور پر کرمان کے باشندے گرمی کی وجہ سے سیاہی مائل گندمی رنگ اور چھریرے جسم کے ہوتے ہیں (الاصطخری) ۔ گرم شیر میں واقعی بہت سخت گرمی پڑتی ہے جو مضر صحت ہوتی ہے ۔ کرمان کے قدیم ترین باشندوں کی نمائندگی ازمنۂ وسطیٰ میں غالباً قُفْس نامی پہاڑی لوگ کرتے تھے جو جنوب کے کوہستانی ضلع میں آباد تھے یا پھر بارز (παρικάνιοι، در ہیروڈوٹس، ۳ : ۹۲) کرتے تھے ۔ وہ ان پہاڑوں میں رہتے تھے جو شہر کرمان کے جنوب مغرب میں واقع اور آج بھی بارز کوہ کے نام سے مشہور ہیں ۔ المقدسی (ص ۴۷۱) لکھتا ہے کہ قُفْس اور بَلُوص کی زبان ناقابل فہم ہے ۔ غالباً یہ لوگ یا تو گردش زمانہ سے نیست و نابود ہوگئے اور یا آل بویہ اور سلاجقہ کے عہد میں ایرانی عنصر میں خلط ملط ہوگئے ۔ بلوص کے بارے میں جو شمال مغرب سے نقل سکونت کرکے (البلاذری اور الطبری ان کا ذکر نہیں کرتے) بارھویں صدی سے مکران میں آباد ہوگئے تھے [رک بہ بلوچستان] ۔ جہاں تک یہاں کی مستقل سکونت رکھنے والی آبادی کا تعلق ہے وہ ایرانی النسل ہی معلوم ہوتی ہے ۔ Strabo پہلے ہی کہہ چکا ہے کہ ان کی رسوم اور زبان میڈیا اور ایران کے باشندوں جیسی ہیں (۱۵ : ۲، ۱۳) ۔ ساسانیوں کے عہد سے ان کا ایک حصہ نسطوری عیسائیوں پر مشتمل تھا ۔ کرمان کا اسقف فارس کے اسقف اعظم کے ماتحت ہوتا تھا ۔ لوگوں میں اسلام آہستہ آہستہ پھیلایا گیا ۔ بقول الطبری کوہستانیوں نے بنو عباس کے عہد میں اسلام قبول کیا تھا ۔ آگے چل کر ان لوگوں نے شیعہ تحریک کی بڑی حمایت دکھائی (المقدسی) ۔ یاقوت (: [معجم البلدان،] بذیل مادۂ قُفْس) اس بات پر زور دیتا ہے کہ جب وہ کسی مذہب کے بھی پیرو نہیں تھے اس وقت بھی حضرت علی رض بن ابی طالب کا انتہائی احترام کرتے تھے ۔ یہاں کی نو مسلم آبادی فرقہ پرستوں، مثلاً خارجیوں اور بعد ازاں اسمٰعیلیوں کے اثرات کی زد میں بہت زیادہ آتی تھی ۔ مذہبی اعتقادات کے نقطۂ نظر سے بقول المقدسی شِیْرجان کے باشندے اہل الحدیث اور جِیْرُفْت کے اہل الرائے تھے ۔ بالآخر جب صفوی نمودار ہوئے تو شیعیت کی سرکاری صورت اثنا عشریہ مذہب رائج ہوئی اور آج بھی لوگوں کی بڑی اکثریت اسی مذہب کی پابند ہے ۔ انیسویں صدی میں شَیْخی فرقے [رک بہ شَیْخیّہ] کے کئی پیرو صوبۂ کرمان میں پیدا ہوگئے، چنانچہ اس کا شمار ان کے اہم ترین مراکز میں ہونے لگا ۔ Sykes کے اندازے کے مطابق ان کی تعداد ۷ ہزار تھی ۔ بابیوں کی تعداد ان سے کچھ کم تھی ۔ آخری بات یہ ہے کہ کرمان ان اضلاع میں سے ہے جہاں مذہب زردشت کے پیرو ایک فرقے کی حیثیت سے برقرار رہے اور اپنے مرشدین مذہب کی قدیم تنظیم کے ماتحت روحانی رہنمائی حاصل کرتے رہے ۔ Tavernier (ص ۳۹۰) لکھتا ہے کہ اس کے وقت (حدود ۱۶۰۹ء) میں ان کی کثیر تعداد کے ہندوستان میں ہجرت کر جانے کے بعد بھی صرف شہر کرمان ہی میں ان کی آبادی ۱۰ ہزار سے زیادہ تھی ۔ آبادی سے چار فرسخ کے فاصلے پر ان کا دَیر تھا ۔ یہ لوگ

www.besturdubooks.wordpress.com

زیادہ تر اُونٹ کے تاجر تھے۔ اٹھارھویں صدی تک کرمان میں دَسْتُور کا ایک مدرسہ بھی لازمًا ہوگا۔ اسے کافی اثر و رسوخ حاصل تھا۔ بقول Khanikoff ۱۸۳۷ء میں آغا محمّد شاہ کے ہاتھوں کرمان کی تباہی عمل میں آنے سے قبل وہاں ۱۲ ہزار پارسی گھرانے آباد تھے۔ ۱۹۰۰ء کے قریب Sykes نے ان کی آبادی ۱۷۰۰ نفوس پر مشتمل بتائی ہے [نیز رک بہ پارسی]۔

یزد کے پارسیوں کی طرح کرمان کے پارسی بھی اپنی قدیم متروک الاستعمال بولی گَبْری بولتے ہیں۔ Houtum Schindler اور براؤن جیسے لوگوں نے (دیکھیے *Grundriss der Ir. Phil.*، ۱ : ۳۸۱ ببعد) اور حال ہی میں O. Mann (*Die Mundarten von Khunsar, etc*، طبع K. Hadank برلن لائپزگ ۱۹۳۶ء) نے مطالعہ کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کرمان میں جو دوسری بولیاں استعمال ہوتی ہیں ان کا کبھی خصوصی مطالعہ نہیں کیا گیا۔ ان کا تعلق جنوبی السنہ کی برادری سے ہے جن کی نمائندگی مثال کے طور پر فارس اور کاشان کی بولیاں کرتی ہیں (دیکھیے Geiger در *Grundriss*، ۱ : ۲، ص ۲۲۴)۔ المقدسی کی رائے ہے کہ کرمان کی زبان خراسان سے ملتی جلتی ہے۔

خانہ بدوش لوگ جو کہ کرمان کی آبادی میں جو خاصی بڑی اقلیت پر مشتمل ہیں غالبًا عرب ترک اور کرد حملہ آوروں کی نسل سے ہیں۔

۱۹۰۰ء کے قریب صوبے کی آبادی کا اندازہ ۷۵۰,۰۰۰ لگایا گیا تھا۔

(۲) شہر کرمان صوبے کے شمال مشرقی حصے میں (۳۰ درجے ۱۷ دقیقے عرض بلد شمالی ۵۶ درجے ۵۹ دقیقے طول بلد مشرقی) واقع ہے اسے ہر اعتبار سے اس شہر اور ضلع سے مطابقت دی جا سکتی ہے جسے عرب جغرافیہ نویس بَرْدَسِیر (یاقوت نے بَرْدَسِیر لکھا ہے) یا گُوَاشِیر (نیز دیکھیے المقدسی ص ۴۶۰) کے نام سے یاد کرتے تھے۔ یہ دونوں صورتیں ممکن ہے 'بِرْ اَرْدَشِیر' سے ماخوذ ہوں جو بقول حَمْزَہ اِصْفَہانی (طبع Gottwald، ص ۴۶) خاندان ساسانیاں کے بانی اَرْدَشِیر کے ایک تعمیر کردہ شہر کا نام تھا۔ شہر کے مشرق میں وہ پرانا قلعہ، یعنی قلعۂ اَرْدَشِیر ہے جو ازمنۂ وسطیٰ میں شہر کے دروازے سے قریب باہر ہی واقع ہوگا۔ یہ قلعہ بھی اردشیر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ شہر بَمّ اور جِیرُفت جتنا قدیم نہیں ہے (Sykes بہ تتبع افضل الدّین)۔ کرمان کے جنوب مغرب میں ایک ضلع ابھی تک بَرْدَسِیر کے نام سے مشہور ہے۔ نویں صدی میں جب ابن الیاس نے اس پر قبضہ کیا تھا اس وقت یہ کچھ ایسا بڑا شہر نہیں تھا، لیکن بارھویں صدی میں یاقوت اسے کرمان کا سب سے بڑا شہر بتاتا ہے۔ اس کا نام کرمان اسی نام کے صوبے کا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے پڑا۔ سرکاری طور پر اس کا اعزازی نام دَارُالْاَمان ہے۔

یہ شہر جوپَر کے سلسلۂ کوہ سے ۱۲ میل کے فاصلے اور تقریبًا ۶۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ایسی جگہ واقع ہے جہاں تین وادیاں آپس میں ملتی ہیں۔ اس کے چاروں جانب سٹیپ کے لق و دق میدان پھیلے ہوئے ہیں اور بہت کم مزروعہ زمین نظر آتی ہے۔ قلعۂ اردشیر جس کا ابھی ذکر ہوا ہے اور شہر کے درمیان ذرا کم بلندی پر ایک منہدم قلعہ، قَلْعَۂ دُخْتَر ہے جو پیشترازیں شہر کے اندر واقع ہوگا۔ شہر کے مشرق اور جنوب کی طرف پھیلے ہوئے میدانوں میں ہر طرف عمارتوں کے کھنڈر بہت بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ یہاں نہایت خوبصورت گلی ظروف (Fayence) کے ٹکڑے اور دیگر آثار قدیمہ نظر آتے ہیں۔ خود شہر کے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

چاروں طرف پکی مٹی کی ایک دیوار ہے جس میں چار دروازے ہیں۔ فصیل سے باہر شمال مشرق کی طرف زردشتیوں کی آبادی محلۂ گبر ہے۔ قلعہ مغربی جانب واقع ہے۔ حمد اللہ المستوفی (نزھۃ القلوب، ص ۱۴۰) نے ایک مسجد کا ذکر کیا ہے جو حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی، لیکن آج جو قدیم ترین مسجد ہمیں ملتی ہے وہ مسجد ملک ہے جسے تورانشاہ سلجوق (۱۰۸۴ تا ۱۰۹۶ء) نے بنوایا تھا۔ یہ مسجد سولھویں صدی عیسوی میں کھنڈر بن گئی تھی، لیکن اب اس کی مرمت ہوگئی ہے۔ دوسری دو اہم مسجدیں مسجد جامع اور مسجد پامنار ہیں۔ مسجد جامع کو ایک کتبے کی رو سے ۱۳۴۹ء میں مبارز الدین مظفر نے اور مسجد پامنار کو اس کے بھائی عماد الدین نے تعمیر کرایا تھا۔ ایک یادگار جو ۱۸۹۶ء میں زلزلے سے تباہ ہوگئی گنبد سبز تھی۔ یہ ایک استوانہ نما عمارت تھی اور اس پر سبزی مائل نیلے رنگ کی کاشی کاری کی ہوئی تھی۔ Sykes کو جو معلومات بہم پہنچائی گئی تھیں ان کی رو سے یہ خاندان قتلغ خانیہ کے ایک رکن کا مقبرہ تھا جو ۶۴۰ھ/ ۱۲۴۲ء میں تعمیر ہوا تھا۔ ۱۷۹۴ء کی تباہی کے بعد فتح علی شاہ کے عہد میں یہ شہر دوبارہ تعمیر کیا گیا، لیکن اس کی خوشحالی کا دور کہیں ۱۸۶۰ء میں شروع ہوا جب یہاں کا والی وکیل الملک تھا۔ موجودہ شہر کا نقشہ Sykes نے ص ۱۸۸ کے مقابل دیا ہے (*10,000 Miles, etc*)۔ انیسویں صدی کے اواخر میں آبادی میں اضافہ ہوا۔ Schindler نے ۱۸۷۸ء میں یہاں کی آبادی ۱۱۷۰۰ اور Sykes نے ۱۹۰۰ء میں ۹۱۲۰ بتائی ہے۔ سب سے زیادہ تعداد شیعیوں کی ہے، پھر شیخی (۶۰۰۰)، پھر بابی (۳۰۰۰) اور پھر زردشتی (۱۶۰۰) آتے ہیں۔ یہودیوں کی تعداد بہت ہی کم، یعنی صرف ۷۰ نفوس پر مشتمل ہے۔ [صوبۂ کرمان کی موجودہ آبادی ۷۷۳,۶۶۹ ہے، دیکھیے: *The Statesman's Year-book 1975/1976*، بمددِ اشاریہ]۔ کرمان کو صنعتی اعتبار سے بڑی بھاری شہرت شالوں کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے، لیکن اب اونی اور ریشمی قالینوں کی صنعت اس سے بازی لے گئی ہے۔ کاریگر تقریباً سب کے سب مرد ہیں۔ Sykes کے اندازے کے مطابق چالیس ہزار پونڈ مالیت کے مال کی سالانہ برآمد ہوتی ہے۔ نمدا تیار کرنا یہاں کی ایک اور اہم صنعت ہے [کرمان دور جدید میں بھی داخل ہو چکا ہے۔ وائرلیس سٹیشن ہے۔ بنک ملی ایران کی شاخ ہے۔ ایبل کے لیے عدالت موجود ہے]۔

مآخذ: عرب جغرافیہ نویسوں کے بیانات (جن کا حوالہ متن میں ہے) سے حسب ذیل نے فائدہ اٹھایا ہے: (۱) P. Schwarz: *Iran im Mittelalter*، ۳ (لائپزگ ۱۹۱۲ء): ۲۱۱ ببعد؛ (۲) Barbier de Meynard: *Dictionnaire de la Perse*، پیرس ۱۸۶۱ء؛ (۳) J. Marquart: *Abh. G. W. Gött. Êrânshahr*، N.F. برلن ۱۹۰۱ء، شمارہ ۲، ۳: ۳۰ ببعد، ۱۷۹ ببعد؛ (۴) Tomaschek: *Zur historischen Topographie Persiens*، *S.B. Ak. Wien*، ۱۸۹۰ء، ج ۱۲۱، Abh.، ج ۸؛ (۵) Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۲۷۹ ببعد [اردو ترجمہ بھی موجود ہے]؛ بڑے بڑے مغربی سیاح یہ ہیں: (۶) Marco Polo؛ (۷) H. Pottinger: *Travels in Beloochistan*، ۱۸۱۰ء؛ (۸) N. de Khanikoff: *Mémoire sur l'ethnographie de la perse*، پیرس ۱۸۶۶ء؛ (۹) Lovett، Smith و Goldsmid: *Eastern Persia*، لنڈن ۱۸۷۶ء؛ (۱۰) A. H. Schindler: *Reisen im Südlichen Persien 1897*، *Z. G. Erd. Berl.*، ۱۶: ۳۲۳ ببعد؛ (۱۱) وہی مصنف: *Itineraries of Marco Polo*، *JRAS.*، *N. S.*، ج ۱۲؛ (۱۲) G. N. Curzon: *Persia*، لنڈن ۱۸۹۲ء، ۲: ۲۴۳

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

بعد؛ (۱۳) E. G. Browne : *A year amongst the Persians*، بار دوم، کیمبرج ۱۹۲۶ء؛ (۱۴) P. Molesworth Sykes : *Ten Thousand Miles in Persia*، لنڈن ۱۹۰۲ء؛ مصنف جو کہ ۱۸۹۳ سے ۱۸۹۹ء تک کرمان میں انگریزی قونصل رہا۔ موجودہ صوبے کے بارے میں مستند ماخذ ہے دیگر جغرافیائی حالات؛ (۱۵) حاجی خلیفہ : جہان نما، قسطنطنیہ ۱۱۴۵ھ، ص ۲۵۶؛ (۱۶) C. Ritter : *Erdkunde*، ج ۸؛ (۱۷) K. Prellberg : *Persien eine historische Landschaft*، لائپزگ ۱۸۹۱ء۔ تاریخی ماخذ کا متن میں پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔ مقامی وقائع کی نوعیت کے تین ماخذ: (۱۸) محمّد بن ابراهیم : تاریخ آل سلجوق، در *Recueil de Textes relatifs à l'histoire des Seldjoucides*، لائیڈن ۱۸۸۶ء؛ (۱۹) افضل الدّین احمد بن حامد کرمانی : عقد الاولی للموقف الاعلی، طبع لیتھو، تہران ۱۲۹۳ھ (دیکھیے *Cat. of the Printed Pers. Books in the Brit. Mus.*، لنڈن ۱۹۲۲ء، ص ۹۰)؛ (۲۰) ناصر الدّین : سمت العلی للحضرت العلیا، محررہ ۱۳۱۶/۱۷۱۶ء (دیکھیے *Cat. of the Pers. Mss. in the Brit. Mus.*، ۲ : ۸۴۹)؛ (۲۱) E. A. Strandman : *Chuandamir's af hanaling om Qarachitaiska dynastin med inledning och anmärkingar*، Helsingfors ۱۸۶۹ء؛ (۲۲) Sykes کی مذکورہ تصنیف کے ص ۴۸ تا ۷۱ پر صوبۂ کرمان کی تاریخ کا خلاصہ درج ہے؛ (۲۳) موجودہ زمانے کے لیے دیکھیے E. G. Browne : *The Persian Revolution*، کیمبرج ۱۹۱۰ء؛ (۲۴) Sir Percy Molesworth Sykes : *History of Persia*، بار دوم، لنڈن ۱۹۲۱ء؛ (۲۴) A. H. Schindler : *Die Parsen in Persien*، *ZDMG*، ۱۸۸۲ء، ص ۵۴ تا ۸۸؛ (۲۵) Dosabhai Framji Karaka : *History of the Parsis*، بار دوم، ۱۸۸۴ء؛ (۲۶) Spiegel : *Eranische Altertumskunde*، ج ۱، لائپزگ ۱۸۷۱ء؛ (۲۷) *Grundriss der Iranischen Philologie*، لنڈن ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۶ء؛ (۲۸) E. G. Browne : *Literary History of Persia*، وہی مصنف : *Persian Literature under Tartar Dominion*، کیمبرج ۱۹۲۰ء؛ (۲۹) وہی مصنف : *Persian Literature in Modern Times*، کیمبرج ۱۹۲۴ء؛ (۳۰) de Gobineau : *Les religions et les philosophies de l'Asie Centrale*، پیرس ۱۹۰۰ء؛ (۳۱) Stanley Lane-Poole : *Catalogue of Oriental Coins in the Brit. Mus.*، لنڈن ۱۸۷۵ تا ۱۸۹۰ء، ج ۱، ۶، ۷، ۹، بالخصوص، ۱۰ : ۱۸۳ تا ۱۸۴؛ [(۳۲) *The Statesman's Year-book 1975/1976*، بمدد اشاریہ؛ (۳۳) منورسکی : حدود العالم، انگریزی ترجمہ، لنڈن ۱۹۳۷ء، بمدد اشاریہ].

(J. H. KRAMERS)

* **کِرْمَان شاہ** : ایک شہر جو ان پہاڑی سلسلوں کے درمیان ایک میدان میں واقع ہے جو سطح مرتفع ایران کی جنوب مغربی سرحد پر پھیلے ہوئے ہیں، آج کل یہ اس ایرانی صوبے کا صدر مقام ہے جس کے شمال میں کُردستان ہے اور جنوب میں لُرِستان۔ شہر کا جغرافیائی محل وقوع تقریباً ۳۴ درجے ۲۰ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۴۷ درجے طول بلد مشرق ہے۔ قَرہ سُو کی ندی اس میدان سے گزرتی ہے اور شہر کے شمال مشرق میں جنوب مغرب کی طرف بہتی ہوئی جنوب میں اور آگے جا کر دریاے گاما سیاب (پیشتر ازیں گاؤماسَارُود) سے جا ملتی ہے۔ مؤخرالذّکر دریاے کَرْخا [رکَ باں] کا معاون اور صوبۂ مذکور کا اہم ترین دریا ہے۔

غالباً یہی وہ علاقہ ہے جہاں میڈیا والوں کی قدیم ترین بادشاہت قائم ہوئی (A. Billerbeck : *Das Sandjak Suleimania und dessen Persische Nachbarlandschaften*، لائپزگ ۱۸۹۸ء، ص ۱۶۲) اور یہیں پارتھیا کے صوبے Μηδία ἡ κάτω اور Καμβαδηνή

www.besturdubooks.wordpress.com

واقع تھے - (Isidore of Charax ۵۴) - یہی صوبہ ساسانیوں کے زمانے میں اور عربوں کی فتح کے بعد ابتدائی صدیوں میں ماہ (موسی سکنہ خسرنہ کے ہاں مے) کے نام سے مشہور رہا - De Morgan یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ قدیم شہر کَمْبَدِنہ (Cambadene) کے کھنڈر کرمان شاہ کے شمال میں واقع تھے - خود یہ شہر کچھ ایسا پرانا نہیں ہے اس کی بنیاد ساسانی دور میں رکھی گئی تھی اور سولھویں صدی سے اس کا شمار اہم شہروں میں ہونے لگا تھا - قدیم عرب جغرافیہ نویس اسے قِرْمَاسِیْن کے نام سے جانتے تھے (اس کی دوسری صورتیں قِرْمَاسِن قَرْمَاسِیْن، قِرْمَاسِین، قَرْمَشِیْن)، مقدسی (ص۲۸) کہتا ہے کہ یہ کرمانشاہان ہی کا دوسرا نام ہے - دوسری طرف یاقوت (۴ : ۶۹) کا خیال ہے کہ قَرْمِیسین کرمانشاہان کا معرب ہے (دمشقی نے یہی بات کچھ تامل سے لکھی ہے، لیکن ابن الفقیہ پہلے ہی پہلی صورت کی تشریح دوسری صورت کی سند سے کر چکا تھا) - تاہم قزوینی (Geography، ص ۲۹۰) کہتا ہے کہ قَرْمِیسِیْن کرمانشاہان کے قریب واقع ہے - قرمیسین کی وجہ تسمیہ کے بارے میں Ritter (۹ : ۳۷۴) دریاے کُرْخہ کی جانب توجہ دلاتا ہے جس کا ذکر Tacitus (*Annales*، ۱۲ : ۱۳) نے کیا ہے - کرمانشاہان کا نام سب سے پہلے بظاہر دسویں صدی میں غالباً آل بُوَیْہ کے عہد میں ہمارے سامنے آتا ہے، لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کن حالات میں حمد اللہ المستوفی (نزھۃ القلوب، ص ۱۰۸) نے ایک بہت مشہور و معروف روایت لکھی ہے جس میں بہرام چہارم (۳۸۸ تا ۳۹۹ء) کو اس شہر کا بانی بتایا گیا ہے - اس بادشاہ نے صوبۂ کرمان [رک بآں] کے والی کی حیثیت سے کرمان شاہ کا خطاب پایا تھا اور بلا شبہہ مؤرخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس نے ایک شہر بسایا تھا، لیکن زیادہ اغلب ہے کہ یہ کرمان شاہ یَزْد اور کِرْمان کے درمیان کا چھوٹا قصبہ تھا (دیکھیے الطبری، در *Gesch. d. Pers. u. Arab.* : Nöldeke، ص ۷۱) - ایک اور روایت میں جو تقریباً ہر جغرافیہ نویس کے ہاں کم و بیش وضاحت کے ساتھ ملتی ہے اس کی بنیاد شاہ کَوَاذ بن فِیْرُوز (۴۸۸ تا ۵۳۱ء؛ بالخصوص دیکھیے المقدسی، ص ۲۵۷ ببعد) سے منسوب کی جاتی ہے - شہر کے گرد و نواح میں ساسانی بادشاہوں کے عہد کے کئی آثار موجود تھے اور آج بھی پائے جاتے ہیں - یہ بادشاہ وہاں اکثر سکونت رکھتے تھے اور زمانۂ مابعد کے فرمانروا بھی اس سلسلے میں ان کے نقش قدم پر چلتے رہے، مثلاً ہارون الرّشید اور عضدالدولہ بُوَیہی جس نے وہاں ایک قصر تعمیر کرایا تھا (المقدسی، ص۳۹۳) - شہر کا نیا نام شاید اسی واقعے سے منسوب کر سکتے ہیں کیونکہ عضدالدولہ ہی کے عہد میں آل بُوَیہ صوبۂ کرمان [رک بآں] کے مالک بنے تھے -

حُلْوَان کی فتح کے بعد قَرْمِیسِیْن پر عربوں کا پرامن طریق سے قبضہ ہو گیا تھا (۶۴۰ء میں؛ البلاذری، ص ۳۰۱) - اسی زمانے میں ضلع ماہ جو صوبۂ جِبَال میں شامل تھا کوفے اور بصرے کے باشندوں کو بطور جاگیر عطا کیا گیا - بالائی حصہ ماہ الکوفہ کے نام سے مشہور ہوا، جس کا صدر مقام دِیْنَوَر تھا اور زیریں حصہ ماہ البصرہ کے نام سے جس کا صدرمقام قَرْمِیسِیْن تھا (البلاذری، ص۳۰۶؛ قدامۃ، ص ۲۲۶) - بہرحال دِیْنَوَر [رک بآں] قرمیسین سے کہیں زیادہ اہم شہر تھا (دیکھیے Schwartz، ص ۴۷۹) اور اس زمانے کے جغرافیہ نویس اس کا ذکر بَغْدَاد —— خَانِقِیْن —— حُلْوَان —— قَرْمِیسِیْن —— بِیْسْتُوْن —— ہَمَذَان والی شاہراہ کی ایک منزل کی حیثیت سے کرتے ہیں - ایک اور اہم سڑک قرمیسین سے نِہَاوَنْد کو جاتی تھی - کہا جاتا ہے کہ اس

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

زمانے میں یہ شہر ایک بہت زرخیز میدان میں عمدہ جگہ پر واقع تھا ۔ اس پر یکے بعد دیگرے بنو عبّاس، آل بُوَیہ (اس زمانے میں یہ لازماً کرد خاندان حَسَنُوَیہ [رک بآں] کی عملداری میں شامل تھا، اگرچہ شرف الدّین نے شرف نامہ میں اس کا تذکرہ نہیں کیا) اور سلاجقہ حکومت کرتے رہے ۔ دور مغول میں اس کی حیثیت گھٹتے گھٹتے ایک معمولی گاؤں کی ہو کر رہ گئی تھی (حمد اللہ قزوینی) ۔

کرمان شاہ کی اہمیت صفویوں کے عہد حکومت میں اس وقت ہوئی جب اسے عثمانیوں کے خلاف سرحدی مورچہ بنایا گیا ۔ عثمانی ترکوں نے خصوصاً مراد چہارم کے بعد عراق میں قدم جما لیے اور ان کا اس قدر قریب آ جانے سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا ۔ ترکوں نے ایران سے جنگ کے دوران میں کئی بار قبضہ کیا، مثال کے طور پر ۱۶۳۰ء میں خُسرو پاشا [رک بآں] کی مہم پیش کی جا سکتی ہے ۔ اس وقت یہ ایک قلعہ بند شہر تھا جس کے گرد خشتی فصیل بنی ہوئی تھی ۔ اولیا چلبی (۴ : ۳۵۳) کے اس بیان، جس میں امن شہر کا بسانا شاہ اسمٰعیل سے منسوب کیا ہے، کا مطلب غالباً یہ ہے کہ شاہ اسمٰعیل ہی نے پہلی بار اس کی قلعہ بندی کی تھی ۔ صفویوں کے زوال (۱۷۲۲ء) کے بعد بغداد کا پاشا اس پر قابض ہو گیا، لیکن اشرف خان نے اسے نکال باہر کیا ۔ ۱۷۳۱ء میں پھر ترکوں کا قبضہ ہو گیا اور اس بار انہیں اس شخص کے ہاتھوں نکلنا پڑا جو آگے چل کر نادر شاہ مشہور ہوا ۔ ۱۷۳۲ء اور ۱۷۳۶ء کے صلح کے عہد ناموں کی رو سے کرمان شاہ ایران کے پاس رہنے دیا گیا (دیکھیے G.O.R. : Von. Hammer، ۷ : ۳۰۴ ببعد) ۔ ۱۷۵۴ء میں نادر شاہ کی طرف سے میرزا محمّد تقی خان یہاں کا والی مقرر ہوا ۔ آگے چل کر اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تاآنکہ ۱۷۶۶ء میں کریم خان زند نے دو سال کے محاصرے کے بعد یہ شہر فتح کر لیا ۔ عہد قاجار میں کرمان شاہ کی اہمیت میں اضافہ ہوا ۔ ۱۷۹۰ء میں یہاں کی آبادی ۶۰۰۰ پر مشتمل تھی (Beauchamps، جس کا حوالہ Ritter نے دیا ہے)، لیکن ۱۸۱۰ء ہی میں یہ ۱۲۰۰۰ گھرانوں تک بڑھ چکی تھی (Kinneir، در Ritter) ۔ فتح علی شاہ کے بیٹے محمّد علی میرزا کی گورنری کے زمانے میں جو کرمان شاہ میں تقریباً خود مختار والی کی حیثیت سے رہتا تھا، یہ شہر ترکوں کے مقابلے کے لیے زبردست گڑھ بن گیا ۔ ترکوں اور ایرانیوں میں جو صلح ۱۸۲۳ء میں ہوئی تھی اس کے بعد علی میرزا نے اتنی قوت حاصل کر لی تھی کہ اس نے زہاب کا وسیع ضلع اپنے صوبے میں شامل کر لیا حالانکہ یہ ترکی کو واپس ملنا چاہیے تھا ۔ عہد قاجار کے کرمان شاہ کے والیوں کی ۱۹۰۵ء کی مکمل فہرست Rabino (دیکھیے ماٰخذ) نے دی ہے ۔ بالکل قریب زمانے، یعنی اپریل ۱۹۱۵ء تک ترک اس شہر پر قابض رہے اور وسطی (= جرمنی و آسٹریا کی) سلطنتوں کے حق میں تبلیغ کرتے رہے تاآنکہ مارچ ۱۹۱۷ء میں یہاں سے پسپائی پر مجبور کر دیے گئے ۔

آج کل کرمان شاہ دراصل صوبے کا نام ہے شہر کو "کرمانشاہان" کہتے ہیں جو زیادہ صحیح ہے ۔ ۱۹۰۵ء کے قریب اس کی آبادی تقریباً ساٹھ ہزار تھی (Rabino) اور اس کی خوشحالی زیادہ تر اس کے محل وقوع کی مرہون منت ہے کہ وہ بغداد سے ہمذان جانے والی خاصی قدیم اور عظیم تجارتی شاہراہ (الجادّہ، در المقدسی) پر واقع ہے (کرمانشاہان ان دونوں شہروں سے سو سو میل کے فاصلے پر ہے) اس راستے پر آگے تک بہ کثرت آمد و رفت رہتی ہے ۔ عراق کے مقدس مقامات کو جانے والے شیعہ زائرین بھی اسی شاہراہ کو استعمال

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کرتے ہیں ۔ کرمانشاہان میں کوئی قدیم عمارت نہیں ۔ برج و بارہ منہدم کر دیے گئے ہیں ۔ سب سے قابل ذکر عمارت اسلحہ خانہ ہے ۔ والی بھی یہیں سکونت رکھتا ہے ۔ یہ عمارت اس وسیع توپ میدان کے کنارے پر بنی ہوئی ہے ۔ اس شہر میں بہت سی کارواں سرائیں ہیں ۔ جب سے قالین بافی کا کام ختم ہوا کوئی خاص مقامی صنعت نہیں رہی۔ باشندوں کی اکثریت کردوں پر مشتمل ہے ۔ ان کے بعد ایرانیوں، ترکوں، یہودیوں اور مسیحیوں کا نام آتا ہے ۔ گرد و نواح کی زمین بہت زرخیز ہے ۔ اولیا (محل مذکور) اور حاجی خلیفہ (جہان نما، ص ۳۰۲) نے زعفران کی کاشت کا خاص طور سے ذکر کیا ہے ۔

صوبہ ۳۴ درجے ۳۰ دقیقے اور ۳۵ درجے عرض بلد شمالی اور ۴۴ درجے ۳۰ دقیقے اور ۴۸ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد مشرق کے درمیان پھیلا ہوا ہے ۔ صدر مقام اس کے تقریباً مرکز میں واقع ہے ۔ مغربی حصے میں کرند اور قصر شیریں [رک بآں] اور مشرق میں اسد آباد کنگاور (قبل ازیں قصر اللصوص)، بیستون [رک بآں] نہاوند [رک بآں] اور دینور [رک بآں] کے کھنڈر ہیں ۔ اس صوبے میں ہخامنشی اور ساسانی دور کے متعدد آثار قدیمہ ملتے ہیں، جن کا قدیم جغرافیہ نویسوں نے تھوڑی بہت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے ۔ مثال کے طور پر طاق بستاں کے مشہور مجسمے جو کرمانشاہان سے تین میل مشرق میں واقع ہیں جنھیں شاہ خسرو کے گھوڑے کی وجہ سے جغرافیہ نگار شبدیز یا شب داز کے نام سے یاد کرتے ہیں، نیز وہ ٹیلا (دکّہ) جہاں روایت کے مطابق ۱۰۰ ستونوں والے دیوان عام میں خسرو پرویز نے ساری دنیا کے بادشاہوں سے اطاعت کا اقرار لیا تھا [نیز رک بہ بیستون] ۔

اس کا شمار ایران کے خوشحال ترین صوبوں میں ہوتا ہے ۔ یہاں سے چاول اور گندم دساور جاتے ہیں اور خود اپنی ضرورت کے لیے مکئی، چارا، ارنڈ کا تیل اور کپاس پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس کی آبادی [پانچ لاکھ] کے قریب ہے اور یہ ۱۹ اضلاع (بلوک) میں منقسم ہے ۔ ان میں سے متعدد اضلاع ان قبائل کے نام سے موسوم ہیں جو وہاں آباد ہیں ۔ Rabino نے اس صوبے کے چوالیس قبائل کے نام دیے ہیں (نیز دیکھیے Curzon، ۱ : ۵۵۷) جن میں سے بیشتر کرد ہیں ۔ کردوں کا سب سے بڑا قبیلہ کلہور ہے (یہ شرف الدین کے شرف نامہ میں مذکور ہے) جو جنوب مغرب میں آباد ہے اور ایک ضلع اسی کے نام سے موسوم ہے ۔ قصرشیریں کے مغرب میں ایک بہت بڑا کرد قبیلہ سنجابی ہے ۔ O. Mann نے جنوبی کردی بولی کا نام لکی (Lakki) لکھا ہے (*Die Mundarten der Lurstämme im Südlichen Persien*، برلن ۱۹۱۰ء، ص ۲۲)، حالانکہ لک صحیح معنوں میں لرستان میں رہتے ہیں ۔ صوبے کے جنوب میں لر قبائل آباد ہیں ۔ نیم خانہ بدوش آبادی کی اکثریت علی اللٰہی [رک بآں] ہے ۔ مذکورۂ بالا قبائل کے علاوہ عربوں اور ترکوں کے کئی چھوٹے چھوٹے قبائل ہیں جو بڑے بڑے کرد قبائل کے حلیف ہوگئے ہیں ۔

مآخذ : (۱) قدیم جغرافیہ نگاروں کے حوالے *B.G.A.* اور دیگر مستند طباعتوں سے دیے گئے ہیں؛ (۲) *Eransahr*، *Abh. G. W. Gott. N. F.*، ج ۳، شمارہ ۲، ص ۱۸؛ (۳) J. Marquart: *Iran in Mitteralter*، لائپزگ ۱۹۲۱ء، ص ۴۰۵؛ (۴) C. Ritter: *Erdkunde*، برلن ۱۸۴۰ء، ۹ : ۳۶۹ ببعد؛ (۵) K. Prellberg: *Persien, eine historische Landschaft*، لائپزگ ۱۸۹۱ء، ص ۶۶؛ (۶) Le Strange: *The Lands of the Eastern Califate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۸۶ ببعد؛ (۷) قدیم یورپی سیاحوں (Ker Porter, Kinneir, Beanchamps, Rawlinson) کے بیانات سے Ritter نے

www.besturdubooks.wordpress.com

استفادہ کیا ہے، نیز دیکھیے: (۸) S. de Sacy: *Mémoire sur les monuments et les inscriptions de kirmanschah*، در *Memoire sur diverses antiquites de la Perse*، پیرس ۱۷۹۳ء؛ (۹) G. Curzon: *Persia*، لندن ۱۸۹۲ء، ۱: ۵۵۷ ببعد؛ (۱۰) A. V. Williams Jackson: *Persia, Past and Present*، نیویارک ۱۹۰۶ء، ص ۲۳۰ ببعد؛ (۱۱) H. L. Rabino: *Kermanschah*، در *R.M.M.*، ۱۹۲۰ء، ۱: ۳۸ تا ۴۰؛ (۱۲) M. Sykes: *Historia of Persia*، بار دوم، لندن ۱۹۲۱ء؛ (۱۳) R. Stuart Pool: *Cat. Coins of Shahs of Persia*، لندن ۱۸۸۹ء، بذیل مادّہ۔

(J. H. KRAMERS)

* کرمانی: کمال الدّین ابو العطا محمود بن علی، رک بہ خواجو کرمانی۔

* کَرْمِسِیْن: رک بہ کرمان شاہ۔

* کُرَمَۃ: بقول راڈلوف (*Versuch eines Wörterbuches der Türk-Dialecte*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۹، ۲: ۹۲۴) ایک ترک قبیلہ جو ترکستان میں آباد ہے۔ راڈلوف ہی کے نزدیک قیر غزی (یعنی قازق) لفظ قرمہ (قرۃ: کپڑوں کے ٹکڑوں کو سی کر جوڑ لینا) کے معنی ہیں "کمبل جو کپڑے کے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنایا جائے"۔ ایک دوسرے مقام پر (*Aus Sibirien*، بار دوم، لائپزگ ۱۸۹۳ء، ۱: ۲۲۵) ہی لکھتا ہے کہ کرمہ ازبک اور قیرغز کے مخلوط لوگ ہیں اور ان کا یہ نام جیسا کہ قیرغز دعوٰی کرتے ہیں، اس لیے ہوا کہ ان کی تشکیل میں متعدد قبائل کے پیوند لگے ہیں (قرۃ ایک دوسرے کو پیوند لگانا)۔ راڈلوف کا بیان ہے کرمۃ ایک مقیم قبیلہ ہے جو تاشکنت اور خجند کے درمیان یا زیادہ صحیح معنوں میں دریاے انگرن (آہنگران کی بگڑی ہوئی شکل) کے کنارے تاشکنت کے جنوب میں آباد ہے۔ روسی ماخذ میں اس کا ذکر سب سے پہلے ۱۸۷۵ء میں ملتا ہے کہ کرمۃ اوّل اوّل اٹھارھویں صدی عیسوی میں نمودار ہوے۔ یہی نظریہ Aristow (*Zamietki ob etniceskom sostavi tyurkskikh plemen*، وغیرہ سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۷ء، ص ۱۱۲) اور حال ہی میں I. Zarubin: *Spisok narodnostei Turkestanskogo Kraya*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۲۵ء، ص ۱۲) نے پیش کیا ہے، لیکن ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵-۱۶۳۶ء ہی میں ہمیں انگرن کے کنارے قازقوں اور ازبکوں کی جنگوں کے حال میں سرداران قورما کا ذکر ملتا ہے (محمود بن ولی: بحر الاسرار، کتاب خانۂ انڈیا آفس، عدد ۵۷۵، ورق ۱۱۹ ا)۔ انیسویں صدی عیسوی میں خوانین خوقند کے عہد حکومت میں لفظ کرمۃ ایک نسلی ہی نہیں جغرافیائی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا رہا اور یہ ایک انتظامی قسمت کا نام بھی تھا۔ خوقند سے جو سڑک درہ کندروں سے گزرتی ہوئی تاشکنت کو گئی ہے شاہراہ قورمہ ہی کے نام سے مشہور تھی (مثلاً تاریخ شاہ رخی، طبع Pantusow، قازان ۱۸۸۵ء، ص ۲۳۸)۔ کرمۃ کا حکمران ایک بیگ تھا اور اس کا قیام قلعۂ کووچی (تحریری زبان میں کیراوچی؛ روسی نقشوں میں کایوچی بھی) میں رہتا۔ لفظ کرمہ روسی حکومت کے ماتحت بھی کچھ عرصے تک مستعمل رہا۔ سیر دریا (سیحوں) کے علاقے (ابلست oblast) کی تقسیم جب اضلاع (uiezd) میں ہوئی تو جس حصے کو بعد (یعنی ۱۸۸۶ء کے بعد) "ضلع تاشکنت" کہا گیا، اسے پہلے ضلع کرمۃ (Kuraminskiy uiezd) ہی کہا جاتا تھا۔ توی تبہ (Toi-Tübe) ایک چھوٹا سا قصبہ، جس کی بنیاد مدلی خان کے عہد حکومت (۱۸۲۲ تا ۱۸۴۲ء) میں رکھی گئی (یہاں ازمنۂ وسطی کے ایک قلعے کے کھنڈر بھی موجود

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ہیں، جن کا ۱۸۸۵ء میں پروفیسر Veselovskiy نے مشاہدہ کیا، اس ضلع کی حکومت کا صدر مقام تھا، لیکن حاکم ضلع (Ujezdniy nacal'nik) اصل میں چرچک کے کنارے کوی لوک میں رہتا۔ خوقند کے عہد حکومت کی طرح روسی دور میں بھی ضلع کرمۃ کو بسبب اس کے کہ چاول کی پیداوار کا مرکز تھا، سیاسی اعتبار سے اچھی خاصی اہمیت حاصل تھی۔ روسی ماہرین نسلیات نے کرمۃ کو ایک جدا گانہ قبیلہ قرار دیا ہے جو ان کے نزدیک خانہ بدوشوں (قیرغز، یعنی قازقوں) کی نسل سے تھے جنھوں نے بعد میں زراعت کا پیشہ اختیار کر لیا [سرت رک باں]، لیکن سرتوں کا طرز زندگی اختیار کرنے کے باوجود کرمۃ ان خصائص سے سرتا سر محروم نہیں جو انھوں نے اپنے خانہ بدوش اجداد سے ورثے میں پائے تھے۔

اس بات کا ان کے یہاں آج بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ پرتوں کے برعکس کرمہ قازقوں کی طرح یرتوں (Yurts) میں رہتے ہیں۔ قازقوں کی طرح ان کی بیویاں بھی نقاب استعمال نہیں کرتیں، لیکن روسی حکومت کے آغاز میں ان کی جو حالت تھی بمقابلہ اس کے کرمہ کئی ایک باتوں میں اپنے اجداد سے آگے بڑھ چکے ہیں۔ اس زمانے میں راڈلوف اور دوسرے محققین دیکھ چکے تھے کہ ان کے یہاں کنبوں کی تقسیم موجود ہے۔ بقول راڈلوف ان کنبوں کی تعداد پانچ تھی: جلائر (Djulaïr)، تلاؤ (Telau) (حتی کہ اس نام کا ایک گاؤں آج بھی موجود ہے اور جس میں کرمۃ آباد ہیں) تمہ، جگلیلی اور ترکلی مگر اب یہ تقسیم بالکل ناپید ہو چکی اور اگر کہیں موجود بھی ہے تو وہاں بھی ایک ہی کنبے کے افراد کے درمیان شادیاں ناجائز نہیں رہیں جس کا قازقوں کے ہاں دستور ہے۔ پھر اس امر کا ثبوت کہ کرمۃ مخلوط النسل قوم ہے، آج بھی ملتا ہے۔ علاوہ مختلف نسلوں کے اختلاط کے ان میں بقول Zarubin (کتاب مذکور) مختلف معاشرتی طریقوں کا اختلاط بھی موجود ہے۔ کرمہ خود بھی اپنے آپ کو کرمہ نہیں کہتے۔ اگر کہتے ہیں تو ایک اور نسلی گروہ کے نام کا اضافہ کر لیتے ہیں (مثلاً قیرغز کرمۃ، سرت کرمۃ)۔ ضلع تاشکنت (سابق کرمۃ) میں ان کی تعداد ۱۹۱۷ء میں ۵۲۳۳۵ اور ۱۹۲۰ء میں ۴۹۶۹۷ تھی لیکن پچھلے چند سالوں سے سارے ترکستان کی آبادی قحط عظیم کے باعث گھٹتی جا رہی ہے)۔ ضلع خجند میں بھی ۹۳۳۰ کرمۃ آباد ہیں حتی کہ "مخلوط قوم" کے معنوں میں لفظ کرمہ اس علاقے میں بھی سنا جاتا ہے جہاں ترکمانی زبانیں بولی جاتی ہیں، لیکن ان کرموں کا انگرن کے کرموں سے کوئی تعلق نہیں۔

مآخذ: مذکورۂ بالا تصانیف کے علاوہ (۱) Kosienko: *Turkestanskiy Krai*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۰ء؛ (۲) Masalskiy: *Turkestanskiy Krai*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۳ء، ص ۳۰۶ و ۶۰۷؛ (۳) Fr. Schwarz: *Turkestan*، Freiburg Br.، ج ۱، ۱۹۰۰ء بعد اشاریہ، بالخصوص، ص ۱ ببعد؛ (۴) N. Mallickiy: در *Protokoli Turk. Kruzka Lyub. Arkh*، ۱۸۹۸ء، ۳: ۱۷۶ ببعد۔

(سید نذیر نیازی)

کرمیان: رک بہ گرمیان۔ *

کرناٹک: (کرنائک)، ہندوستانی جغرافیے میں کئی مفہوم رکھنے والی اصطلاح، ملک کے طور پر وہ علاقہ جہاں کینری زبان بولی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اصل میں وجیانگر کی ہندو سلطنت کے لیے بولا جاتا تھا۔ ۱۵۶۵ء میں جب مسلمانوں نے اسے فتح کر لیا تو انھوں نے جنوبی ہند کے بعض اضلاع کا نام بھی کرناٹک *

www.besturdubooks.wordpress.com

رکھ دیا، یہاں تک کہ انگریزوں نے اس نام کو اس نواب کے لیے بھی استعمال کیا ہے جو ارکاٹ پر حکومت کرتا تھا جہاں کی زبان تامل ہے کینری نہیں ہے۔

[بھارتی صوبوں کی تنظیم جدید کے بعد صوبۂ کرناٹک سابق ریاست میسور اور حیدرآباد دکن اور صوبۂ مدراس کے بعض اضلاع پر مشتمل ہے۔ اس کی آبادی تین کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ مسلمان آبادی کا آٹھ فیصد ہیں۔ صوبے کا دارالحکومت بنگلور ہے؛ جہاں جہاز سازی اور بجلی کا سامان بنانے کے کارخانے ہیں]۔

([و ادارہ] J. S. Cotton)

⊗ **کرنال**: ہندوستان کے علاقۂ پنجاب کا ایک شہر اور ضلع، شہر کا رقبہ ۲۶ مربع میل ہے اور ضلع کا ۳۱۵۳ مربع میل۔ دریائے جمنا ضلع کی مشرقی حد بناتا ہے۔ جنوب میں ضلع دہلی ہے اور شمال میں ضلع انبالہ۔ مغرب میں پٹیالہ اور سکھوں کی سابقہ ریاستیں جیند اور نابھہ ہیں۔ سرسوتی دریا جو ہندوؤں کے نزدیک مقدس ہے کرنال شہر سے بیس میل شمال میں بہتا ہے۔ کورو کشیتر کا میدان جہاں کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان جنگ مہابھارت لڑی گئی تھی، ضلع کے شمال میں ہے۔ اس جنگ سے متعلق یہاں کئی قدیم آثار موجود ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں آبادی ۱۰۹۳۷۹ تھی۔ باشندے مغربی ہندی کی مقامی بولی استعمال کرتے ہیں۔ رانگھڑ اور چوہان راجپوتوں کے علاوہ جاٹ بھی بستے ہیں۔ تاریخی اور نسلی اعتبار سے یہ پنجاب کی نسبت ہندوستان کا حصہ ہے۔ لوگوں کا پیشہ عام طور پر زراعت ہے۔ چنا، باجرا، چاول، کپاس اور گیہوں کی کاشت ہوتی ہے۔ پانی پت، کیتھل اور شاہ آباد ضلع کے دیگر مشہور شہر اور قصبے ہیں۔

کرنال شہر راجا کرن نے آباد کیا تھا جو جنگ مہابھارت میں کوروؤں کا جرنیل تھا۔ اسی سے اس کا نام ماخوذ ہے (کرنالیہ = کرن کی سکونت کی جگہ)۔ پرانے زمانے میں یہ اتنا مشہور نہیں تھا۔ ۶۳۵ء میں ہیون سانگ نے قنوج کے مقام پر بدھ راجا ہرش سے ملاقات کی، لیکن وہ کرنال کا ذکر نہیں کرتا۔ محمود غزنوی اور محمد غوری کی فتوحات میں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا۔ ۱۰۱۱ء میں محمود غزنوی نے تھانیسر پر حملہ کیا جو کرنال سے صرف بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ ۱۰۱۷ء میں وہ متھرا بھی گیا۔ ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء میں محمد غوری نے پرتھوی راج کو تراوڑی کے مقام پر شکست دی جو کرنال سے آگے جنوب میں واقع ہے۔ کرنال نے تغلق خاندان (۱۳۲۰ تا ۱۴۱۳ء) کے عہد حکومت میں تاریخی لحاظ سے شہرت اختیار کی۔ ۷۲۵ھ/۱۳۲۳ء میں پانی پت کے مشہور بزرگ بوعلی قلندر فوت ہوئے۔ علاء الدین غوری کے بیٹوں خزی خان اور شادی خان نے پانی پت میں ان کا مقبرہ بنوایا، لیکن غیاث الدین تغلق نے کرنال میں بھی ان کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ لوگ کہتے تھے قلندرؒ صاحب یہاں دفن ہیں۔ ۱۳۵۵ء میں فیروز شاہ تغلق نے جمنا کے مغربی کنارے سے نہر نکالی جو کرنال سے ۴ میل نیچے گزرتی تھی۔ اس سے علاقے کی پیداوار اور خوشحالی میں اضافہ ہوا۔ ۱۳۹۸ء میں جب امیر تیمور آیا تو وہ کرنال سے تو نہیں گزرا، لیکن پانی پت گیا جو دس کوس کے فاصلے پر ہے اور وہاں جا کر گندم کے ایک بھاری ذخیرے پر قبضہ کر لیا۔ ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ء کو جب پانی پت کے میدان میں بابر نے ابراہیم لودی کو شکست دی تو وہ کرنال ہی سے ادھر گیا تھا۔ ۱۵۵۵ء میں جلال الدین اکبر نے ہیمو بقال کے خلاف اپنی افواج کرنال سے دس میل شمال میں جمع کیں اور جب

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

اکبر ۹۸۰ھ/۱۵۷۳ء میں گجرات میں مصروف تھا کہ ابراھیم حسین مرزا نے فائدہ اٹھا کر کرنال، پانی پت اور سونی پت میں لوٹ مار کی۔ آئین اکبری میں کرنال کا ذکر ایک پرگنے کی حیثیت سے کیا گیا ہے، جہاں ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۵ء میں جہانگیر اپنے باغی بیٹے خسرو کا تعاقب کرتے ہوئے کرنال میں ٹھیرا تھا۔ کرنال میں فیروز شاہ تغلق کی بنائی ہوئی نہر کی مرمت اکبر کے زمانے میں شہاب الدّین احمد خان، صوبیدار دہلی، نے کرائی تھی، لیکن شاہ جہان کے عہد میں علی مردان خان لال قلعے میں پانی پہنچانے کے لیے اسے دہلی تک لے گیا۔ مغلیہ دور میں کرنال میں ایک سرائے بھی تعمیر ہوئی تھی، جس کا اب کوئی نشان باقی نہیں۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد بندہ بیراگی دریائے جمنا کے مغربی علاقے پر قابض ہوا تو اس نے کرنال کے فوجدار کو ہلاک کرکے وہاں قتل عام کیا اور شہر کو لوٹا۔ اس شہر کی تاریخ کا سب سے مشہور واقعہ ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے مقابلے میں محمّد شاہ کی شکست ہے۔ تین ماہ تک کرنال کے جنگوں میں محمّد شاہ پڑاؤ ڈالے رہا۔ لڑائی شہر کی دیواروں کے عین باہر ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی یہاں تو نہیں آیا، لیکن ۱۷۶۱ء میں ضلع کرنال کے مشہور شہر پانی پت میں اس نے مرھٹوں کو زبردست شکست دی تھی۔ مرھٹوں اور احمد شاہ ابدالی کی وجہ سے سلطنت دہلی میں جو انتشار رونما ہوا، اس سے سکھوں نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ دہلی سے قریب ہونے کی بنا پر کرنال کی تاریخ شروع ھی سے دہلی کے حالات سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ ۱۷۶۳ء میں جیند کا راجا گنج پت سنگھ اس علاقے کو اپنے تسلط میں لایا، لیکن ۱۷۷۵ء میں نجف خان نے اسے دوبارہ فتح کر لیا۔ اس کے بعد اقتدار کے لیے مرھٹوں اور سکھوں کی آپس میں لڑائیاں جاری رھیں۔ انجام کار ۱۸۰۵ء میں جب انگریزوں کا قبضہ ہوا تو پھر کہیں امن و امان قائم ہوا؛ لیکن اس سیاسی افراتفری میں کرنال پرگنے کے ۲۲۱ دیہات میں سے ۱۷۸ ویران ہوچکے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی لڑی گئی تو کرنال کے نواب احمد علی خان نے انگریزوں کی مدد کی۔

حکومت انگلشیہ نے کرنال کو ضلع کا صدر مقام بنایا۔ فوجی چھاؤنی قائم ہوئی، جو بعد میں شہر کی مضر صحت آب و ہوا کی وجہ سے انبالے منتقل کر دی گئی۔ سابقہ نہر نادر شاہ کے حملے کے وقت درست حالت میں تھی اور ہر طرف پانی بھرپور مقدار میں مہیا کرتی تھی، لیکن طوائف الملوکی کے ایام میں ٹوٹ پھوٹ گئی اور ادھر ادھر دلدلیں بن گئیں، جن سے وبائیں پھوٹتی تھیں۔ انگریزوں نے نئی نہر جمن غربی بنوائی اور دلدلوں کو پر کرایا۔ شہر میں میونسپلٹی، سکول، ھسپتال، ڈاک خانہ وغیرہ تعمیر کرائے اور سڑکیں پختہ کرائیں۔ دہلی کالکا ریلوے لائن کی تعمیر سے شہر کی تجارت بڑھ گئی اور کرنال ایک اھم تجارتی مرکز بن گیا۔ پرانے شہر کے اردگرد فصیل ہے، جس کے ساتھ ساتھ پختہ سڑک ہے؛ دس دروازے ہیں۔ جہاں پہلے چھاؤنی تھی وہاں مضافاتی بستی آباد ہوئی، جو صدر بازار کہلاتی ہے۔ شمال کی طرف ایک میل کے فاصلے پر سول لائن اور سرکاری دفاتر ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد شہر کی آبادی بڑھ گئی ہے، مضافاتی آبادیوں میں اضافہ ہوا ہے اور کاروبار اور صنعت و حرفت نے فروغ پایا ہے۔ قلندرؒ صاحب کا مقبرہ شہر کی تاریخی عمارات میں شمار ہوتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اس میں مسجد اور تالاب کی تعمیر کرائی تھی۔ ھندو لوگ راجا کرن کی وجہ سے کرنال کے تالاب کو مقدس خیال کرتے ہیں۔ کرنال کا قلعہ بھی مشہور ہے۔ امیر دوست محمّد خان، والی کابل نے کلکتے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

جاتے ہوے یہاں چھے ماہ قیام کیا تھا ۔ چھاؤنی والی جگہ پر انگریزوں کا بنایا ہوا گرجا گھر شکستہ حالت میں اب بھی موجود ہے ۔

مآخذ : (۱) ابوالفضل : آئین اکبری ، کلکتہ ۱۸۷۹ء ، ۲ : ۳۸ ؛ (۲) جہانگیر : توزک جہانگیری ، مطبوعۂ لکھنؤ ، ۱ : ۲۸ ، ۲۹ ؛ (۳) شمس سراج عفیف : تاریخ فیروز شاہی ، کلکتہ ۱۸۹۰ء ، ص ۳۲۹ تا ۳۳۳ ؛ (۴) *Karnal District Gazetteer*، لاہور ۱۸۹۲ء ؛ (۵) ایضاً ، لائیڈن ، بار اوّل ، بذیل مادّۂ کرنال ؛ (۶) کننگھم : *Ancient Geography of India*، لنڈن ۱۸۷۱ء ۔

(عبدالغنی)

* **کرنک** : رک بہ الاقصر ۔

⊗ **کرنکو** : فرِٹز کرنکو Fritz Krenkow ؛ جرمن نسل کا ایک معروف مستشرق ، جس نے اپنی عمر کا اکثر حصہ انگلستان میں گزارا ۔ وہ زیادہ تر عربی شعر اور لغت کے ساتھ شغف رکھتا تھا اور ان مضامین پر بہت سی کتابیں ایڈٹ کرنے میں حیدرآباد دکن کے دائرۃ المعارف العثمانیہ کے ساتھ شریک رہا ۔

کرنکو ۱۸۷۲ء میں شمالی جرمنی کے شہر شونبرگ Schoenberg میں پیدا ہوا ۔ اس کی عمر ابھی چھے برس کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ بعد ازاں اس کی والدہ نے اس کی تربیت کی ۔ تعلیم کے دوران میں اس نے یونانی اور لاطینی کے علاوہ فرانسیسی اور انگریزی زبانیں بھی سیکھیں ۔

اپنی علمی زندگی کے دوران میں کرنکو نے جرمنی اور انگلستان کے علمی رسالوں میں متعدد مقالات لکھے ۔ ۱۹۰۸ء میں اس نے جرمن اورینٹل سوسائٹی کے مجلے میں کعب بن زہیرؓ کے قصیدۂ "بانت سعاد" کو ایک مفصل مقدمے کے ساتھ شائع کیا ۔ اسی طرح اس نے حماسہ ابن شجری اور ابو دھبل جمحی کے اشعار کے علاوہ ابوبکر زبیدی کی کتاب النحویین کو مقدمے اور شرح کے ساتھ شائع کیا ۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ کی مدد سے اس نے ۱۳۴۲ھ میں ابن درید کی کتاب المجتنیٰ شائع کی ۔ ابن درید کی الجمہرہ، جو حیدرآباد دکن میں تین جلدوں میں چھپی تھی، اس نے اس کی تہذیب بھی کی ۔ شیرازی نے ابن الہیثم کی جو شرح لکھی تھی، اس کی بھی اس نے تہذیب کی ۔ کرنکو نے دیوان طفیل بن کعب الغنوی اور دیوان طرمّاح بن حکیم بھی شائع کیا اور ان کے مقدمے اور ترجمے کے علاوہ ان کی شرح بھی لکھی ۔ ابن العمیثل الاعرابی کی کتاب المأنور کو ایک نہایت قدیم نسخے کی بنا پر جس کا سنۂ کتابت ۲۸۰ھ ہے، ۱۹۲۵ء میں بیروت سے ایک جرمن مقدمے اور فہارس کے ساتھ شائع کیا ۔

اس نے دیوان مزاحم العقیلی انگریزی ترجمے کے ساتھ لائیڈن سے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا ۔ اس کے علاوہ دیوان نعمان بن بشیر انصاری بھی اس کے علمی آثار میں سے ہے ۔

کرنکو نے ابن عساکر کی تاریخ دمشق پر ایک مفصل مقالہ لکھا اور اس مقالے میں اس تاریخ کے جو نسخے لنڈن وغیرہ مقامات میں موجود تھے، ان کی طرف رجوع کیا ۔ یہ مقالہ دمشق کے المجمع العلمی کے مجلہ میں شائع ہوا ۔ وہ اس المجمع العلمی کا رکن بھی تھا ۔ اس نے پروفیسر بیون Bevan کے ساتھ مل کر ابو علی القالی کی کتاب الامالی کے اشعار کی فہرست بھی مرتب کی، جو ۱۹۱۳ء میں لنڈن میں طبع ہوئی ۔

کرنکو طویل عرصے تک حیدرآباد دکن کے دائرۃ المعارف العثمانیہ کے لیے یورپ میں عربی کی نادر کتابیں تلاش کرتا رہا اور بعض کتابوں کی اشاعت اور بعض کی تہذیب کے لیے اس ادارے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کے ساتھ تعاون کرتا رہا۔ ایک سال تک وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں صدر شعبۂ عربی کے عہدے پر فائز رہا۔ ۱۹۵۳ء میں اس نے کیمبرج میں وفات پائی۔

مآخذ : (۱) ابوالقاسم سحاب: فرهنگ خاور شناسان، مطبوعۂ ایران، ص ۱۹۸ تا ۲۰۲؛ (۲) نجیب العقیقی: المستشرقون، بارسوم، قاهره ۱۹۶۵ء، ۲: ۵۳۰ تا ۵۳۲؛ (۳) Otto Spies : *Obituary notice*، در *Der Islam*، ۱۹۵۳ء۔

(شیخ عنایت اللہ)

* **کروجا** : رک بہ کرویو، در اآ لائیڈن، بار دوم۔

* **کُروسیڈز** : (Crusades)، رک بہ صلیبی جنگیں۔

* **کُرویا** : (قرویہ : Kroya، Kruje)، البانیہ کا ایک قصبہ اور قلعہ جو کسی زمانے میں سکندر بیگ [رک بآں] کا صدر مقام تھا۔ کرویا (ترکی : آق حصار) کو بعض اوقات آقچہ حصار اور آق سرای بھی کہا جاتا ہے، اس شہر کی تاریخ بڑی پر آشوب ہے۔ خیال ہے کہ یہ شہر اس جگہ آباد ہوا جہاں کبھی یوری پوی Euriboea کا قدیم شہر واقع تھا۔ قرون وسطیٰ میں اس کی تاریخ کیا رہی، یہ ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے۔ اسے نیپلز کے امیر کارلو تھوپیا Carlo Thopia نے بسایا تھا، جس کے آبا و اجداد پندرھویں صدی کے تقریباً وسط میں ترانیہ Tirana اور درزو Durazzo کے درمیان واقع علاقے کے مالک تھے۔ یہاں کے قدیم دفاعی استحکامات کے بچے کھچے حصوں سے ان کے اطالوی الاصل ہونے کا پتا چلتا ہے۔ کرویا کو صرف اس وقت شہرت ہوئی جب البانوی محب وطن جارج کسٹریوٹا G. Kastriota نے، جسے سکندر بیگ (م ۱۷ جنوری ۱۴۶۸ء) بھی کہا جاتا ہے، ترکوں کی قید سے فرار ہو کر پھر عیسائی مذہب قبول کر لیا اور دوبارہ کرویا کو اپنا صدر مقام بنایا۔ یہیں سے سکندر بیگ نے ۱۴۴۳ء میں البانیہ کی جنگ آزادی کا اعلان کیا اور اسے کئی سال تک بڑی دانائی اور کامیابی سے جاری رکھا۔ ۱۴۵۰ء میں سلطان مراد دوم نے کرویا کا محاصرہ کیا تو سکندر بیگ نے سلطان کو محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور کر دیا۔ وہ محمّد ثانی کے مقابلے پر بھی ڈٹا رہا، لیکن اس کی موت کے بعد ترکوں نے کرویا کے گرد و نواح کا علاقہ بے دردی سے تاخت و تاراج کرتے ہوئے ۱۴-۱۵ جولائی ۱۴۷۸ء کو پھر اس پر دھاوا بول دیا۔ آگے چل کر یہ شہر پورے طور پر اسلامی رنگ میں رنگا گیا اور آج کل ایک ضلع کا صدر مقام ہے۔ یہاں زیادہ تر مردیہ (Mirdites) فرقے کے لوگ آباد ہیں۔ آبادی مشکل ہی سے ۱۰ ہزار سے اوپر ہوگی۔ کرویا بکتاشیوں کے مرکز کی حیثیت سے بھی قابل ذکر ہے، جن کی ایک خانقاہ یہاں موجود ہے۔ یہاں ساری صلتیق دده ولی کی ایک قبر بھی ہے۔ دراصل کرویا کے ارد گرد بکتاشی ولیوں کی متعدد قبریں موجود ہیں، گو ان کی اصل کے بارے میں ابھی تک کوئی تحقیق نہیں ہو سکی۔ حاجی حمزہ بابا اور بابا علی کے مقبروں کی لوگ بڑی تعظیم کرتے ہیں (مؤخرالذّکر مقبرے کے ساتھ ایک تکیہ بھی ہے)۔ مقبروں کی تعداد ۳۶۶ بتائی جاتی ہے، لیکن یہ بلا شبہہ محض ایک اندازہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بکتاشی طریقے کو سب سے پہلے اٹھارھویں صدی کے آخر میں ایک شخص شیخ میمی نے رواج دیا تھا، مگر اسے یانینا Janina کے علی پاشا نے کچل ڈالا؛ تاہم یہ بیان بھی قابل اعتبار نہیں (Ippen : *Skutari*، ص ۷۱ ببعد)۔ بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ اہل کرویا کی بہت بڑی اکثریت

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

یکتاشی طریقے کی پیرو ہے۔

مآخذ: (۱) ہم عصر وقائع نگار Benedetto نے عثمانیوں کے ہاتھوں کروبا کی فتح کے بارے میں طرح طرح کی تفصیل بیان کی ہے (اقتباس، در *Della decima e della altre gravezze, della moneta, e della mercatura de' Fiorentini fino al secolo*، ج ۲: لزبن و لکہ Lucca ۱۷۶۵ء، ص ۲۷۰ ببعد)، لہٰذا ان پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے؛ (۲) Ippen: *Skutari*، ص ۱۷ ببعد؛ (۳) *Wissenschaftliche Mitteilungen aus Bosnien*، ۷: ۶۰؛ (۴) A Degrand: *Souvenirs de la Haute-Albanie*، پیرس ۱۹۰۱ء، ص ۲۱۵ ببعد (مع تصاویر)؛ (۵) F. W. Hasluck: *Geographical Annual of the distribution of the Bektashi*، در *British School at Athens*، ۱۹۱۵ء، ۲۱: ۱۲۱ ببعد۔

(FRANZ BABINGER)

* **کُرَیبیۃ**: کیسانیہ [رک بآں] کے ایک فرقے کا نام، جس کا یہ املا غالباً الاشعری کی تصنیف مقالات الاسلامیین (باعتبار مخطوطۂ [آیا صوفیا]، اعراب کے بغیر) میں اختیار کیا گیا اور جو حضرت شیخ عبدالقادر الجیلانیؒ کے ہاں بھی موجود ہے۔ صاحب مفاتیح العلوم کے علاوہ عبدالقاہر البغدادی، ابو المعالی اور المقریزی نے اسے کریبیۃ لکھا ہے۔ اوّل الذکر املا کی تائید اس کی ایک اور شکل الکَرْنُبِیّہ سے بھی ہوتی ہے، جو مطہر بن طاہر المقدسی نے اختیار کی اور جس کی وجہ ممکن ہے متن کی خرابی ہو۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ فرقہ ایک شخص ابو کُرَیب (الاشعری میں بلا اعراب؛ عبدالقادر الجیلانی، مطبوعہ متن، نیز مخطوطۂ لائیڈن، شمارہ Or. ۳۲۵، ورق ۹۶ الف: ابن کُرَیْب؛ الخوارزمی، البغدادی، ابوالمعالی اور المقریزی: ابو کُرَیْب؛ مطہر بن طاہر المقدسی: ابن کرنب) الضَرِیر سے منسوب ہے۔ غالباً یہی وہ شخص تھا جس نے اس نظریے کی جو کریبیۃ کا امتیازی عقیدہ ہے اشاعت کی کہ ابن الحنفیہ [رک بآں] مسیح کی طرح پھر ظہور کریں گے؛ لہٰذا اس کا زمانۂ حیات ابن الحنفیۃ کے انتقال (غالباً ۸۱ھ/۷۰۰ء) سے مؤخر ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

الاشعری کے بیان کی رو سے کُریبیۃ کا عقیدہ تھا کہ ان کے امام محمّد بن الحنفیۃ ابھی زندہ ہیں؛ وہ مدینۂ منورہ کے مغرب میں رضوٰی کے پہاڑوں میں رہتے ہیں، جہاں دائیں جانب ایک شیر اور بائیں جانب ایک چیتا ان کی حفاظت کرتا ہے اور صبح و شام ان کے لیے کھانا آ جاتا ہے؛ چنانچہ اپنے خروج کے وقت تک وہ وہیں رہیں گے۔ کریبیہ کے نزدیک امام کو اس طرح چھپا رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالٰی نے ان کے لیے ایک خاص کام تجویز کر رکھا ہے۔ البغدادی نے بھی ان کے قیام رضوٰی کا حال انھیں الفاظ میں بیان کیا ہے۔ بقول اس کے امام کے قریب ہی ایک چشمہ پانی کا اور ایک شہد کا موجود ہے اور یہی چشمے ہیں جن سے وہ ہر روز اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ الشہرستانی اور المنصور باللہ عبداللہ بن حمزۃ (العقد الثمین، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، عدد Or. ۳۹۷۶، ورق ۸ ب) نے بھی اگرچہ اس بات کا ذکر کیا ہے، لیکن اس سلسلے میں خاص طور سے کریبیۃ کا حوالہ نہیں دیا۔ مؤخرالذکر نے اس خیال کی طرف اشارہ کیا ہے کہ رضوٰی میں امام فرشتوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں (جیسا کہ ابن حزم نے بھی لکھا ہے) اور یہ کہ "بزمانۂ غیبت" ان کی حیثیت اللہ کی آنکھ کی ہے، جو اس کی مخلوقات کو دیکھ رہی ہے۔

ان میں سے کئی ایک باتوں کا سلسلہ ظہور مسیح کے قدیم عقیدے سے جا ملتا ہے اور تقریباً سب کی سب کُثَیِّر [رک بآں] اور السیّد الحِمیَری (دیکھیے الاغانی، بار دوم، ۷: ۳ س ۱۱ ببعد و ۸: ۳۰

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

س ۵۲ ببعد) کے اشعار میں ملتے ہیں؛ چنانچہ ملاحدہ کے مختلف فرقوں پر جس کسی نے قلم اٹھایا اس نے اپنی معلومات انھیں سے حاصل کیں۔

الاشعری نے، جس کے نزدیک کثیّر نظریات کریبیۃ کا پرجوش علمبردار ہے، اس کے وہی اشعار پیش کیے ہیں جو البغدادی (ص ۲۸ ببعد) اور الشہرستانی نے دیے ہیں (نیز دیکھیے الاغانی، بار دوم، ۸ : ۳۱ س ۸ ببعد)۔

مآخذ : (۱) ابوالحسن الاشعری: مقالات الاسلامیین، مخطوطۂ آیا صوفیا، عدد ۲۳۶۶، در باب رافضۃ، ص ۹ ببعد [مطبوعہ استانبول و قاہرہ]؛ (۲) المقدسی: کتاب البدء و التاریخ، ج ۵، در *PELOV*، ج ۴، پیرس ۱۹۱۶ء، سلسلۂ ۲۲، متن؛ ص ۱۲۴ س ۳ ببعد، ۱۲۸ س ۳ ببعد و ترجمہ؛ ص ۱۳۰ س ۲، ۱۳۴؛ (۳) محمّد بن احمد الخوارزمی: مفاتیح العلوم، طبع van Vloten، لائیڈن ۱۸۹۵ء، ص ۳۰؛ (۴) عبد القاہر البغدادی: الفرق بین الفرق، طبع محمّد بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ، ص ۲۷، س ۱۵ ببعد؛ (۵) عبدالرزاق بن رزق اللہ الرسعنی: مختصر کتاب الفرق بین الفرق، طبع F. Hitti، قاہرہ ۱۹۲۴ء، ص ۳۶؛ (۶) ابن حزم: الفصل فی الملل والاہواء و النحل، قاہرہ ۱۳۱۷ - ۱۳۲۱ھ، ۴ : ۱۷۹ س ۲۱ تا ۲۳؛ (۷) ابو المعالی محمّد بن عبیداللہ: بیان الادیان، در Schefer: *Christomathie Persane*، ج ۱ (*PELOV*، ج ۲، سلسلۂ ۷، پیرس ۱۸۸۳ء): ص ۱۵۲ س ۱۵، ۱۵۸ س ۱؛ نیز دیکھیے ڈینش ترجمہ: *Abu'l-Maali : Fremstilling af Religionerne*، از Arthur Christensen، در *Studier fra Sprog-og Oldtidsforskning*، شمارہ ۱۰۱، کوپن ہیگن ۱۹۱۶ء، ص ۳۱، ۴۰)؛ (۸) الشہرستانی: الملل والنحل، طبع Cureton، ص ۱۱۱ س ۱۱ ببعد؛ (۹) عبدالقادر الجیلانی: الغنیۃ لطالبی طریق الحق، قاہرہ ۱۳۲۲ء، ۱ : ۱۰۰ ذیل؛ (۱۰) المقریزی: الخطط، بولاق ۱۲۷۰ھ، ۲ : ۳۵۲ س ۱ ببعد؛ (۱۱) Wellhausen: *Die religiös-Politischen Oppositionsparteien im alten Islam* (*Abh. G.W. Gott*. Phil.-hist. Kl., N.F.، ج ۵، شمارہ ۲، برلن ۱۹۰۱ء)، ص ۹۰ ببعد؛ (۱۲) I. Friedlaender: *The Heterodoxies of the Shiites according to Ibn Hazm*، نیویارک ۱۹۰۹ء، (از *JAOS*، ج ۲۸، ۲۹)، ۲ : ۳۵ ببعد؛ (۱۳) Fr. Buhl: *Alidernes Stilling til de Shi'istike Bevaegelser under Umajjaderne* (*Danske Videns kabernes Selskabs forhandlinger*، ۱۹۱۰ء، شمارہ ۵)، ص ۱۰، ببعد؛ (۱۴) I. Goldziher: *Vorlesungen über den Islam*، بار دوم، ہائیڈل برگ ۱۹۲۵ء، ص ۲۱۷؛ (۱۵) C. van Arendonk: *De Opkomst Van het Zaidietische Imamaat in Yemen*، لائیڈن ۱۹۱۹ء، ص ۱۲، حاشیہ ۳۔

(C. VAN ARENDONK)

کریٹ : رک بہ اقریطش۔ *

کریم : یہ اگر کسی انسان کی صفت ہو تو * اس کے معنی ہیں فیاض، مہربان، کشادہ دل، معزز، شریف، عالی نسب؛ اشیا ہوں تو بافراط، بکثرت، معزز، باشرف، شاندار، اعلیٰ اور نفیس۔ کریم اللہ تعالیٰ کی ۹۹ صفات یا اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ہے (۷[الاعراف] : ۱۸۰)، لیکن قرآن مجید کے چھبیس مواضع میں، جہاں یہ لفظ استعمال ہوا، اللہ تعالیٰ پر اس کا اطلاق صرف دو جگہ ہوا ہے۔ مزید برآں یہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور فرشتوں کے لیے اور زیادہ تر کسی شے کی صفت کے بیان میں استعمال ہوا ہے، مثلاً اس اجر اور رزق کے لیے جو مومنوں کے لیے موجود ہے، نیز قرآن مجید کے لیے اور اس خط کے لیے جو ملکۂ سبا [رک بآں] بلقیس کو بھیجا گیا۔ علیٰ ہٰذا یہ اہل ایمان کے جنت میں داخلے، پودوں، غلے کے کھیتوں، سکونت گاہوں اور والدین سے

www.besturdubooks.wordpress.com

انداز خطاب وغیرہ کے لیے بھی آیا ہے ۔ حدیث میں یہ اصطلاح اکثر حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے استعمال ہوئی، جہاں انھیں کریم ابن الکریم کہا گیا ہے (البخاری، کتاب المناقب، باب ۱۳ و کتاب التفسیر، ۱۲ [یوسف] : ۳۱) ۔ الکریمتان سے مراد آنکھیں ہیں (احمد بن حنبل : مسند، ۳ : ۲۸۳) ۔

مآخذ : لغات، بذیل مادّہ ۔

(T. W. Haig)

* **کریم خان زند** : (محمّد)، قبیلۂ لور کے ایک غیر معروف گھرانے کا فرد، جو اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں درحقیقت ایران کا بادشاہ تھا گو اس نے شاہ کا لقب اختیار نہیں کیا، اپنے آپ کو ہمیشہ وکیل (کار پرداز) ہی کہا اور اسی نام سے عام طور پر اس کی شہرت بھی ہوئی ۔ شروع میں وہ بختیاری سپہ سالار علی مردان خان کے نائبوں میں شامل تھا، جس نے نادر شاہ افشار کو قتل کیا تھا ۔ اس کے بعد طوائف الملوکی پھیل گئی تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اصفہان پر قبضہ کر لیا اور خاندان صفویہ کے آخری کمسن بادشاہ شاہ اسمٰعیل سوم کو، جس کی عمر صرف آٹھ سال تھی، تخت پر بٹھا دیا (۱۱۶۳ھ/۱۷۵۷ء) ۔ علی مردان کے قتل اور والی آذربیجان، نیز محمّد حسین خان حاکم مازندران کی شکست کے بعد کریم خان زند کو سارے مغربی ایران پر قابض ہونے کا موقع مل گیا ۔ پھر جب شیراز میں فتح علی خان قاجار کے بیٹے محمّد حسن نے، جو انھیں دنوں اصفہان فتح کر چکا تھا، اس پر حملہ کیا تو اس نے دشمن کی فوجیں تتر بتر کر دیں ۔ اس سے ایک سال بعد یہ قاجاری شہزادہ کریم خان کے نائبوں کے خلاف جنگ کرتا ہوا مارا گیا ۔ بایں ہمہ خراسان کریم خان کے قبضے میں نہیں آیا، جہاں نادر شاہ کا ایک نام لیوا شاہ رخ نابینا بدستور متصرف رہا ۔ کریم خان کے سپہ سالار اس کے دونوں بھائی صادق اور زکی تھے ۔ ان میں سے زکی تو بسبب اپنے مظالم کے آگے چل کر بدنام ہو گیا اور صادق نے عثمانیوں کے خلاف لشکر کشی کی ۔ اس نے بصرے کا تیرہ ماہ تک محاصرہ جاری رکھا، تا آنکہ اہل بصرہ کو ایرانیوں کی اطاعت قبول کرنا پڑی ۔ یہ شہر وکیل کی وفات تک انھیں کے قبضے میں رہا ۔ کریم خان نے بڑی تن دہی سے ملک میں امن و امان بحال کیا اور تجارت اور زراعت کو ترقی دی ۔ وہ خود تو ذرا بھی تعلیم یافتہ نہیں تھا، لیکن اس نے اپنے دربار میں علما و فضلا کو جمع کیا اور ان کی سرپرستی کی ۔ اس کا قیام عام طور سے شیراز میں رہتا تھا، جسے اس نے متعدد عمارتوں (مسجدوں، کاروانسراؤں اور حماموں) سے رونق بخشی، جو آج بھی موجود ہیں ۔ مشہور شاعر سعدی کے مقبرے کی اسی کے حکم سے مرمت کرائی گئی اور حافظ کے مقبرے کو تبریز کے خوبصورت سنگ مرمر سے مزیّن کیا گیا اور اس پر اس کی دو غزلیں بھی کندہ کی گئیں ۔ ہفت تن (= سات شخص) ان پارسا درویشوں کی یاد میں وقف ہوا جن کا وہاں قیام رہتا تھا ۔ یہ ایک تفریح گاہ ہے، جس کا اندرونی حصہ انجیلی مناظر یا سعدی اور حافظ کی فرضی تصاویر سے آراستہ کیا گیا ہے ۔ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر وکیل کا باغ ہے، جو زیادہ تر جہاں نما کے نام سے مشہور ہے ۔ اس کا یہ نام فتح علی شاہ نے رکھا تھا ۔ باغ دلکشا بھی اسی کی یادگار ہے، لیکن اب اس میں ترکاریاں بوئی جاتی ہیں ۔

کریم خان زند نے ۶۴ برس کی عمر میں وفات پائی ۔ Olivier کی تصحیح کے مطابق اس کی تاریخ وفات ۲۳ صفر ۱۱۹۳ھ/۱۲ مارچ ۱۷۷۹ء ہے ۔ اس کے بعد ایران میں طوائف الملوکی پھیل

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

گئی، جس سے خاندان قاجار کے برسراقتدار آنے کے بعد ہی نجات مل سکی۔

مآخذ: (۱) ابن عبد الکریم علی رضا شیرازی: تاریخ زندیہ، طبع E. Beer، لائیڈن ۱۸۸۸ء، ص ۳ تا ۶؛ (۲) Malcolm: *Hist. de la Perse*، فرانسیسی ترجمہ، ۳: ۱۶۶ تا ۲۲۰؛ (۳) Charmey: شرف نامہ، ۱: ۵۳؛ (۴) L. Dubeux: *La Perse*، ص ۳۴، ۳۶۶؛ (۵) P. Horn، در *Grundr. der iranischen Philologie*، ۲: ۵۹۲ ببعد؛ (۶) Mme Dieulafoy: *La Perse*، ص ۳۱۲، ۳۱۵ تا ۳۵۸؛ (۷) Oilvier: *Voyage dans l'Empire Ottoman*، ۳: ۲۸۳ تا ۳۰۱؛ (۸) Cl. Huart: *Hist. de Bagdad*، ص ۱۵۶ تا ۱۵۷؛ (۹) Niebuhr: *Voyage en Arabie*، ۲: ۹۲ ببعد؛ (۱۰) W. Francklin: *Observations made on a tour from Bengal to Persia in 1786-87*، کلکتہ ۱۷۸۸ء؛ (۱۱) Robert Binring: *Journal of two years' travel*، ۲: ۱ ببعد، ۱۹۲ ببعد؛ (۱۲) R. S. Poole: *Coins of the Shahs of Persia*، لنڈن ۱۸۸۷ء، ص ۱۰۵ تا ۱۰۶۔

(CL. HUART)

⊗ **کریمر**: رک بہ فان کریمر۔

⊗ **کَرِیمیا**: رک بہ قریم۔

* **کسائی**: حکیم مجد الدّین ابو اسحٰق (یا ابوالحسن) کسائی، چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر کا ایرانی شاعر، جس کا شمار فارسی شاعری کے دور اوّل میں ہوتا ہے۔ کسائی بروز چہارشنبہ بتاریخ ۲۶ شوّال ۳۴۱/۱۶ مارچ ۹۵۳ء مرو میں پیدا ہوا اور بیشتر مآخذ کی رو سے ۳۹۲ھ (۱۰۰۲ء) میں فوت ہوگیا، البتہ ایک مأخذ (والہ، جس کا حوالہ Ethé نے دیا ہے) سے پتا چلتا ہے کہ اس نے طویل عمر پائی۔ رہا اس کا کلام، سو اس کا کچھ حصہ مختلف تذکروں میں محفوظ رہ گیا ہے، جس کی Ethé نے اشاعت بھی کر دی ہے (*Die Lieder des Kisai S. B. Bayr. Ak.*، ۱۸۷۴ء، ص ۱۳۳ تا ۱۴۹)۔ کسائی کے کلام میں اس دور کے جملہ فارسی شعرا کے اصناف سخن کا نمونہ ملتا ہے اور اس مجموعے میں سب سے زیادہ مشہور وہ قصیدہ ہے جس میں شاعر نے اپنی تاریخ پیدائش وہی بتائی ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور بتایا ہے کہ یہ قصیدہ اس نے پچاس برس کے سن میں لکھا تھا۔ اس قصیدے میں یاس و قنوط اور زاھدانہ رجحانات کا غلبہ ہے۔ تذکرے کی رو سے وہ ایک ایسا شاعر ہے جس نے اہل بیت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی منقبت میں کئی قیصدے لکھے (اس قسم کا ایک قطعہ Ethé کے مقالے میں بھی موجود ہے)۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے سامانی فرمانرواؤں اور سلطان محمود غزنوی کی مدح میں قصیدے لکھے۔ سامانی دور میں وہ لازماً ایک مشہور و معروف شاعر ہوگا، لیکن زمانۂ مابعد کے تذکروں (مثلاً تذکرۂ دولت شاہ) میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

ناصر خسرو کے دیوان میں ایسے کئی اشعار ملتے ہیں جس میں اس نے کسائی کا ذکر بڑے حقارت آمیز طریق سے کیا ہے۔ Ethé (*Grundr. d. iran. Phil.*، ۲: ۲۸۱ تا ۲۸۲) نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کسائی ناصر کے زمانے (تخمیناً ۱۰۴۰ء) میں زندہ ہوگا جس کا مطلب پھر یہ ہے کہ اس نے بڑی عمر پائی۔ علاوہ ازیں Ethé کے نزدیک ان دونوں شاعروں کے باھمی اختلاف کا سبب ان کے مذہبی عقائد ہیں کیونکہ کسائی اثنا عشری شیعہ تھا اور ناصر خسرو کا تعلق سبعیۃ سے ہے۔ اس کے برعکس براؤن (*A Literary History of Persia*، ۲: ۱۶۰ تا ۱۶۴) کے خیال میں ناصر کی بدگوئی کا مقصد محض یہ تھا کہ بحیثیت شاعر کسائی پر اپنی فوقیت ثابت کرے۔ براؤن کی رائے میں Ethé کے اخذ کردہ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

نتائج ناقابل قبول ہیں، حتّٰی کہ کسائی کی عمر کے بارے میں بھی وہ اس کا نظریہ تسلیم نہیں کرتا کیونکہ اس کے نزدیک ناصر خسرو کی اپنی پیشرو نسل کے معروف ترین شعرا پر اپنی فوقیت جتانے کی کوشش مطلقاً تعجب انگیز نہیں۔

مآخذ: (۱) عوفی: لباب الالباب، طبع براؤن، ۲: ۳۳ تا ۳۹؛ (۲) چہار مقالہ، سلسلۂ یادگار کب، ۱۱: ۲۸، ۱۳۱۔

(J. H. KRAMERS)

* **الکسائی:** (صاحب کتاب قصص الانبیاء)۔ حاجی خلیفہ (۴: ۹۳۷۷) اسے اور مشہور نحوی و قاری علی بن حمزۃ کو ایک ہی شخص قرار دیتا ہے؛ چنانچہ اس کی یہ رائے سب سے پہلے Herbelot (*Bibl. Orientale*، ورق ۹۶۱ ب) نے تسلیم کی گو Pertsch اور Ahlwardt کی پیروی کرتے ہوئے Lidzbarski (*De Propheticis quae discuntur legendis Arabicis*، لائپزگ ۱۸۹۳ء، ص ۲۵) نے بجا طور پر اس کی مخالفت کی ہے، لیکن I. Eisenberg کے مقالے *Die Prophetenlegenden des Muhammad been Abdallah al-kisai*، برن ۱۸۹۸ء، ص ۷، میں Wellhausen اس مفروضے کی بنا پر اسے پھر قبول کرتا نظر آتا ہے کہ یہ کتاب اگرچہ اس مشہور و معروف عالم کی اپنی تصنیف تو نہیں، لیکن اس سے منسوب ضرور ہے۔ بایں ہمہ بیشتر مخطوطات کی شہادت اس رائے کے خلاف ہے، جن میں بعض اوقات مصنف کا نام (ابو عبداللہ) محمد بن عبداللہ بھی لکھا جاتا ہے، کبھی محمّد بن احمد اور کبھی حسن بن محمّد (کذا)۔ پھر اس امر میں بھی شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ کتاب مذکور کا مصنف وہی شخص ہے جس نے کتاب عجائب الملکوت (حاجی خلیفہ، ۴: ۸۰۷۵) یا محض کتاب الملکوت (کتاب مذکور، ۵: ۱۰۵۲۷) تصنیف کی اور جس کا نام حاجی خلیفہ کے نزدیک ابو جعفر محمّد بن عبداللہ الکسائی ہے، علی ہذا کتاب بدء الدنیا کا مصنف، جس کا نام حاجی خلیفہ (۳: ۹۹۱۰) نے کنیت کے بغیر لکھا ہے۔ یہ آخرالذکر تصنیف ناپید ہے، لیکن شاید اصل تصنیف کے حصۂ اوّل کا نسخہ تھا، جسے ایک جداگانہ کتاب کی شکل میں مرتب کیا گیا اس لیے کہ بعض مخطوطات میں کتاب مذکور کا نام کتاب بدء (خلق) الدنیا و قصص الانبیاء بھی آیا ہے۔ اس مصنف نے جس زمانے میں فروغ پایا اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا؛ لہٰذا اس بارے میں کہ اس کا مصنف یہی الکسائی تھا یا مشہور نحوی، جیسا کہ حاجی خلیفہ (۴: ۹۳۷۷) کا بیان ہے، Eisenberg (مقالہ ص ۹) کی رائے کے برعکس کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ سہل بن عبداللہ التستری (رک بآں) ایک مختصر قصص الانبیاء کا مصنف ہے، اس لیے کہ حاجی خلیفہ نے کہیں نہیں لکھا کہ کتاب مذکور کی بنیاد الکسائی کی مشہور تصنیف قصص الانبیاء پر رکھی گئی۔ الثعلبی [رک بآں] نے بھی الکسائی کا ذکر نہیں کیا، لہٰذا مآخذ اور دونوں مصنفوں کے باہمی تعلق کے بارے میں ابھی تحقیق کی ضرورت باقی ہے اور یہی وجہ ہے کہ الکسائی کے زمانے کے متعلق بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنا ناممکن ہے البتہ اس کے تمام ادبی کارناموں کی جو نوعیت ہے اسے مدنظر رکھیے تو Ahlwardt کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ الکسائی کا زمانہ پانچویں صدی ہجری ہے۔ الثعلبی کی تصنیف قرآن مجید کی تفاسیر پر مبنی ہے اور پڑھے لکھے حلقے کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کے برعکس الکسائی قصہ گو طبقے کا مثالی نمائندہ ہے اور قارئین کی آگہی اور دلچسپی کے لیے قصے بیان کرتا ہے۔ بظاہر اسے احتیاط اور صحت پسندی کا دعوٰی ہے، لیکن حوالے ہمیشہ قدیم ترین اسناد، مثلاً کعب الاحبار اور وہب بن

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

منبہ ہی کے دیتا ہے، لہٰذا اس کے اقتباسات علمی تنقید کے قطعاً متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے ابھی موجود ہیں (*GAL.*، ۱ : ۳۵۰ میں مندرجہ نسخوں پر حسب ذیل کا اضافہ کر لیجیے : (۱) Gotha، *Verz.* : Pertsch، عدد ۱۸۳۹؛ (۲) موزۂ برطانیہ : Ellis and Edwards *A descriptive List*، ص ۳۴ Or. ۵۸۲۰؛ (۳) E. G. Browne : *A Supplementary Handlist*، عدد ۱۰۱۲؛ (۴) Littmann, Princeton، عدد ۲۸؛ (۵) فہرست دارالکتب المصریۃ، قاہرہ، ۵ : ۱۳۱؛ (۶) فہرست دارالکتب الظاہریہ، دمشق، الزیات، عدد ۴۷ ۔ یہ کتاب چونکہ مقبول عام تھی، لہٰذا کاتبوں نے اسے نقل کرنے میں ہمیشہ احتیاط سے کام نہیں لیا بلکہ اکثر من مانے اختصار کر دیے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ ترکی میں بھی ہو چکا ہے دیکھیے H. L. Fleischer : *Catalogus codd. mss. Or. bibl. Dresdensis*، عدد ۱۲۸۔

مآخذ : (۱) Hottinger : *Promptuarium*، ہائیڈل برگ ۱۶۵۸ء، ص ۲۰۹؛ (۲) Lidzbarski : *Diss.* (sl.)، ص ۲ تا ۲۵؛ (۳) *Vita Prophetarum auctore Muhammed Ben Abdallah al-kisa'i e codicibus, qui in Monaco, Bonna, Lugd. Batav., Lipsia* Isaae Eisenberg *et Gothana asservantur edidit* ج ۱، لائیڈن ۱۹۲۲ء و ج ۲ لائیڈن ۱۹۲۳ء۔

(BROCKELMANN)

* **الکسائی** : علی بن حمزہ بن عبداللہ بن بہمن بن فیروز، مولیٰ بنو اسد، نحوی اور قاری ۔ کوفے میں پیدا ہوا اور رنبویۃ میں، جو رے سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے، ۱۸۹ھ/۸۰۵ء میں فوت ہو گیا۔

اپنے آبائی شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد الکسائی بصرے چلا گیا تاکہ الخلیل بن احمد [رک بآں] کی خدمت میں رہ کر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے، لیکن اس نے اسے مشورہ دیا کہ نجد، حجاز اور تہامۃ کے قبائل کا رخ کرے، ان کے ساتھ رہے اور زبان سیکھے ۔ الکسائی واپس آیا تو الخلیل کا انتقال ہو چکا تھا اور نحوی یونس بن حبیب البصری اب اس کا جانشین تھا ۔ اس نے صرف و نحو کے بارے میں الکسائی سے متعدد مباحثے کیے اور بالآخر اپنی جگہ اس کے لیے خالی کر دی ۔ الکسائی نے مستقل طور پر بغداد میں اقامت اختیار کی جہاں زیادہ تر وہ قرآن مجید کی قراءات ہی پر درس دیتا ۔ شروع شروع میں تو اس نے اپنے استاد حمزۃ الزیات ہی کے طریقۂ تعلیم کی پیروی کی، لیکن بعد ازاں اپنا الگ طریق اختیار کر لیا ۔ وہ "بدر سابع" ہے لہٰذا اس کا شمار سات مستند قاریوں [قرائے سبع] میں ہوتا ہے۔

ہارون الرشید نے الامین اور المامون اپنے دونوں بیٹوں کی تعلیم اس کے ذمے کی ۔ اگرچہ امام الشافعیؒ صرف و نحو میں اس کی معلومات کی بے انتہا تعریف کرتے ہیں، لیکن کہا جاتا ہے کہ صرف و نحو ہی میں بالخصوص کمزور تھا؛ چنانچہ اس کے حامی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ الکسائی نے اس فن پر آخر عمر ہی میں توجہ مبذول کی ۔ بہرحال اس کے متعدد حریف تھے جن کے متعلق اس کے رویے کو نہ تو دیانتدارانہ کہا جا سکتا ہے نہ منصفانہ۔ ان میں سیبویہ اور الیزیدی قابل ذکر ہیں۔

الکسائی کے اساتذہ میں ابو جعفر، الرؤاسی، معاذ بن مسلم الھراء، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن ارقم اور ابوبکر بن عیاش شامل ہیں۔

شاگرد تھے : ابو عمر الدوری، ابو الحارث اللیث بن خالد، یحیی بن زیاد الفراء اور ابو عبیدالقاسم بن سلیمان۔

معلوم ہوتا ہے کہ الکسائی کی متعدد تصنیفات

www.besturdubooks.wordpress.com

میں سے ایک رسالہ ما تلحن فیہ العوام ہی محفوظ رہ سکا ہے ۔ یہ رسالہ عامیانہ زبان کی غلطیوں کے بارے میں لکھا گیا ہے جسے اس موضوع پر غالباً قدیم ترین تصنیف کا درجہ حاصل ہے اور جسے مخطوطۂ برلن عدد ۷۱۰۳ سے نقل کرتے ہیں، Brockelmann نے *Zeitschr. F. Assyriol*، ۱۲ (۱۸۹۸ء) : ۲۹ تا ۴۶ میں شائع کیا (دیکھیے سطور ذیل Nöldeke، کتاب مذکور، ص ۱۱۱ تا ۱۱۵) ۔ [یہ رسالہ عبدالعزیز المیمنی کی تصحیح سے دوبارہ شائع ہوا ہے] ۔

مآخذ : (۱) الفہرست، ص ۲۹، ۶۵؛ (۲) الاغانی، ۵ : ۳۶، ۵۴؛ ۱۱ : ۱۰۶؛ ۱۲ : ۲۳؛ ۱۸ : ۷۳؛ ۲۱ : ۱۰۶؛ (۳) ابن الانباری : الانصاف، طبع G.Weil، لائیڈن ۱۹۱۳ء، ص ۲۹۳ تا ۲۹۴ و بمدد اشاریہ؛ (۴) ابن قتیبہ : المعارف، قاہرہ ۱۳۰۰ھ، ص ۱۸۴؛ (۵) ابن حجر : تہذیب التہذیب، حیدرآباد ۱۳۲۶ھ، ۷ : ۳۱۳؛ (۶) الانباری : نزھۃ الالبّاء فی طبقات الادباء، قاہرہ ۱۲۹۴ء، ص ۸۱؛ (۷) یاقوت : معجم البلدان، بذیل مادۂ رنبویہ؛ (۸) وھی مصنف : ارشاد الاریب، لائیڈن ۱۹۱۱ء، ۵ : ۱۸۳؛ (۹) ابن خلّکان : وفیات، قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ۱ : ۳۳۰؛ (۱۰) البکری : تاریخ الخمیس، قاہرہ ۱۲۸۳ھ، ۲ : ۳۳۲؛ (۱۱) ابوالفداء : تاریخ، قسطنطنیہ ۱۲۸۶ھ، ۲ : ۱۸؛ (۱۲) السمعانی : الانساب، لائیڈن ۱۹۱۲ء، ورق ۴۸۲ الف؛ (۱۳) السیوطی : المزھر، بولاق ۱۲۸۲ھ، ۲ : ۲۳۲؛ (۱۴) وھی مصنف : بغیۃ الوعاۃ، قاہرہ ۱۳۲۶ھ، ص ۲۳۶؛ (۱۵) وھی مصنف : الاشباہ و النظائر، حیدرآباد ۱۳۱۷ھ، ۴ : ۱۵، ۱۸، ۴۴؛ (۱۶) Flügel : *Die Gramm. Schulen d. Araber*، لائپزگ ۱۸۶۲ء، ص ۱۲۱؛ (۱۷) Nöldeke : *Gesch. d. Qorân*، گوٹنگن ۱۸۶۰ء، ص ۲۹۱، ۲۹۷؛ (۱۸) Brockelmann : *GAL.*، ص ۱۱۵ [تعریب : تاریخ الادب العربی، ۲ : ۱۹۷ تا ۱۹۹]؛ (۱۹) Hurat : *Litt. arabe*، ص ۱۵۰ ۔

(محمّد بن شنب)

کسب : یہ مادّہ قرآن مجید میں تلاش * کرنے، حاصل کرنے، کمانے، کام کرنے [(الراغب : مفردات القرآن، بذیل مادہ)] (اچھا یا برا) کے معنوں میں بارہا استعمال ہوا، نیز دیکھیے C. Torrey : *The Commercial Theological Terms in the Koran* (لائیڈن ۱۸۹۲ء)، ص ۲۷ ببعد اور اس میں Nöldeke کا شذرہ ۔ باب اوّل (فعل) اور باب ہشتم (افتعال) کے مشتقات مترادفات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، لیکن البیضاوی نے (تفسیر البیضاوی طبع Fleischer، ۱ : ۱۴۳ س ۲۱) میں اس آیت (۲ [البقرۃ] : ۲۸۶) کی تفسیر میں الزمخشری کی پیروی کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ باب افتعال میں جا کر معنوں میں زیادہ ذاتی اور راجع الی الفاعل ہونے کا اعتماد پیدا ہو جاتا ہے، لہٰذا کسب اور اکتساب کے معنی تقریباً ایک ہیں البتہ اصطلاحاً اس کا استعمال دو گونہ ہے : (۱) ایک جو اشاعرہ کے "اکتساب" کا مترادف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کا فعل در اصل اللہ کا تخلیق کردہ، ابتدا کردہ اور پیدا کردہ ہوتا ہے، لیکن انسان اس کا اکتساب کرتے ہوئے اسے مکسوب بنا لیتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے اختیار اور ارادے سے اس سے ربط تو قائم کر لیتا ہے، مگر نہ تو اس کے نتیجے پر اثر انداز ہوتا ہے نہ اس کا آغاز وجود اس کا مرہون منت ۔ وہ صرف اس کا مورد (ریاضی کی اصطلاح میں محل) ہے کہ جو عمل سرزد ہوتا ہے، مخلوق کی ذات میں ہوتا ہے (الجرجانی : شرح المواقف از الایجی، بولاق ۱۲۶۶ھ، ص ۵۱۵) ۔ الغزالیؒ نے غالباً اس لیے کہ انسان اپنے عمل کی ذمّے داری قبول کرے اکتساب کو ترجیح دی دیکھیے ان کا ارشاد احیاء علوم الدین (طبع مع شرح المرتضی الزّبیدی، ۲ : ۱۶۵ ببعد) اور اس کی

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

مفصل شرحیں ۔ الرازی (تفسیر، ۲ : ۳۸۸، قاہرہ ۱۳۰۸ھ) نے بھی ۲ [البقرۃ] : ۲۸۶ کی شرح کرتے ہوے ان دو اصطلاحات کے بارے میں مختلف نظریے بیان کیے ہیں ۔ السنوسی نے بھی مقدمہ (طبع Luciani، ص ۶۸ ببعد، نیز حاشیہ ص ۲۳۷) میں اکتساب کی اصطلاح دو بار استعمال کی ہے اور وہ بھی کسب ہی کے معنوں میں ۔ السنوسی کے بیان کو الجرجانی کے بیان پر اضافہ تصور کیجیے ۔ یہ مسلمانوں کے کلام کا ادق ترین مسئلہ ہے (ادق من کسب الاشعری)، لیکن قیاس یہ ہے کہ الاشعری چاہتا تھا اس امر کی تشریح کرے کہ انسان کو آزادی اختیار کا شعور حاصل ہے اس کا کہنا یہ تھا کہ اس شعور کو اللہ تعالیٰ نفس انسانی میں الگ طور پر تخلیق کرتا ہے ۔ اس کے نزدیک انسان ایک خود حرکت کل ہے اور شعور اس کا ایک پرزہ ۔ متکلمین مابعد نے بالخصوص ماتریدی نظام فکر کے زیر اثر جس پر اخلاقیات کا غلبہ ہے، اس نظریے کو اس کے برعکس دوسرے طریقے سے پیش کیا، مثلاً دیکھیے التفتازانی : شرح العقائد النسفی (نسفی ماتریدی تھا)، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ص ۹۸ ببعد؛ (۲) کسبی اور اکتسابی اطلاق اس علم پر ہوتا ہے جو مخلوق اشیا کو حاصل اور علل ثانویہ (اسباب) کے اختیاری استعمال سے حاصل کیا جاتا ہے : (الف) مثلاً استدلال اور استخراج میں مقدمات کو جانچنا یا (ب) جیسے سننا، جیسے ادراک حسی کے دوران میں آنکھ کا پھیرنا ۔ ان کا دائرہ بہ نسبت استدلال زیادہ وسیع ہے ۔ استدلال کا تعلق تو صرف حجت اور دلیل سے ہے ۔ بعض اوقات ایسا ہی ہوتا ہے کہ ضروری کو اکتسابی اور استدلالی کے مقابلے میں پیش کیا جائے ۔ دوسروں کے نزدیک اس کی ترتیب یوں ہے : (الف) ضروری اور (ب) اکتسابی؛ (ب) کے حصول میں اسباب کی تین قسمیں ہیں : صحت مند حواس قابل اعتماد بیان اور "نظر"، یعنی فکر معقول ۔ نظر کی بھی دو قسمیں ہیں : یعنی فوری وجدان (بدیہی) اور استدلال، یعنی (استخراج) (التفتازانی : شرح العقائد النسفی، ص ۳۹ ببعد؛ نیز الجرجانی : شرح المواقف، ص ۱۶، ۲۱)۔

مآخذ : متن میں مذکور ہیں ۔ دونوں قسم کے استعمال کے بارے میں کشاف اصطلاحات الفنون، ص ۱۲۴۳، ببعد کا اضافہ کر لیجیے ۔

(D. B. MACDONALD)

کَسْر : ریاضی کی ایک اصطلاح جسے عرب * ریاضی دان کوئی سے دو عددوں، فاصلوں یا سطحوں وغیرہ کی نسبت کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ ہندسہ میں البتہ الکسر کی اصطلاح شاذ ہی استعمال ہوتی ہے ۔ عام طور پر یوں کہا جاتا ہے نسبت الف الی ب کنسبۃ ج الی د $\left(\frac{ا}{ب} = \frac{ج}{د}\right)$ ۔ عرب ہیئت دان جیب زوایے کو دائرے کے نصف قطروں سے تعبیر کرتے ہیں جو ۱۲ یا ۶۰ حصوں پر مشتمل ہوگا ۔ البیرونی کے نزدیک نصف قطر کی قیمت ہے ایک، لہٰذا اس کی تصنیف میں جیب زاویے کی قیمتیں کسروں ہی کی شکل میں جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں دی گئی ہیں ۔ القانون المسعودی کی عبارت ہے : ویقوم مقام الکسر الّتی مخارجہا من الاثنین الی العشرۃ ولذلک سمواتلک الاوتار امہات کما سموا ہذہ الکسور رؤوسًا (اور پھر کسروں کے ایک باقاعدہ سلسلے کے بعد دوسرا سلسلہ) جو (اعداد) ۲ سے شروع ہو کر ۱۰ تک چلتا ہے، لہٰذا انھوں (ریاضی دانوں) نے ان کا نام وتر "اُمّہات" (مائیں) رکھا ہے بعینہ جیسے کسروں کا سر (دیکھیے القانون المسعودی، مخطوطۂ عربی برلن، عدد ۲۷۵۰، ص ۶۳ ب ۔ جبر و مقابلہ میں البتہ کسروں سے نسبۃً زیادہ سابقہ پڑتا ہے؛ چنانچہ جن کسروں کو عرف عام

www.besturdubooks.wordpress.com

میں "قابل تعبیر" کہا جاتا ہے یہ وہی کسریں ہیں جن کے نسب نما ۳ تا ۱۰ ہیں، مثلاً ثلث ($\frac{1}{3}$)، ربع ($\frac{1}{4}$)، خمس ($\frac{1}{5}$)، سدس ($\frac{1}{6}$) وغیرہ۔ دوسری صورتوں میں، مثلاً ($\frac{5}{11}$) کے بجائے ہم یوں لکھیں گے گیارہ میں سے پانچ حصے۔ پھر اگر نسب نما اجزا میں تقسیم کیے جا سکیں تو کلیۂ ذیل استعمال کیا جائے گا $\frac{1}{48}$ = آٹھویں حصے کا چھٹا حصہ، کسر $\frac{1}{2}$ کو نصف (آدھے) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مآخذ: J. Ruska: *Zur ältesten arabischen Algebra*، ہائیڈل برگ ۱۹۱۷ء، ص ۲۰ و ۲۴۔

(C. Schoy)

* **کَسْر**: رک بہ کَسْرَة۔

* **کَسْرَة**: لغوی معنی توڑنا؛ زیر کی علامت؛ اس کی آواز کسر کہلاتی ہے۔

* **کِسْرٰی**: ساسانی خاندان کے دو ایرانی بادشاہوں کا عربی نام۔ خُسْرو [رک بآں] ایرانی بادشاہوں کا عام نام پڑ گیا۔ آگے چل کر اس سے اَکَاسِرَة (دوسری شکلیں: کُسُور، اکاسر، کسائرہ) جمع مکسر بنی۔ شہر المدائن (Seleucia-ctesiphon) کی واحد یادگار جو حال ہی میں زلزلے سے تباہ ہوئی، طاق کسریٰ اور ایوان کسریٰ کہلاتی تھی (۱) Pietro della Valle، فرانسیسی ترجمہ، پیرس ۱۶۶۱ء، حصہ ۲، ص ۶۴ تا ۶۸؛ (۲) Buckingham: *Travels in Mesopotamia*، ۱: ۵۱۹؛ (۳) Edw. Yves: *Voyage from England to India*، لنڈن ۱۷۷۳ء، ص ۲۹۰؛ (۴) Beauchamp، در *Journal des Savants*، ۱۷۹۰ء، ص ۷۹۷؛ (۵) Olivier: *Voyage dans l' empire Othoman*، ۲: ۳۳۴ ببعد؛ (۶) J. cl. Rich: *Narrative*، ۲: باب ۱۹، ص ۱۵۹؛ (۷) J. Keppel: *Personal narrative*، ۱: ۱۲۲ ببعد؛ (۸) J. Baillie Fraser: *Travels in Koordistan*، ۲: ۱ تا ۹)۔

(Gl. Huart)

* **کَسْف**: رک بہ خسوف۔

* **کَشْف**: رک بہ کَشْف۔

* **کَسْکَر**: عراق کے ایک شہر کا نام۔ جب خلیفہ عبدالملک کے عامل عراق الحجاج [رک بآں] نے یہاں کی بغاوت فرو کر دی تو اس نے ۸۳ھ/۷۰۲ء تا ۸۶ھ/۷۰۵ء میں ایک نیا شہر بسانا شروع کیا جو الواسط (مرکز) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ شہر اس صوبے کے پرانے عرب دارالخلافوں، یعنی شمال میں کوفے اور جنوب میں بصرے سے یکساں فاصلے پر واقع تھا۔ الحجاج نے اس شہر کی تعمیر کے لیے دریائے دجلہ کے کنارے شہر کسکر کے مضافات کا انتخاب کیا، جس نے ساسانیوں کے عہد کی تاریخ میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ نیا اسلامی شہر دجلے کے مشرقی کنارے پر بسایا گیا۔ اس کے برعکس کسکر اس کے بالمقابل دجلے کے دوسرے کنارے پر واقع تھا۔ شہر کے دونوں نصف حصوں کو ایک کشتیوں کے پل کے ذریعے ملایا گیا۔ آج کل نہ تو الواسط باقی ہے نہ کسکر بلکہ ابھی کچھ مدت پہلے تو ان کے صحیح محل وقوع کے متعلق بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ عہد اسلام میں دریائے دجلہ موجود مقام سے کہیں زیادہ مغرب میں بہتا تھا۔ اس زمانے میں اس کی گزرگاہ بہت حد تک غالباً وہی تھی جو آج کل شط الحی کی ہے۔ کسکر واسط یقیناً موجودہ کوت الحی کے قرب و جوار میں کہیں واقع ہوگا۔

ساسانیوں نے عراق کی جو تقسیم کی تھی اس کے مطابق ۷۲ انتظامی اضلاع میں کسکر کا بھی شمار ہوتا تھا دیکھیے Streck، کتاب مذکور [دیکھیے مآخذ] ص ۱۵، ۱۸۔ یہ غالباً جیسا کہ آگے چل کر مسلمانوں کی حکومت میں بھی... تخمیناً اس علاقے پر مشتمل تھا جو دریائے دجلہ کے مشرق میں واقع ہے اور شمال میں موجودہ کوت العمارہ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

سے لے کر دجلے کے دہانے کے علاقے تک پھیلا ہوا ہے ۔ بعض اوقات اسے اور ضلع میسان [رک بآں] کو ایک ہی بتایا گیا ہے ۔ اس بارے میں دیکھیے Schaeder، در *Islam*، ۱۴ (۱۹۲۴ء) : ۱۷ ببعد؛ دیکھیے نقشہ در Sachau : *Die Chronik von Arbela*، ص ۱۶ ۔ دیلم کے دارالخلافہ کو جو عام طور دولاب کے نام سے مشہور ہے بعض اوقات کسکر بھی کہتے ہیں، دیکھیے G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۱۷۴؛ de Morgan : *Miss scientif. en perse*، ۱ (پیرس ۱۸۹۴ء) : ۲۷۶ .

مآخذ : (۱) *BSA*، بمواضع کثیرہ؛ (۲) البلاذری، (طبع ڈخویہ)، ص ۵۸۲؛ (۳) یاقوت : معجم (طبع Wüstenfeld)، ۴ : ۲۷۴؛ (۴) القزوینی : آثار البلاد (طبع Wüstenfeld)، ۲ : ۲۹۹؛ (۵) حمد اللہ المستوفی : نزھۃ القلوب (سلسلۂ یادگار گب، ۲۳/۱ : ۱۶۲، ۶)؛ (۶) G. Le. Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate* (کیمبرج ۱۹۰۵ء)، ص ۳۹، ۴۳، ۸۰؛ (۷) وہی مصنف، در *JRAS*، ۱۸۹۵ء، ص ۴۴ ببعد؛ (۸) Streck : *Babylonien nach den arab. Geograph.*، ۲ (لائیڈن ۱۹۰۲ء) : ۳۱۸ ببعد، ۳۲۱ ببعد؛ (۹) Ritter : *Erdkunde*، ۱۰ : ۱۹۱ .

(M Streck و [تلخیص از ادارہ])

* **کُسکُس** : (Couscous)، ایک قسم کا کھانا جو میدے (Semolina) سے تیار کیا جاتا ہے ۔ تمام شمال مغربی افریقہ (طرابلس، صحراء، تونس، الجزائر اور مراکش) میں یہ لوگوں کی خوراک کا بڑا جزو ہے ۔ اسے بعض اوقات "طَعام"، یعنی "اصلی کھانا" "یا بہترین کھانا" بھی کہا جاتا ہے اور مشرق الجزائر کے بدوی باشندے اسے نَعْمہ بھی کہتے ہیں جس کا مفہوم بھی وہی ہے ۔ مغربی الجزائر کے بادیہ نشین اسے "مَعاش" اور جنوب اور صحرا کے بادیہ نشین "عَیْش" اسی مفہوم میں کہتے ہیں، یہاں تک کہ تونس میں طعام کی اصطلاح خاص طور پر ان دعوتوں کے لیے استعمال ہونے لگی ہے جن میں یہ کھانا خصوصیت سے کھایا جاتا ہے، یعنی وہ دعوتیں جو اور جگہ زردہ (مشرق الجزائر)، وعدہ (مغربی الجزائر) اور مسیم musem (مراکش) کہلاتی ہیں ۔ افریقہ کی یہودی عربی میں کسکس کو فتیل (Ftil) کہا جاتا ہے .

کسکس کسی وقت میں بھی تیار کیا جا سکتا ہے، تاہم بعض لوگ اسے دوشنبے اور جمعے کی راتوں میں تیار کرتے ہیں جو سنت نبویؐ کے مطابق خاص طور پر مبارک راتیں ہیں ۔ تیاری کا عمل، جسے ایک طرح کا مذہبی رنگ دے دیا گیا ہے اور جس میں بعض رسوم کا ادا کرنا ضروری ہے، کسی دعا یا مذہبی کلمے سے شروع ہوتا ہے ۔ جو عورت اسے تیار کر رہی ہو اسے نہ تو کوئی چیز ایسی سننی چاہیے اور نہ دیکھنی جو فال بد تصور کی جا سکے ۔ چنانچہ جو لوگ اس کے گرد و پیش ہوتے ہیں وہ یا تو اولیاے کرام کا ذکر کرتے ہیں، یا زرعی خوشحالی اور زمین کی زرخیزی کا اور یا اس عورت کے گھرانے کی دولت و ثروت کا چرچا کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ اور سب باتوں کے ذکر سے وہ احتراز کرتے ہیں .

کسکس بناتے وقت عورت زمین پر بیٹھ جاتی ہے اور اپنے سامنے ایک لکڑی کا برتن رکھ لیتی ہے جسے مقامی اصطلاح کے مطابق جَفْنہ یا قَصْعَہ کہا جاتا ہے ۔ اس کے قریب ہی میدے کا تھیلا اور ایک برتن میں خفیف سا نمکین پانی رکھا ہوتا ہے ۔ بعض لوگ اس نمکین پانی میں دو تین قطرے ابرنیساں کے پانی کے (یعنی اس مینہ کے جو مئی کے شروع میں برستا ہے اور جس کا پانی ایک بوتل میں بھر کے رکھ لیا جاتا ہے) ملا دیتے ہیں، جس کی

www.besturdubooks.wordpress.com

کچھ خاص تاثیر سمجھی جاتی ہے ۔ وہ عورت ایک مٹھی بھر میدہ لیتی ہے، اسے جفنہ میں ڈال دیتی ہے اپنے چلو سے نمکین پانی اس پر چھڑکتی ہے اور اسے اپنی انگلیوں سے دبا دباکر برتن میں ادھر ادھر پھراتی ہے ۔ یہاں تک کہ سیسے کے چھرّوں کی طرح سے اس کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بن جاتی ہیں ۔ ایک ایک مٹھی آٹا لے کر وہ یہی عمل کرتی رہتی ہے اور چھوٹی گولیوں کو بڑی گولیوں سے جدا کرنے کے لیے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جفنہ کو ہلاتی رہتی ہے اور اس میں گھماگھما کر بڑی گولیوں کی چھوٹی گولیاں بناتی ہے ۔

اس اثنا میں وہ ایک انگیٹھی پر قدرہ (ایک قسم کی مٹی کی ہنڈیا) کے اندر پانی میں گوشت ابالنے کو رکھ دیتی ہے، یعنی اگر کسکس کو گوشت کے ساتھ پکانا منظور ہو، اور یا ترکاریاں (چھوٹی مٹر، شلجم، جنگلی چقندر)، اگر اسے ترکاریوں کے ساتھ پکانا مقصود ہو، اور یا صرف پانی، اگر اسے شکر کے کے ساتھ پکانا چاہیں ۔ آخر کار جب کسکس کے لیے میدے کی حسب ضرورت مقدار تیار ہو جاتی ہے تو عورت اسے کچھ دیر کے لیے ایک چمڑے کی تھیلی یا بوتل میں بند کرکے رکھ دیتی ہے ۔ اس کے اندر چھوٹی گولیاں خشک ہوتے ہی ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں اور ایک طرح کے موٹے دانے دار آٹے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اب پکانے والی اس آٹے کو ایک خاص چھلنی میں الٹ دیتی ہے اور موگری ہاتھ میں لے کر اس سے آٹے کو کچل کچل کر چھلنی میں سے گزارتی ہے ۔ یہ گول دانے جو چھلنی کے سوراخوں میں سے گزرتے ہیں کسکس کے اصلی دانے ہوتے ہیں ۔ جو دانے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ سوراخوں میں سے نہیں گزر سکتے انہیں برغوس یا میدے کے نان جو مفطفہ کہلاتے ہیں، بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے ۔

اسی دوران میں پانی سے آدھی بھری ہوئی قدرہ انگیٹھی پر کھولتی رہتی ہے ۔ اب پکانے والی ایک برتن جسے کسکس کہتے ہیں لیتی ہے جو ایک بغیر گردن کی قیف نما مٹی کی پتیلی ہوتی ہے جس کے پیندے میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے ہیں ۔ پتیلی کو قدرہ کے اوپر رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے کناروں پر کپڑا لپیٹ دیا جاتا ہے تاکہ دونوں برتنوں کے بیچ میں سے بھاپ باہر نہ نکل سکے ۔ اس پتیلی کے اندر کسکس کے دانے بھرے ہوتے ہیں ۔ بھاپ کو باہر نکلنے کے لیے پتیلی کے پیندے کے سوراخوں اور کسکس کے دانوں کے بیچ میں سے گزرنا پڑتا ہے جنہیں وہ پکا دیتی ہے ۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پکانے والی کسکس میں اپنی انگلی ڈال کر یہ دیکھ لیتی ہے کہ آیا وہ ٹھیک طرح پک گیا ہے یا نہیں ۔ جب وہ اچھی طرح پک جاتا ہے تو وہ اس کے دانوں کو جفنہ میں ڈال دیتی ہے اور دوبارہ اپنے ہاتھ سے ان کی گولیاں بناتی ہے تاکہ وہ مل کر آٹا یا منجمد ٹکڑے نہ بن جائیں اور پھر دوبارہ انہیں کسکس، یعنی پتیلی میں بھاپ دیتی ہے ۔ اس مرتبہ جونہیں کسکس سے بھاپ اٹھنی شروع ہوتی ہے وہ اسے آخری دفعہ جفنہ میں ڈال دیتی ہے ۔

اب اگر پکانے والی مسفوف یا میٹھا کسکس بنانا چاہتی ہے تو اس پر مصری چھڑک دیتی ہے اور کہیں کہیں اس کے بیچ میں مکھن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھ دیتی ہے جو گرمی کے اثر سے پگھل کر میدے کی چھوٹی گولیوں میں سرایت کر جاتا ہے ۔ اب قدرہ کا پانی پھینک دیا جاتا ہے ۔ اگر کسکس کو گوشت یا ترکاریوں کے ساتھ پکانا ہوتا ہے تو عورت قدرہ میں پانی کی مقدار بڑھا دیتی ہے تاکہ شوربے یا سقیہ کی مقدار بڑھ جائے، نیز اس میں تھوڑا سا نمک بھی ڈال دیتی ہے ۔ کھانا پیش

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کرنے سے پہلے یہ شوربا اس پر ٹپکا دیا جاتا ہے۔

کسی ضیافت میں خواہ کتنے ہی الوان کا کھانا ہو، کسکس ہمیشہ سب سے آخر میں دسترخوان پر رکھا جاتا ہے۔ بنانے کی ترکیب کے مطابق اسے مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے اور ان ناموں میں مختلف لسانی علاقوں کے اعتبار سے بھی تفریق پائی جاتی ہے۔ جو نام بیان ہو چکے ہیں ان میں مندرجۂ ذیل کا اضافہ کیا جا سکتا ہے: (۱) مَسْفُوف، بہت باریک دانوں کا شکر کے ساتھ؛ (۲) مَعْوار، بہت باریک دانوں کا گوشت کے ساتھ؛ (۳) بَرْبُوخ (تونس، قُسْطِینَة Constantine) باریک دانوں کا جسے ٹھنڈا کرکے مکھن یا کسی بھی قسم کی چربی کے ساتھ اوپر سے چھاچھ چھڑک کر کھاتے ہیں۔ یہ مغرب میں سِیکُوک کہلاتا ہے؛ (۴) مَحَمَّصَہ، بہت بڑے بڑے دانوں کا کسکس؛ (۵) بَرْقُوقس یا برقوقش یا مَرْدُود، بھاپ کے پھولے ہوئے بڑے دانوں کا اور شوربے یا دودھ میں پکا ہوا، جو جنوبی الجزائر میں عَیْش کہلاتا ہے؛ (۶) بَرْبُوشَہ، جو بجائے گیہوں کے جو کے میدے سے بنتا ہے۔ اسے مغرب میں بریول کہا جاتا ہے۔

مآخذ: (۱) Delphin: *Textes Pour l' étude de l' arabe parlé*، پیرس ۱۸۹۱ء، ص ۲۰۷ ببعد؛ (۲) Desparmet: *Enseignement de l' arabe dialectal*، دوسرا دور: الجزائر ۱۹۱۳ء، ص ۱۷۹ ببعد؛ (۳) Destaing: *Dialecte berbère des B. Snous*: ۱: ۳۱۲؛ (۴) Doutté: *Marrakech*، پیرس ۱۹۰۶ء، ص ۲۳۲ اور وہ مآخذ جن کا حوالہ حاشیے میں دیا گیا ہے۔

(A. Cour)

* **کَسْلَہ**: (عربی ہجاء کَسَلة، کَسَلا) اینگلو مصری سوڈان کا ایک شہر اور صوبہ (مدیریة)۔ اریٹیریا کی سرحد سے تقریباً پچیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کا نام جبل کسلة کے نام پر رکھا گیا ہے، جو سنگ خارا کی ایک خوش منظر پہاڑی ہے۔ اس کی سات چوٹیاں ہیں اور بلندی ۲۷۹۱ فٹ ہے، یہ اردگرد پھیلے ہوئے میدانوں کے مابین رہنمائی کا نمایاں نشان ہے۔ کتب قدیم میں اس کا نام کَسْلَہ اللُّس لکھا ہے (بجہ: To-Lus)۔ ابتداء موجودہ شہر کی جگہ حلنقہ (بجہ نسل کے ایک قبیلے) کی بستی تھی۔ ۱۸۴۰ء میں احمد پاشا ابو اذان (حکمدار سوڈان ۱۸۳۹ تا ۱۸۴۴ء) نے ضلع تاکَہ کا صدر مقام اور فوجوں کی چھاؤنی بنانے کے لیے یہ مقام منتخب کیا۔ یہ ضلع اسی زمانے میں ترکی مصری فوجوں نے فتح کیا تھا۔ سواکن اور مساوا (مسوع) کی بندرگاہوں کو جانے والے راستے پر واقع ہونے کی وجہ سے کسلہ کو ایک تجارتی مرکز کی حیثیت سے خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔ ۱۸۸۳ء میں اس کی آبادی ۲۰ ہزار تھی، جس میں غیر ملکی تاجروں کی بھی کچھ تعداد شامل تھی۔ ۱۸۸۵ء میں باقی مصری سوڈان کی مانند کسلہ پر بھی درویشوں، یعنی محمّد احمد [رک بآں] مہدی سوڈانی کے پُرجوش پیروؤں کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۸۹۱ء میں بریطانیہ اور اطالیہ کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے کسلة کو عارضی طور پر اطالوی افواج کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اگرچہ اس عرصے میں درویشوں کی وجہ سے انھیں بڑی پریشانی اٹھانی پڑی اور ان کے خلاف متعدد کامیاب جھڑپیں بھی ہوئیں، مگر یہ فوجیں ۱۸۹۴ سے ۱۸۹۷ء تک یہیں قابض رہیں۔ ان کا قبضہ اس وقت ختم ہوا جب اینگلو مصری افواج نے دوبارہ سوڈان فتح کر لیا اور بریطانیہ اور مصر کی مشترک نگرانی میں حکومت سوڈان قائم ہوئی تو نئے نظام کے تحت اس شہر کو دوبارہ انتظامی و تجارتی مرکز ہونے کی حیثیت سے سابقہ اہمیت حاصل ہوگئی۔ پچھلے چند سالوں میں اس کی رفتار ترقی اس

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

وجہ سے اور بھی تیز ہوگئی کہ کش کے ڈیلٹا میں کپاس کی کاشت کو ترقی دی گئی اور ایک ریلوے لائن تیار ہوگئی (۱۹۲۴ تا ۱۹۲۷ء) جس کی وجہ سے یہ شہر وادی نیل اور بحیرۂ قلزم کے ساتھ مل گیا۔ آبادی مخلوط ہے اور اٹھائیس ہزار کے قریب۔ اس میں مغربی افریقیوں (ہَوْسَہ اور فلّاتہ) کی خاصی تعداد بھی شامل ہے۔ ان میں سے بیشتر لوگ حاجی ہیں۔

سوڈان کی مذہبی زندگی میں کسلہ کی اہمیت یہ ہے کہ یہ مِرغنیّہ (یا خَتمیّہ) طریقے کا ایک مرکز ہے۔ یہ سلسلہ انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں اس کے بانی سید عثمان المِرغنی نے سوڈان میں قائم کیا۔ یہ بزرگ حجاز کے شہر طائف کے رہنے والے تھے۔ کسلہ کی ایک نواحی بستی الخاتمیہ میں ان کے بیٹے اور جانشین سید محمّد الحسن (م۔ ۱۸۶۹ء) کی مسجد اور مقبرہ ہے، جنھیں سوڈان کی تاریخ اولیا میں اہم مقام حاصل تھا۔

کسلہ سے قدیم زمانے ہی سے مشرقی سوڈان کو غلہ بہم پہنچتا رہا ہے۔ یہاں پہلی بار کپاس کی کاشت مصری حکومت کے قیام کے بعد ہوئی جسے پچھلے چند سالوں میں بڑے وسیع پیمانے پر ترقی دی گئی ہے۔ اس سبب سے اس صوبے کو خاصی معاشی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ زمین کے اصل مالک بجہ بولنے والے حَلَنقہ، ہَدَنْدُوا اور بنی عامر ہیں۔ بنی عامر وہ قبیلہ ہے جس کے افراد زیادہ تر اریٹیریا میں رہتے اور تگری بولتے ہیں۔ کاشتکار جو کہ حکومت کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ نظام کے ماتحت کام کرتے ہیں ان میں مقامی قبائیلیوں کی غالب اکثریت ہے۔ باقی لوگ جن میں زیادہ تر جَعْلِیّن ہیں ساحلی اضلاع سے آ کر آباد ہوئے یا مغربی افریقہ کے باشندے ہیں۔

صوبۂ کسلہ کا شمالی حصہ (سابق صوبۂ بحیرۂ قلزم) مصری سرحد سے لے کر اریٹیریا کی سرحد تک پھیلے ہوئے ساحلی علاقے پر مشتمل ہے جس میں سوڈان اور سواکن کی بندرگاہیں بھی شامل ہیں اور اس کا اندرونی کوہستانی (اتبئی Atbai) حصّہ بھی۔ ہدِنْدُوا (Hadendoa)، اَمَرار اور بِشارین یہاں کے باشندے ہیں۔ انھوں نے اگرچہ قرون وسطیٰ میں اسلام قبول کر لیا تھا اور ان میں سے اکثر عربی النسل ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں، لیکن وہ بدستور اپنی قدیم حامی زبان (To-Bedauye توبیضاوی) بولتے ہیں، اور رسم و رواج میں ان لوگوں سے چنداں مختلف نہیں، جو عرب مصنفوں کے ہاں بجہ قبیلے کے نام سے مذکور ہیں۔

صوبے کا مغربی حصہ جو بُطانہ کے نام سے مشہور ہے باریک زردی مائل چکنی مٹی (Loess) کا بنا ہوا ایک وسیع میدان ہے جو دریائے نیل اور دریائے اتبرہ کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک مثالی بدوی علاقہ ہے جہاں موسم برشگال میں اونٹوں اور بھیڑوں کے لیے بہترین چراگاہیں ہیں، لیکن مستقل آبادیاں صرف چند ایک ہی ہیں اور وہ بھی غیر اہم۔ قبائل بطانہ (شکریۃ، کواہلۃ، بطاحین، لحاوین) عربی بولتے ہیں اور سوڈان کے باقی عربوں کے ہم نسل ہیں۔ ان کی تشکیل میں بلاشبہہ بجہ عناصر کی آمیزش بھی ہے۔ دوسری طرف رشائدہ کہیں انیسویں صدی میں عرب سے ترک وطن کرکے یہاں آئے۔ یہ لوگ ابھی تک اپنے سابقہ وطن کے لباس اور زبان کے پابند ہیں۔ انیسویں صدی میں حکومت کے ابتر نظم و نسق اور مہدویوں کی بغاوت سے جو تباہی پھیلی، اس کی وجہ سے اب یہاں کی آبادی پہلے کی نسبت بہت کم رہ گئی ہے، لیکن اگر آبادی میں اضافہ ہو جائے تو معاشی ترقی کے خاصے مواقع موجود ہیں۔ یہاں کے باشندوں میں مغربی سوڈان سے آئے ہوئے لوگوں کو بڑی

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

اہمیت حاصل ہے۔ مشرق سوڈان کا وہ حصہ جو اب کسلہ کے نام سے مشہور ہے اس کے تعلقات بیرونی دنیا کے ساتھ کہیں انیسویں صدی میں جا کر شروع ہوئے۔ اگرچہ تاکہ اور بطانہ ہمیشہ سے حبشہ اور نوبیا کی برسراقتدار طاقتوں (میروئی، مسیحی نوبیا اور سِنّار کی سلطنت فنج) کے حلقۂ اثر میں رہے ہوں گے، لیکن وادی نیل کے ساتھ تعلقات ڈھیلے ڈھالے اور وقتی سے رہے۔ سواکِنْ ۱۵۱۷ء سے سلطنت عثمانیہ میں شامل رہا اور یہاں ایک ترک پاشا حکومت کرتا تھا، لیکن اندرون ملک باب عالی کی سیادت تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ حبشہ کے ساتھ اس کے تعلقات کے آثار بہت کم ہیں، لیکن ایک روایت کی رو سے (جسے James Bruce نے نقل کیا ہے) سسنیوس (Susneyos) (۱۶۰۵ تا ۱۶۳۲ء) کے عہد میں اہل حبشہ نے ملک بجہ پر تاخت کی اور ایک خاتون سردار کو گرفتار کر لیا جس کا نام فاطمہ ملکۂ شبان بیان کیا جاتا ہے۔

مآخذ: J. W. Crowfoot نے بطانہ کی ابتدائی تاریخ کے متعلق تحقیق کی ہے: (۱) *The Island of Meroe*، *Archaeological Survey of Egypt*، *Egypt Exploration Fund*، ۱۹۱۱ء، ج ۱۹؛ (۲) وہی مصنف: *Old Sites in the Butana*، در *Sudan Notes and Records*، ج ۳ (۱۹۲۰ء)، لوحہ ۲؛ اولین یورپی سیاح J. L. Burckhardt ہے: (۳) *Travels in Nubia*، لنڈن ۱۸۱۹ء؛ (۴) مصری فتوحات اور مصری دور کے حالات کے لیے دیکھیے F. Werne: *Feldzug von Sennar nach Tuka, Basa und Beni Amer*، برلن ۱۸۵۱ء؛ (۵) Sir Samuel Baker: *TheNile tributaries of Abyssinia*، لنڈن ۱۸۶۷ء؛ (۶) H. Dehérain: *Le Soudan Égyptien sous Mehemet Ali*، پیرس ۱۸۹۸ء؛ (۷) قبائلی تاریخ پر Sir H. A. MacMichael نے خامہ فرسائی کی ہے: *History of the Arabs in the Sudan*، کیمبرج ۱۹۲۲ء، بمواضع کثیرہ؛ (۸) S. Hillelson: *Historical poems and traditions of the shukriya in Sudan*، در *Notes and Records*، ج ۳ (۱۹۲۰ء)، لوحہ ۱؛ (۹) G. C. و Brenda Seligman: *Note on the history and Present Condition of the Beni Amer*، کتاب مذکور، ج ۱۳ (۱۹۳۰ء)، لوحہ ۱؛ (۱۰) G. E. R. Sandars: *The Bisharin*، کتاب مذکور، ج ۱۶ (۱۹۳۳ء)، لوحہ ۲؛ (۱۱) توکر اور کسلہ کے عام حالات کے متعلق دیکھیے G. J. Fleming، در *Sud. Notes and Rec.*، ج ۳ (۱۹۲۰ء)؛ لوحہ ۱، ج ۵ (۱۹۲۲ء)، لوحہ ۲؛ (۱۲) موجودہ ترقیات کے لیے دیکھیے *Reports on the administration, finances and condition of the Sudan*، لنڈن، His Majesty's Stationery Office، ۱۹۲۵ء و سالانہ۔

(S. HILLELSON)

* **کِسْوَۃ**: رَکَ بہ کَعْبَۃ و مَحْمَل۔

کُسُوف: (و خسوف) سورج گرہن یا چاند گرہن۔ جہاں تک لغت کا تعلق ہے کہا جا سکتا کہ لفظ "الکسوف" چاند گرہن (کسوف القمر) اور سورج گرہن (کسوف الشمس) دونوں کے لیے یکساں طور پر مستعمل ہے؛ چنانچہ الفرغانی، قسطا بن لوقا، البتّانی، البیرونی اس لفظ کو اپنے ہی استعمال کرتے ہیں، مگر بسااوقات ان میں امتیاز پیدا کرتے ہوئے الخسوف کو چاند گرہن اور الکسوف کو سورج کے لیے مختص کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ القزوینی نے کیا ہے (لغوی اعتبار سے یہ امر قابل ذکر ہے کہ صاحب مفاتیح العلوم، طبع Van Vloten کے نزدیک اس کلمے کا باب انفعال میں استعمال، یعنی "انکسف الشمس" عامی اور غیرفصیح ہے، گو اسے اکثر استعمال بھی کیا جاتا ہے جیسے القزوینی وغیرہ ہم نے)۔

سورج اور چاند کا گہن زمانۂ قدیم ہی سے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

بہت کچھ جاذب توجہ رہا ہے ابرخس (ہپارکوس Hipparchus) کے بعد بطلیموس نے اور بطلیموس کی پیروی میں عربوں اور سریانیوں وغیرہم نے گہن کے نظریے کی تحقیق کی ۔ ہم پہلے چاند گرہن کا ذکر کریں گے ۔ سب سے پہلے کہنے کی بات یہ ہے کہ چاند کا ظاہری راستہ (ہم یہاں مرکز ارض کے نظریے کی پابندی کریں گے) طریق الشمس کو دو متقابل نقطوں پر قطع کرتا ہے، جو وقت گزرنے کے ساتھ طریق الشمس ہی پر حرکت کرتے ہیں ۔ ان نقطوں کو الجوزہر کہا جاتا ہے (فارسی جوزچہر، اخروٹ نما، یا اس سے کم صحیح گوی چہر، گیند نما) ۔ وہ التنّین یا "اژدہا" بھی کہلاتے ہیں (مذکورۂ ذیل)، پھر جو بھی سیارہ ہے اس کے ایسے ہی جوزہر ہوتے ہیں ۔ اس لفظ کے ساتھ کسی دوسرے لفظ کا اضافہ نہ کیا جائے تو اس کا تعلق ہمیشہ چاند سے ہوگا ۔ ان کے محل تقویمات فلکی میں درج ہیں ۔ فلک الجوہر وہ عظیم کرہ ہے جس کے اندر بقول ابن الہیثم چاند داخل اور جو اپنی حرکت کے دوران میں چاند کو بھی ساتھ لے چلتا ہے، فلک الجوزہر کہلاتا ہے ۔

چاند گرہن، جیسا کہ قدیم زمانے ہی میں معلوم کر لیا گیا تھا، اس وقت واقع ہوتا ہے جب سورج اور چاند کے درمیان کوئی سیاہ جسم حائل ہو جاتا ہے ۔ ایک زمانے میں خیال تھا کہ یہ جسم ایک اژدہا ہے جو کرۂ سماوی کے دو متقابل نقطوں پر ختم ہوتا ہے اور جس کی حرکت بھی وہی ہے جو چاند کے عقدوں کی ۔ گہن اس وقت ہوتا ہے جب اژدہے کا سر یا دم ہمارے اور چاند کے درمیان حائل ہو جاتا ہے ۔ اس صورت میں چاند نظر نہیں آتا ۔ یہی خیال ہے جس کی بنا پر ہلال اور زوال پذیر عقدوں، یعنی ان نقطوں کا نام جہاں چاند طریق الشمس سے گزرتا ہے، "سر" (الرأس) اور "دم" (الذنب) رکھا گیا ۔ یہ نام، یعنی اژدہا اگرچہ متروک ہو گیا اس کے باوجود الرأس اور الذنب مدتوں رائج ہے ۔ عقدے کے طول کے لیے علامت Ω دراصل اژدہا ہی کی ایک مسخ شدہ شکل ہے ۔ منجموں نے اس اژدہے سے جو اثرات منسوب کیے ہیں وہ زائچے پر بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں، لیکن سیورس سیبوخت Severus Sebokt (تقریباً ۶۵۰ء) : I. Nau *Notes d' Astronomie Syrienne* (سلسلۂ ۱۰)، ۱۹۱۰ء، ۱۶ : ۱۵ نے بہت عرصہ پہلے اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ ایسا کوئی اژدہا موجود نہیں، لہٰذا اس سلسلے میں جو حسابات کیے جاتے ہیں ان کا تعلق حرکت سے ہے ۔ بابی ہمہ البیرونی کی التفہیم وغیرہ میں ہمیں اس قسم کے بیان ملتے ہیں کہ سر اور دم کی خاصیت مختلف ہے ۔ سر گرم اور مبارک ہوتا ہے اور (مال و متاع) میں اضافے پر دلالت کرتا ہے ۔ دم سرد ہوتی ہے، مصیبت لاتی ہے اور دولت وغیرہ کی کمی کی علامت ہے ۔ چاند اور سورج گرہن تو اصل میں یوں واقع ہوتے ہیں کہ سورج اور چاند یا چاند زمین اور سورج کے درمیان آ جائے ۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جوزہر کے بجائے اکثر لفظ عقد اور عقدۃ استعمال کیا جاتا ہے اور ان میں کبھی رأس اور ذنب کے الفاظ بھی جوڑے جاتے ہیں ۔

سورج چونکہ زمین سے کہیں زیادہ بڑا ہے، اس لیے بشکل اوّل زمین کا اس پر سایہ ایک طرف مخروطی شکل کے مستدق سائے (ظلّ محض ہے) اور دوسری طرف ایک متسع سائے (ظلّ مشئوب) پر مشتمل ہوگا ۔ مکمل تاریکی صرف ظل محضّ کی صورت میں ہوتی ہے ۔ پھر چونکہ اس سائے کا قطر مدار قمر میں اس مقام پر جس سے اس کا گزر ہو رہا ہے چاند کے قطر سے بڑا ہوگا، اس لیے بعض حالات میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ چاند اس سائے میں کچھ دیر ٹھیرا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

رہے اور اس صورت میں چاند پورے طور پر گہنایا رہے گا؛ چنانچہ ابن الہیثم ان حالات کی مکمل تحقیقات کر چکا ہے (Beitr., Xiii, : E. Wiedemann *uber eine Schrift von Ibn al. Haitham, Uber die Beschaffenheitder Schatten*، در *S.B.P.M*، *Erlg.*، ۱۹۰۷ء، ۳۹ : ۲۲۶)۔

اگر زمین، سورج اور چاند بہت چھوٹے چھوٹے اجرام، یعنی ان کی حیثیت محض نقطوں کی ہوتی، تو گرہن صرف اس وقت لگتا جب سورج اور چاند قطعی طور پر عقدوں میں آ جاتے، لیکن یہ چونکہ بڑے بڑے جسم ہیں، اس لیے گرہن اس وقت بھی لگتا ہے جب ان کا گزران عقدوں سے ہو چکا ہو، یعنی ان کے فلکی عرض و طول میں تبدیلی واقع ہو چکی ہو۔ عرض اگر سائے اور چاند کے قطروں کے فرق سے کم ہے تو پورا گہن ہوگا۔ آخرالذکر سے زیادہ، لیکن قطروں کے مجموعے سے کم ہو تو جزوی لگے گا۔ اگر مؤخرالذکر کے برابر تو سایہ صرف مس ہی کرتا ہے، گہن نہیں لگتا۔

صرف سائے کو لیا جائے تو جسے مخروط یا صنوبری کہتے ہیں اور جس کی عمودی تراش کا نام دائرۃ الظل ہے تو ذیل کی صورتیں پیدا ہوں گی: سائے میں داخلے کو بدء الکسوف، کہتے ہیں۔ یہ گویا کسوف کی ابتدا ہے۔ کسف کی ابتدا سے اس کی تکمیل کی منزل کو سقوط (جس کے معنی ہیں گرنا اور جس کا نام بطلمیوس نے ἐμπτωσις رکھا) کہا جاتا ہے۔ سائے میں طے شدہ راستے کا درمیانی حصہ طے ہو جائے تو اسے وسط کہتے ہیں۔ سائے سے پورے طور پر باہر نکل آئے تو اسے تمام الانجلاء۔ المکث (رکنا، ٹھیرنا) سے مراد ہے چاند کے گہن میں رہنے کی حالت۔ جزوی کسف میں البتہ ایسا کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔ کسف کُل القمر بلا مکث یا پورا گہن بلاوقفہ اس وقت ہوتا ہے جب مدار قمر کی یہ صورت ہو کہ تاریک شدہ چاند سائے کے مخروط کو صرف ایک نقطے پر مس کرے۔ اندریں صورت پورا گرہن صرف اسی نقطے پر ہوگا۔ پورے گرہن کی صورت میں اس مقام کو جس سے اس کی ابتدا ہوئی اوّل المکث اور وہ جہاں چاند سائے سے باہر نکلنے لگتا ہے آخر المکث کہلاتا ہے۔

جب چاند نیم سائے سے گزرتا ہو تو چاند کی روشنی میں کمی تو واقع ہو گی، لیکن ایسا نہیں کہ بالکل زائل ہو جائے۔ ابن الہیثم نے سایوں پر اپنی معرکۃ الآرا تصنیف (مذکورۂ بالا) میں اس سوال پر نظری حیثیت سے بحث ہی نہیں کی بلکہ مشاہدے سے اس کی جانچ پڑتال بھی کی ہے؛ تاہم ایسی صورتیں بڑی شاذ ہیں کہ گہنایا ہوا پورا چاند کلیۃً سیاہ نظر نہ آئے اور اس کے بجائے مختلف رنگ دکھائی دیں، بالخصوص گہرا سرخ رنگ جس کا کئی ایک قدیم ہیئت دان مشاہدہ بھی کر چکے ہیں۔ ابن الہیثم بھی اس کا بالتفصیل ذکر کرتا ہے؛ چنانچہ ابن الہیثم کے یہ بیانات جدید مشاہدوں کے عین مطابق ہیں، مثلاً Joh. Muller : *Lehrbuch der kos mischen Ppysik*، بار پنجم، ص ۱۹۶ - البیرونی نے ان رنگوں کی مزید تحقیق کی (القانون المسعودی، مقالہ ۷، باب ۷، فصل ۳) [نسخۂ مطبوعۂ حیدرآباد دکن، مقالہ ۸، باب ۷، فصل ۲] - ابن نے قدیم نظریوں اور خاص کر اور رنگوں کی منجمانہ حیثیت کے بارے میں ہندوؤں کے خیالات کی بالخصوص تنقید کی ہے (دیکھیے Weidemann : *Uber die verschiedenen bei der Mondfinsternis auftretenden Farben nach Eders Jahrbuch für Photographie, etc.*، در *Biruni*، ۱۹۱۳ء) - پورے طور پر گہنائے ہوئے چاند کی اس روشنی کی توجیہ یونہیں کی جاتی ہے کہ سورج

www.besturdubooks.wordpress.com

کی شعاعیں جو کہ زمین کے کرہ ہوا سے گزرتے ہوے منحرف ہو جاتی ہیں، لہٰذا یوں ان کے سائے میں داخلے سے چاند کی سطح منور ہو جاتی ہے۔ پھر کرۂ ہوا میں رطوبت کی مقدار جیسی کم یا زیادہ ہوتی ہے منحرف شعاعیں بھی اسی اعتبار سے کم و بیش رنگوں سے رنگین ہو جاتی ہیں۔ سورج گہن کے امکان کی بھی وہی شرائط ہیں جو چاند گرہن کی۔

سورج گرہن: چاند جس زاویے پر ہمیں نظر آتا ہے وہ چونکہ اس زاویے سے چھوٹا ہوتا ہے جس پر ہم سورج کو دیکھتے ہیں، گو یہ فرق خفیف ہی سا ہے، اس لیے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ چاند سورج کو پورے طور پر ڈھانپ لے۔ یہی وجہ ہے کہ سورج کے اس گہن پر بھی جو عرف عام میں پورا سورج گرہن کہلاتا ہے، روشنی کی ایک تنگ سی کور باقی رہ جاتی ہے، خواہ سورج چاند اور زمین کے مرکز ایک ہی سیدھ میں کیوں نہ ہوں اور اکلیل اور ذوات الادیات ایسی روشنی کی شکلیں (Perotuberanes) خروج کرتی رہتی ہیں۔ البیرونی: القانون المسعودی، مقالہ ۸، باب ۱۰ میں ان کا ذکر کرتا ہے ([دیکھیے نسخۂ مطبوعہ، ۲: ۹۴۶]؛ E. Wiedemann: *Erscheinungen bei der Dammerung und Sonnen finsternis*، در *Arch. f. Gesch. d. Med.*، ج ۱۵، ۱۹۲۳ء، ص ۴۳)۔ چاند یا سورج کے ایک ہی گہن کے نظر آنے کے مقامی اوقات کو ان مقامات کے جغرافیائی طول بلد کے فرق سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ ان اوقات کا یہ حساب مشکل ہے، اس لیے کہ ان اجرام کے اختلاف منظر Parallax ایک نہیں کئی ہیں۔ یہ جو حسابی اور اصلی قیمتوں میں بڑا نمایاں فرق رہ جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی ایک حد تک یہی ہے۔ نظری تفصیلات کا ذکر کہ کسف کب شروع ہوتا ہے، کتنی دیر تک رہتا ہے اور پھر کتنی مدت کے بعد عود کرتا ہے وغیرہ وغیرہ باعث طوالت ہوگا۔ الفرغانی، قسطا بن لوقا، القزوینی الچغمینی، الخرقی کی تصنیفات بالخصوص ابوالفرج کی تصنیف، *Le Uvre de l' ascensien de l' esprit*، طبع ایف ناؤ (F. Nau)، پیرس، ۱۸۹۹ء اور البیرونی کی کتاب التفہیم وغیرہ میں بھی ان کا کم و بیش مفصل اور عام تذکرہ مل سکتا ہے، البتہ ریاضیاتی امور اور ان خاص مشاہدات کا جو اس سلسلے میں ضروری ہیں۔ نظریہ ہیئت پر الخوارزمی یا البتانی کی الزیج یا البیرونی کی القانون المسعودی یا نصیر الدین الطوسی کی الزیج وغیرہ میں (مذکورۂ بالا فضلا کے بارے میں دیکھیے H. Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke*، در *Abhandl. zur Gesch. der math. Wissensch.*، حصۂ ۱۰، ۱۹۰۰ء)۔

اس غرض کے لیے کہ کسف کی پیمائش کا ایک معیار مقرر ہو جائے، سورج یا چاند کے قطر کو جن بارہ مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا، انھیں اصبع (انگلی) یا اصبع الکسوف کہتے ہیں۔ ہم ان کی اس تعداد کو جو گہن میں آ جائے شمار کر سکتے ہیں۔ مغرب میں ان انگلیوں کو digits کہتے تھے۔ بعینہٖ سطح کو بھی خیالی طور پر بارہ مساوی حصوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے اور یوں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان میں کتنے حصے گہن میں آ چکے ہیں۔ آخرالذکر اول الذکر سے جو صرف طول کو تعمیر کرتے ہیں حساب لگایا جا سکتا ہے؛ چنانچہ البتانی کے یہاں اس کی جدولیں بھی موجود ہیں۔ چاند گرہن کی مقدار کو بیار کوس کے مبصار (diopter) سے ناپا جاتا تھا اور یوں کہ ایک سلاخ کے ساتھ دو اور سلاخیں علی القوائم جوڑ دی جائیں۔ ان میں ایک سلاخ تو جس کے اندر ایک چھوٹا سا گول سوراخ ہوتا ہے علی حالہٖ قائم رہتی ہے۔ دوسری

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

جس کا گول سوراخ اس سے بڑا ہوتا ہے، پہلی سلاخ کی طرف سرکائی جا سکتی ہے۔ پھر دوسرے سوراخ کو پہلے سوراخ سے ایک مناسب فاصلے پر اس طرح رکھا جاتا ہے کہ پہلے سوراخ سے دیکھا جائے تو پورا چاند اس میں سے نظر آئے۔ پھر دوسرے سوراخ کے سامنے ایک سیاہ تختی رکھ دی جاتی ہے اور اب سوراخ کی ایک طرف سے اس کے کنارے کو جہاں چاند کے تاریک کنارے کی حد ہے، چاند کے روشن کنارے تک سرکنے کی مقدار کو ناپ لیا جاتا ہے۔ ایسے ہی چاند کی پوری سطح پر تختی کے سرکنے کی مقدار ب کو۔ ان دونوں کی باہمی نسبت کو یوں ظاہر کیا جائے ا : ب، لہٰذا گرہن کی مقدار گ ہے تو اصابع الکسوف کی گ = $\frac{\text{ا}}{\text{ب}}$ ۱۲۔

(E. WIEDEMANN)

* کُسَیْلَہ بن لمزم الاَوْرَبِیْ [ابن کمرم البربری]: تلمسان سے مغرب کی سمت میں آباد بڑے قبیلۂ اَوْرَبَہ کی قیادت میں سَکْرْدِیْد الاَوْرَبِیْ کا جانشین یارفیق کار۔ (البکری، کتاب المسالک، ص ۵۰ کی عبارت جس میں کسیلہ کو موسیٰ بن نصیر کے زمانے میں طُبنہ کا حکمران بتایا گیا ہے، یقیناً غلط فہمی پر مبنی ہے، اس کے سوا کہ کُسَیْلَہ دو مختلف آدمیوں کا نام ہو)۔ عرب فتح کے دوران میں اس نے عقبہ کے جانشین اَبُو الْمُہَاجِر کے خلاف مزاحمت کی قیادت کی۔ ۵۵ھ (۶۷۴-۶۷۵ء) میں "تلمسان کے چشموں" (موجودہ الاَرِیط) کی جنگ میں اس نے اَبُو الْمُہَاجِر سے شکست کھائی اور عیسائیت کو خیر باد کہہ کر مسلمان ہو گیا۔ فاتح کی خوشنودی حاصل کرنے میں اسے کامیابی ہوئی اور وہ اس کا معتمد خاص بن گیا لیکن عقبہ کو اس سے نفرت تھی اور پھر جب عُقْبَہ دوبارہ افریقیہ اور المغرب کا والی مقرر ہوا تو کسیلہ زیر عتاب آیا۔ اَبُو الْمُہَاجِر کی عاقلانہ تنبیہ و نصیحت کے باوجود عقبہ کُسَیْلَہ کی تذلیل کرتا رہا، اس لیے اپنی سوار فوج کی معرکہ آرا مہم کے بعد قیروان واپس جاتے ہوئے جب اس نے یہ غلطی کی کہ اپنی فوج کو تقسیم کر دیا تو کُسَیْلَہ نے، جو فتح کے ایک زندہ مال غنیمت کے طور پر اس کے ہمراہ تھا، موقع پا کر ان یونانیوں اور بربروں سے ساز باز کر لی جو اسلامی لشکر کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے، چنانچہ اسلامی فوج پر تہوذہ کے قریب اچانک حملہ کیا گیا (۶۳ھ/۶۸۲-۶۸۳ء) جس میں تقریباً سب آدمی جن میں عقبہ اور اَبُوالْمُہَاجِر بھی شامل تھے، لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اب کُسَیْلَہ ایک فاتح کی حیثیت سے قیروان میں داخل ہوا جہاں سے اس نے افریقیہ پر پانچ سال تک حکومت کی اور عرب، یونانی اور بربر اس کے زیر فرمان رہے۔ جب خلیفہ عبد الملک کو دفعۃً ان مشکلات سے چھٹکارا حاصل ہو گیا جو مشرق میں خانہ جنگیوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں تو اس نے بَرْقہ میں زہیر بن قیس کے پاس ایک فوج بھیج دی جسے لے کر مؤخر الذکر قیروان کے مغرب میں ممش کے مقام پر کُسَیْلَہ سے نبرد آزما ہوا اور اسے شکست دے کر ہلاک کر دیا اور کھوئے ہوئے علاقے کو دوبارہ حاصل کر لیا (۶۹ھ/۶۸۸ء - ۶۸۹ء)۔

مآخذ: ابن خَلْدُون: کتاب العبر، ۶: ۱۰۸ تا ۱۰۹، ۱۳۶ تا ۱۳۸؛ (۲) وہی مصنف: تاریخ البربر، ۱: ۲۱۱ تا ۲۱۳، ۲۸۶ تا ۲۸۹؛ (۳) وہی مصنف: اخبار دولۃ بنی اغلب بافریقیہ و صقلیۃ، طبع و ترجمۂ Desvergess، متن ص ۲، ۳ تا ۵؛ ترجمہ ص ۱۶، ۲۰ تا ۲۳؛ (۴) ابن عذاری: بیان، ۱: ۱۵ تا ۱۷؛ (۵) البَکْری: کتاب المَسَالک، متن ص ۴۳؛ (۶) ابن تَغْری بردی: النُّجُوْمُ الزَّاہِرَہ، ۱: ۱۷۶ تا ۱۷۸؛ (۷) النُّوَیْری: Histoire des Berberes، ضمیمہ ج ۱، ضمیمہ ۲، ص ۳۳۴ تا ۳۳۶، ۳۳۷؛ (۸) ابن الاثیر:

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

الکامل، مطبوعۂ قاہرہ، ۴ : ۵۴ تا ۵۵؛ (۹) ابن النّاجی : معالمُ الایمان، تونس ۱۳۲۰ھ، ۱ : ۴۷ تا ۵۰، ۵۱ تا ۵۳؛ (۱۰) ابن ابی دینار القیروانی : کتابُ المؤنس، ص ۲۹ تا ۳۰؛ (۱۱) احمد الدرعی : الرحلۃ، مطبوعۂ فاس، ص ۴۴ تا ۴۷، مترجمۂ de Berbrugger : *Voyages dans le sud de l' Algererie*، پیرس ۱۸۴۶ء، ص ۲۲۶ تا ۲۳۱؛ (۱۲) محمود بن سعید مقدیش الصفاقسی : نُزْہَۃُ الاَنْظار، تونس ۱۳۲۱ھ، ۱ : ۷۱، ۷۳، ۷۵؛ (۱۳) الوُرْتِلانی : اُزْہَۃُ الاَلْحَاظ، الجزائر ۱۳۲۶ھ، ص ۹۷ تا ۱۰۰؛ (۱۴) W. Roth : *Oqba Ibn Nafi'*، گوٹنگن ۱۸۵۹ء، ص ۵۹ تا ۶۱؛ (۱۵) Fournel : *Les Berbéres*، ۱ : ۱۶۰ تا ۱۶۲، ۱۷۳ تا ۱۷۷، ۱۸۱، ۱۹۳ تا ۱۹۶؛ (۱۶) Mercier : *Histoire de l' Afrique Septentrionale*، ۱ : ۲۰۳ تا ۲۱۱.

(RENE BASSET)

* کَش [کِشّ] : موجودہ شہر سبز (وجہِ تسمیہ یہ ہے کہ اس کے گرد و نواح کا علاقہ بہت زرخیز ہے) ۔ یہ شہر ملک بخارا میں واقع ہے اور کسی زمانے میں سمرقند سے بلخ جانے والی تجارتی شاہراہ یہاں سے گزرتی تھی۔ چینی ماخذ کی رو سے (چینی = کیاشہ Kia Sha یا کئی شوانگ Kie-Shuangna نیز کئیوشہ Kui Sha بطور شہر کی شیہ Ki-She کی بنیاد سترھویں صدی عیسوی کے ابتدائی ایام میں رکھی گئی تھی۔ دیکھیے (۱) J. Marquart : *Chronologie der alttürkischen Inschriften*، لائپزگ ۱۸۹۸ء، ص ۵۷؛ (۲) ایران شہر وغیرہ، برلن ۱۹۰۱ء، ص ۳۰۴؛ (۳) E. Chavannes : *Documents Sur les Toukiue (Turcs) accidentaux*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۳ء، ص ۱۴۶؛ ابن مکولا (م ۴۷۳ھ/۱۰۸۰ء) کے حوالے سے یاقوت کا یہ بیان (معجم، طبع Wüstenfeld، ۴ : ۲۷۴) کہ ماوراء النہر میں اس لفظ کا تلفظ ہر جگہ کِسّ کیا جاتا ہے، بہت مشکوک ہے۔ زمانۂ مابعد میں "کِش دلکش" کی ترکیب اکثر دیکھنے میں آتی ہے جب سے اس کے تلفظ کش کا ثبوت ملتا ہے۔ عربوں کی فتح کا حال Marquart نے خاص طور پر بیان کیا ہے (ایران شہر، بمدد اشاریہ) سامانی عہد کے کش کے حالات عرب جغرافیہ نویسوں (*Bibl. Geogr. Arab.*، طبع de Goeje) (۱) الاصطخری، ص ۳۲۴؛ (۲) ابن حوقل، ص ۳۷۵ ببعد؛ (۳) المقدسی، ص ۲۸۲) نے التہائی تفصیل سے قلمبند کیے ہیں۔ ان دنوں یہ شہر طول و عرض میں ایک تہائی فرسخ (تقریباً ایک میل) تھا۔ قدیم شہر (مدینہ؛ فلوسی : شہرستان)، نیز قلعہ (قہندز) اس وقت بھی غیر آباد ہو چکے تھے صرف بیرون شہر (ربض) میں آبادی تھی۔ قدیم کش کے مضافات میں ایک نیا شہر ابھر رہا تھا۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ موجودہ شہر کا محل و قوع اس کش سے مختلف ہے جو مسلمانوں کی فتح سے قبل موجود تھا۔ محل و قوع کی دوسری تبدیلیوں کے بارے میں اور کسی قسم کی معلومات نہیں ملتیں۔ مغول کی فتوحات کی تاریخ میں کش کا کہیں ذکر نہیں آتا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کش نے مقابلہ کیے بغیر مغول کی اطاعت قبول کرلی ہوگی (۶۱۷ھ/ ۱۲۲۰ء) شہر سبز کا نام پہلی بار سکوں پر بھی آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط میں دیکھنے میں آیا۔ تیمور نے، جو کش کے علاقے کا رہنے والا تھا، اور اس کے معاصرین نے کش میں کئی عمارتیں بنوائیں؛ اس کے لیے دیکھیے W. Barthold، در *Zapiski Wost. otd. arkh. Obshc.*، xxiii ببعد۔ ان میں اق سرای کا محل خاص طور پر مشہور ہے جو خوارزم سے بلوائے ہوئے معماروں نے اواخر ۷۷۲ھ/اوائل ۱۳۸۰ء میں تعمیر کیا تھا دیکھیے شرف الدّین یزدی : ظفر نامہ، کلکتہ ۱۸۸۷-۱۸۸۸ء، ۱ : ۳۰۱ ببعد

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

اور حواشی از نظام الدّین شامی و عبدالرزاق سمرقندی، در W. Barthold : *Ulugbeg i ego Wremya*، پیٹرو گراڈ ۱۹۱۸ء، ص ۲۳ - اب اس محل کے بہت کم آثار باقی رہ گئے ہیں۔ کتبات کے بارے میں دیکھیے N. Stinyakowskiy ، در *Protokoli Turk. Kružka Lyub. Arkh.*، ۵ : ۱۱۴ ببعد .

آخری زمانے، یعنی دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی میں حافظ تالیش نے شہر سبز کا حال بیان کرتے ہوے لکھا ہے (عبداللہ نامہ، مخطوطۂ ایشیاٹک میوزیم، ۵۷۴ ورق، ۸۷ب [نیز دیکھیے مخطوطہ کتاب خانۂ دانش گاہ پنجاب، لاہور] کہ یہ ایک اہم شہر ہے جس کا حاکم عموماً شاہی خاندان کا ایک شہزادہ ہوتا تھا حالانکہ نسف یا قرشی [رک بآں] کا نظم و نسق ایک فوجی افسر (داروغہ) کے حوالے کردیا جاتا تھا۔ آج کل حالت اس سے برعکس ہو چکی ہے اور بارھویں صدی ہجری/ اٹھارھویں صدی عیسوی کے سیاسی انقلابات کی وجہ سے قرشی کے مقابلے میں شہر سبز ایک غیر اہم سا قصبہ ہے ۔ شہر سبز کا ضلع شمال جنوب اور مشرق میں پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے، اس لیے اس علاقے کو ریلوے نظام کے ساتھ جلد مربوط ہو جانے کی امید بہت کم ہے اور قرشی پہلے ہی سے ریل کے ذریعے بخارا اور ترمذ سے ملایا جا چکا ہے ۔ اس امر کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ شہر سبز پھر پہلے کی طرح خوشحال ہو جائے گا .

مآخذ : (۱) G. le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۴۶۹ ببعد؛ (۲) W. Barthold : *Turkestan W Epokhu mongolskago nashestwiya*، ۲ : ۱۳۴ مع تصحیحات، ص ۵۲۴، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۰ء؛ (۳) وہی مصنف : *Kistorii orosheniya Turkestana*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۱۴ء، ص ۱۲۵ ببعد .

(W. BARTHOLD)

کَشْف : لغوی معنی کھولنا، ظاہر کرنا، ⊗ حجاب دور کرنا، انکشاف، کھلنا، ظاہر ہونا، حجاب دور ہو جانا؛ اصطلاح : (۱) علم عروض کی اور (۲) تصوف کی ۔ پہلے علم عروض میں اس کا جو مفہوم ہے وہ بیان کیا جاتا ہے :

[کَشْف با شین منقوطہ یا کسف با سین مہملہ] (ع) [الزمخشری : قسطاس؛ فیروز آبادی : قاموس؛ سکاکی : مفتاح، کا قول ہے کہ اصلاً "کسف" (باسین مہملہ : کاٹنا) ہے؛ "کشف" (باشین منقوطہ) [تصحیف ہے] ۔ علم عروض کی اصطلاح میں ایک زحاف کا نام ۔ مراد رکن کے ساتویں متحرک حرف یا وتد مفروق کے حرف متحرک دوم کا حذف، یعنی "مفعولات" کی 'تاء' ساقط کرکے بقیہ "مَفْعُولاْ" کو "مَفْعُوْلُنْ" سے بدل لینا ۔ رکن مزاحف کو مکشوف [یا مکسوف] کہتے ہیں .

صاحب مفتاح کے نزدیک کشف [یا کسف] "وقف" [= سکون تاے مَفْعُوْلَات بضم تاء] اور "کف" [= حذف تاے ساکنِ مَفْعُوْلَاتُ] کے اجتماع کا نام ہے، یعنی پہلے وقف کے عمل سے مَفْعُوْلَاتُ کی تاء کو ساکن کیا، پھر کف کے عمل سے مَفْعُوْلَات کی تاے ساکن کو حذف کیا، "مَفْعُوْلَا" رہا، اسے مَفْعُوْلُنْ سے بدل لیا .

پہلی صورت میں کشف [یا کسف] زحافاتِ مفردہ میں شمار ہوگا، دوسری صورت میں زحافات مزدوجہ میں] .

مآخذ : عربی، فارسی اور اردو میں علم عروض کی تقریباً سب کتابیں، نیز الجرجانی : تعریفات، بذیل مادّہ .

[ہادی علی بیگ]

(۲) تصوف میں یہ وسیع ترین اصطلاح ہے جو صوفی کے سامنے سے حجابات بمراتب اٹھ جانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے ۔ اس کا سوچ سمجھ کر تجزیہ کیا جائے تو اس میں تین درجے نکلتے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

ہیں : (ا) مُحاضرۃ، جس میں عقل سے بذریعۂ برہان کام لیا جاتا ہے؛ (ب) مکاشفہ، جس میں علم سے بذریعۂ بیان و تشریح کام لیا جاتا ہے؛ (ج) مشاہدہ، جو براہ راست ذاتی تجربہ (معرفت) کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ (ا) کے ذریعے ارباب العقول علم الیقین تک پہنچتے ہیں۔ یہ منزل حدود فکر و نظر ہی سے تعلق رکھتی ہے اور اسے در حقیقت کشف نہیں کہا جا سکتا؛ (ب) کے ذریعے اصحاب العلوم کی رسائی عین الیقین کے درجے تک ہوتی ہے اور (ج) کے ذریعے اصحاب المعرفۃ حق الیقین تک پہنچ جاتے ہیں۔ حق الیقین مطلوب حقیقی کا بلا واسطہ دیدار ہے اور اسے بعض اوقات معاینہ بھی کہتے ہیں (القشیری : الرسالۃ، طبع (مع شرح) از زکریا الانصاری و العروسی، بولاق ۱۹۲۰ء، ۲ : ۷۹ ببعد ۔ الھجویری : کشف المحجوب، مترجمۂ نکلسن، ص ۳۷۳، بمدد اشاریہ .

مآخذ : متن میں مذکور ہیں ۔ ان میں التھانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، ۲ : ۱۲۵۳ کا اضافہ کر لیا جائے .

[D. B. MACDONALD]

⊗ تعلیقہ : تصوف میں کشف یا مکاشفہ کے معنی ہیں رفع حجاب ۔ یہ ایک روحانی کیفیت ہے جس کا ادراک حواس ظاہر سے نہیں کیا جا سکتا (التھانوی : کشاف، بذیل مادّہ) اسے مشاہدہ بھی کہا جاتا ہے .

کشف کی چند اقسام یا مراتب ہیں : (۱) کشف نظری : جب سالک اپنے جذبۂ ارادت سے طبیعت سفلی سے حقیقت علیّین میں قدم رکھتا ہے اور اپنے باطن کو ریاضت کے ذریعے صاف کر لیتا ہے تو اس کی چشم باطن کھل جاتی ہے اور اس رفع حجاب کے مطابق، اس پر حقائق کے دروازے وا ہو جاتے ہیں ۔ کشف نظری ہے؛ (۲) جب اس سے آگے بڑھ جاتا ہے اور نور دل اسے حاصل ہو جاتا ہے تو اسے کشف نوری کہا جاتا ہے؛ (۳) اس سے ترقی کر کے، کشف سِرّی کی منزل آتی ہے، اسے کشف الٰہی بھی کہتے ہیں ۔ یہاں آفرینش کے اسرار اور حکمت وجود کا پتا چلتا ہے؛ (۴) اس کے بعد آگے بڑھ کر بہشت و دوزخ اور دیگر عوالم کی حقیقت کھل جاتی ہے اسے مکاشفۂ روحانی کہا جاتا ہے؛ (۵) اس کے بعد مکاشفۂ خفی ۔ اس منزل میں عالم صفات خدا وندی میں سالک کو راستہ ملتا ہے ۔ اسے مکاشفۂ صفاتی کہا جاتا ہے اور (۶) اخری منزل مکاشفۂ ذاتی کی جو بہت مشکل ہے (التھانوی : کشاف، بحوالۂ مجمع السلوک) .

کشف اللغات کے مطابق "مکاشفہ آنرا گویند کہ آشکارا شود ناسوت و ملکوت و جبروت و لاھوت، یعنی از نفس و دل و روح و سرّ واقف حال شود" (دیکھیے ایضاً) .

مکاشفہ (کشف) کو مداناۃ، المحاضرہ اور المشاھدہ بھی کہتے ہیں ۔ سب کے معنی ایک ہی ہیں، لیکن کشف کی اصطلاح عام و مکمل ہے (ابو نصر سرّاج : کتاب اللمع، قاہرہ ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۰ء، ص ۴۱۲) ۔ کشف کی جدید ترین تعبیرات کے لیے دیکھیے محمّد اقبال : *Reconstruction of Religious Thought in Islam*، باب اوّل و ببعد ۔ [سیّد عبداللہ نے لکھا] .

[ادارہ]

کشکُول : (فارسی)، دھات، لکڑی یا ناریل کا * بیضوی پیالہ (calabash = کچکول، تونبی) جسے ایک زنجیر سے باندھ کر شانے پر لٹکا لیا جاتا ہے اور جس میں خیرات یا کھانے کے لیے جو کچھ ملتا ہے، ڈال لیا جاتا ہے ۔ اس لفظ کے اشتقاق کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ عام طور پر ایرانی اس کی یوں

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

توجیہ کریں گے : کش = کشیدن بمعنی کھینچنا سے (صیغۂ امر) اور کول بمعنی "شانہ"، یعنی وہ شے جسے انسان کندھے پر ڈال کر اٹھاتا ہے"، لیکن اس کی ایک اور صورت خچکول بھی ہے جس کی تصدیق شعرائے متقدمین (انوری، سیف اسفرنگی) سے بھی ہوتی ہے، لہٰذا اولین تشریح کو قبول کرنا مشکل ہے ۔ لغات میں اس کے اصل معنی "گداگر" اور ثانوی مفہوم "گداگر کا پیالہ" لکھے گئے ہیں ۔ ہم نہیں کہ سکتے کہ یہ معنی درست ہیں یا غلط ۔

ادب میں کشکول کے معنی بیاض کے ہیں، یعنی مختلف ادبی پاروں کا مجموعہ جو مختلف مآخذ سے جمع کیے جائیں؛ چنانچہ اس لفظ کا اطلاق بالخصوص بہاء الدّین العاملی کی کتاب الکشکول پر ہوتا ہے ۔

مآخذ : (۱) فرہنگ رشیدی، بذیل مادّۂ خچکول؛ (۲) برہان قاطع، بذیل مادّۂ کشکول؛ (۳) Rev. R. du Mans : *Estat de la Perse 1660*، طبع Schefer، ص ۲۱۷؛ (۴) Ricaut : *Present State of the Ottoman Empire*، ۲، تصویر، باب ۱۷ ....؛ (۵) Lane : *Manners and Customs of Modern Egyptians*، باراول، ۱ : ۳۳۷؛ (۶) A. von Kremer : *Topographie von Damascus*، ۲ : ۴؛ (۷) E. G. Browne : *A Year amongst the Persians*، ص ۵۲ ۔

(CL. HUART)

* کشم : (۱) خلیج فارس میں بندر عباس کے بالمقابل ایک لمبوترا سا جزیرہ، جو بسبب اپنی شکل و صورت کے طویلہ کے نام سے بھی مشہور ہے ۔ یہ ساحل لارستان سے پرے اس مقام پر واقع ہے جہاں سے آبنائے ہرمز شروع ہوتی ہے ۔ اس کا طول ۷۷ میل کے قریب ہے ۔ اسے ایک اور آبنائے، جسے آبنائے کلیرنس (Clarence) کہتے ہیں، براعظم سے جدا کرتی ہے ۔ اس آبنائے کا عرض مختلف مقامات پر ایک سے سات میل تک ہے ۔ یہ جزیرہ پتھریلی اور کھڑیا مٹی کی پہاڑیوں سے بنا ہے؛ چنانچہ مغرب میں کھڑیا مٹی کی چٹانوں سے ایک بلندی سی قائم ہو گئی ہے اور کوہ کشم کے نام سے مشہور ہے ۔ کشم میں نباتات کی کمی ہے، البتہ گندھک اور نمک کی کانیں موجود ہیں ۔ آبادی عربی النسل ہے اور [اس صدی کے اوائل میں] ۱۵ ہزار باشندوں پر مشتمل تھی ۔ ۱۸۸۴ء میں کشم ایک زلزلے سے تباہ ہو گیا تھا ۔ لوگوں کا پیشہ زیادہ تر مونگا اور موتی نکالنا ہے ۔ الادریسی (در ابو الفدا : تقویم البلدان، طبع رینو (Reinaud)، ص ۳۷۳) نے کشم کے قریب سمندر کے ایک بہت بڑے بھنور کا ذکر کیا ہے ۔ کشم دراصل اس جزیرے کے صدر مقام کا نام ہے ۔ یہ ۵۰۰۰ آبادی کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، جو اس کے مشرقی کنارے پر واقع ہے ۔ یہاں ایک قدیم پرتگالی بندرگاہ بھی اب تک موجود ہے ۔ ازمنۂ وسطیٰ میں یہ جزیرہ یکے بعد دیگرے حسب ذیل مختلف ناموں سے مشہور رہا : جزیرۂ بنو کاوان (الاصطخری، ص ۱۰۷)؛ برکاوان (ابن حوقل، ص ۱۸۳)؛ ابن کَوان، ابرکانان، ابرکاوان (البلاذری، ص ۳۸۶)؛ لافت (الاصطخری، ص ۳۲، س ۱۸؛ یاقوت، ۴ : ۳۴۱)، اس مقام کے نام پر، جو آج بھی شمالی جانب واقع ہے ۔ انگریزوں نے باسیدو کے مقام میں باسیڈور (Bassadore) نام کارخانہ قائم کیا تھا، لیکن اسے انھوں نے بہت جلد چھوڑ دیا ۔ دوسرے قابل ذکر مقامات گُرَن اور سوکُسہ ہیں ۔

(۲) پچھلے زمانے میں اسی نام کا ایک شہر دریائے جیحوں کے بالائی طاس میں واقع تھا، جو ایک قلیل مدت کے لیے طُخارِستان کے والی یَبْغُو قبضے میں رہا (الطبری : تاریخ، ۲ : ۱۵۹۰ س ۱۰)۔ ہیون سانگ نے اس کا ذکر کِت لِت سِت مو کے نام

www.besturdubooks.wordpress.com

سے کیا ہے، جو ایک فرضی سنسکرت نام کُرْشُم کا مترادف ہے، یہ کشم ہوہ (Hwoh) کے مشرق میں چار روز کی مسافت پر واقع تھا۔ یول (Yule) کا خیال ہے کہ یہ نواح فندز کا وہی مقام ہے جسے وَرْوالیز کہتے ہیں (Marquart : *Ērānšahr*، ص ۷۰ و ۲۳۱)۔

مآخذ : (۱) ابن حوقل، در *BGA*، ۲ : ۳۸؛ (۲) حمدالله المستوفی : نزهة القلوب، طبع براؤن، ص ۱۳۷، ۱۸۶، ۲۳۴؛ (۳) Pietro della valle : *Voyages*، فرانسیسی ترجمہ (۱۶۴۵ء)، ۵ : ۳۸۴ و ۶ : ۲۳۰ ببعد (کشم)؛ (۴) L. Pelly : *Visit to Lingah*، در *JRGS*، ۱۸۶۵ء، ۳۴ : ۲۵۱ (مع نقشہ)؛ (۵) Dubeux : *Perse*، ص ۵۵؛ (۶) De Bruyn : *Voyages*، ص ۲۲۲؛

(Cl. Huart)

* **کَشْمِیر** : (۱) کشمیر کا نام (عربی تصانیف میں قشمیر بھی) زمانۂ قدیم کی اس وادی کے نام کے طور پر مستعمل رہا ہے جو شمال مغربی ہمالیہ میں ۳۳ درجے ۳۰ دقیقے اور ۳۴ درجے ۴۰ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۴ درجے اور ۷۵ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد مشرق کے مابین واقع ہے۔ اس وادی کی لمبائی شمال مغرب سے جنوب مشرق کی جانب تقریباً ۸۴ میل ہے اور چوڑائی شمال مشرق سے جنوب مغرب کی سمت ۲۰ سے ۲۵ میل تک؛ رقبہ کم و بیش ۸۵۳۹ مربع میل ہے۔ اسے جموں، راجوڑی اور پونچھ کی بیرونی پہاڑیوں سے پیر پنجال کا بلند سلسلۂ کوہ جدا کرتا ہے، جس کی کئی چوٹیاں ۱۵۰۰ فٹ سے زائد بلند ہیں۔ شمال مغرب کی جانب جو پہاڑی سلسلے وادی سے قریب ترین ہیں وہ اس سے بھی زیادہ بلند ہیں؛ ان کی بڑی بڑی چوٹیاں گوش براری (۱۷۸۰۰ فٹ)، امر ناتھ (۱۷۳۲۱ فٹ) اور ہرمکھ (۱۶۹۰۳ فٹ) ہیں۔ ان سے پرے ایک وسیع پہاڑی علاقہ ہے، جسے چند دشوار گزار درے اس وادی کو لداخ، بالائی وادی سندھ، اور وسطی ایشیا سے ملاتے ہیں۔ لداخ سے مواصلات کا بڑا ذریعہ درّہ زاجی (۱۱۳۰۰ فٹ) ہے اور استور اور سکردو سے درّہ برزیل (۱۳۵۰۰ فٹ)۔ پنجاب (پاکستان) کے میدانوں سے ملانے والا سب سے براہ راست راستہ وہ ہے جو درّہ بھمبر سے ہوتا ہوا پیر پنجال (۱۱۴۰۰ فٹ) پر سے گزرتا ہے، لیکن سب سے آسان اور سال بھر کھلا رہنے والا راستہ بارہ مولا [ورَاھا مُولا کا جدید نام] کا ہے جہاں سے دریائے جہلم یا بیہت وادی سے نکل کر میدان میں داخل ہوتا ہے۔ کشمیر تک پہنچنے کا آسان ترین راستہ وہ عمدہ سڑک تھی جو [تقسیم ملک سے پہلے] راولپنڈی سے مری ہوتی ہوئی دریائے جہلم کی وادی کے ساتھ ساتھ چلی جاتی تھی۔ دوسرا راستہ ایبٹ آباد کا ہے، جو اس سڑک سے مظفرآباد (یعنی کشن گنگا [= نیلم] اور جہلم کے مقام اتصال) پر مل جاتا ہے اور اس پر قدرتی سہولتیں زیادہ ملتی ہیں؛ شروع زمانے میں یہی راستہ سب سے زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ برصغیر کے شمال مغربی کونے میں واقع اس الگ تھلگ وادی کی جغرافیائی اور طبقات الارضی کیفیت Drew، Lydekker اور Oestreich نے مفصل بیان کر دی ہے اور تاریخی جغرافیے کی وضاحت Cunningham اور Stein نے کی ہے۔

یہ وادی سطح سمندر سے پانچ سے چھے ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کی سطح کم و بیش ہموار اور زمین بہت زرخیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے قدیم زمانے ہی سے خوشحالی حاصل رہی ہے۔ یہ وادی اپنی دور افتادگی اور دشوار گزار راستوں کے باعث شمالی ہند پر ہونے والے متعدد حملوں سے محفوظ رہی۔ کشمیر کے باشندے جسمانی طور پر اچھے ہوتے ہیں، [تاہم بعض

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

سیاحوں اور مصنفوں نے ان کی مذمت کی ہے؛ لیکن یہ سیاح اور مصنف اس امر کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ یہ لوگ مسلسل جبر و تشدد کا شکار رہے ہیں ۔ اس کے باوجود اس قوم نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اتنی صدیوں تک برابر جد و جہد کی ہے، جو اب بھی جاری ہے ۔ اس سے الٹا اس قوم کی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کا پتا چلتا ہے ۔ کشمیر کے توانا اور مضبوط پٹھوں والے پہلوان اکھاڑوں میں ہمیشہ اپنے مدّ مقابل کے لیے خطرے کا موجب رہے ہیں ۔ حسن جسمانی کے لحاظ سے بھی کشمیری مشہور ہیں ۔ تعلیم یافتہ کشمیری اپنی ذہانت، تہذیب و شائستگی اور دیگر صفات کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں ۔ ان میں ممتاز قانون دان، ماہرین سیاست، مدبّر اور اعلیٰ درجے کے مفکّر اور شاعر پیدا ہوتے رہے ہیں اور پھر کشمیری دستکاروں کی شال بافی اور اخروٹ کی لکڑی کا کام اپنی خوبصورتی، نزاکت اور پائداری کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے] ۔

اگرچہ بہت زیادہ قدیم زمانے سے متعلق ہماری تاریخی معلومات کچھ زیادہ نہیں، تاہم گزشتہ دو ہزار سال کی تاریخ کشمیر کے بارے میں غیر معمولی طور پر اچھے ذرائع معلومات موجود ہیں ۔ ان میں سب سے بڑا ذریعہ کلہن Kalhana کی راج ترنگنی ہے ۔ یہ منظوم وقائع نامہ بارھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے اور Stein کی طبع و ترجمہ و حواشی کی بدولت ہمارا سب سے بڑا مأخذ ہے ۔ دیگر مآخذ میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں: چینی سیاح ہوانگ چوانگ (= ہیون سانگ)، جو ساتویں صدی عیسوی [۶۳۱ تا ۶۳۳ء] میں کشمیر آیا تھا؛ البیرونی [رک بآں] کی گیارھویں صدی عیسوی کی تصنیف تحقیق ماللہند؛ ابو الفضل کی آئین اکبری؛ شہنشاہ جہانگیر کی توزک؛ زمانۂ حال کے کئی ایک سیاحوں کے بیانات، مثلاً فرانسیسی طبیب برنیر Bernier کا سفر نامہ، جو شہنشاہ اورنگ زیب [رک بہ محی الدّین عالمگیر] کے ہمراہ وادی کشمیر میں آیا تھا، اہم معلومات پر مشتمل ہے ۔ ان کے علاوہ سکّوں کا ایک بہت مکمل سلسلہ موجود ہے، جن سے کشمیر کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے، یعنی چھٹی صدی عیسوی سے لے کر موجودہ زمانے کی تاریخ کشمیر پر، جس میں سفید ہنوں Ephthalites، ہندو راجاؤں، مسلمان سلاطین، مغل شہنشاہوں، دُرّانی افغانوں اور سکھوں کے ادوار کے علاوہ برطانوی عہد میں جموں کے ہندو ڈوگرا حکمرانوں کا دور اقتدار بھی شامل ہے ۔

کشمیر کی تاریخ کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہ وادی بڑے بڑے تاریخی فاتحوں سے محفوظ رہی ۔ اسکندر نے اسے چھوا تک نہیں، محمود غزنوی نے حملہ تو کیا، لیکن اسے پسپا کر دیا گیا ۔ چنگیز خاں [رک بآں] اور تیمور اس کے پاس سے گزر گئے اور بابر [رک بآں] نے بھی یہی کیا، لیکن جب اکبر نے تمام شمالی ہندوستان میں اپنی طاقت کو مستحکم کر لیا تو کشمیر آسانی سے اس کے قبضے میں آ گیا ۔ مغلوں کے بعد نادرشاہ نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا، یعنی اس وقت بھی جب مغلیہ اقتدار اس کے حملوں کی وجہ سے درہم برہم ہو گیا تھا ۔ بہرحال یہ غیر منظم ملک احمد شاہ درانی کے حملوں کے سامنے فوراً سرنگوں ہو گیا، لیکن آگے چل کر درانیوں میں پھوٹ پڑ گئی اور سکھوں نے آسانی سے یہاں قبضہ جما لیا ۔

بطلمیوس سے قبل قدیم مآخذ میں کشمیر کے متعلق معلومات نہیں ملتیں کیونکہ سکندر اعظم کے یونانی مؤرخین نے اس کا ذکر تک نہیں کیا ۔ بطلمیوس (دوسری صدی عیسوی کے وسط میں) اسے ایک بہت زبردست ریاست بتاتا ہے، جو وادی کی

www.besturdubooks.wordpress.com

حدود سے بہت آگے تک پھیلی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں یہ کُشان خاندان کی عظیم سلطنت کا ایک حصہ ہوگا جو پورے شمالی ہندوستان پر قائم تھی۔ بطلیموس اسے کسپیریا Kaspeiria کہتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ یہ بِدَسپس Bidaspes، سَنْدابَل Sandabal اور اَدْرِس Adris، یعنی وتستا (=ویہت، بیہت یا جہلم)، چندر بھاگ (=چناب) اور ایراوتی (=راوی) کے منبعوں کے نیچے واقع ہے اور یہ بیان صحیح ہے۔

اگرچہ اس زمانے سے پہلے کی کوئی معاصر معلومات موجود نہیں، تاہم یہ باور کرنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ تقریباً ۲۵۰ ق-م میں کشمیر اشوک کے مقبوضات میں شامل تھا۔ جب چندر گپت نے سلیوکس کو شکست دی تو موریا خاندان کی حدود حکومت شمال کی جانب پھیل گئیں۔ بدھ مت کی اشاعت اس علاقے میں دور دور تک ہو چکی تھی، چنانچہ جب اشوک نے یہ مذہب قبول کر لیا تو اسے کشمیر میں اپنے اثر و رسوخ کو وسعت دینے میں آسانی ہو گئی۔ اس کے فرامین کا کوئی کتبہ کشمیر میں نہیں ملا، لیکن مانسہرہ کا کتبہ اس راستے کے قریب ہی واقع ہے جو پکھلی کے میدان میں سے ہوتا ہوا بارہ مولا کو جاتا ہے؛ یہ میدان اُرسا (ہزارہ) میں شامل تھا۔ اور ہیون سانگ کا بیان ہے کہ اشوک نے وادی میں چار ستوپے تعمیر کرائے تھے۔

اس کی تصدیق راج ترنگنی (۱ : ۱۰۴) سے بھی ہوتی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ روایت کلہن پنڈت کے زمانے میں بھی موجود تھی۔ اس میں اشوک کو ایک ایسا بادشاہ بتایا گیا ہے جس نے متعدد ستوپے تعمیر کیے تھے اور شہر سری نگری کی بنا ڈالی تھی۔ اس شہر کے حقیقی محلِّ وقوع کی نشاندہی پاندریتھن (یعنی پرانا دھستھانہ = قدیم دارالسلطنت) کے مندر سے ہوتی ہے، جو سری نگر سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ علاوہ بریں اسی تاریخ میں ایک حقیقی روایت مندرج ہے جو کنشکا، جشکا اور ہشکا نامی بادشاہوں تک پہنچتی ہے؛ یہ کُشان بادشاہوں کَنِشک، واسِشک اور ہُوشک سے قریبی مطابقت رکھتے ہیں، جن کا ذکر سکّوں اور کتبوں میں آتا ہے۔ ہمیں چینی اور دیگر بدھ ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ کنشک نے کشمیر میں بدھ مت کی دوسری بڑی مجلس مشاورت منعقد کی تھی اور اگر بدھ روایت صحیح ہے تو عین اغلب ہے کہ یہ اجتماع بدھ کی وفات کے ۴۰۰ سال بعد، یعنی پہلی صدی ق-م کے نصف آخر میں عمل میں آیا ہوگا۔ اگر وہ نظریہ صحیح بھی ثابت ہو جائے جس کی رو سے کنشک کا زمانہ اور ساکا عہد ایک ہی بتایا جاتا ہے تو بھی اس مجلس مشاورت کی تاریخ پہلی صدی سے بعد کی نہیں ہو سکتی۔ عظیم کُشان سلطنت کے زوال کے بعد یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر اس کُشان خاندان کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے ماتحت رہا ہوگا، جنھیں چھٹی صدی عیسوی کے شروع میں سفید ہنوں نے ختم کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس سارے ابتدائی عہد میں کشمیر یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور نام برابر مستعمل رہا۔ Stein نے ثابت کیا ہے کہ بطلیموس کا کَسْپیریا (Kaspeiria) ایک پراکرت لفظ کَسْویرا (Kasvira) کے مطابق ہے، جو اس کے جدید کشمیری نام کَشِیر (Kashir) میں محفوظ ہے، جب کہ اس کی قدیم تر سنسکرت شکل کَسْمِیر (Kasmira) تقریباً بغیر کسی رد و بدل کے اس ملک کے نام کے طور پر برصغیر اور ایران میں باقی رہ گئی ہے۔ کشمیر کے نام کا ایک فرضی کسیاپا پورہ (Kasyapa-pura) سے اشتقاق، جو ولسن اور لیسن نے تجویز کیا ہے، اب عام طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ نیز ہیروڈوٹوس

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کے Kaspatyros سے مراد یقیناً کشمیر نہیں ہے بلکہ دریائے سندھ کے کنارے کا کوئی مقام ہے۔ وہ اسے Paktyikē کے صوبے میں بتاتا ہے، جو ضرور وہی ہوگا جو بعد ازاں پکھلی کہلانے لگا، یعنی وہ پہاڑی علاقہ جو دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان واقع ہے اور جس کے نام پر مغل شہنشاہ اکبر کے عہد میں ایک سرکار موسوم تھی۔ Hekataios بھی گندھارا کے ایک شہر Kaspapyros نامی کا ذکر کرتا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں چینی زائرین نے کشمیر کا نام کِپوئی Kipūi رکھ لیا تھا، لیکن ہیون سانگ ایک اور شکل کاسی میلو Ka-si-mi-lo بھی استعمال کرتا ہے۔

کشمیر پر سفید ہنوں (Ephthalites) کا قبضہ بظاہر ہندوستان پر براہ راست حملے کا ایک حصہ نہ تھا، جو مغرب کی طرف سے ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بادشاہ مہرگل Mihiragula ۵۳۰ء میں ساکلہ (سیالکوٹ) میں رہتا تھا۔ چینی زائر سونگ یون کے سامنے اسی زمانے میں اس نے کشمیر پر چڑھائی کی تھی۔ مہرگل کو اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی، یہ واضح نہیں، لیکن ۵۲۸ء میں وسطی ہندوستان میں اپنی شکست کے بعد وہ بظاہر کشمیر چلا گیا اور رفتہ رفتہ اس ملک پر قابض بھی ہو گیا۔ یہیں سے اس نے اپنے بھائی پر حملہ کیا، جس نے گندھارا میں اس کے تخت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسے شکست دینے والا یشو دھرمن کشمیر میں بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا اور وہاں اس نے سکے ضرب کیے؛ لیکن مہرگل بظاہر بدستور کشمیر پر قابض رہا کیونکہ کشمیری طرز کے سکّے اس کے جانشینوں کھنگل اور تورمان کے نام کے بھی ملتے ہیں۔ ہیون سانگ نے، جو آئندہ صدی کے آغاز میں کشمیر آیا تھا، لکھا ہے کہ مہرگل ایک ظالم بادشاہ تھا اور بدھوں پر بہت سختی کرتا تھا۔ اس وقت کے بادشاہ نے اس سیاح کا اچھی طرح استقبال تو کیا، لیکن اس نے اس کا نام نہیں بتایا؛ تاہم ممکن ہے کہ وہ دُرلبھ ہو، جس نے کارکوٹہ خاندان کی بنا رکھی تھی۔ اس نے وہاں ایک سو بدھ خانقاہیں دیکھیں، جو اس وقت تک موجود تھیں۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد قنوج [رک بآں] کے بادشاہ ہرش نے کشمیر سے بدھ کے دانت کی متبرک یادگار حاصل کر لی، لیکن اس نے اس ملک پر حملہ نہیں کیا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے دوران میں چین سے گہرے تعلقات رہے؛ چنانچہ ۷۱۳ء میں چین سے ایک سفارت آئی۔ ۷۲۰ء کے بعد سے کشمیر کے بادشاہوں کو چینی حکمرانوں نے تسلیم کر لیا تھا۔ چین سے آخری سفارت، جس کا ذکر آتا ہے، ۷۵۹ء میں آئی تھی۔ اس وقت کشمیر میں کارکوٹہ خاندان کی حکومت تھی۔ ۷۱۳ء کی یہ سفارت بظاہر راجا چندر پیڈ (بجردت) کی درخواست پر بھیجی گئی تھی، جس نے عربوں کے خلاف، جو اب پہلی بار منظر عام پر آئے تھے، مدد مانگی تھی۔ محمد بن قاسم نے سندھ کی فتح کے بعد کوہ ہمالیہ کے دامن تک پیش قدمی کی، لیکن وہ اس سے آگے نہیں بڑھا۔ کشمیر کے باقاعدہ سکّے، جو متأخر کُشان بادشاہوں کے سکّوں کی نقل تھے (اگرچہ ان کے نقوش بتدریج بگڑتے گئے)، کارکوٹہ خاندان سے شروع ہوتے ہیں، جو چودھویں صدی میں ہندو حکمرانوں پر مسلمان بادشاہوں کے غلبہ پانے کے زمانے تک جاری رہے۔ اس قوم کے قدیم تر بادشاہوں کے قبضے میں کشمیر کی حدود سے بہت آگے تک کے علاقے بھی تھے، جن میں پکھلی، پولچھ، راج پوری، ٹیکسلا اور کوہستان نمک شامل تھے۔

غالباً اسی زمانے سے کشمیری اسلوب تعمیر کی توسیع بھی منسوب کی جا سکتی ہے، جو تقریباً

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

غیر متغیر شکل میں کوہستان لمک کے قدیم مندروں میں نمایاں ہے جیسا کہ ہمیں ہیون سانگ کے ذریعے معلوم ہوتا ہے۔ کشمیر میں ہندو مت اور بدھ مت ساتھ ساتھ پھیلتے رہے۔ بارھویں صدی عیسوی تک بھی، جب پنڈت کلہن نے اپنی کتاب لکھی، یہی صورت قائم رہی اور غالباً ہندو مندروں کے لیے جو طرز تعمیر مروج تھی، وہ بعینہٖ وہی تھی جو بدھ وہاروں (خانقاہوں) کی تھی۔ Foucher (*L' Art Greco - Bouddhique*، ص ۱۳۶ تا ۱۴۵) نے اس کی ابتدا پہلی اور دوسری صدی عیسوی کے گندھارا فن عمارت میں ثابت کی ہے۔ ایک دُہری مخروطی شکل کی چھت اس کی نمایاں خصوصیت ہے، جو آج تک کشمیر کی مسلم مساجد میں برقرار چلی آتی ہے؛ چنانچہ سری نگر میں شاہ ہمدان کی مسجد میں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔

پنڈت کلہن کی تاریخ میں اس عہد کا جو بیان ہے، اس میں گندھارا شاہیوں کا ذکر آنا شروع ہوتا ہے اور (جیسا کہ چین میں ہوا) بظاہر اسلام کی توسیع ہی گندھارا اور کشمیر کے مابین اتحاد کا باعث بنی۔ [مسلمانوں کو] سندھ میں جو کامیابی حاصل ہوئی اس کے علاوہ کابل کی سمت میں بھی گندھارا کی حدود پر حملے ہو رہے تھے۔ الطبری کا کہنا ہے کہ ۲۳ھ ہی میں عاصم بن عمرو قندھار (گندھارا) اور ہندوستانی سرحد تک پہنچ گیا تھا اور المنصور کے عہد (۱۳۶ھ/۷۵۴ء تا ۱۵۵ھ/۷۷۵ء) میں بقول البلاذری ہشام بن عمرو التغلبی، حاکم سندھ، نے کشمیر اور ملتان کو فتح کر لیا؛ پھر وہ قندھار آیا اور اسے بھی سر کیا۔ الیعقوبی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ کشمیر کے وہ علاقے جو اس طرح مفتوح ہوئے، بلا شبہہ ملک کے دور افتادہ حصے تھے۔ یہ سندھ اور جہلم دریاؤں کے درمیان واقع تھے، نہ کہ خود وادی کشمیر۔ اس کی حیثیت ایک حملے سے زیادہ نہ تھی، جس کا کشمیر پر کوئی مستقل اثر نہیں پڑا۔ وہاں چند صدیوں تک ہندو راجا امن و چین سے حکومت کرتے رہے۔ ان ہندو حکمرانوں میں سب سے زیادہ قابل ذکر اَوَنتی وَرمن (۸۵۵ تا ۸۸۳ء) تھا جس نے اونتی پور کی بنیاد رکھی، جہاں ابھی تک اس کے مندروں کے شکستہ آثار پائے جاتے ہیں۔ اس نے دریائے جہلم کے سیلابی پانیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے بھی بڑے پیمانے پر کئی اقدامات کیے۔ اس کے بیٹے کے زمانے میں "شاہیوں" سے اتحاد کا ذکر آتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعلق اور گہرا ہوتا گیا۔ گوپال ورمن (۹۰۲ تا ۹۰۴ء) نے تورمان یا کَملوکا کی (جسے البیرونی نے "کملوا" لکھا ہے) ایک باغی سے اپنا دارالسلطنت واپس لینے میں مدد کی اور تھیم گپت (۹۵۰ تا ۹۵۸ء) نے کملوکا کے جانشین بھیم کی نواسی دِدّا سے شادی کر لی۔ دِدّا کئی حکمرانوں کے عہد میں بڑے اثر و رسوخ کی مالک رہی اور آخر کار ملکہ بن گئی۔ وہ پونچھ کے "لوہر" حکمران خاندان سے تھی اور اسی کے زیر اثر یہ خاندان کشمیر کا حکمران بنا۔ ۳۹۳ھ/۱۰۰۳ء میں محمود غزنوی نے "شاہی" خاندان کو ختم کر دیا۔ اس کے آخری حکمران ترلوچن پال کو، جس کی مدد کشمیر کا ایک فوجی دستہ کر رہا تھا، شکست ہوئی اور وہ فرار ہو گیا، لیکن محمود کی خود کشمیر میں داخل ہونے کی کوشش "لوہر" کے پہاڑی قلعے تک پہنچ کر رک گئی، جسے البیرونی نے لاہور لکھا ہے اور کہا ہے کہ ایسا مستحکم مقام اس نے اور کوئی نہیں دیکھا۔ شاہی سلطنت کی تباہی کے بعد بھی اس خاندان کے شہزادے کشمیر کے معاملات پر اثر انداز ہوتے رہے۔ لوہر خاندان غزنوی عہد کے دوران میں برابر حکمران رہا۔ بقول کلہن، نیم پاگل راجا ہرش دیو

www.besturdubooks.wordpress.com

(۱۰۸۹ تا ۱۱۰۱ء) مسلمانوں کے زیر اثر تھا۔ اس نے ترک سپاہیوں کو ملازم رکھا اور ہندو اور بدھ مورتیوں کو تباہ کر دیا۔ تُرشْک یا ترک سپاہیوں کو ملازم رکھنے کا سبب ایک حد تک کشمیریوں کی نااہلی بتائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں بد نظمی کے باعث ملک بار بار کی سازشوں اور بغاوتوں سے پریشان حال رہا اور ممکن ہے کہ غیر ملکی سپاہیوں کے استعمال کا ایک یہ بھی سبب ہو۔ پنڈت کلہن کی تاریخ ۱۱۴۹ء پر ختم ہو جاتی ہے اور جونراج نے اس کا جو تتمہ لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالات بد تر ہوتے گئے تھے، نیز یہ کہ بتدریج تبلیغ اسلام بھی جاری تھی۔ زولچو [آ: لائیڈن میں اس کا نام ذوالقدر خان غلط بتایا گیا ہے۔ وہ مسلمان نہیں تھا، دیکھیے محب الحسن: کشمیر سلاطین کے عہد میں، ص ۴۸ تا ۴۹] کی سرکردگی میں شمال کی جانب سے ۷۰۶ھ/۱۳۰۵ء میں تاتاریوں کا حملہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں لوٹ مار کرنے کے بعد یہ فوج واپس جاتے ہوئے برفباری کی وجہ سے تباہ ہو گئی۔ اس واقعے سے شاید بعد میں آنے والے ایک مسلمان قسمت آزما شاہ میرسواتی (غالباً ایک افغان) کے لیے راستہ سہل ہو گیا جس نے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا اور ۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء میں سلطان شمس الدّین اوّل کے لقب سے ایک مسلمان خاندان "شاہ میری" کی بنا رکھی۔ بظاہر اس تبدیلی کو کشمیریوں کی اکثرت نے قبول کر لیا۔ ہندوؤں سے، جو زیادہ تر برہمن تھے، اور جنھوں نے اپنا مذہب برقرار رکھا تھا، رواداری کا سلوک کیا جاتا تھا، اور وہ بدستور سرکاری ملازمتوں پر متعین رہے۔ سکندر شاہ کے عہد (۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء تا ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء) میں [بادشاہوں کی مذہبی حکمت عملی میں] ایک تبدیلی رونما ہوئی اور کچھ مندروں کو بھی نقصان پہنچایا [غلام محی الدّین صوفی انگریزی میں اپنی محققانہ تاریخ *Kashir* میں لکھتا ہے کہ یہ تقریباً سب کچھ پرجوش نو مسلم کشمیریوں نے کیا]۔ سکندر شاہ تو خورد سال تھا اسے بت شکن کے نام سے یاد کرنا غلط ہے، البتہ اس کے میر لشکر اور وزیر اعلیٰ ملک سیف الدّین (سابق بودی بٹ) پر، جو نو مسلم تھا، کچھ ذمّے داری عائد ہوتی ہے۔ زین العابدین نے (۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء تا ۸۷۴ھ/۱۴۷۰ء) روا داری کا طریقہ اختیار کیا۔ وہ ہر لحاظ سے نہایت اچھا بادشاہ تھا، اس کے عہد حکومت میں عدل و انصاف کا دور دورہ تھا۔ اس عہد کو کشمیر کے ہر طبقے کے لوگ سنہرے دور کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں، اس نے سڑکیں، نہریں اور پل تعمیر کرائے اور ہر طریقے سے ملک کی خوش حالی کو فروغ دیا۔ اس کے جانشینوں کے عہد میں پھر بدنظمی پھیل گئی۔ شیعہ چکوں نے، جو بقول لارنس غالباً دَرْدِستان سے آئے تھے، بڑا اثر و اقتدار حاصل کر لیا اور آخر کار جائز اور حق دار خاندان کے متأخر حکمرانوں کی جگہ لے لی۔ غازی خان چک اگرچہ بادشاہ تو نہیں کہلایا لیکن دراصل وہ مطاق العنان فرمانروا ہی تھا؛ تاہم حسین شاہ، محمّد علی اور یوسف نے، جیسا کہ ان کے سکّوں سے ظاہر ہوتا ہے، مغول شہنشاہوں کے مقابلے میں بجائے سلطان کے، جو ان سے پہلے کے حکمران استعمال کرتے تھے، بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا۔

جب بابر نے شمالی ہندوستان کو فتح کر لیا تو مغول شہنشاہوں کی توجہ کشمیر کی جانب مبذول ہو گئی، جس میں ایک ایسی قوم کے لیے بڑی کشش موجود تھی جو سرد آب و ہوا، رواں نہروں اور باغوں سے مانوس تھی۔ خود بابر نے کشمیر میں ایک مختصر سی مہم بھیجی، جیسے کوئی

www.besturdubooks.wordpress.com

کامیابی نہ ہوئی۔ ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء میں، یعنی اس سال جب ہمایوں کو شیر شاہ کی بغاوت کی وجہ سے اقتدار سے محروم ہونا پڑا، اس کے چچا زاد بھائی حیدر میرزا دوغلات نے، جو کاشغر کے حکمران خاندان سے تھا [رک بہ دوغلات] اور بہت قابل شخص اور مؤرخ تھا [رک بہ حیدر میرزا]، ہمایوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ کشمیر پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے اور اس طرح اپنے دشمنوں سے ایک محفوظ جائے پناہ حاصل کر لے، لیکن ہمایوں اس منصوبے پر عمل نہ کر سکا۔ تاہم حیدر میرزا نے اپنی مہم جاری رکھی اور چونکہ اسے خاصی مقامی امداد حاصل ہو گئی، وہ ہمایوں کے نام پر کشمیر میں مغلیہ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء تک اس کی حکومت برقرار رہی، لیکن اسی سال وہ ایک بغاوت کے دوران میں شہید ہوگیا۔ اس بغاوت کی تنظیم غالباً سوری بادشاہوں نے کی تھی، کیونکہ اسلام شاہ سوری کا ایک سکّہ، جو کشمیر میں ۹۵۷ھ میں مضروب ہوا تھا، ہمارے علم میں ہے۔ بعد ازاں وادی میں چک حکومت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اکبر نے کشمیر پر حملہ کیا۔ یوسف شاہ کے بیٹے یعقوب خان نے زبردست مزاحمت کی آخر ۹۹۵ھ/۱۵۸۶ء میں تمام مزاحمت ختم ہو گئی اور کشمیر مغل سلطنت کا ایک حصہ بن گیا، جس سے مغل شہنشاہوں کو ایک پسندیدہ سیرگاہ میسر آئی۔

اکبر پہلی دفعہ بذات خود ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں براہ پیر پنجال کشمیر گیا اور دوسری دفعہ ۱۰۰۰-۱۰۰۱ھ/۱۵۹۲ء میں جب کہ اس کے ہمراہ نامور مؤرخ نظام الدّین مصنف طبقات اکبری بھی تھا۔ وہ تیسری بار گیا تو اس نے اپنے وزیر مال ٹوڈر مل سے کشمیر کا بندوبست اراضی کرایا اور سری نگر کی پہاڑی کوہ قلعہ بند کیا، جس پر اب ہری پربت نامی قلعہ واقع ہے۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں اکبر کے عہد میں کشمیر کی مفصل کیفیت لکھی ہے۔ جہانگیر دورِ شہزادگی میں اپنے والد کے ساتھ کشمیر جایا کرتا تھا اور جب وہ تخت نشین ہوا تو اس نے اس ملک کی سیر و تفریح سے پورا پورا حظ اٹھایا۔ اس نے کئی گرمائی محل تعمیر کرائے اور باغ لگوائے، جن میں سے نشاط باغ، جو ڈل کے کنارے واقع ہے، اچھی بل، جہاں دریائے جہلم کی ایک شاخ کے چشمے چٹانوں میں سے پھوٹتے ہیں اور ویری ناگ سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی ملکہ نور جہاں کو خوش کرنے کے لیے اس کے وطن ایران سے چنار کے درخت منگوا کر لگوائے۔ ان درختوں کے خوبصورت جھنڈ اور راستوں کے ساتھ ساتھ دو رویہ قطاریں اب تک کشمیر کے خوش نما مناظر میں شمار ہوتی ہیں۔

اس کے جانشین شاہ جہاں نے متعدد باغ لگوائے۔ اس کے عہد میں علی مردان خان نے پیر پنجال کے راستے پر سرائیں تعمیر کیں۔ شاہجہان کے بیٹے دارا شکوہ [رک بآں] نے ڈل کے اوپر پہاڑی کے پہلو میں پری محل بنوایا، جس کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ اورنگ زیب صرف ایک دفعہ کشمیر آیا۔ وہاں کی تعمیر کردہ مسجدیں اب بھی موجود ہیں۔ سلطنت کی شان و شوکت بدستور قائم رہی۔ برنیئر نے، جو شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ یہاں آیا، کشمیر کا حال بڑے شگفتہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

متاخر مغول شہنشاہوں کے عہد میں حکومت کا نظم و نسق خراب ہوگیا۔ اگرچہ نادر شاہ نے کشمیر کا رخ تو نہیں کیا، مگر اس کے حملے نے افراتفری ضرور پیدا کر دی۔ یہاں کے صوبیدار عملاً

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

خود مختار ہوگئے ۔ تقریباً ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ درّانی [رک بآں] نے اسے فتح کر لیا ۔ ۱۷۵۶ء میں اس نے بلند خان سدو زئی کو کشمیر کا صوبیدار مقرر کیا ۔ تاہم سکّے شہنشاہ عالمگیر ثانی کے نام پر ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء تک مضروب ہوتے رہے ۔ احمد شاہ کے پہلے کشمیری سکّے کی تاریخ ۱۱۷۶ھ ہے (۱۱۶۲ھ کا وہ سکّہ جس کا ذکر راجرز Rodgers نے کیا ہے، اسے وھائٹ ہیڈ White head نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ مغل بادشاہ احمد شاہ کا ہے نہ کہ احمد شاہ درّانی کا) ۔

درّانیوں کے عہد میں، کشمیر کی حالت خراب رہی ۔ ان کے متعلق لوگوں نے کچھ اچھی رائے قائم نہیں کی ۔ مدعیانِ حکومت بالخصوص محمود شاہ اور شجاع الملک کے درمیان ہونے والی خانہ جنگیوں کا صحیح پرتو سکّوں میں دکھائی دیتا ہے ۔ ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء میں فتح خاں بارکزئی نے پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ کی مدد سے کشمیر پر قبضہ کر لیا ۔ برائے نام بادشاہ تو محمود شاہ (اور بعد ازاں ایوب شاہ) رہا، لیکن حقیقی اقتدار بارک زئی سرداروں، بالخصوص محمّد اعظم شاہ کے ہاتھ میں تھا، جس نے غالباً محمّد (۱۲۲۷ تا ۱۲۳۲ھ) کے نام سے سکّے ضرب کرائے ۔ ۱۲۲۳ تا ۱۲۲۵ھ کے دوران میں جو بدنظمی پھیلی رہی، وہ اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس زمانے میں سکّے بجائے کسی برائے نام بادشاہ کے، ایک مقبول ولی اللہ نور الدّین کے نام سے جاری ہوتے رہے ۔ اس صورت حال کا خاتمہ یوں ہوا کہ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے کشمیر پر حملہ کیا اور اسے اپنی مملکت میں شامل کر لیا ۔ سکھوں کی حکومت سخت گیر اور تشدد آمیز تھی ۔ یہاں کے صوبیداروں میں سے ہری سنگھ اپنے جبر و استبداد کے لیے مشہور تھا، البتہ میاں سنگھ قدرے انصاف پسند حکمران گزرا ہے ۔ مُور کرافٹ Moorcroft سیاح اس زمانے میں کشمیر آیا اور اس نے سکھوں کے عہد میں لوگوں کی جو حالت بیان کی ہے، وہ کچھ اچھی نہیں ۔

رنجیت سنگھ کے زمانے میں جموں کے ایک ڈوگرا خاندان کے تین بھائیوں، دھیان سنگھ، گلاب سنگھ اور سچیت سنگھ نے نام پیدا کر لیا تھا ۔ یہ سکھ نہیں بلکہ سخت متعصب ہندو تھے ۔ ڈوگرے کشمیر کی ملحقہ پہاڑیوں کی ایک راجپوت قوم سے ہیں اور وادی کشمیر کے باشندے نہیں ۔ دھیان سنگھ کو سکھ ریاست کے ایک اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا گیا اور گلاب ستگھ کو جموں کا راج مل گیا، جو رنجیت سنگھ نے ۱۸۲۰ء کے قریب ضبط کر لیا تھا ۔ گلاب سنگھ نے رنجیت سنگھ کے نام پر یکے بعد دیگرے کئی پہاڑی ریاستوں پر قبضہ کرکے کشمیر میں اپنی قوت اور اثر و رسوخ میں اضافہ کر لیا ۔ اس طریقے سے اس نے کشتوار اور لداخ کو سکھ مملکت میں شامل کر لیا ۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی وفات اور اس کے بعد رونما ہونے والے مناقشات کی وجہ سے دھیان سنگھ کچھ عرصے کے لیے بہت طاقتور ہو گیا اور اس کی مدد سے گلاب سنگھ کو پہاڑی علاقوں میں اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کا موقع مل گیا ۔ اجیت سنگھ سندھانوالیا کے ہاتھوں دھیان سنگھ اور مہاراجا شیر سنگھ کے قتل (۱۸۴۴ء) کے بعد گلاب سنگھ کچھ عرصے کے لیے اپنے پہاڑی مقبوضات میں چلا گیا؛ لیکن اس سے پہلے اسے ایک بغاوت کی سرکوبی کے لیے کشمیر بھیجا گیا، تھا جس میں حاکم کشمیر میاں سنگھ مارا گیا تھا (۱۸۴۲ء) ۔ اس نے یہ کام کامیابی سے انجام دیا، لیکن ملک ایک دفعہ پھر طوائف الملوکی کا شکار

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ہو چکا تھا اور باغی قبیلہ بمبا سکھ فوجوں کا مقابلہ کر رہا تھا ۔ ۱۸۴۵ء میں جب خالصہ فوج انگریزوں کے خلاف جنگ میں کود پڑی تو گلاب سنگھ نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ جنگ کے بعد نوجوان مہاراجا دلیپ سنگھ کے نمائندے کی حیثیت سے انگریزوں سے گفت و شنید میں شرکت کی ۔ [صلح نامۂ لاہور کی رو سے دوآبۂ بست جالندھر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا، سکھوں پر پندرہ لاکھ اشرفی تاوان لگایا گیا اور مہاراجا دلیپ سنگھ کی اتالیقی انگریز قائم مقام ہنری لارنس کو تفویض ہوئی ۔ خزانے میں تاوان کی رقم پانچ لاکھ اشرفی سے زیادہ نہ نکلی ۔ دس لاکھ اشرفیاں گلاب سنگھ نے دینے کا اقرار کیا اور معاوضے میں کشمیر کی ریاست حاصل کی] ۔

گلاب سنگھ کو اپنی نئی مملکت کا قبضہ امن و آشتی سے نہیں ملا ۔ حاکم کشمیر امام الدّین نے بمبا قبیلے کی مدد سے گلاب سنگھ کی فوجوں کو شکست فاش دی ۔ اب اسے وادی کا قبضہ دلوانے کے لیے انگریزی فوج بھیجی گئی جو بالآخر کامیاب ہوئی ۔ گلاب سنگھ کی حکومت بحیثیت مجموعی مستحکم تھی [لیکن اس کے زمانے میں مسلمانوں کا سیاسی اور معاشی استحصال بری طرح کیا گیا ۔ ریاست کے تمام چھوٹے اور بڑے عہدے ڈوگرا خاندان یا کشمیری پنڈتوں کے پاس تھے ۔ مسلمان کاشتکاروں کے لیے مالیہ کی شرح ناقابل برداشت تھی ۔ مسلمانوں پر ظالمانہ ٹیکس لگائے جاتے تھے ۔ کرنل ٹورنیز لکھتا ہے کہ گلاب سنگھ اپنا خزانہ بھرنے میں بے حد لالچی تھا] ۔ ۱۸۵۷ء میں اس کی موت کے بعد اس کا تیسرا بیٹا رنبیر سنگھ اس کا جانشین ہوا ۔ [اس نے ٹیکسوں میں پہلے کی نسبت بہت اضافہ کر دیا جس کی وصولی بڑی سختی سے کی جاتی تھی] ۔ ۱۸۷۷ تا ۱۸۷۹ء کے قحط سے ملک میں بڑی تباہی آئی اور ۱۸۸۵ء کے زلزلے سے بڑا نقصان ہوا ۔ رنبیر سنگھ کا جانشین ۱۸۸۵ء میں اس کا سب سے بڑا بیٹا مہاراجا پرتاب سنگھ ہوا ۔ [اس کے زمانے میں بھی ڈوگرا راج کا مسلمانوں پر خصوصی عتاب بیگار یا جبری محنت کی صورت میں جاری رہا، جسے قانونی تحفظ حاصل تھا] ۔ قحط اور زلزلے کے بعد ۱۸۹۳ء میں تاریخ کشمیر کا ایک بدترین سیلاب آیا ۔ انگریزوں کے زیر اثر زمین کے لگان کے نظم و نسق کا طریقہ ۱۸۸۷ تا ۱۸۹۲ء کے بندوبست اراضی کے تحت کشمیر میں برطانوی ہند کے نمونے پر رائج ہوا ۔ ان قواعد میں بعد ازاں مزید اصلاح اور نشو و نما بھی ہوئی ، [لیکن اس سے مسلمانوں کی فلاکت زدگی میں کوئی فرق نہ آیا] ۔ ذرائع حمل و نقل بہتر ہو گئے ۔ وادی جہلم میں سے گزر کر بارہ مولا کے راستے سری نگر تک ایک عمدہ سڑک تعمیر ہوئی، جس پر انتظامی نقطۂ نظر سے کشمیر تین اضلاع ، یعنی جنوبی کشمیر، شمالی کشمیر اور مظفر آباد کے اضلاع میں منقسم تھا ۔ پہلے دو اضلاع وادی کشمیر اور ان چھوٹی چھوٹی دریائی وادیوں اور ان سے ملحقہ پہاڑی ڈھلانوں پر مشتمل تھے اور تیسرا بارہ مولا سے نیچے وادی جہلم اور وادی کشن گنگا پر مشتمل تھا ۔ [موجودہ وقت (ستمبر ۱۹۷۶ء) میں کشمیر کے دو حصے ہیں: آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر ۔ آزاد کشمیر شمالی اور مغربی حصے پر مشتمل ہے اور پاکستان کے زیر اقتدار ہے؛ مظفر آباد اس کا صدر مقام ہے ۔ مقبوضہ کشمیر بھارت کے قبضے میں ہے جس کے چار اضلاع ہیں اور صدر مقام سری نگر ۔ مزید تفصیلات کے لیے تعلیقہ دیکھیے] ۔

۱۹۱۱ء میں کشمیر کی آبادی ۱۲۹۵۲۰۱

www.besturdubooks.wordpress.com

تھی ۔ اس میں تقریباً ۹۴ فی صد مسلمان اور چھے فی صد ہندو تھے جن میں سکھوں کی ایک قلیل تعداد شامل تھی ۔ ہندو زیادہ تر برہمن تھے، جنھیں عام طور پر پنڈت کہتے ہیں، خواہ ان کا پیشہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ۔ قدیم زراعت پیشہ باشندے سب کے سب مسلمان ہو گئے تھے ۔ غیر ملکی اقوام کی آمیزش بہت کم، بلکہ بالکل ہی نہیں ہوئی ۔ کشمیریوں میں قدیم ذاتیں ابھی تک باقی ہیں، لیکن آپس میں شادی بیاہ کی اجازت ہے اور خاندانی نام (کرام) جو ابتداءً القاب تھے، بڑی حد تک ذاتوں کے ناموں کی جگہ استعمال ہونے لگے ہیں ۔ [صوبۂ کشمیر میں کل آبادی ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق (جو متحدہ برصغیر کی آخری مردم شماری تھی) ۱۷۲۸۷۰۵ تھی، جن میں سے ۱۶۱۵۴۷۸ مسلمان تھے اور باقی تقریباً ۶۰۶ فی صد غیر مسلم تھے] ۔

کشمیریوں میں فنی صلاحیت اور کاریگری کا قدرتی مادّہ بافراط پایا جاتا ہے ۔ شال بافی کی قدیم صنعت، جس کے لیے کبھی کشمیر مشہور تھا، اب چھوٹے پیمانے پر باقی رہ گئی ہے اور سادہ پشمینے نے، جو تبتی بکریوں کی پشم سے بنا جاتا ہے، کسی حد تک اسی پشم سے بنی ہوئی شالوں کی جگہ لے لی ہے ۔ کئی اور صنعتیں بھی قائم ہوگئی ہیں، چنانچہ قالین، نمدے جن پر کشیدہ کاری ہوتی ہے اور میز پوش بڑی تعداد میں تیار ہوتے ہیں اور لکڑی کے تراشیدہ کام کی اشیاء، لاکھ کے روغن، منقش لکڑی اور گتی (Papier-mache) کے کام کی چیزیں اور اسی طرح چاندی اور تانبے کے برتن یورپ میں اور سیاحوں کے نزدیک بہت مقبول ہیں ۔

کشمیریوں کی ایک خاصی بڑی تعداد دریاؤں اور جھیلوں پر کشتیوں میں رہتی ہے ۔ یہ مانجھی یا ملاح کہلاتے ہیں اور آبادی میں ایک جداگانہ عنصر تشکیل کرتے ہیں ۔

کشمیر میں سیاحوں کے لیے ہمیشہ سے ایک کشش رہی ہے ۔ ذرائع رسل و رسائل میں اصلاح کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا ہے ۔ ہندوستان میں مقیم یورپی [اور مقامی] باشندوں کے علاوہ دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے یہ ایک بڑی گرمائی سیر گاہ رہا ہے، جو یہاں سفر کرتے وقت خیمے یا مکانوں کا کام دینے والی دریائی کشتیاں استعمال کرتے ہیں ۔ وادی گلمرگ ان کی محبوب جگہ ہے، جو سطح سمندر سے ۸۰۰۰ فٹ بلند ہے ۔ پہاڑی وادیوں میں بڑا اور چھوٹا شکار ایک زمانے میں بہت سے شکاریوں کے لیے باعث کشش تھا، لیکن اب اس کی افراط نہیں رہی اور یاد گاروں کے تلاش کرنے والے اب شاذ و نادر ہی کشمیر آتے ہیں ۔

کشمیر کی زبان، جو کشمیری یا کاشر کہلاتی ہے، ایک پراکرتی بولی ہے، جو پنجاب کی بولیوں سے بہت مختلف ہے اور دردستان کی شینا زبانوں سے اتنی ملتی جلتی ہے کہ گریرسن Grierson نے اسے پشاچی زبانوں کے گروہ میں جگہ دی ہے ۔

کشمیر کے بڑے بڑے سیاح جن کے بیانات کا مطالعہ سترھویں صدی عیسوی سے قبل کے مذکورۂ بالا ماٰخذ کے ساتھ کرنا مفید ہوگا، حسب ذیل ہیں : (۱) فرانسسکو زیویر Francisco Xavier، جو اکبر کے ہمراہ کشمیر آیا تھا؛ (۲) فرانکوئی برنیئر Francois Bernier، جو اورنگ زیب کے ساتھ ۱۶۶۴ء میں آیا تھا؛ (۳) جارج فورسٹر George Forster ۱۷۸۳ء میں بعہد تیمور شاہ درانی یہاں آیا؛ (۴) ولیم مورکرافٹ William Moorcroft اور جارج ٹریبک George Trebeck دونوں لداخ سے ہوتے ہوئے کشمیر میں بعہد رنجیت سنگھ (۱۸۱۹ تا ۱۸۲۵ء) آئے؛ (۵) وکٹر جیکوئی ماں Victor

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Jacquemant (۱۸۳۱ء)؛ (۶) فان ہیوگل Von Hügel (۱۸۳۵ء) اور (۷) وائن Vigne (۱۸۳۵ء)؛ قریب تر زمانے کے لیے سب سے اچھے بیانات ڈریو Drew اور لارنس Lawrence کے ہیں اور قدیم تاریخ کے لیے سٹائن Stein کی تصانیف۔

(۲) کشمیر کا نام بسا اوقات سری نگر کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا، جو ملک کشمیر کا پہلے دارالحکومت تھا [اور اب صرف مقبوضہ کشمیر کا ہے] ۔ یہی نام ٹکسالی شہر کے لیے مسلمان سلاطین، مغل شہنشاہوں اور درانی شاہوں کے زمانے میں بھی استعمال ہوتا تھا اور ۱۸۳۵ء کے متأخر زمانے میں بھی Von Hügel شہر کشمیر کا ذکر کرتا ہے ۔ سری نگر کا قدیم نام، جو بقول پنڈت کلہن، اشوک نے رکھا تھا، ہندو حکمرانوں نے دوبارہ استعمال کرنا شروع کر دیا اور اب عام طور پر مستعمل ہے۔

(۳) جموں اور کشمیر کے وسیع علاقے اکثر نقشوں کی کتابوں اور سرکاری اشاعتوں میں کشمیر کے نام کے تحت شامل کر دیے جاتے ہیں، لیکن ۱۸۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے بعد ایسا کرنا درست نہیں ۔ سطور بالا میں کشمیر کے دو حصوں آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کا ذکر ہو چکا ہے ۔ اس سلسلے میں مزید معلومات کے لیے تعلیقہ دیکھیے ۔ کشمیر اور جموں کی تنگ حدود سے باہر کے بہت بڑے علاقے میں، جس کا بیشتر حصہ پہاڑوں پر مشتمل ہے، آبادی صرف ۲۶۵۰۶۰ ہے۔ یہ لداخ، سکردو، بلتستان [رک بآں]، چلاس، گلگت [رک بآں]، ہنزہ، ناگر [رک بآں] اور یاسین کے علاقے ہیں۔ ان کا ذکر اپنے اپنے ناموں کے تحت ملے گا ۔ برصغیر کی تقسیم کا ان پر بھی اثر پڑا ہے۔

مآخذ : جغرافیہ اور عام کوائف (۱) F. Drew : *The Jummoo and Kashmir Territories*، لنڈن ۱۸۷۵ء؛ (۲) W. R. Lawrence : *The Valley of Kashmir*، لنڈن ۱۸۹۵ء؛ (۳) F. E. Younghusband : *Kashmir*، لنڈن ۱۹۰۹ء؛ (۴) M. A. Stein : *The Ancient Geography of Kashmir*، در *JASB*، کلکتہ ۱۸۹۹ء؛ (۵) *Census of India*، ج ۲۰ : *Kashmir*، لکھنؤ ۱۹۱۲ء؛ (۶) Lydekker : *Kashmir*، در *Geological Survey of India*، ج ۲۲؛ (۷) Oestreich : *Die Täler des Nordwestlichen Himalaya*، گوتھا ۱۹۰۷ء؛ (۸) A. Cunningham : *Ancient Geography of India*، لنڈن ۱۸۷۱ء؛ (۹) C. E. Bates : *Gazetteer of Kashmir*، کلکتہ ۱۸۷۳ء؛ (۱۰) J. H. Knowles : *Folk Tales of Kashmir tr. into Engl.*، بار دوم، ۱۸۹۲ء؛ (۱۱) H. W. Bellew : *Kashmir und Kashgar*، لنڈن ۱۸۷۵ء؛ (۱۲) البیرونی : *India*، طبع Sachau، ص ۱۱، ۶۵، ۸۲، ۸۳، ۱۰۱ ببعد، ۱۰۳، ۱۶۳، ۱۹۶، ۲۰۶، ۲۸۷، ۲۸۹؛ ترجمہ، ۱ : ۲۱، ۱۳۵، ۱۷۳، ۱۷۴، ۲۰۶ تا ۲۰۸، ۲۱۱، ۳۱۷، ۳۹۱، ۳۹۳ و ۲ : ۸، ۹، ۱۷۸، ۱۸۱؛ (۱۳) *Relations de Voyages et Textes Géogr.* وغیرہ مترجمۂ G. Ferrand، پیرس ۱۹۱۳ء، ج ۱، ۲؛ (۱۴) Elliot-Dowson : *The Hist. of India etc.*، ج ۱ تا ۷؛ (۱۵) *Hist. of India*، طبع A. V. Williams Jackson، ج ۲، ۳، ۴، ۵۔

تاریخ : (۱) Walters : *Yuan Chwang*، طبع رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لنڈن ۱۹۰۴ء؛ (۲) البیرونی : *India*، ترجمہ از Sachau، لنڈن ۱۹۱۰ء؛ (۳) پنڈت کلہن : راج ترنگنی، ترجمہ و حواشی از Stein، دو جلدیں، ویسٹ منسٹر ۱۹۰۰ء؛ (۴) المسعودی : مروج الذہب، ترجمہ از Sprenger، لنڈن ۱۸۴۱ء؛ (۵) ابو الفضل : آئین اکبری، ترجمہ از Jarret، ج ۲، کلکتہ ۱۸۹۱ء؛ (۶) *The India of Awrangzeb*، ترجمہ از خلاصۃ التواریخ، کلکتہ ۱۹۰۱ء؛ (۷) *Cathay and the Way Thither*، بار دوم، لنڈن ۱۹۱۵ء؛ (۸)

www.besturdubooks.wordpress.com

Ancient India as described by : Mc Crindle
Ptolemy، بمبئی ۱۸۸۵ء؛ (۹) : Sir A. Cunningham
Coins of Mediaeval India، لندن ۱۸۹۱ء؛ (۱۰)
Coinage of Kashmir, Hindu and : Rodgers
Muhammadan، در JASB، کلکتہ ۱۸۷۹ء؛ (۱۱)
Catalogue of Indian Coins, Muham- : Lane-Poole
madan States (British Museum)، لندن ۱۸۸۵ء؛
Catalogue of Coins of Mughal : Whitehead (۱۲)
Emperors, Lahore Museum، آکسفرڈ ۱۹۱۴ء؛ (۱۳)
Catalogue of Coins in Lahore Museum : Rodgers،
Essay on the : H. H. Wilson (۱۴) ؛ کلکتہ ۱۸۹۳ء
Hindu History of Kashmir، کلکتہ ۱۸۸۵ء۔

سیاحت نامے : (۱) Hajus de rebus Japonicis
Indicis etc.، اینتورپ ۱۶۰۵ء؛ (۲) : F. Bernier
Voyages، ایمسٹرڈم ۱۷۲۳-۱۷۲۵ء، انگریزی ترجمہ از
A. Constable، بار دوم، مع نظر ثانی از J. A. Smith،
آکسفرڈ ۱۹۱۶ء؛ (۳) : G. Forster
A Journey from Bengal to England through .... Kashmire
۲ جلدیں، لندن ۱۸۰۸ء؛ (۴) : Trebeck و Moorcroft
Travels ... in Ladakh and Kashmir، ۲ جلدیں، لندن
۱۸۴۱ء؛ (۵) : G. T. Vigne
Travels in Kashmir, Ladakh, etc.، ۲ جلدیں، لندن ۱۸۴۲ء؛ (۶) V. Jacque-
mont : Journey in India، لندن ۱۸۳۵ء؛ (۷) C. V.
Hugel : Kaschmir und das Reich der Siek، ۴ جلدیں،
Stutgart ۱۸۴۰ تا ۱۸۴۴ء و انگریزی ترجمہ : Travels
in Kashmir and the Panjab، لندن ۱۸۴۵ء؛ (۸)
Torrens : Travels، مطبوعہ لندن، ص ۳۰۱۔

آثار قدیمہ : (۱) H. H. Cole : Illustrations
of ancient buildings in Kashmir، لندن ۱۸۶۹ء؛
(۲) A. Foucher : L'Art. Gréco-Bouddhique du
Gandhāra، پیرس ۱۹۰۵ء۔

زبان : (۱) Grierson : Kāçmīrī Grammar، لندن
۱۸۹۹ء؛ (۲) وہی مصنف : The Pisaca Languages of
N. W. India، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن ۱۹۰۹ء؛
(۳) Rev. J. H. Knowles : Dictionary of Kashmiri
Proverbs، بمبئی ۱۸۸۵ء؛ (۴) Sir Aurel Stein
بہ معاونت پنڈت گوولند کول : Hatim's Tales، طبع
سر جارج گریئرسن، لندن ۱۹۲۳ء۔

(M. LONGWORTH-DAMES)

تعلیقہ : جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، ⊗ سکھوں نے تقریباً تیس سال تک کشمیر پر حکومت کی اور یہ ظلم و تشدد اور جبر و استبداد کا تاریک ترین دور تھا (History of the Freedom Movement، ۲/ ۱ : ۹۷) - سکھوں نے مغلوں کے ہاتھوں جو شکستیں کھائی تھیں ان کا بدلہ انھوں نے بے بس اور مجبور مسلمان کشمیریوں سے لیا (Two Nations and Kashmir، ص ۲۰) - ان کی نظر میں مسلمانوں کی اہمیت جانور سے زیادہ نہ تھی، حتّٰی کہ ایک مسلمان کو قتل کرنے کی سزا کسی سکھ کو صرف بیس روپے جرمانہ تھی (The Princes of India، ص ۱۲۱) - معاشی استحصال عام تھا، مذہبی آزادی سلب کر لی گئی تھی اور مسلمان نماز باجماعت بھی ادا نہیں کر سکتے تھے (Kashmir in sunlight and shade، ص ۷۵)۔

رنجیت سنگھ کے زمانے میں جموں کے تین ڈوگرا بھائیوں، گلاب سنگھ، دھیان سنگھ اور سوچیت سنگھ نے خالصہ دربار کی ملازمت اختیار کی اور بڑی وفاداری سے خدمات سرانجام دیں - جس پر ۱۸۱۸ء میں گلاب سنگھ کو جموں، دھیان سنگھ کو بھمبر اور پونچھ اور سوجیت سنگھ کو رام نگر کی سرداری عطا ہوئی - کشمیر پر حملہ کرنے کے سلسلے میں گلاب سنگھ کی خدمات سے خوش ہو کر مہاراجا رنجیت سنگھ نے اسے راجا کا خطاب دے کر جموں کا صوبیدار بنا دیا - ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

موت پر انتشار پھیلا تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گلاب سنگھ نے جموں میں مطلق العنانیت اختیار کر لی اور انگریزوں سے ساز باز شروع کر دی۔ سبراؤں کی لڑائی میں سکھوں کی شکست فاش بڑی حد تک گلاب سنگھ کی غداری کی مرہون منت تھی، جس کے نتیجے کے طور پر فروری ۱۸۴۶ء میں لاہور پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدۂ لاہور پر دستخط ہوئے، جس کی رو سے سکھوں پر ڈیڑھ کروڑ روپیہ تاوان جنگ عائد کیا گیا اور دوآبہ بست جالندھر کا انتہائی زرخیز علاقہ انگریزی حکومت کی حدود میں شامل کر لیا گیا۔ تاوان جنگ میں پچاس لاکھ روپے نقد ادا کر دیے گئے اور بقیہ ایک کروڑ کے عوض انگریزوں نے بیاس اور سندھ کا درمیانی پہاڑی علاقہ، جس میں ہزارہ اور کشمیر بھی شامل تھے، حاصل کر لیے۔ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو انگریزوں اور راجا گلاب سنگھ کے مابین معاہدۂ امرتسر طے پایا، جس کے مطابق وہ تمام کوہستانی علاقہ (مع ملحقات) جو دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب کی طرف واقع تھا، مہاراجا گلاب سنگھ اور اس کی اولاد نرینہ کے حق میں منتقل کر دیا گیا اور انتقال ریاست کے عوض گلاب سنگھ نے پچھتر لاکھ روپیہ نانک شاہی (موجودہ پچاس لاکھ روپے) ادا کرنے کا وعدہ کیا، نیز طے پایا کہ پچاس لاکھ روپے معاہدے کے شروع ہوتے وقت اور پچیس لاکھ روپے یکم اکتوبر ۱۸۴۶ء کو یا اس سے قبل ادا کر دیے جائیں گے۔

معاہدۂ امرتسر کے بعد گلاب سنگھ نے کشمیر پر باقاعدہ قبضہ کرنا چاہا، لیکن حکومت لاہور کے آخری صوبیدار شیخ امام الدّین نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جو ڈوگرا فوج قبضہ لینے کے لیے بھیجی گئی تھی اسے شکست دے کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ جب انگریزوں نے دیکھا کہ گلاب سنگھ کی فوج سے کشمیر کی فتح ممکن نہیں تو کرنل لارنس کی قیادت میں کشمیر پر چڑھائی کر دی گئی۔ شیخ امام الدّین نے مجبوراً اطاعت قبول کر لی اور کشمیر میں ڈوگرا حکومت قائم ہوگئی۔

مہاراجا گلاب سنگھ بڑا متعصب ڈوگرا تھا۔ ڈوگروں نے برہمنوں کے ساتھ مل کر قبضہ ملتے ہی مسلم اکثریت پر ظلم و تشدد کا آغاز کر دیا اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کی حیثیت کم مایہ قلیوں اور مزدوروں کی ہو کر رہ گئی۔ سیاسی و معاشی استحصال نے مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر دی۔ ظالمانہ ٹیکسوں سے ان کے خون کا آخری قطرہ نچوڑ لیا جاتا تھا۔ معاشرے میں وہ تمام سہولتوں سے محروم کر دیے گئے۔ اس پر طرہ یہ کہ انھیں شکایت کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اگر کوئی مسلمان کسی سیاح کے سامنے بھی اپنی حالت زار بیان کرتا تو اسے جیل میں ڈال دیا جاتا (تفصیل کے لیے دیکھیے Karbel : *Danger in Kashmir*، ص ۱۵؛ Mahaffe : *Roaa to Kashmir*، ص ۱۶۸؛ Torrens : *Travels*، ص ۳۰۱؛ *History of the Freedom Movement*، ۱: ۱۱۹؛ Younghusband : *Kashmir*، ص ۱۷۹؛ Walter Lawrence : *The India we Served*، ص ۱۲۸ و *The Valley of Kashmir*، ص ۲۲۹؛ سردار محمّد ابراهیم : *The Kashmir Saze*، ص ۱۴، وغیرہ)۔ بعد میں اگر کوئی نیک دل انگریز ڈوگرا حکومت پر دباؤ ڈالنے کو کہتا تو حکومت کی طرف سے معاہدۂ امرتسر کی قانونی مجبوریوں کو سامنے لایا جاتا تھا، جس میں کشمیر کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔ پنجاب میں سکھوں کا زور توڑنے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اپنی فوجیں بھیج کر مہاراجا گلاب سنگھ نے انگریزوں کی خدمات انجام دی تھیں، جن کی بنا پر برطانوی حکومت ریاست میں ہونے والے

besturdubooks.wordpress.com

تمام مظالم کے سلسلے میں چشم پوشی سے کام لیتی رہی۔ کشمیری مسلمانوں نے اس جبر و استبداد کے خلاف جنگ عالمگیر اوّل کے بعد آواز اٹھانی شروع کر دی۔ ہندوستان سے کشمیری نوجوان مسلمان تعلیم حاصل کر کے لوٹے تو اپنے ساتھ آزادی کا جذبہ لے کر آئے۔ چودھری غلام عبّاس اور شیخ محمّد عبداللہ انھیں نوجوانوں میں سے تھے۔ انھوں نے کشمیری مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کیا۔ ۱۹۳۱ء میں پولیس کے دو ملازمین کی طرف سے مداخلت فی الدّین کے علاوہ قرآن مجید کی بے حرمتی ہوئی تو مسلمان مشتعل ہو گئے اور ساری ریاست سراپا احتجاج بن گئی۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو پولیس نے سری نگر میں مسلمانوں کے ایک پر امن ہجوم پر گولی چلا دی، جو ایک نوجوان عبدالقدیر کے مقدمۂ بغاوت کی سماعت بند کمرے کے بجائے کھلے عام کرنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ بائیس مسلمان شہید اور سیکڑوں زخمی ہوئے۔ شہر میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ سارا دن نہتے مسلمانوں پر اندھا دھند فائرنگ ہوتی رہی۔ انھیں گھروں سے نکال کر اذیت ناک سزائیں دی گئیں، ان کا مال و اسباب لوٹ لیا گیا اور نوجوان عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ کشمیری مسلمانوں کے تمام ممتاز قائد گرفتار کر لیے گئے۔ ریاست میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اگرچہ مہاراجا نے طاقت کے بل پر اسے کچل دیا، لیکن اب کشمیری مسلمانوں میں اپنے حقوق کے لیے قربانیاں دینے کا داعیہ پیدا ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں مسلم کانفرنس قائم ہوئی۔ سیاسی اصلاحات کے ماتحت ۱۹۳۴ء میں انتخابات ہوئے تو مسلم کانفرنس نے مسلمانوں کی ۲۱ نشستوں میں سے ۱۶ نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ دو سال بعد پھر انتخابات ہوئے تو مسلم کانفرنس کی نشستوں کی تعداد الیس ہو گئی۔ اسمبلی کے پاس اختیارات نہ ہونے کے برابر تھے، تاہم معاشی، معاشرتی اور سیاسی اصلاحات کے لیے مسلم کانفرنس نے مسلسل جدوجہد جاری رکھی، تا آنکہ ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے زیر اثر شیخ محمّد عبداللہ نے سیکولر خطوط پر نیشنل کانفرنس قائم کر لی۔ چودھری غلام عبّاس اس اقدام کو درست نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ریاست میں اصل مسئلہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی بازیافت کا تھا اور ہندوؤں کو تو پہلے ہی سے تمام مراعات حاصل تھیں؛ چنانچہ انھوں نے مسلم کانفرنس کو از سر نو زندہ کیا۔ ادھر مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ کر دیا۔ مسلم کانفرنس نے اپنا سیاسی مستقبل مسلم لیگ سے وابستہ کر لیا۔ نیشنل کانفرنس تو پہلے ہی عملی طور پر کانگرس کی ایک ذیلی جماعت بن چکی تھی۔ کشمیری مسلمان سیاسی شعور سے بہرہ ور ہوئے تو نیشنل کانفرنس کا اثر روز بروز کم ہوتا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں شیخ محمّد عبداللہ نے "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک شروع کی اور بغاوت کے جرم میں انھیں قید کر دیا گیا۔ مسلم کانفرنس نے "ڈائرکٹ ایکشن" کا ارادہ کیا تو چودھری غلام عبّاس کو کئی اور رہنماؤں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں ریاست میں پھر انتخابات ہوئے اور مسلم کانفرنس نے مسلمانوں کی اکیس نشستوں میں سے پندرہ حاصل کر لیں اور باقی چھے نشستوں پر انتخاب ہی منعقد نہ ہو سکے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ کشمیر میں مسلم کانفرنس ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اسی زمانے میں برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کے منصوبے کے مطابق حکومت برطانیہ نے ریاستوں کے بارے میں یہ طے کیا کہ ریاستوں کے حکمران بھارت یا پاکستان جس ملک کے ساتھ چاہیں الحاق کر سکتے ہیں، تاہم انھیں فیصلہ کرتے وقت عوام کی خواہشات اور ریاست کی جغرافیائی پوزیشن کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو مسلم کانفرنس

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

نے ایک قرار داد کے ذریعے جغرافیائی حالات، مجموعی آبادی کی اسّی فیصد مسلم اکثریت، پنجاب کے اہم دریاؤں کی ریاست میں سے گزرگاہوں، نیز پاکستان سے ثقافتی، نسلی، معاشی تعلقات اور سرحدوں کے اشتراک کی بنا پر ریاست جموں وکشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا رسمی طور پر اعلان بھی کر دیا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب برصغیر پر آزادی کا سورج طلوع ہوا تو ریاست کے ہر حصے میں مسلمانوں نے قیام پاکستان کا جشن منایا، پاکستان کا پرچم لہرایا گیا اور اسے سلامی دی گئی؛ ریاست کے تمام بڑے شہروں میں پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کے حق میں جلسے اور جلوس منعقد ہوے۔

اس وقت چودھری غلام عبّاس جیل میں تھے، لیکن ان کی مسلم کانفرنس نے اپنا موقف واضح کر دیا تھا۔ نیشنل کانفرنس کا موقف غیر واضح رہا کیونکہ عوام میں یہ اپنی مقبولیت کھو چکی تھی اور شیخ محمّد عبداللہ "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کے سلسلے میں جیل میں تھے۔ برصغیر کی تقسیم اور اعلان آزادی کے فوراً بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو مہاراجا کشمیر نے بھارت اور پاکستان دونوں کو ریاست کے ساتھ معاہدۂ قائمہ (Stand-still Agreement) کرنے کی دعوت دی، جسے پاکستان نے منظور کر لیا، مگر بھارت نے جواب ہی نہ دیا۔ اس معاہدے کے تحت کشمیر کے ذرائع رسل و رسائل پاکستان کے حوالے کر دیے گئے اور کشمیر کے ڈاک خانوں پر پاکستان کا پرچم لہرانے لگا۔ اب پاکستان سے مکمل الحاق ہونا تھا، مگر مہاراجا کشمیر کی نیت صاف نہیں تھی۔ اس نے پٹیالہ، کپورتھلہ اور فرید کوٹ کے مہاراجوں کے مشورے سے ریاست میں مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ بنایا، ریاستی فوج سے مسلمان افسروں کو نکال دیا، مسلمان رعایا سے، حتّٰی کہ پولیس کے مسلمان ملازمین سے بھی ہتیار واپس لے لیے اور راشٹریہ سیوک سنگھ اور جن سنگھ جیسی متعدد تنظیموں اور سکھوں کے مسلح جتھوں کو ریاست میں بلا لیا، جو ہندوستان میں ان دنوں مسلمانوں کے قتل عام میں مصروف تھے۔ اس طرح ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ستمبر میں جموں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوگیا۔ ڈوگرا سپاہیوں نے میر پور، پونچھ، مظفر آباد اور اس سے ملحقہ اضلاع میں پہلے ہی سے دہشت گردی کی فضا قائم کرکے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا تھا۔ اپنے عزیزوں کی لاشیں بے گور و کفن چھوڑ کر لاکھوں مہاجرین نے پاکستان آنا شروع کر دیا۔ کشمیر میں اپنے بھائیوں کے قتل و غارت کی وحشتناک خبریں سن کر صوبۂ سرحد کے غیور قبائلی پٹھان ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کشمیر پہنچ گئے۔ ادھر کشمیر کے مسلمان مجاہدین آزادی بھی اٹھ کھڑے ہوے اور انھوں نے جانیں ہتھیلی پر رکھ کر ریاست کے بہت بڑے حصے کو مہاراجا کے چنگل سے آزاد کرا لیا۔ مسلم کانفرنس کی زیر نگرانی ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آزاد جموں و کشمیر حکومت قائم کر دی گئی اور سردار محمّد ابراہیم اس کے پہلے صدر مقرر ہوے۔

مہاراجا کی فوج اور پولیس اور متعدد ہندو تنظیموں کے مظالم کی وجہ سے ریاست بھر کے مسلمانوں نے بغاوت کر دی تھی۔ مہاراجا اپنی گھناؤنی سازش کو ناکام دیکھ کر اپنے خاندان سمیت بھاگ گیا اور بلا تامل ۲۶ جون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل بھارت سے ریاست کے بھارت سے الحاق کی درخواست کر دی اور نہ تو کشمیری مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم کانفرنس کی ۹ جولائی والی قرارداد اور نہ ۲۴ اکتوبر کو قائم ہونے والی آزاد جموں و کشمیر حکومت ہی کو در خور اعتنا سمجھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بھ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

بھلا دیا کہ ریاستوں کے الحاق کے بارے میں اس نے ۲۵ جولائی کو کیا مشورہ دیا تھا [رک بہ پاکستان]۔ وہ اب ہر لحاظ سے بھارتی گورنر جنرل تھا اور مکمل طور پر آل انڈیا نیشنل کانگرس کے زیر اثر ہو چکا تھا، جو پاکستان کے وجود تک کو برداشت نہیں کر سکتی تھی اور جس نے ریاست جونا گڑھ کے پاکستان سے الحاق کو اس لیے برداشت نہ کیا کہ وہاں کی آبادی کی غالب اکثریت ہندو تھی اور ریاست کشمیر کا اس لیے بھارت سے الحاق چاہتی تھی کہ یہاں کا حکمران ہندو تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے فوراً مہاراجا کی درخواست منظور کر لی؛ چنانچہ اگلے روز، یعنی ۲۷ اکتوبر کو ۹ بجے صبح بھارتی فوج ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر میں اتر گئی اور مجاہدین آزادی کے خلاف لڑائی شروع کر دی۔ یہ ایک مسلمہ سازش تھی اور اسی کی بنا پر ریڈ کلف ایوارڈ میں نا انصافی کرکے گورداسپور کا مسلم اکثریت والا علاقہ بھارت کو دے دیا گیا تھا تاکہ بھارت کو کشمیر تک راستہ مل سکے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے بیرونی ممالک کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ اس الحاق کو عوامی تائید بھی حاصل ہے، شیخ محمد عبداللہ کو استعمال کیا، جن کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ آزادی کشمیر کے سلسلے میں شیخ عبداللہ نے جو مثبت کردار انجام دیا تھا اسے قطعاً فراموش کرکے وہ اس مہاراجا کے وزیراعظم بن گئے جسے وہ ریاست کا جائز حاکم نہیں سمجھتے تھے۔

ریاست کشمیر کا پاکستان کے ساتھ معاہدۂ قائمہ موجود تھا۔ حکومت پاکستان کے نزدیک بھارت سے اس کے الحاق کی کوئی قانونی اور اخلاقی حیثیت نہیں تھی۔ بھارتی حکومت نے اپنی فوج بھیج کر ریاست پر بزور قبضہ کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح نے اس کے جواب میں اپنی افواج کشمیر میں داخل کرنے کا حکم دیا، لیکن چونکہ ابھی پاکستان اور بھارت کی افواج مشترکہ طور پر لارڈ آکن لیک کے زیر کمان تھیں، اس لیے پاکستانی افواج کے انگریز سربراہ جنرل گلیسی نے تعمیل سے انکار کر دیا۔ اگر قائداعظم کے حکم کی تعمیل ہو جاتی تو وادی کشمیر پر پاکستان اپنے قدم جما لیتا اور کشمیری عوام کی خواہش کے مطابق مسئلۂ کشمیر کب کا طے ہو چکا ہوتا۔ بھارت نے یہ تاثر دیا کہ یہ مسئلہ رائے شماری کے ذریعے طے کرایا جائے گا، مگر اس کی کوشش تھی کہ پہلے تمام کشمیر پر قبضہ کر لے؛ لیکن آزاد کشمیر کی جیالی فوج نے بھارت کے اس ارادے کو ناکام بنا دیا۔ اپنی فوج کو شکست خوردہ دیکھ کر بھارت نے یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو مسئلۂ کشمیر سلامتی کونسل میں پیش کر دیا اور پاکستان پر الزام لگایا کہ وہ قبائلی حملہ آوروں کی مدد کر رہا ہے۔ پاکستان نے ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو بھارت کے الزامات کا جواب اور ایک جوابی شکایت سلامتی کونسل کے سامنے پیش کی اور یہ تجویز سامنے رکھی کہ غیر ریاستی لوگوں کو واپس بلا کر ریاست کے مہاجرین کو وہاں دوبارہ آباد کیا جائے اور غیر جانبدار اور نمائندہ حکومت قائم کرکے اقوام متحدہ کی نگرانی میں الحاق کے مسئلے پر ریاست میں استصواب کرایا جائے۔ اس کے بعد بحث و تمحیص گفت و شنید اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور انجام کار ۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی، جس کی رو سے پانچ ارکان پر مشتمل "کمیشن اقوام متحدہ برائے پاک و ہند" متعین ہوا، جسے واضح ہدایات دے کر ریاست میں استصواب کے لیے سازگار حالات پیدا

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کرنے کی ذمّے داری سونپی گئی ۔ کمیشن جنیوا میں اپنے اجلاس کے بعد برصغیر آیا اور ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کو اپنی پہلی قرارداد منظور کی، جس میں جنگ بندی اور فوجوں کے انخلا کی تفصیلات تھیں اور استصواب ہی کو مسئلے کا حل قرار دیا گیا تھا؛ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی عمل میں آ گئی ۔ کمیشن نے اپنی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء والی قرارداد کے ضمیمے کے طور پر ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کو ایک اور قرارداد منظور کی، جس میں ریاست جموں و کشمیر کے بھارت یا پاکستان سے الحاق کے مسئلے پر رائے شماری کے لیے ناظم رائے شماری کے تقرر کے متعلق تفصیلات درج تھیں ۔ یہ دونوں قراردادیں کشمیر پر عالمی معاہدے کی بنیاد ہیں اور بھارت، پاکستان اور اقوام متحدہ تینوں ان پر عملدرآمد کرانے کی ذمّے دار ہیں اور بھارت ان دونوں قراردادوں کو باقاعدہ طور پر منظور کر چکا ہے ۔

ان قراردادوں نے مسئلۂ کشمیر کے منصفانہ حل کی راہ ہموار کر دی تھی، مگر بھارت جوع الارض کے مرض کا شکار تھا ۔ اسی بنا پر اس کی حکمت عملی میں واضح طور پر تضاد موجود تھا؛ چنانچہ اس نے بڑی دیدہ دلیری سے جونا گڑھ، اور حیدر آباد کی ریاستوں پر قبضہ کر لیا تھا ۔ ریاست جموں و کشمیر کے متعلق بھی اس کے یہی ارادے تھے ۔ مذکورۂ بالا حالات کے علاوہ اس کی راہ میں وہ بنیادی اصول بھی حائل تھا جس کی بنا پر برصغیر کی تقسیم ہوئی تھی اور وہ یہ تھا کہ مسلم اکثریت کے ملحقہ علاقے پاکستان میں اور ہندو اکثریت کے ملحقہ علاقے ہندوستان میں شامل ہوں گے ۔ اب ریاست جموں و کشمیر مسلم اکثریت والا علاقہ تھا اور جغرافیائی طور پر پاکستان سے ملحق تھا ۔

اقوام متحدہ میں مسئلۂ کشمیر کو لے جانے سے بھارت کی اصل غرض یہ تھی کہ آزاد کشمیر کی کفن بردوش فوج اس کی نرغے میں آئی ہوئی بددل فوج کا قلع قمع نہ کر دے اور جنگ بندی کرانے کے بعد فرصت مل جانے پر وہ حیل و حجت سے کام لے کر اس مسئلے کو لاینحل بنا دے اور جو علاقہ اس کے قبضے میں ہے کم از کم اسے ہمیشہ کے لیے ہتیالے ۔ اقوام متحدہ نے ناظم رائے شماری بھی مقرر کیا، بعد میں اپنے نمائندے بھی بھیجے، لیکن کسی نہ کسی بہانے بھارت فوجوں کے انخلا کے مسئلے کو ٹالتا رہا ۔ پاکستان اور بھارت کے باہمی مذاکرات بھی ہوئے، لیکن کوئی نتیجہ خیز بات نہ ہوئی ۔ الٹا پاکستان کے احتجاج کے باوجود بھارت مقبوضہ کشمیر پر اپنی گرفت مضبوط کرتا چلا گیا ۔ اس دوران میں ۱۹۶۲ء میں چین کے ہاتھوں نیفا میں بھارت کی پٹائی ہوئی ۔ اس موقع پر پاکستان کشمیر پر قبضہ کر کے کشمیری عوام کی امنگوں کو پورا کر سکتا تھا، مگر صدر پاکستان نے مصیبت زدہ دشمن کی پیٹھ میں چھرا بھونکنے سے دریغ کیا ۔ چین کے مقابلے میں بھارت کی ہر طرح امداد کرنے کے لیے روس اور امریکہ دونوں میدان عمل میں آ گئے ۔ بین الاقوامی سیاست کو اس طرح اپنے حق میں دیکھ کر ۱۹۶۴ء میں سلامتی کونسل میں بھارتی مندوب نے صاف صاف کہ دیا کہ بھارتی حکومت ریاست کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے جو کچھ ممکن ہو سکا کرے گی اور اس امر سے اسے کوئی طاقت نہیں روک سکتی ۔ یہ اسی بھارت کے رویے میں تبدیلی تھی جو شروع ہی سے ریاست جموں و کشمیر کے اپنے ساتھ الحاق کو عارضی کہتا چلا آتا تھا اور استصواب کو اس مسئلے کا حل تسلیم کرتا تھا ۔ اس سلسلے میں ۱۹۵۷ء سے بھارت کو روس کی کھلی کھلی تائید حاصل ہو چکی تھی، چنانچہ الٹی سیدھی

www.besturdubooks.wordpress.com

تعبیرات کو چھوڑ کر ۱۹۶۲ء میں سلامتی کونسل میں بھارت نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ بھارت سے کشمیر کا الحاق حتمی اور آخری ہے اور بھارت کشمیر کا ایک لازمی حصہ ہے۔

بھارت کی اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر میں ہر جگہ لوگ سخت مایوس ہوئے۔ سلامتی کونسل کی بے چارگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۹۵۷ اور ۱۹۶۲ء میں روس نے ویٹو استعمال کرکے مسئلۂ کشمیر کے تصفیے کے متعلق کوئی ٹھوس قرارداد پاس نہیں ہونے دی تھی۔ بھارت نے تمام بین الاقوامی معاہدوں کو پس پشت ڈال کر ۱۹۶۴ء میں بھارتی آئین کو کشمیر پر عائد کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ ریاست کو بھارت کے دیگر عام صوبوں کی سطح پر لا سکے۔ ان تمام واقعات کا یہ نتیجہ نکلا کہ جموں وکشمیر کے عوام نے بھارتی استعمار کے خلاف ہتیار اٹھا لیے۔ طاقت کے نشے میں بھارت نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بین الاقوامی سرحد عبور کرکے لاہور پر حملہ کر دیا اور اس کا جواز یہ پیش کیا کہ پاکستان نے کشمیر میں تخریب کار بھیجے ہیں۔ چونڈہ کے محاذ پر ٹینکوں کی تاریخ کی سب سے بڑی جنگ لڑی گئی۔ پاکستان نے کشمیر میں چھمب اور جوڑیاں کا علاقہ بھارت سے آزاد کرا لیا۔ اگر دیکھا جائے تو ایک اعتبار سے یہ خطرناک جنگ مسئلہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی بے حسی اور بے اثری کی وجہ سے لڑی گئی۔ سلامتی کونسل نے آخر ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو مسئلۂ کشمیر کو حل کرنے کی طرف کوئی قدم اٹھانے کے بجائے جنگ بندی کرا دی۔ جنوری ۱۹۶۶ء کے اوائل میں روس کے وزیراعظم مسٹر کوسیگن کی دعوت پر بھارتی وزیراعظم اور صدر پاکستان نے تاشقند میں ملاقات کی اور ۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو اعلان تاشقند جاری ہوا، جس کی بنا پر دونوں ممالک کی افواج ۵ اگست ۱۹۶۵ء کی پوزیشنوں پر واپس چلی گئیں اور کشمیر کے اصل مسئلے کے متعلق صرف یہ کہا گیا کہ دونوں ملک باہمی جھگڑے طاقت کے بل بوتے پر نہیں، پر امن طریقوں سے حل کریں۔ اس اعلان پر وزیر اعظم بھارت، صدر پاکستان اور روسی وزیر اعظم تینوں کے دستخط تھے۔ ظاہر ہے کشمیر کا مسئلہ کھٹائی میں ڈال دیا گیا اور لاکھوں کشمیری ایک بار پھر بڑی بے تابی سے اس دن کا انتظار کرنے لگے جب اقوام متحدہ ان کی قومی امنگوں کا احترام کرتے ہوئے مسئلۂ کشمیر کا آبرومندانہ حل تلاش کرے گی اور وہ پنجۂ استبداد سے آزادی حاصل کریں گے۔

۱۹۷۱ء میں بھارت نے ایک بار پھر کھلم کھلا جارحیت کا ارتکاب کیا۔ اس جنگ میں عملی طور پر اسے روس کی پوری حمایت و اعانت حاصل تھی؛ چنانچہ مشرقی پاکستان علٰحدہ کر دیا گیا، پاکستان کے نوے ہزار فوجی بھارت کی قید میں چلے گئے اور پاکستان کے پانچ ہزار مربع میل علاقے پر بھارت کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۹۷۲ء میں شملہ کانفرنس ہوئی۔ شملہ معاہدے میں تنازع کشمیر کا ذکر بھی آیا اور تسلیم کیا گیا کہ یہ دونوں ممالک کے مابین متنازع فیہ مسائل میں سے ایک ہے، جس کا حل باہمی مذاکرات کے ذریعے کرنا چاہیے۔ اس طرح کشمیر کا مسئلہ دوبارہ زندہ ہو گیا۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے اعلانات کے مطابق اس وقت پاکستان کا موقف یہ ہے کہ مسئلۂ کشمیر اصولی حیثیت رکھتا ہے اور پاکستان اصولوں پر سمجھوتا نہیں کر سکتا۔ اب (ستمبر ۱۹۷۹ء) بھارت اور پاکستان کے درمیان تقریباً تمام مسائل گفت و شنید کے ذریعے طے کر لیے گئے ہیں۔ دونوں ممالک میں سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ہو چکے ہیں اور توقع ہے کہ کشمیر کا مسئلہ بھی وہاں کے عوام کی خواہشوں اور امنگوں کے مطابق حل کر لیا جائے گا۔

کشمیر میں اشاعت اسلام: مسلمانوں کی آمد سے قبل ریاست جموں و کشمیر اور اس کے ملحقات کے باشندوں کا تعلق ہندو یا بدھ مذہب سے تھا۔ ان کا اسلام قبول کرنا اس لحاظ سے خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ محمد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین محمد غوری یا بابر جیسے نامور فاتحین اسلام میں سے کسی نے اس علاقے پر فاتحانہ یلغار نہیں کی۔ سب سے پہلے ۱۵۳۱ء میں شہزادۂ کامران تیس ہزار کا لشکر لے کر پیر پنجال پر واقع قصبۂ نوشہرہ کے راستے کشمیر پر حملہ آور ہوا اور اس کے دو جرنیل محرم بیگ اور علی بیگ سرینگر کے قرب و جوار میں پہنچ گئے۔ علاوہ بریں اسی سال کے لگ بھگ میرزا دو غلات [رک بآں] بھی ابو سعید میرزا والی کاشغر کے ملازم کے طور پر لداخ کو فتح کر کے کشمیر آیا اور بعد میں ۱۵۴۰ء میں اسی نے کشمیر ہمایوں کے نام پر فتح کر لیا۔ اسی فتح کو اپنا استحقاق قرار دے کر اور وقتی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۵۸۶ء میں جلال الدین اکبر نے کشمیر کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا۔ بایں ہمہ تاریخ شاہد ہے کہ مغلوں کی ان فتوحات سے پہلے پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر ہی میں یہاں کے باشندوں کی اکثریت مشرف باسلام ہو چکی تھی۔ یہاں کے ہندوؤں اور بدھوں کا بلا جبر و اکراہ اور بطیب خاطر جماعتی طور پر قبول اسلام ایک معجزے سے کم نہیں۔ ہم دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ کیسے وقوع پذیر ہوا۔

معلوم ہوتا ہے اہل کشمیر کا ابتدائی مذہب ناگ پوجا، یعنی سانپ کی پرستش تھا۔ بعد میں انھوں نے بدھ مذہب اختیار کیا، چنانچہ ۱۰۰ء میں مہاراجہ کنشک نے کشمیر کے ایک مشہور وہار میں بدھوں کی تیسری تاریخی مجلس منعقد کرائی۔ بعد میں یہاں شیومت کا اجرا ہوا، جو ایک طرح کی وحدت پرستی (Monism) تھی۔ اسلام جب یہاں پہنچا تو اس کا سامنا زیادہ تر شیو مت ہی سے ہوا۔ پہلا مسلمان حمیم شامی تھا جو ۷۱۲ء میں کشمیر میں داخل ہوا۔ وہ راجا داہر کے بیٹے جے سیہ کے ساتھ کشمیر کے راجا کے پاس غالباً اس مقام پر پہنچا جو آج کل کار کہار کہلاتا ہے اور ضلع جہلم میں واقع ہے، لیکن ان دنوں کشمیر میں شامل تھا۔ جے سیہ کو کشمیر کے راجا نے اس علاقے کی حکمرانی عطا کی۔ اس کے مرنے پر حمیم شامی جانشین ہوا، جس نے یہاں متعدد مسجدیں تعمیر کرائیں۔ ۷۳۳ء کے قریب کشمیر کے راجا للتا دتیہ کے عہد میں عرب سندھ کی طرف سے بڑھے تو اس نے فغفور چین کو امداد کے لیے لکھا۔ امداد تو نہ پہنچی، مگر راجا کی مساعی سے عربوں کی پیش قدمی رک گئی۔ خلیفہ منصور کے عہد (۷۵۴ تا ۷۷۵ء) میں ہشام بن عمرو التغلبی سندھ کا والی مقرر ہوا۔ اس نے بھی کشمیر پر حملہ کیا، لیکن کشمیر میں داخل نہ ہو سکا۔ گلگت پر ۷۵۱ء سے عربوں کا قبضہ تھا، جسے عربوں نے دوسرے مقبوضات کے ساتھ فغفور چین کو شکست دے کر حاصل کیا تھا۔ مسلمان فاتح کے طور پر تو کشمیر میں داخل نہ ہو سکے، لیکن مذکورۂ بالا حمیم شامی کے بعد مسلمان تاجر اور سپاہی کشمیر میں بکثرت آنے لگے۔ للتادتیہ کے لڑکے اور جانشین وجرادتیہ نے ملک میں ایسے کام کیے جن سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا۔ بعد میں ہرش (۱۰۸۹ تا ۱۱۰۱ء) نے ترک سپاہی ملازم رکھے اور مسلمانوں کے لباس اور زیورات استعمال کیے۔

www.besturdubooks.wordpress.com

اس سے پہلے محمود غزنوی نے دو بار کشمیر پر حملہ کیا تھا، لیکن سردی کی وجہ سے ناکام رہا۔ بھکشا چر کے عہد (۱۱۲۰ تا ۱۱۳۱ء) میں مسلمان سپاہی دوبارہ ملازم رکھے گئے؛ چنانچہ مشہور سیاح مارکو پولو لکھتا ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں کشمیر میں مسلمانوں کی ایک باقاعدہ آبادی تھی اور وادی کے لوگ گوشت کھانا چاہتے تو وہاں کے مسلمان ان کے لیے جانور ذبح کر دیتے تھے۔ تبلیغ اسلام تو ابھی شروع نہیں ہوئی تھی، لیکن وادی کے لوگ مسلمانوں کے صاف ستھرے لباس، خوراک اور رہن سہن کے پاکیزہ طریقے سے متاثر ہو چکے تھے۔

کشمیر میں سب سے پہلے جس شخص نے اسلام قبول کیا وہ لداخ کا ایک باہمت اور قابل سردار رنچن تھا، جس نے زولجو ترکستانی کی پیدا کی ہوئی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر ۱۳۲۰ء میں یہاں کی حکومت پر قبضہ کر لیا اور ۲۵ نومبر ۱۳۲۳ء تک بڑی دانمشندی، عدل و انصاف اور روا داری کے ساتھ فرمانروائی کرتا رہا۔ سری نگر میں وہ علی کدل اور نوکدل کے درمیان مدفون ہے۔ اپنی روحانی تشنگی کو بجھانے کے لیے وہ اکثر پڑھے لکھے ہندوؤں اور بدھ پروہتوں کو بلا کر ان سے مذہب کے متعلق سوالات کیا کرتا تھا، لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے روحانی اضطراب کو رفع نہ کر سکا۔ اسی اثنا میں اس کی ملاقات سلسلۂ سہروردیہ کے ایک بزرگ شاہ نعمت اللہ فارسی کے ایک مرید سیّد شرف الدّین المعروف بہ بلبل شاہ سے ہوئی، جو منگولوں کے خوف سے ایک ہزار پناہ گزینوں کے ساتھ ترکستان سے کشمیر آ گئے تھے۔ رنچن نے بلبل شاہ سے اسلام کے متعلق معلومات حاصل کیں اور اسلامی تعلیمات کی سادگی اور مسلمانوں کے طریق عبادت سے بڑا متاثر ہوا اور یہ دیکھ کر کہ اسلام میں نہ تو رسم پرستی ہے، نہ ذات پات کی بندش ہے اور نہ کسی مخصوص مذہبی طبقے کا اقتدار اور غلبہ ہی ہے، وہ مشرف با سلام ہو گیا اور صدر الدّین نام اختیار کیا۔ اس کے سالے راون چندر نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ پھر ان کی تقلید میں اور لوگوں نے بھی آغوش اسلام میں پناہ لینی شروع کر دی۔ کشمیر میں ابھی تک ہندو اپنا معاشرتی نظام پوری طرح قائم نہیں کر پائے تھے، اس لیے معاشرتی سطح پر نو مسلموں کو کوئی خاص دقت پیش نہ آئی۔ رنچن سے پہلے سہدیو کے عہد (۱۳۰۰ تا ۱۳۲۰ء) میں کشمیر شرابیوں، جواریوں اور بدکاروں کا ملک بن چکا تھا۔ رنچن کے قبول اسلام کے بعد کشمیر میں ایک نیا دور شروع ہوا اور وہاں اخلاقی اعتبار سے ایک عظیم الشان انقلاب آ گیا۔ رنچن بلبل شاہ کی پاکیزہ اور مقدس سیرت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنے محل کے پاس جہلم کے کنارے ان کے لیے ایک خانقاہ بنوائی اور اس میں ایک مسجد تعمیر کرائی، جس میں وہ نماز پنج گانہ ادا کرتا تھا۔ یہ وادی کشمیر کی پہلی مسجد تھی۔

یہ تو کشمیر کا ذکر تھا، لیکن دریائے سندھ کے کنارے درد قبائل رنچن کے قبول اسلام سے دو صدی پہلے، یعنی بارھویں صدی عیسوی ہی میں بدھ مت چھوڑ کر تیزی سے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے تھے۔ رنچن کے مسلمان ہونے سے کشمیر کی سیاسی اور ثقافتی زندگی میں کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ ملک آزاد تھا، حکومت پر برھمنوں کا تسلط تھا اور سنسکرت سرکاری زبان تھی۔ مسلمانوں نے بھی سنسکرت سیکھی، یہاں تک کہ اب بھی اس زمانے کی بعض قبروں پر سنسکرت کے کتبے ملتے ہیں اور اسمائے معرفہ پر بھی سنسکرت کا اثر نظر آتا ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ اپنے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

واضح قوانین کی وجہ سے اسلام نے بہت جلد سابقہ ہندو معاشرے کو متاثر کرکے ایک نئے اسلامی معاشرے کی تشکیل شروع کر دی۔ ہنود کا اعلیٰ طبقہ اسلامی تعلیمات کی پاکیزگی اور سادگی سے متاثر ہوا تو ادنیٰ طبقہ مساوات اسلامی اور معاشرے میں باعزت مقام ملنے سے خوش ہوا۔ الغرض فکری اور عملی لحاظ سے اسلام کا نظریۂ توحید ہر ایک کے لیے باعث کشش تھا۔

شرف الدّین بلبل شاہؒ کے بعد کئی اور بزرگ کشمیر میں تبلیغ اسلام کے لیے تشریف لائے، جن میں سیّد جلال الدّین بخاریؒ (۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء) اور سیّد تاج الدّینؒ اور ان کے ہمراہی سیّد حسین سمنانیؒ اور سیّد یوسفؒ قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں کی بدولت بہت سے کشمیری اسلام سے متعارف ہوے؛ مگر جس بزرگ نے صحیح معنوں میں عقیدۂ توحید ان کے دلوں میں راسخ کیا وہ علی ثانی امیر کبیر سیّد علی ہمدانیؒ المعروف بہ شاہ ہمدان تھے، جو سہروردیہ سلسلے کی کبرویہ شاخ کے نامور بزرگ تھے۔ دولت شاہ انھیں تیموری دور کا سلطان العرفا والسادات لکھتا ہے۔

سیّد علی ہمدانیؒ کا تعلق ہمدان کے حسنی سادات کے ایک معروف گھرانے سے تھا۔ علوم معقول و منقول کی تحصیل کے بعد وہ تہذیب نفس اور عرفان حقیقت کے ادراک کے لیے چھے سال تک خلوت گزیں ہو کر ذکر و مراقبہ اور ریاضت و عبادت میں مصروف رہے۔ پھر اکیس سال تک انھوں نے بلاد اسلامیہ کے علاوہ دیگر ممالک کی سیر و سیاحت کی اور سیکڑوں اولیاے کرام سے افاضہ و استفاضہ کیا۔ یہ زمانہ امیر تیمور کی ابتدائی یلغاروں کا تھا۔ ماوراء النہر میں اس سے اختلاف ہوا تو وہ سات سو سادات اور مریدوں سمیت ربیع الاوّل ۷۷۴ھ/۱۳۷۲ء میں کشمیر تشریف لے آئے۔ چھے ماہ کشمیر میں گزارنے کے بعد وہ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے چلے گئے، جہاں سے ۷۸۱ھ/۱۳۷۹ء میں لوٹے۔ تقریباً اڑھائی سال یہاں قیام کیا اور پھر لداخ کے راستے ترکستان تشریف لے گئے۔ شاہ ہمدانؒ کا کشمیر میں تیسری بار ورود ۷۸۵ھ/۱۳۸۳ء میں ہوا، لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے انھیں جلد ہی کشمیر کو خیرباد کہنا پڑا۔ پکھلی کے حاکم سلطان محمّد کی درخواست پر وہاں دس روز مقیم رہنے کے بعد وہ کافرستان میں کنار پہنچے تو مرض کا پھر حملہ ہوا اور وہاں ۵ ذی الحجہ ۷۸۶ھ/۱۸ جنوری ۱۳۸۵ء کو ان کا وصال ہو گیا۔ ختلان میں کولاب کے مقام پر ان کا مقبرہ آج مرجع خلائق ہے۔ سری نگر کے عین قلب میں ان کی خانقاہِ معلّٰی ان کے فرزند میر محمّد نے تعمیر کرائی، جو شاہ ہمدان کی مسجد اور زیارت کہلاتی ہے۔ ان کے ہمراہیوں نے بھی متعدد خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ یہ کشمیر میں تبلیغ اسلام کے بہت بڑے مرکز تھے۔ شاہ ہمدان کی تشریف آوری کے وقت عوام اور والیِ کشمیر ابھی تک ہندو عقیدوں کو اپنائے ہوے تھے، بت خانوں میں آمد و رفت اور برہمنوں کی تکریم بدستور جاری تھی اور حاکم غیر اسلامی لباس پہنتے اور غیر شرعی امور پر کاربند تھے۔ ان کی فہمائش پر حاکم نے ہندوانہ لباس ترک کرکے شاہان ترک کی مانند لمبا چغہ پہننا شروع کیا، احکام شریعت کا رواج ہوا اور ہر طرف اسلامی روح کا ذوق و شوق پیدا ہو گیا۔ شاہ ہمدان نے آتے ہی دو ہندو سنیاسیوں کو مسلمان کیا۔ اس کے بعد لوگ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوے۔ شاہ ہمدان ایک اچھے انشا پرداز اور شاعر بھی تھے۔ تحائف الابرار میں ان کے ۱۷۰ رسائل کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں سے ستر سے زیادہ تصنیفات کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ذخیرۃ الملوک کا لاطینی، فرانسیسی،

www.besturdubooks.wordpress.com

ترکی اور اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان تمام رسائل کا مقصد انسانی اخلاقیات کی تبلیغ اور امراض نفسانی کی تشخیص اور ان کا علاج ہے۔ شاہ ہمدانؒ کے اشعار میں جذبۂ عشق جاری و ساری ہے اور روحانی واردات اصطلاحات میں بیان کی گئی ہیں اور وہ ابن العربیؒ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ شاہ ہمدان کی وجہ سے دستی صنعتوں کو بھی فروغ حاصل ہوا اور علامہ اقبال کے قول کے مطابق دل پذیر اور عجیب و غریب صناعی سے کشمیر کو ایران صغیر بنا دیا۔ شاہ ہمدانؒ نے فی الواقع کشمیر میں ذہنی، فکری اور نظری انقلاب پیدا کیا اور اسے علم، صنعت، تہذیب اور دین کا عطیہ دیا۔ وہ حقیقی معنوں میں کشمیر کے ولی، صوفی اور رہنما ہیں۔

شاہ ہمدانؒ اور ان کے پاکیزہ سیرت ہمراہیوں کی وجہ سے چودھویں صدی عیسوی (بالخصوص اس کے ربع آخر) میں ایک عجیب مذہبی فضا پیدا ہوئی۔ ان ایام میں مشہور صوفی خاتون للّہ عارفہ کی بڑی شہرت ہوئی۔ اسی زمانے میں شیخ نور الدّینؒ ریشی جیسے تارک الدنیا بزرگ بھی پیدا ہوئے، جو کشمیر میں نندرشی کے نام سے مشہور ہیں اور کشمیر کے محافظ ولی (Patron-Saint) سمجھے جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ انھوں نے للّہ عارفہ کا ذودھ پیا تھا۔ ریشی نامہ اور نور نامہ میں ان کا ذکر اور ان کے ملفوظات موجود ہیں۔ انھوں نے ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء میں بعہد سلطان زین العابدین اعظم وفات پائی (تاریخ وفات "شمس العارفین" سے برآمد ہوتی ہے) اور سری نگر سے بیس میل جنوب مغرب میں چراڑ کے مقام پر مدفون ہوئے۔ کشمیر میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ افغان صوبیدار عطا محمّد خان نے ان کے نام کے سکّے ضرب کرائے۔ دنیا بھر کے اولیائے کرام میں غالباً شیخ نور الدّین ریشی واحد بزرگ ہیں جن کے نام کے سکّے رائج ہوئے۔

ان کے بعد ان کے اتباع میں ریشی بزرگوں کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہو گیا، جو انھیں ان کی طرح تارک الدنیا تھے اور عوام و خواص ان سے نور ایمان حاصل کرتے تھے۔ ان بزرگوں کی تقدیس اور نفس کشی کا ذکر ابو الفضل اکبر نامہ میں کرتا ہے اور جہانگیر اپنی توزک میں کہتا ہے کہ اس کے زمانے میں اس قسم کے دو ہزار بزرگ کشمیر میں موجود تھے۔ لوگ گروہ در گروہ اسلام قبول کرتے تھے اور نئے مذہب نے ان کے دلوں میں جو ولولہ اور جوش پیدا کیا تھا اس کی وجہ سے اپنے مندروں کو گراتے تھے، اس لیے کہ وہ بت پرستی کے مراکز تھے، اور ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کرکے ان میں خدائے واحد و لا شریک کی عبادت کرتے تھے۔

شاہ ہمدانؒ کے بعد ان کے فرزند میر محمّد ہمدانی تین سو سادات اور علمائے کبار کے ساتھ کشمیر تشریف لائے۔ ان کی وجہ سے بھی اس اسلامی تصوف کو فروغ حاصل ہوا جس کا دارومدار سر تا سر کتاب و سنت پر تھا۔ اسی بنا پر کشمیری مسلمان فقہ و تصوف کے لحاظ سے کافی حد تک افراط و تفریط سے بچ گئے۔ سلطان سکندر (۱۳۸۹ تا ۱۴۱۳ء) ان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتا تھا اور انھیں اپنا استاد اور مرشد سمجھتا تھا۔ ان کے زیر اثر سلطان نے ملک میں شرعی احکام کو سختی سے نافذ کیا، شراب اور دوسری خمریات کے استعمال کے علاوہ قمار بازی اور رقص و سرود کو ممنوع کر دیا (صرف طبل اور فوجی باجا بجانے کی اجازت تھی) اور شیخ الاسلام کا عہدہ قائم کیا تاکہ اسلامی قوانین کا نفاذ مناسب طور پر ہوتا رہے؛ شیخ الاسلام کے ذمّے ان اوقاف کے انتظام و انصرام کا کام بھی تھا جو سلطان نے مسافروں، علما، سادات اور غیر مستطیع اشخاص کے فائدے کے لیے قائم

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

کیے تھے ۔ سلطان نے مساجد اور خانقاہیں تعمیر کرائیں، بچوں کی تعلیم کے لیے مدرسے کھولے اور ستی کی رسم بند کرائی ۔ میر محمد ہمدانیؒ کے ہاتھ پر دیگر ہندوؤں کے علاوہ سلطان سکندر کا وزیراعلیٰ اور سپہ سالار سوہ بھٹ بھی مسلمان ہوا، جس کا نام سیف الدّین رکھا گیا ۔ سیف الدّین نے نو مسلم ہونے کے جوش میں مندر گرائے، جس کی بنا پر لوگ سکندر کو بت شکن کہتے ہیں ۔ میر محمد ہمدانی نے سوہ بھٹ کے اس جوش کو دیکھ کر لااکراہ فی الدّین کی تلقین کی اور دین کے سلسلے میں جبر و تشدد سے منع کیا ۔ میر صاحب مصنف بھی تھے ۔ انھوں نے رسالۂ سکندری کے علاوہ منطق پر بھی عربی میں ایک کتاب لکھی ۔ انھوں نے بیس سال کشمیر میں گزارے اور بمقام ختلان ۸۸۴ھ/۱۴۸۵ء میں وفات پائی ۔

سلطان سکندر کے بعد اس کے دوسرے بیٹے سلطان زین العابدین اعظم کے پچاس سالہ دور حکومت (۱۴۲۱ تا ۱۴۷۱ء) میں اسلام کے ساتھ اسلامی معاشرے کو مستحکم ہونے کا موقع ملا ۔ وہ ایک انصاف پسند حکمران تھا ۔ غیرمسلموں کے ساتھ اس کا برتاؤ منصفانہ اور روادارانہ تھا ۔ اس کے والد کے زمانے میں جن برہمنوں کو جبریہ مسلمان بنایا گیا تھا انھیں اجازت دے دی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنا آبائی مذہب دوبارہ اختیار کر سکتے ہیں ۔ اس نے برباد شدہ مندروں کی از سر نو مرمت کرائی اور غیر مسلموں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے انھیں اعلیٰ عہدے دیے ۔ وہ گوشت بھی نہیں کھاتا تھا، تاہم اسے اسلام سے فطری لگاؤ تھا اور وہ مذہبی فرائض کا سختی سے پابند تھا ۔ لوگ اسے ولی سمجھتے تھے ۔ زینہ لنکا میں اس نے چلہ کشی کی ۔ اس کی نگاہ کبھی نامحرم عورت پر نہ پڑی ۔ امور حکومت میں وہ شیخ الاسلام کے مشورے سے کام کرتا تھا ۔ اس نے علما اور مشائخ کو غیرممالک سے کشمیر میں آنے کی دعوت دی، متعدد مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں اور ایک دارالعلوم قائم کیا، جس کے صدرمدرس مولانا کبیر تھے ۔ اس میں نامور اساتذہ تعلیم دیا کرتے تھے اور طلبہ کے لیے دارالاقامہ تھا ۔ اس نے خود بھی تفسیر و حدیث مولانا کبیر سے پڑھی تھی ۔ کشمیر کا وہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے ایک ضابطۂ قانون بنایا ۔ قانون کے معاملے میں وہ اپنے بیٹے یا بھائی سے بھی رعایت نہ برتتا تھا ۔ اس کی انصاف پرستی اور رواداری کا یہ نتیجہ نکلا کہ برہمنوں نے بھی فارسی پڑھی ۔ سنسکرت کی کئی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں ہوا ۔ ادھر فارسی کی کتابوں کا بھی سنسکرت میں ترجمہ ہوا ۔ سلطان خود شاعر اور مصنف تھا ۔ اس نے فارسی زبان میں دو کتابیں لکھیں ۔ علاوہ بریں رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے بھی اس نے بہت سے کام کیے ۔ سلطنت بھی وسیع تھی ۔ ان تمام امور کی بنا پر اسے اہل کشمیر آج تک بڈشاہ [زک باں] کے لقب سے یاد کرتے ہیں، جس کا مطلب ہے بادشاہ اعظم ۔

۱۴۸۷ء میں شیخ شمس الدّین عراقی کشمیر میں آئے ۔ ان کی وجہ سے چک حکمرانوں نے شیعیت قبول کی ۔ اسی زمانے کے ایک اور صوفی بزرگ شیخ حمزہ مخدوم (م ۱۵۷۶ء) حدیث، تفسیر اور فقہ کے ممتاز عالم تھے ۔ ان کا مزار کوہ ماران کی ڈھلان پر ہے ۔ موسم بہار میں بادام کے درختوں پر پھول آتے ہیں تو ان کا عرس منعقد ہوتا ہے ۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت قائم ہوئی تو شاہنشاہ جلال الدّین اکبر نے ۱۵۸۶ء میں ریاست کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا، لیکن جیسا کہ پیشتر ازیں ذکر کیا جا چکا ہے اس الحاق سے پہلے پندرھویں صدی عیسوی ہی میں خاندان شاہ میر کے زمانے میں مسلمانوں کی یہاں اکثریت ہو چکی تھی ۔ مشہور صوفی شیخ یعقوب صرفی (م ۱۵۹۵ء) اکبری دور ہی میں

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

گزرے ہیں، جو فارسی زبان کے نامور شاعر بھی تھے جو شریعت کو طریقت سے الگ رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ انھیں کی شکایت پر اکبر فتح کشمیر کے لیے آمادہ ہوا تھا۔ اسی عہد میں یہاں بابا بھائی وال بھی تھے جن کی خدمت میں حضرت باقی باللہ (م ۱۶۰۳ء) حاضر ہوئے تھے۔ مغول کے زمانے میں نقشبندی بزرگوں نے کشمیر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور ترویج میں بڑا حصہ لیا۔ خواجہ کمال الدین نقشبندی شریعت و طریقت کی پابندی پر زور دیتے تھے۔ انھوں نے ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء میں شہادت پائی۔ نقشبندی سلسلے کے جامع کمالات بزرگوں میں خواجہ نورالدین محمد آفتاب کشمیری (م ۱۶۷۵ء)، شیخ شرف الدین محمد کشمیری (م ۱۷۵۷ء) اور شاہ محمد صادق قلندر (م ۱۷۵۷ء) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں بھی باہر سے علمائے اسلام کا کشمیر میں ورود ہوتا رہا۔ حضرت عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں سے شاہ فرید الدین قادری ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء میں وادی کشتوار میں تبلیغ کے لیے آئے۔ ان کی سعی سے وہاں کے راجہ کرت سنگھ نے اسلام قبول کیا اور اورنگ زیب عالمگیر نے اس کا نام سعادت یار خان رکھا۔ شاہ فرید الدین کے بعد ان کے فاضل فرزند اخیار الدین (م ۱۷۲۵ء) نے اپنے والد کے کام کو جاری رکھا۔ مغول دور میں ایک اور بزرگ ملّا شاہ قادری (م ۱۶۶۱ء) نے بھی کشمیر میں قابل قدر کام کیا ہے۔ وہ حضرت میاں میر قادری لاہوری (م ۱۶۳۵ء) کے خلیفہ تھے۔ خرقۂ خلافت پہننے کے بعد کشمیر میں توطن اختیار کیا۔ وہ اکثر وقت تبلیغ اسلام میں صرف کیا کرتے تھے، جس سے متاثر ہو کر بہت سے ہندو حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ وہ صاحب تصنیف بزرگ تھے اور شاعر بھی تھے۔ متاخر مغول شہنشاہوں کے زمانے میں بھی اولیائے کرام نے تبلیغ اسلام کا سلسلہ جاری رکھا، چنانچہ مقبوضہ کشمیر کے موجودہ وزیراعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کے جدّ اعلیٰ نے میر عبد الرّشید بیہقی (م ۱۷۶۶ء) کی تبلیغ سے اسلام قبول کیا اور اس کا نام شیخ عبداللہ رکھا گیا۔ ڈوگرا راج کے دوران میں بھی ایک قابل ذکر شخص وریام سنگھ تحصیلدار، شاہ عبدالرحیم صفاپوری کی تبلیغ سے دولت اسلام سے بہرہ ور ہوا۔ سہروردی، ریشی، نقشبندی اور قادری بزرگوں کے علاوہ سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں کے اثرات بھی وادی کشمیر میں نظر آتے ہیں۔ جلالپور (ضلع جہلم) کے سیّد غلام حیدر شاہ چشتی [رکّ بآں] (م ۱۹۰۸ء)، سے جو اسوۂ نبوی کے مقلد اور اخلاق احمدی کا نمونہ تھے، وادیِ کشمیر کے لوگ بھاری تعداد میں ان سے مستفیض ہوئے۔ ان کے پوتے ابو البرکات محمد سیّد فضل شاہ (م ۱۹۶۶ء) نے جو اعلیٰ درجے کے خطیب اور مصنف بھی تھے، یہ فیض جاری رکھا، انھوں نے کئی برس تک وادی کشمیر کا دورہ کیا اور ذکر حبیب کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں حقیقت تصوف اور اپنے جد بزرگوار کی سیرت عالمانہ انداز میں بیان کی۔ مرور ایام سے کشمیری مسلمان مزارات و مقابر سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ ان اولیائے کرام کے مرقد تھے جو اسلام کا پاکیزہ نمونہ بن کر کشمیر میں آئے اور پرامن طریقے سے اہل کشمیر کو روح اسلام سے بہرہ ور کیا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے موقع پر جہاد کشمیر شروع ہوا تو ان کی جماعت حزب اللہ کے رضا کار کرناہ، اوڑی اور ٹیٹوال کے محاذ پر لڑتے رہے۔

کشمیر کے نامور علما میں سے یعقوب صرفی کا ذکر اولیائے کرام کے ضمن میں بھی آ چکا ہے۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

وہ صحیح بخاری کے شارح تھے اور انھوں نے حاشیہ توضیح تلویح کے علاوہ فیضی کی تفسیر سواطع الالہام کی عربی میں تقریظ بھی لکھی۔ فارسی میں مغازی النبی بھی ان کی تصنیف ہے۔ اخوند ملّا کمال عربی اور دینی علوم میں اتنی فضیلت رکھتے تھے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی، سیالکوٹ میں ان سے مستفید ہوئے۔ فتاوی عالمگیری تیار کرنے والے علما میں مولوی خیر الدّین ابو الخیر کشمیری بھی شامل تھے۔ آگے چل کر فرخ سیر نے فتاوی عالمگیری کے ترجمے کے لیے ایک کشمیری ملّا عبیداللہ کو مقرر کیا۔ ملّا محمّد سعید گنددسو دوم نے مفاتیح البرکات کے نام سے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ انھیں صحیح بخاری زبانی یاد تھی اور بخاری کے نام سے مشہور تھے۔ شیخ حمزہ مخدومی بڑے فاضل بزرگ تھے۔ تیراہ کے شاہ محمّد تنولی نے ان سے اکتساب فیض کیا۔ خواجہ محمّد ٹوپی گر کے علم و فضل کی اتنی شہرت تھی کہ بیرون کشمیر سے طالب علم بھی ان کے پاس آتے اور صرف نحوی بن کر واپس جاتے۔ حاجی محمّد کشمیری فقہ اور حدیث کے نامی عالم تھے، انھوں نے شمائل ترمذی، عقائد العضدیہ اور حصن حصین کی شرحیں اور فارسی میں تفسیر القرآن لکھی۔ مولوی چراغ علی، جن کی عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں تصانیف موجود ہیں، سری نگر سے پنجاب چلے آئے تھے۔ مولوی جلال الدّین نے عربی میں فقہ کی مشہور کتاب درمختار کی شرح لکھی۔ آغا سیّد مہدی شیعہ عالم اور عربی و فارسی کی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مفتی صدر الدّین دہلوی کشمیری الاصل تھے۔ اسی طرح علامہ تفضل حسین کا شمار برصغیر کے مشہور علما میں ہوتا ہے۔ وہ عربی، فارسی، انگریزی میں مہارت رکھتے تھے۔ شیخ الحدیث مولانا محمّد انور شاہؒ کشمیری کئی برس تک دارالعلوم دیوبند کے مدرس اعلیٰ رہے۔ انھوں نے صحیح بخاری کی شرح چار جلدوں میں تالیف کی اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی تعریف میں کئی قصائد عربی زبان میں لکھے۔ میر واعظ مولوی رسول شاہ کو علوم دینی میں بڑی دسترس تھی ان کے تلامذہ میں مفتی محمّد شاہ سعادت کشمیری تھے، جو بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ برصغیر کے سب سے نامور شاعر حکیم مشرق علامہ اقبال [رک بآں] بھی کشمیری الاصل تھے۔

کشمیر میں علم طب پر بھی ایک جامع کتاب کفایۂ منصوری کے نام سے لکھی گئی جو ہندوستان میں کئی بار چھپ چکی ہے۔ اس کے مصنف منصور بن محمّد بن احمد بن یوسف بن الیاس سلطان زین العابدین کے شاہی طبیب تھے۔

فارسی شعر و ادب اور مصوری کے سلسلے میں یہاں کچھ زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں۔ شبلی اور دوسرے مصنفین، ہند کی فارسی شاعری کے ضمن میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ ان میں غنی کاشمیری کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ دیگر شعرا کے لیے دیکھیے غلام محی الدّین صوفی Kashir، ۲ : ۴۴۶ ببعد۔ اسی طرح کشمیری زبان کی شاعری کے لیے دیکھیے وہی کتاب، ۲ : ۱۷ ببعد۔

اس کے علاوہ کشمیر کے قدرتی مناظر اور اہل کشمیر کی پیشہ ورانہ زندگی کے متعلق بھی دیکھیے : غلام محی الدّین صوفی : Kashir، ج ۲۔

مآخذ : (۱) محمّد الدّین فوق : مکمل تاریخ کشمیر، ج ۱، لاہور ۱۹۳۱ء و ج ۳، لاہور ۱۹۱۲ء؛ (۲) غلام محی الدّین صوفی : Kashir، ج ۱، لاہور ۱۹۴۸ء و ج ۲، لاہور ۱۹۴۹ء؛ (۳) محب الحسن : کشمیر سلاطین کے عہد

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

میں، مترجمۂ علی حماد عباسی، اعظم گڑھ ۱۹۶۷ء؛ (۴) *The Statesman's Year - Book 1975 - 1976*، لندن، ۱۹۷۵ء، بمدد اشاریہ؛ (۵) ممتاز احمد: مسئلۂ کشمیر، لاہور ۱۹۷۰ء؛ (۶) تھامس آرنلڈ: *Preaching of Islam*، بار دوم، ص ۲۹۱؛ (۷) صفدر محمود: *Pakistan Affairs*، لاہور ۱۹۷۰ء؛ (۸) *Twenty Years of Pakistan*، کراچی ۱۹۶۷ء؛ (۹) کے - کے - عزیز: *Discovery of Pakistan*، لاہور ۱۹۵۷ء؛ (۱۰) اکبر خان: *Raiders in Kashmir*، کراچی ۱۹۷۰ء؛ (۱۱) مشتاق احمد گورمانی: مسئلۂ کشمیر کا جائزہ، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۲) کشمیر الحاق کے بعد، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۳) مشتاق احمد: جہاد کشمیر، لاہور ۱۹۴۸ء؛ (۱۴) محمد عبداللہ قریشی: آئینۂ کشمیر، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۵) مقبول بیگ بدخشانی: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ج ۴، فارسی ادب، لاہور ۱۹۷۱ء؛ (۱۶) غلام سرور: خزینۃ الاصفیاء، ج ۱، مطبوعۂ کانپور؛ (۱۷) محمد الدین: ذکر حبیب، پنڈی بہاءالدین، ۱۹۲۳ء؛ (۱۸) عبدالغنی: امیر حزب اللہ، جلال پور ۱۹۶۵ء؛ (۱۹) ظہورالدین احمد: پاکستان میں فارسی ادب، ج ۱، مطبوعۂ لاہور؛ (۲۰) محمد صادق قصوری: اکابر تحریک پاکستان، گجرات، ۱۹۷۶ء، ص ۲۶۴؛ (تعلیقہ عبدالغنی، مدیر ادارہ، نے لکھا)۔

[ادارہ]

⊗ **کشمیری زبان و ادب**: درد خاندان کی زبانوں سے اساسی تعلق رکھنے کے باوجود کشمیری زبان اپنی موجودہ ہیئت کے اعتبار سے اسلامی اثرات کی بدولت وجود میں آئی۔ یہ جموں کے بعض علاقوں، وادی کشمیر اور آزاد کشمیر میں بولی جاتی ہے۔ ادبی اور صوتی لحاظ سے اسے چھے درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے: (۱) کاشر: وہ کشمیری جو خاص وادی کشمیر میں بولی جاتی ہے اور اسے معیاری کشمیری تصور کرنا چاہیے؛ (۲) کشتواڑی: وہ کشمیری جو صوبۂ جموں میں بولی جاتی ہے اور صوبۂ جموں کے علاقۂ کشتواڑ سے منسوب ہے؛ (۳) گنڈور کشمیری: وہ کشمیری جو شہروں کے پڑھے لکھے لوگ بولتے ہیں؛ (۴) گامی کشمیری: وہ کشمیری جو دیہات میں بسنے والے کسان ملاح اور مزدور بولتے ہیں، اور جسے ٹھیٹ یا کھردری کشمیری کہنا زیادہ موزوں ہے؛ (۵) ہندو کشمیری: وہ کشمیری جس میں سنسکرت یا ہندی کے الفاظ و تراکیب ہوں؛ (۶) مسلمانی کشمیری: وہ کشمیری جس کا رواج مسلمان گھرانوں میں ہے اور اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ و تراکیب، نیز اصطلاحیں اور محاورے بکثرت ملتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب نسانیات کے ماہر کشمیری کو سنسکرت کی بیٹی تصور کرتے تھے، لیکن جدید تحقیقات نے اس تصور کو باطل قرار دیا ہے۔ دراصل کشمیری سنسکرت کی بہ نسبت قدیم زبان ہے اور آریاؤں کی آمد سے پہلے بھی وادی کشمیر میں بولی جاتی تھی۔ آریاؤں کی آمد سے پہلے کشمیر میں ناگا لوگ آباد تھے، جنھیں نائپر Nayar بھی کہا گیا ہے۔ گویا کشمیری ناگاؤں اور نائیروں کی زبان ہے نہ کہ ان کے بعد آنے والے آریاؤں کی۔ اس امر کا ثبوت خود کشمیر کا لفظ مہیا کرتا ہے۔ کشمیر کا قدیم نام ستی سر (= بلند تالاب) ہے۔ اس قدیم نام کی جگہ کشمیر کا نام تجویز ہوا۔ "کا" پانی کو کہا جاتا ہے اور "سمیرا" ہوا کا نام ہے۔ یہ دونوں پراکرت لفظ جب مل گئے تو کاسمیرا یا کشمیرا یا کشمیر کی ترکیب وجود میں آئی، یعنی وہ زمین جہاں سے ہوا کے ذریعے پانی نکالا گیا ہو۔ لفظ کشمیر کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ پراکرت میں "کس" نہر یا ندی کو کہا جاتا ہے

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

(پنجابی میں بھی لدی اور نالے کے لیے "کسی" کا لفظ مروج ہے) اور میر کا مطلب ہے پہاڑ (جیسے شرح میر یا پلمیر) ۔ اس تعبیر کے مطابق کسمیر یا کشمیر وہ لدی یا نہر ہے جو پہاڑ میں سے نکالی گئی ہے ۔ کشمیر واقعی جغرافیائی اعتبار سے ایک بہت بڑی لدی یا جھیل ہے جس کے اردگرد پہاڑی دیواریں کھڑی ہیں (وادی کشمیر ۸۴ میل لمبی اور ۲۰ سے ۲۵ میل تک چوڑی ہے) ۔ اہل کشمیر، وادی کشمیر کو کشمیر کے بجائے کشیر کہتے ہیں ۔ یہ لسانی ترمیم بھی لفظ کشمیر کی پراکرت اصل کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ سر ایرل سٹائین کے مطابق لفظ "کشیر" لفظ کشمیر کا محض صوتی تغیر ہے ۔ کشمیر کے لوگ کشمیر کا لفظ ادا کرتے وقت "م" کو حذف کر دیتے ہیں ۔ ماہرین جغرافیہ کے نزدیک لفظ کشمیر کو مروج ہوئے ۲۳۰۰ سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو چلا ہے ۔

پروفیسر سدھیشور ورما نے کشمیری زبان کے بارے میں لکھا ہے : "کشمیری زبان کی خصوصیت اس کا نہایت ہی پیچیدہ اور لطیف نظام حروف علّت ہے ۔ اس میں ایسے باریک حروف علّت موجود ہیں جنہیں صرف بولنے والا ہی محسوس کر سکتا ہے ۔ سننے والے کو وہ سنائی نہیں دیتے ۔ اگر سنائی دیتے بھی ہیں تو کوشش اور توجہ کے بعد ۔ اس کے علاوہ یہ صوتی شکلیں ایسی پراسرار ہیں جنہیں صوتی علامات میں قلمبند کرنا اور ان کی حقیقت کو سمجھنا ایک ماہر صوتیات کے لیے بھی نہایت مشکل ہے" ۔

کشمیری زبان و ادب خصوصاً شاعری کو تاریخی طور پر پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

پہلا دور : گیت سنگیت، یعنی قدیم ترین دور، مذہبی و اخلاقی لوک گیتوں پر مشتمل؛

دوسرا دور : شتی کنتھ سے شیخ نور الدّین نورانی تک؛

تیسرا دور : حبہ خاتون سے ارتیمال تک؛

چوتھا دور : محمود گامی سے عزیز اللہ حقانی تک؛

پانچواں دور : غلام احمد مہجور سے طاؤس بانہالی تک ۔

ہر زبان کی طرح کشمیری ادب کی ابتدا لوک گیتوں سے ہوئی ۔ یہ لوک گیت حمد اور بھجن سے بے حد مماثلت رکھتے ہیں ۔ ان لوک گیتوں میں پرماتما، اوتاروں اور مختلف دیوی دیوتاؤں کی برتری اور عظمت کو تسلیم کرنے کے علاوہ قلب و روح کی طہارت پر زور دیا گیا ہے ۔ گویا یہ آج کے مفہوم میں لوک گیت کم اور بھجن زیادہ ہیں ۔ ان اخلاق اور روحانی لوک گیتوں میں دھرتی، سورج، چاند، دریاؤں، جھیلوں، چشموں، پہاڑوں، بادلوں اور دوسرے مظاہر فطرت کی بھی توصیف کی گئی ہے اور خدا کی وحدانیت، فکر کی آزادی اور روح کی نجات پر زور دیا گیا ہے ۔ ان پر ناگا مت، شومت اور بدھ مت کی مخصوص تعلیمات کا اثر نمایاں ہے؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوک گیتوں کے دور کے بعد سب سے پہلا شاعر شتی کنتھ بھی روحانی اور اخلاق موضوعات کو اپناتا ہے اور اپنے ان موضوعات اور تصورات کو سنسکرت آمیز کشمیری میں پیش کرتا ہے ۔

کشمیری ادب کے دوسرے دور کا دوسرا اہم شاعر مرد نہیں ایک خاتون ہے، جو لَلّہ عارفہ کے نام سے مشہور ہے ۔ لَلّہ عارفہ کو لل دید Lal Ded بھی کہا جاتا ہے ۔ ان کا اصلی (ہندوانہ) نام پرماوتی ہے ۔ (بعض کا خیال ہے کہ لَلّہ عارفہ جوگن

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

اور شومت کی پیروکار تھی ۔ اس نے یوگا کی تعلیم اپنے استاد سدھ سے حاصل کی ۔ پھر اسے عام کرنے کے لیے گلی کوچوں میں گھومتی پھری اور شعر کو اس نے ذریعۂ اظہار بنایا ۔ اس کے اشعار اشلوک کے نام سے مشہور ہوے، جنھیں مجموعی طور پر لل وکھی، یعنی لَلّہ عارفہ کی کہاوتیں یا باتیں، کہا جاتا ہے ۔ بہرکیف وہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے نزدیک واجب الاحترام رہی ہے) ۔ وہ چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں کشمیر کے تیسرے مسلمان بادشاہ سلطان علاء الدّین کے عہد (۱۳۴۳ تا ۱۳۵۴ء) میں پیدا ہوئی ۔ یہ وہ دور تھا جب اسلام کے احسانات اور اثرات سے ہندو اور کشمیر کے دوسرے مذہبی فرقوں کے لوگ فیض یاب ہو رہے تھے ۔ لَلّہ عارفہ نے بھی مسلم مبلغوں، خصوصاً سیّد علی ہمدانیؒ سے کسب فیض کیا ۔ وہ مؤخرالذّکر بزرگ سے روحانی طور پر بہت متأثر تھی، جس کی جھلک اس کی شاعری میں بھی ملتی ہے ۔

کشمیری ادب کے تیسرے دور میں دو اور خواتین، حبہ خاتون اور ارنی مال، کشمیری شاعری پر چھائی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ ان کے گیتوں کو کشمیری زبان کے ادب عالیہ میں بلند مقام حاصل ہے ۔ "ارنی مال اور حبہ خاتون کے ذاتی دکھوں، پنہاں فلسفے اور نظریۂ زندگی میں اس قدر مماثلت ہے کہ اگر ہم ایک شاعرہ کے بارے میں سوچیں تو دوسری فوراً ذہن میں آ جاتی ہے ۔ ان کے پیار اور محبت کے زمزموں کی اہمیت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ ان کا کلام وادی کشمیر کی عام عورتوں کی افسردگیوں، تکلیفوں، آرزوؤں، حسرتوں، چیخوں اور کراہوں کی عکاسی کرتا ہے ۔ انھوں نے اپنی زندگیوں میں جو دکھ سہے وہ اگرچہ ذاتی نوعیت کے تھے، لیکن ان کی قومی اہمیت اس لیے ہے کہ حبہ خاتون اور ارنی مال کی طرح تمام کشمیری عورتوں سے وہ تمام کچھ چھین لیا گیا تھا جس سے زندگی قابل قدر ہوتی ہے ۔ استعارے کی زبان میں یہی بات یوں ادا کی جائے گی کہ ان سے بے وفائی اور بد عہدی ہوئی تھی ۔ وہ مجبور، مقہور اور بے بس تھیں ۔ انھوں نے اپنا دامن بہتر دنوں کی امید سے باندھ لیا تھا" (پریم ناتھ بزاز: *Daughters of the Vitasta*، ص ۱۷۸)۔

کشمیری شاعری چوتھے دور میں فارسی شاعری سے بے حد متأثر نظر آتی ہے ۔ اس دور کا سب سے بڑا شاعر محمود گامی ہے، جس نے ۱۸۵۵ء میں وفات پائی (بعض نسخوں میں تاریخ وفات ۱۸۸۵ء درج ہے) ۔ اس دور کے دوسرے مشہور شاعر مقبول شاہ کرالہ واری اور رسول میر ہیں ۔

کشمیری شاعری کا جدید دور ۱۹۰۰ء سے شروع ہوتا ہے ۔ اس دور کا ممتاز ترین شاعر پیرزادہ غلام احمد مہجور (ولادت ۱۸۸۸ء) کشمیری کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتا تھا ۔ مہجور دراصل مسلمان عوام کا شاعر ہے ۔ وہ حب وطن کے لیے جان تک قربان کرنے کے لیے تیار رہا ۔ انسانوں سے پیار، آزادی فکر و عمل اور مناظر فطرت اس کی شاعری کے موضوعات ہیں ۔ اس کی شاعری کی بنیاد موسیقی ہے اور وہ جو بات بھی کہتا ہے اس میں شرینی اور دلکشی پائی جاتی ہے ۔ اس کے کلام کے دو مجموعے کلام مہجور اور پیام مہجور چھپ چکے ہیں ۔ ۱۹۴۷ء میں مہجور نے ڈوگروں کی سنگینوں کے تلے کھڑے ہو کر "میرا دل پاکستان کے ساتھ ہے" کا نعرہ لگایا ۔ ڈوگرہ حکومت نے اسے گرفتار کرکے جیل میں ٹھونس دیا اور وہ جیل ہی میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا اللہ کو پیارا ہو گیا ۔

www.besturdubooks.wordpress.com

مہجور کا ہم عصر عبدالاحد آزاد بھی روندی اور ٹھکرائی ہوئی انسانیت کا شاعر اور مزاج کے اعتبار سے انقلابی ہے؛ لیکن مہجور کی طرح وہ بھی سیاسی نہیں، عمرانی انقلاب لانا چاہتا ہے۔ بعض نقادوں نے اس کی انقلابی شاعری کے پیش نظر آزاد کو مہجور سے بڑا شاعر گردانا ہے، مگر یہ درست نہیں۔ مہجور حقیقت کا ادراک رکھتا ہے۔ اس میں جوش و ہوش پہلو بہ پہلو ملتے ہیں، مگر آزاد کا جوش جنون کی اس حد کو چھونے لگتا ہے جہاں حقیقت تصور میں بدل کر ناقابل عمل ہو جاتی ہے۔

قیام پاکستان، یعنی ۱۹۴۷ء کے بعد آزاد کشمیر اور پاکستان میں کشمیری زبان کے متعدد اچھے شاعر ابھرے ہیں۔ ان میں احمد شمیم اور طاؤس بالنہالی کے نام سرفہرست ہیں۔ ان دونوں کے ہاں جدید احساس کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائی بھی ملتی ہے اور شعری موضوعات کو فکر کی آنچ سے گہرائی اور گیرائی دیتے ہیں۔

ماخذ کے لیے رک بہ قصہ، کشمیری۔

(سلیم خان گمی)

تعلیقہ: کشمیری زبان اپنی موجودہ صورت کے لیے اسلام کی مرہون منت ہے۔ اسلام کشمیر میں چودھویں صدی عیسوی میں پھیلا۔ اس وقت کی درباری زبان سنسکرت تھی۔ سلطان شہاب الدین کے دور (۱۳۵۴ تا ۱۳۷۳ء) سے فارسی زبان نے اس کی جگہ لینی شروع کر دی (دیکھیے محب الحسن: کشمیر سلاطین کے عہد میں، اعظم گڑھ ۱۹۶۷ء، ص ۳۹۸، ۴۰۲)۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کشمیری سلاطین سنسکرت کی سرپرستی سے دست کش نہیں ہوے، لیکن فارسی کے نظم و نسق اور ثقافت کی زبان بن جانے سے اس کا رواج کم ہوتا چلا گیا۔ دربار سے باہر چودھویں صدی عیسوی میں بھی عوام کشمیری زبان ہی بولتے تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ لَلّہ عارفہ، جو ۱۳۳۵ء میں پیدا ہوئی، کشمیری زبان میں شعر کہتی تھی۔ شیخ نور الدین ریشی (۱۳۷۷ تا ۱۴۳۸ء میں) کے ملفوظات نور نامہ میں ملتے ہیں، جو کشمیری زبان میں ہیں۔ لَلّہ عارفہ اور شیخ نورالدین نے پرانی کشمیری زبان استعمال کی، جو چودھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ لسانیات کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ کشمیری زبان کی اساس دردی زبان کی ایک شاخ ہے۔ اس میں سنسکرت کے الفاظ ان برہمنوں کی وجہ سے شامل ہوے جو دربار پر چھائے ہوے ہیں۔

پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں شاہ ہمدان کی آمد کے بعد کم وبیش ڈیڑھ صدی کے اندر اندر کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی تھی۔ اس دوران میں اس اکثریت کی جو زبان بنی وہ موجودہ کشمیری زبان ہے، جسے ہندو مصنفین مسلمانی کشمیری کا نام دیتے ہیں۔ ہندو جو کشمیری بولتے ہیں اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں اور اسے ہندو کشمیری کہا جاتا ہے؛ لیکن ایک تو خود بہت سے ہندو مسلمانی کشمیری استعمال کرتے ہیں، دوسرے ہندو کشمیری بولنے والے اتنے تھوڑے ہیں کہ ہمارے نقطۂ نگاہ سے اسے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی؛ لہٰذا غالب اکثریت کی زبان، یعنی مسلمانی کشمیری، ہی وہ زبان ہے جس پر زیادہ تر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

کشمیر میں اشاعت اسلام شروع ہوئی تو مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ خانقاہوں اور مکتبوں کا قیام عمل میں آیا۔ چونکہ کشمیر کے لوگوں نے قبول اسلام جماعتی طور پر کیا اس لیے تمام تہذیبی

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

اور ثقافتی تبدیلیاں اتنی تیزی سے ہوئیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ علما اور صوفیہ نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تبلیغ و ارشاد کا فریضہ بڑی سرگرمی سے انجام دیا۔ اسلام کا سارا مذہبی اور ثقافتی سرمایہ عربی اور فارسی زبانوں میں موجود تھا، اس لیے ان کا رواج روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ اکثر صوفیہ اور مبلغین ترکستان سے آتے تھے، جن کی مادری زبان ترکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عربی اور فارسی کے ساتھ ترکی کے الفاظ بھی کشمیری زبان میں بڑی تعداد میں شامل ہوگئے۔ کشمیری میں اشاعت اسلام شروع ہوئی تو سعدی، رومی، نظامی، امیر خسرو اور حافظ کا ظہور ہو چکا تھا اور ان شعرا کا کلام وہاں بکثرت پڑھا جا رہا تھا۔ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ فارسی کے شعرا کا اتباع کرتے ہوئے یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، شیرین و خسرو اور وامق و عذرا وغیرہ داستانیں کشمیری زبان میں لکھی گئیں۔ نہ صرف یہ کہ کشمیری زبان کو مسلمانوں کی وجہ سے جدید ذخیرۂ الفاظ ملا اور اس کی شاعری یک لخت اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئی بلکہ مسلمانوں نے اسے فارسی رسم الخط میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔ کشمیری کے لیے شاردا رسم الخط بھی استعمال ہوتا رہا، جو اس زبان کا قدیم مقامی رسم الخط ہے اور ناگری سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے حروف تہجی زیادہ تر پنجاب کی پہاڑیوں میں استعمال ہونے والی ٹکری یا ڈوگری سے ملتے جلتے ہیں۔ ہندو اکثر ناگری رسم الخط میں لکھتے تھے، لیکن کشمیر کے لاکھوں مسلمانوں کا رسم الخط فارسی ہی رہا۔ اس سلسلے میں ایک دقت ضرور پیش آئی اور وہ حروف علت کی تھی، جن کی تعداد کشمیری زبان میں زیادہ ہے۔ ان کے لیے علامات مقرر کرنا ضروری تھا؛ چنانچہ کشمیری مصنفین نے تقسیم ملک کے بعد نستعلیق رسم الخط میں مزید ترمیمیں کیں اور کشمیری حروف علت کے تمام صوتی تقاضوں کو پورا کیا (دیکھیے تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ۱۴ (کشمیری ادب): ۱۵۰)۔ معیاری کشمیری میں لسانی اختلاف کی اصل وجہ جموں و کشمیر اور ملحقہ علاقوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی پہلو بہ پہلو موجودگی ہے۔ دیہاتیوں اور شہریوں کی زبان میں بھی فرق ہے۔ تعلیم کی عام اشاعت سے بھی اثر پڑا ہے۔ علاوہ بریں مقامی اثرات کے باعث بالخصوص تلفظ کا فرق بھی نظر آتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں ورود اسلام سے پہلے کشمیری زبان کا کوئی ادب نہیں تھا۔ رنگ رنگ کے لوک گیت، قسم قسم کی لوک کہانیاں، بجھارتیں اور ضرب الامثال ضرور معاشرے میں موجود ہوں گی، لیکن مرتب صورت میں نہیں تھیں۔ کشمیری زبان کا ادب مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوا۔ اس زبان میں شاعری کی ابتدا کشمیر کے حسین ماحول میں جاری و ساری وارفتگی کے باعث ہوئی۔ نظر پرور اور دل نواز ماحول میں جذبات بھرے گیت بے ساختہ زبان پر آ جاتے تھے۔ کشمیری زبان کی بعض نظمیں اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتی ہیں۔ اس ضمن میں مقبول شاہ کی گل ریز، محمود گامی کی شیرین خسرو، ولی اللہ متو کی ہیہ مال (= چنبیلی کا ہار) کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ کشمیری ادب اور شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

پہلا دور شتی کنتھ، للّہ عارفہ اور شیخ نورالدین ریشی کا ہے۔ کشمیری زبان کا پہلا شاعر شتی کنتھ ہے، جو تیرھویں صدی عیسوی میں گزرا۔ مہانیہ پرکاش اس کے کلام کا مجموعہ ہے۔ زبان میں سنسکرت کے الفاظ کی بہتات ہے اور ہندو دھرم کے خیالات بیان کیے گئے ہیں۔ للّہ عارفہ کا کلام

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

صوفیانہ اور فلسفیانہ ہے اور سنسکرت آمیز زبان کے باوجود اس میں مسلمان صوفیہ کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے ۔ شیخ نور الدّین ریشیؒ کے اشعار بھی، جو اشلوک کہلاتے ہیں، متصوفانہ ہیں، البتہ ان کا لہجہ زیادہ نصیحت آموز ہے ۔ ان تینوں کے کلام میں کشمیری کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں سے بیشتر اب متروک ہو چکے ہیں ۔ اس دور میں سوم پنڈت نے زین چرتر اور بودھ پنڈت نے زینہ و لاسی لکھی ۔ یہ دونوں کشمیری ادب کے دور ثانی میں بھی زندہ تھے ۔

دوسرے دور کے ممتاز شعرا میں حبہ خاتون، حبیب اللہ نوشہری، روپا بھوانی، صاحب کول، پرکاش بٹ، مُلّا فقیر اور میر عبداللہ بیٹھی قابل ذکر ہیں ۔ غیر مسلموں کا طرز نگارش ٹھیٹھ کشمیری تھا، لیکن مسلمان شعرا نے فارسی عروض کا اثر قبول کیا ۔ حبہ خاتون، جو کشمیر کے بادشاہ یوسف شاہ چک کی بیوی تھی، موجودہ کشمیری غزل کی بانی ہے ۔

کشمیری ادب کا تیسرا دور محمود گامی سے شروع ہوتا ہے اور عزیز اللہ حقانی تک پہنچتا ہے ۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان کشمیر پر اپنی حکومت کے تقریباً پانچ سو سال ختم کر چکے تھے، کشمیری زبان پر فارسی کا گہرا رنگ چڑھ چکا تھا اور اس میں شستگی، نکھار، روانی اور گھلاوٹ پیدا ہو چکی تھی ۔ اسی دور میں کشمیری باقاعدہ علمی اور ادبی زبان بن گئی، ثقیل اور متروک الفاظ استعمال کرنے کا رواج ختم ہوا اور روزمرہ کی زبان کا استعمال شروع ہوا ۔ اس زمانے میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں اور غزل کو بڑا فروغ حاصل ہوا ۔ سکھوں اور ڈوگروں کا عہد بھی اسی دور میں شامل ہے ۔ ان کی وجہ سے کشمیری شاعری میں قنوطیت پیدا ہوئی ۔

کشمیری ادب کے چوتھے دور (عصر جدید) کا بڑا شاعر پیرزادہ غلام احمد مہجور ہے ۔ اس دور میں کشمیریوں نے ڈوگرا مظالم کے خلاف آواز بلند کی اور جد و جہد آزادی کا آغاز کیا ۔ اسی لیے اس دور کی نظم و نثر میں قومی آزادی اور حریت پرستی کا ذکر ہے ۔ یہ ادب برائے زندگی کا دور ہے ۔ مہجور نے کشمیری زبان میں رزمیہ شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا ۔ عبدالاحد آزاد بھی، جو کشمیر کا شاعر انقلاب اور شاعر السالیت ہے، اسی دور میں پیدا ہوا ۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت کشمیر میں جنگ آزادی چھڑی ۔ کشمیر کے دو ٹکڑے ہو گئے ۔ اس کے باوجود مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر دونوں میں کشمیری ادب کی ترقی بدستور جاری رہی ۔ دینا ناتھ نادم، عبدالرحمٰن راہی، غلام نبی خیال، غلام رسول نازکی وغیرہ مقبوضہ کشمیر کے شاعر اور ادیب ہیں ۔ آزاد کشمیر میں بھی کشمیری ادب کی کیفیت بڑی امید افزا ہے ۔ غلام احمد ناز، احمد شمیم، علی محمّد کنول، شمس العین بخاری، غلام محمّد موروجی، غلام محمّد مسرور، احمد اللہ دلنواز اور تحسین جعفری، وغیرہ وہاں کے ممتاز شاعر ہیں ۔ احمد اللہ دلنواز کے کلام کے کئی مجموعے، رسالہ دل، عشقہ باغ، کلام الفت، کلام عمر خوجہ، ظہور گلشن، سرور عشق شائع ہو چکے ہیں ۔ غلام احمد کشفی نے کاشر زبان کے نام سے کشمیری زبان پر ایک کتاب لکھی ہے ۔ کشمیری بول چال پر کتابچہ محمّد اسد اللہ قریشی اور خواجہ غلام نبی گلکار نے شائع کیا ہے ۔ کئی ایک ادبی انجمنیں اور ادارے کشمیری زبان و ادب اور ثقافت کو فروغ دے رہے ہیں ۔ آزاد کشمیر ریڈیو سے نظمیں، فیچر اور خبریں کشمیری زبان میں نشر کی جاتی ہیں ۔ کشمیری صحافت اردو زبان کے عام

www.besturdubooks.wordpress.com

رواج کے باعث زیادہ ترقی نہیں کر سکی، تاہم متعدد کشمیری ہفت روزے اور ماہنامے نکالے گئے۔ علاوہ بریں اردو جرائد میں کشمیری نظمیں اور مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مآخذ: (۱) میر عبدالعزیز، در تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، لاہور ۱۹۷۱ء، ۱۴: ۱۳۵ تا ۲۰۹؛ (۲) محبوب الحسن: کشمیر سلاطین کے عہد میں، اعظم گڑھ ۱۹۶۷ء، ص ۴۰۳ تا ۴۰۶؛ (۳) غلام محی الدّین صوفی: *Kashir*، لاہور ۱۹۴۹ء، ص ۳۹۵ تا ۴۴۶۔ [تعلیقہ عبدالغنی، مدیر ادارہ، نے لکھا]۔

[ادارہ]

* **کَشیْش طاغی**: (ترکی؛ لغوی معنی "راہبوں کا پہاڑ") یہ وہ نام ہے جو عثمانیوں نے مسیہ Mysia میں واقع کوہ اولمپس Olympus کو دیا اور جس کے دامن میں شمال کے رخ شہر برسہ [رک بآں] آباد ہے۔ اس کی ڈھلانیں جنگلوں سے ڈھکی ہوئی ہیں، لیکن اب یہ جنگل بہت کم ہوگئے ہیں۔ چوٹیوں پر برف جمی رہتی ہے، جو صرف موسم گرما میں پگھلتی ہے (بلندی ۶۲۰۰ فٹ)۔ پہاڑوں کے اس گٹھے ہوئے سلسلے کی ساخت سنگ خارا، سنگ مرمر اور فلسپار (Felsper، ایک قسم کی سفید یا سرخ رنگ دھات)، سے ہوئی ہے۔ جب عثمانیوں نے اسے فتح کیا تو کوہ اولمپس خانقاہوں اور راہبوں کے حجروں سے بھرا پڑا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی میں اس کا نام کشیش طاغی پڑ گیا۔ پھر عیسائی راہبوں کی جگہ مسلمان درویشوں نے لے لی؛ چنانچہ شاعر الامعی کے ہاں گیکلی بابا اور طوغلو بابا کی دو خانقاہوں کا حال بھی ملتا ہے۔ پہاڑ کے دامن میں شہر برسہ کے ایک محلے میں شیخ شمس الدّین محمّد بن علی البخاری کا مزار ہے، جو عام طور پر سلطان امیر ولی کے نام سے مشہور ہیں؛ مقبرے کے ساتھ ایک مسجد بھی بنی ہے۔

مآخذ: (۱) حاجی خلیفہ: جہان نما، قسطنطنیہ ۱۱۴۵ھ، ص ۶۶۰ و مترجمۂ Norberg، ۲: ۴۸۰ و ۴۸۱؛ (۲) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، در سعادت ۱۳۱۴ھ، ۲: ۲۹ تا ۳۰، ۴۶، ۴۷ تا ۴۸ و انگریزی ترجمہ از v. Hammer، لندن ۱۸۵۰ء، ص ۱۵ تا ۱۶، ۲۴، ۲۵؛ (۳) سامی بے: قاموس الاعلام، ۵: ۳۸۶۶؛ (۴) علی جواد: ممالک عثمانیین تاریخ و جغرافیہ لغاتی، ص ۶۶۹؛ (۵) v. Hammer: *Hist. de l' empire ottoman*، ۱: ۱۵۷ ببعد۔

(CL. HUART)

* **کَعْب (بنو)**: ایک عرب قبیلہ، جو آج کل جنوب مغربی ایران کے صوبۂ خوزستان کے بعض حصوں میں آباد ہے۔ بنو کعب متعدد گروہوں پر مشتمل ہیں، اس لیے مشرق عرب اور جنوبی عراق کے باشندے انھیں کُعوب (اٹھارھویں صدی کے یورپی مآخذ میں Chaub) کہتے ہیں۔ عرب مصنفین اور ماہرین انساب ان کا تفصیل سے ذکر نہیں کرتے بلکہ بالعموم انھیں کعب بن ربیعہ کے ذیل میں شمار کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق قیس عیلان سے ہے، جو وسطی اور مشرقی عرب کا ایک بڑا قبیلہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہاں سے ترک وطن کرکے جنوبی عراق اور جنوب مغربی ایران میں سترھویں صدی عیسوی سے قبل نہیں پہنچے تھے۔ ڈنمارک کے سیاح Niebuhr کے زمانے (۱۷۶۵ء) تک وہ بظاہر اس علاقے کے باشندوں میں خاصے بدنام ہو چکے تھے۔ جن لوگوں نے ان کے ہاتھوں تکلیف اٹھائی ان میں ترک، ایرانی اور برطانوی سب شامل ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں ان کے سردار شیخ سلمان کو زیر کرنے میں ہر حکومت ناکام رہی۔ ان کے قلعہ بند شہروں میں قُبّان، دُوْرَق اور فَلّاحِیّہ کا ذکر آتا ہے۔ سلمان کے بعد بنو کعب کا دوسرا ممتاز فرمانروا اس کا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

پرپوتا ٹامر (۱۸۳۷ تا ۱۸۴۰ء) تھا۔

ایران میں آباد دیگر عرب قبائل کی طرح بنو کعب بھی غیر عرب آبادی میں گھل مل گئے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنی عربی شخصیت کھوتے جا رہے ہیں۔ اس قبیلے کے بڑے گروہ یہ ہیں: دُریس، مُقدّم، خَنافِرہ اور حَزْبِیہ۔

بنوکعب کو نہ تو مکمل طور پر حضری کہا جا سکتا ہے نہ ان کے کسی بڑے حصے کو صحیح معنوں میں بدوی کہ سکتے ہیں، بلکہ آج کل اس قبیلے کے بیشتر افراد نیم خانہ بدوش ہیں۔ ان کے اقتدار کے زمانۂ عروج میں (۱۷۷۵ء کے ذرا بعد) ان کے شیخ کی حکومت بظاہر بصرے کے قرب و جوار سے لے کر بہبہان کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی، لیکن جوں جوں محمرہ کے بنو مُحَیْسِن کا اثر و رسوخ بڑھتا گیا ان کا زور کم ہوتا گیا اور بنو کعب کے شیوخ اپنا سیاسی اقتدار کھو کر محمرہ کے شیخ کے معمولی باجگزار ہو کر رہ گئے۔ خود محمرہ کے شیوخ بیسویں صدی کے شروع میں ایرانی بادشاہوں کے باجگزار بن گئے۔

مآخذ: (۱) ابن درید: کتاب الاشتقاق، قاہرہ ۱۹۵۸ء، ص ۲۹۵؛ (۲) ابن رسول: طرفۃ الاصحاب فی معرفۃ الانساب، دمشق ۱۹۴۹ء، ص ۱۵، ۲۸؛ (۳) یاقوت، ۱: ۳۷۳ و ۳: ۹۰۸؛ (۴) النویری: نہایۃ الارب، قاہرہ ۱۹۵۴ء، ۲: ۳۳۸؛ (۵) کحّالۃ: معجم قبائل العرب، دمشق ۱۹۴۹ء، ۳: ۹۸۳ تا ۹۸۷؛ (۶) G. Niebuhr: *Voyage en Arabie*، ایمسٹرڈم ۱۷۸۰ء، ۲: ۱۶۰ ببعد؛ (۷) ایسٹ انڈیا کمپنی: *Persia and the Persian Gulf* (انڈیا آفس لائبریری، لندن میں)، ج ۱۶ و ۱۷؛ (۸) Baron C. A. de Bode: *Travels in Luristan and Arabistan*، لندن ۱۸۴۵ء، ص ۱۱۱ تا ۱۱۹؛ (۹) A. H. Layard: *A Description of the Province of Khusistan*، در *JRGS*، ۱۶ (۱۸۴۶ء) ۳۶ تا ۴۵؛ (۱۰) W. K. Loftus: *Travels and Researches in Chaldea and Susania*، لندن ۱۸۵۷ء، ص ۲۷۹ تا ۲۸۶؛ (۱۱) W. F. Ainsworth: *A Personal Narrative of the Euphrates Expedition*، لندن ۱۸۸۸ء، ص ۲۰۵ تا ۲۱۸؛ (۱۲) G. W. Curzon: *Persia and the Persian Question*، لندن ۱۸۹۲ء، ۲: ۲۳۱ تا ۲۳۸؛ (۱۳) J. G. Lorimer: *Gazetteer of the Persian Gulf, Omān and Central Arabia*، کلکتہ ۱۹۰۸ء، ۲: ۹۴۷ تا ۹۶۳۔

(A. M. ABU-HAKIMA)

کَعْب بن الاَشْرَف: مدینۂ منورہ میں * نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ایک دشمن، جو ایک بیان کے مطابق نضیری، مگر دوسرے بیان کے مطابق نبہانی طائی تھا؛ بہرکیف اس کی ماں بنو نضیر ہی سے تھی۔ وہ یہودیت کا پُرجوش حامی تھا (دیکھیے لفظ سیّد الاحبار، در ابن ہشام، ص ۶۵۹ س ۱۲)۔ [اس کا شمار رؤسائے یہود اور قادرالکلام شعرا میں ہوتا تھا؛ چنانچہ اس کا عرب میں بڑا اثر تھا (کتاب الاغانی، میں اسے "فحل فصیح" کہا گیا ہے)۔ اسلام سے اسے سخت عداوت تھی۔ غزوۂ بدر میں قریش کی عبرتناک شکست کے بعد وہ تعزیت کے لیے مکّے گیا اور مقتولان بدر کے پُر درد مرثیے پڑھ کر لوگوں کو رُلاتا اور انتقام پر ابھارتا رہا؛ چنانچہ ابوسفیان نے حرم کا پردہ تھام کر انتقام لینے کا عہد کیا (الدیار بکری: تاریخ الخمیس، ص ۵۱۷)۔ مدینے میں واپس آنے کے بعد اس نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ہجو میں اشعار کہنا اور لوگوں کو آپؐ کے خلاف برانگیختہ کرنا شروع کردیا (ابو داؤد، ج ۲، کتاب الخراج و الامارۃ)۔ مزید برآں اس نے قصد کیا کہ چپکے سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو قتل کرا دے (ابن حجر: فتح الباری، ۷: ۲۵۹)۔ جب اس کی فتنہ انگیزی

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

حد سے زیادہ بڑھ گئی اور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اس پر ملال کا اظہار فرمایا تو حضرت محمّد بن مسلمہ رض نے آپ ص کی اجازت اور رؤسائے اوس کے مشورے سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا (الزرقانی، ۲ : ۱۲؛ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل کعب) ۔ الواقدی نے اس کے قتل کی تاریخ ۱۴ ربیع الاوّل ۳ھ/ستمبر ۶۲۴ء دی ہے، لیکن بعض کے نزدیک یہ واقعہ غزوۂ بنو نضیر (ربیع الاوّل ۴ھ/اگست ۶۲۵ء) سے ذرا قبل پیش آیا تھا کیونکہ اس وقت بنو نضیر کعب کا سوگ منا رہے تھے (ابن ہشام، ص ۶۵۸ ببعد) ۔ کعب بن الاشرف کے اُطُم (= قلعہ) کے کھنڈر آج بھی باقی ہیں (محمّد حمید اللہ : *The Battlefields of the Prophet Mnhammad*، ووکنگ، لنڈن ۱۹۵۳ء)] ۔

مآخذ : مقالے میں دیے گئے حوالوں کے علاوہ دیکھیے : (۱) ابن ہشام، طبع وُسٹنفلڈ، ص ۵۴۸ تا ۵۵۱، ۶۵۷ تا ۶۶۹؛ (۲) الواقدی، مترجمۂ Wellhaussen، ص ۹۵ تا ۹۹ [و طبع Marsden Jones، ص ۱۲۱ ببعد، ۱۸۴ تا ۱۹۲]؛ (۳) الطبری، طبع ڈخویہ، ۱ : ۱۳۶۸ تا ۱۳۷۲؛ (۴) الحلبی : انسان العیون، قاہرہ ۱۳۰۸ھ، ۳ : ۱۷۶ تا ۱۷۹؛ (۵) المسعودی : التنبیہ، طبع ڈخویہ، ص ۲۴۳؛ (۶) الاغانی، ۱۹ : ۱۰۶ ببعد؛ (۷) کائتانی : *Annali dell' Islam*، ۱ : ۵۳۴ تا ۵۳۷؛ (۸) مارگولیتھ، بار سوم، ص ۲۸۶ ببعد؛ (۹) ونسنک : *Mohammed en de Joden te Medina*، لائیڈن ۱۹۰۸ء، ص ۱۵۲ تا ۱۵۵؛ (۱۰) R. Leszynsky : *Die Juden in Arabien zur Zeit Muhammeds*، برلن ۱۹۱۰ء، ۶۶ تا ۶۹؛ [(۱۱) Fr. Buhl : *Das Leben Muhammeds*، لائپزگ ۱۹۳۰ء، ص ۲۵۰ ببعد؛ (۱۲) M. J. Kister : *The Market of the Prophet*، در *JESHO*، ۸ (۱۹۶۵ء) : ۲۷۲ تا ۲۷۶؛ (۱۲) شبلی نعمانی : سیرۃ النبی، مطبوعۂ اعظم گڑھ، بار ششم، ۱ : ۴۰۵ ببعد؛ (۱۳) البخاری، مطبوعۂ قاہرہ، ۳ : ۱۲] ۔

(Fr. Buhl [و ادارہ])

کَعْب بن جُعَیْل التَغلبی : پہلی صدی * عیسوی/ساتویں صدی ہجری کا ایک عرب شاعر، جو زیادہ مشہور نہیں ۔ ابن سلاّم (طبقات، ص ۴۸۵ تا ۴۸۹) نے اسے اسلامی شعرا کے تیسرے طبقے میں جگہ دی ہے ۔ اس کا نسب نامہ مختلف مصنفین کے ہاں مختلف ہے (ابن الکلبی، طبع Caskel، جدول ۱۶۵، میں بلاشبہہ سب سے زیادہ صحیح نسب نامہ ملتا ہے) ۔ اس کی زندگی کے بارے میں ہمارے پاس بہت کم معلومات ہیں ۔ وہ غالباً ہجرت کے اوّلین سالوں میں پیدا ہوا اور اس نے جنگ صفین (۳۷ھ/۶۵۷ء) میں حضرت معاویہ رض کے ایک مقرب خاص کی حیثیت سے حصہ لیا کیونکہ وہ بھی بنو تغلب [رک بآں] کے بیشتر افراد کی طرح ان کا ایک پرجوش حامی تھا ۔ حضرت علی رض سے مخالفت کی بنا پر اس نے کئی نظمیں لکھیں ۔ امیر معاویہ رض نے اس کا شعر اپنے حریف کے نام ایک خط کے ساتھ لکھ کر بھیجا، جس کا النجاشی نے جواب دیا (الدینوری : الاخبار الطوال، ص ۱۷۰؛ المبرد : الکامل، ۱ : ۲۸۱ تا ۲۸۲) ۔ بعدازاں اس نے عبیداللہ بن الخطاب کے کئی مرثیے لکھے، جو اس جنگ میں مارے گئے تھے (ابن سلام، ص ۴۸۸ تا ۴۸۹؛ الطبری، ۱ : ۳۳۱۵؛ نسب قریش، ص ۳۵۵ تا ۳۵۶؛ یاقوت، بذیل مادّۂ صفین؛ نصر بن مزاحم : وقعۃ صفین، ص ۳۶۶، ۴۱۰؛ شرح نہج البلاغۃ، ۱ : ۴۹۸ تا ۴۹۹؛ ابن کثیر : البدایۃ، ۷ : ۲۶۵) اور اسی طرح ایک قصیدہ امیر معاویہ رض اور ایک عمرو رض بن العاص کی مدح میں لکھا (ابن سلاّم، ص ۴۸۶ تا ۴۸۷؛ المرزبانی : المعجم، ص ۳۴۴؛ ابن قتیبہ : الشعر والشعراء، ص

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۶۳۲؛ یاقوت، بذیل مادۂ اذرح)۔ اس کے باقی ماندہ مقطوعات (تقریباً ۸۰ اشعار) کے علاوہ چند قصائد عبدالرحمٰن بن خالد بن الولید کی مدح میں موجود ہیں (نسب قریش، ص ۳۲۵ تا ۳۲۶)، المغیرۃ بن شعبہ کی ایک ہجو ہے (م ۵۰ھ/۶۷۰ء، الحماسۃ البصریۃ، ۲ : ۱۸۲) اور بعض ایسے اشعار ہیں جو ۵۰ھ/۶۷۰ء اور ۵۹ھ/۶۷۹ء کے درمیان مدینے میں لکھے گئے، جہاں وہ والی شہر سعید بن العاص کے مصاحبین میں سے تھا (ابن سلام، ص ۲۵۵، ۲۷۱؛ الطبری، ۱ : ۲۸۳۸ و ۲ : ۱۰۷) اور الفرزدق کے کلام سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔

روایت یہ ہے کہ اپنے نوعمر ہم قبیلہ شاعر الاخطل [رک بآں] کو یہ نام اسی نے دیا تھا۔ (ابن سلام، ص ۲۵۰، ۳۹۶؛ الاغانی، مطبوعۂ بیروت، ۸ : ۲۸۰ تا ۲۸۱)۔ ایک خبر کی رو سے، جو اکثر بیان کی جاتی ہے (الجاحظ : البیان، ۱ : ۶۳، ۱۷۲؛ ابن قتیبہ : الشعر و الشعراء، ص ۴۵۶، ۶۳۱ تا ۶۳۲؛ المبرد : الکامل، ۱ : ۱۵۳؛ ۱۵ : ۸۳؛ الاغانی، مطبوعۂ بیروت)، یزید بن معاویہ نے ۶۰ھ/۶۸۰ء سے پہلے اس سے یہ فرمائش کی تھی کہ وہ عبدالرحمٰن بن حسان بن ثابت کی ہجو میں کچھ اشعار کہے، لیکن کعب نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ یہ کام الاخطل کے سپرد کر دے کیونکہ وہ خود انصار کی ہجو کہنا نہیں چاہتا تھا۔ کعب نے یزید کو جو جواب بھیجا تھا اس کے سلسلے میں مختلف روایات بیان کی جاتی ہیں (اور جو غیر یقینی ہیں)۔ ان کی بنا پر لوئیس شیخو (الشعراء النصرانیین بعد الاسلام، ص ۲۰۴) نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کعب اس وقت تک عیسائی تھا؛ لیکن تمام شہادتیں اس قیاس کی تصدیق کرتی ہیں کہ وہ مسلمان ہو چکا تھا۔

اس کے بعد وہ ایک غیر معینہ زمانے میں (الاغانی، مطبوعۂ بیروت، ۵ : ۱۳) بصرے کے مربد (میدان) پر بعض شعرا بالخصوص النابغۃ الجعدی کے ساتھ نظر آتا ہے (ان دونوں کے مابین تعلقات کے بارے میں دیکھیے M. Nallino، در RSO، ۱۴ (۱۹۳۴ء) : ۴۰۳ تا ۴۰۵؛ *Le Poesie di an Nabigah*، بار دوم، روما ۱۹۵۳ء، ص ۱۲۰)۔ اگر البلاذری (الانساب، ۱۱ : ۲۱۲) کا بیان صحیح ہے تو عبدالملک بن مروان ۶۵ھ/۶۸۵ء تا ۸۶ھ/۷۰۵ء) کے عہد میں کعب زندہ تھا، جس کی مدح میں، اس کے بیان کے مطابق، کعب نے ایک قصیدہ لکھا تھا؛ تاہم جو ابیات اس نے نقل کیے ہیں وہ القطامی کے ایک طویل قصیدے میں پائی جاتی ہیں (طبع J. Barthe، لائیڈن ۱۹۰۲ء، ص ۸۸ ابیات ۸۹ و ۹۰)۔

ابن سلام کعب بن جعیل کو ایک مفلق (= ذہین و جدت پسند) شاعر کہتا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دیوان جمع نہیں کیا گیا، اگرچہ اس کے اشعار کو اچھی خاصی شہرت حاصل رہی ہے؛ چنانچہ ابن سریج [رک بآں] نے اس کی بعض ابیات کی دھنیں بھی بنائی تھیں (الاغانی، بیروت، ۳ : ۲۷۵)۔ اشعار جمع کرنے والوں نے اس سے زمانۂ جاہلیت کے شاعر عُمَیْرہ یا عَمِیْرَہ بن جُعَیْل یا جُعَلْ کے بعض اشعار منسوب کرنے میں (شیخو : کتاب الشعراء النصرانیہ قبل اسلام، ص ۱۹۵، ۱۹۶) یا اس شاعر کو اس کا بھائی قرار دینے میں (ابن قتیبہ : الشعر والشعراء، ص ۶۳۱ تا ۶۳۲؛ البغدادی : خزانۃ، مطبوعۂ بولاق، ۱ : ۴۵۸؛ مطبوعۂ قاہرہ، ۳ : ۴۴) کئی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ ان کی بنا پر ابن سلام (ص ۴۸۶ تا ۴۸۷) اور دیگر مصنفین نے جو عبارت نقل کی ہے اس سے ان غلط فہمیوں کی شہادت

www.besturdubooks.wordpress.com

ملتی ہے۔

مآخذ: کسی قدر مفصل بیان کے لیے دیکھیے (۱) شیخو: الشعراء النصرانیہ بعد الاسلام، ص ۲۰۳ تا ۲۱۲؛ ان مآخذ کے علاوہ جن کا حوالہ متن مقالہ میں دیا گیا ہے دیکھیے (۲) البحتری: حماسۃ، ص ۳۴۵؛ (۳) الدینوری: الاخبار الطوال، ص ۱۹۲؛ (۴) الآمدی: المؤتلف، ص ۸۴؛ (۵) الاغانی، مطبوعۂ بیروت، ۹: ۷۲؛ (۶) ابن درید: الاشتقاق، ص ۲۰۳؛ (۷) الشریشی: شرح المقامات، ۲: ۸۶؛ (۸) نقائض، ص ۶۱۹؛ (۹) یاقوت، بذیل مادۂ الحیرۃ؛ (۱۰) Nöldoke: *Delectus*، ص ۷۹ تا ۸۰؛ (۱۱) C. A. Nallina: *Letteratura*، بمدد اشاریہ؛ (۱۲) R. Blachere، در *HLA*، ۳: ۶۵ تا ۶۶، نیز وہ مآخذ جن کا اس نے حوالہ دیا ہے۔

(C. H. Pellat)

⊗* **کعب بن زُہَیر**: عرب کے مشہور صاحبِ معلقہ شاعر زہیر بن ابی سُلْمٰی کا بیٹا کَبْشہ بنت عمّار کے بطن سے تھا۔ شاعری کا ملکہ اور استعداد ان کا خاندانی استحقاق معلوم ہوتا ہے کیونکہ کعب اور اس کا باپ تو ایک طرف رہے بشمولیت شاعرہ شہیر تُماضِر (الخنساء، رَکَ بآں) اس خاندان کے گیارہ افراد کا کلام ہمارے پاس موجود ہے۔ ہمیں اس شاعر کی تاریخِ ولادت معلوم نہیں۔ اس کے دو اور بھائی بجیر اور سالم تھے، جن سے وہ عمر میں بڑا تھا۔ اس نے اپنے قبیلے کی جنگوں میں قبیلۂ طی، قریش اور خزرج کے خلاف حصّہ لیا، جیسا کہ اس کے دیوان کے بہت سے قصائد سے ظاہر ہوتا ہے۔ عہدِ رسالت میں ۷ھ سے کچھ پہلے (۶ھ کے آخر میں) اس کا بھائی بجیر حلقہ بگوش اسلام ہوگیا، مگر کعب کفر پر قائم رہا اور آنحضرت صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وآلہٖ وَسَلَّم اور مسلمان عورتوں کے خلاف یاوہ گوئی کرتا رہا (خزانۃ الادب، ۴: ۱۲)۔ آنحضرت صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وآلہٖ وَسَلَّم نے اس کے خون کو رائگاں و باطل قرار دیا (فَاَھْدَرَ دَمَہٗ: الاغانی، ۱۵: ۱۴۹)۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کعب کے لیے زمین تنگ ہو گئی۔ بالآخر اس نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر لیا اور ۹ھ میں اچانک مسجد رَسُولُ اللّٰہ میں آ نکلا، جہاں رسول خدا صَلَّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم تشریف فرما تھے۔ اس نے آپ کو اپنا مشہور قصیدہ "بانَتْ سُعَاد" سنایا۔ نبی کریم صَلَّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم یہ قصیدہ سن کر خوش ہوئے اور اپنی دھاریوں والی چادر (البُرْدہ) اس کو عطا فرمائی۔ اسی وجہ سے اس قصیدے کا نام قصیدۂ بُردہ مشہور ہوا۔ کعب کی تاریخِ وفات معلوم نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خاصی طویل عمر پائی۔ قصیدۂ بانَتْ سُعَاد میں دینی شاعری کا کوئی خاص انداز و اسلوب نہیں ہے۔ اس کے جذبات جاہلی شاعری کے جذبات ہیں اور اس کی ابتدا اس قدر رسمی ہے کہ حمّاد الرَّاوِیَہ [رَکَ بآں] کا دعوٰی تھا کہ وہ اس طرح شروع ہونے والے سات سو قصیدوں سے واقف ہے۔ [بہرحال یہ قصیدہ اس عہد کی قصیدہ نگاری کی مستند ترین مثال ہے۔ موضوعات کے تنوع، عام مضامین کی تکرار، اسلوبِ بیان اور ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے اس کا شمار روایتی شاعری کے اچھے نمونوں میں ہو سکتا ہے۔ اس میں پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے ربعِ اوّل میں مدح نگاری کے ضروری عناصر متعین کیے گئے ہیں]۔

یہ قصیدہ اکثر تشطیر اور تخمیس کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے شارحین کی تعداد بے شمار ہے۔ مشہور ترین شارحین میں ثعلب، ابن دُرید، التبریزی (طبع Krenkow، در *ZDMG*، عدد ۶۵، ص ۲۴۱ تا ۲۷۹)، ابن ہشام (طبع Guidi، ۱۸۷۱ء)، ابن حِجّہ، السّیوطی اور الباجوری

www.besturdubooks.wordpress.com

ہیں [براکلمان، ۱ : ۳۸ تا ۳۹ و تکملہ، ۱ : ۶۸ تا ۶۹] ۔ اس قصیدے کو پہلی مرتبہ Lette نے شائع کیا (لائیڈن ۱۷۴۰ء) ۔ بعد کی اشاعتوں میں ہم فریتاغ کی طباعت مع ترجمۂ لاطینی (۱۸۲۳ء) اور Nöldeke (*Delectus*، ۱۱۰ تا ۱۱۴، برلن ۱۸۴۰ء) کا ذکر کر سکتے ہیں ۔ راقم نے ایک ایڈیشن مع فرانسیسی ترجمہ اور دو غیر مطبوعہ شرحیں شائع کی ہیں (الجزائر ۱۹۱۰ء) ۔ [اس کا دیوان، مع شرح، السکری عبدالعزیز المیمنی کی تصحیح سے دارالکتب المصریہ قاہرہ کے اہتمام سے شائع ہوا ہے] ۔

مآخذ : (۱) R. Basset. : *La Bânat Socâd*، ص ۱۴ تا ۸۲، نیز اس کتاب میں مذکور مصنفین : ص ۹ تا ۱۳؛ (۲) ابن سلّام الجُمحی : طبقات الشعراء، طبع Hell، لائیڈن ۱۹۱۶ء، ص ۲۰ تا ۲۶ ۔

(R. Basset [و ادارہ])

* **کعبؓ بن مالک** : ابو عبداللہ [نیز ابو عبدالرحمٰن، دیکھیے تہذیب التہذیب، ۸ : ۴۰۳]، مدینۂ منورہ میں بنو خزرج کے قبیلۂ سَلَمہ سے تھے ۔ وہ عہد جاہلیّت میں مدینہ منورہ کی خونریز قبائلی جنگوں میں حصّہ لینے کے بعد ہجرت سے پہلے اسلام لے آئے تھے؛ چنانچہ عقبۂ ثانیہ [رکِ بآں] کی مہتم بالشّان بیعت میں وہ بھی شریک تھے ۔ کعبؓ شاعر تھے اور حسّانؓ بن ثابت [رکِ بآں] اور عبدالرّحمٰنؓ بن رواحہ کی طرح حضرت نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی فرمائش پر مسلمانوں کے جنگی کارناموں کا ذکر کرتے اور دشمنوں کے معاندانہ اشعار کے جواب میں شعر کہتے تھے ۔ وہ غزوۂ بدر [رکِ بآں] میں شریک نہیں ہو سکے، لیکن دوسرے متعدد غزوات میں حصّہ لیا؛ چنانچہ غزوۂ احد میں باوجودیکہ انھیں زخم لگ چکے تھے انھوں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو، جن کے بارے میں خیال تھا کہ زخمی ہو کر شہید ہو گئے، تلاش کر لیا ۔ بایں ہمہ وہ ان معدودے چند صحابہ میں سے تھے جو باوجود اپنے جذبۂ ایثار و جان نثاری کے تبوک کے پُرخطر غزوے میں شریک نہ ہو سکے ۔ اس پر انھیں سخت ندامت ہوئی ۔ سخت آزمائش کے بعد انھیں معاف کر دیا گیا (دیکھیے ۹ [التوبۃ] : ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۱۸ ببعد) ۔ یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ کعب ہی غسانیوں [رکِ بہ غسّان، بنو] سے اپنے قبیلے کے تعلقات پر بار بار زور دیتے اور کعب ہی سے ایک غسّانی سردار نے مدینۂ منورہ اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے قطع تعلق کرنے کے لیے کہا تھا ۔

ان کی وفات ۵۳ھ/۶۷۳ء میں ہوئی جب وہ اپنی بصارت کھو چکے تھے ، مگر ایک دوسرے قول کے مطابق ۵۰ھ میں ہوئی [اور ہیثم بن عدی اور ابن حجر کے نزدیک اس زمانے میں جب حضرت علیؓ شہید ہوے (تہذیب التہذیب، ۸ : ۴۴۱)] ۔ کعبؓ بن مالک کے کلام میں جذبۂ حبّ الوطنی کے ساتھ اسلام کے لیے بھی حقیقی جوش پایا جاتا ہے ۔

مآخذ (۱) ابن ہشام، ص ۲۹۴ تا ۳۰۱، ۳۱۰، ۵۷۵، ۸۹۶، ۹۰۷ تا ۹۱۳ (اشعار : ص ۵۲۰ تا ۸۷۱، بمواضع کثیرہ؛ (۲) المبرّد : الکامل، ص ۶۶؛ (۳) ابن قتیبہ : کتاب الشعر، طبع ڈخویہ، ص ۱۸۰؛ (۴) الطبری، طبع ڈخویہ، ۱ : ۱۲۱۷ تا ۱۲۲۵، ۱۴۰۶، ۱۶۹۵، ۱۷۰۵، ۲۹۳۷، ۳۰۴۹، ۳۰۶۲، ۳۰۷۰؛ (۵) الواقدی، مترجمۂ Wellhausen، ص ۱۱۳، ۱۲۳، ۱۳۶، ۱۶۹، ۳۲۶، ۳۹۳، ۴۱۱ تا ۴۱۴؛ (۶) الاغانی، ۱۵ : ۲۶ تا ۳۲؛ (۷) النووی : تہذیب التہذیب، طبع Wüstenfeld، ص ۲۳ ببعد؛ (۸) *Bibl. Geogr. Arab.*، ۷ : ۲۲۴؛ [(۹) البخاری، مطبوعۂ قاہرہ، ۳ : ۵۹ ببعد].

(Fr. Buhl)

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

* **کَعب الاَحبَار**: ابو اسحٰق کعب بن ماتع بن هَیسُوع، عربوں کے یہاں اسرائیلیات میں قدیم ترین مستند راوی۔ وہ یہود یمن میں سے تھے۔ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ یا حضرت عمر رضؓ کے عہد خلافت میں اسلام قبول کیا اور بسبب اپنی فراواں دینی معلومات (بالخصوص بائبل میں) کعب الاحبار یا کعب الحبر (= ربّی کعب) کہلائے۔ Lidzbarski (*De Propheticis, quae dicuntur, legendis arabicis*، لائپزگ ۱۸۹۳ء، ص ۳۴ ببعد) کا خیال ہے کہ کعب کا عبرانی نام عَقِیبا یا یَعقُوب تھا، جو عربی میں بدل کر کعب ہوگیا۔ حبر یا حِبر (جمع: احبار) عبرانی لفظ حابِر سے مشتق ہے، جو بابل کے یہودی ارباب علم و فضل کا لقب تھا، مگر باعتبار مرتبہ "ربی" سے کم تھا۔ الخوارزمی نے بھی یہی کہا ہے کہ حبر یہود کا ایک لقب ہے، جو عربی لفظ "عالم" کا مترادف ہے (مفاتیح العلوم، طبع van Vloten، ص ۳۵)۔ کعب کی زندگی اور تصنیفات کے بارے میں ہماری معلومات بڑی محدود ہیں۔ بقول الطبری، کعب کے تعلقات حضرت عمر رضؓ سے نہایت گہرے تھے، چنانچہ جب وہ بیت المقدس تشریف لے گئے (۱۵ھ/۶۳۶ء، الطبری، ۱: ۲۴۰۸) تو کعب ان کے ہمراہیوں میں تھے اور ۱۷ھ (۶۳۸ء) میں وہ مسلمان ہوئے (کتاب مذکور، ص ۲۵۱۴)۔ کہا جاتا ہے کہ ۲۳ھ/۶۴۴ء میں حضرت عمر رضؓ کی وفات کے تین دن پہلے کعب نے ان سے ان کی شہادت کی پیش گوئی کر دی تھی (کتاب مذکور، ص ۲۷۹۲؛ نیز دیکھیے ابن الأثیر، ۳: ۳۲)۔ النووی (تہذیب، طبع Wüstenfeld، ص ۵۲۳) کا بیان ہے کہ کعب اگرچہ عہد رسالت میں موجود تھے، لیکن کبھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خدمت میں حاضر نہ ہوئے۔ ابو الدرداء رضؓ الانصاری [رک بآں] فرماتے ہیں کہ کعب الاحبار بہت بڑے عالم تھے حتّٰی کہ ان کی وسعت علم اور ثقاہت کے بارے میں کسی کو بھی اختلاف نہیں (النووی: کتاب مذکور)۔ حضرت عمر رضؓ کے عہد خلافت میں وہ یمن سے مدینہ آئے اور پھر شام میں حمص چلے گئے۔ حضرت معاویہ رضؓ نے، جو اس وقت شام کے والی تھے، کعب کو اپنے دربار میں بحیثیت استاد اور مشیر سلطنت کے جگہ دی۔ جب حضرت عثمان رضؓ اور ان کے مخالفین کے مابین خصومت بپا ہوئی تو کعب نے حضرت عثمان رضؓ کی بڑے زور سے طرفداری کی (ابن الأثیر، ۳: ۵۶)۔ حضرت عثمان رضؓ کے عہد خلافت میں انھوں نے بمقام حمص وفات پائی (۳۲ھ/۶۵۲ء یا ۳۴ھ/۶۵۴ء، دیکھیے الطبری، ۳: ۲۴۷۴ ببعد) اور انھیں حمص ہی میں دفن کیا گیا۔ گیا۔ بقول بعض (ابن بطوطہ، طبع Defremery و Sanguinetti، ۱: ۲۲۲؛ یاقوت: معجم، ۲: ۵۹۵) وہ دمشق میں فوت ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔ عبداللہ بن عبّاس رضؓ [رک بآں]، جو قرآن مجید کے قدیم ترین مفسرین میں سے ہیں، اور ابو ہریرہ رضؓ [رک بآں] ان کے مشہور ترین شاگرد ہیں۔

کعب نے جو بھی تعلیم دی، زبانی دی۔ بہرحال اس امر کا بیان کہیں بھی نہیں کہ انھوں نے کوئی کتاب بھی لکھی ہے۔ کعب سے بکثرت اقوال منسوب ہیں۔ ان میں سے بعض اقوال الطبری کے ہاں منقول ہیں اور ان کا ثبوت ربّانی یا کلیسائی بطریقی روایات میں ملتا ہے (مثلاً دیکھیے Lidzbarski: کتاب مذکور، ص ۳۸ ببعد)۔ ابن قتیبہ اور النووی جیسے معتبر مؤرّخین نے ان کے اقوال کا بالکل ذکر نہیں کیا اور کیا بھی ہے تو الطبری کی طرح شاذ و نادر۔ اس کے برعکس الثعالبی اور الکسائی جیسے قصّہ نویسوں نے بار بار اس سے استناد کیا ہے۔ *Leyendas de José* (ہسپانوی رسم الخط میں طبع F. Guillen Rablies: *Leyendas de José hijo de Jacob y de Alejandro*

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Magno، سرقسطہ ۱۸۸۸ء) میں بہرحال اس کی حیثیت ایک ایسے راوی کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا تمام مواد شاید کعب ہی سے روایت ہے۔ ناشر نے کعب الاحبار (ہسپانوی رسم الخط میں Cab Alajbar، ص ۴، تعلیقہ ۲) کا ترجمہ Caab el historiador یعنی کعب مؤرخ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بھی فان ہامر von Hammer کی طرح (دیکھیے Lidzbarski : کتاب مذکور، ص ۲۶، تعلیقہ ۴) احبار کو اخبار پڑھا اور اسی لیے وہ اسے el narrador یا el cronista، یعنی وقائع نگار، لکھتا ہے۔ یہ عربی ہسپانوی روایت، بالخصوص اس کا پہلا باب، زیادہ تر الثعالبی کے قصۂ یوسف کا لفظ بلفظ ترجمہ ہے۔ پھر جہاں اس نے دیگر محدّثین کا ذکر کیا ہے یا کسی کا بھی ذکر نہیں کیا، وہاں وہ کعب ہی کا حوالہ دیتا ہے۔ الثعالبی کے قصے میں کعب کا بطور سند صرف پانچ مرتبہ ذکر کیا گیا ہے۔ پہلی مرتبہ یہ ذکر حضرت یوسف کی پیدائش اور حسن و جمال کے تمہیدی بیان میں آیا ہے (قصص الانبیاء، ص ۶۱ سطر ۴) ۔ *Leyenda* میں یہ عبارت موجود نہیں ہے کیونکہ اس کا پہلا صفحہ ضائع ہو چکا ہے۔ *Leyanda* اور الثعالبی کے بیانات میں مماثلت ابتدائی صفحات ہی میں نظر آ جاتی ہے (*Leyenda*، ص ۳ س ۴ = الثعالبی، ص ۶۲ س ۲۳)، جہاں یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالٰی نے یعقوب علیہ السلام کے صحن خانہ میں ایک درخت اگایا، چنانچہ جیسے ہی ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا تو اس کی ایک شاخ نکل آتی؛ پھر جیسے جیسے لڑکا بڑھتا جاتا ایسے ہی شاخ بھی بڑھتی جاتی، حتّٰی کہ لڑکا بالغ ہو جاتا اور یعقوب[ع] اس ٹہنی کو کاٹ کر اس لڑکے کے حوالے کر دیتے۔ الثعالبی نے خود یہاں ایک عام حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ روایت ان لوگوں کی ہے "جو انبیا کے حالات اور قدیم تاریخ سے واقف ہیں"؛ *Leyenda* میں چوتھے ہی صفحے پر اور اس کے بعد تقریبًا ہر صفحے پر کعب کا حوالہ بطور راوی موجود ہے۔ الثعالبی کے قصے کے ساتھ مزید موازنے سے واضح ہوتا ہے اس کا اس کثرت سے کعب کا حوالہ دینا بالکل من گھڑت سی بات ہے۔ الکسائی (قصص الانبیاء، ص ۳۵۱ تا ۳۸۲) نے اس قصے میں کعب کو صرف ایک مرتبہ، یعنی ابتدا میں، بطور سند پیش کیا ہے جہاں یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالٰی نے ابراہیم علیہ السّلام کو پانچ قیمتی تحفے عطا کیے، جو آگے چل کر سب کے سب حضرت یوسف[ع] کے قبضے میں آ گئے اور اسی باعث ان کے بھائیوں نے ان سے حسد کیا۔ اس کے بعد حضرت یوسف[ع] اور حضرت یعقوب[ع] کے خواب کا قصّہ آتا ہے (دیکھیے Weil : *Biblische Legenden der Musulmanner*، ص ۱۰۱)۔ فردوسی کی یوسف و زلیخا کی صرف ایک عبارت (طبع Ethe، در *Anecdota Oxoniensa*، سلسلۂ آریائی، ۶/۱ (۱۹۰۸ء) : ۲۵۸ تا ۲۵۹۹) کعب کا بطور راوی صرف ایک حوالہ ملتا ہے، جہاں فردوسی نے کہا ہے کہ سب سے پہلے کعب نے یہ بات کہی اور کعب ہی سے یہ صحیح روایت مجھے پہنچی۔ اس کے بعد شاہ مصر (جسے یہاں وہ نطروس یا خطروش کہتا ہے، کنیت ابوالحسن) اور اس کے وزیر ریان بن الولید (جس کا نام انجیل میں فوطیفار Potiphar آیا ہے) اور اس کی بیوی زلیخا اور مجمع عام میں حضرت یوسف[ع] کی نیلامی کا ذکر آتا ہے۔ الطبری (۱ : ۳۷۱ تا ۳۱۳) حضرت یوسف[ع] کا قصہ بیان کرتے ہوئے کعب کا مطلقًا ذکر نہیں کرتا۔ اس کے برعکس الثعالبی، الکسائی اور فردوسی اسی قصے میں مختلف مگر ایک سی عبارات میں بطور سند کے کعب کا ذکر کرتے ہیں، جس سے اس مفروضے کو تقویت

www.besturdubooks.wordpress.com

پہنچتی ہے کہ یہ نام بعد کی ایجاد ہے نہ صرف موری (Moresco) افسانے بلکہ الثعالبی، الکسائی اور فردوسی میں بھی۔

مآخذ: (۱) ابن سعد، طبع Sachau، ج ۷/۲: ۱۵۶؛ (۲) الطبری: تاریخ، بمدد اشاریہ؛ (۳) ابن قتیبہ: کتاب المعارف، طبع وُسٹنفلڈ، ص ۲۱۹؛ (۴) ابن الأثیر: ٹورنبرگ، ۳: ۱۲۱؛ (۵) ابن حجر: الاصابہ، ۳: ۶۳۵ تا ۶۳۹؛ (۶) وہی مصنف: تہذیب التہذیب، حیدرآباد ۱۳۲۹ھ، ۸: ۴۳۸ تا ۴۴۰؛ (۷) النووی، بذیل مادّہ؛ (۸) الاغانی، ۲: ۵۰؛ (۹) Weil: *Biblische Legenden der Musulmänner*، ص ۱۰؛ (۱۰) شپرنگر: *Das Leben und die Lehre des Mohammed*، ۳: ۱۰۹ حاشیہ ۲؛ (۱۱) M. Grünbaum: *Zu Schlechta-Wssehrds Ausgabe des Jussuf und Suleicha*، در *ZDMG*، ۴۴: ۴۵۸، ۴۷۷؛ (۱۲) Lidzbarski، بذیل مادّہ، ص ۳۱ تا ۴۰؛ (۱۳) H. Hirschfeld: *Ka'b al-Ahbar*، بذیل مادّہ؛ *Jewish Encyclopedia*، ۷: ۴۰؛ (۱۴) M. Schmidt: *Uber das altspanische Poema de Jose*، در *Roman. Forschungen*، ۹ (۱۹۰۱ء): ۳۲۱؛ (۱۵) G. Salzberger: *Die Salomosage in der semit. Literatur*، Heidelberg Diss: (برلن ۱۹۰۷ء)، ص ۱۹؛ (۱۶) B. Chapira: *Legendes bibliques attribuees a Ka'b al-Ahbar*، در *Rev. des Etudes Juives* ۶۹: ۸۶، ببعد؛ ۷۰: ۳۷ ببعد۔

(M. SCHMITZ)

⊗ * کعبہ: دنیا میں خدا کا پہلا گھر (بیت اللہ) اور مسلمانوں کا قبلہ جو مکّۂ مکرمہ میں مسجد الحرام کے تقریباً عین وسط میں واقع ہے۔

(۱) کعبہ، اسمائے کعبہ اور جوارِ کعبہ:

[علما نے کعبے کے چند اسما لکھے ہیں:

(۱) کعبہ: یہ نام کعبے کی تکعیب، یعنی مربّع ہونے، کی وجہ سے پڑ گیا ہے۔ لغت کے اعتبار سے ہر بلند اور مربع عمارت کو کعبہ کہتے ہیں (دیکھیے الفاسی: شفاء الغرام، ۱: ۱۲۶، بحوالۂ قاضی عیاض: المشارق؛ النووی: تہذیب الاسماء و اللغات)؛ (۲) البیت الحرام؛ (۳) بکّہ: بکّہ کے معنی توڑ دینے کے ہیں۔ کعبے کو بکہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ سرکش لوگوں کی گردنوں کو توڑ دیتا ہے۔ یہ نام مکّۂ مکرمہ کا بھی ہے؛ (۴) البیت العتیق: چونکہ یہ گھر سرکش لوگوں کے تصرف سے آزاد رہا ہے، اس لیے اس کو یہ نام دیا گیا۔ ابن الأثیر (النہایہ) اور الازرقی (اخبار مکۃ) نے کعبے کے کچھ اور نام بھی ذکر کیے ہیں (دیکھیے الفاسی: شفاء الغرام، ۱: ۱۲۷)]۔

کعبے کا نام، جو دراصل اسم علم نہیں، خانۂ کعبہ کی مکعب نما شکل سے تعلق رکھتا ہے، لیکن یہ عمارت صرف سرسری نظر میں مکعب نما ہے ورنہ حقیقت میں اس کا نقشہ ایک بے قاعدہ مستطیل کا ہے۔ وہ دیوار جس کا رخ شمال مشرق کی طرف ہے اور جس میں دروازہ ہے (یعنی کعبے کے سامنے کا رخ) اور مقابل کی دیوار (کعبے کی پشت) چالیس چالیس فٹ لمبی ہیں، دوسری دو پینتیس پینتیس فٹ؛ بلندی پچاس فٹ ہے۔

کعبے کی عمارت میں سیاہی مائل بھورے پتھر کے ردّے استعمال کیے گیے ہیں، جو مکے کے اردگرد کے پہاڑوں میں ملتا ہے۔ عمارت کی کرسی (شادرواں) سنگ مرمر کی ہے۔ یہ دس انچ اونچی ہے اور کوئی فٹ بھر دیواروں سے باہر نکلی ہوئی ہے۔ کعبے کے مرکز سے اگر چار لکیریں چاروں کونوں (ارکان) سے گزرتی ہوئی کھینچی جائیں تو وہ کم و بیش قطب نما کی چار جہتوں کا پتا دیں گی۔ اگر چاروں دیواروں کے مرکزوں سے عمودی خط کھینچے جائیں تو ان کی سمت شمال مشرق، شمال مغرب، جنوب مغرب اور جنوب مشرق ہوگی۔

www.besturdubooks.wordpress.com

شمالی کونہ الرّکن العراقی کہلاتا ہے، مغربی الرّکن الشامی، جنوبی الرّکن الیمانی اور مشرقی (حجر اسود کی رعایت سے) الرّکن الاسود۔

کعبے کی چاروں دیواریں ایک سیاہ پردے یا غلاف (کِسوۃ) سے ڈھکی رہتی ہیں، جو زمین تک لٹکتا ہے اور جس کا زیریں کنارہ تانبے کے ان حلقوں سے بندھا رہتا ہے جو شادروان میں جڑے ہوے ہیں۔ [کعبے کو غلاف پہنانے کا رواج قدیم ترین زمانے سے چلا آ رہا ہے اور اسلام نے اس کو باقی رکھا۔ اس سلسلے میں پہلا نام تُبّع اسعد الحمیری کا لیا جاتا ہے (شفاء الغرام، ۱: ۱۱۹)۔ قبل از اسلام خالد بن جعفر بن کلاب نے کعبے کو ریشمی غلاف پہنایا۔ جب قریش مکہ نے از سر نو کعبے کی تعمیر کی تو اسے خوبصورت غلاف پہنایا۔ الازرقی کے مطابق رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے کعبے کو یمنی کپڑے کا غلاف پہنایا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اپنے اپنے عہد خلافت میں عمدہ مصری کپڑے کا غلاف چڑھاتے رہے۔ حضرت عثمانؓ اوپر نیچے دو غلاف چڑھایا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت معاویہؓ بھی ریشمی غلاف چڑھایا کرتے تھے۔ ہر سال محرم کی دسویں تاریخ کو کعبے پر غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ آگے چل کر خلفاے بنو امیّہ میں سے یزید بن معاویہؓ اور عبدالملک بن مروان اور عباسی خلفا میں سے خلیفہ مأمون الرّشید اور المتوکل نے بھی اس رسم کو قائم رکھا۔ خلیفہ مأمون نے تین غلاف چڑھانے شروع کیے: (۱) سرخ ریشمی غلاف، ذُوالحجہ کی آٹھویں تاریخ (یوم التّرویۃ) کو؛ (۲) قباطی (مصری) غلاف، یکم رجب کو؛ (۳) سفید ریشمی غلاف، ۲۷ رمضان المبارک کو۔ تفصیل کے لیے دیکھیے السہیلی: الروض الانف، مطبوعۂ قاہرہ، ۱: ۱۲۹ تا ۱۳۰؛ سیرۃ ابن ہشام، مطبوعۂ قاہرہ، ۱: ۱۹۹؛ الفاسی: شفاء الغرام، ۱: ۱۱۹ تا ۱۲۶]۔

پردے میں صرف دو شگاف ہیں: ایک میزاب (پر نالے) کے لیے اور دوسرا دروازے کے لیے۔ کِسوۃ مدت تک ہر سال مصر میں تیار ہوتا رہا، پھر ہند اور پاکستان میں بھی تیار ہوتا اور حاجیوں کے ایک خاص قافلے کے ہمراہ مکّے پہنچتا رہا۔ اب یہ غلاف کعبہ مقامی دارالکِسوۃ میں تیار ہوتا ہے۔ پرانا غلاف ۲۵ (یا البتنونی کے مطابق ۲۸) ذوالقعدہ کو اتار دیا جاتا تھا اور عارضی طور پر ایک سفید غلاف، جو زمین سے تقریباً چھے فٹ اونچا رہتا تھا، چڑھا دیا جاتا تھا۔ اس موقع پر کہا جاتا تھا کہ کعبے نے احرام باندھ لیا۔ [ابن جُبیر نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ ۲۷ ذوالقعدہ کو کعبے کے غلاف کو آٹھ نو فٹ اوپر کی جانب چاروں طرف سے سمیٹ دیا جاتا ہے۔ اسے کعبے کا احرام کہا جاتا ہے۔ بقول ابن جبیر ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے۔ الفاسی (شفاء الغرام، ۱: ۱۲۴) کے مطابق ان کے زمانے میں ۲۵ ذوالقعدہ کو ہر سال کعبے کے غلاف کو اوپر کی جانب چاروں طرف سے سمیٹ دیا جاتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ عمل پہلے عصر کی نماز کے بعد انجام دیا جاتا تھا پھر دن کے آغاز میں اس کا رواج ہو گیا]۔ حج کے اختتام پر نیا غلاف چڑھا دیا جاتا ہے۔ دروازے کے لیے ایک علٰحدہ پردہ ہوتا ہے، جسے البرقع کہتے ہیں۔

کِسوۃ سیاہ کمخواب کا ہوتا ہے، جس میں کلمۂ شہادت بُنا ہوتا ہے۔ اس کی دو تہائی بلندی پر ایک زردوزی کے کام کی پٹی (حِزام) ہوتی ہے، جس پر قرآن مجید کی آیات خوشخط لکھی ہوتی ہیں۔ غلاف کعبہ ہر سال بدلا جاتا ہے اور اس کی ذرا سی کترن بھی تبرّک سمجھی جاتی

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

ہے؛ چنانچہ بنو شیبہ، جو کعبے کے دربان چلے آتے ہیں، اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تبرک کے طور پر تقسیم اور بعض اوقات فروخت کر دیا کرتے تھے [مگر اب سعودی عرب کی حکومت کعبے کی متولّی ہے اور موجودہ حکومت نے غلاف کے اجزا کو فروخت کرنے کی ممانعت کر دی ہے] .

شمال مشرقی دیوار میں زمین سے کوئی سات فٹ اونچا کعبے کا دروازہ ہے، جس کے کچھ حصوں پر چاندی کے پترے چڑھے ہوے ہیں ۔ Burckhardt اور علی بے کے زمانے میں ہر رات دہلیز پر شمعوں کی قطار جلا کرتی تھی ۔ [مگر موجودہ دور میں برقی روشنی کی وجہ سے اس کا رواج باقی نہیں رہا] ۔ جب دروازہ کھلتا ہے تو ایک پہیے دار زینہ (دَرَج یا مِدْرَج) دھکیل کر اس کے برابر لگا دیا جاتا ہے ۔ یہ زینہ جب استعمال میں نہیں ہوتا تو چاہ زمزم اور باب بنو شیبہ کے درمیان کھڑا رہتا ہے (Snouck Hurgronje : *Bilderatlas zu Mecca*، عدد ۲؛ زینے کی تصویر کے لیے دیکھیے علی بے : *Travels*، ۲ : ۸۰ .

کعبے کی چھت تین چوبی ستونوں پر قائم ہے، جس پر پہنچنے کے لیے ایک سیڑھی بھی ہے ۔ یہاں بہت سی سنہری اور روپہلی قندیلیں لٹک رہی ہیں؛ اس کے سوا اور کوئی ساز و سامان نہیں ۔ اندرونی دیواروں پر عمارت کی تجدید و مرمت کے متعلق کئی کتبے ہیں ۔ فرش سنگ مرمر کی سلوں کا ہے .

بیرونِ کعبہ مشرقی کونے میں، فرش سے تقریباً پانچ فٹ بلندی پر، دروازے کے قریب ہی الحجر الاسود (سیاہ پتھر) دیوار میں نصب ہے ۔ اب اس کے تین بڑے اور کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں جو ایک دوسرے سے پیوست ہیں ۔ ان کے گرد ایک پتھر کا ہالہ ہے اور اس ہالے پر ایک چاندی کا حلقہ چڑھا ہوا ہے ۔ حجر اسود کی سطح زائرین کے چھونے اور چومنے سے گھس گھس کر صاف شفاف ہو گئی ہے ۔ علی بے (۲ : ۷۶) نے اس کا ایک خاکہ دیا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ سطح میں اونچ نیچ سی پیدا ہو گئی ہے ۔ البتنونی (ص ۱۰۵) کے اندازے کے مطابق اس کا قطر بارہ انچ ہے ۔ حجرِ اسود کی رنگت سرخی مائل سیاہ ہے جس میں سرخ اور زرد ریزے جھلکتے ہیں .

دیوار کا وہ حصہ جو حجر اسود اور دروازے کے درمیان ہے، اَلْمُلْتَزَم (= جہاں چمٹا جائے) کہلاتا ہے کیونکہ طواف کرنے والے دعا اور اِلْحاح و زاری کرتے وقت اس دیوار (الملتزم) سے لپٹ جاتے ہیں .

کعبے کے باہر کی طرف ایک سنہری پرنالہ (مِیْزاب) شمال مغربی دیوار کے بالائی کنارے سے نیچے نکلا ہوا ہے، جس کا لٹکا ہوا سرا میزاب کی داڑھی کہلاتا ہے ۔ یہ پرنالہ "میزاب الرحمۃ" کے نام سے موسوم ہے (دیکھیے Ben Cherif : *Aux Villes saintes de l'Islam*، ص ۷۵) ۔ بارش کا پانی پرنالے کے ذریعے نیچے پتھر کے فرش پر گرتا ہے، جو اس جگہ پچی کاری سے مزین ہے ۔ کعبے کے چاروں طرف سنگ مرمر کا فرش ہے .

شمال مغربی دیوار کے سامنے، مگر اس سے جدا، سفید سنگ مرمر کی ایک نیم مدوّر دیوار (حَطِیْم) ہے ۔ یہ تین فٹ اونچی اور تقریباً پانچ فٹ موٹی ہے ۔ اس کے سرے کعبے کے شمالی اور مشرقی کونوں سے تقریباً چھے فٹ کے فاصلے پر ہیں ۔ حطیم اور کعبے کے درمیان جو نصف دائرے کی شکل کا قطعہ ہے اسے خاص تقدس حاصل ہے ۔ دراصل یہ کعبے کا حصہ ہے، اسی لیے طواف کے وقت اس کے اندر داخل نہیں ہوتے بلکہ اس کے گرد ہو کر، جس قدر قریب ممکن ہو، گزرتے ہیں ۔ یہ قطعہ الحِجر یا [حِجْر اسمٰعیل[۴]]

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کے نام سے موسوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہؑ یہیں مدفون ہیں۔ وہ فرش جس پر طواف کیا جاتا ہے، مطاف کہلاتا ہے۔

[مطاف اور اس کے گرد و نواح کی صورت ہمیشہ یکساں نہیں رہی، البتہ مطاف میں داخل ہونے والا دروازہ (باب السلام) بدستور قائم ہے۔ ۱۹۵۶ء کی توسیع و تزئین کے دوران میں مطاف میں نیا فرش لگایا گیا تھا] ۔کچھ عرصہ پہلے مطاف کے ساتھ ساتھ اکتیس یا بتیس نازک پتلے ستون نصب تھے اور ہر دو ستونوں کے درمیان سات قندیلیں آویزاں تھیں جو شام کے وقت روشن کی جاتی تھیں۔ [اب روشنی کے لیے بجلی کی جدید خوبصورت ٹیوبیں نصب کی گئی ہیں] ۔ باب بنی شیبہ ایک محراب ہے، جو کعبے کی شمال مشرقی دیوار کے مقابل واقع ہے اور جہاں سے مطاف میں داخل ہوتے ہیں۔ اس محراب اور کعبے کے درمیان ایک چھوٹی سی قبّہ دار عمارت ہے، جو مقام ابراہیمؑ کہلاتی ہے۔ اس میں ایک پتھر رکھا ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ تعمیر کعبہ کے وقت اس پر کھڑے ہوئے تھے۔ مشرقی سیاحوں اور مؤرخوں کے بیان کے مطابق یہ ایک نرم پتھر ہے، جس پر حضرت ابراہیمؑ کے نقش قدم اب تک دکھائی دیتے ہیں۔ المہدی بن المنصور عباسی (م ۱۶۹ھ) کے عہد خلافت میں اس پتھر پر حفاظت کے لیے ایک سنہری حلقہ چڑھا دیا گیا تھا۔ مقام ابراہیم کے علاوہ اسی شمال مشرقی دیوار کعبہ کے سامنے، مگر مقام ابراہیمؑ سے ذرا شمال کی طرف، سفید سنگ مرمر کا منبر ہے۔ باب بنی شیبہ کے نزدیک مدخل کے بائیں ہاتھ اور حجر اسود کے عین سامنے وہ "قبہ" ہے جس کے اندر چاہ زمزم واقع ہے۔ فرش زمین پر کمرے کے اندر یہ ایک کنواں ہے، جو تمام کا تمام پختہ ہے۔ اس پر برقی رو سے چلنے والے ٹیوب ویل (Tube well) لگے ہوئے ہیں۔ سپاٹ چھت کے ایک حصے پر چھوٹا سا مسقّف مصلّٰی ہے، جس کے اوپر ایک گنبدی سی بنی ہے۔ [۱۹۵۶ء کی تعمیر و توسیع کے سلسلے میں صفا و مروہ کا سارا راستہ بڑی خوبصورتی سے پختہ اور مسقّف کر دیا گیا ہے] ۔

(۲) تاریخ کعبہ

[کعبے کی تعمیر کے سلسلے میں مختلف روایات مذکور ہیں۔ بقول الازرقی (اخبار مکہ) کعبے کو سب سے پہلے فرشتوں نے تعمیر کیا۔ اس وقت حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے اثبات میں وہ حضرت زین العابدینؒ سے منقول ایک روایت پیش کرتے ہیں۔ مزید براں حضرت ابن عباسؓ سے بھی اس سلسلے میں ایک روایت منقول ہے۔ النووی نے بھی اپنی کتاب تہذیب الاسماء و اللغات میں فرشتوں کی تعمیر کعبہ کا ذکر کیا اور اسے کعبے کی اوّلین تعمیر قرار دیا ہے۔ اس کے بعد حضرت آدمؑ نے کعبے کو تعمیر کیا۔ اس کے اثبات میں البیہقی نے دلائل النبوۃ میں ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالٰی نے جبریلؑ کو حضرت آدم و حوّاء کی طرف بھیجا اور ان کو کعبے کی تعمیر کا حکم دیا؛ چنانچہ انھوں نے تعمیل ارشاد کی۔ جب تعمیر مکمل ہوگئی تو ان کو طواف کا حکم دیا گیا۔ پھر مرور زمانہ کے بعد حضرت نوحؑ نے کعبے کا حج کیا۔ الازرقی نے بھی آدم علیہ السلام کی تعمیر کعبہ کا ذکر کیا اور اس کی تائید میں دو روایات نقل کی ہیں۔ مشہور محدّث عبدالرزاق اپنی کتاب المصنف میں لکھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے کعبے کی تعمیر میں پانچ پہاڑوں یعنی لبنان، طور زیتا، طور سیناء، الجودی اور حراء کے پتھر استعمال کیے۔ بقول المحب الطبری کعبے

www.besturdubooks.wordpress.com

کی بنیادوں میں حراء کے پتھر استعمال کیے گئے تھے۔ حضرت آدمؑ کی تعمیر کے بعد ان کے بیٹے شیثؑ نے بھی کعبے کی تعمیر ثانی میں حصہ لیا تھا ۔ اس کے بعد حضرت ابراھیم علیہ السلام کی تعمیر کا ذکر تو خود قرآن مجید نے کیا ھے ۔ ابن الحاج المالکی کہتے ھیں کہ حضرت ابراھیمؑ نے کعبے کی جو بنیاد رکھی وہ پچھلی جانب سے گول تھی ۔ اس کے دو کونے (رکن) تھے اور دونوں رکن یمانی کہلاتے تھے ۔ قریش نے تعمیر کعبہ کے وقت اس کے چار ارکان تعمیر کیے (دیکھیے شفاء الغرام، ۱ : ۹۲، ۹۳) .

الفاکہی حضرت علیؓ سے نقل کرتے ھیں کہ حضرت ابراھیمؑ کا تیار کردہ کعبہ جب گر گیا تو قبیلۂ جرھم نے اس کو تعمیر کیا ۔ جب مرور زمانہ سے کعبے کی عمارت پھر منہدم ھوگئی تو عمالقہ نے اس کو تعمیر کیا ۔ بعد ازاں قریش نے کعبہ تعمیر کیا ۔ المسعودی کا بیان ھے کہ قبیلۂ جرھم میں سے جس شخص نے کعبے کو تعمیر کیا اس کا نام الحارث بن مضاض الاصغر تھا ۔ الزّبیر بن بکّار قاضی مکّہ نے کتاب نسب قریش و اخبارھا میں قُصّی بن کلاب کی تعمیر کعبہ کا ذکر بھی کیا ھے ۔ الماوردی (الاحکام السلطانیہ) نے لکھا ھے کہ حضرت ابراھیمؑ کی تعمیر کے بعد قریش میں قُصّی بن کلاب پہلا شخص تھا جس نے کعبے کو از سر نو تعمیر کیا (شفاء الغرام، ص ۹۲ تا ۹۵؛ السہیلی : الروض الانف، ص ۱۲۷ تا ۱۳۰) .

جب ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں یمن کا حاکم اَبْرھہ کعبے کو ڈھانے کے لیے مکے پر حملہ آور ھوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی حفاظت خود فرمائی اور اس کی فوج کو نیست و نابود کر دیا [رک بہ ابرھہ، نیز اصحاب الفیل] .

یہ واقعہ مُزْدَلِفَہ اور مِنٰی کے درمیان وادی محسّب کے قریب مُحَسِّر کے مقام پر پیش آیا تھا ۔ مسلم اور ابو داؤد کی روایات میں مذکور ھے کہ حجّۃ الوداع کے سفر میں رسُولُ اللہ صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم جب مزدلفہ سے مِنٰی کی طرف چلے تو مُحَسِّر کی وادی میں آپؐ نے رفتار تیز کر دی ۔ امام النّووی اس کی شرح کرتے ھوے لکھتے ھیں کہ اصحاب الفیل کا واقعہ اسی جگہ پیش آیا تھا ۔ اس لیے سنت یہی ھے کہ آدمی یہاں سے جلدی گزر جائے .

جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اھل عرب اسے عام الفیل (ھاتھیوں کا سال) کہتے ھیں ۔ اسی سال رسولُ اللہ صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی ولادت مبارکہ ھوئی ۔ محدثین اور مؤرخین کا اس بات پر قریب قریب اتفاق ھے کہ اصحاب الفیل کا واقعہ محرم میں پیش آیا تھا اور حضورؐ کی ولادت ربیع الاوّل میں ھوئی تھی ۔ اکثر مؤرخین کہتے ھیں کہ آپؐ کی ولادت واقعۂ فیل کے ۵۰ دن بعد ھوئی ۔ اسی واقعے کے سلسلے میں سورۃ الفیل نازل ھوئی (دیکھیے ابن ھشام : سیرۃ، ۱ : ۴۳ تا ۵۷؛ السہیلی : الروض الانف، ص ۳۵ تا ۴۸؛ الفاسی : شفاء الغرام، ۱ : ۱۸۹ تا ۱۹۰؛ نیز اردو تفاسیر مثلاً مواھب الرحمن، تفہیم القرآن وغیرہ بذیل تفسیر سورۃ الفیل] .

مستند تاریخ حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ واٰلہ وسلّم کے زمانے ھی سے شروع ھوتی ھے ۔ کہا جاتا ھے کہ جب آپؐ سن بلوغ کو پہنچے تو ایک عورت کے ھاتھ سے جو بخورات جلا رھی تھی کعبے کو آگ لگ گئی اور عمارت تباہ ھو گئی ۔ اتفاق سے انھیں دنوں ایک بوزنطینی جہاز جدے [رک بآں] کے قریب خشکی پر چڑھ گیا تھا اور اھل مکہ اس کی لکڑی اٹھا لائے اور نئی عمارت کے لیے اس کو استعمال کیا ۔ اس ضمن میں ایک شخص باقوم کا نام (یہ نام مختلف صورتوں میں مذکور ھوا ھے)

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ہمیشہ آتا ہے جسے بعض روایات میں جہاز کا کپتان اور بعض میں بڑھئی بتایا گیا ہے جس سے نئی عمارت بنانے کے سلسلے میں مشورہ لیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک قبطی عیسائی تھا [(دیکھیے السہیلی: الروض الانف، ۱: ۱۳۰)۔ السہیلی بھی اس شخص کا نام باقوم بتاتا ہے]۔

کعبے کی قدیم عمارت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ قد آدم اونچی اور غیر مسقّف تھی۔ دھیلز زمین کے برابر تھی جس کی وجہ سے سیلابوں کا پانی آسانی سے اندر داخل ہوسکتا تھا اور سیلاب اکثر آتے رہتے تھے۔ اس دفعہ تعمیر اس طرح ہوئی کہ باری باری سے ایک تہ پتھر کی اور ایک لکڑی کی بنائی گئی اور بلندی پہلے سے دگنی کر دی گئی اور عمارت پر چھت بھی ڈال دی گئی۔ دروازہ زمین سے اتنا اونچا کر دیا گیا کہ داخل ہونے کے لیے سیڑھی درکار تھی۔ ناپسندیدہ زائروں کو دھکے دے کر اونچی دھلیز سے نیچے لڑھکا دیا جاتا تھا۔ جب حجر اسود کو اس کی جگہ پر نصب کرنے کا موقع آیا تو اہل مکہ اس بات پر آپس میں جھگڑنے لگے کہ یہ اعزاز کس کے حصے میں آئے۔ آخر قریش کے معتبر ترین شخص ابو امیّہ بن المغیرہ نے کہا کہ جو شخص سب سے پہلے نمودار ہو وہی یہ خدمت بجا لائے۔ عین اسی وقت حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا وہاں سے گزر ہوا۔ سب پکار اٹھے کہ امین آ گئے، محمد آ گئے، یہ ہمیں پسند ہیں۔ روایت ہے کہ آپؐ نے کمال دانشمندی سے کہا مجھے ایک چادر دیجیے۔ چادر مہیا کر دی گئی آپؐ نے قبائل کے سرداروں سے کہا کہ وہ اس کپڑے کے کونے پکڑ کر لے چلیں۔ پھر آپؐ نے خود پتھر کو اٹھایا اور مقررہ مقام پر رکھ دیا [(ابن ہشام: سیرۃ، مطبوعۂ قاہرہ، ۱: ۱۹۷؛ الروض الانف، ۱: ۱۳۲؛ شفاء الغرام، ۱: ۹۵ و ۹۶)]۔

۸ھ میں فتح مکّہ کے وقت (دیکھیے ذیل میں عنوان ۳) حضرت رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے کعبے کی عمارت کو جوں کا توں رہنے دیا، مگر [ایک حدیث میں آپؐ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا کہ اے عائشہؓ! اگر تیری قوم تازہ تازہ ایمان نہ لائی ہوتی تو میں کعبے کی عمارت میں تبدیلی کرکے دو دروازے بنا دیتا، ایک دروازہ داخل ہونے کے لیے اور ایک نکلنے کے لیے (البخاری: الصحیح، کتاب العلم، باب ۴۸)]۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کا ارادہ تو تھا، لیکن آپؐ نے اس خیال سے اپنے ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنایا کہ مبادا لوگ کسی غلط فہمی کا شکار ہو جائیں اور غلط قسم کی قیاس آرائیاں کرنے لگیں]۔ آپؐ کے ارادے کی تکمیل ۶۴ھ / ۶۸۳ء میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ [رک بآں] کے ہاتھوں معرض عمل میں آئی۔ ان کے مدعی خلافت ہونے کے باعث الحُصَیْن بن نُمَیْر [رک بآں] نے مکے کا محاصرہ کر لیا اور گرد و نواح کی پہاڑیوں پر منجنیقیں گاڑ کر شہر اور حرم پر پتھروں کی بارش شروع کر دی اور بیت اللہ کی عمارت کو بڑا نقصان پہنچایا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے ساتھیوں نے کعبے کے نزدیک اپنے خیمے نصب کر لیے۔ (اس وقت سے وہ العائذ بالبیت، یعنی ایسا شخص جو بیت الحرم میں پناہ گزین ہو، کہلانے لگے)۔ اسی اثنا میں آتشزدگی سے حجر اَسْوَد تین ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔ ابن زبیر نے ان ٹکڑوں کو چاندی کی پٹی کے ساتھ باندھ دیا (شفاء الغرام، ص ۹۸)۔

جب اموی لشکر چلا گیا تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے عمائد مکہ سے کعبے کی شکستہ عمارت کے انہدام اور از سر نو تعمیر کے متعلق مشورہ کیا۔ جب

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

انھوں نے اس بات کا فیصلہ کر لیا اور ملبے کو صاف کرنے اور اٹھانے کا وقت آیا تو کسی کو یہ کام شروع کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ بیشتر شہری حضرت ابن عباسؓ کی سرکردگی میں شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے، کیونکہ انھیں خوف تھا کہ کعبے کے انہدام سے آسمانی عذاب نازل ہوگا، لیکن حضرت عبداللہؓ ہاتھ میں کدال لے کر خود یہ ہیبت ناک کام کرنے لگے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ انھیں کوئی ضرر نہیں پہنچا تو ہمت بندھی اور وہ بھی شریک کار ہو گئے۔

تعمیر کے دوران میں ایک پردے دار باڑ اصل جگہ پر کھڑی کر دی گئی تاکہ کم از کم قبلے اور مطاف کا نشان قائم رہے۔ کہا جاتا ہے کہ معمار اس پردے کے پیچھے کام کرتے رہے۔ حضرت عبداللہؓ خود دارالند وہ میں حجر اسود کی حفاظت کرتے رہے جو کمخواب کے ایک ٹکڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ جب حجر اسود کو، یعنی اس کے تین ٹکڑوں کو، پھر اس کے مقام پر رکھا گیا تو اس کے گرد چاندی کا ایک حلقہ کس دیا گیا۔

اس دفعہ کعبے کی تعمیر میں تمام تر مکے کا پتھر اور یمن کا چونا استعمال کیا گیا۔ عمارت ستائیس گز اونچی کر دی گئی۔ حدیث نبویؐ کی تعمیل کرتے ہوئے حجر (حطیم) کو عمارت میں شامل کر دیا گیا اور فرش کے برابر دو دروازے رکھے گئے، مشرق دروازہ داخلے کے لیے اور مغربی دروازہ نکلنے کے لیے۔ طواف کے وقت چاروں کونوں کو بوسہ دیا جاتا تھا۔

یہ تبدیلیاں فقط تھوڑے عرصے تک قائم رہیں۔ ۷۳ھ/۶۹۳ء میں حجاج بن یوسف [رک بآں] نے مکے کی تسخیر کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو قتل کر دیا۔ اس نے خلیفہ عبدالملک کے اتفاق رائے سے حجر کو پھر کعبے سے جدا کر دیا اور مغربی دروازہ بند کر دیا۔ بعد ازاں جب خلیفہ عبدالملک بن مروان کو حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حدیث کا علم ہوا تو اس نے اس پر اظہار ندامت کیا اور کہا کہ بہتر ہوتا کہ میں کعبے کو ابن زبیرؓ کی بنا کردہ حالت پر چھوڑ دیتا (شفاء الغرام، ص ۹۹)۔ اس طرح کعبے نے عملاً پھر وہی صورت اختیار کر لی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں تھی اور یہی شکل آج تک چلی آتی ہے۔ عوام کا جذبۂ احترام کسی قسم کی معتدبہ تبدیلیوں کا ہمیشہ مخالف رہا ہے۔ کبھی کبھار مرمت کی ضرورت پیش آتی رہی ہے۔ زمانۂ جاہلیت سے لے کر عصر حاضر تک یہ عمارت برابر سیلابوں کی زد میں رہی ہے۔ ۱۶۱۱ء میں جب اس کے گر جانے کا خطرہ پیدا ہوا تو اس خطرے کی روک تھام کے لیے اس کے گرد تانبے کا حلقہ ڈال دیا گیا، مگر ایک نئے سیلاب نے ان حفاظتی تدابیر کو بھی بیکار کر دیا۔ اس لیے ۱۹۳۰ء میں پوری طرح مرمت کرکے عمارت کو درست کر دیا گیا، لیکن اس دفعہ حتی الوسع پرانے پتھر کام میں لائے گئے۔

۳۱۷ھ/۹۲۹ء میں قرامطہ کے حملے کے باوجود کعبہ محفوظ رہا، البتہ حملہ آور حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے جو کوئی بیس برس غائب رہنے کے بعد پھر واپس مکے پہنچ گیا۔

کعبے پر غلاف چڑھانے کی رسم بہت قدیم زمانے سے چلی آتی ہے اس ضمن میں مختلف روایات قبل ازیں ذکر کی جا چکی ہیں۔ [ایک روایت کے مطابق سکندر اعظم نے بھی وہاں سے گزرتے ہوئے ایک غلاف چڑھایا تھا]۔ ہر سال نیا غلاف چڑھانے کا دستور فقط زمانۂ حال ہی میں باقاعدہ طور پر رائج ہوا۔ قدیم ترین اسلامی عہد میں غلاف چڑھانے کا دن عاشوراء مذکور ہے، مگر رجب اور دوسرے مہینوں میں بھی غلاف بدلے گئے ہیں۔ کسوۃ یا

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

غلاف بعض دفعہ یمنی اور بعض دفعہ مصری یا کسی اور کپڑے کا ہوتا تھا۔ [غلاف کعبہ کے سلسلے میں مختلف کپڑوں اور مختلف رنگوں کا ذکر بھی آیا ہے (دیکھیے شفاء الغرام، ۱۱۹ تا ۱۲۶)]۔

کعبے کے گرد کے مقاموں کا تذکرہ عباسی عہد میں بھی پایا جاتا ہے اور بعض دفعہ مقام کے بجائے ظُلّہ (سائبان) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ موجودہ عمارتوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۰۷۴ھ/ ۱۶۶۳ء سے چلی آتی ہیں۔ چاہ زمزم پر گنبد کا ذکر بھی اسی پرانے زمانے میں آیا ہے۔ ۹۳۳ھ میں بیت زمزم کے سامنے آب زر سے سلطان سلیمان آل عثمان کا نام کندہ ہوا۔ ۹۴۸ھ میں بیت زمزم کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔ ۱۰۲۰ھ میں سلطان احمد خان کے حکم سے زمزم کے کنویں میں لوہے کی جالی لگائی گئی۔ ۱۰۷۲ھ میں زمزم کے گنبد کو از سر نو تعمیر کیا گیا (شفاء الغرام، ص ۲۵۱)۔ سلطان عبدالعزیز آل سعود نے زمزم کے پاس پانی کی دو سبیلیں لگا دیں اور پانی پینے والوں کے لیے سائبان تعمیر کر دیا۔

۳۔ کعبہ اور اسلام

مکّے میں نبوت کے بارھویں سال نماز فرض ہوئی اور آپ ؐ حکم خداوندی کے مطابق کعبے کی جانب متوجہ ہو کر نماز ادا کرتے رہے۔ [نماز فرض ہونے سے قبل بھی آپ ؐ کا قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھنا ثابت ہے]۔ ہجرت کے بعد مدنی زندگی کے آغاز میں آپ ؐ کو بیت المقدس کو قبلہ بنا کر نماز پڑھنے کی ہدایت ہوئی، چنانچہ تقریباً ڈیڑھ سال تک آپ ؐ نے اس حکم کی تعمیل فرمائی، مگر دل سے آپ ؐ اس بات کے خواہاں تھے کہ مسلمانوں کا کعبہ بیت اللہ ہی رہے۔ قرآن مجید نے آپ ؐ کی اس دلی تمنا کا ذکر کیا ہے۔ آخر آپ ؐ کی یہ آرزو پوری ہوئی اور یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ (۲ [البقرة]: ۱۴۴)، یعنی ہم دیکھ رہے ہیں آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا، سو ہم پھیر دیں گے آپ کو اسی قبلے کی طرف جو آپ کو پسند ہے۔ پس اب اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور تم لوگ جہاں بھی ہوا کرو (نماز پڑھتے وقت) اسی مسجد کی طرف منہ کر لیا کرو اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ (نیا قبلہ) ان کے ربّ کی طرف سے برحق ہے اور اللہ بے خبر نہیں ہے اس سے جو وہ کر رہے ہیں۔

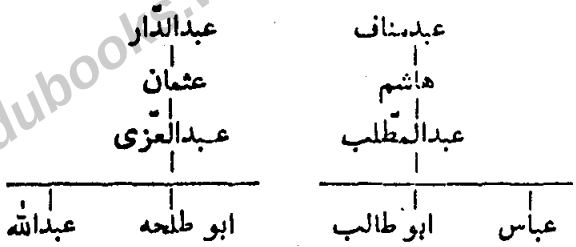
کعبے کے ابتدائی آثار مٹ جانے کے بعد حضرت ابراہیم ؑ نے از سر نو اس کو تعمیر کیا۔ حضرت ابراہیم ؑ جدّالانبیاء تھے۔ یہودی اور عیسائی بھی آپ ؑ کی عزت و تکریم کرتے اور آپ ؐ کی نبوت کو تسلیم کرتے تھے۔ حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو بھی آپ کی پیروی کا حکم دیا گیا تھا۔ حضرت ابراہیم ؑ دین اسلام ہی کے داعی تھے۔ یہود نے اپنے مذہب کو بڑی حد تک تبدیل کر لیا تھا۔ حضرت ابراہیم ؑ و اسمٰعیل ؑ کی تعمیر کعبہ کا ذکر سورۃ البقرۃ میں کیا گیا ہے (۲ [البقرۃ]: ۱۲۷) اور مقام ابراہیم ؑ کو نماز (صلوٰۃ) کے لیے موزوں جگہ قرار دیا گیا (۲ [البقرۃ]: ۱۲۵)۔ حضرت ابراہیم ؑ کو خدا نے حکم دیا کہ لوگوں کو حج کی دعوت دیں (۲۲ [الحج]: ۲۷) اور کعبہ پہلی مقدس عبادت گاہ تھی جو روے زمین پر قائم کی گئی (۳ [آل عمرٰن]: ۹۶)۔ اب کعبہ بیت الحرام (۵ [المائدۃ]: ۹۷) یا

www.besturdubooks.wordpress.com

بیت العتیق (۲۲ [الحج]: ۲۷ و ۳۳) کے نام سے موسوم ہوا۔

۶ھ میں حضرت رسول کریم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے چودہ سو صحابہ کی رفاقت میں عمرے کا ارادہ کیا، مگر اہل مکہ نے آپؐ کو حُدَیْبِیَہ کے مقام پر روک دیا۔ اگلے سال ۷ھ میں عمرۃ القضاء ادا کیا۔ ۸ھ میں اللہ کے حکم سے آپؐ نے جنگ و جدال کے بغیر مکہ فتح کیا۔ اس سے اسلام میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ کفر و شرک کے تمام انبار جو کعبے کے گرد جمع ہو گئے تھے اب صاف کر دیے گئے۔ تاریخی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ کعبے کے چاروں طرف ۳۶۰ بت رکھے ہوے تھے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے جب اپنی چھڑی سے انھیں چھوا اور آیت کریمہ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷ [بنی اسراءیل]: ۸۱) تلاوت فرمائی تو وہ زمین پر گر گئے (کتب صحاح ستّہ)۔ ہبل کا مجسّمہ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ عمرو بن لُحَیّ نے کعبے کے اندر نصب کیا تھا نیز بعض انبیاے کرام کے مجسمے اور تصویریں سب کو ضائع کر کے اٹھوا باہر کیا۔ (ابن ہشام: سیرۃ، ۱: ۸۲؛ ابن الکلبی: کتاب الاصنام)۔

فتح مکّہ کے وقت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ان دینی اور دنیوی منصبوں کا انتظام کیا جو مکے میں قدیم زمانے سے چلے آتے تھے۔ مؤرخوں کا قول ہے کہ پرانے زمانۂ جاہلیت میں قُصَیّ نے قبیلۂ خُزاعہ سے سخت جنگ و جدال کے بعد کعبے پر قبضہ کر لیا اور سب اہم دینی اور دنیوی منصب خود سنبھال لیے، یعنی دارالندوہ کا اہتمام اور پرچم کا باندھنا (عَقد اللِّوا)، زائرین کے لیے خوراک کی بہم رسانی (رِفادہ) اور پانی کی بہم رسانی (سِقایہ)، کعبے کی نگرانی (سِدانہ و حِجابہ)۔ قصّی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے پوتے جن کا شجرہ درج ذیل ہے ان عہدوں کے فرائض بجا لاتے رہے (دیکھیے ابن ہشام: سیرۃ، ۱: ۱۲۳ تا ۱۲۴):



عبد مناف اور ان کی اولاد کو رفادہ اور سقایہ وغیرہ ملے اور عبدالدّار اور ان کی اولاد کو سِدانہ اور حجابہ وغیرہ کے منصب تفویض ہوے۔

جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے مکّہ فتح کیا تو آپؐ کے چچا عباس [رکَ بآں] یا ایک اور روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے ان عہدوں کے لیے درخواست کی، لیکن آپؐ نے فرمایا کہ یہ سب چیزیں سوا سقایہ اور کعبے کی نگرانی کے آپؐ کے پاؤں تلے روند ڈالی جائیں گی۔ سقایہ حضرت عباسؓ کی تحویل میں رہا۔ کعبے کی نگرانی عثمان بن طلحہ کے سپرد ہوئی جنھوں نے اپنے چچازاد بھائی شیبہ بن ابی طلحہ کو اجازت دے دی کہ وہ ان کے نائب کے طور پر کام کریں۔ بنو شیبہ آج تک کعبے کے دربان چلے آتے ہیں۔ رفادہ جو ابو طالب کے قبضے میں تھا، ۹ھ میں حضرت ابو بکرؓ کے نام منتقل ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد خلفا زائرین کے طعام کا انتظام کرنے لگے۔

مکّے پر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا عملی تسلط پہلی دفعہ ۹ھ کے حج کے موقع پر علانیہ طور پر ثبت ہوا۔ آپؐ خود اس حج میں شریک نہ تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آپؐ کی نیابت اور نمائندگی کرتے ہوے امیر الحج کے فرائض انجام دیے اور حاجیوں کے مجمع میں نئے انتظامات کا اعلان کیا جو وحی الٰہی کے پیش نظر عمل میں لائے گئے تھے۔ حضرت علیؓ نے سورۂ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

توبہ [رکَ بہ براءۃ (سورہ)] کی آیات پڑھ کر اعلان کیا کہ اس سال کے بعد مشرکین کو بیت اللہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔

اس کے مطابق آئندہ سے مشرکوں کو بیت اللہ کی تقریبات میں شرکت کی ممانعت کر دی گئی ہے کیونکہ وہ ناپاک (نجس) ہیں۔ علاوہ ازیں اہل اسلام کے خلاف نبرد آزما ہونے والے کفار کو قانون کی حمایت سے محروم قرار دے دیا گیا ہے۔ ان کو چار مہینے کی مہلت دی گئی جس کے دوران میں وہ جہاں چاہیں آزادی سے چل پھر سکتے ہیں، لیکن اس کے بعد انہیں بیت اللہ میں داخلے کی ممانعت کر دی گئی۔ صرف ایسے لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے جن سے معاہدہ ہو چکا ہو اور جنھوں نے معاہدے کی شرائط کی تعمیل بعد میں احتیاط اور پابندی کے ساتھ کی ہو اور مسلمانوں کے خلاف کسی کو مدد نہ دی ہو [نیز رکَ بہ براءۃ (سورۃ)]۔

۹ھ میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے خود حج کی قیادت فرمائی۔ اس موقع پر ایک بھی مشرک موجود نہ تھا۔ کعبہ اب بلا شرکت غیرے صرف مسلمانوں کا مقدس حرم بن گیا۔ ہر نماز کے وقت تمام دنیا کے مسلمان کعبے کی طرف منہ کرتے ہیں اور حج کی تقریبات میں کعبہ ہی جملہ مناسک حج کا مبدأ اور منتہا ہے۔

کعبے کے متعلق دو خاص چیزوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا، یعنی عمارت کا کھولنا اور دھونا۔ کھولنے کی رسم معیّن تاریخوں میں ادا کی جاتی ہے۔ اس موقع پر وہ زینہ جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے دھکیل کر عمارت کے برابر لگا دیا جاتا ہے۔ کھولنے کی تاریخیں حکام مکہ کی مرضی کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔

حج کے موقع پر کعبے کو غسل دیا جاتا ہے غسل کے اوقات کی تعیین حکومت وقت کرتی ہے۔ آج کل چھے سات ذوالحجۃ غسل کے لیے مقرر ہے اس رسم میں سعودی عرب کے حکام، اسلامی ممالک کے وفود اور چند ممتاز زائرین شریک ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے سلطان وقت داخل ہوتا ہے۔ وہ دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد خود فرش کو آب زمزم سے دھوتا ہے۔ پانی دھلیز میں کی ایک موری کے راستے باہر بہہ جاتا ہے۔ دیواریں ایک قسم کی جاروب سے دھوئی جاتی ہیں جو کھجور کے پتوں سے بنائی جاتی ہے۔ اس کے بعد مکۂ مکرمہ کا گورنر ہر ایک چیز پر گلاب چھڑکتا ہے اور آخر میں عمارت کے اندر قسم قسم کے بخورات سے دھونی دی جاتی ہے [رکَ بہ القبلہ]۔

جیسا کہ اس مثال سے ظاہر ہے، اس مقدس عمارت کی تعظیم و تکریم کا دائرہ ان تمام چیزوں تک پھیلا ہوا ہے جو اس سے متعلق ہیں، حجر الاسود، میزاب (پرنالہ)، ملتزم اور سب سے بڑھ کر زمزم کا پانی۔ تاہم جیسا کہ روایات صحیحہ میں مذکور ہے حضرت عمرؓ نے حجر الاسود کے بارے میں اپنے احساسات کا یوں اظہار کیا: "میں جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان اور اگر رسولؐ اللہ نے تجھے بوسہ نہ دیا ہوتا تو میں تجھے کبھی نہ چومتا" (صحیح بخاری)۔ یہ کہنے کے بعد حضرت عمرؓ نے پتھر کو چوم لیا۔ میزاب کے نیچے نماز خاص طور پر موجب اجر و ثواب سمجھی جاتی ہے۔ جو شخص میزاب کے نیچے نماز پڑھتا ہے وہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسا اس دن تھا جب اس کی ماں نے اسے جنا (الازرقی، ص ۲۲۴)۔ آب زمزم جس کو زائر بار بار پی چکا ہے، ہر اس نیک کام کے لیے کار آمد ہے جس کے لیے یہ پیا جائے (قطب الدین: ماء زمزم لما شُرب لہ، ص ۳۴؛ اخرجہ الحاکم فی المستدرک و قال ھذا حدیث صحیح الاسناد؛ شفاء الغرام، ۱: ۲۵۳)۔

www.besturdubooks.wordpress.com

کعبے کے نظارے سے زائرین کے جذبۂ عقیدت میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے بارے میں متعلقہ کتب میں وافر شہادت موجود ہے۔ مثال کے طور پر البتنونی (ص ۲۶) نے کعبے کے سامنے نماز کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ ہم یہاں نقل کر سکتے ہیں: "سارا مجمع اس ذات ذوالجلال کے حضور میں جو دلوں پر ہیبت طاری کرنے والا قادر قیوم ہے اور جس کے آگے بڑی سے بڑی ہستی حقیر و بے مایہ ہو کر لاشے محض بن جاتی ہے، انتہائی خضوع و خشوع کے ساتھ کھڑا تھا اور اگر ہم نے نماز کے دوران میں جسم کو جھکتے اور سیدھا ہوتے، ہاتھوں کو دعا میں اٹھتے اور عجز و انکسار کے اعتراف میں ہونٹوں کو ہلتے نہ دیکھا ہوتا اور اگر ہم نے اس بے پایاں عظمت کے سامنے دلوں کی دھڑکنیں نہ سنی ہوتیں تو ہم یہ سمجھتے کہ ہم کسی دوسرے عالم میں پہنچ گئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس ساعت میں ہم کسی اور ہی عالم میں تھے۔ ہم خدا کے گھر میں تھے اور اس کے قرب حضوری میں کھڑے تھے اور ہمارے پاس فقط جھکا ہوا سر تھا اور گڑگڑاتی ہوئی زبان تھی اور دعا کے لیے بلند ہوتی ہوئی آوازیں تھیں اور آنسو بہاتی ہوئی آنکھیں تھیں اور خشیت الٰہی سے معمور دل تھے اور شفاعت کے پاکیزہ خیالات تھے (نیز دیکھیے Macdonald: *The Religious attitude and Life in Islam*، شکاگو ۱۹۰۹ء، ص ۲۱۶ ببعد؛ Ben cherif: *Aux villes saintes de l'Islam*، ص ۳ ببعد، ۶۸۔ [یہ کیفیت تقریباً ہر حاجی پر طاری ہوتی ہے]۔

اسلام میں کعبے کو جو مقام اور مرتبہ حاصل ہے اس میں مسلمانوں کے تمام فرقے متحد ہیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مکۂ مکرمہ اسلامی شان و شوکت اور سطوت کا مظہر ہے اور کعبہ اس کے جاہ و جلال اور فضل و کرم کا مرکز ہے۔ چار دانگ عالم میں یہی وہ جگہ ہے جہاں دس بارہ لاکھ آدمی حج کے لیے جمع ہوتے ہیں جو سب کے سب خدا کو یک دل و یک زبان ہو کر پکارتے ہیں۔ اور اگرچہ یہ زائرین نسل اور زبان میں مختلف ہوتے ہیں تاہم وہ سب ایک قبلے کی طرف منہ کرتے ہیں اور نماز میں پہلو بہ پہلو کھڑے ہوتے اور تمام ارکان نماز ایک ساتھ ادا کرتے ہیں۔ وہ خدائے واحد کے سوا کسی اور سے اپنی امیدیں وابستہ نہیں کرتے۔

اہل تصوف بھی کعبے کے بارے میں ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں۔ الغزالی جیسے صوفیوں کے نزدیک جو گویا متشرع صوفی ہیں کعبہ واقعی وہ مقدس عمارت ہے جس کے گرد طواف کرنا لازم ہے، لیکن طواف اور جس چیز کے گرد طواف کیا جاتا ہے انسان کے لیے تبھی قدر و قیمت رکھ سکتے ہیں جب وہ اسے بلند تر روحانی درجے کو پہنچنے میں ترغیب کا کام دیں۔

چاہ زمزم کے مبدأ سے تعلق رکھنے والے واقعات کے لیے رک بہ اسمٰعیل[۴]، لیکن یہاں اس سلسلے میں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ جب عبدالمطلب حجرے میں سو رہے تھے انھوں نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص پراسرار الفاظ میں ان کو حکم دے رہا ہے کہ وہ زمزم کو اس جگہ سے جہاں گوبر اور خون اور "پہاڑی کوے کا گھونسلا" اور "چیونٹیوں کا بل" ہے کھود کر نکال لیں۔ جب قریش نے ان کا کنواں کھودنے کا حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو طرفین بتو سعد هُذَیم کی کاہنہ سے مشورہ کرنے روانہ ہوئے۔ راستے میں ان کا پانی ختم ہو گیا، لیکن عبدالمطلب کی سواری کے نقش سم سے ایک چشمہ جاری ہو گیا جو اس بات کی آسمانی علامت تھی کہ وہ حق

www.besturdubooks.wordpress.com

بجانب تھے ۔ پس سب وہیں سے مکے کی طرف واپس لوٹے ۔ واپس پہنچ کر جب عبدالمطلب نے کھدائی شروع کی تو انھیں تلواروں اور زرہ بکتر کے علاوہ دو طلائی غزال بھی ملے جو جرہم نے چاہ زمزم میں دفن کر رکھے تھے ۔ یہ سب چیزیں کعبے میں رکھ دی گئیں (ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۱۴۲ تا ۱۴۷؛ الروض الانف، ۱ : ۹۷ تا ۱۰۰) ۔

[قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مکّے کو اُمّ القُریٰ کہا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے : " وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ (۶ [الانعام] : ۹۳)، یعنی یہ قرآن مجید کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے ۔ برکت والی تصدیق کرنے والی ان (کتابوں) کی جو اس سے پہلے ہیں اور تاکہ تو ڈرائے مکّے والوں کو اور اس کے آس پاس والوں کو] ۔

اُمّ القریٰ کے معنی ہیں بستیوں کی اصل اور جڑ ۔ مکۂ معظّمہ تمام عرب کا دینی و دنیوی مرجع تھا اور جغرافیائی حیثیت سے بھی قدیم دنیا کے وسط میں مرکز کی طرح واقع ہے، اس لیے مکّے کو اُمّ القریٰ فرمایا ۔ اور آس پاس سے یا تو عرب مراد ہے کیونکہ دنیا میں قرآن مجید کے اولین مخاطب وہی تھے ۔ ان کے ذریعے سے باقی دنیا کو خطاب ہوا، یا سارا جہان مراد ہے جیسے فرمایا : لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (۲۵ [الفرقان] : ۱) ۔

ایک روایت کے مطابق عرب میں بت پرستی کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب بنو خزاعہ نے بنو جرہم کو مکّۂ مکرّمہ سے نکال دیا تو اہل مکّہ نے عمرو بن لُحَیّ خزاعی کو اپنا رئیس مقرر کر لیا ۔ یہ شخص جو کام کرتا مکّے والے اس پر عمل کرنے لگتے ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عمرو بڑا دولت مند تھا ۔ یہ حجّاج کو کھانا کھلاتا اور کپڑے پہناتا ۔ بعض اوقات یہ حجاج کے لیے دس دس ہزار جانور ذبح کرتا اور دس دس ہزار آدمیوں کو کپڑے پہناتا ۔ انھیں دنوں قبیلۂ ثقیف کا ایک شخص ایک بڑے پتھر پر حاجیوں کو ستوگھول کر پلایا کرتا تھا ۔ اس پتھر کو صخرۃ اللّات (لات کا پتھر) کہتے تھے ۔ جب یہ شخص مر گیا تو عمرو نے مشہور کر دیا کہ یہ شخص مرا نہیں بلکہ پتھر میں داخل ہو گیا ہے ۔ اس نے عربوں کو اس کی پرستش کرنے کا مشورہ دیا اور یہ بھی کہا کہ اس پتھر پر ایک مکان تعمیر کرکے اس کو "لات" (ستوگھولنے والا) کے نام سے موسوم کر دیں ۔ کہا جاتا ہے کہ تین صدیوں تک عمرو کی اولاد اس کی پرستش کرتی رہی اور اس نے ایک بت کی حیثیت اختیار کر لی (السہیلی : الروض الانف، ۱ : ۶۲؛ ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۷۷) ۔

ایک دوسری روایت کے مطابق بنو اسمٰعیل میں بت پرستی کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب ان کی تعداد زیادہ ہوگئی تو وہ مکہ چھوڑ کر دوسرے بلاد و دیار کو جانے لگے ۔ جب بنو اسمٰعیل کا کوئی شخص مکے سے جاتا تو خانۂ کعبہ کے احترام کے پیش نظر اپنے ساتھ حرم کا ایک پتھر بھی لے جاتا ۔ وہ جہاں کہیں جاتا کعبے کی طرح اس کا طواف کرنے لگتا ۔ مرور زمانہ سے ان کی یہ عادت ہوگئی کہ جو پتھر بھی انھیں پسند آتا اس کی پوجا کرنے لگتے ۔ اس طرح دین ابراہیمی چھوڑ کر وہ بتوں کے پرستار بن گئے اور سابقہ اقوام کی طرح گمراہی اختیار کرلی ۔ تاہم ان میں سے کچھ لوگ اپنے پرانے ابراہیمی دین پر بھی قائم رہے ۔ وہ خانۂ کعبہ کی تعظیم کرتے ۔ اس کا طواف کرتے اور حج و عمرہ کی عبادات بجا لاتے، عرفات و مزدلفہ میں قیام کرتے، قربانیاں ذبح کرتے اور دیگر مناسک حج ادا کرتے، مگر ان میں یہ خرابی پیدا ہو گئی کہ حج کا تلبیہ کہتے وقت مشرکانہ کلمات پکارنے لگتے، مثلاً کنانہ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

اور قریش تلبیہ پکارتے وقت یہ الفاظ کہتے: لَبَّیْک اللّٰھُمَّ لَبَّیْک، لَبَّیْک لَا شَرِیکَ لَکَ، اِلَّا شَرِیکًا ھُوَ لَکَ، تَمْلِکُہٗ وَمَا مَلَکَ.

اس طرح تلبیہ کے کلمات توحید میں اپنے بتوں کو شریک کر لیتے۔ اسی کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا: وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ (۱۲ [یوسف]: ۱۰۶)، یعنی ان کے اکثر لوگ خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں (ابن ہشام: سیرت، ۱: ۷۷؛ الروض الانف، ۱: ۶۲).

ابن اسحٰق سنداً بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا میں نے عمرو بن لُحَیّ کو جہنّم میں انتڑیاں گھسیٹتے ہوئے دیکھا، پھر میں نے اس سے ان لوگوں کے بارے میں سوال کیا جو میرے اور اس کے درمیان تھے۔ اس نے کہا وہ ہلاک ہو گئے (الروض الانف، ۱: ۶۱).

الحجرالاسود: الازرقی (تاریخ مکہ میں) حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت آدمؑ آسمان سے اتارے گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ حجر اسود اور مقام ابراہیم کو بھی اتارا تاکہ آدمؑ ان کے ساتھ مانوس رہیں۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ طوفان نوح کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے حجر اسود کو جبل ابو قُبَیس [رکن بان] پر محفوظ رکھا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ تعمیر کیا تو جبریلؑ نے حجر اسود کو لا کر اس کی جگہ پر نصب کر دیا (شفاء الغرام، ۱: ۱۹۱).

الازرقی ان لوگوں سے نقل کرتے ہیں جو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی تعمیر کعبہ میں بذات خود شریک تھے کہ کعبے کو آگ لگنے سے حجر اسود کے تین ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا اڑ کر کسی طرح بنو شیبہ کے کسی آدمی کے ہاتھ لگ گیا اور مدتوں اس خاندان میں محفوظ رہا۔ پھر عبداللہ بن زبیرؓ نے حجر اسود کے ٹکڑوں کو چاندی کے تار سے باندھ دیا۔ جب مرور زمانہ سے یہ تار ڈھیلا ہو گیا اور حجر اسود کے ٹکڑے ہلنے لگے تو خلیفہ ہارون الرّشید عبّاسی نے اپنے عہد خلافت میں حجر اسود میں آر پار سوراخ کرکے اس میں چاندی بھروا دی (شفاء الغرام، ۱: ۱۹۲ تا ۱۹۳).

مؤرّخین کا بیان ہے کہ ابو طاہر قرمطی جب مکے آیا (۸ ذوالحجہ ۳۱۹ھ) تو اس نے جعفر بن فلاح معمار کو حجر اسود کے کعبے سے اکھاڑنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس نے پیر کے دن ۱۴ ذوالحجہ کو حجر اسود کو اکھاڑا اور اپنے ساتھ بلاد ہجر [(الحسا)] لے گیا۔ خاصے عرصے تک خانۂ خدا حجر اسود سے خالی رہا اور لوگ تبرّکاً اس کی جگہ پر ہاتھ رکھنے پر اکتفا کیا کرتے تھے۔ حتّٰی کہ منگل ۳۳۹ھ کو یوم النحر کے دن حجر اسود کو واپس اس کی جگہ پر نصب کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ سنبر بن حسن قرمطی نے حجر اسود کو دوبارہ اس کی جگہ پر نصب کیا تھا۔ جب لوگوں نے حجر اسود کو دیکھا تو سجدۂ شکر بجا لائے اور اسے بوسہ دیا۔ یوم النحر کو لوگوں کے زیارت کعبہ کے لیے آنے سے قبل حجر اسرد کو اس کی جگہ پر نصب کر دیا گیا تھا (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے شفاء الغرام، ۱: ۱۹۳).

اس کے ایک سال بعد، ۳۴۰ھ میں کعبے کے دربانوں نے ڈر کے مارے سنبر قرمطی کے نصب کردہ حجر اسود کو اکھاڑ کر کعبے میں رکھ دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ حجر اسود کے گرد چاندی کا ایک مضبوط حلقہ بنا دیا جائے تاکہ کوئی شخص اسے اکھاڑ نہ سکے۔ ابن زبیرؓ نے تعمیر کعبہ کے وقت اسی طرح کیا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

تھا ۔ چنانچہ دو ماہر کاریگروں کو اس کام پر مامور کیا گیا جنھوں نے چاندی کا یہ حلقہ تیار کر دیا ۔ تاریخ سے یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ قرامطہ کے حجر اسود کو واپس کر دینے کے بعد بھی کسی نے آج تک حجر اسود کو اس کی جگہ سے اکھاڑا ہے ۔ الفاسی کہتے ہیں ایک مصری فقیہ نے بتایا کہ ۸۱۷ھ میں امیر سودون پاشا نے حجر اسود کو اکھڑوا کر اس کو نئی زیب و زینت سے مزّین کیا تھا، مگر مکّۂ مکرمہ کے بعض لوگ مصری فقیہ کی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے ۔ مصری فقیہ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ میں نے حجر اسود کو اکھڑا ہوا بچشم خود ملاحظہ کیا تھا ۔ الفاسی کہتے ہیں مجھ سے پہلے مکے کے بہت سے فقہا یہ بات مصری فقیہ سے سن کر مجھے بتا چکے تھے ۔ چنانچہ وہ مصری فقیہ جن کا نام نور الدین المنوفی ہے جب ۸۱۴ھ میں مصری کارواں کے قافلہ سالار بن کر مکے آئے تو میں نے خود ان سے پوچھا اور انھوں نے اس کی تائید کی (شفاء الغرام، ۱ : ۱۹۳) ۔

حجر اسود میں اللہ تعالٰی کی چند آیات بیّنات پائی جاتی ہیں :

۱۔ زمین پر آنے کے بعد حجر اسود عظیم حوادث مثلاً طوفان نوح وغیرہ سے دو چار ہونے کے باوجود بھی جوں کا توں محفوظ رہا ۔

۲۔ محدث ابن جماعہ کے مطابق حجر اسود کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ حجر اسود کو کئی مرتبہ اپنی جگہ سے اکھاڑا گیا، مگر وہ اپنی جگہ پر واپس آ گیا مثلاً قبیلۂ جرہم، بنو ایاد اور قرامطہ نے حجر اسود کو اکھاڑا، مگر اسے پھر واپس لایا گیا ۔

۳۔ جب قرامطہ حجر اسود کو اکھاڑ کر لے گئے تو اس کو باری باری چالیس اونٹوں پر لادا گیا اور وہ ہلاک ہو گئے ۔ جب قرامطہ نے اسے واپس کیا تو ایک نحیف اونٹ پر لادا گیا اور وہ پہلے سے موٹا ہو گیا ۔ اس کا محدث الذہبی نے بھی ذکر کیا ہے ۔

۴۔ اسی طرح جب حجر اسود کو بلاد ہجر کی جانب لایا گیا تو یکے بعد دیگرے اس کو لادنے سے پانچ سو اونٹ ہلاک ہو گئے ۔

۵۔ حجر اسود پانی پر تیرتا ہے اور ڈوبتا نہیں ۔

ابن ابی الدم نے الفرق الاسلامیہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے جیسا کہ مؤرخ ابن شاکر الکتبی نے اس سے نقل کیا ہے ۔ بعض محدّثین سے مرفوعاً بھی نقل کیا گیا ہے (شفاء الغرام، ۱ : ۱۹۵) ۔

کعبہ مسلمانوں کا قبلہ ہے اور مرکز حج، اس کی بدولت تمام گرد و پیش کا رقبہ حرم [رک بآں] اور متبرک زمین بن گیا ہے ۔ شہر کے گرد مقدس منطقہ واقع ہے جس کی حدبندی پتھروں کے نشانات سے کی گئی ہے حرم میں داخل ہو کر ہر شخص پر کچھ پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں، اللہ تعالٰی نے اس علاقے کو عزت و حرمت عطا کی ہے ۔ یہ سارا علاقہ امن و امان اور صلح و سلامتی کی علامت قرار دیا گیا ہے ۔ حدود حرم میں جنگ نہیں ہو سکتی ۔ کسی درخت کو کاٹنے تک کی اجازت نہیں ۔ حرم میں داخل ہونے والا ہر گزند سے محفوظ ہو جاتا ہے (لیز رک بہ حرم) ۔

جیسے اوپر بیان ہوا تبّع وہ پہلا شخص سمجھا جاتا ہے جس نے کعبے کو لباس پہنایا ۔ تاریخی اعتبار سے یہ روایت صحیح ہے یا نہیں، اس کا جواب ہمارے احاطۂ علم سے باہر ہے ۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ عمارت پر رنگین کپڑے چڑھانے کا ذکر آتا ہے، اور یہ ایسی رسم ہے جس پر اسی قسم کی رسموں کے سلسلے میں غور کرنا (جو اور جگہ ادا کی جاتی تھیں) ضروری ہے ۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

مآخذ : (۱) Wüstenfeld : *Die Chroniken der Stadt Mekka*، لائپزگ ۱۸۵۷-۱۸۶۱ء، ۴ جلدیں؛ (۲) J. L. Burckhardt : *Travels in Arabia*، لنڈن ۱۸۲۹، ۲ جلدیں؛ (۳) علی بے : *Travels*، لنڈن ۱۸۱۶، دو جلدیں؛ (۴) R. Burton : *Personal Narrative of a Pilgrimage to el-Medinah and Meccah*، لنڈن ۱۸۵۷ء ۲ جلدیں؛ (۵) A. Müller : *Der Islam im Morgen- und-Abend land*، برلن ۱۸۸۵ء، ۲ جلدیں؛ (۶) C. Snouck Hurgronje : *Mekkā*، ہیگ ۱۸۸۸-۱۸۸۹ء، ۲ جلدیں، مع *Bilderatlas*؛ (۷) وہی مصنف : *Bilder aus Mekka*، لائیڈن ۱۸۸۹ء؛ (۸) Caid Ben Chérif : *Aux villes saintes de l' Islam*، پیرس ۱۹۱۹ء؛ (۹) البتنونی : الرحلۃ الحجازیہ، قاہرہ ۱۳۲۹ھ؛ (۱۰) الازرقی [: تاریخ مکّہ]، ص ۸۶ ببعد؛ (۱۱) الفاکہی، ص ۱۸ ببعد؛ (۱۲) الطبری، مطبوعۂ لائیڈن، ۱ : ۹۰۱ ببعد، ۹۳۶ ببعد، ۱۱۳۰ ببعد؛ (۱۳) المسعودی : مروج الذہب، طبع پیرس، ۱ : ۱۳۳ و ۴ : ۱۲۵ ببعد و ۵ : ۱۶۵ تا ۱۶۷، ۱۹۳؛ (۱۴) *Bibl. Geogr. Arab.*، ۱ (الاصطخری) : ۱۵ ببعد و ۲ (ابن حوقل) : ۲۳ ببعد و ۳ (المقدسی) : ۱۷ ببعد و ۵ (ابن الفقیہ) : ۱۶ تا ۲۲ و ۷ (ابن رستہ) : ۲۳ تا ۵۳؛ (۱۵) یاقوت : معجم (طبع Wüstenfeld) ۴ : ۲۷۸ ببعد؛ (۱۶) ابن جبیر : رحلۃ (سلسلۂ مطبوعات بیادگار گب)، ص ۸۱ ببعد؛ (۱۷) البخاری : الصحیح، کتاب العلم، باب ۳۸؛ (۱۸) Gaudefroy و Demombynes : *Mekke et Médine*، در *Rev. de l' Hist. des Religions*، ۲۷ : ۳۱۶ ببعد؛ (۱۹) C. Snouck Hurgronje : *Het Mekkannsche Feest*، لائیڈن ۱۸۸۰ء؛ (۲۰) حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت پر کتابیں جو مشرق اور مغرب میں شائع ہوئیں اور قرآن مجید کی مختلف تفاسیر؛ (۲۱) الطبری، ۱ : ۱۳۰ ببعد، ۲۷۳ ببعد؛ (۲۲) الثعلبی : قصص الانبیاء، قاہرہ ۱۲۹۰، ص ۶۹ ببعد؛ (۲۳) الدیار بکری : تاریخ الخمیس، قاہرہ ۱۲۸۳، ۲ جلدیں؛ (۲۴) ابن ہشام [: سیرۃ]، طبع Wüstenfeld، Göttingen ۱۸۵۸-۱۸۶۰ء، ۲ جلدیں؛ (۲۵) Caussin de Perceval : *Essai sur l' Hist. de Arabes*، پیرس ۱۸۴۷-۱۸۴۸ء؛ (۲۶) A. J. Wensinck : *The Navel of the Earth*، در *Verh. Kon. Akad. v. Wetensch Dl xvii* ج ۱۲/۱؛ (۲۷) J. L. Palache : *Het Heiligdom in de Voorstelling der Semitische Volken*، لائیڈن ۱۹۲۰ء؛ (۲۸) L. Caetani : *Annali del l'Islam*، مقدمہ، فصل ۶۲ ببعد؛ (۲۹) J. Well-hausen : *Reste arab. Heidentums*، بار دوم، برلن ۱۸۹۷، ص ۷۳ ببعد؛ (۳۰) H. Grimme : *Mohammad*، میونخ ۱۹۰۴ء، ص ۴۵ ببعد.

(A. J. WENSINCK و غلام احمد حریری)

کفّ : (ع) علم عروض کی ایک اصطلاح، ⊗ یعنی رکن سباعی سے آخری، ساتویں حرف، ساکن سبب خفیف کو حذف کرنا ۔ یہ عمل صرف مندرجۂ ذیل چار ارکان ہی میں واقع ہو سکتا ہے : (۱) مَفَاعِیْلُنْ؛ (۲) فَاعِلَاتُنْ، متصل یا مجموع؛ (۳) فَاعِ لَاتُنْ منفصل (یا مفروق یا منقطع) اور (۴) مُسْ تَفْعِ لُنْ منفصل (یا مفروق یا منقطع)، چنانچہ مَفَاعِیْلُنْ سے، ن، حذف ہو کر مَفَاعِیْلُ بضمّ لام، فَاعِلَاتُنْ متصل (یا مجموع) سے ن حذف ہو کر فاعلاتُ بضمّ تاء، فَاعِ لَاتُنْ منفصل (یا مفروق یا منقطع) سے فَاعِ لَاتُ بضّم تاء اور مُسْ تَفْعِ لُنْ منفصل (یا مفروق یا منقطع) سے مُسْ تَفْعِ لُ بضّم لام باقی رہتا ہے .

کفّ مندرجۂ ذیل دس بحور میں واقع ہوتا ہے :

(۱) ہَزَج؛ (۲) طویل؛ (۳) مُضارع؛ (۴) رَمَل؛ (۵) مدید؛ (۶) خفیف؛ (۷) مُجْتث؛ (۸) جدید؛ (۹) قریب اور (۱۰) مُشاکل .

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ماخذ : دیکھیے مقالۂ عروض.

(ہادی علی بیگ)

* کفارۃ : (ع)؛ تاوان، تلافی، لغوی معنی وہ چیز جو گناہ کو "ڈھانپ لے" اس کا ازالہ کر دے۔ [قرآن و حدیث میں کفّارہ ادا کرنے کے مندرجۂ ذیل تین طریقے بیان ہوے ہیں۔ (۱) اگر استطاعت ہو تو] غلام کو آزاد کر دیا جائے؛ (۲) جو لوگ اس کی استطاعت نہ رکھتے ہوں وہ تین دن (اور بعض صورتوں میں دو مہینے) روزہ رکھیں؛ (۳) جو لوگ [بیماری یا کمزوری کی وجہ سے] روزہ رکھنے کے قابل نہیں، وہ اہل حاجت کی ایک مقررہ تعداد (۱۰ سے ۶۰ تک) کو کھانا یا کپڑا دیں.

قرآن مجید کے مطابق مندرجۂ ذیل صورتوں میں کفّارہ ادا کرنا ضروری ہے :

(۱) بصورت قتل خطأ : اس کے لیے تین طرح کے کفارے لازم کیے گئے ہیں؛ (۱) اگر مقتول مسلمان ہو تو (الف) ایک مسلم غلام کو آزاد کرنا اور خون بہا (دیت [رک بآں]) کا ادا کرنا؛ (ب) اگر اس کی طاقت نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا؛ (۲) اگر مقتول غیر مسلم لیکن معاہد قبیلے سے تعلق رکھتا ہو تو بھی مندرجۂ بالا طریقے سے کفارہ ادا کرنا ضروری ہوگا؛ (۳) اگر مقتول کسی حربی (حالت حرب کے) قبیلے سے تعلق رکھتا ہو لیکن بذات خود مسلمان ہو تو : (الف) مسلم غلام کا آزاد کرنا؛ (ب) بصورت عدم استطاعت دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا (دیکھیے ۴ [النساء] : ۹۲).

بصورت حنث یعنی قسم توڑ دینے کی صورت میں مندرجۂ ذیل طریقے سے کفارہ ادا کرنا ضروری ہے : (الف) دس مساکین کو کھانا کھلانا، یا انھیں کپڑا پہنانا؛ (ب) یا ایک غلام آزاد کرنا؛ (ج) اگر ان دونوں کی استطاعت نہ ہو تو تین روزے رکھنا (دیکھیے ۵ [المائدۃ] ۸۹).

بصورت ظہار : ظہار کی صورت میں مندرجۂ ذیل کفّارہ لازم ہوتا ہے : (الف) غلام کا آزاد کرنا؛ (ب) عدم استطاعت کی صورت میں دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا؛ (ج) اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا۔ اس میں یہ بھی ایک شرط ہے کہ کفّارے کی ادائی بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہو (۵۸ [المجادلۃ] : ۱-۴).

احادیث میں روزہ توڑنے کے کفارے کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس کے لیے مندرجۂ ذیل تین صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا ضروری ہے : (الف) غلام آزاد کرنا؛ (ب) ۶۰ روزے رکھنا؛ (ج) اگر اس کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا، (دیکھیے البخاری : الصحیح، کتاب الصیام، نیز الجزیری : الفقہ علی المذاہب الاربعہ)].

مآخذ : (۱) ابن قاسم الغزّی : فتح القریب، طبع L. W .C. van den Berg، ص ۲۶۲، ۲۶۶، ۵۰۰، ۵۶۸، ۶۶۲؛ (۲) Th. W. Juynboll : *Handb. des istamischen Gesetzes*، ص ۱۲۲، ۲۲۵، ۲۶۷، ۲۹۸.

(Th. W. Juynboll [و ادارہ])

* کفالۃ : کفالہ کسی شخص (اصطلاحاً کفیل) کا قرض خواہ (مکفول لہٗ) کے لیے قرضدار (مکفول بہ) کا ضامن ہونا کہ قرضدار ایک متعین مقام پر قرضہ یا اس کا جرمانہ ادا کرنے یا کسی جوابی کارروائی کی صورت پر قصاص کے لیے حاضر ہو جائے گا.

مکفول اس معین وقت پر حاضر نہ ہو تو کفیل کو مکفول بہ کی آمد تک قید رکھا جا سکتا ہے۔ تاآنکہ وہ آ جائے یا ثابت ہو جائے کہ وہ آنے سے معذور ہے (مثلاً بصورت انتقال).

یہ مسئلہ کہ کفیل مکفول کی جگہ ادائی

www.besturdubooks.wordpress.com

کرے ۔ اسے اس کی سزا بھگتنا ائمہ کے نزدیک مختلف فیہا ہے ۔ شافعیہ کے نزدیک اس کا ایسا کرنا ضروری نہیں، خواہ اس نے واضح طور پر اس کی ذمّے داری لے لی ہو ۔

مآخذ : (۱) الباجوری : حاشیہ علی شرح ابن قاسم الغزّی، بولاق ۱۳۰۷ھ، ۱ : ۳۹۵ ببعد؛ (۲) زخاؤ : *Muhammedan Recht nach Schafiitischer Lehre*، ص ۵۰۴ ببعد؛ (۳) الدمشقی : رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ، بولاق ۱۳۰۰ھ، ص ۸۱؛ (۴) A Querry : *Droit Musulman*، ۱ : ۴۸۳ تا ۴۸۶ ۔

(TH. W. JUYNBOLL.)

* **کُفْر** : رک بہ کافر ۔

* **کُفْرَۃ** : صحرائے مشرق میں برہ (Cyrenaica) اور ودائی کے مابین مساوی فاصلے پر نخلستانوں کا ایک مجموعہ ہے، اس کے بارے میں ہماری معلومات ایک مدت تک صرف Rohlfs کے بیان تک محدود رہیں جس نے ۱۸۷۹ء میں وہاں تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی، اس کے بعد دو اور یورپی سیاح، Marshal des Legis Lapierre (۱۹۱۸ء) اور مسز روزیٹا فوربس Mrs. Rosita Forbes (۱۹۲۰-۱۹۲۱ء) بھی وہاں کی سیر کر چکے ہیں ۔ نخلستانوں کا یہ مجموعہ جو کفرۃ کے نام سے مشہور ہے، جنوب مشرق سے شمال مشرق کی جانب ۱۲۰ میل تک ۲۴ اور ۲۶ درجے عرض بلد شمالی اور ۳۱ اور ۳۴ درجے طول بلد مشرق کے درمیان پھیلا ہوا ہے ۔ جنوب میں سب سے آخری نخلستان طرابلس سے ۸۵ میل جنوب مشرق میں اور بن غازی سے ۶۰۰ میل جنوب میں واقع ہے، یہ تعداد میں پانچ ہیں اور سرر serir یا کنکریلے ٹیلوں کے خطے انھیں ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں، یعنی تیسربو شمال مشرق میں، بوسیمہ وسط میں، اربہنہ (جسے مسز فوربس نے Ribiana لکھا ہے) جنوب مشرق میں، بوسیمہ کے شمال مشرق میں سرہن اور جنوب مشرق میں وہ نخلستان ہے جسے خاص کفرۃ کہا جاتا ہے اور جس کا نام رولفس Rohlfs نے کبابو Kebabo لکھا ہے ۔ Rohlfs کے بیان کے مطابق اس مجموعے کا کل رقبہ تقریباً ۷۰۰۰ مربع میل ہے جس میں کفرۃ کا ۳۴۰۰ اور تیسربو کا ۲۵۰۰ مربع میل ہے ۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے EI² لائیڈن، بار دوم، بذیل مادّہ] ۔

مآخذ : (۱) G. Rohlfs : *Kufra*، لائپزگ ۱۸۸۱ء؛ (۲) الحشائشی (شیخ محمّد بن عثمان) : *Voyage au pays des Senoussia*، مترجمۃ V. Serres et Lasram، پیرس ۱۹۰۳ء، بار دوم ۱۹۱۲ء؛ (۳) Silva White : *From Sphinx to Oracle*، لنڈن ۱۸۹۹ء، ص ۱۲۴ تا ۱۲۹؛ (۴) Lapierre : *Rapport* ....، در *Afrique française (Renseignements coloniaux)*، اپریل ۱۹۲۰ء، ص ۶۹ تا ۹۱؛ (۵) Rosita Forbes : *Across the Lybian Desert to Kufara*، در *Geogr. Journal*، ۱۹۲۱ء، ص ۸۱ تا ۱۰۱؛ (۶) وہی مصنف : *The Secret of Sahara : Kufara*، لنڈن ۱۹۲۱ء ۔

(G. YVER) [تلخیص از ادارہ]

* **کَفَۃ** : (یا کَفّہ)؛ [ترکوں کے ہاں کِفہ]؛ جسے الکفۃ بھی لکھا جاتا ہے، جزیرہ نمائے کریمیا کے جنوبی ساحل پر ازمنۂ وسطیٰ کا ایک شہر ہے جس کا نام قدیم زمانے میں تھیوڈوشیا Theodosia تھا اور آج کل پھر اسی نام سے مشہور ہو گیا ہے (ابتدا میں یہ ایک نوآبادی تھا) ۔ اس کا نام Κάφα یا Κάφα یا Κάφα سب سے پہلے Konstantinos Porphyrogenetos کے ہاں ملتا ہے (*De administr. imperio*، باب ۵۳) ۔ کہتے ہیں کہ چوتھی صدی عیسوی میں یہاں باسفورس کا بادشاہ Sauromates پنجم، Chersonesus کے Pharnaces کے ساتھ مبارزت میں مارا گیا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

تھا ۔ یہ نظریہ بھی پیش کیا گیا ہے (F. Köppen *Krimskiy Shornik*، سینٹ پٹرز برگ ۱۸۳۷ء، ص ۱۰۷) کہ یہ نام Βοσπορος سے مطابقت رکھتا ہے جس کا ذکر Strabo : باب ۳۱۲ میں آیا ہے ۔ ان مستثنیات سے قطع نظر تیرھویں صدی عیسوی تک کفۃ کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا ۔ کریمیا کے جنوبی ساحل پر تجارتی، نیز جنگی جہازوں کے لیے بندرگاہ کی حیثیت سے ہمیں ہمیشہ سُغْدَاق کا نام ملتا ہے (حتّٰی کہ ان حوالوں میں بھی جو *Recueil de Textes rel. à l'Hist. des Seldjoucides* طبع Houtsma جلد ۳ و ۴، بعدد اشاریہ، میں موجود ہیں) جسے اب سُداق کہتے ہیں ۔

کفۃ کو پہلی بار کہیں تیرھویں صدی کے نصف آخر میں اہمیت حاصل ہوئی جب جینوآ کی جمہوریت نے تاتاریوں کے ایک سردار سے یہ جگہ خرید لی اور یہاں اہل جینوآ آباد ہو گئے ۔ عموماً یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ سردار اُوران تیمور تھا جس کا ذکر ابو الغازی (طبع Desmaisons ص ۱۷۳) نے کیا ہے اور جو تُوقای [= توغہ؛ توقا] تیمور کا بیٹا اور جوچی کا پوتا تھا اور جسے مونگکا [= منکو] تیمور (۱۲۶۶ تا ۱۲۸۰ء) نے کفۃ اور کریمیا عطا کیا تھا ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے اَلا لائیڈن، بار اوّل، بذیل مادّہ ۔

مآخذ : (۱) دیکھیے مادّہ باغچہ سرای اور وہاں Pallas, Broniewski وغیرہ کی مندرجہ تصنیفات کے علاوہ *Zapiski Odesskago Obshcestwa Istorii i Drewnostei* بھی کفہ کی تاریخ کے مطالعے کے لیے ناگزیر ہے؛ (۲) *Zapiski* (جلد ۲ تا ۲۴) میں جینوآ کی اُن سرکاری دستاویزات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو اٹلی میں شائع ہوئیں (*Atti della Societa Ligure di storia patria*)؛ (۳) O. Retowski : سکوں پر *Genuezko-tatarskiya moneti goroda Kaffi* (Simferopol ۱۸۹۷ء؛ نیز دیکھیے (۴) F. Brun : *Černomorye*، ج ۱ (Odessa ۱۸۷۹ء)، باب ۱۱، (*O poseleniyakh*)؛ (۵) J. Kulakowskiy : *Italyanskikh w Gazarii Proshloye Tawridi*، بار دوم (Kiew ۱۹۱۳ء)؛ ایک جامع اور مسلسل جائزے کے سلسلے میں ایک کوشش (۶) W. K. Minogradow : *Feodesiya (Istoricheskiy Ocherk)*، بار دوم (Jekaterinodar ۱۹۰۲ء)؛ نیز دیکھیے (۷) M. G. Canale : *Dellā Crimea* (جینوآ ۱۸۵۵ء) اور (۸) Heyd : *Hist. du Commerce du Levant* (لائپزگ ۱۸۸۵-۱۸۸۶ء)، بعدد اشاریہ بذیل مادّہ Caffa .

(W. Barthold [و تلخیص از ادارہ])

کَفِیل : رَکَ بہ کَفَالَۃ ۔ ⊗*

کِلاب بن رَبِیعہ : [بنو کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صَعْصَعَہ بن معاویۃ بن بَکْر بن ھَوازِن بن منصور بن عِکْرِمَۃ بن خَصَفَۃ بن قَیس عَیْلان بن مُضَر]، عربوں کا ایک نامور قبیلہ جو ضَرِیَّۃ اور رَبَذہ کی چراگاھوں میں رہتا تھا [جو مدینۂ منورہ کے اطراف میں تھیں ۔ فَدَک اور العوالی بھی ان کے علاقوں میں شامل تھے ۔ ضَرِیَّہ کی چراگاہ نہایت سرسبز تھی جس کی وجہ سے اونٹ اور گھوڑے خوب موٹے ہوتے تھے] ۔ بعد میں وہ شام کی طرف منتقل ہو گئے جہاں انھوں نے حلب اور دیگر شہروں پر قبضہ کر لیا اور جہاں ان کے حکمران آل مرداس (رَکَ بہ) کے نام سے مشہور تھے ۔ [بنو کلاب نے الجزیرہ میں بھی بڑی شہرت اور قوت حاصل کر لی تھی] ۔ کلاب جیسا بڑا قبیلہ کئی چھوٹے قبیلوں میں منقسم ہوگیا ۔ ہمیں اُن کی دس بڑی شاخوں کا علم ہے : (۱) جعفر بن کِلاب چار شاخوں کے ساتھ : مالک، الاَحْوَص، خالد اور عُتْبَہ؛ (۲) ابوبکر بن کلاب تین شاخوں عبد، کعب اور عبداللہ کے ساتھ؛ (۳) معاویہ الضِّباب :

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

تیرہ شاخوں کے ساتھ، جن میں سے پانچ کے نام گوہ یعنی سوسمار کے نام پر ہیں: ضَبّ، مُضَبّ، ضَبَاب، حُسَیل، حِسل، عَمرو، اَنَس، الاَعْوَر، زُفَر، اُنَیس، مالک، ربیعہ اور زُہیر۔ شِمر بن شَرْحبیل جس نے امام حسینؓ کو کربلا میں شہید کیا وہ قبیلۂ اعور کا ایک فرد تھا؛ (۴) عامر بن کلاب چار شاخوں کے ساتھ: الاصم و کعب (سارے قبیلے کی اہم ترین شاخوں میں سے)، طریف اور عقیل؛ (۵) ربیعہ بن کلاب: تین شاخوں کے ساتھ: بُجَیر و عُبَید اور نُفَیل؛ (۶) الاضبط بن کلاب [= ابو وَبْر]، جن کی تمام شاخیں وَبْر سے چلی ہیں اور جن میں سے سات کا نسّابوں نے ذکر کیا ہے؛ (۷) عمرو بن کلاب دو شاخوں کے ساتھ: نُفَیل اور ابو عوف؛ (۸) عبداللہ بن کلاب جن کی تین شاخیں تھیں: عامر و عمرو اور الصموت؛ (۹) رؤاس بن کلاب جن کی تین شاخیں تھیں: بُجاد، بُجَید اور عُبید؛ (۱۰) کعب بن کلاب جن کی چار شاخیں تھیں: عامر، وھب، ربیعہ اور اوس۔ اسلام سے پہلے سب سے بڑا قبیلہ بنو جعفر کا قبیلہ تھا جو اس قدر طاقتور تھے کہ انھوں نے قبیلۂ غنی کو کافی مدت تک اپنی پناہ میں رکھا اور بنو عَبْس کی بنو ذُبْیان کے خلاف جنگوں میں بڑی مدت تک مدد کرتے رہے۔ بنو کلاب کا سب سے نمایاں کام ان کا بنو ذبیان اور اسد کے متحدہ قبائل کو جَبَلہ کی جنگ میں مکمل شکست دینا ہے، جہاں، انھوں نے دیگر قبائل عامر سے مل کر ایک نمایاں فتح حاصل کی اور جو جاھلیت کی ان تین بڑی جنگوں میں شمار کی جاتی ہے جن کے متعلق عرب مصنفین کی تحریری دستاویزیں موجود ہیں۔ پہلی صدی ہجری کے بعد بھی ہم انھیں اپنی نو آبادیات ہی میں پاتے ہیں، لیکن وہ ان گورنروں کے جو مدینے یا دمشق سے بھیجے جاتے تھے نہایت اطاعت گزار تھے۔ ۲۳۱ھ میں بغاالکبیر نے مجبور ہو کر ان کے ۱۵۰۰ آدمی قید کر لیے تھے کیونکہ اس وقت وہ پھر اپنی قدیم بدوی زندگی کی طرف لوٹ چکے تھے اور اپنے پڑوس کے قبائل پر لوٹ مار کے لیے حملے کرتے تھے۔

اس قبیلے میں سے جو سربرآوردہ لوگ نکلے، ان میں سے غالباً شاعر لَبید [رک بآں] سب سے زیادہ مشہور ہے۔

مآخذ: (۱) النویری: نہایۃ العرب، مطبوعۂ قاہرہ، ۲: ۳۳۸ تا ۳۴۰؛ (۲) القلقشندی: صبح الاعشی، مطبوعۂ قاہرہ، ۱: ۳۴۰؛ (۳) وہی مصنف: نہایۃ العرب، بغداد ۱۳۳۲ھ، بمدد اشاریہ؛ (۴) نقائض، طبع بیون، بمواضع کثیرہ بالخصوص صفحات ۶۵۵ ببعد اور ۶۶۲ ببعد؛ (۵) Wüstenfeld: *Geneal-Tabellen* اور *Register*، ص ۲۶۷؛ (۶) الطبری، طبع دخویہ، بمواضع کثیرہ؛ (۷) ابن الاثیر: الکامل، بمواضع کثیرہ؛ (۸) ابن حزم: جمھرۃ انساب العرب، ص ۲۸۲ ببعد؛ (۹) ابن خلدون: العبر؛ (۱۰) البکری: معجم ما استعجم، ۱: ۲۹۰: ۲: ۶۷۳؛ (۱۱) عمر رضا کحالہ: معجم قبائل العرب، بذیل مادّہ].

(F. KRENKOW [و ادارہ])

الکلاباذی: ابوبکر محمّد بن [ابی اسحٰق ابراھیم بن یعقوب] الکلاباذی البخاری تصوف کے ابتدائی دور کے لیے ان کی تحریریں سند ہیں۔ بخارا میں وفات پائی۔ سال وفات غالباً ۳۸۵ھ/۹۹۵ء ہے۔ ان کے حالات زندگی کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے البتہ ان کا نام فقہائے حنفیہ کی فہرست میں لکھا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے انھوں نے علم فقہ کی تحصیل محمّد بن فضل سے کی۔ کَلا باذ بخارا کا ایک محلہ ہے، جس کی نسبت سے وہ کَلاباذی کہلائے۔ ان کی دو کتابیں محفوظ ہیں: [پانچ چھے کتابوں میں سے صرف دو ہم تک پہنچی ہیں] ایک کتاب التعرف لمذھب

www.besturdubooks.wordpress.com

اهل التصوّف ہے یہ مختصر سی کتاب پچھتر ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں صوفیہ کے روحانی احوال اور اصول بیان کیے گئے ہیں۔ آگے چل کر اس کی جو شرحیں لکھی گئیں اور دستیاب بھی ہوتی ہیں، ان میں ایک علاء الدّین القونوی (م ۷۲۹ھ/۱۳۲۹ء) کی ہے اور دوسری المُستَملی کی جو ۱۰۷۰ھ/ ۱۶۶۰ء سے پہلے لکھی گئی اور جو ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ سے بچاپ سنگ شائع ہوئی۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ ایک اور شرح بھی ہے جسے غلطی سے شہاب الدّین السہروردی المقتول سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ جس کا متن ۱۹۳۴ء میں قاہرہ میں چھپا اور جس کا اے جے آربری A.J. Arberry نے کیمبرج میں ترجمہ کیا۔

کلاباذی کی دوسری کتاب بحرالفوائد [فی معانی الاخبار] ہے، یہ تصوف کے رنگ میں، دو سو بائیس منتخب احادیث کی شرح پر مشتمل ہے۔ ان میں بہت سی آیات اور ایسے اقوال منقول ہیں جو پہلی تصنیف میں بھی آ چکے ہیں (دیکھیے براکلمان: GAL، بار دوم، ۱: ۲۱۷؛ [تکملہ، ۱: ۳۶۰]).

کلاباذی کے قدیم ترین استاد فارس [ابن عیسٰی (م۔ ۳۴۵ھ)] تھے جن سے انھوں نے اپنی معلومات حاصل کیں لہٰذا ہمارے لیے ان کے دو اقتباسات جو انھوں نے الحلّاج [رک بآں] سے لیے ہیں، غیرمعمولی دلچسپی کا باعث ہو جاتے ہیں۔ کلاباذی نے ان کی طرف باحتیاط اشارہ کیا ہے، یعنی الحلاج کو محض ایک بڑا صوفی کہا ہے۔ تصوف پر قلم اٹھانے سے کلاباذی کا مقصد یہ تھا کہ علما اور صوفیہ کے درمیان جو خلیج حائل ہے، اسے پاٹ دیا جائے کیونکہ یہ خلیج حلاج کے قتل کے باعث سے زیادہ وسیع ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلاباذی نے جن ابواب میں صوفیہ کے عقائد سے بحث کی ہے، وہاں صرف فقہ الاکبر (دوم) کا حوالہ دیا ہے۔ [کلاباذی کا ایک مقصد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ کے صحیح اور مستند عقائد فقہ کی روشنی میں بیان کر دیے جائیں].

تصوف کی ابتدائی تاریخ کے ایک بلاواسطہ مأخذ کی حیثیت سے کلاباذی کا شمار بھی السراج، ابو طالب المکّی، السُّلَمی اور القُشیری کے ساتھ کیا جا سکتا ہے [کتاب التعرف کا انگریزی ترجمہ آربری نے مفید دیباچے کے ساتھ ۱۹۳۵ء میں شائع کیا اور اردو ترجمہ ڈاکٹر پیر محمّد حسن نے ایک محققانہ مقدمے کے ساتھ ۱۳۹۱ھ میں لاہور میں شائع کیا].

مآخذ: (۱) محمد عبدالحی لکھنوی: الفوائد البهية فی تراجم الحنفية، مصر ۱۳۲۴ھ، ص ۱۶۱؛ (۲) براکلمان: GAL، ۱: ۲۱۷، بار دوم، تکملہ، ۱: ۳۶۰؛ (۳) حاجی خلیفہ: کشف الظنون، ۲: ۱۶، ۳۱۶.

(A. J. ARBERRY)

کِلات نادری: (زیادہ صحیح کَلات)، * ایران (خراسان) کا ایک قصبہ جو روس اور ایران کی سرحد پر مشہد کے شمال اور سرخس کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ یہ ایک قدرتی قلعہ ہے اور قرہ داغ کے سلسلۂ کوہ کی ایک آگے کو بڑھی ہوئی چٹان پر بنا ہوا ہے۔ جب ارغون نے تکودار احمد کے مغول کا ایلخان منتخب ہو جانے پر علم بغاوت بلند کیا تھا اور شکست کھائی تو اسی قلعے میں پناہ لی تھی (۶۸۰ھ/۱۲۸۱ء)۔ مغربی جانب داخلے کا دروازہ آج بھی دربند ارغون کے نام سے مشہور ہے۔ (غالباً ایک مقبول عام اشتقاق کی بنا پر اس کا تلفظ ارغوان بھی کیا جاتا ہے)۔ امیر تیمور نے بھی اس کا محاصرہ کیا تھا۔ اس نے اس پر چودہ حملے کیے، لیکن ناکام رہا۔ یہ کشورکشا واپس چلا گیا، مگر قلعے کی ناکہ بندی کے لیے فوجیں چھوڑ گیا تھا۔ آخر وبا کے ہاتھوں تنگ آ کر قلعہ والوں کو سپر انداز ہونا پڑا۔ نادر شاہ جس نے اپنی زندگی کا آغاز ایک مہم جو کی حیثیت سے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کیا تھا، اس نے سب سے پہلے اسی مقام کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا تھا۔ بعد میں اس نے یہاں ایک محل اور دلی کا مال غنیمت رکھنے کے لیے ایک خزانہ گاہ تعمیر کرائی۔

مآخذ: (۱) میرزا مہدی خان: تاریخ جہان گشای نادری، بمبئی ۱۲۶۵ھ، ص ۱۸؛ (۲) تاریخ وصاف، حوالہ، در d' Ohsson: *Hist. des Mongols*، ۳: ۵۹۴؛ (۳) P. M. Sykes: *Journal of the Royal Geogr. Society*، دسمبر ۱۹۰۶ء؛ (۴) وہی مصنف: *History of Persia*، بار اوّل، ۲: ۱۸۵، ۲۰۱، ۳۴۱، ۳۵۹.

(Cl. Huart)

* **کلام**: [کلام کے ایک سے زیادہ معنی ہیں: (۱) لغوی؛ (۲) علم نحو میں؛ اور (۳) علم کلام میں۔ لغوی معنی ہیں گفتار یا بات چیت (لسان)۔] نحویوں نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ اس سے مراد وہ لفظ ہے جو بآواز بلند ادا ہو، جو مرکّب ہو، مفرد نہ ہو اور وضعی معنی ادا کرتا ہو نہ کہ حقیقی۔ آجرومیہ میں بھی ایسا ہی مرقوم ہے۔ المفصل کے مطابق یہ تام (= مکمل) جملہ ہونا چاہیے خواہ سادہ ہی سہی۔ ابن عقیل (شرح الالفیۃ) نے تو نہایت تفصیل سے کلام، کَلِم (تین یا زیادہ الفاظ کا مرکب جس سے ضروری نہیں پورا پورا مفہوم ادا ہوتا ہو)، کلمہ (واحد) اور قول (جو ان سب پر حاوی ہے) کے درمیان فرق کیا ہے۔ تھانوی (کشاف اصطلاحات الفنون، ص ۱۲۶۸ تا ۱۲۷۰) نے کلام اور اس کے اجزا پر صوتی، نحوی، لغوی اور علم بلاغت کے اعتبار سے مناسب شرح و بسط سے متکلمانہ بحث کی ہے (نیز دیکھیے De Sacy، در *Anthol. Gramm.*، ص ۷۳، ۹۳ اور حواشی)۔ لغوی اعتبار سے کلام ایسا اسم جنس ہے، جس کا اطلاق ہر بول چال پر ہوتا ہے، خواہ مختصر ہو یا مفصل (جوہری، در (صحاح) و لسان)، ہر قسم کی بات چیت پر ہوتا ہے: "لِکُلِّ مَا یُتَکَلَّمُ بِہٖ" (ابن عقیل) یا یہ مسلسل اصوات کا وہ اظہار ہے جس کے معنی سمجھ میں آ جائیں (الفیومی: المصباح)؛ چنانچہ عربی زبان میں اس مادّے کا استعمال اسی طرح ہوتا ہے، قرآن مجید میں یہ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے خطاب کرتے ہوے بکلامی کا لفظ استعمال کیا ہے: قَالَ یٰمُوْسٰٓی اِنِّی اصْطَفَیْتُکَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِکَلَامِیْ (۷ [الاعراف]: ۱۴۴)، یعنی فرمایا اے موسیٰ! میں نے تجھے لوگوں پر اپنی پیامبری اور اپنے کلام کے ذریعے سے ممتاز کیا۔ اس کا مطلب بیضاوی (طبع Fleischer، ۱: ۳۴۳) نے بِتَکْلِیْمِی اِیَّاکَ بیان کیا ہے اور سَیَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰی مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْکُمْ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلٰمَ اللّٰہِ (۴۸ [الفتح]: ۱۵)، یعنی "جب تم لوگ غنیمتیں لینے چلو گے تو جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ کہیں گے ہمیں بھی اجازت دیجیے کہ آپ کے ساتھ چلیں، یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے قول کو بدل دیں" کی تفسیر بیان کرتے ہوے لکھتا ہے کہ یہاں کلام ایک اسم ہے جو تکلیم کے لیے استعمال ہوا (۲: ۲۶۸، س ۱۰)۔ باقی وہ مقامات جہاں قرآن مجید میں کلام اللہ آیا ہے: اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ وَ قَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلَامَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ (۲ [البقرۃ]: ۷۵)، یعنی اے مسلمانو! توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مانیں اور ان میں ایک فرقہ تھا کہ وہ اللہ کا کلام سنتا تھا، پھر اس کو جان بوجھ کر بدل ڈالتے تھے اور وہ جانتے تھے۔ وہاں اس کا مفہوم یا تو

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ مچ حضرت موسیٰ سے بات کی اور یا اس سے مطلب ہے اس کا قانون (شریعت) الٰہیہ ؛ وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (۹ [التوبة] : ۶)، یعنی "اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو ان کی جگہ پر پہنچا دے یہ اس واسطے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔" اس آیت میں یہ امر بالکل واضح ہے کہ یہاں "کلام اللہ" کے معنی دین اسلام کے ہیں۔ قرآن مجید میں تکلیم بروزن تفعیل کا استعمال عام ہے جس کے معنی ہیں کسی سے کلام کرنا اور جس سے کلام کیا جائے، اس کی علامت مفعولی کے ساتھ۔ الاشعری (الابانۃ، مطبوعہ حیدر آباد، ص ۲۷) کہتے ہیں : تکلیم کے معنی ہیں کسی سے بالمشافہہ بات کرنا (المشافہۃ بالکلام)، باب تفعل کا استعمال چار مرتبہ آیا ہے : يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ (۱۱ [ہود] : ۱۰۵)، یعنی "جس دن وہ آئے گا کوئی جاندار اس کے حکم کے بغیر بات نہ کر سکے گا"؛ اور وَ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۲۴ [النور] : ۱۶)، یعنی "اور جب تم نے اسے سنا تھا تو کیوں نہ کہ دیا کہ ہمیں شایان نہیں کہ ایسی بات زبان پر لائیں۔ (پروردگار!) تو پاک ہے یہ تو (بہت) بڑا بہتان ہے"، اور اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ (۳۰ [الروم] : ۳۵)، یعنی کیا ہم نے ان پر اتاری ہے کوئی سند کہ وہ انہیں شریک کرنے کو کہہ رہی ہے؛ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ۝ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ (۷۸ [النبا] : ۳۸)، یعنی "جس دن روح (الامین) اور (اور) فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے تو کوئی بول نہیں سکے گا، مگر جس کو خدائے رحمٰن اجازت بخشے اور اس نے بات بھی درست کہی ہو۔" یہاں یہ فعل لازم ہے اور اس کا مطلب ہے بولنا، بات کرنا، بحث کرنا، چنانچہ جو موضوع زیر بحث ہوگا اس سے پہلے جس کا استعمال ضروری ہے۔ ۲۴ [النور] : ۱۶ میں جو لفظ کلام آیا ہے اس کا لب و لہجہ قدرے طنز آمیز ہے اس کے معنی کے لیے (دیکھیے Dozy، *Suppl.* : ۲ : ۴۸۶ الف)۔ کلام کا ایک مطلب کسی عقلی موقف کی تصریح یا کوئی دلیل جس سے اس تصریح کی تائید ہو اور متکلم وہ شخص جو ایسا کلام استعمال کرے (فہرست، بمواضع کثیرہ)۔ المسعودی (مروج، مطبوعہ پیرس، ۸ : ۱۶۱) نے تکلّم کا لفظ عام داستان گوؤں کی تیزی گفتار اور سرِ راہ نقالی کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ [دینی اصطلاح کلام کے لیے رک بہ مقالۂ علم (کلام)].

مآخذ : متن میں آ گئے ہیں۔

(D. B. MACDONALD)

کَلَانْتَر : (کلاں بمعنی بڑا اسم تفضیل)، * آج کل ایران میں اس سے مراد ہے کسی شہر کا اہم ترین شخص، یا جیسے رئیس بلدہ (Mayor)، عمدۂ بلد (Burgomaster) داروغہ یا چاؤش (bailiff)۔ یہ عہدہ بر بنائے انتخاب پر کیا جاتا ہے اور جو کوئی منتخب ہو اس کے لیے بالائی حکومت کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس عہدیدار کی اہم ترین ذمے داری محصولات کا عائد کرنا ہے۔

مآخذ : (۱) رضا قلی خان : فرہنگ انجمن آرائے ناصری، بذیل مادۂ کلان؛ (۲) Raphaël du Mans : *Estat de La Perse en 1660*، طبع Schefer، ص ۳۶؛ (۳)

www.besturdubooks.wordpress.com

(۴): E. Flandin: *Voyage en Perse*، ۲ : ۴۲۱؛ E. G. Browne: *A year amongst the Persians*، ص ۴۵۵.

(Cl. Huart)

* **کَلْب** : (بمعنی کُتّا)، یہ عام طور پر ان جانوروں میں شامل ہے جو، اسلام میں نجس قرار دیے گئے ہیں ۔ اس کی اوّل وجہ تو یہ ہے کہ اس کا گوشت کھانا حرام ہے (النووی : منہاج الطالبین، طبع v.d. Berg، ۳ : ۳۱۲)؛ اور دوسرے اس لیے کہ حدیث میں کتے سے متعلق خاص ارشادات ہیں، مثلاً یہ کہ جس خوراک کو کتا چاٹ جائے وہ نجس ہو جاتی ہے اور وضو کے پانی میں منہ ڈال دے تو اس سے وضو نہیں ہو سکتا (البخاری، کتاب الوضوء، باب ۳۳) [بخاری حوالۂ مذکور کے عنوان میں جو کچھ ہے وہ زہری کی فقط اپنی رائے ہے ۔ جس کے بعد بخاری نے سفیان کا قول نقل کیا ہے کہ میرے دل میں اس کی بابت شبہہ ہے، بہتر ہے کہ وضو کے ساتھ اس صورت میں تیمم بھی کر لے] جن برتنوں کو کتا چاٹ جائے انھیں کئی بار ریت سے مل کر دھونا چاہیے ۔ ایک لحاظ سے وہ اس تمام کمرے کو پلید کر دیتا ہے جس میں وہ ہو کیونکہ حدیث کی رو سے جس گھر میں کتا ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے اور حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کو وہ جگہ جہاں کتا چھپا پڑا تھا پانی سے صاف کرانی پڑی ۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام اس گھر میں داخل ہوے (مسلم : کتاب اللباس، حدیث ۳۱ ببعد) ۔ کتے نماز کے باطل ہونے کا موجب ہیں، یعنی اگر کتا نماز پڑھتے میں مصلّی کے قریب آ جائے تو نماز باطل ہو جاتی ہے ۔ [احادیث سے قریب آ جانا مفہوم نہیں ہوتا بلکہ سامنے سے گزرنا مراد ہے اور یہ بعض اصحاب ظواہر کا مسلک ہے، جمہور کے نزدیک کسی چیز کا سامنے سے گزرنا مفسد صلٰوۃ نہیں ہے (ابن ماجہ، حوالۂ مذکور، حاشیہ صفحہ کے شروع میں؛ ہدایہ اوّلین، مطبوعۂ لکھنؤ، ص ۱۲۳، حاشیہ ۱)] اس فساد کا باعث کتے کی نجاست کو ٹھیرانا اس وجہ سے اور بھی اہم ہو جاتا ہے کہ یہی حکم عورت حائض کے متعلق بھی ہے (ابن ماجہ، قاہرہ ۱۳۱۳ھ، ۱ : ۱۵۷) ۔ [صرف ایک حدیث میں مرأۃ کے ساتھ لفظ حائض آیا ہے، باقی احادیث میں فقط مرأۃ ہے ۔ اس لیے یہاں حائض سے مراد بالغہ ہے، چنانچہ دیگر احادیث میں بھی اس لفظ سے یہی مراد ہوگی ۔ نابالغہ لڑکیوں کے متعلق یہ حکم کسی کے ہاں بھی نہیں ہے ۔ بالغہ عورت کے بارے میں اختلاف پہلے بیان ہوا، یعنی فقط بعض اصحاب ظواہر مرور مرأۃ کو قاطع صلٰوۃ مانتے ہیں اور کوئی نہیں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا (حوالۂ بالا)] ۔ شارحین حدیث اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ کتا نمازی کو ڈرا دیتا ہے اور اس کی توجہ نماز سے ہٹا دیتا ہے (السندی : شرح ابن ماجہ، حوالۂ مذکور) ۔ چونکہ جمہور کسی چیز کے مصلّی کے سامنے سے گزرنے کو قاطع صلٰوۃ نہیں مانتے، اس لیے وہ احادیث کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ قطع سے مراد نقص ہے، یعنی ان اشیا کے مرور سے خیال دوسری طرف منتقل ہو جاتا ہے ۔ اس لیے ان اشیا کا مرور باعث نقصان صلٰوۃ ہے اور قاطع صلٰوۃ نہ ہونے کی دلیل ان کے نزدیک یہ حدیث ہے : "لا یقطع الصلٰوۃ مرور شیء، رواہ مسلم" (ہدایہ اوّلین ۔ مطبوعۂ لکھنؤ، ص ۱۲۳، س ۱ و ۲ از ابتداے صفحہ) ۔ یہ بات کالے کتے کی بابت خصوصیت کے ساتھ درست ہے کیونکہ وہ "شیطان" ہے (ابن ماجہ، قاہرہ ۱۳۱۳ھ، ص ۱۵۷، س ۷ ببعد) ۔ اس حدیث کو بعض نے لفظی معنوں میں لیا ہے، یعنی یہ کہ شیطان کبھی کبھی کالے کتے کی صورت

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

میں دکھائی دیتا ہے (دیکھیے Faust) یا اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ عام طور پر کالے کتے خصوصیت کے ساتھ شریر سمجھے جاتے ہیں [(دیکھیے ابن ماجہ: حوالۂ مذکور، ص ۱۵۷ (حاشیہ) الکلب الاسود شیطان)۔ شیطان کا مرور قاطع صلوٰۃ نہیں ہے، اس لیے اختلاف صورۃ کلبیہ ہی پر مرتکز ہے]۔ کتے بالعموم خطرناک سمجھے جاتے ہیں، اس لیے انہیں نیست و نابود کر دینا چاہیے (النسائی، مطبوعۂ قاہرہ، کتاب الصید والذبائح، باب ۹-۱۴، وسط صفحہ، باب الأمر بقتل الکلاب ببعد)، لیکن چونکہ "خدا کوئی ایسی چیز پیدا نہیں کرتا جس میں اس کی حکمت کی کوئی نشانی نہ ہو"، (السندی: شرح النسائی، حاشیہ (لولا ان الکلاب أمّة من الامم)، کتاب مذکور، حوالۂ بالا کی اس عبارت پر شرح) اس لیے یہ حکم صرف کالے کتے پر جاری ہوتا ہے۔ کتے کی ساری نوع کو فنا کرنے سے روک دیا گیا ہے۔

کتوں کو صرف شکار، بکریاں چرانے اور حفاظت کے لیے رکھنے کی اجازت ہے (النسائی: کتاب مذکور، ص ۱۹۵، س ۱۰ ببعد) جو شخص ان کے سوا کسی اور غرض سے کتا اپنے گھر میں رکھے گا، اسے اس کے نیک اعمال کے ثواب میں سے روزانہ دو قیراط کی کمی ہوتی رہے گی (دیکھیے *Babylon Talmud Shabbāth*، ورق ۶۳ الف: جس کسی کے پاس خطرناک کتا ہوگا سعادت مندی اس کے گھر کے نزدیک نہ آئے گی)۔ بلکہ حدیث کی رو سے کتے کا بیوپار سخت ممنوع ہے (البخاری، کتاب البیوع، باب ۲۵)۔

اس کے خطرناک اور ناپاک ہونے کے باوجود عرب کتے کی اچھی خصلتوں اور خدمات کی قدر پہنچانتے تھے۔ [اسلام میں اسی لیے اس سے مفید کام لینے کی اجازت ہے، مثلاً شکار، حفاظت وغیرہ]۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے (خود ایک عورت کو اس مہربانی کے صلے میں جو اس نے ایک پیاسے کتے سے کی تھی ثواب کا مژدہ دیا ہے (البخاری، کتاب الوضوء، باب ۳۳)۔ [اس حدیث میں عورت کا ذکر نہیں رجل کے لفظ سے آپ نے فرمایا کہ اس کو ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے بخش دیا گیا اور جنّت میں داخل کیا گیا۔] القزوینی (عجائب المخلوقات، ص ۴۰۳) کتے کی بابت لکھتا ہے کہ یہ "بہت سمجھدار، کارآمد، بھوک اور پاسبانی میں صابر جانور ہے، جس کی دانشمندی اور وفاداری بہت سے واقعات سے ثابت ہے"۔ القزوینی (عجائب المخلوقات) باؤلے کتے سے کاٹے جانے کی علامات تفصیلاً بیان کرتا ہے، اس پر دیکھیے *Babylon. Talmud Yōmā*، ورق ۸۳ ب: "باؤلے کتے کی پانچ علامتیں ہیں، اس کا منہ کھلا ہوتا ہے، اس کی رال بہ رہی ہوتی ہے، اس کے کانوں سے بدبو آتی ہے، اس کی دم ڈھیلی ہو کر سیدھی لٹک جاتی ہے اور وہ گلی کوچوں میں آوارہ پھرتا رہتا ہے"۔

اصحاب الکہف کا کتا البتہ مستثنیٰ ہے۔ البیضاوی کے بیان کے مطابق (طبع فلائشر Fleischer، ص ۵۵۷) یہ ایسا کتا تھا جس کو قوت گویائی عطا کی گئی تھی۔ الطبری (تفسیر، ۱۵: ۱۴۱، بار اوّل، ص ۱۳۱)، کی رائے ہے کہ یہ کتے کی شکل میں ایک انسان تھا، لیکن شاید یہ ایک عام کتا تھا۔ [اصحاب الکہف کے کتّے کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھیے عبدالماجد دریا بادی: تفسیر ماجدی؛ شبیر احمد عثمانی: تفسیر؛ محمّد شفیع: معارف القرآن، ج ۵، بذیل وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ (۱۸ [الکہف]: ۱۸)]۔

مآخذ: حدیث کے دوسرے مجموعوں میں وہ عبارتیں دیکھیے جو محولۂ بالا احادیث کے انداز پر ہیں۔

(۱) القزوینی: عجائب المخلوقات، طبع وستنفلڈ، ص

www.besturdubooks.wordpress.com

۴۰۳ ببعد؛ (۲) الدمیری: کتاب حیوۃ الحیوان الکبری، قاہرہ ۱۲۷۵ھ، ۲: ۳۲۰ تا ۳۶۰؛ مشرق کے سیاح مثلاً (۳) Ch. M. Doughty: *Travels in Arabia Deserta*، کیمبرج ۱۸۸۸ء بمدد اشاریہ؛ (۴) A. Musil: *Arabia Petraea*، ۳، (وی انا ۱۹۰۸ء)، بمدد اشاریہ؛ (۵) Julius Euting: *Tagbuch einer Reise in Innerarabien*، ۲: ۵۳، کتوں کے ناموں پر؛ مشرق کے شہروں کے کتوں پر دیکھیے (۶) Von Oppenheim: *Vom Mittelmeer Zum Persichen Golf*، برلن ۱۸۹۹-۱۹۰۰ء، ۱: ۶۹ تا ۷۱.

(B. JOEL)

* **الکَلْب**: علم ہیئت کا شِعْریٰ الیمانیہ (کلب الجبّار) ہے۔ اس سے صورت الکلب الاکبر (= بڑے کتے کا مجمع الکواکب) اور صورت الکلب الاصغر (= چھوٹے کتے کا مجمع الکواکب) یا صورت الکلب المتقدم (= اگلے کتے کا مجمع الکواکب) مراد ہے۔ اوّل الذّکر کلب اکبر (Canis major) اور مؤخر الذّکر کلب اصغر (Canis minor) کہلاتا ہے۔ یہ جنوبی افلاک کے مجمع الکواکب ہیں جن کے نام اور اشکال عربوں نے بطلیموس کی المجسطی سے اخذ کی ہیں۔ مؤخر الذّکر کے تتبع میں عربوں نے بھی ۱۸ ستارے کلب اکبر کی خاص شکل میں شامل کیے ہیں جن میں سے سیریوس Sirius (الشعریٰ العبور) قدر اول (دراصل ۱٫۶) کا ہے۔ ۱۱ ستارے مجمع الکواکب کے باہر واقع ہیں اور کلب اصغر میں دو ستارے ہیں جن میں سے پروکیون Prokyon (اے) کلب اصغر یا الشعریٰ الغمیصاء) بھی قدر اول (دراصل ۰٫۵) کا ہے۔ جہاں تک کوکبی محدّدوں (عرض بلد و طول بلد) کا تعلق ہے عبدالرحمٰن الصوفی (م ۳۷۶ھ/۹۸۶ء) اور البیرونی (م ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء) کی فہرست ہائے نجوم تمام تر بطلیموس کی المجسطی پر مبنی ہیں، لیکن وہ فہرست جو الغ بیگ نے ۱۴۳۷ء کے دوران میں تیار کی تھی، ستاروں کے مقامات کی بہت سی نئی حدود پر مشتمل ہے۔

شِعریٰ (یمانی) کے نام کی روایت غالباً مصر قدیم تک پہنچتی ہے جہاں آج کل کا سیریوس، یعنی مشتعل، درخشاں (= Dog Star کے اضافے کے ساتھ) سوپ ڈٹ (Sopdet) کہلاتا تھا جو بلاشبہہ بعد میں یونانی سوتھس (Sothis) بن گیا۔ اصل میں ستارے نام کا کتے سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن یونانی سفال کاری (Terracotta) میں جس کے آثار مصر میں اکثر پائے جاتے ہیں دیوی ایزیس (Isis) جس کے نزدیک یہ ستارہ مقدس تھا، اکثر ایک کتے کی ہمراہی میں دکھائی گئی ہے اور بقول L. Borchardt ایک خاص قسم کے کتے کی معیت میں جسے عرف عام میں ارمنت Ermant or Arment کتا کہتے ہیں دکھایا گیا ہے۔ سریوس Sirus کا چربہ بھی سفال کاری میں اسی طور پر اتارا گیا ہے۔ بعض اوقات اس کے سر پر بھی ستارہ ہوتا ہے۔ L. Borchardt کے نزدیک یہ غیر اغلب نہیں کہ جو ستارہ رامیسی Ramesid مقبروں سے برآمد شدہ ستاروں کی جدولوں میں دکھایا گیا ہے اور جو سوپ Sopdet سے پہلے یا پیچھے آتا ہے، وہ آج کل کا پروکیون Prokyon ہی ہو۔

بابل میں سیریوس "تیر ستارہ" (Arrow Star) کہلاتا تھا۔ اس کا نام کتا ستارہ کبھی نہ تھا؛ اس ستارے کا قدیم بابلی نام (بقول ایکس کیوگلر F. X. Kugler) ککب مشری Kakkabmishre تھا اور بعد کی بابلی زبان میں اسے کک کشتی kak-kashti (کمان کا ہتیار، تیر) کہتے تھے۔

مآخذ: (۱) Schjellerup: *Description des étoiles fixes*، (سینٹ پٹرز برگ ۱۸۷۴ء، ترجمۂ کتاب الکواکب الثابتہ، از عبدالرحمٰن الصوفی؛ (۲) البیرونی:

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

القانون المسعودی، مخطوطۂ کتاب خانۂ برلن، ص ۲۰۹ ب ببعد؛ (۳) الخوارزمی: مفاتیح العلوم، طبع v. Vloten، ص ۲۱۳؛ (۴) المسعودی: مروج الذهب، پیرس ۱۸۶۹-۱۸۷۷ء، ۳: ۳۱۶ ببعد؛ (۵) القزوینی: عجائب المخلوقات، طبع وستنفلڈ، ص ۳۹ ببعد؛ (۶) L. Ideler: *Untersuch über den Ursprung u. die Bedeutung der Sternnamen*، برلن ۱۸۰۹ء، ص ۲۳۸ ببعد؛ (۷) C. A. Nallino: *Opus astronomicum*، ۲: ۱۷۱؛ (۸) B. Knobel: *Ulug Beg's catalogue of stars*، طبع واشنگٹن ۱۹۱۷ء؛ (۹) F. X Kugler: *Sternkunde und Sterndienst in Babel*، ج ۲ (Münster ۱۹۲۴ء): ۵۲۲ ببعد.

(C. Schoy)

* **کَلْب بن وَبَرَة**: بنو کلب کا جدّ امجد جس کے نام سے یہ قبیلہ منسوب ہے۔ بنو کلب شام کے بدوی عربوں کا ایک گروہ ہے جو قضاعۃ [رک بآں] کے طاقت ور گروہ سے وابستہ ہے۔ ہجرت کے بعد کلب کے قبائل میں سب سے زیادہ شہرت خصوصاً تاریخ ادب میں بنو عذرۃ (رک بآں) نے پائی۔ بنو کلب کے زمانۂ قبل اسلام کے جو حالات و واقعات معلوم ہیں، وہ بہت دھندلے اور نیم افسانوی ہیں۔ زُہیر بن جناب [رک بآں] جو قریب قریب ایک فرضی شخصیت بن چکا ہے اور جس کا مُعَمَّرون، یعنی صد سالہ لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے، اس قبیلے کے بڑے بڑے سرداروں میں سے تھا۔ معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے جزیرہ نمائے عرب کے دوسرے قبائل سے بالکل الگ تھلگ رہ کر نشو و نما پائی تھی اور ان کا دوسرے قبائل سے کوئی رشتہ یا تعلق نہیں تھا۔ ان کی زبان میں بعض عجیب و غریب امتیازی خصوصیات ملتی ہیں اور ہمیں زمانۂ قبل از اسلام کا کوئی شاعر نظر نہیں آتا جس نے یہ زبان استعمال کی ہو۔ زمانۂ ہجرت میں یہ شامی عربوں کا وقیع قبیلہ تھا۔

شام کی فتح کے بعد بنو کلب منظر عام پر آئے۔ اس بات میں ان کا کچھ کم دخل نہ تھا کہ امیر معاویہؓ اول نے اس قبیلے سے معاہدۂ اتحاد کر لیا اور میسون [رک بآں] مادر یزید اول کے ساتھ شادی کر کے معاہدے پر مہر توثیق ثبت کر دی۔ اس سیاسی اتحاد سے بنو کلب کے افراد کو دربار اور فوج میں اونچے عہدے مل گئے۔ فوج کو اس قبیلے سے تربیت یافتہ سپاہی اور بڑے دلیر سپہ سالار ملے۔ پہلی صدی ہجری کے وسط کے قریب ان کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی۔ ان میں سے ۲۰۰۰ افراد کو ۲۰۰۰ درہم کا وظیفہ دیا جاتا تھا۔ اسے "شرف العطا" کہتے تھے اور یہ ایک ایسا امتیاز تھا جو فقط اشراف کے لیے مخصوص تھا۔ ان نیم حضری اور نیم بدوی لوگوں نے جو گلہ بانی میں بڑے مشّاق تھے، اپنے مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ صحرائے سَماوَۃ کے لق و دق میدانوں میں جو شام کو عراق سے جدا کرتے ہیں اور اسی وجہ سے اس کو سَماوَۃ کلب یا صحرائے کلب کہتے ہیں، پھیلا رکھے تھے۔ حوران کے جنوب اور مشرق کے چشمے اور نخلستان ان کے قبضے میں تھے، بالخصوص دومۃ الجندل، تبوک اور چند دیگر مقامات جن میں وادی القُریٰ کے آس پاس جگہ جگہ کھجوروں کے باغات تھے، جو بنو عذرۃ کی املاک تھے۔ شام میں وہ سَلَمیَہ اور پالمیرا کے گرد و نواح میں متعدد گروہوں میں آباد تھے۔ یہ دونوں شہر بھی انھیں کے تھے۔ ضلع امسۃ Emesa کا کچھ علاقہ اور دریائے عاصی کی وادی زیریں کا ایک حصہ ان کے مقبوضہ علاقے میں شامل ہو کر باہم متحد ہو گئے تھے اور غوطۂ دمشق [رک بآں] میں بھی کچھ دیہات پر بنو کلب قابض تھے۔ چونکہ پالمیرا اور دومۃ الجندل جیسے تجارتی مرکزوں پر ان کا

www.besturdubooks.wordpress.com

قبضہ تھا، اس لیے یہ امر قرین قیاس ہے کہ ان شاہراہوں سے جہاں پہلی صدی ہجری تک بھی بہت آمد و رفت رہتی تھی، گزرنے والے قافلوں سے یہ ہوشیار، محنتی، شامی قبیلہ کافی فائدہ اٹھاتا ہوگا.

معلوم ہوتا ہے کہ متحدہ قبائل کی قیادت قدیمہ انہیں بنو غسان سے ورثے میں ملی تھی۔ بنو غسان اور دوسرے شامی عرب قبائل کی طرح ہجرت کے وقت اس قبیلے کے اکثر لوگ بھی عیسائی تھے اور فرقۂ یعقوبیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک فریق نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے پاس ایک وفد بھی بھیجا تھا۔ متعدد کلبیوں نے آنحضرتؐ کا متبع ہو کر عروج حاصل کیا اور بڑی اہم خدمات سر انجام دیں۔ ان میں سے آنحضرتؐ کے متبنّٰی زید بن حارثہ اور آپؐ کے سفیر دحیۃ بن خلیفہ قابل ذکر ہیں۔ اس قبیلے میں اسلام خاص طور پر اس وقت پھیلا جب بنو امیہ کے ساتھ ان کے ازدواجی تعلقات قائم ہونے لگے۔ سب سے پہلا تعلق حضرت عثمانؓ [رک بآں] اور [حضرت] نائلہ کی شادی سے پیدا ہوا اور اس سے انھیں عرب کے دوسرے قبائل پر غلبہ حاصل ہونے کا یقین ہو گیا۔ یزید اول نے کچھ ایام شباب اپنی ماں کے ساتھ صحرائے کلب میں بسر کیے اور ایک کلبیہ سے شادی کی۔ اس قبیلے اور طاقتور قبیلۂ بَجْدَل [رک بآں] کے عروج کی وجہ سے بنو قیس ان کے خلاف بھڑک اٹھے۔ انھوں نے معاویۂ ذوم کو خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کر کے ابن الزبیرؓ [رک بہ عبداللہؓ بن الزبیرؓ] کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ مرج راہط کی فتح کے بعد جو زیادہ تر کلبیوں کی جوانمردی کی مرہون منت تھی، ان دونوں قبائل کے درمیان پوری طرح ٹھن گئی۔ جوش انتقام میں انھوں نے بنو کلب پر ہر جگہ حملے شروع کر دیے اور انھیں عراق اور اس سے ملے ہوئے اضلاع سَماوۃ سے نکال دینے میں کامیاب ہو گئے۔ مزید برآں آل مروان کے برسراقتدار آنے سے دربار دمشق میں جہاں مرج راہط کی شاندار فتح کے بعد ان کے کئی دشمن پیدا ہو گئے تھے، ان کی قدر وقتی طور پر گھٹ گئی تھی، لیکن انھیں دوبارہ اثر و رسوخ حاصل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ان کا شمار بدستور سلطنت بنی امیہ کے ثابت قدم اور سرگرم ترین حامیوں میں ہوتا رہا۔ ان کے فوجی دستوں نے بارہا عراق کو مشرق کے باغیوں سے دوبارہ چھیننے میں بڑی کامیابی سے اعانت کی۔ اسی وجہ سے ان کو قضاعۃ کا سب سے زیادہ بہادر قبیلہ مانا جاتا تھا۔ قصہ مختصر لقب کلبی، بنی امیہ کے معاون کا مرادف ہو کر رہ گیا تھا۔ بنی امیّہ کا طریق عمل تقریباً ہمیشہ یہی رہا کہ بنو کلب کے معاہدۂ اتحاد پر بھروسا کیا جائے اور پھر ان کے ذریعے دیگر شامی قبائل کی اعانت حاصل کی جائے۔ ایک روایت ہے کہ السفیانی [رک بآں] کے آخری حمایتی کلب ہوں گے۔ اس صورت حالات کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ عہد عباسی میں بنو کلب کو بڑی سخت پاداش بھگتنی پڑی اور ان پر بہت جلد زوال آ گیا کیونکہ ان کی تعداد ایک مدت تک قیس کے ساتھ لڑنے میں اور اسلامی فتوحات کی جنگوں کے اندر عملی حصہ لینے میں پہلے ہی بہت کچھ گھٹ چکی تھی۔ ان کی عصبیت ختم اور اتفاق پارہ پارہ ہو گیا اور لقب کلبی جو بغداد کی حکومت کی نگاہ میں شک و شبہہ کا مورد بن چکا تھا، رفتہ رفتہ بالکل غائب ہو گیا۔ ابن سعد جس کا قول القلقشندی نے (اپنی تصنیف نہایۃ الارب) میں نقل کیا ہے کہتا ہے کہ اس کے زمانے میں بنو کلب کی ایک بڑی تعداد "آبنائے قسطنطنیہ" کے ساحلی علاقوں

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

میں آباد تھی اور ان میں نصف مسلم تھے اور نصف عیسائی۔

مآخذ: (۱) ابن دُرید: کتاب الاشتقاق، ص ۳۱۴ ببعد؛ (۲) Wüstenfeld: *Register zu den genealog. Tabellen*، ص ۲۶۴ تا ۲۶۷؛ (۳) دوسرے حوالوں کے لیے بڑی تصنیف *Etudes sur le regne du calife omalyade Moâwia I^er* ص ۵۰، ۵۱، ۶۵، ۲۸۶ تا ۲۹۳، ۳۰۹ تا ۳۱۲، ۳۲۴ تا ۳۲۶، ۳۱۸

(H. LAMMENS)

* **کُلبَرگَہ**: رک بہ احسن آباد، گُلبَرگہ۔

* **اَلکَلبی**: کوفی علما کا ایک خانوادہ۔ الکلبی الکبیر ابو النّضر محمّد (بن سالک بروایت ابن الکوفی، در الفہرست) بن السائب بن بِشْر کے دادا نے اپنے بیٹوں، السائب، عُبَید اور عبدالرحمٰن نے حضرت علیؓ کی حمایت میں جنگ جمل میں حصہ لیا تھا۔ اس کے باپ نے حضرت مصعبؓ بن الزبیرؓ کے ساتھ شہادت پائی اور خود ابو النضر محمّد الکلبی نے دیر الجماجم [رک بآں] کی لڑائی میں عبدالرحمٰن بن محمّد الاشعث [رک بآں] کی ہمراہی میں شرکت کی تھی۔ بعد ازاں ابو النضر محمّد الکلبی نے خود اپنے کو لغت اور اخبار العرب کے درس و تدریس کے لیے وقف کر دیا۔ اس نے الفرزدق کے نقائض کو الفرزدق [رک بآں] سے پڑھا تھا۔ وہ کوفے میں تفسیر اور اخبار العرب پر لیکچر دیا کرتا تھا۔ سلیمان بن علی کی دعوت پر اس نے کچھ عرصہ اس کے گھر میں قرآن مجید کی تفسیر کا بھی درس دیا تھا۔ اس کی تفسیر سے الثّعلبی (م ۴۲۷ھ/ ۱۰۳۶ء) نے بھی استفادہ کیا تھا (دیکھیے *Cat. Codd. Mss. or.*، موزۂ برطانیہ، ج ۲، عدد ۸۲۱)۔ اس نے ۱۴۶ھ/۷۶۳ء میں وفات پائی۔

ابو المنذر ہشام نے اخبار العرب کی تعلیم اپنے والد سے پائی اور پھر خود اس نے ایام العرب اور اخبار العرب کی تدریس جاری رکھی۔ ارباب جرح و تعدیل نے دونوں علما کو ضعیف الروایت لکھا ہے (دیکھیے الاغانی، ۹: ۱۹؛ ۱۱: ۴۸؛ ۱۸: ۱۶۱؛ Goldziher: *Muh. Studien*، ۱: ۱۸۶)؛ جب کہ بعض نے انھیں ثقہ بتلایا ہے (یاقوت: معجم، طبع Wüstenfeld، ۲: ۱۵۸)۔ موجودہ علمی تحقیقات نے ان کی روایات کی تصدیق کر دی ہے، کیونکہ ان کے استدلال علمی کی بنیاد کتبات کے مطالعے پر ہے (دیکھیے Nöldeke: *Gesch. der Araber U. Perser*، ص ۲۷)۔ محمّد بن المنذر نے کچھ عرصے کے لیے بغداد میں ملازمت بھی کی تھی۔ اس نے اپنے وطن کوفے میں ۲۰۴ھ/۸۱۹ء میں وفات پائی۔ بعض اس کا سال وفات ۲۰۶ھ بتاتے ہیں۔

محمّد بن المنذر کی ایک سو پچاس کتابوں (الفہرست، ص ۹۵ تا ۹۸) میں سے یہ کتابیں اب دستیاب ہوتی ہیں: (۱) کتاب النّسب الکبیر یا الجمہرۃ فی النسب (حاجی خلیفہ میں جمہرۃ الانساب)، جو کہ عربوں کے انساب پر ہے اور ایسکوریال Escorial میں اس کا ایک مخطوطہ محفوظ ہے (دیکھیے Casiri: *Bibl. arabico-hispana*، عدد ۱۶۹۳)؛ اس کی دوسری جلد موزۂ برطانیہ میں ہے (دیکھیے Brit. Mus.: *Cat. Codd. Mss*، ۲، عدد ۹۱۵) جو جدید مگر ناقص ہے۔ شاید یہ کسی اقتباس کی نقل ہے۔ اس کتاب کا کچھ حصہ پیرس میں ایک مخطوطے کی شکل میں محفوظ ہے (فہرست کتاب خانہ ملّی، مرتبۂ دیسلان، عدد ۲۰۴۷)۔ ابو سعید علی بن موسی السّکّری (م ۴۶۵ھ/۱۰۷۵ء) نے اس کتاب کی تلخیص بھی کی تھی جو کہ محمّد بن حبیب کی روایت پر مبنی ہے۔ السّکری نے ابن العربی اور دوسرے قدیم

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

مصادر سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ اس کی پہلی جلد موزۂ بریطانیہ میں موجود ہے (دیکھیے Cat.، عدد ۱۲۰۲، ص ۸۳ ب) ۔ یاقوت کا اقتباس کردہ نسخہ قاہرہ میں ہے، فہرست، (دارالکتب المصریہ، ۵ : ۱۵۶؛ Vollers : Zeitschr. d. deutsch. Morg. Gesellsch، ۴۳ : ۱۱۶)؛ (۲) کتاب نسب فحول الخیل فی الجاهلیة و الاسلام (دیکھیے Hammer : Denks. der Wiener Akad, Phil. Hist. Kl، ۶ : ۲۱۴، عدد ۵۰)، در گوتھا (دیکھیے Pertsch : Die arab. Hdss.، عدد ۲۰۷۸)، نیز در ایسکوریال (دیکھیے Casiri، عدد ۱۷۰۰، ۲)؛ (۳) کتاب الاصنام (یا کتاب تنقیص الاصنام)، طبع زکی پاشا [Ibn al Kalbi : Le Livre des Idoles، (کتاب الاصنام)، قاہرہ ۱۹۱۴ء] ۔ عبدالقادر البغدادی نے کتاب کے مطالب کا خلاصہ بیان کیا ہے (خزانة الادب، ۳ : ۲۴۲ تا ۲۴۶)، جس سے کتاب کی وسعت اور اس کی ترتیب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ یاقوت نے معجم البلدان میں اس کتاب کے بہت سے اقتباسات دیے ہیں، جن کا ترجمہ مع حواشی Wellhausen نے شائع کیا ہے : Reste arab. Heidentums، بار دوم، ص ۱۰ تا ۶۴ (دیکھیے ص ۲۴۳) ۔ الانباری نے کتاب الکلاب (فہرست، ص ۹۷، س ۱۸) سے ایک اقتباس مفضلیات کی شرح میں بھی دیا ہے، دیکھیے Ibn al-Kalbi's Account of the first : C. J. Lyall Orient. Stud. Th. Nöldeke در day of al Kulāb Giessen) Gewidmet ۱۹۰۶ء)، ۱ : ۱۲۷ تا ۱۵۴ ۔

مآخذ : ابن سعد : طبقات، ۶ : ۲۴۹ تا ۲۵۰؛ (۲) ابن حجر : تہذیب التہذیب، (حیدر آباد دکن، ۱۳۲۵—۱۳۲۷ھ)، ج ۹، عدد ۲۶۶؛ (۳) ابن الانباری : نزهة الألبّاء فی طبقات الأدبّاء، ص ۱۱۶ تا ۱۱۸، قاہرہ ۱۲۹۴ھ؛ (۴) Wüstenfeld : Geschichtsschreiber، عدد ۲۶، ۴۲؛ (۵) Nöldeke-Schwally : Gesch d. Qorāns، ۲ : ۱۶۸، ۱۷۰، ۱۷۱؛ (۶) Brockelmann : Gesch. d. ar Lit.، ۱ : ۱۳۸ تا ۱۴۰ ۔

(BROCKELMANN)

* کُلثُوم بن عیّاض القُشَیْرِیّ : بنو قیس [ابن الأعْوَر بن قشیر بن کعب ربیعة کا نامور فرزند اور اموی عہد کا بہادر سپہ سالار جس نے افریقیة میں لشکر کشی کی] ۔ اسے خلیفہ ہشام [ابن عبدالملک] نے اس شکست فاش کے انتقام کے لیے منتخب کیا تھا جو ۱۲۳ھ [/۷۴۱ء] کی ابتدا میں عربوں کو غزوات الاشراف میں صوفی بربروں کے ہاتھوں ہوئی تھی ۔ کُلثوم ۳۰ ہزار فوج کے ساتھ جس میں الافریقیة اور مغرب کے دستے بھی شامل ہو گئے تھے روانہ ہوا اور حبیب بن ابی عُبَیْدة سے جو تلمسان کے قریب خوارج کی پیشقدمی روکنے کی کوشش کو رہا تھا جا ملا، لیکن شامیوں کے نامناسب رویے اور بالخصوص کلثوم کے بھتیجے اور نامزد جانشین بَلْج [ابن بِشْر بن عیاض] کے غرور اور نخوت سے وہ لوگ ناراض ہو گئے جن کی اعانت کے لیے وہ یہاں آئے تھے ۔ بربری قائد خالد بن حمید عربوں سے کٹ کر وادی سبو جو مغرب کے وسط (طنجہ) میں واقع ہے چلا گیا ۔ اسی دوران [فاس کے شمال میں] نَبْدُوره (مقامی تلفظ بَقْدُوره) کے مقام پر ایک معرکہ ہوا جس میں حبیب کے دانشمندانہ مشورے کو رد کر دیا گیا ۔ بالآخر وہ عرب رسالہ جسے بَلْج نے چھپا رکھا تھا بمشکل بربری صفوں کو چیر کر نکلنے میں کامیاب ہو سکا، لیکن بربروں نے ان کے عقب میں اپنی صفیں دوبارہ مرتب کر لیں اور خلیفہ کی فوج کو گھیرے میں لے لیا ۔ حبیب اور چند دوسرے سپہ سالار مارے گئے ۔ کلثوم آیات قرآنی پڑھ پڑھ کر دوسروں کو جرأت

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

دلاتا رہا اور انتہائی دلیری سے لڑا، مگر بالآخر وہ بھی کام آیا۔ ایک تہائی فوج ہلاک ہو گئی اور ایک تہائی گرفتار (ذوالحجہ ۱۲۳ھ/اکتوبر نومبر ۷۴۱ء)۔ بَلْج کے رسالے کے لیے بچاؤ کی واحد صورت یہ تھی کہ سبتہ میں پناہ لے جہاں سے بڑی مصیبتیں اٹھاتا ہوا وہ سمندر پار کرکے ہیسپانیہ پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ [اَرَکَ بہ بَلْج بن بِشْر].

مآخذ: (۱) ابن خلدون: کتاب العبر، ۶: ۱۱۱، ۱۱۹؛ (۲) [ابن حزم: جمهرة انساب العرب، ص ۲۹۰]: (۳) *Histoire de l' afrique et de la Sicile*، طبع و ترجمہ Desverges، ص ۱۱ تا ۱۳ متن، ۳۶ تا ۳۸ ترجمہ؛ (۴) ابن عذاری: البیان المغرب، ۱: ۴۱ تا ۴۳؛ (۵) ابن القوطیة: تاریخ افتتاح الاندلس، میڈرڈ ۱۸۶۸ء، ص ۱۵ تا ۱۵ [کذا ؟]؛ (۶) البلاذری: فتوح البلدان، ص ۲۲۹ ۲۳۲؛ (۷) اخبار مجموعة، ص ۳۲ تا ۳۵؛ (۸) ابن الأثیر: کامل، طبع قاهره، ۵: ۱۱۷؛ (۹) ابن تغری بردی: النجوم الزاهرة، ۱: ۳۲۱؛ (۱۰) المقری: نفح الطیب، ۲: ۱۲؛ (۱۱) ابن ابی دینار القیروانی: کتاب المؤنس، ص ۳۸؛ (۱۲) Dozy: *Hist. des Musulmans d' Espagne*، ۱: ۲۴۵ تا ۲۴۸؛ (۱۳) Fournel: *Les Berbers*، ۱: ۲۹۱ تا ۲۹۶؛ (۱۴) Mercier: *Histoire de l' Afrique septentrionale*، ۱: ۲۳۱ و ۲۳۲.

(RENÉ BASSET)

کِلِک: (فارسی) وہ بیڑا جو لمبے لٹھوں یا شہتیروں کو باہم رسّوں سے باندھ کر بنایا جائے اور پانی میں چھوڑ کر اس کے نیچے بھیڑوں کی کھالوں کی مشکیں ہوا سے پھلا کر مضبوطی سے باندھ دی جائیں۔ اس قسم کے بیڑے زیادہ تر دریاے دجلہ کے ان مقامات میں استعمال ہوتے ہیں جہاں جہازرانی ممکن نہیں۔ ان کا بیان اس قدیم زمانے میں موجود ہے کہ Herodotus (۱: ۱۹۴) اور Xenophon (*Anabasis* ۱:۵، ۲:۵، ۹) بعد) میں ملتا ہے یہ آج کل بھی زیر استعمال ہیں اور عراق کے تقریباً تمام سیاحوں نے ان کا ذکر کیا ہے۔

مآخذ: (۱) Thévenot: *Suite du voyage de levant*، پیرس ۱۶۷۴ء، ۲: ۱۰۳ ببعد؛ (۲) Buckingham: *Travels in Mesopotamia*، لنڈن ۱۸۲۷ء، ۲: ۸۷؛ (۳) Ker Porter: *Travels*، لنڈن ۱۸۲۱ - ۱۸۳۲ء، ۲: ۲۵۹؛ (۴) V. Moltke: *Gesammelte Schriften*، ۸: برلن ۱۸۹۳ء بمدد اشاریہ؛ (۵) H. Ritter در *Isl.*، ۹: ۱۴ ببعد.

(ادارۂ [آ]، لائیڈن، بار اوّل)

کَلکَتّہ (Calcutta): صوبۂ مغربی بنگال کا* ⊗ صدر مقام اور بھارت کا سب سے بڑا شہر، جو خلیج بنگال سے تقریباً ۸۰ میل کے فاصلے پر دریاے گنگا کی ایک شاخ ہگلی (جس میں بڑے بڑے جہاز بھی چل سکتے ہیں) کے بائیں، یعنی مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ ریل اور سمندر کے ذریعے آمد و رفت کا مرکز اور یورپ اور مشرق بعید کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے دنیا کی مصروف ترین بندرگاہوں میں سے ہے۔ ہندوستان کی سمندر پار کے ممالک سے تجارت کے تقریباً ۵/۷ حصے میں کلکتہ اور بمبئی شریک ہیں، جس میں بڑا حصہ کلکتے کا ہے۔ ملک بھر کے کارخانوں کی تقریباً ایک تہائی منظم صنعت اس کے گرد و نواح میں قائم ہے۔ یہاں بہت بڑا بین‌الاقوامی ہوائی اڈا ہے۔ [خاص کلکتے کا رقبہ ۴۰ مربع میل (تقریباً ۱۰۰ مربع کیلومیٹر) ہے، آبادی ۱۹۷۱ء میں ۷۰۰۵۳۶۲ تھی۔ کلکتے کے بڑے نواحی شہر ہوڑہ، بڑا نگر، جنوبی ڈم ڈم، بہالہ اور گارڈن ریچ ہیں۔ اس تمام علاقے کا رقبہ ۵۰۰ مربع میل تقریباً ۱۳۰۰ مربع کیلومیٹر ہے جو دراصل کلکتے ہی سے ملحق ہے۔ کلکتے کا ان شہروں سے دریاے ہگلی کے دو پلوں،

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ہوڑہ پل اور بابی پل کے ذریعے رابطہ قائم ہے ایک تیسرا پل بھی زیر تجویز تھا (۱۹۷۳ء)]۔

موجودہ دور کے اس گنجان دارالملک کا آغاز سترھویں صدی کے اواخر میں کچّے گھروں والے تین گاؤں کے مجموعے سے ہوا۔ کلکتے کا ذکر سب سے پہلے ویر داس کی بنگالی نظم "منسا۔ وِجَیہ" (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا متن، ۱۴۴) میں پایا جاتا ہے، جو ۱۴۹۵ء میں لکھی گئی تھی، لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ حصّہ جس میں کلکتے کا حوالہ ہے، بعد میں بڑھایا گیا ہو۔ قطعیت کے ساتھ کلکتے کے متعلق پہلا بیان آئین اکبری (لکھنؤ کا متن، ii، ۶۲) میں ہے جو ۱۵۹۶ء کے لگ بھگ مرتب ہوئی۔ اس میں کلکتے کا ذکر شہنشاہ اکبر کے زیر نگیں گاؤں کی سرکار کے ایک مالیہ گزار گاؤں کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ شہر کی بنیاد تقریباً ایک صدی بعد ۱۶۹۰ء میں رکھی گئی۔ انگریزی تاجروں کو جو تقریباً پچاس سال سے بنگال میں آئے ہوئے تھے کسی مورچہ بند جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ ۱۶۸۶ء کے بعد Job Charnock کی زیر ہدایت آباد ہونے کی دو ناکام کوششیں کرنے کے بعد بالآخر ۲۴ اگست ۱۶۹۰ء کو موجودہ کلکتے کے شمالی حصے "سوتانت" میں آباد ہو گئے۔ ۱۶۹۶ء میں انگریزوں کو قلعہ بنانے کی اجازت مل گئی۔ دو سال بعد انھوں نے شہنشاہ اورنگ زیب کے پوتے شہزادہ (بہ تصحیح) عظیم الشان سے سوتانت (شمال) کلکاٹا (وسط) اور گووند پور (جنوب) کے تین گاؤں کرایہ پر لینے کی اجازت حاصل کر لی۔ جدید کلکتہ انھیں تین مواضع کے گرد پھیلا۔ ۱۷۹۷ء میں اسے ایک علٰحدہ پریذیڈنسی Presidency (= احاطہ) کا مرکز بنا دیا گیا۔ ۱۷۱۷ء میں انگریزوں کو مغل بادشاہ فرخ سیر سے اس آبادی کے نواح میں ۳۸ گاؤں خریدنے کی اجازت مل گئی۔ ان میں سے بعض کے نام اب بھی شہر کے محلوں کے ناموں میں موجود ہیں [انگریزوں کو تین ہزار روپے سالانہ کی ادائی پر تجارت کرنے کی آزادی بھی مل گئی کمپنی کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے] جون ۱۷۵۶ء میں نواب بنگال سراج الدّولہ نے اس پر قبضہ کر لیا اور اپنے عارضی قبضے کے دوران میں اس کا نام علی نگر رکھا۔ جدید کلکتے کا آغاز ۱۷۵۷ء سے ہوتا ہے جب کہ پلاسی کی جنگ (ماہ جون) کے بعد انگریز عملی طور پر بنگال کے مالک ہو گئے۔ پرانے قلعے کو ترک کر دیا گیا اور [لارڈ] کلائیو نے گووند پور کے مقام پر موجودہ فورٹ ولیم کی تعمیر شروع کی۔ ۱۷۷۲ء میں صوبے کا خزانہ مرشد آباد سے کلکتے منتقل کیا گیا اور ۱۷۷۳ء میں کلکتہ برطانوی ہندوستان کا سرکاری صدر مقام بن گیا۔ اس وقت سے ۱۹۱۱ء تک یہ ہندوستان، نیز بنگال کا اور ۱۹۴۷ء تک صوبۂ بنگال کا دارالحکومت رہا۔

۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے بنگال کو دو حصوں (مغربی اور مشرقی بنگال) میں تقسیم کر دیا اور ڈھاکے کو مشرقی بنگال اور آسام کا دارالسلطنت مقرر کر دیا۔ ۱۹۱۲ء میں حکومت انگلشیہ کا دارالسلطنت دہلی میں منتقل ہو گیا۔

انیسویں صدی میں انگریزوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اقتصادیات نے جغرافیائی تبدیلیوں کی وجہ سے جو صورت اختیار کی اس سے کلکتے اور نواحی شہروں کو بہت فائدے پہنچے۔ بڑی بڑی آبادی والے علاقوں تک بحری راستے بنائے گئے۔ زراعت کو ترقی دی گئی۔ خام پیداوار [جالیہ بنگلہ دیش] کی پٹ سن تو کی

www.besturdubooks.wordpress.com

دروازوں پر تھی، اس لیے یہ شہر پٹ سن کی برآمد کا اہم مرکز بن گیا۔ اب کلکتہ بہت بڑا صنعتی اور تجارتی مرکز ہے۔ یہاں پٹ سن روئی اور دوسرے اہم خام مال کے بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی اور پاکستان عالم وجود میں آیا تو تقریباً ۸۰ فی صد پٹ سن کا رقبہ مشرقی پاکستان میں آگیا۔ انجینئرنگ اور دھات سازی کی صنعتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ہر قسم اور ہر سائز کے کارخانے کلکتے اور مضافات میں پائے جاتے ہیں۔ مشینوں کے پرزے بنانے والے کارخانے بھی قائم ہیں۔ شہر کی مالیات کا انحصار تجارت پر ہے۔ بھارت کی ۲۵ فی صد درآمد اور ۴۰ فی صد برآمد کلکتے ہی کی بندرگاہ سے ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے کلکتہ غیر ملکی زر مبادلے کا بڑا ذریعہ ہے۔

کلکتے میں تین بڑی یونیورسٹیاں ہیں۔ (۱) کلکتہ یونیورسٹی؛ (۲) جداد پور یونیورسٹی اور (۳) رابندر بھارتی یونیورسٹی۔ کلکتہ یونیورسٹی کے تحت ۵۰ کالج ہیں۔ یہ بھارت کا اہم ثقافتی مرکز بھی ہے۔ تین متذکرہ یونیورسٹیوں کے علاوہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، بنگیہ ساہتہ پریشاد، راما کرشنا مشن انسٹی ٹیوٹ آف کلچر، اکیڈیمی آف فائن آرٹس، برلا اکیڈیمی آف آرٹ اینڈ کلچر، مہا بودھی سوسائٹی، خانۂ فرہنگ ایران اور کلکتہ ہسٹاریکل سوسائٹی بھی وہ تنظیمیں ہیں جو تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔

کلکتہ ویسے تو برطانوی دور حکومت کی پیداوار ہے، لیکن مسلمانوں کی معاشرت کا بھی ایک اہم مرکز ہے۔ یکم مارچ ۱۹۵۱ء کو کلکتے کے شہر میں مسلمانوں کی آبادی ۳۰۵۹۳۲ تھی۔ کلکتے کے عین قریبی مضافات ہوڑہ اور گارڈن ریچ کو ملا کر یہاں کے مسلمانوں کی آبادی مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کے صدر مقام اور مسلمانوں کی سرگرمیوں کے تاریخی مرکز ڈھاکے کی آبادی کے قریب قریب برابر تھی۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری سے پہلے تقریباً ۳۱۰۰۰ مسلمان غیر یقینی صورت حال کے پیش نظر کلکتے کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہ شہر یعنی کلکتہ مسلم ثقافت کا ایک اہم مرکز ہے۔ "کلکتہ مدرسہ" کی بنیاد وارن ہیسٹنگز نے علوم اسلامیہ کے فروغ کے لیے ۱۷۸۱ء میں رکھی۔ اس کے پرنسپلوں میں H. Blochmann اور Sir E. Devisor Ross ایسے معروف علمائے اسلامیات بھی ہوئے۔ ایشیاٹک سوسائٹی میں جو ۱۷۸۴ء میں قائم ہوئی، ۶۰۰۰ سے زائد عربی اور فارسی کے خطی نسخے موجود ہیں اور اسے مسلم تاریخ اور ثقافت سے متعلق بڑی تعداد میں گرانمایہ کتابیں شائع کرنے کا فخر حاصل ہوا۔

نیشنل لائبریری کے بوھار مجموعے میں عربی اور فارسی مخطوطات کی معقول تعداد موجود ہے۔ ہندوستان کے ممتاز مؤرخ سر جادو ناتھ سرکار کے قیمتی مجموعے کا بھی اس میں اضافہ ہو گیا ہے۔ انڈین میوزیم اور وکٹوریہ میموریل میں ہندی مسلم تصویروں کے چند نایاب اور حسین نمونے نظر آتے ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی میں اسلامیات سے متعلق دو پوسٹ گریجویٹ شعبے قائم ہیں۔ (۱) عربی اور فارسی اور (۲) اسلامی تاریخ اور ثقافت۔ کلکتے ہی میں ٹیپو سلطان کے بیٹے اور اودھ کے آخر حکمران واجد علی شاہ (م ۱۸۸۷ء) رہتے تھے۔ مسلمانوں کی یادگار عمارتوں میں صرف ایک فن تعمیر کے اعتبار سے اہم ہے اور وہ ایک مسجد ہے جو دھرم تلہ سٹریٹ میں واقع ہے۔ اسے ٹیپو سلطان کے لڑکے شہزادہ غلام محمد نے ۱۸۴۲ء میں تعمیر کرایا تھا۔ سب سے پرانی

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

عمارتیں نیم تلہ کی مسجد (جو ۱۷۸۶ء کے کچھ عرصے بعد تعمیر ہوئی)، چت پور میں واقع بھرنسر شاہ کی مسجد اور مقبرہ (۱۸۰۴ء) اور ٹیتا جی سبھاش (کلائیو) سٹریٹ میں واقع جمّہ شاہ کا مقبرہ (۱۸۰۸ء) ہیں۔

مآخذ: (۱) غلام حسین سلیم: ریاض السلاطین، کلکتہ ۱۸۹۰-۱۸۹۸ء؛ (۲) C. R. Wilson: *Early Annals of the English in Bengal*، جلد ۳، کلکتہ ۱۸۹۶-۱۹۱۷ء؛ (۳) وہی مصنف: *Old Fort William in Bengal*، ۲ جلدیں، لنڈن ۱۹۰۶ء؛ (۴) *List of Ancient Monuments*، کلکتہ، بنگال سیکرٹریٹ پریس ۱۸۹۶ء؛ (۵) A. K. Ray: *A Short History of Calcutta*، کلکتہ ۱۹۰۲ء؛ (۶) H.E.A. Cotton: *Calcutta old and new*، کلکتہ ۱۹۰۷ء؛ [(۷) مکرجی: *The port of Calcutta: A short History*، ۱۹۶۸ء؛ (۸) P. Sinha: *Bengal, Past and Present*، *The City as a physical Entity*، ۱۹۷۰ء؛ (۹) انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا، ۱۹۷۳ء].

(SUKUMAR RAY [و ادارہ])

* **کِلِز:** شمالی شام کا ایک قصبہ، جو حلب اور عین تاب کے درمیان واقع ہے۔ بظاہر آشوری بھی اس سے واقف تھے، کیونکہ خطِ میخی کے ایک کتبے (Harper ۱۰۳۷، موزۂ برطانیہ، K ۱۳۰۷۳، Obv. ۳) میں ایک قصبہ ک۔ل۔ز کا ذکر ملتا ہے۔ رومیوں کے زمانے میں یہ قصبہ *Ciliza sive Urmagiganti* کے نام سے مشہور تھا (*Itin. Ant.*، طبع Pinder-Parthey، ص ۸۴)۔ ازمنۂ قدیم میں یقیناً یہ بالکل معمولی سا مقام ہوگا۔ یاقوت کلّز (وہ اسے یونہیں لکھتا ہے) کے بارے میں بتاتا ہے کہ یہ عزاز کے ناحیہ کا ایک گاؤں ہے۔ باقی عرب جغرافیہ نویسوں نے اس کا بالکل تذکرہ نہیں کیا۔ جدید شہر کی آبادی ۲۰ ہزار کے قریب ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد ۱۵ ہزار ہے (Cuinet ۱۸۹۱ء)، عرب اب تک اسے کلّز ہی کہتے ہیں اور ترک کلیس۔ M. Hartmann کے خیال میں قدیم کلز، موجودہ ترزمہ خان (موجود کلّز کے مغرب، جنوب مغرب میں، ایک گھنٹے کی مسافت پر) کے محل وقوع پر واقع تھا، جہاں اب بھی بڑے بڑے پتھر ملتے ہیں۔ دوسری طرف روایت یہ چلی آتی ہے کہ (کلز سے ۲۰ منٹ کی مسافت پر مشرق میں) الزی باغچسی نامی چھوٹا سا باغ اس قصبے کا یا اس کے کچھ حصے کا محل وقوع تھا کیونکہ فرض کیا جاتا ہے کہ کلز کا نام "الزی" کی صورت میں باقی رہ گیا ہے۔ یہاں، یعنی الزی میں کسی قدیم قصبے کا مقام ہونے کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔

مآخذ: (۱) یاقوت: معجم، طبع Wüstenfeld، ۴: ۱۵۸، ۲۲۹: (۲) صفی الدّین: مراصد الاطّلاع، طبع Juynboll، ۲: ۴۴۰، ۵۰۸؛ (۳) یحییٰ بن سعید الانطاکی، طبع Rosen، ص ۱۷، س ۱۴؛ (۴) *Zapiski Imp. Akad. Nauk*، ۱۸۸۳ء، ۴۴: ص ۱۶۶ و ۱۷۱ ببعد؛ (۵) Le Strange: *Palestine under the Moslems*، ۱۸۹۰ء، ص ۴۸۶؛ (۶) M. Hartmann: *Zeitschr. Gesellsch. f. Erdk. Berlin*، ۱۸۹۴ء، ۲۹: ۴۸۵؛ (۷) *M.V.A.G.*، ۱۸۹۶ء، ص ۱۰۶ (بار دوم، ص ۲۲)؛ (۸) Barthélémy: *Recueil de travaux rel. à la philol. èt a l'archéol. égypt. et assyr.*، ۱۸۹۷ء، ص ۳۳ (اس میں غلطی سے کلّز اور قدیم کیّر ہوس Kyrrhos کو ایک ہی شہر بتایا گیا ہے)؛ (۹) Cuinet: *La Turquie d' Asie*، ۲: ۱۸۵ ببعد؛ (۱۰) R. Hartmann: *Geogr. Nachrichten über Palästina u. Syrien in Halil az-Zāhirīs Zubdat-u-Kašf al-Mamālik*، (در خلیل الظاہری: زبدۃ کشف الممالک)، Diss. Tubingen (مقالہ Tubingen)، ۱۹۰۷ء، ص ۶۳،

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

حاشیہ ۱؛ (۱۱) Meissner، در Z. A.، ج ۲۷، ۱۹۱۲ء، ص ۲۶۶؛ (۱۲) Cumont : Études Syriennes، پیرس ۱۹۱۷ء، ص ۲۵۷ ببعد.

(HONIGMANN)

کَلِمَة : کَلْم (ک ل م) سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی اس تاثیر کے ہیں جس کے اثر کا ادراک دو حاسوں (سامعہ یا باصرہ) میں کسی ایک کے ذریعے سے کیا جا سکتا ہو، چنانچہ اس سے کلام [رک بآں] بھی مشتق ہے اور اسی سے کلم بمعنی جراحت (زخم) بھی آیا ہے۔ اوّل الذّکر کا ادراک، حاسۂ سمع اور مؤخر الذّکر کا، حاسۂ بصر سے ہوتا ہے۔ اس ایک مادّۂ لغوی میں ہر دو معانی کے جمع ہو جانے سے عرب شعرا نے استفادہ کیا ہے، مثلاً یہ ایک مصرع ملاحظہ ہو : ع : وَالْکَلْمُ الاَصِیْلُ کَارْعَبِ الْکَلْمِ [یعنی دل میں لگ جانے والی باتوں کی تاثیر وسیع تر زخموں کی طرح ہوتی ہے]۔ یہاں پہلا کلام الفاظ یا کلام کے معنی میں اور دوسرا، جراحات کے معنی میں استعمال ہوا ہے (راغب الاصفہانی : مفردات، بذیل مادّہ)۔ کلم اور اس کے مشتقات، احادیث و آثار میں بمعنی جراحت بھی استعمال ہوئے ہیں، ابن الأثیر نے اس ضمن میں یہ حدیث نقل کی ہے : إِنّا نَقُومُ عَلَی الْمَرْضٰی وَ نُداوِی الْکَلْمٰی؛ آخری لفظ (الْکَلْمٰی) کی توضیح یوں کی ہے : ھو جمع کَلِیم و ھُوَ الْجَرِیح، فَعِیل بمعنی مَفْعُول . . . . . (ابن الأثیر : النھایۃ فی غریب الحدیث و الاثر، بذیل مادّۂ کلم)، [یعنی ہم بیماروں کی دیکھ بھال کرتے اور زخمیوں کی مرحم پٹی کرتے ہیں].

لغت اور نحو کی اصطلاح میں کلمہ کا اطلاق بالعموم مفرد لفظ پر ہوتا ہے۔ بمقابلۂ کلام، اس کا اطلاق جملۂ مرکّبۂ مفیدہ پر ہوتا ہے (راغب : کتاب مذکور)۔ علمائے لغت کے ہاں، کلمہ کا اطلاق حروف تہجّی میں سے کسی ایک حرف پر بھی ہوتا ہے، نیز با معنی لفظ واحد (حروف تہجّی سے مرکب) پر بھی۔ اسی طرح پورے قصیدے اور خطبے کو بھی کلمہ کہہ دیتے ہیں۔ لسان میں ہے : والکلمۃ تقع علی الحرف الواحد من حروف الھجاء و تقع علی لفظۃ مؤلفۃ من جماعۃ حروف ذات معنی و تقع علی قصیدۃ بکمالھا و خطبۃ بأسرھا یقال "قال الشاعر فی کلمتہ" ای فی قصیدتہ قال الجوھری الکلمۃ القصیدۃ بطولھا (لسان العرب، بذیل مادّہ)۔ تاہم علم النّحو کی اصطلاح میں کلمہ اس لفظ کو کہتے ہیں جو معنی مفرد کے لیے وضع کیا گیا ہو، اور اس کا اطلاق، اسم، فعل اور حرف پر ہوتا ہے : الکلمۃ لفظ وُضِعَ لمعنی مفرد وھی اسم و فعل و حرف (ابن الحاجب : الکافیۃ، ص ۱).

عُرف شرعی میں کلمۂ طیّبہ سے کلمۂ توحید (و رسالت) مراد لیا جاتا ہے : وَ فی الشّرع الکلمۃ الطّیبۃ اعنی لا إلٰہ الّا اللّٰہ محمدٌ رسول اللّٰہ (عبدالنّبی احمد نگری : دستور العلماء، ۳ : ۱۲۹؛ نیز دیکھیے تھانوی : کشّاف اصطلاحات الفنون، ۵ : ۱۲۶۷، بذیل مادّۂ کلمہ، جہاں بتایا گیا ہے کہ خطبے اور قصیدے کے علاوہ کلمۂ شہادت پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے) اس کی تائید القرّاء کی تالیف معانی القرآن سے بھی ہوتی ہے جو دوسری صدی ہجری کے اواخر میں لکھی گئی۔ موصوف وَ جَعَلَ کَلِمَۃَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا السُّفْلٰی ط وَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا ط (۹ [التوبۃ] : ۴۰) کی تفسیر میں لکھتے ہیں : و کلمۃ الّذین کفروا الشرک باللّٰہ و کلمۃ اللّٰہ قولُ لَا إِلٰہَ اللّٰہ (الفرّاء : معانی القرآن، ۱ : ۴۳۸).

قرآن مجید کی آیات میں لفظ کلمۃ (نیز کلمات اور کَلِم) جن معانی اور مفاہیم کے لیے استعمال ہوا ہے اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے حوالۂ مذکور،

www.besturdubooks.wordpress.com

۱ : ۲۲۰ و ۴۳۸؛ ۳ : ۸ و ۳۱، ۶۶، ۶۸ (نیز فہرست مندرجات کی مدد سے جو ہر جلد کے آخر میں ملحق ہے)، الدامغانی، اصلاح الوجوہ و النظائر فی القرآن الکریم، بذیل مادّہ؛ راغب الاصفہانی : مفردات القرآن، بذیل مادّہ (ان مصادر میں وہ متعدد آیات قرآنی نقل کی گئی ہیں جن میں لفظ کلمہ یا اس کے مشتقات استعمال ہوے ہیں اور ان کے معانی کی طرف اشارے کر دیے گئے ہیں۔ ان مصادر کی رو سے لفظ کلمہ، مختلف آیات میں کلام (جملۂ مفیدہ یا طویل گفتگو)، قضیہ، حجّت، حکم شرعی، وعدۂ خداوندی (متعلق بہ انعام یا عقوبت)، آیت (معجزہ)، مشیت خداوندی، قرآن، دین (الاسلام)، قول لا الٰہ الّا اللہ، عجائبات قدرت (عجائب الصنع) اور حضرت عیسٰی علیہ السلام پر بولا گیا ہے۔

قرآن مجید میں حضرت عیسٰیؑ کو کلمۃُ اللہ کہا گیا ہے (۳ [آل عمرٰن] : ۳۹، ۴۵؛ ۴ [النساء] : ۱۷۱)۔ امام راغب نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ وہ براہ راست کلمۂ کُن سے پیدا کیے گئے : وتسمیۃُ عیسٰی بکلمۃ . . . لکونہ موجدًا بکن المذکور فی قولہ انّ مثل عیسٰی عند اللہ کمثل آدمؑ خلقہ من تراب ثمّ قال لہ کُنْ فیکونO (راغب : مفردات، مادّۂ کلمۃ)۔ راغب نے اس کی دیگر وجوہ بھی بیان کی ہیں اور لسان میں بھی حضرت عیسٰی کے "کلمۃ اللہ" کہلانے کی توجیہات درج ہوئی ہیں (لسان العرب، بذیل مادّہ)۔

احادیث نبویہ سے بھی کلمہ (یا کلمات) کے مختلف مفاہیم معلوم ہوتے ہیں؛ چنانچہ حدیث "اَعوذُ بکلمات اللہ التّامّات" میں ابن الأثیر نے کلماتُ اللہ التامات کا مفہوم، قرآن نقل کیا ہے اور حدیث نساء، یعنی "اسْتَحْلَلْتُمْ فروجَهُنَّ بکلمۃ اللہ" کی شرح میں دو قول نقل کیے ہیں : (۱) اس حدیث میں کلمۃ اللہ سے وہ حکم خداوندی مراد ہے جو آیت فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ (۲ [البقرۃ] : ۲۲۹) میں مذکور ہوا؛ (۲) قانون اباحت ازدواج، (ابن الأثیر : النہایۃ، بذیل مادّہ)۔ بخاری کی حدیث میں ورد کے طور پر پڑھے جانے والے دو جملوں کے لیے کَلِمَتَان کا لفظ آیا ہے (البخاری : الصحیح، دیکھیے آخری حدیث : کلمتان حبیبتان . . . . الحدیث)۔

علم المنطق کی اصطلاح میں کلمۃ وہ مفرد لفظ ہے جو اپنے صیغے اور وزن (کی شکل مخصوص) سے معنی اور زمانے پر دلالت کرتا ہو : و عند المنطقیین ھی اللّفظ المفرد الدّالّ علٰی معنی و زمان من الازمنۃ الثلاثہ بصیغتہ و وزنہ (تھانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، بذیل مادّہ کلمہ)، گویا علماے نحو کے نزدیک جسے "فعل" کہا جاتا ہے اہل منطق نے اسے کلمۃ کہا ہے اور پھر کلمے کی دو قسمیں بیان کی ہیں، حقیقیہ اور وجودیہ (تفصیل کے لیے تھانوی کی کشاف اصطلاحات الفنون کے علاوہ دیکھیے، عبدالنبی احمد نگری : دستور العلماء، ۳ : ۱۲۹، ۱۳۵)۔

اہل تصوّف کی اصطلاح میں لفظ کلمہ (کلمات) ایک الگ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے؛ ان کے ہاں ان "اعیان ثابتہ" کو کلمات کہا جاتا ہے جو تحت الایجاد علم الٰہی میں داخل ہوں۔ تھانوی نے اسے یوں بیان کیا ہے : و عند اھل التّصوف عَیْنٌ من الاعیان الثّابتۃ فی العلم الالٰہی الداخلۃ تحت الایجاد (تھانوی بذیل مادّۂ کلمہ)۔ عبدالکریم الجیلی نے اپنی کتاب الانسان الکامل میں کہا ہے : کلمات وہ حقائق مخلوقات عینیہ ہیں جن کا تعین عالم شہود میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ تھانوی نے الجیلی کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں : فی الانسان الکامل فی باب ام الکتاب " الکلمات عبارۃ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

عن حقائق المخلوقات العینیة اعنی المتعیّنة فی العالم الشهادی" انتہی ۔ (تھانوی بذیل مادّۂ کلمة) ۔ تھانوی ہی نے، صدر الدّین قونوی کی جو عبارت بحث کلمہ سے متعلق نقل کی ہے، وہ نسبۃً زیادہ مفصّل اور فکر انگیز ہے ۔ القونوی کے خیالات کا لُبّ لباب یہ ہے کہ احاطۂ علم الٰہی میں ہر شے کی معلومیت کی ایک صورۃ ہے، جسے مرتبۂ حرفیّت پر متصور کیا جاتا ہے اور جب معلومیتِ شی کو مرتبہ کتابت میں داخل کر دیا جاتا ہے، یعنی حق تعالٰی نور وجودی ذاتی کا پرتو اس پر ڈال دیتا ہے (یہ عمل ایک عقلی و معنوی حرکت پر مبنی ہے جو شان الٰہی کا مقتضا ہے) تب یہ صورۃ معلومیتِ شی جس کی تکوین ارادۂ الٰہی میں شامل ہو جاتی ہے، کلمۃ کہلاتی ہے ۔ القونوی نے حضرت عیسیٰؑ کو کلمہ قرار دینے اور جملہ موجودات کو لفظ کلمات کے ساتھ پکارنے کی توجیہ اپنے مذکورۂ بالا تصور کے ماتحت کی ہے ۔ اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ (۳۵[فاطر] : ۱۰) کی تاویل، القونوی نے ارواح طاہرہ سے کی ہے، (کلمۃ بحیثیت اصطلاح صوفیہ کی مزید توضیح کے لیے دیکھیے تھانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، بذیل کلمۃ و کلام) ۔ نصاریٰ کی اصطلاح میں "کلمۃ" صفت علم کا نام ہے جو اقانیم ثلٰثہ (یعنی صفات باری : علم، وجود، حیوٰۃ ۔ وجود "اب" (باپ) ہے، حیوٰۃ "روح القدس" ہے اور علم "کلمۃ" ہے) میں سے ایک ہے (کتاب مذکور، بذیل مادّۂ اقنوم (ق ن م) اور بذیل مادۂ کلمۃ) ۔

مآخذ : (۱) قرآن مجید : (۲) محمّد بن اسمٰعیل البخاری : الجامع الصحیح، قاہرہ ۱۳۱۵ھ؛ (۳) الفرّاء : معانی القرآن، قاہرہ ۱۹۵۵ء، ج ۱ : ۳؛ (۴) ابن الأثیر : النهایة فی غریب الحدیث و الاثر، قاہرہ ۱۳۲۲ھ، ج ۴؛ (۵) راغب الاصفہانی : مفردات القرآن؛ (۶) ابن منظور : لسان العرب، قاہرہ ۱۳۰۳ھ؛ (۷) ابن حاجب : الکافیة (فی النحو)، دہلی، ۱۹۲۹ء؛ (۸) الدامغانی : اصلاح الوجوہ و النظائر فی القرآن الکریم، بیروت ۱۹۷۰ء؛ (۹) تھانوی : کشاف اصطلاحات الفنون، کلکتہ ۱۸۶۲ء؛ (۱۰) عبدالنبی احمد نکری : دستور العلماء، حیدرآباد دکن ۔

(عبدالنبی کوکب)

کِلْوَہ : یہ نام ساحل مشرقی افریقہ کے متعدد * مقامات اور جزائر کے ساتھ مربوط ہے، لیکن آج کل اس سے بالعموم علاقۂ ٹانگانیکا کا ایک ضلع مراد ہوتا ہے اور بالخصوص دو بندرگاہوں کا نام ہے :

(الف) کِلوہ کونجہ، جو دارالسّلام (۲۰ درجے ۴۵ دقیقے) سے ۱۳۳ میل جنوب کی جانب کِلوہ کے شمال میں براعظم پر واقع ہے ۔ یہ ایک بندرگاہ ہے جس میں خوش منظر باغات اور یورپین لوگوں کے بہت سے مکانات ہیں ۔ یہ جھیل نیاسا کی طرف جانے والی کاروانی شاہ راہ کا مقام آغاز ہے ۔ اس کی آبادی تقریباً پانچ ہزار ہے اور ان میں اکثر سواحلی ہیں ۔

اور (ب) کلوہ کسونی جو دارالسّلام سے ۱۵۰ میل جنوب مغرب کی طرف (۸ درجے ۵۸ دقیقے) اور زنجبار [رک بآں] سے تقریباً ۲۰۰ میل جانب جنوب واقع ہے ۔ تاریخی لحاظ سے کِلْوَہ کسونی زیادہ اہم ہے ۔ یہ ایک چھوٹے سے جزیرے پر واقع ہے اور اس کے قرب میں دیواروں، محلات کی عمارتوں، قلعوں اور مساجد کے کثیر التعداد آثار موجود ہیں جو عربی دور کی اور اس کے بعد پرتگیزی قبضے کی یاد تازہ کرتے ہیں ۔ ابن بطّوطہ جو اس قصبے میں گیا تھا، اسے "کُلوا" لکھتا ہے ۔ اس کا محل وقوع اس قدیمی شہر کے نزدیک تھا جسے مستند جغرافیہ دان (دیکھیے *R.E.* : Pauly-wissowa، بذیل مادّہ Pxioi) راپٹہ Rhapta کا نام دیتے ہیں ۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جزیرہ کِلْوَہ کے اوّلین

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

مسلم آبادکار حضرت زیدؓ کے متبعین تھے جو "ائمۃ زیدیہ، مشہور ہیں (Emozaidij، در De Barros)۔ یہ تقریباً ۱۲۲ھ/۷۳۹ء میں تھے۔ ان کے اخلاف کو ۳۶۵ھ/۹۷۵ء میں ایک شیرازی خاندان کے بانیوں نے یہاں سے بے دخل کیا۔ یہ خاندان پرتگیزوں کی ۱۵۰۰ء میں آمد تک یہاں حکمران رہا (اس کے حکمرانوں کی تعداد ۹۴ ہے)۔ ان کا حلقہ اقتدار و حکومت اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں شمال میں زنجبار تک اور جنوب کی جانب سوخالہ کی کانوں تک جس میں جزائر پمبہ و مافیہ (جسے Mofia de Barros کہتا ہے) شامل ہیں، پھیلا ہوا تھا۔ اس طرح کِلْوَہ ایک معنے میں "سلطنت زنج [زک بار] کے دارالحکومت کی حیثیت رکھتا تھا۔ براعظم سے اس جزیرے کو ایک پایاب رودبار جدا کرتی ہے۔ کلوہ کی قدیم رونق و عظمت کا انداز اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جب پرتگیز یہاں آئے ہیں تو یہاں پر تین سو مساجد موجود تھیں۔ ۱۵۰۵ء میں جب ابراہیم سلطان کلوہ (Mir Hahraemo De Barros) نے خراج دینے سے انکار کیا تو (Don Framisco d Almeyda) نے کلوہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد جو کشمکش عربوں اور یورپی حملہ آوروں میں ہوئی اس کی وجہ سے یہ قصبہ تباہ ہوگیا۔ اور ۱۵۱۲ء میں عارضی طور پر بالکل خالی کر دیا گیا۔ سترھویں صدی میں یہ سلاطین مسقط کے قبضے میں آیا اور ۱۸۴۶ء میں اس پر سلطان زنجبار نے قبضہ جما لیا، ۱۸۹۰ء میں یہ جرمنوں کے ہاتھ لگ گیا، لیکن جنگ عظیم کے بعد سے اسے علاقۂ ٹانگانیکا میں شامل کر دیا گیا ہے۔

مآخذ: (۱) J. de Barros: *Asia*، حصۂ اوّل، ۸ : ۴ بعد؛ (۲) شیخ محی الدّین زنجباری کی مرتبہ (*Arabic History of Kilwa*) عربی تاریخ کلوہ، (مخطوطات موزہ برطانیہ، عدد Or ۲۶۶۶) اور مرتبہ، در *JRAS* ۱۸۹۵ء، ص ۳۸۵ تا ۴۰۳ مع ایک خلاصہ اور حواشی از قلم S. Arthur-Strong؛ ان دو مآخذ کے موازنے کے لیے اور مسکوکات کے متعلق مواد؛ (۳) کے لیے دیکھیے J. Walker: *The Coinage of Kilwa Numismahi*، *Chronicle*، ۱۹۳۶ء، ص ۴۳ تا ۸۱؛ (۴) Sir Richard Burton: *Zanzibar*، ۲ : ۴۳۹ بعد؛ (۵) Guillain: *Documents sur L'histoire la geographie et If commerce de I' Afrique Orientale*، پیرس ۱۸۵۶ء، ۱ : ۱۷۷ بعد؛ (۶) O. Kerston: *Tabellarische Uebersicht der Geschichte Ostafrikas*، لائپزگ ۱۸۷۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۷) J. Strandes: *Die Portugiesenzeit von Deutsch- und Englisch-Ostafrika*، برلن ۱۸۹۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۸) C. P. Righy: *Report on the Zanzibar Dominions*، بمبئی ۱۸۶۱ء؛ (۹) A. M. H. J. Stokvis: *Manuel d' Histoire de Généalogie*، لائیڈن ۱۸۸۸ء، ۱ : ۵۵۸؛ (۱۰) Zambaur: *Manuel*، ہانوور ۱۹۲۷ء، ص ۳۰۹؛ (۱۱) Rieu: *Cat. Arabic MSS. Suppl.*، ص ۳۹۱ تا ۳۹۲؛ (۱۲) *Geographical Journal*، ۱۹۱۷ء، ص ۱۱۸؛ (۱۳) ابن بطوطہ (ترجمہ Defrémery و Sanguinetti)، ۲ : ۱۹۱ بعد؛ (۱۴) یاقوت: معجم، بذیل مادہ؛ (۱۵) G. Ferrand، در *J. A.* ۱۹۲۰ء، ص ۲۲ و ۶۹ بعد، ۲۳۳؛ (۱۶) وہی مصنف: *Textes relatifs à l' extrême orient*، ص ۳۳۶ تا ۳۳۸ و ۵۳۶؛ (۱۷) W.F.W. Owen: *Narrative of Voyages*، لندن ۱۸۳۳ء، ۲ : ۲ بعد؛ (۱۸) Carlo Conte Rossini، در *Atti del Terzo Congresso Geogr. Italiano*، فلارنس ۱۸۹۹ء، ۲ : ۴۹۱ تا ۵۰۰؛ (۱۹) C. H. Becker: *Materialien zur Kenntnis des Islam in Deutsch Ostafrika*، در *Der Islam*، ۲ : ۹؛ (۲۰) Hobson Jobson: *Sub Quilra*؛ (۲۱) Admiralty: *Handbook of*

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

German East Africa، ص ۱۸۵؛ (۲۲) F.B. Pearce :
Zanzibar، ۱۹۲۰ء، ص ۴۱ تا ۴۳ و ۶۳ تا ۶۴.

(J. WALKER [تلخیص از ادارہ [ا]، اردو])

* کَلَہ : (نیز کَلاہ، کَلا، کِلا اور کِلّہ) ازمنۂ وسطیٰ کے عرب جغرافیہ نویسوں کے نزدیک یہ ایک جزیرے یا جزیرہ نما کا نام تھا جو عرب، ہندوستان اور چین کے درمیان تجارت اور جہازرانی کے لیے ایک بہت اہم رابطے کا کام دیتا تھا۔ یہ اپنی ٹین کی کانوں کی وجہ سے خاص طور پر مشہور تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے کافور، بانس، ایلوا، ہاتھی دانت وغیرہ کی تجارت کا مرکز بھی بتایا گیا ہے۔ اس کا دارالحکومت بھی اسی کی طرح کلہ کے نام سے مشہور تھا، دیکھیے بطور مثال الدمشقی، ص ۱۵۲، س ۱۱؛ ۱۷۰، س ۱۰؛ النُّوَیْری (در A.V. d. Lith)، کتاب مذکور (ذیل میں مآخذ دیکھیے)، ص ۲۸۱۔ سمندر کا جو حصہ اس علاقے کے ساحل سے ٹکراتا ہے جس میں جہازرانی بہت مشکل بتائی گئی ہے، اسے بھی اسی کے نام پر "بحیرۂ کلہ" کہتے ہیں (دیکھیے المسعودی، ۱ : ۳۷۰، س ۱۰، ۳۴۰ س ۱؛ الدمشقی ص ۱۵۲، س ۱۱، ۱۶۹، س ۲۰)۔ ہندوستان اور عرب کی تجارت کی تاریخ کے لیے اس علاقے کے صحیح محل وقوع کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ تاجر سلیمان (اس کا روزنامچہ ۲۳۷ھ/۸۵۱ء میں مرتب ہوا تھا) اور یاقوت کے بیانات کی رو سے اس کا محل وقوع ہند اقصیٰ ہی میں ہونا ممکن ہے۔ ہند اقصیٰ کے جزیرے اور جزیرہ نما صدیوں تک ٹین پیدا کرنے والے علاقوں کی حیثیت سے خاص طور پر مشہور رہے ہیں، (دیکھیے دریں مادہ Ritter : Erdkunde، ۵ : ۲۳، ۲۴، ۲۸، ۳۰، ۷ تا ۸۰، ۴۳۸ و ۴۳۹)۔ چونکہ کلہ کے بارے میں صاف طور پر بیان کیا گیا ہے (مثلاً ابو زید السیرافی، ذیل میں مآخذ دیکھیے) یہ کم از کم کچھ عرصے کے لیے زابج (= جاوا، [رک بہ] A. van der Lith، کتاب مذکور، ص ۲۳۱ ببعد اور مادۂ جاوا، ۲ : ۵۷۴ ببعد) کے بادشاہ کے زیر حکومت تھا، اس لیے اس کا محل وقوع معلوم کرنے کے واسطے سب سے پہلے لازمی ہے کہ ہند اقصیٰ کے جنوب مغربی حصے میں آبنائے ملاکا (Malacca) کے علاقے پر نظر ڈالیں۔ سماٹرا کا ذکر تو خارج از بحث ہے، اس لیے کہ یہاں ٹین نکلتا بھی ہے تو مقدار میں بہت کم اور گھٹیا قسم کا۔ جزیرۂ بنگکا (Bangka) بھی جو سماٹرا کے جنوب مشرق ساحل پر ہے اور کثیر مقدار میں ٹین نکلنے کی وجہ سے آج کل مشہور ہے قابل اعتنا نہیں ہے، کیونکہ اس کی کانیں ۱۷۱۰ء ہی میں دریافت ہوئی ہیں اور اس سے قبل ان کو ٹین نکالنے کی غرض سے کبھی کھودا نہیں گیا (دیکھیے A.v.d. Lith، ص ۲۶۳)۔ اب ہمارے پاس صرف جزیرہ نمائے ملاکا رہ جاتا ہے اور ہمیں Walckenaer (در *Nouvelles Annales des Voyages*) پیرس ۱۸۵۲، ص ۱۰۱) کی رائے ماننی پڑتی ہے کہ موجودہ شہر قدہ Queda (Quedah، کدہ Kedah، کِدّہ Keddah) جو اس جزیرہ نما کے مغربی ساحل پر چھے درجے شمالی عرض بلد پر واقع ہے، وہی مقام ہے جسے عربوں نے کَلَہ لکھا ہے۔ صوبہ قدہ (Quedah) (دیکھیے دریں بارہ Ritter : *Erdkunde*، ۵ : ۲۰ ببعد)، جس کو دریائے کلنگ (Kalang) سیراب کرتا ہے اور علامات سے معلوم ہوتا ہے کہ "جزیرہ نمائے" کلہ کی جائے وقوع کم و بیش یہی ہے اور آج کل بھی ٹین کی تجارت کی گہما گہمی کے باعث ملاکا بھر میں ممتاز ہے۔ مرکزی شہر کا اصل نام کدہ (موجودہ تلفظ کدہ Kedáh) ہے۔ Quedah کی یہی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ پرتگالی میں بگڑ کر اس کی یہ

www.besturdubooks.wordpress.com

صورت ہو گئی ہے۔ سیدی علی (۱ : ۲۸۷) کی ترکی کتاب محیط میں جو تقریباً ۱۵۵۴ء میں لکھی گئی، لفظ کیدا ملتا ہے؛ دیکھیے Bittner و Tomaschek : *Die Topogr. Kapitel des indischen Seespiegels Mohit*، (وی انا ۱۸۹۷ء)، ص ۸۶، نیز یہاں وہ نقشے بھی دیکھیے جو Tomaschek نے محیط کے بیانات اور پرتگالی مآخذ کی رو سے دوبارہ تیار کیے ہیں (لوحہ ۲۳ و ۲۴)۔ آج کل قدہ (کدہ) ایک گمنام سی جگہ ہے، لیکن گزشتہ زمانے میں یہ ایک بارونق خوب معمور بندرگاہ تھی جسے دیکھنے کے لیے لوگ بہ کثرت آتے رہتے تھے، دربار دیکھیے Ritter : کتاب مذکور، ص ۲۵ اور A.v.d. Lith، ص ۲۶۱۔

کلہ سے متعلق Walckenaer کی پیش کردہ تشخیص و تطبیق سے A.v.d. Lith، ص ۲۵۹، ۳۰۸؛ de Goeje (در *De Gids*، ایمسٹرڈم ۱۸۸۹ء، ۳ : ۲۹۷)، Tomaschek، کتاب مذکور، اور G. Le Strange نے حمد اللہ المستوفی کی نزھۃ القلوب (ترجمہ، ص ۱۹۴) میں اتفاق کیا ہے۔ Quatremère (کتاب مذکور، ص ۳۴۷) اور Yule - Burnell (کتاب مذکور، ص ۱۴۵) اسے قرین حقیقت سمجھتے ہیں، لیکن دونوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کلہ وہی مقام ہو جسے بطلمیوس (Ptolemy) نے Κῶλα لکھا ہے، لیکن نشاندہی کے لحاظ سے اس شہر کی جو جائے وقوع ہونا چاہیے (دیکھیے مادہ Koli، در Pauly - Wissowa : *Realenzykl. d. klass. Altertumswiss*، ۱۱ : ۱۰۷۵) اس سے اس نظریے کی تردید ہوتی ہے۔

یہ مساوات، یعنی کدہ = کلہ بالکل یقینی ہو جاتی ہے جب ہم اس حقیقت کو زیر نظر رکھیں جس پر Kern نے A.v.d. Lith، ص ۳۰۸ میں زور دیا ہے کہ ملائی زبان کا د بہت کچھ ل کی طرح بولا جاتا ہے، اس لیے ملایا والے جب کدہ بولیں گے تو عرب کے کانوں کو وہ کلہ سنائی دے گا، لیکن دوسری طرف یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حال ہی میں G. Ferrand (دیکھیے مآخذ) نے ایسے صوتی تغیّر کے وقوع سے اختلاف کیا ہے جس کی رو سے کدہ کا لفظ کلہ ہو جائے گو بظاہر اس کے مان لینے کو کیسا ہی جی چاہتا ہو۔ اس کی تحقیق کی رو سے کلہ کی اصلیت کبھی کدہ نہیں ہو سکتی بلکہ یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ کلہ اصل میں کیرہ (Kerah)، کرہ Kra (نقشوں میں) ہو جو ملاکا کے جنوب مشرقی حصے میں (۱۰° عرض بلد شمالی کے قریب) واقع ہے [تفصیل کے لیے دیکھیے آ، لائیڈن بار اول]۔

مآخذ : (۱) سلیمان تاجر کا سفر نامہ، در Reinaud : *Relation des Voyages faits par les Arabes et les persans dans l' Inde . . . dans le IX^e siècle*، (پیرس ۱۸۴۵ء)؛ ۲: متن، ص ۱۸، س ۱۲ ببعد، ۲۲؛ س ۱؛ دیکھیے *Voyage du marchand arabe Sulay-man en Inde et Chine*، مترجمہ G. Ferrand (پیرس ۱۹۲۲ء)، ص ۱۲، ۱۸، ۱۹، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۹۵، ببعد؛ (۳) ابو زید السیرافی، در Reinaud : کتاب مذکور، ۲ : متن، ص ۹۰، ببعد؛ (۴) سند باد جہاز ران کے سفر، طبع Langlés، در Savary : *Gramm. de la Langue Arabe*، پیرس ۱۸۱۳، ص ۹۹۴، (علٰحدہ ایڈیشن، پیرس ۱۸۱۴ء، ص ۶۳)؛ (۵) مُسْعِر بن مہلہل (دیکھیے K. v. Schlözer : *Abu Dolef Misaris b. Mohalhal de itinere Asiatico Comment.*، برلن ۱۸۴۵ء، ص ۱۸ ببعد)؛ (۶) بزرگ بن شہریار : کتاب عجائب الہند (*Livre des Merveilles de l' Inde*)، طبع A. v. d. Lith و L,M. Devic، لائیڈن ۱۸۸۳-۱۸۸۶ء، ص ۲۲۲ (Register)؛ (۷) المسعودی : مُرُوج الذَّہَب (مطبوعہ پیرس)، ۱ :

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۳۰۸، س ۹؛ ۳۳۰، س ۱۰؛ ۳۴۰، س ۱؛ (۸) الادریسی : نزھۃ المشتاق (Geographie، ترجمہ از Jaubert) پیرس ۱۸۳۶ء، ۱ : ۷۷، ۷۹ ببعد؛ (۹) یاقوت : معجم (طبع Wüstenfeld)، ۲ : ۴۵۴، س ۱۰ : ۳ : ۴۵۲، س ۲۳ : ۴ : ۱۰۳، س ۱۹، ۱۶۲، س ۶، ۲۹۷، س ۲۳؛ (۱۰) الدمشقی : نخبۃ الدھر (طبع Mehren)، ص ۱۵۲، س ۱۱، ۱۵۵، س ۱۸ ببعد، ۱۷۰، س ۱؛ (۱۱) القزوینی : آثار البلاد (طبع Wüstenfeld)، ۲ : ۳۸، س ۲۵ = Gildemeister : Script. Arab. de Rebus Indicis loci etc.، (بون ۱۸۳۸ء)، ص ۵۷ ببعد، عربی متن؛ (۱۲) ابو الفداء : تقویم البلدان (طبع Reinaud و De Slane)، ص ۳۷۵؛ (۱۳) الباکوی : تلخیص الآثار، مترجمہ de Guignes : Notices et Extraits des Manuscr.، ۲ : ۵۰۳؛ (۱۴) ابن الوردی : خریدۃ العجائب (قاہرہ ۱۳۲۴ھ)، ص ۸۶، س ۱۹؛ (۱۵) ابن ایاس : نشق الازھار، در Arnold : Chrestom. Arab.، ہل ۱۸۵۳ء)، ص ۷۲، س ۱۰؛ (۱۶) Vullers : Lex. Pers. Lat.، ۲ : ۸۷۳ (کلہ)، ۸۷۴ (کلہ)؛ (۱۷) حمد اللہ المستوفی : نزھۃ القلوب (طبع G. le Strange، سلسلۂ یادگار گب، عدد ۲۳/۲)، ص ۲۰۳، س ۶، ۲۳۱، س ۲۱؛ (۱۸) Relations de voyages et Textes Geographiques arabes, persans et turcs relatifs à l'Exterme-Orient du viii^e au xviii^e siecles ترجمۂ G. Ferrand (پیرس ۱۹۱۳-۱۹۱۴ء)، بمدداشاریہ، بذیل کلہ؛ (۱۹) گرشاسپ نامہ میں جو ۱۰۶۶ء میں ختم ہوا اور اسدی سے منسوب کیا جاتا ہے، کلہ کا ذکر ایک بحری مہم کے بیان کے سلسلے میں آیا ہے؛ دیکھیے عبارت، در Ouseley : Travels in various countries of the East، لنڈن ۱۸۱۹ء ص ۵۲، حاشیہ؛ (۲۰) الجوالیقی : المعرب، طبع Sachau، ص ۱۲۵، س ۶ اور دریں بارہ Sachau کا حاشیہ، ص ۵۶ ببعد؛ (۲۱) Reinaud : Relation des Voyages، وغیرہ (دیکھیے سطور بالا)، ۱ : ۶۱ ببعد و در Geogr. d' Aboulfeda (تقویم البلدان از ابو الفداء کا ترجمہ)، ۱ : ص CDXIV و CDXVIII ببعد؛ (۲۲) Quatremere، در Journal des savants (پیرس ۱۸۴۶ء)، ص ۷۲۹ تا ۷۳۱؛ (۲۳) Dulaurier، در Journ. Asiat.، سلسلۂ ہشتم، ۸ : ۲۰۹؛ (۲۴) Yule و Burnell : Hobson-Johson, A Glossary of Colloquial Anglo-Indian Words.، بار دوم، لنڈن ۱۹۰۳ء، ص ۱۴۵ ببعد؛ (۲۵) کلہ کے مسئلے پر ایک جامع تبصرہ A. v. d. Lith. نے (کتاب) عجائب الہند کے اپنے ایڈیشن کے ص ۲۵۶ تا ۲۶۴ (ص ۲۴۸ : ابن سعید اور النُّویری کے اقتباسات) پر اپنے حواشی میں کیا ہے، ص ۲۷۹ (اقتباس از مُختَصَر العجائب)، در G. Ferrand (۲۶)، Journ. Asiat.، سلسلۂ بازدہم، ۱۲ (۱۹۱۸ء) : ۸۹، ۱۰۹؛ ۱۳ (۱۹۱۹ء) : ۳۱۲، ۳۳۸، حاشیہ ۲، ۳۳۹ ببعد اور ۱۴ (۱۹۱۹ء) ۲۱۴ تا ۲۳۳، نیز جلد ۱۹۲۳ء، ص ۳۱.

(M. Streck [و تلخیص از ادارہ])

الکلی : رک بہ القِلی .

کُلَیب بن رَبیعہ : عہد جاہلیت میں شیوخ بنو تغلب میں سے ایک، جو اپنے برادر نسبتی جساس بن مرۃ الشیبانی کے ہاتھوں قتل ہوگیا اور جس سے قدیم نسل قبائل تغلب ابو بکر [رک باں] کے درمیان وہ طویل اور خونریز جنگ شروع ہوگئی جو حرب بسوس [رک باں] کے نام سے مشہور ہے۔ کلیب کا نسب نامہ یہ ہے، کلیب بن ربیعہ بن الحارث بن مرۃ بن زہیر بن جشم (Wüstenfeld : Geneal Tabellen، باب ۲۲)۔ کہا جاتا ہے کہ کلیب کا اصل نام وائل تھا جو کلیب (چھوٹا کتا) اس لیے ہوگیا کہ وہ ہمیشہ ایک چھوٹا سا کتا اپنے ساتھ رکھتا تھا اور اسے ہر ایسی جگہ پر مار مار کر بھونکنے پر مجبور کرتا تھا جسے وہ اپنی ذاتی ملکیت کے طور پر مخصوص رکھنا چاہتا تھا؛ چنانچہ جس کسی کے کان میں بھونکنے کی

www.besturdubooks.wordpress.com

آواز جاتی وہ اسے استعمال کرنے سے پرہیز کرتا ۔ یہ کہانی جس کا مطلب اگرچہ ہمیں معلوم نہیں ہو سکتا بدیہی طور پر بعد کی اختراع ہے ۔ کلیب ایک ایسا نام ہے جو عربوں کے یہاں اکثر ملتا ہے اور اس لیے ہم کہ سکتے ہیں کہ عرف کے طور پر استعمال نہیں ہوتا تھا ۔

کلیب کے اندر وہ سب باتیں موجود تھیں جو کسی مستبد حکمران میں ہو سکتی ہیں اور جن سے بادیہ نشین عربوں کی آزاد اور نکتہ چیں طبیعت ہمیشہ متنفر رہی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اسے جب یمن کے باہم حلیف قبائل پر خزازہ کے مقام پر زبردست فتح حاصل ہوئی تو اس نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا (اس لقب کے استعمال کے لیے دیکھیے Lammens : *Le Berceau de l' Islam*، روم ۱۹۱۴ء، ص ۲۱۰) ۔ وہ صرف بنو تَغْلب ہی نہیں بلکہ بنو بَکْر کے اہم ترین قبیلے بنو شَیْبان پر بھی حکومت کرتا تھا ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے کچھ عرصے کے بعد اپنی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا اور رعایا کے شکار کھیلنے اور چراگاہوں میں مویشی چرانے کے حقوق غصب کر لیے ۔ بدوؤں کو "مستبد حکمرانوں" سے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ وہ "چراگاہ" (حِمٰی) سے متعلق ان کے حقوق غصب کر لیتے ہیں ۔ دراصل کلیب قتل ہوا تو اس لیے کہ ایک تمیمی خاتون البَسُوس کی اونٹنی سُراب، یا اگر اس کی نہیں تھی، تو اس کے موالی بنو جرم کی اونٹنی کلیب کی ذاتی زمین میں جا نکلی ۔ کلیب نے اسے مار ڈالا (یا اسے نہیں تو اس کے بچے کو مار ڈالا اور اسے بھی زخمی کر دیا) ۔ جَسّاس کے ہاتھوں، جس کی ماں البسوس کی بہن تھی، اس کے قتل کا باعث یہ متشددانہ فعل ہوا ۔

اس قصے کی تفصیلات تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ قدیم مآخذ میں بھی ملتی ہیں، جن میں سے بیشتر ابو عُبَیْدہ کی تصنیف میں موجود ہیں جو ایام العرب (۱ : ۲۳) کے بارے میں جیسا کہ سب کو معلوم ہے، تقریباً جملہ معلومات کا سرچشمہ ہے ۔ کچھ باتیں ابن الکلبی سے لی گئی ہیں بالخصوص وہ جن کا تعلق کتاب الاغانی سے ہے ۔ علاوہ ازیں المُفَضَّل الضَّبّی کا بیان بھی محفوظ ہے کہ ہم ابھی تک تحقیق کے ساتھ نہیں کہ سکتے کہ کلیب کی زندگی (بلکہ عام طور پر بنو تغلب اور بنو بکر کے خلاف معرکہ آرائی) کے بارے میں ہمیں جو روایات بکثرت ملتی ہیں اور جن میں بعض افسانہ ہیں، کہاں تک ٹھیک ہیں ۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حل جب ہی ممکن ہے جب اس سوال کا جواب مل جائے کہ زمانۂ قبل از اسلام کی روایات کی تاریخی قدر و قیمت کیا ہے ۔ اگر ہم صرف اس واقعے پر نظر رکھیں، جو کلیب کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی بات غیر اغلب نہیں ۔ یہ حکایت اس کوشش کی یاد دلاتی ہے جو بنو تغلب اور بنو بکر کی ایک ایسی تنظیم قائم کرنے کے لیے کی گئی جو بدوی قبائل کی تنظیم سے برتر ہو، یعنی کچھ ویسی ہی کوشش جس کی بدولت بنو کِنْدَہ کے سر پر تاج شاہی رکھا گیا اور جس کا خیال حِیْرہ میں بنو لَخْم کی بادشاہت کو دیکھ کر جو بنو تغلب اور بنو بکر کے گھروں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھی، پیدا ہوا ۔ کلیب کے استبداد اور اس کی موت اور مظالم کی روایت کا تعلق بھی کسی بڑے قدیم زمانے سے ہے ۔ اس کی تصدیق عباس بن مِرْداس اور النّابِغَة الجَعْدِی (دونوں آغاز اسلام میں ایک دوسرے کے معاصر تھے) کے ان اشعار سے ہوتی ہے جن کا حوالہ ہمارے مآخذ میں موجود ہے ؛ چنانچہ النابغۃ کے اشعار میں اونٹنی کی ہلاکت کا قصہ بالخصوص تفصیل سے بیان کیا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

گیا ہے ۔ کلیب کے اقتدار کا ذکر تو تغلبی شاعر عمرو بن کلثوم (۵ : ۶۵) کے "مُعَلَّقہ" میں بھی آیا ہے ۔

کلیب کا جو انجام ہوا، اس کی خود اس کے زمانے کی دستاویزی شہادت ان مرثیوں میں ملے گی جو اس کی موت پر لکھے گئے اور جن میں اس کی طرف متعدد اشارات موجود ہیں ۔ یہ مرثیے اس کے بھائی مُہَلْہِل سے منسوب ہیں (جس کا شمار عرب کے قدیم ترین شعرا میں ہوتا ہے، دیکھیے ابن قتیبہ : کتاب الشعر و الشعراء، طبع De Goeje، ص ۱۶۴ تا ۱۶۶ ؛ محمّد بن سلام : طبقات الشعراء، طبع Hell، ص ۱۳ س ۱۱ تا ۱۶ وغیرہ، لیکن جن کی صحت بہت زیادہ مشکوک ہے) ۔

کُلیب کے قتل کی کہانی بنو ہلال کی رومانی نظموں کے مجموعے میں، جیسا ان کا جی چاہا، مرتب کر دی گئی ہے (دیکھیے Mittwoch : *Proelia Arabum Paranorum*، برلن ۱۸۹۹ء، ص ۱۱) ۔

مآخذ : مادّۃ البسوس کے مآخذ کے علاوہ دیکھیے (۱) ابن الاثیر : الکامل، طبع Torenberg، ۱ : ۳۸۴ تا ۳۹۷ ؛ (۲) ابن عبدربہ : العقد، ۱۲۹۳ھ، ۳ : ۹۳ تا ۹۵ ؛ (۳) نقائض، طبع Bevan، ص ۹۰۵ تا ۹۰۷ ؛ (۴) المفضّل بن سَلَمہ : فاخر، طبع Storey، ص ۷۶ تا ۷۸ ؛ (۵) المُفَضَّل الضَّبّی : اَمثال، استانبول ۱۳۰۰ھ، ص ۵۵ تا ۵۶ ؛ (۶) المیدانی : مجمع الامثال، طبع ۱۳۱۰ھ، ۱ : ۲۵۴، ۲۵۵ ؛ (۷) خزانۃ الادب، ۱ : ۳۰۱ تا ۳۰۴ ؛ (۸) یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۱ : ۱۵۰، ۱۵۱ ۔

(G. Levi Della Vida)

* **کِلیدُ البحر** : درِ دانیال کے سب سے تنگ حصے میں ایک قلعہ اور چھوٹا سا قصبہ ہے ۔ [رک بہ مادّۃ قلعۂ سلطانیّہ جس میں اس قلعے کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے جو ایشیائی جانب کلید البحر کے بالمقابل واقع ہے] ۔ یہاں صرف ضروری معلومات مجملاً پیش کی جاتی ہیں ۔ قلعۂ کلید البحر کو گیلی پولی کے سنجق بے، یعقوب بے نے محمّد ثانی کے حکم سے ۱۴۶۳ء میں ایشیائی دفاعی استحکامات کے سلسلے میں تعمیر اور مسلح کیا تھا (*Kritobulos*، طبع C Müller کتاب ۴، باب ۱۴ ؛ کتاب ۱۵، باب ۳۳، نیز دیکھیے : *Chalkokondyles*، طبع I. Bekker، ص ۵۲۰، و *G O R* : J.v. Hammer، ۲ : ۷۳) سلیمان اعظم نے ۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء میں اس کی فصیل کی از سر نو مرمت کرائی جو اس عرصے میں ٹوٹ پھوٹ گئی تھی ۔ ان استحکامات کی ۱۰۶۹ء - ۱۰۷۰ء میں قلعۂ سلطانیہ کے ساتھ از سر نو بالکل جدید طریق پر تعمیر و توسیع کی گئی ۔ کلید البحر کی مزید تاریخ عملی طور پر وہی ہے جو قلعۂ سلطانیہ [رک بآں] کے ایشیائی قلعے کی ہے جو یہاں سے ۱۵۰۰ گز کے فاصلے پر واقع ہے ۔ اس پرانے مدور مینار والے قدیم قلعۂ کلید البحر کا محلِ وقوع نہایت حسین منظر پیش کرتا ہے ۔ زمانۂ مابعد میں اسی نام کے ایک جدید طرز کے قلعے کا اضافہ کرکے اسے مزید مستحکم کیا گیا ہے اس سے ملحق ایک توپخانہ اور نئی مجیدیہ کے چھوٹے اور "نماز گجاہ" کے بڑے پشتے تھے ۔ قلعہ پرانے مینار کے پیچھے ایک پہاڑی کی ڈھلان پر، اسی نام کا چھوٹا سا گاؤں آباد ہے جسے جنگ عظیم میں در دانیال کے معرکے میں بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑا تھا ۔

مآخذ : (حوالوں کے لیے دیکھیے مادّۃ قلعۂ سلطانیہ کے علاوہ) : اولیا : سیاحت نامہ، ۵ : ۳۰۲ تا ۳۰۴ (مادّہ ہائے تاریخ)؛ (۲) Jacob Spon : *Voyage du Levant* Lyon، ۱۶۷۸ء، ۱ : ۲۰۹ ؛ (۳) G. Wheeler : *Journey*، لنڈن

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۱۶۸۲ء، ص ۴۷؛ (۴) G. A. Olivier : *Voyage dans l'Empire Ottoman*، پیرس ۱۸۰۱ء، ۱ : ۲۳۴؛ (۵) Félix de Beaujour : *Voyage militaire*، ۱۸۲۹، ۲ : ۴۸۹؛ (۶) d' Anville : در *Mémoires de l' Académie des Inscriptions*، ۲۸، (۱۷۶۱ء)، ۳۲۲؛ (۷) Jean Reinhard : *J. M. Angiolello*، (۱۴۵۲-۱۵۲۵)، حصۂ ۱؛ (۸) Besançon : *Jeorine Maurand*، ۱۹۱۳ء، ص ۵۸؛ (۹) تصویر، در Jérome Maurand : *Itinerâire* (1544)، طبع Ch. Schefer، پیرس ۱۹۰۱ء، لوح ۱۴، تصویر ۲ ("Sestos") اور ص ۱۷۹ ببعد؛ (۱۰) ایک تشریح در : *Historia, osia vero, e distinto Raggua-glio dello Stato presente della città di Costantino-poli*؛ (۱۱) : *La descrittione . . . delli Turd-anelli*، وینس (۱۶۸۶ء، ۴°، ۳۶ صفحات؛ (۱۲) J. Löwenklau (Leunclavius) : *Annales Sultan-orum Othmanidarum altera*، طبع فرینکفرٹ ۱۵۹۶ء، ص ۱۲۲ ببعد۔

(FRANZ BABINGER)

* **کلیلہ و دمنہ** : ایک کتاب کا عنوان ہے جو شاہزادوں کے لیے بطور آئینۂ ہدایت کے مرتب کی گئی تھی۔ یہ عنوان سنسکرت کے دو لفظوں کرتکا Karataka اور دمنکا Damanaka کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ کرتکا اور دمنکا دو گیدڑوں کے نام تھے جو قصے کے اہم کردار ہیں (قدیم سریانی ترجمے میں یہ Kalilag اور دمنگ Damnag ہی کی شکلوں میں آئے ہیں)۔ اس کا سنسکرت سے پہلوی میں اور پھر پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا گیا اور یوں اسے اسلامی ادب میں اور مسیحی ادب میں بھی ہمہ گیر شہرت حاصل ہوگئی۔

۱۔ اصل تصنیف: اصل ہندوستانی کتاب بقول ہرٹل Hertal ایک نامعلوم وشنو برہمن نے کشمیر میں ۳۰۰ء کے قریب تصنیف کی جس کے حق میں اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کتاب میں denarius کو dīnāra لکھا گیا ہے مگر یہ کوئی دل لگتی بات نہیں، کیونکہ حرف "n" کا تلفظ بطور "i" اس زمانے سے بہت زیادہ قدیمی ہے جو Hertel سمجھتا ہے (نیز دیکھیے A Berriedale Keith، در *Journ. Roy. As. Soc.*، ۱۹۱۵ء، ص ۵۰۵)۔ کلیلہ و دمنہ ایک مقدمے اور پانچ فصلوں پر مشتمل ہے۔ ہر فصل کا عنوان تنترا، یعنی "عقل سلیم کا معاملہ" ہے۔ اس تصنیف کا مقصد یہ تھا کہ جانوروں کے فصیح و بلیغ سنسکرت میں لکھے ہوئے قصے کہانیوں کے پیرائے میں بادشاہزادوں کو اصول مدنیت سمجھائے جائیں۔ اصل کتاب کو سامنے رکھ کر جو کتابیں مرتب کی گئیں، ان میں قدیم ترین تنترا کھیا یکا *Tantrākhyāyika* ہے، جسے J. Hertal نے پھر سے دریافت کیا (دیکھیے *Tantrākhyāyika, die älteste Fassung des Pañcatantra* سنسکرت سے ترجمہ مع مقدمہ و تشریحات از J. Hertel، ۲ حصے، لائپزگ و برلن ۱۹۰۹ء)۔ اصل کتاب کا ایک دوسرا نسخہ پنچ تنترا کے نام سے مشہور ہے (دیکھیے J. Hertal : *Pañcatantra, etc.* در Harvard Oriental Series، جلد ۱۱ تا ۱۴)۔ اسے ہندوستان میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے ان گنت ترجمے متداول ہیں۔ J. G. L. Kosegarten نے اس کے مخطوطے کا ایک غیر تنقیدی نسخہ بون Bonn سے ۱۸۴۸ء میں شائع کیا، اسی پر Th. Benfey نے اپنے ترجمے کی بنیاد رکھی: *Pantschatantra fünf Bücher Indischer Fabeln, Märchen und Erzählungen*، سنسکرت سے ترجمہ مع مقدمہ و حواشی (۲ حصے) لائپزگ ۱۸۵۹ء۔ اس تصنیف کے مقدمے میں پہلی بار پوری جامعیت کے ساتھ اس امر کی تحقیق کی گئی ہے کہ ہندوستان کے ادبی موضوعات کس طرح یورپ میں منتقل ہوئے۔

www.besturdubooks.wordpress.com

۲ - پہلوی ترجمہ ساسانی بادشاہ خسرو نوشیروان (۵۳۱ تا ۵۷۹ء) کے حکم سے پنچ تنترا کے کسی قدر قدیم منقح نسخے کا ترجمہ اس کے طبیب برزویہ نے کیا، جسے بادشاہ نے اسی غرض سے ہندوستان بھیجا اور جس نے بعض دوسرے ہندوستانی مآخذ سے قصے کہانیاں حاصل کرتے ہوے اس تصنیف میں ایک ضمیمے کا اضافہ بھی کیا - ان میں پہلی تین کہانیاں (de Sacy میں باب ۱۱ تا ۱۳) مہا بھارت کی بارھویں کتاب سے مأخوذ ہیں، باقی پانچ (de Sacy میں باب ۱۴، ۱۵، ۱۷، ۱۸، اور چوھوں کے بادشاہ کی کہانی (دیکھیے سطور ذیل جو de Sacy کے نسخے میں موجود نہیں) ابھی تک ہندوستانی ادب میں نہیں مل سکیں، تاھم اس میں شبہے کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ کہانیاں اصلاً ہندوستانی ھیں - برزویہ نے ترجمے کے شروع میں اپنی خود نوشت سرگزشت بطور دیباچہ قلمبند کی تھی - معلوم ہوتا ہے مصنف کی عزت افزائی کے لیے وزیر بزرجمہر نے اپنے ہاتھ سے اس پر دستخط ثبت کیے (دیکھیے *Burzōes Einleitung zur dem Buche Kalila wa-Dimna*، ترجمہ و حواشی از Th. Noldeke : *Schriften der wissensch Gesellsch. in Strassburg*، حصہ ۱۲، سٹراسبورگ Strassburg ۱۹۱۲ء).

۳ - قدیم سریانی ترجمہ : برزویہ کا پہلوی ترجمہ تو ضائع ہو چکا ہے، لیکن ۵۷۰ء کے قریب Periodeut Būd اس کا سریانی میں ترجمہ کر چکا تھا - اس ترجمے کا صرف ایک نسخہ باقی بچا ہے جو پہلے تو مار دین کی خانقاہ میں محفوظ تھا پھر موصل کے بطریق کے کتاب خانے میں پہنچا - یہاں سے یہ پیرس میں Mgr. Graffin کے قبضے میں آیا - اس کی ایک ناقص نقل سے جسے سوسن Socin اپنے ساتھ لایا تھا، بکل Bickle نے پہلا ایڈیشن تیار کیا (*Kalilag und Damnag, alte syrische Übersetzung des indischen fürstenspiegels*، متن و جرمن ترجمہ از C. Bickell، مع مقدمہ از Th. Benfey، لائپزگ ۱۸۷۶ء - آگے چل کر *Schulthess* ان تین نئی نقول کو سامنے رکھ کر جنھیں زخاؤ (Sachau) نے موصل میں تیار کرایا تھا، ایک زیادہ مستند متن شائع کرنے میں کامیاب ہو گیا (*Kalila und Dimna* سریانی اور جرمن، برلن ۱۹۱۱ء).

۴ - عربی ترجمہ : تقریباً تین صدی بعد عبداللہ بن المقفع (رک بہ مادّۂ ابن المقفع، ۲ : ۴۰۴) نے برزویہ کے پہلوی ترجمے کو عربی میں منتقل کیا - اس نے کتاب پر اپنی طرف سے مقدمہ تحریر کیا اور برزویہ کے دیباچے میں غالباً اس حصے کو داخل کیا جو مذاھب کے ظنی اور غیر یقینی ہونے کے بارے میں ہے اور اس سے برافروختہ ہوکر (جس کی اس کتاب میں تعلیم دی گئی ہے)، پنچ تنترا کے حصۂ اول کے بعد دمنہ کے عدالتی مقدمے (de Sacy میں باب ۶) پر ایک باب خود لکھا، جس میں غدار کو سزا مل جانے کی وجہ سے انصاف کا تقاضا پورا ہوتا ہے - ظاہر یہی ہے کہ اسی نے "راھب اور مہمان" کے باب کا بھی اضافہ کیا (de Sacy میں شمارہ ۱۶) - ابن المقفع کا ترجمہ در حقیقت فنِ انشا کے حسن اسلوب کا نمونہ تھا، جو ماھرین علم ادب کے سامنے پیش کیا گیا تھا، لیکن موضوع کی نوعیت کی وجہ سے عوام میں بھی اس کو بہت جلد بڑی مقبولیت حاصل ہو گئی اور اسی وجہ سے نقل و روایت کی کثرت کی بنا پر اس کی اصل صورت میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوتا گیا، حتّٰی کہ ابن قتیبہ کی عیون الاخبار میں بھی جو اس کے متعدد اقتباسات موجود ہیں، وہ ابن المقفع کی اصل کتاب سے لفظ بلفظ نہیں ملتے - اس تصنیف کے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

بے شمار قلمی نسخے جو ملتے ہیں، سب کے سب بعد کے زمانے کے لکھے ہوے ہیں Sylvestre de Sacy کا نسخہ 'Calila et Dimna' ou Fables de Bidpai پیرس ۱۸۱۶ء، ایک کم مرتبہ قلمی نسخے پر مبنی ہے اور دوسرے نسخوں کی مدد سے اس میں من مانی ترمیمیں کی گئی ہیں (دیکھیے Nöldeke، در Göttinger Gelehrte Anz.، ۱۸۸۴ء، ص ۶۷۶) de Sacy کے متن میں ابن المقفع کے مقدمے سے پہلے ایک اور نیا مقدمہ درج ہے، جو ایک غیر معروف شخص بہنود بن سحوان یا علی بن شاہ الفارسی کا لکھا ہوا ہے، جس میں یہ شخص اس کتاب کی وہ سرگزشت بیان کرتا ہے، جو اس کو ہندوستان میں پیش آئی، اس کے علاوہ ایک روداد دی گئی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ برزجمہر نے لکھی ہے، یہ روداد برزویہ کے مشن کے بارے میں ہے، جو خاص طور پر یہی کتاب لانے کے لیے ہندوستان گیا تھا، بعض مخطوطات میں ایک اور کہانی ملتی ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ برزویہ کو ایک کراماتی پودا لانے کے لیے بھیجا گیا تھا، بعض مخطوطات (دیکھیے J. Derenbourg : Directorium vitae humanae، ص ۳۲۳) میں خاتمے پر دو اور کہانیوں کا بھی اضافہ نظر آتا ہے، یعنی بگلے، بطخ اور فاختہ، اور لومڑی اور بگلے کی کہانیاں جو دوسرے مآخذ سے لی گئی ہیں، جن کا ابھی تک پتا نہیں چلا، ان میں سے آخری کہانی اس نسخے میں بھی شامل ہے جو de Sacy کے نسخے کی رو سے مشرق میں پہلی مرتبہ ۱۲۴۹ء میں بولاق میں طبع ہوئی (بقول Chauvin، کتاب مذکور، ص ۱۳ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں ہے، اس کا ایک نسخہ راقم مقالہ کے پاس بھی ہے) اس سے یہ کہانی قاہرہ، موصل اور بیروت میں شائع شدہ نسخوں میں بھی شامل ہو گئی ہے جن کی ایک فہرست Chauvin، ص ۱۳ بعد پر موجود ہے، مگر جو بقول Cheikho (دیکھیے نیچے) ص ۶ ابھی نامکمل ہے۔ I. Guidi نے Studii sul testo arabo del Libro di Calila e Dimna، روم ۱۸۳۷ء میں اطالوی مخطوطات کی رو سے de Sacy کے متن کی تنقیدات میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے چوہوں کے بادشاہ اور اس کے وزیروں کی کہانی de Sacy کے نسخے میں نہیں، لیکن اس کے بارے میں سریانی متن سے پتا چلتا ہے کہ وہ پہلوی ترجمے میں موجود تھی۔ Nöldeke نے اس کہانی کا متن اور ترجمہ Abhandl. der Königl Gesellsch der Wissensch zu Göttingen، ۱۸۷۹ء، ۲۵ شمارہ ۴ میں شائع کر دیا ہے "راہب اور شکستہ پیالے" کی کہانی سے متعلق مکمل مواد پیرس کے ۱۶ مخطوطات سے حاصل کر کے Zotenberg نے Journ. Asiat.، سلسلۂ ہشتم، ۷ (۱۸۸۶ء)، ص ۱۱۷ تا ۱۲۳ میں شائع کر دیا تھا۔

مشرق کے متعدد مطبوعہ نسخوں میں زیادہ تر de Sacy کے متن ہی کو نقل کیا گیا ہے، لیکن A.N. Tabbara (Kalila et Dimna trad. arabe copiée d' après un ancien manuscrit trouvé à Damas, avec notes، بیروت ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) نے تنقید متن کے لیے ایک نیا مأخذ دریافت کیا ہے، لیکن یہ قلمی نسخہ (مکتوبۂ ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء) اس قدر قریب زمانے کا ہے کہ اس سے نیا مواد نہیں مل سکتا۔ اس سے قطع نظر اس نسخے سے تمام عریاں مواد خارج کر دیا گیا ہے۔ دوسری طرف Cheikho کو لبنان میں 'دیر الشیر' کی خانقاہ سے ایک بیش قیمت نسخہ ملا، جو ۷۳۹ھ/۱۳۳۹ء کا لکھا ہوا تھا اور اس نے اسے نہایت سلیقے کے ساتھ طبع کرا کے، سہل الحصول کر دیا : La version arabe de kalilah et Dimnah d'après le plus

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ancien manuscrit arabe daté بیروت ۱۹۰۵ء۔ خلیل الیازجی کا نیا ایڈیشن (کتاب مذکور، ۱۹۰۸ء) میری نظر سے گزرا ہے۔ سلیم ابراہیم صادر اور شاہین عطیہ (کتاب مذکور ۱۹۱۰ء) کے نسخے مدرسوں میں پڑھنے پڑھانے کے لیے ہیں۔ de Sacy کے متن سے جو جدید یورپی ترجمے تیار ہوے ہیں، ان کا ذکر Hertel نے کتاب مذکور، ص ۳۹۳ میں کر دیا ہے، ان میں اب M. Moreno : *La versione araba de Kalilah e Dimmah* کا اطالوی ترجمہ جو San Remo سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا، اضافہ کر لینا چاہیے (دیکھیے *Riv. d. Studi Orient*، ۶ : ۲۰۱)۔

۵۔ کلیلہ و دمنہ عربی نظم میں، ابن المقفع کے ترجمے کو تین بار عربی میں منظوم کیا گیا، پہلی بار اس کے ہم عصر ابان اللاحقی [رک بآں] نے جو عمر میں اس سے چھوٹا تھا، اسے نظم کیا (دیکھیے نیز A. E. Krymski : *Abān al-Lāḥiḳī, le Zindīq (environ 750-815), versificateur arabe des recueils des apologues indo-persans. Essai sur sa vie et ses écrits, tiré de l' unique manuscrit de Souli..., Bibl. Khéd. No. 594, et d' autres sources primitives. Appendices : a. Barslaam et Joasaph, essai littéraire-historique; b. Texte arabe intact d'al-Awrāq par Souli, éd. en collaboration avec* مرزا عبداللہ غفاروف Ghaffarow (روسی میں اور روسی عنوان کے ساتھ ہے) Moskva ماسکو ۱۹۱۳ء؛ مخطوطے کے بارے میں دیکھیے ہورو وٹز Horovitz، در *Mitt. des Seminars Für Orient Sprachen* مطبوعۂ برلن، ۱۰ : ۳۵۔ یہ نسخہ ضائع ہو چکا ہے، اس سے استفادہ کر کے ابن المقفع کے متن کی بنیاد پر ۱۱۰۰ء کے قریب ابن الہبارية [رک بآں] نے صرف دس دن میں یہ مواد نتائج الفطنة فی نظم کلیلہ و دمنہ (طبع سنگی بمبئی ۱۲۱۷ھ) کے عنوان سے نہایت لطیف اور رواں نظم میں منتقل کر دیا تھا (دیکھیے Houtsma، در *Orient Stud. Th. Nöldeke...gewidmet*، ۹۱ تا ۹۶) اس کتاب کے تیسرے منظوم ترجمے کا عنوان درر الحکم فی امثال الہنود و العجم ہے، اسے عبدالمؤمن بن الحسن بن الحسین الصفانی نے ۸۰ روز کی محنت کے بعد ۲۰ جمادی الاولی ۶۴۰ھ/۱۱ نومبر ۱۲۴۲ء کو مکمل کیا، اس کا صرف ایک قلمی نسخہ وی انا میں ہے (دیکھیے Flügel : *Die arab., Pers. und türk. Hdss. der...Hofbibliothek zu Wien* ۱ : ۴۶۹، شمارہ ۸۰۴)۔

۶۔ زمانۂ مابعد کے سریانی ترجمے : دسویں یا گیارھویں صدی میں ایک سریانی پادری نے اس کا ایک بار پھر المقفع کے متن سے اپنے کلیسا کی زبان میں ترجمہ کیا جو اس کے زمانے سے پہلے ہی مردہ ہو چکی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ اس کتاب میں مسیحیت کی رنگ آمیزی کی جائے، چنانچہ اس نے ہندی تصنیف کے اشعار کو جو پہلوی ترجمے میں پہلے ہی کافی مسخ ہو چکے تھے، طول دے کر لمبے اور تھکا دینے والے اخلاق مباحث و مواعظ میں بدل دیا۔ اس نے ترجمے میں بھی بہت سی غلطیاں کیں، لیکن چونکہ اس کے پیش نظر ایک ایسا متن تھا جو ہمارے بیشتر قلمی نسخوں کی نسبت اصل کتاب سے قریب تر تھا، اس لیے تمام نقائص کے باوجود اس کا ترجمہ تنقید متن کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ یہ W. Wright : *The Book of Kalilah and Dimnah. Transl. from Arabic into Syriac* مطبوعۂ لنڈن ۱۸۸۴ء۔ اصل کتاب کی صاف گوئی کے مقابلے میں اس سریانی نسخے کا انگریز مترجم Keith - Falconer (کیمبرج ۱۸۸۵ء) جنسی معاملات کے بیان میں پادری صاحب سے بھی کہیں زیادہ محتاط ثابت ہوا ہے۔ متن اور

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ترجمے کے بارے میں دیکھیے Nöldeke، در *Göttinger Gelehrte Anz.*، ۱۸۸۴ء، ص ۷۵۳ ببعد۔

۷- فارسی منثور و منظوم ترجمے: شاھنامہ میں فردوسی کے بیان کے مطابق (دیکھیے de Sacy، در *Not. et Extr. X* (۱۸۱۸ء)، ۱، ۱۴۰ ببعد) سامانی بادشاہ نصر بن احمد (۹۱۴ تا ۹۴۳ء) کے عہد میں اس کے وزیر بلعمی [رک بآں] کے حکم سے ابن المقفع کی کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ کبھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اسی بادشاہ کے حکم سے شاعر رودکی (م ۳۰۴ھ/۹۱۶ء) نے اسے فارسی نظم کا جامہ پہنایا، لیکن اس کے صرف وہ ۱۶ اشعار محفوظ رہ سکے ہیں، جو اسدی کی لُغت الفرس، طبع Horn، ص ۱۸ ببعد میں درج ہیں۔

ابن المقفع کی تصنیف کا فارسی نظم میں ترجمہ غالباً ۵۳۹ھ/۱۱۴۴ء کے بعد دیکھیے Rieu: *Cat. of the Pers. Mss. in the Brit Mus., London*، ۷۴۵ ببعد) نظام الدّین ابوالمعالی نصراللہ بن محمّد بن عبدالحمید نے کیا اور اپنی کتاب بہرام شاہ غزنوی (رک بآں، ۱: ۵۸۶) کے نام سے معنون کی۔ نصراللہ ایک جدید مقدمے میں لکھتا ہے کہ اس نے مکمل صورت میں اسے دوبارہ پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے، جس میں وہ تمام امثال حکمیہ شامل ہیں، جو اس کے نزدیک بڑی قدر و قیمت کی حامل ہیں اور اسے نثر مصنوع کے تمام بدائع و محاسن کے ساتھ آراستہ بھی کرنا چاہا ہے۔ اس نے صرف برزویہ کا مقدمہ سادہ نثر میں لکھا ہے کیونکہ اس مقدمے کا نفس مضمون کچھ اس قسم کا ہے کہ مرصع نگاری اس کے لیے موزوں معلوم نہیں ہوتی۔ یہ کتاب ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۴ء (اس سے Chauvin کے شکوک رفع ہوجاتے ہیں، ص ۴۶-۴۷) ۱۳۰۴ اور ۱۳۰۵ھ میں تہران میں چھپی (چاپ سنگی) دیکھیے de Sacy، در *Not. et Extr.* ۱۰: ۱، ۹۶ ببعد؛ E.G. Browne: *A Literary History of Persia*، ۲ (لنڈن ۱۹۰۶ء): ۳۴۹۔

اس کتاب کا ایک منظوم ترجمہ قونیہ میں مولانا جلال الدّین رومی کے ایک معاصر احمد بن محمود الطوسی قانعی نے جو مغول کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ کر وہاں آ گیا تھا، سلطان عز الدّین کیکاؤس (۶۴۳ھ/۱۲۴۴ء تا ۶۶۲ھ/۱۲۶۳ء) کے لیے کیا۔ یہ غالباً نصراللہ کے ترجمے پر مبنی تھا۔ تاہم اس نے اس امر کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ دیکھیے Rieu: *Cat of the Pers. Mss. in the Birt. Mus.*، ص ۵۸۲ ببعد؛ E. G Browne: *A History of Persian Literature under Tartar Dominion* (کیمبرج ۱۹۲۰ء)، ص ۱۱۱۔

جب سلطان ہرات، حسین بایقرا [رک بہ حسین میرزا] کے درباری واعظ حسین واعظ کاشفی [م ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء (رک بہ کاشفی)] نے نصراللہ کے ترجمہ پر نظر ثانی کرکے اسے پیش کیا تو طوسی کے ترجمے کی اہمیت بالکل جاتی رہی۔ حسین واعظ کاشفی نے سلطان حسین کے وزیر میر احمد سہیلی کے اعزاز میں اپنی کتاب کا نام انوار سہیلی رکھا۔ اس کا دعوٰی تو یہ ہے کہ اس نے نصراللہ کی پر تصنع اور مرصع عبارت کو اپنی نئی طرز تحریر میں آسان اور سلیس کر دیا ہے تاکہ لوگ اسے آسانی سے سمجھ سکیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کاشفی نے اسے پہلے سے بھی زیادہ پر تکلف بنا دیا ہے اور اپنے اطناب اور رنگین کلام کی وجہ سے ایک ایسا مجموعہ تیار کیا ہے، جو بے معنی مبالغہ آرائیوں، پیچیدہ الفاظ، فضول القاب، دوراز کار تشبیہوں اور بے مزہ عبارت آرائیوں سے پُر ہے اور ان مرصع نگاروں کے اسلوب کا بہترین نمونہ ہے جنھوں نے سلاطین تیموریہ کی سرپرستی میں بڑا

www.besturdubooks.wordpress.com

عروج حاصل کیا تھا۔ (E. G. Browne : *Lit. History of Persia*، ۲ : ۳۵۲، کتاب مذکور، ص ۵۰۳ ببعد)، لیکن چونکہ یہ اسلوب موجودہ دور کے آغاز تک ایران اور خصوصاً ہندوستان میں بہت مقبول رہا، اس لیے اس کتاب کو بے نظیر کامیابی حاصل ہوئی اور اصل کتاب فارسی ہی میں انگلستان میں طبع ہوئی (پہلا مکمل نسخہ، لنڈن ۱۸۳۶ء) اور اسے ہندوستان جانے والے انگریز افسروں کے امتحان کے لیے بطور درسی کتاب مقرر کیا گیا۔ اور پھر یہ کئی بار چاپ سنگی میں ہندوستان اور ایران میں طبع ہوئی اور اس کا ہندوستان کی متعدد زبانوں نیز پشتو، گرجستانی، اور یورپ کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہوا (دیکھیے Chauvin ص ۶ تا ۴۳) حسین کاشفی نے ترجمۂ المقفع کے چار مقدمات کے بجائے اپنے ترجمے کا ایک نیا مقدمہ لکھا ہے، جس کا مأخذ ابھی تک شناخت میں نہیں آیا۔ de Sacy کا قیاس ہے کہ (*Not. et Extr.*، ۱۰، ۱ : ۵۹) اس کے اندر وہی قدیم تر جاویدان خِرَد موجود ہے جس سے الطرطوشی نے اپنے زمانے میں اپنی تصنیف سراج الملوک (بولاق ۱۲۸۹ء) ص ۹۷، س ۲۲ تا ۲۴، ص ۱۸۵، س ۲۵ بعد کے لیے استفادہ کیا تھا۔ ہمایوں فال شہنشاہ چین کو اس کا وزیر ترغیب دیتا ہے کہ تخت و تاج چھوڑ دینے کا خیال ترک کر دے۔ اس سلسلے میں اسے دابشلیم شاہ ہند کا قصہ سناتا ہے کہ اسے خواب میں ہدایت ہوئی کہ ایک غار میں جائے، جہاں اسے ایک پیر مرد ایک خزانہ دے گا۔ اس خزانے میں سے دابشلیم صرف ہوشنگ شاہ فارس کا وصیت نامہ اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے، جس میں بادشاہوں کے لیے ۱۴ نصیحتیں درج ہیں، انھیں لے کر وہ لنکا جاتا ہے، جہاں ایک برہمن بید پاے یا پیلپاے ان میں سے ہر نصیحت کی تشریح کہانیوں کے ذریعے کرتا ہے۔ یہی کہانیاں زیربحث ہیں، جن پر اس کتاب کے مختلف ابواب مشتمل ہیں۔

انوار سہیلی کے حد سے زیادہ پُرتکلف اسلوب بیان سے بیزار ہو کر شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵ء) نے اپنے وزیر ابو الفضل کو اس کتاب کا ایک نیا منقح نسخہ مرتب کرنے پر مأمور کیا۔ اس نسخے کا نام عیار دانش ہے اور یہ ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۷-۱۵۸۸ء میں مکمل ہوا۔ اس میں ترتیب تو انوار سہیلی ہی کی ملحوظ رکھی گئی ہے، لیکن ابن المقفع کا مقدمہ اور برزویہ کا دیباچہ دوبارہ شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، البتہ حفیظ الدّین نے خرد افروز کے نام سے اس کا ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کے پاکیزہ طرز تحریر سے متأثر ہوکر Th. Roebuck (کلکتہ ۱۸۱۵ء) اور Eastwick (Hertford، ۱۸۵۷ء اور لنڈن ۱۸۶۷ء) نے شائع کیا۔

۸۔ ترکی ترجمے: نصراللہ نے ابن المقفع کی تصنیف کا جو ترجمہ کیا تھا، اس کا مشرقی ترکی میں دوبار ترجمہ ہوا دیکھیے مخطوطات ڈریسڈن، در Fleischer : *Cat. Codd. Mss. orient Bibl. Regiae Dresdensis*، (لائپزگ ۱۸۳۱ء)، ص ۱۹، شمارہ ۱۳۶ اور Munich، در Aumer : *Die Pers. und türk. Hdss der K. Hof-und Staatsbibliothek* ص ۵۴۔

نصراللہ کے ترجمے کا ایک ترجمہ قدیم عثمانی ترکی میں (مشرقی ترکی میں نہیں جیسا کہ Ethé کے کسی قدر غلط فہمی پیدا کرنے والے ایک جملے پر انحصار کرکے Hertel، نے خیال ظاہر کیا ہے، ص ۳۰۷) مسعود نے والیِ آیدین کے شاہزادے عُمور بیگ (م ۷۵۰ھ/۱۳۴۹ء) کے لیے کیا (ایک مخطوطہ، در Bodleian Marsh. ۱۸۰)۔ اس نثری تصنیف کو

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ایک نامعلوم مصنف نے نظم کا جامہ پہنا کر اسے سلطان مراد اول (۷۶۱ھ / ۱۳۵۹ء تا ۷۹۲ھ / ۱۳۸۹ء) کے نام معنون کیا ۔ اس کا تقریباً نصف حصہ ایک مخطوطے Gotha (دیکھیے Pertsch : *Verz. der türk Handschr. d. Herz Bibl.*، ص ۱۶۸، شمارہ ۱۸۹) میں محفوظ ہے ۔ اس کا جدید عثمانی نثر میں ترجمہ جو لازمی طور پر ۹۵۵ھ/۱۵۴۸ء سے قبل ہوا ہوگا، اس کا قلمی نسخہ کتابخانہ Bodleian، ۶۱ میں موجود ہے (دیکھیے H. Ethé : *On some hitherto unknown Turkish Versions of Kalilah and Dimnah* در *Actes due be Congr. internat. des Orientalistes*، حصہ ۲، ۱ : ۲۴۱ ببعد ۔

علی بن صالح المعروف بہ علی واسع یا علی چلبی نے انوار سہیلی کا ترجمہ مسجع عثمانی نثر میں ہمایون نامہ کے عنوان سے کیا اور سلطان سلیمان اول (۹۱۲ تا ۹۷۰ھ) کے نام معنون کیا ۔ یہ کتاب کئی مرتبہ بولاق اور استانبول میں چھپ چکی ہے (دیکھیے Chauvin، ص ۵۰) ۔ ہمایون نامہ کے جو تراجم مختلف یورپی زبانوں میں ہوئے، ان میں سب سے زیادہ مشہور Galland کا فرانسیسی ترجمہ ہے، جسے Gueulette نے اس کی وفات کے بعد شائع کیا (پیرس ۱۷۲۴ء) اسی کا Gonggrijp نے ملائی زبان میں ترجمہ کیا (بٹیویا ۱۸۶۶ء) اور Kramaprawira نے ترجمے سے متاثر ہو کر اس کا ترجمہ جاوی زبان میں کیا اور جسے ایک نامعلوم الاسم شاعر نے جاوی ہی میں منظوم بھی کر دیا ۔ ہمایون نامہ پرتکلف عبارت آرائی میں، اصل فارسی کتاب سے بازی لے گیا اور اس کی پیچیدگیاں صاف کرنے کے لیے مفتی یحیٰی افندی اوزعثمان زادہ کو جس نے ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں جب وہ قاہرہ کا قاضی تھا، وفات پائی، اس کا ملخص تیار کرنے پر آمادہ کیا (دیکھیے Éthé، کتاب مذکور، ص ۲۴۲) ۔ محمد موسیٰ بے پچہ کی ترغیب سے فضل اللہ بن عیسیٰ تاشقندی نے ہمایون نامہ کی مدد سے انوار سہیلی کا ترجمہ جدید مشرقی ترکی نثر میں کیا (زیادہ صحیح، جیسا کہ خاتمۂ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے، تاشقند اور فرغانہ کی زبان میں اور جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، ترکستان اور فرغانہ کی زبان میں) اور خاتمۂ کتاب کی رو سے محمد موسیٰ بے نے ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء میں میرزا ہاشم خجندی خوش نویس سے لکھوا کر لتھو میں طبع کرایا، لیکن عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی ۔

عبدالعلام فیض خاں اوغلو نے ابن المقفع کی کتاب کا ترجمہ عربی سے قازان ترکی میں کیا ۔ یہ ترجمہ ۱۸۸۹ء میں قازان میں طبع ہوا (یونیورسٹی پریس *Orient Bibliographie*، ۳ : ۱۴۲۱) اسی سال Wjatschakow (کتاب مذکور، ۴ : ۱۶۷، عدد ۳۹۳۵) میں اور ۱۸۹۲ء میں Circova (کتاب مذکور، ۴ : ۱۶۷، عدد ۳۱۶۶) میں چھپا ۔ پروفیسر Hommel کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقدمہ انوار سہیلی سے لیا گیا ہے ۔

۹ ۔ مغولی ترجمہ : ملک افتخار الدین محمد بن ابی نصر نے جو محمد بکری کی اولاد میں سے تھا، قزوین میں اس کا مغولی زبان میں ترجمہ کیا، لیکن یہ ناپید ہے (دیکھیے حمد اللہ المستوفی : تاریخ گزیدہ طبع، Gibb Mem.، Browne، ۱۴ : ۸۴۴، ۸۴۵؛ Browne : *A History of Persian Literature under Tatar Dominion*، ترجمہ، ص ۲۳۳؛ Hammer-Purgstall نے *Journ. Asiat*، سلسلۂ سوم، ۱ : ۵۸۰ میں جو بیان دیا ہے، وہ صحیح ہے ۔ یہ بیان حاجی خلیفہ (۵ : ۲۳۹) میں خلط ملط ہو گیا ہے ۔ اس نے اس کا ترکی میں ایک ترجمہ ملک افتخار الدین

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کے جد امجد بکرمی سے منسوب کیا ہے (دیکھیے Not et Extr. : De Sacy، ۱۰ : ۱۷۵؛ Éthé، کتاب مذکور، ص ۲۴۳، جس نے von Hammer کے بیان کو جو صحیح ہے، نظر انداز کر دیا) جس طرح Flugel نے "in lingnam Tatarorum" کا ترجمہ غلط کیا ہے، اسی طرح Hertel (ص ۴۱۴) نے غلطی سے اس نامبردہ تاتاری ترجمے کو قازان ترکی (جسے تاتاری کہا گیا ہے) ترجمہ سمجھ لیا ہے، جس کا حوالہ Chauvin، ص ۷۸، حاشیے میں دیا گیا ہے۔

۱۰ - حبشی ترجمہ: ایک حبشی ترجمہ جو یقیناً ابن المقفع کے ایک ایسے عربی متن پر مبنی تھا، جو مصر میں رائج تھا، ضائع ہو چکا ہے اور جس کا ۱۵۸۲ء کی ایک تصنیف میں ذکر ملتا ہے (دیکھیے Cat. of the Ethiop. Mss. : Wright، in the Brit. Mus.، ص ۸۲ ب) (دیکھیے Nöldeke : Gött. Gelehrte Anz.، ۱۸۸۴ء : ص ۶۷۶، حاشیہ ۵)۔

۱۱ - عبرانی اور قدیم یورپی تراجم: بارھویں صدی کے آغاز میں ربّی جوئیل نے ابن المقفع کی تصنیف کا عبرانی میں ترجمہ کیا، ترجمہ ایک بیش قیمت قلمی نسخے سے کیا گیا تھا، لیکن اس میں برزویہ کی مہم کی غلط کہانی اور آخر کتاب میں دو بے اصل کہانیاں بگلے، بطخ اور لومڑی کی، اور فاختہ اور بگلے کی شامل تھیں۔ اس کے واحد قلمی نسخے سے جس کے شروع کے حصے میں بے حد غلطیاں ہیں، J. Derenbourg نے یہ ترجمہ تیرھویں صدی کے ایک شخص Jacob b. Eleazar کے ترجمے کے ساتھ شائع کیا (Deux versions hébraïques du Livre de Kalilâh et Dimnâh، Bibl. de l'École des Hautes Études، Fasc. ۴۹، پیرس ۱۸۸۱ء) جیکب کا ترجمہ اسی قسم کے متن پر مبنی ہے، جس طرح کا جوئیل کے پیش نظر تھا، پھر بھی یہ ایک صاف آزاد مقفّی نثر میں لکھا ہوا ہے اور بائیبل کے محاوروں سے پر ہے۔ اس کے بعد ربّی جوئیل کے ترجمے کا ایک یہودی John Capua نے جو عیسائی ہو گیا تھا، ۱۲۶۳ اور ۱۲۷۸ء کے مابین کارڈینل ارسینس Ursinns کے لیے Directorium vita Humanae کے عنوان سے لاطینی میں ترجمہ کیا (دیکھیے Johnnes de Capua : Directorium vitae humanae، مرتبہ و مشرحہ از J. Derenbourg، Bibl. de l' École des Hautes Études، Fasc. ۴۲، پیرس ۱۸۸۷ء) توقع کی جاتی ہے کہ Hilka ایک نیا ایڈیشن شائع کرے گا، جو ایسے قلمی نسخوں پر مبنی ہوگا، جنھیں اس نے حال ہی میں دریافت کیا ہے) ایک قدیم ہسپانوی ترجمے کو جس میں اسی اصل متن کا جسے ربّی جوئیل نے استعمال کیا ہے، John of Caua سے کہیں زیادہ التزام کے ساتھ لفظ بلفظ تتبع کیا گیا ہے (دیکھیے Clifford G. Allen : L'ancienne version espagnole de Kalila et Dimna, texte des Mss. de l'Escorial, précédé d'un avant propos et suivi d' un glossaire، Thesis، Paris-Macon، ۱۹۰۶ء)۔ تمام تراجم جو مغربی یورپ کی زبانوں میں ہوے، ان میں سے بالکل حال کے تراجم نکال کر سب کے سب John of Capua کے لاطینی ترجمے پر مبنی ہیں (دیکھیے Chauvin، ص ۵۹ تا ۷۲؛ Hertel، ص ۳۶۶ تا ۴۰۰)۔

۱۲ - یونانی ترجمہ: گیارھویں صدی کے آخری ایام میں Seth کے بیٹے Symeon نے ابن المقفع کے ترجمے کے ایک ایسے قلمی نسخے کو جو بعد کے اضافوں سے پاک تھا، لیکن پھر بھی اس میں چوہوں کے بادشاہ اور اس کے وزیروں کی کہانی شامل تھی، خاصے آزاد اسلوب میں یونانی زبان کا جامہ پہنایا۔ اس نے اس کتاب کا نام Συντιπας

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

καὶ Ἰχνηλάτης رکھا کیونکہ اس نے لفظ کلیلہ کا تعلق عربی لفظ اکلیل سے اور دمنہ کا تعلق عربی لفظ دمنہ، بمعنی آثار کہنہ سے سمجھا تھا ۔ دیکھیے Στεφανίτης καὶ Ἰχνηλάτης *Quattro recensioni della versione greca del Kitāb Kalila wa-Dimna, Pubbl. da Vittorio Puntoni Pubblicazioni della Soc. Asiat. Ital.*، ۲، (۱۸۸۹ء) یہ ترجمہ پھر لاطینی جرمن، نیز متعدد سلافی زبانوں میں منتقل ہوا ۔

۱۳ - ہِتوپدیش کا فارسی ترجمہ : ہِتوپدیش کا جو سنسکرت میں پنچ تنترا کی، زمانۂ ما بعد کی نقل تھی، غالباً [ہمایوں یا] اکبر کے عہد میں ایک شخص تاج الدین نے مفرح القلوب کے نام سے فارسی میں آزاد ترجمہ کیا (دیکھیے de Sacy : *L' électuaire des coeurs, ou traduction persane du liver indien intitulé Hitoupadésa par Taj-eddin, ms. persan de la Bible du Roi* شمارہ ۳۸۶ در *Not. et Extr.*، ۱۰ : ۱ : ۲۲۶ تا ۲۶۴) ۔ بعد ازاں ایک بلند مرتبہ ہندوستانی مصنف میر بہادر علی حسینی نے ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں اس کا اپنی مادری زبان میں ترجمہ کیا (دیکھیے Garcin de Tassy : *Hist. de la litér hindouïe ou hindoustanie*، بار دوم، ۱ : ۶۰۹ ببعد) ایک سال بعد گلکرسٹ نے اسے طبع کیا، بنام *Ukhlaqi Hindee or Indian Ethics transl. from the Version of the celebrated Hitoo-pades or Salutary Counsel*، از میر بہادر علی ۔۔۔۔ زیر نگرانی جان گلکرسٹ، کلکتہ ۱۸۰۳ء، دیکھیے J. Hertel : *Die Akhlāq-ē Hindi und ihre Quellen*، در *Zeitschr. d. Deutsch. Morg. Gesellsch.*، ۷۲ : ۶۵ تا ۸۶؛ ۷۳ : ۹۵ تا ۱۱۷؛ ۷۵ : ۱۲۹ تا ۲۰۰ ۔

۱۴ - قدیم سلافی ترجمہ : ابن المقفع کے ترجمے اور پنچ تنتر کے ایک نامکمل نسخے پر سلافی ترجمہ حکایت کلیلہ دن دمنہ مبنی ہے، جسے سب سے پہلے Werndly نے اپنی تصنیف *Maleische Spraakkunst* (ایمسٹرڈم ۱۷۳۶ء) کے ذریعے متعارف کیا اور ۱۸۷۶ء میں Gonggrijp نے لائیڈن سے شائع کیا (بار دوم ۱۸۹۲ء، دیکھیے J.J. Brandes، در Feestbundel، لائیڈن ۱۸۹۱ء، ص ۷۷، ببعد) اس کے بعد اسی کا جاوی (بٹیویا ۱۸۷۸ء) اور مدوری (وہی مقام ۱۸۷۹ء) میں ترجمہ ہوا ۔

۱۵ - کلیلہ و دمنہ کے مماثلات : ان قصوں سے قطع نظر جو الف لیلہ و لیلۃ میں شامل کیے گئے، ابن المقفع کی کتاب کا اسلامی ادب میں تین بار اتباع کیا گیا ۔ ابن الہبّاریۃ (دیکھیے اوپر) نے اپنی منظوم تصنیف کتاب الصادح والباغم (دیکھیے اوپر، ص ۳۷۸ ببعد، نیز مطبوعۂ قاہرہ ۱۲۹۴ھ) اس کے نمونے پر تیار کی، لیکن اس میں محض حیوانوں کی حکایات کی نقل کی گئی ہے، لیکن محمّد بن عبداللہ بن ظفر الصِقلّی (م ۵۶۵ھ/۱۱۶۹ء یا ۵۶۸ھ/۱۱۷۲ء) اپنی کتاب سُلوان المُطاع کو جسے اس نے پہلی بار ۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء میں مرتب کیا اور جس کے نئے ایڈیشن کو ۵۵۴ھ/۱۱۵۹ء میں صقلیہ کے قائد ابو عبداللہ محمّد القرشی کے نام معنون کیا، وہ بھی کلیلہ و دمنہ کی طرح اسے بادشاہوں کے لیے آئینۂ حالات بنانا چاہتا تھا ۔ اس لیے جانوروں کے قصے کہانیوں کے علاوہ اس میں تاریخی حکایات بھی درج کی گئی ہیں ۔ یہ ۱۲۷۸ھ میں قاہرہ سے لتھو میں طبع ہوئی ۔ تونس میں ۱۲۷۹ھ میں چھپی اور بیروت سے ۱۳۰۰ھ میں شائع ہوئی ۔ اس کا ترکی ترجمہ قرہ خلیل زادہ (م ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء) نے کیا جو ۱۲۸۵ھ میں استانبول میں چھپا ۔ M. Amari نے اسے اطالوی زبان میں منتقل کیا ۔ *Solwan el-mota ossiano Conforti*

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

politici di Ibn Zafar arabo Siciliano del xii Secolo، فلورنس ۱۸۵۱ء، ۱۸۸۲ء (انگریزی ترجمہ، لنڈن ۱۸۵۴ء)۔

ایک اور آئینہ ہدایت جس میں قارئین کی اخلاقی اصلاح کے لیے جانوروں کے قصوں کے ساتھ ساتھ تاریخی حکایات کی آمیزش بھی کی گئی ہے، چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں اسپہبذ مرزبان والیِ طبرستان نے اپنے ملک کی فارسی زبان میں لکھی۔ خود یہ تصنیف تو ضائع ہو چکی ہے، لیکن چھٹی صدی ہجری بارھویں صدی عیسوی اور ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں دوبارہ اس کا مستند فارسی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے، پہلا ترجمہ ایشیاے کوچک کے سلجوق فرمانروا سلیمان شاہ (۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء تا ۶۰۰ھ/۱۲۰۴ء) کے دربار میں اس کے وزیر محمّد بن غازی الملطی کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس کا نام روضۃ العقول ہے اور اس کے دو قلمی نسخے لائیڈن اور پیرس میں موجود ہیں۔ سعد الدّین وراوینی کے مرزبان نامہ نے، جو ۶۰۷ھ اور ۶۲۲ھ کے مابین (۱۲۱۰ - ۱۲۲۵ء) لکھا گیا، اس سے زیادہ مقبولیت پائی۔ اسے میرزا محمّد نے برائے طبع مرتب کیا (Gibb. Mem. Ser، جلد ۸)۔

وراوینی کی کتاب کا ایک نامعلوم مصنف نے عثمانی ترکی میں ترجمہ کیا (۸۴۸ھ/۱۴۴۴ء) (اس کا ایک قلمی نسخہ برلن میں ہے، (دیکھیے Pertsch : *Verz. der Türk-Hdss.*، عدد ۴۴۴) اس ترکی نسخے کا ایک بار پھر عربی میں ترجمہ ہوا، لیکن مترجم کا نام معلوم نہیں (مخطوطۂ برلن دیکھیے Ahlwardt : *Verz*، عدد ۸۴۷۲)۔ ایک دوسرا عربی ترجمہ جو مخطوطۂ Gotha (دیکھیے Pertsch : *Die Arab Hdss. der Herz Bibl*، عدد ۲۶۹۲) کی رو سے اسی ترکی ترجمے پر مبنی ہے، ابن عرب شاہ [رک بآں] نے کیا۔ ایک اور قلمی نسخہ پیرس میں موجود ہے (de Slane : *Catal.*، شمارہ ۳۵۲۴) اور یہ ۱۲۷۸ء میں قاہرہ سے لتھو میں طبع ہوا۔ اسی مصنف نے دوبارہ اپنی یہی کتاب فاکہۃ الخلفاء و مفاخرۃ الظرفاء کے نام سے مرصع نثر میں لکھی اور اس میں متعدد نئی حکایات کا اضافہ کیا۔

اسی منقح و مہذب کتاب کو جس کا عثمانی ترکی میں ترجمہ ہو چکا تھا اور جسے دسویں (آخری) باب "در بیان زیادت عمر و دولت و زندگانی کردن با دوست و دشمن" کی بنا پر وراوینی کی تصنیف سے ممیز کیا جاتا ہے، ایک نامعلوم الاسم مصنف نے کسی سلیمان بک بن محمّد بک کے لیے قازانی ترکی کا جامہ پہنایا اور یہ کتاب دستور شاهی فی حکایات پادشاهی کے نام سے ۱۸۶۴ء میں قازان میں طبع ہوئی۔

مآخذ : (۱) V. Chauvin : *Bibliographie des ouvrages arabes ou relatifs aux Arabes*، وغیرہ، ii : *Kalilah (Liège - Leipzig)*، ۱۸۹۷ء؛ (۲) J. Hertel : *Das Pañcatantra, seine Geschichte und seine Verbreitung*، لائپزگ و برلن ۱۹۱۴ء۔

(C. BROCKELMANN)

کلیم، ابو طالب : ایرانی الاصل شاعر تھا۔ ابتدائی عمر کے سوانح کچھ زیادہ نہیں ملتے، یہاں تک کہ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی، اس کے والد کے نام کا بھی پتا نہیں چل سکا۔ طاہر نصر آبادی نے کلیم کو ہمدانی بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کاشان میں بہت عرصہ رہا تھا، اس لیے اسے کاشی (کاشانی) کہتے ہیں (تذکرہ نصر آبادی، ص ۲۲۰، تہران، ۱۳۱)، لطف علی بیگ آذر نے لکھا ہے کہ تذکرہ نویسوں کا اس کے وطن کے

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

بارے میں اختلاف ہے، بعض اسے ہمدانی اور بعض کاشی (کاشانی) لکھتے ہیں۔ آذر کے نزدیک وہ کاشانی تھا (آتشکدہ، طبع محمد علی علمی، تہران، ص ۲۵۲؛ نیز دیکھیے عبدالحمید: پادشاہنامہ، ۱: ۳۵۳) ۔ معاصر ایرانی ادیب پرتو بیضائی نے بھی اسے کاشانی ہی لکھا ہے (دیوان کلیم، طبع ایران، مقدمہ) اس لیے یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ کاشانی تھا، اگرچہ اس نے شیراز میں تعلیم پائی (عبدالحمید: پادشاہنامہ، ص ۳۵۳) اور کچھ عرصہ ہمدان میں گزارا (آتشکدہ، ص ۲۵۲) ابو طالب کلیم، جہانگیر (۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء تا ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء) کے عہد میں ۱۰۲۷ھ/۱۶۱۷ء میں برصغیر پاکستان و ہند آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر کے شاہان مغلیہ کی زبان فارسی تھی اور وہ فارسی شاعری کے قدر دان بھی تھے، ادھر ایران میں صفویوں کو (بقول رضا زادہ شفق) قصیدہ و غزل سے کوئی شغف نہ تھا۔ (شفق: تاریخ ادبیات ایران، تہران، ص ۳۶۳) ان وجوہ سے ایرانی علما و شعرا کو برصغیر میں قسمت آزمائی کی آرزو رہتی تھی ۔ کلیم نے ہندوستان آ کر امیر شاہنواز صفوی (خسر اورنگ زیب) کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اس کی وفات کے بعد کلیم گولکنڈہ گیا اور میرزا محمد امین میر جملہ کے دربار سے وابستہ ہوا، لیکن ایک ہی سال (۱۰۲۸ھ) وہ واپس چلا گیا۔ (تذکرۂ نصر آبادی، ص ۲۲۰) اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جہانگیر نے طالب آملی کو ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا اور اس کی شاعری کا سکہ دربار میں جما ہوا تھا اور یہ کہ نور جہاں بیگم کلیم کی شاعری کی معتقد نہ تھی (دیکھیے شیر خان لودھی: مرآۃ الخیال، ۹۰) اس لیے وہ دل برداشتہ ہو گیا تھا، مگر یہ وجہ کچھ زیادہ قابل اعتماد معلوم نہیں ہوتی ۔ کلیم کا طالب آملی کے ملک الشعرا ہونے پر دل برداشتہ ہونا قرین قیاس نہیں۔ اسے یہاں آتے ہی یہ توقع کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ طالب آملی کی موجودگی ہی میں ملک الشعرا بن جاتا۔ اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب وہ وطن کو واپس جا رہا تھا تو اسے برصغیر کو چھوڑنے کا قلق ہوا، چنانچہ ایک غزل لکھی جس کے ایک شعر میں اپنے اس درد کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

ز شوق ہند زان سان چشم حسرت برقفا دارم
کہ رو ہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را

کہتے ہیں "جا تو رہا ہوں مگر آنکھیں پیچھے کو لگی ہوئی ہیں"۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دل برداشتہ ہو کر نہیں گیا تھا اور پھر ہند کا شوق اسے دو ہی سال میں واپس لے آیا۔ یہاں آ کر اس نے دکن کا رخ کیا اور عالم بے بسی میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ دکن میں اسے بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ بیجاپور سے گزر ہوا تو راستے میں جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہوا۔ کلیم نے اپنے دو قصیدوں میں، جن میں ایک ابراہیم عادل شاہ (۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء تا ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء) کی مدح میں ہے، اپنی اسیری کی کیفیت بیان کی ہے۔ بالآخر میر جملہ مذکور کے توسط سے شاہجہان کے دربار میں رسائی ہوئی اور محمد جان قدسی کی وفات (۱۶۴۶ء) کے بعد کلیم ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز ہوا (شیر خان: مرآۃ الخیال، ص ۱۱۹)۔

کلیم بہت سیر چشم، قانع اور خوش گفتار شخص تھا، محمد طاہر کے بیان کے مطابق بادشاہ کی طرف سے جو انعام و اکرام ملتا فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیتا (تذکرۂ نصر آبادی، ص ۲۲۰)۔ جاہ و منصب سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ایک

www.besturdubooks.wordpress.com

مرتبہ شاہجہان نے اسے مُہرداری کا منصب سونپنا چاہا تو اس نے ایک شعر کہہ کر معذرت چاہی جس کا دوسرا مصرع یہ ہے۔ "مرا مہرداری بہ از مُہرداری" کلیم کے اپنے معاصرین کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ صائب کے ایک قطعے سے واضح ہے کہ کلیم کے صائب اور میر معصوم کے ساتھ بہت خوشگوار تعلقات تھے۔ قدسی اور ملک قمی کے ساتھ بھی اس کے روابط دوستانہ تھے، ملک قمی فوت ہوا تو کلیم نے ترکیب بند میں مرثیہ لکھا جس سے اس کے قلبی تأثرات کا پتا چلتا ہے۔

کلیم پُرگو شاعر تھا۔ اس نے ہر شاہی تقریب پر قصیدے کہے اور بڑے بڑے انعام پائے شاعان وقت عموماً اپنے عہد کے حالات لکھنے کا کام علما و شعرا کے سپرد کیا کرتے تھے جیسے کہ نثر میں پادشاہ نامہ لکھنے کی فرمائش عبدالحمید کو ہوئی۔ منظوم حالات لکھنے کے لیے قدسی منتخب ہوا، جس نے بڑی محنت سے ظفر نامہ لکھنا شروع کیا، لیکن زندگی نے وفا نہ کی، بالآخر کلیم نے مثنوی ظفر نامۂ شاہجہان کی تکمیل کی۔ (دیکھیے آگے) شاہجہان کو یہ مثنوی پسند آئی اور کلیم کو انعام و اکرام سے نوازا۔ کلیم کو پادشاہنامہ لکھنے کی بھی فرمائش ہوئی۔ اسے شاہجہان کے ساتھ کشمیر جانے کا اتفاق ہوا، وہاں کے مناظر اور خوشگوار آب و ہوا کا اس پر اس قدر اثر ہوا کہ یہیں ٹھیر جانے کی اجازت چاہی۔ شاہجہان نے اس کی درخواست منظور کرلی اور اس کے لیے ماہیانہ مقرر کر دیا (تذکرۂ نصر آبادی، ص ۲۲۰) کلیم نے قیام کشمیر کے زمانے میں مثنوی پادشاہنامہ کی تکمیل کی۔ آخر یہیں ۱۰۶۱ھ میں وفات پائی۔ غنی کشمیری نے مادۂ تاریخ اس مصرع سے نکالا "طور معنی بود روشن از کلیم" (۱۰۶۱ھ کلمات الشعراء، مطبوعۂ شیخ مبارک علی، ص ۹۶) شیر خاں لودھی نے اس کی وفات کا سال ۱۰۶۲ھ لکھا ہے (جو درست نہیں) اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا مرقد لاہور کے نواح میں کسی دیہ میں ہے (مرآۃ الخیال، ص ۱۱۹)، لیکن یہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ مصنف آتشکدہ نے لکھا ہے کہ وہ خطۂ کشمیر ہی میں مدفون ہے، (مطبوعۂ ایران ۱۳۳۷ ش، ص ۲۵۲)۔

تصانیف: ظفر نامۂ شاہجہانی جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے، اسے قدسی نے لکھنا شروع کیا تھا، لیکن تکمیل اس کی کلیم نے کی۔ اس کے مضامین کچھ خلط ملط سے ہیں کیونکہ یہ ان کے مطبوعہ دیوان میں بھی ملتے ہیں اور بعض اجزا قدرے تفاوت کے ساتھ دوبارہ بلکہ سہ بارہ بھی آ گئے ہیں۔

(۱) اس کا پہلا جزو جلال الدّین محمّد طباطبائی کے دیباچے پر مشتمل ہے؛ (۲) یہ جزو آغاز داستان سال یازدہم کے عنوان سے شروع ہوتا ہے؛ (۳) اس میں ردیف وار قصائد درج ہیں؛ (۴) یہ ظفرنامہ کا طویل اور مربوط حصہ ہے، جس میں شاہجہان کی تخت نشینی اور اس کے عہد حکومت کے آغاز کے بعض واقعات قلمبند کیے گئے ہیں؛ (۵) ساقی نامہ؛ (۶) مثنوی در وصف کشمیر؛ (۷) وہی ساقی نامہ قدرے تفاوت سے؛ (۸) یہ ظفر نامہ ہی کا ایک اور حصہ ہے جو جزو ۴ سے مربوط ہے۔ اس میں ان عمارات کا، بالخصوص دہلی مسجد (تعمیر ۱۰۴۷ھ) کا ذکر آیا ہے جن کی تعمیر دکن کی مہم سے واپسی پر شاہجہان نے کرائی۔ اس کے ورق ۱-ا پر ایک مہر ثبت ہے، جس میں سال ۱۱۵۵ھ/[۱۷۴۲ - ۱۷۴۳ء] درج ہے۔

پادشاہنامہ: شاہجہان نے کلیم کو اپنے عہد حکومت کے حالات بصورت مثنوی لکھنے کی فرمائش کی تھی جو اس نے کشمیر کے قیام کے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

دوران میں لکھی - یہ مثنوی پانچ ابواب پر مشتمل ہے : (۱) شاھجہان کی ابتدائی زندگی کے حالات؛ (۲) مقدمۂ کتاب کا کچھ حصہ اور شاھجہان کے آبا و اجداد، یعنی امیر تیمور سے ھمایوں تک کے حالات؛ (۳) شاھجہان کے عہد حکومت کے ابتدائی حصے، یعنی اس کی تخت نشینی سے ظفر خان کی مہم تبت (۱۰۳۶ - ۱۰۳۷ھ) تک کے حالات؛ (۴) تمہیدی حصہ جو معراج النبی سے شروع ہو کر شاھجہان کی ولادت تک کے حالات پر مشتمل ہے؛ (۵) وصف کشمیر .

مثنوی پادشاھنامہ کا نام سپرنگر کی اودھ کیٹلاگ، ص ۳۵۴ پر شاھنشاہ نامہ کلیم لکھا ہے، نیز دیکھیے میونخ کیٹلاگ، ص ۹۳ - حسین پرتو بیضائی نے لکھا ہے کہ یہ مثنوی ایران کے کتابخانہ ملی میں موجود ہے - اس میں تقریباً ۱۵ ہزار اشعار ہیں (دیوان کلیم، مقدمہ، طبع چاپخانۂ حیدری، ایران ۱۳۳۶ ش، ص ید) .

ان دو ضخیم مثنویوں کے علاوہ کلیم نے کچھ مختصر مثنویاں بھی لکھی ہیں جن کا ذکر ذیل میں آتا ہے .

"تعریف اکبر آباد" : کلیم اکبر آباد (آگرہ) میں بھی رہا تھا، چنانچہ اکبر آباد کی تعریف میں مثنوی لکھی، اس میں بتایا ہے کہ وہاں کی گلیاں پر پیچ ہیں، آبادی گنجان ہے، عمارتیں سنگ خارا کی بنی ہوئی ہیں، پتھر کی ہر ہر سل میں فن کاروں کی مہارت نمایاں ہے - معماروں کے تیشوں نے ایسے ایسے نقش کندہ کیے ہیں کہ گلی کوچے مانی کے نقش ارژنگ کا عکس معلوم ہوتے ہیں - ہر عمارت کے دروازے کا ستون ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پاؤں کے بل روح فرہاد کھڑی ہے :

بپای ہر بنای اکبر آباد
بیک پا ایستادہ روح فرہاد

اس مثنوی میں مقامی ماحول کی عکاسی خوب کی ہے - پیشہ وروں کے سلسلے میں مہاجن، بزاز، عطار، صراف، پان فروش، خیاط اور دھوبی کا تفصیل سے ذکر آیا ہے ایک پان فروش کے متعلق لکھا ہے :

قرارے نیست بر اقرار ایشان
ورق گرداندن آمد کار ایشان

کلیم برصغیر کے لوگوں کی مہمانداری سے متاثر نظر آتا ہے چنانچہ اسے بھی موضوع سخن بنایا ہے - دربار سے تعلق کی بنا پر کلیم نے ایسے حالات بھی لکھے ہیں جن سے اس دور کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے .

"باغ جہان آرا" : یہ مثنوی شاھزادی جہان آرا کے باغ اور محل کی تعریف میں لکھی ہے - کچھ اس طرح ذکر آیا ہے کہ یہ محل حسن و زیبائی میں ارجمند لوگوں کے نصیبے جیسا اور بلندی میں بلند فطرت لوگوں کے رفعت خیال کے مانند ہے - اس میں پتھر جو لگایا گیا ہے، آئینے کے مانند تابناک اور شفاف ہے، خوشبودار پودوں کا عکس ان میں جھلکتا نظر آتا ہے گویا یہ فردوس کا کوئی ایک محل ہے، اس کے تین طرف باغ ہے اور سامنے دریا بہتا ہے، جس کی ہر ہر موج خم زلف محبوب کی طرح دلکش اور فرحت زا ہے .

کشمیر کا باغ "فرح بخش" : شاھجہان کے باغات سے اس عہد کے ذوق نفاست اور احساس تناسب کا پتا چلتا ہے - لاہور کی طرح اس نے کشمیر میں بھی شالامار باغ بنوایا تھا جس کا نام بعد میں باغ فرح بخش رکھا گیا تھا - باغ فرح بخش میں کلیم نے یہاں کے چناروں، شاہ نہر اور روشوں کی عملی تصویر کشی کی ہے .

"قحط دکن" : نظام الملک کے عہد میں دکن میں خشک سالی کی وجہ سے شدید قحط پڑا، جس

www.besturdubooks.wordpress.com

کی وجہ سے بہت سے لوگ فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے ۔ ساتھ ہی وبا بھی پھوٹ پڑی ۔ اس سلسلے میں کلیم نے اہل دکن کے مصائب کی تفصیل ایک مثنوی میں بڑے درد انگیز انداز میں پیش کی ہے ۔

"تعریف جنگ نیل" : شاہزادہ اورنگ زیب کی ہاتھی سے جنگ مشہور تاریخی واقعہ ہے، کلیم نے اس لڑائی کو بچشم خود دیکھا تھا چنانچہ اس مثنوی میں اس کی جزئیات بڑی خوبی سے پیش کی ہیں ۔

ان کے علاوہ بعض اور مثنویاں (دولت خانۂ اکبر آباد، دولت خانۂ پادشاہی، صعوبت راہ کشمیر وغیرہ) بھی لکھیں ۔

شاہجہانی دور کے آثار جو آج بھی قائم ہیں اور ایک خاص تہذیبی دور کے آئینہ دار ہیں، ان کا عکس کلیم کی مثنویوں میں نمایاں ہے ۔ مختصر مثنویوں میں کلیم کی ایک یہ خصوصیت بھی نظر آتی ہے کہ اس نے ہندی الفاظ کا اس طرح استعمال کیا ہے کہ فارسی کے جملوں میں وہ بالکل قدرتی اور مانوس معلوم ہونے لگتے ہیں ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عرفی عمر بھر ہندوستان میں رہا، لیکن صرف ایک ہندی لفظ "جھکڑ" زبان سے نکلا، وہ بھی اس طرح کہ گویا یہ فارسی ہی کا لفظ ہے ۔ طالب آملی نے جہانگیر کا صرف ایک ایجاد کردہ لفظ "رام رنگی" ایک شعر میں باندھا، لیکن کلیم نے یہاں ہند کے بعض پیشہ ورانہ الفاظ کو اپنا کر شعروں میں اس طرح استعمال کیا کہ غرابت و ثقل کا احساس بہت کم ہوتا ہے ۔ جو ہندی الفاظ اس کی زبان و قلم پر آئے ہیں، گویا یہ فارسی ہی کے الفاظ ہیں، مثلاً مہاجن، تنبولی (پان فروش)، دھوبی، جہل پٹھانی، چنبہ، گڑھل، نیم، کیوڑہ، بیڑی، پان، کٹارہ، ابری وغیرہ ۔

شبلی نے لکھا ہے کہ کلیم کی مثنویاں کم رتبہ اور عامیانہ ہیں (شعر العجم : مطبوعۂ لکھنؤ، ۳ : ۲۱۰)، لیکن اس رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے ۔ کلیم کی مثنویوں کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ ان کے ذریعے زمانے کی تاریخ و ثقافت کے بعض پہلو ہمارے سامنے آئے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ادبی پیش کش کے طور پر بھی وہ بہت اچھی نہ سہی، بری بھی نہیں ۔

کلیم نے بعض قطعات بھی لکھے ہیں جو شاہی یادگاروں پر درج ہیں، ان میں سے ایک قطعہ شاہجہان کے زمانے کی ایک اہم یادگار "مرقع گلشن" ہے، جسے مرقع شاہجہانی بھی کہتے ہیں ۔ اس کا شمار بر صغیر کے ان نفائس میں ہوتا ہے، جنھیں نادر شاہ افشار حملۂ دہلی کے بعد ایران لے گیا تھا ۔ اب یہ مرقع "موزۂ سلطنتی" میں محفوظ ہے (سفر ایران کے دوران میں راقم الحروف کو یہ مرقع دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس میں ایران و ہند کے بادشاہوں، مغل شاہزادوں، شاہزادیوں، عالموں اور فن کاروں کی تصویریں ہیں، جو محمد فقیر اللہ، میر محمد ہاشم، نادر سمرقندی اور دوسرے نامور مصوروں کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں ۔ تصویریں بڑی جاذب نظر ہیں، تصویروں کے ارد گرد منقش اور طلائی حاشیوں پر بعض لکیریں اتنی باریک ہیں کہ محدب شیشوں ہی کے ذریعے دیکھی جا سکتی ہیں ۔ انسانی تصویروں میں اعضائے جسمانی، اسلحہ و پوشاک کی جزئیات، کمال مہارت سے نمایاں کی گئی ہیں ۔ تصویروں کے علاوہ نامور خطاطوں کی تحریروں کے نمونے بھی ہیں) ۔ اس کی تعریف میں کلیم نے دو قطعے لکھے ہیں ۔ ایک قطعے کا آخری شعر یہ ہے :

چندین ہزار نقش بدیع انتخاب کرد
دوران کہ شد مرقع شاہ جہانش نام

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

دوسرے قطعے کے دو شعروں سے پتا چلتا ہے کہ مرقع گلشن کا آغاز جنت مکانی جہانگیر کے عہد میں ہوا اور تکمیل صاحبقران ثانی شاہ جہان کے عہد میں ہوئی۔

فرمائشی اشعار کہنے میں کلیم کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ کوئی شاہی محل یا کسی امیر کبیر کی عمارت مکمل ہوتی، سراپردہ تیار ہوتا، سیرشاہی بن کر آتی، کوئی قلمدان یا مجلد کتاب بادشاہ کے حضور پیش ہوتی، تو کلیم کو کتبہ لکھنے کی فرمائش ہوتی اور سرخوش کے بیان کے مطابق سب شاہی اشیا پر اس کے اشعار کندہ کیے جاتے یا لکھے جاتے (کلمات الشعرا، لاہور ۱۹۴۲ء، ص ۹۴)، فرمائشی اشعار لکھنے پر شاہجہان نے اسے دوبار سونے میں تلوایا (کتاب مذکور، حاشیہ ۹۴)۔

مادّۂ تاریخ نکالنے میں کلیم کو بڑی مہارت تھی، اس کی تاریخوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں بعض اہم تاریخی اور تہذیبی آثار پر روشنی ڈالتی ہیں۔ چند تاریخیں پیش ہیں:

دارا شکوہ کی ولادت: گل اولین گلستان شاہی (۱۰۲۴ھ)

شکارگاہ کی تکمیل: صید گاہِ نشاط و مسکن عیش (۱۰۴۶ھ)

کشمیر کی شاہی عمارت:

راحت آباد اہل عرفان (۱۰۵۴ھ)

وفات ملک قمی:

بگفتا "او سر اہل سخن بود" (۱۰۲۵ھ)

اورنگ زیب کی شادی کی تاریخ:

دو گوہر بیک عقد دوزان کشیدہ (۱۰۴۷ھ)

کلیم کی غزلیات میں ہمیں وہی طرز ادا اور انداز فکر نظر آتا ہے جو اکبر اعظم کے دور کی شاعری کا خاصّہ ہے۔ یہ فکر و فلسفہ کا دور تھا جس سے شعرا کا متاثر ہونا قدرتی بات تھی، لیکن اس کے لیے پر پیچ خیال انگیزی یا دقت و ابہام کی کوئی تخصیص نہیں جیسا کہ ملک الشعرا بہار کا خیال ہے (سبک شناسی، ۳: ۲۵۹، ۲۶۶، نیز شہابی: روابط)۔ بہر حال فلسفیانہ موضوع اور فلسفیانہ توجیہات کا جو انداز بیان انھوں نے اختیار کیا وہ سادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس خاص اسلوب کی نشاندہی کلیم کے کلام میں بھی ہوتی ہے۔ فلسفیانہ افکار اور انداز بیان کے علاوہ انھوں نے شاعرانہ تجسیم سے بھی کام لیا۔ چنانچہ انھوں نے اکثر وجدانی تاثرات کو مادّی شکل میں پیش کیا۔ یہ خصوصیت شاہجہانی دور کے شاعروں کے کلام میں بھی نظر آتی ہے، جس کی بہت واضح مثالیں کلیم کے اشعار میں ملتی ہیں، مثلاً:

ماز آغاز و ز انجام جہان ہیچ خبریم
اوّل و آخر ایں کہنہ کتاب افتادہ است

کائنات کو مجسم صورت میں پیش کرنے کے لیے کلیم نے اسے "کتاب" کہا اور کائنات کے آغاز و انجام سے بے خبر ہونے کی کیفیت اس طرح ظاہر کی کہ اس کے شروع اور آخر کے صفحات موجود نہیں۔ یہ شعر فلسفیانہ فکر کے علاوہ تجسیم کی بھی عمدہ مثال ہے۔

قوت تخیل بھی برصغیر کے اسلوب کا خاصّہ ہے۔ کلیم کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مناظر عالم کی ایک ایک چیز پر اس کی نظر ہے اور اس کی قوت تخیل سے یہ مناظر نئے نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتے ہیں، مثلاً

بعد ازیں تاریکی شب‌ہا بخود خوش کن کلیم
شکوہ کم کن در چراغ اختران روغن نماند

کلیم اور اس کے ہم عصر شعرا نے اس اسلوب خاص کی پیروی تو کی لیکن رفتہ رفتہ فلسفیانہ توجیہات کی جگہ واقعیت نے لے لی اور مقامی

www.besturdubooks.wordpress.com

تہذیب و ثقافت واقعیت کے آئینے میں جھلکنے لگی ۔ انداز بیان صاف اور سادہ ہو گیا ۔ اس اسلوب کو "تازہ گوئی" کہا گیا، چنانچہ جہانگیر اور شاھجہان کے دور کے شعرا کا طرۂ امتیاز بھی تازہ گوئی ھی ھے ۔ کلیم نے بھی قبول عام کی سند حاصل کرنے کے لیے تازہ گوئی کو شعار بنایا ۔

کز متاع سخن امروز کساد است کلیم
تازہ کن طرز کہ در چشم خریدار آید

کلیم کی شاعری میں مثالیہ نگاری بہت نمایاں ھے ۔ مثالیہ شاعری کی ضرورت کسی بلند تر حقیقت کو واضح کرنے کے لیے محسوس ہوئی، اس لیے شعرائے قدیم نے مثال و حکایت کا سہارا لیا چنانچہ اسے مثالیہ شاعری کہا گیا، پھر رفتہ رفتہ ایسا ھی ہوا کہ تمثیل سمٹ کر ایک شعر میں محدود ہو گئی ۔ اس قسم کے تمثیل نگار صائب اور کلیم تھے ۔ کلیم نے شعری تمثیل کے فن کو خاص طور سے بہت ترقی دی ۔ اس کی خصوصیت یہ ھے کہ شعر کے پہلے مصرع میں وہ کوئی حقیقت یا دعوی پیش کرتا ھے، پھر دوسرے مصرع میں مثال دے کر دعوے کو ثابت کرتا ھے مثلاً :

قطع امید کردہ نخواھد نعیم دھر
شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

دعوی یہ ھے کہ جو شخص بالکل نا امید ہو جاتا ھے ، دنیوی نعمتوں کا خیال اسے نہیں آتا ۔ اس کا استدلال یوں کیا ھے کہ درخت سے جو شاخ کٹ جاتی ھے، وہ امید بہار کی منتظر نہیں رھتی ۔ کلیم کی غزلیات اور مثنویوں میں ترکیبیں بہت سلجھی ہوئی ھیں، محاورے بڑے برجستہ استعمال کیے ھیں اور انداز بیان میں بہت روانی ھے ۔

شعرا کے ایرانی تذکروں پر نظر ڈالیں تو ایسا معلوم ہوتا ھے کہ جونہیں کسی ایرانی الاصل شاعر نے سر زمین ایران کو خیر باد کہا تو تذکرہ نویسوں نے انھیں ایرانی شعرا کی ردیف سے خارج کر دیا ۔ یہاں تک کہ عرفی، نظیری، صائب، قدسی ایسے شعرا کا نام کے سوا کوئی ذکر نہیں کیا ۔ کلیم کے متعلق رضا زادہ شفق نے صرف دو چار سطروں میں اس کا ذکر کر دینا کافی سمجھا ھے ۔ دیگر معاصرین نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا البتہ مغل بادشاہ محمد شاہ کے زمانے کے ایک ایرانی تذکرہ نویس علی قلی والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ (ریاض الشعراء، قلمی ، کتابخانہ دانشگاہ پنجاب، شمارہ PFI ۱۷) میں اس کے حالات زندگی اور اس کی مثنویوں اور غزلیات کا انتخاب بھی دیا ھے (ورق ۱۶۶ ب تا ۱۷۵ الف) اس کے علاوہ تذکرۂ نصر آبادی میں بھی کلیم کا مختصر سا ذکر آیا ھے جس کے راقم الحروف نے حوالے دیے ھیں ۔

مآخذ : (۱) عبدالحمید : بادشاہ نامہ، کلکتہ ۱۸۷۲ء، ۱ : ۳۵۳ تا ۳۵۶ : (۲) احمد علی سندیلوی : تذکرۂ مخزن الغرائب، طبع محمد باقر، مطبوعۂ دانشگاہ پنجاب لاھور؛ (۳) میرزا محمد طاھر : تذکرۂ نصر آبادی، تہران ۱۳۱۷ھ؛ (۴) محمد افضل سرخوش : کلمات الشعراء، مطبوعۂ لاھور؛ (۵) شیر خان لودھی : مرآۃ الخیال بمبئی ۱۳۲۴ھ؛ (۶) علی قلی والہ داغستانی : ریاض الشعراء، قلمی، کتاب خانۂ دانشگاہ پنجاب، لاھور ، شمارہ PFI ۱۷؛ (۷) لطف علی بیگ آذر : آتشکدۂ آذر، ایران ۱۳۳۷ ش، بمدد اشاریہ؛ (۸) شبلی نعمانی: شعرالعجم، مطبوعۂ لکھنؤ، ۳ : ۲۰۵ تا ۲۳۰؛ (۹) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ھند، ج ۴، فارسی ادب طبع مقبول بیگ بدخشانی، شائع کردۂ دانشگاہ پنجاب، لاھور ۱۹۷۱ء؛ (۱۰) ریو : *Catalogue of the persian Mss in the British Museum*؛ (۱۱) Ethe : *catalogue of the Persian Mss in the Liberary of India Office*؛ (۲۱) شپرنگر : *A Catalogue of the Mss.....of The Libraries of the Kings of Oudh.* [یہ مقالہ مقبول بیگ بدخشانی

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

نے لکھا].

[ادارہ]

* **کلیمُ اللہ** : حضرت موسٰی علیہ السلام کا مخصوص اعزازی لقب، جس کے معنی ہیں اللہ تعالٰی سے باتیں کرنے والا، بقول الازہری (تہذیب) وہ شخص جس سے اللہ تعالٰی نے باتیں کیں (لسان العرب، بذیل مادّہ) ۔ اس لقب کی بنیاد قرآن مجید کی ان آیات پر ہے جن میں اللہ تعالٰی اور موسٰی علیہ السلام کے درمیان بلا واسطہ باتیں کرنے کا ذکر ہے، بالخصوص : وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا (۴ [النساء] : ۱۶۴)، یعنی اللہ نے موسٰی سے باتیں بھی کیں ۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں مصدر (مفعول مطلق) کے اضافے کا مطلب یہ ہے کہ کلام سے اس جگہ بلا واسطہ کلام مراد ہے اور کلام کے معنی حقیقی ہیں، نہ کہ مجازی (لسان العرب ۱۵ : ۴۲۹، س ۳ بعد ؛ الاشعری : الابانۃ، حیدر آباد (لیز دیکھیے ۲ [البقرۃ] : ۲۵۳؛ ۷ [الاعراف] : ۱۴۳ :) ان آیات میں ہر جگہ یہی تصریح ہے کہ اللہ تعالٰی نے موسٰی علیہ السلام سے کلام کیا اور غالبًا یہی وجہ ہے کہ تہذیب (۱ : ۱۳۰، س ۹) نے کلیم کے جو معنی بیان کیے ہیں ان میں وسعت پیدا ہو گئی ہے .

امام البیضاوی نے حضرت موسٰیؑ کے اعزازی لقب کلیم کو بمعنی مُکالم قرار دیا ہے دیکھیے اس کا ایک ہم معنی لقب جو موسٰی علیہ السلام کے لیے آیا ہے، نَجِیّ ہے : وَ نَادَیْنٰہُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَیْمَنِ وَ قَرَّبْنٰہُ نَجِیًّا (۱۹ [مریم] : ۵۲)، یعنی ہم نے موسٰی کو طور کی داہنی جانب سے آواز دی اور انہیں راز کی باتیں کرنے کے لیے نزدیک بلایا ۔ اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے امام البیضاوی نے نَجی کو مُنَاجی کے مساوی قرار دیا ہے .

مآخذ : [(۱) قرآن مجید؛ (۲) تفاسیر قرآن بذیل آیات مذکورہ، در متن؛ (۳) لسان العرب، بذیل مادّہ؛ (۴) کتب متعلقہ قصص القرآن و قصص الانبیاء]؛ (۵) Goldziher : *Die Richtungen der islamischen Koranauslegung*، ص ۱۷۴؛ (۶) Dozy : *Supplément*، ۲ : ۴۸۶ ب .

(D. B. MACDONALD)

(شاہ) کلیم اللہ جہاں آبادی : بن نور اللہ * بن احمد المعمار الصدیقی، اپنے زمانے کے سر برآوردہ چشتی بزرگ ۔ جب اسلامی معاشرہ بری طرح بد نظمی کا شکار ہو چکا تھا تو انھوں نے برصغیر پاک و ہند میں سلسلۂ چشتیہ کا احیا کیا ۔ وہ شاہجہاں آباد (دہلی) میں ۲۴ جمادی الآخرۃ ۱۰۶۰ھ/۲۴ جون ۱۶۵۰ء کو اورنگ زیب کی تخت نشینی سے آٹھ سال پہلے پیدا ہوئے ۔ اسی لیے ان کی نسبت شاہجہاں آبادی ہے ۔ ان کے آباء اجداد جو پیشے کے لحاظ سے معمار تھے، اصلًا خجند [رک بآں] کے باشندے تھے ۔ ان کے باپ دادا دونوں نے مشہور و معروف لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی کی تعمیر میں نمایاں کردار انجام دیا تھا ۔ آیات قرآنی اور اسماء الحسنٰی [رک بآں] سے متعلق بہت سے کتبات جن سے جامع مسجد کی زینت و آرائش ہوئی ہے، ان کے والد، استاذ نور اللہ کے لکھے ہوئے ہیں ۔ انھوں نے تکمیل تعلیم مقامی علما اور فضلا سے کی جن میں شاہ ولی اللہ دہلوی [رک بآں] کے چچا ابو الرضا محمّد بھی شامل ہیں ۔ آشیخ ابو الرضا اپنے زمانے کے جید عالم تھے ۔ علوم عقلی و نقلی پر کامل عبور تھا ۔ درس و تدریس کے علاوہ نماز جمعہ کے بعد وعظ کہتے تھے ۔ وعظ میں بڑی تأثیر تھی ۔ طبیعت کا زیادہ رجحان تصوف کی طرف تھا اور وحدت الوجود کے قائل تھے] ۔ حصول تعلیم کے بعد شاہ کلیم اللہ

www.besturdubooks.wordpress.com

جہاں آبادی حج بیت اللہ اور زیارات کے لیے حجاز مقدس گئے اور وہاں بہت عرصے تک ٹھیرے رہے۔ سلسلۂ چشتیہ میں انھوں نے شیخ یحیٰی بن محمود الگجراتی (م ۱۰۰۱ھ/۱۶۸۹ء) کے ہاتھ پر بیعت کی جو ہجرت کرکے مدینۂ منورہ چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ [شیخ یحیٰی مدنی سے انھوں نے شرح وقایہ کا درس بھی لیا]۔ نزہۃ الخواطر (۶ : ۱ تا ۲۴۰) کے بیان کے مطابق حجاز رہتے ہوئے شاہ کلیم اللہ نے میر محترم اور شیخ محمد غیاث کے ذریعے نقشبندی اور قادری سلسلوں میں بھی نسبت حاصل کی۔

دہلی واپسی پر وہ ایک مسجد میں قیام پذیر ہوئے جو لال قلعے اور جامع مسجد کے درمیان اس محلے میں واقع تھی جسے بازار خانم کہا جاتا تھا۔ یہاں انھوں نے سلسلۂ درس و تدریس شروع کیا [بازار خانم اس وقت دہلی کا سب سے زیادہ بارونق بازار تھا جس جگہ انھوں نے اپنا مسکن بنایا وہ غالباً ان کے خاندان کو شاہجہان نے عطا کی تھی]۔ مدرسے کی شہرت کے باعث طلبہ بڑی تعداد میں دور دور سے آتے تھے۔ کھانے اور رہنے کا مفت انتظام تھا۔ مدرسے کے متعلق تفصیلی معلومات دستیاب نہیں۔ شاہ کلیم اللہ کو حدیث کے درس میں خاص دلچسپی تھی۔ ایک مرتبہ صوفی شاعر مرزا مظہر جان جاناں ملاقات کے لیے گئے تو شاہ صاحب اپنے شاگردوں کو صحیح بخاری کا درس دینے میں مشغول تھے۔ مدرسہ شاید اس مسجد کا ایک حصہ تھا جس میں انھوں نے قیام کیا تھا۔ مرزا محمد اختر گورگانی کے بیان (تذکرۃ الاولیائے ہند و پاکستان، لاہور ۱۹۵۴ء، ۲ : ۲۷۲) کے مطابق بعد میں اورنگ زیب نے حکم دیا کہ شاہ صاحب کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کی جائے جس کے ساتھ چند اور عمارات بھی شامل تھیں جن میں عبادت خانہ، مجلس خانہ اور لنگر خانے کے علاوہ اہل و عیال کے رہنے کے لیے مکانات بھی تھے۔ مرزا محمد اختر نے اس بات کا بھی اضافہ کیا ہے کہ شہنشاہ محمد معظم بہادر شاہ اوّل [رک بآں] اپنی حکومت کے چوتھے سال (۱۱۲۳ھ/۱۷۱۱ء) میں جب کہ وہ باغی سکھوں کے سرغنہ بندہ بیراگی کے خلاف ایک مہم میں مصروف تھا، شاہ کلیم اللہ کا مرید بنا۔ شاہ صاحب سادگی اور توکل کی زندگی بسر کرتے تھے۔ معتقدین اور مریدوں کی طرف سے فتوحات بھی آ جاتی تھیں، لیکن خلیق احمد نظامی تاریخ مشائخ چشت (ص ۷ تا ۳۸۶) میں تکملۂ سیر الاولیاء کے حوالے سے لکھتا ہے کہ گزر اوقات زیادہ تر حویلی کے اس کرائے پر تھی جو حویلی کے ایک حصے سے حاصل ہوتا تھا۔ فرخ سیر [رک بآں] نے اپنے مختصر، مگر ہنگامہ خیز دور میں شاہ صاحب کی تنگ دستی کا حال معلوم کرکے انھیں مالی امداد کی بارہا پیشکش کی، مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا [اس نے حاضر ہونا چاہا، لیکن انھوں نے کہا یہ بات ہمارے لیے تصدیع کا موجب بنے گی۔ نماز جمعہ جامع مسجد میں پڑھتے تھے۔ وہاں بادشاہ بھی ہوتا تھا، مگر اجازت کے بغیر بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی]۔

شاہ صاحب اپنے مریدوں کو حکمرانوں اور بادشاہوں کے قرب سے روکتے تھے اور نصیحت کیا کرتے تھے کہ ان کے پاس نہ جایا کریں اور ان سے ملاقات نہ کیا کریں۔ اگرچہ سماع سے وہ خود روحانی غذا حاصل کیا کرتے تھے، لیکن ان ایام میں سماع میں ہائے وہو کا جس طرح رواج پڑ چکا تھا، اسے وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ اپنے ایک مکتوب (نمبر ۱۱۰) میں وہ ناپختہ اور مصنوعی صوفیہ کی شد و مد سے ملامت کرتے ہیں، انھیں

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ملحد قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں انھوں نے شریعت کو ترک کر دیا ہے۔ وہ غیر مسلموں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے کے حق میں تھے تاکہ اس طرح وہ لوگ اسلامی تعلیمات کا اثر قبول کر سکیں۔ اسی طرح شاہ صاحب عوام کی صحبت سے ہرگز متنفر نہیں تھے، بلکہ اسے پسند کرتے تھے۔ [وہ حلیم الطبع اور خوش مزاج انسان تھے۔ دشمنوں اور مخالفوں سے بھی کبھی ناراض نہ ہوتے تھے اور حسن اخلاق سے دلوں میں جگہ کرنا ان کا کام تھا]۔ وہ وحدت الوجود جیسے پیچیدہ مسئلے پر اندھا دھند بحث مباحثے کے سخت خلاف تھے۔ زندگی بھر وہ اعلائے کلمۃ الحق اور اسلام حقیقی، کی اشاعت کے لیے جد و جہد کرتے رہے۔ [ان کی اس تحریک احیا کا یہ نتیجہ نکلا کہ دکن میں اسلام کی بڑی تبلیغ ہوئی اور بالخصوص پنجاب، بہاولپور اور سرحد میں ان کے سلسلے کے بعد میں آنے والے بزرگوں خواجہ نور محمد مہاروی، قاضی محمد عاقل، خواجہ محمد سلیمان تونسوی، خواجہ شمس الدین سیالوی، خواجہ غلام حیدر شاہ جلالپوری اور پیر مہر علی شاہ گولڑوی [رکّ بآں] کی مساعی کی بدولت اسلام کو نئی زندگی نصیب ہوئی]۔

شاہ صاحب لمبی عمر پا کر دہلی میں ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ/۱۷ اکتوبر ۱۷۲۹ء کو فوت ہوئے اور اپنی خانقاہ کے صحن میں دفن ہوئے جہاں آپ کے سکونتی مکانات بھی تھے۔ ان کے سال وصال میں اختلاف ہے۔ نزھۃ الخواطر (۶ : ۲۳۱) میں ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء اور ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء بتایا گیا ہے۔ سواء السبیل کے ضمیمے (ص ۱۳۹) میں ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء اور غلام علی آزاد بلگرامی کی مآثرالکرام (حیدر آباد دکن ۱۹۱۰ء، ۱ : ۴۲) میں ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء درج ہے۔ چونکہ بہت سے مصنفین کا اس پر اتفاق ہے اس لیے ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء کا سال وثوق سے اختیار کر لیا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد وہ تمام محلہ جہاں ان کی خانقاہ واقع تھی، برطانوی فوج نے ملیامیٹ کر دیا، البتہ ان کی قبر باقی رہنے دی گئی تھی جو بدستور شکستہ حالت میں رہی اور اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی، تا آنکہ کوئی چالیس سال بعد [مذکورۂ بالا قاضی محمد عاقل کی اولاد میں سے] خواجہ غلام فرید نے جو نواب بہاول پور [رکّ بآں] کے مرشد طریقت تھے، اس کی تعمیر نو کے لیے معتدبہ رقم دی۔ شاہ صاحب کے ورثا میں سے ایک نے بعد میں اس کی مرمت کرائی اور اسے از سر نو تعمیر کرایا۔ سنگتراشی کرکے قبر کے اردگرد خوبصورت کٹہرا بنوایا گیا اور سنگ مرمر کی سلوں سے فرش بچھایا گیا۔ ان کا مقبرہ ابھی تک موجود ہے اور لال قلعے اور جامع مسجد کے درمیان تنہا یہی عمارت ہے۔ ہر سال ان کا عرس منایا جاتا ہے۔ دہلی کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر [رکّ بآں] اور شاہزادگان اس میں باقاعدگی سے شریک ہوا کرتے تھے۔

شاہ صاحب کے خلیفۂ اعظم حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادی تھے، جنھیں تصوف کے مسائل کے متعلق انھوں نے بہت سے خطوط لکھے تھے۔ شاہ صاحب کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں، لیکن ان کی وفات کے وقت تینوں بیٹے نابالغ تھے۔

[مناقب فریدی میں شاہ صاحب کی تصانیف کی تعداد ۳۲ بتائی گئی ہے۔ ان میں سے قرآن القرآن، عشرۃ کاملۃ، سواء السبیل، کشکول، مرقع، تسنیم، الہامات کلیمی، رسالۂ تشریح الافلاک عاملی محشی بالفارسیہ اور شرح القالون دستیاب ہیں۔ ان سے ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعض کتابوں میں ان کی ایک تصنیف رد روافض

www.besturdubooks.wordpress.com

کا بھی ذکر ہے۔ مناقب المحبوبین میں لکھا ہے کہ علم منطق پر بھی ان کا ایک رسالہ تھا۔ اردوے معلّٰی میں حکیم سیّد احمد حسن مودودی کے نام اسد اللہ خان غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب شعر بھی کہتے تھے اور ان کا کلام ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے دوران میں تلف ہو گیا تھا۔

قرآن القرآن عربی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر ہے جسے جلالین کے ہم پایہ بتایا گیا ہے۔ [و اللہ اعلم] فرق صرف یہ ہے کہ وہ شافعی مذہب کی ہے اور یہ حنفی کی۔ ۱۲۹۰ھ میں مطبع احباب میرٹھ سے یہ اس طرح شائع ہوئی کہ حاشیے پر اس کا متن تھا اور آیات قرآنی کے نیچے شاہ رفیع الدّین کا ترجمہ تھا۔ مولانا محمّد قاسم نانوتوی ؒ نے تاریخ کہی تھی۔ عشرۂ کاملۃ، سواء السبیل، کشکول اور مرقع طبع ہو چکی ہیں۔ یہ چاروں کتابیں اور تسنیم اور الہامات کلیمی تصوف سے متعلق ہیں۔ عشرۂ کاملۃ عربی میں ہے اور اس میں تصوف کے دس مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ کشکول کا سال تصنیف ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء ہے۔ صوفیۂ متأخرین کا یہ دستور العمل رہا ہے کہ خرقۂ خلافت دیتے ہوئے یہ کتاب اور مرقع ساتھ دیا کرتے تھے۔ تسنیم کو بھی صوفیہ نے بہت پسند کیا۔ قاضی محمّد عاقل اس کا درس دیا کرتے تھے۔ رسالۂ تشریح الافلاک عاملی کی شرح علم ہیئت سے متعلق ہے، جس کا ایک نسخہ نذیریہ پبلک لائبریری دہلی میں موجود ہے۔ شرح القانون کا واحد نسخہ رامپور کے کتابخانے میں ہے۔

ان تصانیف کے علاوہ ۱۳۲، مکتوب بھی شاہ صاحب کی یادگار ہیں جو مکتوب کلیمی کے نام سے طبع ہو چکے ہیں۔ مسائل تصوف کے علاوہ ان سے شاہ صاحب کی تبلیغی سرگرمیوں کا پتا چلتا ہے۔ ان میں سے بعض خطوط شاہ نظام الدّین اورنگ آبادی کے علاوہ دیگر لوگوں کے نام ہیں]۔

مآخذ: (۱) غلام سرور لاہوری: خزینۃ الاصفیاء، کانپور ۱۹۱۴ء، ۱: ۴۹۴ تا ۴۹۵؛ (۲) محمّد حسین مراد آبادی: انوار العارفین، بریلی ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء، ص ۴۲۹ تا ۴۳۰؛ (۳) کل محمّد احمد پوری: تکملۂ سیر الاولیاء، دہلی ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء، ص ۷۹ تا ۸۵؛ (۴) نجم الدّین: مناقب المحبوبین، رام پور ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء، ص ۴۵ تا ۴۶؛ (۵) آزاد بلگرامی: مآثر الکرام، حیدر آباد ۱۹۱۰ء، ۱: ۴۲؛ (۶) احمد اختر مرزا: مناقب فریدی، دہلی ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء، ص ۳۴؛ (۷) وہی مصنف: تذکرۃ الاولیاء ہند و پاکستان، لاہور ۱۹۵۴ء، ۲: ۲۷۱ تا ۲۷۲؛ (۸) رحمٰن علی: تذکرۂ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۸۹۴ء، ص ۱۷۲، اردو ترجمہ از ایوب قادری، کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۳۹۷ تا ۴۸۹؛ (۹) فقیر محمّد: حدائق الحنفیہ، لکھنؤ ۱۹۱۴ء، ص ۴۸۳ تا ۴۸۹؛ (۱۰) زین العابدین: تذکرۃ المعین فی ذکر الکاملین، بریلی ۱۸۹۰ء، ص ۱۴۲ تا ۱۴۳؛ (۱۱) بشیر الدّین احمد: واقعات دارالحکومت دہلی، آگرہ ۱۹۰۹ء، ۳: ۱۱۶ تا ۱۱۷؛ (۱۲) سیّد احمد ولی اللّٰہی: یادگار دہلی، مطبوعۂ دہلی، ص ۴۳؛ (۱۳) خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت، دہلی ۱۹۵۳ء، ص ۲۳۱، ۲۳۲، ۳۶۶ تا ۴۲۶؛ (۱۴) عبدالقادر: واقعات عبدالقادر خانی، (اردو ترجمہ بعنوان علم و عمل از ایوب قادری، کراچی ۱۹۶۰ء، ۱: ۲۲۲)؛ (۱۵) مکتوبات کلیمی، دہلی ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء؛ (۱۶) *List of Muhammadan and Hindu Monuments*، کلکتہ، ۱۹۱۹ء، ۱: ۱۵۰ (شاہ صاحب کے مقبرے کی عمارت کی تفصیلات)؛ (۱۷) عبدالحی لکھنوی: نزھۃ الخواطر، حیدر آباد ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۸ء، ۶: ۲۴۰ تا ۲۴۱۔

(اے۔ ایس بزمی انصاری و [ادارہ])

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

⊗ **اَلْکُلَیْنِی** : ابو جعفر محمّد بن یعقوب رازی کلینی ۔ اَلْکُلَیْنِی کُلَیْن کے رہنے والے تھے، کُلَیْن، رَے کا قصبہ یا قریہ ہے، (بار ٹولڈ، ترجمۂ حمزہ سردار : جغرافیۂ ایران، ص ۱۷۹، تہران) ۔

رَے ابتدائی دورِ اسلام میں فتح ہوا اور بنی امیّہ کے عہد تک والی کا صدر مقام رہا ۔ بنو عباس کے خلیفہ منصور نے اس پر مزید توجہ کی ۔ اس کا فرزند مہدی رے آیا اور اس نے اس شہر میں محل، باغ، مسجد اور حصار بنوائے ۔ ۱۸۸ھ میں جریر بن عبدالحمید الحافظ یہاں قیام پذیر رہے ۔ خلیفہ ہارون الرّشید یہاں پیدا ہوا ۔ امام محمّد بن حسن شیبانی رے میں فوت ہوئے ۔ ۱۹۲ھ میں قراءت و لغت میں نحو کے امام النسائیؒ یہاں دفن ہوئے ۔ ۲۵۱ھ میں محمّد بن زکریا رازی یہاں پیدا ہوئے (لارڈ کرزن، ترجمہ علی جواہر کلام : ایران، ص ۴۶) ۔

رے کے قریب شاہراہ قم سے مشرق کی سمت پانچ کیلومیٹر کے فاصلے پر "کُلَیْن" نامی قصبہ واقع ہے جو ابو جعفر محمّد بن یعقوب کا وطن تھا ۔ فرہنگ جغرافیائی ایران، ۱ : ۳۰۳؛ کُلَیْن بر وزن زُبَیْر، تہرانی و رازی عوام کا تلفظ ہے ۔ مجدالدّین فیروز آبادی، محمّد مرتضٰی الزبیدی، اور دوسرے حضرات کے مابین اس کے تلفظ میں جو اختلاف ہے اس کا سبب مختلف علاقوں کے عوامی تلفظ ہیں ۔ (مقدمۃ الکافی، ص ۴؛ جنۃ النعیم، ص ۵۱۵) ۔ [ابن الأثیر نے کُلَیْن (بضم الکاف و کسر اللام) تحریر کیا ہے (اللباب فی تہذیب الانساب، ۳ : ۴۹؛ لیز السمعانی : کتاب الانساب بذیل الکلینی) ۔ کلین کے نامور علما کا ذکر تذکروں میں آتا ہے ۔ اس کے آثار اب بھی موجود ہیں ۔

ابو جعفر الکلینی کا خانوادہ فقہ و حدیث میں خاص امتیاز رکھتا تھا، ان کے والد یعقوب بن اسحٰق بھی عالم تھے اور ان کے ماموں ابو الحسن علی بن محمّد بن ابراہیم بن ابان، علّان کلینی بھی محدّث و فقیہ تھے ۔ اسی عالمانہ ماحول میں ان کی ولادت ہوئی ۔ تاریخ ولادت محفوظ نہیں رہ سکی ۔ اگر ان کی عمر اوسطاً ساٹھ ستّر سال مانی جائے تو ان کی ولادت ۲۶۰ اور ۲۷۰ھ کے مابین ہوئی ہوگی ۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کرنے کے بعد انھوں نے رَے، قم اور نیشاپور کے نامور اساتذہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا ۔ الکافی کی ترتیب و تبویب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف کو علم عقائد و کلام، معقولات و فقہ میں بے مثال مہارت تھی، ان کا حافظہ قوی اور بصیرت پختہ تھی، نیز تاریخ و رجال، درایت و روایت، تفسیر و ادب پر عبور تھا، الکافی کا مقدمہ مؤلف کی وسعت نظر، قدرت تحریر، قدرت اسلوب اور کمال فہم و بصیرت کا آئینہ دار ہے ۔ ان کے علمی مرتبے اور جلالت قدر کے بارے میں نجاشی (کتاب الرجال، ص ۲۶۶) اور الطوسی (فہرست، ص ۳۲۶) نے لکھا ہے کہ کلینی اپنے عہد میں رے کے شیخ الاصحاب اور باوجاہت عالم اور فاضلِ حدیث تھے ۔

کتب رجال سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابو جعفر محمّد کلینی کا بیشتر وقت وطن میں گزرا ۔ تیسری صدی ہجری کے ربع آخر میں حمدان قرمط نے دین کی مخالفت اور اسلام دشمن سرگرمیاں تیز کیں اور عراق و ایران میں طوفان برپا کر دیا ۔ رے قرمطیوں کی آماجگاہ تھا (سیاست نامہ، باب ۴۷) ۔ ہوسکتا ہے کہ علامہ کلینی نے کتاب الرد علی القرامطہ انھیں دنوں میں لکھی ہو ۔ کچھ عرصے کے لیے وہ رے کو چھوڑ کر بغداد چلے گئے ۔ مقتدر باللہ کے دور خلافت میں علّامہ کلینی فقہائے امامیہ کے زعیم تھے (تاج العروس، ۹ : ۳۲۲) ۔ اس عظمت کا اعتراف

www.besturdubooks.wordpress.com

بڑے بڑے علما نے کیا ہے (روضات الجنات، ۶ : ۱۰۹)۔

ابو جعفر محمّد بن یعقوب کلینی نے ماہ شعبان ۳۲۹ھ/مئی ۹۴۱ء میں وفات پائی (کتاب الرجال، ص ۹۵م) ۔ نماز جنازہ محمّد بن جعفر ابو قیراط الحسنی نے پڑھائی ۔ ابوجعفر الکلینی، کثیر التلامذہ محدّث ہیں، رجال پر لکھی ہوئی کتابوں میں ان کے تلامذہ کے نام مذکور ہیں ۔

ابو جعفر محمّد بن یعقوب کلینی معروف مصنف بھی تھے، ان کی کتابیں دستبرد زمانہ سے ضائع ہوگئی ہیں، لیکن فہارس اور قدیم کتابخانوں میں ان کا سراغ ملتا ہے ۔ ان کتابوں میں سے چند یہ ہیں :

(۱) کتاب تفسیر یا تعبیر الرؤیا (الطوسی : الفہرست، ص ۱۳۵؛ النجاشی: کتاب الرجال، ص ۳۶۷؛ معالم العلماء، ص ۸۸؛ الذریعہ، ۴ : ۲۰۸)؛ (۲) کتاب الرجال (النجاشی، ص ۲۶۷)؛ (۳) کتاب الرد علی القرامطہ (المسعودی : التنبیہ والاشراف، مطبوعۂ بیروت، ص ۳۹۶؛ النجاشی : الرجال، ص ۳۶۷؛ الطوسی : الفہرست، ص ۳۲۷ ؛ کشف الحجب والاستار، ص ۴۴۲)؛ (۴) کتاب الرسائل، رسائل الائمہ (النجاشی : الرجال، ص ۲۶۷؛ الطوسی : الفہرست، ص ۳۲۷)، ابن طاؤس نے کشف المحجہ میں کتاب کے معاصر نسخے کا تذکرہ اور اس کے اقتباسات نقل کیے ہیں؛ (۵) کتاب ما قیل فی الائمہ علیہم السلام من الشعر (النجاشی : الرجال، ص ۲۶۷)؛ (۶) کتاب الکافی ۔

اپنے ایک دوست کے خط سے متاثر ہو کر انھوں نے مقدمہ اور کتاب کافی لکھی اور یہ تمنا ظاہر کی کہ "اگر موت نے مہلت دی تو اس سے زیادہ وسیع و مکمل انداز میں کتاب لکھوں گا ۔ جس میں تمام حقوق ادا ہو جائیں گے، انشاء اللہ" (الکافی، ص ۹) ۔

مؤلف موصوف نے ہر بڑے عنوان کے ذیل میں چھوٹے چھوٹے عنوان قائم کیے، الاقوی فالاقوی کے اصول پر پوری کتاب یوں مرتب کر دی کہ عقائد و اخلاق اور اعمال و احکام میں جس مسئلے پر احادیث کی ضرورت ہو، عنوان دیکھیے اور حدیثیں پڑھ لیجیے ۔ عنوان اتنے واضح رکھے کہ ذیل میں جمع شدہ احادیث کا خلاصہ ہوں اور پڑھنے والا ان کا مطلب سمجھ لے ۔ اس محنت طلب اور صبر آزما کام پر شیخ نے بیس سال صرف کیے (تمام مصادر) ۔ شیخ نے بڑے عنوان کا نام "کتاب" اور ذیلی عنوانوں کا نام "باب" لکھا ہے ۔

"دارالکتب الاسلامیہ تہران" کا تحقیقی متن شائع ہو چکا ہے (سید ابوالقاسم الخوئی : معجم رجال الحدیث، المدخل، ص ۱۲۴، طبع ۱۹۷۰ء) ۔

عام طور پر الکافی کی تقسیم، الاصول، الفروع اور الروضہ کے نام سے کی گئی ہے ۔ خصوصیات : (۱) الکافی سے پہلے کی تالیف میں بصائر الدرجات اور کتاب المحاسن آج بھی موجود ہیں، لیکن کافی کی جامعیت نے فقہا و محدّثین کو ہر کتاب سے بڑی حد تک بے نیاز کر دیا ہے ۔ وقت تالیف سے لے کر آخر عمر تک اور ۳۲۹ سے آج (۱۳۹۴ھ) تک الکافی درس و مطالعہ، حاشیہ و شرح اور تجرید و تنقید کا موضوع ہے؛ (۲) مؤلف زمانِ ائمہ و اصحاب ائمہ اہل بیت کے قریب تھے؛ (۳) شیخ نے ہر حدیث کو کامل السند اور کامل المتن وارد کیا ہے سوائے چند احادیث و اقوال کے) جس کا سبب یا تو اصل مروی عنہ سے نقل ہے یا حوالہ عام دسترس میں تھا؛ (۴) تخریج احادیث میں وہ صحت و وضوح کو مقدم کرتے اور اسی ترتیب سے روایات نقل کرتے ہیں؛ (۵) احادیث کی تقطیع اور استخراج

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

حکم کر کے قاری کو اپنا پابند نہیں کرتے؛ (۶) متعارض احادیث لانے سے احتراز کرتے ہیں؛ (۷) اقرب طرق روایت کا ذکر کرتے ہیں، حتّٰی کہ بعض ثلاثیات بھی نظر آتی ہیں؛ (۸) الکافی چوتھی صدی ہجری کے بعد تک کئی کتب حدیث سے زیادہ احادیث کی حامل ہے۔ ان حدیثوں کی تعداد صاحب لؤلؤۃ البحرین کے خیال میں ۱۶۱۹۹ یا ۱۵۹۷۷ ہے۔ علی اکبر غفاری نے جدید طرز پر احادیث شماری کے بعد ان کی تعداد ۱۵۱۷۶ بتائی ہے (سید جواد: حاشیہ شرح الکافی، ص ۹)۔

چونکہ اس کتاب میں فقہا و متکلمین دونوں کے لیے بہت زیادہ مواد موجود ہے، اس لیے ہر ذوق کے علما نے اس کی شرح کی ہے، مثلاً: (۱) محمد باقر داماد (م ۱۰۴۰ھ): الرواشح السماویہ فی شرح الاحادیث الامامیہ (عربی)، مطبوعۂ ۱۳۱۱ھ؛ (۲) ملا صدر الدین شیرازی (م ۱۰۵۰ھ): شرح الکافی (عربی)، مطبوعہ؛ (۳) شرح محمّد امین الاستر آبادی الاخباری (م ۱۰۳۶ھ)؛ (۴) شرح ملّا محمّد صالح مازندرانی (م ۱۰۸۰ھ) (فقہی شرح)؛ (۵) ملّا محمّد باقر مجلسی (م ۱۱۱۰ھ): مرآۃ العقول (عربی)، ۴ جلدیں، مطبوعہ؛ (۶) ملّا محمد محسن الفیض الکاشانی (م ۱۰۹۱ھ): الوافی (عربی)، ۳ جلدیں، مطبوعہ؛ (۷) ملّا خلیل القزوینی: الصافی، (فارسی)، مطبوعہ۔ ارباب فہارس نے کم و بیش اٹھارہ شروح اور اکیس حواشی کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں برصغیر میں لکھے ہوئے ترجموں اور خلاصوں کا ذکر نہیں (جواہر کلام = فہرست کتب خطی، ص ۶۶؛ مقدمۃ الکافی، ص ۳۷)، مثلاً ظفر حسن امروہوی کا ترجمہ، ۳ جلدیں، مطبوعہ؛ نواب محمّد حسین خان: کتاب العقل، کتاب التوحید و کتاب العلم کا متن و ترجمہ، مطبوعہ، باقی غیر مطبوعہ؛ فاضل ظہور حسین کا ترجمہ و شرح کتاب الایمان و الکفر مطبوعہ؛ سید یوسف حسین امروہوی: از اول تا کتاب العقل و الجہل، مطبوعۂ ۱۹۲۷ء۔

حل لغات، احوال رواۃ، جرح و تعدیل، روایات پر بکثرت کام ہوا ہے، اس لیے قدیم و جدید متعدد مطبوعات ملتے ہیں۔ راقم مقالہ کے پاس نفیس خطی نسخوں کے علاوہ چھے عمدہ ایڈیشن بھی ہیں۔ بڑے کتاب خانوں میں بہت سے خطی اور مطبوعہ نسخے موجود ہیں۔ خود راقم مقالہ نے تجرید الکافی کے نام سے الاصول کا خلاصہ اور عربی شرح لکھی ہے جو قلمی ہے۔

جناب ہاشم معروف الحسینی نے دراسات فی الکافی للکلینی و الصحیح للبخاری کے نام سے ایک تقابلی مطالعہ شائع کیا ہے (بیروت ۱۳۸۸ھ) اور مجتہد اکبر سید ابوالقاسم الخوئی النجفی نے معجم رجال الحدیث کے مقدمے میں نئے اسلوب سے کتاب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے (المدخل، نجف ۱۳۹۰ھ)۔ ثقۃ الاسلام الشیخ الحافظ ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی نے الکافی لکھ کر فن حدیث کی عظیم خدمت سر انجام دی ہے۔

مآخذ: (۱) حسین علی محفوظ: مقدمۃ الکافی تحقیق علی اکبر غفاری: الاصول من الکافی، ج ۱، تہران ۱۳۷۴ھ (تحقیقی مقالہ جو سو مصادر پر مبنی ہے)؛ (۲) محمد باقر الکمرئی: مقدمۂ شرح و ترجمۂ فارسی: الاصول من الکافی، ج ۱، تہران ۱۳۸۱ھ؛ (۳) سیّد جواد مصطفوی: مقدمۂ اصول کافی، ج ۱، طبع تہران ۱۳۸۹ھ؛ (۴) شیخ اسمٰعیل کجوری: جنّۃ النعیم فی احوال عبد العظیم، تہران ۱۲۹۵ھ؛ (۵) ابو العباس احمد بن علی النجاشی: کتاب الرجال، بمبئی ۱۳۱۷ھ؛ (۶) ابو جعفر محمد بن حسن الطوسی: الفہرست، کلکتہ ۱۲۷۱ھ؛ (۷) وہی مصنف: رجال الطوسی، نجف ۱۳۸۱ھ؛ (۸) فضل اللہ الالٰہی: عین الغزال

www.besturdubooks.wordpress.com

فی فہرس الاسماء الرجال، تہران ۱۳۱۵ھ؛ (۹) محمد بن علی الاردبیلی الحائری : جامع الرواۃ و ازاحۃ الاشباہات عن الطرق و الاسناد، تہران ۱۳۳۱ھ؛ (۱۰) الخوانساری : روضات الجنات، ج ۶، تہران ۱۳۹۰ھ؛ (۱۱) محمد تقی التستری : قاموس الرجال، ج ۸، قم ۱۳۸۷ھ؛ (۱۲) مرتضی حسین: تاریخ تدوین حدیث و شیعہ محدثین، راولپنڈی ۱۹۵۷ء، پچاس سے زیادہ مآخذ کے حوالے؛ (۱۳) ذوالفقار حسین : ثقۃ الاسلام کلینی اور کافی، لکھنؤ ۱۹۶۰ء؛ (۱۴) محمد رضا الطبسی : الشیعہ و الرجعہ، ج ۱، نجف ۱۳۷۵ھ؛ (۱۵) سید ہاشم معروف : دراسات فی الکافی للکلینی و الصحیح اللبخاری، بیروت ۱۳۸۸ھ؛ (۱۶) السید ابو القاسم الخوئی : معجم رجال الحدیث اور المدخل، نجف ۱۳۹۰ھ؛ (۱۷) سید محسن الامین: اعیان الشیعہ، ج ۱، دمشق ۱۳۵۳ھ؛ (۱۸) وہی مصنف : کتاب مذکور، ج ۴۷، بیروت ۱۳۸۰ھ؛ (۱۹) نظام الملک : سیاست نامہ؛ (۲۰) شیخ عباس قمی : تتمۃ المنتہی فی وقائع ایام الخلفاء، تہران؛ (۲۱) وہی مصنف : تحفۃ الاحباب فی نوادر الاصحاب، تہران ۱۳۶۹ھ؛ (۲۲) عبداللہ المامقانی : تنقیح المقال فی علم الرجال، نجف ۱۳۵۲ھ؛ (۲۳) محمد شفیع الموسوی : الروضۃ البہیۃ فی الطریق الشفیعہ، تہران ۱۳۷۸ھ؛ (۲۴) شیخ عباس قمی : فوائد الرضویہ فی احوال علماء المذہب الجعفریہ، تہران ۱۳۶۷ھ؛ (۲۵) ابن الأثیر : الکامل فی التاریخ، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۲۶) ابن حجر العسقلانی : لسان المیزان، حیدر آباد دکن ۱۳۳۱ھ؛ (۲۷) شیخ یوسف البحرانی : لؤلؤۃ البحرین، تہران ۱۲۶۹ھ؛ (۲۸) محمد حسین النوری : مستدرک الوسائل، تہران ۱۳۲۱ھ؛ (۲۹) وہی مصنف : نہایۃ الدرایۃ، لکھنؤ ۱۳۲۳ھ؛ (۳۰) السید رضی الدین ابن طاؤس : کشف المحجہ الثمرۃ المہجہ، نجف ۱۳۷۰ھ؛ (۳۱) الدّرایہ، مطبوعۂ نجف؛ (۳۲) مرتضی حسین فاضل : اوصاف الحدیث، لکھنؤ۔

(مرتضیٰ حسین فاضل)

کِماخ : (کَماخ، کَمخ، یونانی : Kάμαχα) دریاے فرات (قرہ صو) کا بہاؤ جہاں شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف ہے اور ابھی اس کا سیدھا جنوب کی طرف رخ نہیں ہوا ہے اس حصے کے جنوبی کنارے پر قلعۂ کماخ واقع ہے۔ اس مقام پر دریا اونچی اونچی چٹانوں کے درمیان اس قدر تنگ راستے سے ہو کر گزرتا ہے کہ اس شاہراہ کے لیے جو یہاں تک اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ شہر کماخ جو انیسویں صدی کے اواخر تک بھی ایشیاے کوچک کے جنگی سامان سے آراستہ شہروں میں شمار ہوتا تھا، ایک پہاڑی ڈھلان پر واقع ہے۔ اور پھل دار باغات اور میوے کے تختوں سے گھرا ہوا ہے۔ موسم بہار میں شہتوتوں کی کثرت کی وجہ سے یہاں ہزار ہا بٹیر کھنچ آتا ہے اور اس واقعے کو لوگ ایک طرح سے خرق عادت سمجھتے ہیں۔ اس کے آس پاس جنگلات میں جو کڑیاں۔ شہتیر وغیرہ کاٹے جاتے ہیں، انہیں دور دور بھیجنے کے لیے مقامی لوگ ابھی تک دریا کو کام میں لاتے ہیں اور ان کے بیڑے باندھ کر بہاؤ پر چھوڑ دیتے ہیں اور وہ ساحل کی منڈیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ کماخ میں نمک، پنیر، اور کتان تیار کیے جاتے ہیں اور بہت مشہور و مقبول ہیں [تفصیل کے لیے دیکھیے EI² لائیڈن، بار اول بذیل مادّہ]۔

مآخذ : (۱) ابن الأثیر : الکامل، طبع Tornberg، ۳ : ۴۳۴؛ ۵ : ۳۴۲ ببعد؛ ۱۲ : ۳۱۲؛ (۲) الیعقوبی : تاریخ، طبع Houtsma، ۲ : ۴۴۷؛ (۳) البلاذری : فتوح، طبع de Goeje، ص ۱۸۴ ببعد؛ (۴) *BGA.*، ۲ : ۱۲۹ ببعد ۶ : ۱۷۳؛ (۵) M. Th. Houtsma : *Recueil de textes rel. à l'hist. des Seldjoucides*، ج ۳ و ۴، بمدد اشاریہ؛ (۶) یاقوت: معجم، طبع Wüstenfeld،

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۳ : ۸۶۰؛ ۴ : ۳۰۴؛ (۷) حمداللہ المستوفی : نزھۃ القلوب، طبع و ترجمہ G. Le Strange، سلسلۂ یادگار گب، ج ۲۳، بمدد اشاریہ؛ (۸) Const. Porphyrog. : *De adm. imp.*، طبع بون، ۳ (۱۸۴۰ء)، ص ۲۲۶؛ (۹) J. Saint-Martin : *Mém. hist. et géogr. sur l'Arménie*، ۱ : ۷۲ ببعد، ۲ : ۳۳۳، ۳۳۵؛ (۱۰) v. Hammer : *Narrative of Travels ... by Evliya Efendi*، لنڈن، ۱۸۵۰ء، ۲ : ۱۹۹ ببعد؛ (۱۱) G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۱۱۸؛ (۱۲) v. Hammer : *Gesch. d. osm. Reiches*، ۱ : ۲۴۹؛ ۲ : ۳۲۵؛ (۱۳) Ritter : *Erdkunde*، ۱۰ : ۷۸۲ ببعد؛ (۱۴) J. Brant، در *The Journal of the Geographical society*، ۱۸۳۶ء، (مصنف کو نہیں مل سکا)؛ (۱۵) E. Reclus : *Nouvelle Géographie Universelle*، ۹ : ۳۶۳؛ (۱۶) *Peace Handbooks*، ۱۱، لنڈن ۱۹۲۰ء، عدد ۶۲، ص ۳۴؛ (۱۶) V. Cuinet : *La Turquie d'Asie*، پیرس ۱۸۹۲ء، ص ۲۲۰ ببعد.

(W. BARTHOLD)

* **کِمَاک** : (اسے عام طور سے کِیمَاک لکھا جاتا ہے؛ [ابن خرداذبہ، نیز المقدسی نے اس کا تلفظ کَیْمَاک بتایا ہے] ان ترکوں کا نام ہے جو دریاے اِرتش کی زیریں گزرگاہ پر آباد ہیں۔ ابن خُرداذبہ (متن در *BGA*، ۶ : ۲۸ و ۳۱) ایک سڑک کا ذکر کرتا ہے جو طَرَاز (حال اَوْلِیا آتا) یا اس سے سات فرسخ پر کُوِیکت سے وہاں تک آتی ہے (۸۰ یا ۸۱ روز کی مسافت) اور گردیزی (در Barthold : *Otčet O poyezdke v Srednyuyu Aziyu*، ص ۸۲ ببعد) ایک اور راستے کی پوری کیفیت لکھتا ہے جو فاراب (اُتْرَار) سے (براہ جِنْکِند؛ آج کل اس کے کھنڈر جانکِنْت کے نام سے موسوم ہیں اور سِیر دریا کے دہانے کے جنوب میں واقع ہیں) آتا ہے۔ بقول المقدسی (در *BGA*، ۳ : ۲۷۴) چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں کماک کا ایک حصہ ترکستان کے اسلامی مقبوضات کے متصل علاقے میں آباد ہو چکا تھا۔ کماک کی تاریخی اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ آگے چل کر ان میں قِپچاق کی انتہائی کثیر التعداد قوم پیدا ہوئی (جسے یورپ میں کمان Kuman اور روسی پولوتزی Polovitzi کے نام سے پکارتے ہیں)۔ ابتدا میں یہ محض کماک کا ایک قبیلہ تھا۔ پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی (ان کا ذکر الادریسی کے ہاں ملتا ہے تو اس کا مأخذ بعض کتابیں ہی ہو سکتی ہیں) سے کماک کا نام غائب ہو جاتا ہے اور پھر عہد مغول میں اس کا دوبارہ ذکر نہیں آتا، دیکھیے J. Marquart، در *Osttürkische Dialektstudien*، ۱۹۱۴ء، بمدد اشاریہ، بذیل مادۂ کیماک؛ تلفظ کے بارے میں دیکھیے ص ۸۹، حاشیہ ۱).

(W. BARTHOLD)

کمال پاشا زادہ : (شمس الدین احمد بن سلیمان بن کمال پاشا) عثمانی مؤرخ، فقیہ اور صاحب طرز انشا پرداز جسے اکثر ابن کمال پاشا بھی کہتے ہیں.

کمال پاشا زادہ ادریانوپل کے ایک ممتاز خاندان سے تھا۔ اس کا باپ سلیمان پاشا ایک متمول رئیس تھا اور دادا کمال پاشا تھا جس نے اس کے باپ کی طرح دشمنان اسلام کے خلاف بارہا لڑائیوں میں حصہ لیا اور بڑی عزت و شہرت حاصل کی [اس کے بارے میں رک بہ سجل عثمانی]۔ کمال پاشا زادہ نے پہلے پہل بایزید کی فوج میں ملازمت کی تھی، [لیکن سرکار کے ہاں اہل علم کا اعزاز و اکرام دیکھ کر اسے عالم بننے کا شوق پیدا ہوا اور وہ] فوج کی ملازمت ترک کر کے لطفی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گیا۔ لطفی ادریانوپل

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کے دارالحدیث میں قسطلانی [رک بآں]، خطیب زادہ اور مُعَرِّف زادہ جیسے نامور اساتذہ کے ساتھ فقہ اسلامی سے متعلق علوم کا درس دیا کرتا تھا۔ جب کمال پاشا زادہ نے اپنی تعلیم ختم کر لی تو اسے (ادرنہ) کے شہرۂ آفاق مدرسۂ علی بیگ میں پڑھانے پر مقرر کر دیا گیا، لیکن اس کے تھوڑے ہی دن بعد اسے مدرّس کے عہدے پر اسکوب میں بلا لیا گیا اور وہاں سے آخر کار ادرنہ آ گیا اور مدرسۂ حلبیہ میں درس دینے لگا۔ ایک مدت تک قاضی القضاۃ حاجی حسن زادہ کی عداوت کا شکار رہا، کیونکہ وہ ہمیشہ ایسے ذہین لوگوں سے حسد کرتا تھا جن میں ترقی کی استعداد ہو اور ان کے راستے میں ہر طرح کی رکاوٹ حائل کیا کرتا تھا۔ آخر کار سلطان نے اپنے درباری شاعر مُؤَیِّد زادہ (المتخلص بہ حاتمی، م ۹۲۲ھ/ ۱۵۱۶ء) کی سفارش پر اس کا تقرر بطور مدرس تیس ہزار اسپر aspers کے مشاہرے پر ادرنہ میں تاشلیق مدرسۂ عالیہ (= مدرسۂ علی بیگ) میں کر دیا۔ مُؤَیِّد زادہ جیسے بااثر شخص کی سرپرستی کی بدولت اسے ہر قسم کی آزادی حاصل ہو گئی، چنانچہ اب وہ بڑی آسانی سے کچھ وقت تو صوفیہ میں گزارتا اور کچھ Dupnitza (بلغاریہ) میں۔ اس طرح بڑے آرام اور اطمینان سے عثمانی تاریخ کی تالیف کا کام کرتا جو سلطان نے اسے سونپ رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے مختلف علوم و فنون پر تصانیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس نے کبھی فقہ پر لکھا، کبھی تاریخ پر، کبھی شاعری پر اور کبھی بلاغت پر۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں اس کے قلم سے تین سو سے زیادہ رسائل نکلے۔

سلطان سلیم اول کے عہد میں کمال پاشا زادہ نے آخرکار ۱۵۱۶ء میں آناطولی کے قاضی عسکر کا عہدہ حاصل کر لیا تھا۔ مصر کی مہم میں وہ اسی حیثیت سے بادشاہ کا ہمرکاب تھا۔ دوران سفر میں دوسرے فرائض کے علاوہ سلطان نے اسے یہ کام اور سپرد کیا کہ علاوہ اور کتابوں کے مشہور عرب مؤرخ ابوالمحاسن بن تغری بردی [رک بآں] کی ممالیک مصر پر دو تصنیفات کا ترکی میں ترجمہ کر دے۔ ہر صبح وہ ترجمے کی ایک قسط اپنے آقا کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔ اس ترجمے کا نام بقول حاجی خلیفہ (عدد ۸۷۵۸ و ۱۳۶۱۶) الکواکب الباهرة من النجوم الزاهرة تھا (اس کے لیے دیکھیے Brockelmann: *GAL.*، ۲: ۴۲)۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے ایک فوجی ترانے کے ذریعے سلطان کو فوج کی اس خواہش سے آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ جلد از جلد وطن لوٹنے کے متمنی ہیں۔ اگرچہ سلطان نے اصل مدعا بھانپ لیا، لیکن پھر بھی اس نے شاعر کو معاف کر دیا، بلکہ بطور اکرام پانچ سو طلائی سکے بھی مرحمت کیے (دیکھیے J.v. Hammer: *Gesch. des osm. Reiches.*، ۲: ۵۱۹؛ H. F. v. Diez: *Denkwürdigheiten aus Asien*، ۱: ۲۸۳؛ نیز دیکھیے ادریس بِتْلِیسی کی ہشت بہشت کا ذیل (حصّۂ چہارم) از ابوالفضل (مخطوطہ وی انا نیشنل لائبریری، H.D. 16 d، ورق ۱۲۶)۔ وطن واپس آنے پر کمال پاشا نے دارالحدیث میں اپنی پرانی مدرسی کی خدمت سنبھال لی اور اس کے ساتھ اپنی علمی و شاعرانہ سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ اس نے سعدی کی گلستان و بوستان کے طرز پر فارسی میں نگارستان لکھی (دیکھیے حاجی خلیفہ: کشف الظنون، ۶: ۳۸۱ و *Der Islam*، ۷: ۱۱۸؛ جرمن میں اس کے اقتباسات کے لیے دیکھیے Count v. Harrach: *Fundgr. des Orients*، ۱: ۴۰۱ ببعد و ۲: ۱۰۷ و ۳: ۴۷ ببعد)۔ کمال پاشا زادہ ایک تاریخ عثمانیہ کا مصنف بھی ہے جو ۸۸۶ھ (بایزید ثانی کی تخت نشینی) سے لے کر ۹۳۳ھ، یعنی ہنگری پر سلیمان اعظم کے پہلے حملے تک کے حالات پر مشتمل ہے، مکمل تصنیف کے مخطوطات نہایت کمیاب ہیں۔ ڈریسڈن Dresden کے کتاب خانۂ Sächsische

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Landesbibliothek میں اس کے بیشتر حصص موجود ہیں (دیکھیے J.H. Mordtmann کی تحقیقات، در *Der Islam*، ۱۳ : ۱۵۳ ببعد)، لیکن وی انا میں اس کے محض چند اجزا ملتے ہیں غالباً یہ کتاب مختلف ادوار سے متعلق علٰحدہ علٰحدہ حصوں میں وقتاً فوقتاً لکھی گئی اور شائع ہوئی (کم از کم ایک حصہ اتنا پرانا ہے کہ بایزید دوم کے عہد سے تعلق رکھتا ہے) (دیکھیے G. Flügel، کتاب مذکور، ۲ : ۲۲۰؛ اس تصنیف کے بارے میں دیکھیے حاجی خلیفہ: کشف الظنون، ۲ : ۱۱۱، عدد ۲۱۵۳)۔ قدیم عثمانی وقائع کے پیچیدہ مسائل حل کرنے کے لیے اس کتاب کے مکمل نسخے کی طباعت و اشاعت بہت مفید اور قدر و قیمت کی شایان ہوگی، کمال پاشا زادہ کی بابت یہ کہنا کہ اس نے ادریس کی ہشت بہشت کا ترجمہ کیا تھا جیسا کہ علمیہ سالنامسی، ص ۳۴۷ میں لکھا ہے غالباً کسی غلطی پر مبنی ہے۔ کمال پاشا زادہ نے Mohács کی مہم پر بڑا مفصّل و مکمّل تبصرہ لکھا جو پہلی بار de Pavet Courteillel کے فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شائع ہوا (*Hist. de la Campagne de Mohacz*، پیرس ۱۸۵۹ء) اس کا ایک نہایت عمدہ قلمی نسخہ ڈریسڈن پبلک لائبریری میں موجود ہے۔

اس کی شاعری کا شاہکار حکایت یوسف و زلیخا ہے جسے اس سے پہلے بھی (مثلاً حمدی نے) اور اس کے بعد بھی شعرا نے اکثر جولانگاہ سخن بنایا ہے، لیکن کمال پاشا زادہ نے جس طرز سے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے وہ عجیب و غریب طور پر خوش آئند ہے۔ اس کی دیگر نظمیں، جس میں اس کی نکتہ آفرینی ۔۔۔ جس کی اس کی زندگی میں سب تعریف کرتے تھے اور حذاقت ذہنی جھلکتی ہے، ایک علٰحدہ دیوان میں جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ دیوان ۱۳۱۳ھ میں استانبول سے شائع ہوا۔ (دیکھیے Gibb : *History of Ottoman Poetry*، ۲ : ۳۴۷ تا ۳۶۳، جہاں اس کی ادبی سرگرمیوں کا پوری طرح جائزہ لیا گیا ہے) علاوہ ازیں اس نے علم اللغۃ پر بھی کچھ کتابیں تصنیف کیں جن میں سے دقائق الحقائق (دیکھیے G. Flügel، کتاب مذکور، ۱ : ۱۳۰) کا ذکر یہاں مناسب ہے۔ یہ ایک معجم ہے جس میں فارسی کی مشکل تراکیب کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کی فقہی تصنیفات میں سے رسالۃ فی طبقات المجتہدین کا ذکر ضروری ہے جس میں فقہا کے مختلف طبقات کا بیان ہے (دیکھیے G. Flügel : *Die Klassen der hanefit rechtsgel*، در *Abh. der Kgl. Sächs. Gesellsch der Wiss.*، ۱۸۶۱ء، ۸ : ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۳۴۶؛ اس کے قلمی نسخے جو وی انا میں ہیں، دیکھیے G. Flügel : *Die arab . . . pers. u. türk. Handschr. . . . zu Wien*، ۲ : ۶۱۲)۔

[کمال پاشا زادہ کثیر التعداد مصنف تھا۔ اسے عربی فارسی اور ترکی زبانوں پر یکساں دسترس حاصل تھی۔ اس نے علوم اسلامیہ کی ہر شاخ پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ براکلمان نے اس کی چھوٹی اور بڑی کتابوں کی تعداد ایک سو ستر بتلائی ہے اور ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے (تکملہ، ۲ : ۶۶۸، ۶۷۳، لائیڈن ۱۹۳۸ء) اور ان میں قابلِ ذکر ہدایہ، تجرید، مفتاح، تہافت وغیرہ کی شرحیں ہیں۔ بقول سامی بے اس نے الصحیح للبخاری اور مشارق انوار کی بھی شرحیں لکھی تھیں (قاموس الاعلام، ۵ : ۳۸۸۶، استانبول ۱۳۱۴ھ)] ۔ قرآن مجید پر فوائد و ملاحظات، الکشاف وغیرہ پر حواشی لکھے ہیں۔ ان کے قلمی نسخے اکثر مشرقی کتاب خانوں کی فہرست مخطوطات میں مذکور ہیں (دیکھیے مثلاً G. Flügel، کتاب مذکور، ۱ : ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۲۵۱، ۲۹۱، ۵۲۴، ۷۱۰، ۷۱۴، ۷۲۲، ۷۲۳؛ ۲ : ۲۲۰، ۲۲۱، ۶۱۲؛ ۳ : ۱۷۹، ۲۱۵

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

بعد؛ متعدد رسائل کی فہرست در Ahlwardt : Berliner Kat. ۱ : ۱۲، عدد ۱۹؛ ۵۹ رسائل کا مجموعہ در فہرست الکتب العربیۃ المحفوظۃ بالکتب خانۃ الخدیویۃ المصریۃ (دارالکتب المصریہ) جلد ۷، قاہرہ ۱۳۰۹ھ، ص ۳۳۵ تا ۳۴۴؛ نیز دفتر کتب خانۂ ایاصوفیہ، استانبول ۱۳۰۴ھ، عدد ۴۷۹۴، ۴۷۹۷، ۴۸۲۰، دفتر کتب خانۂ لالیلی [=لا لہ لی] جامع، استانبول ۱۳۰۰ھ، عدد ۲۴۳۳، ۳۶۴۵، ۳۶۴۷-۳۶ رسائل کا ایک مجموعہ ۱۳۱۶ھ میں استانبول (اقدام پریس) سے دو حصوں میں رسائل کے نام سے شائع ہوا تھا۔ دیکھیے *Zeitschr. d. deutsch. Morgenl. Ges*، ۶۶ : ۵۲۵.

اس نے باہ کے موضوع پر بھی قلم اٹھایا تھا جیسا کہ اس کی کتاب رجوع الشیخ الی صباہ فی القوۃ علی الباہ (طبع قاہرہ ۱۳۱۶ھ و ۱۳۳۵ھ؛ ترکی ترجمہ طبع سنگی تاریخ ندارد، ۹۹ صفحات) سے ظاہر ہے۔ [اس کا رسالہ "فی تحقیق مؤنثات السماعیۃ" نحو کی مشہور کتاب کافیہ کے ساتھ متعدد بار دہلی، کانپور اور کلکتے سے شائع ہو چکا ہے].

کمال پاشا زادہ نے ۲ شوال ۹۴۱ھ/ ۶ اپریل ۱۵۳۵ء کو استانبول میں وفات پائی اور باب ادریانوپل سے باہر محمود چلبی کی خانقاہ میں دفن ہوا۔ یہاں اس کے ایک شاگرد محمود بے نے، جو مرتے وقت تک قاہرہ کا قاضی تھا، اس کی یاد میں پتھر کا ایک کتبہ نصب کرایا۔ اس کے تابوت، کفن اور سنگ لحد پر اشعار مشتمل برمادہ‌های تاریخ عربی میں لکھے گئے جن میں سے ہر ایک سے عدد ۹۴۱ برآمد ہوتا تھا (دیکھیے حدیقۃ الجوامع، ۱ : ۱۸۰، ۱۸۱ اور اولیا چلبی : سیاحت نامہ، ۱ : ۳۴۵، خصوصاً ۳۵۹، دیکھیے اس کے برخلاف J.v. Hammer-Purgstall در *Z.D.M.G.*، ۶ : ۲۸۲، و *Sitzungsber. der Wiener Ak. der Wiss.*، ۱۸۵۱ء، ۶ : ۳۲۶ تا ۳۲۸، جس کی رو سے اس کی تاریخ وفات ۹۴۰ھ ہے، لیکن یہ یقیناً غلط ہے).

مآخذ : متن میں مندرجہ مآخذ کے علاوہ (۱) کمال پاشا زادہ کی زندگی کے بارے میں رک بہ تاش کوپری زادہ : شقائق النعمانیہ، استانبول ۱۲۶۹ھ، ص ۳۸۱ تا ۳۸۵؛ (۲) Th. Chabert : *Latifi*، زیورچ ۱۸۰۰ء، ص ۷۹؛ (۳) J. v. Hammer : *Gesch. des Osm. Reiches*، ۳ : ۶۳۵؛ (۴) وہی مصنف : *Gesch. der Osm. Dichtk*، ۲، ۲۰۵ ببعد؛ (۵) بروسلی محمد طاہر : عثمانلی مولفلری، ۱ : ۲۲۳؛ (۶) علمیہ سالنامہ، استانبول ۱۳۳۴ھ، ص ۳۴۶ ببعد؛ (۷) محمد عارف بے، در *Revue Historique Ottomane*، ص ۱۳۱۱، ببعد؛ (۸) C. Brockelmann : *Gesch. der arab. Lit.*، ۲ : ۳۴۹ تا ۳۵۳، (جہاں اس کی بیشتر تصنیفات مع عنوانات دی ہوئی ہیں)؛ [(۹) سامی بے : قاموس الاعلام، ۵ : ۳۸۸۵، ۳۸۸۶، استانبول ۱۳۱۴ھ؛ (۱۰) براکلمان، *GAL*، تکملہ، ۲ : ۶۶۸ تا ۶۷۳، لائیڈن ۱۹۳۸ء؛ (۱۱) محمد ثریا : سجل عثمانی؛ (۱۲) علی : کنہ الاخبار].

(FRANZ BABINGER [و سلطان بخش])

کمال خجندی : (کمال الدین مسعود) فارسی زبان کے ایک غزل گو شاعر جن کا تعلق عہد تیموری سے تھا، وہ ماوراءالنہر میں بمقام خجند پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی [بہت بڑے صوفی تھے اور شاش (ماوراءالنہر) کے ایک بزرگ خواجہ عبیداللہ کے مرید تھے۔ حج کے لیے مکۂ معظمہ گئے اور واپسی پر تبریز میں مقیم ہو گئے۔ تبریز کی آب و ہوا پسند تھی۔ ابھی زندگی کی ابتدا ہی تھی کہ وہاں ایک بزرگ شیخ زین الدین خوافی سے فیض حاصل کیا۔ سلطان حسین جلائر (۷۷۶ھ/ ۱۳۷۴ء تا ۷۸۴ھ/ ۱۳۸۲ء) [رک بہ جلایر

www.besturdubooks.wordpress.com

نے ان کے لیے خانقاہ تعمیر کرائی جس میں بڑی سادگی سے رہتے تھے ۔ ایک چٹائی پر بیٹھتے اور سوتے اور ایک پتھر سے تکیے کا کام لیتے تھے ۔ جامی نے نفحات الانس میں ان کا ذکر کیا ہے ۔ ان کی بزرگی کا شہرہ سن کر لوگ بڑی تعداد میں مرید ہوے] ۔ ۱۳۸۵ء میں تُقْتَمِش خانِ قپچاق نے تبریز کو فتح کیا تو انھیں اپنے صدر مقام سرائے واقع دشت قپچاق لے گیا جہاں چار سال رہے، اس کے بعد پھر تبریز چلے آئے ۔ ان دنوں امیر تیمور کا بیٹا میرانشاہ آذربیجان کا حاکم تھا اور تبریز میں رہتا تھا ۔ [وہ پہلے محمد شیرین مغربی (م ۸۰۹ھ/ ۱۴۰۷ء) کا معتقد تھا ۔ لیکن خجندی کے آنے پر میران شاہ ان کا عقیدتمند ہوگیا ۔ ان کا قرض ادا کیا اور بھی ہر طرح خدمت کی ۔ خجندی سے مغربی کے دوستانہ مراسم تھے ۔ دونوں صوفی شاعر تھے] ۔ دولت شاہ کے بیان کے مطابق انھوں نے ۷۹۲ھ/ ۱۳۹۰ء میں اور خواند میر کی رو سے ۸۰۳ھ/ ۱۴۰۰ء میں وفات پائی ۔ تبریز کے محلۂ فرح بخش میں دفن ہوے اور ان کا مقبرہ مرجع عقیدت بن گیا ۔ Bland نے ان کی ۱۰ غزلیات اپنی کتاب *A Century of Ghazals* (ص ۹ تا ۱۲) میں شائع کی ہیں ۔ وی‌انا کی نیشنل لائبریری میں ان کے دیوان کا ایک خوبصورت قلمی نسخہ موجود ہے جس میں ان کے مطالب کو میناتوری تصاویر (Miniature) سے مصور کیا گیا ہے (G. Flugel: *Die arab., pers. u. turk, Handschr., zu Wien*، ۱: عدد ۸۵۱).

[ان کا دیوان وفات کے بعد مرتب ہوا جس میں غزلیات، قطعات اور رباعیات ہیں ۔ قطعات میں اس زمانے کے حالات کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں ۔ تُقْتَمِش کے حملۂ تبریز کا ذکر قطعات اور غزلیات دونوں میں موجود ہے ۔ جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خجندی اپنے صوفیانہ کمال کو مخفی رکھنے کے لیے شعر کہا کرتے تھے ۔ جامی نے ان کے کلام کو سہل ممتنع کہا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ شعری اسلوب میں انھوں نے حسن دہلوی (م ۷۳۸ھ/ ۱۳۳۷ء) کا تتبع کیا، اگرچہ لطافتِ خیال میں ان سے آگے نکل گئے ۔ کمال خجندی کی غزلیں شیرین ہیں اور خیالات میں تازگی ہے ۔ حافظ شیرازی نے بھی ان کی تعریف کی ہے].

مآخذ: (۱) دولت شاہ: تذکرۃ الشعراء طبع ادوارد براؤن انگلیسی، ص ۳۲۵؛ (۲) لطف علی بیگ آذر: آتش کدہ، ایران ۱۳۳۷ ش، ص ۳۱۹ و ۳۳۹؛ (۳) رضا قلی خان: مجمع الفصحاء، طبع ایران (درعہد ناصرالدین قاجار)، ۲: ۲۹؛ (۴) J. von Hammer: *Schöne Redekü nste Persiens*، ص ۲۰۰؛ (۵) خواند امیر: حبیب السیر، طبع بمبئی ۱۸۵۷ء، ۳/ ۳: ۶۹۰؛ (۶) Sir Gore Ouseley: *Biographical Notices of Persian Poets*، ص ۱۹۲ تا ۱۹۴؛ (۷) H. Ethe در *Grundriss d. Iran. Philologie*، ۲: ۳۰۴؛ [(۸) ای ۔ جی براؤن: *A Literary History of Persia*، ج ۳، کیمبرج ۱۹۶۴ء، بمدد اشاریہ؛ (۹) چارلس ریو: *A Discriptive Catalogue of Persian Manuscripts in the British Museum London*، ج ۱، ۲، ۳، آوکسفرڈ ۱۹۶۶ء، بمدد اشاریہ؛ (۱۰) محمد باقر و محمد وحید مرزا: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، لاہور ۱۹۷۱ء، ج ۳، فارسی ادب ۱۰۰۰ تا ۱۰۲۶ء، ص ۲۰۰ تا ۲۳۲؛ (۱۱) جامی، عبدالرحمٰن: نفحات الانس، کانپور ۱۸۹۳ء، ص ۳۹۹].

(Cl. Huart و [ادارہ])

کمال الدین: ابو القاسم عمر بن احمد [بن ہبۃ اللہ] ابن ابی جَرادۃ بن العدیم العُقَیلی، مؤرخ حلب، زوسا کے ایک جلیل القدر خاندان بنو جَرادۃ کا ایک فرد جس کا جد امجد ایک وبا کے باعث ۵۲۰۰ (۸۱۵ء) کے

www.besturdubooks.wordpress.com

لگ بھگ بنو عقیل کے دوسرے افراد کے ساتھ بصرے سے ہجرت کر کے شام چلا آیا اور ایک سوداگر کی حیثیت سے حلب میں آباد ہو گیا۔ کمال الدین ذوالحجہ ۵۸۸ھ/دسمبر ۱۱۹۲ء، (قواۃ میں ۵۸۶ھ غلط ہے) میں پیدا ہوا۔ وہ ایک حنفی قاضی کا بیٹا تھا اور یہ عہدہ ان کے خاندان میں موروثی طور پر چار پشتوں سے چلا آ رہا تھا۔ اس نے پہلے اپنے آبائی شہر یعنی حلب میں تعلیم پائی؛ پھر بیت المقدس میں جہاں اسے اس کا باپ ۶۰۳ھ/۱۲۰۶ء میں اور پھر ۶۰۸ھ/۱۲۱۱ء میں لے گیا تھا، پھر دمشق، عراق اور حجاز میں تعلیم پائی اور بعد میں حلب کے مدرسۂ شادبخت میں معلم ہو گیا، پھر قاضی کے عہدے پر فائز ہوا اور آخری دو ایوبی بادشاہوں الملک العزیز (۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء تا ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء) اور الملک الناصر (۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء تا ۶۵۸ھ/۱۲۶۰ء) کا وزیر بنا اور کئی بار ان کے حکم سے بغداد اور قاہرہ میں سفیر کے فرائض انجام دیے۔ ۹ صفر ۶۵۸ھ/۲۶ جنوری ۱۲۶۰ء کو جب تاتاریوں نے اس کا آبائی شہر فتح کر کے تباہ و برباد کر دیا تو وہ الملک الناصر کے ساتھ مصر بھاگ گیا۔ مگر ہلاکو نے اسے قاضی القضاۃ کے عہدے کے لیے شام واپس بلا لیا؛ مگر وہ اس حکم کی تعمیل سے قبل ہی ۲۹ جمادی الاولیٰ ۶۶۰ھ/۲۱ اپریل ۱۲۶۲ء کو قاہرہ میں فوت ہو گیا۔

کمال الدین کی اہم ترین تصنیف بُغْیَۃ الطلب فی تاریخ حلب ہے۔ یعنی حلب اس کے وطن کے مشاہیر کی تاریخ جو خطیب البغدادی [رک بآں] اور ابن عساکر [رک بآں] کے نمونے پر بہ ترتیب حروف تہجی دس (اور بعض مآخذ کی رو سے ۳۰) جلدوں میں مرتب ہوئی۔ یہ کتاب چونکہ بڑی ضخیم تھی اس لیے اس کا صاف شدہ نسخہ کبھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا نتیجہ یہ کہ تیمور کے زیر قیادت مغلوں کے حملے سے قبل ہی اس کے اجزا ہوا میں منتشر ہو چکے تھے؛ چنانچہ ابن الشحنۃ کو بھی اس کی صرف ایک جلد کا علم ہو سکا (دیکھیے *Cat. Codd. Arab. Bibl. Acad. Lugd. Bat.*، ۲ : ۸۲)۔ کچھ بے ترتیب اجزا پیرس (*Bibl. Nat.*, de Slane, *Cat.*، شمارہ ۲۱۳۸)، لنڈن (*Cat. Codd.*، ۲، شمارہ ۱۲۹۰) اور غالباً قسطنطنیہ، آیا صوفیہ عدد ۳۰۳۶ (دیکھیے Horovitz : *Mitt. Sem. Or. Spr.*، برلن، ۱۰ : ۶۰ : عدد ۱۰) میں محفوظ ہیں۔ اس کتاب کا خود کمال الدین نے ۶۴۱ھ/۱۲۴۳ء تک کا ایک خلاصہ زبدۃ الحلب فی تاریخ حلب کے نام سے تاریخی ترتیب کے ساتھ تیار کیا۔ لیکن اسے بھی صاف نہ کر سکا اور وفات پا گیا۔ [پہلی جلد طبع ہو چکی ہے]۔ پیرس کے قلمی نسخے (de Slane) ایک اور قلمی نسخہ سینٹ پیٹرزبرگ میں ہے جو غالباً پیرس والے نسخے ہی کی نقل ہے، دیکھیے V. Rosen : *Not. sommaires des manuscr. arabes du Musée Asiat*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۸۱، ص ۹۸، عدد ۱۶۰) سے حسبِ ذیل مصنفین نے استفادہ کیا : G.W. Freytag : *Selecta ex historia Halebi*، Lantetiae Par. ۱۸۹۱ء)؛ *Regnum Saahd-aldaulae in oppido Halebi* بون ۱۸۲۰؛ *Historiens Orientaux des Croisades*، ۳ : ۶۹۱ تا ۷۳۲؛ H. Derenbourge : *Vie d Ousâma* (*Publ. d l'Ec. des Langues or. viv.*، سلسلۂ دوم، ۱۲/۱، ۵۶۹ تا ۵۸۰؛ E. Blochet : *L'histoire d' Alep de Kamaladdin*، عربی متن کے بعد فرانسیسی ترجمہ در *Rev. de l'Orient latin*، ۱۸۹۶ء، ص ۵۰۹ تا ۵۶۵؛ ۱۸۹۷ء، ص ۱۴۶ تا ۲۳۵؛ ۱۸۹۸ء، ص ۳۷ تا ۱۰۷، ۱۸۹۹ء، ص ۳۷ تا ۱۰۷؛ ۱۸۹۹ء، ص ۱ تا ۴۹۔ اس کے آگے کا ۶ ربیع الآخر ۹۵۱ھ (۲۸ جون ۱۵۴۴ء) تک کا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

خلاصہ محمد ابن الحنبلی (م ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء) نے درّ الحبب فی تاریخ اعیان حلب کے نام سے تیار کیا دیکھیے Cat. Codd. Mss. Or. in Mus. Brit، عدد ۳۳۴؛ Bibl. Bodl. Codd. Mss. Orient، ۱، عدد ۸۱۰، ۸۳۶، دیکھیے ۲ : ۵۹۷؛ V. Rosen : Not. Sommaires، عدد ۲۰۳۔

انیسویں صدی عیسوی میں اصل بنیادی تصنیف بغیۃ کو آگے جاری رکھنے کی دوبار سعی کی گئی: (۱) علاء الدین ابوالحسن علی بن محمد بن خطیب الناصریۃ (م ۸۴۳ھ/۱۴۳۹ء) نے الدّر المنتخب فی تاریخ حلب، لکھی۔ یہ کتاب شہر حلب کے بیان اور ۶۵۸ھ سے (تحریر کتاب تک کے) ممتاز باشندگان حلب کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ Horovitz نے اس کے مخطوطات کی تفصیل Mitt. Sem. Or. Spr.، ۱۰ : ۶۰ ببعد میں دی ہے؛ (۲) محب الدین ابو الفضل محمد بن الشحنۃ الحلبی (م ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء) نے نزھۃ النواظر فی روض المناظر کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس کے مخطوطات برلن میں ہیں (Ahlwardt : Verz، عدد ۹۷۹۱)، جلد ۱ لنڈن میں (Cat. Codd. Or. in Mus. Brit عدد ۴۳۶، ۲)؛ جلد ۲ Gotha میں (Pertsch : Verz، عدد ۱۷۷۲)، جلد ۳، پیرس میں (de Slane : Cat، شمارہ ۲۱۳۹) ہیں۔ اس کتاب سے ابن الشحنہ کی اولاد میں سے ایک شخص نے ۱۰۱۴ھ اور ۱۰۲۴ھ کے درمیان ایک ملخص مرتب کیا جس میں جگہ جگہ اپنے زمانے کے لوائف سے متعلق حواشی تحریر کیے، اس ملخص کے مخطوطات کی فہرست Pertsch : Verz. d. Arab. Hdss. Zu Gotha، عدد ۱۷۲۳ : مزید برآں Cat. Codd. Arab. Bibl. Lugd.-Bat.، ۲ : ۸۵، عدد ۹۵۲ میں دی ہوئی ہے۔ اس ملخص دو الدّر المنتخب فی تاریخ مملکت حلب کے زیر عنوان Joseph Elias Sarkis نے بیروت سے ۱۹۰۹ء میں شائع کیا۔ A. v. Kremer نے Phil. Hist. Kl.، ۴ (۱۸۵۰ء)، ۱ : ۱۲۵ ببعد) اس کے اقتباسات (در Sitzungsber d. Wien Akad.) پیش کیے۔

اس نے اپنے خاندان کی جو تاریخ الاخبار المستفادۃ فی ذکر بنی ابی جرادۃ کے نام سے یاقوت کے لیے تحریر کی تھی اس کے اقتباسات یاقوت نے اپنی تصنیف ارشاد (معجم الادباء، ۶ : ۱۸ تا ۳۵) میں دیے ہیں۔ منظوم کلام میں اس کا ایک مرثیہ جو اس نے حلب کی تباہی پر لکھا تھا سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کے بعض اشعار بطور نمونہ ابوالفداء (کتاب مذکور) نے پیش کیے ہیں۔ اس نے ۶۱۰ھ/۱۲۱۳ء میں الملک الظاہر کی خدمت میں اس کے بیٹے الملک العزیز کی ولادت کے موقع پر ایک مکتوب تہنیت پیش کیا تھا جس کا نام الدراری فی ذکر الذراری رکھا تھا۔ یہ مکتوب مخطوطہ نوری عثمانیہ، شمارہ ۳۷۹۰ سے نقل کر کے مجموعہ، استانبول ۱۲۹۸ھ، شمارہ ۲ میں شائع کر دیا گیا ہے۔ آخری کتاب جو اس نے لکھی وہ الوصلۃ الی الحبیب فی وصف الطیبات والطیب ہے۔ اس میں ہر قسم کی خوشبوئیں اور عطر تیار کرنے کی ہدایات مندرج ہیں۔ قلمی نسخے برلن میں (Ahlwardt : Verz.، عدد ۵۴۶۳، برٹش میوزیم میں (Ellis اور Edwards : A descr. List of the Arab Mss. . . . . since 1894، لنڈن ۱۹۱۲ء : ص ۵۶، ۶۲، Or. ۶۳۸۸) اور بانکی پور میں (Cat. of the Arab. and Pers. Mss. in the Orient. Lib.، ۴ : ۱۴۶، شمارہ ۹۶) موجود ہیں۔ بقول یاقوت اس کا شمار مشہور ترین خوشنویسوں میں ہوتا ہے۔ اس کی خوشنویسی کے نمونے سینٹ پیٹرز برگ میں موجود ہیں (دیکھیے Cat. des Mss. et Xylographes Orient. de la Bibl. Imp.، عدد ۱۴۷)۔

مآخذ: (۱) یاقوت: ارشاد الاریب (سلسلۂ یادگار گب)، ۶ : ۱۸ تا ۳۶؛ (۲) ابن شاکر: فوات الوفیات، (بولاق ۱۲۹۹ھ)، ۲ : ۱۰۱؛ (۳) ابوالفداء، تاریخ،

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۴ : ۶۳۴؛ (۴) ابن قتاوبغا : طبقات الحنفیة (*Abh. f. d. Kunde des Morg.*، ۲ : لائپزگ ۱۸۶۲ء)، عدد ۱۴۳؛ (۵) Weijers : *Orientalia*، ۲ : ۲۰۸؛ (۶) Wüstenfeld : *Geschichtschreiber der Araber*، عدد ۳۴۰؛ (۷) Brockelmann : *Gesch. d. Arab. Lit.*، ۱ : ۳۳۲، [تکملہ، ۱ : ۵۶۸؛ (۸) الزرکلی : الاعلام، مع ماخذ].

(BROCKELMANN)

کمال الدّین اِسْمٰعیل : اصفہان کا ایک فارسی شاعر، جمال الدین عبدالرزاق کا بیٹا، ان شعرا کے زمرے میں شامل ہے جنھوں نے اصفہان کے دو مذہبی خانوادوں [آل صاعد اور آل خجند] کی شان میں مدحیہ قصیدے لکھے ۔ یہ وہ خاندان ہیں جنھوں نے اصفہان میں سیاسی اور عدالتی اختیارات اپنے قبضۂ اقتدار میں رکھے۔

ان کے قصائد زیادہ تر قاضی رکن الدین صاعد بن مسعود کی مدح میں ہیں، لیکن بعض خوارزم شاہی حکمرانوں (علاءالدین تکش اور اس کے بیٹے محمد اور پوتے جلال الدین اور غیاث الدین) کے قصیدے بھی کہے، جو عراق کے حکمران تھے، نیز اتابکان فارس (سعد بن زنگی اور اس کے بیٹے ابوبکر) اور حسام الدین اردشیر شاہ ماژندران کی مدح سرائی بھی کی ۔ [کمال اسمٰعیل اپنے اشعار میں نئے مضامین اور دقیق معانی لاتا ہے، اس لیے اس کے معاصرین اسے خلاق المعانی کہتے تھے ۔ کمال الدین معمولاً بغیر تشبیب قصیدہ شروع کرتا ہے اور کبھی کبھی گریز کے بعد ممدوح کی مدح کرتے ہوے پند آمیز شعر کہتا ہے ۔ وطن سے محبت کا اظہار بھی اس کے قصیدوں میں نمایاں ہے ۔ اصفہان میں مغول کے ہاتھوں جو خرابی و تباہی ہوئی اس پر بھی آنسو بہاتا ہے ۔ اس نے اپنے والد کا جو مرثیہ کہا ہے بہت پُر درد ہے] ۔ آخر عمر میں اس نے دنیا کو ترک کر دیا اور شیخ شہاب الدین عمر بن محمد السہروردی سے بیعت کر کے صوفیانہ اور زاھدانہ زندگی اختیار کر کے شہر سے باہر سکونت اختیار کر لی تھی ۔ جب چنگیز خان کے بیٹے اوکتای کی فوج نے اصفہان فتح کیا تو اس کے مغول سپاہیوں نے ۲ جمادی الاولی ۶۳۵ھ / ۲۱ دسمبر ۱۲۳۷ء کو کمال الدّین اسمٰعیل کو بڑی اذیت پہنچا کر ہلاک کر دیا، کیونکہ انھیں یہ امید تھی کہ اس کے گھر میں انھیں کوئی پوشیدہ خزانہ ملے گا ۔ اس کا دیوان بمبئی میں طبع ہو چکا ہے (تاریخ ندارد) ۔ اس کی ان پندرہ رباعیات میں سے جنھیں Salemann-Shukovski (*Persisch Grammatik*:) نے شائع کیا تھا، بعض کے Louis H. Gray نے انگریزی میں ترجمے کیے اور Ethel Watts Mumford (*Hundred Love Songs*، نیویارک ۱۹۰۳ء) اور Theodosis Garrison (*Lippincott's Mag.*، ۶۵ : ۷۸۳) نے ان ترجموں کو انگریزی نظم کا جامہ پہنایا۔

ماٰخذ : (۱) دولت شاہ : تذکرۃ الشّعراء، ص ۱۴۸ تا ۱۵۴؛ (۲) لطف علی بیگ آذر : آتشکدہ، مطبوعہ بمبئی، ص ۱۷۶؛ (۳) رضا قلی خان : مجمع الفصحاء، مطبوعہ تہران، ۱ : ۴۸۹ تا ۴۹۴؛ (۴) J. v. Hammer : *Schone Redekünste Persiens*، ص ۱۰۹؛ (۵) حمد اللہ المستوفی : تاریخ گزیدہ، سلسلۂ یادگار گب، (۱۳)، ۱ : ۸۲۴؛ (۶) H. Ethe در *Grundriss d. Iran Philologie*، ۲ : ۲۶۹؛ (۷) E.G. Browne : *A Literary History of Persia*، ۲ : ۵۴۰ ببعد.

(CL. HUART [و ادارہ])

کمال الدین پارسی : نور اور رؤیت کا مسئلہ فلسفے کے اہم مسائل میں سے تھا، لیکن آج فلسفے سے جدا (متصور) ہونے کی وجہ سے یہ مسائل علم طبیعیات کے بہت اہم مسائل میں شمار ہونے لگے ہیں ۔ تسلیم کرنا ہو گا کہ نور اور رؤیت ایسے

www.besturdubooks.wordpress.com

موضوعات ہیں جن کے متعلق ہر دور میں اہل فکر خصوصاً یونانی دور حکومت سے آج تک سوچتے رہے اور رنگ، نور اور رؤیت کے بارے میں تمام وہ آرا جو ابن سینا کی کتاب (علم النفس، مقالہ سوم) میں نقل ہوئی ہیں ان سب کا ماخذ یونانی فکر ہے۔ مسلمانوں نے ان پراگندہ و منتشر مسائل کو از سر نو ترتیب دے کر ایک مستقل علم کی شکل دی ہے۔

ابن الہیثم نے اپنے ذہن رسا کی مدد سے مذکورہ موضوعات کو بطلیموس کی کتاب ''مناظر'' میں شامل کیا اور اس میں ان موضوعات کا بھی اضافہ کیا جو ارشمیدس نے اپنے رسالے ''محدّب عدسہ'' میں بیان کیے ہیں۔ اپنی طرف سے اس نے آنکھ (کے موضوع) کو بھی جو دیکھنے کا ایک بہت بڑا آلہ ہے، ان مباحث میں شامل کر کے ان موضوعات کے مجموعے کو کتاب المناظر والمرایا کے نام سے پیش کیا۔

واضح رہے کہ ابن الہیثم کا کام ان موضوعات کی محض ترتیب و تدوین اور انہیں ایک اکائی کی شکل دینا ہی نہ تھا بلکہ اس نے ان میں سے ہر موضوع کا از سر نو مطالعہ کیا اور ان کے بارے میں تجربے کیے جن کو اس نے ''اعتبار'' کا نام دے کر ایک مفید اور دلچسپ علم ایجاد کیا۔

البیرونی جیسا ماہر ریاضی دان بھی جو مسائل طبیعی کا علم ریاضی کے مسائل کی طرح بڑی دقت کیساتھ مطالعہ کرتا تھا، ان مسائل (رنگ، نور اور رویت) کے متعلق تحقیق و جستجو میں دلچسپی رکھتا تھا؛ چنانچہ وہ آثار الباقیہ (ترجمۂ فارسی ص ۳۰۰) میں لکھتا ہے کہ نور اور شعاع کے موضوع پر میرے اور ابن سینا کے درمیان متعدد بار مباحثے ہوئے ہیں اور ان مباحثوں کو ایک دوسرے مقام پر میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یقیناً وہ کتاب تجرید الشعاعات والانوار ہے، لیکن اس گران قدر تصنیف کے متعلق اہل علم کو کچھ معلوم ہی نہ تھا حالانکہ وہ ان چند نادر کتابوں میں سے تھی جو اسلامی عہد میں نور کے متعلق لکھی گئیں۔ البیرونی نے اپنی ایک اور کتاب ''افراد المقال فی امر الظلال'' میں بھی رؤیت سے متعلق، ابو العباس ایرانشہری کے بیان کردہ، چند بڑے دقیق مسائل نقل کیے ہیں جو قدر و قیمت سے خالی نہیں۔

فارس کی مردم خیز سر زمین کے ایک فاضل نے جس کا پورا نام کمال الدین فارسی ہے، اپنے فطری ذوق و شوق کی بنا پر علوم عقلی کی تحصیل شروع کی اور جیسا کہ وہ خود اپنی کتاب ''تنقیح المناظر'' کے مقدمے میں لکھتا ہے، اسے شروع ہی سے نور اور رؤیت سے متعلق مسائل کو جاننے کا بڑا شوق تھا اور وہ اکثر اس کے متعلق سوچا کرتا تھا کہ پانی اور شیشے میں چیزوں کی رؤیت، ان کی حقیقی رؤیت سے مختلف ہوتی ہے۔ اس نے انعطاف نور کے متعلق بعض مسائل اور انعکاس و انعطاف سے پیدا ہونے والے بعض زاویوں کے بارے میں تو سن رکھا تھا، لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ان مسائل کو کونسی کتاب میں دیکھنا چاہیے اور ان افکار کا سرچشمہ کہاں ہے۔ جب وہ قطب الدین شیرازی کی خدمت میں پہنچا تو اس نے اس نوجوان کو ابن الہیثم کی کتاب پڑھنے کا مشورہ دیا۔ کمال الدین نے نہ صرف اس کتاب کا مطالعہ کیا بلکہ اس نے اس کتاب کی ایک تلخیص بھی تیار کی جس میں اس نے ابن الہیثم کے بیان کردہ مطالب کو اور زیادہ واضح الفاظ میں اور کہیں کہیں مزید دلائل کے ساتھ بیان کیا، دیکھیے (کتاب تنقیح المناظر، مطبوعۂ حیدر آباد، ۱ : ۴)۔

ابن سینا حدوث نور کو آنی (عارضی) سمجھتا تھا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

اور اس بات کا قائل تھا کہ جیسے ہی کوئی چیز آنکھ کے نور کے سامنے آتی ہے فوراً اس کی حالت میں ایک تبدیلی رونما ہوتی ہے جسے اس چیز کی روشنی اور نور سے تعبیر کیا جاتا ہے (الشفاء، علم النفس، مقالۂ سوم، فصل دوم)، لیکن ابن الہیثم نور کی حرکت کا قائل تھا اور اب اس حرکت کی رفتار کا یورپ والوں نے اثبات بھی کر دیا ہے ۔ ابن الہیثم نے غبار آلود اور تاریک کمرے میں جا کر یہ تجربہ کیا تھا کہ (باریک سوراخوں یا دروازوں کی درزوں کے ذریعے باہر سے آنے والی) شعاع بالکل سیدھی سمت سے حرکت کرتی ہے اور اس کی یہ حرکت ہمیشہ ایک ہی رخ کو ہوتی ہے ۔

ابن الہیثم نور کے علاوہ رنگ کی حرکت کا بھی قائل ہے ۔ اس نے لکھا ہے : ''غرض کہ رنگ ہمیشہ نور کے ساتھ ممزوج و متحرک ہوتا ہے اور چونکہ تمام رنگوں کے بارے میں جو تجربات ہوئے ہیں ان سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، اس لیے سمجھ لیا گیا ہے کہ رنگوں کی خاصیت طبیعی یہی ہے اور اگر نور کے ساتھ حرکت کرنے والے مدھم رنگ نظر نہ آئیں تو اس کا سبب یہ ہوگا کہ حس (باصرہ) انہیں دیکھنے سے قاصر رہتی ہے (تنقیح المناظر، ۱ : ۵ تا ۷)؛ نیز حرکتِ نور کے متعلق رجوع کیجیے کتاب مذکور، ۲ : ۱۳۰، جہاں وہ انعطافِ نور کے بارے میں بحث کرتا اور واضح طور پر کہتا ہے : ''ضو (یعنی نور) اجسام کثیفہ میں اس قدر تیزی کے ساتھ داخل ہوتی ہے کہ حس اس کی حرکت کو محسوس نہیں کر پاتی [البتہ یورپ والوں نے مشتری کے سیاروں کے طلوع اور غروب (کے مطالع کی مدد) سے اس حرکت کی رفتار کو معین کر دیا ہے)]۔

انگریز سائنس دان نیوٹن نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ دعوٰی کیا کہ خود نور ہی رنگ ہے اور نور و رنگ دو مختلف چیزیں نہیں ہیں، لیکن ابن الہیثم نے صریحاً لکھا ہے کہ نور اور رنگ دو الگ چیزیں ہیں جو ایک ساتھ ہوتی ہیں اور اکٹھی حرکت میں آتی ہیں ۔

رنگ کے بارے میں ابن الہیثم اور کمال الدین نے (اپنی کتابوں میں) جو بحثیں کی ہیں (اور نظریات پیش کیے ہیں) ان سے بعض ایسے اصول ہاتھ آئے ہیں جن سے (فن) نقاشی میں استفادہ کیا گیا ہے، مثلاً یہ کہ مدھم روشنی میں گاڑھے رنگ بھی مٹیالے سے نظر آتے ہیں، لیکن تیز روشنی میں (وہی رنگ) چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں (کارادوو : متفکرین اسلامی) ۔ اسی طرح ان دو عالموں نے آئینۂ مقعر اور آئینۂ محدّب کے متعلق جو بحثیں اٹھائی ہیں (اور اپنی آرا بیان کی ہیں) ان کے نتیجے میں دور اور نزدیک دیکھنے والی عینک ایجاد ہوئی ہے (اس کے لیے تنقیح المناظر، کے اس حصے سے رجوع کیا جائے جو ''مرایا'' کے نام سے لکھا گیا ہے اور جہاں آئینۂ محدب اور آئینۂ مقعر کے متعلق بحث ہوئی ہے) ۔

کہا جا سکتا ہے کہ کمال الدین پیدا نہ ہوتا تو ابن الہیثم کے علمی کارنامے قصہ پارینہ ہو کر رہ جاتے ۔ اس فاضل نے تنقیح المناظر لکھ کر نہ صرف اپنا بلکہ اس عرب عالم (ابن الہیثم) کا نام بھی زندہ جاوید بنا دیا ہے ۔ اس کی کتاب یورپ پہنچی تو وہاں راموس نے اس کی اصلاح کر کے فرانس کی ملکہ کیتھرین کی خدمت میں پیش کی (متفکرین اسلامی)۔

کمال الدین کی تنقیح المناظر، ابن سینا کا قانون البیرونی کا ''قانون مسعودی'' اور رازی کی ''الحاوی'' ایسی کتابیں ہیں جن کا جدید علوم اور جدید یورپ کی سائنسی ترقی میں بڑا حصہ ہے ۔ عینک، دوربین اور خوردبین کی ایجاد اور نور و رنگ کی طبیعی بحثیں انہیں دو حکما

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کے بیان کردہ نظریات کا نتیجہ ہیں ۔ جدید علوم نے ان کے نظریات کی تصدیق کر دی ہے ۔ کمال الدین نے ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء میں وفات پائی ۔ کارادّ وو: متفکرین اسلامی.

مآخذ: [(۱) براکلمان، تکملہ؛ ۲: ۲۹۰، لائیڈن؛ (۲) F. M. Shuja: *Cause of Reflection according to Kemal Din Abi A. Hassan al Farsi*، در *Proceedings of the third Session of Idara-Maarifia, held at Delhi*، ص ۵۷ تا ۶۸، لاہور ۱۹۴۲ء].

(اکبر دانا سرشت)

* کمال رئیس: سلطان بایزید ثانی کے عہد حکومت کا ایک ترک بحری چھاپا مار اور قپودان ۔ قپودان پاشا سنان نے اسے کم عمری میں سلطان کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کیا تھا ۔ اس کے بعد ایک پیش خدمت کی حیثیت سے اس نے دربار میں پرورش پائی، اس کے دور زندگی کا آغاز عزب کے سردار کی حیثیت سے ہوا ۔ پھر وہ بحیرۂ روم میں ترک تازیاں کرنے لگا اور ۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء میں اس نے مالٹا کے ایک شہزادے کو گرفتار کر لیا (سجل عثمانی، ۴: ۷۸) ۔ ۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء میں اس نے بایزید کے حکم سے ہسپانیہ کے ساحل پر حملہ کیا جس کی غرض یہ تھی کہ اس طریقے سے غرناطہ کے آخری ناصری سلطان مولای حسن کی مدد کی جائے جس نے اپنے آپ کو خطرات میں گھرا دیکھ کر سلطان سے مدد کی درخواست کی تھی ۔ اس حملے کا ذکر حاجی خلیفہ نے فقط تقویم التواریخ میں کیا ہے، لیکن اس کی بحری جنگوں کی داستان (تحفۃ الکبار) میں اس کا کوئی ذکر نہیں اور بظاہر اس واقعے کا علم دوسرے مؤرخین کو بھی نہیں ہو سکا ۔ بہرحال یہ کوئی بہت زیادہ اہم واقعہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس زمانے میں سلطنت عثمانیہ مصر اور آسٹریا کے خلاف جنگوں کی وجہ سے شدید مشکلات میں مبتلا تھی ۔ ۹۰۳ھ/۱۴۹۷-۱۴۹۸ء میں کمال رئیس بحیرۂ روم کے مشرقی حصے میں دوسرے بحری چھاپا ماروں کے ساتھ مل کر لوٹ مار کرتا رہا ۔ اس نے عیسائیوں کے کئی جہاز پکڑ لیے اور اس مال غنیمت کو سکندریہ کے 'بے' کے پاس لے آیا (عاشق پاشا زادہ، ص ۲۰۰)، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شاید وہ سلطان کی ملازمت میں نہیں تھا، لیکن جب ترکوں کی وینس سے جنگ چھڑی (۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء) تو وہ ترکی بیڑے کا ایک امیر البحر تھا ۔ ترکی بیڑے میں تین مسلح اور غیر معمولی طور پر بڑے جنگی جہاز تھے (ترکی: کوکہ)، ان میں سے ایک جہاز کی کپتانی قپودان پاشا داؤد کے ہاتھ میں تھی اور باقی دو کے کپتان کمال رئیس اور بُراق رئیس تھے (منجم باشی نے بُداق لکھا ہے، اسی طرح Leunclavius (اسے Budacus لکھتا ہے) ۔ Spienza کی بحری لڑائی (۲۸ جولائی ۱۴۹۹ء) میں وینس والوں کو دھوکا ہوا اور انھوں نے بُراق رئیس کے جہاز کو کمال رئیس کا جہاز سمجھ لیا جس سے وہ خاص طور پر انتقام لینا چاہتے تھے، چنانچہ براق رئیس کے جہاز پر وینس کے دو بڑے اور کئی چھوٹے جہاز حملہ آور ہوئے ۔ براق نے جلتے ہوئے لنگر سے مدافعت کی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اور اس کے دشمن دونوں بھک سے اڑ گئے ۔ جزیرۂ Spienza کا نام اس واقعے کی یاد میں براق رئیس "آلہ" سی پڑ گیا ۔ اس جنگ کے بعد ترکی بیڑے نے انی بختی (Lepanto) پر قبضہ کر لیا ۔ اس سے اگلے سال جب ترکی بیڑے نے تورون Koron اور مودون Modon کے شہر فتح کر لیے تو کمال رئیس کو ۴۰ جہاز دے کر Navarino (ترکی: ناوارین) پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا گیا اور اس نے اس شہر کا قلعہ وینسی سپہ سالار Contarini سے چھین لیا ۔ قاموس الاعلام، (۵: ۳۸۸۶) کی رو سے اس نے

www.besturdubooks.wordpress.com

دسویں صدی کے آغاز میں وفات پائی ۔ موت کا سبب یہ ہوا کہ اس کا جہاز ڈوب گیا تھا (سجلّ عثمانی).

مآخذ: (۱) مُنَجِّم باشی: صحائف الاخبار، قسطنطینیہ ۱۲۸۵ھ، ۳: ۳۲۳، ۳۲۷؛ (۲) حاجی خلیفہ: تحفۃ الکبار فی اسفار البحار، استانبول ۱۱۴۱ھ، ورق ۸، ۹؛ (۳) عاشق پاشا زادہ: تاریخ آل عثمان، استانبول ۱۳۳۲ھ، ص ۲۵۰؛ (۴) سعد الدّین: تاج التواریخ، قسطنطینیہ ۱۲۷۹ھ، ۲: ۶۰۰؛ (۵) von Hammer: *Gesch. des Osm. Reiches*، پسٹ ۱۸۲۸ء، ۲: ۲۹۵، ۳۱۶، ۳۱۸، ۳۲۷، ۶۰۲؛ (۶) Leunclavius: *Annales Sultanorum Othmanidarum*، فرینکفرٹ ۱۵۹۶ء، ص ۱۹۶.

(J. H. KRAMERS)

کمال، محمد نامق: ترکی کے عظیم ترین شعرا، صاحب طرز انشا پردازوں اور مصنفین میں سے ایک، جدید ترکی مصنفین کا بڑا رہنما، جدید ترکی نثر کا بانی اور عصر حاضر کا ممتاز ترین محب وطن ترک ۔ کمال ۲۱ دسمبر ۱۸۴۰ء/۲۶ شوال ۱۲۵۶ھ کو ردوسجق Rhodosto [کی قضا تکفورطاغی] میں پیدا ہوا جو بحیرۂ مارمورا Marmora کے ساحل پر واقع ہے ۔ اس کا تعلق امرا کے ایک قدیم خاندان سے تھا اور اس کا سلسلۂ نسب اس کے باپ مصطفٰی عاصم بے، عالم ہیئت و نجوم، اور اس کے دادا شمس الدّین بے، سلطان سلیم ثالث کے حاجب اول، اور اس کے پردادا امیر البحر قپودان احمد راتب پاشا کی وساطت سے صدر اعظم طوپال عثمان پاشا سے جا ملتا ہے جس نے ایران کے نادر شاہ کو ہزیمت دی تھی ۔ اس کا باپ آناطولی کے ینی شہر کا رہنے والا تھا اور ماں قونیجہ Konica کی تھی جو البانیا میں واقع ہے ۔ اس البانوی عنصر کا اثر اس کے مزاج میں سب سے زیادہ نمایاں تھا اور اسی سے اس کی انتہائی سرکش اور جوشیلی طبیعت کا راز بہت کچھ سمجھ میں آ جاتا ہے ۔ ظاہری شکل و شباہت میں وہ بالکل کسی یورپی کی طرح تھا ۔ وہ بلند نظر، وسیع القلب اور ایک جاذب شخصیت کا مالک تھا.

کمال کو گھر پر کسی قدر بے قاعدہ اور بے نظام تعلیم ملی ۔ اس نے قسطنطنیہ میں رشدیہ بایزید اور 'والدہ مکتبی' میں صرف نو ماہ تک باقاعدہ درسی نظام کے مطابق تعلیم حاصل کی ۔ اس کے نجی اتالیق نے اسے عربی، فارسی اور فرانسیسی سکھائی ۔ ۱۸۵۲ء میں وہ اپنے دادا شمس الدین بے کے ساتھ قارص میں اور کچھ دن بعد صوفیا میں مقیم رہا اور یہیں اس نے چودہ برس کے سن میں بالکل سنبل زادہ [وہبی] کے انداز میں شاعری شروع کر دی ۔ اس کے سامنے اور شاعروں کے کلام کے نمونے نہیں تھے، اس لیے دیوان سنبل زادہ ہی اس کے لیے نمونہ بن گیا ۔ ۱۸۵۷ - ۱۸۵۸ء میں قسطنطنیہ واپس آ جانے کے بعد وہ باب عالی کے دارالترجمہ میں داخل ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں دبستان قدیم کے متبع شعرا کی جماعت کا ایک رکن بن گیا جو اس وقت بہت فروغ پا رہے تھے ۔ اس جماعت میں نائلی، مظلوم پاشا زادہ، ممدوح فائق، حالت، ہرسکی، عارف حکمت، غالب اور کاظم تھے جو زیادہ تر نفعی اور فہیم کے نقش قدم پر چل رہے تھے ۔ کمال نے بہت جلد ان شاعروں میں ایک بلند رتبہ حاصل کر لیا اور ایک مختصر سا دیوان بھی مرتب کیا، گو اس کی ان نظموں میں کچھ زیادہ تازگی اور جدت نہ تھی ۔ اپنی نظموں میں اس نے اپنا تخلص نامق رکھا ۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس دیوان کی آخری ناتمام غزل اس کی پہلی قومی نظم ہے.

جس اسلوب انشا کا آگے چل کر وہ بانی ہوا اس کے میدان عمل میں اسے ابتدا میں داخل ہونے کا موقع 'شناسی افندی' کی وساطت سے میسر آیا ۔ شناسی

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

افندی نے یورپ میں تعلیم پائی تھی اور اُس وقت وہ قسطنطینیہ میں اس کوشش میں مصروف تھا کہ ارباب فہم کو مغربی افکار و ثقافت کی طرف متوجہ کرے اور اس کے لیے بڑا ذریعہ اس کا اخبار تصویر افکار تھا جو اس کے زیر ادارت شائع ہوتا تھا ۔ کمال کے شناسی سے دوستانہ تعلقات قائم ہوے اور بہت جلد وہ پوری طرح اس کے زیر اثر آ گیا ۔ اس اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قدیم انشا پردازی کی تقلید کو چھوڑ کر مغربی انشا پردازی کی روح حاصل کرنے کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گیا ۔ کمال نے بڑی سرگرمی سے نئے افکار کو اپنانا شروع کر دیا کیونکہ ان کی اہمیت اس پر زور روشن کی طرح واضح ہو چکی تھی ۔ اب اس نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دیا کہ پرانی متحجر (fossilised) ترکی میں جدید ادبی، سیاسی اور سائنسی نہضت علمیہ برپا کی جائے، تاکہ ترکی کے لیے اقوام مغربی کی صف میں جگہ پیدا ہو جائے ۔ اس نے اپنی پُر آشوب زندگی کا آغاز شناسی کے اخبار کے لیے مقالات لکھنے سے کیا ۔ اس وقت سے اس نے جو کچھ لکھا کمال کے نام سے لکھا اور یہ نام لوگوں میں بہت جلد مقبول اور ہر دلعزیز ہو گیا ۔

جب ۱۸۶۴ء میں شناسی [رک باں] کو پیرس کو فرار ہونا پڑا تو وہ اپنے اخبار کی ادارت کا پورا کام نوجوان کمال کے سپرد کر گیا ۔ شروع شروع میں تو یہ کام کمال کو بہت ہی دشوار معلوم ہوا اور ایک سال تک اس نے سوا فرانسیسی ترجموں کے کوئی چیز شائع نہ کی ۔ اس کے بعد کچھ اہم سیاسی مسائل (پولینڈ کی بغاوت اور امریکہ کی خانہ جنگی) سامنے آئے ۔ ان سے اپنے اپنے اخبار کا معیار، جو بہت پست ہو چکا تھا، بلند کرنے میں مدد ملی، چنانچہ اس نے میدان سنبھالا اور اپنے قلم سے سیاسی مقالات لکھ کر شائع کرنا شروع کیے جن سے چاروں طرف شور مچ گیا، لوگ ان مقالات کو بڑی دلچسپی سے پڑھنے لگے، اور تصویر افکار سب سے زیادہ بااثر اخبار بن گیا ۔ یہی اخبار تھا جس کے صفحات پر سب سے پہلے ''نوجوان ترک'' کی اصطلاح نظر آئی ۔

اب کمال حکومت وقت کے لیے روز افزون پریشانی بنتا چلا گیا ۔ گو اس کی عمر صرف ۲۳ سال تھی، لیکن اسے قلعۂ سلطانیہ (گیلی پولی) کے متصرّفِ قلق کا عہدہ دیا جا چکا تھا ۔ اب ارباب حکومت یہ چاہتے تھے کہ اسے ایران میں سفیر متعین کر کے قسطنطینیہ سے دور بھیج دیا جائے، لیکن کمال نے یہ عہدہ قبول نہیں کیا ۔ پھر اسے ارز روم بھیجا جانے لگا اور اس نے بڑی مشکل سے اپنی جان اس سے بچائی ۔ اس وقت کمال نوجوان ترکوں کی انجمن میں شامل ہو چکا تھا جس کی بنیاد ضیا [پاشا] نے ان عناصر کے درمیان رکھی تھی جو اصلاحات کے حق میں تھے ۔ ان کا مقصد خاص یہ تھا کہ ترکی کو موجودہ پسماندہ حالت سے نکال کر وہاں ایک آئینی حکومت قائم کی جائے ۔ جب ارکان انجمن کو اپنی گرفتاری کا خطرہ پیدا ہوا تو ۱۸۶۶ء میں ضیا، کمال نوری، رفعت اور علی سعاوی ترکی سے بھاگ کر لنڈن چلے گئے اور وہیں مقیم ہو گئے ۔ اپنی اس پہلی خود اختیار کردہ جلا وطنی کے وقت کمال اپنے پہلے بچے کی پیدائش کا منتظر تھا ۔ یہ بچہ آگے چل کر شاعر علی اکرم مشہور ہوا ۔ لنڈن میں کمال نے اپنی جماعت کی ترجمانی کے لیے اخبار مخبر (خبر نگار) شائع کیا ۔ کچھ مدت بعد اس اخبار کو پیرس منتقل کر دیا گیا اور پھر حریت (آزادی) نے اس کی جگہ لے لی ۔ پیرس میں رہ کر کمال نے قانون اور اقتصادیات کا مطالعہ کیا اور زیادہ اہم فرانسیسی تصنیفات کو ترکی میں منتقل کیا ۔

قیام یورپ نے اس کے سیاسی اور ادبی ارتقا

www.besturdubooks.wordpress.com

پر بہت گہرا اثر ڈالا ۔ اس کے بعد وہ بار بار ثقافت پر قلم اٹھاتا نظر آتا ہے ۔ جب علی پاشا صدر اعظم کی وفات کے بعد نوجوان ترکوں کو وطن واپس آنے کا موقع ملا تو کمال نے نوجوان ترکوں کے مجلّہ عبرت کی عنان ادارت سنبھالی ۔ کمال اپنے مقالوں کی بدولت، جن کی ایک مستقل اور پائدار قدر و قیمت ہے، اس مجلّے کو ترکی کے اہم ترین مجلات میں سے ایک بنانے میں کامیاب ہو گیا ۔ اسی زمانے میں اس نے متعدد دوسرے اخباروں اور مجلوں کے لیے بھی مقالات لکھے اور اس طرح رائے عامّہ پر اپنا پورا اثر جما لیا اور ان کے خیالات میں کامل انقلاب پیدا کر دیا ۔

کمال کی سیاسی سرگرمیاں حکومت کی نظروں میں بری طرح کھٹکنے لگیں، خصوصاً اس کے قومی ڈرامے وطن نے تو لوگوں میں بے حد جوش و خروش پیدا کر دیا ۔ مجبوراً حکومت نے اسے قبرص کے قلعے فاماغوستا Famagusta میں جلاوطن کر کے بھیج دیا ۔ ابتدا میں اسے بہت سخت قید تنہائی میں رکھا گیا اور یہیں اس نے اپنے زمین دوز حجرے میں اپنے ڈرامے عاکف بے کا منصوبہ تیار کیا اور جونہیں قید کی سختی کچھ کم ہوئی اس نے اسے لکھ کر چھپوا دیا ۔ فاماغوستا Famagusta میں وہ ۳۸ ماہ تک قید رہا، تاآنکہ سلطان مراد تخت پر بیٹھا اور اسے رہائی نصیب ہوئی اور قسطنطنیہ واپس آنے کی اجازت مل گئی، لیکن مراد کی حکومت صرف ۹۳ روز رہی ۔ اس کے بعد عبدالحمید کا دور حکومت آیا اور بہت جلد کمال کی سرگرمیوں پر پھر پابندی عائد کر دی گئی ۔ کمال نے آئین کی تشکیل میں حصہ لیا اور مدحت پاشا اور ضیا پاشا کے ساتھ مل کر اس کی تنقید و تمحیص کا کام بھی سر انجام دیا ۔

اس کی حریت پسندانہ کارروائیوں نے عبدالحمید کے دل میں اس کی جانب سے بہت زیادہ گہری بےاعتمادی پیدا کر دی ۔ اسے گرفتار کر کے ساڑھے پانچ ماہ تک قسطنطنیہ کے عام قید خانے میں رکھا گیا ۔ یہاں اس نے اپنا سارا وقت ترک فوج کی تاریخ کی تیاری کے سلسلے میں تاریخی کتب کے مطالعے میں صرف کیا ۔ اگرچہ عدالت نے سماعت مقدمہ کے بعد اسے رہا کر دیا تھا پھر بھی عبدالحمید نے اسے نظر بند کر کے Mytilene (ساقز Chios) بھیج دیا ۔ روس کی جنگ کا خاتمہ تباہ کن نتائج پر ہو چکا تھا ۔ ان حالات میں یہ زبردستی کی پابندی اور بیکاری کمال کے لیے بڑی تکلیف دہ تھی، چنانچہ اس نے اپنے گیتوں میں اپنے الم انگیز جذبات کا اظہار کیا ہے جن کا ایک نمونہ مہاجر کا یہ دردناک گیت ہے ''اللہ اچن ایلدیر بنی'' [خدا کے لیے مجھے مار دے]۔

دو سال کی نظر بندی کے بعد جس کے دوران میں اس نے جلال اور جزمی کتابیں لکھیں اسے ساقز (Chios) کا متصرف بنا دیا گیا ۔ یہاں اس پر پھیپھڑوں کی اس بیماری کا پہلا حملہ ہوا جو آگے چل کر اس کی موت کا باعث بنی ۔ جب ساقز ایک ولایت کا صدرمقام بن گیا تو کمال کو رودس تبدیل کر دیا گیا جہاں کی ساز گار آب و ہوا میں اس کی صحت عود کر آئی اور اس کی تخلیقی قوتیں جو کسی قدر کم ہو گئی تھیں پھر بحال ہونے لگیں ۔ ایک شاندار کتاب خانے کی مدد سے جس کی توسیع کے لیے اس نے گراں قدر ذاتی خرچ پر ہندوستان، ایران، مصر اور یورپ میں اپنے کارندے مقرر کر رکھے تھے، اس نے ترکی سلطنت کی تاریخ لکھنے کی تیاریاں شروع کر دیں ۔

رودس سے اسے پھر متصرف کے عہدے پر ساقز بھیج دیا گیا ۔ اس نے بڑے جوش اور تندھی سے اپنا تاریخ نویسی کا کام جاری رکھا، حالانکہ اس کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی ۔ دیگر تمام

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

اصناف ادبی میں بھی اس نے اچھی خاصی سرگرمیاں جاری رکھیں ۔ اس کے خلاف کسی دشمن کی مخبری پر قسطنطنیہ سے فرمان صادر ہوا کہ تاریخ نویسی کا کام اور اس کی طباعت دونوں روک دیے جائیں۔ یہ ایک بڑا خوفناک وار تھا؛ چنانچہ ۲ دسمبر ۱۸۸۸ء کو اسے یہ فرمان وصول ہوا اور اسی رات Mytilene کے مقام پر اس نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی ۔

اسے پہلے تو Mytilene میں مسجد کے بالکل سامنے دفن کیا گیا اور پھر اس کا بیٹا علی اکرم سنجیدہ رسوم کے ساتھ اس کی میت کو بُلیر Bulair لے گیا جو گیلی پولی سے ۸ میل مشرق میں واقع ہے اور وہاں اسے سلیمان پاشا کے مقبرے میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا ۔ یہ اعزاز اس جلیل القدر محبِ وطن کے بالکل شایان شان تھا ۔ عبدالحمید نے کمال کا ایک شاندار مقبرہ (تربہ) تعمیر کرایا ۔ اس سے قبل سلیمان پاشا کی تربت تو زیارت گاہ تھی، اب کمال کی تربت بہت سے ترکوں کے لیے اس سے کہیں زیادہ مرجعِ ارادت بن گئی کیونکہ انھیں کمال کے اندر اپنے دلی مقاصد کی زندہ تصویر نظر آئی ۔ انجمن اتحاد و ترقی نے ۱۹۰۸ء کا انقلاب برپا کرنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ سالونیکا سے اس کے ارکان احترام و تعظیم کے جذبات لیے ہوئے بُلیر Bulair پہنچے اور کمال کی قبر پر حاضر ہو کر اس مؤسسِ قصرِ حریت کی روحِ پُرفتوح کو بادبِ خراجِ عقیدت پیش کیا ۔ اس جماعت نے کامیابی حاصل کرنے کے بعد جس بے نظیر اعتدال و سکون سے اپنا کام جاری رکھا وہ بھی کامل کی بلند خیالی کا اثر تھا جس کے لیے وہ تحسین و آفرین کا مستحق ہے ۔

عثمانی ادب میں کمال کو جو اعلیٰ ترین اور بے مثال مقام حاصل ہے اس کا ہم جتنا بھی اونچا اندازہ کریں کم ہے ۔ اس نے اپنے معاصرین پر اور آنے والی نسل پر بہت ہی گہرا اثر ڈالا ہے ۔ اسے اپنے کام کی دشواریوں کا پوری طرح احساس تھا، لیکن اسے ہمیشہ یقین واثق تھا کہ ان مساعی کے نتائج بہت خوش آیند و مبارک ہوں گے اور یہ بات اس کی پُرجوش طبیعت کے بالکل مطابق تھی۔ اگرچہ وہ طبقۂ امرا میں پیدا ہوا تھا، لیکن سیاسی تحریکوں کی قیادت کی صلاحیت اس میں پیدائشی طور پر موجود تھی اور وہ کاملاً انقلابی تھا ۔ اس کی سرگرمیٔ عمل نیز غیر معمولی عزم و ارادہ عوام کے دلوں کو موہ لیتا تھا ۔ وہ گہرے دینی جذبے سے سرشار تھا ۔ اس کا زاویۂ نگاہ کلیۃً اسلامی تھا اور اسے اپنی قوم، اپنے ملک اور ان دونوں کے مستقبل پر پورا بھروسا تھا ۔ صحیح ثقافت اسلامیہ پر اعتقاد رکھتے ہوئے، جس میں اتحادِ عالمِ اسلامی کے رجحانات بہت قوی تھے، اس نے اس کے حصول کی کوشش کی اور اس غرض کے لیے اصلی ابتدائی اسلام کو اپنا نصب العین قرار دیا اور درمیانی اسلامی دور کو جس سے وہ بالکل مطمئن نہ ہو سکا، قطعاً نظر انداز کر دیا ۔ حقیقی اسلام کے احیا کے لیے اس نے ضروری سمجھا کہ ترکوں میں پہلے جذبۂ حب الوطنی پیدا کرے، چنانچہ اس کے ذریعے وہ اپنی خوابیدہ قوم کے ملّی جذبات کو بیدار کرنے میں کامیاب ہوا ۔ کمال پہلا شخص ہے جس نے اپنے ہم وطنوں کے دلوں کو گرمانے کے لیے سب سے پہلے تصور وطن کو جاگزیں کیا جس کی جگہ بعد ازآں ترکی لفظ یؤرت استعمال ہونے لگا ۔ اس کے بعد قومیت اور حریت کے تصورات بروے کار آئے اور یہی نوجوان ترکوں کے نعرے اور نصب العین بن کر رہ گئے ۔

کمال نہایت استقلال سے اپنے کام میں لگا رہا، اگرچہ حالات سخت ناہموار اور پیچیدہ تھے ۔

www.besturdubooks.wordpress.com

اس کے نزدیک اس کا مقصد مقاصد رسالت کا ایک حصہ تھا جس کی تکمیل ضروری تھی ۔ اس کا سلیقۂ تصنیف و انشا کچھ کم درجے کا نہ تھا، لیکن اس سے اس تقریباً مافوق العادۃ اثر کی پوری توجیہ نہیں ہوتی جو اس نے اپنی قوم پر ڈالا اور آج تک ڈال رہا ہے ۔ عثمانی ادب کے جدید ترین نقادوں کا رجحان اس طرف ہے کہ اسے مصنف کی حیثیت سے بہت زیادہ بلند مرتبہ نہ دیا جائے، لیکن اس سے کوئی نقاد انکار نہیں کر سکتا کہ جو صفات اسے سب سے زیادہ بلند مقام عطا کرتی ہیں وہ اشتیاق حریت، حب الوطنی، بے باکانہ جرأت اظہار خیالات اور سب سے بڑھ کر اس کی قادر الکلامی ہیں ۔ جب اس نے لکھنا شروع کیا ہے اس وقت زبان کی حالت ابتر تھی، لیکن جب اس کی وفات ہوئی جو عمر طبعی تک پہنچنے سے پہلے ہی واقع ہوئی تھی تو ترکی زبان ایک حیرت انگیز ترقی یافتہ آلۂ اظہار خیالات بن چکی تھی ۔ موجودہ ترکی کی نثر نویسی کی ایجاد کا سہرا کمال کے سر ہے ۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ۔

سیاسی اور ادبی مقالات میں کمال کے استدلال میں زور اور اثرانگیزی ہوتی ہے ۔ جب وہ کسی رائے کی حمایت کرتا ہے تو یہ دونوں قوتیں اپنا کام کرتی ہیں ۔ مقالہ نگاری میں کوئی شخص بھی کمال سے نہیں بڑھ سکا ہے ۔ اس کی زیادہ طویل تصنیفات مقالات کے ایک سلسلہ وار مجموعے سے زیادہ مشابہ معلوم ہوتی ہیں نہ کہ کسی ایک مربوط تصنیف سے ۔

کمال کو کس قدر نظر استحسان سے دیکھا جاتا تھا اس کا اندازہ متبعین کی کثرت تعداد سے کیا جا سکتا ہے جنھوں نے اس کے اسلوب کی نقل کی ۔

کمال کی تصانیف : کمال ابتداءً شاعر نہیں تھا ۔ اپنے دیوان کے علاوہ جو پرانی طرز میں لکھا گیا ہے، گو اس میں بھی جدید خصوصیات (حب الوطنی اور حب ابنائے وطن) کی جھلک نظر آنی شروع ہو گئی ہے اور نئی مخترعات (تھئیٹر، اسٹیمر) کے تصورات بھی پائے جاتے ہیں، غزل کے میدان میں اس نے چند ایسی زور دار نظمیں کہی ہیں جو وحی کی طرح زبانزد خلق ہو گئیں ۔ اس کی طرز کے بسرعت مقبول عام ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ابھی تک اپنے کلام میں پرانے خیالات کی کچھ نہ کچھ طرف داری کر جاتا تھا ۔ اس کی بہت سی نظمیں اس کی تصنیفات میں بکھری پڑی ہیں اور بہت سی غیر مطبوعہ شکل میں دست بدست لوگوں کے پاس پہنچ گئیں ۔ ان تمام نظموں سے اس کا گہرا جذبۂ حب الوطنی ظاہر ہوتا ہے ۔

اپنی نظم واویلا ''(اظہار تاسف، شیون) (طبع دوم ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء) میں کمال اپنے وطن کے لیے آہ و زاری کرتا ہے جو کفن میں لپٹا پڑا ہے؛ اس کی نظم بارقۂ ظفر (کامیابی کی چمک) (۱۸۷۲ء) میں جو ایک بلند پایہ اسلوب میں لکھی گئی ہے، فتح قسطنطنیہ کی مدح سرائی کی گئی ہے ۔ اس کی پر جوش نظم وطن منظوسی ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء میں کہیں جا کر طبع ہوئی [یہ نظم جس میں نامق کمال نے ترکی کی بے بسی اور خراب خستہ حالت بہت پر تاثیر الفاظ میں بیان کی ہے ، ایک ترجیع بند کی شکل میں ہے جس میں ہر تین ہم قافیہ مصرعوں کے بعد یہ شعر آتا ہے :

وطنگ با غرینہ دشمن طیاری خنجرینی
یوق ایمش تور تارہ جق بختی قدہ مادرینی

یعنی دشمن نے وطن کے سینے پر اپنا خنجر رکھ دیا ہے، شاید اپنی اس سیاہ بخت ماں کو بچانے والا کوئی نہیں''] ۔

ایک مصنف کی حیثیت سے کمال کی اصل کامیابی کا راز اس کی تمثیلی حکایات میں مضمر ہے

www.besturdubooks.wordpress.com

جو تعداد میں چھے ہیں ۔ ہم اسے ترکی ڈرامے کا موجد کہہ سکتے ہیں ۔ ابوالضیاء توفیق کا، جو اس کا سب سے زیادہ عقیدت مند دوست اور پیرو تھا، ڈراما اجلِ قضا (تقدیر محذور) (۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ - ۱۸۷۲ء) ترکی میں پہلا قومی ڈراما ہے اور اس کی تیاری کے سلسلے میں کمال نے نہایت خاموشی سے معاونت کی اگرچہ اس کا نام کہیں نہیں لیا گیا ۔ اس کے بعد اس نے اپنی استعداد سے بلا شرکت غیرے کام لیا اور حسب ذیل ڈرامے لکھے :

۱ ۔ وطن یا خود سِلستره، چار ایکٹ کا ڈراما، پہلی بار ۱۸۷۲ء میں اور اس کے بعد کئی دفعہ طبع ہوا (روسی میں ترجمہ از W.D. Smirno، در *Wiestnik Ewropi*، ۱۸۷۶، ۹: ۱۵۱؛ جرمن ترجمہ از L. Pekotsch، وی انا ۱۸۸۷ء) ۔ یہ ڈراما جو عمرانی اور نفسی نقاط نظر سے اہم ہے شجاعت اور مردانگی کے ان مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے جو ۱۸۵۴ء میں سلستره کی مدافعت کے وقت رونما ہوئے تھے ۔ اس ڈرامے نے لوگوں میں بے انتہا جوش و خروش پیدا کیا اور Famagusta میں کمال کی جلا وطنی کا سب سے بڑا باعث یہی تھا .

۲ ۔ زوالی چوجق (''بےچارہ لڑکا'') تین ایکٹ کا ڈراما (۱۸۷۳ء)، اس میں بچے پر والدین کے بے جا دباؤ کے برے اثرات بیان کیے گئے ہیں اور رواج کے مطابق شادیاں طے کرنے کے طریقے کی مخالفت کی گئی ہے ۔ کمال نے اس میں نئے زمانے کے اس خیال کی تائید کی ہے کہ عورتوں کو ان کے احساسات اور عواطف میں جائز آزادی دی جائے ۔ اس میں ''La Dame aux Camelias'' کا اثر بلاشک و شبہہ نمایاں ہے .

۳ ۔ عاکف بے، پانچ ایکٹ کا ڈراما (۱۸۷۴ء)، اس میں ترکی بحری فوج کے ایک افسر کی حب الوطنی کی روداد لکھی گئی ہے اور اس کا مقابلہ اس کی بیوی کی بیوفائی اور تلون مزاجی سے کیا گیا ہے جو اپنے خاوند کی عدم موجودگی سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے .

۴ ۔ گل نہال، پانچ ایکٹ کا ڈراما (۱۸۷۵ء) غالباً اس کی بنیاد [شیکسپیر کے ڈرامے] ہملٹ پر رکھی گئی ہے ۔ اس میں جذبۂ انتقام کو سراہا گیا ہے اور خصوصاً استبداد کے خلاف عورت کی ہاؤت اور انتقام کو قابلِ تحسین و آفرین قرار دیا گیا ہے .

۵ ۔ جلال الدین خوارزم شاہ، پانچ ایکٹ کا ایک المیہ ڈراما (۱۸۷۵ء) جس کے ساتھ عثمانی ادبیات اور ڈرامے کی ہیئت و اسلوب کے نقائص سے متعلق ایک طویل ادبی مقدمہ شامل ہے ۔ یہ ڈراما سب سے پہلے رودوسلی صالح جمال نے ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء میں شائع کیا ۔ اس کے بعد قاہرہ میں بغیر مقدمے کے ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء، میں شائع ہوا ۔ فقط مقدمہ مجموعۂ ابوالضیاء، عدد ۴۱ (۱۸۸۵ء) اور کتاب خانۂ ابوالضیاء، عدد ۶۹ میں چھپا ہے ۔ یہ ایک روحانی (المیہ) افسانہ ہے جو تاریخ ایران سے ماخوذ ہے اور ہیوگو Hugo کے *Cromwell* اور *Hernani* کے نمونے پر لکھا گیا ہے ۔ جلال کو ترکی ادب کے روحانی دور کا نقطۂ عروج تصور کیا جاتا ہے ۔ یہ ڈراما صرف پڑھنے کی غرض سے لکھا گیا تھا اور اس میں سلاطین آل عثمان کے نظام حکومت کے خلاف بڑی پرجوش صدائے احتجاج بلند کی گئی ہے ۔ اس کے اس نمایاں رجحان کے باعث محتسبان حکومت اس ڈرامے پر ہمیشہ پابندیاں عائد کرتے رہے [سجاد حیدر یلدرم کے قلم سے اس کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے] .

۶ ۔ قره بلا (''کالی بلا'') پہلی بار ۱۹۰۸ء میں کلیات میں شائع ہوا ۔ یہ ڈراما ۱۹۰۸ء میں Famagusta میں لکھا گیا تھا اور اس میں ہندوستان کے ایک شہنشاہ کی بیٹی کی ایک حبشی کے ہاتھوں بےحرمتی کی حکایت بیان کی گئی ہے جو خواجہ سرا بن کر

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

حرم میں داخل ہو گیا تھا اور شہزادی کا عاشق بن بیٹھا ۔ مظلوم شہزادی اپنی شادی کی رات کو اس کالی بلا کو قتل کرنے کے بعد خود کشی کر لیتی ہے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ Smirnow نے ایک ڈراما انادولی کویلری (*Anadolu Kuyleri*) غلطی سے کمال کی طرف منسوب کر دیا ہے جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ سلطان نے اس پر اسے ایک خاص انعام دیا تھا ۔ واقعات سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی ۔ کمال کے ڈراموں میں حسب ذیل کمزوریاں ہیں : بےساختگی اور تتبع فطرت کی کمی، داخلی محرکات سے متعلق روشن بیانی کا فقدان، جذباتی، حب وطن کے جوش و خروش سے متعلق ضرورت سے زیادہ رقت انگیزی اور طعن و ملامت آمیز عبارات ۔ لیکن کمال کو اپنے سامعین کی توجہ اور دلچسپی پر قابو رکھنے کا طریقہ آتا ہے اور وہ انہیں اپنے ساتھ ساتھ لیے بڑھا چلا جاتا ہے ۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ہاں ایک قسم کی نفسیاتی گہرائی ضرور موجود ہے ۔ اس زمانے میں ترکی تھیٹر بالکل ایک نئی چیز تھی ۔ اس زمانے کو اور اس کے ماحول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کمال کے ڈراموں کو ایک عظیم الشان کارنامہ کہا جا سکتا ہے، گو ان میں ڈرامائی اور اصطلاحی نقائص موجود ہیں ۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ کمال کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ڈرامے کو عوام تک اپنے خیالات پہنچانے اور ان کے خوابیدہ احساسات کو جگانے کا ذریعہ بنایا جائے ۔ اس کے نزدیک تھیٹر ''ایک ایسا ذریعۂ تفریح ہے جس سے عوام پر خاطر خواہ اثر ڈالا جا سکتا ہے''۔

اس نے اپنے دو ناولوں میں بھی یہی وتیرہ اختیار کیا اور ان میں بھی یہی نقائص موجود ہیں، لیکن ان میں ہم ترکی معاشرت و افکار کے مخصوص پہلوؤں کی واضح اور صاف تصاویر دیکھ سکتے ہیں ۔ طرز نگارش کے اعتبار سے بھی ان میں بہت بڑی خوبیاں موجود ہیں ۔ چنانچہ اس کے ناولوں کا اثر عوام پر بہت ہی زیادہ پڑا ۔ وہ ایک پورے دبستان فکر کے لیے نمونہ بن گئے جس کا سب سے بڑا نمائندہ وجیہی تھا ۔ وہ دو ناول یہ ہیں :

۱ ۔ انتباہ یا خود علی بیگ سرگذشتی (بیداری یا علی بے کی سرگذشت) ۱۸۷۴ء؛ کہتے ہیں کہ اس کا اصلی نام صون پشیما نلیق تھا) ۔ یہ ایک سالدار بگڑے مزاج کی عورت کے لاڈلے فرزند کی سرگذشت ہے جو ایک طوائف کے پنجے میں پھنس جاتا ہے اور اس کے بہکانے میں آ کر اپنی معصوم محبوبہ کو بڑی بےرحمی سے ٹھکرا دیتا ہے اور بالکل تباہ و برباد ہو جاتا ہے ۔ بالآخر جب اس کی ٹھکرائی ہوئی محبوبہ اپنی جان دے کر اس کی زندگی بچا لیتی ہے تو وہ طوائف کو ہلاک کر ڈالتا ہے اور اپنی باقی ماندہ زندگی قید خانے میں گزارتا ہے ۔

۲ ۔ جزمی، ایک تاریخی ناول (۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء، طبع ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ء)؛ یہ کریمیا کے فرمانروا عادل گرائی اور شاہ ایران کی ہمشیرہ کی داستان محبت ہے جو سولھویں صدی میں جب عادل گرائی ایران میں قید تھا، ظہور پذیر ہوئی ۔ اصلی واقعات تاریخ سے ماخوذ ہیں ۔ جہاں تک اسلوب کی چستی اور بیان کے تنوع کا تعلق ہے، جزمی فنی اعتبار سے علمی ہی سے بہت بڑھا ہوا ہے ۔ اس میں عالم اسلامی کے اتحاد کا تصور بیّن طور سے نظر آتا ہے ۔

کمال کی سب سے زیادہ قابل ذکر تاریخی تصنیفات حسب ذیل ہیں، (۱) اس کی سوانح عمری اوراق پریشان (بکھرے ہوئے ورق) (۱۳۰۱ھ)، جس کے ۴ حصے ہیں اور ان میں چار ناموران اسلام کی سیرتوں کا بیان ہے؛ اسلوب بیان فاضلانہ ہے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

جس میں یورپی طرز انشا کا تتبع کیا گیا ہے ۔ اس تصنیف میں اس نے اپنے اسلامی رجحانات کو ترقی یافتہ صورت میں واضح کیا ہے، یہ چار ناسور ہیں : صلاح الدّین اَیوبی؛ آلِ عثمان میں سے سلطان محمّد ثانی اور سلطان سلیم اوّل یاووز اور امیر نوروز بے ۔ زبان اور علمیت کے اعتبار سے ترک اس مجموعے کو ایک کلاسیکی تصنیف کا درجہ دیتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ ایک اچھی تالیف ہے جس کا بیشتر حصّہ یورپی مأخذ سے لیا گیا ہے، البتہ جہاں تک وضاحتِ مطالب اور زور بیان کا تعلق ہے، یہ اس کی بہترین تصنیف ہے؛ (۲) دورِ اِستیلا؛ (۳) قنیزہ، ہنگری کے قلعۂ قنیزہ (Kanisza) کی فتح کی داستان؛ یہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں Famagusta میں لکھی گئی اور اسی سال مصنّف کے نام کے بغیر شائع ہوئی۔

(۴) کمال کو اسلام کی قوت حیات پر پورا اور پر جوش اعتقاد تھا، تاہم اس کی تصنیفات میں اسلامی تصوّرات اور روسو (Rosseau) کے فلسفے کے درمیان، جسے وہ اختیار کرنا چاہتا تھا، مکمل ہم آہنگی نظر نہیں آتی ۔ کمال نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کی پیش کردہ اقدار جدید تہذیب کے بنیادی تصورات سے کسی طرح بھی کم پایہ نہیں بلکہ اگر ہم بنظر غائر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ یہ وہی تصورات ہیں جنھیں اسلام نے پیش کیا تھا ۔ اسلام سولھویں صدی تک کسی طرح پسماندہ نہ تھا اور یورپ کی فوقیت اسے فقط اس وقت ماننا پڑی جب یورپ نے تجربی اور استقرائی علوم میں آگے قدم بڑھایا ۔ ارنسٹ رینان (Ernest Renan) کے اس دعوے کے رد میں کہ اسلام تعلیم کا دشمن ہے کمال نے رنان مدافعہ نامہ سی لکھی جو کلیات میں شائع ہوئی ۔ رینان کے نظریے کے خلاف مسلمانوں کے لکھے ہوئے دیگر رسائل کی بہ نسبت کمال کے اس رسالے میں زیادہ مضبوط دلائل سے کام لیا گیا ہے ۔

(۵) مدخل، تاریخ رومانے قدیم اور تاریخ اسلام جو ۴۳۸ھ/ ۱۰۴۶ء تک ہے ۔ کمال نے اسے اپنی تاریخ آل عثمان کی بنیاد اور مقدمہ بنانے کی غرض سے لکھا ہے ۔ تاریخ آل عثمان میں آغاز سلطنت سے لے کر سلطان سلیم اول یاووز کی وفات (۹۲۶ھ/ ۱۵۲۰ء) تک کے حالات درج ہیں ۔

(۶) رؤیا، اس کی سب تصانیف سے زیادہ پر زور اور تصنع سے خالی تصنیف ہے جسے ردعمل کے دور میں ہر ترک نے ضرور پڑھا ہو گا ۔ اس میں ان دنوں سے متعلق خواب بیان کیے گئے ہیں جب وطن زنجیروں سے آزاد ہو جائے گا ۔ یہ کئی بار چھپی ہے، مثلاً قاہرہ (اجتہاد)میں دوبار، ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۹ء۔

(۷) سرگذشت (۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) میں بھی ایک خواب کا حال ہے ۔

کمال بنیادی طور پر ایک جریدہ نگار تھا (رک بہ سطور بالا) ۔ اس نے عبرت کو ایک مثالی اخبار بنا دیا تھا ۔ اس میں اس کے جو مقالات شائع ہوئے وہ آج بھی بار بار طبع کیے جاتے ہیں اور مجموعوں میں شامل کیے جاتے ہیں ۔ اس اخبار کے گزشتہ پرچوں کو بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا جاتا ہے ۔

اس نے ایک نقاد کی حیثیت سے بھی بڑی جامعیت کا ثبوت دیا ۔ گب (Gibb) نے اس کی تنقید کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگایا ہے ۔ اس نے قدامت پسند ادب پر سخت جرح کی اور جدید دبستان ادب کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا ۔ اس کے مقالات میں اور مقدمہ میں نقد و کاوش کا بہت کچھ ذخیرہ ہے ۔ جب اس کے پرانے رفیق کار ضیا پاشا نے خرابات کے نام سے تین جلدوں میں ترکی ادب کا کسی قدر نامناسب سا انتخاب شائع کیا تو کمال نے پہلی دو جلدوں پر دو زور دار تنقیدی تبصرے

www.besturdubooks.wordpress.com

تخریب خرابات، ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء اور تعقیب خرابات، طبع ثانی ۱۹۰۳ء، لکھ کر شائع کیے، گب کی رائے میں ان مقالوں کا شمار ترکی کے بہترین مقالات میں ہوتا ہے۔

کمال کے مکتوبات و رسائل کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ اس کی ترکی کے تقریباً تمام نامور سیاسی اور ادبی لوگوں سے خط و کتابت تھی۔ افسوس ہے کہ اب تک ان کا صرف کچھ حصہ طبع ہو سکا ہے، مثلاً خطوط بنام مِدْحت افندی اور عرفان پاشا، اسی طرح ابوالضیاء توفیق، عبدالحق حامد وغیرہ کے نام چند مکتوبات؛ وہ عموماً بڑی بے ساختگی اور بے تکلفی سے اور زوردار طرز میں لکھتا ہے؛ کمال پہلا شخص ہے جس نے اپنی قوم کو مکتوب نگاری کے اسلوب سے روشناس کیا۔

اس کے تحریر کردہ سرکاری کاغذات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اگرچہ ترکوں کا سرکاری انداز نگارش بہت پابند رسوم اور پیچیدہ تھا، تاہم بالآخر کمال نے اس میں صفائی اور وضاحت پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس نے اپنی مختلف سرکاری حیثیتوں سے جو منشئات مرتب کیے ان کی بہت زیادہ تعداد ہے۔ یہ ریاست کی تشکیل اور اس کی اصلاحات پر، عوام کے حقوق پر، ان کی ذہنی اور مثالی ضروریات پر، قانون، تاریخ، معاشیات، فلسفہ اور عمرانیات پر مشتمل مقالات ہیں اور ان میں مختلف منصوبوں کی وضاحت کی گئی ہے، نیز ان میں شاہی فرامین اور نیم سرکاری دستاویزات وغیرہ بھی شامل ہیں۔

آخر میں اس کے متعدد تراجم کا بھی ذکر کر دینا چاہیے۔

بہار دانش: یہ ایک ہندی مصنف شیخ عنایت اللہ کی کتاب کا ترجمہ ہے جس کے ساتھ اس نے ایک ادبی مقدمہ بھی لکھ کر شامل کیا ہے۔ کمال نے کئی فرانسیسی مصنفین مثلاً Lamartine و Victor Hugo، Rousseau، Montesquieu، Condorcet، Volney وغیرہ کی تصنیفات کے بھی ترجمے کیے۔

اس کے بیٹے علی اکرم نے اس کی تصنیفات کے ایک مکمل مجموعے کی اشاعت کا کام شروع کر دیا تھا، لیکن وہ بیچ ہی میں ہمت ہار کر بیٹھ گیا۔ علی اکرم نے کمال کی مکمل سوانح عمری پیش کرنے کا جو وعدہ کیا تھا، وہ بھی جہاں تک مجھے معلوم ہے، پورا نہیں ہو سکا۔ تاریخ ادب میں کمال کے مقام سے متعلق ڈاکٹر رضا توفیق نے جو مقالہ تحریر کیا تھا، افسوس ہے کہ وہ بھی تا حال شائع نہیں ہوا۔

مآخذ: متن میں مذکورہ تصنیفات کے علاوہ دیکھیے: (۱) W.D. Smirnow: *Tureckaya Ciwiliza-ciya*، در *Wiestnik Ewropi*، ۱۸۷۶ء، ۹: ۱۰؛ (۲) وہی مصنف: *Očerk istorii tureckoi literaturi*، در *Korsh's Wsepbshčaya Literatura*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۱ء، ص ۵۳۱ و ببعد؛ (۳) وہی مصنف: *Obra-zcowiya Protzwiedieniya Osmanskoi Literaturi*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۹۰۳ء، ص ۲۰ و ببعد نیز ۳۵۰ تا ۳۹۴؛ (۴) Charles Wells: *The literature of the Turks*، لنڈن ۱۸۹۱ء، ص ۱۴۸ تا ۲۰۶؛ (۵) L. Bonelli: *Della lingua e letteratura con-temporanea*، در *Atti. del R. Istituto Veneto di Scienze*، (۱۸۹۲ء)، ص ۱۴۶۷ تا ۱۴۷۰؛ (۶) وہی مصنف: *La moderna letteratura Ottomana*، در *Bessarione, Rivista di Studi Orientali*، ۷، ج ۴، رسالہ ۷۰، [مطبوعہ] روم ۱۹۰۳ء؛ (۷) Gibb: *A History of Ottoman Poetry*، لنڈن ۱۹۰۰ء-۱۹۰۹ء؛ (۸) P. Horn: *Türkische Moderne*، لائپزگ ۱۹۰۲ء، ص ۳۰ تا ۳۴؛ (۹) Edmond Fazy و عبدالحلیم ممدوح: *Anthologie de l'amour turque*، پیرس ۱۹۰۵ء،

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ص ۱۶۱ تا ۱۹۱؛ (۱۰) *Oszmán-török*: I. Kúnos *nyelvtönyv*، بوڈاپسٹ ۱۹۰۵ء، ص ۵۲ تا ۶۲؛ (۱۱) *Essai sur l'histoire de la littérature Ottomane*: K. J. Basmadjian، قسطنطنیہ ۱۹۱۰، ص ۱۹۳ تا ۱۹۶؛ (۱۲) *Nàmik Kemàl Bej*: Fr. Vincze، بوڈاپسٹ ۱۹۱۱ء؛ (۱۳) *Očerki po novoi osmanskoi literaturie*: Wl. Gordlewskji، ماسکو ۱۹۱۲ء، ص ۱۳ تا ۲۷؛ (۱۴) A. Fischer و احمد محیّ الدّین: *Anthologie aus der neuzeitlichen türkischen Literatur*، لائپزگ ۱۹۱۹ء، ص ۴ و ۲؛ (۱۵) احمد محیّ الدّین: *Die Kulturbewegung im modernen Türkentum*، لائپزگ ۱۹۲۱ء، ص ۶ ببعد؛ (۱۶) ابوالضیاء توفیق: نمونۂ ادبیات عثمانیہ، قسطنطنیہ ۱۳۰۸ھ، ص ۲۹۹ تا ۵۰۰؛ (۱۷) وھی مصنّف: جملۂ منتخبۂ کمال، قسطنطنیہ ۱۳۱۱ھ؛ (۱۸) وھی مصنّف: کتاب خانۂ ابوالضیاء، عدد ۱۱ تا ۱۳، تخریب خرابات (۱۳۰۳ھ)؛ (۱۹) عدد ۱۹ تا ۲۰: ادبیات؛ (۲۰) عدد ۲۸ و ۲۹ تعقیب خرابات؛ (۲۱) عدد ۶۸ بارقۂ ظفر؛ (۲۲) عدد ۶۹ مقدمۂ جلال؛ (۲۳) عدد ۸۸ تا ۸۹: تبصیر عاکف پاشا؛ (۲۴) عدد ۹۷: قنیزہ (طبع اوّل ۱۲۹۰ھ، مصنّف نامعلوم، طبع ثانی ۱۳۰۳ھ میں کمال کا نام بطور مصنّف درج ہے، طبع ثالث از ابو الضّیاء)؛ (۲۵) ابو الضّیاء: مجموعۂ ابو الضیاء، عدد ۴۱ (۱۳۰۲ھ)؛ (۲۶) سامی: قاموس الاعلام، ۵: ۳۸۸۴ ببعد، قسطنطنیہ ۱۳۱۴ھ: (۲۷) علی سعاد: نامق کمالہ، آشیان، قسطنطنیہ ۱۳۲۴ھ ج ۱، عدد ۷، ص ۱۹۰ ببعد؛ (۲۸) کمال زادہ علی اکرم: روح کمال، قسطنطنیہ ۱۳۲۴ھ؛ (۲۹) وھی مصنّف: کلّیات کمال، قسطنطنیہ ۱۳۲۶ھ؛ (۳۰) بلقور لوزادہ رضا: منتخبات بدائع ادبیہ، قسطنطنیہ ۱۳۲۶ھ (۱۲ نثر کے اور ۲۵ نظم کے نمونے)؛ (۳۱) عبداللہ جودت: اجتہاد، ج ۲، عدد ۶ و ۷، ص ۲۲۷ تا ۲۳۰ و ۲۵۴ تا ۲۶۳، قاہرہ ۱۹۰۸ء؛ (۳۲) رشاد: *Kemal ile Mukhābirimiz*، قسطنطنیہ ۱۶۳۲ھ؛ (۳۳) اشرف: حسب حال یا خواہ اشرف و کمال، قسطنطنیہ ۱۹۰۸ء؛ (۳۴) امین عثمان: حدیقۃ الادباء قسطنطنیہ ۱۲۹۹ھ، ۲: ۳۲۷ھ؛ (۳۵) شہاب الدین سلیمان: تاریخ ادبیات عثمانیہ، قسطنطنیہ ۱۳۲۸ھ، ص ۳۲۵-۳۳۱؛ (۳۶) عبدالحلیم ممدوح: تاریخ ادبیات عثمانیہ، قسطنطنیہ، ۱۳۰۶ھ؛ (۳۷) مدحت جمال: نفائس ادبیہ منظومہ قسمی، قسطنطنیہ ۱۳۲۹ھ؛ (۳۸) وھی مصنف: ایک ڈراما کمال؛ مکمل مجموعہ ۷ جلدوں میں مرتب ہونا تھا - اس کی ادارت کا بیڑا ۱۹۱۰ء/ ۱۹۱۱ء میں کمال کے بیٹے علی اکرم نے اٹھایا تھا - تجویز کے مطابق اس مجموعے کو اس طرح شائع کرنے کا ارادہ تھا: سلسلۂ اول (۱) زنان مدافعہ نامہ سی؛ (۲) قرہ بلا؛ (۳) مقالات سیاسیہ و ادبیہ و رویا؛ (۴) وطن، گل نہال، عاکف، زوالی چوجق؛ (۵) اشعار کمال: (۶) جلال الدین خوارزم شاہ مع مقدمہ؛ (۷) و (۱۱) مکاتیب خصوصیہ، خطوط کی دو جلدیں؛ (۸) اوراق پریشان مجموعہ سی (سوانح فاتح، سلطان سلیم، و سلطان صلاح الدین ایوبی و امیر نوروز؛ اوردو راستیلا)؛ (۹) منتخبات محررات رسمیہ: (۱۰) جزمی و انتباہ؛ (۱۲) تعقیب و تخریب خرابات و تنقیدی مقالات سلسلۂ ثانی، مدخل (مقدمۂ تاریخ)، تاریخ اسلام و عثمانلی تاریخ؛ مزید منتشر نگارشات و متعدد تراجم وغیرہ؛ سلسلۂ اول میں (۱)، (۲)، (۳) چھے حصوں میں؛ اور سلسلۂ ثانی میں سے عثمانلی تاریخ کی چار جلدیں طبع ہوئی تھیں۔

(TH. MENZEL)

کمان کش: (یعنی "تیر انداز") علی پاشا، ایک عثمانلی صدر اعظم، آنا طولی کے ایک ضلع حمید ایلی [رک بہ حمید اوغلری] میں پیدا ہوا اور ابتدائے عمر ہی میں استانبول چلا آیا جہاں اس کی تعلیم و تربیت قصر شاہی میں ہوئی - ۱۰۳۰ھ/ ۱۶۲۰-۱۶۲۱ء میں وہ دیاربکر کا، اور اس کے چند روز بعد بغداد کا والی مقرر ہوا - اگلے سال اسے

www.besturdubooks.wordpress.com

قبّہ وزیری (وزیرِ قبّہ) کا عہدہ دیا گیا ۔ ذوالحجّہ ۱۰۳۲ھ میں صدر اعظم ہرہ حسین پاشا کے برطرف ہو جانے پر مہر شاہی اس کے سپرد کی گئی ۔ یہ عہدہ اسے زیادہ تر شیخ الاسلام یحیی افندی کی کوششوں کی بدولت ملا تھا لیکن یہ اس کی اس مستعدی کا صلہ بھی تھا جو اس نے نا اہل اور بیوقوف سلطان مصطفٰی اوّل کو معزول کرنے کی کوششوں میں دکھائی تھی ۔ کمان کش علی پاشا نے جو کمزور، ڈرپوک اور معمولی نہاد کا آدمی تھا، سب سے پہلے اپنے رقیبوں اور دشمنوں سے پیچھا چھڑانے کی ٹھانی، چنانچہ اس نے وزیر گوچی محمد پاشا اور وزیر خلیل پاشا کو قید خانے میں ڈالا اور مفتی یحیی کو معزول کر دیا ۔ اس کی حرص و آز نے اسے اس پر آمادہ کیا کہ بہت ہی قابل نفرین خیانت اور چالبازی کے ساتھ شاہی خزانے کا روپیہ خورد برد کرے ۔ اس نے چاندی کے سکوں میں کھوٹ زیادہ کر دیا اور چاندی بمشکل کوئی پانچواں حصّہ رہ گئی ۔ ینی چریوں کی تنخواہ ساری کی ساری اپنی جیب میں ڈالی اور ایسے ہی اور کمینہ طریقوں سے ریاست کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی سکّوں کی قدر و قیمت گھٹا کے اور سرکاری ملازمتیں دلانے کی رشوتیں وصول کر کے چھے ماہ کے اندر اندر ہی اس نے بڑی بھاری دولت جمع کر لی ۔ جب اس نے وزیراعظم کا قلمدان سنبھالا تھا تو اس وقت سرطامس رو Sir Thomas Roe نے اس کی بابت اپنے ایک سرکاری مراسلے مؤرخہ ۲۳ اگست ۱۶۲۳ء میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''وہ ایک خاموش اور دیانت دار آدمی ہے لیکن چونکہ ناآزمودہ ہے اس لیے اس بات میں تردد ہے کہ وہ اتنے بڑے عہدے کی ذمے داریاں سنبھالنے کے قابل ہو گا یا نہیں'' (دیکھیے *The Negotiations of Sir Th. Roe in his Embassy to the Ottoman Porte, from the year 1621 to 1628*، لنڈن ۱۶۴۰ء، ص ۱۷۳)، لیکن اس کے بعد وہ ۳ ۔ اپریل ۱۶۲۴ء کو اس کی بابت کہتا ہے کہ ''وہ اس قدر کمینہ اور لالچی ہے کہ اس نے چھے ماہ ہی میں ہر قسم کے انصاف اور عہدوں کو فروخت کر کے بے انتہا خزانہ جمع کر لیا ہے ۔ جس کے بوجھ میں دب کر وہ خاک میں ملنے کے قریب پہنچ گیا ہے'' (کتاب مذکور، ص ۲۳۰)۔ اور اگست ۱۶۲۴ء کی ایک وینیشی رپورٹ میں اس کی دولت کی بابت کہا گیا ہے : *"somma di 700,000 scudi in contanti, molto opportuna"* (دیکھیے *GOR* : J. V. Hammer، ۵ : ۲۱۰)۔

مملکت میں جو خوفناک صورت حال پیدا ہو چکی تھی (مثلاً ایشیائے کوچک اور مصر میں بغاوتیں، ایران کی جانب سے حملے کا خطرہ، ۲۸ نومبر ۱۶۲۳ء کو سقوط بغداد جس کی خبر سلطان سے پوشیدہ رکھی گئی، استانبول میں خوراک کا فقدان، سکّے کی قیمت میں واضح کمی، خزانے کا تہی ہونا اور ینی چریوں کا قابو سے باہر ہو جانا) اسے دیکھ کر صدر اعظم کے خلاف جو ان سب باتوں کا ذمے دار تھا، نوجوان سلطان مراد چہارم کا غیظ و غضب انتہا کو پہنچ گیا ۔ ۱۴ ۔ جمادی الآخرۃ ۱۰۳۳ھ/ ۲۴ مارچ ۱۶۲۴ء کو کمان کش قصر شاہی میں طلب کیا گیا اور بہ عجلت تمام اس کی گردن اڑا دی گئی، اور اس کی لاش کو مسجد عاتق علی پاشا کے بیرونی صحن میں دفن کر دیا گیا (دیکھیے حدیقۃ الجوامع، ۱ : ۱۵۰؛ *GOR* : J. Von Hammer، ۹ : ۵۷، عدد ۳۱۲) ۔ چرکس محمّد پاشا اس کا جانشین مقرر ہوا ۔ کمان کش علی پاشا کی شادی مشہور و معروف قاضی عسکر اور شیخ الاسلام بوستان زادہ محمد افندی کی بیٹی سے ہوئی تھی۔

مآخذ : (۱) عثمان زادہ احمد تائب : حدیقۃ الوزراء، استانبول ۱۲۷۱ھ، ص ۷۲؛ (۲) حدیقۃ الجوامع، ۱ : ۱۵۰

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

بعد (جس میں اس کے مختصر سوانح حیات بھی درج ہیں)؛ (۳) J. v. Hammer : *GOR* بذیل کمان کش علی پاشا؛ (۴) نعیما : تاریخ، استانبول ۱۲۸۰ھ، ۲ : ۲۹۳ ببعد؛ (۵) حاجی خلیفہ : فذلکہ، ۲ : ۵۲ (سزاے موت کا ذکر)؛ (۶) سجل عثمانی، ۳ : ۵۲۰.

(FRANZ BABINGER)

* **کمبایت** (کھمبایت) : ہندوستان کے صوبۂ گجرات کی ایک سابقہ ریاست جو خلیج کمبایت کے دہانے پر واقع ہے، رقبہ تین سو پچاس مربع میل اور آبادی باون ہزار نفوس پر مشتمل ہے جن میں اکثریت ہندؤوں کی ہے ۔ نوابانِ کمبایت شیعی ہیں اور اپنا شجرۂ نسب والی گجرات مومن خان سے ملاتے ہیں، جس نے ۱۷۴۲ء میں وفات پائی تھی ۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ ریاست صوبۂ گجرات میں مدغم ہو گئی ہے ۔ قدیم زمانے میں کمبایت گجرات کی ایک بڑی بندرگاہ تھی اور کہا جاتا ہے کہ جب مسلمانوں نے ۱۲۹۸ء میں اسے فتح کیا تو یہ ہندوستان کا امیر ترین شہر تھا، لیکن سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ بندرگاہ مٹی سے بھر گئی اور تجارت سورت کو منتقل ہو گئی ۔ کمبایت کا ذکر المسعودی، الاصطخری، ابن حوقل اور دیگر عرب مؤرخین نے کیا ہے ۔ اب یہاں پچاس ٹن سے زیادہ وزنی جہاز نہیں ٹھیر سکتے.

مآخذ : (۱) *Imperial Gazetteer of India*، بذیل مادّہ؛ (۲) Elliat-Dawson : *History of India*، بمدد اشاریہ؛ (۳) کمبایت کے متعلق عربوں کے بیانات کے لیے دیکھیے *Gazetteer of Bombay Presidency*، ۱/۱ : ۴، ۵ ببعد؛ (۴) *Archaeological Survey of Westera India*، ج ۶، لنڈن ۱۸۷۶ء.

(J.S. COTTON)

⊗ . **تعلیقہ** : کمبایت (کھمبایت)، خلیج کے سرے پر مغرب میں دریاے سابرمتی اور مشرق میں دریاے ماہی کے دہانوں کے درمیان سمندر سے ایک فرسنگ کے فاصلے پر ہے۔ الاصطخری کتاب الاقالیم میں لکھتا ہے کہ منصورہ واقع سندھ سے یہ بندرگاہ بارہ روز کے سفر کے برابر ہے ۔ شہر کے قریب سابرمتی اور ماہی دریاؤں کا درمیانی علاقہ سمندر کے قرب کی وجہ سے کھاری دلدل پر مشتمل ہے۔ اس لیے شہر کا پانی بھی کھاری ہے اور اس کے غیر محتاط استعمال سے بدن پر چھالے نکل آتے ہیں ۔ تاہم نسیم بحری کے باعث شہر کی آب و ہوا خوشگوار ہے ۔ سالانہ بارش ۲۹۰۳۰ انچ ہے ۔ علاقے میں آم ، لیمو، ناریل اور چاول پیدا ہوتے ہیں ۔ ریاست کھمبایت کے خشک حصوں میں کپاس کی کاشت ہوتی ہے ۔ شہر کھمبایت میں جامع مسجد ۱۳۲۵ء میں تعمیر ہوئی تھی جو بڑی خوش منظر ہے ۔ عقیق قریب کی ریاستوں میں سے نکلتا ہے اور سرخ، سفید اور زرد رنگ کا ہوتا ہے ۔ کھمبایت کے سوداگر اسے ادھر ادھر بھیجتے ہیں ۔ سورت اس کے جنوب میں ہے ۔ ان دونوں بندرگاہوں میں عرب سوداگروں کی بڑی آمد و رفت ہوا کرتی تھی . (عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا).

(ادارہ)

* **کُمبَرہ جی** : رک بہ خُمبَرہ جی .

* **الکُمَیت** : [بنو سَعْد بن ثَعْلَبہ] کا عرب شاعر الکُمیت بن زید الأسَدی ۶۰ھ/ ۶۷۹ء کے قریب کوفے میں پیدا ہوا اور ۱۲۶ھ/ ۷۴۳ء میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا ۔ اس کے کلام کا مشہور ترین مجموعہ المُذَہَّبۃ (دیکھیے نیچے) کے بعد الھاشمیّات ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اس میں رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے خاندان بنو ہاشم کی مدح سرائی کی ہے ۔ شاعر نے سارے ہاشمیوں کو مدح و ستائش اور عزت و احترام

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کا مستحق نہیں سمجھا۔ اس کے ممدوحین میں پیغمبر خدا صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے علاوہ ہم، حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کو بھی پاتے ہیں۔ اشعار ۱ : ۷۹، اور ۲ : ۱۰۵ ببعد جو حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد کی مدح میں ہیں، شاید بنو عباسؓ کے عہد میں شامل کیے گئے ہوں گے۔ الھاشمیات چھے قصیدوں پر مشتمل ہے، چار قصیدے طویل ہیں اور دو مختصر۔ علاوہ ازیں ایک قطعہ ہے جس کا بیشتر حصہ قصیدے کی بطرز معین تشبیب اور چار مختصر نشید ہیں جن میں سے تین تو محض دو دو شعروں کے ہیں۔ سب قصیدے ایک ہی زمانے کے کہے ہوئے نہیں۔ دوسرا قصیدہ سب سے قدیم معلوم ہوتا ہے۔ انداز سے اس کا زمانہ ۹۶ تا ۹۷ھ ہونا چاہیے۔ تیسرا قصیدہ اس سے زیادہ بعید زمانے کا نہیں ہے۔ پہلا قصیدہ ۱۰۵ھ سے پہلے کا نہیں ہو سکتا، نہ چوتھا قصیدہ ۱۱۸ھ سے قبل کا۔ ۹ سے ۱۱ تک کے قصائد ۱۲۲ھ سے پہلے کے نہیں ہیں۔ چھٹا قصیدہ شاید ۱۲۵ تا ۱۲۶ھ میں لکھا گیا ہو۔ قصیدوں میں الکمیت قدیم شعرا کی طرز کا تتبع کرتا ہے۔ اگرچہ بحیثیت شہری ہونے کے وہ صحرائی زندگی سے دور ہے، پھر بھی وہ اس اونٹ کی توصیف کرتا ہے جو اسے اپنے ممدوح کے پاس لے جاتا ہے؛ نیز وہ صحرائی سانڈ (بیل) اور قطا (بھٹ تیتر) پرندے کی تعریف کرتا ہے اور علویوں کی مدح اسی روایتی انداز میں کرتا ہے جیسے پہلے شاعر کسی بدوی سردار کی کیا کرتے تھے۔ اس نے قرآن مجید نیز قدیم شعرا سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ چنانچہ دوسری صدی ہجری کے کوئی لغوی ابن کُناسہ نے کتاب سرقات الکمیت من القرآن (دیکھیے ابن الندیم، ص ۷۰) لکھ ڈالی۔

گو عرب نقادوں میں الھاشمیات کو کچھ زیادہ قابل قدر اسلوب شاعری کا نمونہ نہیں سمجھا جاتا، لیکن شیعی حلقوں میں اس کی بڑی وقعت ہے۔ معلومات کی حد تک اس کی اہمیت زیادہ تر اس حیثیت سے ہے کہ اس میں پہلی صدی ہجری کے آخر اور دوسری صدی کے شروع میں شیعیوں کے اعتدال پسند حلقے کے اندر مقبول عام خیالات کی تصویر نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود شاعر عملی طور پر علویوں کی مدد کرنے کے لیے اپنے آپ کو کبھی آمادہ نہ کر سکا، گو ان کی مدح میں وہ بہت کچھ جوش و خروش ظاہر کرتا ہے۔ قصیدہ ۱۰، ۱۱ میں وہ اپنے آپ کو اس لیے مورد طعن و ملامت قرار دیتا ہے کہ وہ حضرت زیدؓ کی دعوت قبول نہ کر سکا، لیکن وہ اپنے زمانے کے حکمرانوں پر بڑی بے باکی سے شدید تنقید کرتا ہے۔ وہ بنو امیہ کو یہ کہہ کر سرزنش کرتا ہے کہ انھیں امت کی قیادت کا کوئی حق نہیں ہے اور وہ اپنے جاہ و اقتدار کو ذاتی اغراض کے لیے بےجا استعمال کرتے ہیں۔ باوجود اس کے جب اس کی نکتہ چینی کی خبر خلیفہ ہشام کو پہنچی (بنو عبد شمس کے خلاف ایک طویل نظم جمھرۃ (ص ۱۸۷ ببعد) میں بھی محفوظ ہے) تو کمیت نے اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لیے بنو امیہ کی مدح سرائی کی۔ شاعروں میں یہ موقع شناسی (یا ابن الوقتی) کوئی شاذ و نادر واقعہ نہیں، خود کمیت اپنی اس روش کو تقیّے سے تعبیر کرتا ہے، (۴ : ۸۶، بقول Goldziher : *Z.D.M.G.*، ۶۰ : ۲۱۹، یہ لفظ یہاں پہلی مرتبہ شیعی اصطلاح میں استعمال ہوا ہے) اور بنو امیہ کی یہ جبری تعریف و توصیف بنو ہاشم سے متعلق اس کے اصلی خیالات و احساسات پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتی۔

قبائل یمن کے خلاف کمیت کی نظم "المذہبۃ" طوالت کی وجہ سے نمایاں ہے۔ اسی وجہ سے بعد میں "کمیت کی نظم سے طویل تر" ایک مثل بن گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قصیدہ تین سو اشعار پر

www.besturdubooks.wordpress.com

مشتمل تھا، جن میں سے قصیدے کے جستہ جستہ اشعار کا تقریباً ایک تہائی حصہ بچ سکا ہے۔ الھاشمیات میں یمنیوں کے خلاف کوئی معاندانہ انداز نظر نہیں آتا؛ شاعر اس بات پر زور دیتا ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی ذات گرامی کی طرح خود شاعر بھی خِنْدِف شاخ سے وابستہ ہے۔ ۹۷ اور ۱۰۱ھ کے درمیان الکمیت نے بنو مہلب کی شان میں جو کہ جنوبی عربوں کے اقتدار کے بڑے حامی تھے، بھی ایک مدحیہ قصیدہ لکھا۔ شاید جذبۂ نفرت و حقارت بعد میں پیدا ہوا جو غالباً ۱۱۸ھ تک موجود نہ تھا اور الھاشمیات کا چوتھا قصیدہ کہنے کے بعد رونما ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ جنوبی عرب کے کسی کلبی شاعر نے علویوں کے خلاف ایک ہجویہ نظم لکھی تھی۔ لکھنے والے کا نام خالد بن عبداللہ القسری والی عراق بتایا جاتا ہے۔ یہ وہی شخص تھا جو جنوبی عرب کے قبائل کی امداد پر تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ ان قبائل نے الکمیت کے وہ اشعار جو بنو امیہ کے خلاف تھے، خلیفہ کے روبرو پیش کیے تھے تاکہ اس کے شر سے محفوظ رہیں۔ اس ہجویہ نے الکمیت کو جنوبی عربوں کے خلاف زبان طعن دراز کرنے پر اکسایا، بہر حال یہ یقینی بات ہے کہ کمیت نے خالد کی موت کے بعد بھی اس کے خلاف ہجو گوئی جاری رکھی اور اسی وجہ سے اس نے اپنی ہلاکت مول لی۔ یمنی فوج نے کمیت کو خالد کی ہجو گوئی کرتے سنا تو اُسے ایسی بری طرح زخمی کیا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔

مآخذ: متن مقالہ میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ؛ (۱) الاغانی، ۱۵: ۱۱۳ ببعد؛ (۲) ابن قتیبہ: کتاب الشعر، طبع De Goeje، ص ۳۶۸ ببعد؛ (۳) عبدالقادر البغدادی: خزانۃ، ۱: ۶۸ ببعد؛ (۴) الجاحظ: کتاب البیان و التبیین، ۱: ۲۲؛ (۵) *Die Haschimijat des Kumait*، لائیڈن ۱۹۰۴ء؛ (۶) Noldeke: *ZDMG*، ۵۸: ۸۸۸؛ (۷) Brockelmann: *GGA*، ص ۲۴۵ ببعد؛ (۸) M.J. de Goeje: *FA*، سلسلہ ۱، ۵: ۱۵۷ ببعد؛ (۹) H. Lammens: *MFOB*، ۲: ۴۷؛ (۱۰) C. van Arendonk: *De opkomst van het Zaidietische imamat*، لائیڈن ۱۹۱۹ء، ص ۱۴ ببعد و ۳۲؛ [(۱۱) براکلمان: تاریخ الادب العربی (تعریب)، ۱: ۳۴۲ تا ۳۴۴؛ (۱۲) الزرکلی: الاعلام، بذیل مادّہ (بالخصوص ماخذ)؛ (۱۳) ابن حزم: جمھرۃ انساب العرب، ۹۴، ۱۹۳].

(J. Horovitz)

* **کِنانہ**: بن خُزَیْمہ بن مُدْرِکہ بن الیاس بن مُضَر، ایک بڑے عرب قبیلے کا نام ہے جس کی خیمہ گاہیں آغاز اسلام کے وقت مکّے کے گرد و نواح کے اس علاقے میں تھیں جو شہر کے جنوب مغرب میں تہامہ سے لے کر، جس کے متصل ان کے قرابتی قبیلے ھُذَیل کی مقبوضہ اراضی تھیں، شہر کے شمال مشرق تک، جہاں ان کے سب سے قریبی رشتے دار اَسَدُ الخُزَیْمہ آباد تھے، پھیلا ہوا تھا۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور عرب نسابوں کی نظروں میں ان کی خاص اہمیت کا سبب یہ حقیقت تھی کہ قریش اور پھر حضرت نبی کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا نسب اسی قبیلے کنانہ سے جا ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس کی متعدد شاخوں اور اس سے نسبی تعلق رکھنے والے کئی قابل ذکر اشخاص کے تذکرے کثرت سے ملتے ہیں، اگرچہ زمانۂ مابعد کے نسابوں نے عموماً صرف چھے بڑی بڑی شاخوں کا نام لیا ہے، تاہم ابن الکلبی جمھرۃ النسب میں کنانہ کے حسب ذیل ۱۴ بیٹوں کا ذکر کرتا ہے: (۱) النَّضْر، یعنی قیس جو قریش [رک بآں] کا مورث اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے؛ (۲) نُضَیر؛ (۳) مالک؛ (۴) ملکان (جمھرۃ کے ایک اچھے قلمی نسخے میں اس نام کی املا یونہیں ہے، لیکن القلقشندی کو اصرار ہے کہ اس کا تلفظ

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

مَلکان ہے)؛ (۵) عَامر؛ (۶) عَمْرو؛ (۷) الحارث؛ (۸) عَزْوان (یا عَزْوانَ)؛ (۹) سَعْد؛ (۱۰) عَوْف، (۱۱) غَنْم؛ (۱۲) مَخْرَمہ اور (۱۳) جِرْوَل، کہا جاتا ہے کہ یہ تیرہ کے تیرہ بیٹے بَرّہ بنت مُرّ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے جو تمیم بن مُرّ کی بہن تھی - یہی وجہ ہے کہ انھیں تمیم کے کثیر التعداد قبیلے کا قرابتی قرار دیا جاتا ہے - کنانہ کا چودھواں بیٹا عَبْد مَناۃ قبیلۂ بنو قُضاعہ کی الذُّفْراء بنت ھَنِیّ بن بَلِیّ کے بطن سے تھا، اور اسی لیے اس شاخ کو اکثر بنو قضاعہ ہی میں شمار کیا گیا ہے - زمانۂ مابعد کے نسابین ہمیشہ صرف النّضر، عامر، عَمْرو اور عبد مناۃ ہی کا ذکر کرتے ہیں اور ان میں سے بیشتر کی ضمنی شاخیں بھی گنواتے ہیں - مِلکان، عمرو اور عامر کی کسی شاخ کا ذکر نہیں ملتا، ماسوا قَیْن کے، جو آخر الذّکر کی ایک شاخ ہے - قریش کے جد امجد ہونے کی وجہ سے النّضر کا بیان اس مادّے میں کیا گیا ہے جو قریش کے بارے میں ہے - مالک، ثَعْلَبہ ابن الحارث بن مالک اور اس کی ضمنی شاخوں فِراس ابن غنم بن ثَعْلَبہ اور مُدْلِج بن عامر بن ثَعْلَبہ اور فَقَیْم ابن عَدِی بن عامر میں منقسم تھے - [بنو] عبد مناۃ غالباً سب سے زیادہ کثیر التعداد تھے اور متعدد خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں: (۱) غِفار؛ (۲) بَکْر مع اپنی ضمنی شاخوں دُئل اور لَیث کے؛ (۳) بِلْحارِث؛ (۴) مُدْلِج، جنھیں کہانت میں شہرت حاصل تھی؛ (۵) ضَمْرہ بن بَکْر.

[عرب ماہرین انساب کے مطابق] یہ سب کنانہ کی نسل میں سے تھے - اسلام کے ابتدائی دور میں ان کی اہمیت یہ ہے کہ ان سے اس باہمی رشتے کا پتا چلتا ہے جو کنانہ کے مختلف قبائل اپنے مابین سمجھتے تھے [دیکھیے ابن حزم: جمھرۃ انساب العرب اور السنویری: نھایۃ الارب] اور ممکن ہے اسی بنا پر انھیں حضرت عمرؓ کے مرتب کردہ دیوان میں درج کیا گیا ہو - دیگر تمام عربی قبائل کی طرح یہاں بھی لوگوں کا فرداً فرداً کسی خاص شاخ سے اپنا نسب ثابت کرنا کوئی مشکل نہ تھا - کنانہ کے کچھ قبائل زمانۂ مابعد یعنی چھٹی صدی ہجری میں بالائی مصر میں اِخْمیم کے قریب یا مغربی دیلٹا کے علاقے میں سکونت پذیر ہو گئے تھے - انھیں بھی اپنی اصل نسل کا اتنا علم ضرور تھا، کہ وہ اصلاً کنانہ کی اولاد ہیں اور مختلف زمانوں میں مصر میں نقل مکانی کر کے آئے تھے - آخری نقل مکانی طَلائع بن رُزِّیک کے دور وزارت (۵۴۹ تا ۵۵۶ھ) میں ہوئی تھی.

چونکہ بنو کنانہ حرم کعبہ کے پڑوس میں رہتے تھے، اس لیے انھوں نے زمانۂ قبل از اسلام میں شہر مکّہ کی تاریخ میں کچھ کم اہم حصہ نہیں لیا اور اس قبیلے کے بیرونی افراد ہی نے اس وقت آخری فیصلہ دیا جب خاندان قریش نے شہر کی حکومت بنو خُزَاعہ سے چھینی تھی؛ چنانچہ انھیں کے شیخ یَعْمَر بن عَوف بن کَعْب بن عامر بن لَیث بن بَکْر بن عبدمناۃ کو آخری فیصلہ دینے کے لیے منتخب کیا گیا تھا جو قریش کے حق میں صادر ہوا - اسی فیصلے کے باعث اسے الشَّدّاخ (کچلنے والا) کا عرف ملا، کیونکہ اس نے اس جھگڑے کو کچل دیا تھا - [زمانہ جاھلیت میں بنو کنانہ نے تین مشہور جنگیں یوم الفجار اول، ثانی اور ثالث لڑنے کے علاوہ بنو خُزاعہ سے کئی مرتبہ میدان جنگ میں زورآزمائی کی - تین پہاڑوں (جبل یَلْمَلم، جبل تُضارِع اور جبل وَصِیف) پر ان کا جزوی قبضہ تھا] - ان کی ایک شاخ بنو فِراس صِفّین [کی جنگ] میں حضرت علیؓ کے خاص حامیوں میں تھی. الطّبری کی تاریخ میں ان کا تذکرہ آخری بار ۲۳۰ھ میں یوں آیا ہے کہ اس وقت تک ان کے ایک حصے کا مکّے کے قرب و جوار میں پڑاؤ تھا، لیکن اب وہ اتنے کم زور

www.besturdubooks.wordpress.com

تھے کہ ان قبائل کی تاخت و تاراج کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے تھے جو ان دنوں زیادہ طاقتور ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں ان کے لیے ایک بڑے گروہ نے حوران میں اور صرخد کے قریب پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ اگرچہ انھیں بطور قبیلے کے کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں، لیکن ان کے بہت سے افراد محدثین وغیرہ کی حیثیت سے معروف ہیں اور یہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔

مآخذ: (۱) ابن الکلبی: جمہرۃ النسب، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، Add. ۲۳۲۹۷، ورق ۴؛ (۲) النویری: نہایۃ الارب، قاہرہ، ۲: ۳۵۰ ببعد؛ (۳) القلقشندی: صبح الاعشی، قاہرہ، ۱: ۳۵۰؛ (۴) ابن دُرید: کتاب الاشتقاق، طبع Wüstenfeld، ص ۱۰۵ تا ۱۰۸؛ (۴) Wüstenfeld: *Tabellen*؛ (۵) السمعانی: کتاب الانساب، سلسلۂ یادگار گب، ج ۲۰، بذیل مادّہ؛ [(۶) عمر رضا کحالہ: معجم قبائل العرب، بذیل مادّہ، بالخصوص مآخذ].

(F. KRENKOW)

⊗ **کُنْجاہ**: پنجاب (پاکستان) کے ضلع گجرات سے سات میل جانب مغرب پھالیہ روڈ پر واقع ہے۔ یہ قصبہ (رئیس) کنج پال برادر زادۂ راجہ کہسال قوم طور نے ۷۰۴ء میں آباد کیا۔ اولاً قوم کھتری یہاں کی مالک تھی۔ پھر کلچو قوم وڑائچ نے لکھی جنگل سے آ کر اس قصبے پر قبضہ کر لیا اور ۱۸۴۹ء تک یہاں زمینداری کا پیشہ اپنائے رکھا۔ (وڈیرہ گنیش داس: چار باغ پنجاب، ۲۰۸ تا ۲۰۹)۔

جب یہ قصبہ برباد ہو گیا تو امیر تیمور کی فتح ہندوستان کے وقت جیتو قوم جاٹ وڑائچ نے دکن سے آ کر اسے دوبارہ آباد کیا (غلام سرور مفتی لاہوری: تاریخ مخزن پنجاب، ۳۰۴) ۔ ۱۸۶۸ء تک اس میں مسلمانوں اور [ہندو] کھتریوں کے دو ہزار تیرہ گھر آباد تھے (تاریخ مخزن پنجاب، ۳۰۴)۔ کنجاہ کی درج ذیل عمارات و باغات کا ذکر وڈیرہ، مفتی غلام سرور اور اعظم بیگ نے کیا ہے: (۱) حویلی دیوان کرپا رام؛ (۲) حویلی بہشت آباد؛ (۳) باغ دیوان کرپا رام مذکور؛ (۴) باغ دیوان وتوہل والا؛ (۵) باغ سرکاری جانب مشرق؛ (۶) باغ سردار نہال سنگھ چھاچھی (غلام سرور مفتی لاہوری: تاریخ مخزن پنجاب ۳۰۴؛ وڈیرہ: چار باغ پنجاب؛ ۲۰۹؛ اعظم بیگ مرزا: تاریخ گجرات ۱۰۲)۔

کنجاہ کو خاصی علمی و ادبی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہاں کے علما و شعرا میں سے ملّا محمّد اکرم غنیمت، علّامہ صداقت اور مولوی صالح نے علم و ادب میں قابل قدر اضافہ کیا۔ بعض علما کے مختصر حالات درج ذیل ہیں:

قاضی عبدالنبی: ۱۰۸۸ھ/۱۶۷۸ء میں کنجاہ کے قاضی تھے۔ ان کی ایک مہر ۱۰۸۸ھ کی نقل محفوظ ہے (محمد عالم عبدالباسط: تاریخ سادات خوارزمیہ، ۷۰) جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۱۰۸۸ھ/۱۶۷۸ء تک بقید حیات تھے۔

قاضی رضی الدین بن قاضی عبدالنبی: حضرت نوشہؒ کے مرید تھے۔ پہلے وزیر آباد کے قاضی تھے (محمد حیات نوشاہی: تذکرۂ نوشاہی (قلمی)، ورق ۳۶)، پھر کنجاہ اور گجرات کی قضا بھی انھیں ملی (محمد بیگ لاہوری: الاعجاز (قلمی)، ورق ۳۶۲۔ یہ قصبۂ قلعدار کے بھی قاضی تھے (شیر محمّد قریشی: مقامات قطبیہ، قلمی)؛ گجرات کے عامل بھی رہے (وڈیرہ گنیش داس: چار باغ پنجاب)۔ ان کی تین تصانیف کے حوالے ملتے ہیں: (۱) شرح قصیدۂ بردۃ (صداقت: ثواقب ۱۶۵)؛ (۲) رسالہ در حالات حضرت نوشہؒ (مشمولۂ رسالۃ الاعجاز تصنیف احمد

www.besturdubooks.wordpress.com

بیگ قلمی، ورق ۱۱۲ تا ۱۲۲): (۳) تذکرۂ قاضی رضی الدین (محمد شیر: حدیقۃ الارباب فی مناقب قطب الاقطاب موسوم بہ مقامات قطبیہ قلمی) - رسالہ الاعجاز میں ان کے اشعار بھی ملتے ہیں (احمد بیگ: الاعجاز، ۱۱۹).

شیخ نظر محمّد حضرت نوشہؒ کے مرید تھے (صداقت: ثواقب (قلمی)، ورق ۱۲۵) - ان کے دو بیٹے تھے، پہلے ملّا محمّد اکرم غنیمت تھے، لیکن دوسرے کا نام معلوم نہیں ہو سکا - محمد اکرم کے دو فرزند تھے: شیخ محمّد ماہ صداقت اور شیخ محمّد - ملّا اکرم غنیمت پنجاب کے معروف فارسی شاعر تھے - نیرنگ عشق ان کی مشہور مثنوی ہے - ان کے حالات ذیل کے مصنفین نے بیان کیے ہیں: (۱) شرافت نوشاہی: (الف) شریف التواریخ ج ۳، قلمی، (ب) رقعات غنیمت، صحیفہ، لاہور جنوری ۱۹۷۳ء، (ج) غنیمت کے مزید حالات در مجلہ العلم، کراچی اپریل تا جون ۱۹۷۳ء؛ (۲) صادق علی دلاوری: شیخ کنجاہی، در اورینٹل کالج میگزین، لاہور مئی ۱۹۴۲ و نومبر ۱۹۴۳ء؛ [نیز رک بہ غنیمت، محمد اکرم].

محمد ماہ صداقت کابل میں پیدا ہوئے - ان کے والد، نواب ارادت مند خان شرف الدّولہ بہادر کی طرف سے تحویل خزانہ پر مقرر تھے، سہمات ملکی میں ان کے ہمراہ رہتے تھے (ثواقب، ورق ۹) - صداقت کو نظم و نثر پر کامل عبور تھا - ثواقب المناقب (در حالات و مقامات حضرت حاجی محمّد نوشہ) ان کی معروف تصنیف ہے اس کے علاوہ فتح نامۂ عبدالصمد خان، ساقی نامہ، مثنوی مہتاب، مثنوی چراغان، گل صنوبر (منثور)، قصہ کلیلہ و دمنہ، دیوان اشعار، رباعیات آبدار، مخمسات رنگین، رقعات، بیاض صداقت، لطافت ہزلیات، مطلع الاسرار بھی ان کی تصانیف ہیں (شرافت نوشاہی: شریف التواریخ، جلد سوم، حصۂ سوم (قلمی)، ۶۸ تا ۱۰۳).

میاں جعفر بن شاہ درگاہی: شاہ محمّد غوث لاہوری (م ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء) نے اپنے کنجاہ جانے اور میاں جعفر سے ملاقات کا حال لکھا ہے (رسالہ کسب سلوک، ۴۲) - میاں جعفر شاہ نے تحفۂ کنجاہ کے نام سے کنجاہ کے بزرگوں پر ایک کتاب لکھی تھی (احمد حسین قریشی: گجرات کی تمدنی تاریخ، حصۂ دوم (قلمی) ۱۳۶).

میاں شیخ محمّد ابراہیم صاحب دیوان تھے - ان کا قلمی دیوان شریف کنجاہی کے پاس ہے (احمد حسین قریشی: گجرات کا دبستان ۱۰) - شیخ یحیٰی نے راے حاکم سنگھ دیوان کی فرمائش پر مثنوی نیرنگ عشق کی فارسی میں شرح لکھی تھی (شرح مثنوی غنیمت [قلمی]، کتابخانۂ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، راولپنڈی)، شیخ محمد صالح (م ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء) بن مولوی محمد یار، میاں محمد قاسم ساکن گولیکی (م ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء) اور غلام محی الدین قصوری (م ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء) سے بیعت تھے - سلسلۃ الاولیاء (۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء) ان کی مشہور تصنیف ہے - اس کے علاوہ نغمۂ توحیدی، مجموعۂ وظائف، مکتوبات اور بیاض بھی ان کی تصانیف ہیں.

حافظ غلام محی الدّین بن محمّد صالح (۱۲۵۱-۱۲۷۳ھ/۱۸۳۵-۱۷۶۷ء) کو تاریخ گوئی میں عبور حاصل تھا - مجمع التواریخ ان کی معروف تالیف ہے جس میں انھوں نے حضرت نبی کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے لے کر اپنے معاصر بزرگوں کے سنین وفات نظم کیے ہیں - ان کے والد مولانا محمد صالح نے مجمع التواریخ کے نام سے ان کے قطعات تاریخ ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں مرتب کیے اور ان کے مختصر حالات بھی لکھے (غلام محی الدین: مجمع التواریخ، بخط محمّد صالح (قلمی)، ورق

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

۱۷ ب تا ۱۸ ب).

ملک علی محمد افغان کے زنی قصیدۂ محبوبیہ کے مؤلف تھے ۔ مسلمان علما کے علاوہ کنجاہ میں کچھ ہندو اور سکھ فضلا بھی ہوے ہیں ۔ مثلاً لچھمی نرائن دبیر جس کے رقعات چھپ چکے ہیں (سید محمد عبداللہ: ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ۱۸۸)، راجا سکھ جیون اور ساحر ساز .

مآخذ: متن میں درج مآخذ کے علاوہ دیکھیے (۱) محمد صالح کنجاہی: بیاض محمد صالح (قلمی بخط محمد صالح)، مملوکۂ احمد حسین قریشی؛ (۲) محمد افضل سودھری: لطائف نامہ (قلمی)، مملوکۂ احمد حسین قریشی گجرات (۳) جعفر شاہ کنجاہی: کرسی نامہ (قلمی) مملوکۂ احمد حسین قریشی: (۴) منظر الدین حکیم: وقائع اسلاف ۱۲۷۴ھ (در حالات خاندان میاں محمد قاسم ابو الوفا ساکن گولیکی) قلمی، مملوکۂ احمد حسین قریشی: (۵) دبیر لچھمی نرائن: رقعات (قلمی)، کتب خانۂ دانشگاہ پنجاب نمبر ۴۵ PIX؛ (۶) احمد علی سندیلوی: مخزن الغرائب (قلمی) کتاب خانۂ دانشگاہ پنجاب؛ (۷) آرزو سراج الدین علی: مجمع النفائس (قلمی) کتاب خانۂ دانش گاہ پنجاب ۱۴۸۹ / ۴۵۳۹؛ (۸) بوٹے شاہ غلام محی الدین: تاریخ پنجاب، قلمی، کتب خانۂ دانش گاہ پنجاب، ۸/۸۶ APC III؛ (۹) احمد حسین قریشی: گجرات کی تمدنی تاریخ، حصۂ دوم، ۱۹۶۶ء، قلمی، مملوکۂ احمد حسین قریشی؛ (۱۰) محمد اقبال مجددی: تاریخ مغلیہ کے فارسی مآخذ (بسلسلۂ ثواقب المناقب)، مقالہ برائے حصول درجۂ ایم اے تاریخ، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۲ء؛ (۱۱) غنیمت کنجاہی: دیوان غنیمت، مرتبۂ غلام ربانی عزیز، لاہور ۱۹۵۸ء؛ (۱۲) علی الدین مفتی لاہوری: عبرت نامہ، لاہور ۱۹۶۱ء؛ (۱۳) محمد اسلم پسروری: فرحت الناظرین، مترجم محمد ایوب قادری، کراچی ۱۹۷۲ء؛ (۱۴) کنہیا لال: تاریخ پنجاب، لاہور ۱۸۷۷ء؛ (۱۵) سید عبداللہ: ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، دہلی ۱۹۴۲ء؛ (۱۶) عبدالرشید کرنل: تذکرۂ شعرائے پنجاب کراچی ۱۹۶۷ء؛ (۱۷) محمد لطیف: *History of the Punjab*، دہلی ۱۹۶۴ء؛ (۱۸) احمد حسین قریشی: گجرات بعہد قدیم و جدید، گجرات ۱۹۶۸ء؛ (۱۹) وہی مصنف: مولوی محمد صالح کنجاہی، در مجلۂ شاہین، گجرات، دسمبر ۱۹۶۸ء؛ (۲۰) ظہور الدین احمد: رقعات غنیمت، در مجلۂ صحیفہ، لاہور اپریل ۱۹۷۳ء .

(محمد اقبال مجددی)

کَنْدُوْری: (نیز کَنْدُورَۃ؛ فارسی)؛ کندوری کا مفہوم چمڑے یا سوتی کپڑے کا بنا ہوا دسترخوان ہے؛ [وہ رومال یا کپڑا جس میں روٹیاں لپیٹی جاتی ہیں نیز کھانا کھاتے وقت رانوں پر ڈالنے کا رومال]؛ اس سے بیوی کی نیاز بھی مراد ہے مثلاً کسی مقدس و محترم ہستی مثلاً حضرت فاطمہؓ کی نیاز ۔ آخری معنوں میں یہ لفظ بظاہر مجمع الجزائر شرق الہند میں ہندوستان سے پہنچا، آچے [رک باں] Acheen میں یہ لفظ تبدیل نہیں ہوا ۔ جاوا میں کسی قدر تغیر کے ساتھ کَنْدُری Kenduri یا کَنْدُرِن Kenduren کہتے ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو اصطلاح جاوا میں عام طور پر مستعمل ہے وہ صِدَکہ یا صِدَکہ (Sidekeh, Sedekah) ہے جو عربی لفظ صدقۃ سے نکلا ہے، یا سلمتن (Slametan) ہے جو عربی لفظ سلامت کی بگڑی ہوئی شکل ہے یا حاجت جو ایک مشہور عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں ضرورت یعنی کسی دعوت میں ایک شخص کی موجودگی کی ضرورت ۔ اس کے بعد خود دعوت ہی کا یہ نام ہو گیا ۔ عام طور پر یہ ایک ایسی ضیافت ہوتی ہے جس کا کوئی دینی مقصد ہو یا کم از کم شرعی رسم و رواج کے مطابق ہو، جیسے ولیمہ جس کا کتب فق

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

میں ذکر ہے ۔ جن موقعوں پر یہ ضیافت کی جاتی ہے وہ متعدد ہیں مثلاً مرنے ہوئے لوگوں کی یاد میں، گھریلو رسموں خصوصاً رسم ختنہ میں، ختم قرآن پاک، بعض مخصوص اوقات مثلاً حمل کے وقت یا فصل بونے اور کاٹنے کے وقت اور دیگر مختلف مواقع پر جیسے نئے مکان میں سکونت اختیار کرتے وقت کسی اور ضروری کام کے آغاز کے وقت یا امراض و بلیات وغیرہ سے بچاؤ کے لیے ۔ مقررہ قاعدے کی رو سے ہر کندوری کا مذہبی رنگ ہونا چاہیے؛ غربا کو مدعو کرنا لازمی ہے، حرام چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے. لیکن جو مقامی عادات کی بدولت عوام میں راسخ ہو چکی ہوں ان اوامر و نواہی سے چشم پوشی کا عذر ہمیشہ ڈھونڈھ لیا جاتا ہے ۔ ہر مکمل کندوری کو خصوصاً اسے جو متوفی رشتے داروں کا فاتحہ دلانے اور کسی ولی کے سالانہ عرس کے موقع پر منائی جاتی ہے، تلاوت قرآن، ذکر یا دعاؤں سے متبرک بنایا جاتا ہے ۔ لیکن اوہام پرست عوام تو یہاں تک مانتے ہیں کہ اس قسم کی کندوریوں کے ذریعے متوفی کو واقعی کھانا پہنچا دیا جاتا ہے ۔ تقریباً ہر کندوری کا آغاز دعا سے ہوتا ہے اور فاتحہ کی کندوری کا افتتاح دعائے قبور سے ہوتا ہے ۔ اچے (Acheen) میں بعض مہینوں کو کندوری کہتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک اور لفظ کا اضافہ کیا جاتا ہے جو اس کھانے کا نام ہوتا ہے جو اس متبرک ضیافت میں دیا جاتا ہے ۔ [نیز ایک قسم کا جنگلی گھیا: ایک قسم کے سرخ پھل کا نام].

مآخذ: (۱) C. Snouck Hurgronje : *The Achehnese*، ۱: ۲، ۲۱۴ تا ۶۱۶، ۲۳۶؛ (۲) Th. W. Juynboll : *Handb. des Islam Gesetzes* ص ۱۶۴: [(۳) فرہنگ آصفیہ؛ (۴) نور اللغات؛ (۵) فرہنگ انند راج بذیل مادہ].

(PH. S. v. RONKEL)

کُنْدَة المعروف بہ کِنْدَةُ المُلوک (یعنی شاہی کندہ) ۔ جنوبی عرب کا ایک قبیلہ جو غالبا کچھ زیادہ کثیر التعداد نہ تھا ۔ یہ قبیلہ ظہور اسلام سے قریب کے زمانے میں اس علاقے میں آباد تھا جو حضرموت کے مغرب میں واقع ہے، عرب نسابین ان کا سلسلۂ نسب جانتے ہیں مگر جنوبی عرب کے دوسرے قبائل کی طرح وہ بھی سراسر خیالی ہے ۔ ان کا شجرۂ نسب یوں بیان کیا جاتا ہے: ثَور (یعنی کندہ) بن عُفَیر بن عَدی بن الحارث بن مُرّہ بن اُدَد بن زید بن یَشْجُب بن زَید بن عَریب بن زید بن کَہْلان بن سَبَأ ۔ [ابن حزم اور القلقشندی وغیرہ کے نزدیک یشجب اور عریب کے درمیان زید کا نام نہیں ہے (دیکھیے جمہرۃ انساب العرب، ص ۴۱۸ و ۴۱۹؛ نہایۃ الارب، فی معرفۃ انساب العرب، ص ۳۶۴، معجم قبائل العرب، بذیل مادہ)] ۔ حُجر بن عَمرو ابن معاویۃ بن الحارث الاصغر بن معاویہ بن الحارث الاکبر بن معاویہ بن کندہ، المعروف بہ آکل المُرار، حِمیری بادشاہ حسّان تُبّع کا سوتیلا بھائی تھا اور شاہان حمیر کے دستور کے مطابق حسّان تبّع نے اس کے بیٹے عمرو بن حُجر کو اپنے دربار میں بطور خدمتگار اور ساتھ ہی بطور یرغمال رکھا ہوا تھا ۔ جب حسّان تبّع نے اندرون عرب میں لشکر کشی کی اور متعدد قبائل کو، جو وہاں آباد تھے، مطیع کر لیا تو اس نے یمن واپس آ کر اپنے سوتیلے بھائی حُجر کو مفتوحہ قبائل کا حکمران مقرر کیا ۔ حسان تبّع کو اس کے بھائی عمرو کی تحریک پر موت کے گھاٹ اتارا گیا ۔ یہ جدیس کے خلاف جو یمامہ میں رہتا تھا حسّان کی فوج کشی کے بعد کا واقعہ ہے ۔ عمرو نے حسّان تبع کی ایک بہن عَمرو بن حُجر کو بیاہ دی اور جب اس کا باپ حُجر مرا تو وہ اس کی جگہ وسط عرب کے قبائل کا حکمران قرار پایا اور المَکْسُور اس کا عرف ہو گیا ۔ عمرو کا جانشین اس کا بیٹا الحارث ہوا ۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

ایران کے بادشاہ قُباذ کی وفات کے بعد الحارث کچھ عرصے کے لیے الحیرہ کا حاکم بھی مقرر ہوا، لیکن نوشروان کی تخت نشینی کے بعد یہ حکومت اس کے قبضے سے نکل گئی ۔ الحارث کے مرنے پر وسط عرب کی سلطنت جو عملاً خود مختار ہو چکی تھی، اس کے بیٹوں میں بٹ گئی: بنو اسد پر اس کے بیٹے حُجر کی حکومت قائم رہی ۔ شُرحبیل [الحارث کا دوسرا بیٹا]، بنو بکر، حنظلۃ، عمرو بن تمیم اور رباب کے قبائل کا حاکم ہو گیا اور سَلَمہ [ابن الحارث] بنو تغلب، النمر بن قاسط اور سعد بن زید منات کے قبائل پر حکومت کرنے لگا، بنو قیس اور بنو کنانہ مَعْدیکرب کے زیر فرمان آ گئے ۔ لیکن ابھی تھوڑا ھی عرصہ گزرنے پایا تھا کہ انھوں نے حکومت کے لیے آپس میں جھگڑنا شروع کر دیا ۔ یہ جھگڑا پہلی جنگ کُلاب پر منتج ہوا جس میں عملاً عرب کے سبھی قبائل شریک تھے ۔ اس مقام کُلاب کی نشان دہی ذرا مشکل ھے ۔ کہا جاتا ھے کہ یہ بصرے اور کوفے کے درمیان یمامہ سے سات دن کی مسافت پر واقع تھا ۔ شدید لڑائی کے بعد شُرحبیل مارا گیا، لیکن اس کے حامیوں نے اس کے اھل و عیال کو بحفاظت یمن لوٹ جانے دیا ۔ بہرحال اس جنگ کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف رئیسوں کی حکومت کے بندھن ڈھیلے پڑ گئے اور بہت سے قبائل نے خود مختاری حاصل کر لی ۔ اس عرصے میں حُجر نے اس جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا اور بڑے مستبدانہ انداز سے بنو اسد پر حکومت کرتا رہا ۔ بوزنطی وقائع نگاروں نے ان دھاووں کا ذکر کیا ھے جو حجر Ogaros اور اس کے بھائی مَعْدیکَرِب نے پانچویں صدی کے اواخر میں بوزنطی سرحدوں پر مارے تھے ۔ حُجر بنو اسد کے ھاتھوں دھوکے سے مارا گیا ۔ وہ قبیلے سے باھر گیا ھوا تھا کہ اھل قبیلہ نے آئندہ اس کی اطاعت کرنے اور اسے خراج دینے سے انکار کر دیا ۔ اس پر اس نے ایک فوج لے کر ان پر چڑھائی کی ۔ یہ فوج غالباً ان قبائل سے بھرتی کی گئی تھی جن پر اس کے اقربا حکومت کرتے تھے ۔ بنو اسد نے اس کی خیمہ گاہ پر اچانک حملہ کر دیا اور وہ مارا گیا ۔ البتہ اس کا بیٹا اِمْرُؤ القیس فرار ھونے میں کامیاب ھو گیا ۔ اس واقعے سے عرب قبائل پر شاھان کندہ کی حکومت عملی طور پر ختم ھو گئی ۔ بعد ازاں کئی سال تک امرؤ القیس ھاتھ پاؤں مارتا رھا کہ کسی طرح اپنے باپ کی وراثت کا کم از کم تھوڑا سا حصہ ھی حاصل کر لے ۔ متعدد کوششوں میں ناکام ھونے کے بعد وہ بالآخر یونانی شہنشاہ سے امداد واستعانت حاصل کرنے قسطنطنیہ پہنچا، لیکن یہاں بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ۔ بلکہ حسب روایت اسے انقرہ میں شہنشاہ ھی کے فرستادہ آدمیوں نے زھر دے کر مار ڈالا ۔ [عام روایت کے مطابق شہنشاہ نے اسے زھر میں بجھا ھوا ایک چغہ بھیجا تھا جس کے پہننے سے اس کے جسم پر آبلے پڑ گئے اور بالآخر وہ مر گیا، چنانچہ اسی لیے اس کا لقب ذُوالقُروح ھو گیا تھا] ۔

لیکن محض یہی خاندان کندۃ الملوک کے نام سے مشہور نہیں تھا، کیونکہ ھمیں اسلامی دور میں بہت مدت بعد تک کئی ایسے قابل ذکر اشخاص ملتے ھیں جو نہایت ممتاز رئیس ھونے کی وجہ سے دربار (خلافت) میں اعلیٰ عہدوں پر متمکن ھوے ۔ وہ اس لیے بھی مشہور تھے کہ انھوں نے اسلام کے ابتدائی مبلغین کی مزاحمت کی تھی ۔ ظہور اسلام کے وقت قَیس بن مَعْد یکَرِب کو بڑا امتیاز حاصل تھا جس کی تصدیق الاعشٰی کے کلام سے ھوتی ھے ۔ اس کے بیٹے الاَشْعَث نے اسلام قبول کیا، لیکن پھر مرتد ھو گیا ۔ حضرت ابوبکرؓ کے بھیجے ھوے لشکر کے ھاتھوں اس نے شکست کھائی، گرفتار ھوا، اور بعد ازاں اسے معافی مل گئی ۔ اس کے اَخلاف بنو امیہ کے

www.besturdubooks.wordpress.com

دور حکومت میں اہم عہدوں پر فائز تھے ۔ دیگر نامور لوگوں میں سے متنبی المقنع الکندی اور قاضی شریح [رک بآں] قابل ذکر ہیں ۔ بعض اور لوگ جو الکندی کے نام سے مشہور ہوے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس قبیلے کے موالی تھے، مثال کے طور پر فلسفی یعقوب بن اسحٰق الکندی [رک بآں] کا نام پیش کیا جا سکتا ہے ۔ شام کا ایک قلعہ، کبیر شہر بصرے کا ایک محلہ بھی اس قبیلے کے نام سے موسوم تھا، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ مشہور شاعر ابو نواس بصرے کے محلۂ کندہ میں پیدا ہوا تھا۔

کندہ کی شاخوں میں سکون بن اشرس اور السکاسک کے قبیلوں کا نام بھی لیا جاتا ہے ۔ اول الذکر کی نسل سے بنو تجیب ہوے جو ان لوگوں میں سے تھے جو اول اول مصر جا کر آباد ہوے اور امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت میں پیش پیش تھے، چنانچہ حضرت عثمانؓ کا اصلی قاتل اسی قبیلے کا شخص بتایا گیا ہے ۔ آگے چل کر بنو تجیب کو اندلس میں بہت اثر و اقتدار حاصل ہو گیا اور بنو صمادح المریہ Almeria میں، بنو ذوالنون مالقہ Malaga میں اور بنو الافطس بطلیوس Badajoz میں یکے بعد دیگرے ان علاقوں میں اپنی بادشاہت کا ڈنکا بجاتے رہے، تا آنکہ المرابطون کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔

مآخذ: (۱) القلقشندی: صبح الاعشی، ۱: ۳۲۸؛ (۲) النویری: نہایۃ الارب، ۲: ۳۳۱؛ (۳) ابن قتیبہ: کتاب المعارف، قاہرہ ۱۳۰۰ھ، ص ۲۱۲؛ (۴) ابن خلدون: العبر، ۲: ۲۷۴ تا ۲۷۷؛ (۵) کتاب الاغانی، ۹: ۶۳ تا ۶۶؛ (۶) دیوان عبید، طبع Lyall، دیباچہ؛ (۷) المفضلیات، طبع Lyall، بمواضع کثیرہ؛ (۸) Wüstenfeld: *Registers Tabellen*؛ (۹) ابن حزم: جمہرۃ انساب العرب، ص ۴۲۵ تا ۴۳۲؛ (۱۰) ابن الاثیر: الکامل، ۱: ۲۰۷ ببعد؛ (۱۱) القلقشندی: نہایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب، ۳۶۴ و ۴۰۹؛ (۱۲) جواد علی: تاریخ العرب قبل الاسلام، ۳: ۳۱۵ تا ۳۷۴، ۴: ۴۶۴ ببعد؛ (۱۳) عمر رضا کحالہ: معجم قبائل العرب، بذیل مادّہ (بالخصوص ماخذ)؛ (۱۴) عنایت اللہ: اندلس کا تاریخی جغرافیہ، بذیل بطلیوس، وغیرہ].

(F. KRENKOW [و ادارہ])

الکندی: [مؤرخ]؛ ابو عمر [محمد] بن یوسف [بن یعقوب]؛ مصر کا ایک عرب مؤرخ جس کی پیدائش ۱۰ ذوالحجہ ۲۸۳ھ/ ۱۸ جنوری ۸۹۷ء کو مصر میں ہوئی جس کے مقام ولادت کا ٹھیک ٹھیک پتا نہیں، مگر جو بنو کندہ کے ایک قبیلے تجیب میں سے تھا جو حضرت عمروؓ بن العاص کے ساتھ مصر آیا تھا ۔ الکندی نے حدیث کی تعلیم ابن قدید (م ۳۱۲ھ/ ۹۲۴ء) اور النسائی (م ۳۰۲ھ/ ۹۱۴ء [رک بآں]) سے پائی ۔ کہا جاتا ہے اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ خود بھی حدیث کا درس دیا کرتا تھا، مگر درحقیقت اسے سب سے زیادہ دلچسپی اپنے وطن کی تاریخ اور روایات سے تھی ۔ معلوم ہوتا ہے اس نے اپنی ساری عمر فسطاط ہی میں بسر کی اور یہیں رمضان ۳۵۰ھ/ ۱۶ اکتوبر ۹۶۱ء کو اس کا انتقال ہو گیا ۔ [مگر بعض کے نزدیک اس کی وفات ۳۵۵ھ کے بعد ہوئی اور بعض کے نزدیک ۳۶۶ھ کے بعد (دیکھیے الزرکلی: الاعلام، بذیل محمد بن یوسف الکندی)]۔

الکندی کی اہم تصنیفات دو ہیں: (۱) تسمیۃ ولاۃ مصر یا صرف امراء مصر اور (۲) تاریخ قضاۃ مصر یا کتاب القضاۃ ۔ اوّل الذکر میں مصر کے والیون کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ان کے مقرر کردہ کوتوال (والی یا صاحب الشرطہ یا صاحب الحرب) بھی شامل ہیں، لیکن دوسرے اعلیٰ حکام شامل نہیں ۔ [دوسری کتاب میں مصر کے قاضیوں کے اخبار و احوال درج ہیں]۔

www.besturdubooks.wordpress.com

ناموں کی ان سادہ سی فہرستوں میں کہیں کہیں ملک کی داخلی اور خارجی حکمت عملی کے متعلق مختصر اشارات بھی ملتے ہیں ۔ بہر حال یوں مصنف نے مصر کی تاریخ کو الاخشید [رک بہ اخشیدیہ] کی وفات (۳۳۵ھ / ۹۴۶ء) تک پہنچا دیا ہے اور جس کا سلسلہ پھر کسی نامعلوم مصنف نے ۳۶۲ھ / ۹۷۲ء یعنی فاطمیوں کی آمد تک بڑھا دیا تھا ۔ کتاب مذکور کے بعض حصوں کو اول K. Tallquist نے ابن سعید کی کتاب المغرب لائیڈن ۱۸۹۹ء میں اور پھر N.A. König نے *The History of the Governors of Egypt*، نیویارک ۱۹۰۸ء میں شائع کیا ۔ الکندی نے اپنی پہلی تصنیف کے ضمیمے کے طور پر ۲۴۶ھ / ۸۶۱ء میں بکار کے تقرر تک قضاۃ مصر کی تاریخ لکھی اور اس میں قاضیوں کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ان کے بعض اہم قانونی فیصلوں کا ذکر بھی کر دیا جس سے اسلامی قانون کے متعلق ہمیں بڑا گراں قدر مواد حاصل ہوجاتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے اس کتاب کی ترتیب ثانی میں الکندی اس کا سلسلہ اپنے زمانے تک لے آیا تھا، مگر یہ نسخہ ضائع ہو چکا ہے اور اس کے بجائے صرف دو مستزاد باقی رہ گئے ہیں: ایک احمد بن عبدالرحمن بن بُرد کا ۳۶۶ھ/۹۷۷ء تک اور دوسرا کسی نا معلوم شخص کا ۳۴۷ھ / ۹۵۹ء تا ۴۲۴ھ / ۱۰۳۳ء جس کی ابتدا میں اصل نسخوں کا کچھ حصہ شامل ہے، مگر دونوں محض سنین وار فہرستوں کی شکل میں ہیں ۔ اس کتاب کو R. Gottheil نے *The History of the Egyptian Qadis* (پیرس ۱۹۰۸ء) کے نام سے مرتب کیا اور پھر یہ دونوں تصنیفات Rhuvon Guest کے ہاتھوں عنوان ذیل کے تحت *The Governors and Judges of Egypt or Kitab el-umara (el-wulâh) wa-Kitab el-Qudâh of el-Kindi together with an appendix derived, mostly from Raf' el-isr by Ibn Hajar* (سلسلۂ یادگار گب، لائیڈن ۱۹۱۲ء) نہایت خوبی سے شائع ہوئیں [(دیکھیے حسن احمد محمود : الکندی المؤرخ، مصر)].

الکندی کی دوسری تصنیفات کا علم ہمیں زیادہ تر المقریزی کی الخطط اور ابن دُقماق [رک بآں] کے اقتباسات سے ہوتا ہے، مثلاً کتاب الجند الغربی یا الاجناد [الغربیۃ ؟]؛ ایک کتاب الخندق والتراویح (اس لڑائی کا بیان جو فُسطاط کے دفاع میں ابن الزُبیر کے مقرر کردہ والی ابن جُحدَم کی تعمیر کردہ خندق کے لیے ہوئی)؛ کتاب الخطط؛ کتاب اخبار مسجد اھل الرایۃ الاعظم اور کتاب الموالی؛ سیرۃ السَری بن الحَکَم جس کا ذکر صرف المقریزی نے کیا ہے ۔ ارشاد الاریب (۲ : ۱۵۶) میں یاقوت نے الکندی کی ایک تاریخ کا حوالہ دیا ہے جو ۲۸۰ھ / ۸۹۳ء سے شروع ہوتی ہے اور ابن دُقماق (۴ : ۳۱۸) نے ۲۹۰ھ/۹۰۳ء کے ایک واقعے کے سلسلے میں بطور مأخذ جس کا ذکر کیا ہے ۔ السیوطی نے غلطی سے ایک مختصر سی تصنیف کتاب فضائل مصر اس سے منسوب کی ہے جو دراصل اس کے بیٹے عمر نے کافور الاخشیدی (۳۵۵ھ / ۹۶۶ء تا ۳۵۷ھ/۹۶۸ء) کے لیے لکھی تھی جسے J. Oestrup نے (*Umar b. Muhammad al-Kindis Beskrivelse of Ägypten, Udgivet og Oversatt* در *Bulletin de l'Academie Royale de Danemark*، کوپن ہیگن ۱۸۹۶ء، شمارہ ۴ طبع کیا تھا، لیکن Nallino : *Opus Astron.*) : *al Battani*، ۲ : ۳۲۵) کے مطابق الکندی نے خود اسی عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جس کے متعدد حوالے اس کے بیٹے نے دیے ہیں ۔

مآخذ : (۱) المقریزی : المقفّی؛ (۲) الذہبی: تاریخ الاسلام؛ [(۳) السیوطی : حسن المحاضرۃ، ۱ : ۳۱۹؛ (۴) ابن سعید الاندلسی : المغرب فی حلی المغرب، السفر السابع، لائیڈن ۱۸۹۸ء، ص ۵ و ۴۸؛ (۵) حاجی

www.besturdubooks.wordpress.com

خلیفہ: کشف الظنون، ۲۸، ۷۱۵؛ (۶) اسمٰعیل پاشا: ھدیۃ العارفین، ۲: ۳۶؛ (۷) الزرکلی: الاعلام، بذیل مادّہ؛ (۸) سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ: (۹) براکلمان: تاریخ الادب العربی (تعریب)، ۳: ۸۲ و ۸۳].

(C. BROCKELMANN [و ادارہ])

* **الکِندی**: ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق، ایک عرب فلسفی، جو نسلاً جنوبی عرب سے تعلق رکھنے کی وجہ سے فیلسوف العرب کے نام سے مشہور تھا۔ غالباً نویں صدی عیسوی کے وسط میں الکندی کوفے میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ عامل تھا۔ اس نے بصرے اور بغداد میں تعلیم پائی جو اس کے زمانے میں تعلیم کے بڑے مرکز تھے۔ خلفاے بنو عباس کے دربار خصوصاً المامون اور المعتصم کے عہد میں اس نے فلسفۂ یونان کی کتابوں کے مترجم یا مرتّب، اور المعتصم کے ایک بیٹے کے اتالیق اور منجم وغیرہ کی حیثیت سے خدمات سر انجام دیں؛ چونکہ وہ دربار [خلافت] کے معتزلہ عقائد کا سچا پیرو تھا، اس لیے جب المتوکل کے عہد میں پرانے عقائد کا احیا ہوا تو اس پر بھی اثر پڑا اور اس کا کتب خانہ کچھ عرصے کے لیے ضبط کر لیا گیا۔ ۸۷۰ء میں وہ بقید حیات تھا، کیونکہ انھیں دنوں جب سلطنت عباسیہ کو قرامطہ اور ستاروں کے ایک [منحوس] قِران سے خطرہ لاحق ہوا تو وہ سمجھتا تھا کہ یہ پیش گوئی کر سکتا ہے کہ ابھی یہ سلطنت تقریباً ۵۰۰ سال تک قائم رہے گی . . . .

الکندی کی جہاں تک رسائی ہو سکتی تھی اس نے نام نہاد ''قدیم'' یعنی یونانی علوم میں اچھی خاصی بصیرت حاصل کر لی تھی اور پھر وہ عمر بھر اپنی ادبی سرگرمیوں کے ذریعے بڑی جانفشانی سے ان کی نشر و اشاعت اسلامی دنیا میں کرتا رہا۔ دسویں صدی ہجری میں اس کی ان سرگرمیوں کے آثار ہر شعبۂ علم، بالخصوص ریاضی اور طبیعیات میں ملتے ہیں۔ اس کی تصنیفات میں سے بہت کم عربی میں محفوظ رہ سکی ہیں، البتہ لاطینی زبان میں ان کے تراجم نسبۃً زیادہ تعداد میں موجود ہیں اور ان میں وہ تراجم بھی شامل ہیں جو گرھارڈ قرمونی (Gerhard of Cremona) نے کیے تھے۔ بہر صورت ہمارے پاس خاصا مواد بچ رہا ہے جس میں کچھ اقتباسات اور کچھ اس کی سوانح اور تصانیف کے حوالے ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فلسفے اور سائنس کی دنیا میں اس کا کیا مقام ہے۔

یونانیت ما بعد کی اصطلاح میں وہ خُذْ ما صَفَا کا قائل تھا۔ اس نے نوفیثاغورثی ریاضی کو تمام علوم کی اساس قرار دیا اور نو افلاطونیوں کے انداز میں افلاطون اور ارسطو کے نظریات کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ وہ صرف طبیعیات ھی میں نہیں بلکہ طب میں بھی ریاضی کے اصولوں کا اطلاق کرنے کا شائق تھا۔ مثال کے طور پر مرکب ادویات کا نظریہ لے لیجیے۔ اس نے ان ادویات کے اثرات کی توضیح ان کے طبیعی خواص، گرم سرد خشک اور مرطوب کے ھندسی تناسب کی رو سے کی۔ اسی لیے دور احیاے علوم (Renaissance) کے فلسفی کارڈن Cardan نے بھی اس کا شمار دنیا کے بارہ بہترین نکتہ رس اشخاص میں کیا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ میں الکندی کو ایک منجم کی حیثیت سے شہرت حاصل تھی۔ اس کا نام علم نجوم کے نو حکموں (Judices) میں شمار کیا جاتا تھا، لیکن اس نے محض علم النجوم کے ان مسائل ھی سے بحث نہیں کی جو ھمارے نزدیک توھمات کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ صحیح فلکیاتی پیمائشیں کیں اور حسابات لگائے ہیں۔

جہاں تک کیمیا کا تعلق ہے اس کا مطالعہ الکندی کے زمانے میں بڑے ذوق و شوق سے کیا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

باتا تھا اور طبیب الرّازی نے الکندی کے مقابلے میں اس کی حمایت و مدافعت کی ۔ اس بارے میں ہمارے فلسفی نے کچھ مشکل روش اختیار کی ہے ۔ اس کے نزدیک سونا چاندی صرف کانوں سے نکالا جا سکتا تھا، جہاں دست قدرت انھیں وجود میں لاتا ہے اور ان کا بنانا انسانی کاریگری کے بس میں نہیں . . . . . .

الکندی نے علم مناظر و مرایا پر سیر حاصل بحث کی ۔ اس کی اہم ترین کتاب بلاد مشرق میں اس کے جلیل القدر جانشین ابن الہیثم کی تصنیف کے بعد سب سے زیادہ پڑھی جاتی تھی ۔ یہ کتاب زیادہ تر اقلیدس (Euclid) کی بصریات (*Optics*) کے اس نسخے پر مبنی ہے جو تھیون Theon کا تصحیح کردہ ہے ۔ اس کتاب میں الکندی نے حسب ذیل امور سے بحث کی ہے : (۱) روشنی کا گزر خطوط مستقیم میں، (۲) رویت کا براہ راست عمل، (۳) رویت کا عمل آئینے کے ذریعے، (۴) نظر پر فاصلے اور زاویۂ بصر کا اثر نیز مغالطہ ہائے بصری ۔ اس کے نزدیک روشنی کے سفر میں کوئی وقت صرف نہیں ہوتا اور رویت کرنوں کے اس مجموعے سے عمل میں آتی ہے جو آنکھوں سے نکلتا اور ایک مخروطی صورت اختیار کر کے خارجی شے کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے ۔ باقی چار حسیں تو اشیا سے اثر قبول کرتی ہیں، لیکن حسِّ باصرہ اپنے موضوع کو ایک فاعلانہ اور فوری انداز میں گرفت میں لے لیتی ہے ۔

اس کی دوسری بڑی بڑی کتابوں کی طرح اس کی ایک مختصر تصنیف بھی صرف لاطینی ترجمے کی صورت میں ملتی ہے ۔ اس کا موضوع ہے آسمان کے نیلے رنگ کا سبب ۔ الکندی اس کی تشریح اس کتاب میں یوں کرتا ہے کہ یہ رنگ در اصل افلاک سے مخصوص نہیں بلکہ آسمان کی تاریکی اور گرد و غبار اور بخارات کے ان ذرات سے مل کر بنا ہے جو ہوا میں موجود اور سورج کی روشنی سے منور ہوتے ہیں ۔ اس کی ایک تصنیف مدّ و جزر پر بھی لاطینی ہی میں محفوظ ہے جو اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ مصنف نے اپنے نظریے کو جو اگرچہ غلط ہے، تجربات کی روشنی میں جانچا تھا ۔

الکندی اگرچہ بنیادی اعتبار سے ایک ماہر طبیعیات تھا لیکن اس نے عقیدۂ روح و عقل (νοῦς) پر بھی بحث کی ہے ۔ اس کی دانست میں یہ دنیا بحیثیت مجموعی ایک خارجی علت فاعلہ یعنی عقل الٰہیہ کی تخلیق ہے جس کا عمل عالم بالا سے دنیا میں کئی طرح سے نافذ ہوتا رہتا ہے ۔ خدا اور عالم اجسام کے درمیان عالم روح ہے، جس نے اجسام سماوی کے عالم کو تخلیق کیا ۔ روح انسانی عالمی روح سے نکلتی ہے ۔ جس حد تک انسانی روح جسم سے مخلوط ہے وہ اجسام سماوی کے اثرات کی ماتحت ہے، لیکن اپنی روحانی اصل اور ہستی کے اعتبار سے وہ آزاد ہے کیونکہ محض عالم عقل (νοῦς) ہی میں آزادی اور بقاے دوام ہے، لہٰذا اگر ہمیں اعلیٰ ترین مقام پر پہنچنے کی تمنا ہے تو لا محالہ خوف خدا، علم اور اعمال حسنہ کا سہارا ڈھونڈنا پڑے گا جو عقل کی جاودانی مملوکات ہیں ۔

الکندی کے رسالۂ *De Intellectu* [رسالہ فی العقل، مطبوعۂ قاہرہ] طبع Nagi میں نظریۂ عقل ہمیں پہلی بار اس صورت میں نظر آتا ہے جو مسلمانوں کے نوافلاطونی ارسطاطالیسی فلسفے کے پورے دور میں امتیاز رکھتی ہے ۔ اسکندر الافرودیسی (Aphrodisias) (*De Anima*، ج ۲) کی پیروی کرتے ہوے الکندی نے عقول اربعہ کو ایک دوسری سے ممیز کیا ہے : (۱) جو ہمیشہ مصروف عمل رہتی ہے، (۲) جو بالقوہ روح میں موجود ہوتی ہے، (۳) جسے عقل اول روح میں بروے کار لاتی ہے (یہاں تک اسکندر الفرودسی کی سہ گونہ عقل νοῦς، یعنی ποιητικός، ὑλικός،

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ἐπίκτητος کے مطابق) اور (۳) عقل اثباتی پی ڈوہم P. Duhem (Le Systeme du Monde، پیرس ۱۹۱۶ء، ۳: ۳۰۵) کے قیاس کے مطابق مؤخرالذکر کا مطلب حسِ حیوانی (anima Sensitiva) ہے جس کا ذکر اسی ضمن میں اسکندر الافرودیسی سیاسی نے کیا ہے، لیکن اس نے اسے عقل نہیں کہا اور نہ وہ ایسا کہہ سکتا تھا۔ میرے نزدیک تو الکندی کی چوتھی عقل سے مراد تیسری کی مؤثر کار کردگی ہے بعینہٖ جیسے ارسطو نے اکتسابی نیکی کے رکھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے اور اکتسابی علم اور ذہنی عمل کے درمیان تمیز کی ہے، لہٰذا زمانۂ ما بعد کی عربی اصطلاحات کے مطابق چوتھی اور پہلی عقل کے مابین یوں تمیز کی جائے گی کہ یہ عقل بالفعل ہے اور وہ عقل فعّال۔

[الکندی کثیرالتصانیف مصنف تھا۔ اس نے ۲۲ رسائل فلسفہ، ۱۹ رسائل نجوم، ۱۶ رسائل علم ہئیت، ۱۷ رسائل علم مناظرہ، ۱۱ رسائل حساب، ۲۳ رسائل علم ہندسہ، ۲۲ رسائل طب، ۱۲ رسائل طبیعیات، ۸ رسائل علم الکرات، ۷ رسائل علم موسیقی، ۵ رسائل نفس اور ۹ رسائل منطق وغیرہ لکھے تھے (قدری حافظ طوقان: تراث العرب العلمی، ص ۱۶۶ تا ۱۷۶، قاہرہ ۱۹۶۳ء) ۔ ان میں سے فلسفیانہ رسائل کا مجموعہ دو جلدوں میں ابو ریدہ نے شائع کیا ہے (قاہرہ ۱۹۵۰ء)۔]

مآخذ (۱) G. Flügel: *Al. Kindi, Genannt der Philosoph der Arabes* (*Abh. f.d.k.d.m.*، ۱: ۲) لائپزگ ۱۸۵۷ء؛ (۲) O. Loth: *Al. kindi als Astrog* (*Morgenl. Forsch. Festschr. f. Fleischer*) لائپزگ ۱۸۷۵ء، ص ۶۳ ببعد؛ (۳) A. Nagy: *Die Philosophischen Ab handlungen des Ja'qub ben Ishaq al-Kindi*، *Beitr. z. Gesch. d. Philos. d. M.A.*، ۲/۵ منشر ۱۸۹۷ء؛ (۴) T.J. de Boer: *Zu kindi und seiner Schule* *Arch. f. Gesch. d. Philos*، ۱۳: ۱۰۳ ببعد؛ (۵) وہی مصنف: *Gesehichte der Philosophie im Islam*، سٹٹ گارٹ ۱۹۰۱ء، ص ۹۰ ببعد؛ انگریزی ترجمہ: ص ۹۷ ببعد)؛ (۶) وہی مصنف: *Kindi wider* (*Orient. Stud. Fetschr f. Nöldeke*) Giessen، ۱۹۰۶ء، ص ۲۷۹ ببعد؛ (۷) H. Suter: *Die Mathematiker und Astronomen der. Araber*، *Abhd. z. Gesch. d. Math Wiss*، ج ۱۰، لائپزگ ۱۹۰۰ء؛ [(۸) George Sarton: *Introduction to the History of Science*، مطبوعۂ بالٹی مور ۱: ۵۵۹ تا ۵۶۰؛ (۹) قدری حافظ طوقان: تراث العرب العلمی فی الریاضیات والفلک، ص ۱۶۶ تا ۱۷۶، قاہرہ ۱۹۶۳ء؛ (۱۰) براکلمان: *G.A.L.*، تکملہ، ۱: ۳۷۲ تا ۳۷۰، لائڈن ۱۹۳۷ء؛ (۱۱) ابن الندیم: الفہرست، ۲۵۵ تا ۲۵۶، لائپزگ؛ (۱۲) القفطی: تاریخ الحکماء، ص ۳۶۶ تا ۳۷۷، لائپزگ؛ (۱۳) عمر فروخ: من تاریخ الفکر العربی الی ایّام ابن خلدون، ص ۲۲۵ و ببعد، بیروت ۱۳۹۲ھ؛ (۱۴) محمد لطفی جمعہ: تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق و المغرب، ص ۱ تا ۷، قاہرہ ۱۹۲۷ء؛ (۱۵) احمد فؤاد الاہوانی: الکندی، فیلسوف العرب، مطبوعۂ [قاہرہ]؛ (۱۶) وہی مصنف: الکندی، در *History of Muslim Philosophy*، ۱: ۴۲۱ تا ۴۳۳، طبع M.M. Sharif، ویز بادن، ۱۹۶۳ء]۔

(Tjide Boer [و ادارہ])

الکندی: عبدالمسیح بن اسحٰق۔ عیسائیت کی حمایت میں مشہور عربی تصنیف: رسالۃ الی عبداللہ بن اسمٰعیل الہاشمی کے مصنف کا فرضی نام۔ اس کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے (طبع ۱۸۸۰ء، ص ۴۷؛

www.besturdubooks.wordpress.com

دیکھیے ص ۲) کہ یہ اس مناظرے کے بارے میں ہے جو تقریباً ۲۰۴ھ/۸۱۹ء میں خلیفہ المامون کے سامنے اسلام اور عیسائیت کی متعلقہ اقدار کے بارے میں ہوا تھا، لیکن اس میں الٰہیات کے ضمن میں جو بیانات دیے گئے ہیں اور جو اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں وہ غالباً ۳۰۰ھ/۹۱۲ء سے بعد کی ہیں۔ ان کی ایک خاص مثال یہ ہے کہ حنبلی بربہاری (م ۳۲۹ھ/۹۴۰ء) کے اس نظریے کی کہ خدائے تعالیٰ کے عرش کے پائے پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اسم مبارک کندہ ہے، الطبری (م ۳۱۰/۹۲۳ء) کی تردید کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مسیحی الٰہیات میں اسلامی علم کلام کے تصورات مثلاً صفات ذات اور صفات فعل میں تمیز کو شامل کر لینے کی وجہ سے اس کندی کو کوئی ایسا یعقوبی مصنف بھی قرار دینے کی کوشش کی جا سکتی ہے جو ابن رشد سے پہلے کے زمانے کے رجحانات کا حامل تھا، مثلاً مشہور مصنف یحییٰ بن عدی (م ۳۶۴ھ/۹۷۴ء)۔ البیرونی نے اس کے متن سے استفادہ کیا ہے اور اس کے مصنف کا ذکر اس کے اختیار کردہ نام نسطور کندی یعنی ''فرزند اسحٰق'' سے کیا ہے جو ایک ہاشمی یعنی ''فرزند اسمٰعیل'' سے خطاب کر رہا ہے۔

اس وکالت کا لہجہ بیشتر مقامات پر جارحانہ ہے تاہم یہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن پاک کے موجودہ متن کی تدریجی تالیف اور اس کی تنقیدی تاریخ کا خاکہ سب سے پہلی بار اسی میں پیش کیا گیا۔ اصل عربی کتاب سریانی رسم الخط میں لکھی گئی تھی (کرشنی Karshuni، مخطوطات پیرس، *Catal. Zotenberg*، ص ۲۰۴، ۲۰۵؛ Gotha : *Catal. moller*، ص ۱۶۰)۔ ۱۱۴۱ء کے قریب پطرس الطلیطلی (Peter of Teledu) نے اس کا تجزیہ اور پھر لاطینی میں ترجمہ کیا (لاطینی مخطوطات، پیرس، عدد ۳۳۹۳، ۳۶۴۹، طبع در Bibliander : *Alcoranus*، ۱۵۴۳ء، ۱۰۲ تا ۲۰) اور پھر انیسویں صدی میں سرولیم میور اسے گمنامی سے نکال کر دوبارہ منظر عام پر لایا۔

مآخذ : (۱) Dionysius Carthusianus (م ۱۴۷۱ء)، *In Alchoran Lib. V.*، کولون ۱۵۳۳ء، ج ۲، حصہ ۱، ص ۷۰، ۲۰۵ وغیرہ؛ (۲) W. Muik : *The Apology of Al-kindy*، لنڈن ۱۸۸۲ء، ص ۵۹ ببعد؛ (۳) P. Casanova : *Mohammad et la findu monde*، پیرس ۱۹۱۳ء، ص ۱۱۰ تا ۱۲۲؛ (۴) کاشف الغطاء (شیعی): الدین والاسلام ۱۳۳۱ھ ج ۲، آخر کتاب، متن اول بار Ant. Tien نے ۱۸۸۰ء میں طبع کیا (لنڈن، طابع Gibbert O. Riwington : *Turkish Mission Aid Society*، ۱۶۶ صفحات)۔

(L. MASSIGNON)

کَنْعان : لفظ کے عربی الاصل یا عجمی الاصل ہونے کے بارے میں علمائے لغت کے ہاں اختلاف موجود ہے، اسی طرح عربی الاصل ہونے کی صورت میں اس کے اشتقاق اور معانی کے بارے میں بھی مختلف اقوال ہیں۔ ابن منظور (لسان العرب، بذیل مادۂ کَنَع) اور مرتضٰی الزبیدی (تاج العروس، بذیل مادۂ کَنَع) نے تفصیل سے بحث کی ہے اور اسے یاقوت (معجم البلدان، ۴: ۴۸۳، دارالصادر بیروت) نے مفصل نقل کیا ہے۔ اس کا فصیح تلفظ کاف کی زبر (ـَـ) اور نون ساکن کے ساتھ ہے مگر کاف کی زیر (ـِـ) بھی منقول ہے (تاج العروس، مادۂ کنع)۔

کتب انساب و تاریخ میں کنعان نام کے تین اشخاص مذکور ہیں جن میں سے ایک حضرت نوح کا بیٹا، دوسرا ان کا پوتا اور تیسرا کنعان بابل کے مشہور بادشاہ نمرود کا باپ تھا۔ اول الذکر کنعان کے بارے میں روایات میں اختلاف بلکہ تضاد پایا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

جاتا ہے، الطبری (۱ : ۱۹۹، طبع ڈخویہ) نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت نوحؑ کے چار بیٹوں میں سے ایک کا نام کنعان تھا۔ اس کنعان ہی کو عرب یام کہتے ہیں اور غرق بھی یہی ہوا تھا ۔ ابن الکلبی سے یاقوت (معجم البلدان، ۴ : ۴۸۳، بیروت) نے بھی یہی نقل کیا ہے اور بتایا ہے کہ کنعان کا نام اصل میں شالوما تھا اور یہ غرق ہو گیا تھا اور اس کی نسل آگے نہیں چل سکی، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ بلاد شام میں آباد ہونے والے لوگ کنعانی کہلاتے تھے جو کنعان بن نوح سے منسوب تھے اور عربی کے مشابہ کوئی زبان بولتے تھے ۔ فیروز آبادی (القاموس بذیل مادۂ کنع) نے لکھا ہے کہ کنعان حضرت نوحؑ کا ہی بیٹا تھا ۔ شارح القاموس مرتضٰی الزبیدی (تاج العروس بذیل مادۂ کنع) نے لکھا ہے کہ مشہور ماہر نسب ابن المنذر الکوفی اور ماہر لغت اللیث سے بھی یہی منقول ہے ۔ ابن خلدون (العبر، ۶ : ۹۳، ۹۷) نے بربر کو کنعان بن نوحؑ (بربر بن تملا بن مازیغ بن کنعان بن نوحؑ) کی اولاد بتایا ہے۔

دوسرے کنعان کے سلسلے میں یاقوت (محلّ مذکور) نے لکھا ہے کہ وہ سام بن نوحؑ کا بیٹا تھا اور بلاد شام کے کنعانی اسی کنعان بن سام بن نوح کی نسل سے تھے۔ یاقوت اسے قول مستقیم حسن (صحیح اور اچھا) قرار دیتا ہے ۔ المسعودی (مروج الذہب، ۳ : ۲۹۴) کے نزدیک بلاد شام کے کنعانی کنعان بن حام بن نوحؑ کی اولاد ہیں ۔ تیسرے کنعان کے بارے میں الزبیدی (تاج العروس، بذیل مادۂ کنع) نے لکھا ہے کہ کتب تاریخ میں ایک کنعان بن کوش کا بھی ذکر ملتا ہے جو حام بن نوح کی اولاد سے تھا ۔ شاید وہی کنعان نمرود بابل کے نسب میں مذکور ہے جس کا سلسلۂ نسب بقول المسعودی (مروج الذہب، ۳ : ۲۴۰؛ نیز تاج العروس بذیل مادۂ کنع) یوں ہے : نمرود بن کنعان بن سنجاریب بن نمرود الاکبر ابن کوش بن حام بن نوحؑ؛ بعض کتب تفسیر (البیضاوی، ۱ : ۵۱۳، طبع فلائشر) میں بھی یہی مذکور ہے کہ نمرود کے باپ کا نام کنعان تھا۔

مآخذ : (۱) فیروز آبادی : القاموس، بذیل مادّہ کَنَعَ؛ (۲) الزبیدی : تاج العروس، بذیل مادّہ؛ (۳) ابن منظور : لسان العرب، بذیل مادّہ؛ (۴) یاقوت الحموی : معجم البلدان، طبع دارالصادر، بیروت؛ (۵) الطبری : تاریخ الرسل والملوک، طبع ڈخویہ؛ (۶) ابن خلدون : کتاب العبر؛ (۷) المسعودی : مروج الذہب؛ (۸) البیضاوی : انوار التنزیل و اسرار التأویل، طبع فلائشر؛ (۹) عمر رضا کحالہ : معجم قبائل العرب، دمشق؛ (۱۰) الثعالبی : قصص الانبیاء، قاہرہ ۱۳۲۴ھ۔

(ظہور احمد اظہر)

کنعان پاشا : جو صاری کنعان پاشا بھی کہلاتا ہے، سلطنت عثمانیہ کا ایک امیر البحر اعظم (قپودان پاشا) تھا ۔ پیدائش کے اعتبار سے وہ روسی (چرکس) تھا ۔ وہ ایک غلام کی حیثیت سے مصر کے عثمانلی حاکم باقیرجی احمد پاشا کے حلقۂ خدمت میں داخل ہوا ۔ جب احمد پاشا کو سزائے موت ملی تو سلطان مراد چہارم کنعان کو سرای [محل سلطانی] میں لے گیا اور وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی ۔ اسے ترقی دے کر رکاب دار آغا سی بنایا گیا (وقائع وجیہی، ورق ۹۱ ـ ب، مخطوطۂ وی‌انا) ۔ سلطان ابراہیم کی تخت نشینی (فروری ۱۶۴۰ء) کے بعد وہ اس کا منظور نظر ہو گیا اور اس کی بیٹی عاتکہ سلطانیہ سے شادی کی ۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسے وزیر ثالث کے عہدے پر سرفراز کر دیا گیا، لیکن ابراہیم کی وفات (۱۸ اگست ۱۶۴۸ء) کے چند ہی روز بعد اسے اقریطش (Crete) میں جلا وطن کر دیا گیا ۔ ستمبر ۱۶۵۲ء میں وہ استانبول واپس آیا اور در دانیال

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کے مورچوں کا نگران مقرر ہوا ۔ ۹ ستمبر ۱۶۵۳ء کو اوفن Ofen کا حاکم ہوا، لیکن ۲۲ ستمبر ۱۶۵۵ء کو اس عہدے سے برطرف کر دیا گیا اور پھر ۹ فروری ۱۶۵۶ء کو سلستره کا حاکم مقرر ہوا ۔ اسی سال ۳ مئی کو اسے قپودان پاشا (رک بآں) کا عہدہ دے دیا گیا ۔ ۲۶ جون ۱۶۵۶ء کو اس کے زیر قیادت ترکی بیڑا وینس کے مقابلے میں بھیجا گیا، لیکن درہ دانیال میں اس نے شکست فاش کھائی ۔ Lepanto کی جنگ کے بعد یہ سب سے بڑی بحری شکست تھی جس سے ترکی کو سابقہ پڑا (دیکھیے J. v. Hammer : *GOR*، ۵ : ۶۴۹ ببعد) ۔ سلطان کے سارے غیظ و غضب کا ہدف کنعان پاشا قرار پایا، چنانچہ اسے فوراً زندان میں ڈال دیا گیا ۔ بالآخر اس کی ہموطن خاتون سلطانہ والدہ (کو سم والدہ رک بآں) کی سفارش سے ۱۸ جولائی ۱۶۵۶ء کو اسے رہائی ملی، لیکن تقریباً اسی وقت اسے قپودان پاشا کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا ۔ دو سال بعد ۲۳ جون ۱۶۵۸ء کو اسے قائم مقام (رک بآں) بنایا گیا، لیکن اس سے اگلے ہی مہینے (۱۶ جولائی ۱۶۵۸ء) کو پھر معزول کر دیا گیا اور قلعہ نشین فوج کا محافظ بنا کر بروسہ [بورسہ] بھیج دیا گیا (دیکھیے J. von Hammer : *GOR*، ۶ : ۳۷؛ نعیما : تاریخ، طبع اول، ۲ : ۶۶) ۔ یہاں سے وہ آناطولی کے باغی عبازہ حسن کے ساتھ جس سے اس نے بڑے گہرے تعلقات پیدا کر لیے تھے، کچھ ساز باز کر کے روانہ ہو گیا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسے عبازہ کے انجام میں شریک ہونا پڑا، چنانچہ اسے ۱۷ فروری ۱۶۵۹ء کو حلب میں دغا بازی سے قتل کر دیا گیا (دیکھیے نعیما : تاریخ، ۲ : ۶۸۵) ۔ اس کا سر ۹ مارچ ۱۶۵۹ء کو استانبول کے دیوان میں لایا گیا ۔

اگر یہ وہی کنعان پاشا ہے جس کا ذکر اولیا چلبی نے سیاحت نامہ (۳ : ۳۶۶) میں کیا ہے (اور وہ یقیناً کبھی Oczakov کا حاکم نہیں تھا، اسی طرح توجہ کنعان پاشا (م ۱۰۶۲ھ / ۱۶۵۲ء) بھی جسے اکثر قپودان پاشا سے ملتبس کر دیا جاتا ہے، مثلاً سجِلِّ عثمانی، ۴ : ۸۳ کبھی اس عہدے پر مامور نہیں ہوا تھا) تو وہ ایک مصنف بھی تھا اور اس نے صاری صلتیق بابا (رک بآں) کی شان میں صلتیق نامہ نظم کیا تھا ۔ اس کے اپنے جنگی کارناموں خصوصاً اس کی ۱۰۳۶ سے ۱۰۳۸ھ / ۱۶۲۶ء سے ۱۶۲۸ء تک کی فوجی کاروائیوں کو طُلّوعی ابراہیم افندی (ساکن قَلْقَنْدِلن) نے جو شاعر بھی تھا اور فقیہ بھی اپنی نظم پاشا نامہ میں بیان کر گیا ہے ۔ اس کا ایک نقل کردہ نسخہ موزۂ بریطانیہ (Sloane مخطوطہ ۳۵۸۴) میں موجود ہے، دیکھیے Ch. Rieu : *Catalogue of the Turk. Mss.* ص، ۱۹۱ ببعد، جس میں مضامین کا تفصیل دار خلاصہ بھی شامل ہے ۔ اس امکان کو ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یہ نظم مذکورہ بالا توجہ کنعان پاشا سے بھی متعلق ہو سکتی ہے جس کی زندگی کے واقعات بہت کچھ اپنے ہم نام اور ہم عصر کے کارناموں سے ملتے جلتے تھے (مثلاً دونوں اوفن Ofen کے والی رہے تھے) ۔ صاری کنعان پاشا کی زندگی کے جو حالات ملتے ہیں وہ بے حد الجھے ہوئے اور گڈ مڈ ہیں جیسا کہ رامز پاشا زادہ محمد کے خریطۂ قپودانانِ دریا (استانبول ۱۲۸۵ھ) کے ص ۶۵ ببعد پر مقالے سے، نیز قاموس الاعلام، ص ۳۹۰۰، کی تصریحات سے جو خریطہ ہی کی پیروی کرتا ہے ظاہر ہوتا ہے ۔ اس مآخذ کی رو سے کنعان پاشا کو اس مدرسے کے پاس دفن کیا گیا تھا جو قرق چشمہ کے قریب ہی واقع ہے ۔

مآخذ : (متن میں مذکورہ تصنیفات کے علاوہ) :

(۱) A. V. Gévai در Jos v. Chmel : *Osterreich. Geschichtsforscher*، وی انا ۱۸۴۱ء، ۲ : ۸۲، عدد ۷۶ : (۲) وہی مصنف **Bées 'A' Budai pasák**

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۱۸۴۱ء، ص ۴۱ عدد ۸۶؛ (۳) سجلِّ عثمانی، ۴: ۸۲؛ (۴) J. von Hammer: *Geschichte des Osmanischen Reiches*، ۱۰: ۴۹۷، بذیل *Kenaanpascha*.

(FRANZ BABINGER)

* **کنغری**: (اسے کَنْقری اور کبھی کبھی چنگری بھی لکھا جاتا ہے)، ایک اسی نام کی لوا (اداری ضلع) کا صدر مقام - یہ ضلع ولایت (صوبہ) قسطمونی Kastamuni میں قزل ایرماق (Hayls) کے ایک معاون اجی صو Gangra کے کنارے واقع ہے - یہ وہی قدیم گنگرہ Gangra ہے جو پرانے زمانے میں بھی ایک مستحکم مقام کی حیثیت سے مشہور تھا - بعض اوقات بوزنطی اسے جلاوطنی کے مقام کے طور پر استعمال کرتے تھے اور زمانۂ ما بعد میں جب عربوں اور دانشمند اوغلو حکمرانوں سے جو لڑائیاں چھڑیں ان میں اسے پھر اپنے تقریباً ناقابل تسخیر قلعے کی بدولت اہمیت حاصل ہوگئی - بوزنطیوں کے خلاف چڑھائیوں کے دوران میں بنو امیّہ کئی بار خَنْجَرَة (بشکل دیگر جنجرة) تک بڑھ آئے؛ مثلاً ۹۳ھ/۷۱۱ - ۷۱۲ء میں (الطبری طبع de Goeje، ۲: ۱۲۳۶؛ ابن الاثیر، طبع Tornberg، ۳: ۴۵۷؛ الیعقوبی، ۲: ۳۵۰ جو اس شہر کو حصن الحدید کے نام سے یاد کرتا ہے) - ۱۰۹ھ/ ۷۲۷ - ۷۲۸ء میں (الیعقوبی، ۲: ۳۹۵) اور ۱۱۴ھ/ ۷۳۱ - ۷۳۲ء میں (ابن العبری (Bar-Hebraeus): *Ketabā de Maktebānūt Zabed*، طبع Bruns و Kirrsch، ۲: ۱۲۵، دیکھیے الطبری، ۲: ۱۵۶۱ اور Theophanes، بذیل سال ۶۲۲۴) - جب ۱۰۷۱ء میں منگرت Mangikert کی شکست کے بعد بوزنطی شہنشاہ نے مشرقی صوبے چھوڑ دیے تو سلجوق اور دانشمند اوغلو نے اس مال غنیمت کو آپس میں بانٹ لیا - سلجوق نے قونیہ میں حکومت قائم کی اور دانشمند اوغلو ایشیائے کوچک کے شمالی نصف حصے میں املسیہ سے قسطمونی تک پھیل گئے - سب سے پہلے دانشمند اوغلو کی فتوحات کے ضمن میں ہمیں ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ - ۱۰۷۶ء میں کنغری کا ذکر ملتا ہے، دیکھیے تاریخ آل دانشمند در آماسیه لی کی حسین حسام الدّین، آماسیه تاریخی، استانبول، ۱۳۲۲ء ۲۸۶ ببعد؛ هزارفن: تنقیح التّواریخ، در *ZDMG*، ۳۰: ۴۷۰ - ۱۱۰۱ء میں صلیبی جنگ آزماؤں کا ایک لشکر قسطنطنیه سے سر زمین دانشمند اوغلو کی طرف روانه هوا تاکه انطاکیه کے حاکم Boemund کو جسے انھوں نے ملطیه Malatya میں گرفتار کر کے نیکسار Niksar میں قید کر دیا تھا، رهائی دلائے - یه لشکر انقره کو فتح کر کے کنغری (قدیم نام گنگرة) پهنچ گیا، لیکن اس کا قلعے پر حمله ناکام ثابت هوا اور کچھ هی دن بعد سلجوقوں اور دانشمند اوغلو کی متحده فوجوں نے اماسیه میں اس لشکر کا مکمل قلع قمع کر دیا، Albertus Aquensis: *Liber*، Caput؛ ابن الاثیر، طبع Tornberg، ۱۰: ۲۰۳ دیکھیے *ZDMG*، ۳۰: ۴۷۶؛ Chalandon: *Les Comnene*، ۱: ۲۲۳ ببعد) - شہنشاه Jhon Comnenus نے اپنے طاقتور قلعه شکن توپ خانے کی مدد سے ۱۱۳۴ء میں کنغری فتح کر لیا حالانکه اس میں ایک سال قبل اس کا حمله ناکام رہ چکا تھا (Niketas: *Chronicle*، باب ۶، دیکھیے نیز Joannes Prodromos: رک به Chalandon، کتاب مذکور ۸۴۲ ببعد)، لیکن شہنشاه کے رخصت هوتے هی دانشمند اوغلو نے قلعے پر دوباره قبضه کر لیا اور اس کے بعد بوزنطی پھر کبھی اس پر قابض نه هو سکے - اس کے بعد هم دیکھتے هیں که قونیه کی سلجوق سلطنت کے زوال کے بعد کنغری قسطمونی کے اسفندیار اوغلو کے هاتھ آ گیا اور پھر ان سے ۷۹۵ھ/ ۱۳۹۲ء (ازروے نشری) یا ۷۹۷ھ/ ۱۳۹۵ء (ازروے عاشق پاشا زاده و نامعلوم الاسم

www.besturdubooks.wordpress.com

عثمانی وقائع نگار) میں بایزید اول نے ان کی مملکت کے بیشتر حصے کے ساتھ کنغری بھی چھین لیا۔ ۸۰۳ھ/۱۴۰۱ء میں تیمور نے اسفند یار اوغلو کو پھر یہ علاقہ واپس کر دیا، لیکن ۸۲۲ھ/۱۴۱۹ء میں [سلطان] محمد اول نے اسے قطعی طور پر اپنی حدود سلطنت میں شامل کر لیا (عاشق پاشازادہ: تاریخ، ص ۸۸ ببعد؛ Leunclavius: *Historiae Musul-manae Turcorum*، فرینکفرٹ ۱۵۹۱ء، کالم ۴۷۵؛ von Hammer کے بیانات، *Gesch. des Osman. Reiches*، ۱: ۷۰، ۲۴۸ اور ۲: ۱۷۶، غلط فہمی پر مبنی ہیں)۔ اس کے بعد ترکی حکومت کے ماتحت جو زمانۂ امن شروع ہوا تو کنغری بالکل گمنامی کے پردے میں چھپ گیا اور مؤرخین اس کا ذکر بمشکل ہی کبھی کرتے ہیں تاہم ہمیں اس شہر کا مفصل تذکرہ اولیا: سیاحت نامہ، ۳: ۲۵۰ ببعد اور حاجی خلیفہ: جہاں نما، ص ۶۴۵ سے مل جاتا ہے۔ یورپی سیاحوں میں سے سب سے پہلے اس کا ذکر ۱۵۵۳ تا ۱۵۵۵ء میں Dernschvan نے اپنی کتاب، *Tagebuch einer Reise nach Konstantinople und Kleinasien*، طبع Babinger، میونخ ۱۹۲۳ء، ص ۱۹۶ میں کیا۔ Anisworth پہلا یورپی تھا جس نے اس سے تقریباً تین سو سال بعد اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر اس کا مفصل حال بیان کیا۔ خود ہمارے زمانے میں بعض جرمن سیاح یہاں جاتے اور اس کے کوائف قلمبند کرتے رہے ہیں۔ وہ قلعہ جس پر اپنے اپنے زمانے میں عرب، دانشمند اوغلو، بزنطی اور صلیبی جنگجو یورشیں کرتے رہے آج کھنڈر بنا پڑا ہے۔ قرہ تگین نے پہلے دانشمند اوغلو بادشاہ کی خاطر یہ شہر فتح کیا تھا اور لوگوں نے اب اسے ولی محترم مان لیا ہے۔ اس کا مقبرہ یہاں اب تک موجود ہے۔ قلعے کی پہاڑی پر حوضوں کے نظام کی جس کا تعلق زمانۂ قبل از تاریخ سے ہے اور جس کا اولیا اور حاجی خلیفہ نے تفصیلی ذکر کیا ہے، اب تک پوری تحقیق نہیں کی گئی ہے۔ یہی حال مسجد طاش (طاش مسجد) یعنی مولوی درویشوں کی خانقاہ اور اس کے کتبات کا ہے جس کے بارے میں Anisworth کو بتایا گیا تھا کہ یہ عرب خلفاء کے زمانے کی یادگار ہے۔ یہاں کی چھوٹی بڑی ۲۷ مسجدوں میں سے چند ایک بوزنطی دور کی ہیں (رک بہ Cuinet)۔ جامع مسجد کو سلیمان اوّل نے ۹۶۶ھ/۱۵۵۸-۱۵۵۹ء) میں تعمیر کرایا تھا۔

کنغری سے دو گھنٹے کی مسافت پر جنوب مشرق میں مغارۃ کے مقام پر معدنی نمک کے وسیع ذخائر (Cuinet، ۴: ۴۲۷، اور Marcker) بہت مشہور ہیں۔ یہاں سے نکلے ہوئے نمک سے بوزنطی بھی واقف تھے جسے وہ Γαγγρηνὸν ἅλας کہتے تھے (Nicholaos Myrepsos، تیرھویں صدی کے آخر میں در De Cange *Glossar. ad scriptores med. et inf. Graec*، بذیل مادّہ) زلزلوں کے شدید جملوں کا، جن سے عصر حاضر میں بھی اسے سابقہ پڑتا رہتا ہے، ذکر قرون وسطیٰ میں بھی ملتا ہے۔ القزوینی: آثار البلاد، طبع Wüstenfeld، ص ۳۶۸ میں اسی قسم کے ایک خوفناک زلزلے کا مفصل حال بیان کرتا ہے جس نے اگست ۱۰۵۰ء میں اس شہر کو تباہ کر ڈالا تھا۔

باشندوں کی تعداد کا اندازہ ۳۰۰۰۰ تیس ہزار [چالیس ہزار] لگایا جا سکتا ہے جو ۵۰۰۰ پانچ ہزار مکانات میں آباد تھے۔ ان میں ۱۵۰ یونانی اور ۵۰ آرمینی خاندان تھے جو جنگ عظیم کے نتائج کے زیر اثر شاید اس وقت تک یہاں سے رحلت کر چکے ہوں گے۔

مآخذ: (جو اوپر نہیں دیے گئے) (۱) Ritter: *Erdkunde*، ۱۸: ۳۵۳ ببعد؛ (۲) G. Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۱۵۸؛ (۳) سالنامۂ ولایت قسطمونی ۱۲۸۶ھ رغیرہ؛ (۴) Cuinet: *La Turquie d' Asie*، ۴: ۵۵۱ ببعد؛ (۵)

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Travels and Researches in Asia Minor, etc.، لندن ۱۸۴۲ء، ۱ : ۱۰۹ ببعد؛ (۶) v. Flottwell در *Petermann's Mitteilungen*، تکملہ حصہ ۱۱۳ (۱۸۹۵ء)، ص ۳۸ ببعد و ۵۰ (پہاڑی پر کھنڈروں کے نقشے کے ساتھ)؛ (۷) G. Marcker در *Zeitschrift der Ges. f. Erdkunde*، ۱۸۹۹ء، ۳۴ : ۳۶۸ ببعد؛ (۸) R. Leonhard : *Paphlagonia*، برلن ۱۹۱۵، ص ۶۶ و ۱۲۰ (مع تصویر)۔

(J. H. MORDTMANN)

* **کِنکَوَر، کَنْکَوَر، کَنْگَوَر** : ایک چھوٹا سا ضلع جو اسی نام کے ایک شہر اور تقریباً ۳۰ مواضع پر مشتمل ہے ۔ یہ ہمدان اور قرمیسین کے درمیان واقع ہے ۔ شہر کی آبادی پانچ ہزار ہے اور اس کے نواح میں ایک مشہور قلعہ ہے جس کا نام قصر اللصوص یا قصر دزدان یعنی ڈاکوؤں کا قلعہ ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا یہ نام اس وجہ سے پڑا کہ فتح کے وقت مسلمانوں کے کئی مویشی چرا لیے گئے تھے، طبری، ۱ : ۲۶۳۹۔

مآخذ : (۱) *B.G.A.*، ۱ : ۱۹۰؛ ۲ : ۲۰۶؛ ۳ : ۳۹۳؛ (۲) Barbier de Meynard : *Dict. de la Perse*، ص ۵۰۳ تا ۵۰۱؛ (۳) Le Strange : *Lands*، ص ۱۸۸ ببعد؛ (۴) Flaudin : *Voyage*، ۱ : ۳۰۸ ببعد۔

(J. RUSKA)

* **کَنْنُور [کَنّانُور]** : کیرالا کے ضلع مالابار میں بھارت کے مغربی ساحل پر ایک بندرگاہ ۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کی رو سے شہر کی آبادی پچاس ہزار نفوس پر مشتمل ہے جس میں نصف سے کچھ زیادہ مسلمان ہیں جو موپلے [رک بان] کہلاتے ہیں ۔ یہ ہندو ماؤں کے بطن سے عرب مہاجرین کی اولاد ہیں ۔ کنور موپلا سردار علی راجا (امیر بحر) کی اقامت گاہ بھی رہا ہے جس نے ۱۹۱۱ء میں جزائر لکادیپ سے دستبرداری کے بدلے پنشن قبول کر لی تھی ۔ علی راجا کا مورث اعلیٰ ایک ہندو تھا، جو سولھویں صدی عیسوی میں مشرف باسلام ہوا تھا ۔ اس خاندان کے اخلاف کو اب بھی برائے نام سیادت حاصل ہے [کنور میں فوجی چھاؤنی بھی قائم ہے ۔ شہر میں سوتی کپڑے اور بسکٹ بنانے کے کارخانے ہیں ۔ مرچیں، ناریل اور ناریل کے رسے بھی دساور جاتے ہیں]۔

مآخذ : (۱) *Madras District Gazetteers*، *Malabar*، مدراس ۱۹۰۸ء؛ [(۲) Encyclopaedia of Britannica، بذیل مادّہ ج ۴، ۱۹۵۰ء لنڈن]۔

(G. S. COTTON [و ادارہ])

کُنْیَة : (عربی) کا صحیح مطلب تو ایک ایسا اصطلاحی نام یا لقب ہے جس میں صفت سے موصوف اور جزو سے کل (صنعت مجاز مرسل) مراد لیا جائے، لیکن اس کے علاوہ یہ کسی مرد کے (یا عورت کے بھی) اپنے بڑے بیٹے کی نسبت سے نام رکھنے کے لیے بطور اصطلاح استعمال ہوتا ہے، یعنی ابو [یا اُمّ] فلاں ۔ یہ ایک ایسا نام ہے جو بہت کم عربوں کے ذاتی نام کا جزو نہیں ہے (دیکھیے نیز مادّۂ لقب) بلکہ بسا اوقات تو وہ محض اسی نام سے معروف ہوتے ہیں ۔ اس رسم کے آغاز کا سبب اس قدر و قیمت میں مضمر ہے جو سامی نسل کے لوگوں کی نظروں میں اپنے بچوں خصوصاً بیٹوں کی ہوتی تھی ۔ اس سے تدفین کے موقعوں پر اس رسم کی پابندی پر بھی روشنی پڑتی ہے جس کی رو سے یہ فرض لازمی طور پر بالخصوص بڑے بیٹے پر عائد ہوتا تھا ۔ کنیۃ اور رسوم تدفین کے درمیان تعلق کی منفی شہادت اس امر میں موجود ہے کہ غلاموں کی بالعموم کوئی کنیۃ نہیں ہوتی تھی اور مولی نہ بنائے جانے کی صورت میں انہیں بغیر رسموں کے دفن کر دیا جاتا تھا [یعنی زمانۂ جاہلیۃ میں]۔

عربی ادب میں کنیۃ کو اگر ایک واقعی

www.besturdubooks.wordpress.com

اعزازی لقب کے طور پر نہیں تو کم از کم سادہ نام کی نسبت ہمیشہ زیادہ وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لسان، ہذیل مادہ کی رو سے جب کوئی پہلوان، حریف لشکر کو ایک ایک کر کے لڑنے کے لیے للکارتا تھا تو ہمیشہ اپنی شخصیت کا اعلان اپنی کنیۃ کے ذریعے کرتا تھا، جب کسی جنگجو سے اس کا قبیلہ استمداد کرتا ہے تو اسے اس کی کنیۃ سے پکارتا ہے (قیس بن الخطیم، طبع Kowalski، لائپزگ ۱۹۱۴ء، نا مکمل ج ۴، ص ۳۸) ایک بار (حضرت) عائشہؓ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی خدمت میں عرض کی کہ آپ کی سب ازواج کی کنیۃ ہے، لیکن میری کنیۃ نہیں، تو آپ نے ارشاد فرمایا تم اپنی کنیۃ ام عبداللہ رکھ لو (احمد بن حنبل، ۶ : ۱۵۱)۔ اس حدیث سے ہمیں ایک ایسی بات کا پتا چلتا ہے جو یوں شاید کبھی ہمارے علم میں نہ آتی اور وہ یہ کہ بے اولاد لوگ بھی اپنے لیے کوئی کنیۃ اختیار کر سکتے تھے۔ بعض دفعہ کنیۃ کسی شخص کی ابویت کی جگہ اس کے دیگر خصائص کو ظاہر کرتی تھی۔ ابو ہریرۃ [رک بآں] بمعنی ''بلی کے بچوں کے باپ'' کی کنیۃ اس لیے پڑی تھی کہ وہ بلیوں پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ تاریخ کے صفحات سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ خلیفہ اول کی کنیۃ ''ابوبکر'' (بکر بمعنی اونٹنی کا بچہ) کی کیا وجہ تھی۔ اکثر اوقات کنیۃ میں ابو کا لفظ کسی جسمانی خصوصیت کو بھی ظاہر کرتا ہے، مثلاً ابو شامۃ وہ شخص جس کے جسم پر کوئی پیدائشی نشان ہو۔ بعض اوقات محض عناد کے باعث یونہیں مزاحاً یا طنزاً کنیۃ رکھ دی جاتی ہے، مثلاً (ابو جہل [رک بآں]، ابو لہب [رک بآں]، اور آخر میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کئی جغرافیائی نام بھی کنیۃ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، مثلاً ابو سُمبُل [رک بآں]، ابو قُبَیس [رک بآں]، ابو حبّۃ [رک بآں] ابوعریش [رک بآں]۔

سب قسم کی مشرقی کتب لغات میں کنیتوں کو بالعموم ایک صنف میں مرتب کیا جاتا ہے۔ ایسی لغات بھی موجود ہیں جن میں محض کنیتوں سے بحث کی گئی ہے۔

مآخذ : (۱) Goldziher : *Der Gebrauch der Kuja als Ehrenbezeichnung* در *Muhammedanische Studien*، ۱ : ۲۶۷؛ (۲) A.J. Wensinck : *Some Semitic Rites of Mourning and Religion*، در *Verh. Ak. Wet. Amsterdam*، N.R.، ج ۱۸، شمارہ ۱، ص ۲۶ ببعد؛ (۳) Barbier de Meynard : *Surnoms et Sobriquets*، در *J. A.* ۱۹۰۷ء، بالخصوص ۱۸۹ تا ۲۰۲۔

(A. J. WENSINCK)

کَنِیْسَۃ : (جمع کَنائس)، معبد یا مجلس، گرجا، آرامی لفظ کنشتا Kenishta [دیکھیے فارسی، کنشت، حافظ :

تنہانہ بنم کعبۂ دل بتکدہ کردہ
در ہر قدمی صومعہ‌ای ہست و کنشتی]

کا معرب ہے جس کے معنی ہیں ''جائے جلوس، مدرسہ معبد'' (دیکھیے J. Levy : *Neuhebr. und Chald. Wörterbuch*، ۲ : ۳۰۹ ببعد)۔ عہد نامۂ جدید (انجیل) کی سریانی تفسیر (Peshitta) میں اس کی سریانی شکل کُنشتا (Kenushtā) یونانی لفظ συναγωγή اور بعض اوقات ἐκκλησία کا ترجمہ ہے (دیکھیے Payne Smith : *Thesaurus Syr.*، ج ۱ : عمود ۱۴۷۳)۔ اس کے مقابلے میں مسیحی مغربی آرامی لفظ کنشتا (Kenishta) συναγωγή نیز ἐκκλησία ہی کی دوسری شکل ہے (دیکھیے Soulthous : *Lex. Syropal.*، برلن ۱۹۰۳ء، ص ۹۰)، مؤخرالذکر اصطلاح تقریباً ہمیشہ [سریانی تفسیر] پشتا میں عیدطا کے ترجمہ کی جاتی ہے۔ لسان العرب، ۸ : ۸۳، س ۲ ببعد، کا بیان اس حد تک تقریباً صحیح ہے کہ کنیسۃ کُنشت سے ماخوذ

www.besturdubooks.wordpress.com

ہے، لیکن الخفاجی (شفاء الغلیل، قاہرہ ۱۲۸۲، ص ۱۹۰) اس نظریے کو رد کرتے ہوے یہ رائے پیش کرتا ہے کہ اس لفظ سے ایک مخصوص مسیحی ادارہ مراد ہے اور اس کا سلسلہ کلیسا سے جا ملتا ہے جو کلیسیا (ἐκκλησία) کا مخفف ہے۔ البستانی بھی اس لفظ کو ἐκκλησία کا معرب سمجھتا ہے (محیط المحیط، بیروت ۱۲۸۶ ص ۱۸۴۷ الف)۔

عربی میں کنیسة کا اطلاق یہودی اور عیسائی دونوں کے عبادت خانے پر ہوتا ہے اور مختلف لغات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ بعض لغات میں اس کے معنی صرف معبد نصاری اور بعض میں صرف معبد یہود لکھے ہیں (دیکھیے الجوہری: صحاح، بولاق ۱۲۸۲، ۱: ۴۷۳ تا آخر؛ الزمخشری: اساس البلاغة، قاہرہ ۱۲۹۹، ۲: ۲۱۲، س ۲۰؛ لسان العرب، محل مذکور؛ یاقوت: معجم، طبع Wüstenfeld، ۴: ۳۱۴، س ۷)۔ بقول الفیروز آبادی (القاموس، بولاق ۱۲۷۲ھ، ۱: ۵۴۹، ۱) کنیسہ کا مطلب ہے یہودیوں، عیسائیوں یا کفار کا عبادت خانہ (متعبد)؛ دیکھیے نیز تاج العروس، ۴: ۲۳۵ ذیل۔

قدیم ادب میں لفظ کنیسہ اکثر اوقات "گرجا معبد نصاری" کے معنوں میں آیا ہے۔ ۸۸ھ/۷۰۷ء کے لکھے ہوے دو مخطوطہ اوراق بردی (Papyrus) میں ایک خانقاہ کے گرجا کا ذکر ملتا ہے جسے مصر میں (سنیة) کنیسة مارية کہتے تھے (*Papyri Schott-Reinhardt*، طبع J. Becker، ہائیڈل برگ ۱۹۰۶ء، ص ۱۱۱، س ۴، ص ۱۱۲، س ۴)۔ جریر اپنی ایک ہجویہ نظم میں بنو تغلب کے کنائس کا ذکر کرتا ہے (المبرد، الکامل، طبع Wright، ص ۴۸۵، ۵)۔ حضرت عمرؓ یا ان کے سپہ سالار مختلف شہروں کے باشندوں سے عام طور پر جو معاہدے کرتے تھے ان میں کنائس کے بارے میں شرائط کا صراحة ذکر کیا جاتا تھا (البلاذری: فتوح البلدان، طبع de Goeje، ص ۱۷۳؛ الیعقوبی: تاریخ، طبع Houtsma، ۲: ۱۶۷؛ الطبری، ۱: ۲۴۰۵، ۸ ببعد، ۲۵۸۸، ۷؛ Eutychius، طبع Cheikho، ۲: ۱۷، ۷؛ ابن عساکر: التاریخ الکبیر، دمشق ۱۳۲۹، ۱: ۱۷۸؛ دیکھیے نیز ابو یوسف کتاب الخراج، بولاق ۱۳۰۲، ص ۸۰)۔ حدیث میں آیا ہے کہ کس طرح حضرت امّ حبیبہؓ اور حضرت امّ سلمہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حبشہ کے ایک گرجا کا ذکر کیا تھا جو بتوں سے مزین تھا (البخاری، کتاب الصلوٰة، باب ۴۸، ۵۴؛ جنائز، باب ۷۰؛ مناقب الانصار، باب ۳۷)۔

مزید براں کنیسة کا لفظ بعض اسما کی طرف مضاف ہو کر بھی استعمال ہوا ہے مثلاً کنیسة حنّس (اسکندریہ میں، یاقوت: کتاب مذکور، ۱: ۲۵۷ س ۳۲)؛ کنیسة الغراب (جنوبی پرتگال میں، راس سینٹ ونسنٹ پر، یاقوت: کتاب مذکور، ۱: ۳۷۷ س ۱۹؛ الادریسی: نزهة المشتاق، جزئی طبع از Dozy و de Goeje، متن ص ۱۸۰: ترجمہ ص ۲۱۸)؛ کنیسة الکف (مصر میں، اس میں حضرت عیسیٰ کے ہاتھ کا نشان موجود ہے، یاقوت، ۲: ۲۲، س ۲ ببعد)؛ کنیسة یوحنا و کنیسة مریم (دمشق میں، یاقوت، ۲: ۵۹۱ س ۱۰، ۵۹۶ س ۲۳)؛ کنیسة القمامة (ربت کے تودے والا گرجا، یہ کنیسة القیامة کی جان بوجھ کر بگاڑی ہوئی شکل ہے، بیت المقدس میں المسعودی: مروج الذہب، پیرس، ۱۸۶۱ تا ۱۸۷۷ء، ۱: ۱۱۱، ۳: ۴۰۵؛ دیکھیے نیز *Palestine under the Moslems*: G. Le Strange، لندن ۱۸۹۰ء، ص ۱۴۱ ببعد، ۲۰۲ ببعد)؛ کنیسة الباعوثة (الباعوثة؟؛ الحیرة میں، الہمدانی: صفة جزیرة العرب، طبع D. H. Müller، ص ۱۲۷ س ۲)؛ [کنیسة السوداء، مصیصہ کے قریب، دیکھیے القاموس، بذیل کنس] وغیرہ۔

المقریزی معبد یہود اور نصاری دونوں کے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

لیے لفظ کنیسة استعمال کرتا ہے (الخطط، (بولاق ۱۲۷۰ھ، ۲ : ۴۶۴ ببعد، ۵۱۰ ببعد).

اندلس اور مغرب میں یہ لفظ کنیسیة Kanisiya کی صورت میں مستعمل تھا (غالباً iglesia کے زیر اثر)؛ مراکش اور تونس میں یہ آج تک مروج ہے (Supplement : vgl. Dozy، ۲ : ۴۹۳).

موجودہ زبان میں کنیسہ سے مراد گرجا ہے، اور کنیس سے معبد یہود (البستانی، محل مذکور)۔ مصری لغة کے لیے دیکھیے Arabic-English: S. Spiro Bey Dictionary، بار دوم، قاہرہ ۱۹۲۳ء، بذیل مادّہ).

الکنیسہ یا الکنیسة السّوداء شمالی شام کے سرحدی صوبے کا ایک شہر تھا جس میں ایک قلعہ بھی تھا جو بالکل شکستہ اور ویران ہو چکا تھا۔ ہارون الرّشید نے اسے دوبارہ درست کرایا (یاقوت ۴ : ۳۱۴؛ دیکھیے ۱ : ۹۲۷، س ۲۰، الاصطخری، B.G.A.، ۱ : ۶۳ س ۷، ۶۸، ۳)؛ vgl. le Strange : کتاب مذکور، ص ۱۷۷ ببعد)۔ المقدسی (B.G.A.، ۳، بار دوم : ۴۵۳ س ۹) نے ایک مقام کنیسة المجوس کا ذکر کیا ہے جو ارّجان سے ایک دن کی مسافت پر واقع تھا۔ یمن میں بحیرۂ قلزم کے کنارے، زبید کے قریب ایک بندرگاہ کا نام بھی الکنیسہ تھا (الفیروز آبادی، محل مذکور، تاج العروس، محل مذکور)۔ تاج العروس کی رو سے مصر کے کئی مقامات کے ناموں میں کُنَیسہ کا لفظ پایا جاتا ہے۔

مسلمانوں نے گرجاؤں کے لیے جو قوانین منضبط کیے تھے، ان کے لیے دیکھیے مادّۂ نصاریٰ.

مآخذ: مذکورۂ بالا تصنیفات کے علاوہ دیکھیے S. Fränkel : Die aramäischen Fremdwörter im Arabischen، لائیڈن ۱۸۸۶ء، ص ۲۷۰.

(C. VAN ARENDONK)

کوئٹه: (پشتو: کوټه Kawatta)؛ ضلع کوئٹہ [بلوچستان، (پاکستان)، رکھ بآں] کے ایک شہر اور تحصیل کا نام۔ ضلع کوئٹہ میں تحصیل کوئٹہ، اور پشین اور چمن کی انتظامیہ سب ڈویژن شامل ہے۔ اس کا کل رقبہ ۴۸۰۶ مربع میل اور آبادی (۱۹۵۱ء) ۲۰۹۲۲۱ ہے۔ یہ ضلع ایک پہاڑی علاقہ ہے، جس کے شمال مغرب میں افغانستان، مشرق میں زھوب اور سبی کے اضلاع، جنوب میں درۂ بولان اور قلات ڈویژن کا علاقہ سوران، جنوب مغرب میں کوھستان چلتان اور شمال مشرق میں زرغوم کا میدان مرتفع ہے.

کوئٹے کی تحصیل خان آف قلات سے اجارہ داری پر لی گئی تھی۔ اس کا رقبہ ۵۴۸ مربع میل ہے۔ ۱۹۳۵ء میں کوئٹے کا شہر زلزلے سے تباہ ہو گیا تھا۔ شہر کوئٹہ بشمول رقبہ چھاؤنی کی آبادی (۱۹۷۲ء) ۱۵۶۰۰۰ ہے۔ بلند پہاڑوں سے گھری ہوئی یہ ایک وادی ہے جس کی بلندی ۵۵۰۰ فٹ کے قریب ہے۔ یہ ایک اہم فوجی مرکز بھی ہے۔ ۱۹۰۷ء میں یہاں فوجی افسروں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک سٹاف کالج کھولا گیا، جہاں اب نہ صرف پاکستان بلکہ غیر ملکی فوجی افسروں کی تعلیم و تربیت بھی ہوتی ہے۔ [قیام پاکستان کے بعد کوئٹے میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بہت سی سہولتیں حاصل ہوگئی ہیں۔ مقامی ڈگری کالج نے ۱۹۷۰ء سے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ بلوچی، بروھی اور پشتو زبان کے فروغ کے لیے بلوچی اکادمی، بروھی ادبی دیوان اور پشتو اکادمی مصروف عمل ہیں۔ اردو صحافت کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ کوئٹے نے صنعتی اعتبار سے بھی ترقی کی ہے۔ یہاں سوتی تاگا اور اون بنانے کے کارخانے بھی ہیں۔ صحت افزا مقام ہونے کے باعث یہاں گرمیوں میں بڑی چہل پہل رہتی ہے] ۔ یہاں پھلوں اور میووں کی بہت بڑی منڈی بھی ہے.

اٹھارھویں صدی کے نصف تک، جب

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کوئٹہ بروہی بلوچیوں کے قبضے میں آیا۔ کوئٹے کی تاریخ بھی غالباً وہی ہے جو قندھار کی ہے۔ [قدیم تاریخ کے لیے رک بہ بلوچستان، قندھار]، پہلی افغان جنگ (۱۸۳۹ تا ۱۸۴۲ء) کے زمانے میں کوئٹے پر انگریزوں کا عارضی قبضہ رہا۔ (دیکھیے W. Hough : *A Narrative of the march and operations of the army of the Indus in the expedition into Afghanistan*، ۱۸۴۰ء) اس مقام کی جنگی اہمیت سب سے پہلے جنرل جان جیکب نے تسلیم کی، جس نے ۱۸۵۶ء میں لارڈ کیننگ کو ترغیب دی کہ اس فوجی مقام پر قلعہ گیر فوج متعین کی جائے (*Views and Opinions of General John Jacob*، طبع Pelly، ص ۳۴)، لیکن اس تجویز کو اس لیے مسترد کر دیا گیا کہ یہ مقام ہر طرف سے دشمن قبائل سے گھرا ہوا تھا اور اپنے اصلی مرکز سے منقطع تھا اور ایسے دور افتادہ مقام پر قلعہ گیر فوج کا رکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ دس سال بعد سر ہنری گرین، پولیٹیکل ایجنٹ اپر سندھ نے بالائی سندھ کی سرحدوں کو مستحکم کرنے کے منصوبے کے سلسلے میں یہ تجویز پیش کی کہ کوئٹے میں قلعہ گیر فوج رکھی جائے اور اس شہر کو کراچی سے بذریعۂ ریل ملا دیا جائے۔ ان لوگوں کی بدقسمتی سے، جو بلوچستان کے علاقے میں پیش قدمی کرنا چاہتے تھے، لارڈ لارنس اور اس کی کونسل نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی کیونکہ وہ سب کے سب عدم مداخلت کی حکمت عملی کے علمبردار تھے۔ دس سال اسی طرح گزر گئے اور وائسرے کی کونسل میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے والے ارکان کا اثر اور غلبہ کم ہو گیا۔ ادھر خیوا [رک بہ خوارزم] کا علاقہ روسیوں نے فتح کر لیا تھا اور وہ اب ہندوستان میں داخل ہونے والے راستوں کے قریب تر آ رہے تھے۔ اس سے پہلے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ شیر علی کی بے اعتنائی کی وجہ سے امیر افغانستان اور حکومت ہند کے درمیان جنگ کا خطرہ روز بروز بڑھ رہا تھا؛ چنانچہ ۱۸۷۶ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ کوئٹے پر قبضہ کر لیا جائے۔ ۱۸۶۴ء کے عہد نامے کی رو سے یہ بات طے پا چکی تھی کہ انگریزی فوج قلات کی حدود میں بھیجی جا سکتی ہے۔ (ایچیسن، ۱۱: ۲۱۲ تا ۲۱۳)؛ چنانچہ اس معاملے میں میجر (بعد میں سر رابرٹ) سنڈیمان کی کوششوں سے اس عہد نامے کی، مزید اضافے کے ساتھ، ۸ دسمبر ۱۸۷۶ء کو عہد نامۂ جیکب آباد (*Parl. Papers*، ۱۸۷۷ء، ۶۴، حدود ۱۸۰۸ء، ص ۳۱۴ تا ۳۱۶) کے نام سے تجدید ہوئی۔ وظیفے میں کچھ اضافہ کرا لینے کے بعد خان قلات نے اس بات کی اجازت دے دی کہ انگریزی فوجیں اس کے علاقے میں مقیم ہو جائیں اور قلات کے علاقے میں تار اور ریل کا سلسلہ قائم کر دیا جائے۔ اس کے بعد بلوچستان ایجنسی کا قیام عمل میں آیا؛ اس لیے کہ ۲۱ فروری ۱۸۷۷ء کو سنڈیمان کو گورنر جنرل کا ایجنٹ مقرر کیا گیا اور اس کا صدر مقام کوئٹہ قرار پایا۔ [نیز رک بہ بلوچستان]۔ [۱۹۷۷ء تک تازہ ترین حالات کے لیے دیکھیے The Statesmans' Year Book، ۱۹۷۶ — ۱۹۷۷ء].

مآخذ (۱) Administration Report of the Baluchistan Agency، (سالانہ شائع ہوتی تھی)؛ (۲) C. U. Aitchison : *Treaties, Engagements and Sanads*، ج ۱۱، ۱۹۰۹ء؛ (۳) D. Bray : *Ethnographical Survey of Baluchistan*، ۲ جلدیں ۱۹۱۳ء؛ (۴) C. C. Davies : *The problem of the N. W. Frontier*، ۱۹۳۲ء؛ (۵) *Frontier and overseas Expeditions from India*، ج ۳، ۱۹۱۰ء؛ (۶) R. Hughes-Buller : *Baluchistan District Gazetteer Series (Quetta-Pishin District.)*، ج ۵، ۱۹۰۷ء؛ (۷) *Parliamentary Papers, Quetta and*

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Central Asia، ۱۸۷۸-۱۸۷۹ء، ج ۷۷، قلات ۱۸۷۷ء، ج ۶۴، حدود ۱۸۰۷-۱۸۰۸ء؛ (۸) T. H. Thornton: *Life of Sir Robert Sandeman*، ۱۸۹۵ء؛ [(۹) *Ency. Britannica*، بذیل مادّہ؛ (۱۰) Sqr.، *The Statesman's Year Book*، ۱۹۷۶-۱۹۷۷ء].

(C. Collin Davies [و ادارہ])

* **کوئل** : رک بہ علیگڑھ.

* **کوار** : صحرائے اعظم میں نخلستانوں کا ایک مجموعہ (جنوب میں سب سے آخری نخلستان بلمۃ ۱۸° - ۲۱′ عرض بلد شمالی اور ۱۳° طول بلد مشرقی کے درمیان ہے) جو تبستی کے بلند اور گٹھے ہوئے سلسلۂ کوہ کے مغرب میں، فزان [رک بہ] کے راستے طرابلس سے چاڈ [رک بہ شاد] کے ارد گرد کے علاقے کو جانے والی تجارتی شاہراہ پر واقع ہے۔ اس شاہراہ پر کوار فزان اور کانم کے تقریباً بیچوں بیچ واقع ہے؛ فزان سے ایک حمّادۃ اور کانم سے ریت کے ٹیلوں کا ایک منطقہ جدا کرتا ہے۔ یہ نخلستان پہاڑیوں کے ایک سلسلے کی بدولت ظہور میں آئے ہیں جو شمالاً، جنوباً چلا گیا ہے۔ یہ پہاڑیاں اسے مشرقی سمت سے گھیرے ہوئے ہیں اور شمال مشرق سے آنے والی خوفناک ہوا سے اسے محفوظ رکھتی ہیں۔ ان نخلستانوں کو پہاڑ کی ایک وادی کہنا چاہیے جس کا طول شمالاً جنوباً ۵۰ میل ہے اور عرض کسی مقام پر بھی دو تین میل سے زیادہ نہیں۔ پانی بہت ہی کم گہرائی پر نکل آتا ہے اور خاصی افراط کے ساتھ مگر عموماً کھاری ہوتا ہے.

کوار کی تاریخ تاریکی میں پوشیدہ ہے۔ جس تجارتی شاہراہ پر یہ واقع ہے وہ زمانۂ قدیم میں پہلے ہی سے استعمال ہوتی تھی، اگرچہ اس کا کوئی صریح قطعی ثبوت موجود نہیں ہے۔ بہرصورت شمالی افریقہ کی فتح کے وقت یہ مجموعۂ نخلستان موجود تھا۔ اگر ہم ان عرب مؤرخوں کی روایات پر اعتماد کریں جو اس فتح کو اپنے بطل جلیل عقبۃ بن نافع کی طرف منسوب کرتے ہیں جس کی بابت کہا گیا ہے کہ اس نے کوار کے قلعے یکے بعد دیگرے فتح کر لیے تھے۔ الادریسی نے بارھویں صدی عیسوی کے اندر ان علاقوں کی وساطت سے ہونی والی تجارت کی اہمیت کا کئی بار ذکر کیا ہے.

انیسویں صدی عیسوی میں کئی یورپین سیاح کوار پہنچے۔ سب سے پہلے جنوری ۱۸۲۳ء میں Denham، Clapperton اور Oudney کی جماعت زائرین آئی؛ اس کے بعد Rohlfs, Barth, Vogel اور Nachtigal اور سب سے آخر میں Monteil۔ گزشتہ صدی کے آخری سالوں میں کوار کی حالت کسی حد تک خراب ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں یہاں ایک شیخ (mai) کی برائے نام حکومت قائم تھی جسے وہاں کے ممتاز افراد نے منتخب کیا تھا۔ در اصل ہر گاؤں میں اس کی اپنی ہی حکومت تھی۔ صحرا میں تجارت کی عام کمی کے باعث کوار بری طرح متاثر ہو چکا تھا۔ اس پر جب چاڈ کا علاقہ فرانسیسیوں کے قبضے میں آ گیا اور انھوں نے غلاموں کی تجارت کو روک دیا تو کوار کے کاروبار کا گویا دم ہی نکل گیا، کیونکہ اس کا سب سے بڑا بیوپار یہی تھا۔ پھر جب سنوسی شیخ نے صحرائے اعظم میں ایک باقاعدہ ریاست قائم کرنے کا خواب دیکھا تو اس کے لیے بھی یہ مقام ناگزیر تھا۔ ترکوں نے جنت اور تبستی کی طرح یہاں بھی اپنی حکومت تسلیم کرانے کی کوشش کی، لیکن جب جولائی ۱۹۰۶ء میں فرانسیسیوں نے چاڈ کے علاقے سے بڑھ کر کوار پر قبضہ کر لیا تو ان کوششوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا اور نخلستانوں کے اس مجموعے کے باشندوں کو بھی اپنے فتنہ پرداز پڑوسیوں کے خلاف قانون مطالبۂ زر سے امن حاصل ہو گیا.

مآخذ : (۱) البکری : کتاب المسالک و الممالک،

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

طبع ڈی سلان، ص ۱۳؛ ترجمۂ ڈی سلان: الجزائر ۱۹۱۳ء، ص ۳۴؛ (۲) الادریسی: *Description de l'Afrique et de l'Espagne*، طبع و ترجمۂ ڈوزی و ڈخویہ، لائیڈن ۱۸۶۶ء، بمدد اشاریہ؛ (۳) Denham و Clapperton: *Narrative of Travels and Discoveries in Northern and Central Africa*، لنڈن ۱۸۲۶ء؛ (۴) Barth: *Travels and Discoveries in Northern and Central Africa*، لنڈن ۱۸۵۱ء، ۱: ۵۰۴؛ ۵: ۴۲۴ تا ۴۳۰؛ (۵) G Nachtigal: *Sahârâ und Sûdân*، برلن ۱۸۷۹ء، ۳: اشاریہ ص ۵۲۴؛ (۶) Monteil: *De St. Louis à Tripoli per le lac Tchad*، پیرس، تاریخ ندارد؛ (۱۸۹۵ء)؛ (۷) Gadel: *Notes sur Bilma et les oasis environnentes*، در *Revue Coloniale*، جون ۱۹۰۷ء؛ (۸) H. Carbou: *La région du Tchad et du Ouadai*، پیرس ۱۹۱۲ء؛ (۹) E. F. Gautier: *Le Sahara*، پیرس ۱۹۲۳ء؛ (۱۰) Prévost و Mayet: *L'oasis du Kouar et la Prehistoire du Sahara Oriental*، در *La Nature* ۱۴ مارچ ۱۹۲۵ء ص ۱۶۱ تا ۱۶۸؛ (۱۱) کنوری زبان کے بارے میں رک بہ P. Noel: *Petit Manuel Francais-Kanouri*، پیرس ۱۹۲۳ء (بلمۃ میں مرتب ہوئی).

(HENRI BASSET)

* **کوپری**: (ترک: بمعنی پل؛ مشرقی ترکی میں: کوپریک) جو "وزیر کوپری" یعنی "وزیر کے پل" کے نام سے بھی مشہور ہے (وزیر کا اشارہ البانوی نسل کے مشہور وزیر اعظم کوپرلی محمد پاشا کی طرف ہے، نیز رک بہ کوپرلی)، صوبۂ سیواس میں سنجاق اماسیہ کی ایک قضا کا صدر مقام ہے۔ یہ دریائے اسٹاولز Astawoluz کے کنارے آباد ہے جو قزل ایرماق کا ایک معاون ہے اور اس میں دائیں جانب سے آ کر ملتا ہے۔ کوپری کی آبادی ۸۶۰۰ اور بیشتر مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۷ مسجدیں ہیں، دو کتب خانے ہیں جن میں سے ایک کتب خانہ کوپری زادہ فاضل پاشا نے قائم کر کے وقف کر دیا تھا، ۶ مدارس ہیں اور متعدد عمارات جنھیں کوپرلی محمد پاشا نے رفاہ عام کے لیے بنایا تھا، ۶ کاروان سرائیں ہیں اور ۵ حمام اور ۳ درویشوں کی خانقاہیں ہیں۔ مکانوں کی چھتوں پر سرخ رنگ کے ٹائل لگے ہوے ہیں اور دود کشوں کے اوپر دھات کی ویسی ہی ٹوپیاں چڑھی ہوئی ہیں جیسی ترکی مساجد کے میناروں پر نظر آتی ہیں۔ یہاں الحاج یوسف آغا کا ایک محل اور قلعے میں اسی کی ایک مسجد بھی ہے علاوہ ازیں قادریہ اور خلوتیہ درویشوں کی خانقاہیں، ۱۱ کاروان سرائیں، دو عمارتیں (غربا کے لیے لنگر خانے) اور ۸ مدرسے ہیں۔ احمد پاشا کے حمام بہترین ہیں۔ بزستان (بزاز ہٹا) یوسف آغا نے بنوایا تھا۔ اس قصبے کی بندرگاہیں بفرہ اور سنوپ ہیں جو بحیرہ اسود پر واقع ہیں۔ اسے ایک سڑک صمسون سے ملاتی ہے جو گاڑیوں کی آمد و رفت کے لیے مناسب ہے۔

کوپری صویہ ایک دریا کا نام ہے، جو شان طاغ سے نکلتا ہے اور وزیر کوپری کے قریب قزل ایرماق [رک بآں] میں گر جاتا ہے۔ قدیم دریا یوری مڈون (Eurymedon) بھی جو خلیج عدالیہ میں گر کر بحیرۂ روم سے مل جاتا ہے، اسی نام سے مشہور ہے۔ اس کے دہانے پر ایک چھوٹا سا قصبہ کوپری بازار آباد ہے۔

مآخذ: (۱) علی جواد: جغرافیا لغاتی، ص ۶۸۷؛ (۲) سامی بے: قاموس الاعلام، ۵: ۳۹۰۵؛ (۳) اولیا افندی: *Travels*، ترجمہ از v. Hammer، ۲: ۲۱۷.

(CL. HUART)

کوپری حصار: (پل کا قلعہ)؛ ایشیاے کوچک میں صوبۂ خداوند گار کا ایک گاؤں جو ینی شہر کے قریب چوروک صو کے کنارے آباد ہے

www.besturdubooks.wordpress.com

یہاں ایک بوزنطی قلعہ تھا جسے ۶۸۸ھ / ۱۲۸۹ء میں سلطان عثمان نے بیلہ جک [رک بہ بلجک] کی فتح کے بعد (جہاں اس نے اپنے چچا دندار کو تیر مار کر ہلاک کر دیا تھا) تسخیر کیا تھا۔

مآخذ: (۱) سامی بے: قاموس الاعلام، ۵: ۳۹۰۶؛ (۲) J. de Hammer: *Hist. de l'empire ottoman*، فرانسیسی ترجمہ از Fr, de Hellert، ۱: ۸۷ تا ۸۹؛ (۳) Cl. Huart: *Konia, la ville des derviches tourneurs*، پیرس ۱۸۹۷ء، ص ۱۸ (پل کا منظر)۔

(CL. HUART)

کوپریلی: یا کو پرولو (Köprülü): سلاطین آل عثمان کے وزرا کا ایک گھرانا؛ اس خاندان میں جو غالباً البانوی نسل کا تھا، سلطنت عثمانیہ کے انحطاط کے ابتدائی دور کے ممتاز ترین سیاستدان پیدا ہوئے۔ Sieur de la Croix نے اپنی کتاب *Mémoires, Contenans diverses relations très curieuses de l'Empire Othoman* (پیرس ۱۶۸۴ء) میں لکھا ہے کہ اس خاندان کا بانی ایک یونانی یا عرب پادری کا بیٹا تھا اور اس بیان کو لیوپولڈ فون رانکہ L. von Ranke نے بھی قبول کیا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ خاندان مذکور کا بانی کوئی البانوی تھا جو سولھویں صدی عیسوی میں اپنا آبائی وطن ترک کر کے آناطولی کے شہر کوپری مرزیفون میں چلا آیا تھا۔ کوپری، جسے اب عموماً وزیر کوپری کہتے ہیں، اس زمانے کی ایک اہم آبادی تھی جس کی ایک بڑی طویل تاریخ تھی (دیکھیے حاجی خلیفہ: جہان نما، ص ۶۲۵، نیچے سے س ۴ و ص ۶۲۸، س ۹ جہاں اس کا پرانا نام کدہ عرہ (قرہ کدہ در J. v. Hummer: *GOR*، ۶: ۳۰۳ درج ہے۔ نیز اولیا: سیاحت نامہ، ۲: ۳۹۹) اور اس کی اہمیت کہیں بعد کے زمانے میں کم ہونا شروع ہوئی تھی (دیکھیے M. Kinneir: *Journey Through Asia Minor*، لنڈن ۱۸۱۸ء، ص ۲۹۸)۔ اس کے قریب طاش کوپری واقع ہے جس کی نسبت سے علما کا ایک مشہور و معروف خاندان طاش کوپری زادہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس مقام کو آخرالذکر کوپری سے متمیز کرنے کے لیے آگے چل کر اس کا نام تبدیل کر کے کوپریلی کے اعزاز میں وزیر کوپری رکھ دیا گیا۔ یہیں اس البانوی تارک وطن کا پوتا محمد کوپریلی پیدا ہوا۔ اسی نے سب سے پہلے اپنے خاندان کا نام روشن کر کے دور دور تک مشہور کیا۔ اس خاندان نے جن اہم شخصیتوں کو پیدا کیا ہے، ان کی تعداد کچھ کم نہیں، ایک شخص بہجتی حسین (ساکن رژغراد Ražgrad، م ۱۰۹۴ھ / ۱۶۸۳ء بمقام بلغراد) نے تاریخ سلالۂ کوپریلی کے نام سے اس خاندان کی ایک تاریخ مرتب کی تھی جس کا اصل قلمی نسخہ استانبول کے کتب خانے کوپریلی (شمارہ ۲۱۲) میں موجود ہے۔ اس میں کوپریلی گھرانے کے حسب نسب کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ اس خاندان کے اہم ترین افراد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کوپریلی محمد پاشا، صدر اعظم ترکی یا زیادہ صحیح الفاظ میں ناظم سلطنت۔ کہتے ہیں کہ وہ ۹۹۱ھ / ۱۵۸۳ء میں پیدا ہوا اور یکم نومبر ۱۶۶۱ء کو ادرنہ میں فوت ہوا۔ اوائل عمر میں وہ ایک معمولی برتن دھونے والا ملازم تھا۔ پھر قصر شاہی میں طباخین خاصہ کے زمرے میں داخل ہوا۔ خسرو پاشا صدر اعظم کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد وہ اس کا کیسہ بردار (خزینہ دار) ہوا پھر ترقی کر کے قرہ مصطفی پاشا [رک بآن] مرزیفونی کی ملازمت کے دوران میں اس نے میر آخور کا رتبہ پایا۔ اس کے بعد وہ پیہم ترقی کے زینے پر چڑھتا گیا اور اعلیٰ سے اعلیٰ تر سرکاری عہدوں پر فائز ہوتا رہا، اسے دو طوغ والے پاشا کی حیثیت دے کر شام، قدس اور طرابلس کا والی مقرر کیا گیا اور ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء

www.besturdubooks.wordpress.com

میں وہ مرتبۂ وزارت پا کر قبّہ نشین ہوا، تاہم اس کے بعد وہ کوستندیل کی معمولی سی سنجاق پر مامور ہوا جس سے بر ہم ہو کر وہ اپنے آبائی شہر میں گوشہ نشین ہوگیا۔ وہ کچھ عرصے تک باغی واردار علی پاشا کے ہاتھوں، جس کا اس نے میدان جنگ میں مقابلہ کیا تھا، اسیر رہا، اس قید سے اسے صدر اعظم اپشیر پاشا نے رہائی دلائی اور اسے دوبارہ طرابلس کا والی مقرر کرا دیا۔ محل ماموریت میں پہنچ کر ابھی وہ اپنے فرائض منصبی سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ اس سے یہ عہدہ لے لیا گیا اور وہ ایک بار پھر کوپری میں عزلت گزین ہوگیا۔ پھر بویونی اگری (''لیڑھی گردن والا'') محمد پاشا صدر اعظم اسے اپنے ساتھ استانبول لے گیا، جہاں وہ جلد ہی اس کا خطرناک ترین حریف ثابت ہوا۔ ۳ ذوالحجّہ ۱۰۶۶ھ/ ۲۲ ستمبر ۱۶۵۶ء تک اسے مہر سلطانی مل چکی تھی۔ اس نے بڑی مستعدی سے مذہبی جنونیوں کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا (قب J. v. Hammer: *GOR*، ۶: ۵ ببعد)، گزشتہ بغاوتوں کے سرغنوں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارا اور یوں عوامی زندگی کو آلائش سے پاک کیا۔ حکومت کے بگڑے ہوئے امور مالیہ کی اصلاح کے سلسلے میں وہ بہت ایماندار اور سخت گیر ثابت ہوا، چنانچہ اس وجہ سے اس کے متعدد دشمن پیدا ہو گئے۔ اس نے ملت عثمانی کی ہمت اور قومی حیثیت میں۔ جو پست ہو چکی تھی، ایک نئی جان ڈالی اور اہل وینس کے خلاف معرکہ دار و گیر برپا کر کے دولت عثمانیہ کی قوت و سطوت کو بحال کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء میں اس نے امیر البحر L. Mocenigo کے خلاف در دانیال میں جنگ کی۔ اس لڑائی میں ترکی بیڑا تباہ ہو گیا اگرچہ وینس کے امیر البحر کا جہاز پکڑا گیا۔ محمد پاشا نے بوزجہ آطہ یا تینیدوس Tenedos اور لیمنوس (لمنی، Lamanos) فتح کر کے اس نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔ اگلے سال یعنی ۱۰۶۸ھ/ ۱۶۵۷ء میں ٹرانسلوینیا (Transylvania، اردل) بھی فتح ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ایران کی طرف توجہ کی اور شہر یانووہ Yanuwa پر قبضہ کر لیا، پھر اس نے ان بغاوتوں کو کچلا جن سے شمالی شام اور مصر میں خطرہ پیدا ہو رہا تھا، در دانیال پر نئے قلعے تعمیر کرائے (دیکھیے مادۂ قلعۂ سلطانیہ) اور سرحدوں کے لیے بالعموم استحکامات تجویز کیے (دیکھیے فان ہامر: *GOR*، ۶: ۸۶ ببعد)۔ اس نے سرکاری خزانہ معمور کرنے میں خاصی کامیابی حاصل کی۔ ۷ ربیع الاول ۱۰۷۳ھ/ ۳۱ اکتوبر ۱۶۶۱ء کو وفات سے قبل اس نے بستر مرگ پر سلطان سے سفارش کی کہ اس کے بعد اس کے ۲۶ سالہ بیٹے احمد کو صدر اعظم بنایا جائے۔ اسے دارالحدیث کے عقب میں چنبرلی طاش (''ستون سوختہ'') کے قریب دفن کیا گیا۔

محمد پاشا کا ایک برادر نسبتی قبلہ لی مصطفٰی پاشا (م ۱۰۷۴ھ/ ۱۶۶۳ء، دیکھیے سجلّ عثمانی، ۴: ۳۹۷) تھا جس کے بیٹے قبلہ لی زادہ علی بک کو ۱۱۱۴ھ/ ۱۷۰۲ء میں موت کی سزا ملی (دیکھیے راشد: تاریخ، ۱: ۲۶۱ وفان ہامر: *GOR*، ۷: ۴۹)۔ ان کی نسل سے مؤرخ ادبیات کوپریلی زادہ محمد فواد بک ۱۳۰۶ھ/ ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوا (علی امیری کے سلسلۂ نسب کے لیے دیکھیے عثمانلی تاریخ و ادبیات مجموعہ سی، ۶: ۷۹ و ۸: ۱۱۶ ببعد؛ M. Hartmann: *Dichter der neuen Türkei*، برلن ۱۹۱۹ء، ص ۹۱ ببعد)۔

مآخذ: کتب تاریخ از (۱) نعیما؛ (۲) فان ہامر؛ (۳) Zinkeisen، اور خصوصاً: (۴) Sir Parul Rycaut و (۵) Richard knolles، نیز (۶) Andrea Valiero: *Historia della guerra di Candia*، وینس ۱۶۷۹ء،

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ص ۵۲۷، (جس میں G. Brusoni کی کتاب *Historia dell' ultima guerra trà Veneziani e Turchi*، طبع وینس ۱۶۷۳ء، ۱: ۲۹۲ کی طرح یہ بیان کیا گیا ہے کہ محمد کوپریلی ایک renegato Perugino di casa Ferretti تھا)؛ (۷) تاریخی ناول *Histoire des Grands Vizirs Mahomet Coprogli Pascha, et Ahmet Coprogli Pascha celle des trois derniers Grands Seigneurs*، پیرس ۱۶۷۶ء، بالکل فرضی ہے (یہ افسانہ جسے بار بار دہرایا گیا ہے پہلی بار ہمیں اس کتاب میں ملتا ہے کہ محمد کوپریلی نسلاً فرانسیسی تھا)؛ (۸) M. Brosch : *Gesetiehten aus dem Leben dreier Grosswesire* گوتھا ۱۸۹۹ء؛ (۹) L. v. Ranke : *Die Osmanen und die spanische Monarchie*، بار سوم لائپزگ ۱۸۷۷ء، ص ۴۳۰، ببعد (محمد پاشا کی شخصیت کے متعلق نہایت عمدہ تلخیص)؛ (۱۰) عثمان زادہ احمد تائب : حدیقۃ الوزراء، ص ۳۰۱ ببعد؛ (۱۱) سجلّ عثمانی، ۴: ۱۷۳ ببعد؛ (۱۲) احمد رفیق کوپریلیلر، استانبول ۱۳۳۱ھ، حصہ ۱: ۱۴۳ ص۔

۲ - کوپریلی زادہ فاضل احمد پاشا، سابق الذکر کا بیٹا، ترکی کا صدر اعظم، وزیر - کوپری میں ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں پیدا ہوا اور ادرنہ کے نزدیک ۲۶ شعبان ۱۰۸۷ھ/ ۳۰ اکتوبر ۱۶۷۶ء کو فوت ہوا، کہا جاتا ہے کہ محمد لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا - اس لیے اس کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا عالم فاضل بن جائے، چنانچہ ننھے احمد کو بچپن ہی میں مشہور مؤرخ قرہ چلبی عبدالعزیز [رک بآں] کے سپرد کر دیا گیا جو آگے چل کر شیخ الاسلام بنا - احمد اس کا ملازم ہو گیا اور صرف سولہ برس کی عمر میں اس نے محمد فاتح کی مسجد میں مدرس کا منصب حاصل کر لیا، یہ عہدہ دس سال تک اس کے پاس رہا اور پھر اس نے حکومت کے شعبۂ انتظامیہ میں ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا - اس کے باپ کی وفات سے تین سال پیشتر اسے پہلے ارض روم کا والی بنا کر بھیجا گیا اور اگلے سال اسی عہدے پر دمشق میں متعین کیا گیا - یہاں سے اس نے دروزیوں کے خلاف کامیاب مہم شروع کی (دیکھیے J. von Hummer : *G O R*، ۶: ۹۳) لیکن اس کے باپ کا مرض استسقا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا، اس لیے بالآخر سلطان نے اسے دارالخلافہ میں واپس بلا لیا اور شرف باریابی دینے کے بعد اسے قائمقام کے منصب پر فائز کر دیا - ۷ ربیع الاول ۱۰۷۲ھ/ ۳۰ اکتوبر ۱۶۶۱ء کو اس کے باپ کے انتقال کے فوراً بعد مُہر سلطانی اس کے سپرد کر دی گئی - اس وقت اس کی عمر صرف ۲۶ سال تھی - اس نے پندرہ سال تک وزارت عظمٰی کے فرائض بڑی قابلیت اور مستعدی سے سرانجام دیے - وہ تعلیم اور تدبیر کے اعتبار سے اپنے باپ سے گوے سبقت لے گیا - اس نے اپنی وزارت کے دوران میں متعدد مہمات میں حصہ لیا - اس کی پہلی مہم ہنگری کے خلاف تھی جس میں اس نے نیوہوسل Neuhausel (اُجوار ujuar ۲۹ ستمبر ۱۶۶۳ء) کو فتح کیا، کئی قلعوں کا محاصرہ کیا اور زرینوار Zerénuar کو سطح زمین کے برابر کر دیا، لیکن بالآخر اس نے کونٹ مونٹی ککولی Count Monte Cuccoli کے ہاتھوں یکم اگست ۱۶۶۴ء کو سینٹ گوٹہارڈ St. Gotthard کے مقام پر جو دریاے راب Raab کے کنارے واقع ہے، شکست فاش کھائی - اس واقعے سے کچھ ہی عرصے پیشتر اس نے اپنے دو نسبتی بھائیوں کو سلطنت کے دو اہم ترین عہدوں پر فائز کرا دیا تھا، یعنی قپلان مصطفٰی پاشا کو امیر البحر [قپودان پاشا، رک بآں] اور قرہ مصطفٰی پاشا [رک بآں] کو شاہی عسکر میں قائم مقام بنا دیا گیا تھا (J. von Hammer : *G O R*، ۶: ۲۲۷) - قپودان پاشا سبد

www.besturdubooks.wordpress.com

محمد پاشا کو اس کا ایک تیسرا برادر نسبتی بیان کیا جاتا ہے ۔ (دیکھیے J. von Hammer : *G O R*، ۶: ۳۲۳) لیکن اس بات کی صحت کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء کے موسم گرما میں اس نے پولینڈ کی طرف توجہ کی اور کئی روز کے محاصرے کے بعد ۳ جمادی الاولیٰ ۱۰۸۳ھ/۲۷ اگست ۱۶۷۲ء کو کمینیک پوڈولسک Kamiencic Podolsk پر قبضہ کر لیا جس پر شاعر نابی نے ایک نظم لکھی اس کے برعکس صدر اعظم کو اگلی یعنی چوٹن (پولش چوسم، ترکی چوتین) کی لڑائی میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور نومبر ۱۶۷۳ء رجب / ۱۰۸۴ھ میں یہ تلعہ ہاتھ سے نکل گیا اور احمد پاشا کو راہ فرار اختیار کرنا پڑی ۔ اس نے سینٹ گوٹہارڈ کی ہزیمت کی تلافی و سوار کے تسلی بخش صلحنامے سے کر لی (۱۰ اگست ۱۶۶۴ء) مگر اسے اگلے سال ایک نئی مہم کی تیاری کرنی پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے چوٹن Chotin پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور لادیزن Ladyzin کو بھی فتح کر لیا، فاضل احمد پاشا جب شاہی لشکر گاہ کی طرف جا رہا تھا تو دوران سفر میں اٹھارہ یوم کی بیمازی کے بعد ۲۲ شعبان ۱۰۸۷ھ/ ۳۰ اکتوبر ۱۶۷۶ء کو اِرکینہ کے پل کے قریب (ہور غاس اور ادرنہ کے درمیان) قرہ بیر کے کھیتوں سے ملحق ایک مکان میں انتقال کر گیا ۔ اس کی میت استانبول لائی گئی اور اسے اس کے باپ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا، اس کی جوانمرگی کی وجہ شراب نوشی کی کثرت اور استسقا بیان کی جاتی ہے ۔ یہ بیماری بھی اسے زیادہ شراب پینے کے باعث لاحق ہوئی تھی (دیکھیے de la Croix : *Etat générale de l' Empire Othoman*، پیرس ۱۶۹۵ء، ۲ : ۸۱) کندیہ Kindia کے محاصرے کے زمانے ہی میں اسے مرگی کے دورے پڑنے لگے تھے اور وہ شکل و صورت سے ایک ایسا تھکا ماندہ بوڑھا نظر آنے لگا تھا جو زندگی سے بیزار ہو چکا ہو۔ اس کے بعد وہ ہر قسم کی بری عادتوں میں پڑ گیا، اس نے اپنے گرد عورتیں جمع کر لیں (کہا جاتا ہے کہ اس کی ۸۰ بیویاں اور کنیزیں تھیں) اور پولش برانڈی کا جو ڈاکٹروں نے اس کے لیے تجویز کر رکھی تھی، بے حد مشتاق ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ احمد پاشا فہم و ذکا کے اعتبار سے اپنے باپ پر سبقت رکھتا تھا اور علوم و فنون سے بھی اس سے زیادہ شغف رکھتا تھا، یہاں تک کہ فوجی مہمات کے دوران میں بھی ان کی سرپرستی جاری رکھتا تھا ۔ اس نے استانبول میں ایک بڑا جامع کتب خانہ قائم کیا تھا ۔ (دیکھیے Mouradgea d' Ohsson : *Tableau*، ۲ : ۴۸۸) جو اب تک موجود ہے (فہرست دفتر، ص ۲۴۸ ببعد، عدد ۴، تاریخ ندارد) اور اس کی شہرت کی ایک زندہ یادگار ہے ۔ اس کے مہر بردار حسن نے جواہر الاخبار کے نام سے اس کی سوانحعمری لکھی ہے۔ اس کی مہمات کے قصیدے کئی بار لکھے گئے (دیکھیے F. Babinger : *Die Geschichtsschreiber der Osmanen*، لائپزگ ۱۹۲۷ء، ص ۲۱۱ ببعد) تمام ہم عصر یورپی مصنفین اس ممتاز سیاستدان کی اصابت رائے اور اس کی ذہانت اور گہری بصیرت کی تعریف و توصیف میں ایک دوسرے کے ہمنوا ہیں۔

مآخذ : مذکور بالا مؤرخین اور (۱) M. Brosch : *Geschichten aus dem Leben dreier Grossvesire*، گوتھا ۱۸۹۹ء؛ (۲) L.v. Ranke : *Die Osmanen*، وغیرہ لائپزگ، ۱۸۷۷ء، ص ۷۵ ببعد؛ (۳) عثمان زادہ احمد تائب : حدیقۃ الوزراء، ص ۲۰۶ ببعد؛ (۴) مُنجّم باشی، ۱ : ۲۲۲؛ (۵) احمد رفیق : کوپریلیلری، ج ۲ : استانبول ۱۳۳۱ھ، ص ۱۰۶؛ (۶) Brozzi-Berchet : *Relazione degli stati Europei*، حصہ ۲ (جس میں

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

bailo Nani کے واقعات relazione بالخصوص اہم ہیں)؛ (۷) J. Covell : *Early Voyages in the Levant*، لنڈن ۱۸۹۳ء (Covel نے اسے ایک مختصر سا داڑھی والا بڑی آنکھوں اور گول چہرے والا آدمی لکھا ہے، دیکھیے ۱۹۵، ۲۰۶، ۲۶۷)؛ (۸) J. Chardin : *Voyages*، ۱: ۸۱ ببعد، ۸۷ (اس کے بیان کے مطابق وہ لنگڑاتا تھا)، دیکھیے Covel، ص ۲۰۶)؛ (۹) Sir Paul Rycaut : *Present state of the Ottoman Empire*، ص ۱۳۵ ببعد؛ (۱۰) C. Magni : *Quanto di più curioso, e vago ha potuto raccorre*، وغیرہ Parma ۱۶۷۹ء، ص ۴۶۵، ۴۷۹ ببعد؛ (۱۱) Antanio Geropoldi : *Bilancia historico-politica dell' Impero Ottomano*، وینس ۱۶۸۶ء، ص ۱۳۹ ببعد (اس کا مطالعہ بڑی احتیاط سے کرنا چاہیے).

۳ - کوپریلی زادہ مصطفٰی پاشا، کوپریلی محمد پاشا کا بیٹا اور کوپریلی احمد پاشا کا بھائی تھا - وہ محمد پاشا کا دوسرا بیٹا تھا - ۱۰۴۷ھ/ ۱۶۳۷ء میں پیدا ہوا تھا - جمادی الآخرۃ - ۱۰۹۱ھ/ جولائی ۱۶۸۰ء میں اسے وزیر قبہ مقرر کیا گیا پھر وہ یکے بعد دیگرے بندر، سلستریا، باباطاغ، در دانیال اور کیوس Chios وغیرہ کا مستحفظ (محافظ قلعہ) بنا - ذوالحجہ ۱۰۹۸ھ اکتوبر ۱۶۸۷ء میں اسے صدر اعظم کا نائب (قائمقام) بنایا گیا - بعد ازآں در دانیال اور کندیہ Candia میں ایک بار پھر مستحفظ کے فرائض سرانجام دینے کے بعد بالآخر ۲۴ محرم ۱۱۰۱ھ/ ۷ نومبر ۱۶۸۶ء کو اسے مہر سلطنت تفویض ہوئی - اس وقت اس کی عمر ۵۲ برس تھی اور اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شریعتِ اسلام کا سختی سے پابند ہے اور عیسائیوں کا مخالف ہے - اس کی طبیعت امور جنگ کی نسبت علم و فضل کی طرف زیادہ مائل تھی - ایک اطالوی معاصر لکھتا ہے کہ ''یہ صدر اعظم ایک زاہد مفتی ہے جو شراب کا دشمن اور عیسائیوں کا مخالف ہے، پابند شریعت دیانتدار، پرہیزگار اور دبلا پتلا آدمی ہے، ایک ولی اور فقیہ کی حیثیت سے لوگ اس کی عزت کرتے ہیں - وہ ایک سیاست دان ہے مگر اسے امور جنگ کا مطلق کوئی تجربہ نہیں'' (J. v. Hammer : *GOR*، ۶: ۵۴۷) - اس سے کوپریلی زادہ مصطفٰی پاشا کی سیرت اور صفات کا بڑا واضح تصور ہمارے ذہن میں قائم ہو جاتا ہے - اس کا مقصد تھا کہ صدر اعظم کو جہاں تک ہو سکے خود مختار بنا دیا جائے، چنانچہ اس نے وزرائے قبّہ کی تعداد میں تخفیف کی اور جن عہدیداروں کو وہ پسند نہیں کرتا تھا انھیں برطرف کر دیا - اس نے حکومت کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے دانشمندانہ قدم اٹھائے، مثلاً علانیہ طور پر تمباکو کا محصول مقرر کیا اور سکّے کی قیمت میں باقاعدگی پیدا کی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملکی ضروریات پر اس کی نظر کتنی گہری اور صاف تھی - اس نے اپنی اور قصر شاہی کی تمام فالتو چاندی پگھلوا کر ٹکسال میں بھجوا دی اور خود جست کے برتنوں پر اکتفا کی - ۱۶۹۰ء میں اس نے سربیا پر لشکر کشی کی، بلغراد دوبارہ فتح کیا (۱۸ اکتوبر ۱۶۹۰ء) اسزیک (Esseqq ہنگروی : Eszék) پر قبضہ کیا اور ۱۹ ستمبر ۱۶۹۱ء کو بلغراد کے قریب سلنکامن Salankamen کے سامنے لڑتا ہوا مارا گیا - اس کی لاش دستیاب نہ ہو سکی - اپنے بھائی کی طرح وہ بھی فاضل کے لقب سے مشہور تھا - وہ ایک ممتاز سیاستدان تھا - اس نے اپنے زمانے کی ضروریات کو بڑی اچھی طرح سمجھ لیا تھا، اسی لیے اس نے کئی نئے نئے اقدامات کیے جن کی صحت پر زمانے نے مہر تصدیق ثبت کر دی.

مآخذ: جن مؤرخین کا ذکر ہو چکا ہے، ان کے علاوہ دیکھیے (۱) عثمان زادہ احمد تائب حدیقۃ الوزراء، ص ۱۱۶ ببعد؛ (۲) سجلّ عثمانی، ۴: ۳۰۶ ببعد.

www.besturdubooks.wordpress.com

۴ - کوپریلی زادہ حسین پاشا، کوپریلی محمد پاشا کا بھتیجا سلطنت عثمانیہ کا صدر اعظم بالعموم عمر جہ زادہ یعنی ''بھتیجا'' کے نام سے مشہور ہے، حسن آغا کا بیٹا تھا جو کوپریلی محمد پاشا کا بھائی تھا - اسے اپنے چچا زاد بھائیوں کی صحبت میں سرکاری ملازمت کی تربیت حاصل کرنے کا موقع مل گیا - وہ امیر البحر (قپودان پاشا) اور حاکم کیوس کے عہدوں پر فائز رہا - ۱۱۰۸ھ/ ۱۶۹۶ء کے موسم گرما میں اسے بلغراد کا دفاع سونپا گیا، سلطان مصطفٰی دوم اس کے دانشمندانہ مشوروں سے بہت متأثر ہوا اور اسے بلغراد کی حکومت سے ترقی دے کر یکم ربیع الاول ۱۱۰۸ھ/ ۱۷ ستمبر ۱۶۹۷ء کو صدر اعظم بنا دیا (دیکھیے J. v. Hammer : *GOR*، ۶ : ۶۴۱ ببعد) - اس نے ایک معتدل اور امن پسندانہ حکمت عملی کے مؤید ہونے کا ثبوت دیا، اور پہلا اہم قدم یہ اٹھایا کہ ۲۶ جنوری ۱۶۹۹ء کو آسٹریا، روس، پولینڈ اور وینس کے ساتھ صلحنامۂ کارلووٹز Carlowitz طے کر لیا - اس کی رو سے آسٹریا کو قریب قریب وہ سارا علاقہ مل گیا جو ۱۵۲۶ء کے بعد سے اس کے ہاتھ سے نکل کر باب عالی کے قبضے میں جا چکا تھا - اس طرح یہ صلحنامہ آگے چل کر آسٹریا اور ترکی کے درمیان ہونے والے معاہدوں کے لیے ایک اساس ثابت ہوا - حسین پاشا علما اور شعرا کا سرپرست بھی تھا اور انھیں اکثر بڑی فراخدلی سے انعام و اکرام سے نوازا تھا - چچا زاد بھائی کی طرح اس نے بھی خزانے کی حالت سدھارنے، بری اور بحری فوجوں کو بہتر بنانے، اور خصوصاً جزیہ کم یا معاف کر کے عیسائیوں کی مشکلات کم کرنے کی کوشش کی (دیکھیے J. v. Hammer : *GOR*، ۷ : ۴۴) - اس نے مذہبی کاموں نیز رفاہ عامّہ کے لیے متعدد عمارتیں بنوائیں، مثلاً استانبول، ادرنہ گردسکہ Gradisca اور لپانتو Lapanto میں مسجدیں تعمیر کرائیں، سکول اور کالج کھولے، آبرسانی کے انتظامات کیے اور ہر قسم کے کنویں کھدوائے (قب J. v. Hummer *GOR*، ۷ : ۴۷ ببعد) کہا جاتا ہے کہ جب چچا زاد بھائی کسی ذاتی بغض کی بنا پر قبلہ لی زادہ علی بیگ کے ہاتھوں مارا گیا (دیکھیے راشد : تاریخ، ۲۶۱؛ Kantemir : *Geschichte des Osmanischen Reisches* ہامبورگ ۱۷۴۵ء، ص ۶۱۸ ببعد میں جو کہانی درج ہے وہ بالکل غلط اور بے سروپا ہے) تو اس سانحے کا اس پر بڑا گہرا اثر پڑا - بالآخر ایک لاعلاج مرض کے باعث وہ استعفا پیش کرنے پر مجبور ہو گیا جو ۱۲ ربیع الآخر ۱۱۱۴ھ/۵ ستمبر ۱۷۰۲ء کو منظور کر لیا گیا - اس نے ادرنہ کے قریب بوچوق تپہ کی بلندیوں پر اپنی جاگیر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اس کے چند ہی روز بعد ۲۹ ربیع الآخر ۱۱۱۴ھ سلولوری کے قریب اپنی جاگیر والے مکان میں فوت ہو گیا - اسے استانبول کے بازار زین فروشاں میں ایک خاص مقبرے کے اندر دفن کیا گیا۔

مآخذ: مؤرخین مذکورۂ بالا نیز (۱) عثمان زادہ احمد تائب: حدیقۃ الوزراء، ص ۱۲۴ ببعد؛ (۲) رامز پاشا زادہ محمد عزت: خریطہ قپودانان دریا، استانبول ۱۲۸۵ھ، ص ۵۷ ببعد؛ (۳) سجلّ عثمانی، ۲ : ۲۰۲ ۔

۵ - کوپریلی زادہ نعمان پاشا، کوپریلی زادہ مصطفٰی پاشا کا بیٹا اور سلطنت عثمانیہ کا صدر اعظم - اس کی ملازمت کا آغاز مختلف مقامات (ارزوم، آناطولی، نیگرو پونتہ، Negroponte کندیہ Candia کی حکومت سے ہوا - پھر وہ در دانیال کی فوجوں کا سپہ سالار مقرر ہوا - اس کے بعد ایک بار پھر اس نے کندیہ، نیگرو پونتہ بوسنہ اور بلغراد کی حکومت کے فرائض سرانجام دیے - اس کی شادی سلطان مصطفٰی دوم کی بیٹی عائشہ سلطان سے ہوئی (جون ۱۷۱۰ء، دیکھیے J. v. Hammer : *GOR*، ۷ : ۱۴۵) اور

besturdubooks.wordpress.com

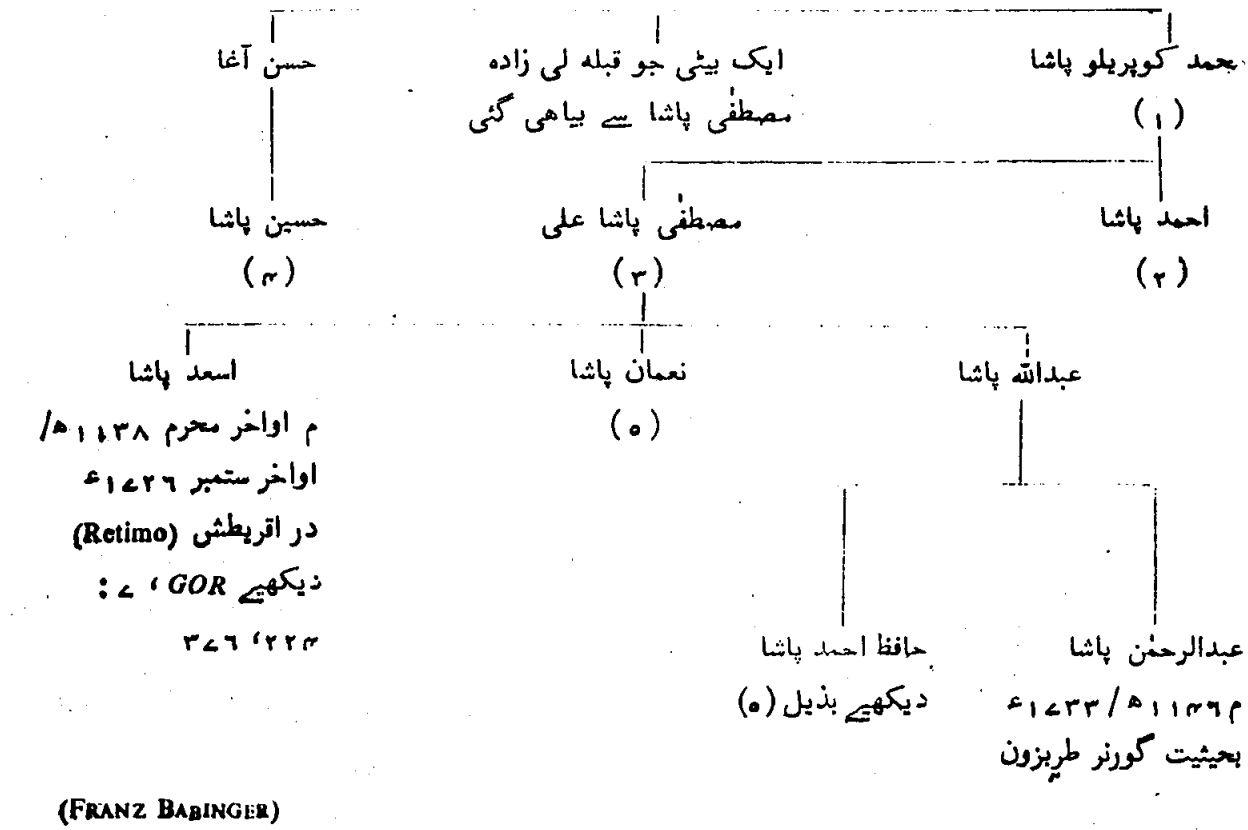
www.besturdubooks.wordpress.com

شادی کے عین بعد اسے صدر اعظم بنا دیا گیا ۔ ہر شخص کو یہ امید تھی کہ وہ سلطنت کا نجات دہندہ ثابت ہوگا، لیکن اس کے عہد وزارت میں وہ امیدیں جو اس کی ذات سے وابستہ تھیں درست ثابت نہ ہو سکیں ۔ اس نے شاہ سویڈن کی حمایت میں روس کے خلاف جنگ کرنے کی مخالفت کی، چنانچہ وہ نظروں سے گر گیا اور ۱۸ اگست ۱۷۱۰ء کو اسے والی بنا کر واپس نیگرو پونتہ بھیج دیا گیا ۔ بعد ازاں اس نے یکے بعد دیگرے کندیہ، بوسنہ اور بلغراد، قبرص، ایچ ایلی، مغنشہ [رک باں] کی ولایت کی اور آخر ایک مصروف زندگی بسر کرنے کے بعد وہ بخار میں مبتلا ہو کر ۷ ربیع الاوّل ۱۱۳۱ھ/ ۲۱ جنوری ۱۷۱۹ء کو اقریطش (Crete) میں فوت ہو گیا ۔ اس کا بیٹا حافظ احمد پاشا نشانجی باشی تھا جو بعد ازاں کئی بار ولایت کے عہدے پر فائز ہوا (دیکھیے J. v. Hammer : GOR، ۸: ۱۱۵، ۱۵۳، ۱۸۵، ۲۶۴) ۔ حافظ احمد پاشا آخری کوپریلی زادہ ہے جس کا ذکر ہمیں ترکی کی تاریخ میں کسی سرکاری عہدیدار کی حیثیت سے ملتا ہے ۔ اس کے اور اس کی اولاد کے بارے میں دیکھیے سجلِّ عثمانی، ۱ : ۲۶۲ ببعد.

مآخذ: (۱) دلاورزادہ عمر: ذیل بر حدیقۃ الوزرا، ص ۱۲ ببعد؛ (۲) سجلِّ عثمانی، ۴ : ۵۸۶ ببعد.

حسب ذیل شجرے سے کوپریلی نام کے مختلف افراد کے باہمی رشتے کو سمجھنے میں مدد ملے گی:

خاندان کوپریلی کا شجرۂ نسب



(FRANZ BABINGER)

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

* **کُوپَک** : ایران اور ماوراء النّہر کا ایک سکّہ، کُوپکی دیناروں کا ذکر شرف نامہ (سوانح تیمور) میں ملتا ہے، بابر (*Memoirs*، *GMS*، ص ۱۸۵) نے بھی ۳۰۰ تومان کُوپکی کا ذکر کیا ہے (نیز رك بہ ترجمہ از P. de Courteille، ۱ : ۴۲۰) Quatremère نے P. de La Civise سے جو اقتباس نقل کیا ہے، (*NE.*، ۱۴ : ۴۷، حاشیہ) اس میں وہ لکھتا ہے کہ کوپکی دینار طلائی سکّے ہیں جن کی مالیت فرانسیسی سکے کے حساب سے ۷۰۱۰ بنتی ہے، نیز دیکھیے Tavernier : *Hobson-Jobson* و Murray : *English Dict.*، بذیل مادّۂ Copeck - اگرچہ ماوراء النّہری اور ایرانی کوپک ایک طلائی سکّہ تھا، لیکن ہو سکتا ہے کہ اشتقاق کے اعتبار سے یہ لفظ اور روسی کوپک ایک ہی چیز ہو، جس طرح کہ دینار اور دناریس denarius پہلے سونے کے سکے تھے، مگر بعد ازآں انحطاط پذیر ہو کر چاندی کے سکے رہ گئے۔

(H. Beveridge)

* **کُوتاهیه** (قدیم Cotyacum) : ایشیائے کوچک کا ایک قصبہ، صوبۂ خداوندگار میں ایک سنجاق کا صدر مقام، دریائے پُرسق کے کنارے جو سقاریہ میں گرتا ہے، واقع ہے - اس کی بلندی سطح سمندر سے ۳ ہزار فٹ ہے - آبادی ۲۲۲۶۶ ہے، جس میں ۳۰۰۰ راسخ العقیدہ یونانی اور ۳۰۰ ارمنی ہیں - یہاں ۲۴ مسجدیں، ۲۱ مدرسے، ۲ کتب خانے، ۱۶ درویشوں کی خانقاہیں، ۴ گرجے، ۹ کارواں سرائیں، ۱۱ حمام اور ۱۲ مٹی کے برتنوں کی دکانیں ہیں - یہ بغداد ریلوے کا سٹیشن بھی ہے - چودھویں صدی عیسوی میں یہ گرمیاں اوغلی کا دارالحکومت تھا، اس زمانے کی مساجد کھنڈر بن چکی ہیں، یہاں کی دوسری قابل ذکر عمارتیں یہ ہیں : مجیدی مدرسہ (۷۰۴ھ/۱۳۰۴ء)، قرشوں لی جامع (۷۷۷ھ/۱۳۷۵ - ۱۳۷۶ء)، ایک اور مسجد (۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء)، یعقوب چلبی جامع (۸۳۷ھ/ ۱۴۳۳ - ۱۴۳۴ء)، اُولُو جامع عظیم، جس کی تعمیر گرمیاں اوغلی سے منسوب کی جاتی ہے، لیکن وہ بایزید اول سے قبل کی نہیں ہے، اس میں بلندی پر بنا ہوا ایک قدیم قلعہ بھی ہے، لیکن یہ اب تباہ و برباد ہو چکا ہے - Texier نے جس سنگ مرمر کے شیر اور بوزنطی سنگین تابوت کا ذکر کیا ہے، وہ اب باقی نہیں، یہاں آق صُو، سلطان باغہ، کپ گیر، سلطان بایزید باغچہ سی نامی سیرگاہیں ہیں، مضافات میں گرم پانی کے چشمے ہیں - کسی زمانے میں یہ آرائشی پھولوں سے منقش روغنی مٹی کے برتن (جنھیں Rhodian Pottery کہتے ہیں) بنانے کی صنعت کا ایک اہم مرکز تھا - اس صنعت کے احیا کی کوشش کی گئی ہے، لیکن موجودہ برتن خوبصورتی میں قدیم نمونوں کے برابر نہیں۔

یہ قصبہ گرمیاں اوغلی کی بیٹی کو جہیز میں ملا تھا جس کی شادی بایزید اول سے ہوئی تھی - جنگ انقرہ کے بعد اس پر تیمور کا قبضہ ہو گیا (۱۴۰۲ء) - فاتح نے جب Ephesus پر پیش قدمی کی تو اپنے بیٹے شاہرخ کو والی بنا کر یہاں چھوڑ گیا (H. A. Gibbons : *The Foundation of the Ottoman empire*، اوکسفرڈ ۱۹۱۶ء، ص ۱۵۶، ۲۵۸)۔

مآخذ : (۱) حاجی خلیفہ : جہاں نما، ص ۶۳۲؛ (۲) علی جواد : جغرافیہ لغاتی، ص ۶۸۸؛ (۳) سامی بے : قاموس الاعلام، ۵ : ۳۹۱۰؛ (۴) Texier : *Asie Mineure*، پیرس ۱۸۸۲ء، ص ۳۹۴؛ (۵) J. de Hammer : *Hist. de l'empire ottoman*، ۱ : ۲۴۶؛ (۶) Cuinet : *Turquie d' Asie*، ص ۲۰۳؛ (۷) Cl. Huart : *Konia la ville des derviches tourneurs*، پیرس ۱۸۹۷ء، ص ۵۴ ببعد (قلعے کی تصویر)۔

(Cl. Huart)

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

* **کُوت العمارة**: العراق میں ایک مقام جو دریاے دجلہ کے بائیں کنارے، بغداد اور عمارۃ کے درمیان، بغداد کے جنوب مشرق میں بخط مستقیم ۱۰۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ کوت در اصل ہندوستانی لفظ کوٹ بمعنی قلعہ ہے جو العراق کے کئی اور مقامات کے ناموں کا جزو ہے، مثلاً کوت المُعمّر، اکثر اوقات کوت العمارۃ کو محض کوت بھی کہا جاتا ہے۔ کوت شط الحی کے دہانے کے مقابل واقع ہے جسے الغرّاف بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک قدیمی نہر ہے جو دجلے کو فرات سے ملاتی ہے اور اس کا کئی مقامات پر فرات سے اتصال ہوتا ہے، مثلاً ناصریۃ اور سوق الشیوخ پر۔ کوت کے شمال میں جو میدان ہیں، وہاں بنو لام کے جلیل القدر قبیلے کی ایک شاخ بنو ربیعۃ آباد ہے۔ کوت کوئی پرانا شہر نہیں، اس میں اور المذار میں جس کا ذکر یاقوت نے کیا ہے، مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے (یاقوت، ۴: ۲۷۵؛ دیکھیے Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۳۸ اور H. H. Schaeder در *Islam*، ۱۴: ۱۷)۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اور ۱۸۶۰ء تک یہ ایک چھوٹا سا معمولی گاؤں تھا جس کے چاروں طرف مٹی کی دیواریں بنی ہوئی تھیں (Keppel در ۱۸۲۴ء، بمطابق Ritter؛ Petermann: *Reisen im Orient*، لائپزگ ۱۸۶۰ء، ۲: ۱۵۰)۔ لیکن جب میسرز لینچ Messers Lynch نے بغداد اور بصرے کے درمیان دخانی جہاز چلانے کی اجازت حاصل کر لی تو اس کے بعد کوت دریا کے کنارے پر ایک اہم مستقر بن گیا جس کے بعد اس کی آبادی میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ ترکی حکومت کے آخری دنوں (۱۸۶۱ء) میں کوت اپنی ایک ہم نام قضا کا صدر مقام تھا جو سنجاق بغداد میں شامل تھی (آج بھی عراق کی نئی حکومت میں اسے یہی حیثیت حاصل ہے)۔ ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ اس کی آبادی کا اندازہ ۴۱۱۵ تھا (Cuinet) اور یہ تقریباً تمام تر شیعہ تھی (کوئی ۱۰۰ سنّی ہوں گے اور ۱۰۰ یہودی)۔ اس نام کی قضا شمالی جانب کوہ لرستان تک پھیلی ہوئی ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں جو میدان ہے، اسے دریاے کَلّال سیراب کرتا ہے۔ اس میں متعدد گاؤں آباد ہیں، جن پر ترکوں کے قبضے پر ایرانی حکام کو اعتراض تھا۔ ۱۸۶۱ء کے بعد قضا کی آبادی میں بھی اسی طرح اضافہ ہوا جو ۱۸۹۰ء کے قریب ۳۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ آبادی (موضع کوت کے سوا) سب کی سب سنّی تھی۔

کوت کا محل وقوع عسکری نقطۂ نظر سے بڑا اہم تھا، اسی وجہ سے جنگ عظیم کے دوران میں اس نے بڑا نمایاں حصہ لیا۔ ترکوں کے خلاف پیش قدمی کرتے ہوے جنرل ٹاؤنشنڈ Townshend نے ستمبر ۱۹۱۵ء میں کوت پر قبضہ کیا۔ کچھ ہی دن بعد اسے بغداد پر لشکر کشی کرنے کے لیے فوج کا ایک مقام بنا دیا گیا، لیکن یہ منصوبہ انگریزوں کی پسپائی پر ختم ہوا اور اس کے بعد ترکوں نے فوراً کوت کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ شروع ہونے کی تاریخ ۸ دسمبر ۱۹۱۵ء ہے۔ کوت کو اس محاصرے سے نجات دلانے کی تمام کوششیں ناکام رہیں، چنانچہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۶ء کو اس پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا اور وہ اسے خوب مستحکم کر کے وہاں جم گئے، یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۱۶ء میں یہ دوبارہ انگریزوں نے فتح کر لیا اور ۱۹۲۰ء میں اسے عراق کی نئی سلطنت میں شامل کر دیا گیا۔

مآخذ: (۱) C. Ritter: *Erdkunde*، ۱۱: ۹۳۵ ببعد؛ (۲) V. Cuinet: *La Turquie d' Asie*، پیرس ۱۸۹۴ء، ۳: ۱۳۹ تا ۱۴۲؛ (۳) von Oppenheim: *Vom Mittelmeer zum Persisehen Golf*، برلن ۱۸۹۹ء، ص ۲۸۸ ببعد؛ (۴) H. Longrigg: *Four*

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Centuries of Modern Iraq، آکسفرڈ ۱۹۲۵ء، ص ۲۹۴، ۳۱۳۔

(J. H. KRAMERS)

* **کوتل** : (ارمنی لفظ Kothal سے، بمعنی ''دیوار، طرف'': Fraenkel، *Aram. Fremdwörter*، ص ۲۲۳)، فارسی میں اس کا مطلب ہے پہاڑی درہ، دو چوٹیوں کے درمیان کی تنگ جگہ۔ یہ لفظ جو کسی فارسی لغت میں نہیں ملتا، مشرقی ترکی سے مستعار لیا گیا ہے اور وہاں ارمنی زبان سے آیا تھا۔ یہ لفظ بابر نامہ میں آیا ہے (طبع Ilminsky، ص ۹۹ س ۲۳، ۱۰۰ س ۱، ۱۷۲ س ۱۸، ۱۶۶، ۲۲)؛ نیز دیکھیے (۱) Radlof: *Opit*، ج ۲، عمود ۱۲۷۷؛ (۲) Pavet de Courtielle: *Dict. turk-oriental*، ص ۴۶۳۔

(CL. HUART)

⊗ **کوٹ مٹھن** : ضلع ڈیرہ غازی خان کا یہ قصبہ مٹھن کوٹ کے نام سے بھی شہرت رکھتا ہے۔ پنجند اور دریاے سندھ کے مقام اتصال سے چند میل نیچے کی طرف دریاے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ ڈیرہ غازی خان سے ۸۰ میل کے فاصلے پر ہے اور پختہ سڑک سے ملا ہوا ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۴۳۸۲ تھی جبکہ ۱۸۹۱ء میں ۳۶۲۴ تھی۔ بازار چوڑا ہے اور شمالاً جنوباً واقع ہے جس میں دو رویہ درخت ہیں، اس لیے عمدہ منظر پیش کرتا ہے۔ بازار کے دونوں طرف متوازی گلیاں ہیں جنھیں اسی قسم کی گلیاں عموداً کاٹتی ہیں۔ شہر سے باہر آم کے باغات ہیں۔ عین وسط میں غلہ منڈی ہے۔ یہاں سے گڑ اور نیل باہر بھیجا جاتا ہے۔ طغیانی سے بچانے کے لیے شہر کے چاروں طرف بند باندھا گیا ہے۔ یہاں ڈاک بنگلہ، تھانہ، سرائے، ہسپتال، سکول اور میونسپل کمیٹی موجود ہیں۔

کوٹ مٹھن ایک متبرک مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں قاضی محمد عاقل رح رک ہاں کا خوبصورت مقبرہ ہے۔ قاضی صاحب چشتی بزرگ ہوے ہیں۔ ان کی اولاد میں سے خواجہ غلام فرید رح (م ۱۹۰۲ء) بھی یہیں دفن ہوے جن کی سرائیکی زبان میں درد بھری کافیاں مشہور ہیں۔ اس خاندان کے دیگر بزرگ بھی یہاں مدفون ہیں۔ نوابان بہاولپور اور اضلاع رحیم یار خان، ملتان، مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان کے معزز گھرانے ان تمام بزرگوں کے مرید تھے۔ بنا برین لوگ ہزاروں کی تعداد میں ان کے عرس میں شرکت کرتے ہیں۔ مناقب فریدی کے حوالے سے تاریخ مشائخ چشت میں درج ہے کہ قاضی محمد عاقل کے والد مخدوم شریف جب یاراوائی میں آ کر آباد ہوے تو وہاں کا رئیس مٹھن خان بلوچ ان کا مرید ہوگیا۔ جہاں کوٹ مٹھن آباد ہے وہاں سے مخدوم صاحب کا گزر ہوا تو پرفضا مقام دیکھ کر انھوں نے مٹھن خان کو فرمایا کہ اس جگہ ایک شہر آباد کیا جائے جو اللہ والوں کا مسکن ہو، چنانچہ اس طرح کوٹ مٹھن وجود میں آیا اور خان کی درخواست پر مخدوم صاحب نے اسے اپنا مستقر بنایا۔ حضرت مخدوم کی موجودگی کے باعث دور دور سے علما و مشائخ وہاں جمع ہو گئے۔ ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء میں طغیانی کے باعث پرانا شہر دریا برد ہو گیا اور چند میل کے فاصلے پر ہٹ کر پھر آباد ہوا اور تمام بزرگوں کے تابوت بھی نکال کر موجودہ قبرستان میں دفن کیے گئے۔

مآخذ : (۱) *Gazetteer of the Dera Ghazi Khan District*، لاہور ۱۸۹۸ء، ص ۱۹۰؛ (۲) *Bahawalpur State Gazetteer*، لاہور ۱۹۰۸ء، ص ۱۸۰؛ (۳) *Dera Ghazi Khan Census Report (1961)*، مطبوعۂ لاہور، ص ۷، ۲۲؛ (۴) خلیق احمد نظامی : تاریخ مشائخ چشت، دہلی ۱۹۵۳ء، ص ۵۷۸، ۵۷۹ [عبدالغنی، رکن ادارہ، نے لکھا]۔

(ادارہ)

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

⊗ اَلْکَوْثَر: بمعنی خیر کثیر، جو اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو عطا فرمائی (المفردات، ۴۳۹) - اس خیر کثیر سے مراد قرآن، حکمت، نبوت، دینِ حق اور ہدایت ہے جو سعادت دارین کا باعث ہے (تفسیر القاسمی، ۱۷ : ۶۲۷۶؛ تفسیر المراغی، ۳۰ : ۲۵۳) - بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد جنت کی ایک نہر ہے جس سے بہت سی نہریں نکلتی ہیں (المفردات : ۴۳۹) - حضرت انسؓ سے بھی روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا : ھو نہرٌ فی الجنّۃ'' (صحیح الترمذی، ۱۲ : ۲۵۸) - ابن جریر نے ابو بشر سے روایت کی ہے، انھوں نے بیان کیا : ''میں نے سعید بن جبیر سے کوثر کے بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے جواب میں فرمایا : ھوالخیر الکثیر الّذی اٰتاہ اللہ ایّاہ'' (وہ خیر کثیر ہے جو اللہ نے خاص حضورؐ ہی کو عطا فرمائی ہے) تو میں نے سعید سے کہا کہ ہم سنتے تھے کہ وہ جنت میں ایک نہر ہے تو انھوں نے فرمایا : ''ھو من الخیر الّذی اعطاہ اللہ ایّاہ'' (وہ بھی اس خیر میں سے ہے جو اللہ نے خاص آپؐ کو عطا فرمائی'' (تفسیر القاسمی، ۱۷ : ۶۲۷۷) .

قرآن حکیم کی ایک سورۃ کا نام ہے جو صرف تین آیات پر مشتمل ہے اور پہلی آیت : اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَر کے لفظ الکوثر کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے - ترتیب تلاوت کے لحاظ سے اس کا عدد ۱۰۸ ہے - یہ سورۃ الماعون [رَءَیْتَ] کے بعد اور سورۃ الکافرون [رَءَیْتَ] سے قبل مندرج ہے، مگر نزول وحی کے لحاظ سے یہ پندرھویں سورۃ ہے - اور سورۃ العٰدیٰت [رَءَیْتَ] کے بعد مکے میں نازل ہوئی (تفسیر المراغی، ۳۰ : ۲۵۱) - حضرت حسن بصریؒ، عکرمہؓ، مجاہدؒ اور قتادہؓ اس کو مدنی قرار دیتے ہیں امام السیوطی نے الاتقان میں اسی قول کو صحیح ٹھیرایا ہے (الاتقان، ۱ : ۱۵) - ابن کثیر نے بھی اسے مدنی قرار دیا ہے ''وھی مدنیّۃ و قیل مکّیّۃ (تفسیر القرآن العظیم، ۴ : ۵۵۶) - غالباً اس کی وجہ وہ روایت ہے جسے محدّثین نے حضرت انسؓ بن مالک سے نقل کیا ہے کہ : ''حضورؐ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے - اتنے میں آپ پر کچھ غنودگی سی طاری ہو گئی پھر آپ نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا اور فرمایا : ''ابھی ابھی مجھ پر ایک سورۃ نازل ہوئی ہے'' - پھر بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھ کر آپؐ نے سورۃ الکوثر کو ختم کیا اس کے بعد آپؐ نے پوچھا : ''ھل تدرون ما الکوثر؟'' (کیا تم جانتے ہو کوثر کیا ہے؟) - لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں، تو آپ نے فرمایا : ''ھو نھرٌ اَعطانیہ ربّی عزّ و جلّ فی الجنّۃ علیہ خیر کثیر . . .'' (وہ ایک نہر ہے جو میرے رب کریم نے مجھے جنت میں عطا کی ہے جہاں خیر کثیر ہے) (ابن کثیر : تفسیر القرآن العظیم، ۴ : ۵۵۶) - چونکہ حضرت انسؓ مدینے کے مقامی باشندے (انصاری) ہیں اس لیے ان کا یہ کہنا کہ یہ سورۃ ہماری موجودگی میں نازل ہوئی اس کے مدنی ہونے پر دال ہے، لیکن اگر سورۃ کے مضمون نیز دوسری روایات کو [جو بسلسلۂ شان نزول نقل کی جاتی ہیں] پیش نظر رکھا جائے تو پورے وثوق سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ سورۃ مکۂ مکرمہ میں نازل ہوئی (تفصیل کے لیے دیکھیے : تفہیم القرآن، ۶ : ۴۸۸ ببعد).

گزشتہ سورۃ سے اس کا ربط یہ ہے کہ اس میں دین حق کی تکذیب کرنے والوں کے چار خصائل کا ذکر کیا گیا ہے : بُخل، نماز سے غفلت، ریاکاری اور معمولی ضرورت کی چیزیں لوگوں کو دینے سے گریز کرنا - سورۃ الکوثر میں، اس کے مقابلے میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے چار محاسن

www.besturdubooks.wordpress.com

جمیلہ کا ذکر کیا گیا ہے: ''الخیر الکثیر، و الحرص علی الصلاۃ و دوامہا و الاخلاص فیہا و التصدق علی الفقراء'' (یعنی خیر کثیر، نماز کے لیے رغبت اس میں مداومت اور اخلاص اور فقرا کے لیے سخاوت) (دیکھیے : تفسیر المراغی، ۳۰ : ۲۵۱) - امام رازی نے مدلّل طور پر اس امر کی صراحت کے ہے کہ سورۃ والضّحیٰ [ربّك بآن] سے سورۃ الماعون [ربّك بآن]، تک کے مضامین رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کی مدح اور آپ کے شرف و منزلت کے ذکر پر مشتمل ہیں اور سورۃ الکوثر ان سب کا تتمہ ہے (التفسیر الکبیر، ۳۳ : ۱۱۹) - امام رازی نے اس سورۃ کو سب کا نچوڑ اور جامع قرار دیا ہے : ''فکانت صغیرۃ فی الصورۃ کبیرۃ فی المعنی'' (یعنی یہ سورۃ الفاظ میں چھوٹی، لیکن معانی کے اعتبار سے بہت بڑی ہے) (کتاب مذکور، ۳۳ : ۱۲۸) .

اس سورۃ کے مضمون اور اس کی جامعیّت کا صحیح اندازہ اس کے تاریخی پس منظر سے ہوتا ہے - مکّۂ مکرّمہ میں رسول اکرم ؐ قریش کی اذیتوں اور ایذا رسانی کو کمال صبر سے برداشت کرتے ہوے تبلیغ اسلام کا فرض منصبی ادا کر رہے تھے - پوری قوم دشمنی پر تلی ہوئی تھی آپ ؐ اور آپ ؐ کے رفقا کے لیے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی تھیں - ابتلا کے اس نازک دور میں آپ ؐ اپنے مٹھی بھر رفقا کے ساتھ، ان تمام مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود، دین حق کی تبلیغ کے لیے سرگرم عمل تھے پہلے آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت قاسم کا انتقال ہوا پھر چھوٹے صاحبزادے حضرت عبداللہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے، دشمنوں کو مزید زبانِ طعن دراز کرنے کا موقع مل گیا - ابو لہب نے مشرکین کے مجمع کے سامنے یوں خوشی کا اظہار کیا : ''بتر محمّدٌ اللّیلۃ'' یعنی آج رات (العیاذ باللہ) محمد کی جڑ کٹ گئی (تفسیر القاسمی، ۱۷ : ۶۲۷۸) شمر بن عطیہ کا قول ہے کہ یہ الفاظ عقبۃ بن ابی معیط نے کہے تھے - ابن اسحٰق نے یزید بن رومان کے حوالے سے العاص بن وائل کا نام لیا ہے کہ وہ جب کبھی حضور اکرم ؐ کا ذکر کرتا تو اس قسم کے نازیبا الفاظ استعمال کرتا، ایسے نازک اور پُر آشوب موقع پر رحمت حق نے آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی ڈھارس بندھائی اور اس سورۃ میں آپ ؐ کو نہ صرف خیر کثیر اور فتح و نصرت کی نوید سنائی گئی بلکہ آپ کے دشمنوں کو آپ کی مخالفت سے باز نہ آنے کی صورت میں مکمل تباہی اور استیصال کی وعید بھی سنائی گئی تاکہ آپ ؐ پوری دلجمعی اور مستعدی سے اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف رہیں (دیکھیے، تفسیر المراغی، ۳۰ : ۲۵۲)، چنانچہ وحی ربّانی کا نزول ہوتا ہے : ''(اے نبی ؐ) ہم نے تمھیں کوثر عطا کر دیا - پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو - بے شک تمھارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے :

الکوثر کثرت سے مبالغے کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں خیر اور بھلائیوں کی کثرت - اس میں نبوت، قرآن حکیم، علم و حکمت، دین حق اور سعادتِ دارین کی عظیم نعمتوں کے علاوہ حوض کوثر بھی شامل ہے جو قیامت کے روز میدان حشر میں آپ کو ملے گا، اور دوسرے وہ نہر کوثر بھی جو جنت میں آپ ؐ کو عطا فرمائی جائے گی (دیکھیے تفہیم القرآن، ۶ : ۴۹۳)، جس کے دونوں کنارے موتی کے خیمے ہیں - جس کی مٹی خالص مشک ہے (صحیح الترمذی، ۱۲ : ۲۵۸)، جس کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا، دودھ سے زیادہ سفید اور برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے (الکشاف، ۴ : ۸۰۷)، جس کے کنارے دراز گردن والے پرندے بیٹھے ہوے ہیں جو نہ صرف خوبصورت بلکہ کھانے میں بھی بہت ہی لذیذ ہیں (دیکھیے ابن کثیر،

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

تفسیر القرآن، ۴ : ۵۵۸ ببعد)۔ ''ابتر'' دم کٹے جانور کو کہتے ہیں۔ دُم سے تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ وہ پیچھے ہوتی ہے اور جانور کے لیے زینت ہوتی ہے، انہٗ یتبعہٗ و ھو زینۃٌ لہٗ، یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ ''لا یبقی لہٗ ذکرہ و لا یدوم اثرہٗ'' یعنی نہ آپ کے دشمن کا ذکر باقی رہے گا اور نہ اس کا کوئی نشان رہے گا۔ (تفسیر المراغی، ۳۰ : ۲۵۳)۔ تاریخ شاھد ہے کہ یہ پیشگوئی پوری ہوئی دشمنوں کی جڑ کٹ گئی۔ جہاں تک نبی اکرمؐ اور ان کے رفقا کا تعلق ہے، اللہ تعالٰی نے انھیں عظیم رتبے عطا فرمائے اور ان کے ذکر کو بلند کیا۔ آپؐ کی شریعت باقی ہے اور ابدالآباد تک باقی رہے گی۔ آپؐ کا پیارا اور مبارک نام ہر ایک مسلمان کے دل و زبان پر ہے اور قیامت تک فضاے آسمانی میں عروج و اقبال کے ساتھ گونجتا رہے گا (دیکھیے ابن کثیر : تفسیر القرآن)۔

مآخذ : (۱) الراغب الاصفہانی : المفردات فی غریب القرآن، مصر، بلا تاریخ؛ (۲) الزمخشری : الکشاف، لبنان ۱۹۴۷ء؛ (۳) اسمٰعیل بن کثیر : تفسیر القرآن العظیم، لاہور ۱۹۷۳ء؛ (۴) احمد مصطفٰی المراغی : تفسیر المراغی، مصر ۱۹۴۶ء؛ (۵) القاسمی : تفسیر القاسمی، مصر ۱۹۶۰؛ (۶) الفخرالرازی : التفسیر الکبیر، مصر، بلا تاریخ؛ (۷) صحیح الترمذی، مصر ۱۹۳۴ء؛ (۸) ابو الاعلٰی مودودی : تفہیم القرآن، لاہور ۱۹۷۵ء؛ (۹) السیوطی : الاتقان، مصر بلا تاریخ۔

(بشیر احمد صدیقی)

کُوثی : عراق کا ایک بہت ہی قدیم شہر یہ ان نہروں میں سے جو دجلے اور فرات کو ملاتی ہیں ایک کے کنارے پر واقع ہے، اس شہر اور اس نہر کا ذکر مسماری (Cuneiform) کتبوں میں اکثر ملتا ہے (دیکھیے حوالے در Messner : *Babylonien und Assyrien*، ۱۹۲۰-۱۹۲۵ بمدد اشاریہ، بذیل مادۂ Kuta یا Kutû، نیز نقشہ از Schwenzner، جلد اول میں)۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہی شہر ہے جس کا ذکر بائبل، کتاب سلاطین، حصّۂ دوم، ۱۷ : ۲۴، میں آتا ہے، جہاں سے آنے والے ان لوگوں کا ایک حصہ ہیں جنھیں شاہ اشوریہ (Assyria) نے سماریہ (Semaria) میں وہاں کے یہودیوں کو جلا وطن کر کے بسایا تھا۔ اس نہر کی گزرگاہ، کم سے کم اس کے مغربی حصے کی، وہی ہے جو آج کل حبلِ ابراھیم کی ہے؛ جدید ترین نقشوں میں (مثلاً *Karte von Mesopotamien* [صرف سرکاری استعمال کے لیے عارضی ایڈیشن] مرتب کردۂ جرمن جنرل سٹاف محکمۂ نقشجات بہ تاریخ دسمبر ۱۹۱۷ء، پیمانہ ۱ : ۴۰۰۰۰۰، ورق ۵ ڈی) حبلِ ابراھیم شط النّول میں ختم ہوتی ہے۔ عرب جغرافیہ نویس اس کا ذکر نہیں کرتے بلکہ اسے براہ راست دجلے میں جا گراتے ہیں (دیکھیے G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، نقشہ ۲)۔

مآخذ : جو حوالے مقالے کے متن میں آ گئے ہیں ان کے علاوہ دیکھیے (۱) ابن سراپیون، در *J.R.A.S.*، ۱۸۹۵، ص ۷۵؛ (۲) ابن حوقل، در *B.G.A.*، ۲ : ۱۶۸؛ (۳) المقدسی، در *B.G.A.*، ۳ : ۲۶، ۱۲۱ ببعد؛ (۴) ابن خرداذبہ، در *B.G.A.*، ۶ : ۷، ۹، ۱۲۵، ۱۸۵، ۲۳۶ ببعد؛ (۵) ابن رستہ، در *B.G.A.*، ۷ : ۱۷۴، ۱۸۲؛ (۶) یاقوت : معجم، طبع Wüstenfeld، ۴ : ۳۱۷ ببعد؛ (۷) وہی مصنف : مشترک، طبع Wüstenfeld، ۲ : ۷۷۳؛ (۸) البکری : معجم، طبع Wüstenfeld، ص ۴۸۵؛ (۹) Streck : *Die alte Landschaft Babylonien*، ۱ : ۱۱، ۱۶، ۲۴؛ (۱۰) G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۶۸ ببعد؛ مسئلہ انہار پر دیکھیے (۱۱) Ritter : *Erdkunde*، ۱۱ : ۷۷۱؛ (۱۲) M. Hartmann، در EI۱. لائیڈن، بذیل مادۂ عراق؛ (۱۳) P. Sykes : *History of Persia*، ج ۱، ۱۹۲۱ء، کا نقشہ مشرقی تاریخ کے مختلف ادوار کے سمجھنے میں نہایت ہی کارآمد ہے۔

(M. Plessner [و تلخیص از ادارہ])

www.besturdubooks.wordpress.com

* **کوچک بیرام** : رک بہ عیدالفطر و بیرام).

* **کُوچُک قَیْنارجہ** : (ترکی: گرم پانی کا چھوٹا چشمہ")، سلسٹریا (Silistria) سے ۴۵ میل جنوب میں بلغاریہ کا ایک قصبہ جو عہد نامۂ برلن (۱۳ جولائی ۱۸۷۸ء) سے پہلے سلطنت عثمانیہ میں شامل تھا ۔ اسی قصبے میں ۱۲ جمادی الاولٰی ۱۱۸۸ھ / ۲۱ جولائی ۱۷۷۴ء کو عبدالحمید اول سلطان ترکی اور کتھرائن (Catherine) دوم ملکۂ روس کے درمیان ایک صلح نامے پر دستخط ہوے تھے۔

مآخذ : (۱) رسمی احمد افندی : خلاصۃ الاخبار، مترجمۂ Diez : *Wesentliche Betrachtungen*؛ (۲) واصف افندی : محاسن الآثار، ۲، ۱۸۴ و ببعد؛ (۳) J. von Hammer : *Hist. de l'empire ottoman*، فرانسیسی ترجمہ ۱۶ : ۳۹۲ ببعد؛ (۴) Jouannin و von Gaver : *Turquie*، ص ۳۵۸ .

(Cl. Huart [و تلخیص از ادارہ])

* **کُوچک (میرزا) وصال** : انیسویں صدی کے ایرانی شاعر محمد شفیع کا لقب جو شیراز میں پیدا ہوا ۔ وہ ایک اچھا خوشنویس اور موسیقار تھا جس نے ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء میں وفات پائی ۔ اس کی تصنیفات یہ ہیں : متعدد منظومات (دیوان مطبوعۂ تہران ۱۲۷۵ھ)؛ بزم وصال جس میں وحشی کی فرہاد و شیریں کی تکمیل کی گئی ہے (مطبوعۂ تہران ۱۲۶۳ھ) اور الزّمَخْشری کی اَطْوَاق الذّہب ("طلائی طوق") کا فارسی ترجمہ اس کے بیٹوں وَقار محمود حکیم (طبیب)، ابوالقاسم فرہنگ، دّاوری، یزدانی اور ہمت نے باپ کا کمال ورثے میں پایا۔

مآخذ : (۱) رضا قلی خان: ریاض العارفین، ص ۳۳۷ تا ۳۵۰؛ (۲) مجمع الفصحاء، تہران ۱۲۹۵ھ، ۲ : ۵۲۸ تا ۵۴۸؛ (۳) E. G. Browne : *Hist. of Persian Literature in Modern Times*، کیمبرج ۱۹۲۴ء، ص ۳۱۶ و لوح ۹ (ص ۳۰۰ خود نوشت تحریر۔

(Cl. Huart)

کُوچم خان : سائبیریا کا ایک تاتاری خان جس کے عہد میں روسیوں نے یہ ملک فتح کیا ۔ صرف ابو الغازی (طبع Desmaisons، ص ۱۷۷) ہی وہ سند ہے جس سے ہمیں اس کے عہد اور چنگیز خان کے دیگر اخلاف کے ساتھ اس کی نسبی قرابت کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں، اس مآخذ کی رو سے اس نے "توران" میں چالیس سال حکومت کی اور آخر عمر میں اس کی بینائی جاتی رہی تھی ۔ ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۴ء - ۱۵۹۵ء) میں روسیوں نے اسے اس کی مملکت سے باہر نکال دیا ۔ اس نے منعت نوغای کے ہاں پناہ لی اور انہیں لوگوں کے درمیان جان جان آفرین کے سپرد کر دی ۔ عثمانلی ترک سیفی کی اس تصنیف میں بھی کُوچم کے متعلق حوالے ملتے ہیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء میں لکھی گئی تھی (لائیڈن قلمی نسخہ، شمارہ ۹۱۷، ترجمہ مخطوطے کا حوالہ دیے بغیر از Ch. Schefer جو اس کے ترجمے تاریخ وسط ایشیا (عبدالکریم بخاری *Histoire de l'Asie centrale* پیرس ۱۸۷۶ء، ص ۳۰۳ ببعد) میں بطور ضمیمہ شامل ہے) ۔ اس میں کُوچم کی مملکت اور دارالحکومت کا نام "تُرا" لکھا ہے روسیوں نے اس قصبے پر کُوچم کی عدم موجودگی میں قبضہ کیا تھا ۔ بعد ازاں کُوچم نے واپس آ کر ایک طویل محاصرے (ایک دو سال) کے بعد روسیوں کو باہر نکال دیا، لیکن روسی اس کے بیٹے کو قیدی بنا کر ماسکو لے گئے ۔ ان روایات سے پتا چلتا ہے کہ سیفی کی تصنیف کا سن تالیف اس سنہ سے غالباً متأخّر ہے جو کتاب کے سرورق پر درج ہے (Schefer، محل مذکور، پیش لفظ، ص iv میں تو مصنف کا سال وفات تک ۹۹۰ھ دیا گیا ہے)۔

کُوچم کے دارالحکومت کا نام "اِسْکَر" (تبول اور اِرْتش کے سنگم کے قریب) محض روسی مآخذ ہی

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

میں نظر آتا ہے اور صرف انہیں مآخذ کی مدد سے اس کے عہد کے مشہور واقعات تاریخ وار ترتیب دیے جا سکتے ہیں، کوچم نے یہ مملکت اپنے باپ سے ورثے میں نہیں پائی تھی بلکہ اس نے اپنے پیشرو یادگار Yādigār کو بیدخل کر کے حاصل کی تھی ۱۵۶۳ء تک شاہ سائبیریا کی حیثیت سے یادگار ہی کا ذکر ملتا ہے، البتہ ۱۵۶۹ء میں اس کی جگہ کوچم کا نام نظر آتا ہے۔ ۱۵۸۱ء میں روسی قزاقوں نے یرمک کے زیر قیادت اسکر فتح کر لیا، قزاقوں کی یہ فتح آتشیں اسلحہ کی مرہون منت تھی جن سے سائبیریا میں کوئی شخص واقف نہ تھا۔ کوچم کا بیٹا محمد قلی (مخمت کل) قیدی بنا کر ماسکو بھیجا گیا۔ روسیوں سے اسکر کہیں اس وقت جا کر خالی کرایا جا سکا جب ایک ناگہانی حملے کے دوران میں (۱۵۸۴ء یا ۱۵۸۵ء) میں یرمک مارا گیا۔ لیکن ۱۵۸۷ء میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ فوجی دستے جو اسی زمانے میں وہاں پہنچے تھے اس قصبے کے نزدیک تبولسک (Tobolsk) کا روسی قصبہ تعمیر کر رہے تھے۔ کوچم نے روسیوں سے آخری شکست ۲۰ اگست ۱۵۹۸ء سے قبل نہیں کھائی۔ کہا جاتا ہے کہ نوغای نے جن کے ہاں اس نے جا کر پناہ لی تھی اسے ان حملوں کا انتقام لینے کے لیے ہلاک کر دیا جو اس کے باپ نے ان پر کیے تھے۔ بخارا میں کوچم کی سفارت بھیجے جانے اور سائبیریا میں مذہبی مبلغ بھیجنے کے بارے میں خوارزم میں اس کے عامل عبداللہ خان [ازبک] کے حکم کا ذکر جس دستاویز میں ہے اور جس سے روڈلوف (Rodloff) نے استفادہ کیا ہے (*Aus Sibirien* بار دوم، لائپزگ ۱۸۹۳ء، ص ۱۴۶ ببعد) اسے اصلی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خوارزم اس زمانے میں ایک آزاد مملکت تھا اور بخارا کے ماتحت نہیں تھا۔ روڈلوف (Rodloff) نے اس کے نام کی جو شکل Közüm لکھی ہے وہ بھی کسی تاریخی مآخذ میں نہیں ملتی۔

مآخذ: (۱) Howorth: *History of the Mongols*، ج ۲ لنڈن ۱۸۸۰ء، ص ۹۸۲، نیز وہ روسی تصنیفات جن سے یہاں استفادہ کیا گیا ہے؛ (۲) ہادی اطلاسی: سیبیر تاریخی، ۱۹۱۲ء، ص ۳۶، ۴۶، ۶۴ ببعد اور (۳) تبصرہ از W. Barthold در *Z.f.p.*، ۲۳: ۴۲۱ ببعد۔

(W. BARTHOLD)

* کورانی: (نیز گورانی)، شمس الدین احمد بن اسمٰعیل ملّا، نامور عثمانلی فقیہ اور مصنف ملّا کورانی کردستان کے ایک مقام شہر زور (رک بآں) کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے تعلیم قاہرہ میں پائی جہاں ان کی ملاقات ملّا یکان (یعنی محمد بن ارمغان بن خلیل، دیکھیے طاش کوپری زادہ مجدی: شقائق النعمانیہ، ۱: ۹۹ ببعد؛ سعد الدین ۲: ۳۳۸ ببعد) سے ہوئی۔ وہ انہیں اپنے ساتھ ایشیائے کوچک لے آئے اور سلطان مراد ثانی سے متعارف کرا دیا۔ پہلے پہل وہ قپلیجہ میں اور پھر بروسہ [بورسہ] کی جامع بایزید میں معلّم مقرر ہوئے۔ بعد ازاں ان کے سپرد شہزادہ محمد کی تعلیم کر دی گئی جو آگے چل کر سلطان بنا اور ان دنوں مغنیسہ کا والی تھا دیکھیے (J. von. Hammer: *GOR*، ۲: ۲۴۲ ببعد)۔ جب [سلطان] محمد [ثانی]ؒ تخت نشین ہوا تو ملّا کورانی نے پیش کردہ عہدۂ وزارت لینے سے انکار کر دیا، تاہم قاضی عسکر کا عہدہ قبول کرلیا (۸۵۵ھ/ ۱۴۵۱ء) جب یہ عہدہ ان سے لے لیا گیا تو وہ بروسہ [بورسہ] کے قاضی اور مہتمم اوقاف کی حیثیت سے وہاں چلے گئے، لیکن سلطان کے ساتھ ان کا اختلاف ہو گیا۔ جس سے وہ ہمیشہ بےباکی سے پیش آتے تھے۔ اس پر انہیں برخاست کر دیا گیا، اور وہ واپس مصر چلے گئے جہاں سلطان قائت بے نے بڑے اعزاز و امتیاز سے ان کا خیر مقدم کیا۔ ۸۷۲ھ/ ۱۴۶۷ء میں سلطان محمد ثانیؒ نے انہیں دوبارہ طلب

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کرلیا اور ۸۸۵ھ/۱۴۸۰ء میں استانبول کا شیخ الاسلام مقرر فرمایا۔ یہاں ایک طویل بیماری کے بعد انھوں نے ۸۹۳ھ/۱۴۸۸ء میں وفات پائی۔ سلطان بایزید ثانی نے سرکاری خزانے سے ان کے قرضے ادا کیے جن کی مالیت ۱۸۰۰۰ [ایک لاکھ اسی ہزار] آقچہ ہوتی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ملّا کورانی طویل القامت اور دراز ریش شخص تھے۔ انھیں غلطہ میں یوکسک قالدیرم کے مقام پر انھیں کی تعمیر کردہ مسجد کے صحن میں دفن کیا گیا (دیکھیے حافظ حسین: حدیقۃ الجوامع، ۱: ۲۰۷؛ J. v. Hammer: GOR، ۹: ۸۹، شمارہ ۴۴۵)۔ استانبول کا ایک محلّہ بھی ان کے نام سے منسوب ہے، لیکن بالعموم اس کا تلفظ گورانی کیا جاتا ہے۔ ملّا کورانی نے متعدد نظمیں اور تفسیر کی کتابیں لکھیں جن میں اہم ترین غایۃ الامانی فی تفسیر سبع المثانی اور الکوثر الجاری علی ریاض البخاری ہیں۔ یہ کتابیں البخاری کی کتاب حدیث اور اس کے علاوہ دیگر علوم قرآنی سے متعلق ہیں۔ ملا کورانی مذہباً شافعی تھے، لیکن مراد ثانی کی درخواست پر انھوں نے حنفی مذہب اختیار کر لیا تھا۔

مآخذ: (۱) طاش کوپری زادہ مجدی: شقائق النعمانیۃ، ۱: ۱۰۲ تا ۱۱۱؛ (۲) سعد الدین: تاج التواریخ، ۲: ۴۴۱ تا ۴۴۹ (جہاں متعدد روایات درج ہیں)؛ (۳) بروسلی محمد طاہر: عثمانلی مؤلفلری، ۲: ۳؛ (۴) علمیہ سالنامہ سی، استانبول ۱۳۳۲ھ، ص ۳۳۴ ببعد؛ (۵) J. v. Hammer: G.O.R.، ۱: ۵۳۲، ۲: ۲۴۴، ۵۸۹؛ (۶) Brockelmann: G.A.L.، ۲: ۲۲۸ ببعد (مع ایک فہرست جس میں اس کی بعض تصانیف درج ہیں، محمد طاہر کی مذکورہ کتاب میں ان کی زیادہ تفصیل موجود ہے)؛ (۷) رفعت: ذوحۃ المشائخ، استانبول تاریخ ندارد، ص ۲۰ ببعد؛

(FRANZ BABINGER)

کُور اوغلو: (ترکی: "اندھے کا بیٹا")، ایک مقبول عام رومانی داستان کا ہیرو۔ یہ داستان نثر میں ہے لیکن بیچ بیچ میں اشعار بھی آ گئے ہیں اور اس کے فارسی اور ترکی میں اصلاح شدہ نسخے ملتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کوراوغلو روشان نامی ایک تکّہ قبیلے کا ترکمان اور میرزا صرّاف کا بیٹا تھا جو شاہ عباس ثانی (۱۰۵۱ تا ۱۰۷۷ھ/ ۱۶۴۱ تا ۱۶۶۶ء) کے زمانے میں زندہ تھا۔ کور اوغلو خراسان میں پیدا ہوا اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک اس نے وہیں زندگی بسر کی۔ وادی سلماس (آذر بیجان) میں ابھی تک اس کے بنوائے ہوئے قصر چاملی بل کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ وہ ان قافلوں کو لوٹ لیا کرتا تھا جو ترکی سے ارزروم اور خوی کے راستے ایران جاتے تھے۔ وہ ایران کے ترکمان نسل کے خانہ بدوش قبائل کا قومی بطل ہے۔ اس کے کارناموں کی منظوم داستانیں تہواروں میں سازوں کے ساتھ گائی جاتی ہیں۔ اس کا گھوڑا قراط بھی اس کی شہرت میں شریک ہے، جس نظم میں اس کی موت پر ماتم کیا گیا ہے اس کا شمار ان بہترین مرثیوں میں ہوتا ہے جو آج ہمیں ملتے ہیں۔ جہاں گرد گویّے جو عاشق کے نام سے مشہور ہیں، مداریوں اور نٹوں کے ساتھ مل کر ماورائے قفقاز اور آذر بیجان کے شہروں دیہات اور چھاونیوں میں پھرتے رہتے ہیں اور اس رزمیہ نظم کو ٹکڑوں میں سناتے ہیں جنھیں مجلس کہتے ہیں۔ ان لوگوں کو کوراوغلو خوان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ترکی نظم کی رو سے کوراوغلو کے کارنامے ایشیائے کوچک میں وقوع پذیر ہوئے تھے اور ان کا محل وقوع بولی (قدیم Claudiopolis صوبۂ قسطمونی میں) کے مضافات میں تھا۔

اس کے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حاکم ضلع (فارسی نظم میں سلطان مراد، ترکستان کے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

ایک حصے کا فرمانروا اور ترکی میں بولی کا درہ بیگی) نے اپنے داروغۂ اصطبل کو جو ہمارے ہیرو کا باپ تھا، خراج میں آئے ہوئے گھوڑوں میں سے بہترین گھوڑا لانے کے لیے کہا اور جب وہ ایک مریل سا گھوڑا لے آیا تو اس نے اس حرکت پر غضبناک ہو کر اس کی آنکھیں نکلوا دیں۔ کوراوغلو نے جس علاقے میں اپنے کارنامے دکھائے تھے اس کا رقبہ فارسی نظم میں بہت وسیع بتایا گیا ہے، اس میں یکے بعد دیگرے خراسان، آذربیجان، اریوان، نخچوان، آناطولی، قارص، شام اور مصر شامل کیے جاتے ہیں، لیکن ترکی نظم میں یہ علاقہ بولی کے ضلع سے متجاوز نہیں ہوتا۔

مآخذ: (۱) A. Chodzoko، *Popular Poetry of Persia*، ص ۳ تا ۳۴۴؛ (۲) L. Szamatolski در *Aus türkischer Volks-und kunstdichtung*، برلن ۱۹۱۳ء، ص ۸ تا ۲۶۔

(C. L. HUART)

کُور دُفان: مصری سوڈان کا ایک صوبہ جو تقریباً ۱۶° اور ۱۰′ عرض بلد شمالی اور ۳۲° اور ۲۷′ طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے عرب مؤرخین یا جغرافیہ نگاروں میں سے کسی کے ہاں بھی لفظ کُور دُفان یا جیسا کہ اکثر مقامی طور پر بولا اور قدیم دستاویزات میں لکھا جاتا ہے، کور دُفال نہیں ملتا۔ عموماً گمان گزرتا ہے کہ اس نام کو اسی نام کی ایک چھوٹی سی پہاڑی سے نسبت ہے جو العُبَید (۱۳°-۱۱′ عرض بلد شمالی، ۳۰°-۱۴′ طول بلد مشرقی) سے ۱۰ میل جنوب مشرق میں واقع ہے، لیکن اس لفظ کے معنوں کے متعلق، کس زبان سے یہ نکلا ہے اور گزشتہ صدی سے قبل کن علاقوں پر اس کا اطلاق ہوتا تھا، ان باتوں کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مآخذ: (۱) Mac-Michael: *The tribes of Northern and Central Kordofan*، ۱۹۱۲ء اور (۲) *A History of the Arabs in the Sudan*، ۱۹۲۲ء، میں قدیم ادب کے مآخذ کے علاوہ ایسا نیا مواد کافی مقدار میں موجود ہے، جس سے عربوں کے دور پر خاص طور سے روشنی پڑتی ہے؛ (۳) Meinhof نے *Eine Studien fahrt nach Kordofan*، ہامبورگ ۱۹۱۶ء، میں جنوبی علاقوں کی زبانوں کے بارے میں جو حالیہ تحقیقات ہوئی ہے، اس کا ملخص دیا ہے، اور دوسری باتوں کے علاوہ اس نظریے کی تردید کی ہے کہ نوبیائی گروہ سے تعلق رکھنے والی زبانیں حال ہی میں وجود میں آئی ہیں، کیونکہ اس نے بتایا ہے کہ عیسائی مذہب کی اشاعت سے قبل، جس کے باعث یونانی اور قبطی زبانوں کے مستعار الفاظ یہاں کی زبانوں میں داخل ہوئے تھے، جنوبی گروہ لازمی طور پر دریائے نیل والے گروہ سے علٰحدہ ہو چکا ہوگا، اس سلسلے میں دیکھیے نیز (۴) حکومت سوڈان کی سرکاری مطبوعات و مقالات از C. G. و B. Z. Seligman در *Harvard African Studies*، ۱۹۱۸ء؛ و در (۵) Hastings کی *Encyclopaedia of Ethics*، وغیرہ بذیل مادۂ نوبہ؛ و در (۶) *JRAI*، بابت ۱۹۱۰ء و در (۷) *Zeitschrift für kolonialsprachen*، ۱۹۱۰ء؛ اور (۸) وہ مختلف تبصرے جو ۱۹۱۸ء اور اس کے بعد کے *Sudan Notes and Records* میں، Mac-Michael، Newbold، Davies Hillelson the Seligmans، اور دوسرے لوگوں نے لکھے ہیں۔

(J. W. CROWFOOT [و تلخیص از ادارہ])

کوڑا: [بھارت] ایک قدیم زوال یافتہ بستی جو شمالاً ۲۶ درجے، ۷ دقیقے، اور شرقاً ۸۰ درجے ۲۲ دقیقے، پر آگرے سے الٰہ آباد جانے والی قدیم شاہراہ پر واقع ہے اور آج کل بھارت کے اتر پردیش کے ضلع فتح پور کا ایک قصبہ ہے۔ سلاطین دہلی کے عہد میں کوڑا ایک صوبے کا صدر مقام تھا اور

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

(شہنشاہ) اکبر کے زمانے میں صوبۂ الٰہ آباد کی ''سرکار'' کا صدر مقام۔

اکبر کا ایک تانبے کا سکہ کوڑا کی ٹکسال کا بتایا جاتا ہے، متأخر مغل بادشاہوں کے دور میں بھی رفیع الدّرجات کے عہد سے کوڑا میں ٹکسال موجود تھی۔

* مآخذ: *District Gazetteer of United Provinces of Agra and Oudh*، الٰہ آباد ۱۹۰۶ء، ۲۰: ۱۵۴، ۱۵۷-۱۵۸، ۲۵۱ ببعد۔

(R. B. WHITEHEAD)

* **کوزہ گری**: رک بہ فن۔

* **کوسم والدہ**: نیز جو ماہ پیکر بھی کہلاتی ہے، عثمانلی خاندان کے سلطان احمد الاول (رک بآں) کی بیوی اور سلطان مراد چہارم اور سلطان ابراہیم الاوّل کی ماں تھی۔ کوسم (لغوی معنی ''سب سے آگے چلنے والی بھیڑ، ''جرنی'') یا ماہ پیکر نسلاً یونانی تھی۔ ۱۶۳۷ء میں اس کی عمر تقریباً ۴۵ برس کی تھی اور اس اعتبار سے وہ ۱۵۹۲ء کے قریب پیدا ہوئی ہوگی۔ معاصر تذکرہ نگاروں نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک ایسی عورت تھی جس کا حسن ادھیڑ عمر میں بھی قائم تھا۔ اس کے خد و خال دلکش تھے، خوب چاق چوبند نظر آتی تھی اور چہرے سے کریم النفسی اور اعلیٰ ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔ تقریباً تیس سال تک ملک کی حکومت پر اس سیاست دان سلطانہ کا بے حد اثر رہا۔ وہ اپنے خاوند سلطان احمد الاول کی زندگی میں بھی کاروبار حکومت میں عملی طور پر حصہ لیتی رہی تھی۔ وہ اپنی پروقار وجاہت اور ذہانت کی وجہ سے سرکاری کاروبار چلا سکتی تھی اور پھر آگے چل کر جب اس کا نابالغ بیٹا مراد چہارم تخت نشین ہوا تو اس نے عنان حکومت بڑی مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لی۔ پانچ برس تک وہ اس کے سرپرست کی حیثیت سے حکمران رہی۔ جب ۱۰۴۹ھ/۱۶۴۰ء میں مراد کے انتقال پر بزدل اور زنانہ مزاج ابراہیم الاول (۱۶۴۰ء تا ۱۶۴۸ء) تخت نشیں ہوا تو کوسم والدہ داخلی مشکلات کو دور کرنے میں سرگرم رہی۔ اس نے کریٹ [اقریطش] کی جنگ شروع کرا دی۔ اس جنگ نے طول کھینچا اور نالائق سلطان عوام میں روز بروز غیر مقبول ہوتا چلا گیا۔

کوسم والدہ نے اسے معزولی سے بچانے کی کوشش کی جو ناکام ہوئی، اگرچہ اس نے سلطانہ کو بالکل بیدخل کر دیا تھا جیسا کہ اس سے پہلے مراد رابع نے کیا تھا۔ ۸۔ اگست ۱۶۴۸ء/۱۸۔ رجب ۱۰۵۸ھ کو ابراہیم معزول کیا گیا اور چند دن بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ تین سال بعد جب نابالغ محمّد چہارم تخت نشین ہوا، تو عمر رسیدہ والدہ کوسم اور ابراہیم کی بیوہ تُرخان خدیجہ کے درمیان رقابت پیدا ہو گئی جس کے دوران میں کوسم پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے سلطان کے بھائی سلیمان کو تخت دلانے کے لیے محمد چہارم کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے، آخر کار ینی چریوں کی ایک بغاوت میں جو ۱۶ رمضان ۱۰۶۱ھ/۲ ستمبر ۱۶۵۱ء کو محل میں برپا ہوئی اسے بڑے الم ناک انجام کا سامنا کرنا پڑا، یعنی ایک پردے کی ڈوری سے اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ وہ اپنے شوہر کے پہلو میں دفن کی گئی۔ ترکوں کے دلوں میں کوسم والدہ کی یاد آج تک تازہ ہے اور وہ اس کا بڑا احترام کرتے ہیں کیونکہ اس نے متعدد اداروں کی بنا رکھی تھی اور ان کی وجہ سے اس کا نام اب تک زندہ ہے۔ وہ ایک شریف النفس اور عالی ہمت خاتون تھی۔ اس میں ایک ملکہ کے اوصاف حقیقی معنوں میں موجود تھے۔ وہ انتہائی ذہین، نیک دل، اور بڑی مضبوط سیرت کی مالک تھی۔ اس نے پانچ شاہی جاگیروں کی ساری سالانہ آمدنی جو اس کی واحد ملکیت تھیں، حسب ذیل کاموں

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کے لیے وقف کر دی تھیں : ایک سرائے کی تعمیر جو اس کے نام سے موسوم تھی (والدہ خان، جو ۲۱ مارچ ۱۹۲۶ء کو منہدم ہو گئی)، سقوطری میں اپنے نام کی ایک جامع مسجد کی تعمیر، استانبول میں ایک اور مسجد (والدہ جامعی) کی تعمیر جو اس نے شروع کی تھی، لیکن اسے والدہ کوچک نے مکمل کرایا، مصر میں آب رسانی، مکے میں غربا کی امداد، ایسے مقروضین کے قرضے کی ادائی جو خود ادا کرنے کے قابل نہ ہوں، اور بیواؤں اور یتیموں کی امداد کے انتظامات کیے ۔ (نعیما : تاریخ، ۲ : ۲۹۸، ۳۱۰؛ J. v. Hammer : G.O.R.، ۵ : ۵۴۷، جہاں اس کے خیراتی کاموں کی تفصیلات درج ہیں)۔

مآخذ : (۱) J. v. Hammer اور (۲) Zinkeisen کی تواریخ، جن میں عثمانلی (خصوصاً نعیما اور حاجی خلیفہ) اور یورپی مآخذ (وینس کے baili کی *Relazioni*) سے استفادہ کیا گیا ہے؛ نیز دیکھیے (۳) احمد رفیق : قادینلر سلطنتی، ۲ جلد، استانبول ۱۳۳۲ھ اور ۱۹۲۴ء۔

(FRANZ BABINGER)

کوسہ میخال : (ترکی : میخالِ بے ریش)، عثمانلی سپہ سالار جو ایک نو مسلم یونانی تھا ۔ جب والی اینونو In. Önü کے ایک دھاوے کے دوران (۶۹۸ھ / ۱۲۹۹ء) میں شہزادۂ عثمان نے جو بعد ازاں سلطان بنا، اسے گرفتار کیا تو اس وقت وہ اماسیہ (Mysia) میں ادرنہ کی مشرقی جانب کوہ اولمپس کے دامن میں ایک مستحکم شہر خرمن قیا کا والی تھا ۔ جب عثمانلی اپنے باپ ارطغرل کا جانشین ہوا تو کوسہ میخال کو سلطان کے بے تکلف دوست کی حیثیت حاصل ہو گئی، چنانچہ اسی کے مشورے پر سلطان نے لفکہ، بنیجہ، آق حصار، گیوہ، تکنور بنار، مودرنی، بیلہ جک پر قبضہ کیا (۶۹۹ھ / ۱۳۰۰ء) ۔ جب کوسہ میخال مشرف باسلام ہو گیا (۷۰۶ھ / ۱۳۰۶ء) تو اور خان کی مہمات کا انتظام اس کے سپرد کیا گیا ۔ نوجوان شہزادے کے ساتھ جنگی معاملات کے لیے جو مجلس شوری تھی وہ اس کا ایک رکن تھا اور اسی نے سقوط بروسہ کے بارے میں گفت و شنید کی تھی (۷۲۶ھ / ۱۳۲۶ء) ۔

اس کی اولاد میخال اوغلو (میخال کے بیٹے) کے نام سے مشہور ہوئی اور ایک عرصے تک آقنجی (scouts) کی قیادت ان کے ہاں باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی رہی ۔ اس کے ایک بیٹے نے بایزید اوّل کے بیٹے شہزادۂ سلیمان کا ساتھ دیا، لیکن بعد ازاں اپنی خدمات محمد کو پیش کر دیں ۔

کوسہ میخال کے دوسرے بیٹے یخشی بیگ نے موسی کے مقابلے میں محمد کی حمایت اور اس کے ہراول دستے کی کمان کی ۔ اس کے برعکس ایک میخال اوغلو محمد بیگ جو یخشی بیگ کا بھتیجا تھا اور روم ایلی کے بیگلر بیگ کی حیثیت سے موسی کی جماعت میں شامل تھا، شہزادۂ مذکور کی شکست کے بعد توقاد کے مقام پر گرفتار ہوا اور پھر ۹۲۷ھ / ۱۵۲۱ء میں ہنگری والوں کے خلاف سلیمان اول کی مہم کے دوران میں کوسہ میخال ہی کی نسل کے ایک شخص کو ٹرانسلوینیا کو تاخت و تاراج کرنے کے لیے بھیجا گیا ۔

مآخذ : (۱) سعد الدین : تاج التواریخ، قسطنطنیہ ۱۲۷۹ھ، ص ۱۹، ۲۴، ۲۸؛ (۲) قرہ چلبی زادہ : روضۃ الابرار، بولاق ۱۲۴۸ھ، ص ۳۴۱؛ (۳) سامی بے : قاموس الاعلام، ۵ : ۳۹۲۱؛ (۴) J. v. Hammer : *Hist. de l'Empire Ottoman*، ترجمۂ Hellert، ۱ : ۶۴، ۷۷، ۱۰۲، ۱۲۹، ۱۴۷، ۲ : ۱۴۳، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۶، ۵ : ۱۰۔

(CL. HUART)

کوشک : (فارسی لفظ کوشک کا ترکی تلفظ؛

www.besturdubooks.wordpress.com

اس کا عربی مشتق جوسق ہے جس میں اس لفظ کی ایک غیر مصدقہ شکل گوشک یا گوشہ بمعنی کونا مضمر ہے)؛ کسی کشادہ باغ میں بنی دوئی ایک الگ تھلگ سی عمارت ۔ خلفا کے دیہاتی محلات (ان کے شہری محلات کے مقابلے میں) اس نام سے پکارے جاتے تھے ، مثلاً سامرا کا جوسق الخاقانی، جس کا نقشہ Herzfeld نے دیا ہے (*Mitteilung über die Arbeiten der Zweiten Kampagne von Samarra*، در *Isl.*، ۱۹۱۴ء، ۵ : ۲۰۳) ۔ قاہرہ میں گورستان القرافہ میں اس قسم کے چند ایک کوشک موجود تھے، جنھیں قصر (جمع : قصور) بھی کہا جاتا تھا (المقریزی : خطط، ۲ : ۴۵۲) ۔ یہ دونوں الفاظ مترادف ہیں جیسا کہ ابن بطوطہ، ۳ : ۲۱۲، کی ایک عبارت سے ظاہر ہوتا ہے ۔

(Cl. Huart)

* **کوطه** : رک بہ کوتله ۔

* **الکوفه** : ایک زمانے میں بہت مشہور و معروف شہر تھا، بابل کے کھنڈروں کے جنوب میں، دریاے فرات [رک بہ الفرات] کی مغربی شاخ کے کنارے، جو آگے چل کر ان دلدلوں میں غائب ہوجاتی ہے جو واسط کے مغرب میں ہیں ۔ جنگ قادسیہ [رک بآں] کے بعد حضرت عمرؓ کے حکم سے عربوں نے یہاں ایک مضبوط اور دفاعی اعتبار سے مستحکم چھاؤنی تعمیر کی تاکہ نئے نئے مفتوحہ صوبوں کے لوگوں کو زیادہ آسانی سے قابو میں رکھا جاسکے ۔ یہ نو آبادی جسے الکوفہ کا نام دیا گیا، اور البصرہ [رک بآں] جو اس سے کچھ پہلے کی بستی تھی ان دونوں کو فوجی اسباب کی بنیاد پر دریا کے مغربی کنارے پر بسایا گیا تاکہ دارالخلافہ مدینہ اور ان فوجی مرکزوں کے درمیان حمل و نقل پر طبعی رکاوٹیں اثر انداز نہ ہو سکیں ۔ بصرہ تو ایسی جگہ آباد کیا گیا جہاں پہلے ہی ایک گاؤں الخُرَیبۃ موجود تھا، چنانچہ کچھ عرصے بعد یہ گاؤں بصرے کے مضافات میں شامل ہوگیا لیکن کوفہ بالکل نئی آبادی تھی جس کی بنیاد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے بعض مؤرخین کی رائے میں ۱۷ھ/ ۶۳۸ء میں رکھی تھی، مگر بعض کا خیال ہے کہ یہ ۱۸ھ بلکہ ۲۹ھ سے قبل نہیں رکھی گئی تھی ۔ عربی لفظ کوفہ کے عام معنی ہیں ''ریت کا گول ٹیلا''۔ لہٰذا اس نام سے پتا چلتا ہے کہ شہر کا قدیم ترین حصہ اسی نوع کی بلندی پر بسایا گیا ہوگا ۔ بہر حال اس کی کچھ اور توجیہات بھی پیش کی جاتی ہیں (دیکھیے یاقوت، ۴ : ۳۲۲)۔ عرب جغرافیہ نگاروں کی رو سے کوفہ دریاے فرات کے کنارے ایک وسیع میدان کے بہت بڑے رقبے میں پھیلا ہوا تھا ۔ اس کا محل وقوع بصرے سے زیادہ صحت افزا سمجھا جاتا تھا ۔ قرب و جوار کے علاقے کی اہم پیداوار کھجور، نیشکر اور کپاس تھی ۔ جوں جوں عرب مشرق کی جانب بڑھتے گئے، کوفے کی اہمیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا ۔ وہاں کے سپہ سالار عساکر کو امیرالمؤمنین کے سیاسی نمائندے کی حیثیت بھی حاصل ہوتی تھی اور وہاں کا نظم و نسق بھی وہی سنبھالتا تھا ۔ ان دونوں نئے شہروں یعنی کوفے اور بصرے کے والی عموماً علٰحدہ علٰحدہ ہوا کرتے تھے، لیکن بعض اوقات ان کا ایک دوسرے کے ساتھ الحاق بھی کر دیا جاتا تھا ۔ اس بارے میں رک بہ العراق ۔ حکمران عربوں اور ان کی ایرانی رعایا کے نزدیک کوفہ رفتہ رفتہ بہت اہم ہوگیا ۔ اسی اعتبار سے یہاں کی آبادی بھی بڑی تیزی سے بڑھنے لگی ۔ عرب سپاہیوں کے علاوہ سوداگروں، کاریگروں اور دوسرے مزدوروں کے خاندان جو بیشتر ایرانی النسل تھے، یہاں بڑی تعداد میں آباد ہو گئے ۔ ابتداءً یہ چھاؤنی محض خیموں اور قدیم وضع کی سکونت گاہوں

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

پر مشتمل تھی۔ ایک مسجد اور چند دوسری سرکاری عمارتیں بھی تھیں، مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہاں پڑاؤ مستقل ہو گیا اور کچے گھر بن گئے، بالآخر (عام بیانات کی رو سے) زیاد بن ابیہ کے عہد ولایت میں (یعنی تقریباً ۵۰ھ/۶۷۰ء کے بعد) ایک باقاعدہ شہر خشتی مکانوں سے تعمیر کیا گیا۔ کوفے کے باشندے کچھ تو مختلف عرب قبائل کے افراد تھے، خصوصاً جنوبی عرب کے بدوی اور کچھ ایرانی عناصر تھے۔ ان کی عسکری قابلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں کوفیوں کو اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں اور ان کارناموں کے باعث جو انھوں نے علوم اسلامی کے میدان میں سرانجام دیے، ایک خاص امتیاز حاصل ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی کردار کے اعتبار سے وہ متلوّن مزاج اور ناقابل اعتبار تھے۔ یہی چیز آگے چل کر سیاسی زندگی کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہوئی اور بڑی حد تک ان خانہ جنگیوں کا سبب بنی جو خلافت کے خوش‌آئند ارتقا میں سد راہ بنیں۔ خود حضرت عمرؓ جن کی وجہ سے یہ شہر وجود میں آیا تھا، کوفیوں کی سرکشی سے ناخوش تھے۔ یہ لوگ کبھی مطمئن نہیں ہوتے تھے اور خلیفہ کے مقرر کردہ عامل کی ہمیشہ کوئی نہ کوئی شکایت کرتے رہتے تھے۔ جب بھی حضرت عمرؓ ان کی خواہشات کی پذیرائی کرتے، ان کے مطالبات زیادہ ناقابل برداشت ہو جاتے، حتی کہ اپنے عہد خلافت کے آخری چھے سال میں انھیں تین بار کوفے کے عامل بدلنے پڑے۔ حضرت عثمانؓ کی مخالفت میں جو سازش خفیہ طور پر مدت سے ہو رہی تھی، جب ۳۴ھ / ۶۵۵ء میں آشکار ہوئی تو سب سے پہلے کوفیوں ہی نے حضرت علیؓ کی بیعت کا اعلان کیا۔ ۳۶ھ / ۶۵۶ء میں جنگ جمل ہوئی اور حضرت علیؓ اپنے مخالفوں کی متحدہ فوجوں پر غالب آنے کے بعد کوفے چلے گئے تو یوں معلوم ہونے لگا کہ یہی شہر اب دارالخلافہ بن جائے گا، لیکن جب صفین کے میدان میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا مقابلہ ہوا تو عراقی شامیوں سے مات کھا گئے۔ حضرت علیؓ کے ہاتھوں فتح ہوتے ہوتے رہ گئی، کیونکہ عین اس وقت جب آپ کی گرفت مضبوط تھی اور آپ نے تحکیم پر رضامندی کا اعلان فرما دیا تھا، خوارج آپ کا ساتھ چھوڑ گئے۔ ۴۰ھ / ۶۶۱ء میں حضرت علیؓ کو دغا سے شہید کر دیا گیا تو کوفی مجبور ہو گئے کہ حضرت معاویہؓ کو امیر المؤمنین تسلیم کر لیں۔ نئے خلیفہ کے اولوالعزم عامل پہلے زیاد بن ابیہ اور پھر ان کا فرزند عبیداللہ جسے ۵۵ھ/۶۷۴-۶۷۵ء میں بصرے کا امیر بنایا گیا تھا اور پھر حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد کوفہ بھی اسی کے تحت کر دیا گیا، ان دونوں نے بڑے تدبر کے ساتھ فتنہ جو کوفیوں کو قابو میں رکھا۔ جب حضرت حسینؓ بن علیؓ نے اپنے بہت سے عراقی پیروؤں کی التجا قبول کرنے کا فیصلہ کیا اور مکۂ مکرمہ سے کوفے روانہ ہوئے، تو عبیداللہ کے زبردست اقدامات کی وجہ سے کوفیوں کے باغیانہ رجحانات بڑی آسانی سے دبا دیے گئے۔ محرم ۶۱ھ / اکتوبر ۶۸۰ء میں حضرت حسینؓ نے کربلا میں جام شہادت نوش فرمایا۔ دوسرے اموی خلیفہ یزید الاول کی موت کے بعد ایک بار پھر خانہ جنگی ہوئی۔ چونکہ حضرت علیؓ کے چھوٹے بیٹے حضرت محمد بن الحنفیہ کوفے کی شیعی جماعت کی قیادت قبول کرنے پر تیار نہیں تھے، اس لیے کوفیوں نے حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کی بیعت کر لی۔ اس وقت حضرت عبداللہؓ کی خلافت کا اعلان سارے حجاز میں ہو چکا تھا اور کئی برس تک اموی حکمران مروان اور ان کے بیٹے عبدالملک کے ساتھ خلافت کے بارے میں ان کا جھگڑا چلتا رہا۔ ۶۶ھ / ۶۸۵ء میں ایک بیباک

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

طالع آزما مختار بن ابی عبیدؓ [رک بآں] کوفے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اب ایک مستقل دہشت انگیزی کا دور دورہ شروع ہوا۔ جو تقریباً ڈیڑھ سال جاری رہا؛ یہاں تک کہ عرب آبادی نے مصعب بن زبیر سے مدد کی درخواست کی جنھیں ان کے مدعی خلافت بھائی عبداللہ بن زبیر نے بصرے کا عامل مقرر کیا ہوا تھا۔ کوفے کے نزدیک جنگ حروراء [رک بآں] (۶۷ھ / ۶۸۷ء) میں مختار شکست کھا کر مارا گیا۔ مصعب نے باغیوں سے سخت انتقام لیا۔ الغرض عراق کی سیاسی تاریخ کی تشکیل میں عربوں اور ایرانیوں کے اختلاف کی بہ نسبت مختلف عرب قبائل کے موروثی مجادلات نے زیادہ اہم حصہ لیا۔ جب مصعب امویوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے (۷۲ھ / ۶۹۱ء) تو کوفے کو سر اطاعت خم کرنا پڑا اور خلیفہ عبدالملک بلا مخالفت شہر میں داخل ہو گئے۔ ۷۵ھ / ۶۹۴ء سے ۹۵ھ / ۷۱۳ء تک سارے عراق کا نظم و نسق حجاج بن یوسف [رک بآں] کے پر زور ہاتھوں میں رہا۔ اس نے ہر قسم کی مقاومت کو ختم کرنے کے لیے واسط میں ایک نیا دارالحکومت قائم کیا جہاں سے وہ کوفہ اور بصرہ دونوں کو قابو میں رکھ سکتا تھا۔ خالد بن عبداللہ القسری کے طویل دور ولایت (۱۰۵ تا ۱۲۰ھ / ۷۲۳ تا ۷۳۸ء) میں عام طور سے عراق میں امن و آسودگی کا دور دورہ رہا، لیکن ۱۲۷ھ / ۷۴۵ء میں خوارج نے کوفے پر قبضہ کر لیا اور انھیں نکال باہر کرنے میں خلیفہ مروان ثانی کی فوجوں کو دو برس لگ گئے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد بنو عباس میدان میں نمودار ہوئے۔ خراسان کے اموی عامل نصر بن سیّار کو شکست ہوئی اور ۱۳۲ھ / ۷۴۹ء میں کوفے کے اندر وہ بغاوت پھوٹ پڑی جس کی ایک مدت سے تیاری ہو رہی تھی۔ عباسیوں کو شہر پر قبضہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ کوفہ دارالخلافہ بنایا گیا اور اسے تقریباً بیس برس تک یہ حیثیت حاصل رہی۔ اگرچہ اس دوران میں عباسی فرمانرواؤں نے کوفے کے بجائے زیادہ تر اپنی سکونت یا تو ہاشمیہ میں رکھی جو فرات کے کنارے کوفے سے کچھ دور شمال میں ہے یا پھر انبار میں۔ بعدازاں جب بنوعباس کے دوسرے خلیفہ المنصور نے نئے دارالخلافت بغداد [رک بآں] کی بنیاد رکھ دی تو کوفے کی اہمیت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ بہر کیف کافی مدت تک اسے خاصی بڑی چھاؤنی کی حیثیت حاصل رہی اور علمی مرکز ہونے کی شہرت بھی۔ یہ شہرت یہاں کے باشندے دوسری صدی ہجری کے نصف اول ہی میں حاصل کر چکے تھے اور انھوں نے اسے پانچویں صدی ہجری تک قائم رکھا، مگر سیاسی حالات تبدیل ہو چکنے کے باوجود کوفیوں کے دلوں میں علویوں کی ہمدردی نئی نئی تحریکوں میں شریک ہونے کے پرانے اشتیاق اور باغیانہ رجحانات میں کمی نہ آئی، چنانچہ ۱۹۹ھ / ۸۱۵ء میں حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ایک شخص محمد بن ابراہیم جو ابن طباطبا کے نام سے بھی مشہور ہے کوفے میں نمودار ہوا اور اپنا دعوائے خلافت تسلیم کرانے کی کوشش کی۔ والی کو شہر سے نکال دیا گیا اور بہت سے معتقد مدعی خلافت کے گرد جمع ہو گئے۔ اگرچہ اس کا انتقال اسی سال ہو گیا، مگر یہ خطرناک بغاوت بڑی کوششوں سے فرو ہو سکی۔ المستعین [رک بآں] کے عہد میں علویوں نے ایک بار پھر کوفے میں اختلال پیدا کیا۔ ۲۵۰ھ / ۸۶۴-۸۶۵ء میں یحییٰ بن عمر العلوی نے ہر قسم کے اراذل و انفار کو ساتھ لے کر حکومت کے خلاف بغاوت برپا کر دی، عامل کو فرار ہونا پڑا اور بغاوت بڑی تیزی سے پھیل گئی، تاہم بہت جلد امن و امان قائم ہو گیا۔ کچھ

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

عرصے بعد اس شہر میں جو ہمیشہ سے شورش پسند چلا آ رہا تھا ایک اور علوی نے حکومت قائم کر لی، مگر اس کا عہد بھی قلیل المیعاد ثابت ہوا۔ ۲۵۶ھ/۸۷۰ء میں علی بن زید نے کہ وہ بھی اسی طرح آل علی میں تھا، کوفے میں خلافت کا دعوی کیا اور عامل کو نکال دیا۔ بعد ازاں اس نے شاہی افواج کے سپہ سالار الشاہ بن میکال کو شکست فاش دی جو اسے کچلنے کے لیے بھیجا گیا تھا، لیکن جب نئی فوج نے پیش قدمی کی تو اسے کوفہ خالی کرنا پڑا۔ جب قرامطہ نے مغربی عراق اور شام کو تاخت و تاراج کیا تو کوفہ بھی نہ بچ سکا۔ ۲۹۳ھ/۹۰۶ء میں یہ لوگ شہر میں داخل ہوئے اور پھر ۳۱۲ھ/۹۲۴-۹۲۵ء میں قرامطہ کے مشہور قائد ابو طاہر نے فتح کر کے اسے تاراج کر دیا۔ اسی طرح ۳۱۵ھ/۹۲۷ء اور ۳۲۵ھ/۹۳۷ء میں بھی وہ غارت ہوا۔ چوتھی صدی میں تیزی کے ساتھ خلافت کے انحطاط سے کوفے پر بھی زوال آیا۔ اگرچہ آل بویہ نے جو ۳۳۴ھ/۹۴۵ء میں دارالخلافت بغداد پر قابض ہونے کی وجہ سے سیاسی اقتدار حاصل کر چکے تھے، شیعہ ہونے کے باعث کوفے یا یوں کہنا چاہیے کہ اس کی نواحی آبادی نجف کی بہبود میں خاص دلچسپی لی تھی؛ کیونکہ روایت کے مطابق نجف میں مزارات مقدس واقع تھے، لیکن وقت کے ساتھ آل بویہ کی قوت بھی کمزور پڑ گئی۔ ۳۷۵ھ/۹۸۵-۹۸۶ء میں قرامطہ نے ایک بار پھر کوفے پر قبضہ کر لیا اور گیارہ برس بعد بہاء الدولہ [رک بآں] نے دوسرے مقامات کے ساتھ اسے بھی بطور جاگیر المقلّد بن المسیّب کو عطا کر دیا۔ بعد ازاں یہ بنو مزید کے قبضے میں آیا، لیکن جب ان لوگوں نے ۴۹۵ھ/۱۱۰۱-۱۱۰۲ء میں اس کے شمال میں اپنا نیا دارالحکومت حلّہ تعمیر کر لیا اور تیزی کے ساتھ وہاں رونق بڑھنے لگی تو پرانا دارالحکومت رفتہ رفتہ ہر قسم کی اہمیت سے محروم ہوتا چلا گیا۔ کوئی ۹۰ برس بعد جب ابن جبیر یہاں پہنچا ہے تو قدیم دیواریں گرائی جا چکی تھیں اور زوال کے دوسرے آثار بھی کوفے میں ہویدا تھے۔ عہد مغول کے بعد تو وہ سرعت کے ساتھ زاویۂ خمول میں چلا گیا۔ ابن بطوطہ جب اپنی سیاحت کے دوران میں یہاں آیا ہے تو اس کا بیشتر حصہ ویران ہو چکا تھا۔ اس کا بڑا سبب قرب و جوار کے بنو خفاجۃ کے بدویوں کی ترکتاز تھی، البتہ اس کی تحریروں سے اتنا پتا ضرور چلتا ہے کہ یہاں کی مسجد اس وقت تک اچھی حالت میں محفوظ تھی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی بنائی ہوئی قدیم سرکاری عمارات میں سے (قصرالامارۃ) کی محض بنیادیں باقی رہ گئی تھیں۔ اس کے انحطاط کی توثیق حمد اللہ مستوفی قزوینی کی کتاب نزھۃ القلوب سے بھی ہوتی ہے جو ۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء-۱۳۴۰ء میں لکھی گئی تھی۔ ایام ما بعد میں ہمیں صرف نجف کا ذکر ملتا ہے جو اس کے نواح میں واقع تھا اور جسے ایک شیعی زیارتگاہ کی حیثیت سے اہمیت حاصل رہی۔ آج کل اسے عموماً مشہد علی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کوفے کے قرب و جوار کے بارے میں Neibhur نے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:

''ارد گرد کا سارا علاقہ صحرا ہے اور شہر میں کسی قسم کی آبادی نہیں۔ یہاں کی سب سے زیادہ قابل ذکر چیز وہ جامع مسجد ہے جہاں حضرت علیؓ کے زخم کاری لگا تھا، لیکن اب اس کی بھی صرف چار دیواری ہی باقی رہ گئی ہے۔''

عربی لسانیات کے سلسلے میں کوفی علما نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کے بارے میں رک بہ عرب (ادبیات)۔ کوفے کے فرخندہ ترین ایام میں بصرے کی طرح علوم اسلامیہ کے دوسرے شعبوں میں بھی وہاں خاصی سرگرمی کا اظہار کیا جاتا تھا،

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

خصوصاً ۶۳ھ/۶۸۳ء کے بعد سے جب جنگ حرۃ ہوئی اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے کئی پرانے صحابی جو روایات اسلامیہ میں سند سمجھے جاتے تھے، نقل مکانی کر کے عراق آئے اور یہاں کے اہم ترین شہروں میں سکونت پذیر ہو گئے، ان راویانِ حدیث میں سے یہاں صرف دو کا ذکر کافی ہے، یعنی مشہور و معروف عبداللہ بن مسعود کا جو السابقون الاوّلون میں سے ہیں اور جنھیں اہل کوفہ کا رہبر و معلم بنا کر بھیجا گیا تھا اور عامر بن شَرَاحِیل الشَّعْبی (م تقریباً ۱۰۴ھ/۷۲۲ء) بھی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ [کوفے کے اعاظم رجال میں امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) اور محمد بن العلاء بن کُرَیب الھمدانی الکوفی (م ۲۴۳ھ) بھی قابل ذکر ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ فقہ حنفی کے بانی و امام ہیں اور اسلامی دنیا کی اکثریت ان کی فقہ پر عامل ہے۔ ابن کریب کا شمار حفّاظ حدیث میں ہے۔ ان سے صحاح ستّہ کے مؤلفین نے حدیث کی روایت کی ہے]۔

مآخذ (۱) *B.G.A.* (سلسلۃ جغرافیۃ العربیہ)، طبع de Goeje، ۱: ۲۷، ۷۹، ۸۲، ۸۵؛ ۲: ۳۴، ۱۵۷ ببعد، ۱۶۲ ببعد، ۱۶۶، ۲۱۱، ۲۱۳؛ ۳: ۳۳ ببعد، ۵۳، ۶۰، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۲۵ ببعد، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۳ تا ۱۳۵، ۲۵۹، ۲۹۳، ۳۱۶؛ ۵: **بالخصوص** ۱۶۲ تا ۱۸۷؛ ۶: ۱۲۵، ۱۲۹، ۱۷۴، ۲۳۳؛ ۷: ۱۷۳ ببعد، ۱۷۷، ۱۸۰، ۱۸۲، ۲۵۱، ۲۶۳، ۳۰۸ تا ۳۱۱؛ ۸: بمواضع کثیرہ؛ (۲) ابن جبیر، رحلۃ، بار ثانی طبع Wright و de Goeje، ص ۲۱۱ تا ۲۱۳؛ (۳) یاقوت، طبع Wüstenfeld، ۴: ۳۲۲ تا ۳۲۷؛ (۴) ابوالفداء: تقویم، طبع Reinaud و Guyard، دیکھیے اشاریہ؛ (۵) البلاذری، طبع de Goeje، بالخصوص ص ۲۷۵ تا ۲۸۹؛ (۶) ابن سعد: طبقات، ۶: ۱ تا ۶؛ (۷) الطبری، طبع de Goeje، رک بہ اشاریہ؛ (۸) ابن الاثیر: الکامل، طبع Tornberg بمواضع کثیرہ؛ (۹) ابن بطوطہ: الرحلۃ، طبع پیرس، ۲: ۹۳ تا ۹۶؛ (۱۰) حمداللہ مستوفی قزوینی: نزھۃ القلوب، طبع Le Strange، ص ۳۰ تا ۳۳، ۱۶۶، ۲۱۰؛ (۱۱) Niebuhr: *Reisebeschreibung*، ۲: ۲۶۱ ببعد؛ (۱۲) Le Strange: *The Lands of Eastern Caliphate*، ص ۳، ۲۱، ۲۵ ببعد، ۴۷ ببعد، ۸۱ تا ۸۳؛ (۱۳) Caetani: *Annali dell' Islam*، دیکھیے اشاریہ۔

(K.V. ZETTERSTEEN)

کُوفِیَّة: (شام کی مقامی بولیوں میں کِفیّہ، Guche: *Dict*، ص ۵۷۷؛ Burckhardt: *Notes on the Bedouins* ص ۲۷؛ G. Fesquet: *Voyage en orient*، ص ۱۸۵) - یہ عربی لفظ لاطینی نژاد (Romance) زبانوں سے مأخوذ ہے (اطالوی: cuffia؛ ہسپانوی: cofia؛ پرتگالی coifa؛ فرانسیسی: coiffe, coëffe)؛ یہ ایک ریشمی رومال کا نام ہے جسے مکۂ معظمہ کے علاقے تک بادیۂ شام میں بسنے والے بدوی سر کی پوشش کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اسے سیاہ رنگ کے اونٹ کے بالوں کی ایک ڈوری کی مدد سے سر پر ٹکایا جاتا ہے جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شوخ رنگ کی ڈوریاں بندھی ہوتی ہیں اور جسے عُگال (کلاسیکی: عقال) کہتے ہیں۔ یہ رومال چوکور شکل کا ہوتا ہے؛ اس کا رنگ زرد یا زرد و سبز ہوتا ہے اور اسے اس طریقے سے سر پر رکھتے ہیں کہ اس کا ایک کونا پشت پر اور باقی دونوں کونے سامنے شانوں پر لٹکتے رہیں۔ پہلے اس مربّع رومال کو طے کر کے دوہرا کرتے ہیں تاکہ اس کی تکون بن جائے جسے درزیوں کی اصطلاح میں کلی (gore) کہتے ہیں۔ شانوں والے کونے منہ پر ڈالے جا سکتے ہیں تاکہ سورج کی کرنوں، سرد ہوا اور بارش سے بچاؤ ہو سکے، یا جب یہ مقصود ہو کہ آدمی پہچانا نہ جا سکے، تو چہرہ چھپایا جا سکے، جو تاگے کپڑے کے کنارے سے باہر نکلے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ہوے ہوتے ہیں انہیں بٹ کر ڈوریاں بنا لیتے ہیں جو ایک لمبی جھالر کی طرح نظر آتی ہیں (J.B. Fraser: *Travels in Koordistan*، ۱ : ۲۲۸) ۔ مصر کے مملوک سلاطین بھی سر کے لیے یہی لباس استعمال کرتے تھے۔

مآخذ: (۱) R. Dozy: *Noms des vêtements*، ص ۳۹۰؛ (۲) Lane: *Thousand and one Nights*، ۱ : ۱۳۰، ۶۱۴؛ (۳) (Baede er) A Socin: *Palestine and Syria*، ص xiv، ۱۹۱۲ء؛ (۴) Buckingham: *Travels in Mes potamia*، ۲ : ۱۹۵؛ (۵) Ker Porter: *Travels*، ۲ : ۲۹۲، ۲۹۳؛ (۶) R.P. Jaussen: *Coutumes des Arabes au pays de Moab*، ص ۳۲، حاشیہ ۳، (سیاہ اور بعض اوقات سفید رنگ کا)؛ (۷) M. Tilke: *Orientalische Kostüme*، برلن ۱۹۲۳ء، نوحہ ۲۹۔

(CL. HUART)

* کَوْکَب: [ع]؛ ستارہ، علم ہیئت کی ایک عام اصطلاح، جس کا اطلاق کسی منوّر جرم فلکی پر کیا جاتا ہے ۔ وہ پانچ سیارے (عُطارِد تا زُحَل) جن کا علم عربوں کو تھا الکواکب الخَمْسہ (المُتَحَیِّرہ) کہلاتے تھے ۔ ثابت ستاروں (الکواکب الثابتہ) کے مقابلے میں سورج چاند اور ان پانچ سیاروں کے لیے عام اصطلاح الکواکب الجاریہ یا الکواکب السیّارہ یعنی متحرک ستارے استعمال کی جاتی ہے ۔ کوکب شمالی الدُّبّ الاصغر کے ستارہ عہ (اے) کا نام ہے جو افلاک کے قطب شمالی سے قریب ترین ہے ۔ البیرونی کے ہاں اسے ''طَرَفُ الذَّنَب و ھو جَدْیُ القِبلۃ'' (دم کا سرا، یعنی قبلہ [دریافت کرنے] کا بزغالہ کہا گیا ہے ۔ اس میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ قطب شمالی (سمت شمال) کے علم سے اس کی قطراً متقابل جنوبی سمت دریافت کی جا سکتی ہے جو قبلے کے رخ (سمت القبلہ) کے مترادف ہے ۔ قبلہ دریافت کرنے کا یہ طریقہ صرف انہیں علاقوں کی صورت میں صحیح ہے جو مکّے کے تقریباً شمال میں واقع ہیں (دیکھیے Reinaud کی یاداشت اس کی *Geographie d'Aboulféda* کی تمہید میں، ص cxcv: یا la Mecque est au midi de la Syrie, ainsi que d'une partie de la Mesopotamie et de l'Egypte (!) le mot Kiblah est devenue pour les musulmans de ces contrées, le synonyme de midi et il a été employé ailleurs avec la meme acception" [چونکہ مکّہ شام کے جنوب میں ہے جیسے کہ عراق عرب اور مصر کے ایک حصے کے بھی (!)، لہٰذا لفظ قبلہ ان ملکوں کے مسلمانوں کے ہاں جنوب کا ہم معنی ہو گیا ہے اور دیگر مقامات میں بھی انہیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے] ۔ آخر میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ قیفاوس Cepheus کے ستارے عہ (a) بہ (B) اور یہ (n) الغ بیگ کے قول کے مطابق کَواکِبُ الفِرَق یعنی (بھیڑوں کے) گلّے کے ستارے بھی کہلاتے تھے۔

ثابت ستاروں کی فہرست جو کئی عرب مصنّفین کے ہاں پائی جاتی ہے جَدْوَل الکواکب کہلاتی ہے۔

مآخذ: (۱) البیرونی: القانون المسعودی، مخطوطات عربی برلن، ۸، ۲۷۰، ص ۱۹۳ الف؛ (۲) L. Ideler: *Untersuchungen über den Ursprung und die Bedeutung der Sternnamen*، برلن ۱۸۰۹ء، ص ۳ و ۴۴؛ (۳) قبلے کے متعلق دیکھیے C. Schoy: *Abhandlung von Al Ḥasan ibn al-Ḥasan ibn al-Haitam (Al-hazen) über die Bestimmung der Richtung der Qibla* ZDMG، ۱۹۲۱ء، ص ۲۰۲ تا ۲۰۴)؛ (۴) وہی مصنف: *Abhandlung von al-Faḍl b. Ḥātim an Nairizi über die Richtung der Qibla (arab. Hdschr. N. 2457,17 der Bibl. nat. in Paris)* در S.B. Bayr. Ak.، حصہ

www.besturdubooks.wordpress.com

ریاضیات و طبیعیات، ۱۹۲۲ء، ص ۵۵ تا ۶۸؛ (۵) وهی مصنف: *Gnomonik der Araber*، برلن ۱۹۲۳ء، ص ۳۳ تا ۴۴.

(C. SCHOY)

کَوکبان: جنوبی عرب میں چند مقامات کا نام ہے.

(۱) ایک عبادت گاہ کا نام جس کا ذکر کتبۂ ہالوے (Halévy) عدد ۶۸۶، ۳ تا ۴ میں ہے؛ اس کتبے کو J. Halévy نے عدن میں ایک عمارت سے نقل کیا تھا (بحرابان کوکبان) دیکھیے نیز J. Hommel: *Grundriss der Geographie und Geschichte des alten Orients*، ۲، لائپزگ ۱۹۲۵ء، ص ۷۰.

(۲) ناعط کے شمال میں ظفار کے قریب ایک قلعے کا نام ۔ اسے کوکبان (دو ستارے) یعنی قلعہ ستارہ اس لیے کہتے تھے کہ اس کے بیرونی جانب آرائش کے لیے چاندی کی دھاریاں بنائی گئی تھیں اور چھت سفید پتھر کی سلوں سے پاٹی گئی تھی۔ اندرونی حصے میں سرو کی لکڑی کے تختے منڈھے گئے تھے اور فرش پر رنگ برنگ کی پچی کاری کی گئی تھی اور انواع و اقسام کے جواہر سلیمانی اور نیلم جڑے گئے تھے جو رات کے وقت ستاروں کی طرح چمکتے تھے ۔ یہ طرفہ عمارت لامحالہ جنّون کی طرف منسوب کی جاتی تھی ۔ اس قلعے کا ذکر شاید کتبۂ گلیسر Glaser عدد ۱۲۳۸، ۳ (بیت و کوکبان) میں بھی آیا ہے جو اس کے مضافات میں بیت غُفر سے حاصل ہوا تھا ۔ کہتے ہیں کہ یہ قلعہ ابھی تک قائم ہے.

(۳) اس نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں وادی سَلَامَۃ کے دائیں جانب حَجّۃ کے شمال مشرق میں بڑی چٹان پر آباد ہے اور اسے اسی نام کے دوسرے مقامات سے متمیّز کرنے کے لیے کوکبان حجۃ کے نام سے یاد کرتے ہیں.

(۴) اسی نام کے ایک صوبے کا صدر مقام ہے جو صَنْعَاء کے شمال مغرب میں واقع ہے ۔ کوکبان کا شہر سطح سمندر سے ۸۷۵۰ فٹ کی بلندی پر ۱۵° ۳۱′ ۴۲″ عرض بلد شمالی میں واقع ہے اور اس پہاڑ کی ماہی پشت کے جنوبی حصے پر آباد ہے جو اس شہر کی بائیں جانب طویلے کی طرف تقریباً نصف میل جنوب مشرق سے شروع ہوتا ہے اور کئی گھنٹے کی مسافت تک جنوب مشرق سے شمال مغرب کو چلا گیا ہے یہ مَصَانَعَۃ کی وسیع سطح مرتفع کا ایک حصہ ہے اور جبل ضُلاع کے نام سے مشہور ہے . . .

کوکبان اب تقریباً بالکل غیر آباد ہو چکا ہے اگرچہ اس کے مکانوں میں جو کافی بربادی کے باوجود اب تک شاندار ہیں تقریباً ۳۰ ہزار انسان رہ سکتے ہیں، لیکن اب یہاں مشکل سے ۱۰۰ نفوس رہتے ہیں۔ شہر سے گرد و نواح کے علاقے، وادیوں اور زرخیز کھیتوں، خصوصاً شِبام کے میدانوں، صنعاء کے میدان کے ایک حصے اور آس پاس کی پہاڑیوں کا نہایت خوبصورت منظر دکھائی دیتا ہے.

(۵) کوکبان السّباعۃ مَحْوِید میں، شہر کوکبان نمبر ۴ کے مغرب میں واقع ہے، لیکن یہ علاقۂ طَویلہ میں شامل ہے اور ایک چھوٹی سی جگہ ہے جس کی کوئی خاص اہمیت نہیں.

مآخذ: (۱) J. Halévy: *Rapport sur une mission archéologique dans le Yémen*، ۱۸۷۲ء، *J.A.*، سلسلہ ۶، جلد ۱۹: ۲۶۶؛ (۲): D.H. Müller: *Die Burgen und Schlösser Südarabiens nach dem Iklil des Hamdâni*، *S.B. Ak. Wien*، جلد ۱، ۱۸۷۹ء، ۹۴: ۳۵۴، حاشیہ ۱، ۳۶۹ و حاشیہ ۴، ۳۷۰، ۴۱۱؛ (۲) یاقوت: معجم، طبع وُسٹنفلڈ، ۳: ۳۲۲، ۴: ۳۲۷ (اس میں نیز اگلی کتاب میں یہ غلط لکھا ہے کہ قلعہ، صَنْعَاء کے قریب جبل کوکبان پر واقع تھا)؛ (۳) مَرَاصِدُ الاطِّلاع، طبع T. G. J. Juynboll، ۲

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

لائپزگ ۱۸۵۳ء، ص ۵۲۳؛ (۴) E. Osiander : *Zur himjarischen Alterthums-und Sprachkunde*، *ZDMG* ۱۰ : ۲۵، ۱۸۵۶ء، ۲۶؛ (۵) E. Glaser : *Geographische Forschungen im Yemen 1883*، ورق ۱ الف (قلمی نسخہ)؛ (۳) : (۱) C. Niebuhr : *Beschreibung von Arabien*، کوپن ہیگن ۱۷۷۲ء، ص ۲۵۲؛ (۲) E. Glaser : *Geographische Forschungen im Yemen 1883*، ورق ۸۵ ب (قلمی نسخہ)؛ (۴) : (۱) الہمدانی: صفۃ جزیرۃ العرب، طبع ڈی ایچ مُلّر) لائیڈن ۱۸۸۴ء تا ۱۸۹۱ء، ص ۱۰۷، ۱۹۰؛ (۲) D.H. Müller : *Die Burgen und Schlösser Süd-arabiens*، ۱ : ۳۵۲، حاشیہ ۲، ۳۵۳، ۳۵۵، ۳۵۶؛ (۳) یاقوت : معجم، طبع وسٹنفلڈ، ۴ : ۳۳۔؛ (۴) C. Niebuhr : *Baschreibung von Arabien*، کوپن ہیگن ۱۷۷۲ء، ص ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۵۲، ۲۵۵؛ (۵) C. Ritter : *Die Erdkunde von Asien*، ۷/۱، حصہ ۱۲، کتاب ۳، برلن ۱۸۴۶ء، ص ۷۱۱، ۷۲۸، ۷۳۴؛ (۶) A. Sprenger : *Die Post-und, Reiserouten des Orients, Abhandl. f.d. Kunde des Morgenlandes*، ۲ / ۳، لائپزگ ۱۸۶۴ء، ص ۱۳۶، ۱۵۳؛ (۷) وہی مصنف : *Die alte Geographie Arabiens*، Bern ۱۸۷۵ء، ص ۷۳؛ (۸) Ch. Millingen : *Notes of a Journey in Yemen*، در *JRGS*، ۱۸۷۴ء، ۴۴ : ۱۲۳؛ (۹) E. Glasser : *Geographische Forschungen im Yemen 1888*، ورق ۸ الف، ۱۰ الف تا ۵۵ ب، ۱۲۴ ب (قلمی نسخہ)؛ (۱۰) وہی مصنف : *Meine Reise durch A'rhab und Hâschid*، در *Petermann's Mittilungen*، ۱۸۸۴ء، ۳۰ : ۱۷۳؛ (۱۱) وہی مصنف : *Von Hodeida nach San'a vom 24. April bis 1. Mai 1885*، کتاب مذکور، ۱۸۸۶ء، ۳۲ : ۳۳؛ (۱۲) A. Deflers : *Voyage au Yemen*، پیرس ۱۸۸۹ء، ص ۶۸ تا ۷۲؛ (۱۳) E. Glaser : *Skizze der Geschichte und Geographie Arabiens*، برلن ۱۸۹۰ء، ۲ : ۱۵۱؛ (۱۴) W. B. Harris : *A Journey through the Yemen*، ایڈنبرا ۱۸۹۳ء، ص ۲۰، ۲۱؛ (۱۵) H. Burchardt : *Reiseskizzen aus dem Yemen*، در *Zeitschr. d. Gesellsch. f. Erdkunde zu Berlin*، ۱۹۰۲ء، ص ۶۰۳؛ (۱۶) M. Hartmann : *Der islamische Orient, Berichte und Forschungen*، ۲، *Die Arabische Frage*، لائپزگ ۱۹۰۹ء، ص ۵۴۵؛ (۱۷) H. Krumpholz : *Eduard Glaser's astronomische Beobachtungen im Yemen im Jahre 1883*، در *S.B. Ak. Wien* (Math. naturw. Klasse)، ۱۹۱۱ء، عدد ۱۲۰، حصہ ۲ الف : ص ۱۹۲۱، ۱۹۲۲؛ (۱۸) F. Stuhlmann : *Der Kampf um Arabien zwischen der Türkei und England*، *Hamburgische Forschungen*، ۱، ہیمبرگ ۱۹۱۶ء ص ۷۱؛ (۱۹) احمد راشد : تاریخ یمن و صنعاء، قسطنطنیہ ۱۲۹۱ھ؛ (۵) : (۱) E. Glaser : *Geographische Forschungen im Yemen 1883*، ورق ۵۴ الف (قلمی نسخہ)۔

(ADOLF GROHMANN [تلخیص از ادارہ])

کوکبری: ابوسعید مظفرالدین بن علی بن بکتگین فرمانروائے اربل، خاندانِ بکتگین کا سب سے مشہور بادشاہ تھا۔ کوکبری محرم ۵۴۹ھ/اپریل ۱۱۵۴ء میں [قلعۂ موصل میں] پیدا ہوا، جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تو وہ ۱۴ برس کا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے بھائی یوسف سے بڑا تھا لیکن اتابک مجاہد الدین قایماز یوسف کو اپنی زیر نگرانی تخت دلوانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس پر کوکبری نے اربل چھوڑ دیا اور پہلے بغداد اور پھر موصل چلا گیا۔ یہاں سیف الدین غازی بن مودود زنگی نے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے اپنی ملازمت میں لے لیا۔ آگے چل کر سیف الدین نے یا ایک اور روایت کے مطابق اس کے بھائی اور وارث تخت عزالدین مسعود نے اسے حرّان کا شہر بطور جاگیر عطا کر دیا۔ صلاح الدین کا

www.besturdubooks.wordpress.com

وفادار ملازم ہونے کی وجہ سے اسے ۵۷۸ھ/۱۱۸۲-۱۱۸۳ء میں الرُّھا اور آگے چل کر سمیساط بھی مل گیا۔ ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں صلاح الدین نے اسے ایک پرانے الزام کی بنا پر قید کر دیا، لیکن بہت جلد رہا کر دیا، کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ اگر کوکبری کے ساتھ زیادہ سختی کا برتاؤ کیا گیا تو عراق عرب کے لوگ اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ شعبان۔ رمضان ۵۸۶ھ/اکتوبر ۱۱۹۰ء میں یوسف کی وفات کے بعد کوکبری کو اپنے سابقہ مقبوضات کے عوض اربل اور شہرزور کی حکومت مل گئی؛ [دشمنوں کے خلاف محاذ آرا رہا اور کئی معرکے سر کیے۔ علم حدیث سے بھی بڑا شغف تھا۔ نیز حجاز میں کئی آثار حسنہ اپنی یادگار چھوڑے]۔ لاولد ہونے کی وجہ سے اس نے اپنے تمام علاقے عباسی خلیفہ المستنصر کو دے دیے جانے کی وصیت کر دی۔ کوکبری رمضان ۶۳۰ھ/جون ۱۲۳۳ء میں فوت ہوا۔ نیز رک بہ بگتگین؛ اربل۔

مآخذ: (۱) ابن خلکان، طبع Wüstenfeld، شمارہ ۵۰۸؛ ترجمہ از de Slane، ۲: ۵۳۵؛ (۲) ابن الاثیر: الکامل، طبع Tornberg، ج ۱۱، ۱۲، بمواضع کثیرہ؛ (۳) Weil: *Geschichte der Chalifen*، ۳: ۳۸۷، ۳۹۰، ۳۹۹، ۴۳۸، ۴۴۹، ۴۶۸؛ (۴) Lane-Poole: *The Mohammadan Dynasties*، ص ۱۶۵؛ [(۵) احمد السعید سلیمان: تاریخ الدول الاسلامیہ، ص ۳۴۹، (قاہرہ ۱۹۷۲ء)]؛ [(۶) ابن تغری: النجوم الزاہرۃ، ۶: ۲۸۲].

(K. V. Zetterstéen [و ادارہ])

کوکہ: بورنو [رک بآں] کا صدر مقام، ۱۲ درجے ۵۵ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۱۳ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد مشرقی (گرین وچ) پر واقع ہے۔ اس قصبے کی بنیاد شیخ محمد الکانمی نے ۱۸۱۴ء میں بحیرۂ شاد سے ۹ میل مشرق کی جانب ایک ریتلے میدان میں رکھی تھی یہاں جب baobab adawsonia digitata اگتا ہے جسے کنوری میں کوکہ کہتے ہیں، اس لیے مقامی باشندوں نے اس نسبت سے اس کا نام کوکوکوا (کُکُوَہ) یا کیکوہ (کوکہ کا شہر) رکھ دیا۔

مآخذ: (۱) Denham و Clapperton: *Narrative of Travels ....*، لنڈن ۱۸۲۸ء؛ (۲) H. Barth: *Reisen und Etdeckungen*، ج ۲، باب ۸؛ (۳) Rohlfs: *Quer durch a frcea*، لائپزگ ۱۸۷۴ء، ج ۲، باب ۱۷؛ (۴) Nachtigal: *Sahara und Sudan*، ج ۱، کتاب ۳؛ (۵) Monteil: *De Saint Louis a Tripolis par le Tchad*، پیرس ۱۸۹۴ء، باب ۱۲؛ (۶) J. Marquart: *Benin*، لائیڈن ۱۹۱۱ء، بمواضع کثیرہ؛ (۷) A. Schultze: *Das Sultanat Bornū*، Essen، ۱۹۱۰ء (انگریزی ترجمہ مع ضمیمہ جات از P. A. Benton آکسفرڈ ۱۹۱۳ء).

(G. Yver [و تلخیص از ادارہ])

کوکچہ: رک بہ بدخشان۔

کوکلتاش: خان جہاں میرزا عزیز کوکلتاش (= بادشاہ کا رضائی بھائی، کوکہ = دودھ پلانے والی کا بیٹا، دودھ شریک بھائی)۔ میر شمس الدین محمد خان کا، جو اکبری عہد میں خان اعظم اور "اتکہ" کہلاتا تھا، چھوٹا بیٹا تھا۔ وہ اکبر اعظم کا ہم عمر تھا۔ اکبر نے اس کی والدہ جیجی اتکہ کا دودھ پیا تھا، اس لیے وہ اس کا دودھ شریک بھائی تھا۔ بچپن میں وہ ساتھ کھیلتے بھی رہے۔ اکبر نے ہمیشہ اسے اپنا قرب بخشا اور عزت افزائی میں کمی نہ آنے دی۔ اکبر اس کی والدہ کا اپنی والدہ ہی کی طرح خیال رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس سے کبھی جسارت اور بے باکی ہو جاتی تو اکبر اسے نظر انداز کر دیتا اور کہا کرتا تھا: "میان من و عزیز جوی شیر واسطہ است، از آں نمی توان گذشت" (میرے اور عزیز کے درمیان دودھ کا رشتہ ہے جسے میں نظرانداز نہیں کر سکتا)

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

(صمصام الدولہ شاہنواز خان : مآثرالامرا، ۱ : ۶۷۵، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ ۱۸۶۹ء)۔

پنجاب عرصے سے بطور جاگیر میرزا عزیز کے بزرگوں، یعنی اتکہ خیل کے قبضے میں چلا آتا تھا۔ اکبر نے ان کی جاگیر میں کچھ تغیر و تبدل کر دیا، بہرحال دیپال پور کی جاگیر میرزا عزیز ہی کے پاس رہی۔ سولھویں سال جلوس اکبری (۹۷۸ھ/ ۱۵۷۱ء) میں جب اکبر شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد واپس ہوا تو راستے میں میرزا عزیز کی درخواست پر بادشاہ نے اس کے ہاں قیام کیا (ابوالفضل : اکبر نامہ، ۲ : ۳۶۳)۔ میرزا نے اس تقریب پر ایک عظیم الشان جشن منعقد کیا (تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب مذکور، ۶۷۵)۔ محمد غزنوی نے جشن کی تاریخ مصرع ذیل سے نکالی : ''میہمانان عزیزند شہ و شہزادہ'' (۹۷۸ھ)، (اکبر نامہ، ۲ : ۳۶۳ - ۳۶۴)۔

مصنف طبقات اکبری لکھتا ہے کہ ایسی پر تکلف ضیافتیں کم ہی ہوئی ہیں۔ سترھویں سال جلوس جب احمد آباد گجرات اکبر اعظم کے تصرف میں آیا تو وہاں کی حکومت دریائے مہندری کی سرحد تک میرزا عزیز کے سپرد ہوئی (مآثرالامرا، ۱ : ۶۷۶) اور اکبر خود قلعہ سورت کی تسخیر کی طرف متوجہ ہوا۔ اتنے میں باغی امرا یعنی محمد حسین میرزا اور شاہ میرزا نے شیر خاں فولادی کے ساتھ مل کر نہروالہ (پٹن) کا محاصرہ کر لیا۔ میرزا عزیز قطب الدین خاں اور بعض دوسرے امرا کے ساتھ پٹن آیا اور باغیوں کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا (اکبر نامہ، ۳ : ۲۳ تا ۲۶)۔ ۲ صفر ۹۸۱ھ/ ۴ جون ۱۵۷۳ء کو اختیار الملک اور محمد حسین میرزا نے احمد آباد پر قبضہ کرنے کی سازش کی لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی بلکہ تصادم میں وہ جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

بیسویں سال جلوس اکبری میں جب بادشاہ نے ''آئین داغ'' رائج کرنا چاہا تو اس نے امرا کو طلب کیا۔ امرا نے اس آئین پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ بادشاہ نے میرزا عزیز کو، جسے وہ بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا، بلا کر رائے پوچھی تو اس نے بھی ناخوشی کا اظہار کیا۔ بادشاہ اس سے سخت ناراض ہوا اور کچھ عرصے کے لیے منصب سے معزول کر کے اسے آگرے کے باغ ''جہاں آرا'' میں نظر بند کر دیا (مآثرالامرا، ۱ : ۶۸۰) آخر تیسویں سال جلوس میں نظر بندی کی معیاد ختم ہوئی۔ پچیسویں سال جلوس (۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء) میں میرزا پنج ہزاری منصب اور ''اعظم خاں'' کے خطاب سے سرفراز ہوا (مآثرالامرا، ۱ : ۶۸۰)۔ ملک کے مشرقی علاقے میں جب مفسدین کی شورش اور مظفرخان صوبیدار بنگالہ کے قتل کی اطلاع دارالسلطنت میں پہنچی تو اسے ایک بڑے لشکر کے ساتھ بھیجا گیا۔ میرزا عزیز نے اگرچہ صوبۂ بہار کی شورش کے خیال سے بنگال کا رخ تو نہ کیا، لیکن علاقے کے انتظام اور سرکش گروہ کی سرکوبی کے لیے سعی بلیغ کرنے کے بعد کچھ عرصہ وہ حاجی پور میں قیام پذیر ہوا۔

چھبیسویں سال جلوس میں اکبر کابل کی مہم سر کر کے واپس ہوا اور فتح پور پہنچا تو میرزا باریابی کا شرف حاصل کر کے طرح طرح کی نوازشوں سے سرفراز ہوا۔ ستائیسویں سال جلوس اکبری میں جباری، خبیطہ اور ترخان دیوانہ بنگال سے بہار آئے اور حاجی پور کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ وہاں وہ رعایا پر طرح طرح کے ظلم بھی کرنے لگے۔ میرزا کو حکم ہوا کہ بہار کے مفسدین کو مناسب سزا دینے کے لیے حملہ کرے۔ اگرچہ میرزا کے پہنچنے سے پہلے ہی یہ احسان فراموش فتنہ پرداز شاہی فوج کے دستوں کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچ چکے تھے، لیکن موسم برسات مانع ہونے کی وجہ سے میرزا خود

www.besturdubooks.wordpress.com

اس وقت وہاں نہ پہنچ سکا۔ بہر حال برسات ختم ہوتے ہی اٹھائیسویں سال جلوس اکبری کے شروع میں وہ الٰہ آباد، اودھ اور بہار کے جاگیرداروں کے ہمراہ بنگال کو روانہ ہوا۔ یہاں اس نے معصوم خان کابلی اور قاقشالوں پر اپنی سیاسی فراست سے قابو پا لیا (مآثرالامراء، ۱ : ۶۸۱)۔ یہاں کی آب و ہوا ناموافق ہونے کی اطلاع اس نے بادشاہ کو پہنچائی تو حکم صادر ہوا کہ اس علاقے کو شہباز خان کنبوہ کے جو عنقریب پہنچ جائے گا، سپرد کر کے اپنے علاقے بہار کو واپس ہو جائے۔ اس سال جب اکبر الٰہ آباد روانہ ہوا تو میرزا حاجی پور سے چل کر بادشاہ کے حضور پہنچا اور اسے گڑھ اور راے سین کی جاگیر عطا ہوئی (ص ۶۸۱)۔

اکتیسویں سال جلوس اکبری ۹۹۴ھ/ (۱۵۸۵-۶ ع) میں میرزا کو دکن کی مہم پر بھیجا گیا، لیکن رفقا کی دو روئی کی وجہ سے نامناسب توقف ہو گیا اور فوج کم ہوتی گئی اور غنیم جو خائف تھا، قوی دل ہو گیا اور جنگ کے ارادے سے آگے بڑھا۔ میرزا مقابلے کی تاب نہ پا کر برار کی جانب نکل گیا۔ ایلچ پور کو خالی پا کر اس نے وہاں لوٹ مار کی اور کثیر مال غنیمت کے ساتھ گجرات کو روانہ ہوا۔ غنیم نے اس کا تعاقب کیا تو میرزا نے رفتار تیز کر کے نذر بار پہنچ کر دم لیا اور یہ سارا علاقہ غنیم کے تصرف میں آ گیا۔ نذر بار سے وہ تنہا گجرات پہنچا تاکہ وہاں فوج جمع کرے۔ وہاں کے حاکم خانخاناں نے بڑی گرم جوشی سے تھوڑے ہی عرصے میں لشکر فراہم کر دیا، لیکن لوگوں میں طرح طرح کی بےسروپا باتوں کی وجہ سے اس نے لشکرکشی کا ارادہ کر دیا (مآثرالامراء، ۱ : ۶۸۲)۔ بتیسویں سال جلوس شاہی میں میرزا کوکہ کی بیٹی شاہزادۂ سلطان مراد کے عقد ازدواج میں آئی۔ اس تقریب میں عالی شان جشن منعقد ہوا۔ چونتیسویں سال جلوس اکبری کے آخر میں گجرات کی حکومت خانخاناں سے لے کر میرزا کوکہ کے سپرد کی گئی۔ پینتیسویں سال جلوس میں میرزا احمد آباد پہنچا تو اس وقت سلطان مظفر نے جام، زمیندار کچھاور حاکم جونا گڑھ کی مدد سے شورش بپا کی۔ میرزا کوکہ نے چھتیسویں سال جلوس اکبری میں ان کی طرف رخ کیا اور ایک خون ریز جنگ کے بعد دشمن کو شکست دی۔ اگلے سال پھر جام اور دوسرے زمیندار متفق ہو گئے اور سومنات اور سولہ بندرگاہوں پر قبضہ کر کے جونا گڑھ کا محاصرہ کر لیا جو سورت کا ضدر مقام تھا۔ یہاں بھی میرزا کی سیاسی فراست بروے کار آئی اور سلطان مظفر کو جو دراصل شورش کا محرک تھا، اس کے حلیف حاکم کچھ نے میرزا کے حوالے کر دیا۔ اس طرح یہ شورش ختم ہو گئی۔

بادشاہ نے انتالیسویں سال جلوس (۱۰۰۱ھ/ ۱۵۹۲-۱۵۹۳ع) میں میرزا کوکہ کو طلب کیا۔ تو اس نے مزاج شاہی کو موافق حال نہ پا کر حجاز جانے کا ارادہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بادشاہ کو سجدہ کرنے، داڑھی منڈوانے اور بعض دوسری نئی رسوم بجا لانے کی پابندی نہیں کرتا تھا۔ داڑھی بھی اس کی خاصی لمبی تھی؛ اس لیے بادشاہ کے سامنے جانے سے معذرت کر دیا کرتا تھا۔ حج کو روانہ ہونے سے پہلے میرزا کوکہ نے بندر دیو فتح کر کے شہرت حاصل کی۔ آخر میں بندر بلاول سے جو سورت کے قریب ہے، اپنے چھوٹے بیٹوں اور چھوٹی بیٹیوں کو ساتھ لے کر جہاز پر سوار ہوا۔ عبدالقادر بداؤنی نے قطعۂ تاریخ لکھا جس کے مندرجۂ ذیل مصرع سے تاریخ نکلتی ہے: بگفتا ''میرزا کوکہ بحج رفت'' (۱۰۰۲ھ/ ۱۵۹۳-۱۵۹۴؛ مآثرالامراء، ۱ : ۶۸۴)۔ کہتے ہیں کہ میرزا نے حرمین میں زر کثیر صرف کیا۔ وہاں کے شرفا و اعیان کی تواضع کی۔ حضرت رسالت

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے روضۂ مبارک کے اخراجات کا پچاس سال کا تخمینہ کر کے شریف مکہ کے حوالے کر دیا اور پتھر خرید کر اس مقام مقدس کے لیے وقف کر دیے (کتاب مذکور، ۶۸۴؛ نیز دیکھیے ذخیرۂ خواتین، ۸۰، ۸۱) - ۱۰۰۳ھ/ ۱۵۹۴-۱۵۹۵ء میں عزیز میرزا حج کعبہ کے بعد واپس آیا۔ بادشاہ کے حضور پہنچا تو اس کا منصب اور صوبۂ بہار کی جاگیر بحال کر دی گئی - چالیسویں سال جلوس میں اسے بادشاہ کی وکالت اور مہر شاہی کے رکھنے کی عزت حاصل ہوئی - اکتالیسویں سال جلوس میں صوبۂ ملتان میرزا کی جاگیر میں مقرر ہوا - اسی سال کے آخر میں شاہزادۂ سلیم (جہانگیر) کے بڑے بیٹے کے ساتھ جو راجا مان سنگھ کا بھانجا تھا، میرزا کی بیٹی کا عقد ہوگیا تو ان دونوں امرا نے حکومت کی ترقی میں سعی بلیغ کی - پہلے سال جلوس جہانگیری میں جب شاہزادۂ خسرو نے فرار ہو کر اپنے باپ جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تو اس کی یہ حرکت میرزا کے ایما پر محمول کی گئی جس کی وجہ سے وہ کچھ عرصہ زیر عتاب رہا۔

شاہ نواز کا بیان ہے: کہتے ہیں کہ میرزا عزیز کفن پہن کر دربار میں آیا کرتا تھا - خیال تھا کہ اسے ہلاک کر دیا جائے گا - اسے اپنی زبان پر اختیار نہ تھا، جو منہ میں آتا کہہ بیٹھتا تھا - ایک رات اس نے امیر الامراء (شریف خان) سے سخت کلامی کی - جہانگیر وہاں سے اٹھا اور تخلیے میں مشورہ کیا - امیر الامراء نے کہا کہ اسے قتل کرنے میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے - بعض اور امرا نے بھی یہی رائے دی، کسی نے یہ بھی کہا کہ بظاہر میرزا سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی کہ اسے واجب القتل سمجھا جائے، اگر اسے ہلاک کر دیا گیا تو ایک دنیا اسے مظلوم سمجھے گی - اس سے جہانگیر کے غصے کو کسی قدر تسکین ہوئی - اس اثنا میں بادشاہ کی مادر مہربان سلیمہ بیگم نے پردے کے پیچھے سے باآواز بلند کہا: ''حضرات بیگمات میرزا کو کہ کی سفارش کے لیے جمع ہیں - آپ تشریف لا سکیں تو بہتر ہے، ورنہ وہ سب باہر آ جائیں گی'' مجبوراً بادشاہ نے حرم سرا میں جا کر ان سب کی سفارش سے میرزا عزیز کی خطا معاف کر دی (مآثرالامراء، ۱: ۶۸۶، ۶۸۷) - کسی موقع پر میرزا عزیز نے راجا علی خاں حاکم خاندیس کے نام ایک اہانت آمیز خط لکھا جو جہانگیر کی خدمت میں پیش کر دیا گیا - جہانگیر نے خط پڑھ کر کہا: ''اس وقت بھی محبت کا وہ واسطہ، جو عرش آشیاں (اکبر اعظم) تجھ سے رکھتے تھے، مانع ہے، ورنہ کل تجھے قتل کرا دیا جاتا'' - بہرحال منصب اور جاگیر سے معزول کر کے اسے نظربند کر دیا گیا - آخر تیسرے سال جلوس جہانگیری میں اس کی خطا معاف ہوئی اور گجرات کی صوبیداری اسے سونپ دی گئی - نویں سال جلوس جہانگیری میں وہ پھر زیر عتاب آیا اور اسے گوالیار میں نظر بند کر دیا گیا - ایک سال بعد رہائی ہوئی تو اسے پہلی تحریر یہ ملی کہ بادشاہ کے حضور میں بغیر اجازت کوئی بات نہ کرے، اس لیے کہ اسے زبان پر اختیار نہیں - (کتاب مذکور، ۶۸۸)۔

اٹھارھویں سال جلوس جہانگیری میں میرزا عزیز کو شاہزادۂ خسرو کے بیٹے سلطان داور بخش کی اتالیقی اور ہمراہی کے لیے مقرر کیا گیا، لیکن وہ انیسویں سال جلوس ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۶ء میں فوت ہوگیا - شاہنواز کا بیان ہے کہ وہ بڑائی کے اظہار اور درشت گوئی میں یکتا تھا - بہت مغلوب الغضب شخص تھا، لیکن خوش گفتار بھی تھا - وہ نماز کا پابند لیکن دین کے معاملے میں متعصب ضرور تھا؛ اس وجہ سے اس نے لامذہبی میں اکبر کی پیروی نہ کی - اس معاملے میں وہ بے باکی سے اکبر کے

www.besturdubooks.wordpress.com

طریق کار کو برا کہتا تھا۔ زمانہ سازی اس میں قطعاً نہ تھی (مآثرالامراء ۱: ۶۹۰)۔ وہ کثیرالاولاد تھا اور اس کی اولاد میں سے بعض اعلیٰ مناصب پر سرفراز ہوئے۔

مآخذ: (۱) عبدالقادر بدایونی: منتخب التواریخ، مطبوعہ نولکشور، لکھنؤ ۱۸۸۳ء؛ (۲) ابوالفضل: اکبرنامہ، مطبوعۂ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ؛ (۳) محمد ہاشم خان المخاطب بہ خافی خان: منتخب اللباب، مطبوعۂ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ؛ (۴) صمصام الدولہ شاہنواز خان: مآثر الامراء، مطبوعۂ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ؛ (۵) محمد حسین آزاد: دربار اکبری؛ (۶) نور الدین جہانگیر: تزک جہانگیری؛ (۷) شیخ فرید: ذخیرۃ الخوانین، کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۸) خواجہ نظام الدین بخشی: طبقات اکبری، کلکتہ ۱۹۳۱ء؛ (۹) دیگر معاصر تواریخ کے ضروری اقتباسات کے لیے دیکھیے Elliot و Dowson: *History of India as told by its own historians*؛ (۱۰) T. W. Beale: *The Oriental Biographical Dictionary*، ۱۸۹۴ء؛ (۱۱) A. V. Smith: *Akbar the great Moghal*، آکسفورڈ ۱۹۱۷ء [مقبول بیگ بدخشانی رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

کولوم بشار: Colomb-Bechar؛ صحراء کے ضلع کا بڑا شہر (Organisation Commune des Regions Sahariennes)؛ جو ۷ اگست ۱۹۰۷ء کے ایک حکم کی بنا پر نیا بنایا گیا ہے۔

یہ شہر بالکل جدید ہے۔ فرانسیسی قبضہ ہونے سے پہلے، جو ۴۳-۱۹۰۳ء میں قائم ہوا، معدودے چند گاؤں جن کی کوئی تاریخی وقعت نہیں، وادی بشار (Oued Beeher) کے کناروں پر ادھر ادھر تعمیر ہو گئے تھے اور ندی سے چند کھجوروں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ کی پرورش ہوتی تھی۔ ۱۸۰۷ء سے کپتان ڈی کولوم Captain de Colomb نے اس علاقے کے حالات کی تفتیش شروع کی۔ اسی کے نام پر یہ نیا شہر بسا ہے اور بشار کا لفظ اس لیے بڑھایا گیا کہ مقامی روایت کے مطابق پندرھویں صدی عیسوی کے کسی ترکی سلطان (؟) نے ایک مسلمان کو اس علاقے کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ جب اپنے سفر سے واپس آیا تو صاف پانی شیشے کے برتن میں ساتھ لایا، اس لیے اس کو یہ لقب (بشّار) دیا گیا جو ب ش ر (خوشخبری لانا) سے بنا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے وقت اس شہر کے قریب جو کوئلے کی کانیں ۱۹۱۷ء میں دریافت کی گئی تھیں، ان سے ۱۹۳۱ء سے پوری طرح کوئلا نکالا جانے لگا۔ اسی زمانے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ بحر متوسط سے نائجر Niger تک ریل چلائی جائے۔ اس ریل سے اس شہر کی ترقی کی اور تحریک ہوئی۔ جنگ کے وقت سے ارد گرد کے کوئلے کے میدان سے کوئلے کی پیداوار کی مقدار تخمیناً ۳۰۰۰۰۰ ٹن سالانہ رہی ہے، ۱۹۵۶ء میں یہاں حرارت سے بجلی پیدا کرنے کا Thermo-electric کارخانہ بنانے کے منصوبے تیار ہوئے اور علاقے کے اندر اہم معدنی ذخیرے دریافت کیے گئے، آخری بات یہ ہوئی ہے کہ حکومت فرانس نے "کولوم بشار" اور آس پاس کے علاقے میں تحت الارضی فضائی خدنگ (= میزائل) کی مشق کا مرکز تیار کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ۱۹۰۶ء کی ۷۰۵۰ کی آبادی بڑھتے بڑھتے ۱۹۵۳ء میں ۱۰۶۵۰ سے زیادہ ہو گئی جس میں (۱۹۵۳ء کی مردم شماری کے مطابق) ۳۳۵۰ یورپی تھے۔

مآخذ: (۱) L. Geard: *L'oasis de Colomb-Béchar*، در *Arch. de l'Inst. Pasteur d'Algerie*، ۱۹۳۳ء؛ (۲) *Bull Comite Afrique Francaise*، ۱۹۳۱ء (شمارہ ۴ تا ۷)؛ (۳) A. G. P. Martin: *Les oasis sahariennes*، الجزائر ۱۹۰۸ء؛ (۴) Lyautey:

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Vers le Moroc. Letters du Sud-Oranais (۱۹۰۳ - ۱۹۰۶ء)، پیرس ۱۹۳۷ء؛ (۵) J. Eberhardt : *Dans l'Ombre chaude de L'Islam*، پیرس ۱۹۲۶ء؛ (۶) J. P. Cambo : *Le "Combinat" de Colomb-Béchar*، در *Encycl. Mens. d'O-M*، ضمیمہ، شمارہ ۱۴۷ تک (جولائی ۱۹۵۴ء) : دسمبر، شمارہ ۳۰ .

(R. Le Tourneau)

* **کُوْمُوْک** : [= قُوْمُوق]؛ ایک ترک قبیلہ جو داغستان (رک بآں، خصوصاً ۹ : ۱۶۸ ببعد، جہاں قازی قُومُوق یا غازی غموق کے لزگیون Lezgians کے بارے میں معلومات درج ہیں اور وہ سیاسی احوال بھی جن کے تحت اس قوم کی ایک جماعت نے اپنے اعزہ سے علٰحدگی اختیار کر کے ترکوں کا اثر قبول کرلیا) کے شمالی حصے میں آباد ہے۔ قاضی قومُوک [قومُوق] کے حکمرانوں (شامخالوں) نے دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں آہستہ آہستہ اپنی حدود مملکت اپنے اس قدیم صدر مقام سے آگے بڑھالیں جو ساحل کے شمال مشرقی جانب پہاڑوں کے درمیان موضع کمخ میں قائم تھا .

مآخذ : (بالخصوص رک بہ مآخذ بذیل مادّۂ داغستان ان کے علاوہ) (۱) B. Çobanzade (ب۔ چوبان زادہ) *Zamietki o yazikiel slovesnosti Kumikov* (*Izv. vost. fak. Azerb. gos. Universiteta*) ۱، باکو ۱۹۲۶ء، ص ۹۵ ببعد) اس کے ص ۱۳۸ پر مآخذ تا ۱۹۲۶ء؛ درین ملد بارہ دیکھیے؛ (۲) A. Samoilovic در *Zap.* ۲۱ : ۱۵۲ ببعد.

(W. Barthold)

* **کُوْمِیہ**: ازمنۂ وسطٰی میں المغرب کے اہم ترین قبائل میں شمار ہوتا تھا۔ ایک زمانے میں یہ لوگ صطفورۃ کے نام سے مشہور تھے، نسلاً فاتن کے واسطے سے مادغیس الابتر کی اولاد تھے۔ روایت یہ ہے کہ کومیہ جس کے نام سے قبیلہ موسوم ہے، اس کے دو بھائی تھے، لمایہ اور مطغرہ، جن کی نسل سے بہت سے گھرانے وجود میں آئے اور ان میں سے بعض آج بھی موجود ہیں۔ کومیۃ کے اہم ترین نمائندہ قبائل جو الجزائر کے شمال مغرب میں تلمسان اور ارشقول (رشگن) کے درمیان رہتے ہیں، حسب ذیل ہیں : بنو عابد، انہیں کی نسل سے الموحدون کے خاندان کا پہلا خلیفہ عبدالمؤمن [رک بآں]، ھنین اور ندرومۃ کے درمیان تاجزۃ کے مقام پر پیدا ہوا؛ بنو ندرومۃ جنھوں نے اپنے نام سے ایک اہم شہر منسوب کیا؛ بنو صغارۃ جن کی نمائندگی آج کل ماتیلۃ کر رہے ہیں، بنو الول جن کا ایک گھرانا مسیفۃ اب تک موجود ہے۔ کومیۃ نے اپنے آپ کو عبدالمؤمن کا عقیدت مند ثابت کر دیا کہ وہ انہیں میں سے تھا۔ الموحدون کے لشکر کا دوسرا جند (دستہ) انہیں پر مشتمل تھا، لیکن بالآخر ہسپانیہ اور شمالی افریقہ کی جنگوں میں اس حکمران خاندان کو سپاہی مہیا کرتے کرتے انھوں نے اپنا خاتمہ کر لیا۔ جب وہ زناتہ کو خراج (رک بآں) دینے پر مجبور ہو گئے تو ان میں سے چند ایک نے ایک دوسرے فریق اولہاصۃ سے اتحاد کر کے الجزائر کے شمالی مغرب میں تزارۃ کے طائفوز وفاق کی تشکیل کر لی.

مآخذ : R. Basset : *Nédromah et les Traras*، پیرس ۱۹۰۱ء اور دیگر مصنفین جن کا حوالہ وہاں دیا گیا ہے.

(René Basset)

کُوْتنگ: لفظ کُونگ کپون کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ ایک جگہ کا مقامی نام ہے جو ساحل عاج Ivory Coast کی موجودہ فرانسیسی نوآبادی کے شمال میں اس حد فاصل کے قریب واقع ہے جو کومو Comoe اور بنڈمہ کے ایک معاون نزی Nzi کے طاس کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے.

مآخذ: (۱) Cap. Binger : *Du Niger au Golfe*

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

de Guinée par le pays de Kong et le Mossi، پیرس ۱۸۹۲ء، باب ۶ و ۱۳ اور ضمیمہ ۵ کا آخری حصہ؛ (۲) M. Monnier : France Noire، پیرس ۱۸۹۴ء، باب ۹، ۱۰ و ۱۱؛ (۳) A. Mévil : Samory، پیرس، بدون تاریخ [۱۸۹۹ء] باب ۸ و ۱۰؛ (۴) Salvan : Cercle de Dabakala، در La Côte d'Ivoire، ص ۳۲۳ تا ۳۶۷، اشاعت Gouvernement Général de l'Afrique occidentale Fraçaise، پیرس ۱۹۰۶ء.

(MAURICE DELAFOSSE [و تلخیص از ادارہ])

⊗ **کُوِّرَتْ** : [قرآن مجید کی سورۃ التکویر کا ایک نام]: کوّرت تکویر سے صیغۂ ماضی مجہول ہے جو کَوْر (ک و ر) سے مشتق ہے ۔ بقول امام راغب اصفہانی، الکور کے معنی کسی چیز کو عمامے کی طرح لپیٹنے اور اس کو اوپر تلے گھمانے کے ہیں: ''کَوْرُ الشّی ادارتہ و ضمّ بعضہ الی بعض کَکَوْرِ العمامۃ'' (المفردات : ۴۵۹؛ طنطاوی جوہری : الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، ۲۵ : ۸۰)؛ چنانچہ کُوِّرَت کے معنی ہیں لپیٹی گئی، یعنی وہ سورت جس میں (کائنات کے مختلف مظاہر کی تباہی اور ان کے) لپیٹنے کا ذکر آیا ہے یا اس روز کا ذکر ہے جس دن سورج کی لمبی لمبی شعاعیں، جن سے سورج کے ارد گرد ہزاروں میل تک فضا میں دھوپ اور روشنی پھیلتی ہے، لپیٹ کر رکھ دی جائینگی اور آفتاب بے نور ہو جائیگا (سیّد قطب : فی ظلال القرآن، ۳۰ : ۶۰).

قرآن حکیم کی یہ سورت ۲۹ آیات پر مشتمل ہے اور مکۂ مکرمہ میں نازل ہوئی (الرّازی : التفسیر الکبیر، ۳۱ : ۴؛ الدّر المنثور، ۶ : ۳۱۸؛ تفسیر المراغی، ۳۰ : ۵۲) ۔ اس کی پہلی آیت ''اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ'' کے لفظ کُوِّرَتْ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے ۔ ترتیب تلاوت کے لحاظ سے اس کا عدد ۸۱ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے، اس کا عدد ۷ ہے ۔ جو تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَہَبٍ [رَبِّکَ بِہ اللَّہَبِ] کے بعد اور سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی [رَبِّکَ بِہ الْاَعْلٰی] سے پہلے نازل ہوئی (الاتقان، ۱ : ۱۰؛ تفسیر المراغی، ۳۰ : ۵۲) ۔ اس کے مضامین اور اسلوب سے بھی اس امر کی داخلی شہادت ملتی ہے کہ یہ مکۂ مکرمہ میں نازل ہونیوالی ابتدائی دور کی سورتوں میں سے ہے ۔ ترتیب تلاوت کے لحاظ سے، گزشتہ سورۃ [عبس] سے اس کا ربط یہ ہے کہ سورۃ [عبس] کے آخری حصے میں انسان کی توجہ اس کی اصل حقیقت پر غور کرنیکی طرف مرکوز کی گئی ہے ۔ انسان کی تخلیق، اس کی پرورش، زندگی میں خداوندی نعمتوں کی فراوانی، اس کے بعد اس کی موت اور قبر اور پھر حشر و نشر کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد نفخ صور اور روز قیامت کی ہیبت اور ہولناکیوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ اس روز انسان اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور بیٹوں سے بالکل بیگانہ بعض اپنی فکر میں لگا ہوگا (۸۰ [عبس] : ۱۸-۴۲)؛ چنانچہ گزشتہ سورت اور زیر نظر سورت دونوں قیامت کے احوال اور اس کی ہولناکیوں کو کھول کر بیان کرتی ہیں، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ زیر نظر سورت اپنی ماقبل سورت سے کہیں زیادہ جامع اور مفصل ہے ۔ ابن کثیر نے ترمذی کے حوالے سے حضرت ابن عمرؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے فرمایا : ''من سرّہ ان ینظر الی یوم القیامۃ کانّہ رای عین فلیقرا اذا الشّمس کوّرت و اذا السّماء انفطرت و اذا السّماء انشقّت'' (تفسیر القرآن العظیم ۴ : ۴۷۴) الترمذی : الجامع، ۱۲ : ۲۳۳) یعنی (جس کو یہ بات بھلی لگے کہ وہ قیامت کے دن کو اس طرح دیکھے جیسا کہ بچشم خود مشاہدہ کیا جاتا ہے تو وہ سورۃ کورت اور سورۃ انفطار اور سورۃ انشقاق پڑھے) ۔ امام ترمذی نے ہشام بن یوسف سے بعینہ اسی مضمون کی دوسری روایت بھی بیان کی ہے، جس میں صرف سورۃ کورت

www.besturdubooks.wordpress.com

کا ذکر ہے اور دوسری دو سورتوں انفطار اور انشقاق کا ذکر نہیں کیا گیا (الترمذی : الجامع، ۱۲ : ۲۳۳).

اس سورت کی اہمیت اور جامعیت کا اندازہ اس کے تاریخی پس منظر سے کیا جا سکتا ہے ۔ یہ سورت نزول وحی کے اعتبار سے تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ کے بعد نازل ہوئی ۔ تبلیغ اسلام کا یہ وہ ابتدائی دور ہے جس میں رسول کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کی دعوت کو ناکام بنانے کے لیے ابو لہب اور اس کے ساتھی پورا زور صرف کر رہے تھے ۔ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم اور آپ پر ایمان لانے والے صحابۂ کرامؓ پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا تھا اور اذیت رسانی کی ہر ممکن صورت اختیار کی جا رہی تھی ۔ ابو لہب مکۂ مکرمہ میں حضور اکرمؐ کا قریب ترین ہمسایہ تھا، چنانچہ وہ اور اس کے ساتھی گھر میں بھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کو چین نہ لینے دیتے تھے ۔ آپ جہاں کہیں بھی دعوت حق کے لیے تشریف لے جاتے، معاندین آپ کے پیچھے پیچھے جاتے اور لوگوں کو دعوت حق کے قبول کرنے سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرتے (سید ابوالاعلیٰ مودودی : تفہیم القرآن، ۶ : ۵۲۰ ببعد) ۔ زیر نظر سورت میں معاندین کی توجہ کو قیامت کی ہولناکیوں اور آخرت میں اپنے اعمال کی جوابدہی کی طرف مبذول کیا گیا ہے اور رسول اکرمؐ کی بے داغ اور تابندہ زندگی کو جو انھوں نے انھیں مشرکین میں بسر کی ہے، دلیل و برہان کے طور پر پیش کر کے انھیں قرآن اور صاحب قرآنؐ کے پیغام ہدایت کو قبول کرنے کی تلقین کی گئی ہے (دیکھیے سید قطب : فی ظلال القرآن، ۳۰ : ۳۸)۔

اس سورت کے مضامین کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلے حصے میں سورت کے آغاز سے ارشاد خداوندی ''عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ'' تک قیامت کی ہولناکیوں کا نقشہ پیش کیا گیا ہے؛ دوسرے حصے میں ستاروں، رات اور صبح کی آمد کی قسم کھا کر، یعنی انھیں گواہ ٹھیرا کر یہ اعلان کیا گیا ہے کہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے کمال صفات سے متصف ایک فرشتے کے توسط سے رسالت مآب پر نازل کیا گیا ہے ۔ یہ حصہ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ'' سے شروع ہو کر سورت کے آخر پر ختم ہوتا ہے (الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، ۲۰ : ۸۰؛ سید قطب : فی ظلال القرآن، ۳۰ : ۵۸ ببعد) ۔ ڈاکٹر محمد محمود حجازی نے ستاروں، رات اور صبح کی قسم کھانے کو اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرتوں کی طرف اشارہ قرار دیا ہے تاکہ انسان اس حیرت انگیز نظام پر غور و فکر سے کام لے (التفسیر الواضح، ۳ : ۲۲) ۔ سورت کی پہلی چھے آیات میں ان ہولناکیوں کا ذکر ہے جو قیامت سے قبل رونما ہوں گی اس کا صحیح نقشہ ابیّ بن کعب نے اس طرح کھینچا ہے کہ ''لوگ بازاروں میں ہوں گے جب کہ آفتاب بے نور ہو جائے گا ۔ ستاروں کی مدّھم سی روشنی رہ جائے گی ۔ لوگ اسی حالت میں ہوں گے کہ پہاڑ زمین پر آ گریں گے ۔ لوگ اسی پریشانی میں ہوں گے کہ ستارے بھی ٹوٹ کر گر پڑیں گے اور جن و انس پر اضطراب کی انتہائی پریشان کن کیفیت طاری ہو گی اور بد حواسی سے بھاگیں گے؛ نفسی نفسی کا یہ عالم ہو گا کہ درندے، جانور، پرندے، درندے باہمی خلط ملط ہو کر بھاگ رہے ہوں گے ۔ لوگ اسی حالت میں ہوں گے کہ زمین تھر تھر کانپنے لگے گی اور انتہائی خوفناک آواز سے پھٹ جائے گی ۔ لوگ اسی حالت میں ہوں گے کہ ایک تیز آندھی آئے گی اور لوگوں کو ہلاک کر دے گی (الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، ۲۰ : ۸۰) ۔ اس کے بعد کی آیات میں قیامت کے واقع ہونے کے بعد کی ہولناکیوں کا ذکر کیا گیا ہے (دیکھیے کتاب مذکور)، جس میں عرب معاشرے کے بگاڑ کی

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

ایک انتہائی گھناؤنی رسم کی طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ اپنی بیٹیوں کو کس بربریت سے زندہ دفن کر دیتے تھے تاکہ وہ اپنے زعم کے مطابق، عار سے محفوظ رہیں ۔ ابن کثیر نے حضرت عمرؓ بن الخطاب کے حوالے سے قیس بن عاصم کا واقعہ بیان کیا ہے جس نے اپنے جرم کا اعتراف کر کے حضور اکرمؐ سے یہ درخواست کی کہ وہ اس جرم کا کیا کفّارہ ادا کرے تو حضورؐ نے اسے اونٹوں کی قربانی کرنے کے لیے کہا ۔ (تفسیر القرآن العظیم، ۴ : ۴۷۸) ۔ المراغی نے عرب معاشرے میں اس قسم کی قساوتِ قلبی کو تفصیل سے بیان کیا ہے تفسیر المراغی، ۳۰ : ۵۵) ۔ [جمال الدین] القاسمی نے الدّارمی کے حوالے سے جو روایت بیان کی ہے وہ اس قدر درد ناک ہے کہ اس نے لکھا ہے کہ حضور اکرمؐ نے جب سنا تو بے اختیار رو پڑے، آپ نے اسے دوبارہ بیان کرنے کے لیے کہا ۔ جب اس نے اعادہ کیا تو حضورؐ اسقدر روئے کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی اور آپ نے اسے فرمایا : اِنَّ اللہ قد وَضَعَ عَنِ الجاھلیّۃ ما عَمِلُوا ۔ فاستأنِف عملک (تفسیر القاسمی، ۲۷ : ۶۰۷۲)، یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے سابقہ اعمال سے در گزر فرمائی ہے پس تو اب سے نیک عمل کا آغاز کر [بعض محققین نے کہا ہے کہ دوسرے معاصی کو چھوڑ کر اس کا ذکر آثارِ قیامت و احوال حشر میں کرنے سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ سب سے پہلے پرسش خون کی ہوگی اور خون کے مقدمات میں اس دفعہ کے مجرم سب سے پہلے پیش ہوں گے (عبدالماجد دریابادی : تفسیر ماجدی، ص ۱۱۷۸، مطبوعۂ لاہور)] ۔ سورت کے آخر میں رسالت محمّدی کا یقین دلایا گیا ہے اور قرآن حکیم کی حقانیت کی طرف توجہ مرکوز کی گئی ہے کہ ایسے جامع اور کامل ضابطۂ ہدایت کو چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ جس کا لانے والا امین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی خطا، لغزش اور خیانت سے محفوظ رکھا ہے (الرازی : التفسیر الکبیر ۳۱ : ۷۴) پس ہر وہ شخص جو ہدایت کا طالب ہے، اسے خود کو قرآن حکیم سے وابستہ کر لینا چاہیے (ابن کثیر : تفسیر القرآن العظیم، ۴ : ۴۸۰) ۔

مآخذ : (۱) الراغب الاصفہانی : المفردات فی غریب القرآن، مطبوعہ قاہرہ؛ (۲) السیوطی : الاتقان، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۳) السیوطی : الدرالمنثور، قاہرہ ۱۳۱۴ھ؛ (۴) الرازی : التفسیر الکبیر، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۵) ابن کثیر : تفسیر القرآن العظیم، لاہور، ۱۹۷۳ء؛ (۶) سید قطب : فی ظلال القرآن، مطبوعۂ بیروت؛ (۷) طنطاوی جوہری : الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، قاہرہ ۱۳۵۰ھ؛ (۸) محمد مصطفٰی المراغی : تفسیر المراغی، قاہرہ ۱۹۴۲ء؛ (۹) محمد جمال الدین القاسمی : تفسیر القاسمی، مصر ۱۹۱۴ء؛ (۱۰) محمد محمود حجازی : التفسیر الواضح، قاہرہ ۱۹۶۸ء؛ (۱۱) ابوالاعلٰی مودودی : تفہیم القرآن، لاہور ۱۹۷۰ء؛ (۱۲) ابو عیسٰی الترمذی : الجامع السنن، قاہرہ ۱۹۳۴ء؛ (۱۳) [عبدالماجد دریا بادی : تفسیر ماجدی، ص ۱۱۷۸، لاہور ۱۹۷۲ء].

(بشیر احمد صدیقی)

کوہاٹ : پاکستان (صوبۂ سرحد) کا ایک شہر اور ضلع، رقبہ ۲۶۹۳ سربع میل، ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی ۳۰۰۶۸۲ نفوس ہے ۔ مغربی پاکستان کے شمال مغربی صوبۂ سرحد میں واقع ہے ۔ اس کے شمال اور شمال مغرب میں کوہ سفید کا مشرقی سلسلہ ہے، مغرب میں تورغر کا پہاڑی سلسلہ ہے اور جنوب میں چورب غر کی پہاڑیاں ۔ مشرق میں دریائے سندھ بہتا ہے ۔ کوہاٹ پہاڑی علاقہ ہے، جس میں نشیب و فراز زیادہ ہیں، اوسط بلندی دو ہزار فٹ کے قریب ہے ۔ اس علاقے میں بے شمار موسمی ندیاں بہتی ہیں جن میں کوہاٹ توی اور

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

تیرا توی کے دریا بھی شامل ہیں ۔ بارش غیر یقینی ہے، اوسط مقدار ۱۸ء ۱۶ ہے ۔ اس ضلع میں تین تحصیلیں ہیں: کوہاٹ، تیری اور ہنگو ۔ اس علاقے میں بنگش اور خٹک نامی دو پٹھان قبیلے آباد ہیں۔ قبیلۂ بنگش میراں زئی کی وادی اور ضلع کے مغربی حصے میں آباد ہے اور خٹک اس ضلع کے مشرقی حصے میں دریائے سندھ کے کنارے تک پھیلے ہوئے ہیں ۔ یہاں کے لوگوں کی عام زبان پشتو ہے ۔

عام پیشہ زراعت ہے ۔ باجرہ، گندم، جوار چنے اور جو کی پیداوار ہوتی ہے۔ ٹوکریاں، چٹائیاں اور چمڑے کا مال بنانا، کپڑا بننا یہاں کی دستکاریاں ہیں ۔ جنوبی سلسلۂ کوہ کے وسطی حصوں میں ۔ یعنی بہادر خیل اور جٹہ اسمٰعیل میں نمک کے بہت بڑے ذخیرے ہیں ۔ بہادر خیل کے قریب یہ نمک کانوں سے نکالا جاتا ہے ۔

کوہاٹ (آبادی ۱۹۵۱ء میں ۴۰۸۹۱) پشاور سے ۳۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے، یہاں فوجی چھاؤنی ہے ۔ فوجی نقطۂ نظر سے یہ ایک مستحکم مقام ہے، جو درۂ قرم کے راستوں کی حفاظت کرتا ہے ۔

مأخذ : (۱) *Imperial Gazetteer of India, Provincial Series N.W.F.P.*، کلکتہ ۱۹۰۸ء، ص ۱۶۷ ببعد.

(R. WHITEHEAD)

⊗ تعلیقہ : کوہاٹ کو پختہ سڑک کے ذریعے ایک طرف پشاور اور دوسری طرف بنوں کے ساتھ ملایا گیا ہے ۔ مشرق میں دریائے سندھ پر پل تعمیر کرکے ریلوے لائن راولپنڈی تک پہنچائی گئی ہے ۔ اس طرح قصبے کا رابطہ بیرونی علاقوں سے قائم ہو گیا ہے ۔ میٹرک تک تعلیم مفت ہونے کے باعث پڑھنے کا شوق بڑھ رہا ہے ۔ یہاں ایک ڈگری کالج بھی ہے ۔ پاکستان بھر کی بری، بحری اور ہوائی افواج کے کمیشن کے امیدواروں کے آخری انتخاب (ISSB) کا مرکز بھی یہیں ہے ۔ جس سے شہر کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے امرود، انار، سیب، خوبانی وغیرہ پھل بھی علاقے میں پیدا ہوتے ہیں اور ادھر ادھر بھیجے جاتے ہیں [عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا].

(ادارہ)

کوہِ بابا : کوہِ بُبک، کوہِ مالک سیاہ، کوہِ سفید، کوہِ سیاہ، کوہِ تافتان ۔ افغانستان کا سب سے بڑا کوہستانی نظام ہندو کُش اور اس کا وہ عظیم مغربی سلسلہ ہے جو کابل کے مغرب میں واقع کوہ کوہ بابا اور اس دہرے سلسلے پر مشتمل ہے جسے دریائے ہری رود، جو مغربی سمت میں ہرات کی جانب اور اس کے پاس سے بہتا ہے، تقسیم کرتا ہے اور جس کا پانی بھی بہہ کر اس میں جاتا ہے ۔ کوہِ سفید اس دہرے سلسلے کا جنوبی حصہ ہے ، شمالی سلسلہ مشرق سے مغرب کی طرف جاتا ہوا علی الترتیب پیرو پے می سس (Paropamisus) کوہ بُبک اور کوہِ سیاہ کے نام سے مشہور ہے، سفید کوہ اس اہم سلسلۂ کوہ کا بھی نام ہے ۔ یہ وادی جلال آباد کو جو دریائے کابل پر واقع ہے، وادی کُرم اور آفریدی تیراہ سے جدا کرتا ہے، اس کی بلند ترین چوٹی ''سکا رام'' سطح سمندر سے ۱۵۶۰۰ فٹ بلند ہے ۔ ایران سے ملنے والی بلوچستان کی مغربی سرحد پر پہاڑوں کے جو متوازی سلسلے ہیں، یہ کوہ تافتان کے نام سے موسوم ہیں ، ان کی انتہائی بلندی ۱۳۵۰۰ فٹ ہے اور یہ شمال مغربی سمت پھیلتے ہوئے کوہِ مالک سیاہ سے جا ملتے ہیں جو سیستان کے مغرب میں واقع ہے ۔

کوہِ بابا کی بلند چوٹیوں سے افغانستان کے دریاؤں یعنی ہری رُود، ہلمند اور دریائے کابل کے سرچشمے نظر آتے ہیں اور یہ چوٹیاں ۱۷۰۰۰ فٹ کی بلندی تک جا پہنچتی ہیں (شملہ فولادی کی بلندی :

www.besturdubooks.wordpress.com

۱۶۸۷۰ فٹ ہے) - یہ سلسلۂ کوہ ان پہاڑوں کا ایک حصہ ہے جو جغرافیائی اعتبار سے براعظم ایشیا کو تقسیم کرتے ہیں - یہ پہاڑ، ناہموار اور بے آب و گیاہ ہیں، ان پر چڑھنے کے لیے مشکل ہی سے کوئی راستہ ملتا ہے - سر ٹومس ہولڈچ Sir Thomuas Holdich نے *The Gates of India* میں اس خطے کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک بنجر سطح مرتفع ہے جس میں نشیب و فراز بہت ہیں اور جسے پہاڑوں کے تنگ سلسلے کاٹتے ہیں - ان پہاڑوں کی چوٹیاں ۱۲ ہزار سے ۱۴ ہزار فٹ تک بلند ہیں - یہاں موسم سرما طویل اور شدید ہوتا ہے - اس موسم میں یہاں سے گزرنا غیر ممکن ہو جاتا ہے یہاں مغلوں کی ایک مختصر سی آبادی ہے جو بڑی عسرت اور تنگی کی زندگی بسر کرتی ہے - ہری رود مذکورۂ بالا عمودی اور ہموار ڈھلانوں والے پہاڑوں کے درمیان ایک گہری اور تنگ گھاٹی میں سے گزرتا ہوا ہرات کی جانب بہتا ہے - پہاڑوں کے ان سلسلوں کی بلندی بتدریج کم ہوتی چلی جاتی ہے، حتیٰ کہ وہ مشہد کے قریب ایران کے میدانوں میں نظر نہیں آتے.

وسطی افغانستان کے پہاڑوں میں ابھی تک عملی طور پر کوئی تحقیق نہیں ہو سکی.

آخذ : رک بذیل مادۂ افغانستان.

(R. B. WHITEHEAD)

⊗ **کوہ مکلی** : یہ بحیرۂ عرب کے ساحل اور کوہ مکران کو ملانے والے ہاڑہ اور پب وغیرہ پہاڑوں کی سب سے چھوٹی شاخ ہے - یہ ٹھٹھہ (سندھ) کے بالکل متصل اور تقریباً بارہ میل لمبی ہے - جس کے چھے مربع میل کے رقبے میں مشرقی ممالک کا سب سے بڑا گورستان ہے - اس میں موجود مقبرے بہت ممتاز ہیں - تحفۃ الکرام میں ہے کہ قدیم زمانے میں یہاں سہسہ لنگ کے تالاب پر عالیشان محلات بنے ہوئے تھے، جو اب نابود ہو چکے ہیں (ترجمۂ اردو، ص ۵۶۶)-۱۱۷۱ء سے پہلے یہاں ایک ہندو برہمن خاندان کی حکومت تھی - محمد بن قاسم کی آمد سے یہاں کی حکومت عربوں کو ملی - ۱۰۲۶ء میں محمود غزنوی کے وزیر عبدالرزاق نے ٹھٹھہ کو فتح کیا اور خلیفۂ بغداد کے مقرر کردہ عرب حاکموں کو یہ جگہ چھوڑنی پڑی - اس کے کچھ عرصے بعد سومرہ لوگ ٹھٹھہ پر قابض ہوئے جن سے فیروز تغلق کے عہد میں عمر بن بینو سمّہ خاندان کے ایک سردار نے ۱۳۵۱ عیسوی کے قریب اقتدار حاصل کیا - سمون کا خطاب جام تھا - انھوں نے کوہ مکلی پر سامونی میں اپنا صدر مقام بنایا جو ٹھٹھہ سے تین میل شمال مشرق میں تھا - انھیں کے عہد سے مکلی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی.

بارش کے موسم میں یہاں کے جا بجا تالاب پانی سے لبریز ہو جاتے ہیں اور ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے - پہلے یہ ہوا کرتا تھا کہ ٹھٹھے کے لوگ دل بہلانے کے لیے گروہ در گروہ مکلی پر اس طرح محفلیں جمایا کرتے تھے جیسے قریب کے دوسرے باغات میں - سمہ عہد تھا اور غالباً جام جونا کا زمانہ، جب شیخ حماد جمالیؒ ابن شیخ رشید الدین نے مکلی پر سامونی کے زیریں حصے میں عبادت کے لیے خانقاہ قائم کی جو بالآخر سلوک و معرفت اور علوم ظاہری کی تعلیم کا مرکز بن گئی - جب جام تماچی کو سندھ کی حکومت ملی تو وہ ایک کثیر رقم بطور نذر لے کر شیخ حماد جمالی کی خدمت میں حاضر ہوا اور دعا کی التماس کی - انھوں نے فرمایا کہ اس رقم سے میری خانقاہ کے متصل ایک مسجد تعمیر کرا دو - اس نے مسجد تعمیر کرائی جو مسجد مکلی کے نام سے مشہور ہوئی اور بعد میں تمام پہاڑی بھی اسی نام سے موسوم ہوئی - شیخ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

موصوف نے تعمیر مسجد کے بعد سمون سے کہا کہ آئندہ سے جو لوگ فوت ہوں ان کی قبریں اس مسجد کے آس پاس ہی بنوائیں، چنانچہ سلاطین سمّہ اور دوسرے لوگ یہاں دفن ہونے لگے، ورنہ اس سے پہلے سمون کا قبرستان پیرآر (پیر پٹھو) تھا۔ مسجد کی چار دیواری جام نظام الدین عرف جام نند کے مقبرے کے سامنے خستہ حالت میں موجود ہے۔ اعجاز الحق قدوسی نے مسجد مکلی کا سال تعمیر ۷۹۲-۷۹۳ھ/ ۱۳۸۹-۱۳۹۰ء بتایا ہے (دیکھیے: تاریخ سندھ، ج ۲، حاشیہ ص ۳۱۹)۔ شیخ حماد جمالیؒ جب فوت ہوئے تو ان کا مزار بھی وہیں بنا جہاں ان کی خانقاہ تھی۔ ان کا مقبرہ مکلی میں جام نند کے مقبرے کے قریب اور مسجد مکلی کے برابر نہایت خستہ حالت میں نظر آتا ہے لیکن تحفۃ الکرام کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ شیخ حماد جمالیؒ سے پہلے میاں لال جو مخدوم لعل شہباز قلندر (م-۶۷۳ھ/ ۱۲۷۴ء) کے سگے یا چچیرے بھائی تھے، یہاں دفن ہو چکے تھے۔ ان کی قبر شیخ جیو کے مزار کے مشرق میں ہے (دیکھیے: تحفۃ الکرام، ص ۷۰۲)۔ اس طرح یہ پہاڑی اولیائے کرام اور سلاطین و امرا کا ایک ایسا قبرستان بن گئی جو اپنی عظمت اور تاریخ کے اعتبار سے ممتاز ہے۔

مکلی کی وجہ تسمیہ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ایک پاکدامن، خدا رسیدہ خاتون جس کا نام مکلی تھا، مسجد کی محراب کے زیر سایہ مدفون ہیں، ان کی وجہ سے شیخ حماد نے مسجد کو مسجد مکلی کے نام سے موسوم کیا پھر رفتہ رفتہ قبرستان کا بھی یہی نام پڑ گیا۔

سمّہ حکمرانوں کا عہد سلطنت ۷۵۱-۹۲۶ھ/ ۱۳۵۰-۱۵۱۹ء تک رہا اور اگر اس میں سلطان فیروز شاہ بن سلطان نظام الدین جام نندہ کا وہ زمانہ بھی شامل کر لیا جائے جو اس نے شاہ بیگ ارغون کے ماتحت گزارا تو پھر یہ عہد سلطنت شوال ۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء تک رہا [دیکھیے: تاریخ معصومی، ص ۳۶۳ تا ۳۶۵] - ۱۷۷ سال کے اس عرصے میں بعض نامور اولیائے کرام اس قبرستان میں دفن ہوئے۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ (م ۱۲۶۲ء) کی اولاد میں سے شیخ نعمت اللہ ٹھٹھے میں آئے، یہ صاحب کمال بزرگ تھے۔ ٹھٹھے میں وفات پائی اور مکلی میں دفن ہوئے۔ ان کے فرزند شیخ جیو (جیہ) بھی مقتدر ولی اور عارف تھے۔ تذکرۂ صوفیائے سندھ میں انہیں چراغ مکلی، کہا گیا ہے اور تحفۃ الکرام میں وفور تجلیات کے باعث مکلی کا دریا۔ ہر ماہ کے پہلے پیر کو مزار پر عقیدتمندوں کا بڑا اجتماع ہوتا تھا۔ رات عبادت میں گزرتی تھی اور وجد و سماع کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ پوری مکلی پہاڑی پر سب سے ممتاز درگاہ انہیں کی ہے۔ اس وقت ان کے مزار پر ایک بڑا گنبد ہے جس میں کئی قبریں ہیں۔ ان کی درگاہ کے عقب میں ان کے والد کی قبر ہے۔ شیخ طلحہ بھی شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی اولاد میں سے تھے۔ کامل ولی تھے اور مکلی ہی میں مدفون ہیں۔ شیخ حمادؒ کی خانقاہ کے عقب میں ایک بزرگ قاضی عبداللہ بن تاجو کا مزار ہے۔ قطب الاقطاب سید محمد حسین پیر مراد ۸۹۳ھ/ ۱۴۸۷ء میں فوت ہوئے۔ جن کا سلسلۂ نسب بیسویں پشت میں حضرت امام موسی کاظمؒ سے ملتا ہے، انہوں نے ٹھٹھے میں مسجد صفہ تعمیر کرائی۔ ان کی تبلیغی کوششوں سے ہزاروں لوگ مستفیض ہوئے۔ مکلی میں ان کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ سمّہ عہد کے اختتام کے قریب سید محمد مہدی جونپوری ۹۰۶ھ/ ۱۵۰۰ء میں سندھ آئے اور مکلی پہاڑی پر اقامت پذیر ہوئے۔ متعدد مقتدر

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

اصحاب ان کے مرید بنے ۔ بعد میں میر محمد یوسف رضوی بھکر کی سکونت ترک کر کے ٹھٹھے آئے اور عبادت و ریاضت کے لیے مکلی میں اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں سید محمد مہدی جونپوری ٹھیرے تھے ۔ ان کا شجرۂ طریقت سید صاحب موصوف سے ملتا تھا ۔ ہر شخص میر صاحب کی بزرگی اور ولایت کا معترف تھا ۔ فارسی کے شاعر بھی تھے ۔ مکلی پر ان کا مزار ہے ۔

ابتدائی زمانے ہی میں سمّہ عہد کے قریب قریب مخدوم بلالی (م ۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء) شیخ حسین صفائی (م ۹۳۱ھ/ ۱۵۲۴ء)، سید عیسیٰ لنگوٹی (م ۹۳۱ھ/۱۵۲۴ء)، مخدوم احمد (م ۹۳۴ھ/ ۱۵۲۷ء)، مخدوم رکن الدین عرف مخدوم مٹو (م ۹۴۹ھ/ ۱۵۴۲ء)، مخدوم میراں بن مولانا یعقوب (م ۹۴۹ھ/ ۱۵۴۲ء)، سید علی ثانی شیرازی (م ۹۷۱ھ/ ۱۵۶۳ء)، مخدوم جمعہ (م ۹۸۱ھ/ ۱۵۷۳ء کے قریب)، مخدوم اسمٰعیل سوسرہ (م ۹۹۸ھ/ ۱۵۸۹ء) اور مخدوم نوح ہالائی (م ۹۹۸ھ/ ۱۵۸۹ء) بھی مکلی کے قبرستان میں دفن ہوے ۔ یہ تمام اعلیٰ پائے کے بزرگ تھے ۔ غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے سیّد شاہ منبہ اور شاہ عبداللہ حسنی کے مزارات مکلی پہاڑی پر ہیں ۔ ثانی الذکر ۱۰۹۳ھ/ ۱۶۸۲ء کے لگ بھگ فوت ہوے ۔ سندھ میں سیّد عبداللہ صحابی کے لقب سے مشہور ہیں ۔ ہر خاص و عام کا آج بھی ان کے مزار پر ہجوم رہتا ہے ۔ مزار کی جدید عمارت ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۱ء میں تعمیر ہوئی اور سارے مکلی میں یہی ایک عمارت نئی وضع کی نظر آتی ہے ۔ اس قبرستان میں بعد کے دفن ہونے والے بزرگوں میں مخدوم ابوالقاسم معروف حضرت نقشبندی (م ۷ شعبان ۱۱۳۸ھ/ ۱۰ اپریل ۱۷۲۶ء) کا مقام بڑا بلند ہے ۔ سندھ میں سلسلۂ نقشبندیہ کو غیر معمولی فروغ انھیں کی وجہ سے حاصل ہوا ۔ مستجاب الدعوات تھے ۔ ان کے مریدین اور خلفا کی تعداد کثیر ہے ۔ ایک بزرگ نے انھیں ''خورشید مکلی'' کہا ہے، شاعر بھی تھے ۔

مکلی میں دفن ہونے والے چند بزرگوں کا سطور بالا میں نام لیا گیا ہے ورنہ میر علی شیر خان تحفۃ الکرام میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق سوا لاکھ اولیاے کرام یہاں مدفون ہیں [دیکھیے : ص ۵۶۷] ۔ اگر اس تعداد کو مبالغہ آمیز کہا جائے تو ضلع ٹھٹھہ کی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں جو تعداد بتائی گئی ہے، وہ قرین قیاس نظر آتی ہے ۔ اس میں کہا گیا ہے کہ مکلی میں تین ہزار اولیا اللہ کی قبریں ہیں ۔ اور ان میں ''۴۰'' ایسے ہیں جن کا سندھ میں بڑا احترام کیا جاتا ہے ۔ سندھ سے متعلق کتب کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سے ایسے بزرگوں کے نام مل جاتے ہیں جن کے مزارات مکلی پہاڑی پر ہیں ۔ سندھ میں طریقت کے تین سلسلے قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ قائم رہے ہیں اور ان تینوں سلسلوں کے بزرگ اس قبرستان میں مدفون ہیں ۔ مزید معلومات کے لیے ذیل میں دیے ہوے ماخذ کے علاوہ دیکھیے مکلی نامہ اور حواشی مکلی نامہ مرتبۂ حسام الدین راشدی ۔

صوفیہ کے علاوہ علما و فضلا بھی مکلی پر مدفون ہیں ۔ ان میں سے ایک محمد معین ہیں جو صوفی با صفا ہونے کے علاوہ غیر معمولی تبحر علمی کے مالک تھے ۔ عربی اور فارسی کی بعض کتابیں ان کی یادگار ہیں ۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے ۔ ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء میں فوت ہوے اور اپنے شیخ مخدوم ابوالقاسم کی پائنتی دفن ہوے ۔ مخدوم محمد ہاشم (م ۱۷۶۱ء) بھی علم و فضل میں شہرت رکھتے تھے ۔ مکلی کے قبرستان میں مزار

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

ہے ۔ اسی طرح میر علی شیر قانع ٹھٹھوی (م ۱۷۸۸ء) ہیں جو خاندان شکر اللّٰہی کے قبرستان مکلی میں دفن ہیں۔ میر عظیم الدین عظیم درباری شاعر تھے۔ ۱۸۳۳ء میں فوت ہوئے اور مکلی میں دفن ہوئے ۔ مقبروں کے علاوہ مکلی پر مسجدیں بھی ہیں۔ چنگیز خان کی اولاد میں سے تنہا خسرو خان چرکسی نے ٹھٹھہ، مکلی اور شہر کے گرد و نواح میں متعدد مسجدیں اور درگاہیں تعمیر کرائی تھیں ۔ قدیمی مساجد کے علاوہ مکلی کے قبرستان کی بھی ایک مسجد ہے۔

اب مکلی کے قبرستان میں دفن ہونے والے سلاطین اور امرا کا مختصر سا ذکر کیا جاتا ہے ۔ سطور بالا میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ شیخ حماد جمالی نے سلاطین سمہ سے کہا تھا کہ آئندہ فوت ہونے والوں کو مسجد مکلی کے آس پاس دفن کیا کریں ۔ چنانچہ اس کے بعد تمام جام صاحبان وہاں دفن ہوئے ۔ ان میں سے جام نظام الدین عرف جام نندو (۱۴۶۰ تا ۱۵۰۸ء) کا مقبرہ بہت نمایاں ہے ۔ اس کا دور حکومت سمہ حکمرانوں کا سنہری زمانہ تھا۔ اس کے مقبرے کا کچھ حصہ اب خستہ حالت میں ہے ۔ اس کے باوجود سنگتراشی کے اس فن کا یہ بہترین نمونہ ہے جسے نیم خود مختار عرب حکمرانوں نے پندرھویں صدی عیسوی میں اسلامی اور مغربی ہند کے فن کے امتزاج سے ٹھٹھے میں فروغ دیا ۔ مذکورۂ بالا مسجدیں بھی اسی فن تعمیر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ میرزا عیسٰی ترخان اور ان کی اولاد کے مقبرے ہیں ۔ میرزا عیسٰی ترخان زیریں سندھ کا پہلا ترخان حکمران تھا ۔ ان کے مقبرے کا عکس دس روپے (روپے) کے نوٹ کی پشت پر چھپتا رہا ہے۔ حکمرانوں کے ان مقبروں کے ساتھ محکمۂ آثار قدیمہ نے میرزا جانی بیگ ترخان، مرزا غازی بیگ ترخان، میرزا طغرل بیگ، نواب امیر خان خلیل اور دیوان شرفہ خان کے مقبروں کو محفوظ قدیمی عمارات قرار دے دیا ہے اور کتبے لکھوا دیے ہیں ۔ فن تعمیر کے اعتبار سے دیوان شرفہ خان کے مقبرے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا گنبد سرخ اینٹوں سے بنا ہوا ہے جس میں نیلے سبز رنگ کی مینا کاری کی گئی ہے دوسرے مقبروں کے گنبد سفید ہیں ۔ مغلوں کی حکومت شروع ہوئی اور ان کے مقرر کردہ صوبیدار ٹھٹھے آنے لگے تو بعض یہاں فوت ہوئے اور مکلی پہاڑ پر دفن ہوئے ۔ ان کے مقبرے مکلی کے ممتاز مقبروں میں شامل ہیں۔

الغرض صوفیہ اور علما کے مقابر، سلاطین اور شاہی صوبیداروں کی شاندار قبریں، ان پر محراب نما یا گنبد نما چھتیں مکلی پہاڑی پر اپنی عظمت اور شان دکھاتی نظر آتی ہیں ۔ ان کے درمیان خستہ حال گنبد اور حجرے اور سیکڑوں سنگین تابوت یا قبریں موجود ہیں ۔ چودھویں سے اٹھارھویں صدی عیسوی تک سندھ میں جو فن تعمیر رائج رہا، اس کے بھی یہاں بے مثال نمونے ملتے ہیں ۔ پہاڑی میں سے ایک سڑک بنائی گئی ہے جس پر سے ادھر ادھر مزارات پر جانا آسان ہے ۔ قبرستان کی تاریخی عظمت کے زیر نظر سیاح لوگ یہاں آتے جاتے رہتے ہیں ۔ جنگ شاہی ریلوے سٹیشن سے پکی سڑک پہنچتی ہے ۔ پہاڑی پر قومی شاہراہ کے ساتھ ساتھ ہاشم آباد کے نام سے ایک مضافاتی بستی تعمیر ہوئی ہے جو ٹھٹھے سے دو میل دور ہے ۔ ضلع کے انتظامی دفاتر اسی جگہ واقع ہیں۔

مآخذ : (۱) میر علی شیر قانع: تحفۃ الکرام، مترجمۂ اختر رضوی، کراچی ۱۹۵۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۲) میر محمد معصوم: تاریخ معصومی، مترجمۂ اختر رضوی، کراچی ۱۹۵۹ء، بمدد اشاریہ؛ (۳) اعجاز الحق قدوسی: تاریخ سندھ، ج ۲، لاہور ۱۹۷۴ء، بمدد اشاریہ؛ (۴)

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

اعجاز الحق قدوسی : تذکرۂ صوفیاے سندھ، کراچی ۱۹۵۹ء؛ (۵) *Gazetteer of the Province of Sindh*، کراچی ۱۹۰۷ء، بمددِ اشاریہ؛ (۶) *Thatta District Census Report, Census of Pakistan, 1961*، مطبوعۂ کراچی. [یہ مقالہ عبدالغنی رکنِ ادارہ نے لکھا].

(ادارہ)

⊗ **کوہِ نُور** : کم از کم ایشیائی ممالک میں جو شہرت کوہ نور کو حاصل ہے وہ شاید کسی دوسرے ہیرے اور قیمتی پتھر کو حاصل نہیں، حالانکہ دوسرے قیمتی پتھروں کے مقابلے میں نہ تو یہ وزن میں زیادہ بڑا ہے، نہ کوئی اور خاص امتیازی شان رکھتا ہے ۔ وجہ غالباً یہ ہے کہ قدیم زمانے ہی سے اس کی قدر و قیمت کے متعلق عجیب عجیب افسانے مشہور رہے۔ جن کا ذکر آگے آئے گا.

اس میں شک نہیں کہ سلطنت مغلیہ کے خزانے میں بابر کی پانی پت کی فتح سے لے کر نادر شاہ کے حملے تک اس سے زیادہ وزنی ہیرے کا پتا نہیں چلتا ۔ (دیکھیے *The Mughal Treasury of the Indian Mughuls*، ص ۲۳۰ تا ۲۳۵) تاہم خزانۂ شاہی سے باہر ہندوستان ہی میں بعض ایسے ہیرے تاریخوں میں مذکور ہیں جو وزن میں کوہ نور سے کہیں زیادہ تھے اور جن میں سے ایک کی قیمت شاہجہان کے زمانے میں ساڑھے چار لاکھ روپے بتائی جاتی تھی (کتاب مذکور، ص ۲۳۶ تا ۲۳۷) ۔ دنیا میں بہت سے ایسے ہیرے ہیں جن سے وزن اور قیمت کے لحاظ سے کوہ نور مقابلہ نہیں کر سکتا (کتاب مذکور، جدول ۳، ص ۲۴۲ تا ۲۴۹) ۔ کوہ نور صحیح معنوں میں اس ہیرے کا نام ہے جو ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے کے وقت دہلی کے خزانۂ شاہی میں موجود تھا اور اب انگلستان کے شاہی جواہرات میں شامل ہے ۔ اس ہیرے کی تاریخ ۱۷۳۹ء سے لے کر آج تک باوثوق اور معتبر کتب تواریخ پر مبنی ہے ۔ سلسلۂ ثبوت کی تمام کڑیاں مضبوط ہیں اور اس پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے۔ ۱۷۳۹ء سے قبل کی تاریخ بھی معتبر حوالوں پر مبنی ہے، مگر کہیں کہیں ثبوت کی کڑیاں کمزور ہیں اور محققین میں جا بجا اختلاف ہے اس لیے ترتیب تاریخی کو نظر انداز کر کے یہ بہتر ہو گا کہ ہم آخری حصے کو پہلے قلمبند کریں، کیونکہ اس کی بنیاد مضبوط ہے .

''کوہ نور'' کا ذکر تاریخ میں نادر شاہ کے زمانے میں آیا ہے ۔ نادر شاہ نے جب ہندوستان پر حملہ کیا اور وہ دہلی کے خزانوں پر متصرف ہوا تو اس وقت ایک بڑا ہیرا اس کی نظر سے گذرا ۔ اس کی چمک دمک سے نادر شاہ ایسا متأثر ہوا کہ اس لیے اس کا نام ''کوہ نور'' رکھ دیا ۔ اس وقت سے اس کا یہی نام مشہور ہے (عمدۃ التواریخ از موہن لال، دفتر دوم، ص ۱۳۱).

۱۷۴۷ء میں نادر شاہ مارا گیا اور یہ ہیرا اس کے بعد بہت سے بادشاہوں کے ہاتھوں سے منتقل ہوتا ہوا شاہ شجاع کے پاس پہنچا ۔ شاہ شجاع کے تخت کابل پر بیٹھنے کے بعد الفنسٹن Elphinstone جب اس سے ۱۸۰۹ء میں پشاور میں ملا تو اس نے شاہ شجاع کو یہ ہیرا اپنے بازو پر باندھے ہوے دیکھا.

شاہ شجاع اور اس کے بھائیوں کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہیں اور ان کا سلسلہ نہ صرف کابل تک محدود رہا بلکہ کشمیر اور پنجاب تک پھیل گیا ۔ حتی کہ شاہ شجاع قید ہوا اور اسے جان کا خطرہ لاحق ہو گیا ۔ اس کی بیوی وفا بیگم نے (جو اس وقت لاہور میں تھی) رنجیت سنگھ (م ۱۸۳۹ء) سے وعدہ کیا کہ اگر رنجیت سنگھ شاہ شجاع کو رہائی دلوا دے تو وہ کوہ نور اسے دے دیگی ۔ آخر کار شاہ شجاع نے رہائی پاکر بہت پس و پیش کے بعد کوہ نور

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیا۔

ایک انگریز مصنف کا بیان ہے کہ رنجیت سنگھ اسے اکثر پہنا کرتا تھا ۔ (ظفر نامۂ رنجیت سنگھ از دیوان امر ناتھ، طبع سیتا رام کوہلی)، ص ۱۷۰، ۱۷۱، مرتے وقت رنجیت سنگھ نے وصیت کی کہ یہ ہیرا جگن ناتھ کے مندر کو دیا جائے، مگر اس خواہش کی تعمیل نہ ہو سکی۔ ۱۸۴۹ء میں جب دلیپ سنگھ نے تخت چھوڑا تو یہ ہیرا انگریزی حکومت کو دے دیا گیا ۔ آخر کار اگلے سال ملکۂ وکٹوریہ کو نذر کر دیا گیا۔ ۱۸۵۱ء میں لنڈن کی ایک بڑی نمائش میں یہ ہیرا رکھا گیا ۔ اس وقت اس کا وزن ۱۸۶.۰۶ (قیراط انگریزی (589.52 grs. Troy =) تھا ۔ ۱۸۵۲ میں اسے لنڈن میں دوبارہ تراشا گیا جس پر ۳۸ دن اور ۸۰۰۰ پاونڈ خرچ ہوئے ۔ اس تراشے سے اس کا وزن ۱۸۶.۰۶ قیراط انگریزی سے گھٹ کر $\frac{1}{16}$ ۱۰۶ قیراط انگریزی (اور بقول ایک دوسرے مصنف کے $\frac{1}{4}$ ۱۰۲ قیراط) رہ گیا ۔ اب ہم ۱۸۳۹ء سے قبل کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں : بابر نامہ میں مذکور ہے کہ جب مصنف (بابر) نے پانی پت کی جنگ میں ابراہیم لودی کو شکست دی جس میں گوالیار کا راجہ بکرماجیت مارا گیا تھا تو ہمایوں اس کے آنے سے پہلے آگرے پہنچ گیا ۔ اس وقت بکرماجیت کے کنبے نے کچھ جواہرات ہمایوں کی نذر کیے، ان میں یہ ہیرا بھی تھا، جو ہمارا موضوع بحث ہے ۔ جب بابر آگرے پہنچا تو ہمایوں نے یہ ہیرا بابر کی خدمت میں پیش کیا، لیکن بابر نے اسے ہمایوں ہی کو دے دیا ۔ اس کی قیمت کے متعلق بابر نامہ کے مختلف نسخوں اور ترجموں میں بے حد اختلاف ہے اور ابو الفضل کا بیان ان سب سے الگ ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے *Imperial Treasury of the Indian Moghuls*، ص ۱۸۳ و حاشیہ ۲) ۔ ایک روایت کے مطابق اس ہیرے کی قیمت تمام دنیا کے روزانہ خرچ کے نصف کے برابر ہے (ایک اور روایت کے مطابق تمام دنیا کے ایک دن کے خرچ کے برابر ہے)۔ اور ایک تیسری روایت یہ ہے کہ اس کی قیمت تمام دنیا کی اڑھائی دن کی خوراک کے مساوی ہے۔ اس کے وزن کے بارے میں بابر لکھتا ہے کہ یہ ۸ مثقال ہے، جو برابر ہے، ۲۲۱.۶ جوہری رتی = ۵۸۹.۴۴ گرین کے (اوزان کے متعلق مصنف ہذا نے اپنی کتاب، باب ۱، حصہ ۱، ص ۱۱۷ تا ۱۳۴ پر مفصل بحث کی ہے) ۔ یہ صحیح طور پر پتا نہیں چلتا کہ یہ ہیرا گوالیار کے راجاؤں کے قبضے میں کیسے آیا ۔ البتہ اتنا سراغ ملتا ہے کہ اسی وزن کا ایک ہیرا ۱۲۹۴ء سے قبل مالوے کے راجاؤں کے پاس تھا ۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ ۱۲۹۴ء میں علاء الدین نے اپنے چچا جلال الدین خلجی کے عہد میں مالوے پر حملہ کیا اور اس کو فتح کر کے اجین کے خزانوں پر قابض ہو گیا (دیکھیے N. Story : *Maskelyne's article, the Koh-i-Nur*، تنقیدی مقالہ در *Nature*، ۸ اکتوبر ۱۸۹۱ء، ص ۵۵۶) ۔ قیاس ہے کہ شاہی جواہرات کے زمرے میں وہ ہیرا بھی خلجیوں کے خزانے میں آ گیا ہوگا ۔ مگر پھر بھی یہ ثابت نہیں کہ یہ علاء الدین خلجی کے قبضے سے گوالیار کے راجاؤں کے پاس کیسے پہنچا ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر پھرتا پھراتا مارواڑ کے قریب پہنچا تو راجا مالدیو کا ایک کارکن سوداگر کے بھیس میں ہمایوں کے خیمے میں آیا اور اس نے اس ہیرے کو خریدنے کی خواہش ظاہر کی ۔ ہمایوں اس کی چال سمجھ گیا ۔ ابوالفضل لکھتا ہے ''حضرت جہانبانی فرمودند کہ باین مشتری خاطر نشان کنید کہ امثال این جواہر گرانبہا

www.besturdubooks.wordpress.com

بخریدن بہم نمی رسد ۔ یا بجوہر شمشیر آبدار بدست افتد کہ رائے جہان آرائے باو انضمام یافتہ باشد یا بعنایت پادشاہان والا میسر مے شود" ۔(اکبر نامہ دفتر اول، ص ۱۸۰) ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ہیرے کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی ۔ پھر ہمایوں ہندوستان کی فتح سے مایوس ہو کر ایران پہنچا تو شاہ ایران نے ہمایوں کا خوش دلی سے خیر مقدم کیا ۔ ہمایوں نے احسان مندی کے طور پر یہ ہیرا مع ۲۰۰ بدخشی لعلوں کے شاہ طہماسپ کے پیش کر دیا Beveridge : "Babar's Diamond" در Asiatic Quarterly Review جنوری تا اپریل ۱۸۸۹ء، ص ۳۷۰ تا ۳۸۹) ۔ ایک طرف ابوالفضل اس تفصیل کے دوران میں لکھتا ہے کہ ان تحائف کی قیمت اس سے چار گنا زیادہ تھی جو ہمایوں کے استقبال اور تواضع پر خرچ ہوا، دوسری طرف خود شاہ سفیر ابراہیم قطب شاہ والی "کولکنڈہ" کا بیان ہے کہ شاہ طہماسپ کی نظروں میں یہ الماس کچھ زیادہ نہیں جچا ۔ یہی سفیر لکھتا ہے کہ شاہ ایران نے یہ الماس تحفے کے طور پر برہان نظام شاہ والی احمد نگر کے پاس آقائے اسلام مہتر جمال کے ہاتھ بھیج دیا ۔ اس الماس کے اس طرح ہندوستان واپس آنے کی تائید تاریخ فرشتہ سے بھی ہوتی ہے ۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ ہیرا دوبارہ مغلوں کے خزانۂ شاہی، میں داخل ہوا اور داخل ہوا تو کیسے؟ ۔ قیاس ہے کہ جب اکبر نے ۱۶۰۰ء میں احمد نگر کو فتح کیا تو یہ ہیرا دوسری قیمتی اشیاء کے ساتھ اکبر کے خزانے میں آ گیا ہوگا ۔ تاہم اگر یہ خزانۂ شاہی میں دوبارہ داخل ہوتا تو تاریخوں میں اس کا کہیں نہ کہیں ذکر آتا، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بقیہ عہد اکبر، نیز جہانگیر یا شاہجہان کے زمانے میں اس کی کوئی خبر نہیں ملتی ۔ ایسے مشہور ہیرے کا ذکر ضرور آنا چاہیے تھا ۔ بالخصوص ملا عبدالحمید کے پادشاہ نامہ میں جہاں ۲۰ جلوس کے آخر میں خزانۂ شاہی کے قیمتی جواہرات پر ایک بسیط تبصرہ ہے (پادشاہ نامہ ۲ : ۳۹۱)، وہاں اس کا ذکر ہونا چاہیے تھا، مگر نہیں ہے ۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مورخین ایک خاص ہیرے کا ذکر کرتے ہیں جس کا بیان شاہجہان کے زمانے کی تاریخوں میں پایا جاتا ہے ۔

بادشاہنامہ کی جلد ۳ طبع محمد وارث میں مذکور ہے کہ ۱۸ صفر ۱۰۶۶ھ کو جب میر محمد سعید میر جملہ کو ہندوستان کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا تو اس نے کچھ قیمتی جواہرات شاہجہان کی نذر کیے ۔ ان میں ایک ہیرا تھا جس کا وزن ۲۱۶ جوہری رتی تھا اور بادشاہی حکم سے اس کی قیمت ۲۱۶۰۰۰ روپیہ مقرر ہوئی [دیکھیے شاہ نواز خان : مآثر الامرا، لاہور ۱۹۷۰ء، اردو ترجمہ، ۳ : ۴۴۸] کیونکہ اس کا وزن کوہ نور کے وزن کے قریب ہے اس لیے بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ وہی بابر والا ہیرا تھا جو دکن میں موجود تھا اور میر جملہ کے ہاتھ آ گیا اور اس نے لا کر بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا ۔ مگر اس مصنف کے خیال میں اس ہیرے کا نہ کوہ نور سے کوئی تعلق ہے اور نہ بابر والے ہیرے سے ۔ بابر والا ہیرا اور کوہ نور وزن میں برابر ہیں ۔ یعنی ۲۲۰۶ جوہری رتی ۔ میر جملہ والے الماس کا وزن جو غالباً جواہر خانے کے رجسٹروں سے لیا گیا ہوگا، ۲۱۶ جوہری رتی ہے ۔ یعنی اول الذکر سے ۵۰۶ رتی یا ۱۰ گرین کم ۔ یہ ممکن نہیں کہ جس ہیرے کا وزن ۱۶۵۰ء میں ۲۰۶ رتی ہو تو وہ ۱۸۵۱ء میں ۲۲۱ رتی سے زیادہ ہو جائے ۔ آخری نتیجہ یہ ہے کہ اغلباً بابر والا الماس اور کوہ نور ایک ہی ہیں ۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

مآخذ: متن میں درج ہیں۔

(شیخ عبدالعزیز)

• **کوی**: (kiöy) ایک لفظ جو مغربی ترکی میں گاؤں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہ وہ شکل ہے جس میں فارسی لفظ کوی (دیکھیے Bittner: *Der rin Fluss der Arabischen und Persischen auf das Turkische*، *S.B. Ak. wien.* ج ۱۴۲، شمارہ ۳۰ ص ۷۰۹) یا غالباً صحیح طور پر لفظ کُوی (Vullers: *Lexicon*، برہان قاطع، ص ۷۰۹) کو ترکی زبان میں مستعار لیا گیا ہے جس کے اصلی معنے راستہ یا گلی کے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے جغرافیائی ناموں کی فہرست میں ہمیں ایسے متعدد مقامات کے نام نظر آتے ہیں جن میں کوی کی ترکیب موجود ہے جیسے بوغاز کوی، ارمنی کوی، وغیرہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلجوقی عہد سے پہلے ان ناموں کا وجود نہ تھا۔ ایک کھلے گاؤں کے مفہوم میں لفظ کوی قصبے کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہے ایک چھوٹا شہر۔ مشرقی ترکی میں مقامات کے ناموں میں گاؤں کے معنوں میں ہمیشہ لفظ کند استعمال ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات اس مؤخرالذکر لفظ کی جگہ کوی بھی استعمال ہوتا ہے (دیکھیے مثلاً Ritter: *Erdkunde*، ۱۱: ۲۲۱) بعد؛ چنانچہ قاضی کند جو الموصل کے قریب واقع ہے قاضی کوی ہوگیا ہے۔

(J. H. KRAMERS)

⊗ **الکویت**: دولت الکویت (State of Kuwait) آزاد و خود مختار عرب امارات جو جزیرہ نمائے عرب کے شمال مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ (*The Encyclopaedia of Britannica*، انڈکس، ۱۹۷۴ء، ۵: ۹۰۷)۔ اس کے مشرق میں خلیج فارس ہے اور شمال میں عراق ہے جس کا علاقہ ریاست کے مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔ ریاست کے مغرب ہی میں سعودی عرب واقع ہے جس کا علاقہ ریاست کے جنوب تک پھیلا ہوا ہے (*World Muslim Gazetteer*، کراچی ۱۹۷۵ء: ۳۰۴)۔ ریاست الکویت کا رقبہ ۶۸۸۰ مربع میل = ۱۷۸۱۸ مربع کلو میٹر ہے (*The New Encyclopaedia Britannica*، انڈکس۔ ۱۹۷۴ء، ۵: ۹۰۶ نیز کتاب مذکور ۱۰: ۵۴۷)۔

عبدالعزیز الرشید نے الکویت کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے اسے لفظ ''کوت'' کا اسم تصغیر قرار دیا ہے: تاریخ الکویت: ۳۰، مطبوعۂ بیروت) اس کا اطلاق قلعے کی طرز پر بنے ہوئے ایک ایسے چوکور مکان پر ہوتا ہے جسے کسی ضرورت کی بنا پر تعمیر کیا گیا ہو اور پھر اس کے اردگرد اس کی نسبت بہت چھوٹے چھوٹے مکان تعمیر کیے گئے ہوں۔ اور اس مکان سے دخانی جہاز اور کشتیاں، لنگر انداز ہو کر، زاد راہ حاصل کرتی ہوں، نیز یہ مکان پانی کے قریب واقع ہو خواہ وہ سمندر ہو یا دریا یا بحیرہ (کتاب مذکور: ۳۰) چنانچہ ایک چھوٹے سے قلعے کے موجود ہونے کی بنا پر اسے ''کویت'' کا نام دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس قلعے کو محمد لصکة بن عریعر نے تعمیر کروایا تھا اور بعد میں اسے قبیلۂ الصبّاح کو دے دیا تھا۔

طبعی حالات: الکویت زیادہ تر میدانی صحرا پر مشتمل ہے جس میں چند نخلستان ہیں۔ یہ باور کیا جاتا ہے کہ کویت کا ساحل، قدیم زمانے سے اب تک، کئی حوادث و تغیرات سے گزر چکا ہے۔ ہزاروں برس پہلے کویت کی ساحلی پٹی زیر آب تھی۔ موجودہ کویت کا علاقہ ریت اور سنگریزوں پر مشتمل ہے۔ ساحل سے پرے متعدد چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جن میں سب سے بڑا بوبیان Bubiyan ہے۔

آب و ہوا: کویت میں شدت کی گرمی پڑتی ہے۔ کبھی موسم گرما میں مئی سے اکتوبر تک کے مہینوں میں موسم مرطوب رہتا ہے۔ اکتوبر سے

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

اپریل تک کے مہینوں میں اکثر و بیشتر ایک سے سات انچ کے مابین سالانہ بارش ہوتی ہے۔ جب بارش کھل کر ہوتی ہے تو پورے صحرا میں، مارچ اور اپریل کے مہینوں میں، سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ اگست میں درجۂ حرارت ۹۰ ہوتا ہے جب کہ جنوری میں ۶۰ درجے رہ جاتا ہے۔ موسم گرما میں بعض دفعہ درجۂ حرارت ۱۲۵ تک جا پہنچتا ہے (*World Muslim Gazetteer*، ۱۹۷۵ء ایڈیشن: ۴۰۳؛ *The New Encyclopaedia Britannica*، ۱۰: ۵۴۸) نومبر کے اواخر میں رات کو خاصی شبنم پڑتی ہے اور صبح کے وقت ہوا میں خاصی نمی آ جاتی ہے (زہرا: *Kuwait Wasmy Home*، ص ۱۲۴ لنڈن ۱۹۵۸ء۔

آبادی: ۱۹۷۲ء کے اندازے کے مطابق، کویت کی آبادی ۸۱۵۰۰۰ تھی (*The New Encyclopaedia Britannica*، انڈکس، ۵: ۹۵۶ نیز کتاب مذکور ۱۰: ۵۴۷) ۱۹۷۳ء کے سرکاری اندازے کے مطابق کویت کی آبادی ۹۱۶۲۰۰ ہے۔ سو فیصد لوگ مسلمان ہیں اور سرکاری زبان عربی ہے (*World Muslim Gazetteer*، ۱۹۷۵ء ایڈیشن: ۴۰۳)۔

دارالسلطنت: کویت کا دارالسلطنت کویت ہے جو ملک کا سب سے بڑا اور سب سے اہم شہر ہے اگرچہ حوالی (Hawalli) آبادی کے اعتبار سے کویت شہر سے بڑھ گیا ہے۔ ملک کی زیادہ تر آبادی شہروں میں آباد ہے۔ مجموعی اعتبار سے کویت دنیا کی اعلیٰ متمدن ریاستوں میں سے ایک ہے (*The New Encyclopaedia Britannica*، ۱۰: ۵۴۷) جہاں دنیا کے ہر خطے سے آئے ہوئے انجینیر، ڈاکٹر، ٹھیکیدار اور تاجر مصروف عمل نظر آتے ہیں۔ پانی سے محروم یہ خطہ اس حد تک قابل رشک بن چکا ہے کہ آج وہاں کے لوگ کشید کیا ہوا سمندر کا پانی پیتے اور ایرکنڈیشنڈ عمارات میں کام کرتے ہیں (کتاب مذکور ۱۰: ۵۴۸)۔

تاریخ: اگرچہ کویت زمانۂ خلافت کی ابتدا ہی سے مسلمان سلطنت کا حصہ رہا ہے لیکن وہاں مستقل آبادی نہیں رہی۔ اور اسی بنا پر اس کی قدیم تاریخ پردۂ اخفا میں ہے۔ اس کے سوا کہ نخلستانوں میں، صحرا نورد عرب، چند مہینوں کے لیے خیمہ زن ہو جاتے جب کہ بارش کا موسم ہوتا اور نخلستان سرسبز ہوتے (*World Muslim Gazetteer*، ۱۹۷۵ء، ص ۴۰۴)۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں عنزہ قبیلے کے چند خاندان عرب کے اندرونی علاقے سے ہجرت کر کے خلیج کے ساحل پر آباد ہونا شروع ہو گئے (*The New Encyclopaedia Britannica*، ۱۰: ۵۴۷)۔ عنزہ عرب کے قبیلوں میں سے ایک مشہور قبیلہ ہے اور آل الصبّاح، آل خلیفہ و آل سعود اسی قبیلے کی شاخیں ہیں۔ (تاریخ الکویت، طبع بیروت، ۳۱) اور انھیں لوگوں سے موجودہ کویت کی قوم کی ابتدا ہوئی، کویت کے اکثر لوگ اسی قبیلے کے مشہور خاندانوں کی اولاد ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے *World Muslim Gazetteer*، ۱۹۷۵ء، ص ۴۰۴)۔ ۱۷۰۹ء میں یہاں کے آباد کاروں نے الصبّاح قبیلے سے ایک شیخ کے تقرر کا فیصلہ کیا (*The New Encyclopaedia Britannica* ۱۰: ۵۴۷) جو ان کے امور کا تصفیہ کرے اور عثمانی ترک خلیفہ سے معاملات میں ان کی نمائندگی کرے جس کے زیر اثر یہ علاقہ تھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں شیخ الصبّاح ثانی کو منتخب کیا [۱۷۰۹ تا ۱۷۷۲ء]۔ صبّاح خاندان کی قیادت میں آبادکاروں کو بڑی تقویت و ترقی حاصل ہوئی اور ۱۷۶۵ء تک آبادی دس ہزار باشندوں تک پہنچ گئی جن کے قبضے میں ۸۰۰ کشتیاں یا چھوٹے جہاز تھے اور جن کا گزارہ تجارت، ماہی گیری اور سمندر

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

سے موتی نکالنے پر تھا (*World Muslim Gazetteer*، ۱۹۷۵ء، ص ۳۰۴)۔

۱۷۷۶ء میں ایران اور ترکی کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ ایرانیوں نے بصرے پر قبضہ کر لیا جو ۱۷۷۹ء تک رہا۔ اسی اثنا میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا ڈاک کا خشکی کا راستہ، بصرے سے کویت تبدیل کر لیا۔ اس طرح بصرے کی بہت سی تجارت کویت منتقل ہو گئی۔ حکومت برطانیہ نے اس علاقے پر ترکی کے قبضے کو اس وجہ سے تسلیم کر لیا کہ ترکی نے برطانیہ کے تجارتی مفادات کو، بحیرۂ روم سے ہندوستان تک کے راستے پر جو خلیج سے گزرتا تھا، تحفظ دیا۔ کویت کے شیخ عبداللہ الصباح نے جو عثمانی ترکوں کو خراج ادا کرتا تھا ۱۸۷۰ء میں بصرے کے ترکی گورنر کا قائم مقام (ایجنٹ) کا خطاب قبول کیا۔ اس کے جانشین شیخ مبارک نے، اس خوف سے کہ مبادا ترک کویت پر قابض ہی نہ ہو جائیں ۱۸۹۹ء میں حکومت برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے اور برطانیہ کے زیر حفاظت آنا منظور کر لیا (کتاب مذکور، ۳۰۵)۔ اس معاہدے کے مطابق، شیخ نہ تو بصورت تفویض نہ بصورت رہن اور نہ کسی اور ہی طریق سے، کسی ملک کو بھی، ماسوا حکومت برطانیہ کے اپنا علاقہ سپرد نہیں کر سکتا تھا اور نہ کسی دوسری حکومت ہی سے، حکومت برطانیہ کی اجازت حاصل کیے بغیر، کوئی معاہدہ کر سکتا تھا (تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ الکویت، مطبوعۂ بیروت، ۸۳)۔ نتیجۃً حکومت برطانیہ نے کویت کے تمام امور خارجہ کی نگرانی خود سنبھال لی (*The New Encyclopaedia Britannica*، ۱۰: ۵۴۷)۔ کویت پر برطانیہ کی نگرانی نے ایک نئے بین الاقوامی تصادم کو جنم دیا۔ ۱۸۹۹ء میں جرمنوں کو بغداد ریلوے کے ضمن میں کچھ مراعات حاصل ہوئیں اور انہوں نے اپنا ایک تحقیقاتی وفد عراق بھیجا تاکہ ریلوے کے راستے (روٹ) کے بارے میں نقشہ تیار کرے جس میں تجویز یہ تھی کہ کویت کو آخری سٹیشن بنایا جائے، لیکن انگریزوں نے مخالفت کی تاکہ کویت پر برطانوی محافظت (Protectrate) قائم ہو سکے (V. Lutsky : *Modern History of Arab Countries*، ۳۵۸ ببعد، ماسکو ۱۹۶۹ء)۔ ایچ آر پی ڈکسن کے بیان کے مطابق لارڈ کرزن نومبر ۱۹۰۳ء میں کویت پہنچے اور برطانوی روابط کو مستحکم کیا، جس کے نتیجے میں ۱۹۰۴ء میں شیخ مبارک اس امر پر آمادہ ہو گئے کہ کویت میں کسی دوسری حکومت کو ڈاک خانہ قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جون ۱۹۰۴ء میں کویت میں ایک برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ کا تقرر عمل میں آیا (Dickson : *Kuwait and Her Neighbours*، ۱۴۰، لنڈن ۱۹۵۶ء) ۱۹۰۹ء میں ترکی اور حکومت برطانیہ کے مابین مذاکرات ہوئے۔ جس میں کویت کو خود مختاری حاصل ہو گئی۔ شیخ سالم نے جو شیخ مبارک کا ۱۹۱۷ء میں جانشین ہوا، پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی حمایت کی جس سے برطانیہ اور کویت کے روابط میں تعطل پیدا ہو گیا۔ شیخ سالم کے بعد ۱۹۲۱ء میں شیخ احمد جابر الصباح جانشین بنا جو حکومت برطانیہ کا دوست تھا۔ شیخ احمد نے ۱۹۳۴ء میں U.S.A. کی گلف آئل کارپوریشن اور اینگلو پرشین آئل کمپنی کو مشترکہ طور پر مراعات دیں۔ جنھوں نے کویت آئل کمپنی کی تشکیل کی۔ ۱۹۳۶ء میں گہری کھدائی شروع کر دی گئی اور اس سے قبل کہ کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوتا دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جنگ کے اختتام پر تیل کی صنعت پر پھر توجہ دی گئی اور چند برسوں میں کویت ایک قدیم طرز کی بندرگاہ سے ایک ترقی پذیر جدید طرز کا شہر بن گیا جس کا انحصار

www.besturdubooks.wordpress.com

تیل کی صنعت سے حاصل ہونے والے محاصل پر تھا۔ شیخ احمد جسے بجا طور پر موجودہ کویت کا معمار کہا جا سکتا ہے، کے دنیا سے رخصت ہونے پر صباح خاندان کے گیارھویں حکمران فضیلت مآب شیخ عبداللہ السالم الصباح فروری ۱۹۵۰ء میں جانشین ہوئے (*World Muslim Gazetteer*، ص ۴۰۵: ۱۹۷۰ء)۔

شیخ عبداللہ کی پالیسی یہ رہی ہے کہ تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی کو عوامی بہبود پر خرچ کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۵۱ء میں رفاہی کاموں، تعلیمی اور طبّی منصوبوں کا ایک جامع پروگرام تیار کیا۔ جس نے کویت کو ایک فلاحی مملکت میں بدل دیا۔ ۱۹ جون ۱۹۶۱ء کو حکومت برطانیہ سے ۱۸۹۹ء کا معاہدہ منسوخ کر دیا گیا اور کویت کو مکمل آزادی و خود مختاری حاصل ہو گئی (*The New Encyclopaedia Britannica*، ۱۰: ۵۴۷)۔ اس کے چھے روز بعد حکومت عراق کے وزیر اعظم نے کویت کو عراق کے جزو لاینفک (Integral Part) ہونے کا دعوٰی کیا۔ اس کے خیال میں کویت سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ تھا اور جغرافیائی، لسانی اور تمدنی اعتبار سے کویت اور عراق ایک ہی ملک ہیں جسے حکومت برطانیہ نے دو خطوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ حملے کے خدشے کے پیش نظر کویت کے حکمران نے برطانیہ سے مدد کی درخواست کی۔ جولائی کے آغاز میں برطانوی فوج کو کویت میں اتار دیا گیا۔ ۲۰ جولائی کو عرب لیگ نے اسے آزاد امارت کے طور پر تسلیم کر لیا اور اپنا رکن بنا کر اس کی آزادی و خود مختاری کو تسلیم کر لیا اور عراقی دعوے کی تردید کر دی۔ تقریباً دو برس بعد ۱۴ مئی ۱۹۶۳ء کو کویت اقوام متحدہ کا رکن بن گیا (*The New Encyclopaedia Britannica*، ۱۰: ۵۴۷)۔ اسی اثنا میں ۱۹۶۲ء میں کویت عالمی بنک اور انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (بین الاقوامی مالی فنڈ) کا رکن پہلے ہی بن چکا تھا۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں نئی عراقی گورنمنٹ نے کویت کی مکمل خود مختاری تسلیم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کویت سے اس کے تعلقات سازگار ہوتے چلے گئے۔ ایک معاہدہ طے پایا جس کے مطابق عراق نے ۱۲۰ ملین گیلن پانی روزانہ کویت کو سپلائی کرنا منظور کیا۔ نومبر میں ایک تجارتی اور اقتصادی معاہدہ طے پایا، جس میں دو طرفہ کسٹم ڈیوٹی ختم کر دی گئی (*World Muslim Gazetteer*، ۱۹۷۰ء، ص ۴۰۶)۔ شیخ عبداللہ السالم الصباح کے فوت ہونے کے بعد ۲۴ نومبر ۱۹۶۵ء کو امیر صباح السالم الصباح، جو پہلے وزارت عظمٰی پر فائز تھے حکمران بنے۔ ان کی جگہ شہزادہ جابر وزارت عظمٰی پر فائز ہو گئے (کتاب مذکور، ۴۰۷)۔ [شیخ صباح السالم الصباح کی وفات پر جنوری ۱۹۷۸ء کو شیخ جابر الاحمد الجابر الصباح نے عنان حکومت سنبھالی]۔

اقتصادی جائزہ: زراعت: کھجور کی کاشت کے علاوہ ملک کے چند حصوں میں سبزیاں، اناج اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ کویت کو غذا کے معاملے میں زیادہ انحصار درآمد پر کرنا پڑتا ہے۔ حکومت نے ایک تجرباتی زرعی فارم کا اہتمام کیا ہے۔

صنعت: ۱۹۵۵ء میں حکومت نے اینٹیں تیار کرنے کا ایک کارخانہ ساڑھے سات لاکھ پونڈ کی مالیت سے قائم کیا، جہاں یومیہ ایک لاکھ اینٹیں تیار ہوتی ہیں۔ کویت میں ریت اور چونے کے ذخائر بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں ایک پیٹرو کیمکل انڈسٹریز کمپنی قائم کی گئی جو کھاد تیار کرتی ہے۔ ایک نئے کارخانے کے اضافے کے بعد اب کویت میں سالانہ ۱۵ لاکھ ٹن کھاد تیار ہونے لگی ہے۔ شعیبہ کے علاقے میں اور بھی صنعتیں قائم کی گئی ہیں۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

بجلی : بجلی تمام تر تیل اور قدرتی گیس سے حاصل کی جاتی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں بجلی کا اندازہ ۱,۳۳۴,۸۵۸,۰۰۰ کلوواٹ تھا۔

ماہی گیری : خوراک کی گھریلو ضروریات پوری کرنے کے لیے ماہی گیری ایک اہم ذریعہ ہے۔ نیز اس سے جانوروں کے لیے چارا بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ سالانہ کوئی پانچ ہزار ٹن مچھلی پکڑی جاتی ہے۔ چار مختلف کمپنیاں ماہی گیری کا اہتمام کرتی ہیں۔ موتی حاصل کرنے کی صنعت اب زوال پذیر ہو رہی ہے۔

مویشی : کویت کے بدوی لوگ اونٹ، بھیڑ، بکری اور گدھے پالتے ہیں۔ مقامی مویشیوں کے گوشت سے خوراک کا ایک حصہ حاصل کیا جاتا ہے۔ حکومت نے ۹۰ ایکڑ کا ایک تجرباتی زرعی فارم قائم کیا ہے جس میں ڈیری فارم اور پرورش حیوانات کے مراکز بھی شامل ہیں۔ ملک سے کسی حد تک کھالیں اور چمڑا برآمد کیا جاتا ہے۔

برآمدات : برآمدات کا ۹۰ فیصد حصہ تو تیل اور پٹرولیم کی مصنوعات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ موتی، مچھلی، بال، کھالیں اور چمڑا برآمد کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں کویت نے ۱۳۹ ملین بیرل۔ صاف شدہ پٹرولیم کی مصنوعات برآمد کیں جو ۱۰۱۴ ملین بیرل کروڈ آئل (خام تیل) اور ۱۵۰۵ ملین رقیق مائع (Liqui Fied) پٹرولیم گیس کے علاوہ تھیں۔ ۱۹۷۲ء میں کویت کی کل برآمدات ۱۶۷۱۰۵ ملین امریکی ڈالر (سولہ ارب پاکستانی روپے سے زائد) تک پہنچ گئی تھیں (*World Muslim Gazetteer*، ۱۹۷۵ء، ص ۳۱۵)۔

تیل : کویت کی پوری معیشت اور اقتصادی ترقی کا انحصار ملک کے تیل کے بڑے بڑے ذخیروں سے حاصل ہونے والی آمدنی پر ہے۔ کویت میں ۷۱ بلین بیرل، تیل کے ذخائر موجود ہیں۔ جو ریاستہائے متحدۂ امریکہ کے ذخائر سے دگنے ہیں اور پوری دنیا کے ذخائر کا ۲۰۰۳ فیصد ہیں۔ کویت کی تیل سے حاصل ہونے والی سالانہ آمدن ۱۹۷۳ء میں ۱۷۰۰ ملین ڈالر تک پہنچ چکی ہے جب کہ ۱۹۵۰ء میں یہ صرف ۲۰۰ ملین ڈالر تھی۔ ۱۹۴۶ء میں کویت نے پہلی بار، تیل برآمد کیا اور تیل کی پیداوار میں اسقدر اضافہ ہوا کہ ۱۹۵۳ء میں کویت پوری دنیا میں چوتھے نمبر پر سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والا ملک شمار ہونے لگا۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک میں ذخائر کے اعتبار سے کویت کو اولیت حاصل ہے (*The New Encyclopaedia Britannica*، ۱۰ : ۵۴۷)۔ ۱۹۶۴ء میں کویت نے رضاکارانہ طور پر پیداوار میں کچھ تخفیف کی ہے۔ اب بھی کویت دنیا میں چھٹے نمبر پر سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والا ملک ہے اور اس کی تیل کی پیداوار تین ملین بیرل یومیہ ہے (*World Muslim Gazetteer*، ص ۳۱۱، ۱۹۷۵ء)۔ قدرتی گیس اور پٹرولیم گیس کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب مذکور، ص ۳۱۳؛ بنکنگ، انشورنس اور فنانس کے امور کی تفصیلات کے لیے دیکھیے کتاب مذکور، ص ۳۱۶) [نیز *The Statesman year-Book* ۱۹۷۶ء-۱۹۷۷ء بذیل مادّہ]۔

سکہ : کویت میں نیا کویتی دینار مروّج ہے۔ ایک کویتی دینار ۱۰۱۷ پونڈ سٹرلنگ کے برابر ہے۔ اور تقریباً تین امریکی ڈالر ۳۲۷ء کے برابر ایک دینار کو ۱۰۰۰ فلس میں تقسیم کیا گیا ہے۔

بجٹ : ۱۹۶۹-۱۹۷۰ء میں بجٹ کے محاصل ۳۰۲/۰۵ ملین کویتی دینار تھے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء میں محاصل کا تخمینہ ۵۳۶ ملین کویتی دینار تھا جس میں ۵۰۶ ملین کویتی دینار کے محاصل صرف تیل (کل کا ۹۴ فیصد) پر مشتمل تھے تفصیلات کے لیے دیکھیے کتب مذکورہ۔

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

پانی کا مسئلہ : کویت کے بعض لوگ آج بھی یہ ذکر کرتے ہیں کہ پانی کی قلت کے پیش نظر وہ کبھی عراق سے پانی درآمد کرتے رہے ہیں ۔ پانی کی فراہمی کے لیے ۱۹۵۳ء میں کویت میں سمندر کے پانی کو کشید کرنے کا ایک پلانٹ (Kuwait Seawater Distillation Plant) کا پہلا حصہ مکمل ہو گیا تھا، جس سے یومیہ دس لاکھ گیلن پانی فراہم ہوتا تھا۔ اب اس میں مزید یونٹ مکمل کیے گئے ہیں جس سے ساٹھ ملین (چھے کروڑ) گیلن پانی یومیہ فراہم ہوتا ہے ۔ پوری دنیا میں نمکین پانی کو مقطر کرنے کا یہ سب سے بڑا پلانٹ ہے ۔ ریاست کے شمال میں الروضتین کے مقام پر کنووں سے تازہ پانی دارالحکومت میں فراہم کیا جاتا ہے ۔

آئین : کویت کے حکمران یا امیر کا جانشین بننے والے کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ مرحوم مبارک الصباح کے خاندان سے ہو ۔ ہر حکمران کی تخت نشینی کے ایک سال کے اندر اس کے ولی عہد کا نامزد کیا جانا بھی لازمی قرار دیا گیا ہے۔ سرکاری مذہب اسلام اور سرکاری زبان عربی ہے ۔ انتظامیہ کے جملہ اختیارات امیر کو حاصل ہیں جو ان اختیارات کو وزرا کی کونسل کے ذریعے سے استعمال کرتا ہے جو ایک وزیر اعظم کی قیادت میں کام کرتی ہے ۔ امیر کو مارشل لاء نافذ کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے، لیکن اس ضمن میں اسے اسمبلی کی منظوری لینا پڑتی ہے ۔

ایک قومی اسمبلی کا جو ۵۰ افراد پر مشتمل ہوتی ہے ۔ چار سال کے لیے انتخاب کیا جاتا ہے جو کویت کے پڑھے لکھے، ۲۱ سال سے زائد عمر والے مردوں کے ووٹوں سے عمل میں آتا ہے ۔ ملازمین اور پولیس والے انتخاب میں حصہ نہیں لیتے ۔ ملک میں سیاسی جماعتیں نہیں ۔ امیدوار انفرادی حیثیت سے انتخاب لڑتے ہیں ۔ اگر اسمبلی کوئی بل منظور کر کے امیر کے پاس بھیج دیتی ہے تو امیر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ بل مذکور اسمبلی کو نظرثانی کے لیے بھجوا دے اور اگر آئندہ اجلاس میں ممبران کی دو تہائی اکثریت اسے پھر منظور کر لے یا اس سے آئندہ نشست میں سادہ اکثریت اسے منظور کر لے تو اس کو قانون کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے ۔ اسمبلی کسی وزیر کے لیے عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر سکتی ہے ۔ البتہ وزیر اعظم کے سلسلے میں اسے یہ اختیار حاصل نہیں ۔ اس صورت میں اسمبلی امیر تک رسائی حاصل کر سکتی ہے اور امیر یا تو وزیر اعظم کو برخاست کر دیتا ہے یا اسمبلی ہی توڑ دیتا ہے ۔

جو آئین ۱۶ نومبر ۱۹۶۲ء کو نافذ ہوا وہ تمام شہریوں کے لیے قانونی مساوات کا حق تسلیم کرتا ہے ۔ اس طرح آئین میں انفرادی آزادی کے حق کی ضمانت دی گئی ہے جس سے کویتی باشندوں میں تحفظ کے احساس کو پیدا کرنے کے لیے بڑی مدد ملی ہے ۔

کویت کے مجموعۂ قوانین میں اکثر و بیشتر مصری قانونی نظام کی پیروی کی گئی ہے ۔ جرائم کے مسائل میں چھوٹے چھوٹے مقدمات کا فیصلہ عام عدالتوں کے مجسٹریٹ کرتے ہیں جب کہ سنگین جرائم کا فیصلہ بڑی عدالتوں میں طے پاتا ہے ۔ ان فیصلوں کے بارے میں اپیل کی سماعت کے لیے ایک اور عدالت قائم کی گئی ہے (*World Muslim Gazetteer*، ۱۹۷۵ء، ص ۳۰۸ ببعد)۔

تعلیمی ترقی : ۱۹۳۶ء میں پورے کویت میں صرف ایک سکول تھا جس میں فقط ۳۰۰ طلبہ تھے اب کنڈر گارٹن، ابتدائی اور ثانوی سکول کثرت سے قائم کر دیے گئے ہیں ۔ ۱۹۶۶ - ۱۹۶۷ء میں تعلیم لازمی کر دی گئی ۔ اب ۲۷۰ اسکولوں میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں ۔ اساتذہ کی

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

تعداد گیارہ ہزار ہے ۔ حکومت کویت کی پالیسی کے مطابق کویتی باشندوں کے لیے کنڈرگارٹن سے لے کر یونیورسٹی تک تعلیم مفت ہے ۔ طلبہ کو کتابیں، خوراک اور طبی سہولتیں مفت فراہم کی جاتی ہیں ۔ ۱۹۷۳ء میں کویت میں پرائیویٹ سکولوں کی تعداد ۶۶ تھی جن میں ۳۴۱۷۱ طلبہ زیر تعلیم تھے اور اساتذہ کی تعداد ۵۷۷ تھی ۔ ثانوی سکولوں کے علاوہ ایک ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ (لڑکوں کے لیے)، دو ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (ایک لڑکوں کے لیے اور ایک لڑکیوں کے لیے)، ایک دینی مدرسہ (Religious Institute)، ایک ٹیکنیکل سیکنڈری سکول (لڑکیوں کے لیے اور ایک اور تربیتی ادارہ (Post-Secondery Teachers Training College) ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء میں قائم کیے گئے ہیں ۔ سات تعلیمی ادارے مختلف النوع معذور طلبہ کے لیے قائم کیے گئے ہیں ۔ وزارت تعلیم نے اپریل ۱۹۶۶ء میں ان سات اداروں کو ایک وسیع ادارے میں مدغم کرنے کے لیے اقدام کیا ہے ۔ بڑی کثیر تعداد میں کویتی طلبہ کو وظائف دے کر بیرونی ممالک میں حصول تعلیم کے لیے بھیجا جاتا ہے ۔ جن میں سے اکثر مصر، لبنان، امریکہ اور برطانیہ میں زیر تعلیم ہیں ۔ ۱۹۶۲ء میں کویت یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی (*The New Encyclopaedia Britannica*، ۱۰ : ۵۳۹)۔

اسی طرح عرب ممالک سے اس وقت پونے چھے سو طلبہ وظیفہ پاکر کویت کی ثانوی اور انٹرمیڈیٹ سطح پر زیر تعلیم ہیں ۔ تعلیم بالغاں کے ۴۹ مرکز ہیں جہاں ۲۳۹۴۳ افراد زیر تعلیم ہیں اور ۷۱۱ اساتذہ جزوقتی کام کر رہے ہیں ۔ وزارت تعلیم، اس کے علاوہ، ۳۸ پرائیویٹ سکول اور تعلیمی اداروں کی بھی نگرانی کرتی ہے جہاں ۱۵۰۵۰ طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔ وزارت تعلیم نے، ساحل عمان پر ۳۵ سکول اس کے علاوہ قائم کیے ہیں جہاں ۱۰۵۴۹ طلبہ تعلیم کے حصول میں مصروف ہیں (*World Muslim Gazetteer*، ۱۹۷۵ء، ص ۳۱۸ ببعد)۔

مدارس : کویت کے مشہور مدارس میں المدرسة المبارکیه، المدرسة الاحمدیه، مدرسة السعادة الجمعیة الخیریة، المکتبة الاهلیة قابل ذکر ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے : تاریخ الکویت، ۲۸۸ ببعد۔

فلاحی مملکت اور تعمیر و ترقی : کویت اپنے تیل کے عظیم ذخائر کی بدولت اپنے باشندوں کی فلاح و بہبود کو مرکز توجہ بنائے ہوئے ہے ۔ سماجی خدمات کا دائرہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے ۔ تعلیم مکمل طور پر مفت ہے اس وقت کویت میں ۳۵ ہسپتال اور ۸۳ کلینک ہیں ۔ ہر ۸۰۰ آدمی کے لیے ایک ڈاکٹر ہے اور ہر ۱۱۱ افراد کے لیے ہسپتال کا ایک بستر ہے ۔ کویت کے اندر اور ارد گرد سڑکوں کا جال بچھایا جا رہا ہے ۔ شویخ (Shuwaikh) کے مقام پر ایک بندرگاہ تعمیر کی گئی ہے جو کویت شہر سے دو میل مغرب میں ہے ۔ اس میں بیک وقت آٹھ بڑے بار بردار جہاز اور کئی چھوٹے جہاز لنگر انداز ہو سکتے ہیں ۔ شعیبہ کے مقام پر ایک دوسری بندرگاہ ہے جو کویت شہر کے جنوب میں واقع ہے ۔ ان دونوں بندرگاہوں کو ۵۰ ملین امریکی ڈالر کے صرف سے جدید بنایا جا رہا ہے ۔ کویت میں بین الاقوامی پروازوں کے لیے ایک ہوائی اڈا بھی موجود ہے ۔

عالمی سیاست میں اہم کردار : کویت نے عرب اور غیر عرب مسلم ممالک کو بڑی فیاضی سے مالی امداد دی ۔ اس نے جنگ فلسطین ۱۹۶۷ء کے متاثر ممالک کی دل کھول کر مدد کی ہے ۔ کویت کی مجموعی امداد جو اس نے رمضان ۱۹۷۳ء کے بعد مختلف ممالک کو دی، ۳۰۰ ملین ڈالر تک پہنچ گئی ہے ۔ اسی طرح کی

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

مالی امداد فلسطینی فدائیین کو بھی دی گئی۔ [کویت کی تعمیر و ترقی میں اہل پاکستان نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب ہزاروں پاکستانی کویت میں ملازم ہیں اور اسے اعلیٰ درجے کی فلاحی مملکت بنانے میں شب و روز مصروف ہیں].

وزارت اوقاف: حکومت کویت عالم اسلام کے مسائل میں بڑی دلچسپی لیتی ہے، بالخصوص بیرونی ممالک میں مسلم اقلیتوں کے مسائل پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔ مذہبی امور کے انتظام اور انصرام کے لیے وزارت اوقاف ہے جو اسلامی ادب اور قرآن حکیم کی طباعت پر سالانہ زر کثیر خرچ کرتی ہے۔ علاوہ ازیں مسلم تنظیموں کو امداد بھی مہیا کرتی ہے۔ کویت اسلامی سیکرٹریٹ، اسلامی وزرائے خارجہ کانفرنس اور اسلامی بنک کا بھی رکن ہے۔ ۱۹۷۰ء میں کویت نے عالم اسلام کے وزرائے اوقاف کی بین الاقوامی کانفرنس کا اہتمام کیا تھا تاکہ مسلم ممالک میں باہمی تعاون سے ان سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے (*World Muslim Gazetteer*، ۱۹۳: ۱۹۷۵ء).

اگست ۱۹۷۷ء کے ایک اعلان کے مطابق کویت کی وزارت اوقاف، قاہرہ کی جامعۃ الازہر کی طرز پر ایک اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے پر بھی غور کر رہی ہے۔

مآخذ: (۱) عبدالرشید: تاریخ الکویت، مطبوعہ بیروت؛ (۲) *Kuwait and his neighbours*، مطبوعہ لنڈن؛ (۳) *Kuwait was my home*، مطبوعہ لنڈن؛ (۴) *The New Encyclopaedia Britannica*، بذیل مادّہ؛ (۵) *World Muslim Gazetteer*، کراچی ۱۹۷۵ء.

(بشیر احمد صدیقی)

* **کہانی**: (= افسانہ، مختصر افسانہ) رک بہ حکایہ، حدیث، روایۃ، سمر، قصہ [نیز اردو، عربی، وغیرہ].

کہربا: (کاہ ربا) وہی ہے جسے انگریزی میں amber کہتے ہیں۔ فارسی لفظ کے معنی تنکے کو کھینچنے یا لوٹ لینے والا ہیں۔ عام طور، پر جیسا کہ القزوینی میں ہے، اس کی یہ مخصوص خاصیت بیان کر دی جاتی ہے، لیکن اس پر کوئی رائے زنی نہیں کی جاتی، البتہ ابن الکبیر نے اتنا لکھا ہے کہ اگر اسے کسی قدر رگڑ لیا جائے تو یہ بڑی تیزی اور شدت سے تنکوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کشش کو شاعری میں استعارۃً عشاق کی باہمی کشش کے بیان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے.

کاہربا کی کچھ مقدار تو بلغار کے بحیرۂ بالٹک سے متصل علاقہ کسن (Kasin) سے لائی جاتی تھی اور اسے لوگ جوز روسی کی گوند سمجھتے تھے، اور کچھ مقدار ہسپانیہ سے آتی تھی۔ الغافقی، جس نے دونوں قسموں کا ذکر کیا ہے، بتاتا ہے کہ یہ مکھیوں، تنکوں وغیرہ کو پکڑ لیتا ہے.

قدیم زمانے کے کاہ ربا سے بنے ہوئے زیورات اب مشرق میں باقی نہیں رہے البتہ الوشاء زرد کاہ ربا کے بعض نمونوں کا ذکر کرتا ہے جو عورتیں زیورات کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ اسی طرح کیمیا گر الجلدکی کاہ ربا میں کھدے ہوئے نقوش کی بابت کہتا ہے کہ یہ بلور طلسمی تعویذوں کے استعمال ہوتے تھے۔ موجودہ زمانے میں اس سے تسبیح کے دانے اور ''سگار ہولڈر'' بنائی جاتی ہیں۔ یہ دوا کے طور پر ہمیشہ کثرت سے استعمال ہوتا رہا ہے۔ جس طرح انگریزی میں الیکٹرون electron سے الیکٹرسٹی electricity نکلا ہے، اسی طرح مشرقی زبانوں میں کہربا سے [بجلی کا نام] کہربائیۃ بن گیا۔ بسا اوقات کاہ ربا کو سندروس سے، جو بقول الانطاکی رگڑے ہوئے تنکوں کو کھینچتا ہے، ملتبس کر دیا جاتا ہے، لیکن دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں کے باہمی فرق پر زور دیا گیا ہے.

www.besturdubooks.wordpress.com

مآخذ: (۱) قب G. Jacob، در Zeitschr. der Deutsch. Morgenl. Gesellsch، ۴۳ (۱۸۸۹ء)، ص ۳۱۳ ببعد؛ ج ۴۵ (۱۸۹۱ء)، ص ۶۹۱ ببعد؛ (۲) Schneider: وہی کتاب، ج ۴۵ (۱۸۹۱ء) ص ۲۳۹ ببعد؛ (۳) E. Wiedemann: Beiträge. z. Gesch. der Naturwiss، ج ۲، در Sitzungsber. d. r Physik-mediz. Soz in Erlangen، ج ۳۵ (۱۹۰۳ء)، ص ۳۱۴ ببعد؛ (۴) Archiv f. d. Gesch. d. Naturw. u. Technik، ج ۱ (۱۹۰۹ء)، ص ۲۱۱.

(E. WIEDEMANN)

اَلْکَہْف: بقول امام راغب اصفہانی الکہف کے معنی پہاڑ میں غار کے ہیں - اس کی جمع کہوف آتی ہے: ''الکہفُ الغارُ فی الجبل و جمعہ کہوفٌ'' (المفردات، ۴۵۸).

یہ قرآن حکیم کی ایک سورت کا نام ہے جو ۱۱۰ آیات پر مشتمل ہے (تفسیر القاسمی، ۱۲: ۴۰۲۰؛ فی ظلال القرآن، ۱۵: ۷۶) - اس سورت کی دسویں آیت: اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَہْفِ (۱۸ [الکہف]: ۱۰) کے لفظ الکہف کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے - ترتیبِ تلاوت کے لحاظ سے اس کا عدد ۱۸ اور نزول وحی کی ترتیب کے اعتبار سے، اس کا عدد ۶۹ ہے - یہ سورۃ الغاشیہ [ارک بآں] کے بعد اور سورۃ النحل [ارک بآں] سے پہلے نازل ہوئی (الاتقان، ۱: ۱۰) - پوری سورت مکۂ معظمہ میں نازل ہوئی اور اسی رائے کو علما کے ایک بہت بڑے گروہ نے اختیار کیا ہے (تفسیر المراغی، ۱۵: ۱۱۳)، لیکن بعض کے قول کے مطابق، پہلی آٹھ آیات: صَعِیْدًا جُرُزًا تک (۱۸ [الکہف]: ۱ تا ۸) اور ارشاد باری: وَ اصْبِرْ نَفْسَکَ الایۃ (۱۸ [الکہف]: ۲۸) اور اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے لے کر سورت کے آخر تک (۱۸ [الکہف]: ۱۰۷ تا ۱۱۰) مکی ہونے سے مستثنی ہیں (الاتقان، ۱: ۱۶: تفسیر القاسمی، ۱۱: ۴۰۲۰)، لیکن درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ پوری سورت مکی ہے - ابن کثیر نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ پوری سورت مکۂ معظمہ میں نازل ہوئی ''الکہفُ کُلُّہا مکیۃٌ'' (تفسیر القرآن العظیم، ۳: ۱۱۰) - سید امیر علی نے قرطبی کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ یہ سورۃ تمام مفسرین کے قول کے مطابق مکی ہے (تفسیر مواہب الرحمن، پارہ ۱۵: ۲۱۶).

گزشتہ سورت سے اس کا ربط یہ ہے کہ اوّلاً، سورۂ بنی اسرائیل کا آغاز تسبیح سے ہوتا ہے اور اس سورت کا آغاز تحمید سے ہوتا ہے اور کلام میں دونوں اکٹھے استعمال ہوتے ہیں جیسا کہ: فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ (۱۱۰ [النصر]: ۳) یا سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ میں ان کا استعمال ساتھ ساتھ ہوا ہے: ثانیاً گزشتہ سورت خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا پر ختم ہوئی ہے جب کہ اس سورت کا آغاز حمد و ثنا سے ہو رہا ہے؛ ثالثاً، گزشتہ سورت میں یہود کے، روح کے بارے میں، استفسار پر انہیں مخاطب کر کے یہ کہا گیا ہے: وَ مَا اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا'' (۱۷ (الاسراء: ۸۵) جب کہ اس سورت میں حضرت موسی علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا قصہ بیان کر کے انسانی علم کی محدودیت اور اللہ تعالی کے علم کی وسعتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؛ رابعاً، سابقہ سورت میں یہود کو یہ بتایا گیا ہے: وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِہٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اسْکُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَۃِ جِئْنَا بِکُمْ لَفِیْفًا (۱۷ [بنی اسرائیل]: ۱۰۴) جب کہ اس سورت میں فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَہٗ دَکَّآءَ ۚ وَ کَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ۵ سے لِّلْکٰفِرِیْنَ عَرْضًا ۙ تک (۱۸ [الکہف]: ۹۸ تا ۱۰۰) کے ارشاد باری میں بھی اللہ تعالی کی عظیم قدرتوں اور کفار کے عبرتناک انجام کا ذکر کیا گیا ہے - (دیکھیے تفسیر المراغی، ۱۵: ۱۱۳).

www.besturdubooks.wordpress.com

احادیث میں اس سورت کے فضائل کثرت سے بیان کیے گئے ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے : ابن کثیر : تفسیر القرآن العظیم، ۳ : ۷۰ - ۷۱؛ تفسیر مواہب الرحمن، پارہ ۱۵ : ۲۱۸) - امام رازیؒ نے ابن عباسؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم نے فرمایا : اَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی سورۃ شیّعھا سبعون الف ملک حین نزلت ھی سورۃ الکہف ''(کیا میں تمھیں ایک ایسی سورت نہ بتاؤں کہ اس کے نزول پر ستر ہزار فرشتے اس کے جلو میں آئے - یہ سورت الکہف ہے) (التفسیر الکبیر، ۲۱ : ۷۳).

اس سورت کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم اس کے تاریخی پس منظر کو پیش نظر رکھتے ہیں - سورت کی داخلی شہادت سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ وہ دور ہے جب قریش مکّہ نے حضور اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم اور آپؐ کے صحابۂ کرام پر دست ظلم دراز کر رکھا تھا - ہر ممکن صورت میں اذیت رسانی کی جاتی - رسالتؐ مآب اور آپؐ کے رفقا پر مکمل معاشی اور معاشرتی مقاطعے سے دباؤ ڈالنے اور دعوت و تبلیغ سے باز رکھنے کے لیے آپؐ اور آپؐ کے خاندان کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا تھا - [قریش مکہ نے یہود کے اشارے سے جو چند سوالات کیے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اصحاب کہف کون اور کیا تھے - قرآن مجید اس کے جواب میں ان کا صحیح قصّہ بیان کرتا ہے (تفسیر ماجدی، ۶۰۲، مطبوعۂ لاہور] المختصر ایسے پُر خطر اور نازک دور میں مسلمانوں کو جو مظالم کی چکّی میں پسے جا رہے تھے تشفّی دی گئی ہے کہ پہلے اہل ایمان پر بھی ابتلا و مصائب کا دور اس سے بھی سخت تر گزرا ہے، لیکن انھوں نے انتہائی صبر و استقامت سے کام لیا اور انجام کار کامیاب و کامران ہوئے - دوسری طرف قریش مکّہ کو یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ ان سے کہیں زیادہ طاقتور اور مقتدر اقوام ظلم کی بنا پر بالآخر تباہ و برباد ہو گئیں، لہٰذا انھیں حق کو قبول کر لینا چاہیے ورنہ ان کا انجام بھی عبرتناک ہو گا (دیکھیے تفہیم القرآن، ۳ : ۶ تا ۸).

اس سورت کا مرکزی مضمون عقائد و افکار کی تصحیح ہے - شرک کی مذمت بیان کر کے توحید کے تصور کو راسخ کیا گیا ہے اور وحی کی ضرورت و اہمیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے؛ چنانچہ سورت کا آغاز حمد و ثنا اور اثبات وحی سے ہوتا ہے اور اختتام بھی توحید کے بیان، شرک کی مذمت اور اثبات وحی و رسالت پر کیا گیا ہے - سورت میں قصوں کا عنصر غالب ہے - ابتدا میں اصحاب الکہف کا قصہ آتا ہے اس کے بعد اصحاب جنّتین کا قصہ آتا ہے، پھر آدمؑ و ابلیس کے قصے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے - درمیان میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور حضرت خضر علیہ السّلام کا قصہ مذکور ہوا ہے اور آخر میں ذوالقرنین کا قصہ بیان ہوا ہے گویا سورت کا بڑا حصہ، ۱۱۰ میں سے ۷۱ آیات، انھیں قصص پر مشتمل ہے - (دیکھیے فی ظلال القرآن، ۱۵ : ۶۷).

ان میں پہلا اہم قصہ اصحب الکہف کا ہے - یہ واقعہ مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا ہے اور جنھیں پیش آیا تھا وہ عیسائی موحّدین تھے (ترجمان القرآن، ۲ : ۳۹۶) - اس قصے کی قدیم ترین شہادت ایک عیسائی پادری جیمس سروجی کے مواعظ میں ملتی ہے جو ۴۷۴ء کے لگ بھگ زمانے میں، سریانی زبان میں، لکھے گئے تھے - گبن نے انھیں تاریخ زوال و سقوط دولت روم کے باب ۳۳ میں اسی مأخذ کے حوالے سے ''Seven Sleepers'' (سات سونے والوں) کا جو قصہ بیان کیا ہے وہ ابن جریر طبری اور دیگر قدیم مفسرین کی روایات سے ملتا جلتا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے : تفہیم القرآن، ۳ : ۱۲ ببعد) - اس کا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

خلاصہ ہے کہ قیصر ڈیسیس یا دقیانوس (م ۲۵۱ء) کے زمانے میں جب مسیح ؑ کے پیروؤں پر سخت ظلم و ستم ہو رہے تھے تو یہ سات نوجوان ایک غار میں پناہ گزین ہو گئے تھے اور ان پر غنودگی طاری ہو گئی تھی ۔ تقریباً تین سو برس گزرنے کے بعد قدرت خداوندی سے یہ بیدار ہوئے تو پوری رومی سلطنت مسیح علیہ السلام کی پیرو بن چکی تھی؛ تاہم ایک گروہ میں آخرت کے عقیدے کا انکار پایا جاتا تھا ۔ اس واقعے کے پیش آنے پر ان کے عقیدے کی تصحیح ہو گئی ۔ ابوالکلام آزاد نے الکہف (غار) کے اندرونی منظر کی دہشت انگیزی کا نقشہ خوب کھینچا ہے (دیکھیے ترجمان القرآن، ۲ : ۳۹۸) ۔ انھوں نے وَ لَبِثُوْا فِیْ کَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا (۱۸ [الکہف] : ۲۵) کو قرآن کی تصریح کے بجائے لوگوں کا قول قرار دیا ہے اور ارشاد خداوندی قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا'' (۱۸ [الکہف] : ۲۶) کو بطور دلیل پیش کیا ہے، نیز حضرت ابن عباس ؓ کا ایک تفسیری قول اس کی تائید میں پیش کیا ہے (وہی کتاب، محل مذکور) ۔ ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا ہے (دیکھیے تفہیم القرآن، ۳ : ۲۱) ۔

دوسرا اہم قصہ حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت خضر ؑ کا ہے ۔ جمہور علما کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اس میں مذکور حضرت موسیٰ ؑ بن عمران، نبی بنی اسرائیل ہیں (تفسیر المراغی، ۱۵ : ۱۷۲) ۔ الجامع الترمذی میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ موسیٰ ؑ بنی اسرائیل ہی موسیٰ صاحبِ خضر ہیں (الجامع الترمذی، ۱۲ : ۲ تا ۷) ۔

خَضِر (بفتح الخاء و کسر ها و کسر الضاد و سکونها) کے متعلق اکثر یہی باور کیا جاتا ہے کہ وہ نبی تھے (التفسیر المراغی، ۱۵ : ۱۷۲) ۔ مفسرین نے ''فتیٰ موسیٰ ؑ'' کا نام یشوع بن نون بیان کیا ہے [جو حضرت موسیٰ ؑ کے عزیز خاص و خادم خاص تھے ۔ یہ سفر کہاں پیش آیا، اس کے متعلق اختلاف ہے، اغلب یہ ہے کہ یہ سفر جزیرہ نمائے سینا کے دوران قیام میں پیش آیا جو بحرِ قلزم کے شمالی دو شاخہ کے اتصال کی جگہ ہے] ۔

القاسمی نے اس خیال کو باطل قرار دیا ہے کہ خضر ابھی زندہ ہیں ۔ انھوں نے لکھا ہے کہ خضر ؑ فوت ہو چکے ہیں اور اس کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو رسول اکرم ؐ کے حضور میں حاضر ہوتے اور آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے ۔ نیز ابن عباس ؓ کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ''لَمْ یَذْکُرْ اَحَدٌ مِّنَ الصَّحَابَةِ اَنَّهٗ رَاٰی الْخَضِرَ'' (کسی بھی صحابی ؓ نے اس امر کا ذکر نہیں کیا کہ اس نے خضر ؑ کو دیکھا ہے) (تفسیر القاسمی، ۱۱ : ۴۰۹۴) ۔ [مزید تفصیلات کے لیے رک بہ الخضر] ۔

تیسرا اہم قصہ ذوالقرنین کا ہے جو بقول ابوالکلام آزاد ۵۵۹ ق م میں ایک غیر معمولی شخصیت کے طور پر ابھرا ۔ یہ پارس کے ہخامنشی خاندان کا ایک نوجوان گورش تھا جسے یونانیوں نے سائرس، عبرانیوں نے خورش اور عربوں نے کے خسرو کے نام سے پکارا ۔ اسے پہلے پارس کے تمام امیروں نے اپنا فرمانروا تسلیم کر لیا ۔ پھر بغیر کسی خونریزی کے میڈیا کی مملکت پر فرمانروا ہو گیا اور اس طرح دونوں مملکتوں نے مل کر ایران کی ایک عظیم الشان شہنشاہی کی صورت اختیار کر لی (ترجمان القرآن، ۲ : ۴۰۲) ۔ ابوالکلام آزاد نے اس امر پر دلائل پیش کیے ہیں کہ قرآن کا ذوالقرنین سکندر مقدونی نہیں ہو سکتا ۔ (کتاب مذکور، ۳۹۹ ببعد؛ نیز دیکھیے تفہیم القرآن، ۳ : ۴۲ ببعد) ۔ ابوالکلام آزاد نے بائبل کی ایک کتاب دانی ایل کے رؤیا کے حوالے سے (نیز دیکھیے کتاب مقدس : ۴۸۲) بالخصوص حقائق اور موجودہ اکتشافات کی روشنی میں اس پر بڑی مبسوط بحث کی ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے : ترجمان القرآن، ۲ : ۴۰۰ تا ۴۳۰؛

www.besturdubooks.wordpress.com

[نیز رک به ذوالقرنین]).

ان قصوں میں بالخصوص حضرت موسیٰ[۳] و حضرت خضر[۳] اور اصحاب الکہف کے قصوں میں جہاں توحید کے تصور کو راسخ کیا گیا ہے، وہاں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ غیب کا علم اللہ کے پاس ہے جو لامحدود قدرتوں کا مالک ہے اور جو حکیم و مدبر ہے اور جس کے اسرار و حکم کی معرفت سے بشری نگاہیں کوتاہ رہ جاتی ہیں۔ البتہ قدرت بقدر ضرورت، بعض حکمتوں سے پردہ اٹھا کر انہیں آشکارا کر دیتی ہے تاکہ انسان اپنی کوتاہی اور محدود علم کا اعتراف کرتے ہوے، غرور علمی کا شکار نہ ہونے پائے (دیکھیے فی ظلال القرآن، ۱۰ : ۱۰۸؛ ۱۶ : ۲۰).

مآخذ (۱) الراغب الاصفہانی: المفردات فی غریب القرآن، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۲) السیوطی: الاتقان، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۳) الرازی: التفسیر الکبیر، مطبوعۂ قاہرہ؛ (۴) ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، لاہور ۱۹۷۳ء؛ (۵) محمد جمال الدین القاسمی: تفسیر القاسمی، قاہرہ ۱۹۵۹ء؛ (۶) سیّد قطب: فی ظلال القرآن، مطبوعۂ بیروت؛ (۷) احمد مصطفٰی المراغی: تفسیر المراغی، قاہرہ ۱۹۶۳ء؛ (۸) سید امیر علی: تفسیر مواہب الرحمٰن، لکھنؤ ۱۹۴۰ء؛ (۹) ابو الکلام آزاد: ترجمان القرآن، لاہور ۱۹۳۶ء؛ (۱۰) ابوالاعلٰی مودودی: تفہیم القرآن، لاہور ۱۹۷۶ء؛ (۱۱) الترمذی، قاہرہ ۱۹۳۴ء؛ (۱۲) الخطیب التبریزی: مشکوٰۃ المصابیح، دمشق ۱۹۶۱ء.

(بشیر احمد صدیقی)

اَلْکُہّان :[(ع)]؛ کاہن کی جمع؛ دوسری جمع کَہَنَہ ہے۔ کاہن کا مؤنث کاہنہ ہے اور کاہن کے پیشے کو کہانت کہا جاتا ہے۔ [لسان میں ہے: رجلٌ کاہن من قوم کَہَنة و کُہّان و حرفته الکہانة (لسان، بذیل مادّہ)] ۔ عرب جاہلیة کے ہاں غیب دان اور پیش گو کا نام ہے۔ [لسان میں ہے: الکاہن الذی یتعاطی الخبر عن الکائنات فی مستقبل الزمان و یدّعی معرفة الاسرار، یعنی کاہن وہ ہے جو زمانۂ آئندہ سے متعلق امور کی خبر بہم پہنچائے نیز اسے اسرار کے علم کا دعوٰی ہو) ۔ عبرانی میں اس کا نظیر کوہن Kōhen اور آرامی میں کاہن Kāhen اور کاہنا Kahna (مذہبی قائد) ہیں۔ یہ لفظ عبرانی یا آرامی لفظ کا معرب نہیں ہے۔ بلکہ قدیم عربی زبان کے اصل مادّے سے تعلق رکھتا ہے۔ Nöldeke اس کے خلاف کہتا ہے: *Neue Beiträge zur Semitischen Sprachwissenschaft*، ص ۳۶، حاشیہ ۶) کیونکہ یہودیوں کا کوہن (Kohen) یا کاہن (Kāhen) عربی کاہن سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اغلب ہے کہ یہودیوں کے ہاں کوہن کسی وقت غیب دان کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہو گا، لیکن بعد میں وہ ایک دانشمند، فیصل اور خاص کر ذابح قربانیں اور معلم تورات کی حیثیت سے نظر آتا ہے، برخلاف اس کے عرب کاہن کی بابت جو کبھی مذہبی پیشوا نہیں ہوا (نان کریمر کی رائے اس کے خلاف ہے۔ دیکھیے حصۂ زیریں مآخذ ص ۴۷ ببعد اور نیز ولہاوزن بھی اس کے خلاف ہے، ۱۳۴ اور دیگر صفحات) ۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے کبھی یہ عہدے سنبھالے ہوں اور نہ اس کا پوجا اور پوجا گھروں کے ساتھ کبھی مستقل تعلق رہا۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی کار گزاریوں میں کبھی کسی عہدے وغیرہ کا پابند نہ تھا۔ کاہن کا مبدأ البتہ شامنیوں (شامنی مذہب کے پروہتوں) معالجوں، اور افسوں گر پجاریوں میں ملتا ہے، لیکن جب پہلے پہل قدیم عربی حکایات میں، حدیث میں، اس سے زیادہ ندرت کے ساتھ اشعار جاہلیة میں ہمارا ان سے سابقہ پڑتا ہے وہ تو خام شامنیت کی سرحد سے آگے نکل چکے

www.besturdubooks.wordpress.com

ہوتے ہیں، ان کی غیب دانی کا دارومدار استغراقی کشف پر ہے ۔ یہ بھی درست ہے کہ رات کو انہیں ایسے خواب نظر آتے ہیں، جن سے آئندہ کے احوال اور دیگر اشیا اور واقعات جو معمولی بشر کی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں ان پر کسی قدر روشن ہو جاتے ہیں (المسعودی : ۳ : ۳۷۹، ۳۹۴ ببعد؛ شپرنگر Sprenger، ۱ : ۱۷۶ ببعد وغیرہ)، لیکن یہ لوگ درحقیقت صاحب کشف و کرامت نہیں ہیں ۔ ان کے الہام کی اصل جنّی یا شیطانی ہے ۔ کوئی جن یا شیطان (Saikoriov) جسے ان کا ''تابع'' ''صاحب''، ''مولیٰ'' یا ''ولی'' اور بالعموم رئیّ یا رِئیّ (غالباً غیب دان) کہا جاتا ہے ۔ ان کے اندر بولتا ہے ۔ ان کے وجدانی استغراق کا یہ تجسم جو پہلی نظر میں ان کو قدیم طرز کے شاعر (لفظی معنی جاننے والا) کے ساتھ جس کی بابت یہ مان لیا گیا ہے کہ جنّ انہیں، فوق العادۃ، سحری علم عطا کرتے ہیں مرتبط کرتا ہے ۔ ان کو ایک خارجی حقیقت نظر آتا ہے حتیٰ کہ کاہن کو اس کا خیالی جن حقیقی متکلم معلوم ہوتا ہے اور وہ خود اپنے آپ کو اس کا مخاطب محسوس کرتا ہے ۔ وہ صاف طور پر دیکھتا ہے کہ ایک روح اس کے پاس آ رہی ہے، اس کے قدم کی آواز سنتا ہے اور اس کے بولنے کی آواز اس کے پاس دور ہی سے آنے لگتی ہے ۔ وغیرہ وغیرہ (Sprenger : کتاب مذکور؛ Holscher، ص ۱۸۵) ۔ [لسان میں، جہاں کاہن کے اس مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے جو عربوں کے ہاں سمجھا جاتا تھا، یہ بتا دیا گیا ہے کہ کاہنوں کا ایک گروہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ اس کا ''تابع جنّی'' یا ''رئیّ'' انہیں خبریں بہم پہنچاتا ہے اور دوسرا گروہ یہ کہتا تھا کہ ہم امور کو ان کے پیشگی اسباب وغیرہ کے ذریعے پہنچاتے ہیں ۔ لسان کے الفاظ یہ ہیں ۔ فمنھم من کان یزعم انّ لہ تابعًا من الجنّ و رئیًا یلقی الیہ الاخبار و منھم من کان یزعم انّہ یعرف الامور بمقدمات اسباب یستدل بھا علی مواقعھا (دیکھیے لسان، بذیل مادّہ) ۔ بہر نوع لسان میں اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں کہ کاہن لوگ یہ دعویٰ بھی کرتے کہ ان کا تابع جنّی خارجی پیکر کے ساتھ ان سے ملاقی اور ہمکلام ہوتا انہیں نظر آتا تھا وغیرہ] ۔ سچ مچ ان موکلوں (یا جنوں) کے اپنے علٰحدہ نام بھی ہوتے تھے (اسی طرح جیسے کہ شاعروں کے جنوں کے نام ہوتے تھے ۔ دیکھیے یاقوت : معجم، طبع وسٹنفلڈ، ۴ : ۹۱۴ س ۱۴ ببعد اور الجاحظ : ۴ : ۶۹ ؛ van Vloten، ۸ : ۶۵) کاہنوں کے اقوال سجع یعنی چھوٹے چھوٹے مقفّی نثر کے جملوں کی شکل میں ہوتے تھے جو عام طور پر ایک ہی قافیے پر ختم ہوتے تھے یا کبھی شاذ و نادر ایک جملہ چھوڑ کر پہلے جملے کا قافیہ دہرایا جاتا تھا جیسا کہ عربستان میں ابتدائی زمانے سے آئندہ کی خبریں دینے والوں اور ساحروں کے ادنیٰ اور اعلیٰ ہر طبقے میں رواج چلا آتا تھا ۔ (بہت شاذ و نادر طور پر باقاعدہ شعر بھی استعمال کر لیا جاتا ہے، مثلاً الاغانی، بار اول، ۱۱ : ۱۶۱ س ۱۳)؛ سجع کے علاوہ ایک مخصوص ترنم جس میں یہ اقوال ادا کیے جاتے ہیں کاہن کے ملفوظات کی ایک خصوصیت ہے (ابن ہشام، ۱ : ۱۷۱ س ۲ اور اسی موضوع پر، ۲ : ۵۸) ۔ اس حیثیت سے سجع کے ابتدائی معنے شاید محض دندنہ یا تغرید کے یا کسی ایسی ہی آواز کے ہوں گے جو جن مفروض کی ہو سکتی ہے ۔ سجع کا فعل دوسری جگہوں میں جنّوں کی دوی اور طنین کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور کبوتر کی آواز اور اونٹوں کے بلبلانے کے لیے تو باقاعدہ مستعمل ہوا ہے (مثال کے طور پر دیکھیے عہد عتیق میں ۔ اشعیا باب ۲۹، آیت ۴) ۔ کاہن، جن میں سے اکثر کو جعلساز کہا جا سکتا ہے بالعموم اپنے اقوال کو

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

مشکل اور مبہم الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ (کاہنوں کے ملفوظات کے لیے دیکھیے مثلاً ہولشر Holscher ۸۷ ببعد، ۹۵ ببعد؛ المسعودی: ۳: ۳۸۷ ببعد؛ الابشیہی: باب ۶۰؛ الاغانی، ۱۱: ۱۶۱ س ۱۰ ببعد)۔

زمانہ قبل اسلام کی اجتماعی اور انفرادی دونوں زندگیوں میں کاہنوں کو بڑا دخل تھا۔ تمام قبائلی اور ملکی اہم معاملات میں ان سے استفسار کیا جاتا تھا بالخصوص جنگی مہموں اور غارتوں کے وقت جن میں بالعموم وہ خود بھی حصہ لیتے تھے اور کبھی بذات خود ان کی قیادت بھی کرتے تھے (دیکھیے عہد نامہ عتیق میں ڈیبورہ Deborah)۔ اسی لیے بادشاہ اور ملکہ اپنے اپنے نجومی اور پیش گو رکھا کرتے تھے D. H. Muller : *Die Burgen und Schlosser Sudarabiens nach dem Iklil des Hamdani*، ۱: ۷۳ اور الطبری، طبع ڈخویہ، ۱: ۷۶۲ س ۵) اور ہر قبیلے کا اپنا ایک کاہن یا کاہنہ، نیز ایک شاعر اور ایک خطیب ہوتا تھا۔ نجی زندگی میں یہ کاہن خاص طور پر ہر قسم کے جھگڑوں اور قانونی بحثوں پر بطور حاکم کے فیصلے کرتے تھے؛ چنانچہ کاہن کا تصور حَکَم کے تصور سے بالکل ملا ہوا تھا (الحطیئۃ، قصیدہ ۱۷، شعر ۷؛ الابشیہی، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ۲: ۷۳ س ۱)۔ ان کے فیصلے خداوندی فیصلے خیال کیے جاتے تھے جن کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ خوابوں کی تعبیر دیتے، گم شدہ اونٹوں کا پتا بتاتے، زنا کا راز فاش کرتے، دیگر جرائم اور بدکرداریوں بالخصوص چوریوں اور قتل وغیرہ کا پتا بتاتے تھے۔ ان کارگزاریوں میں وہ اخبار غیب کے ادنیٰ درجے پر اتر آتے تھے جو عَرّاف یا مُعَرِّف کے لیے مقرر ہے (دیکھیے Wellhausen، لائیڈن، بار اول، ۱: ۴۶۰ ب اور دیکھیے ابن الأثیر: النہایۃ، ۳: ۴۰؛ الجاحظ، ۶: ۶۲ س ۵ نیچے سے؛ المسعودی، ۳: ۳۵۲)۔ اس قسم کے کاموں کے لیے انہیں کچھ رقم بطور اجرت اکرامیہ دی جاتی تھی جسے اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے (حلوان؛ البخاری: الصحیح، طبع Krehl-Juynbol) ۲: ۳۴ و ۵۵ اور مواضع کثیرہ؛ [تاج العروس، بذیل مادۂ حلو، والحُلوان بالضم اجرۃ الدلال خاصۃً عن اللحیانی و ایضًا اجرۃ الکاھن و منہ الحدیث عفی عن حلوان الکاھن] البتہ لوگ ان کو اجرت دینے سے پہلے ان کی پیشگوئی کی طاقت کا امتحان کر لیتے تھے۔

اس قسم کے مردوں اور عورتوں کا طبعًا اثر بہت ہوتا تھا اور وہ اکثر اپنے قبیلے کی حدود سے باہر اور دور دور تک تجاوز کر جاتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ کاہن بالکل ادنیٰ طبقے کے لوگوں سے چنے جاتے ہوں بلکہ بعض اوقات یہ لوگ بڑے ممتاز گھرانوں کے ہوتے تھے اور کبھی کبھی قبیلے کا سردار ہی ان کا کاہن بھی ہوتا تھا (Lammens، ص ۲۰۴ و ۲۰۷؛ الجاحظ، ۴: ۶۲؛ van Vloten، ۷: ۱۸۴، نیز ولہاؤزن، ص ۱۳۴ جس نے غلطی سے یہ کہ دیا ہے کہ ان اونچے خاندان کے کاہنوں کو ان کا عہدہ ورثے میں ملتا تھا)۔ بہر حال یہ لوگ اپنے قبیلے کے سردار اور عقلمند طبقے کے افراد ہوتے تھے (دیکھیے الجاحظ: البیان، باب اسماء الکُہّان و الحکام و الخطباء والعلماء من قحطان= قبیلۂ قحطان کے کاہنوں حاکموں۔ خطیبوں اور علما کے نام، ۱: ۱۳۶ نیچے سے۔ دیکھیے نیز کتاب مذکور، ص ۱۱۳ سطر ۱۵ ببعد، طبع قاہرہ ۱۳۳۳ھ، ۱: ۱۹۲؛ ۱۵۹)۔

دونوں صنفوں کے چند مشہور کاہن یہ تھے: سطیح الذِئبی شام میں اور شِق بن صَعب البَجَلی، (اور ان دونوں کا ذکر بالعموم ایک ساتھ آتا ہے اور دونوں یکساں فرضی معلوم ہوتے ہیں) غالبًا انہیں کے برابر غیر تاریخی یمنی شہزادی

www.besturdubooks.wordpress.com

طریفہ، جو Cassandra سے مشابہت رکھتی ہے۔ قبیلۂ مذحج کا المأسور الحارثی۔ قبیلۂ ربیعہ کا سردار عمرو بن جُعید الأفکل، قبیلۂ قریش کی سوداء بنت زہرہ، اور بنی قضاعہ کی زرقاء بنت زہیر وغیرہ (ولہاوزن، ص ۱۳۶؛ المسعودی: ۳: ۳۵۲، ۳۶۴ مواضع کثیرہ؛ فان فلوٹن - ۷: ۱۷۲، ۱۷۴، ۱۸۰ وغیرہ) - جنوبی عرب کے کاہن خاص طور پر بڑی شہرت رکھتے تھے (الأغانی، ۸: ۵۱ س ۴).

من حیث الاستعمال کاہن کا مترادف لفظ حازی (جمع حزاۃ اور حَازَۃ اور حَازُون، مؤنث حَازِیَۃ جمع حَوَازِی) کچھ کم رائج نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عبرانی لفظ Haza کا مترادف ہے۔ لیکن اس کے خالص عربی لفظ ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے۔ دوسری جانب ضروری ہے کہ ہم کاہن کو، جس کے، مافوق العادۃ علم کا داروبدار جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اندرونی الہام، پر ہے ان لوگوں سے بالکل ممتاز سمجھیں۔ جو ادنی قسم کی پیشگوئی اور جادو کے کرتب دکھاتے پھرتے ہیں اور جن کا داروبدار خارجی اور فنی ذرائع پر ہوتا ہے۔ جو مقررہ امور عادیہ کی مشق سے حاصل ہو سکتے ہیں اور بالفاظ دیگر ان معمولات پر کاربند ہو کر کا جو چاہے انہیں سیکھ سکتا ہے، یعنی عائف یا زاجر جو پرندوں کی اڑان کو پہچانتا ہے۔ قائف، حازر اور حزّار جو نشان قدم دیکھتا ہے۔ عَرّاف یا مُعَرِّف پانی کی جگہ بتانے والا (اصطلاحوں کے لیے بیان بالا بھی دیکھیے)، منجّم ستارہ شناس، الناظر فی اسرار الکف، ہاتھ کی لکیریں دیکھنے والا۔ خاطّ جو زمین پر کھنچی ہوئی لکیروں سے قسمت کا حال بتاتا ہے الضّارب یا الطّارق بالحصا جو کنکریاں ڈال کر پیش گوئی کرتا ہے اور جھاڑ پھونک کرنے والا ساحر یا راتی کبھی کبھی ان لوگوں کو بھی لفظ کا غلط استعمال کرتے ہوئے کاہن کہہ دیا جاتا ہے۔ اس کا رواج غالباً اس وقت ہوا جب اسلام نے اعلیٰ درجے کی کہانۃ کا خاتمہ کر دیا اور فقط بیرونی کرتب ٹونا، جھاڑ پھونک اور سحر باقی رہ گئے [مقالہ نگار کی یہ بات محل غور ہے کہ اسلام نے فقط اعلیٰ درجے کی کہانۃ کا خاتمہ کیا اور یہ کہ کہانۃ کی ادنی اقسام باقی رہ گئیں۔ معلوم نہیں اس بات کی سند مقالہ نگار کے پاس کیا ہے؟ - جب کہ ابن الأثیر نے کہا ہے کاہن سے رجوع کی ممانعت والی حدیث میں عراف اور منجم وغیرہ تک شامل ہیں۔ قال ابن الأثیر و قوله فی الحدیث من اتی کاهنا یشتمل علی اتیان الکاهن والعرّاف والمنجّم (دیکھیے لسان، بذیل مادّہ) میں یہاں پھر اس بات پر اصرار کرنا چاہتا ہوں (گو ویل ہاوزن نے ص ۱۳۴ اور دیگر مواضع میں اس سے اختلاف کیا ہے) کہ کاہن، یہودیوں کے کوہن کی طرح، خدائی آوازوں کا دہرانے والا نہ تھا۔ یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ہم "کوہن" کو کبھی تیروں کے ذریعے سے قسمت کا فیصلہ (استقسام) کرتے ہوئے نہیں پاتے.

قرآن مجید میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے کاہن ہونے سے صاف طور پر انکار کیا گیا ہے (۵۲ [الطّور]: ۲۹؛ ۶۹ [الحاقّة]: ۴۲؛ ۸۱ [التکویر]: ۲۲ ببعد) لیکن [ابتدائے نبوت کی بعض باتیں مثلاً آغاز وحی کی کیفیت استغراق اور سچے خواب بظاہر کاہنوں کی مذعومہ کیفیات سے مشابہ دکھائی دیتے ہیں].

مشرکین مکّہ نے ابتداء آپؐ کو کاہن ہی سمجھا اور آپؐ کے اس دعوے سے کہ میرا کاہن سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، بلکہ میں اللہ کا رسول اور پیغمبر ہوں، ان پر شروع میں کوئی اثر نہ ہوا۔ آپ کے جھوٹے نقالوں مثلاً مسیلمہ، طلیحہ [جو بعد میں مسلمان ہوگئے اور زمانۂ اسلام میں وفات ہوئی رک بہ طلیحہ] اور بالخصوص

www.besturdubooks.wordpress.com

اسود عنسی نے جس سے سجاح [بنی بعد ازاں تائب ہوگئی تھیں اور زمانۂ اسلام میں انتقال کیا رک بہ سجاح] بنی، جو اس جرگے کی ایک مؤنث فرد ہے، پیچھے نہیں ہے۔ اپنا کھیل کاہنوں کے بھیس میں کھیلا عرب کے لوگ پشتینی کافر اور مشرک تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو معمولی کاہن کہہ کر ان سے اپنا پیچھا چھڑا لیں، لیکن بعد میں ان کی بہت جلد آنکھیں کھل گئیں۔ حیرت اور افسوس تو ان کے حال پر ہے جو عالم اور عقلمند ہوتے ہوئے آنکھیں بند کر کے نصف النہار کے سورج کا انکار کرتے رہے۔

اسلام نے توحید کا ڈنکا بجا کر محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر ہر قسم کی وحی کے خاتمے کا اعلان کر کے اور شرع کے مقرر قانون کے ذریعے تمام معاشی رسوم و رواج کو ایک ضابطے کے ماتحت لا کر قدیم کاہنوں کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن حقیقت میں یہ کام رفتہ رفتہ پورا ہوا کیونکہ ہم ۱۳۲ھ تک میں ایک کاہن کا ذکر سنتے ہیں (الطبری، ۳: ۲۱ س ۱) موجودہ عربستان میں کہنہ (کاہنوں) کی بابت دیکھیے لینڈ برگ: *La Langue arabe et sesdialectes* ۷۰، اسلامی شمالی مغربی افریقہ میں کاہنہ عورتوں کی بابت دیکھیے Doutte، ص ۳۲ ببعد) غالباً محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کاہنوں کے اقوال کے مافوق العادۃ ہونے میں کبھی تردد نہ ہوا [مقالہ نگار کا یہ خیال درست نہیں، احادیث نبوی سے بھی کہیں اس کی تائید نہیں ہوتی]، لیکن جب آپ نے جنوں کو شیاطین کے مرتبے میں اتار کر ان کے علم کو آسمان سے سرقہ کیا ہوا قرار دیا جس کی شکل کو مسخ کر کے اور بہت کچھ اپنی طرف سے ملا جلا کر وہ کاہنوں کو دیتے تھے (۷۲ [الجن]: ۸ ببعد؛ ۳۷ [الصّٰفّٰت] ۷ ببعد؛ ۱۱۴ [النّاس]: ۱ تا ۶)، ابن ہشام: سیرۃ: ۱۳۱ ببعد) - اس سے کاہنوں کی پیش گوئیوں کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا - اسی سلسلے میں وہ احادیث سامنے آئیں - جن میں اہل اسلام کو کاہن کے پاس جانے سے منع کیا گیا ہے - (السیوطی: الجامع الصغیر، باب من اتی کاہنا: البخاری، ۲: ۳۴۳-۵۵ بمواضع کثیرہ نیز دیکھیے ابن عباس کا قول: ایّاکم و الکہانۃ وغیرہ - درالزمخشری: الکشاف، سورۃ لقمان ۳۱ آیت ۳۴).

besturdubooks.wordpress.com

مآخذ: (۱) Wellhousen: *Reste arabischen Heidentums*، بار دوم، ص ۱۳۴ ببعد، ص ۱۴۳، ۲۰۶ ببعد؛ (۲) شپرینگر: *Das Leben und die Lehre des Mohammad*، بار دوم، ج ۱، بالخصوص ص ۲۵۵ ببعد؛ (۳) فان کریمر: *Studien zur vergliechunden Culturgestichte Vorzüglich nach arabischen Quellen* (*Sitzungsb. der Phil-hist. kl.*، ج ۳ اور ۴، *der Wiener Akademie* ۱۲ نمبر ۸) ص ۷۳ ببعد؛ (۴) Van Vloten: *Dämonen Geister und Zauber bei den alten Arabern. Mitteilungen aus Djâhitz, Kitab al-Haiwân*، در *Wiener Zeitxhr. f. die Runde dis Morgenlondes*، ج ۷، ص ۱۶۹ ببعد، ص ۲۳۳ ببعد، ج ۸، ص ۵۹ ببعد؛ (۵) Goldziher: *Abkandl zur arab. Philologie*، ۱: ۱۸ ببعد، ص ۶۹ و ۱۰۷ ببعد؛ (۶) Lagrange: *Etudes sur les religions semitiques* بار دوم، ص ۲۱۸ ببعد؛ (۷) Doutte: *Magie et Religion dans l'Afrique du Nord*، ص ۲۸ ببعد؛ (۸) D. B. Macdonald: *The Religious life and Attitude in Islam*، ص ۲۰ تا ۳۳ بمواضع کثیرہ؛ (۹) Hölscher: *Die Profeten Untersuchangen zur Religionsgeschichte Israels*، ص ۷۹ ببعد؛ (۱۰) Lammens: *Le berceau de l'Islam*، ۱: ۲۰۳ ببعد، ص ۲۰۷؛ (۱۱) Schrieke: *Die Himmelsreise Muhammads* در

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Islam der، ۴ : ۲۲ ببعد؛ (۱۲) الجاحظ : کتاب الحیوان، بمواضع کثیرہ (دیکھیے : V. Vloten)؛ (۱۳) المسعودی : مروج الذّہب، طبع Barbier de Meynard اور Pavet de Courteille، ۳ : ۳۴۷ ببعد؛ (۱۴) القزوینی : عجائب المخلوقات، طبع Wüstenfeld، ص ۳۱۸ ببعد؛ (۱۵) ابن خلدون : مقدمہ، طبع Quatremère : *Not. et Extr.*، ۱۶ : ۱۸۱ ببعد، ترجمۂ ڈی سلان، ۱۹ : ۲۰۶ ببعد (طبع قاہرہ ۱۳۲۷ھ، ص ۱۱۲ ببعد)؛ (۱۶) الابشیہی : المستطرف، باب ۶۰.

(A. FISCHER)

* کیا : کیایا [رک بہ کتخدا].

* کَیْخُسْرَو : ایران کا ایک اساطیری بادشاہ جو کیانی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، وہ سیاوَخش کا بیٹا تھا ۔ سیاوخش نے اپنے باپ کیکاؤس کے ہاں سے بھاگ کر توران میں پناہ لی اور وہاں کے بادشاہ افراسیاب [رک بآں] کی دختر سے شادی کر لی ۔ کیخسرو اپنے باپ کی وفات کے بعد پیدا ہوا اور اسی ملک توران میں قلّو (بامیان کے نزدیک ایک وادی ہے) کے پہاڑی علاقے میں پرورش پائی ۔ وہ اس بات سے بےخبر تھا کہ وہ شاہی نسل سے ہے، لیکن آخر اس پر یہ راز منکشف ہو گیا ۔ سات سال کی عمر میں وہ کمانیں بنا لیا کرتا تھا اور جب دس سال کا ہوا تو نہ شیر سے ڈرتا تھا اور نہ چیتے سے ۔ اس کے بعد افراسیاب کا وزیر پیران اسے اپنے گھر لے گیا ۔ ایک ایرانی امیر گودرز کو جو کاوہ آہنگر کی نسل سے تھا، خواب میں معلوم ہوا کہ ایران کے تخت و تاج کا وارث دشمنوں کے ملک میں موجود ہے، چنانچہ اس نے اس کی تلاش میں اپنے بیٹے گیو کو روانہ کیا ۔ گیو توران پہنچا اور کیخسرو سے اس کی مڈ بھیڑ بالکل اتفاقی طور پر ہو گئی اور اس کے بازو کا سیاہ نشان جو کیانیوں کی امتیازی علامت تھی، دیکھ کر اسے پہچان لیا اور اسے اور اس کی ماں فرنگیس کو اپنے ساتھ ایران لے آیا.

یہاں پہنچ کر کیخسرو کو اپنے چچا فَرِیبُرز سے مقابلہ کرنا پڑا، جو وارث تخت و تاج ہونے میں اس کا حریف تھا ۔ یہ مسئلہ طے کرنے کے لیے کیکاؤس نے فیصلہ کیا کہ تخت اسی کو ملے گا جو قلعۂ بہمن دز فتح کرے گا، یہ قلعہ اردبیل [رک بآں] کے قریب تھا اور اس پر اَہْرِمَن کی حکومت تھی ۔ فاتح آخر کیخسرو ہی کو ہونا تھا، چنانچہ وہ آسمانی قوتوں کی مدد سے اس مہم میں کامیاب ہوا اور وہاں مقدس ''آگ آذرگُشَنْسَپ'' کے اعزاز میں ایک آتشکدہ تعمیر کیا ۔ شاہ ایران ہونے کے بعد اپنی مملکت کا دورہ کرنے سے کیخسرو کو ان تباہ کاریوں کا علم ہوا جو تورانیوں نے ایران میں کی تھیں ۔ چنانچہ اس نے قسم کھائی کہ انتقامی جنگ کے ذریعے توران کو برباد کر کے چھوڑے گا ۔ اس نے تمام امرا کا تعاون حاصل کر کے توران پر فوجی حملے شروع کر دیے ۔ پہلی مہم میں تو اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، لیکن جلد ہی پانسہ پلٹ گیا ۔ اس نے جنگ کی قیادت خود سنبھالی ۔ افراسیاب کو خاقان چین کی اعانت کے باوجود آخر کار فرار ہونا پڑا ۔ کیخسرو نے سمندر پار تک اس کی جستجو کی افراسیاب آذر بیجان [رک بآں] کے پہاڑوں کے ایک غار میں چھپا ہوا تھا اور اس کی یہ پوشیدہ پناہ گاہ خارق عادت و سائل کے بغیر ڈھونڈی نہیں جا سکتی تھی ۔ بالآخر وہ گرفتار ہوا اور اس کا سر قلم کر دیا گیا ۔ اس طرح سیاوخش کے قتل کا انتقام پورے طور پر لے لیا گیا.

کیخسرو نے اپنے دادا کیکاؤس کا چالیس روز تک ماتم کیا، اس کے بعد اس کا جانشین ہو کر امن و امان کے ساتھ حکومت کی ۔ اس کے عہد سلطنت میں کوئی اس سے زیادہ نمایاں واقعہ پیش نہیں آیا کہ اس نے ایک اژدھے کو جس نے اصفہان اور فارس کے درمیان کوہ شید کے سرخ پہاڑ میں اپنی

www.besturdubooks.wordpress.com

جگہ بنا لی تھی، ہلاک کیا (حمزۃ الاصفہانی، طبع Gottwaldt، ص ۳۶، برلن، ص ۷)۔ کیخسرو نے آخر عمر میں خدا سے التجا کی کہ اسے بہشت میں جگہ دی جائے۔ اس کے بعد اس نے لُہْراسْپ کو اپنا جانشین مقرر کیا پھر ایک چشمہ (چشمہ حیات جاودان ''آب روشن'') میں غسل کرکے پہاڑوں کی طرف روانہ ہوا اور انہیں میں کہیں غائب ہو گیا۔ جو لوگ اس کے ساتھ گئے تھے، وہ برف کے طوفان میں ہلاک ہو گئے۔ یہ امر واضح ہے کہ کیخسرو کی شخصیت اوستا کے بطل ھاؤسْرَوَنْہ Haosravanh سے ملتی ہے جو ہندی ایرانی اساطیر سے تعلق رکھتا ہے۔

مآخذ: (۱) فردوسی: شاھنامہ، طبع Vullers، ۲: ۶۷۰ تا ۶۷۹، ۷۰۱ تا ۷۰۳، ۷۱۰ و ۳: ۱۴۴۲؛ طبع و ترجمۂ Mohl، ۲: ۳۱۶ تا ۳۳۰، ۳۶۲ تا ۳۶۵، ۳۷۶ و ۳: ۲۷۳؛ (۲) الطبری: Annales، طبع de Goeje، ۱: ۶۰۳ ببعد؛ (۳) الثعالبی: غُرَر اخبار مُلُوک الفُرس، طبع و ترجمہ Zotenberg، ص ۲۱۴، ۲۱۸ تا ۲۴۳ [(۴) ثعالبی: شاھنامہ، مطبوعۂ تہران، ص ۱۳۲۸ - ۱۳۲۹ھ، ص ۹۷، ۹۹ تا ۱۱۰؛ (۵) Dubeux: La Perse، پیرس ۱۸۴۱ء، ص ۲۴۸ تا ۲۶۱؛ (۶) Fr. Spiegel: Eranische Alterthumskunde، ۱: ۶۰۹، ۶۵۶ ببعد؛ (۷) وہی مصنف: Awestâ und Shâhnâme، در Deutsch. Morg. Gesellsch.، ۴۵ (۱۸۹۱): ۱۹۶؛ (۸) Gründr. d. iran Philologie، ۲، بمدد اشاریہ، بذیل Kavi؛ (۹) Th. Nöldeke: Das iranische Nationalepos، بار دوم، (برلن - لائپزگ) ۱۹۲۰ء ص ۱، ۳، ۵، ۱۲، ۴۵، ۴۹ ببعد، ۵۰، ۵۲، ۵۵، ۶۰ ببعد۔

(Cl. Huart)

کَیْخُسْرَو: ایشیائے کوچک کے تین سلجوقی فرمانروا اس نام کے ہوئے ہیں:

کَیْخُسْرَو اول: غیاث الدین بن قِلِج ارسلان۔ ۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء میں قلج ارسلان دوم بڑھاپے اور ناتوانی کے عالم میں فوت ہوا تو اس وقت اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کیخسرو کے ہاں تھا، جو اس کی زندگی میں بُرغلو (یعنی اَلْبُرْلُوْ) کا والی تھا۔ کیخسرو نے اپنے باپ کی موت کی خبر پوشیدہ رکھی اور اس خبر کو فقط اس وقت ظاہر کیا جب وہ اس کا جنازہ لے کر قونیہ پہنچ گیا، غرض یہ تھی کہ وہاں خود اسے سلطان تسلیم کرکے اس کی اطاعت اختیار کی جائے۔ اس کے بھائیوں نے جن میں سے ہر ایک سلجوقی سلطنت کے الگ الگ حصے پر حکومت کر رہا تھا، اس کی بس اسی قدر پروا کی جتنی وہ اپنے باپ کی اس کے آخری دنوں میں کیا کرتے تھے۔ بہرحال کچھ مدت بعد (بعض کے نزدیک ۵۹۲ھ / ۱۱۹۶ء اور بعض کے نزدیک ۵۹۵ھ میں) ہی وہ اس قابل ہوئے کہ ان میں سے کوئی اس سے قونیہ لے لے۔ آخر کار رکن الدین سلیمان [رلک بآں] قونیہ فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا اور کیخسرو کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ اس نے ارمینیا کے بادشاہ لیون Leon اور ہمسایہ ممالک مثلاً مَلَطْیَہ، حَلَب، اور آمِد کے فرمانرواؤں کی مدد سے اپنا تخت دوبارہ حاصل کرنے کی کئی بار کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس کے بعد، وہ ادھر ادھر سرگردان پھرتا رہا (دیکھیے اس کی اپنی کہی ہوئی نظم در ابن بیبی، ص ۲۹ ببعد)، تاآنکہ قسطنطنیہ میں الکسیس Alexius سوم نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اسی زمانے میں اس نے ایک ممتاز یونانی ماروزومز Maurozomes کی بیٹی سے شادی کی۔ اس کے چند ہی دن بعد ۶۰۰ھ / ۱۲۰۳ء میں اس کے بھائی کی وفات ہو گئی اور اسے قونیہ واپس آنے کا موقع ہاتھ آیا۔ وجہ یہ تھی کہ چند امرا اس کے متوفی بھائی کے بیٹے قلج ارسلان سوم کی حکومت سے جو ابھی نابالغ تھا، مطمئن نہیں تھے۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

اس سازش میں خاندان دانشمندیہ [رک بآں] کے بعض افراد نے بڑا حصہ لیا کیونکہ دانشمندیہ کو قلج ارسلان دوم نے تاج و تخت سے محروم کر دیا تھا۔ اب اس کے باوجود کہ قاضی الترمذی نے اس کے خلاف فتوی دے دیا تھا کہ وہ تخت نشینی کے قابل نہیں، کیونکہ اس کی ماں عیسائی ہے اور کفار سے اس کے گہرے مراسم ہیں، تاہم کیخسرو قونیہ میں اپنی بادشاہت کا اعلان کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس فتوے کی بدولت قاضی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ابن الأثیر (الکامل، طبع Tornberg، ۱۲: ۱۶۰ و قاہرہ ۱۳۰۳ھ / ۱۱: ۹۳) کے بیان کے مطابق کیخسرو نے ۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء میں طرابزون Trebizond کا محاصرہ کر لیا، لیکن بظاہر اس کو کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ ۶۰۳ھ / ۱۲۰۷ء میں اس نے الدوبراندینی Aldobrandini سے انطالیہ کی اہم بندرگاہ چھین لی۔ اسی قبضے کے وقت سے سلجوقیوں کے روابط اہل وینس سے شروع ہوتے ہیں، جنہیں اس نے تجارت کا پروانہ عطا کیا (دیکھیے Heyd: *Gesch. des Levantehandels*، ۱: ۳۳۴)۔ ۶۰۵ھ/۱۲۰۸ء میں اس نے الملک الظاہر شاہ حلب کے ساتھ مل کر ارمنیوں پر چڑھائی کی اور پرتس Pertus کا قلعہ فتح کر لیا۔ ۶۰۷ھ/ ۱۲۱۰ء میں وہ جنگ خوناس میں اور غالباً تھیوڈور لیسکارس Theodore Lascaris کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ دیکھیے Nicephoros Gregoras طبع Bonn، ۱: ۱۷ تا ۲۰؛ اور Georg. Acropolita طبع Bonn، ص ۱۶؛ اور پھر اسی کے بارے میں Houtsma، در *Verslagen en Mededeelingen der Kon Akad van Wetensch* سلسلۂ Afd. Letterk. سوم، ۹ (۱۸۹۳ء): ۱۳۸ ببعد۔

کیخسرو دوم: غیاث الدنیا و الدین بن کیقباد، ۶۳۴ھ/۱۲۳۷ء میں اپنے باپ کے قتل ہو جانے کے بعد تخت نشین ہوا، حالانکہ اس کے باپ نے اپنے دوسرے بیٹے عزالدین کو جو ایوبی شہزادی کے بطن سے تھا، اپنا جانشین مقرر کیا [رک بہ کیقباد اول]، جس کی وجہ بقول وسٹنفلڈ بظاہر یہی تھی کہ کیخسرو ایک داشتہ کے بطن سے تھا (جیسا کہ قیصریہ میں اس کے لوح مزار سے پتا چلتا ہے۔ یہ داشتہ ماہ پری خاتون کے نام سے مشہور تھی)۔ اس کے علاوہ وہ ایک حقیر شخصیت کا آدمی تھا، لیکن یہ بات ضرور تھی کہ اس کے باپ نے داؤد شاہ کو معزول کر کے اسے ارزنجان کا والی مقرر کر دیا تھا [رک بہ کیقباد] اور اجیر عیسائیوں کے بل بوتے پر وہ تخت کا امیدوار تھا۔

ان عیسائی اجیر سپاہیوں نے امیر سعد الدین گوبگ Göbäk کے ساتھ مل کر کیخسرو کی بادشاہت کا اعلان مکمل کرا ہی دیا۔ بد نصیب عزالدین، اس کی ماں اور ایک اس کا چھوٹا بھائی سب راستے سے ہٹا دیے گئے۔ اس صورت حال سے فقط خوارزمی [رک بہ کیقباد اول] غیر مطمئن تھے۔ انھوں نے اطاعت احکام سے انکار کر دیا اور ملحقہ ایوبی حکومت کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرنے کے لیے سلجوقی مملکت کی حدود سے نکل گئے۔ کیخسرو نے مصلحتاً یہ کیا کہ ایوبیوں کے ساتھ صلح کر لی اور دوسری شادی کے ذریعے حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ اس تقریب میں مشہور مؤرخ کمال الدین نے شاہ حلب کے بااختیار وکیل کی حیثیت سے اس کی نمائندگی کی۔ کیخسرو کاروبار حکومت کی طرف توجہ دینے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔ اس لیے امیر سعد الدین نے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر وحشت و بربریت کا دور قائم کر دیا۔ امیر مذکور نے تو یہاں تک کیا کہ وہ اپنے آپ کو کیخسرو اول کا بیٹا ظاہر کرنے لگا۔ غرض اس کی

www.besturdubooks.wordpress.com

چیرہ دستیاں اتنی بڑھ گئیں کہ بالآخر سلطان کو اسے فریب سے قتل کروانا پڑا ۔ اس کے بعد سلطان نے گرجستان کی حسین شہزادی تمر سے شادی رچائی [رک بہ کیقباد اول] اور اس کی تصویر سکوں پر کندہ کرانے کی خواہش بھی ظاہر کی ۔ یہ خیال جب اسے مجبوراً ترک کرنا پڑا تو دلی سکون کی خاطر شیر اور نکلتے ہوئے سورج کا نشان منتخب کر لیا جو آج بھی بصورت شیر و خورشید ایران کا قومی نشان ہے ۔ تھوڑے ہی عرصے میں ترکمانوں کے شورش بپا کرنے پر سلطنت کی داخلی کمزوریوں کا پتا چل گیا (۶۳۸ھ/۱۲۴۱ء) ۔ یہ بغاوت بابا اسحٰق ولی کے ظہور کے ساتھ وابستہ تھی جس کے مبلغوں نے سارے ملک کا دورہ کر کے مجالس وعظ میں سلطان اور امرا کی عیاشانہ زندگی کی خوب مذمت کی ۔ تھوڑے ہی دنوں میں سمیساط اور ملطیہ کے اضلاع سے مسلح دستے سیواس، تموقات اور آماسیہ Amasia کی طرف بڑھے اور ترکی سپہ سالاروں کو جو ان کے مقابلے کے لیے، بھیجے گئے تھے، مار بھگایا ۔ اس پارسا بابا کو سزائے موت دینے سے اس کے پیروؤں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی کیونکہ لوگ اسے ملہم من اللہ مانتے تھے ۔ جب سرحد ارز روم پر متعین فوجوں کو جن میں اجیر عیسائی سپاہی شامل تھے، بلایا گیا، تب کہیں جا کر بڑی خونریزی کے بعد باغیوں کی سرگرمیوں کا خاتمہ ہوا (دیکھیے روئداد، در Vincent de Beauvais، کتاب ۳۰، باب ۱۳۹، ۱۴۰) ۔ یہاں اس دینی رہنما کو بابا روئیسول Roissole (= رسول اللہ) لکھا ہے ۔ المقریزی، *Histoire d' Egypte Makrizi*، مترجمۂ Blochet پیرس ۱۹۰۸ء ص ۴۷۴، میں ال بابا لکھا ہے (ال غالباً عربی حرف تعریف ال کی تحریف ہے یا الیاس کا مخفف ہے کیونکہ الیاس بابا کا نام بھی ملتا ہے) ۔ (دیکھیے کو پرولو زادہ محمد فؤاد، الک متصوفلر، ص ۲۳۲) ۔ ابھی اس مصیبت سے پوری نجات نہیں ملی تھی کہ ۶۳۹ھ/ ۱۲۴۱ء میں بایجو نویان Baidju Noyon اپنے مغولی لشکر کے ساتھ ارز روم کے سامنے آ دھمکا اور سرحد پر متعین افواج سے شدید جنگ کے بعد شہر میں بہت لوٹ مار کی ۔ مہذب الدین وزیر اور اس کے نائب شمس الدین اصفہانی نے بڑی سرعت سے کثیر تعداد میں ایک لشکر جمع کیا اور مال و دولت کے ذریعے آرمینی اور ایوبی اجیر سپاہیوں کی خدمات حاصل کیں اور مغول کے مقابلے پر نکلے، لیکن ترک سپاہیوں کی نا اہلی اور کم ہمتی کے باعث کوزہ داغ Közädagh کے مقام پر شکست کھائی (۶ محرم ۶۴۱ھ/ ۲۶ جون ۱۲۴۳ء) ۔ اس کے بعد بایجو نے سواس پر یلغار کی، لیکن وہاں کے لشکر نے ہتیار ڈال دیے جس کی وجہ سے یہ مقام غارت گری سے بچ گیا ۔ مگر قیصریہ کو اس نے بزور شمشیر فتح کیا ۔ وہاں بہت لوٹ مار ہوئی اور قتل عام بھی ہوا ۔ اس کے بعد بایجو اپنے سرمائی مستقر کو چلا گیا اور وزیر اس سے ایک عارضی صلح طے کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ لیکن اس کی تکمیل خان اعظم کی توثیق پر موقوف تھی ۔ انھیں دنوں اوگدائی Ugedei کا انتقال ہو گیا اور اگلی وریلتائی [مغول کی مجلس شوریٰ] ۱۲۴۶ء تک منعقد نہ ہو سکی (دیکھیے صفحات سابقہ، در ۱: ۶۸۲ الف) ۔ اس لیے ترکوں کو چند سال کے لیے امن نصیب ہو گیا ۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہوشیار شمس الدین نے باتو خان Batü کے پاس متعدد ممتاز ترکوں کی معیت میں پُر تشریفات سفارت لے جا کر اس کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی ۔ اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہا، چنانچہ واپسی پر اسے عہدۂ وزارت مل گیا جو مہذب الدین کی وفات پر خالی ہوا تھا ۔ نا اہل سلطان نے جو کوزہ داغ کی لڑائی کے بعد یونانیوں کے ہاں بھاگ جانے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کے لیے تیار بیٹھا تھا، اب کچھ کمر ہمت باندھی اور ۱۲۴۵ء میں ارمنیوں پر لشکر کشی شروع کر دی ۔ اسے ارمنیوں کے خلاف سخت رنجش تھی، کیونکہ انھوں نے اس کی ماں کو جس نے ان کے بادشاہ کے پاس پناہ لی تھی، اس کے خزانوں سمیت مغول کے حوالے کر دیا تھا ۔ اس مہم کا مقصد اس موقع پر طرسوس کو فتح کرنا تھا، لیکن برسات کا موسم شروع ہونے کی وجہ سے اس سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔ بہر حال ملک کو نہایت وحشت ناک طریقے سے تاخت و تاراج کرنے کے بعد فوج واپس آ گئی ۔ ارمنیوں نے ایک صلح نامے کی رو سے سالانہ خراج ادا کرنے اور برگنہ Bragana کا شہر حوالے کرنے کا عہد کیا ۔ جب ان کے سردار دوبارہ سلطان کے دربار میں پہنچے تو وہ ایک ہفتہ پہلے اچانک وفات پا چکا تھا ۔

مآخذ (۱) : دیکھیے بذیل مادۂ کیکاؤس: (۲) اس سلسلے میں Vincent de Beauvais اور عہد مغول کے مؤرخین خاص طور پر اہم ہیں ۔

کیخسرو سوم : غیاث الدین بن رکن الدین قلج ارسلان اگرچہ ابھی کمسن ہی تھا، لیکن کامل الاقتدار ''پروانہ معین الدین سلیمان'' [رک بآں] نے اس کے باپ کے قتل ہونے کے فوراً بعد اس کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا ۔ اس کے عہد حکومت میں ایشیائے کوچک میں جو واقعات رونما ہوئے، ان کا ذکر بذیل مادۂ سلیمان زیادہ مناسب ہوگا ۔ پروانہ کے قتل (۶۷۶ھ / ۱۲۷۷ء) کے بعد بہت جلد کیخسرو کی حکومت بھی ختم ہو گئی، کیونکہ کمسنی کے باعث وہ تاتاریوں کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا ۔ اس کا بھتیجا مسعود [رک بآں] جب اپنے باپ کی وفات کے بعد ایشیائے کوچک واپس آیا تو (خان اعظم) اباقا [رک بآں] کی عنایات حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ۔ یہاں تک کہ ۶۸۱ھ ہی سے اس کے نام کے سکے ہمیں ملتے ہیں ۔ بد نصیب کیخسرو بالکل تاتاری شہزادے اور مدعی تخت قنقرطائی Kankuratai کے زیر اقتدار تھا ۔ تبعاً قنقرطائی کے زوال پر اس پر بھی عتاب ہوا اور ۶۸۲ھ / ۱۲۸۳ء میں ایلخان احمد کے حکم سے ارزنجان میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔

(اوو لائیڈن، بار اوّل)

کیسان : ابوعمرۃ بنو عرینہ کا مولیٰ جن کا تعلق بجیلہ (رک بآں) سے تھا ۔ وہ المختار کے زمانے میں کوفے کے موالی [رک بہ مادّہ مولیٰ] کے رہنماؤں اور اس کے مقربین میں سے تھا ۔ المختار نے اسے محکمۂ پولیس (حرس، شُرطۃ) کا حاکم اعلیٰ مقرر کر دیا تھا ۔ اس منصب کے بل پر اس نے [حضرت امام] حسین رض کا انتقام لینے میں باین صورت حصہ لیا کہ جن لوگوں نے حضرت امام رض کے خلاف تلوار اٹھائی تھی، انھیں جہاں ممکن ہوا قتل کیا اور ان کے مکانات تباہ کیے ۔ المختار کے حکم سے اس نے عمر بن سعد بن ابی وقاص کا سر تن سے جدا کیا جو اس فوج کا سپہ سالار تھا جو [امام] حسین رض کے خلاف بھیجی گئی تھی ۔ جنگ مذار (۶۷ھ / ۶۸۶ء) میں کیسان کے ہاتھ میں موالی کی قیادت تھی ۔ غالباً وہ اسی گھمسان کی لڑائی میں مارا گیا ۔ بقول الکشّی کیسان کے طرز عمل کی بدولت اھالی کوفہ میں ایک مثل بن گئی تھی: وہ اس شخص کی نسبت جو اپنے مال سے محروم ہو چکا ہو، کہا کرتے تھے کہ اس کے گھر میں ابو عمرۃ داخل ہو گیا ہے؛ دیکھیے الدّینوری، ص ۲۹۷، س ۵؛ یعنی ابو عمرۃ سے اس کی ملاقات ہو گئی ہے ۔ الکشی کے ہاں ایک شعر ملتا ہے جس میں اس کی ہجو کی گئی ہے ۔ چونکہ محمّد بن الحنفیہ فرقۂ کیسانیہ کے امام تھے، اس لیے بعض اوقات کیسان کو ان کا مولیٰ یا شاگرد بھی بتایا جاتا ہے ۔

(C. Van Arendonk)

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

* **کَیْسَانِیَّہ** : کیسان کے لفظ کا استعمال سب سے پہلے اس شیعہ گروہ، المُوالی کے لیے ہوا جن کا سرگروہ کیسان ابو عمرہ تھا (دیکھیے ۷ لائیڈن بذیل مادّۂ کیسان) اور جس کی حمایت المختار نے کی، لیکن بعد میں اس کا مصداق وسیع تر ہو گیا ۔ اور اس میں وہ لوگ بھی شامل کر لیے گئے جنھوں نے ان خیالات کو مانا جو مختار کے زیر قیادت شیعہ گروہ میں پھیل چکے تھے اور جن کا اثر بعد میں بھی بہت دن تک رہا ۔ جب کچھ مدت گزرنے پر گمنام شخص کَیْسان عملاً بھلا دیا گیا تو کیسان کی توجیہ یہ کی جانے لگی کہ یہ مختار کا لقب تھا اور قدیم تر طبقۂ کیسانیہ کا دوسرا نام اس وجہ سے مختاریہ ہو گیا ۔ اس کے ساتھ ہی کیسانیہ کی وجہ تسمیہ بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ کیسان کی طرف جو حضرت علیؓ کا مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھا، منسوب ہے ۔ یہ غلام جنگ صفین (الطبری : ۱ : ۳۲۹۳ س ۱۰) میں قتل ہوا ۔ کہا گیا ہے کہ مختار نے اپنے عقائد اسی سے اخذ کیے تھے ۔ کیسانیہ کو خشبیہ [رک بآں] بھی کہتے ہیں کیوں کہ یہ ایک خاص قسم کی لکڑی (خشب) کا ڈنڈا ہتیار کے طور پر اپنے ساتھ رکھتے تھے ۔

مختار کے ہم عصر کیسانی لوگ اسے ایک خاص قسم کا دانائے راز سمجھتے تھے اور اسے ایک حد تک پیغمبر مانتے تھے ۔ ان کے ہاں عبادت کی ایک خاص صورت بھی ضرور رائج ہو گی جس کو یمنی قبائل نے اختیار کیا تھا اور جسے سبائی کہا گیا ہے، یعنی حضرت علیؓ کی طرف منسوب ایک کرسی کی ، جس کو یہودیوں کے تابوت العہد کے مشابہ ٹھیرایا گیا تھا، پوجا کرنا اور اس سے مشیر غیبی کا کام لینا ۔ ان کے ہاں حضرت امام حسینؓ کے جانشین محمد بن الحنفیہ [رک بآں] تھے جنھیں مختار نے محض ایک رسمی امام بنا رکھا تھا ۔ الشہرستانی نے بیان کیا ہے، کہ کیسانی محمد بن الحنفیہ کو تمام علوم کا مالک مانتے تھے اور کہتے تھے کہ انھوں نے دو سیدوں (یعنی الحسنؓ اور الحسینؓ) سے تمام باطنی، تاویلی اور مخفی علم نیز کرہ ہائے افلاک اور ارواح کا علم حاصل کر لیا تھا ۔ کچھ زمانے کے بعد ایسے کیسانی پیدا ہوئے جنھوں نے ابن الحنفیہ کو اپنے باپ (حضرت علیؓ) کا بلاواسطہ جانشین امام قرار دیا اور اس طرح الحسن اور الحسین کو درمیان سے بالکل خارج کر دیا ۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے ایک روایت پیش کی کہ جنگ جمل میں حضرت علیؓ نے جھنڈا محمد بن الحنفیہ کے سپرد کیا تھا ۔ غالباً یہ عقیدہ امامیوں اور زیدیوں کے عقیدے کے مقابلے میں پیدا ہوا ۔

ابن الحنفیہ کی وفات پر جو غالباً ۸۱ھ/۷۰۰ء میں ہوئی، کیسانیوں میں پھوٹ پڑ گئی ۔ ایک گروہ نے ابن الحنفیہ کے بیٹے علی کو امامت کا منصب دیا اور ایک نے اس کے بیٹے ابوہاشم [رک بآں] کو امام مانا کیونکہ وہ اس کو اپنے باپ کے مخفی علم کا وارث سمجھتے تھے ۔ ان کا لقب ہاشمیہ ہوا، لیکن ابوہاشم کی وفات (۹۸ھ/۷۱۶-۷۱۷ء یا ۹۹ھ/۷۱۷-۷۱۸ء) کے بعد جانشینی کے مسئلے پر ان کی کئی شاخیں ہو گئیں ۔ اس وقت عباسیوں نے اس خیال کی اشاعت شروع کی کہ ابو ہاشم نے اپنی وفات سے پہلے امامت کے جملہ حقوق محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس [رک بآں] کی طرف منتقل کر دیے تھے ۔

کیسانیہ کا ایک گروہ محمد بن الحنفیہ کی موت کا قائل نہیں ۔ ان کے خیال میں وہ رَضْوی [رک بآں] پہاڑ کے خفید غار میں پوشیدہ ہیں، جہاں سے وہ ایک دن مہدی [رک بآں] کے نام سے اپنے پیروؤں کے قائد بن کر نکلیں گے اور دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے ۔ کیسانی شاعر الکُثَیِّر [رک بآں] اور السید الحِمْیَری [رک بآں]

www.besturdubooks.wordpress.com

نے ان کے پوشیدہ مقام پر فروکش ہونے کو حضرت عیسیٰؑ کے قیام کے حالات سے ملایا ہے۔ غَیْبَة [رَکّ بآن] اور رجعة [رَکّ به رجوع] کے عقیدے کو ایک شخص ابو کَرب (کُرَیب) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس کے متبعین کو اس کے نام پر کُرَیبیہ (کُرَیْبِیَّہ) [رَکّ بآن] کہتے ہیں۔

الشہرستانی کا بیان ہے کہ تمام کیسانی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ دین صرف ایک آدمی کی اطاعت کا نام ہے۔ بذریعۂ تاویل [رَکّ بآن] افتا اور استنباط مسائل کا حق ان لوگوں کی طرف جو لائق رہنما ہیں، منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس عقیدے نے بھی کیسانیوں ہی میں جنم لیا کہ نئے حالات کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے قضائے الٰہی بدل سکتی ہے [رَکّ بہ بداء]۔ مخفی امام کی رجعت کے عقیدے کے علاوہ ان میں سے بعض لوگ تناسخ [رَکّ بآن] کے قائل تھے۔

امامیہ [رَکّ بآن] اور زیدیہ [رَکّ بآن] کے ہوتے ہوئے فرقۂ کیسانیہ کو کوئی دیر پا زندگی نصیب نہ ہوئی۔ ابن حزم نے اپنے زمانے ہی میں کیسانیہ کو ایک مردہ فرقہ قرار دیا۔ عقیدۂ غیبت اور رجعت کا عَلَوِیّہ کی طرف جن کی حمایت زیدیہ نے کی تھی، منسوب کیا جانا غالباً کیسانیہ ہی کے اثر کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ ایک قابل توجہ وثیقہ بھی، جس میں قرامطی عقائد پائے جاتے ہیں (دیکھیے ZDMG، لائیڈن بذیل مادۂ قرامطہ)، ممکن ہے، کیسانی ہی حلقوں سے نکلا ہو۔ اس میں ایک شخص احمد بن محمد بن الحنفیہ نامی مہدی اور پیغمبر ہونے کا مدعی نظر آتا ہے (الطبری: ۳: ۲۱۲۸ ببعد؛ ابن الاثیر: الکامل، ۷: ۳۱۱ س، ۱۶ ببعد؛ de Sacy: *Expose de la religion des Druzes*، پیرس، ۱۸۳۸ء، ۱ (دیباچہ): ۱۷۷ ببعد)، لیکن محمد بن الحنفیہ کے بیٹوں میں کوئی ایسا شخص نہیں جس کا نام احمد ہو (دیکھیے ابن سعد: الطبقات، ۵: ۶۷؛ احمد بن علی الداؤدی الحسنی: عمدة الطالب فی انساب ابی طالب، بمبئی ۱۳۱۸ھ، ص ۳۱۹ ببعد)۔

مآخذ: (اس مقالے کے لیے بھی جو اس سے پہلے ہے دیکھیے): (۱) الطبری، طبع ڈخویہ، ۲: ۵۹۸ ببعد، بالخصوص ۶۳۴ س ۸ ببعد، ۶۳۶ س ۱۱ ببعد، ۶۶۲ س ۸ ببعد، ۶۷۱ س ۱، ۶۷۳ س ۱۰ ببعد، ۷۰۲ ببعد، ۷۲۱ س ۸ ببعد؛ (۲) الدینوری: الاخبار الطوال، لائیڈن ۱۸۸۸ء، ص ۲۹۸، ۳۰۰، ۳۰۵ اور پر، ۳۰۸؛ (۳) المسعودی: مروج الذهب (پیرس ۱۸۶۱ تا ۱۸۷۷ء)، ۵: ۱۸۰ ببعد، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۶۸، ۴۷۵ و ۶: ۵۸ و ۷: ۱۱۷؛ (۴) ابن قتیبہ: کتاب المعارف، طبع وسٹنفلڈ، ص ۳۰۰؛ (۵) ابن عبد ربہ: العقد الفرید، قاہرہ ۱۲۹۳ھ، ۱: ۲۶۷ ببعد، ۲۶۹ س ۶ ببعد؛ (۶) الکشّی: کتاب الرجال، بمبئی ۱۳۱۷ھ، ص ۸۵؛ (۷) الاغانی، ۷: ۳، س ۱۹، و ۴ ہیں ۱۰ ببعد، ۵، س ۱۷، ۲۲ و ۹، س ۲۶ ببعد؛ ۸: ۳۲، س ۸ ببعد، ۳۳؛ (۸) الخوارزمی: مفاتیح العلوم، لائیڈن ۱۸۹۵ء، ص ۲۹ ببعد؛ (۹) عبدالقادر البغدادی: الفَرق بین الفِرق، قاہرہ ۱۳۲۸ھ، ص ۱۶، ببعد، ۲۷ تا ۳۸، ۵۳ س ۱۴ ببعد؛ (۱۰) ابن حزم: الفصل فی الملل والا هواء والنحل، قاہرہ ۱۳۱۷ تا ۱۳۲۱ھ، ۴: ۹۴، س ۲ ببعد، ۱۷۹ س ۲۰ ببعد، ۱۸۰ س ۷ ببعد، ۱۸۲، س ۷، ۱۷ ببعد، ۱۸۴ س ۱۰ تا ۱۲؛ (۱۱) ابوالمعالی: بیان الادیان، در Schefer: *Chrest. Persane*، ج ۱ (*Publ. de l'École des Langues or. viv.*، سلسلہ ۲، ۷)، ص ۱۰۷ ببعد؛ (۱۲) الشہرستانی: الملل والنحل، طبع Cureton، ص ۱۰۹ ببعد؛ (۱۳) المقریزی: الخطط، بولاق ۱۲۷۰ھ، ۲، ۳۵۱ ببعد؛ (۱۴) ابن خلکان: وفیات الاعیان، طبع وسٹنفلڈ، عدد ۵۰۷ (ص ۹۱)؛ (۱۵) ابن خلدون: المقدمہ، قاہرہ ۱۳۲۷ھ، ص ۲۱۹ ببعد؛ (۱۶) الجوہری: الصحاح، بولاق ۱۲۸۲ھ، ۱: ۳۷۴، س ۲۱ ببعد؛ (۱۷)

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

لسان العرب، ۷ : ۸۶، س ۱۶ ببعد؛ (۱۸) تاج العروس، ۴ : ۲۳۸، س ۱۴؛ (۱۹) Barbier de meynard : *Le Seid Himyarite*، در *Journ. As.*، سلسلہ ہائے ہفتم، ۴ (۱۸۷۴ء) : ۱۶۲ ببعد، ۲۴۰ ببعد؛ (۲۰) H. D. Van Gelder : *Mohtar de valsche Prfoeet*، (لائیڈن ۱۸۸۸ء)، ص ۸۲ ببعد؛ (۲۱) G. van Vloten : *Recherches sur la Domination arabe, le Chiitisme* وغیرہ (*Verhand. der Kon, Akad. v. Wetensch., Afd. Letterkunde*، ایمسٹرڈم ۱۸۹۴ء، ج ۱، عدد ۳)، ص ۴۱ ببعد؛ (۲۲) J. Wellhausen : *Die religiös-politischen Oppositionsparteien im alten Islam* (*Abhandl. d. Kön. Gesellsch. d. Wissensch. zu Göttingen*, Phil. Hist. Kl. n. F., *v. No. 2*)، ص ۷۴ ببعد؛ (۲۳) E. Blochet : *Le Messianisme dans l'hétérodoxie musulmane*، (پیرس ۱۹۰۳ء)، ص ۳۲ ببعد؛ (۲۴) Isr. Friedlaender : *The Heterodoxies of the Shiites according to Ibn Ḥazm* (*Journ. of the American Orient. Soc.*، ج ۲۸ و ۲۹ بمدد اشاریہ، بذیل Keisan؛ (۲۵) H. Banning : محمد بن الحنفیہ Diss Erlangen، (*Muḥammad ibn al-Ḥanafija*) ۱۹۰۹ء، ص ۴۶ تا ۵۳؛ (۲۶) F. Buhl : *Alidernes Stilling til de Shi'itiske Bevaegelser under Umajjaderne* (*oversight over det Kgl., Danske vidnskabernes Selskabs Forhandlinger*، ۱۹۱۰ء، عدد ۵)، ص ۳۶۴ ببعد؛ (۲۷) C. Van Arendonk : *De opkomst van het Zaidietische Imamaat in Yemen*، لائیڈن ۱۹۱۹ء، ص ۱۱ تا ۱۳۔

(C. VAN ARENDOHK)

کَیْقُبَاد : ایران کا ایک اساطیری بادشاہ جو خاندان "کیان" سے تھا۔ اَوستا میں اس کا نام کَوی کَوَاتہ (Kavi Kavata) دیا گیا ہے، لیکن اس کے سوا اس سے متعلق اور کسی چیز کا ذکر نہیں ہے۔ روایات میں سے اس کی بابت بس یہی واقعہ محفوظ ہے کہ وہ یزتس (Yazatas) کا بہت شکر گزار تھا کہ اس نے اس کی مملکت کو عظیم الشان بنایا اور ایران کے تخت حکومت پر دوبارہ اس کے صحیح النسب بادشاہوں کو لا بٹھایا۔ اس سلسلے میں فقط شاہنامۂ فردوسی ہی ایک ایسا مأخذ ہے جس سے مدد لی جا سکتی ہے۔ سر زمین ایران کو افراسیاب تورانی کے حملوں سے بچانے کے لیے رستم کے باپ زال پہلوان نے کامل غور و فکر اور موبذ کے صلاح مشورے کے بعد کیقباد کے حق میں فیصلہ کیا جو ان دنوں البرج البرز (Hare-berezaiti) کے پہاڑوں میں رہا کرتا تھا؛ چنانچہ زال نے اپنے بیٹے کو اس کی تلاش میں البرز بھیجا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ کیقباد اپنے ہنس مکھ دوستوں کے درمیان ایک ضیافت میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ تعظیم بجا لایا۔ نئے بادشاہ نے پہلے ہی خواب میں دیکھ لیا تھا کہ دو سفید بازوں نے اس کے سر پر ایک زریں دستار رکھ دی ہے۔ اس طرح گویا وہ سفارت کی آمد سے مطلع ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس نے انسانوں سے دور الگ تھلگ رہنے میں بڑی کوشش کی تھی، لیکن قسمت نے قاصد کو پھر بھی اس کے راستے پر ڈال دیا۔ ایرانی فوج کا سپہ سالار مقرر ہو جانے کے بعد رستم نے افراسیاب کو کامل شکست دی۔ افراسیاب یقیناً گرفتار ہو جاتا، لیکن اس کی کمر کی پیٹی جسے پکڑ کر اسے اٹھائے لا رہے تھے اتفاقاً ٹوٹ گئی اور وہ بھاگ نکلا۔ اس فتح کا یہ نتیجہ نکلا کہ دونوں ملکوں میں صلح ہو گئی اور اس کی رو سے ایران کو پھر اپنی پرانی سرحد دریاے جیحوں تک کی ساری سر زمین مل گئی۔ کیقباد نے اپنا عہد حکومت سلطنت کی تنظیم، اس کے طول و عرض کا دورہ کرنے، نئے شہر بسانے اور ان بہادروں پر اعزاز و اکرام نچھاور کرنے میں بسر کیا جنھوں نے

www.besturdubooks.wordpress.com

سلطنت کو دوبارہ قائم کیا تھا ۔ یہ بہادر رستم ۔ قارن وغیرہ تھے ۔ سو سال تک حکومت کرنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

مجمل التواریخ (*Journ. Asiat.*)، سلسلۂ سوم، جلد ۱۱ (۱۸۴۱ء، ص ۳۲۱) میں لکھا ہے کہ کیقباد البرز سے نہیں بلکہ ہمذان کے پہاڑ الوند سے آیا تھا اور حمزہ اصفہانی (طبع Gottwaldt، ص ۳۰) نے فقط اس کے شہروں کے بسانے کا ذکر کیا ہے بالخصوص جیحوں کے کنارے آبادیاں بسانے کا اور اصفہان کی توسیع کا ۔ بندھش Bundihish میں اس کے عہد حکومت کی معیاد سو سال کے بجائے پندرہ سال لکھی ہے۔

مآخذ: (۱) فردوسی: شاہنامہ، طبع Vullers، جلد ۱، ص ۲۹۰ تا ۳۱۵، طبع و ترجمۂ Mohl، جلد ۱، ص ۴۵۲ تا ۴۸۴؛ (۲) الثعالبی: غرر اخبار ملوک الفرس، طبع و ترجمۂ Zotenberg، ص ۱۳۷ تا ۱۴۰، ۱۴۳ تا ۱۵۴؛ (۳) الطبری، طبع لائیڈن، ۱: ۵۳۳ ببعد؛ (۴) Fr. Spiegel: *Erânische Alterthumuskunde*، ۱: ۵۸۱ ببعد؛ (۵) وہی مصنف: *Avestâ und Shâhnâme*، در *Zeitschr. d. Deutsch. Morgenl. Gesellsch.*، جلد ۴۵ (۱۸۹۱ء)، ص ۱۹۰؛ (۶) Dubeux: *La Perse* (پیرس ۱۸۴۱ء)، ص ۲۳۳؛ (۷) *Gundr. d. iran. Philol*، ۲: ۹۵، ۱۳۴، ۱۶۹، ۱۷۴، ۳۴۶، ۴۱۰؛ (۸) Nöldeke: *Das iran Nationalepos*، بار دوم، (برلن ۔ لائپزگ ۱۹۲۰ء) ص ۵۰، ۵۰، ۵۵۔

(CL. HUART)

کَیْقُبَاد: ایشیائے کوچک کے تین سلجوقی فرمانرواؤں کا نام:

کیقباد اول: علاء الدنیا والدین ابوالفتح کیقباد بن کیخسرو ۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے (بذیل مادۂ کیکاؤس اول) کہ کیقباد کو اس کے بھائی کے عہد حکومت میں کس نے اور کیوں قید کر لیا تھا ۔ ۶۱۶ھ / ۱۲۱۹ء میں اس کے بھائی کی وفات پر نہ صرف قلعہ گذر پرت Gudharpert کے دروازے کھلے جہاں وہ قید تھا، بلکہ اسے سلجوقوں کے تخت پر بھی بٹھا دیا گیا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سارے ترک امیر اس فیصلے کے حق میں نہیں تھے کیونکہ انھوں نے اس کے ایک اور بھائی کَیْفِرِیْدُون کی طرفداری کا اعلان کر دیا، لیکن کیقباد صدر مقام قونیہ پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں شورش پسند امرا کو بےدست و پا کر دیا ۔ غالباً عیسائیوں کی امدادی فوج نے اسے قابل قدر امداد دی کیونکہ ابن بیبی لکھتا ہے کہ اسیر کمنینس (Comnenus) نے ان واقعات میں بڑا حصہ لیا تھا ۔ Vincent de Beauvais کے ایک بیان سے (کتاب ۳۰، باب ۱۴۴) جس میں اگرچہ کیقباد کا نہیں اس کے جانشین کے عہد حکومت کا ذکر ہے، یہ پتا چلتا ہے کہ طرابزون Trebizond اور نیقیہ Nicaea کے شہنشاہوں اور شاہ Lampron نے ایک عہد نامے کی رو سے حلف اٹھا رکھا تھا کہ وہ اپنی کچھ فوج سلجوقیوں کی امداد کے لیے وقف کر دیں گے ۔ یہ یقینی ہے کہ کیخسرو اول اور کیکاؤس اول دونوں کے عہد حکومت میں اس عہد نامے کی شرائط پر عمل ہوتا رہا ہے اور اس کی تجدید میں شاید ایک ہی ترمیم ہوئی اور وہ بھی کیکاؤس اول کے عہد سے پہلے نہیں کہ اس میں مذکورۂ بالا عیسائی علاقوں کے آرمینی عیسائی بھی شامل ہو گئے ۔ کیقباد کے عہد میں اس کی تجدید ہوئی ۔ کیقباد کے ابتدائے عہد ہی میں ارمینیہ کے بادشاہ لیون Leon دوم کا انتقال ہو گیا (۱۲۱۹ء) اور اس کی بیٹی ایزابیلا (Isabella) نے انطاکیہ کے کیتھولک بادشاہ کے بیٹے سے شادی کر لی ۔ اس وجہ سے ارمنوں کے درمیان بڑا اختلاف رائے پیدا ہو گیا ۔ اس کا نتیجہ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

یہ نکلا کہ مخالف سرداروں نے قسطنطین شاہ لیمپرن (Lampron) کی زیر قیادت جمع ہو کر شہزادے کو گرفتار کر لیا اور اسے زہر دے دیا اور اس کی بیوہ کو قسطنطین کے بیٹے ہیثم (Haithum) سے بیاہ دیا۔ اب انطاکیہ کے بادشاہ سے لڑائی ناگزیر ہو گئی۔ سینٹ جان کے فدائیوں اور جانبازوں کو روم سے احکام پہنچ گئے کہ وہ اس میں قطعاً حصہ نہ لیں۔ اس لیے Bohemund ارمنوں کے خلاف کوئی زیادہ کاروائی نہ کر سکا اور بقول ابن الأثیر اس کی نوبت آ گئی کہ اسے کیقباد کے سامنے دست سوال دراز کرنا پڑا۔ بہر حال عیسائیوں کے باہمی نزاع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کیقباد نے بحیرۂ روم کے کنارے اور دوسرے علاقوں میں ارمینیہ کے قلعے فتح کر لیے جن میں Galonoros یا Candelor یا Scandalor کے قلعے شامل تھے۔ مؤخرالذکر قلعے کو اس نے اپنا سرمائی مقام قرار دیا اور وہاں عمارتیں تعمیر کر کے اسے ایک خاصی اہم بندرگاہ بنا دیا۔ اور اسی کے نام پر اس جگہ کا نام الایہ (عَلَائِیَّة) پڑ گیا۔ ان حالات کے اندر شاہ لیمپرن (Lampron) کے لیے بجائے خود اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ کیقباد کو فرمانروائے اعلیٰ تسلیم کر لے اور جنگ کی صورت میں اپنی فوجوں سے اس کی مدد کرے۔

آمد اور حصن کَیْفَة کے ارتقی فرمانروا مسعود نے جسے ۶۱۹ھ/۱۲۲۲ء میں اپنے باپ کے انتقام پر ان شہروں کی حکومت حاصل ہوئی تھی، خطبے سے کیقباد کا نام خارج کرنے اور اپنے ہمسایہ ایوبی بادشاہوں کے ساتھ عہد و پیمان کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی حرکت کی بدولت کاخته (Kiakhta) اور چمشکزک (Cemishkezek) کے قلعوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ الاشرف (دیکھیے جلد ۱، ص ۲۲۲ ب) نے اس کی مدد کے لیے جو فوجی دستے روانہ کیے انھیں محاصرہ کرنے والی فوج نے منتشر کر دیا لیکن کیقباد نے فوراً ہی ان کے سپہ سالار کو جو گرفتار کر لیا گیا تھا اعزاز و اکرام کے ساتھ سرفراز کر کے رہا کر دیا کیونکہ اس کی کامیابی بڑی حد تک ایوبیوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے پر منحصر تھی۔ فی الواقع اس نے یہاں تک کیا کہ ایک ایوبی شہزادی سے شادی کی درخواست کر دی اور اس کی درخواست قبول بھی کر لی گئی اور کچھ مدت بعد شادی ہو گئی۔ ۶۶۲ھ/۱۲۲۵ء میں ارزنجان کے بادشاہ بہرام شاہ نے ساٹھ سال حکومت کرنے کے بعد وفات پائی اور ارز روم کے سلجوقی بادشاہ طغرل شاہ کی وفات بھی اسی زمانے میں ہو گئی۔ کیقباد نے سوچا یہ اچھا موقع ہے کہ ان دونوں فرماں رواؤں کی زمینوں پر جہاں ممکن ہو قبضہ کر لیا جائے۔ بہرام شاہ کے جانشین داؤد شاہ نے جلال الدین خوارزم شاہ، حشیشین کے مقتدائے اعظم علاءالدین اور الاشرف سے عہد موافقت کر کے اس خطرے کو ٹالنے کی حتی القدور کوشش کی۔ لیکن وہ ناکام رہا۔ کیقباد نے اسے دبا کر اپنی مملکت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور ایسی ہی کامیابی اسے خاندان منگوچک کے ایک رکن مظفر الدین محمد کے مقابلے میں نصیب ہوئی جو کاغانیه (Coghonie) (شبین قره حصار) پر حکومت کرتا تھا۔ لیکن اس سے قبل کہ کیقباد ارز روم پر قبضہ کرے اسے جلال الدین کے ساتھ جو شاہ ارز روم کا حلیف تھا ایک پر صعوبت جنگ کرنی پڑتی تھی۔ اس سلسلے میں پہلے تو ان دونوں بادشاہوں کے درمیان کئی بار سفیر آئے گئے لیکن بالآخر کیقباد نے الاشرف سے اتحاد کر لیا جو اس وقت شہر خلاط (Khilat) پر قبضہ کرنے کے لیے جلال الدین سے لڑ رہا تھا۔ خوارزم شاہ (جلال الدین) اس کی اطلاع پاتے ہی بڑی تیزی سے آگے بڑھا تاکہ اس کے دونوں حریفوں کے لشکر باہم ملنے نہ پائیں۔ لیکن ۲۸

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

رمضان ۶۲۷ھ / ۱۰ اگست ۱۲۳۰ء (دیکھیے *Actes du 1oe Congrès internat. des Orientalistes*، ۳ : ۱۹) کو اسے ایک دہشت خیز شکست ہوئی اور اس سے اسی وقت ارزروم [رک بآں] کے بادشاہ کی قسمت کا بھی فیصلہ ہوگیا۔ اس کا علاقہ کیقباد نے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ ۶۲۹ھ/۱۲۳۲ء میں گرجستانیوں سے جنگ ایک صلحنامے کے ذریعے بسرعت ختم کر دی اور اسی کی رو سے ملکہ رُسُدان Russudan نے اپنی بیٹی کی کیقباد کے بیٹے کیخسرو سے شادی کر دینے پر رضا مندی کا اظہار بھی کر دیا۔ اس دوران میں تاتاری ایک بار پھر ان علاقوں میں آ چکے تھے۔ جلال الدین ختم ہو چکا تھا اور خوارزمیوں کے بڑے بڑے گروہ ادھر ادھر تاخت و تاراج کر کے اپنے ہاتھ رنگتے پھرتے تھے۔ اس وقت کیقباد نے خِلاط کے ضلع پر، جو جلال الدین کی شکست کے بعد الاشرف کو مل چکا تھا، لیکن اس نے اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا، قبضہ کرنے اور خوارزمی لٹیروں کے جتھوں کو تنخواہ دار سپاہیوں کی حیثیت سے ملازم رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصر کے فرمانروا الکامل کے زیر قیادت تمام ایوبی شاہزادے کیقباد کے خلاف متحد ہو گئے۔ بہت جلد ان کی فوجیں ایشیاے کوچک کی سرحد پر جا پہنچیں، لیکن وہ ملک کے اندر داخل ہونے کے لیے دَرّوں کو فتح کرنے میں ناکام رہیں۔ علاوہ بریں تھوڑی ہی مدت میں ایوبی سرداروں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ بالآخر انھیں اسی بات پر قناعت کرنی پڑی کہ ترکوں کی پیش قدمی سے شہر خرتبرت Khartbart کو بچائیں، لیکن ترکوں کو بڑھنے سے روکنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ حما کا ایوبی فرمانروا المظفر جس پر مدافعت کا انتظام آ پڑا تھا، پکڑا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہاں ارتقی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد ۶۳۱ھ/۱۲۳۴ء سے یہ شہر سلجوقیوں کے قبضے میں آ گیا۔ اب کیقباد نے حرّان، الرُّہا اور رَقّہ کا محاصرہ کرکے انھیں فتح کر لیا (۶۳۲ھ / ۱۲۳۵ء)، لیکن وہ پھر تھوڑے ہی دنوں میں ایوبیوں کے قبضے میں چلے گئے۔ اسی طرح آمِد کا محاصرہ بھی ناکام رہا۔ ۶۳۴ھ / ۱۲۳۷ء میں جب کیقباد ایک نئی مہم شروع کرنے والا تھا اسے قیسریہ میں زہر دے دیا گیا۔ کہا گیا ہے کہ یہ اس کے بیٹے کیخسرو کے حکم سے ہوا کیونکہ کیقباد نے اس کے بجاے اپنے ایک اور بیٹے کو جو ایوبی شہزادی کے بطن سے تھا اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔

کیقباد کے پر شوکت عہد حکومت میں مملکت سلجوق نے انتہائی وسعت اور خوشحالی حاصل کی کیونکہ کیقباد محض ان تھک حوصلے والا مرد میدان ہی نہیں تھا بلکہ اس نے عالیشان عمارتوں کی تعمیر کا کام بھی ہاتھ میں لیا جن کے آثار آج بھی قونیہ، سیواس، علائیہ اور دوسرے مقامات میں سلطان کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اس نے تجارت کے لیے اپنے ملک کے دروازے کھولنے اور وہاں کے قدرتی وسائل کو ترقی دینے میں انہماک سے کام کیا۔ اس مقصد کے پیش نظر وہ اطالویوں کی درخواست پر ایک مہم لے کر کریمیا بھی گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں اس کی سلطنت دنیا کی امیر ترین سلطنت سمجھی جاتی تھی۔

مآخذ: (۱) اوپر دیکھیے مادّۂ کیکاؤس کے نیچے؛ (۲) نیز دیکھیے۔ جلال الدین سے جنگ کے بارے میں النسوی: سیرۃ السلطان جلال الدین منکبرتی (طبع *de l'Ecole des Langues Or. Viv*، سلسلۂ سوم، جلد ۹، ۱۰) عربی متن و فرانسیسی ترجمہ از Hondas؛ (۳) بنو منگو چک کے بارے میں: V. Berehem: *Matériaux pour un Corpus Inscript. Arab.*، ۳ : ۵۵ ببعد؛ (۴) Houtsma در *Keleti Szemle*، ۱۹۰۳ء، ص ۷۷ ببعد۔

(ق لائیڈن بار اول)

www.besturdubooks.wordpress.com

کیقباد دوم : علاءالدین بن کیخسرو، جیسا کہ مادّۂ کیکاؤس دوم کے ذیل میں مختصراً بیان کیا جا چکا ہے، اس نے اپنے دو بھائی کیکاؤس اور قلیج ارسلان کے ساتھ مل کر حکومت کی۔ یہاں ہمیں فقط ایک سکّے کی طرف توجہ دلانی ہے جس کو غالب ادھم نے تقویم مسکوکات سلجوقیہ، شمارہ ۱۱۳، میں بیان کیا ہے اس پر سال ۶۶۳ھ اور فقط کیقباد کا نام درج ہے حالانکہ کیقباد اس سے آٹھ سال قبل وفات پا چکا تھا۔

کیقباد سوم : علاءالدین کیقباد بن فرامرز بن کیکاؤس کو غازان خان نے ۶۹۷ھ/۱۲۹۸ء میں تخت نشین کیا۔ اس کی تاریخ کے بارے میں جو معلوم ہے وہ وثوق کے لحاظ سے نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کا نام ۷۰۱ھ تک کے ایک سکّے پر موجود ہے جس سے منجّم باشی کا یہ بیان غلط معلوم ہوتا ہے کہ ۷۰۰ھ میں اسے دوبارہ معزول کر دیا گیا تھا، دیکھیے V. Berchem : *Materiaux*، ۳ : ۹۲ حاشیہ، لیکن چونکہ مسعود کا ایک سکّہ بھی ۷۰۰ھ کا ہے اس لیے قرین قیاس ہے کہ اس سال ان دونوں شہزادوں نے سلطان کا لقب اختیار کر رکھا تھا، لیکن دوسری طرف یہ بات یقیناً غلط ہے کہ کیقباد ۶۸۳ھ میں بھی سلطان تھا۔ یہ بات اس سند سے ماخوذ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کیقباد نے عثمان غازی کو عطا کی تھی (فریدون بیگ : منشآت، ۱ : ۴۸ تا ۵۰)۔ اسی طرح وہ اندازہ بھی غلط ہے جو جنابی میں درج ہے اور جس کی رو سے کیقباد کا عہد حکومت ۲۰ سال ۳ ماہ ۱۳ دن بتایا جاتا ہے۔

(ا۔ ا۔ لائیڈن، بار اوّل)

کیقباد معزّالدین، شاہ دہلی، ناصر الدّین بغرا حاکم بنگالہ کا بیٹا تھا۔ بغرا غیاث الدّین بلبن شہنشاہ دہلی کا دوسرا بیٹا تھا۔ اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمّد خان کی وفات پر جو مغولوں کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، بلبن نے اپنے دوسرے بیٹے بغرا خان کو جو ان دنوں بنگالے کا صوبیدار تھا اپنا جانشین نامزد کیا، لیکن وہ اپنے باپ کے دربار کی پابندیاں برداشت نہ کر سکا؛ چنانچہ جب ۱۲۸۷ء میں تخت خالی ہوا تو وہ بنگال گیا ہوا تھا۔ امرا نے اس کے بیٹے کیقباد کو بادشاہ بنا دیا۔ کیقباد تخت نشینی کے وقت بمشکل اٹھارہ سال کا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت میں اس کے دادا نے بڑی سختی سے کام لیا تھا: چنانچہ پابندیوں سے اچانک آزاد ہوتے ہی اس نے بے لگام ہو کر عیاشانہ زندگی اختیار کی۔ اس نے اپنے چچا زاد بھائی محمّد کے بیٹے کیخسرو کو قتل کرا دیا۔ وزیر خطیر الدین کا منصب چھین لیا۔ اس کی برطرفی کے بعد دہلی کے کوتوال کا بھتیجا اور داماد نظام الدین مملکت کا سب سے بڑا صاحب اقتدار بن گیا۔ کیقباد کے ابتدائے عہد میں مغولوں کے ایک جتھے کو جو ہندوستان میں گھس آیا تھا شکست دی گئی۔ ان میں سے جو گرفتار ہوئے ان سے بڑا ظالمانہ سلوک کیا گیا اور کثیر التّعداد مغولوں کو جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور ہندوستان میں بس گئے تھے قتل کر دیا گیا۔

۱۲۸۸ء میں بادشاہ کا باپ بغرا خان بنگال سے روانہ ہوا تاکہ تخت دہلی پر اپنا فائقانہ حق جتائے، لیکن جب دریائے گھاگرا کے کنارے کیقباد اسے ملنے آیا تو اس نے اپنا طرز عمل بدل دیا۔ ملاقات جانبین سے شفقت اور محبت بھری تھی اور باپ نے از روے نصیحت ذاتی طور پر اپنے بیٹے کو اس کی غلط روی پر تنبیہ کی اور نظام الدین کی ہوس پرستی سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیا، اگرچہ ان نصیحتوں سے نوجوان بادشاہ کی بری عادتوں کی کوئی اصلاح نہیں ہوئی۔ تاہم ان کا یہ اثر ہوا کہ اس نے اپنے وزیر کو زہر دے کر اپنے راستے سے ہٹا دیا۔

www.besturdubooks.wordpress.com

۱۲۸۸ء کے اواخر میں کیقباد پر اس کی عیاشی کی بدولت فالج گرا اور وہ صاحب فراش ہوگیا ادھرملک میں انتشار، ابتری اوز پراگندگی پھیل گئی ۔ ملک جلال الدین فیروز خلجی نے جو انہیں دنوں برن کا عامل مقرر کیا گیا تھا دارالسلطنت میں امن و امان قائم کرنے کی کوشش کی ۔ ترک امرا نے اسے شک و شبہہ کی نظر سے دیکھا ۔ حالات بھی شبہات کے مساعد تھے اور کیقباد کے کمسن بچے شمس الدین کیومرث کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا ۔ ان دونوں جماعتوں میں نزاع و جدال جاری رہا اور بادشاہ نزار و درماندہ بستر علالت پر پڑا رہا ۔ بالآخر فیروز خلجی کو اپنے مخالفوں پر غلبہ حاصل ہوا اور وہ تخت پر متمکن ہوا ۔ بدبخت کیقباد کو جون ۱۲۹۰ء میں قتل کر دیا گیا اور اس کی لاش دریاے جمنا میں پھینک دی گئی۔

مآخذ : (۱) برنی : تاریخ فیروز شاهی؛ (۲) بدایونی : منتخب التواریخ، ترجمہ، G.S.A. Ranking؛ (۳) نظام الدین احمد : طبقات اکبری؛ (۴) فرشتہ : گلشن ابراهیمی (بمبئی ۱۸۳۲ء)؛ (۵) *The Cambridge History of India*، ج ۳۔

(T. W. Haig)

کیکاؤس : ایران کا ایک افسانوی بادشاہ جو کیانی خاندان سے تعلق رکھتا تھا ۔ اوستا میں اسے ''کوا اُچا'' Kava uça کہا گیا ہے ۔ فردوسی اسے کیقباد کا فرزند مانتا ہے، دوسرے مآخذ اسے کیقباد کا پوتا بتاتے ہیں ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک جنگجو بادشاہ تھا جو فوج لے کر مازندران میں گھس گیا ۔ مازندران دیووں کا ملک تھا جس کا محافظ دیو سفید تھا ۔ اس نے رات کے وقت کیکاؤس اور اس کی فوج پر آسمان سے پتھر برسائے [اور کیکاؤس کو قید کر لیا] ۔ بادشاہ کو قید سے چھڑانے کے لیے زال کا بیٹا رستم روانہ ہوا ۔ اسے راستے میں سات معرکے [ہفتخوان] سر کرنا پڑے جنھیں نظم فارسی میں بہت شہرت حاصل ہو چکی ہے (دیکھیے مادّۂ رستم) ۔ دیو سفید کا سوتے میں کام تمام کر دیا گیا اور اس کے دل کے خون سے بادشاہ اور اس کی فوج کی بینائی بحال ہو گئی ۔ اس بادشاہ کو ایک اور لڑائی لڑنے کے لیے هاماوران جانا پڑا جو ایران کے جنوب میں واقع ہے اور ممکن ہے کہ وہ یمن (حمیر) ہو کیونکہ یہاں پہنچنے کے لیے بادشاہ مکران سے براہ سمندر جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہوا تھا ۔ اپنی منچلی طبیعت کی بدولت وہ کوہ قاف [رک بآں] تک جا پہنچا جس کے متعلق یہ اعتقاد تھا کہ اس پہاڑ نے ساری دنیا کا احاطہ کر رکھا ہے ۔ اس نے شاہ هاماوران کی دختر سودابہ (الثعالبی سودانہ، عربی سعدی بنت ذوالاذعار) سے شادی کی ۔ ایک بار جب وہ اپنے خسر سے ملنے گیا ہوا تھا تو اسے غدّاری سے گرفتار کر کے سمندر کے کنارے ایک قلعے میں قید کر دیا گیا ۔ یہاں بھی اسے رہائی دلانے کے لیے رستم ہی پہنچا۔

چونکہ کیکاؤس دیووں پر فرمانروا تھا، اس لیے اس نے ان کی قوت سے یہ فائدہ اٹھایا کہ البرج میں قلعے تعمیر کرائے (الثعالبی، ص ۱۶۵، مینار بابل؛ نیز حمزة الاصفهانی، طبع Gottwaldt، ص ۳۵ مجمل التواریخ، *Journ. Asiat.* سلسلۂ سوم، ۱۱ (۱۸۴۱ء) : ۳۲۵) ۔ اس جبری محنت کا انتقام لینے کے لیے ان دیووں میں سے کسی نے بادشاہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ آسمان پر چڑھنا ممکن ہے، چنانچہ اس مقصد کے لیے بادشاہ نے جوان عقاب سدھائے اور چار عقابوں کو اپنے تخت کے چار کونوں پر باندھ کر ستاروں کی جانب پرواز شروع کی، جب عقاب تھکنے لگے تو وہ پھر نیچے اتر آئے اور آمُل [رک بآں] کے قرب و جوار میں ایک جنگل کے بیچوں بیچ بادشاہ کو زمین پر پھینک دیا ۔ یہاں سے امرا نے جو اس کی تلاش میں سرگرداں تھے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

اسے ڈھونڈ نکالا ۔ کیکاؤس کے ایک بیٹے سیاوَخش (سیاوش، چیاور شانہ) پر اس کی سوتیلی ماں سودابہ نے، جس کی ناجائز خواہشوں کو اس نے ٹھکرا دیا تھا، یہ الزام لگایا کہ اس نے اس کی عصمت پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے ۔ سیاوَخش نے آگ کی آزمائش سے گزر کر اپنی بے گناہی ثابت کی اور وہ ایک تنگ جگہ سے لکڑیوں کے دو شعلہ زن انباروں کے درمیان صحیح سالم گزر گیا ۔ اس کے بعد نوجوان شہزادے نے تورانیوں سے لڑنے کی اجازت چاہی اور بلخ [رک بآں] کے قریب ان سے مقابلہ کیا ۔ سیاوخش کی موت کی اطلاع پاکر جو اب افراسیاب [رک بآں] کا داماد بن چکا تھا اور سودابہ کی سازشوں کا شکار ہو چکا تھا، رستم نے ایران پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ اس دلیر پہلوان نے بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے ملکہ کو موت کے گھاٹ اتارا اور پھر اپنے ملک کا انتقام لینے کے لیے توران پر چڑھ دوڑا ۔

کیکاؤس نے ایک سو پچاس سال حکومت کی اور عمر کا آخر سال اس نے عزلت میں گزارا اور اپنا تخت اپنے پوتے سیاوخش کے بیٹے کیخسرو [رک بآں] کے حوالے کر دیا ۔

مآخذ : (۱) فردوسی : شاھنامہ، طبع Vullers، ۱ : ۳۱۵، ۲ : ۶۳۷؛ طبع و ترجمۂ Mohl، ۱ : ۴۸۶ ببعد، ۲ : ۱ تا ۵۵۷؛ (۲) الطّبری : تاریخ، ۱ : ۵۹۷ ببعد؛ (۳) الثّعالبی : غُرَر و اخبار ملوک الفرس، طبع و ترجمۂ Zotenberg، ص ۱۵۳ تا ۲۳۴؛ (۴) Fr. Spiegel : *Erânische Alterthumskunde*، ۱ : ۵۸۴ ببعد؛ (۵) وہی مصنف : *Awestâ und Shâhnâme* در *Zeitschr. d. Deutsch. Morg. Gesellsch.*، ۴۵ (۱۸۹۱ء) : ۱۹۵؛ (۶) Dubeux : *La Perse* (پیرس ۱۸۴۱ء)، ص ۲۳۳ ببعد؛ (۷) J. Darmesteter : *Etudes iraniennes* (پیرس ۱۸۸۳ء)، ۲ : ۲۱۱ ببعد؛ (۸) *Gründr. d. iran. Philologie*، ج ۲، اشاریہ رک بذیل Kavi؛ (۹) Th. Nöldeke : *Das iranische Nationalepos*، بار دوم (برلن ۔ لائپزگ ۱۹۲۰ء)، ص ۱، ۴۸، ۵۲، ۵۵، ۶۰ ۔

(CL. HUART)

کیکاؤس : ایشائے کوچک کے دو سلجوق فرمانرواؤں کا نام :

کیکاؤس اول : السلطان الغالب عزّ الدّنیا و الدّین کیکاؤس بن کیخسرو، برھان امیر المؤمنین، نے ۶۰۶ھ تا ۶۱۶ھ / ۱۲۱۰ء تا ۱۲۱۹ء حکومت کی ۔ اس نے Theodore Lascaris سے صلح کر لی (دیکھیے کیخسرو اول)، کیونکہ اسے اپنے چچا طُغرل شاہ والی ارزروم اور اپنے بھائی کیقباد کی دستبرد سے جو اس کے مقابلے میں خود تخت کے دعویدار تھے، اپنے حقوق کی حفاظت مقصود تھی ۔ ارمنوں کو جو Lifun (Leon) کے زیر قیادت تھے اور جنھوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ھرقلیہ Heraclea اور لارندہ Larenda پر قبضہ کر لیا تھا اور قیصریہ کو لوٹ لیا تھا، ایک معقول رقم دے کر عارضی طور پر پیچھے ہٹ جانے پر آمادہ کر لیا ۔ کچھ عرصے بعد طُغرل شاہ بھی ارزروم میں جا بیٹھا لیکن کیقباد جو قلعۂ انقرہ (Anguria) پر قابض ہو چکا تھا مدت دراز تک ڈٹا رہا اور اس نے کئی سال محصور رہنے کے بعد بمجبوری ہتیار ڈالے ۔ اس پر اسے عارضی طور پر قلعہ مِنْشَر (آج کل مزرہ Mizere، سلطنیہ کے جنوب مشرق میں دیکھیے Defremery : *Hist. des Croisades, Documents Arméniens*، ۱۴۳، حاشیہ ۳) میں قید کر دیا گیا ۔ کیکاؤس ایک کامیاب یورش کی بدولت طربزون (Trebizond) کے بادشاہ کیرالکس Klr Aleks کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اسے اپنی رہائی حاصل کرنے کے لیے سینوپ Sinope کی اہم بندرگاہ اس کے حوالے کرنے اور سالانہ خراج کی

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

ادائی منظور کرنا پڑی (۶۶۱ھ/۱۲۱۴ء) - شہر انطالیہ جسے کچھ ہی عرصے پہلے کیخسرو نے لے لیا تھا اور مسیحی سرداروں کی مدد سے قلعے کی محافظ ترک فوج وہاں سے نکال دی تھی، دوبارہ نئے سرے سے فتح کر لیا گیا - ۶۱۳ھ/ ۱۲۱۶ء میں کیخسرو نے ارمنوں کے ملک پر چڑھائی کر دی اور قلعہ جبان Gaban کا محاصرہ کر لیا (ابن بی بی نے اس کی جگہ چن چین Činčin اور گان چین Gānčin دو قلعوں کا ذکر کیا ہے) محاصرہ اٹھانے کے لیے جو فوج بھیجی گئی، اس میں کانسٹیبل کنسٹنٹائن Constable Constantantine اور کئی رؤسائے مملکت شامل تھے - ترکوں نے اس فوج کو شکست فاش دی اور کانسٹیبل مع چند رؤسا اور سرداروں کے گرفتار کر لیا گیا - اس کے بعد کیکاؤس ملک کو تاخت و تاراج اور بالکل ویران کرنے کے بعد قلعے پر قبضہ کیے بغیر قیصریہ واپس چلا گیا - اب ارمنوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ صلح کے لیے اور قیدیوں کی رہائی کے لیے منت سماجت کریں - ان کی یہ دونوں درخواستیں قبول کرلی گئیں، لیکن ان کے بادشاہ کو یہ عہد کرنا پڑا کہ وہ خراج ادا کرے گا اور لولوہ Lu'lu'a اور لوزد Lawzad کے اہم سرحدی قلعے، جہاں سے کیلیکیا Cilicia کے درّوں کی نگرانی ہو سکتی تھی، حوالے کر دے گا - جب ۶۱۳ھ/ ۱۲۱۶ء میں کیکاؤس کا حلیف حلب کا ایوبی بادشاہ الملک الظاہر فوت ہو گیا تو کیکاؤس نے سمیساط کے ایوبی فرمانروا الملک الافضل سے یہ طے کر لیا کہ وہ اسے اپنا فرمانروائے اعلیٰ تسلیم کرتے ہوئے حلب پر قبضہ کر لے - شروع شروع میں یہ تجویز کامیاب ہوتی نظر آئی - ترک فوجوں نے بلا دقت مرزبان (کمال الدین، ترجمہ Blochet، ص ۱۵۸، بُرج البرّصاص کا ذکر کرتا ہے، علی ہذا یاقوت، طبع Wüstenfeld، ۲ : ۶۰۴؛ یاقوت تلّ خالد کا اضافہ کرتا ہے)، رعبان، تلّ باشر اور منبج پر قبضہ کر لیا، لیکن کیکاؤس نے ان شہروں کو الافضل کے حوالے کرنے کے بجائے، جو از روئے معاہدہ لازم تھا، وہاں ترک فوجی حاکم مقرر کر دیے - اس طرح دونوں حلیفوں میں پھوٹ پڑ گئی - اہل حلب نے موقع پا کر الملک الاشرف (رک بآں) سے مدد مانگی، جس کی فوجوں نے تلّ قبّاسین (یاقوت، : ۸۶۹) پر ترکوں کے ہراول دستے کو شکست دی - اس کے بعد کیکاؤس ہٹ کر ابلستین چلا گیا اور الاشرف نے ترک دستوں کو ان قلعوں سے نکال دیا جن پر وہ قابض ہو گئے تھے - کیکاؤس نے اس شکست پر، جسے وہ خود اپنے امیروں کی غداری کا نتیجہ سمجھتا تھا، غضب ناک ہو کر ان میں سے کئی ایک کو پھانسی پر لٹکا دیا اور باقی ماندہ کو ایک عمارت میں بند کر دیا، جسے یاقوت ربض طرطوش کے نام سے یاد کرتا ہے - اس کے بعد اس عمارت کو آگ لگا دی گئی اور وہ سب کے سب جل کر مر گئے - کچھ عرصے بعد اسے تپ دق کا مرض لاحق ہو گیا اور ۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء میں وہ فوت ہو گیا - اسے ایک شفا خانے میں دفن کیا گیا جو اسی نے سیواس میں تعمیر کیا تھا - اس کا کتبۂ مزار، جو ۶۱۷ھ میں کندہ کیا گیا تھا، آج بھی محفوظ ہے؛ دیکھیے *Matériaux pour un Corpus Inscriptionum Arabicarum*، حصہ ۳، ص ۵ ببعد۔

مآخذ : (۱) سب سے بڑا مآخذ ابن بی بی ہے؛ اس کی تاریخی تصنیف کے اقتباس کے لیے دیکھیے *Recueil de Textes relatifs à l'Histoire des Seldjoucides*، ج ۴ (ترکی ترجمہ، در کتاب مذکور، ج ۳)؛ اس کے علاوہ اہم کتابیں یہ ہیں : (۲) Barhebraeus [ابن العبری] : *Chronicon Syriacum*؛ (۳) کمال الدین

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

زبدۃ الحلب وغیرہ (فرانسیسی ترجمہ از E. Blochet : *Histoire d'Alep*، پیرس ۱۹۰۰ء)؛ (۴) *Historiens des Croisades, Documents Arméniens*، ج ۱ (پیرس ۱۸۶۹ء)؛ (۵) عام تواریخ مصنفۂ ابن الاثیر، ابن الخلدون، النُّوَیری، خواند میر، منجّم باشی، اور دوسری تصنیفات جو ابھی مخطوطات کی شکل میں ہیں؛ سکّوں کی فہرستیں: (۶) *British Museum Cat. of Oriental Conis*، ج ۳ (۱۸۷۷ء)؛ (۷) غالب ادھم : *Numismatique Seldjoucides* (قسطنطنیہ، ۱۸۹۲ء)؛ (۸) احمد توحید : *Cat. des Monnaies du Musée Impérial Ottoman*، حصہ ۴ (قسطنطنیہ ۱۹۰۳ء)؛ (۹) Huart : *Epigraphie arabe d'Asie Mineure*، در *Revue Sémit*، ج ۲ و ۳؛ (۱۰) J. H. Löytved : *Konia, Inschriften der Seldschukischen Bauten*، برلن ۱۹۰۷ء؛ (۱۱) خلیل ادھم : قیصریۃ شہر مبانی اسلامیہ و کتابہ لری (استانبول ۱۳۳۴ھ)؛ دیکھیے نیز (۱۲) Fallmarayer : *Gesch. des Kaisertums von Trapezunt*، میونخ ۱۸۲۷ء؛ (۱۳) F. Sarre : *Reise in Kleinasian*، برلن ۱۸۹۶ء؛ (۱۴) وہی مصنّف : *Konia, Seldschukische Baudenkmäler* (برلن ۱۹۲۱ء)؛ نیز رکن بہ سلجوق (بآخذ).

۲۔ کیکاؤس دوم، عزّالدّنیا و الدّین بن کیخسرو دوم: جب ۶۴۳ھ / ۱۲۴۵ء میں کیخسرو دوم (رکن بآں) نے وفات پائی تو اس کی وصیت کے مطابق اس کے بیٹے علاءالدّین کیقباد کو سلطان بننا چاہیے تھا، جس کی ماں گرجستان کی شہزادی تمر تھی، لیکن اس کی عمر صرف سات سال تھی۔ اس کے دو بڑے بھائی اور بھی تھے، یعنی عزّالدّین اور رکن الدّین قلج ارسلان، مگر وہ بھی ابھی بچے تھے۔ عزّالدّین سب میں بڑا تھا اور اس کی ماں ایک یونانی پادری کی بیٹی تھی (Frater Simon، در *Vincent de Beauvais*، کتاب ۳۱، باب ۲۶، لیکن اس نے عزّالدّین اور رکن الدّین کو باہم ملتبس کر دیا ہے)۔ متوفی سلطان کے وزیر شمس الدّین اصفہانی نے، جس کے ہاتھ میں سارا اقتدار تھا، عزّالدّین کی طرف داری کا اعلان تو کر دیا، لیکن باقی دونوں بھائیوں کو نظر انداز کرنے کی فی الحال اسے جرأت نہ ہوئی کیونکہ آخری فیصلہ مغل خوانین کے ہاتھ میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب رکن الدّین متعدد ترک امرا کے ہمراہ خان اعظم کے اردو کی جانب اس عظیم قورولتای (مجلس شوریٰ) (۱۲۴۶ء) میں شریک ہونے کے لیے، جہاں کیوک کے خان اعظم ہونے کا اعلان کیا گیا، روانہ ہوا تو کیکاؤس اسے روک نہ سکا، لیکن اس دوران میں وزیر (جسے Frater Simon نے Losyr لکھا ہے) اس فکر میں لگا رہا کہ ساری طاقت اپنے ہاتھ میں لے لے؛ چنانچہ اس نے عزّالدّین کی والدہ سے شادی کر لی، جس سے ترک امرا بہت جھنجلائے اور اپنے مقصد کے اتمام کے لیے کئی امیروں کو لقمۂ اجل بنا دیا، جن میں Vincent کے بیان کے مطابق ایک امیر Salefadinus یعنی شرف الدّین محمود والی ارزنجان بھی شامل تھا۔ یہ شخص عیسائیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا اور فرانسیسی اور جرمن زبانیں سمجھتا تھا (وہی کتاب، باب ۲۷)۔ بہرحال اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وزیر سے بیزار امرا نے کیوک کے سامنے اس کے خلاف شکایت پیش کی اور اس نے انھیں ایک یرلیق [فرمان] عطا کیا، جس کی رو سے رکن الدّین کو سلطان مقرر کر دیا گیا۔ مزید برآں خان نے یہ بھی حکم دیا کہ وزیر کو مقتول کے اقارب کے حوالے کر دیا جائے۔ اس نے صلح کی قطعی شرائط بھی عائد کر دیں۔ سلجوقیوں کے لیے طے ہوا کہ وہ ہر سال بطور خراج ۱۲۰۰۰۰ بیزنت bezants، ۵۰۰ ریشمی زربفت کی قبائیں hyperpres، ۵۰۰

www.besturdubooks.wordpress.com

گھوڑے، ۵۰۰ اونٹ اور ۵۰۰ دوسرے چھوٹے جانور بطور خراج ادا کریں گے اور ان سب کے علاوہ دیگر ایسے تحفے تحائف بھی نذر کریں گے جن سے خراج کی کل مالیت دوگنی ہو جاتی تھی - یہ Vincent کی بیان کردہ کہانی ہے (باب ۲۸) - اس سلسلے میں دیکھیے Barthold، در *Zapiski Wost. Otd. Imp. Arkh.*، ۲۸ : ۱۲۸؛ d'Ohsson، *Hist. des Mongols*، ۳ : ۸۳.

رکن الدین جب ایشیاے کوچک واپس پہنچا تو اسے سلطان تسلیم کر لیا گیا - خان اعظم کے احکام کے مطابق وزیر کو اس کے دشمنوں کے سپرد کر دیا گیا، جنھوں نے ۶۴۶ھ/۱۲۴۹ء میں اسے قتل کر دیا - ہمیں ۶۴۶ھ/۱۲۴۹ء کے ایسے سکے ملتے ہیں جن پر رکن الدین کا نام ہے - خان اعظم فوت ہوا تو اس کا جانشین سنگو قاآن کہیں ۱۲۵۱ء میں پوری طرح اقتدار سنبھال سکا - اسی لیے ترک امیروں نے یرلیق [فرمان] کی پروا نہ کی اور آپس میں یہ طے کر لیا کہ کیخسرو کے تینوں بیٹے مل کر حکومت کریں؛ چنانچہ ۶۴۷ سے ۶۵۵ھ تک کے سکوں پر تینوں کے نام ملتے ہیں، فقط ۶۵۲ھ/۱۲۵۴ء اس سے مستثنیٰ ہے - اس سال رکن الدین نے قیصریہ میں صرف اپنے نام کے سکے ضرب کرائے کیونکہ اس شہر کے صوباشی [کوتوال] صمصام الدین نے بلاشرکت غیرے اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا - رکن الدین کے سلطان ہونے کے بعد رکن الدین اور عزالدین کے درمیان بہت عرصے تک گفت و شنید جاری رہی، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا - آخر ان کے درمیان بزور شمشیر فیصلہ ہوا - رکن الدین گرفتار کر لیا گیا اور اسے پہلے اماسیہ اور بعد ازاں برغلو بھیج دیا گیا - اسی دوران میں سنگوقاآن نے حکم بھیجا کہ عزالدین اس کی خدمت میں حاضر ہو، لیکن عزالدین کا جی نہ چاہا کہ یہ خطرناک سفر اختیار کرے - بنابریں اس نے اپنے بھائی علاءالدین کیقباد کو بیش قیمت تحائف دے کر روانہ کیا، لیکن یہ شہزادہ راستے ہی میں مارا گیا - خان اعظم نے یہ پتا چلانے کے لیے کہ اس قتل میں کس کا ہاتھ تھا، تفتیش کرائی، لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا - ۶۵۴ھ میں آق سرای کے مقام پر عزالدین اور مغل سپہ سالار (نویان) بیجو کی فوجوں کے مابین مقابلہ ہوا، جس میں عزالدین کو شکست ہوئی اور اسے مجبوراً Theodore Lascaris کے پاس پناہ لینی پڑی - اس کے بعد رکن الدین کو محبس سے نکال کر سلطان تسلیم کیا گیا (دیکھیے ۶۵۵ھ کے سکّے) - بیجو ابھی اپنی مغل فوج کو پوری طرح ہٹانے بھی نہ پایا تھا کہ عزالدین قونیہ میں لوٹ آیا - ان دنوں رکن‌الدین قیصریہ میں تھا - طویل گفت و شنید اور اس دوران میں دونوں بھائیوں کی فوجوں کے درمیان گاہ بگاہ جھڑپوں کے بعد یہ طے پایا کہ ملک کو باہم تقسیم کر دیا جائے: قزل ایرماق سے مشرق میں رکن‌الدّین حکومت کرے اور مغرب میں عزالدین اور اس کے بعد دونوں بھائی عہد نامے کی توثیق کے لیے ہلاکو کے پاس جائیں، جو ان دنوں تبریز کے گرد و نواح میں فروکش تھا - یہ تمام باتیں عمل میں آ گئیں، لیکن اس کے بعد جلد ہی مغلوں کو پتا چلا کہ عزّالدّین ان کے جانی دشمنوں، یعنی مصر کے مملوکوں کے ساتھ گفت و شنید کر رہا ہے اور انھوں نے اس کی حکومت کو ختم کر دیا ہے، لیکن عزالدین کو بھاگنے کا موقع مل گیا، چنانچہ اس نے انطالیہ کا رخ کیا اور وہاں سے اپنے رشتے داروں اور چند وفادار امیروں کے ساتھ سمندر کے راستے قسطنطنیہ جا پہنچا، جو لاطینی سلطنت کے زوال کے بعد ایک بار پھر یونانیوں کے ہاتھ لگ

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

گیا تھا ۔ اسے یقین تھا کہ وہاں اس کا خیر مقدم کیا جائے گا کیونکہ اس کی ماں عیسائی تھی، لیکن بہت جلد ان ترکوں کی موجودگی شہنشاہ کے لیے پریشان کن ثابت ہوئی ۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ سازش شروع کی کہ شاہ قسطنطنیہ کو قتل کر کے عزّالدّین کو شہنشاہ بنایا جائے ۔ جب سلطان کے عیسائی ماموں نے اس سازش کا بھانڈا پھوڑا تو یونانیوں نے سلطان کو فوراً جلا وطن کر کے اینوس بھیج دیا اور اس کے ملازمین کو یا تو بطور ترک سپاہیوں (Turkopols) کے شاہی افواج میں بھرتی کر لیا گیا، یا قید کر کے قتل کر دیا گیا (۶۶۲ھ/۱۲۶۴ء) ۔ چھے سال بعد (۶۶۸ھ/ ۱۲۶۸ - ۱۲۶۹ء) عزّالدّین کو منگوتمر کی فوجوں نے، جو اس نے قسطنطنیہ کے خلاف بھیجی تھیں، اینوس سے رہا کر کے قریم (کریمیا) پہنچا دیا ۔ یہاں اس نے برکہ خان کی ایک بیٹی سے شادی کی اور ۶۷۸ھ/ ۱۲۷۹ - ۱۲۸۰ء) میں فوت ہو گیا ۔ اس کے بیٹے مسعود کے بارے میں علٰحدہ مقالہ دیکھیے ۔

مآخذ: (۱) دیکھیے گزشتہ مادّے کے مآخذ ۔ یہاں خاص طور پر اہم یہ ہیں: (۱) Vincentuis Bellovacensis: *Speculum historiale*، کتب ۳۰ و ۳۱، باب ۲۶، ۲۷؛ (۲) نیز مغل اور بوزنطی مؤرخین (Nicephorus Gregoras اور Georgius Acropolita)؛ (۳) W. v. Tiesenhausen: *Recueil de matériaux relatifs à l'histoire de la Horde d'or*، ۱: ۳۸۲ ۔

(Cl. Huart)

کیکاؤس: بن سکندر بن قابوس بن وَشمگیر، عُنصر المعالی، والیِ جُرجان و طبرستان، جس کا تعلق آلِ زیار [رک بآں] سے تھا ۔ اس نے پہلے دو جلیل القدر سلجوقی سلاطین، طُغرل بیگ اور آلپ آرسلان کے ہم عصر اور باجگذار کی حیثیت سے ۴۳۱/ ۱۰۳۹ء تا ۴۶۲ھ/۱۰۶۹ء) حکومت کی ۔ اپنی تصنیف قابوس نامہ، جس کی وجہ سے اس کی شہرت ہوئی، کے خاتمے پر اس نے اپنی عمر ۶۳ برس لکھی ہے ۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے یہ کتاب ۴۷۵ھ/۱۰۸۲ - ۱۰۸۳ء) میں لکھنی شروع کی تھی، لہٰذا اس کا سن پیدائش ۴۱۰ھ/ ۱۰۱۹ - ۱۰۲۰ء کے قریب ہوگا ۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۳۰ برس کے لگ بھگ ہو گی اور اپنی وفات سے خاصی مدت پہلے وہ حکمرانی سے دست بردار ہو گیا ہوگا ۔ ہمیں وہ اسباب معلوم نہیں جن کی بنا پر اس نے تخت و تاج چھوڑا ۔ بہر حال جہاں اس سے اس کی پختگی عقل ظاہر ہوتی ہے، وہاں اس شدید تلخی کا بھی پتا چلتا ہے جس کا اظہار اس کی تصنیف میں نمایاں طور پر ہوا ہے ۔

قابوس نامہ بادشاہوں کے لیے ان اہم ترین ''ہدایت ناموں'' میں سے ایک ہے جو فارسی زبان میں اب تک باقی چلے آتے ہیں ۔ یہ کتاب مصنف نے اپنے بیٹے گیلان شاہ کے لیے لکھی اور اس کا نام اپنے دادا قابوس بن وشمگیر [رک بآں] کے نام پر رکھا، جو فرمانروا اور مصنّف، دونوں حیثیتوں سے یکساں مشہور ہے ۔ یہ ملکی حکمت عملی کی ایک تلخیص ہے، جسے ۴۴ ابواب میں ترتیب دیا گیا ہے ۔ اس کا بیشتر حصہ فلسفۂ اخلاق اور اقتصادیات سے تعلق رکھتا ہے، جس میں متعدد پیشوں کی بابت مباحث بھی شامل ہیں ۔ سیاسیات کے بارے میں صرف آخر کے چند ابواب میں بحث کی گئی ہے ۔

اس کتاب کا عمومی بیان براؤن E. G. Browne کی *A Literary History of Persia*، ۲ (۱۹۰۰ء): ص ۲۷۶ تا ۲۸۷، میں ملتا ہے ۔ کتاب سے عیاں ہے کہ ترتیب مباحث میں مصنف نے بلا شبہہ ایک حد تک یونانی فلسفۂ اخلاق کا تتبع کیا ہے اور اسی جیسے مرکزی تصورات اخذ کیے ہیں، لیکن دوسری

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

جانب کتاب کی ترتیب اور اس کی مثالیں تقریباً تمام فارسی الاصل ہیں۔

اس کے متن کا کوئی تحقیقی نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔ ۱۲۷۵ اور ۱۲۸۵ھ میں دو نسخے، جو تہران سے لیتھو میں طبع ہو کر شائع ہوئے ہیں، ان کا مقابلہ مخطوطات سے کرنے کی ضرورت ہے۔ ترکی زبان میں اس کتاب کے تین تراجم ہوئے ہیں، جن میں سے دو ابھی تک موجود ہیں، لیکن یہ بھی تنقید و تنقیح متن کے لیے کافی نہیں کیونکہ ان میں کئی اضافے اور تغیرات شامل ہیں۔ ان میں سے پہلے ترجمے کی تاریخ کی تعیین اب نہیں کی جا سکتی۔ دوسرا ترجمہ مراد ثانی کے لیے مُرجَمک احمد بن الیاس نے ۸۳۵ھ/ ۱۴۳۲ء میں ختم کیا۔ اس کے پینتیسویں باب (متعلقۂ شاعری) کو Wickerhauser نے بعنوان *Wegweiser zum Verständniss der türkischen Sprache* (۱۸۵۳ء) میں طبع کیا، ص ۲۶۲ تا ۲۶۵) اور ترجمہ بھی کیا (ص ۲۸۷ تا ۲۹۰)۔ تیسرا ترجمہ نظمی زادہ مرتضٰی نے حسن پاشا والیِ بغداد کے لیے ۱۱۱۷ھ / ۱۷۰۵ - ۱۷۰۶ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ H. F. v. Diez نے دوسرے اور تیسرے ترجمے کا تین مخطوطات کی مدد سے ایک مفصل مقدمے کے ساتھ جرمن ترجمہ تیار کیا (دیکھیے مآخذ)۔ اصل فارسی متن کے پہلے ۲۲ ابواب کا ایک ناقص نسخہ بمبئی میں ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا، جو سر تا سر نسخۂ تہران مطبوعۂ ۱۲۸۵ھ پر مبنی تھا، (قابوس نامہ، از عنصر المعالی، مع وافر فرہنگ از منشی جلیل الرحمٰن)۔ ۱۸۸۲ء میں Querry نے مکمل فارسی متن کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔

مآخذ: (۱) v. Zambaur: *Manuel de Généalogie* ص ۲۱۰، مع مآخذ (ص ۱۲۱): (۲) وہ تصانیف جن کا ذکر مادہ میں درج ہے: (۳) Geiger Kuhn: *G. I. Ph.*، ۲: ۳۴۷ تا ۳۴۹؛ (۴) *Buch des Kabus*: Heinr. Friedr. v. Diez، برلن ۱۸۱۱ء؛ (۵) *Der des Neupythagorers*: Plessner *Bryson*، ۱۹۲۸ء، ص ۵۵ تا ۵۸ و ۲۶۰ تا ۲۶۲ (تنقید بر متن)۔

(M. PLESSNER)

کَیْل: پیمائش کے لیے سب سے عام اصطلاح۔ خصوصی معنوں میں یہ خشک اشیا مثلاً ہر قسم کے غلے اور دالوں کے پیمانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بالآخر اس کے معنی (''کَیْلہ'' کی طرح) ایک خاص پیمانے کو پر کر دینے والی مقدار (یا اس مقدار کے وزن) کے ہو گئے۔ اس کے دیگر معانی یہ ہیں: پیمانہ، صحیح پیمانہ، آزمودہ، منضبط اور مستند سرکاری پیمانہ (یا وزن)۔ اس معنی میں یہ مصر کے بلّوری اوزان (مثلاً درہم کیل) اور اوراق بردی میں بطور کیل الدیموس ملتی ہے (کیل الدیموس: غلے کا مشہور سرکاری پیمانہ جسے ٹیکس لگانے کے لیے عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور جو ''قنقل'' سے، جس کا مطلب بظاہر متفاوت مقامی پیمانہ ہے، بالکل مختلف ہے)۔ محدود متعین پیمانے کے لیے کیلہ معمولی لفظ ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کیل کا لفظ بھی بغیر کسی امتیاز کے ایک متعین مقدار کے پیمانے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کیلہ عربوں کے مقداری پیمانوں کے متعارف سلسلے میں نہیں ہے (دیکھیے قَفِیز) بلکہ جیسا کہ دوسری زبانوں میں پیمائشی اصطلاحیں داخل ہوئی ہیں، اسی طرح عربی میں بھی یہ لفظ بازار سے قانونی زبان میں داخل ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے ہم کیلہ کو پیمانوں کے نظام میں بمقدار معین کہیں بھی منسلک نہیں پاتے۔ ایران کے ایلخانی فرمانروا غازان کے عہد حکومت (۶۹۴ھ/ ۱۲۹۵ء تا ۷۰۳ھ/ ۱۳۰۴ء) میں پہلی بار کیلہ کو غلے کی تجارت کے لیے ایک مستند پیمانہ قرار دینے کی کوشش

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کی گئی ۔ رشید الدّین ہمیں بتاتا ہے کہ اس بادشاہ نے تبریز کے کیلے کو ناپ کا معیاری پیمانہ قرار دیا اور اس کا وزن ۲۶۰۰ درہم (۸۰۸۷ کیلو گرام = ۱۹ پونڈ) مقرر کر دیا ۔ اس کے بعد یہ ضابطہ جاری ہوا کہ ایسے پیمانے جن میں آنے والے غلے کی مقدار مذکورۂ بالا وزن کے مطابق ہو، ہر قسم کے غلے (جو، گندم، چاول، مٹر، لوبیا، تل، باجرہ وغیرہ) کے لیے تیار کیے جائیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت بھی آج کل کی طرح تجارتی لین دین میں پیمانے کے بجائے وزن ہی سے کام لیا جاتا تھا ۔ ترکی مملکت میں بھی غلے کی تجارت کے لیے کیلہ سرکاری اکائی تھا اور استانبول کا کیلہ، جس کا وزن ۳۵ پونڈ تھا (۷۵/۳ گیلن)، حکمًا سرکاری معیاری پیمانہ قرار دیا گیا تھا، لیکن ہر تجارتی مرکز کا (جیسا کہ اب بھی معمول ہے) اپنا مقامی کیلہ تھا، جو معیاری کیلہ سے بہت مختلف تھا ۔ یہی بات ''کیلجہ'' کی بابت بھی درست ہے، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

مآخذ: دیکھیے بذیل کیاجة.

(E. VON ZAMBAUR)

* **کَیْلَجَة** : وزن کا ایک پیمانہ جو بعض جگہ مستعمل ہے اور جو وزن کے لحاظ سے مختلف مقامات پر ایک دوسرے سے مختلف ہے ۔ اس کا وزن ½ سے ۲ پاؤنڈ تک (یا کیلوگرام میں ۳/۴ سے ۱½.۳ پائنٹ تک) ہے ۔ یہ اصطلاح اتنی قدیم ہے کہ تیسری صدی ہجری میں بھی موجود تھی۔

مآخذ: (۱) Sauvaire : *Matériaux*، در *Journ. As.*، سلسلہ ۸، ۸ (۱۸۸۶ء): ۱۲۶ ببعد؛ (۲) S. Lane-Poole : *Arabic Glass Weights in the British Museum*، شمارہ ۳۷، ۵۱؛ (۳) Becker : *Papyri Schott-Reinhardt*، ۱: ۳۱، ۷۲؛ (۴) الطّبری، طبع de Goeje : *Glossarium*، ص cdxxxiv و cdlxii؛ (۵) Behrnauer : *Institutions de Police chez les Arabes*، در *Journ. As.*، سلسلہ ۵، ۱۶ (۱۸۶۰ء): ۱۳۱؛ (۶) الخوارزمی : مفاتیح العلوم، طبع Van Vloten، ص ۱۵.

(E.V. ZAMBAUR)

* **کِیْمِیا** : رک بہ الکیمیا.

* **الکِیمِیا** : رک بہ علم (الکیمیا).

* **الکَیَّال** : احمد الکیّال الخصیبی، تیسری صدی ہجری کا ایک فلسفی، جس کے ہاں اسمٰعیلی اور غناسطی رجحانات ملتے ہیں ۔ الشہرستانی اس کی عربی و فارسی تصنیفات سے واقف تھا ۔ اس نے ان کے جو اجزا پیش کیے ہیں، ان کا رسائل اخوان الصفا سے مقابلہ کرنا چاہیے (دیکھیے الشہرستانی، الملل، قاہرہ ۱۳۱۷ھ/ ۲: ۱۷، ۱۸).

(L. MASSIGNON)

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

گ

⊗ گ : (ف) اسم مذکر؛ فارسی کا چھبیسواں، اردو کا چالیسواں اور (بروے فرہنگ آصفیہ، مادّۂ گ) ہندی کا تیسرا حرف (ا ا) ۔ حرف ''گ'' عربی میں نہیں آتا ۔ حساب جُمل میں ''گ'' کے عدد ۲۰ ہیں، جو ''ک'' کے اعداد کے برابر ہیں ۔ اہل ایران ''گ'' کو کاف فارسی کہتے ہیں (اسے کاف عجمی بھی کہا جاتا ہے)، لیکن اہل ماوراءالنہر ''گ'' کو کاف تازی ہی کہتے ہیں (دیکھیے محمد پاشا : فرہنگ آنند راج ، مادّۂ گ) اور ''ک'' کو ''گ'' سے بدل دیتے ہیں، جیسے کُشاد = گُشاد؛ کشاورز = گشاورز؛ جہانکشا = جہانگشا؛ پَرکار = پرگار: کلابتوں = گلابتوں وغیرہ .

ہندی حرف ''گ'' فارسی زبان میں کبھی اول، کبھی وسط اور کبھی آخر میں حروف ذیل سے بدل جاتا ہے: ب، ج، د، خ، غ، م، ڈ، و، ی (فرہنگ آصفیہ، مادّۂ گ).

کبھی کسی لفظ میں ''گ'' کی تخفیف ہو جاتی ہے، لیکن معنی میں فرق نہیں آتا، مثلاً اگر = ار .

اب ہم بعض ایسے الفاظ کا ذکر کرتے ہیں جن میں ''گ'' خاص خاص حروف سے بدل جاتا ہے، مثلاً درج ذیل الفاظ میں ''گ''، ''ب'' سے بدل گیا ہے : گِریوَن (بیماری کا نام جسے عربی میں قوبا اور ہندی میں داد کہتے ہیں) = بریوَن (وہی بیماری)؛ گُلگونہ (غازہ) = بلغُونہ (غازہ).

بعض اوقات ''گ'' کو شفہی (بہی؛ وہ صوت جو ہونٹوں کو بند کرکے یا قریب لا کر پیدا ہو) حروف سے بدل دیتے ہیں (دیکھیے F. Steingass : *Persian and English Dictionary*)، مثلاً ''گُمرک'' (= محصول چنگی) کو بصورت ''جمرک'' معرب کیا گیا ہے.

''ج'' سے بدلنے والے بعض اور الفاظ درج ذیل ہیں : لگام = لجام (گھوڑے کی باگ ڈور)، گُوال (بالیدگی، نشو و نما کرنے والا) = (معرب) جُوال (یہ لفظ لُغت ژند پا ژند سے ہے، شاید یہ جوبال کا مخفف ہے دیکھیے فرہنگ آنند راج، مادّۂ گ).

کبھی ''گ'' کو کسی حلقی حرف (حلق سے نکلنے والی صوت کا حرف) مثلاً غ سے بدل دیا جاتا ہے (دیکھیے F. Steingass)، مثلاً گیلواج بمعنی چیل (= گلیواز) = غلیواج؛ لگام = لغام؛ گُلولہ (بمعنی گولی، گولا، غُلّا) = غُلولہ؛ لژگاؤ (ایسی گائے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی دم سے پرچم بناتے ہیں) = گژگاؤ = غز گاؤ؛ گُلالہ = غُلالہ (خم دار زلف)، کمال اسمٰعیل :

ع ہر سال رنگ عارض و بوی گلالہ است
ع بس لطیف است در غلالہ لاد

''ل'' سے بدلنے والے ''گ'' کا لفظ : گلگونہ = لغُونہ (آرائش و گلگونہ)

www.besturdubooks.wordpress.com

''واو'' سے بدلنے والا ''گ'' کا لفظ : گراز (خوک، سور) = وراز.

''ی'' سے بدلنے والے ''گ'' کے الفاظ: آذرگون (ایک قسم کی شقیق، جس کے کنارے بہت سرخ ہوتے ہیں اور درمیان سے سیاہ ہوتی ہے) = آذریون؛ رشید الدین وطواط :

همیشه تا که بود در فراق عاشق را
دلی چو آذر و رخسارهٔ چو آذر یون

پوردگان = پوردیان = خوردیان (معرب فورد جان)، بمعنی پانچ الحاقی دن، جو ایرانی سال کے آخر میں بڑھائے جاتے ہیں؛ زرگون = زریون، قطران تبریزی :

آن درختی کش تو باری باد زریون جاودان
گو بدانش باغ دولت را همی زریون بود

حرف ''گ'' کسی ذاتی معنی میں نہیں آتا، البتہ کسی لفظ کے آخر میں کبھی نسبت کے طور پر ''گ'' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، مثلاً شنگ، بمعنی شوخ و ظریف (شوخ و شنگ)، یہ لفظ شن اور گ کا مرکب ہے : شن کا مطلب ہے ناز، کرشمہ اور ''گ'' نسبت کے طور پر آیا ہے ۔ اسی طرح غریژنگ، غریژن اور گ کا مرکب ہے : غریژن کا مطلب ہے تالاب کی تہ میں جمی ہوئی سیاہ رنگ کی کیچڑ اور ''گ'' نسبت کو ظاہر کرتا ہے .

مآخذ : متن میں درج ہیں (مقبول بیگ بدخشانی رکن ادارہ نے لکھا) .

(ادارہ)

* **گابون** : Gabon، ان چند افریقی ممالک میں سے ایک ہے جن میں اسلام آبادکاروں کے قافلوں کے ذریعے متعارف ہوا ۔ کہیں ۱۸۴۳ء میں جا کر سب سے پہلے سینی گالی سپاہیوں (وولوف Wolofs یا تکولرز Tukulors) کو قلعۂ د، اومیل Fort d'Aumale کے محافظ دستے کے ساتھ اور پھر لیبرویل Liberville میں سطح مرتفع پر واقع کیمپ میں متعین کیا گیا ۔ ان میں سے بعض سپاہیوں نے اپنی ملازمت کے مکمل ہونے پر گابون میں اقامت اختیار کر لی، جہاں وہ زیادہ تر اگوی Ogoué، نگونی Ngounie یا فرنان واز Fernan Vaz کی سمندری جھیل کے ساتھ ساتھ تجارت کرتے تھے ۔ انھوں نے گابون کی عورتوں سے شادیاں کر لیں، جو شادی کے بعد بھی عیسائی ہی رہیں اور ان کے بچے عام طور پر سینٹ میری مشن کے کیتھولک سکولوں میں پڑھتے رہے .

استعماری پیدل فوج کا ایک حفاظتی دستہ زیادہ تر سینی گال اور فرانسیسی سوڈان کے رہنے والے بندوقچیوں پر مشتمل تھا ۔ مقصد یہ تھا کہ فوج میں مسلمانوں کے نئے نئے دستے متواتر بھرتی ہوتے رہیں؛ تاہم وہ دو یا تین سال یہاں ٹھیرتے تھے اور اس کے بعد واپس اپنے وطن چلے جاتے تھے اور ان کی جگہ ہوسا Hausa اور دیولہ Dyula قبائل کے پھیری والوں اور دکانداروں کو لینی پڑتی تھی ۔ ان مسلمانوں میں سے بعض نے جنگلی دیہاتیوں کی خوش اعتقادی سے فائدہ اٹھا کر نجومیوں یا جادوگروں کا پیشہ اختیار کر لیا .

گابون کے باشندوں میں سے جو مشرف باسلام ہوئے ان کی مجموعی تعداد چند درجن سے زیادہ نہیں. ۱۹۵۹ء کے ان اعداد و شمار میں، جو ڈاکار Dakar کے پاپائی ضلع میں کام کرنے والے (عیسائی) تبلیغی اداروں کے سالنامے میں دیے گئے ہیں. مسلمانوں کی تعداد دو ہزار بتائی گئی ہے (یہ شمار غالباً اصل سے کم ہے) ۔ ان میں سے ۱۰۹۰ دریا کے دہانے کے ضلع میں، ۲۶۶ وولیونیم Woleu Ntem میں، ۱۷۵ سمندر کے قریب واقع اوگو Ogoue میں، ۸۰ اوندو Ivindo میں، ۳۱ نگونی Ngounie میں، ۲۱ اگوئی لولو Ogoué Lolo میں، ۱۰ نیانگا Nyanga میں اور ۴ بالائی اگو Upper Ogoue میں آباد ہیں. مسلمانوں کی قلت کا اندازہ مسجدوں کی تعداد

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

سے لکایا جا سکتا ہے جن میں سے ایک پورٹ جینٹل Port Gentil میں ہے، ایک لمبارینی Lambaréné میں اور دو لیبرویل Libreville میں، جن میں سے سب سے بڑی مسجد فرانسیسی حکومت کے خرچ پر بنائی گئی تھی۔

دیوں کے مسلمان، جو کل آبادی کا چار فیصد ہیں۔ صرف استعماری دور میں انتظامیہ کے ماتحت ملازمین کی حیثیت سے اہم تھے۔ مسلمان اب بھی یہاں متوسط تجارتی طبقے کی حیثیت سے تھوڑی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

مآخذ: (۱) گابون سے متعلق مختلف تصانیف میں کچھ سطریں؛ (۲) مندرجۂ بالا مقالے کی اہم معلومات ایبے راپوندا واکر Abbé Raponda-Walker نے مقالہ نگار کو مہیا کی ہیں، [نیز دیکھیے؛ (۳) گلزار احمد: تذکرۂ افریقہ، معارف لمیٹڈ کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۷، ۲۴۳، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷ الف)۔

(R. CORNEV.N)

گارڈافوئی: (Guardafui) افریقہ کی انتہائی مشرقی زاس، جسے عربی میں "راس عسیر" کہتے ہیں۔ اس نام کی اصل کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یقینی بات صرف اتنی ہے کہ اس میں حفون (Opone) کا نام مضمر ہے بلاشبہہ اس سے تقریباً ۶۰ میل جنوب میں ایک اور راس ہے جسے عرب جرد (گرد) حفون کہتے ہیں، لیکن اس میں شبہہ ہے کہ آیا یہ جرد یا گرد جس کا عربی زبان میں کوئی مطلب نہیں نکلتا، یورپین سے تو مستعار نہیں لیا گیا کیوں کہ اس کا قدیم ترین نام جو پرتگیزوں نے رکھا تھا، اس کا سلسلہ ایک حد تک ورد سے ملایا جا سکتا ہے اور یہ لفظ ضروری نہیں کہ عربی الاصل ہی ہو۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں یہ نام کسی راس کے بجائے پورے علاقۂ حفون (ارض حفون) کو ظاہر کرتا ہو اور پرتگیزوں نے صرف راس کے لیے محدود کر دیا ہو۔

مآخذ: Yule و Burnell: *Hobson Jobson*، ص ۳۶۸ ببعد۔

(ؤؤ بار اوّل)

گارسیف: گرسیف [آ درسیف: بربری: اجرسیف، فرانسیسی: گرسیف Guercif]، مشرقی مراکش میں ایک قصبہ، جو تازہ سے ساٹھ کیلو میٹر مشرق میں تافر الما کے لق و دق میدان میں دریائے مُلُّوّ اور دریائے ملویہ کے سنگم کے درمیانی قطعۂ زمین پر واقع ہے۔ (اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ بربری زبان میں "جر" "درمیان" اور "اسیف دریا" کے معنوں میں آتا ہے)۔

Marmol نے گرسیف اور بطلمیوس کے Galapha کو ایک ہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ غیر اغلب ہے، چونکہ اس یونانی جغرافیہ نویس نے مؤخرالذکر مقام Molochat (ملویہ) کے مشرق میں بتایا ہے، لہٰذا صحیح نام تاوریرت ہی ہو سکتا ہے۔

گرسیف کی بنیاد بنو ابی العافیہ کے ہاتھوں تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں پڑی تھی۔ یہ مکناسہ کا بربری قبیلہ تھا جو وادی ملویہ میں خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتا تھا۔ بعد ازاں یہ قصبہ موسیٰ بن ابی العافیہ (م ۳۲۷ھ/۹۳۸ء) اور اس کے اخلاف کے مقبوضات کا صدر مقام قرار پایا۔ موسیٰ بن ابی العافیہ کے بیٹوں نے بنو ادریس اور بنو فاطمہ کے ساتھ جنگوں میں بڑی شہرت حاصل کی۔

گرسیف (اجرسیف) کی تجارتی اور جنگی اہمیت کا باعث اس کا محل وقوع تھا۔ یہ دو راستوں کے مقام اتصال پر واقع تھا، جن میں سے ایک فاس سے تلمسان اور دوسرا سجلماسہ سے ملیلہ کو جاتا تھا۔ پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی میں البکری نے لکھا تھا کہ یہ ایک آباد قصبہ

www.besturdubooks.wordpress.com

(قریہ العامرۃ) ہے، لیکن جب ۴۷۳ھ/۱۰۸۰ء میں المرابطی سلطان یوسف بن تاشفین نے اس کو فتح کر کے برباد کر دیا تو اس کی سابقہ اہمیت جاتی رہی۔ الادریسی بھی اس مقام سے نا آشنا تھا۔

ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں بربروں کے خانہ بدوش قبائل بنو مرین نے جو زناتہ کی شاخ تھے، گرسیف میں آمد و رفت شروع کر دی۔ یہ قبائل گرمیوں میں صحرا کے بالمقابل پہاڑی علاقوں سے اتر کر زیریں ملویہ وادی میں گرمیوں کا سارا موسم گزارتے، گرسیف میں وہ اناج کا ذخیرہ کر لیتے اور موسم خزاں کی آمد پر صحرائی چراگاہوں میں جانے سے پیشتر باہمی ملاقات کر لیتے تھے۔ العقاب کی جنگ کے بعد جب مرابطی سلطنت زوال پذیر ہو گئی، تو بنو مرین اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملویہ کی زیریں وادی میں آباد ہو گئے اور انھوں نے گرسیف پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۶۳۶ھ/۱۲۳۸ء میں جب مرابطی فوج تلمسان سے پسپا ہو کر فاس واپس آ رہی تھی تو بنو مرین اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملویہ کی زیریں وادی میں آباد ہو گئے اور انھوں نے گرسیف پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس وقت انھوں نے اس مقام پر کلہات لگا کر مرابطی فوج کو تباہ و برباد کر دیا۔ ۶۷۵ھ/۱۲۷۶ء میں بنو مرین نے سارے مراکش پر قبضہ کر لیا، لیکن ملک کی مشرقی سرحدوں پر تلمسان کے زیّانی حکمران خطرہ بنے رہے۔ (اب) تاوریرت اور دبدّو [رک بآں] کے ساتھ گرسیف بھی فوجی چھاؤنی (ثغر) بن گیا، جس کی وجہ سے مراکش کے اندرونی علاقوں پر یلغار مسدود ہو گئی۔ ۷۲۱ھ/۱۳۲۱ء میں ابو سعید مرینی نے گرسیف کی فصیل دوبارہ بنوا دی۔ بعد ازاں جب شہریوں نے بغاوت کر دی تو ابو عنان نے حملہ کر کے شہر کو آگ لگا دی اور شہر پناہ کے بعض حصے گرا دیے۔

ابو عنان کی وفات ۷۵۹ھ/۱۳۵۸ء پر گرسیف مرادہ کے مستحکم قلعے (ملویہ کے کنارے جانب شمال مغرب پندرہ کیلو میٹر کے فاصلے پر) سمیت سویدی عربوں کے نامور سردار ونزمار بن عریف کی جاگیر بن گیا۔ یہ بنو مرین کے حامی بدوی قبائل کا سالار لشکر اور حکمران خاندان کا مشیر کار تھا۔ تلمسان کے حکمران ابو حمّو نے بارہا گرسیف پر حملے کیے اور کئی دفعہ مستحکم مقامات پر قبضہ کر کے ان کو برباد کر دیا۔

جب ترکیہ اور فرانس کے درمیان الجزائر کی سرحد اوجدہ سے آگے جانب مشرق قرار پائی تو مصریوں اور عاویون نے (اقامت کے لیے) تاوریرت کو ترجیح دی۔

۱۹۱۲ء میں فرانس نے گرسیف پر قبضہ کر لیا اور اوجدہ سے آنے والی ریلوے لائن پر سٹیشن بننے سے اسے کچھ اہمیت بھی حاصل ہو گئی۔ جب ریلوے لائن کی توسیع تازہ اور بعد ازاں فاس تک کی گئی تو اس قصبے کی رونق جاتی رہی۔ مسون سمیت گرسیف ہوّارہ قبائل کا ایک اہم مرکز ہے۔ گرمیوں میں یہ قبائل اپنے مویشی لے کر ان اطراف میں آ نکلتے ہیں اور بھیڑیں وغیرہ پالتے ہیں۔

مآخذ: (۱) البکری: المُغرب فی ذکر بلاد افریقیہ والمغرب، بمدد اشاریہ، الجزائر ۱۹۱۱ء؛ (۲) Leo Africanus طبع شیفر، متن ۲۷، ۳۲۹، مترجمۂ Epaulard ۲۹۹۔

(G. S. COLIN)

گازرون: رک بہ کازرون۔

گاگوز: (Gagauzes) ایک ترکی نسل کی قوم ہے جو ایک خالص ترکی زبان بولتی ہے مگر عیسائی مذہب کی پیرو ہے۔ ان کی تعداد کم ہے۔ یہ لوگ متفرق نوآبادیوں میں رہتے ہیں اور آج کل زیادہ تر بیسرابیا میں بکھرے ہوئے ہیں (یہ

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

وگ بیشتر اس مثلث میں رہتے ہیں جو اسمٰعیل لغراد اور کُکل کو خطوط کے ذریعے ملانے سے بنتی ہے، نیز دیوار تراجن (Trajans wall) کے ضلع ور بندر اور اِکرمن میں) ۔ یہ لوگ متعدد علاقوں میں بکھرے پڑے ہیں۔

مآخذ: (۱) W. Radloff: *Ctenija v Imp.* ... ۱۸۴۶ء، شمارہ ۱: (۲) *Obshč istor. i drevn. Ross* ... ۱۸۴۸ء، شمارہ ۲۱: (۳) A. Zashčuk: *Bolgarskija Kolonii v Bessarabii i Novorossijskom Kraje, journal ministerstva vnutren djel*, ۱۸۴۸ء، شمارہ ۲۱: (۴) *Materialy dlja geografi i statistiki Rossii Bessarabskaja oblast*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۲ء؛ (۵) G. Golubovski: *Pečeniegi Torki i Polovcy do nashestvija Tatar. Istorija juzhnorusskich stepej*، جلد ۹ تا ۱۳ (Kiev ۱۸۸۴ء)؛ (۶) P. Draganoff: *Zapiski imp. russk. geogr. obslič po otdjel Etnogr.*, جلد ۲۲، شمارہ ۱ (*Makedonsko slavjanski shornik*)؛ (۶) Constantin Jiriček: *Sitzungsber. d. Kgl. böhm. Gesellsch d. Wiss*، ۲۱ جنوری ۱۸۸۹ء، اور *Das Fürstentum Bulgarien*، Wien ۱۸۹۱ء؛ (۷) Pecz: *Osterr. Monatsschr. f.d. Orient*، ۱۸۹۴ء؛ (۸) V. Moshkoff: *Proben der Volkslitteratur der Türkischen stämme*، طبع W. Radloff X. Teil: *Mundarten der bassarabischen Gagausen* (۱) متن و فرہنگ؛ (۲) ترجمہ (روسی)؛ (۹) Gheorghe Popescu-Ciocanel در *Revue du Monde Musulman*، جلد ۱ (۱۹۰۶ء)، ۱۹۶: (۱۰) Djansizoff: *Revue historique publiée par l'institut d'Histoire Ottomane* Heft ۱۸ (دسمبر ۱۹۱۲ء).

(Th. Menzel [و تلخیص از ادارہ])

گاور: (G. Aur) = گبر [رک باں].

گاور طاغی (جبل برکت): کوہ امانوس (Amanus) اور زیادہ صحیح الفاظ میں اس سلسلۂ کوہ کے شمالی حصے کا نام۔

گایوس Gayos: ایک قبیلہ جو آچے (Atjeh) [رک باں] میں آباد ہے۔

گِب: ای۔ جے۔ ڈبلیو، E. J. W. Gibb، [۱۸۵۷ء میں] سکاٹ لینڈ کے ایک شریف اور متمول گھرانے میں پیدا ہوا۔ [ایڈنبرا یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کی تحصیل کی اور عربوں اور ترکوں کے علوم و آداب اور تاریخ و فلسفہ میں تخصص حاصل کیا۔ گلاسکو یونیورسٹی میں محفوظ عربی، سریانی اور عبرانی مخطوطات کی ایک فہرست تیار کی جو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلّے (JRAS، ۱۸۹۹ء) میں شائع ہوئی] ۔ گب کو ترکوں کے ادبیات اور خصوصاً ان کی شعر و شاعری کے ساتھ بڑا شغف تھا ۔ اسی بے پناہ شوق کی بدولت انھوں نے ترکی شعر و شاعری کی ایک مبسوط تاریخ *A History of Ottoman Poetry*، (لنڈن ۱۹۰۰ تا ۱۹۰۹ء) کے نام سے چھے جلدوں میں لکھی ۔ اس کتاب کی اشاعت کے دوران میں بعمر ۴۵ سال، ۱۹۰۱ء میں مصنف کا انتقال ہو گیا اور ان کی وفات کے بعد اس کتاب کی اشاعت کو پروفیسر ای ۔ جی ۔ براؤن نے مکمل کیا جو گب کے ذاتی دوست تھے اور ان کے علم و فضل اور ان کی تصنیف کے مداح تھے ۔ گب نے بیشتر ترکی شعرا کے حالات لکھے ہیں اور اس تفصیل، استیعاب اور ناقدانہ بصیرت سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب تمام دنیا کے لٹریچروں میں اپنے موضوع پر ایک منفرد اور بے مثال تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

پروفیسر براؤن نے متوفی کی والدہ کو مشورہ دیا کہ ان کے فرزند عزیز کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے ایک فنڈ قائم کر دیا جائے، جس سے ان مشرقی علوم کی کتابیں شائع ہوتی رہیں جن علوم کے ساتھ

www.besturdubooks.wordpress.com

مرحوم کو خاص شغف تھا ۔ اس نیک دل خاتون نے پروفیسر ممدوح کا مخلصانہ اور دانشمندانہ مشورہ قبول کیا، اور اس مقصد کے لیے پانچ ہزار پاونڈ کی رقم سے Gibb Memorial Series کے نام سے ایک اشاعتی وقف قائم کر دیا اور اس رقم میں خداوند کریم نے ایسی برکت ڈالی کہ اس سے عربی فارسی اور ترکی کی بیسیوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ابھی تک شائع ہو رہی ہیں اور اس طرح سے مسلمانوں کے بہت سے علمی خزانے منظر عام پر آچکے ہیں ۔

مآخذ : (۱) ابوالقاسم سحاب: فرہنگ خاورشناسان، طبع ایران، ص ۱۳۳ : (۲) نجیب العقیقی : المستشرقون، ۲: ۴۹۱ : (۳) A. J. Arberry : *British Orientalists*، ص ۱۹) ۔

(شیخ عنایت اللہ)

③ **گِبْ** (ہملٹن) : (سر اے ۔ آر ہملٹن گب Sir A. R. H. Gibb) انگلستان کا مشہور مستشرق جس نے عربی زبان و ادب کی نمایاں خدمات انجام دیں، ۱۸۹۵ء میں اسکندریہ (مصر) میں پیدا ہوا، لیکن عربی زبان کی تعلیم لنڈن کے سکول آف اورینٹل سٹڈیز میں حاصل کی ۔ یہاں اسے ایک دوسرے نامور مستشرق سر ٹامس آرنلڈ (Sir Thomas Arnold) کے علاوہ شیخ عبدالرزاق حسنین مصری ایسے اساتذہ سے بھی استفادے کا موقع ملا جنھوں نے اس کے ذوق علمی کو پختہ کرنے میں نمایاں حصہ لیا ۔ ۱۹۲۱ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد گب اسی مدرسے میں لیکچرار بن گیا ۔ ۱۹۳۰ء میں وہ لنڈن یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا اور ۱۹۳۷ء میں مارگولیتھ کی وفات کے بعد آکسفرڈ میں عربی زبان و ادب کا صدر شعبہ قرار پایا، جہاں وہ ۱۹۵۵ء تک کام کرتا رہا ۔ اس کے بعد وہ فورڈ (امریکہ) میں شعبۂ دراسات شرق الاوسط کا صدر مقرر ہوا ۔ اس نے ۱۹۷۵ء میں وفات پائی ۔

گب عربی لکھنے اور بولنے میں اہل زبان کی سی قدرت رکھتا تھا ۔ براؤن، آرنلڈ اور نکلسن کی طرح اس کا شمار معتدل مزاج مستشرقین میں ہوتا ہے ۔ اس نے ممالک عربیہ، مثلاً مصر، شام، لبنان، فلسطین اور مغرب اقصی کی بھی سیر و سیاحت کی تھی اور وہاں کے ادبا سے اس کے ذاتی مراسم بھی تھے ۔ ان ممالک کے علمی ادارے بھی اس کے قدر دان اور مرتبہ شناس تھے، چنانچہ وہ مجمع اللغہ (قاہرہ) اور مجمع العلمی العربی (دمشق) کا اعزازی رکن تھا ۔ اسے عربی زبان کے جدید ادب اور مسلمانوں کی سیاسی، دینی اور اصلاحی تحریکوں سے بڑی دلچسپی تھی ۔

تصانیف : اس کی مشہور تصانیف درج ذیل ہیں : (۱) *The Arab conquest in Central Asia*، لنڈن، ۱۹۲۳ء؛ (۲) *Arabic Literature an introduction*، لنڈن ۱۹۲۶ء؛ (۳) سفر نامۂ ابن بطوطہ کا انگریزی ترجمہ : Ibn Battuta : *Travels in Asia and Africa*، ج اول، طبع لنڈن ۱۹۲۹ء، ج ثانی کیمبرج ۱۹۶۲ء؛ باقی اجزا زیر طباعت ہیں؛ (۴) ذیل تاریخ دمشق لابن القلانسی (متن و ترجمہ)، لنڈن ۱۹۳۲؛ (۵) *Whither Islam*، لنڈن ۱۹۳۲ء؛ (۶) : *Mohammedanism An Historical Survey*، لنڈن ۱۹۵۳ء؛ (۷) *Islamic Society and the West*، آکسفرڈ ۱۹۵۰ء ۔ ۱۹۵۷ء؛ اس نے مختصر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لنڈن ۱۹۵۳ء، کی تدوین و ترتیب میں بھی نمایاں حصہ لیا تھا ۔ اس کے علاوہ اس نے بیسیوں مقالات عربی زبان و ادب، تصوف، اسلامی تاریخ اور مشاہیر رجال کے بارے میں لکھے تھے ۔ ان میں قابل ذکر مصر جدید کے ادبا اور نثر نگاروں کے فکر و فن اور اسلوب پر *Studies in contemporary Arabic Literature* کے نام سے BSOS (۱۹۲۹ تا ۱۹۳۰ء)

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

لنڈن میں شائع ہوے تھے۔ پھر یہ مقالات اس کے مجموعۂ مقالات (*Studies on the civilization of Islam*) میں شائع ہوے ہیں۔

مآخذ: (۱) نجیب العقیقی، المستشرقون، ۲: ۵۵۱ تا ۵۵۴، قاہرہ ۱۹۶۵ء؛ (۲) Webster: *Biographical Dictionary*، (نذیر حسین رکن ادارہ نے لکھا).

(ادارہ)

گَبْر: ایک اصطلاح جو فارسی ادب میں بالعموم کسی قدر تحقیر آمیز انداز میں زرتشتیوں کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ اس کے اشتقاق کی بابت ابھی تک لسانیات کے ماہر کوئی متفقہ فیصلہ نہیں کر پائے۔ اس کے متعلق بہت سی تجاویز پیش کی گئی ہیں، مثلاً (الف) عبرانی لفظ جبر habher (''ساتھی'') سے، قدوشین کے مفہوم میں ۲۔الف؛ (ب) آرامی۔ پہلوی گبرا (پڑھیے مرت) سے، خاص طور پر موغ۔ مرتان mog marton (''مجوسی Magi'' (جو موغ۔ گبرا۔ آن لکھا جاتا ہے) کی ترکیبوں میں (ج) عربی لفظ ''کافر'' کی فارسی تعریف سے۔ پہلے دو اشتقاق تو قیاس سے بہت بعید ہیں، عربی لفظ کافر سے اس کا اشتقاق سب سے زیادہ قابل قبول ہے۔ فارسی ادب میں اس لفظ کے ساتھ تحقیر کے لیے اکثر ''ک'' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے (گبرک، ج گبرکان) فارسی میں اس لفظ کی شکل گور (gawr, gaur) کردی شکلیں، گبیر (ارمنوں کے لیے)، گور (زردشتیوں کے لیے)، گاویر (یورپیوں، خاص طور پر روسیوں کے لیے)، ترکی کا مشہور لفظ گاور gavur (کافر) بھی معروف ہیں۔ فارسی ادب میں اس لفظ کا استعمال محض ثانوی حیثیت سے عام معنوں میں ''کافروں'' کے لیے ہوتا ہے۔ قدیم متون میں یہ لفظ خاص اور اصطلاحی طور پر زردشتیوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ [= دیکھیے سعدی: اگر صد سال گبر آتش فروزد: چو یکدم اندر آن افتد بسوزد] ۔ اس سے عربی لفظ، جو غالباً اس کے پیچھے کارفرما ہے، کی فارسی تحریف سمیت، پتا چلتا ہے کہ اس کا مأخذ خالص زبانی۔ بہت قدیم زمانے سے متعلق ہے، یقینی طور پر اس دور سے پہلے کا جس میں نئے فارسی تحریری ادب کی تخلیق کے وقت فارسی زبان میں نئے عربی الفاظ بکثرت داخل کیے گئے تھے۔

مآخذ: (۱) *Gr. I. Ph.*، ۲: ۶۹۷؛ (۲) برہان قاطع، طبع ایم۔ معین، بار دوم، تہران ۱۳۴۲ھ شمسی، ۳: ۱۷۷۳ تا ۱۷۷۴، ۱۸۵۰؛ (۳) ایم۔ معین: مزدیسنا و تأثیر آن در ادبیات پارسی، تہران ۱۳۲۶ھ، ص ۳۹۵ تا ۳۹۶ (اور طبع جدید دو جلدوں میں، تہران ۱۳۳۸ھ)؛ (۴) اکبر دہخدا: لغت نامہ، کراسہ ۳، تہران ۱۳۳۵ھ شمسی/۱۹۵۶ء، ص ۹۴ تا ۱۰۰.

(A. BAUSANI)

گَبَن: جس کی صحیح شکل گبنپرت Gabnopert ہے (دیکھیے ابو الفرج: *Chron. Sry*، طبع Bruns، ص ۳۲۹)؛ یہ آرمینیا کے ملک میں ایک پہاڑی قلعہ ہے، جو دریاے جیحان کے معاون تکرِ صو پر واقع ہے۔ آج کل اسے گبن کہتے ہیں اور یہ مرعش کی سنجاق میں اندریں کی قضا میں شامل ہے۔ آرمینیا کے بادشاہ یہاں اپنے خزانے محفوظ رکھتے تھے اور ضرورت کے وقت پناہ لیتے تھے، مثلاً آخری بادشاہ لیون Leon ششم والی لوسگنان Lusignan ۱۳۷۴ء میں یہاں محصور ہو گیا تھا، لیکن نو ماہ کے محاصرے کے بعد اسے مملوک سلطان الملک الاشرف شعبان کی اطاعت قبول کرنا پڑی۔

(اے اے لائیڈن، بار اول)

گِبّن: ایڈورڈ، Edward Gibbon (۱۷۳۷ - ۱۷۹۴ء) مشہور برطانوی مؤرخ، مستشرق، مصنف *The History of Decline and Fall of the Roman Empir*، (۱۷۷۶ تا ۱۷۸۸ء).

[ادارہ]

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

* گُجرات : پنجاب، (پاکستان) : کے راولپنڈی ڈویژن، کا ایک ضلع جو ۳۳ درجے اور ۳۲ درجے ۸ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۳ درجے، ۱۷ دقیقے اور ۷۴ درجے، ۳۰ دقیقے طول بلد شرقی کے درمیان واقع ہے ۔ اس کا رقبہ ۲۲۵۸ مربع میل ہے اور ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۱۱۵۸۶۷۵ ہے ۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے جس کے جنوب مشرق میں دریاے چناب ہے اور جہلم شمال مغرب کی جانب بہتا ہے، کوہ ہمالیہ کی بیرونی پہاڑیاں شمال مشرق میں ہیں اور ضلع شاہ پور اس کے جنوب مغرب میں ہے، اس ضلع کا بہت سا قدیمی بنجر علاقہ، اب زیر کاشت آ چکا ہے کیونکہ جہلم کی نہریں اور معاون نہریں اس کو سیراب کرتی ہیں ۔

سکندر اعظم اس ضلع میں سے گزرا تھا ۔ موجودہ شہر جہلم کے نزدیک اس نے دریاے جہلم ہیڈ سپس (Hydaspês، ونستہ، ویہٹ یا جہلم) کو عبور کیا اور پہاڑی رستوں سے گزرتے ہوے دریاے چناب کو اس مقام پر عبور کیا، جہاں وہ پہاڑوں سے نکل کر میدان میں داخل ہوتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضلع، پورس Porus کی مملکت کا وسطی علاقہ تھا ۔ اس کے بعد یہ ضلع موریا اور کوشان حکمرانوں کی سلطنت کا ایک حصہ بنا لیکن گپت خاندان کی سلطنت میں اس کا شامل ہونا معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہرش کی مملکت ہی کا کبھی حصہ بنا، گوجروں کے قبیلے کی اکثریت اور خود اس کے نام سے اغلب معلوم ہوتا ہے کہ گجرات کا شمول اس بڑی گورجارا سلطنت میں ہو جس کا صدر مرکز راجپوتانے میں بھین مال تھا ۔ لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ مقامی راجا عرصۂ دراز سے مرکزی حکومت سے جس کا دارالسلطنت قنوج [رک بآں] تھا، اپنا تعلق منقطع کر چکے تھے، جب کہ نویں صدی میں گوجر دیس جو گجرات کے ضلع کے تقریباً مطابق تھا جمّوں کے حکمران نے مہاراجا کشمیر کے حوالے کر دیا تھا ۔ بعد کے زمانے میں یہ سرزمین سب حملہ آوروں کے لیے شارع عام بن گئی، جس میں محمود، محمّد بن سام، تیمور، بابر اور نادر شاہ کی فوجیں شامل ہیں ۔ اس ضلع کے باشندے خواہ وہ جاٹ ہوں، راجپوت یا گوجر، رفتہ رفتہ سب مسلمان ہو گئے ، سکھ مذہب نے کچھ زیادہ ترقی نہیں، کی اس لیے زیادہ تر یہ مسلمانوں ہی کا علاقہ ہے .

اگرچہ سکھ مذہب یہاں کچھ زیادہ نہیں پھیلا، تاہم جب احمد شاہ دُرّانی وسط پنجاب کو چھوڑ کر چلا گیا تو سکھوں نے گجرات کے علاقے پر قبضہ کر لیا ۔ بھنگی مسل نے دریاے جہلم تک اپنا قبضہ جما لیا اور ۱۷۶۸ء میں تو وہ آگے بڑھ کر راولپنڈی تک پہنچ گئے تھے ۔ بھنگی مسل کے قائم کردہ مقامی علاقے کو رنجیت سنگھ نے بہت جلد اپنے علاقے میں شامل کر لیا ۔ اس کی موت کے بعد گجرات کا علاقہ ۱۸۴۹ء تک برابر سکھ حکومت میں شامل رہا ۔ اس وقت یہاں نہایت خونریز لڑائی شروع ہو گئی جسے دوسری سکھ جنگ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سعد اللہ پور ، چلیانوالہ اور گجرات کی لڑائیاں اسی ضلع کی حدود میں ہوئیں اور جنرل گف Gough کو جو کامیابی مؤخرالذّکر مقام پر ہوئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارا پنجاب برٹش انڈیا میں مدغم کر لیا گیا ۔ پاکستان کے قیام کے وقت اس کو مغربی پنجاب کی حدود میں شامل کیا گیا ۔

شہر گجرات جس کے قریب یہ جنگ ہوئی تھی، اب ضلع کا صدر مقام ہے، اس کی آبادی ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۴۶۹۷۱ نفوس پر مشتمل ہے ۔ یہ شہر کوفت گری damascended work کی صنعت کے لیے مشہور ہے اور یہاں گلی اور روغنی یا چینی کے برتنوں کا کاروبار بھی ہوتا ہے ۔ یہاں طلبہ

www.besturdubooks.wordpress.com

اور طالبات کے کالج ہیں اور صوبائی سول سروس کے امیدواروں کو یہاں تربیت دی جاتی ہے۔ گجرات شہر میں حضرت شاہ دولا کا مزار ہے جو اپنے نیم دیوانہ درویشوں (جنھیں شاہ دولا کے چوہے کہتے ہیں) کے لیے مشہور ہے، جن کے سر بےحد چھوٹے ہوتے ہیں۔

[تقسیم ہند سے پہلے گجرات فرنیچر کی صنعت کے لیے بہت مشہور تھا۔ جس میں میزیں اور آرام کرسیاں خاص طور پر بہت پسند کی جاتی تھیں۔ Captain Daves نے لکھا تھا کہ یہاں کا فرنیچر بالخصوص کرسیاں پنجاب بھر میں منگوائی جاتی ہیں۔ شیشم کے بنے ہوئے پہیے وغیرہ یہاں خوب بنتے ہیں جو دوسرے شہروں میں منگوائے جاتے ہیں۔ گجرات کے قصبوں میں دروازوں اور کارنسوں پر کھدائی کا کام نہایت عمدہ ہوتا ہے (پرانی طرز کے مکانوں میں اس کام کی مہارت کے نمونے اب بھی کہیں کہیں دیکھنے میں آتے ہیں) (دیکھیے *Punjab District Gazetteer*، جلد ۲۵ اے، لاہور ۱۹۲۱ء، ص ۱۰۴، ۱۰۵)۔ پیتل کے برتن بھی یہاں بہت عمدہ بنتے ہیں۔ ضلع گجرات کے شہر جلال پور جٹاں میں شالیں بہت اچھی بنتی ہیں، جو پاکستان بھر میں پسند کی جاتی ہیں۔ سوہنی مہینوال کا قصۂ عشق بھی سر زمین گجرات سے متعلق ہے، جسے متعدد شعرا نے نظم کیا جن میں ہاشم شاہ اور احمد یار خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مشہور شاعر غنیمت (م ۱۶۸۸ء) گجرات کے قصبۂ کنجاہ کا رہنے والا تھا۔ مثنوی نیرنگ عشق اس کی بہت مقبول یادگار ہے۔ اس مثنوی کے علاوہ وہ صاحب دیوان بھی تھا جو غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے]۔

مآخذ: (۱) V. A. Smith: *Early Hist. of India*، طبع دوم، آکسفرڈ ۱۹۰۸ء، ص ۵۹ تا ۶۲؛ (۲) گزیٹیر ضلع گجرات، لاہور ۱۹۲۱ء؛ (۳) Ibbetson: *Outlines of the Punjab Ethnography*، کلکتہ ۱۸۸۳ء؛ (۴) Cunningham: *Hist. of the Sikhs*، لندن ۱۸۴۹ء۔

(M. LONGWORTH DAMES [و ادارہ])

تعلیقہ: ضلع گجرات میں سے شاہراہ اعظم ⊗ گزرتی ہے جس کی وجہ سے آج کل (۱۹۷۸ء) لاہور، راولپنڈی اور پشاور تک لاری کے ذریعے سفر بڑا آسان ہے۔ ریلوے کی لائن بھی اس میں سے گزرتی ہے اور لالہ موسیٰ جنکشن سے برانچ لائن ملکوال جاتی ہے، جہاں سے ادھر خوشاب میانوالی اور اس سے نیچے ایک طرف سرگودہ کو ریل گاڑیاں جاتی ہیں۔ گجرات کے لوگ ذہین اور چاق چوبند ہوتے ہیں۔ جاٹوں کی مختلف اقوام کے علاوہ یہاں زیادہ تر گوجر اور اعوان لوگ آباد ہیں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع کی آبادی ۱۳۲۶۰۱۲ تھی۔ فی مربع میل اوسط آبادی ۵۹۱ تھی اور اس لحاظ سے پاکستان میں اس کا ساتواں مقام تھا۔ تقسیم ملک کے بعد شہری آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مشہور قصبوں کی بھی خاصی تعداد ہے مگر بڑا شہر گجرات ہے جو ضلع کا صدر مقام ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں اس کی آبادی ۵۸۷۲۱ تھی۔ گجرات شہر میں متعدد بنک ہیں، بجلی کے پنکھے بنانے کے کئی کارخانے ہیں، چمڑا رنگنے کا ایک کارخانہ ہے، چینی کے عمدہ قسم کے ظروف بکثرت بنتے ہیں۔ صنعتی اور تجارتی لحاظ سے شہر کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ زنانہ اور مردانہ تعلیمی درسگاہیں ہیں۔ ایک صنعتی سکول بھی ہے۔ قصبۂ شادیوال میں کولمبو پلان کے تحت ۱۳۵۰۰ کلوواٹ بجلی تیار ہوتی ہے، جس سے ضلع کی صنعتی پیداوار بڑھ گئی ہے (عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا)۔

[ادارہ]

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

* **گجرات:** (بھارت) یہ لفظ اپنے وسیع معنوں میں اس سارے ملک یا علاقے کے لیے استعمال ہوتا ہے جہاں گجراتی زبان بولی جاتی ہے، محدود معنوں میں جو صحیح بھی ہیں، یہ نام اس وسطی میدان سے منسوب ہے جو دریائے نربدا کے شمال میں خلیج کچھ اور کاٹھیاواڑ کے مشرق میں واقع ہے۔

گجرات کے میدان کے شمال میں صحرائے مار واڑ ہے اور مشرق میں ان بلوری پہاڑیوں کا سلسلہ ہے جو کوہ آبو کے جنوب مشرق سے شروع ہو کر وندھیاچل کے مغربی بڑھے ہوئے حصوں سے جا ملتی ہیں۔ وسطی علاقے میں رسوبی زمینیں ابھی حال ہی میں بنی ہیں اور یہ علاقہ ہندوستان میں سب سے زیادہ زرخیز علاقوں میں سے ایک ہے۔ یہاں کی خاص زراعتی پیداوار کپاس ہے۔

جب ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار تھا تو علاقۂ گجرات میں صرف وہی علاقہ شامل نہ تھا جسے اس زمانے میں سورٹھ کہتے تھے، بلکہ سورت تک کا سارا ضلع اسی میں شامل تھا اور جنوب کی جانب بمبئی بھی اسی میں تھا۔ مشرق میں ایک حصہ خاندیس اور مالوے کا، اور راجپوتانے کا جنوب مغربی گوشہ۔ انہل واڑا کے گرد شمال میں شامل تھا۔ مسلمانوں کو اس علاقے کا علم اس وقت ہوا جب ۱۰۳۴ء میں سلطان محمود غزنوی ملتان سے انہل واڑا پہنچا اور وہاں جا کر سوناتھ کے مشہور مندر کو جو سورٹھ کے جنوب مشرق میں ساحل سمندر پر واقع تھا، مسمار کیا۔ ۱۱۷۸ء میں شہاب الدین کو انہل واڑا میں زک اٹھانا پڑی لیکن ۱۶ سال کے بعد دہلی کے نائب السلطنت قطب الدین ایبک نے اس ہزیمت کا بدلہ لیا۔ اس لیے پوری ایک صدی کے بعد الغ خان نے اس سر زمین پر قبضہ کر لیا۔ یہ شخص سلطان علاءالدین خلجی کا ایک سپہ سالار تھا۔ ۱۳۴۷ اور ۱۳۵۱ء کے درمیانی عرصے میں سلطان محمد تغلق نے سندھ سے گجرات کے علاقے پر کئی یلغاریں کیں اور آخر الامر وہیں فوت بھی ہو گیا۔ اس کے جانشین سلطان فیروز شاہ نے اس ملک میں اپنا اقتدار قائم کیا، جو اس زمانے سے برابر مسلمان والیوں کے ماتحت رہا۔ ان حکمرانوں میں سے ایک کا نام ظفر خان تھا جو گجرات میں خودمختار حکمران بن گیا اور جس نے مظفر خان کا لقب اختیار کیا۔ یہ اس وقت ہوا جب دہلی کی مرکزی حکومت کو تیمور نے کچل کر رکھ دیا تھا۔ یہ حکمران ایک سپہ سالار تھا۔ اس نے اپنے عہد میں سومنات کو تیسری مرتبہ تباہ کیا اور ایدر، دھار اور مانڈو کو بھی مطیع و منقاد کر لیا۔ اس نے شاہ دہلی کو بھی جونپور کے ابراہیم شرقی کے حملے سے بچایا۔ اس کا پوتا احمد اوّل اس کا جانشین ہوا جس نے ۱۴۱۳ء میں احمد آباد بسایا۔ ان حکمرانوں نے مختلف مواقع پر چمپانیر، جونا گڑھ، ایدر، چتوڑ اور کچھ پر حملے کیے اور اپنی طاقت بہت کچھ بڑھالی لیکن ان کے خاندان کے زوال کے قریب انہیں ترکوں اور پرتگیزوں نے بے حد تنگ کیا۔ ۱۵۷۳ تا ۱۵۷۵ء میں شہنشاہ اکبر نے اس ملک پر حملہ کیا اور وہ بنفس نفیس احمد آباد، بڑودہ کھنبایت (Cambay) اور سورت تک آیا۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر مرہٹوں کے عروج کے زمانے تک یہ ملک شاہان دہلی کے مامور کردہ والیوں کے زیرنگین رہا۔ اس کے بعد انگریز آ گئے۔ انہوں نے ملک کے اس حصے میں مسلمانوں کے اقتدار کو بالکل ختم کر دیا۔ اس حصۂ ملک کا مالی بندوبست مشہور و معروف وزیر مالیات ٹوڈرمل نے کیا تھا۔ اس علاقے کے مشہور ترین والیوں میں سے یہ تھے: مرزا عزیز کوکلتاش جو اکبر کا دودھ شریک بھائی تھا؛ مرزا خان جو بعد میں خان خاناں کے جلیل القدر خطاب سے سرفراز ہوا؛ شہزادۂ خرم جو بعد میں شاہجہان کے لقب سے بادشاہ ہوا

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۱۶۱۸ تا ۱۶۲۲ء یہاں کا حکمران رہا۔ شہزادۂ اورنگ زیب ۱۶۴۳ء میں یہاں نائب السلطنت تھا اور اس کے بھائی داراشکوہ نے ۱۶۴۸ تا ۱۶۵۲ء یہاں حکومت کی۔ اس کے بعد مراد شاہ ۱۶۵۴ تا ۱۶۵۷ء اس کا حاکم رہا۔ ۱۶۵۹ء سے لے کر ۱۶۶۲ء تک مہاراجا جسونت سنگھ والی جودھ پور یہاں گورنر رہا۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں مرہٹے روز بروز زیادہ باغی ہوتے چلے گئے اور اس کی وجہ سے حکومت کا زور دن بدن گھٹتا چلا گیا اور ملک میں انتشار پیدا ہو گیا۔ ملک عنبر نے ایک مرتبہ سورت کو تاخت و تاراج کیا اور سیوا جی نے دو مرتبہ۔ مسلمانوں نے پانی پت کی جنگ ۱۷۶۱ء کے بعد ایک مرتبہ احمد آباد پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے۔ اتنے میں گائیکواڑ نے پیشوا سے الگ ہو کر انگریزوں سے شرائط طے کر لیں اور انگریزوں نے ۱۸۱۸ء میں علاقۂ گجرات کے اصلی بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔

مآخذ : (۱) سکندر بن محمّد : مرآت سکندری، طبع بمبئی ۱۸۵۱ء؛ (۲) علی محمد خان : مرآت احمدی؛ (۳) میر ابو تراب ولی : تاریخ، طبع Dénison Ross، ۱۹۰۹ء؛ (۴) محمد بن عمر الغ خانی، ظفر الوالہ بمظفّر وآلہ، طبع Denison Ross، ۱۹۱۰ء؛ (۵) Forbes : *Rás Málá Hindoo Annals of the Province of Goozerat*، ۱۸۰۶ء؛ (۶) Elliot : *Historians of India*، (۷) Bailey : *History of Gujarat*؛ (۸) بمبئی گزیٹیر (*Hist. of Gujarat*، ج ۱، حصہ ۱)۔

(H. C. FANSHAWE)

⊗ **تعلیقہ** : قدیم الایام سے برصغیر پاک و ہند کے ساتھ عربوں کے تعلقات چلے آتے ہیں اور اس کی وجہ بحیرۂ عرب اور خلیج فارس کے ساحل کے ساتھ ساتھ عربوں کی جہاز رانی ہے۔ سید سلیمان ندوی اپنی تصنیف عرب و ہند کے تعلقات میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع یازدھم، مادّۂ سنسکرت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مہاراجا اشوک نے اپنے کتبوں میں جس خروشتی رسم الخط کو استعمال کیا داہنی جانب سے لکھا جاتا تھا اور بظاہر کسی سامی زبان سے ماخوذ تھا۔ اس قسم کے کتبات گجرات میں بھی تھے (عرب و ہند کے تعلقات، الٰہ آباد ۱۹۳۰ء، ص ۸ تا ۱۰)۔ سید صاحب موصوف نے انھیں قدیمی تعلقات کی بنا پر قرآن مجید میں تین خالص ہندوستانی الاصل الفاظ ۔۔۔ مسک، زنجبیل، کافور کی نشاندھی کی ہے (کتاب مذکور، ص ۷۲)۔ یہ لفظ عربوں کی ہندوستان سے تجارت کی قدامت پر دلالت کرتے ہیں۔ شروع ہی سے عرب تاجر گجرات میں آتے رہے تھے۔ مؤرخ مسعودی (مروج الذھب، جلد اوّل، طبع لائیڈن، ص ۲۰۴) لکھتا ہے کہ جب وہ ۳۰۳ھ میں گجرات کی بندرگاہ کھمبایت [رک بآں] میں آیا تو یہاں کا راجا ہندو تھا اور مسلمانوں سے مذہبی معاملات پر بحث و مناظرہ کیا کرتا تھا۔ محمد عوفی بھی اپنی جوامع الحکایات و لوامع الروایات میں ایک ہندو راجا کا ذکر کرتا ہے جس نے کھمبایت کی جامع مسجد میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے سلسلے میں حق رسی سے کام لیا تھا (دیکھیے جوامع کا انگریزی ترجمہ۔ مطبوعۂ لنڈن ۱۹۲۹ء، ص ۱۸)۔ سندھ پر عربوں کی حکومت تھی تو منصورہ سے کھمبایت تک آمد و رفت عام تھی۔ اس لیے سندھ اور گجرات سے مسلمانوں کا خاص تعلق رہا ہے۔ گجرات اور سندھ کا دنیا میں سب سے پہلا نقشہ ابن حوقل بغدادی نے ۳۴۳ھ / ۹۴۳ء میں تیار کیا تھا (نقشے کے لیے دیکھیے عرب و ہند کے تعلقات، فہرست مضامین ص ۲۶ کے بعد)۔ مسلمانوں نے مسلسل صدیوں تک گجرات پر حکومت بھی کی۔ اس لیے عربی اور فارسی کے بہت سے الفاظ گجراتی زبان میں مخلوط ہو گئے، جنھیں وہاں کے ادیب اور

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

شاعر آج تک استعمال کرتے ہیں (دیکھیے ابو ظفر ندوی : تاریخ گجرات، طبع ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۳۳ تا ۳۵) ۔ گجرات کے لوگ اردو بھی بولتے ہیں ۔ تقسیم ملک کے بعد گجرات بھارت میں شامل ہوا البتہ گجرات کاٹھیاواڑ کی ریاستوں جونا گڑھ، مانودر اور مانگرول نے پاکستان [رک ہاں] کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا تھا مگر بوجوہ اسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا ۔ گجرات کی آب و ہوا صحت افزا ہے۔ اوسطاً تقریباً ۳۰ انچ بارش ہوتی ہے ۔ یہاں گیہوں، باجرا، کپاس، چاول، آم اور امرود کی زیادہ پیداوار ہوتی ہے ۔ عقیق پایا جاتا ہے جو کھمبایت میں آ کر جلا پاتا ہے ۔

آغاز اسلام کے وقت سے مسلمان گجرات کاٹھیاواڑ میں عرب تاجروں کی قدیمی روش کے مطابق بسلسلۂ تجارت آ گئے تھے ۔ محمد بن قاسم کی آمد سے سندھ میں عربوں کی حکومت قائم ہو گئی اور پھر کوئی تین سو سال بعد محمود غزنوی کی فتوحات کا دور شروع ہوا اور وہ گجرات کاٹھیاواڑ تک پہنچا ۔ ۱۲۹۹ء میں علاءالدین خلجی نے یہاں مسلمانوں کے اقتدار کا آغاز کیا اور ۱۴۰۷ء تک یہاں خلجی اور تغلق گورنر حکومت کرتے رہے جن کا تقرر دہلی سے ہوتا تھا ۔ اس کے بعد ۱۵۷۳ء تک ان اطراف میں سلاطین گجرات کی حکومت رہی جو اصلاً گوجر [رک ہاں] تھے اور مقامی گوجر آبادی سے انہیں نسلی مناسبت تھی ۔ ۱۵۷۳ء میں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کی فتح گجرات کے بعد ۱۷۵۸ء تک یہاں مغل صوبیدار آتے رہے ۔ اس سال مرہٹوں نے مومن خان صوبیدار کو شکست دے کر احمد آباد پر قبضہ کر لیا اور یہاں مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا ۔ اگرچہ آغاز اسلام سے مسلمان یہاں پہنچ چکے تھے ، لیکن ان کے اقتدار کا زمانہ کوئی چار سو ساٹھ سال بنتا ہے ۔ ان صدیوں میں مسلمانوں نے اپنی طرز کی تعمیرات وغیرہ سے گجرات کاٹھیاواڑ کا عام منظر بالکل تبدیل کر کے رکھ دیا ۔ تہذیب و تمدن میں بنیادی قسم کے مستقل اثرات چھوڑے اور پرانی گجراتی زبان کی جگہ رائج الوقت گجراتی [رک ہاں] کو فروغ دیا ۔ ان باتوں کو ذرا تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہے ۔ یادگاروں سے ایک قوم کے تمدن کا اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ اس لیے پہلے انہیں کا ذکر کیا جائے گا ۔

مسلمان جہاں پہنچے وہاں مساجد اور مقابر کی تعمیر شروع ہو گئی ۔ ابو ظفر ندوی تاریخ گجرات میں لکھتے ہیں کہ ۷۰۷ء کے قریب خلیفہ منصور عباسی کے زمانے میں سندھ کے گورنر ہشام بن عمر تغلبی نے گندھار (کاٹھیاواڑ) پر حملہ کیا اور بدھ مدرسے کی جگہ مسجد تعمیر کی ۔ یہ غالباً گجرات کی پہلی مسجد تھی جو عربوں نے تعمیر کرائی ۔ ۹۱۵ء میں ابو الحسن علی مسعودی گجرات میں آیا ۔ راجا ولہب رائے کی حکومت تھی جس کا دارالخلافہ مانکھیر تھا ۔ وہ لکھتا ہے کہ اس راجا کے ملک میں مسلمانوں کی مسجدیں ہیں ۔ ۹۵۱ء میں ابو اسحٰق ابراہیم اصطخری ہند پہنچا ۔ وہ اس راجا کے شہروں میں جامع مسجدوں کا ذکر کرتا ہے اور تاسہل، سنان، صیمور اور کنبایت [رک ہاں] کا خاص طور پر نام لیتا ہے ۔ ابن حوقل بغدادی ۹۷۷ء میں آیا ۔ وہ بھی اصطخری کے بیان کی تائید کرتا ہے ۔ بھروچ میں ایک وسیع اور عظیم جامع مسجد سنگین ۴۵۸ھ/۱۰۶۵ء میں تعمیر ہوئی جب کہ یہاں کوئی اسلامی سلطنت نہ تھی ۔ ۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء میں اس شہر میں ایک مدرسہ قائم ہو چکا تھا جو بعد میں مولانا اسحٰق کے مدرسے کے نام سے مشہور ہوا اور کوتی ۱۹۲۰ء میں آ کر ختم ہوا ۔ سومنات، یعنی دیوپٹن میں منگرولی شاہ کا مقبرہ ہے جہاں دھوم دھام سے عرس منایا جاتا ہے ۔ یہ بزرگ اصلاً

www.besturdubooks.wordpress.com

عراقی تھے ۔ منگلور آئے اور وہاں سے سومنات کے مسلمانوں تاجروں کی آبادی میں آ کر رہنے لگے ۔ کہتے ہیں انھوں نے محمود غزنوی کو خط لکھا تھا کہ سومنات آ کر مسلمانوں کو مختلف مصائب سے نجات دلائے ۔ منگرولی شاہ کے مقبرے میں کئی قبریں ہیں ۔ سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں بھی گجرات پر حملہ ہوا اور ایک مسجد کی بنا قائم ہوئی ۔ جوناگڑھ میں مائی گھڑونچی کی مسجد ۶۸۵ھ / ۱۲۸۶ء میں تعمیر ہوئی تھی جو اب شکستہ حالت میں ہے ۔ ان کوائف سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت شروع ہونے سے پہلے مسجدوں، مدرسوں اور مقبروں کی تعمیر کا آغاز گجرات کاٹھیاواڑ میں ہو چکا تھا اور یہاں کے معاشرے میں مسلمانوں کے تمدنی اور تہذیبی اثرات پھیلنے لگ گئے تھے ۔

جمادی الاولیٰ ۶۹۹ھ / فروری ۱۲۹۹ء میں علاءالدین خلجی نے گجرات فتح کیا اور سلطان نے اپنی طرف سے ایک ناظم گجرات مقرر کیا، جو ۱۳۰۰ سے ۱۳۱۶ء تک وہاں رہا ۔ اس وقت سے اس علاقے میں دہلی کا اقتدار شروع ہو گیا ۔ بعد میں خلجیوں اور تغلقوں کے دور میں لگاتار دہلی سے ناظموں کا اسی طرح تقرر ہوتا رہا ۔ نئی عمارات تعمیر ہوئیں اور جس جدید فن تعمیر کا یہاں ارتقا ہوا وہ ہندوستان کے فنون لطیفہ کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ گجرات کا علاقہ جب سلطنت دہلی میں شامل ہوا تو علاءالدین خلجی کے ماتحت حسنِ اتفاق سے دہلی کا فن تعمیر اپنے کمال کا اظہار کر چکا تھا ۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ اسی سلطان نے تعمیر کرائی تھی ۔ دہلی سے جو معمار گجرات میں آئے انھوں نے دیکھا کہ ایک عجیب و غریب قسم کا حسین و جمیل فن تعمیر یہاں رائج ہے جس میں بڑی توانائی پائی جاتی ہے ۔ جن ہندو معماروں نے کسی زمانے میں سومنات اور کوہ آبو وغیرہ کے مندر بنائے تھے ان کی اولاد اس فن میں ان دنوں کم درجے کی مہارت نہیں رکھتی تھی ۔ فاتحین نے ان ہندو معماروں کو بھی اپنے شاہی معماروں کے ساتھ نئی عمارتیں بنانے کا کام سپرد کیا ۔ اس طرح اسلامی روایات مقامی فن تعمیر میں شامل ہو گئیں ۔ اس لیے خلجیوں کے فن تعمیر میں جو آہنگ و تناسب اور ذوق کا کمال پایا جاتا تھا وہ شروع ہی میں یہاں کے فنی تصورات میں بنیادی حیثیت اختیار کر گیا اور فن تعمیر میں ایک جدید مکتب کا آغاز ہوا جو بعد میں سلاطین گجرات کے زمانے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ۔ خلجی اور تغلق سلاطین کے عہد میں گجرات کے اس جدید فن تعمیر میں جو تبدیلی رونما ہوئی وہ اس عہد کے آثار سے نمایاں ہے (*A History of Gujrat* : Commissariat، ج ۱، انڈیا ۱۹۳۸ء، ص ۶۲، ۶۳)۔

الپ خان گورنر گجرات (۱۳۰۰–۱۳۱۶ء) نے انہل واڑا پٹن کے قدیمی شہر میں سنگ مرمر کی عالی شان خوشنما اور وسیع جامع مسجد بنائی جس کے ستونوں کی اتنی کثرت تھی کہ شمار نہیں ہو سکتے تھے ۔ اس گورنر نے گڑی کے قلعے کو اہتمام سے تعمیر کرایا اور اس کے عہد میں پٹن میں سرور نامی ایک امیر نے ایک تالاب بنوایا جو اب بھی اس کے نام سے مشہور ہے (ابوظفر ندوی : تاریخ گجرات دہلی ۱۹۴۸ء، ص ۳۳۶، ۳۳۸، ۳۴۰) ۔ پتلاد ضلع بڑودہ نزد ٹھنبایت میں اس گورنر کے زمانے میں ایک مسجد تعمیر ہوئی جو برباد ہوئی تو اس کا کتبہ جس پر رمضان ۷۱۳ھ/دسمبر ۱۳۱۳ء کی تاریخ کندہ ہے، اس شہر میں واقع بابا ارجن شاہ کے مقبرے میں منتقل ہو گیا ۔ شاہ صاحب کی تاریخ وفات رجب ۶۳۳ھ/مارچ ۱۲۳۶ء ہے ۔ مقبرے کا کتبہ سنگ مرمر کی سل پر خوبصورت خط نسخ میں لکھی ہوئی عربی میں موجود ہے ۔ بابا ارجن شاہ کے مقبرے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

میں ۷۲۳ھ / ۱۳۲۳ء کا فارسی اور سنسکرت دو زبانوں میں کتبہ ہے جو پہلے تغلق سلطان کے صوبۂ گجرات پر تسلط کی یادگار ہے۔ اس کتبے سے پتا چلتا ہے کہ مزار کے لیے کنویں کے ساتھ جاگیر عطا ہوئی تھی۔ پتلاد کے ان کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں گجرات میں عربی اور فارسی کا رواج ہو چکا تھا وہاں سنسکرت بھی استعمال ہو رہی تھی۔

کھنبایت [رک بآں] میں علاءالدین خلجی کے عہد کا امیر اختیار الدولہ ''بحربک'' شہید کے سنگ مرمر کے تعویذ پر عربی زبان میں ۷۱۶ھ / ۱۳۱۶ء کا خط نسخ میں کتبہ ہے۔ کھنبایت کی جامع مسجد سلطان محمد بن تغلق کے عہد کے پہلے سال، یعنی ۱۳۲۵ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ یہ اپنے عمدہ تناسب، وسیع داغ بیل اور کھلے پیش منظر کے لحاظ سے ممتاز ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کے اثرات گجراتی اسلوب تعمیر پر مرتب ہوے ہیں۔ مسجد کے تین اطراف میں ستونوں والی غلام گردشیں ہیں۔ درمیانی محراب کے اوپر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ اس کا گنبد کلان منقش ہے۔ صحن میں سامنے وضو کے لیے بڑی آراستہ مسقف جگہ ہے۔ جامع مسجد کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا دو سقفی عمر بن احمد الکزیرونی (م ۱۳۳۳ء) کا مقبرہ ہے جس کا گنبد گر چکا ہے۔ نیچے دو خوبصورت قبریں ہیں جن پر آیات قرآنی اور کلمۂ طیبہ کندہ ہیں۔ کھنبایت کی عیدگاہ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ۱۳۸۱ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس کا کتبہ سفید سنگ مرمر پر ہے۔ لوگ اب بھی یہاں عید کے روز جمع ہوتے ہیں۔ ابن بطوطہ یہاں ۱۳۴۲ء میں آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ کھنبایت کے تمام دولت مند سوداگروں کے گھروں کے ساتھ مساجد ہیں۔ اس نے بعض سوداگروں کے نام بھی لکھے ہیں۔ وہ کاٹھیاواڑ کی بندرگاہ گوگھا میں بھی گیا اور ایک پرانی مسجد میں نماز ادا کی۔ اس نے یہاں حیدری فقیروں کا ایک گروہ دیکھا۔

بھڑوچ کی جامع مسجد سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی۔ چھت پر منبت کاری کی گئی ہے اور قسم قسم کے شاندار نقش و نگار ہیں۔ تمام برصغیر میں اس سے بہتر مزین سقف نہیں ملتی۔ درمیانی محراب کے اوپر آیات و احادیث درج ہیں۔ یہ کھنبایت کی جامع مسجد سے چھوٹی ہے، لیکن اسلامی ہندی فن تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ یہاں کی عیدگاہ ۱۳۲۶ء میں تعمیر ہوئی تھی اور سب سے پرانے اسلامی آثار قدیمہ میں سے ایک ہے۔ گجرات میں اپنی قسم کی یہ سب سے نفیس عمارت ہے۔ منبر بلند ہے اور دروازہ بڑا دلکش۔ بھڑوچ کی عیدگاہ اور کھنبایت کی جامع مسجد تعمیر کرانے والا ایک ہی شخص ملک الشرق فخر الدولہ والدین محمد بوتماری تھا۔

دھولکا نزد احمد آباد میں بھی اس عہد کی بڑی خوبصورت مسجد ہے جو ۱۳۳۳ء میں تعمیر ہوئی تھی اور ہلال خان قاضی کی مسجد کہلاتی ہے۔ باقی گنبدوں کے مقابلے میں اس کا درمیانی گنبد سات فٹ زیادہ بلند ہے۔ اس کے نیچے چھوٹے چھوٹے ستون بنائے گئے ہیں جن کی درمیانی جگہوں کو سنگتراشی کر کے آرائشی کام سے پُر کیا گیا ہے۔ مسجد کے ایک طرف عورتوں کے لیے پردے کا انتظام ہے۔ درمیانی دیوار مشبّک ہے۔ اس کی اپنی محراب اور الگ دروازہ ہے۔ اس کی سطح باقی مسجد سے تقریباً تین فٹ بلند ہے۔ مسجد کی تمام محرابیں سنگ مرمر کی ہیں اور سنگتراشی کا کام بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ چھت کے تختوں کی تراش خراش بھی نفاست سے کی گئی ہے۔ مسجد کا منبر سنگ مرمر کا ہے جس پر اہرام نما سقف ہے۔ منبر کی سیڑھیوں کے پہلوؤں پر مربع تختے ہیں جن پر ہندسی اشکال بنی ہوئی ہیں۔ یہ برصغیر کے انتہائی خوبصورت

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

منبروں میں سے ایک ہے ۔ مسجد کے مینار نہیں ۔ ان کے بجائے درمیانی محراب کے دونوں طرف دو چھوٹے چھوٹے برج ہیں ۔ مشرق کی طرف سے صحن میں داخل ہونے کے لیے ۳۲ ستونوں پر قائم خوبصورت غلام گردش ہے ۔ مسجد سے ملحقہ یہ انتہائی فنکارانہ تعمیر ہے ۔ مسجد کا کتبہ درمیانی محراب کے قریب ہے ۔ اس کے معمار کا نام عبدالکریم لطیف تھا ۔ دھولکا کی ایک مسجد کا نام تنکا مسجد ہے، جو فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ۱۳۶۱ء میں تعمیر ہوئی تھی ۔ اس میں زینت و آرائش کا کام اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا پندرھویں صدی عیسوی میں احمد شاہی سلاطین کی بنوائی ہوئی مسجد میں ہے ۔ تنکا مسجد میں عربی اور فارسی میں کچھ کتبے موجود ہیں ۔

سنگلور (سورتھی) میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ایک پر شکوہ جامع مسجد ۱۳۸۳ - ۱۳۸۴ء میں بنی تھی ۔ یہ کاٹھیاواڑ کی نفیس ترین مسجد شمار ہوتی ہے ۔ میناروں کے بغیر یہ ایک وسیع عمارت ہے ۔ صحن کے ارد گرد غلام گردش ہے اور درمیان میں سیڑھیوں والی باولی ہے ۔ شہر کے باہر مسجد رحمت ہے جو ۱۳۸۲ - ۱۳۸۳ء میں تعمیر ہوئی تھی ۔ ۱۳۸۶ء میں بننے والی ایک باولی مسجد بھی ہے ۔ ۱۳۹۵ء میں یہاں حصن سنگین حصار، بھی تعمیر ہوا تھا ۔ ۱۳۹۷ - ۱۳۹۸ء میں شہر کے ارد گرد دیوار بنائی گئی تھی جس کا کتبہ موجود ہے ۔ یہاں سیدنا سکندر (م ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء) کا مزار ہے جو اوچ (بہاولپور) کے مخدوم جہانیاں [رک بآں] کے مرید تھے ۔ ان کے تبرکات اب بھی موجود ہیں جنھیں وہاں کے مسلمان مقدس سمجھتے ہیں ۔ سید صاحب فیروز شاہ تغلق کی افواج کے ساتھ کاٹھیاواڑ آئے تھے ۔ ایک گاؤں ان کی خانقاہ کے لیے عطا ہوا جس کا نام مخدوم پور پڑ گیا ۔ سادات منگلور ان کی اولاد میں سے ہیں ۔ سید سکندر کی زندگی میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت منگلور تشریف لائے تھے اور ایک مسجد کی بنیاد رکھی گئی تھی (ابو ظفر ندوی : تاریخ گجرات، ص ۴۱۷، ۴۱۹، ۴۲۵) ۔ موضع مالن علاقۂ پالن پور میں محمد تغلق کے عہد میں سنگ سفید سے ایک جامع مسجد تیار ہوئی تھی ۔

مندرجۂ بالا کوائف سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ خلجیوں اور تغلقوں کے زمانے میں گجرات کے شہروں میں مساجد کے حسن میں کیسے جمالیاتی عنصر کا اضافہ ہوا تھا، کس طرح نئے کنویں بننے لگے تھے، ملک کی مدنی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہو رہے تھے اور وہاں کی زبان کس قسم کے نئے ذخیرۂ الفاظ کو اپنے اندر جگہ دے رہی تھی ۔ اب ہم سلاطین گجرات کے زمانے کے آثار کا مطالعہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ انھوں نے اس ملک کو آراستہ کرنے کے لیے کیا کچھ کیا ۔

۱۴۰۷ء سے سلاطین گجرات کا زمانہ شروع ہوتا ہے جو ۱۵۷۳ء تک رہا ۔ گجرات کا پہلا سلطان مظفر شاہ تھا جو اگرچہ ۱۳۹۲ء سے یہاں بطور صوبیدار کام کر رہا تھا مگر اس نے اعلان آزادی ۱۴۰۷ء میں کیا اور اس طرح اس سنہری دور کا آغاز ہوا جو تاریخ گجرات میں ہمیشہ یادگار رہے گا ۔ یہ سلاطین نسلاً گوجر تھے ۔ سلطان کے والد نے محمد تغلق کے عہد میں اسلام قبول کیا تھا اور دہلی دربار میں وجیہ الملک کا خطاب پایا تھا ۔ اس لیے گجرات کے گوجر ان کی اپنی نسل کے لوگ تھے اور سلاطین اپنے آپ کو غیر ملکی تصور نہیں کرتے تھے ۔ انھوں نے اپنی عظمت کے ایسے نشانات باقی چھوڑے ہیں کہ پانچ صدیوں سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی آج اہل عالم انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں ۔ انھوں نے نئے شہر تعمیر کرائے، فصیلیں

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

بنوائیں، مضافاتی آبادیوں کا سلسلہ قائم کیا، حوض، باؤلیاں اور جھیلیں بنیں، محل تعمیر ہوے، عالیشان مسجدیں بنوائی گئیں، مقبرے بنوائے گئے اور فنِ تعمیر اپنے کمال کو پہنچا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مقبروں کی تعمیرات بھی فرح بخش تھیں۔ صرف دریا خان کے مقبرے واقع احمد آباد کی فضا غم انگیز ہے۔ ان تمام جدید کارناموں کی وجہ سے ملک بھر کے نقشے میں بڑی خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی۔ احمد شاہ اول کا عہد (۱۴۱۱–۱۴۴۲ء) اس لحاظ سے بڑی شہرت رکھتا ہے، لیکن محمود بیگڑے کا عہد (۱۴۵۸–۱۵۱۱ء) سنہری زمانہ کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کے بعد ہر قسم کی روایات تنزل پذیر ہو گئیں۔ بعد کے ایام میں یہاں عشرت گاہیں بنیں۔ ان میں جدت تو تھی، لیکن عہدِ عروج والی علوّشان مفقود تھی۔ اپنے مقام پر ان کا بھی ذکر کیا جائے گا۔

احمد نگر (موجودہ نام ہمّت نگر) میں احمد شاہ اول نے قلعہ تعمیر کرایا۔ اس شہر میں قاضی کی باؤلی تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں دو کتبے ہیں۔ ۱۴۱۷ء کا عربی میں ہے اور ۱۵۲۲ء کا دیو ناگری میں۔ بعد میں اساروا اور ادلج میں بھی باولیاں بنیں، لیکن ان کا نقشہ مختلف تھا۔ احمد نگر میں نولکھ کنڈ کی عمارت بڑی دلچسپ ہے۔ یہ دریاے ہتھ منی کے کنارے پر زیر زمین پتھر کا محل ہے جس کے درمیان پانی کا ایک گہرا تالابچہ ہے۔ محل کے دو طرف مسقّف رستے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسلامی دور میں قلعے کی خواتین ایک زیر زمین رستے کے ذریعے دریا کی طرف اس کنڈ میں جایا کرتی تھیں۔ گرمی کے موسم کے لیے یہ ایک ٹھنڈی جگہ تھی مگر اب کوئی نہیں جاتا۔ قلعے سے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو سلطان احمد شاہ کے بھائی یا بیٹے نے بنوائی تھی۔ فن مقامی احمد آبادی ہے، کھڑکیوں کے چوکھٹوں میں سنگتراشی سے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔

احمد آباد کا شہر سلطان احمد شاہ کی غیر فانی شہرت کا موجب ہے۔ انہل واڑا پٹن چھے صدیوں تک گجرات کا دارالحکومت رہا تھا۔ سلطان نے ۱۴۱۱ء میں اپنے مرشد شیخ احمد کھتوؒ کے کہنے پر دریاے سابرمتی کے مشرق میں اساول کے پرانے قصبے کے قریب احمد آباد تعمیر کرا کے اسے اپنا دارالحکومت بنایا۔ احمد نام والے چار پاکباز اور نیک سیرت اشخاص یعنی شیخ احمد کھتوؒ، سلطان احمد شاہ، قاضی احمد جدّ اور ملک احمد نے اس کی چار حدود قائم کیں۔ ۱۴۱۳ء میں یہاں بھدرا کا قلعہ تعمیر ہوا جس کے دو برج لنڈن ٹاور کی قسم کے ہیں۔ قلعہ مربع شکل کا ہے جس کے کئی دروازے ہیں۔ اس میں دو مسجدیں ہیں۔ ایک جنوب مغربی کونے میں ہے جو احمد شاہ نے بنوائی تھی۔ دوسری شمال مشرقی کونے میں سیدی سید کی خوبصورت مسجد ہے جو اکبر کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی۔ عہد عالمگیری کے صوبیدار محمد امین خان کا روضہ بھی قلعے کی چار دیواری کے اندر ہے۔ مغلیہ دور میں کابل اور قندھار کے بعد یہ سب سے مضبوط قلعہ شمار ہوتا تھا۔ محمود بیگڑے نے ۱۴۸۷ء میں شہر کے ارد گرد فصیل بنوائی جس کا محیط چھے میل ہے، ۱۸۹ برج ہیں اور چھے ہزار کنگرے۔ اس میں پختہ اینٹیں استعمال ہوئی ہیں اور اس کی تعمیرات مضبوطی اور بلندی کے لحاظ سے دہلی اور شاہجہان آباد کی عمارتوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ صدیاں بیت جانے کے باوجود اچھی حالت میں ہے۔ ابتدا میں اس کے بارہ دروازے تھے مگر اب زیادہ ہیں۔ تجارت کے لیے مانک چوک مشہور ہے۔ سلاطین اور ان کے امرا نے یہاں بڑے شاندار تعمیری آثار چھوڑے ہیں۔ ان کی وجہ سے سولھویں صدی عیسوی کے اختتام تک احمد آباد ہندوستان کے عظیم اور حسین ترین شہروں

www.besturdubooks.wordpress.com

میں شمار ہونے لگا۔ ہفت اقلیم مصنفہ ۱۵۹۳ء میں امین احمد رازی اس شہر کی صفائی، رونق، آثار کی نفاست، شہر کی عظمت اور گلیوں کی ترتیب اور کشادگی کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ علی محمد خان مصنف مرآۃ احمدی اسے زینت البلاد اور عروس مملکت کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ سلطان محمود دوم (۱۵۳۷ - ۱۵۵۴ء) نے بارہ کوس کے فاصلے پر اپنا دارالحکومت محمود آباد تعمیر کرایا۔ سڑک کے دو رویہ اس طرح آبادی تھی کہ معلوم ہوتا تھا دو نہیں ایک شہر ہے۔ آب و ہوا کی موزونیت کی وجہ سے سنہری اور ریشمی منسوجات مثلاً کمخواب، مخمل، زربفت وغیرہ تیار ہوتے تھے جو اپنے رنگ اور حسن کی وجہ سے ہندوستان بھر میں بے مثال تھے اور ایران، توران، روم اور شام کو بھیجے جاتے تھے۔ ابوالفضل بھی آئین اکبری میں اس کی خوشحالی کی تعریف کرتا ہے اور اس کی تین سو ساٹھ مضافی آبادیوں کا ذکر کرتا ہے جن میں سے چوراسی بڑی بارونق تھیں۔ اس نے شہر کی ایک ہزار مساجد بتائی ہیں جن کے مینار اور کتبے شاندار تھے۔ وہ کہتا ہے شہر کی زینت کا موجب بالخصوص اس کی مساجد ہیں۔ فرشتہ نے بھی کہا ہے کہ احمد آباد دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں سے ہے۔

احمد آباد کے آثار میں سے پہلے احمد شاہ اول کی مسجد بھدرا تعمیر شدہ ۱۴۱۴ء کا ذکر کیا جاتا ہے۔ عربی میں کتبہ مرکزی محراب کے اوپر ہے۔ ملوک خانہ جو اب زنانہ گیلری کہلاتا ہے ۲۰ ستونوں پر قائم ہے۔ اس کے مشرق اور جنوب میں مشبک پردے ہیں۔ ملوک خانہ میں احمد شاہ کی عبادت کے لیے عالیشان شامیانہ بنا ہوا ہے جس کے ستون آراستہ ہیں۔

شہر کی جامع مسجد ۱۴۲۴ء میں تعمیر ہوئی۔ یہ احمد آباد کی سب سے وسیع اور عظیم الشان عمارت ہے جو بارہ سال میں مکمل ہوئی تھی۔ "سہ دروازہ" کے قریب ہے۔ یہ برصغیر کی سب سے بڑی مساجد میں سے ہے۔ ماہر نقادوں کی رائے ہے کہ یہ مشرق کی ایک انتہائی خوبصورت عمارت ہے۔ اس کا منظر مرعوب کن ہے۔ کتبہ عربی زبان میں ہے جو سب سے بڑی مرکزی محراب میں موجود ہے۔ اس میں حروف کو دیدہ ریزی سے بڑی رعنائی کے ساتھ ایک دوسرے سے وابستہ کیا گیا ہے۔ ابتدا میں دو بلند مینار اس کی زینت کو دوبالا کرتے تھے جن کا تناسب اور ساتھ ہی نقش و نگار کا کام بڑا دلکش تھا۔ جون ۱۸۱۹ء کے زلزلے میں یہ مینار گر پڑے اور مسجد اپنی ایک نمایاں فنی خصوصیت سے محروم ہو گئی۔ ان کی چار چار منزلیں تھیں اور اگر ایک مینار میں جنبش نمودار ہوتی تھی تو درمیانی چھت کو متاثر کیے بغیر دوسرا بھی اسی طرح مرتعش ہو جاتا تھا۔ یہی صفت احمد آباد کی سیدی بصر کے میناروں میں بھی پائی جاتی تھی جس کی تصدیق ہندوستان کے محکمۂ آثار قدیمہ کی ۱۹۰۵ء کی ایک رپورٹ سے ہوتی ہے۔ یہ احمد آباد کی مساجد کا ایک محیر العقول وصف تھا۔

جامع مسجد کا صحن وسیع ہے۔ درمیان میں پانی کا حوض ہے۔ اس کے ارد گرد تین طرف مسقف غلام گردشیں ہیں پندرہ بڑے بڑے گنبد ہیں، دو سو ساٹھ خوبصورت مینار ہیں۔ مسجد کے سامنے کے حصے کی ترکیب اس قدر قابل تعریف، متنوع اور اپنے حصوں کی لحاظ سے ایسی متناسب ہے کہ اس کی وسعت تمام عمارت کے حسن اور اس کے تاثر میں اضافہ کرتی نظر آتی ہے۔ تمام عمارت نفیس بھربھرے پتھر کی بنی ہوئی ہے، فرش معمولی قسم کے سفید سنگ مرمر کا ہے۔ ایک کونے میں ملوک خانہ (شاہی گیلری) ہے جسے مشبک چلمن کے ذریعے علیحدہ کیا گیا ہے اور جہاں پہنچنے کے لیے علیحدہ

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

رستہ ہے۔

مانک چوک میں احمد شاہ کا مقبرہ: جامع مسجد کے مشرق میں ایک رواق کے ذریعے اس احاطے میں پہنچتے ہیں جہاں احمد شاہ کا مقبرہ ہے۔ روضہ گنبد والی ایک عظیم عمارت پر مشتمل ہے، جس کے درمیان میں ایک بڑا کمرہ ہے، کونوں میں چار مربع شکل کے کمرے ہیں، جن کے درمیان ستونوں والے عمیق برآمدے ہیں۔ بڑے کمرے کے وسط میں سلطان اعظم کی قبر ہے، جس کے پہلوؤں میں اس کے بیٹے محمد ثانی اور پوتے قطب الدین احمد شاہ ثانی کی قبریں ہیں اور تینوں خوبصورتی سے تراشیدہ سفید سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہیں۔ ساتھ والے کمروں میں جو قبریں ہیں، وہ بےشک و شبہہ شاہی خاندان کے افراد کی ہوں گی۔ مقبرے کے ارد گرد کی تمام زمین میں قبریں ہیں۔ احمد شاہ کے مقبرے کو ''بادشاہ کا حضیرہ'' کہا جاتا ہے۔ اغلباً اس کی تعمیر جامع مسجد کے بعد احمد شاہ نے خود کرائی تھی۔ اس کے مشرق میں ''رانی کا حضیرہ'' ہے جہاں اس خاندان کی بیگمات مدفون ہیں۔ سب سے اہم قبر بی بی مغلی کی ہے جو محمود بیگڑہ کی ماں تھی۔ سفید سنگ مرمر کی اس قبر کے ساتھ سیاہ سنگ مرمر کی مرثی بی بی کی قبر ہے جو بی بی مغلی کی بہن تھی۔ سیاہ قبر پر شروع میں سیپ کا جڑاؤ کام کیا گیا تھا۔ دونوں قبریں فن تعمیر کا خوبصورت نمونہ ہیں۔ ان کی جزئی تزئین بڑی عمدگی سے کی گئی ہے۔ دونوں بہنیں جام صاحب سندھ کی بیٹیاں تھیں۔

یہ عہد احمد شاہ اول کی مذہبی اور مقابر سے متعلق تعمیرات کا ذکر تھا۔ سلاطین اور ان کے جانشینوں کے محلات کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ اس عہد کی غیر مذہبی عمارات کی یادگار صرف تین دروازہ (سہ درہ) ہے جو جامع مسجد کی طرح شان اور تجمل رکھتا ہے۔ اس کے حسن کا باعث اس کے کامل درجے کے متناسب قوسی دروازے ہیں جن کے درمیان اعلیٰ درجے کے مزین پشتے ہیں۔ تین دروازہ کی موٹائی ۳۷ فٹ ہے اور اونچائی ۴۴ فٹ سے کچھ زیادہ۔ مسطح چھت ہے جس کے دونوں طرف تین شہ نشین کھڑکیاں ہیں۔ یہ ایک وسیع صحن کا رفیع الشان دروازہ تھا جسے میدان شاہ کہا جاتا تھا اور برجوں کے قریب قلعے کے اصلی دروازے تک چلا جاتا تھا۔ اس کے اطراف میں کھجور اور ترنج کے درختوں کی قطاریں تھیں۔

احمد آباد کی اسلامی تعمیرات برصغیر کی فنون لطیفہ کی تاریخ میں بڑا اہم مقام رکھتی ہیں۔ مسلمانوں نے یہاں کی جین مت کی تعمیرات سے بہت کچھ اخذ کیا اور پھر اپنے ملّی فکر و فن کو بروئے کار لا کر اس میں شاندار اضافہ کیا۔ تعمیرات کے لیے پتھر زیادہ تر احمد نگر (ہست نگر) اور اجمیر وغیرہ سے حاصل کیا گیا تھا۔ احمد آباد کی مساجد کا فنی حسن تین خصوصیات رکھتا ہے؛ عمارت میں روشنی پہنچانے کا عجیب و غریب طریقہ، حسین و جمیل مینار، اور پتھر کے کٹاؤ کا نفیس آرائشی کام۔ کھڑکیوں کا ایک پیچیدہ نظام تھا جس کے ذریعے منعکس روشنی نیچے سے اندر جاتی تھی اور بارش بھی داخل نہیں ہوتی تھی۔ یہ طریقہ برصغیر میں اور کہیں رائج نہ تھا اور گجرات کے معماروں نے خود ایجاد کیا تھا۔ جہاں تک میناروں کا تعلق ہے سلطان احمد شاہ کی مسجد میں ان کی حیثیت کنگروں سے زیادہ نہ تھی مگر ایک صدی کے اندر اندر بعد کی مساجد میں ان کے نقشے اور جزئی تزئین میں ایسا کمال درجے کا حسن پیدا ہو گیا کہ قاہرہ میں بھی ان کی مثال نہیں ملتی۔ تعمیرات کی آرائش اور تزئین کے لیے سنگتراشی میں بھی ماہرین فن نے مختلف مدراج میں سے گزرتے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ہوے جو خوشنما نمونے بنائے (مثلاً مرزا پور میں ملکہ کی مسجد میں) انھیں بھی دنیا بھر میں اپنی قسم کے ہر زمانے کے فنی نمونوں میں بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ عالمگیر شہرت والی سیدی سید کی مسجد میں پچھلی طرف کھڑکیوں کے نفیس و نازک نمونے برصغیر کے لیے فی الواقع سرمایۂ افتخار ہیں۔ ان امور کی بنا پر احمد آباد کا شہر زینت البلاد کہلاتا تھا۔

سرکھیج نزد احمد آباد میں متعدد شاندار عمارات تعمیر ہوئیں۔ شاہی خاندان کے روحانی پیشوا شیخ احمد کھتوؒ کا یہاں مقبرہ ہے۔ منتخب التواریخ میں ہے کہ جب ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے حملہ کیا تو شیخ صاحب نے باشندگان دہلی کی بیش بہا خدمات انجام دی تھیں۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے احمد آباد کا شہر انھیں کے مشورے پر آباد ہوا تھا۔ ان کا مقبرہ ۱۴۴۶ء میں سلطان قطب الدین احمد کے عہد میں مکمل ہوا۔ ۱۰۰ فٹ مربع عظیم الشان مقبرہ ہے اور گجرات میں سب سے بڑا ہے۔ اسے ایک بلند چبوترے پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں ایک طرف سے سولہ ستونوں پر قائم نفیس شہ نشین سے گزر کر پہنچا جاتا ہے۔ بیرونی دیواروں پر تختے لگے ہوے ہیں اور پتھر کی بنی ہوئی مختلف نمونوں کی مشبک جعفری دار کھڑکیاں ہیں۔ روضے کے اوپر بہت بڑا مرکزی گنبد ہے۔ تابوت کو باقی اندرونی حصے سے جدا کرنے کے لیے خوبصورت نمونوں والے پیتل کے تختے استعمال کیے گئے ہیں۔ مقبرے کے ساتھ ہی مسجد ہے۔ فنی نمونے کے لحاظ سے یہ عجیب عمارت ہے اور موتی مسجد آگرہ کے بعد حسن سادہ کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں اس کی نظیر نہیں۔ نہایت ہی پرسکون مقدس فضا ہے۔ شیخ صاحب کے تقدس کے باعث سرکھیج کے لوگ یہاں دفن ہونا پسند کرتے تھے۔ قبر گاہ میں میناروں کے بغیر چھوٹی سی خوبصورت قلندر مسجد ہے۔ جن بارہ قلندروں نے احمد آباد کی تعمیر میں مدد کی تھی ان میں سے بابا علی شیر کا مقبرہ یہیں ہے۔ اس جگہ روضوں اور تعمیرات کا ایک مربوط سلسلہ ہے۔ غزالی مشہدی جیسے فاضل اور فصیح البیان صوفی کی قبر بھی یہیں ہے۔ اکبر نے اسے ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا۔

عبادت اور تسکین قلب کے لیے محمود بیگڑے کو سرکھیج کا مقام بڑا پسند تھا۔ اس کا طویل عہد احمد آباد کے فن تعمیر کا سنہری زمانہ ہے۔ سرکھیج میں اس نے کئی عمارتیں بنوائیں۔ حرم اور محل کی تعمیر کرائی جو اب ویران کر دیے گئے ہیں، تاہم برآمدوں اور شہ نشینوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عمارتوں میں خنکی اور استراحت کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔ اس نے یہاں ساڑھے سترہ ایکڑ کی ایک خوبصورت جھیل بنوائی جس کے جنوب مشرق میں، شیخ احمد کھتوؒ کے مقبرے کے سامنے، محمود بیگڑے نے اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے مقبرہ تعمیر کرایا۔ ایک قبر رانی راجبائی کی ہے۔ بیگمات کی اور قبریں بھی ہیں۔ فن تعمیر ہند اسلامی ہے۔ اس تمام مربوط سلسلۂ تعمیرات کی وجہ سے یہاں بہت سے عالی شان آثار قدیمہ یک جا دیکھے جا سکتے ہیں۔

حوض قطب: احمد آباد کے رائے پور دروازے سے جنوب مشرق میں ایک میل سے بھی کم فاصلے پر ہے۔ سلطان قطب الدین نے تعمیر کرایا اور ۱۴۵۱ء میں مکمل ہوا۔ ہندوستان بھر میں اس سے بڑا کوئی حوض نہیں۔ یہ ۳۴ ضلعوں کی کثیر الاضلاع ہے، جس کا رقبہ ۷۶ ایکڑ ہے۔ اردگرد سیڑھیاں ہیں۔ پہنچنے کے لیے ڈھلان والے چھے رستے ہیں جن کے سروں پر بارہ بارہ ستونوں پر قائم

www.besturdubooks.wordpress.com

مربع قبے ہیں۔ جھیل کے درمیان میں جزیرہ ہے، جہاں باغ لگایا گیا تھا، جسے باغ نگینہ کہتے تھے ۔ ساحل سے جزیرہ اڑتالیس چھوٹی چھوٹی محرابوں پر بنے ہوئے پل سے ملا ہوا ہے ۔ غت منڈل کے نام سے وہاں فرحت منزل بھی ہے ۔ حوض قطب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ پانی کی نالی بھی فن کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس سے احمد آباد والوں کی جمال دوستی کا پتا چلتا ہے ۔ نالی کے دونوں سروں پر احمد آباد کی مسجدوں کے میناروں کی ترسیوں کی مانند پشتے ہیں اور ان کے ساتھ تراشیدہ پردے ہیں اور چھے فٹ قطر والے تین سوراخ ہیں جن کے کنارے بڑے خوبصورت ہیں ۔

ملک شعبان کا روضہ : تعمیر ۱۴۵۲ء، احمد آباد کے مشرق کو موضع رکھیال میں دو میل کے فاصلے پر سلطان قطب الدین احمد کے ایک معزز درباری کا روضہ ہے ۔ کتبہ فارسی میں ہے جس میں عربی کی آمیزش ہے۔ مقبرہ محفوظ حالت میں ہے۔ ملک شعبان کی قبر کے علاوہ اور قبریں بھی ہیں ۔ اس کے ساتھ باغ شعبان تھا جس میں درخت اور کنویں تھے ۔ روضے سے قریب ہی جھیل بھی تھی جو ملک شعبان نے بنوائی تھی ۔ احمد آباد سے رکھیال کی ان تمام عمارات تک ایک سڑک تھی جس کے دو رویہ درخت تھے ۔

حضوری شاہ کی مسجد : احمد آباد میں ملک شعبان نے ۱۴۵۲ء میں تعمیر کرائی ۔

وتوا کا مقبرہ : احمد آباد کے قریب ایک گاؤں میں سید جلال بخاری مخدوم جہانیاںؒ کے پوتے سید برہان الدین قطب عالم کا روضہ ہے ۔ ان کی وفات ۱۴۵۳ء میں ہوئی ۔ سید صاحب شاہان گجرات کے مرشد تھے ۔ محمود بیگڑے نے شاندار مقبرہ تعمیر کرایا ۔ اس میں محرابیں ہی محرابیں ہیں اور گنبد بھی اوپر تعمیر شدہ محرابوں پر بنایا گیا ہے ۔ مقبرہ اب اچھی حالت میں نہیں ۔ سید صاحب مرحوم کی یادگار یہاں ایک متحجر لکڑی ہے جسے بڑے احترام سے دیکھا جاتا ہے ۔

عثمان پور میں مسجد اور مقبرہ : مضافات احمد آباد میں قطب عالمؒ کے خلیفہ سید عثمان، خطاب شمع برہانی (م ۱۴۵۹ء) کا مقبرہ اور ان کی مسجد سلطان محمود بیگڑے نے تعمیر کرائے ۔ مسجد کے مینار بڑے خوبصورت ہیں ۔ کاریگروں نے حسین و جمیل نقوش سے انہیں مزین کیا تھا ۔

دریا خان کا روضہ : واقع احمد آباد، اینٹوں کی بہت بڑی عمارت ہے ۔ دہلی دروازے کے شمال میں ایک میل کے فاصلے پر ہے ۔ ایک رئیس دریا خان نے تعمیر کرایا تھا ۔ مربع شکل کی بارعب عمارت ہے ۔ درمیانی گنبد ہے ۔ گنبد والے چوڑے برآمدے ہیں ۔ ہر طرف پانچ محراب دار رستے ہیں ۔ دیواریں مضبوط ہیں ۔ تمام عمارت محراب دار ہے ۔ یہ الف خان بھکائی کی دھولکہ والی مسجد کی مانند ہے جو غالباً اسی معمار نے بنائی تھی اور اب ویران ہے ۔ اس کی فضا غم انگیز ہے اور باقی مقابر کی طرح فرح بخش نہیں ۔

فتح جونا گڑھ کی یادگاریں : محمود نے چار سالہ جنگ کے بعد ۱۴۷۰ء میں کاٹھیاواڑ کو مکمل طور پر فتح کیا تو وہاں جونا گڑھ اور اپر کوٹ کے ارد گرد فصیل بنوائی جو کم از کم ۱۹۳۸ء تک بالکل صحیح حالت میں تھی ۔ علاوہ بریں اس نے اپر کوٹ کی چوٹی پر ایک مسجد بھی تعمیر کرائی جو اب بھی وہاں موجود ہے ۔ سلطان نے اس شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کیا اور بجا طور پر اس کا نام مصطفیٰ آباد رکھا ۔

خان جہاں کا مقبرہ : احمد آباد میں مانک چوک کے قریب ہے، خان جہاں جونا گڑھ کا آخری راجپوت حکمران تھا جس نے ایک بخاری بزرگ شاہ عالم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ۔ اس کی قبر پر

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ آٹھ فٹ مربع کا یہ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔

محمود آباد: محمود بیگڑے نے احمد آباد سے جنوب مشرق میں اٹھارہ میل کے فاصلے پر اپنے نام کی مناسبت سے نیا شہر تعمیر کرایا۔ دریا کے ساتھ مضبوط بند باندھے گئے۔ محل کے علاوہ خوبصورت عمارات اور وسیع باغات بنوائے گئے۔ بعد میں سلطان محمود سوم نے اسے اپنی سکونت کے لیے منتخب کیا اور اس میں ہرنوں کے لیے اپنا مشہور کھلا باغ بنوایا۔

قلعہ: محمود بیگڑا نے مستطیل سطح مرتفع پر مشتمل پواگڑھ کی چوٹی پر پتھر کا قلعہ تعمیر کرایا۔ دروازے کا نام نقار خانہ ہے اور اوپر چڑھتے ہوئے چمپانیر کے اسلامی شہر کے کھنڈروں میں جامع مسجد نیلا گنبد، دیگر مسجدیں اور کئی حوض نظر آتے ہیں۔ گھنے جنگل قدرتی مناظر کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔

محمد آباد: چمپانیر کے قدیم ہندو شہر کے قریب محمود بیگڑے نے ۱۴۸۴ء میں نیا شہر آباد کیا۔ نام محمد آباد رکھا اور اسے شہر مکرم کا خطاب دیا۔ شہر کے ارد گرد فصیل بنائی جس کا نام جہاں پناہ تھا، قلعہ تعمیر ہوا، محل اور خوبصورت جامع مسجد کی تعمیر ہوئی۔ امرا نے بھی بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں۔ وسیع باغات تھے جن میں فوارے اور جھرنے تھے۔ آم اور صندل کے درخت لگوائے گئے۔ یہ شہر پچاس سال تک گجرات کا دارالخلافہ رہا، لیکن اب ویران ہو چکا ہے۔ اس ویران شہر کے مختلف تاریخی آثار دلکش اور قابل دید ہیں۔ جامع مسجد تو انتہائی خوبصورت فن تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس میں مرکزی گنبد کے نیچے ایک دوسرے کے اوپر ستونوں کی تین قطاریں ہیں، جن کے درمیان سنگتراشی کرکے بالا خانے بنائے گئے ہیں۔ مسجد کے فرش پر کوئی ۱۷۲ ستون ہیں جنھیں اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ان پر گیارہ بڑے بڑے گنبد ہیں۔ اعلیٰ درجے کی جزئیات اور تزئین کے لحاظ سے مشرق کی تمام اسلامی عمارتوں کے ساتھ اس جامع مسجد کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ مسجد ۹۱۴ھ/۱۵۰۸ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ محکمۂ آثار قدیمہ نے باقی مساجد کے ساتھ اس کی مرمت کرا دی ہے۔ ان میں نگینہ مسجد خالص سفید پتھر کی بنی ہوئی ہے اور بڑی خوبصورت ہے۔ ایک یک میناری مسجد بھی ہے۔

رسول آباد کی عمارات: احمد آباد سے جنوب کو ایک میل کے فاصلے پر رسول آباد ہے جسے اب سید شاہ عالم کے مقبرے کے باعث شاہ عالم کہتے ہیں۔ ان کے اور ان کی اولاد کے دو خوبصورت روضوں کے علاوہ مسجد اور جماعت خانہ ہے۔ دونوں روضوں کا نقشہ آنکھوں کو فرحت بخشتا ہے۔ شاہ عالم کا روضہ بڑا متناسب اور انتہائی خوبصورت ہے۔ روضے پر کتبے سے سال تعمیر ۹۳۸ھ/۱۵۳۱ء برآمد ہوتا ہے۔

محافظ خان کی مسجد: محمود بیگڑے کے ایک نامور امیر کی مسجد احمد آباد میں دہلی دروازے کے قریب ہے۔ میناروں پر خوبصورتی سے سنگتراشی کی گئی ہے۔ مسجد کتبے کے مطابق ۸۹۷ھ/۱۴۹۲ء میں مکمل ہوئی۔

بی بی اچھوت کوکی کی مسجد: ۱۴۷۲ء میں تعمیر ہوئی۔ احمد آباد کے شمال میں ہاجی پور میں واقع ہے اور اس عہد کے فن تعمیر کا یہ عمدہ نمونہ ہے۔

باغ فردوس: احمد آباد سے مشرق میں چھے میل کے فاصلے پر سلطان بیگڑے نے لگوایا۔ ارد گرد دیوار تھی۔ آم کے علاوہ اور کئی قسم کے پھل دار درخت تھے۔ اس نے احمد آباد کے علاوہ مصطفیٰ آباد (جونا گڑھ) اور محمد آباد (چمپانیر) کے ارد گرد بھی

besturdubooks.wordpress.com
www.besturdubooks.wordpress.com

فصیلیں بنوائیں۔

رانی روپ متی کی مسجد: بی بی اچھوت کوکی اور رانی سپاری کی مسجدوں کی طرح یہ بھی بڑی خوبصورت مسجد ہے۔ میناروں پر آرائش کا کام (بالخصوص طاقچوں میں نقش و نگار) متنوع اور جمیل ہے۔ مسجد میں روشنی کے لیے کھڑکیاں بنائی گئی ہیں اور انہیں آنکھوں سے اوجھل رکھنے کے لیے جو چھجا بنایا گیا ہے، اس کا تاثر بڑا خوشگوار ہے۔

باولیاں: (سیڑھیوں والے کنویں): محمود بیگڑے کے زمانے میں احمد آباد کے شمال مشرق میں اساروا کی مضافاتی آبادی میں بائی حریر کا کنواں اور احمد آباد سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر شمال میں ادلاج گاؤں میں اس سے بھی زیادہ خوبصورت کنواں بنا۔ یہ ''واو'' کہلاتے ہیں۔ یہ جمیل اور پرشکوہ تھے اور خاص نقشے کے مطابق بنائے گئے تھے۔ سیڑھیوں کے درمیان ستون دار گیلریاں ہیں جن کی قطاریں گہرائی کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ان پر اعلیٰ درجے کے نقش و نگار ہیں۔ غربی ہند کے ان جیسے کنووں (یعنی باولیوں) کی دنیا میں مثال نہیں۔ بائی حریر کا کنواں ۱۴۹۹—۱۵۰۰ء میں بنا تھا۔ بائی حریر نے ایک مضافاتی آبادی حریر پور بھی بنوائی تھی اور وہاں مسجد بھی سیڑھیوں والے کنویں کے مغرب میں تعمیر کرائی تھی۔ اس کا روضہ بھی وہاں ہے۔

رانی سبرائی (سپاری) کی مسجد: ۱۵۱۴ء میں تعمیر ہوئی۔ احمد آباد کے فنِ تعمیر کا یہ انتہائی خوبصورت نمونہ ہے۔ یہ مسجد سلطان محمود بیگڑہ کی بیوہ رانی سبرائی نے بنوائی تھی جو شاہزادۂ ابوبکر خان کی والدہ تھی۔ طول و عرض کم یعنی صرف ۴۸ × ۱۹ فٹ ہونے کے باوجود اسے احمد آباد کا نگینہ کہنا چاہیے۔ یہ اپنی قسم کی دنیا کی نفیس ترین عمارات میں سے ہے۔ میناروں کی ساخت بڑی عمدہ ہے۔ ان کے اندر سیڑھیاں نہیں ہیں۔ اذان کے لیے گیلری بھی کوئی نہیں۔ ان کی حیثیت خالصۃً آرائشی ہے۔ مشرق و مغرب میں کسی ایسی عمارت کا تلاش کرنا مشکل ہے، جس کے مختلف حصوں میں اس قدر ہم آہنگی ہو۔ اور جس میں توازن، موزونیت اور تناسب آرائش مل کر اتنا شاندار اثر پیدا کر رہے ہوں۔ عمارت کا مختصر ہونا بھی اس کے لیے خوبی کا موجب ثابت ہوا ہے۔ نفاست سے تراشے ہوئے سنگی اجزا اور منبت کاری کے نگینے کی طرح نقش و نگار چونکہ صنف لطیف کے حسن کی یاد دلاتے ہیں یہ کسی بڑی اور مردانہ عمارت میں اتنے فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ کتبے میں معمول کے مطابق دیگر عبارات کے علاوہ رانی سبرائی کا نام اور سال تعمیر ۹۲۰ھ / ۱۵۱۴ء درج ہے۔ مسجد کے سامنے رانی کا مقبرہ ہے۔ یہ ایک خوبصورت عمارت ہے جس کے ارد گرد جالی دار دیواریں ہیں جو مقامی اسلوب کی نمائندگی کرتی ہیں۔

۱۵۱۴ء تک احمد آباد میں عہد سلاطین کے فن تعمیر پر تبصرہ: شہر کی بنیاد ۱۴۱۱ء میں قائم ہوئی اور محمود بیگڑے کے زمانے تک اس کا فن تعمیر باقاعدہ ارتقا پذیر رہا۔ نشو و نما اور ارتقا کے اس دور میں جینی اور اسلامی عناصر کا امتزاج ہوا۔ ابتدائی مساجد میں، مثلاً بھدرا والی احمد شاہ کی مسجد میں دونوں عناصر کے امتزاج میں کامیابی نظر نہیں آتی، لیکن ۱۴۲۴ء میں جب جامع مسجد تعمیر ہوئی تو ان میں بڑی خوبی سے آہنگ و امتزاج پیدا ہو گیا۔ میناروں اور محرابوں کو چوڑے ہندووانہ بغلی رستوں کے ساتھ بڑی کامیابی کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے۔ اس صدی کے وسط میں تمام غیر ملکی اثرات سے کنارہ کشی اختیار کر لی گئی اور سرکھیج اور وتوا میں ہندو طرز کی عمارات بنیں۔ اسلامی عناصر بہت ہی کم تھے۔ ۱۴۶۵ء سے بعد محمود

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

بگڑے کی حکومت کے اختتام تک ملی جلی طرز کی مساجد تعمیر ہوئیں ۔ ہندوانہ اور اسلامی عناصر کا امتزاج، مثلاً بی بی اچھوت کوکی کی مسجد (۱۴۷۲ء) میں، ایسا کامل ہے کہ امتیاز کرنا مشکل ہے ۔ ۱۵۱۴ء میں رانی سپاری کی مسجد بنی جسے احمد آباد کا نگینہ کہا جاتا ہے ۔ اس میں خالص ہندوانہ اثر ترک نہیں ہوا ۔ سولھویں صدی کے دوسرے عشرے کے بعد احمد آباد میں تعمیر ہونے والی عمارات کا فنی اسلوب پست ہو گیا ۔ گویا رانی سپاری کی مسجد کے بعد احمد آباد کے فن تعمیر کا تخلیقی دور ختم ہو گیا [رک بہ فن : تعمیر، ص ۸۲۴، ۸۲۵]۔

اس کے بعد اگرچہ فن انحطاط پذیر ہو گیا مگر عمارات پھر بھی بنتی رہیں ۔ ان میں سے بعض قابل تعریف تھیں، مثلاً چمپانیر کے قریب ہلول میں سلطان سکندر اور اس کے بھائیوں کا مقبرہ ۱۵۲۷ء میں بنا جس کے ستون نفیس ہیں اور پیش دہلیز خوبصورت ہے ۔ روضے بھی تعمیر ہوئے ۔ احمد آباد میں سیدی سعید کی مسجد ۹۸۰ھ/۱۵۳۷ء میں بنی ۔ اس کی کھڑکیوں پر نقش و نگار پتھر کو تراش کر بنائے گئے ہیں ۔ اقلیدسی نمونے ہیں ۔ بیل بوٹے بڑے نفیس ہیں سارا کام اس طرح ہے جیسے یونانی یا قرون وسطیٰ کے معماروں نے کیا ہے ۔ سلطان بہادر (۱۵۲۶ - ۱۵۲۷ء) نے بھڑوچ کی فصیل تعمیر کرائی اور خواجہ سفر نے ۱۵۴۰ء میں سورت کا قلعہ بنوایا ۔ ستمبر ۱۵۷۳ء میں سلطان مظفر ثالث کے زمانے میں اکبر نے گجرات کو فتح کر کے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا ۔ عہد مغلیہ میں یہاں کوئی قابل قدر عمارت نہ بنی، لیکن اس بیان کو ختم کرنے سے پہلے نامناسب نہ ہوگا کہ ایک عشرت گاہ کا ذکر کیا جائے۔

سلطان محمود ثالث نے ۱۵۴۶ء میں دارالخلافہ محمود آباد میں منتقل کیا اور وہاں چھے میل کے رقبے میں آہو خانہ تعمیر کرایا ۔ اس کے ہر کونے میں خوشنما شہ نشین بنوائے جہاں عورتیں ایسی چیزیں بیچا کرتی تھیں جن کا تعلق آرائش حسن سے ہوتا ہے ۔ درخت کے تنوں کو مخمل و دیبا سے آراستہ کیا جاتا تھا اور ان کی شاخوں کو اطلس و کمخواب سے ڈھانپا جاتا تھا ۔ اس عمارت کے مزین گوشوں میں سلطان اپنی بیگمات کے ساتھ سکونت رکھا کرتا تھا ۔ اس باغ کی تفصیلات طبقات اکبری اور مرآۃ سکندری میں موجود ہیں ۔ یہ زوال کے آثار تھے۔

عہد مغلیہ میں صوبیدار آتے رہے تا آنکہ مرہٹوں نے ۱۷۵۸ء میں احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔

لازماً مذکورۂ بالا تمام عمارتوں کے تہذیبی اثرات گجرات میں پھیلتے چلے گئے ۔ ان تعمیرات کے نام لوگوں کی زبانوں پر رواں تھے ۔ مساجد میں منبر و محراب اور مکتبوں سے دین اسلام اور اسلامی تہذیب کی تبلیغ ہو رہی تھی ۔ بود و باش اور تمدن و معاشرت میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ جس طرح عمارتوں میں جینی اثرات کے ساتھ اسلامی رجحانات دخیل کار ہوے اور ان کا بڑا لطیف امتزاج ہوا، رسوم و رواج کے لحاظ سے بھی ایک مشترکہ تمدن کی بنیاد پڑی ۔ گجرات میں جو لباس کمر تک پہنا جاتا ہے وہ مسلمانوں ہی کا تحفہ ہے ۔ عدالتی لباس بھی اسلامی تھا ۔ ایرانی روایات بھی مسلمانوں کا اقتدار قائم ہونے پر گجرات میں باقاعدہ پہنچتی رہیں ۔ اس لیے ایرانی خصوصیات بھی گجرات کے معاشرے میں رواج پذیر ہوئیں ۔ مسلمانوں کے زمانۂ اقتدار میں عربی اور فارسی زبانیں عام استعمال ہوتی تھیں ۔ عربی زبان تو عرب تاجروں کی وجہ سے زمانۂ قبل از اسلام سے یہاں وارد ہو چکی تھی ۔ کھنبایت [رک بآں] اور گجرات کی بندرگاہوں میں عرب

www.besturdubooks.wordpress.com

تاجر زمانۂ قدیم سے سکونت رکھتے تھے ۔ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھڑوچ پر حکم بن العاص نے حملہ کیا ۔ خلیفہ ہشام کے عہد میں سندھ کا مستقل گورنر جُنید بن عبد الرحمن مُری بھی بھڑوچ پر حملہ آور ہوا ۔ اور پھر ۷۰۷ء کے قریب خلیفہ منصور عباسی کے زمانے میں سندھ کے گورنر ہشام بن عمر تغلبی نے گجرات پر حملہ کیا اور بدھ مدرسے کی جگہ مسجد تعمیر کی (ابو ظفر ندوی : تاریخ گجرات، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۱۹۹) ۔ عربی زبان کا اس طرح گجراتی پر اثر بڑھتا چلا گیا ۔ فارسی زبان یہاں محمود غزنوی کے ساتھ آئی جب اس سلطان نے ہندو بادشاہ بھیم دیو کے زمانے میں گجرات پر حملہ کیا ۔ چھوٹے بھیم دیو کے زمانے میں شہاب الدین غوری نے بھی گجرات کو فتح کرنے کی کوشش کی ۔ قطب الدین ایبک بھی ۵۹۳ھ/۱۱۹۶ء میں گجرات آیا ۔ جب سلطان شمس الدین التتمش [رک بآں] کا زمانہ تھا تو اس وقت بھی گجرات پر حملہ ہوا اور ایک مسجد کی بنیاد رکھی گئی ۔ اس لیے علاء الدین خلجی کی فتح گجرات سے کوئی تین سو سال پہلے فارسی زبان گجرات میں پہنچ چکی تھی اور اپنے لسانی اثرات پھیلا رہی تھی ۔ اس کے بعد مسلمانوں کے کئی صد سالہ اقتدار نے عربی اور فارسی دونوں کے ہزاروں الفاظ گجراتی [رک بآں] زبان میں داخل کر دیے اور مشترکہ تمدنی رسوم و رواج کے ساتھ مشترکہ زبان کی نشوونما ہوئی ۔ گجرات ودیا سبھا بھدرا احمد آباد نے ان دونوں زبانوں کے ان الفاظ کی طویل فہرست ایک مستقل کتاب کی صورت میں شائع کر دی ہے جو گجراتی میں داخل ہوے ہیں (ابو ظفر ندوی : تاریخ گجرات، ص ۳۴) ۔ ان میں سے بعض الفاظ اپنی اصل شکل ترک کر کے بالکل گجراتی بن چکے ہیں ۔ لوگ انھیں بے دریغ روز مرہ کی بات چیت میں استعمال کرتے ہیں اور فرق معلوم کرنا دشوار ہے ۔ ادب میں بھی اسی اقتدار کے اثرات نظر آتے ہیں ۔ امیر خسرو [رک بہ خسرو دہلوی ص ۹۳۳] کی فارسی میں مثنوی عشیقہ یا دول رانی خضر خان گجرات ہی کی ایک حقیقی داستان ہے جو علاء الدین خلجی کے زمانے میں وقوع پذیر ہوئی ۔ یہ مثنوی ۱۳۱۶ء میں تصنیف ہو کر اس سلطان کے نام معنون ہوئی تھی ۔ بعد میں اسی سلطان کے حبلۂ گجرات کے متعلق ۱۴۵۵ء میں پرانی گجراتی میں ایک نظم کھاندے پر بھاندھا (کنہاد دی پرابندھ) ایک شخص پدمنا بھا (پدما نابھ) نے لکھی جو چھپ چکی ہے ۔ عربی فارسی کی آمیزش سے جو نئی گجراتی زبان پیدا ہوئی اس میں ہندو اور مسلمان اہل قلم لکھتے رہے ہیں.

مآخذ : (۱) سلیمان ندوی : عرب و ہند کے تعلقات، الٰہ آباد ۱۹۳۰ء؛ (۲) ابو ظفر ندوی : تاریخ گجرات، دہلی ۱۹۵۸ء؛ (۳) محمود شیرانی : پنجاب میں اردو، لاہور ۱۹۶۳ء؛ (۴) *A : M. S. Commissriat History of Gujarat*، انڈیا، ۱۹۳۸ء، ج ۱ بمدد اشاریہ؛ (۵) A. M. A. Shushtery : *Outlines of Islamic Culture*، بنگلور، ۱۹۵۴ء، ص ۱۹۶، ۱۹۷؛ (۶) Abdullah Chaghatai : *Gujarat Architecture*، در *A History of Muslim Philosophy*، ج ۲، جرمنی ۱۹۶۶ء، ص ۱۱۰۳، ۱۱۰۴ (عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا).

(ادارہ)

گجراتی : زمانۂ حال کی ایک انڈو ۔ آریائی مقامی زبان، جسے مغربی ہندوستان [صوبۂ گجرات، کاٹھیاواڑ، کچھ] میں نوّے لاکھ سے زائد انسان بولتے ہیں، اور دس لاکھ سے زائد وہ لوگ بھی جو گجرات چھوڑ کر ملک کے دوسرے حصوں میں آباد ہو گئے ہیں، یہی زبان بولتے ہیں ۔ اس کا اپنا ایک قابل طباعت رسم الخط ہے جو دیوناگری کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے، اور اس کے ادب کا سراغ

www.besturdubooks.wordpress.com

چودھویں صدی عیسوی تک ملتا ہے۔ یہ مغربی ہند کی سب سے بڑی تجارتی زبان ہے اور اس حیثیت سے جو جماعت بھی اسے استعمال کرے اس کے مطابق یہ اپنے آپ کو ڈھال لیتی ہے۔ کوچ میں یہ سرکاری اور ادبی زبان کی حیثیت میں رائج ہے [پارسی سب یہی زبان بولتے ہیں]۔ گجرات کے مسلمانوں کا اکثر حصہ اردو بولتا ہے، لیکن ان میں سے وہ لوگ جو نو مسلموں کی اولاد ہیں گجراتی بولتے ہیں اور اس طبقے کے تعلیم یافتہ افراد اپنی دیسی زبان کے الفاظ میں بکثرت اردو (اور اس کے توسط سے عربی اور فارسی) الفاظ کا اضافہ کر لیتے ہیں۔ [عربی اور فارسی کے بعض الفاظ اپنی اصلی شکل ترک کر کے گجراتی الفاظ بن گئے ہیں جو روز مرہ کی بات چیت میں بے دریغ استعمال ہوتے ہیں اور تحریروں میں بھی عام مستعمل ہیں۔ گجرات کی عدالتوں میں رائج تقریباً تمام اصطلاحات عربی یا فارسی سے لی گئی ہیں۔ عدالتوں میں جو لباس پہنا جاتا ہے اس کی ایک ایک چیز کا نام عربی اور فارسی سے لیا گیا ہے۔ گجرات میں مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں ناگر اور کایستھ لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور فارسی زبان سیکھتے تھے۔ ناگروں میں فارسی زبان میں گفتگو کرنا ایک فیشن تھا۔ ان کی وجہ سے بھی فارسی عربی کے الفاظ گجراتی میں داخل ہوئے اور لسانی اعتبار سے گجراتی زبان مالدار ہو گئی (دیکھیے ابو ظفر ندوی: تاریخ گجرات، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۳۴، ۳۵)]۔ مسلمانوں نے ادبی خیالات کے اظہار کے لیے گجراتی کو بہت ہی کم استعمال کیا ہے، اس مقصد کے لیے وہ فارسی (اور قریب العہد زمانۂ حال میں اردو) کو کام میں لاتے ہیں۔ گجراتی زبان سندھ تک بھی پہنچی ہے اور ضلع تھرپارکر کے نزدیک کے جنوبی علاقے میں بولی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں گجراتی بولنے والوں کی تعداد تیس ہزار ہے (*Linguistic Survey of India*، جلد ۹، حصہ ۲، ص ۴۲۴ ببعد)، *Linguistic Survey of India* میں کم و بیش ڈیڑھ سو گرامر اور لغت کی کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ ان میں سے بعض درج ذیل ہیں جن سے ان کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے گا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے ص ۳۳۳ تا ۳۳۷)

Dossabhaee Sorabjee: *Idiomatical sentences in the English, Hindustanee, Goozratee and Persian Languages*، بمبئی ۱۸۴۳ء؛ محمد کاظم مرزا و نو روجی فردنزی: گجراتی انگلش ڈکشنری، بمبئی ۱۸۴۶ء؛ Faulkner, A.: *The orientalist's grammatical vade Mecum: being an Easy introduction to the Rules and Principles of the Hindustani, Persian, Gujrati Gujrati*: Young, R.: *Languages*، بمبئی ۱۸۵۴ء؛ *Exercises, or a new Mode of learning to read write or speak the Gujrati language on the Ollendorffian System*، ایڈنبرا ۱۸۶۵ء؛ وہی مصنف: *English Gujrati Idiomatic dictionary*، ایڈنبرا ۱۸۸۸ء؛ عبدالحلیم: *Idiomatic sentences in English, Hindustani and Guzerati*، بمبئی ۱۸۷۲ء؛ Jamaspi Dastur Minocheherji Jamasp: *Pahlavi, Gujrati and English Dictionary*، دو جلد، لنڈن ۱۸۷۷ء؛ Asana: *Select Persian Proverbs with their English, Gujrati and Hindustani equivalents, including sayings and Familiar Quotations*، بمبئی ۱۸۹۴ء؛ K.R., Nanjiani, A collection of Proverbs and sayings in English Gujrati, Sanskrit, Persian and Marathi with their explanations in Hindi، بمبئی ۱۸۹۸ء؛ مسلمانوں نے جو چند کتابیں گجراتی زبان میں تصنیف کی ہیں ان میں سے زیادہ تر عربی، فارسی اور اردو کتب کے تراجم ہیں، یا مذہبی رسائل اور مذہبی تعلیم و تدریس کی ابتدائی کتب۔ گجراتی زبان میں ایک رزمیہ نظم کھانڈے پر

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

بھاندھا ہے جو ۱۴۵۵ء میں پدما نابھ نے لکھی تھی اور جس میں علاءالدین خلجی کے حملے کا ذکر ہے۔ پرانی گجراتی زبان ہے مگر واقعات سب فرضی ہیں یہ نظم چھپ چکی ہے۔ گجراتی کے ادب و شعر پر مسلمانوں کے اس اثر کے علاوہ خود مسلمان شاعروں کی تخلیقات کا ذکر بھی معنی خیز ہے۔ شیخ محمد خوب ۹۸۶ھ کی تصنیف اپنی مثنوی خوب ترنگ کو گجراتی بولی کی نظم بتاتے ہیں۔ شاہ علی محمد جیو گام دھنی کی جواہر اسرار اللہ کو بھی گوجری گجراتی تصنیف کہا گیا ہے۔ محمد امین کی مثنوی یوسف زلیخا ۱۱۰۹ھ میں بعہد عالمگیر نظم ہوئی تھی۔ وہ بھی اسے اسی زبان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ شاہ برہان صاحب جانم (م ۹۹۰ھ) نے اپنے کلام میں کئی جگہ اپنی زبان کو گجری (یعنی گجراتی) کہا ہے، اس لیے کہ ان کے زمانے میں فارسی و عربی کے الفاظ بیشتر مقامی لہجہ اختیار کر چکے تھے اور شاہ صاحب مروجہ لہجے میں لکھ جاتے ہیں۔

حافظ محمود شیرانی نے اپنی تصنیف پنجاب میں اردو کے علاوہ اپنے مقالات میں بھی گوجری یا گجراتی زبان کے متعلق بحث کی ہے۔ نومبر ۱۹۳۰ء و فروری ۱۹۳۱ء کے اورینٹل کالج میگزین میں انھوں نے اردو کی تعمیر میں دائرہ کے مہدویوں کے حصے کا ذکر کرتے ہوئے گوجری/گجری کے مسئلے کی طرف ضمناً اشارہ کیا ہے۔ مگر اس سے پہلے وہ گوجری یا گجراتی اردو سولھویں صدی عیسوی میں کے عنوان سے اگست ۱۹۳۰ء کے اورینٹل کالج میگزین میں ایک مستقل مقالہ لکھ چکے تھے۔ امیر خسرو (م ۱۳۲۵ء) نے اپنی ایک رباعی میں گجراتی/گوجری کے الفاظ استعمال کیے ہیں [دیکھیے رسالۂ قومی زبان، کراچی، اکتوبر ۱۹۷۷ء مقالہ گوجری زبان]۔ اس لیے میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، علی محمد جیوگام دھنی، میاں خوب محمد چشتی، ملّا وجہی اور ولی دکنی کا کلام گوجری/گجراتی کے مطالعے کی غرض سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ دکن کے شعرائے اردو ہیں اور حافظ محمود شیرانی کا قول ہے کہ گوجری اور دکنی زبانیں آپس میں اس قدر مشابہ ہیں کہ انسان کو ان میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے [دیکھیے مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، ج ۲، لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۲۰۱]۔

مآخذ: (۱) *Linguistic Survey of India*، ج ۹: حصہ ۲، ص ۳۲۳ و ببعد (کلکتہ ۱۹۰۸ء)؛ (۲) J. F. Blumhardt: *Catalogue of Gujarati Printed Books in the library of the British Museum* لنڈن ۱۸۹۲ء؛ (۳) وہی مصنف: *Catalogue of the library of the India office Marathi and Gujarati Books*، ج ۲، حصہ ۵، لنڈن ۱۹۰۸ء؛ [(۴) ابو ظفر ندوی: تاریخ گجرات، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۳۴، ۳۵، ۴۱؛ (۵) محمود شیرانی: پنجاب میں اردو، لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۵۳، ۵۵، ۲۳۷، ۲۳۸؛ (۶) M. S. Commissariat: *A History of Gujarat*، انڈیا ۱۹۳۸ء، ص ۴]۔

(M. Longworth Damos) [و ادارہ]

گجرانوالہ: رک بہ گوجرانوالہ۔

گدالہ: ایک مختصر سا بربر قبیلہ جو صحرا نشین صنہاجہ کے بڑے نسلی گروہ سے تعلق رکھتا ہے (بربری حرف صوتی گ کو عربی رسم خط میں عام طور پر ج سے لکھا جاتا ہے، لیکن ابن خلدون نے غیر زبانوں کے الفاظ کو عربی رسم خط میں منتقل کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، اس کے مطابق وہ اسے بطور کاف لکھتا ہے جس کے اوپر یا نیچے اصلی مخطوطے میں شاید کوئی حرکت diacritical point بھی دی گئی تھی)۔ یہ لوگ اس علاقے کے جنوبی

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

حصے میں رہتے تھے جو اب ماری ٹینیا Mauretania کہلاتا ہے اور سینی گال کے شمال میں سمندر سے متصل واقع ہے۔ جنوب میں ان کے علاقے کی سرحد زنگیوں (Negroes) کی سرزمین سے ملتی تھی، شمال کی جانب ماری ٹینیا کے موجودہ ادرار میں ان کے ''بھائی بند'' لَمْتُونہ اور مسوفہ آباد تھے۔

مآخذ: قدیم مؤرخین اور جغرافیہ نگاروں کی تصانیف کے علاوہ، دیکھیے (۱) A. Huici Miranda: *Un fragmento inédito de Ibn 'Idari sobre los Almorávides*، در *Hespéris-Tamuda*، ج ۲: ۱، ۱۹۶۱ء، ص ۴۳؛ (۲) P. Marty: *l'émrat des Trazas*.

(G. S. COLIN)

گرامی: شیخ غلام قادر؛ [برصغیر پاکستان و ہند میں آخری دور کے ممتاز ترین فارسی شاعر] ۔ غلام صمدانی نے ان کا وطن بلگرام بتایا ہے (تزک محبوبیہ: ۲: ۱۴۷)، لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ جالندھر (بھارت) میں پیدا ہونے کی سند ان کے کلام سے ملتی ہے:

نظم دلکش بخواں بہ طرز دگر
مولد تست شہر جالندھر

گرامی ۱۸۰۷ء سے چند سال قبل پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سکندر بخش تھا جو ککے زئی برادری سے تعلق رکھتے اور نیل کی رنگائی کا کام کرتے تھے۔ گرامی نے محلے کی مسجد میں قرآن مجید کی تعلیم پائی پھر انہیں بستی دانشمندان (جالندھر) میں خلیفہ ابراہیم کے مکتب میں داخل کیا گیا وہاں فارسی کی متداول کتابیں گلستان، بوستان اور سکندر نامہ وغیرہ پڑھیں، تحصیل علم کا شوق کشاں کشاں لاہور لے آیا۔ چودہ برس کی عمر میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں داخل ہوئے اور فارسی کے امتحانات منشی عالم اور منشی فاضل پاس کیے۔ پھر وکالت کا امتحان دیا اور اس میں بھی کامیابی حاصل کی۔

تعلیم سے فارغ ہو کر گرامی نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ عرصہ امرتسر کے ایم۔ اے۔ او ہائی سکول میں فارسی پڑھائی، پھر کپورتھلے کے کسی مدرسے میں چلے گئے۔ وہاں دل نہ لگا تو لدھیانے کے گورنمنٹ ہائی سکول میں فارسی کے مدرس ہو گئے۔ لدھیانے میں ان دنوں واربرٹن سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا، جسے فارسی سیکھنے کا بہت شوق تھا اور وہ اکثر گرامی کو بلا کر ان سے فارسی میں گفتگو کیا کرتا اور ان سے فارسی اشعار سنا کرتا تھا۔ اس نے گرامی کو پولیس میں سارجنٹ بھرتی کر لیا، لیکن انہوں نے بہت جلد یہ ملازمت ترک کر دی۔ اس کے بعد معاش کی تلاش میں وہ کبھی لاہور، کبھی پٹیالے، کبھی رام پور اور کبھی مالیر کوٹلے پھرتے پھراتے رہے، مگر کہیں ڈھب کی ملازمت ملی، نہ کہیں دل ہی لگا۔ لاہور میں وہ چار سال نواب فتح علی خان قزلباش کے معلم و اتالیق رہے۔

گرامی کو شاعرانہ مزاج قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ ملازمت کی تلاش میں جب پٹیالے گئے تو وہاں کے وزیر اعظم خلیفہ محمد حسین نے ان کا کلام سن کر کہا کہ اس جنس کی قدر یہاں نہیں ہوگی، بہتر ہے کہ حیدرآباد چلے جائیے؛ چنانچہ انہیں کی ترغیب سے گرامی نے حیدرآباد دکن جانے کے لیے نظام کے اتالیق، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کے چھوٹے بھائی میجر سید حسن بلگرامی کو وسیلہ بنایا۔ حیدرآباد پہنچے تو انہیں سید غلام حسنین بلگرامی مرحوم کی جگہ شاعر خاص مقرر کر دیا گیا۔ اسی موقع پر انہوں نے تاریخ کہی تھی: ''گرامی بحضور آید'' (۱۳۰۷ھ)۔ چند سال بعد انہیں ملک الشعرا کا خطاب ملا۔

www.besturdubooks.wordpress.com

گرامی ۱۹۱۶-۱۹۱۷ء تک حیدرآباد میں رہے اور خوب ٹھاٹھ سے رہے۔ انھوں نے وہیں کی طرز بود و ماند اختیار کر لی تھی۔ میر محبوب علی خان اور میر عثمان علی خان دونوں کا زمانہ دیکھا اور ہر عہد میں محبوب و مقبول رہے۔ کئی دفعہ انعام و اکرام بھی حاصل کیے۔ گرامی کی شادی کے موقع پر دو سیر پختہ سونا سرکاری خزانے سے دیے جانے کا حکم صادر ہوا۔ شادی ہوشیار پور کے شیخ قمر الدین کی دختر نوراں بھری سے ہوئی، جو بعد میں اقبال بیگم کہلائی۔ شادی کے بعد گرامی نے جالندھر کے بجائے ہوشیار پور ہی کو مستقر بنا لیا۔ خود کہتے ہیں: ''گرامی از شہر ہوشیار پور زن گرفت و بجائے آن کہ زن را بہ شہر خود بیاورد خودش بہ شہر زن منتقل شد'' (یعنی لوگ تو جورو بیاہ کر لاتے ہیں، گرامی تو جورو بیاہ لے گئی)۔ یہاں گرامی نے ایک شاندار حویلی تعمیر کرائی جس کی پیشانی پر یہ سجع کندہ تھا: ''سر جلوۂ اقبال گرامی منزل''۔ گرامی کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ہوشیار پور کے پڑھے لکھے نوجوانوں اور با مذاق لوگوں نے ''بزم گرامی'' کے نام سے ایک مجلس مشاعرہ قائم کی، جس کی سرپرستی میں مشاعرے ہوتے تھے اور گرامی بھی اس میں اپنا کلام سناتے تھے۔ گرامی ذیابیطس کی وجہ سے بہت پریشان رہتے تھے، جسے وہ حیدر آباد ہی سے لائے تھے۔ اس پریشانی میں شعر کی طرف بھی طبیعت مائل نہ ہوتی تھی۔ رباعیات زیادہ تر اسی زمانے میں [illegible]۔ آخر ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء کو بروز [illegible] بہ تین بجے صبح داعی اجل کو لبیک کہا اور ہوشیار پور کے قبرستان کندن شاہ بخاری میں دفن کیے گئے۔ علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان نے ان کی وفات پر پُر درد مرثیے کہے۔ دیوان گرامی اور رباعیات گرامی دو شعری مجموعے انتقال کے بعد شائع ہوئے، مگر بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں ''گرامی جہانگیری بہار کا آخری پھول ہے جو ذرا دیر کے بعد شاخ سے پھوٹا'' (مکتوب اقبال بنام گرامی، ۹ فروری ۱۹۲۲ء)۔ ان کا کلام بحیثیت مجموعی بالخصوص غزل میں نظیری کے کلام سے ایک نسبت رکھتا ہے (مخزن، لاہور، جون ۱۹۲۷ء)۔

مآخذ: (۱) غلام صمدانی: تزک محبوبیہ، ۲؛ (۲) محمد حسین آزاد: مکتوبات آزاد، لاہور ۱۹۲۷، ص ۳۰۶۔

(محمد عبداللہ قریشی)

گرای: تاتاری فرمانرواؤں کا ایک خاندان جس نے تین صدیوں (نویں سے بارھویں صدی ہجری / پندرھویں سے اٹھارویں صدی عیسوی) تک جزیرہ نمائے قریم (کریمیا) پر حکومت کی۔ اس خاندان کی ابتدا اور اس کے بانی حاجی گرای بن غیاث الدین بن تاش تیمور، آلتون اردو کی سلطنت کے ایک شہزادے کے کارناموں کے بارے میں ہمیں بہت ناکافی اور متناقض معلومات ملتی ہیں۔ اس کے قدیم ترین سکے سال ۸۴۵ھ / ۱۴۴۱-۱۴۴۲ء کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اس سے بہت پیشتر لتھوانیا اور پولینڈ کے بادشاہوں کی مدد سے اپنی حکومت کی بنیاد رکھی تھی اور وہ انھیں پر بعد ازاں مرتے دم تک (۸۷۱ھ / ۱۴۶۶ء) بھروسا کرتا رہا۔ گرای کے نام کے بارے میں ہمیں کسی قسم کی قابل اعتبار معلومات حاصل نہیں۔ ایک مقامی روایت کی رو سے شہزادے کا اتالیق قبیلۂ گرای سے تعلق رکھتا تھا (قبیلے کا یہ نام وسط ایشیا میں اب تک ملتا ہے، وہاں اس کا تلفظ کرای کیا جاتا ہے)۔ احمد رفیق پاشا اپنی لغت (ص ۱۰۴۳) میں مآخذ کا حوالہ دیے بغیر

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

لکھتا ہے کہ گرای ایک مغولی لفظ ہے، جس کا مغولی زبان میں تلفظ گرای ہے اور یہ مستحق، شائستہ اور اَحَق [اہل] کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے حاجی اس نام کو اپنے اخلاف میں منتقل کرنے کا ارداہ نہیں رکھتا تھا؛ چنانچہ اس کے صرف ایک بیٹے منگلی نے گرای کا لقب اختیار کیا اور وہ نہ تو اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور نہ وہ اس کے فوراً بعد تخت نشین ہوا۔ اس کے برعکس منگلی کے زمانے سے گرای خاندان شاہی کے ہر فرمانروا کے نام کا جزو قرار پا گیا۔ ترکوں کے کفہ کو فتح کر لینے کے بعد (۸۸۰ھ / ۱۴۷۵ء) قریم صرف برائے نام سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو گیا۔ جنوبی ساحل تو براہ راست ترکی حکومت کے ماتحت آ گیا، لیکن باقی ماندہ علاقے پر گرای ہی باب عالی کے باجگذار کی حیثیت سے قابض رہے۔ بایں ہمہ یہ بات قطعیت کے ساتھ کبھی واضح نہ ہو سکی کہ کفہ میں متعین پاشا اور خان کے مابین اور خان اور باب عالی کے مابین تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ اسلام گرای ثانی کے عہد (۹۹۲ھ / ۱۵۸۴ء تا ۹۹۶ھ / ۱۵۸۸ء) کے بعد کہیں جا کر خطبۂ جمعہ میں خان کے نام سے پہلے سلطان کا نام لیا جانے لگا۔ ابتدائی خوانین (حاجی گرای، نور دولت اور منگلی گرای، ترکی فتح سے قبل) اپنے سکّوں پر سلطان کا لقب استعمال کرتے تھے؛ بعد میں انھوں نے صرف خان کے لقب ہی پر اکتفا کر لیا۔ اُزبکوں اور تازاقوں کی مانند ان کے ہاں بھی لفظ سلطان کے معنی ایک ایسے شہزادے کے ہوتے تھے جو حکمران خاندان سے تعلق تو رکھتا ہو لیکن خود اس کے ہاتھ میں عنانِ حکومت نہ ہو۔ گرای کے سکّوں اور دستاویزات کی ایک خصوصیت ان کی مُہر (تمغا) ہے، [جس کی شکل بڑی حد تک انگریزی حرف T سے ملتی جلتی ہے] ۔ بہت سے خوانین نے کبھی تو خود مختارانہ طور پر اور کبھی سلطان ترکیہ کے نام پر اپنی حکومت جزیرہ نما کی سرحدوں سے پرے کے علاقے میں بھی قائم کر لی، یعنی شمال میں ماسکو تک اور مشرق میں والگا اور بحیرۂ خزر تک۔ ۱۷۳۶ء میں جزیرہ نما پر پہلی بار روسیوں کا عارضی قبضہ ہوا۔ ۱۷۷۱ء میں اسے مستقل طور پر فتح کر لیا گیا اور اگرچہ صلحنامۂ نوچک قینارجہ (۱۷۷۴ء) اور عہد نامۂ آئینہ لی قاوق (۱۷۷۹ء) کی شرائط کے مطابق یہ طے ہوا تھا کہ تاتاری باشندے آزادانہ طور پر خان کا انتخاب کیا کریں گے اور خان باب عالی اور روس دونوں کے اثر سے آزاد ہو کر ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے اپنے ملک پر حکومت کیا کرے گا، لیکن روسیوں نے اسے پھر بھی خالی نہ کیا۔ ۱۷۸۳ء میں قریم کو سلطنت روس میں شامل کر لیا گیا، جس سے گرای کی حکومت ختم ہو گئی۔ بختی گرای [قاموس الاعلام (ص ۳۶۰۷) میں بخت گرای] آخری گرای تھا جس کے نام کے ساتھ لقب خان استعمال ہوا، اس نے جزیرۂ متیلین Mytilene میں رمضان ۱۲۱۵ھ / جنوری ۱۸۰۱ء میں وفات پائی (نیز رک بہ باغچہ سرای، جہاں ماخذ دیے گئے ہیں)۔

[اس خاندان کے حکمران علم و ہنر کے قدردان اور سرپرست تھے، چنانچہ ان میں سے ایک شاہین گرای ترکی کا اچھا شاعر تھا۔ گب نے اس کی ایک غزل مدوّر نقل کی ہے جس کا ہر شعر "ی" سے شروع ہوتا ہے اور "ی" ہی پر ختم ہوتا ہے، مثلاً پہلا شعر یوں ہے کہ:

یاد گلوب عاشقک منزلینه قیلسه جانی نه
اتیمه می گون یوزک دیده سنی روشنای

اور آخری شعر یوں ہے کہ:

یاره ایدر اهل عشق طورمیوب غرض هنزد
نوبت عوض هنر سنده می شاهین گرای

(W. BARTHOLD)

www.besturdubooks.wordpress.com

* **گرج** : رک بہ گُرْج.

* **گرجستان** : رک بہ گُرْج.

* **گُرچانی** : ایک بلوچ قبیلہ، جس کے کچھ افراد ضلع ڈیرہ غازی خان کے میدانوں میں اور کچھ اس کے قریب کوہ سلیمان کی پہاڑیوں ماری اور درا گل اور شم اور پھیلاوغ کے بلند میدانوں میں آباد ھیں ۔ یہ لوگ مخلوط النسل ھیں ۔ ان میں سے بعض سندھی راجپوتوں کی نسل کے ڈوڈائی ھیں اور باقی خالص نسل کے رند بلوچ ۔ ان کے سردار کا خاندان ڈوڈائی جماعت سے تعلق رکھتا ھے ۔ ماضی میں یہ قبیلہ بے حد شورش پسند تھا اور اپنے اکثر ھمسایوں اور سکھوں کے ساتھ نبرد آزما رھا ۔ ۱۸۴۸ء میں انھوں نے سکھوں کے خلاف جنگ میں ایڈورڈس Edwardes کا ساتھ دیا ۔ لشاری اور دُرکانی گروہ پہاڑی ھیں اور بہت ھی دشوار گزار پہاڑی علاقے میں آباد ھیں.

مآخذ : (۱) *The Baloch* : Longworth Dames، *Race*، لندن ۱۹۰۴ء؛ (۲) Edwardes : *A Year on the Punjab Frontier*، لندن ۱۸۵۰ء.

(M. LONGWORTH DAMES)

* **گَرْدیْزی** : ابو سعید عبدالحیّ بن الضّحاک بن محمود، ایک ایرانی مؤرخ، جس کے حالات زندگی کے بارے میں ھمیں کچھ معلوم نہیں ۔ جیسا کہ اس کی نسبت سے ظاھر ھے وہ گردیز میں پیدا ھوا تھا (گردیز کو عموماً عربی میں کردیز لکھا جاتا ھے مثلاً یاقوت، ۴ : ۲۵۸، لیکن بعض اوقات جَرْدیز بھی لکھا جاتا ھے، جیسا کہ العُتْبی : تاریخ الیمینی میں از اول تا آخر آیا ھے ۔ اس سے اس امر کی تصدیق ھوتی ھے کہ اس کا تلفظ گ کے ساتھ ھے) ۔ یہ مقام غزنہ سے ایک دن کی مسافت پر ھندوستان جانے والی سڑک پر واقع ھے (المقدسی، طبع de Goeje، ص ۳۴۹) ۔ گردیزی کی زَیْنُ الاخبار عبدالرشید غزنوی کے عہد حکومت (۴۴۱ھ/ ۱۰۴۹ء تا ۴۴۴ھ / ۱۰۵۳ء) میں لکھی گئی تھی ۔ اس میں شاھانِ ایران، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور ان کے خلفاءؓ ۳۲۳ھ / ۹۳۵ء تک کی خراسان کی مفصل تاریخ، یونانی علوم (در معارف رومیان) پر مقالات اور مختلف اقوام کے تاریخ وار سلسلۂ واقعات اور ان کی مذھبی رسوم کے حالات شامل ھیں ۔ اس میں ایک باب ترکوں کے متعلق ھے، جس سے وسط ایشیا کے جغرافیے کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات بہم پہنچتی ھیں اور ایک ھندوستان پر ھے ۔ گردیزی نے تاریخی مآخذ کے قطعاً حوالے نہیں دیے ۔ ترکوں سے متعلق باب کے سلسلے میں اس نے ابن خرداذبہ، الجیہانی اور ابن المقفّع کے بیانات پر بھروسا کیا ھے ۔ وہ بتاتا ھے کہ اس نے ھندوستانی تہواروں کے بارے میں معلومات البیرونی سے حاصل کی تھیں؛ اسی بنا پر اسے البیرونی کا شاگرد سمجھا جاتا ھے ۔ گردیزی نے مشرق کی تاریخ نویسی کو بہت کم متاثر کیا ھے اور اس کا حوالہ شاذ و نادر ھی دیا جاتا ھے (دیکھیے Rieu : *Catalogue*، ص ۲۲۰ ب) ۔ ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء کا لکھا ھوا ایک قلمی نسخہ کتابخانۂ ہوڈلین Bodleian (Ouseley ۲۴۰) میں موجود ھے ۔ مغربی مصنفین نے عموماً اسی کو استعمال کیا ھے اور اکثر اوقات اسے واحد مخطوطہ سمجھا جاتا ھے (حتّٰی کہ *Grundr. d. Iran Phil.*، ۲ : ۳۵۶، میں بھی) ۔ اس مخطوطے میں سے ترکوں سے متعلقہ باب کو دوبار شائع کیا گیا ھے (W. Barthold : *Otčet o poyezdke v srednyuyu Aziyu*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۸۷ء، ص ۷۸ ببعد؛ Géza Kuun : *Keleti Kútfők*، ۱۸۹۸ء، ص ۵ ببعد و *Keleti Szemle*، ۱۹۰۳ء، ص ۱۷ ببعد) اور ترجمہ ھوا ھے (روسی اور ھنگاروی زبان میں) ۔ ایک اور مخطوطہ کیمبرج (King's Coll. Library شمارہ ۲۱۳) میں موجود ھے، جس کی طرف

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۱۸۶۸ء میں Morley نے توجہ دلائی تھی (*Journ. R. As. Soc.*، ۳ : ۱۲۰) ۔ مقالۂ ھذا کا مصنف ثابت کر چکا ہے (*TurKestan v epokhu mongolskago nashestviya* ۲ : ۵۲۰) کہ مخطوطۂ Ouseley، شمارہ ۲۴۰، لازمی طور پر King's College کے نسخے، عدد ۲۱۳، کی نقل ہوگا ۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ راورٹی Raverty نے کونسا نسخہ استعمال کیا تھا (طبقات ناصری، ص ۹۰۱) ۔ سخاؤ Sachau اور ایتھے Ethé نے (*Catalogue*، ص ۹ ببعد) زینُ الاخبار کے مضامین کا سیر حاصل تجزیہ کیا ہے (دیکھیے تاریخی ابواب کے اقتباسات، در Barthold : *Turkestan*، ۱ : ۱ ببعد اور تصحیحات، ۲ : ۵۱۳؛ نیز گردیزی نے البیرونی کی کتاب الہند سے جو اقتباسات نقل کیے ہیں ان کے بارے میں دیکھیے Sachau : *Alberuni's India*، انگریزی ترجمہ، ۲ : ۳۶۰ و ۳۹۷؛ گردیزی اور سلامی کے باہمی تعلق کے متعلق دیکھیے W. Barthold، در *Orientalische Studien The Nöldeke dargebracht*، ۱ : ۱۷۳ ببعد ۔

(W. BARTHOLD)

گِرگا : بالائی مصر کا ایک صوبہ (مدیریۃ)، ضلع (مرکز) اور شہر ۔ اس کے نام کا اشتقاق غیر یقینی ہے ۔ غالباً گرگا میں ولی گرگس (St. George) کا نام پنہاں ہے ۔ علی مبارک نے اس کا تعلق دَگرگا اور دِگرگا کے ناموں سے بتایا ہے، جو اسی ضلع میں معروف ہیں (دِگرگا کا ذکر ابن جبیر، ص ۱۸۹، اور ابن دقماق، ۵ : ۲۷، نے بھی کیا ہے) ۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصری ماخذ گرگا سے واقف نہیں تھے، چنانچہ القضاعی نے کُوَرات کی فہرست میں اس کا ذکر نہیں کیا، تاہم یاقوت کے ہاں یہ نام نظر آتا ہے ۔ صوبے کے طور پر اس کا نام پہلی بار *Description de l' Egypte*، ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۸ء، میں آتا ہے ۔ روک ناصری مصنفۂ ۷۱۵ھ / ۱۳۱۵ء تک میں یہ نام نہیں ملتا، لہٰذا گرگا کا صوبہ پہلی بار غالباً دور عثمانیہ میں بنا ہوگا ۔ خدیووں کے عہد میں صوبۂ گرگا کا صدر مقام سوھاگ بنا دیا گیا اور شہر گرگا کی حیثیت گر کر محض ایک ضلع کے صدر مقام کی رہ گئی ۔ یہ شہر لکڑی اور چمڑے کی صنعتوں کی وجہ سے مشہور تھا اور یہ کام دیگر مصری صنعتوں کی مانند عیسائیوں کے ہاتھ میں تھا ۔ اس شہر کی کثیر عیسائی آبادی اس کی قدامت کی دلیل ہے ۔ جب تک حجاج کے قافلے قُصَیر کے راستے سے جاتے رہے یہ شہر خوشحال رہا کیونکہ یہاں کے لوگ حاجیوں کو کھانے پینے کی چیزیں خصوصاً بَقْسماط (بسکٹ) مہیا کرتے تھے ۔ راستے کی تبدیلی کے ساتھ ہی گرگا پر زوال آنے لگا (دیکھیے یہی حال عَیْذاب [رک بآں] کا ہوا) ۔ محمد علی کے عہد میں اس شہر کو، جس کی تعمیرات بہت عمدہ تھیں، دریاے نیل کی طغیانی سے نقصان پہنچا، لیکن اسمٰعیل کے عہد میں حفاظتی تدابیر اختیار کر کے اسے تباہی سے بچا لیا گیا ۔ ۱۹۲۷ء میں شہر کی کل آبادی ۱۹۸۹۳ تھی، جس میں ۵۴۴۳ قبطی تھے اور صوبے کی کل آبادی ۷۰۰۰۰ تھی ۔

مآخذ : (۱) علی مبارک : خِطَط جدید، ۱۰ : ۵۳؛ (۲) یاقوت : معجم، ۲ : ۴۸؛ (۳) Boynet Bey : *Dictionaire Geographique de l' Egypte*، ص ۲۱۴، بذیل Guerga؛ (۴) Baedeker : *Egypte*، ج ۵، بمدد اشاریہ ۔

(G. H. BECKER)

گُرگان : رک بہ جُرجان ۔

گُرگانج : (عربی جُرجانیہ)، شمالی خوارزم کا ایک شہر ۔ شہر کے محل وقوع اور دریاے جیحون کے معاون کے بارے میں، جو اس کے پاس سے گزرتا ہے، رک بہ آمُودریا ۔ اگرچہ اس کا ذکر پہلی بار عربوں کے ہاں ملتا ہے لیکن یہ بلاشبہہ

www.besturdubooks.wordpress.com

زمانۂ قبل از اسلام میں بسایا گیا تھا ۔ خوارزم کے قدیم ترین چینی نام یوی کین Yüe Kien کا سراغ بلا شبہہ گرگانج کے نام میں ملتا ہے ۔ عرب فتح (۹۳ھ/۷۱۲ء) سے متعلق مآخذ میں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ عربوں نے ملک کے شمالی حصے کو کس حال میں پایا تھا ۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں خوارزم دو خود مختار سلطنتوں میں تقسیم ہو گیا ۔ خوارزم شاہ کا علاقہ، جس میں اس ملک کا قدیم پای تخت کاث شامل تھا، اور امیر گرگانج کا علاقہ ۔ البیرونی (*Chronology*، طبع Sachau، ص ۳۶) کے بیان کی رو سے جو شاہی خاندان کاث میں رہتا تھا اسے عرب فتح کے بعد شاہی خطاب (شاہیة) محض برائے نام حاصل رہا ۔ اس کے بعد اصل حکومت (ولایة) کبھی تو اس خاندان کے ارکان کے ہاتھوں میں رہی اور کبھی دوسرے کے، حتی کہ آخری فرمانروا کے عہد میں شاہیة اور ولایة دونوں قطعی طور پر اس کے ہاتھ سے جاتی رہیں ۔ سخاؤ (*Sitz. Ber. Wien. Ak.*، ۷۳ : ۴۹۹) نے اس بیان سے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ قدیم خاندان کاث میں رہتا تھا اور عرب والی گرگانج میں اور اس دو عملی کی وجہ سے سیاسی اعتبار سے شمالی علاقے کی جنوبی علاقے سے علٰحدگی عمل میں آئی تھی ۔ ۳۸۵ھ / ۹۹۵ء میں امیر گرگانج کاث فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس خاندان کا تختہ الٹ دیا جو زمانۂ قبل از اسلام سے اس پر حکومت کرتا رہا تھا ۔ اس طرح اس نے خوارزم کو ایک بار پھر ایک سلطنت کے ماتحت منظم کر کے خوارزم شاہ کا لقب اپنے خاندان میں منتقل کر لیا ۔

چوتھی / دسویں صدی کے عرب جغرافیہ دانوں نے گرگانج کو خوارزم کا دوسرا بڑا شہر بیان کیا ہے (دیکھیے W. Barthold : *Turkestan*، ۲ : ۱۳۶ ببعد؛ G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۴۴۷ ببعد)؛ کاث کے قدیم شہر کے مقابلے میں تجارت اور صنعت کے اعتبار سے گرگانج اس زمانے میں بڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا ۔ دونوں سلطنتوں کے متحد ہو جانے کے بعد کاث اور گرگانج اس مملکت کے دو دارالحکومت بیان کیے جاتے ہیں جن کو مساوی مراعات حاصل تھیں، لیکن آخری بادشاہوں اور والیوں کے عہد میں کاث کی رونق گرگانج کے مقابلے میں بالکل ماند پڑ گئی ۔ گرگانج کی انتہائی خوشحالی کا زمانہ چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی اور ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے خوارزم شاہوں کے عہد کے مطابق ہے (یاقوت ۲ : ۵۴، ۴۸۶؛ ۴ : ۲۶۰ ببعد)۔ اس خاندان کے بارونق پائے تخت کے بارے میں جو معلومات میسر ہیں نامکمل ہیں ۔ اس زمانے میں گرگانج سے تین فرسخ کے فاصلے پر ایک اور شہر تھا جسے ''گرگانج خرد'' کہتے تھے ۔ مغلوں کے محاصرے اور شہر کی فتح (۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء) کا جو حال الجوینی نے قلمبند کیا ہے اس سے ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے گرگانج کے جغرافیے سے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں، دیکھیے متن در Schefer : *Chrestomathie Persane*، ۲ : ۱۳۶ ببعد؛ اور دیگر مآخذ سے موازنہ، در W. Barthold : *Turkestan*، ۲ : ۴۶۷ ببعد؛ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر شہر کو مسمار کر دیا گیا، بند تباہ کر دیے گئے اور سارے ضلع میں آمو دریا کا سیلاب آ گیا ۔ اس کے برعکس دیگر مآخذ (الجوزجانی : طبقات ناصری، ترجمہ Raverty، ص ۲۸۱، ۱۰۰۰؛ دیکھیے نیز عبدالکریم بخاری، طبع Schefer، ص ۷۸) کی رو سے بہت سی عمارتیں جن میں سلطان تکش کا مقبرہ بھی شامل تھا، تباہی سے بچ گئیں ۔ ایک مینار پر ایک کتبہ ملا ہے (دیکھیے تصویر در H. Landsdell : *Through Russian Central Asia*، ص

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۵۱۷) جس میں تاریخ تعمیر ۴۰۱ھ/۱۰۱۰-۱۰۱۱ء) دی گئی ہے، اسے کاتانوف Katanow نے (*Zapiski vost. otd. arkh. obshč*، ۱۴ : ۱۵ ببعد) شائع کیا ہے۔ اس سے دراصل یہ پتا چلتا ہے کہ مغل عہد سے پہلے کے گرگانج کے بعض آثار آج بھی باقی ہیں۔ تجارتی شہر کے بارے میں جو چند سال بعد ایک اور مقام پر آباد ہوا رک بہ اُرگنج۔

مآخذ: مقالہ میں درج ہیں۔

(W. BARTHOLD)

* گرم سیر: (فارسی) فارس اور کرمان کے گرم ساحلی علاقے کو کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں سرد پہاڑی علاقوں کو سرد سیر کہتے ہیں۔ عرب جغرافیہ نگاروں نے ان الفاظ کو جَرُوم اور سَرُود یا صَرُود کی شکلوں میں معرّب کر لیا ہے۔

* گرمیان اوغلو: ایک ترکمانی (حکمران) خاندان کا نام ہے جس نے سلجوقی سلطنت کے زوال کے بعد، خود مختاری اختیار کر کے کوتاہیہ Kiutahia کو جسے قدیم زمانے میں Cotyaeum کہتے تھے، اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا، اصل میں گرمیان ایک قبیلے کا نام تھا جس کا بعد ازاں اس شاہی خاندان پر اطلاق ہونے لگا (دیکھیے Houtsma: *Recule*، ۴ : ۲۲۹، ۲۳۲، ۳۲۶ ببعد، ۳۳۲ ببعد)۔ والی کوتاہیہ Cotyaeum (KantaKuzenos)، جلد ۲ : ۸۲) کا ذکر عثمان اور صُرحان اور پنتیشہ وغیرہ کے ساتھ ملتا ہے جو بوزنطینی سلطنت کے ایشیائی مقبوضات پر حملہ آور ہوے تھے۔ اس نے دیگر مقامات کے علاوہ کلّہ اور دریاے میندر کے کنارے طرابلس پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے الاشہر (Philadelphia) کو بھی فتح کرنے کی کوشش کی، لیکن Katalans اور Almugavars کے ساتھ جنگ میں شکست فاش کھائی (۱۳۰۴ مگر Muralt کی رو سے ۱۳۰۶ء) (دیکھیے Pachymeres، ۲ : ۴۲۱ ببعد، Muntaner، نواح ۲۰۵)۔ ترکی مآخذ کے مطابق ارطغرل کے زمانے میں "علی شیر"، گرمیان کا والد" افیون قراحصار پر حکومت کرتا تھا (نشری اور اس کے ناقل)۔ ابن بطوطہ کا ایک معاصر شہاب الدین، علی شیر کے بیٹے گرمیان کو کوتاہیہ کے حکمران کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اس بیان کی تصدیق گرمیان خان کے ۷۰۷ھ/۱۳۰۷ء کے ایک سکے سے ہوتی ہے جو شہر گرمیان میں مضروب ہوا تھا (اسمٰعیل غالب نے اپنے سلجوقی سکّوں کے مجموعے کی فہرست، شمارہ ۱۷۵ میں اسے یکتا قرار دیا ہے)۔

چودھویں صدی عیسوی کے اواخر تک کی خاندان گرمیان کی تاریخ کے متعلق ہماری معلومات افسوسناک حد تک محدود ہیں۔ منجّم باشی، جلد ۳، ص ۳۴ ببعد نے حکمرانوں کی حسب ذیل فہرست دی ہے: گرمیان بیگ، علی شیر بیگ، عَلَم شاہ، علی، یعقوب، لیکن یہ ہم عصر مؤرخین کے بیانات اور دیگر دستاویزات کے مطابق نہیں۔ ہمیں کوتاہیہ کے ایک کتبے سے جو ۷۷۹ھ/۱۳۷۷ء میں لکھا گیا تھا یہ پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں سلیمان شاہ گرمیان پر حکومت کرتا تھا اور وہ محمد کا بیٹا اور یعقوب کا پوتا تھا۔ خلیل ادھم کے بیان کے مطابق یہ یعقوب وہی "امیر اعظم" یعقوب بن علی شیر ہے جس کا انقرہ کے کتبے مکتوبۂ ۶۹۹ھ/۱۲۹۹ء میں ذکر آیا ہے۔ ممکن ہے کہ یعقوب کا باپ علی شیر وہی علی شیر حاکم گرمیان ہو جس کا بوزنطینی اور عثمانی مؤرخین نے ذکر کیا ہے، لیکن وہ کریم الدین علی شیر نہیں ہو سکتا (Houtsma: *Recueil*، جلد چہارم ۴، ص ۲۹۹) جو قلج ارسلان چہارم کے عہد میں (۶۵۵ تا ۶۶۳ھ) مارا گیا تھا۔ اس کے پوتے یعقوب ثانی کی دستاویز وقف کی رو سے محمد نے کوتاہیہ اور سیماو (Simav) فتح کیے تھے۔ اس کے با اس

www.besturdubooks.wordpress.com

کے جانشین سلیمان شاہ کے دورِ حکومت میں قراحصار اور ڈینزلی کے اضلاع گرمیان کی ریاست میں شامل کر لیے گئے ۔ سلیمان شاہ (ترکی مؤرخین اسے محض گرمیان اوغلی لکھتے ہیں) نے اپنی بیٹی خاتون سلطان کی شادی ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء میں مراد اول کے بیٹے بایزید کے ساتھ کر دی اور اسے جہیز میں اپنی ریاست کے بڑے بڑے شہر جن میں صدر مقام بھی شامل تھا، دے دیے ۔ اس کے بیٹے یعقوب (ثانی) کو جو ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء میں اس کی جگہ تخت نشین ہوا تھا، بایزید نے ۷۹۳ھ/۱۳۹۱ء میں قید کر کے روم ایلی میں اپسلہ کے مقام پر نظر بند کر دیا اور اس کی ساری ریاست ضبط کر لی ۔ یعقوب اپسلہ سے فرار ہو کر تیمور کے پاس چلا گیا اور جنگ انقرہ کے بعد ان تمام چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کی مانند جن کی ریاستیں بایزید نے چھین لی تھیں، اس کی ریاست بھی تیمور نے واگذار کر دی تھی ۔ جب تیمور آناطولی سے رخصت ہوا تو یعقوب کو بایزید اول کی میت اور اس کے قیدی بیٹے موسیٰ چلبی کا محافظ مقرر کر گیا ۔ یعقوب نے ان دونوں کو محمد چلبی کی تحویل میں دے دیا ۔ محمد چلبی اور مراد ثانی سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ تادم مرگ بغیر کسی خرخشے کے اپنی ریاست پر قابض رہا ۔ جب وہ اولاد نرینہ چھوڑے بغیر انتقال کر گیا تو مراد ثانی نے اس کی جائداد بحق سرکار ضبط کر لی ۔ محمود ثانی کی جانشینی کے موقع پر ۱۴۵۳ء میں ایک مدعی حکومت نے علم بغاوت بلند کیا اور قرامان اوغلو نے اس کی اعانت کی مگر یہ بغاوت جلد ہی دبا دی گئی ۔ اس وقت گرمیان کے علاقے کو گرمیان اور قراحصاری صاحب کی دو سنجاقوں میں تقسیم کر دیا گیا، ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء میں کوتاہیہ آناطولی کے بیگلر بیگ کا صدر مقام بن گیا ۔ حسب ذیل شجرۂ نسب کی بنیاد اس مواد پر ہے جو دستیاب ہو سکا ہے ۔

علی شیر (۷۰۰ھ کے قریب)
|
گرمیان خان (۷۰۷ تا ۷۳۰ھ کے قریب)
|
محمد = یعقوب اول
|
سلیمان شاہ (۷۷۹ھ کے قریب)
|
یعقوب ثانی (۷۹۰ تا ۷۹۳ھ؛ ۸۰۵ تا ۸۳۲ھ)

اس سلسلے میں بہترین مأخذ حلیل اِدْھم ہے (در *Revue Historique publiee par l' Institut d' Histoire Ottoman I*، ص ۱۱۲ ببعد؛ سلیمان شاہ اور یعقوب ثانی کے انتہائی کمیاب سکّوں کا ذکر احمد توحید نے *Catalogue of the Moh. Coins in the Ottoman Museum* کے حصۂ چہارم، ص ۲۹۴ ببعد و ۵۲۹ میں کیا ہے ۔

مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں ۔

(J. H. MORDTMANN)

گَزُولی: رک بہ جَزُولی ۔

گَزہ (Gaza): رک بہ غَزّہ ۔

گَکھڑ: قبیلۂ گکھڑ پنجاب میں راولپنڈی، اٹک اور جہلم اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں ضلع ہزارہ، نیز چناب کے مغرب میں ریاست جموں کے علاقوں میں آباد ہے ۔ یہ سب لوگ (مذہباً) مسلمان ہیں اور برصغیر کے شمال مغربی پہاڑی علاقوں اور دامن کوہ کے اضلاع کی زراعت پیشہ اقوام میں انہیں ایک بلند معاشرتی مقام حاصل ہے اور عام طور پر راجپوت نسل کے قبیلوں سے علٰحدہ سمجھے جاتے ہیں ۔ ان میں سے بعض اپنے آپ کو مغل کہتے ہیں، لیکن راجا جہاندار خان (ہزارہ گکھڑوں کے سردار) کا دعوٰی تھا کہ وہ نوشیروان اور یزدگرد کی اولاد میں سے ہیں اور ان کا لقب کیانی ہے ۔ وہ بیان کرتے تھے کہ ان کے اسلاف

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

ایران سے نکل کر چینیوں کے ماتحت تبت پر حکومت کرتے رہے، پھر انھوں نے اسلام قبول کرلیا اور کابل چلے آئے ۔ بالآخر وہ محمود غزنوی کے ساتھ برصغیر میں داخل ہوئے ۔ ظاہر ہے کہ یہ بیان مصدقہ نہیں ہے، لیکن اس میں گکھڑوں کے ہاں کی ایک مشہور روایت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ ان کی ابتدا وسط ایشیا سے ہوئی تھی ۔ بہت اغلب ہے کہ گکھڑ ان اقوام میں سے ایک ہوں جو عہد کشاں سے لے کر ہپتالیوں (ہیاطلہ، Epthalites) کے زمانے تک برصغیر میں داخل ہوتی رہیں ۔ لیکن اس امر کا کوئی قطعی اور بین ثبوت دستیاب نہیں ہوتا ۔ کننگھم Cunningham کی رائے میں وہ کشان (Kushans) ہی تھے ۔ زمانۂ مابعد کے اکثر مؤرخین انھیں وہی قوم سمجھتے رہے ہیں جس کا ذکر تاریخ فرشتہ، ترجمۂ Briggs، ۱ : ۴۶، ۱۸۲ میں گکّر (Gukkurs) کے نام سے کیا گیا ہے ۔ اس قوم نے ۳۹۹ھ/۱۰۰۸-۱۰۰۹ء میں محمود غزنوی کے مقابلے میں ہندو راجاؤں کی متحدہ افواج میں شمولیت اختیار کی تھی ۔ اس کے بعد ۶۰۲ھ/۱۲۰۵-۱۲۰۶ء میں محمد بن سام کے خلاف بھی یہ قوم لڑی ۔ فرشتہ نے اس کے قتل کا الزام ان پر عائد کیا ہے؛ تاہم ہمارے پاس اس بات کے لیے مضبوط دلائل موجود ہیں کہ قبیلۂ زیر بحث کا نام گکھڑ کے بجائے کوکر (برائے کھوکھر) پڑھنا چاہیے ۔ جہاں تک ۶۰۲ھ کے واقعات کا تعلق ہے Raverty (طبقات ناصری، ترجمہ، ۱ : ۴۸۵ حاشیہ) نے اس پر مکمل بحث کی ہے، تاہم جہاں تک محمود غزنوی کے زمانے میں ۳۹۹ھ کے واقعات کا تعلق ہے یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ جس بہادر دستے نے پشاور کے قریب اس کی فوج پر شبخون مارا تھا وہ کھوکھر نہیں بلکہ گکھڑ ہی تھے، کیونکہ یہ مقام گکھڑوں کے علاقے کے قریب واقع ہے ۔ اس کے برعکس کھوکھر وسطی پنجاب کے رہنے والے ہیں ۔ بہرحال پرانی تاریخوں مثلاً تاریخ یمینی یا طبقات ناصری میں اس قوم کا کہیں ذکر نہیں ملتا ۔ ہمارا واحد ماخذ فرشتہ ہے جو اس کے نام کو کھکر کی صورت میں قلمبند کرتا ہے ۔ ممکن ہے کہ بلبن نے کوہ جود [کذا] (Salt Range) کے پہاڑی قبیلوں پر جو حملہ کیا تھا وہ انھیں کے خلاف ہو ۔ شہنشاہ بابر کے زمانے میں گکھڑ ایک بار پھر گمنامی کے پردے سے باہر نکلے ۔ ۹۲۵ھ/۱۵۱۹ء میں بابر نے کوہ جود [کذا] کے دو گکھڑ سرداروں کے باہمی جھگڑے میں مداخلت کی ۔ اس نے ان کا قلعہ پرہالہ فتح کرلیا اور ہاتی خان گکھڑ نے اس کی اطاعت قبول کر لی، لیکن بعد ازاں وہ پھر باغی ہو گیا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ قبیلے کی سرداری اس کے حریف سردار تاتار خان کے کنبے ہی میں رہی جس کی بابر نے اعانت کی تھی، اور جیسا کہ آئین اکبری سے معلوم ہوتا ہے اکبر کے عہد میں تاتار خان کے بیٹے سلطان سارنگ اور سلطان آدم اس قبیلے پر حکمران تھے اور سارنگ خان کا پوتا نظر خان پنج صدی (بعد ازاں ۱۰۰۱ھ میں یک ہزاری) کے منصب پر فائز تھا ۔ جہانگیر اپنی توزک میں اس سفر کا حال بیان کرتا ہے جو اس نے ۱۰۱۶ھ میں گکھڑوں کے علاقے میں کیا تھا ۔ اس نے نظر خان کے باپ سید خان کی ایک بیٹی سے شادی بھی کی تھی ۔ وہ لکھتا ہے کہ گکھڑوں کا علاقہ راولپنڈی اور حسن ابدال کے درمیان درۂ مارگلا تک پھیلا ہوا ہے ۔ سکھوں کی حکومت میں انھیں خاصے مصائب اٹھانا پڑے، لیکن اس کے بعد وہ پھر سنبھل گئے ہیں اور اب اچھی حیثیت رکھتے ہیں ۔ انگریزی حکومت میں انھیں خاص طور پر فوج میں بھرتی کیا جاتا تھا ۔

گکھڑ پانچ قبیلوں میں منقسم ہیں : بگیال، اسکندرال، فیروزال، آدمال اور سارنگال ۔ یہ نام ان

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کے آباء و اجداد کے ناموں پر رکھے گئے ہیں ۔ مؤخر الذکر دونوں قبیلے عہد اکبری کے سرداروں آدم اور سارنگ کی اولاد سے ہیں ۔ سارنگال ہزارہ اور اٹک میں اور آدمال راولپنڈی اور جہلم میں آباد ہیں ۔ ان کے سرداروں کا لقب پہلے سلطان تھا، لیکن سکھوں کے زمانے سے راجا ہے ۔ مرحوم راجا جہانداد خان سی ۔ آئی ۔ ای اپنے زمانے کے نامور لوگوں میں سے تھے ۔ ان کی جگہ ۱۹۰۶ء میں ہزارہ کے گکھڑوں کا سردار ان کا بیٹا علی حیدر خان بنا ۔

مآخذ : (۱) Ibbetson : *Out-lines of Panjab Ethnography*، (کلکتہ ۱۸۸۳ء)، ص ۳۰۰؛ (۲) Griffen : *Panjab Chiefs*، (لاہور)؛ (۳) فرشتہ : تاریخ، لیتھو طبع لکھنؤ، ۱ : ۲۶ تا ۵۸ (ترجمہ Briggs، ۱ : ۱۳۶ و ۱۸۲)؛ (۴) Elliot and Dowson : *History of India*، ج ۲، ضمیمہ، ص ۴۴۳؛ (۵) ابوالفضل : آئین اکبری، Blochmann ۱ : ۴۸۶ (کلکتہ ۱۸۷۳ء)؛ (۶) Massy : *Chiefs and Families of the Panjab*، (الٰہ آباد ۱۸۹۰ء)، ص ۴۲۳؛ (۷) طبقات ناصری، ترجمۂ انگریزی از Raverty، ۱ : ۴۸۱ ببعد (لنڈن ۱۸۸۱ء)؛ (۸) توزک بابری، ترجمۂ Erskine، لنڈن ۱۸۲۶ء، ص ۲۶۹؛ (۹) Cunningham : *Later Indo-Scythians Num. Chron.*، ۱۸۹۳ء، ص ۹۴ ۔

(M. LONGWORTH DAMES)

⊗ **تعلیقہ :** گکھڑ قوم کا پاکستان و ہند کی تاریخ میں ایک خاص مقام ہے ۔ اس قوم کی تاریخ "کیگوہر نامہ" کے عنوان سے زایزادہ دیوان دنی چند نے لکھی تھی جو ڈاکٹر محمد باقر کے اہتمام سے پنجابی ادبی اکیڈمی نے ۱۹۶۵ء میں لاہور سے شائع کی ہے ۔ کتاب فارسی میں ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا تعارف انگریزی میں کرایا ہے اور انہوں نے گکھڑوں کی تاریخ مہاراجا رنجیت سنگھ کے زمانے تک بیان کر دی ہے ۔ اپنے تعارف کے بعد انہوں نے جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ج ۴۰، حصۂ اول، ۱۸۷۱ء، ص ۶۷ تا ۱۰۷ سے لے کر گکھڑوں کی وہ تاریخ بھی شامل کر دی ہے جو J. G. Delmerick نے انگریزی میں لکھی تھی اور جس میں فاضل مقالہ نگار نے گکھڑ سلاطین اور سرداروں کا بقید تاریخ ذکر کیا ہے ۔ ان تینوں ماخذ سے استفادہ کر کے ذیل میں اس قوم کی مختصر تاریخ درج کی جاتی ہے ۔

۱۰۲۱ تا ۱۷۷۳ء نیلاب (سندھ) سے چناب تک گکھڑ وسیع علاقے کے مالک رہے ہیں ۔ وہ اپنا نسب کیگوہر (کے گوہر) سے شروع کرتے ہیں جو کے قباد اور کے کاؤس شاہان ایران کا معاصر اور اصفہان کا حکمران تھا ۔ سلطان کیگوہر کے بیٹے نے تبت فتح کیا اور اپنے لڑکے سلطان تبت کے حوالے کیا ۔ کئی نسلوں تک یہ سلاطین تبت پر حکمرانی کرتے رہے اور پھر ان میں سے سلطان قاب نے کشمیر فتح کیا ۔ یہاں بھی کئی نسلوں تک یہ حکمران رہے ۔ ان کے تیرھویں سلطان رستم کو کشمیریوں نے بغاوت کر کے قتل کر دیا ۔ اس کا لڑکا سلطان قابل، بھاگ کر کابل چلا گیا جسے فتح کر کے اس نے وہاں حکومت قائم کی ۔ ناصرالدین سبکتگین نے لمغان کے مقام پر ۹۷۶ء میں سلطان قابل سے لڑائی کی ۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان دوستانہ مراسم قائم ہو گئے ۔ قابل خان نے سبکتگین کی ملازمت اختیار کر لی اور جب محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس کا بیٹا گکھڑ شاہ ساتھ تھا ۔ تسخیر ہند کے بعد اسے کابل سے لے کر سندھ ساگر دوآب کی حدود تک کا علاقہ عطا ہوا ۔ اس نے بعد میں دریائے جہلم کے کنارے پر اس قصبے کو اپنا دارالحکومت بنایا جسے اب رام کوٹ کہتے ہیں ۔ وہ ۱۰۲۷ء میں فوت ہوا ۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا بیج شاہ ہوا ۔ جب سلطان معزالدین محمد بن سام نے حملہ کیا تو سلطان منگ خان گکھڑ حکمران تھا ۔ منگ خان کی اولاد میں

www.besturdubooks.wordpress.com

سے ملک بوگا خان نے رھتاس میں ایک آزاد حکومت قائم کی جہاں اس نے بوگیال قبیلے کا آغاز کیا جو اب بھی رھتاس اور ڈومیلی میں آباد ھے ۔ ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور کے خلاف گکھڑوں کے سردار مک قاد خان اور اس کا بیٹا گل محمد لڑے ۔ اسی گل محمد نے ۱۴۳۶ء میں گلیانہ شہر آباد کیا ۔ بابر نے گکھڑوں کا ذکر اپنی توزک میں کیا ھے ۔ اس نے ان کے دارالحکومت پھروالہ [پرہالہ] کو فتح کیا ۔ گکھڑ حکمران ھاتھی خان کو شکست ھوئی، لیکن اس نے بابر کے ساتھ صلح کر لی اور سلطان کا خطاب پایا ۔ ھاتھی خان کی وفات پر سلطان سارنگ خان ۱۵۲۵ء میں گکھڑوں کا سردار بنا ۔ دہلی تک سہم کے دوران میں خدمات کے صلے میں بابر نے اسے چناب سے نیلاب (سندھ) تک کا علاقہ عطا کیا ۔ بابر کے اس احسان کو یاد رکھتے ھوے سارنگ خان نے رھتاس کے قلعے کی طرف شیر شاہ سوری کے زمانے میں چھیڑ چھاڑ جاری رکھی اور آخر کار سلیم شاہ سوری نے تخت نشین ھونے پر حملہ کر کے سارنگ خان اور اس کے سولہ بیٹوں کو ۱۵۴۶ء میں ایک لڑائی میں تہ تیغ کر دیا ۔ سلطان سارنگ خان کا مقبرہ روات (نزد راولپنڈی) میں ھے ۔ اس فتح کے باوجود سلیم شاہ گکھڑوں کی مزاحمت کو ختم نہ کر سکا ۔ سلطان آدم خیل اپنے بھائی سارنگ خان کا جانشین بنا ۔ ھمایوں آیا تو اس نے شہزادۂ کامران کو اس کے حوالے کر دیا جو سلیم شاہ سوری کی طرف سے مایوس ھو کر اس کے پاس آیا ھوا تھا ۔ ھمایوں نے پھروالہ کے قلعے میں کامران کی آنکھیں نکلوا دیں ۔ باھمی نزاع کے باعث گکھڑوں میں افراتفری مچ گئی اور شہنشاہ اکبر نے ان کا علاقہ مختلف گکھڑ سرداروں کے درمیان تقسیم کر دیا ۔ ان ایام میں شادمان خان گکھڑ نے اکبر کے خلاف بغاوت بھی کی ۔ گکھڑ سرداروں میں سے کئی ایک جہانگیر، شاھجہان اور عالمگیر کی افواج میں مختلف مناصب پر فائز رھے ۔ جب احمد شاہ ابدالی نے پوٹھوھار کے علاقے پر قبضہ کیا تو اس نے سلطان مقرب خان کو ڈنکلی اور پھروالہ کا پرگنہ دیا، تخت پڑی (اکبر آباد) کا پرگنہ مہابت خان اور علی خان کو اور راولپنڈی کا پرگنہ نوازش علی خان کو ۔ سلطان مقرب خان آخری آزاد گکھڑ حکمران تھا ۔ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ وہ کئی مہموں میں شامل رھا اور اس سے نواب کا خطاب بھی حاصل کیا ۔ اس کے زمانے میں گکھڑ اس قدر طاقتور تھے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھے ۔ وہ ۱۷۶۳ء میں سکھوں سے گجرات میں لڑتا ھوا کام آیا ۔ یہ خبر سن کر احمد شاہ ابدالی نے نواب سر بلند خان کو بھیجا ، مگر سکھوں نے اسے اور نواب مقرب خان کے بیٹوں کو شکست دی اور گکھڑوں کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا ۔ اس طرح ۱۷۷۳ء میں گکھڑ قبیلے کی حکومت ۷۵۲ سال بعد ختم ھو گئی جس کا آغاز ۱۰۲۱ء میں ھوا تھا ۔

لیگوھر نامہ سے بہت سے قلعوں اور قصبوں کی تاریخہاے تعمیر کا بھی پتا چلتا ھے ۔ یہ بھی معلوم ھوتا ھے کہ گکھڑ خواتین کی شادی مغل شہزادوں سے ھوئی تھی ۔ اس کتاب سے اس امر کا بھی علم ھوتا ھے کہ گکھڑ سردار کیسے اعلیٰ سیاسی شعور کے مالک اور صاحب تدبیر تھے ۔ مذکورۂ بالا سلطان شادمان خان (م ۱۶۶۸ء) اپنے زمانے میں فارسی زبان کا مشہور شاعر بھی تھا ۔ اس کی فارسی شاعری کے سلسلے میں دیکھیے تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ھند، ج ۴، فارسی ادب ۲، طبع لاھور ۱۹۷۱ء ص ۳۷۲ تا ۳۷۷ ۔ (عبدالغنی، رکن ادارہ نے لکھا) ۔

(ادارہ)

گُل : (فارسی)، گلاب کا پھول (لیکن عام پھول کو بھی گل کہ دیا جاتا ھے ۔ اور پھولوں

www.besturdubooks.wordpress.com

کی مختلف اقسام کے ناموں کے ساتھ بھی لفظ گل لایا جاتا ہے) ۔ گلاب کو مشرقی (اردو ۔ فارسی) شاعری میں بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ اسی وجہ سے اس کا نام فارسی، ترکی اور ہندوستانی [اردو] کتابوں کے عنوانات میں اکثر نظر آتا ہے ۔ گل اور بلبل کے باہمی تعلقات پر پیشتر بحث ہو چکی ہے [رک بہ بلبل] لہٰذا ایسی متعدد نظمیں موجود ہیں جن کا عنوان گل [یا] بلبل ہے [یعنی جن کے عنوان میں لفظ گل آتا ہے ۔ اسی طرح بلبل یا عندلیب بھی بعض عنوانات میں ہے ہے ۔ عندلیب (شاہ ناصر، والد خواجہ میر درد دہلوی) کی ایک کتاب کا نام نالۂ عندلیب ہے اور بطور تخلص بھی یہ لفظ استعمال ہوا ۔ عندلیب کی جمع عنادل] ۔ لیکن گل کی اور بھی کئی چیزوں سے نسبت ہے ۔ مثلاً گل استعارۂ محبوب؛ اردو میں اور فارسی میں بھی عجیب بات، انوکھی خلاف توقع بات مثلاً این گل دیگر شگفت میں ۔ دیگر استعمالات کے لیے دیکھیے فرہنگ آنند راج (فارسی) فرہنگ آصفیہ و نور اللغات (اردو)] دیکھیے اشاریہ *Grundriss*، جلد ۲ و در *der Iran. Phil.*، جلد ۲ و در Gibb : *History of Ottoman Poetry*، [جو ترکیبیں بھی قابل توجہ ہیں مثلاً گل و مل، سبزہ و گل ۔ اور] گل و صنوبر وغیرہ ۔ قصوں کہانیوں میں یہ نام بطور عنوان آتے ہیں ۔ گل و صنوبر کا ذکر Ethe نے *Grundriss der Iran* میں کیا ہے، ہندوستانی [اردو] اور ہندوستان کی دیگر مقامی زبانوں میں اس قصے کے لیے دیکھیے *Histoire de la Litter Hindouie*، جلد ۱، ص ۱۰۵ ببعد؛ اسی مصنف نے اس نظم کا ایک مکمل فرانسیسی ترجمہ *Revue Orient et Americ*، جلد ۷، ص ۶۹ تا ۱۲۰ میں شائع کیا ۔ اس کے اصل نسخے جو بلاد مشرق میں شائع ہوے ہیں ان کے لیے دیکھیے Ethe کتاب مذکورۂ بالا ص ۳۲۲ ۔

(Ch. Huart [و ادارہ])

تعلیقہ : دراصل فارسی، اردو اور ترکی شاعری میں گل (و گلزار) کی ایک تہذیبی اہمیت ہے جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔ شبلی نعمانی نے شعر العجم، ج ۴، ص ۱۷۰، ۱۷۱ طبع انوار المطابع لکھنو ۱۳۴۱ھ میں ان محاورات کا ذکر کیا ہے جن میں گل کا لفظ کسی ترکیب اور جملے میں شامل ہو کر خاص معانی پیدا کرتا ہے ۔

فارسی شاعری میں الفاظ گل و گلزار کا بکثرت استعمال، شبلی کی رائے میں تو اس امر کا غماز ہے کہ ایران میں پھولوں کی (سبزہ و گل) کی بڑی کثرت ہے جس کا شاعری میں بھی عکس ابھرتا ہے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایران کا خاصا حصہ ریگستان اور صحرا ہے جیسا کہ جغرافیہ نگاروں اور اکثر سیاحوں نے لکھا ہے (ملاحظہ ہو سید عبداللہ : فارسی زبان و ادب، طبع مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۷ء مقالۂ گل و گلزار کی تہذیبی اہمیت، ص ۵۷-۸۴) اور گل و گلزار کا بکثرت تذکرہ بہتات کی بنا پر نہیں بلکہ سبزہ و گل کی کمی کی بنا پر ہے اور یہ کمی ان کی تمنا کا اظہار کرتی ہے ۔ یوں عام ایرانی پھولوں اور سبزہ و چمن کے شائق ہوتے ہیں ۔ محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب سخندان فارس طبع استقلال پریس لاہور (ص ۳۶۸، ۳۷۲ تا ۳۷۵، ۵۱۳) میں گل کی بہار اور اس کے ساتھ بلبل کی چہک، کا ذکر بڑے رومانی انداز میں کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ایرانی گھروں میں باغیچے آراستہ کرنے کے عادی ہیں اور یہ ان کے ذوق کا حصہ ہے ۔

فارسی اور اردو ادب میں مختلف پھولوں کا ذکر اور ان کی صفات و خواص کا جو تذکرہ ہے اس لیے پھولوں کی اقسام، ان کے رنگوں کی نوعیت، اور دیگر کوائف پر ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے ۔ بعض لوگ گل و بلبل کے استعارے کا ذکر تحقیر سے کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

شعرائے فارسی، اردو و ترکی نے اس ایک استعارے کے توسط سے سیکڑوں بلند حقائق بیان کیے ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے سید عبداللہ : مقالۂ گل و گلزار کی تہذیبی اہمیت در کتاب فارسی زبان و ادب، طبع مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۷ء) [سید عبداللہ رئیس ادارہ نے لکھا]۔ (ادارہ)

* **گل بابا** : ایک بکتاشی درویش - وہ مرزفون (مرزیوان ایشیائے کوچک میں سیواس کی ولایت میں) کا باشندہ تھا - اس نے ترکوں کی کئی جنگوں میں حصہ لیا جو سلطان محمد ثانی، سلطان بایزید ثانی، سلطان سلیم اول اور سلطان سلیمان ثانی کے عہد حکومت میں لڑی گئیں اور بوڈا (اوفن Ofen) کے محاصرے کے دوران ۲۹ ربیع الآخر ۹۴۸ھ/ ۲۱ اگست ۱۵۴۱ء کو شہر کی فصیل کے نیچے ایک جھڑپ میں شہید ہو گیا (پیچوی، ۱ : ۲۲۷) - اسے اسی مقام پر دفن کرنے کے بعد جہاں وہ شہید ہوا تھا، سلطان سلیمان ثانی نے اعلان کر دیا کہ وہ شہر کا محافظ ولی [گوزجی سی = نگران] ہے - باب خروس Khoros کے باہر ولی بے کے گرم پانی کے چشموں کے قریب ایک بکتاشی خانقاہ بھی اسی کے نام سے منسوب کی گئی، اس خانقاہ کو غازی میخال کی اولاد نے خیراتی مقاصد کے لیے قائم کیا تھا - اس ولی کا مزار بوڈاپسٹ میں موجود ہے - یہ ترکن گاسی Turkengasse ترک کوچہ Törökutcza میں واقع ہے - اس کی شکل ہشت پہلو ہے - اس کے گنبد پر سیسے کی چادریں اور لکڑی کے چوکے لگے ہوے ہیں - چوٹی پر ایک لالٹین ہے اور اس کا بیرونی حصہ بیلوں سے ڈھکا ہوا ہے - Toth Béla نے اپنی تصنیف *Szájról Szájra* میں اس ولی پر بحث کی ہے۔

مأخذ : اولیا چلبی، سیاحت نامہ، ۶ : ۲۲۵، ۲۴۴، (اس کا ماخذ وہ معلومات ہیں جو اسے اپنے والد سے حاصل ہوئیں)۔

(CL. HUART)

گلبدن بیگم : شہنشاہ بابر کی بیٹی، ہمایوں کی سوتیلی بہن اور اکبر کی پھپی؛ اس کی ماں دلدار بیگم تھی جس کا اصلی نام صالحہ سلطان تھا اور جو سلطان محمود میرزا فرمانروائے سمرقند کی بیٹی تھی۔ گلبدن کی ولادت شہر کابل میں ہوئی تھی اور جیسا کہ وہ اپنی دلآویز سرگذشت میں بتاتی ہے دسمبر ۱۵۳۰ء کے آخری ہفتے میں جب اس کے والد کا انتقال ہوا تو اس کی عمر آٹھ برس کی تھی، لہٰذا وہ ۹۲۹ھ/ ۱۵۲۲ء میں پیدا ہوئی ہو گی - جب اس کا والد ہندوستان فتح کرنے گیا تو وہ کابل ہی میں مقیم رہی لیکن ۱۵۲۹ء میں وہ اس کے پاس پہنچ گئی، چنانچہ جب اس کا انتقال ہوا تو وہ آگرے ہی میں تھی، ۱۵۳۹ء میں بھی وہیں تھی، جب ہمایوں شکست کھا کر بنگال سے واپس آیا - معلوم ہوتا ہے اس وقت اس کی شادی خضر خواجہ خان سے ہو چکی تھی جو چغتائی خاندان کا ایک فرد اور یونس خاں کا پرپوتا تھا - ریو Rieu بیان کرتا ہے کہ اس کی شادی ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء میں ہوئی تھی لیکن معلوم نہیں کہ اس نے کس سند پر یہ لکھا ہے - اپنے خاوند سے جو ہمایوں اور اکبر کا ایک عہدیدار تھا اور ایک زمانے میں پنجاب کا صوبیدار بھی رہا، اس کے ہاں کم از کم ایک بیٹا محمد یار اور ایک بیٹی پیدا ہوئی - جب ہمایوں ہندوستان سے نکلا تو وہ اس کے ساتھ ایران نہیں گئی بلکہ اپنے بھائیوں کامران اور ہندال کے پاس افغانستان میں رہی اور ۱۵۴۵ء تک پھر ہمایوں سے نہیں ملی - ہمایوں کی وفات تک وہ کابل چھوڑ کر ہندوستان نہیں آئی، یہاں وہ اپنے بھتیجے [اکبر] کے عہدِ حکومت کے دوسرے سال یعنی ۱۵۵۷ء میں پہنچی تھی - ۱۵۷۶ء میں وہ اپنی بھتیجی سلیمہ بیگم اور خاندان شاہی کی دوسری خواتین کے ہمراہ حج کے لیے مکّۂ معظّمہ گئی - واپسی

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کے سفر میں عدن کے قریب ان کا جہاز تباہ ہو گیا اور وہ ۱۵۸۱ء یا ۱۵۸۲ء سے قبل واپس نہ آ سکی (بداؤنی، ترجمہ از Lowe، ص ۲۱۶) - ۱۵۹۰ء میں وہ اکبر کی والدہ کے ہمراہ شہنشاہ سے ملنے کابل گئی۔ الزبتھ ملکۂ انگلستان کی وفات سے چند ہی روز بعد ۶ ذوالحجہ ۱۰۱۱ھ / ۱۷ مئی ۱۶۰۳ء کو وہ آگرے میں وفات پا گئی - اس وقت قمری سال کے حساب سے اس کی عمر ۸۲ سال تھی - اس کی صحیح تاریخ وفات ریو Rieu کی *Catalogue* ۳ : ۱۰۸۳ میں دی گئی ہے - اس کا بے حد احترام کیا جاتا تھا - اکبر نے اس کا جنازہ خود اپنے کندھوں پر اٹھایا تھا.

گلبدن کے بارے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے اپنی جو سرگذشت لکھی، اس کتاب کا نام ہمایوں نامہ ہے اور مسز اے بیوریج Mrs. A. Beveridge نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے اسے طبع اور ترجمہ کیا (لنڈن ۱۹۰۲ء) - بدقسمتی سے اس کا جو واحد نسخہ دستیاب ہو سکا ہے، وہ وہی ہے جس کا ذکر ریو Rieu نے *Catalogue of Persian Mss* ۱ : ۲۴۷ میں کیا ہے، لیکن یہ نسخہ نامکمل ہے اور آخری جملے کے وسط میں ختم ہو جاتا ہے - اس نے یہ سرگذشت اکبر کی درخواست پر لکھی تھی تاکہ اس کے معتمد ابوالفضل کو اپنی تاریخ کے لیے مواد مل سکے۔ غالباً یہ ۱۵۸۷ء کا واقعہ ہے - اس کی کتاب اس لحاظ سے بہت گرانقدر ہے کہ اس میں [بابر اور ہمایوں کی] گھریلو زندگی کی تفصیلات، مصنفہ کی ایک دلآویز تصویر اور ہمایوں کے زمانے کی درباری زندگی کا بیان شامل ہے - اکبر نامہ کی تیسری جلد میں کئی واقعات کے سلسلے میں گلبدن کے حوالے موجود ہیں.

(H. BEVERIDGE)

* **گُلبَرگہ** : رک بہ احسن آباد، گلبرگہ.

* **گُلپایگان** : ایران کا ایک شہر جو دریاے قوم کی زرخیز وادی اور کوہستان زاگروس Zagros کے دامن میں واقع ہے۔ عرب جغرافیہ نگار اسے جرباذ خان یعنی گربا ذ خان لکھتے ہیں - حاجی خلیفہ (جہان نما، ص ۲۹۹) ان دونوں شکلوں سے واقف ہونے کے باوجود دربایگان لکھتا ہے لیکن یہ گربایگان کی جگہ غالباً کتابت کی غلطی کے باعث لکھا گیا ہے - موجودہ زمانے ہی میں اس مقام کا ذکر کثرت سے سننے میں آیا ہے - عرب جغرافیہ نویسوں نے اس کا ذکر محض اصفہان سے ہمذان جانے والی سڑک پر ایک پڑاؤ کی حیثیت سے کیا ہے - اگرچہ گلپایگان ایک ایرانی صوبے کا صدر مقام ہے جس کی زرعی پیداوار مقامی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور اس کے علاوہ وہاں سے افیون، تمباکو اور کپاس بھی برآمد کی جاتی ہے، تاہم اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس پر ادبار طاری رہا ہے - اس کے بارہ تا پندرہ ہزار باشندوں میں کچھ یہودی بھی ہیں جن کے تقریباً ۱۰ خاندان یہاں آباد ہیں.

مآخذ : (۱) یاقوت، معجم، ۲ : ۴۰؛ (۲) Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۲۱۰؛ (۳) Ritter : *Erdkunde*، ۹ : ۶۳؛ (۴) Aubin : *La Perse d' Aujourd'hui*، ص ۳۱۰ ببعد؛ (۵) قزوینی، طبع Wüstenfeld، ۲، ۲۳۳؛ (۶) Schefer : سیاست نامہ، تکملہ، ص ۱۹۲؛ (۷) Brugsch : *Reise nach Persien*، ۲ : ۲۵ ببعد.

(CL. HUART)

گُل خانہ : یا گُل خانہ میدانی، یہ ان باغات کے ایک حصے کا نام ہے جو استانبول میں قدیم شاہی محل کے مشرق میں بحیرۂ مارمورا کے کنارے واقع ہیں۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ پرانے زمانے میں دربار کے لیے گلاب کی مٹھائیاں جس جگہ تیار کی جاتی تھیں وہ یہیں واقع تھی - تاریخ میں اس مقام کو سلطان عبدالمجید کے اس

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

مشہور و معروف فرمان کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے جسے عام طور پر خطِ شریف کہا جاتا ہے اور جس میں اصلاحات کا اعلان کیا گیا تھا ۔ یہ فرمان ۲۶ شعبان ۱۲۵۵ھ/۳ نومبر ۱۸۳۹ء بروز یکشنبہ اسی مقام پر عوام کے سامنے سنایا گیا تھا ۔ دیکھیے تفصیلات Rosen : *Geschichte der Türkei*، ۲، ۱۴ ببعد؛ لطفی: تاریخ، ۶ : ۵۹ ببعد؛ خاص اس جگہ کے بارے میں دیکھیے White : *Three years in Constantinople*، ۱ : ۱۱۰ اور *Revue Histor. publ. par l' Inst.d' Hist. Ott.*، ۱ : ۲۹۱ ببعد.

(J. H. MORDTMANN)

* **الگلدکی** (جلدکی) : علی بن ایدمر بن علی ۔ دیگر ماخذ کی رو سے عزالدین ایدمر بن علی ۔ علوم مخفی بالخصوص کیمیا گری کے بارے میں متعدد کتابوں کا مصنف، ان کتابوں کی تفصیل Brockelmann نے *Gesch. der. arab. Litterat* ۲ : ۱۳۹ میں دی ہے اور حسب ذیل کو مطبوعہ بتایا ہے : المصباح فی اسرار علم المفتاح، ۱۳۰۲، اور نتائج الفکر فی احوال الحجر، بولاق، تاریخ ندارد؛ اس کی زندگی کے بارے میں جو معلومات دستیاب ہوئے ہیں، نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ وثوق سے ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنی ایک کتاب ۷۳۰ھ/۱۳۳۹ء میں دمشق میں اور ایک اور ۷۴۲ھ (جیسا کہ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے، ۷۴۳ھ نہیں) میں قاہرہ میں لکھی تھی، عموماً اس کا سنہ وفات ۷۴۳ھ/۱۳۴۲ء بیان کیا جاتا ہے تاہم Brockelmann نے ۷۶۲ھ/۱۳۶۱ء بتایا ہے ۔

ماٰخذ : رک بہ Brockelmann، کتاب مذکور.

(M. LONGWORTH DAMES)

* **گلڈ** : رک بہ صنف.

⊗ **گلزار عبدالعلی** : (حافظ جھنڈا) ان کے بارے میں پنجابی زبان و ادب کی تاریخیں اور تذکرے خاموش ہیں ۔ فقط احمد حسین قریشی قلعداری نے اپنی کتاب ''پنجابی زبان کی مختصر تاریخ'' مطبوعۂ میری لائبریری، لاہور میں چند معلومات بہم پہنچائی ہیں جن میں انہیں گوجرانوالہ کی ایک معروف شخصیت قرار دیا ہے ۔ علاوہ ازیں وہ بتاتے ہیں کہ ان کے نام سے ایک ''دیوان گلدستہ حافظ جھنڈا'' شائع ہو چکا ہے جو بہت ضخیم ہے ۔ اس کلام کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا کلام پختہ اور اعلیٰ پائے کا ہے ۔ کلام سے اصلاحی رنگ نمایاں ہے ۔ اس کی وجہ ان کی مجاہدانہ شخصیت ہے .

ماٰخذ : متن میں مذکور ہیں.

(شہباز ملک)

* **گلستان** : ایرانی شاعر سعدی شیرازی کی مخلوط نظم و نثر میں ایک مشہور و معروف اخلاقی کتاب ۔ یہ ایک ''مقدمہ'' اور آٹھ ابواب (سیرت پادشاہان، اخلاق درویشان، فضیلت قناعت، فوائد خاموشی، عشق و جوانی، ضعف پیری، تاثیر تربیت، آداب صحبت اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، اس کی بہت سی حکایات شاعر کے ذاتی تجربات کے متعلق معلومات بہم پہنچاتی ہیں، گلستان ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں، یعنی ان کی کتاب بوستان سے ایک سال پہلے پایۂ تکمیل کو پہنچی ۔ اس کا انتساب فارس کے اتابک ابوبکر بن سعد بن زنگی اور اس کے بیٹے سعد کے نام سے کیا گیا ہے ۔ اس کی بہت سی طبعات حسب ذیل لوگوں کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہیں: F. B. Eastwick Hereford ۱۸۵۰ء؛ Johnson ایضاً ۱۸۶۳ء؛ J. T. Platts، لنڈن ۱۸۷۴ء ۔ اس کے ترجمے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں ۔ ترجموں میں سے حسب ذیل کا تذکرہ کر دینا چاہیے : لاطینی : از G. Gentius (*Rosarium Politicum*، ۱۶۰۱ء)؛ فرانسیسی : از D. Allégre (۱۷۰۴ء)؛

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Gaudin (۱۷۸۹ء، ۱۷۹۱ء)؛ Semelet (۱۸۳۴ء)؛ Defrémery (۱۸۵۸ء)؛ Franz Toussaint مع مقدمہ از Comtesse de Noailles، ۱۹۱۳ء)؛ جرمن : از A. Olearius (*Persianisches Rosenthal*، ۱۶۵۴ - ۱۶۶۰ء)؛ Schummel (۱۷۷۵ء)؛ B. Dorn (۱۸۲۷ء)؛ Ph. Wolff (۱۸۴۱ء)، K. H. Graf (۱۸۴۶ء)، G. H. F. Nesselmann (برلن ۱۸۶۴ء)؛ انگریزی : از Gladwin (فارسی متن مع ترجمہ، کلکتہ ۱۸۰۶ء، ۱۸۰۹ء)؛ Dumoulin (۱۸۰۷ء)؛ J. Ross (۱۸۲۳ء)، Eastwick (۱۸۵۲ء)، J. T. Platts (لنڈن ۱۹۷۳ء) E. H. Whinfield (فارسی متن مع ترجمہ و حواشی، لنڈن ۱۸۸۰ء) Edw. Arnold (۱۸۹۹ء)؛ رومانوی : از Gh. Popescŭ Ciocănel (Ploesti ۱۹۰۶ء)؛ پولش : از Biberstein Kazimirsky (پیرس ۱۸۷۶ء)؛ اطالوی : از Gherardo de Vincentiis (منتخبات، نیپلز ۱۸۷۳ء)، عربی از جبرائیل بن یوسف المخلّع (۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء)، اردو : از میر شیر علی افسوس زیر نگرانی جان گلکرائسٹ Gohn Gilchrist (باغ اردو، کلکتہ ۱۸۰۲ء).

مآخذ : (۱) H. Éthé در *Grundr. der Iran. Philol.* ۲ : ۲۹۳ تا ۲۹۶، ۲۹۷، ۵۷۰ [(۲) حالی : حیات سعدی، طبع لاہور؛ (۳) شبلی : شعر العجم، طبع اعظم گڑھ].

(CL. HUART)

گلستان : قفقاز (حکومت ایلسوّیت پول Elisavetpol میں) کا ایک مقام، اس صلح نامے کی وجہ سے مشہور ہے جو یہاں ۱۸۱۳ء میں مکمل ہوا (''صلح نامۂ گلستان'')، نپولین کی شہ پر فتح علی شاہ نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا، اسلانڈوز اور لنکران کے مقامات پر روسی سپہ سالار کوتلیروسکی Kotliarevsky کی فتوحات کے بعد عہد نامۂ گلستان کی ۱۲ (۲۴) اکتوبر ۱۸۱۳ء کو تکمیل ہوئی جس کے مطابق قرہ باغ، شکی، شیروان، دربند، کوبہ، باکو اور تالش کی ریاستوں (Khanates) پر روسیوں کا قبضہ ہو گیا۔ گنجہ [رک بآں] کی ریاست پہلے ہی سے روسیوں کے قبضے میں تھی۔ اسی سلسلے میں ایران نے وعدہ کیا کہ وہ بحیرۂ خزر میں جنگی جہاز نہیں رکھے گا۔

(A. DIRR)

گلشنی : ایک ترکی شاعر، صارو خان (ایشیائے کوچک، ولایت آیدین میں) پیدا ہوا۔ وہ سلطان محمد ثانی کا ہم عمر تھا جس کے نام اس نے اپنی کتاب منتسب کی۔ وہ راہبانہ زندگی بسر کرتا تھا، اس کے مقالات منظوم اخلاقی مکالمات کے ایک سلسلے پر مشتمل ہیں جن کی توضیح حکایات کے ذریعے کی گئی ہے۔

مآخذ : (۱) Gibb : *Ottoman Poetry*، ۲ : ۳۷۸؛ (۲) v. Hammer : *Osm. Dichtkunst*، ۱ : ۲۸۶.

(CL. HUART)

گلشنی : (شیخ ابراہیم) خلوتی سلسلے کے ایک مشہور و معروف صوفی جو آذربیجان میں پیدا ہوئے، تبریز میں تعلیم پائی، اور جب شاہ اسمٰعیل نے شیعہ مذہب کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا تو وہ ترکِ وطن کر کے قاہرہ چلے گئے۔ جب اس شہر پر ترکوں کا قبضہ ہوا تو سلطان سلیم اول ان کے ساتھ انتہائی عزت سے پیش آیا، ۹۳۵ھ / ۱۵۲۸ - ۱۵۲۹ء میں سلطان سلیمان کی دعوت پر وہ قسطنطنیہ گئے جہاں ان کا غیرمعمولی احترام کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ ان کا انتقال قاہرہ میں ۹۴۰ھ / ۱۵۳۳ - ۱۵۳۴ء میں ہوا۔ انھوں نے فارسی میں ۴۰ ہزار ابیات پر مشتمل ایک صوفیانہ مثنوی، جلال الدّین رومی کی مثنوی معنوی کے جواب میں لکھی۔ ان کے متعدد شاگردوں میں سے خاص طور پر

www.besturdubooks.wordpress.com

قابل ذکر یکیجہ واردرا کا شاعر اصولی اور ایک صوفی یوسف المعروف بہ ''سینہ چاک'' ہیں۔ انھوں نے ایک سلسلے کی بنیاد رکھی تھی، جو ان کے نام پر گلشنی، یا بعض اوقات ان کے استاد اور مرشد دیدہ عمر روشنی کی نسبت سے ''روشنی'' بھی کہلاتا ہے۔ یہ سلسلہ اپنے مخصوص عمامے کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے، جس میں آٹھ بل دیے جاتے ہیں.

مآخذ: (۱) Gibb: *Ottoman Poetry*، ۲: ۳۷۴؛ (۲) M. d' Ohsson: *Tableau*، ۴: ۶۲۵، ۶۳۰.

(CL. HUART)

گلگت. پاکستان کے شمالی علاقوں میں ایک ایجنسی کا نام، جو براہ راست مرکزی حکومت پاکستان کے ماتحت ہے۔ اس ایجنسی کے صدر مقام کا نام بھی گلگت ہی ہے، جو دریاے گلگت پر واقع ہے۔ اس کے گرد ایک بہت بڑا سلسلۂ کوہ ہے۔ یہ شہر اس درے کے بالکل مقابل میں ہے، جو ہنزہ کو جاتا ہے۔ اس سے پرے شمالی مشرقی کوہ ہندوکش، اسے وخان سے اور مزطاغ مملکت چین سے علٰحدہ کرتا ہے۔ یہاں شین نسل کے لوگ آباد ہیں اور شینا زبان بولی جاتی ہے، جو پشاچہ گروہ سے تعلق رکھتی ہے؛ یہ نسل غالباً زیادہ تر آریائی ہے، لوگ بڑے اچھے زراعت کار، شکار اور کھیل کود کے شوقین، خوش مزاج اور خوش باش ہیں۔ گلگت کو جانے والے راستے دریاے گلگت کے ساتھ ساتھ بنجی کے قریب تک جاتے ہیں، جہاں یہ دریاے سندھ میں جا ملتا ہے۔ ایک راستہ تراگ بل اور برزل سے ہوتا ہوا کشمیر تک جاتا ہے۔ اسی طرح ایک راستہ چلاس میں سے گزر کر ایبٹ آباد کو اور وہاں سے درہ ہابوسر اور وادی کاغان تک پہنچ جاتا ہے۔ اب راولپنڈی سے یہاں تک ہوائی آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ گلگت میں تمام آبادی شیعہ مسلمانوں کی ہے، لیکن وہ کٹر یا متعصب نہیں۔ اس کی قدیم تاریخ کی بابت بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ قدیم ''پرانوں'' کے زمانے کی فہرست کے مطابق چین یا شین درداسیوں کے ساتھ شامل ہیں۔ البیرونی لکھتا ہے کہ گلگت کے لوگ ترکی بولتے ہیں اور ان کے بادشاہ کو بھٹہ شاہ کہتے ہیں۔ یہ بات بعید الاحتمال معلوم ہوتی ہے کہ وہ ترکی بولتے ہوں، لیکن شین لوگ اب تک ہندوستان کے مغلوں سے اپنی قرابت داری ظاہر کرتے ہیں۔ ابھی حال ہی کے زمانے تک گلگت کا علاقہ ترخانی خاندان کے بادشاہوں کے زیر نگین تھا۔ یہ خاندان پرانے زمانے کے ایک بادشاہ کی اولاد میں سے ہے، جو چودھویں صدی میں حکومت کرتا تھا اور جس نے یہاں اسلام کی بنیاد قائم کی تھی۔ اس زمانے سے پہلے بادشاہ کا لقب ''را'' ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس کے بعد یہ لقب ''شاہ رامے'' میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس ملک کو بھی اگلے وقتوں میں ''سارگین'' کے نام سے موسوم کیا کرتے تھے۔ بعد میں گلگت نام استعمال ہونے لگا.

۱۸۴۱ء میں گلگت ایجنسی کے جائز اور آخری بادشاہ کریم خان کو گوہر رحمٰن (یا گوہر امان)، نے جو یاسین کے ''خوش وقتی'' خاندان کا ایک رکن تھا، ملک سے باہر نکال دیا اور خود علاقے کا مالک بن بیٹھا۔ وہ نہایت ظالم اور جابر حکمران ثابت ہوا۔ جلا وطن شہزادے نے کشمیر کے سکھ حاکم کے ہاں پناہ لی، جس نے ۱۸۴۲ء میں گلگت پر چڑھائی کی اور کریم خان کو پھر تخت دلوا دیا۔ اب وہ سکھ سلطنت کے ماتحت حکومت کرنے لگا، اور جب گلاب سنگھ ڈوگرا ۱۸۴۶ء میں کشمیر کا مہاراجا بن گیا تو گلگت کا علاقہ بھی دوسرے سکھ مقبوضات کی طرح اس کی حکومت میں آ گیا۔

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۱۸۵۲ء میں گوہر رحمٰن نے دوبارہ حملہ کر کے ڈوگروں کو، جو ہنزہ پر حملہ آور ہوے تھے اس علاقے سے نکال دیا اور کریم خان مارا گیا۔ ۱۸۶۰ء میں ڈوگرے پھر قابض ہوگئے اور اس کے کچھ عرصے بعد انھوں نے خرد سال علی داد خان کو ''را'' مقرر کر دیا، جو ناگر کے حکمران کا بیٹا تھا؛ لیکن وہ ترخانی خاندان کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ سب سے پہلے گلگت ایجنسی بِڈلف Biddluph کے ماتحت ۱۸۷۷ء میں قائم ہوئی اور اس کے بعد ۱۸۸۹ء میں ڈیورنڈ Durand کے ماتحت اس کی تجدید ہوئی۔ ۱۸۹۵ء میں جنگ چترال کے دوران میں ایک فوجی دستے نے، جس نے چترال پر درہ شندر کے راستے پیش قدمی کی تھی، گلگت پر قبضہ کر لیا تھا (رک بہ چترال)۔

[گو یہ علاقہ ریاست کشمیر کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا لیکن مقامی سرداروں کے ساتھ روابط قائم رکھنے کا کام گلگت میں مقیم انگریز ایجنٹ ہی کیا کرتا تھا۔ تقسیم کے بعد یہ علاقہ پاکستان میں شامل ہوگیا۔ یہ علاقہ بے حد فوجی اہمیت کا حامل ہے۔ حکومت پاکستان اس علاقے کو ترقی دینے کے لیے بہت کوشاں ہے۔ اس کا نظم و نسق مرکزی حکومت کی وزارتِ امورِ کشمیر کے ماتحت ہے۔ آزاد حکومت جموں و کشمیر کے لیے وزارت کی طرف سے مقرر کردہ مشیر اعلیٰ ہی گلگت ایجنسی و بلتستان کے ریذیڈنٹ کے فرائض سرانجام دیتا ہے]۔

مآخذ: Biddulph: *Tribes of the Hindoo-Koosh*، کلکتہ ۱۸۸۰ء؛ (۲) Holdich: *The Indian Borderland*، لندن ۱۹۰۱ء؛ (۳) Capt. W. R. Robertson: *Chitral Expedition*، کلکتہ ۱۸۹۸ء؛ (۴) Grierson: *The Pisāca Languages*، لندن ۱۹۰۶ء؛ (۵) Pakistan Year Book 1975، کراچی ۱۹۷۵ء۔

(M. LONGWORTH DAMES)

گمرون: Gamron، جسے گومرون Gomron وغیرہ بھی لکھا جاتا ہے (دیکھیے انگریزی، طبع اول ۱: ۶۹۴ ببعد)؛ خلیج فارس کے کنارے ایک بندرگاہ، جسے شاہ عباس اوّل کے عہد حکومت سے بندر عباس کہا جاتا ہے، انگریزی ۱: ۶۹۵-۱ میں جو مآخذ دیے گئے ہیں، ان میں Yule and Burnell: *Hobson Jobson*، بذیل مادّہ Gombroon، کا اضافہ کر لیجیے۔

(M. LONGWORTH DAMES)

گُناہ: (فارسی؛ عربی: جُناح)، رک بہ سَیِّئة۔

گنج شکر: رک بہ فریدالدین گنج شکر۔

گنج العلوم عین الدین: رک بہ عین الدین۔

گَنْجه: عربی جَنْزَة، جلیساوت پول Jelisawet pol ۱۸۰۴ء سے (مقامی باشندے آج بھی صرف قدیم نام ہی استعمال کرتے ہیں)۔ ارمن مصنف موسیٰ کلنکتوچی Moses KalanKatuači کے بیان کے مطابق (ترجمہ از Patkanian، ص ۲۷۰، دیکھیے J. Marquart: *Osteuropäische und Ostasiatische streifzuge*، ص ۴۶۲) یہ شہر سب سے پہلے عربوں کی حکومت میں ۸۴۰ء کے لگ بھگ میں اور حمد اللہ قزوینی (در Schefer، سیاست نامہ، تکملہ، ص ۲۲۷) کی رائے میں ۳۹ھ (غالباً یہ ۲۳۹ھ=۸۵۳-۸۵۴ء ہے) میں آباد ہوا تھا۔ پرانے عرب جغرافیہ دانوں، مثلاً ابن خرداذبہ اور الیعقوبی کے ہاں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام آذر بیجان کے زمانۂ قبل از اسلام کے دارالحکومت پر رکھا گیا تھا (جس کے آثار اب تخت سلیمان کے کھنڈروں کی صورت میں موجود ہیں [رک بہ آذربیجان]۔ الاصطخری (طبع ڈخویہ، ص ۱۸۷، ۱۹۳) نے گنجہ کے متعلق صرف اتنا بتایا ہے کہ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے اور بَرْذَعَہ سے تفلس جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ اس کے بیان کے مطابق بَرْذَعَہ اور گنجہ کا درمیانی فاصلہ ۹ فرسخ اور

www.besturdubooks.wordpress.com

یاقوت (۲ : ۱۳۲) کی رو سے ۱۶ فرسخ تھا۔ برذعہ [رک بآں] کے زوال کے بعد گنجہ آران [رک بآں] کا دارالحکومت قرار پایا۔ تقریباً ۳۴۰ھ / ۹۵۱-۹۵۲ء سے بنو شدّاد یہاں حکمران رہے لیکن سلطان ملک شاہ (۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء ۴۸۵ھ / ۱۰۹۲ء) نے ان کا تختہ الٹ کر گنجہ بطور جاگیر اپنے بیٹے محمد کو دے دیا۔ ۵۳۳ھ / ۱۱۳۸-۱۱۳۹ء [یہی صحیح تاریخ ہے، جو عماد الدین الاصفہانی (*Recueil des Taxtes*، طبع Houtsma، ۲ : ۱۹۰) میں درج ہے۔ باقی تفصیل کے لیے رک بہ ۷۷ لائیڈن].

مآخذ : متن میں مذکور ہیں.

(W. BARTHOLD)

* گنڈو : Gando، مغربی سوڈان میں فلبہ Fulbe لوگوں کی سلطنت؛ رک بہ پُل.

* گندھارا : رک بہ قندھار.

* گنڈا پور : [گنڈا پور] ایک افغان قبیلے کا نام، جو ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان [پاکستان] کے علاقے دامان میں آباد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نسلی اعتبار سے یہ قبیلہ سیّد ہے اور بختیاری قبیلے کی طرح (جو خود بھی سیّد ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں) ابتداءً قبیلۂ استرانہ سے وابستہ تھا۔ درانی بادشاہوں کے عہد حکومت میں یہ لوگ میدانوں میں اتر آئے اور دامان میں آباد ہو گئے۔ ان کا علاقہ جنوب میں درابن سے لے کر شمال میں پہاڑ پور تک پھیلا ہوا ہے۔ کلاچی ان کا مرکزی شہر ہے اور ان کا سردار بھی وہیں رہتا ہے۔ زمین بنجر ہے، لیکن کہیں کہیں پہاڑی ندی نالوں، خصوصاً دریائے گومل کے معاونین کے ذریعے آبپاشی ہو جاتی ہے۔ ان کے نام گنڈا پور کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ سترائی Storai (استرانہ قبیلے کا جد امجد، جس کے نام پر یہ قبیلہ مشہور ہوا) کے بیٹے ترائی نے اپنے باپ کی مرضی کے خلاف شیرانی قبیلے کی ایک لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اس وجہ سے اس کا نام گندا پور یعنی "گندا بیٹا" پڑ گیا۔ اس کہانی سے بلاشبہہ اس حقیقت کا پتا چلتا ہے کہ یہ قبیلہ مخلوط النسل ہے۔ گنداپور اگرچہ ابتدا میں شورش پسند لوگ تھے، لیکن اب یہ ایک امن پسند قبیلہ ہے۔ یہ سارا قبیلہ پاکستانی علاقے میں رہتا ہے اور ان کی زبان قندھاری طرز کی پشتو ہے.

مآخذ : (۱) محمد حیات خان : افغانستان (حیات افغانی) مترجمۂ Priestley، لاہور ۱۸۷۴ء؛ (۲) H. Edwardes : *A Year on the Panjab Frontier*، لنڈن ۱۸۵۱ء؛ (۳) Raverty : *Notes on Afghanistan*، لنڈن ۱۸۸۰ء.

(M. LONGWORTH DAMES)

گنگا : (پاکستان و ہند کے مؤرخوں کے ہاں گنگ، نیز کنگ) بالائی ہند [رک بہ ہند] کا سب سے بڑا دریا، جو گڑھوال کے ضلع میں کوہ ہمالیہ سے تقریباً ۳۱۰۰ میٹر کی بلندی سے نکلتا ہے اور اتر پردیش، بہار اور بنگال سے گزرتا ہوا خلیج بنگال میں جا گرتا ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً ۲۵۰۰ کیلومیٹر ہے؛ آخری ۵۰۰ کیلومیٹر بنگال کے ڈیلٹا میں ہیں۔ ڈیلٹا سے اوپر اس میں یکے بعد دیگرے رام گنگا، جمنا [رک بآں]، گومتی، گوگرا، سون، گنڈک اور کوسی دریا بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ پریاگ (الٰہ آباد [رک بآں]) کے مقام پر جمنا کے سنگھم کے اوپر اسے پایاب عبور کیا جا سکتا ہے۔ ڈیلٹا گوڑ [رک بآں] کے جنوب سے شروع ہوتا ہے، جو انتہائی مغربی نہر ہے اور مرشد آباد [رک بآں] کے قریب سے گزرتی ہے۔ اپنے بالائی حصے میں یہ بھاگی رتھی اور زیریں حصے میں ہوگلی [رک بآں] کے نام سے معروف ہے۔ بڑی (مشرقی) نہر، جو پدما کے نام سے بھی معروف ہے،

www.besturdubooks.wordpress.com

گوالندا کے جنوب مشرق میں بہتی ہے، گوالندا میں یہ (بنگال) جمنا، یعنی برہما پترا کے زیریں حصے میں داخل ہو جاتی ہے ۔ سنگھم کے مقام پر دریا کا دہانہ چوڑا ہو جاتا ہے، جسے اب مگھنا کہتے ہیں، جو انتہائی مشرقی نہر کی حیثیت سے نواکھلی کے نزدیک خلیج بنگال میں گر جاتی ہے ۔ ڈیلٹا کا شمالی حصہ زرخیز ہے اور دلدلی سندربن (نمک اور کشتی بنانے کی لکڑی) اس کا جنوبی طاس ہیں ۔ ہوگلی اس کی بڑی تجارتی نہر ہے ۔ ریلوے لائن آنے سے قبل گنگا اپنے معاونین سمیت نہایت اہم ذریعۂ آمد و رفت تھا (*Memoir of a map of Hindoostan*: J. Rennel، بار سوم، لنڈن ۱۷۹۳ء، ص ۳۳۵ ببعد) ۔ اس کے کنارے آباد اکثر بڑے بڑے شہروں مثلاً قنوج، الٰہ آباد، فیض آباد، بنارس، پٹنہ، مُنگر، راج محل [رکّ باں] کی زمینیں پتھریلی ہیں ۔ آبپاشی بالائی اور زیریں گنگائی نہروں کے ذریعے ہوتی ہے، جن کا سرچشمہ ہردوار میں ہے ۔

اس کے زیریں حصے میں اس کے بہاؤ کے ساتھ سطح زمین کی بلندی میں ایک سے تین سنٹی میٹر فی کیلو میٹر کی کمی واقع ہوئی ہے، اس لیے مون سون کے دباؤ سے اس کی گزرگاہ میں تغیر واقع ہونے کا بڑا امکان ہوتا ہے؛ مثال کے طور پر مسلمانوں کی فتح بنگال سے پہلے بڑی ندی اپنے موجودہ مقام پر جنوب کی جانب رخ کرنے کے بجائے مالوے کے مشرقی جانب بہتی تھی، اور پھر گوڑ کی طرف بہتی ہوئی اپنے سہانڈ کی موجودہ گزرگاہ کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف رخ کرتی تھی (دیکھیے E. V. West-macott، در *JASD*، ۱۸۷۰ء، ص ۷ ببعد) ۔ ۷۳۹ھ/۱۳۳۸-۱۳۳۹ء میں گوڑ کے بجائے پانڈوا کو بنگال کا دارالحکومت بنایا گیا ۔ یہ تبدیلی اسی قسم کے ایک تغیر کی وجہ سے عمل میں آئی تھی ۔ اسی طرح اس کے بعد ۸۵۰ھ / ۱۴۴۶ء میں گوڑ کی عدالت کو ٹانڈے میں منتقل کیا گیا تھا ۔ گنگا اور اس کے ڈیلٹائی معاونوں کی موجودہ گزرگاہوں اور ان گزرگاہوں کے درمیان فرق جو Rennell کے نقشے میں دکھایا گیا ہے (کتاب مذکور، ص ۳۴۵، ۳۶۴) وہ حیران کن ہے ۔ گزرگاہ میں تغیر کی بابت مزید تفصیلات کے لیے رکّ بہ ہوگلی.

ہندوؤں کے نزدیک گنگا ایک مقدس دریا ہے، جس کا منبع بہشت میں بتایا جاتا ہے، جہاں سے یہ نکل کر سات ندیوں کے مرکز کی حیثیت سے، زمین میں آیا ہے ۔ سنسکرت کی کتابوں، متسیاپران، وایوپران، رامائن وغیرہ میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے، وہ البیرونی : کتاب الہند (انگریزی ترجمہ از سخاؤ E. Schau، لنڈن ۱۸۸۸ء، ۱ : ۲۶۱) میں بھی درج ہے ۔ سنگموں پر اور خاص طور پر الٰہ آباد میں، جب سورج برج دلو (Aquarius) میں ہوتا ہے، اس کے پانی سے نہانا مذہبی اعتبار سے بہت اہم سمجھا جاتا ہے ۔

مآخذ : متن مقالہ میں مذکور حوالوں کے علاوہ دیکھیے *Imperial Gazetteer of India*، طبع ۱۹۰۸ء، بذیل مادّۂ گنگا.

(J. BURTON-PAGE)

گِنی : (Guinea)، مغربی افریقہ کے ساحل پر ایک علاقہ ۔ یاقوت (معجم، ص ۷۴، ۳۰۷) نے ایک علاقہ کَناوۃ (گناوۃ) کا ذکر کیا ہے، جس کا نام اس کی رائے میں وہاں کے باشندوں کے نام پر پڑ گیا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ گناوۃ ایک بربری قبیلہ تھا، جو سیاہ فام لوگوں کے ملک (بلاد السّودان) میں داخل ہو کر غانّۃ [رکّ باں] کے پڑوس میں آباد ہو گیا تھا ۔ بظاہر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جِنّۃ [رکّ باں] کے نام کا جو اشتقاق عام طور پر کیا جاتا ہے وہ غلط ہے ۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے Mraquart پہلا شخص تھا، جس نے یاقوت کی اس عبارت کی طرف توجہ دلائی.

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

گنی کے لوگوں میں اسلام پھیلنے کے بارے میں دیکھیے مقالہ از Westermann : *Die Welt des Islams*، ۱: ۸۵ ببعد اور جن کتابوں کا اس میں حوالہ دیا ہوا ہے، مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے مادّۂ سوڈان [سودان].

(CL. HUART)

* **گَوْ**: (Gao)، رک بہ گوگو.

گُوَاد: Guad، گوادی Guadi : رک بہ واد، وادی.

* **گوالیار**: پہلے وسط ہند میں یہ ایک مقامی ریاست تھی، اب اسے مدھیا پردیش (بھارت) کے صوبے میں شامل کیا گیا ہے، سردی کے موسم میں یہ شہر صوبے کا صدر مقام ہوتا ہے۔ گوالیار، کوہ وندھیاچل کی ایک عریض اور مرتفع چٹان پر جو ریتلے پتھر کی بنی ہوئی ہے، واقع ہے۔ میدان سے یہ چٹان کوئی تین سو فٹ بلند ہے اور کوئی دو میل تک شمالاً پھیلتی چلی گئی ہے۔ اس کی چوڑائی زیادہ سے زیادہ نصف میل کے قریب ہے۔ پرانا شہر قلعے کے دامن میں آباد ہے لیکن ''لشکر'' یعنی اصلی پایۂ تخت کوئی دو میل پرے جنوب میں واقع ہے.

اس کی آبادی بشمول ''لشکر''، ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۴۱۵۷۷ تھی۔ ۱۰۳۲ء میں قلعے پر سلطان محمود کے حملے کا خطرہ پیدا ہوا لیکن ۱۱۹۶ء میں دہلی میں سلطان شہاب الدّین غوری کے نائب قطب الدین ایبک نے پریہاروں سے لڑ کر اس قلعے پر قبضہ کر لیا۔ پریہار راجپوتوں نے اس سے قبل کچھواہا راجپوتوں کو یہاں سے نکال دیا تھا۔ چودہ سال کے بعد پریہاروں نے اس پر پھر قبضہ کر لیا لیکن ۱۲۳۲ء میں التتمش نے اسے دوبارہ فتح کر لیا، گو اس کا محاصرہ طویل عرصے تک قائم رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قلعے کی ساری محصور عورتوں نے قلعے کے جوہر نامی تالاب میں، جو قلعے کے شمالی حصے کے آخر میں تھا، ڈوب کر جان دے دی۔ قلعے پر قبضہ کر لینے کے بعد سلطان نے سوریا دیوا کا مندر جو اس پہاڑی کے جنوب کی طرف سورج کنڈ کے قریب واقع تھا، مسمار کرا دیا۔ تیمور کے حملے کے وقت جو عام گڑبڑ ہوئی تو تونوارہ راجپوتوں نے اس مقام پر قبضہ کر لیا اور وہ ۱۵۱۸ء تک اس پر قابض رہے، اس کے باوجود کہ اس دوران میں مالوے کے ہوشنگ شاہ، جونپور کے حسین شاہ شرقی، اور دہلی کے لودھی بادشاہ کئی دفعہ اس پر حملہ آور بھی ہوئے۔ گزشتہ سوا سو سال میں یہ شہر بہت مشہور ہو گیا بالخصوص راجہ مان سنگھ کے عہد میں جس نے مان مندر (محل) اور قلعے کے اندر جانے کا صدر دروازہ تعمیر کرایا۔ شہنشاہ بابر ۱۵۲۶ء میں گوالیار آیا۔ ۱۵۴۲ء میں پٹھان بادشاہ شیر شاہ سوری کے زمانے میں تو یہ شہر عملی طور پر کل ہندوستان کا پایۂ تخت بنا رہا۔ اسلام شاہ سوری ۱۵۵۳ء میں یہیں فوت ہوا تھا۔ اکبر کے تخت نشین ہونے کے بعد ہی اس شہر نے اطاعت قبول کر لی تھی حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کا مقبرہ جو قلعے کے دامن میں ہے نیز دہلی میں شہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ ہندوستان کے مغلیہ فن تعمیر کا ابتدائی اہم نمونہ شمار ہوتا ہے۔ مغل بادشاہوں کے عہد میں اس قلعے کو سرکاری قید خانے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا [چنانچہ جہانگیر کے عہد میں حضرت مجدّدؒ الف ثانی بھی کوئی ایک سال تک یہاں قید رہے] اور شاہی خاندان کے بہت سے شورش پسند اراکین نئی چوکی کی کال کوٹھڑیوں میں، جو قلعے کے شمال مغرب میں واقع ہیں اور جنھیں ''دھوندا پول'' کہا جاتا ہے جان بحق ہوئے [بظاہر مغلیہ دور سے پہلے بھی

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

گوالیار کے قلعے سے قید خانے کا کام لیا جاتا تھا، چنانچہ علاءالدین خلجی کے بڑے بیٹے خضر خان کو بھی یہیں قید کیا گیا تھا، دیکھیے خسرو دہلوی: مثنوی خضر خان و دولرانی]۔ مغل گورنر معتمد خان نے گنیش دروازے کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی اور نور ساگر تالاب کو اور زیادہ گہرا کرا دیا۔ اس نے رشی ''گوالی پا'' کا مندر بھی منہدم کرا دیا جس کے نام پر کہتے ہیں کہ اس چٹان کا نام مشہور ہوا۔ یہاں کی جامع مسجد ایک خوبصورت عمارت ہے، اس کی تعمیر ۱۶۰۵ء کے قریب شروع ہوئی اور ساٹھ سال بعد مکمل ہوئی۔ جہانگیری مندر (تقریباً ۲۹۰ فٹ × ۱۰۰ فٹ) چوتھے مغل شہنشاہ کے عہد میں مان سنگھ کے محل کے شمال میں تعمیر ہوا۔ اس کا مقام وہی تھا جو سوری شہنشاہوں کے محل کا تھا۔ شاہجہانی مندر (۵۲۰ فٹ × ۱۷۰ فٹ) بھی پھر اسی طرح شمال میں اس جگہ تعمیر ہوا جہاں کبھی ہمایوں کا محل تھا۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں مرہٹوں کی شکست کے بعد یہ قلعہ پہلے تو جاٹوں کے قبضے میں چلا گیا پھر اس پر مرہٹے غالب آ گئے۔ ۱۷۹۱ء میں انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ بہت سے تغیرات کے بعد انگریز ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۸۶ء تک اس پر قابض رہے اس وقت سے لے کر تقسیم ہند تک یہ مہاراجا سندھیا کے قبضے میں چلا آتا تھا [گوالیار آج کل بھارت کے صوبۂ مدھیا پردیش کی سات قسمتوں میں سے ایک کا مرکز ہے، اور اس کی آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے تین لاکھ سے زائد تھی]۔

مآخذ: (۱) *Gwalior State Gazetteer*، کلکتہ ۱۹۰۸ء؛ (۲) *Archaeological Survey of India*، سلسلۂ اول، ج ۲ (۱۸۶۲ء تا ۱۸۶۵ء)۔

(H. C. FANSHAWE)

گُوجَر (گُجر، گَجر): ایک قوم کا نام ہے جو شمالی برصغیر پاکستان و ہند میں دور دور تک آباد ہے۔ یہ جاٹوں اور راجپوتوں سے ملتی جلتی ہے اور ان کی قرابت دار بھی ہے۔ گوجر بھی جاٹوں اور راجپوتوں کی طرح غالباً سیتھین Scythian قوم کے ان وارذین کی نسل میں سے ہیں جو چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان کی جسمانی خصوصیات ظاہر کرتی ہیں کہ وہ خالص ہندی آریائی نسل سے ہیں اور ان میں دراوڑی خون کی آمیزش مطلق نہیں ہوئی، ڈی۔ اے سمتھ (*Journ. As. Soc.*، ۱۹۰۹ء) اے۔ ایم۔ ٹی۔ جیکسن (*Bombay Gagetteer*، ۱۸۹۶ء، ج ۱: حصہ ۱) اور ڈی۔ آر بھنڈارکر (*Epigraphic Notes and Questions*، جلد ۳) نے ثابت کیا ہے کہ گورجارے شمالی ہندوستان میں ۵۵۰ء کے قریب سفید ہُنوں کے ساتھ یا ان کے بعد داخل ہوئے تھے۔ گورجاروں کا ذکر سب سے پہلی مرتبہ بانا کی کتاب ہرش چرت میں آیا ہے، جو انہیں ہُنوں کی طرح ہرش کے باپ کا دشمن قرار دیتا ہے۔ انہوں نے کوہ آبو کے قریب بھین مال کو صدر مقام بنا کر ایک طاقتور ریاست قائم کر لی۔ اسی مملکت کی جنوبی شاخ نے جنوبی گجرات کو گجرات کا نام دیا اور وسطی حصے کے حکمران خاندان رفتہ رفتہ راجپوت قبیلے بن گئے۔ چنانچہ پرتیہار یا پریہار ذات کے راجپوت دراصل گوجر ہیں لیکن گورجاروں کی کثیر تعداد آج کل کے گوجروں کی صورت میں پائی جاتی ہے جن کی آبادی کا دور دور تک منتشر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کی فرمانروائی کا دائرہ کس قدر وسیع تھا۔ گوجر بیشتر گلہ بانوں کی ایک قوم تھی جو جنگ و پیکار اور لوٹ کھسوٹ کی دلدادہ تھی اور آج کل بھی بہت سے گوجروں میں یہ رجحانات پائے جاتے ہیں۔ مستقل مزاج زراعت کاروں کی حیثیت سے وہ

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

اپنے قرابت دار جاٹوں کی سی شہرت کے مالک نہیں، تاہم انھوں نے عمومی حیثیت سے اقامت کی زندگی اختیار کر لی ہے۔ ہند کے انتہائی شمال مغربی حصے میں، خاص کر ہزارہ، جموں، کانگڑہ اور سبھال کے پہاڑوں کے بیرونی کناروں پر گوجر تا حال خانہ بدوش چرواہوں اور گلہ بانوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اپنی مخصوص بولی بولتے ہیں جو گوجری یا گجری کہلاتی ہے۔ گریئرسن Grierson نے اس بولی اور مشرقی راجپوتانے کی میواتی بولی میں زبردست مماثلت دریافت کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب گوجر حکمران تھے اور ان کا مرکز راجپوتانے میں تھا تو انھوں نے اس ملک کی زبان اختیار کر لی۔ اس بولی کو ان کی سب سے کم تہذیب یافتہ بیرونی شاخ نے آج تک محفوظ رکھا ہے، حالانکہ وہ پنجابی بولنے والوں اور مغربی پہاڑی بولیاں بولنے والوں کے درمیان الگ تھلگ بود و باش رکھتے ہیں۔ پشاور میں گوجر کے لفظ کو اکثر اوقات عام گلہ بان کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ سکونت پذیر گوجروں کی بھاری تعداد موجودہ ضلع گجرات میں آباد ہے اور وہاں کی آبادی کا ایک اہم عنصر ہے۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کی رو سے ان کی تعداد ۱۱۱۰۰۰ ہزار نفوس تھی۔ ہزارہ میں ان کے سکونت پذیر اور گلہ بان عناصر کی تعداد ۹۱۶۷۰ تھی۔ ان دونوں ضلعوں میں نیز سارے شمالی اور مغربی پنجاب میں وہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ مشرقی جانب یعنی ہوشیارپور میں اور جمنا کے دونوں طرف کے اضلاع میں جو پنجاب اور صوبہ جات متحدہ میں واقع ہیں گوجر بھاری تعداد میں پائے جاتے ہیں لیکن یہاں ان کی اکثریت ہندو چلی آ رہی ہے۔ پنجاب میں گوجروں کا شمار ۷۳۹۶۲۲ اور صوبجات متحدہ [اُتر پردیش] میں ۳۴۴۰۰۰ ہے سارے برصغیر میں ان کی تعداد ۲۱۰۳۰۰۰ ہے اور وہ مذکورۂ بالا اضلاع کے علاوہ خاص طور پر راجپوتانہ، وسط ہند اور بمبئی میں پائے جاتے ہیں۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ میدانی علاقوں کے گلہ بان گوجروں کو اکبر کے عہد میں اس بات پر مجبور کیا گیا تھا کہ وہ دیہات میں آباد ہو کر سکونت اختیار کریں اور یہ کہ انھیں دنوں پنجاب کے علاقۂ گجرات نے اپنا یہ نام پایا۔ گوجروں کے مشرف باسلام ہونے کو اورنگ زیب کے عہد کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے، لیکن اودھ کی روایت اسے تیمور کے زمانے سے منسوب کرتی ہے جو بہت غیر اغلب سی بات ہے۔ شمالی گجرات اور جنوبی گجرات کے علاوہ گوجرانوالہ (پنجاب) کا نام بھی اسی قوم کے نام پر رکھا گیا حالانکہ اس ضلع میں ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ مزید برآں انھوں نے ضلع سہارنپور کے ایک حصے کو بھی جو پہلے گجرات کہلاتا تھا اپنا نام دیا۔ گجراتی زبان [رک باں] کو جنوبی گجرات کی وجہ سے یہ نام ملا ورنہ یہ زبان گوجر قوم کے ساتھ کسی قسم کا واسطہ نہیں رکھتی۔

مآخذ: (۱) Ibbetson: *Outlines of Panjab Ethnography*، (کلکتہ ۱۸۸۳ء)؛ ص ۲۶۲ ببعد؛ (۲) Crooke: *Tribes and Castes of N. W. Provinces and Oudh*، ۲: ۳۳۹ ببعد (کلکتہ ۱۸۹۶ء)؛ (۳) V. A. Smith: *Early History of India*، طبع ثانی ص ۳۰۳؛ (۴) وہی مصنف: *The Gujaras of Rajputana and Kanaudj*، در *Journ. Roy. As. Soc.*، ۱۹۰۹ء؛ (۵) H. D. Watson: *Gazetteer of Hazara Dist.*، (لنڈن ۱۹۰۸ء) ص ۳۰۔

(M. LONGWORTH DAMES)

تعلیقہ: گوجر ایک بڑی قوم ہے۔ ⊗ سکندر نامۂ نظامی میں اس کا خزرانیوں کے نام سے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

ذکر کیا گیا ہے، جنھیں وحشی لوگوں سے بچانے کے لیے سکندر نے پہاڑوں کے درے بند کیے تھے ۔ نظامی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔ انھوں نے سکندر سے التماس کی ؎

درین پا سگہ رخنہائے کہ ہست
عمارت کند تاشود سنگ بست
مگر زآفت آن بیابانیان
براحت رسد کار خزرانیان
بفرمود شہ تا گزر ہائے کوہ
بہ بندند خزرانیاں ہم گروہ

دوسرے ممالک میں اس قوم کو خُزر، جُزر، چُرز، گنور بھی کہا گیا ہے (دیکھیے محمد عبدالمالک : شاہان گوجر، اعظم گڑھ ۱۹۳۴ء، ص ۴۸) ۔ برصغیر میں پہلے پہل یہ لفظ گُرْجر کی صورت میں استعمال ہوا پھر گوجر ہو گیا ۔ یہ لوگ گرجستان (وسط ایشیا) سے آئے تھے ۔ بحیرۂ خزر کا یہ نام شاید اس لیے پڑ گیا کہ اس کے ارد گرد خزر، یعنی گوجر آباد تھے، جو سیتھین قبائل سے تھے اور مختلف اوقات میں آتے رہے تھے ۔ پرانوں میں ایک گوجر لڑکی کاتری سے برہما کی شادی کا ذکر آیا ہے (شاہان گوجر، ص ۶۲) ۔ ان میں سے جو درۂ بولان سے آئے تھے وہ آگے بڑھ کر گجرات کاٹھیاواڑ میں آباد ہو گئے ۔ کابل کی طرف سے آنے والے پنجاب، کشمیر، شمالی راجپوتانہ اور گنگا کے دوآبے میں رہنے لگے ۔ ان کے نام پر شمال مغربی برصغیر میں بہت سی بستیاں، قصبے اور شہر آباد ہوے جو اب تک موجود ہیں ۔ پنجاب میں گوجرانوالہ واضح طور پر انھیں سے متعلق ہے ۔ علاوہ بریں پنجاب میں ضلع کا اور بھارت میں صوبے کا نام گجرات انھیں کی وجہ سے رکھا گیا ۔ ان کی آمد پر گجرات پہلے گُرجر آسترا، کہلایا، یعنی گوجروں کا ملک جو ہولے ہولے یہ صورت اختیار کر گیا ۔ صوبے کا ابتدائی نام راٹ تھا ۔

گوجر آج کل بھی ان تمام علاقوں میں آباد ہیں ۔ ان کی بہت سی گوتیں (Sub. Castes) ہیں ۔ تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ گوجر، جاٹ اور راجپوت فی الجملہ ایک ہیں ۔ آریاؤں کی طرح یہ بھی وسط ایشیا سے ریوڑ چراتے آئے ۔ پہاڑی علاقوں مثلاً پنچھ، سوات، دیر اور ایبٹ آباد میں ان کا آج بھی یہی پیشہ ہے، لیکن باقی علاقوں میں یہ اچھے زراعت پیشہ ثابت ہوے اور انھوں نے اور پیشے بھی اختیار کیے ۔ یہ لوگ تنومند اور خوبصورت ہونے کے علاوہ بہادر تھے اور یہ ضرب المثل مشہور رہی ہے کہ گوجری عورت اور شیرنی کا دودھ پیو گے تو شجاع بنو گے ۔ گوجر سکنری زبان ساتھ لائے تھے جو بتدریج اس نرم لہجے کی گوجری زبان میں تبدیل ہو گئی جسے یہ لوگ وہاں بولتے ہیں جہاں اکھٹے رہتے ہوں ۔ یہ راجپوتانے کی زبان گوجری سے مشابہت رکھتی ہے ۔ اس بات کا ذکر گریئرسن نے بھی کیا ہے : *Linguistic Survey of India*، ج ۹، حصۂ ۴، دہلی ۱۹۶۸ء، ص ۱۵ ۔

گوجر سورج کی پرستش کرتے آئے تھے ۔ ان کو ہندو معاشرے میں شامل کرنے کے لیے برہمنوں نے کوہ آبو پر قربانی کی آگ سے ان کو پوتر کرنے کا انتظام کیا جس میں سے کہا جاتا ہے چار عظیم گوجر پرہار، پرمار، چوہان اور سولنگی نمودار ہوے اور پھر ان میں سے کئی عظیم المرتبت حکمران پیدا ہوے ۔ پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں جنوب مغربی راجپوتانے میں گوجروں کی سلطنت تھی ۔ چھٹی صدی عیسوی میں گوجروں کی مُنمال کی سلطنت عظمی اور بھڑوچ کی سلطنت صغری موجود تھیں ۔ ان ایام میں یہ گور جارے کہلاتے تھے ۔ اس وقت یہ ایک طاقتور قوم کی حیثیت سے نمودار ہوے ۔ انھوں نے وسیع علاقے میں قدم جمائے اور بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں ۔ چینی سیاح ہیون سانگ ۶۴۰ء میں

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

راجپوتانے کے ایک بڑے حصے پر گورجاروں کی حکومت بتاتا ہے۔ وہ ان کے تاریخی شہر لبھی پور میں بھی گیا ۔ آٹھویں، نویں اور دسویں صدی عیسوی کے متعدد گوجر حکمرانوں کے کتبے دستیاب ہوئے ہیں جن سے ان کی سلطنت اور دارالخلافہ وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔ ۸۴۰ء میں قنوج میں راجہ بھوج کی حکومت تھی ۔ کتبوں سے اس راجا کے شجرۂ نسب کا بھی پتا چلتا ہے ۔ گوجروں کا گرھوار خاندان ۱۱۹۳ء تک قنوج میں حکمران رہا ۔ اس کا خاتمہ محمد غوری نے کیا ۔ انہل واڑہ میں ان کے سولنگی خاندان کا خاتمہ علاء الدین خلجی کے ہاتھوں ہوا۔

عرب سیاح آئے تو انھوں نے بھی گوجر حکومتوں کا ذکر کیا ۔ چنانچہ سلسلۃ التواریخ، فتوح البلدان، المسالک و الممالک، مروج الذھب میں ان کا بیان موجود ہے ۔ (دیکھیے شاھان گوجر، ص ۵۱۴ تا ۵۲۸) ۔ کتاب الھند میں البیرونی نے بھی ذکر کیا ہے۔ سلاطین گجرات جنھوں نے اس ملک میں اسلامی تہذیب و تمدن کے شاندار آثار چھوڑے ہیں ۔ نسلاً گوجر تھے ۔ ان کے جد اعلیٰ گوجروں کی تانک گوت سے تھے ۔ سہارن نام تھا، مشرف باسلام ہوئے، فیروز شاہ تغلق کے معتمد اھلکار بنے اور وجیہہ الملک خطاب پایا ۔ ان کا بیٹا ظفر خان گجرات کا صوبیدار مقرر ہوا، جو بعد میں مظفر خاں کے لقب سے سلطان بنا (دیکھیے : Commissariat : *A History of Gujrat*، طبع انڈیا ۱۹۳۸ء، ص ۴۸؛ نیز شاھان گوجر، ص ۳۳۳ تا ۳۳۶) ۔ اس مظفر شاہی گوجر خاندان کا خاتمہ جلال الدین اکبر مغل شہنشاہ نے کیا ۔ ابوالفضل نے بھی گوجروں کا ذکر آئین اکبری میں کیا ہے ۔ فارسی زبان کے شاعر شاہ فقیر اللہ آفرین لاہوری گوجر تھے (آزاد بلگرامی : خزانۂ عامرہ، نولکشور پریس کانپور ۱۸۷۱ء، ص ۲۸) ۔ احسن القصص والے پنجابی زبان کے شاعر مولوی غلام رسول بھی گوجر تھے ۔ اسلام قبول کرنے کے بعد گوجروں میں بہت سے علماء، فضلاء، اولیا اور شعرا ہوئے ہیں۔ الغرض ہر زمانے میں اس قوم کے لوگ اعلیٰ صفات کے مالک رہے ہیں ۔ نیز گریئرسن کی محولۂ بالا جلد حصۂ چہارم، ص ۸ تا ۱۰۴ متن میں دیے گئے مآخذ کے علاوہ دیکھیے ابو ظفر ندوی : تاریخ گجرات، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۸۱، ۸۲، ۸۶ تا ۱۰۸ [عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

گوجرانوالہ : پاکستان کے لاہور ڈویژن کے ایک ضلع اور شہر کا نام ہے، ضلع کا کل رقبہ ۲۳۰۱ مربع میل ہے اور اس کی آبادی ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱،۴۶،۹۳۳ تھی ۔ یہ ضلع دریاے راوی اور دریاے چناب کے درمیان ایک ہموار میدان میں واقع ہے، لیکن اس کی حدود دریاے راوی تک نہیں پہنچتیں ۔ گجرات کی طرح اس کا نام بھی قبیلۂ گوجر سے منسوب ہے، لیکن اب اس کی آبادی میں گوجر عنصر کچھ زیادہ نہیں ہے ۔ اس ضلع کا نام شہر کے نام کی وجہ سے پڑ گیا جو گوجروں نے آباد کیا تھا ۔ اب یہاں زیادہ تر آبادی راجپوتوں بالخصوص (بھٹی) جاٹوں اور ارائیوں کی ہے

یہاں مقام تکی پر بدھ آثار ملتے ہیں ۔ تکی وہی مقام ہے جسے چینی سیاح ہیوں سانگ Hioueu Thsang [کذا] نے Tsē-Kiē لکھا ہے ۔ شاہ کوٹ کے کھنڈر جو جنوب میں واقع ہیں غالباً ھن بادشاہ مہر اکل Mihirakula کے آباد کردہ شہر ساکلہ کی نشان دہی کرتے ہیں ۔ مغل شہنشاہوں کے عہد میں یہ علاقہ خوش حال تھا، چنانچہ یہاں کئی اور قصبے آباد ہوگئے ۔ ایمن آباد (صحیح امین آباد) کا قصبہ محمد امین نے، اور حافظ آباد کا قصبہ حافظ نے آباد کیے تھے ۔ یہ دونوں اکبر کے عہد میں گذرے ہیں اور شیخوپورہ (صحیح شکوہ پورہ) شاھجہان کے بیٹے

www.besturdubooks.wordpress.com

دارا شکوہ نے آباد کیا تھا جس نے وہاں ایک نہر بھی کھدوائی۔ اس وقت اس کا دادا جہانگیر بھی زندہ تھا۔ اٹھارھویں صدی میں یہ علاقہ بالکل برباد اور ویران ہو گیا۔ اس کے بعد سکھ یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ رنجیت سنگھ گوجرانوالہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنے باپ مہان سنگھ کی یاد میں یہاں ایک مڑھی بھی تعمیر کرائی۔ ضلع گوجرانوالہ کے بڑے بڑے شہر گوجرانوالہ (آبادی بموجب مردم شماری ۱۹۵۱ء=۱۱۴۱۹۳) اور وزیر آباد (آبادی ۱۹۵۱ء=۳۳۰۲۷) ہیں۔ گوجرانوالہ مغربی پاکستان کا ایک شہر ہے، جو کئی قسم کی صنعت و حرفت کا مرکز ہے مثلاً ظروف مسی، پارچہ بافی، میووں کا مربع اور اچار، چمڑے کی رنگائی؛ نہر اپر چناب حافظ آباد اور وزیر آباد تحصیلوں کے ایک بہت بڑے رقبے کو سیراب کرتی ہے۔ وزیر آباد کی چھریاں، چاقو مشہور ہیں۔

یہ ضلع قاعدے سے دو حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے جن میں سے ایک وہ نشیبی علاقہ ہے جو زرخیز زمینوں پر مشتمل ہے اور دوسرا دریائے چناب اور ڈیک نالے کے درمیانی اونچے میدان، نہروں کی تعمیر کی وجہ سے مغربی پاکستان کا یہ سب سے زیادہ زرخیز ضلع ہے، اب تھور (کھار، سیم) زراعت کے لیے ایک مصیبت بن گئی ہے۔

مآخذ: (۱) مقامی گزیٹیر اور بندوبست کی رپورٹیں؛ (۲) امپیریل گزیٹیر آف انڈیا، پنجاب سیکشن ۱۹۰۸ء۔

(M. LONGWORTH DAMES)

⊗ تعلیقہ: موجودہ صدی (بیسویں) کا ربع اول ختم ہو رہا تھا کہ شیخوپورہ کو علیحدہ ضلع بنا دیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد گوجرانوالہ ایک صنعتی شہر بن گیا ہے اور اس کے دونوں طرف شاہراہ اعظم کے ساتھ ساتھ صنعتی علاقہ پھیل رہا ہے جس کے اپنے علیحدہ مسائل ہیں۔ دھان اور ظروف سازی وغیرہ کے کارخانے ہیں۔ ریلوے لائن سے مشرق کی طرف زیادہ تر سرکاری دفاتر ہیں۔ اس طرف کی آبادی کو شہر سے ملانے کے لیے سٹیشن کے ساتھ زاویۂ قائمہ بناتا ہوا بالا بالا (Overhead) ایک لمبا سا پل تعمیر دیا گیا ہے۔ ہائی سکولوں کے علاوہ شہر میں ڈگری کالج بھی ہے۔ ضلع گوجرانوالہ مردم خیز ہے۔ بعض اچھے اچھے شعرا اور اہل علم اصلاً یہیں کے رہنے والے تھے۔ گوجرانولہ پہلوانوں کے لیے مشہور ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد شہر سے شمال مغرب کی طرف تین چار میل کے فاصلے پر فوجی چھاؤنی قائم کی گئی ہے۔ راولپنڈی سرگودھا، شیخوپورہ، لاہور اور سیالکوٹ کی طرف جانے کے لیے لاریوں کا ایک بہت بڑا اڈا شہر کے ساتھ شمال کی طرف بنایا گیا ہے۔ ان تمام امور کے باعث گوجرانولہ جدید زمانے کا ایک ترقی پذیر شہر بن چکا ہے۔ (عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا)۔

(ادارہ)

گُور خان: قرہ ختائی [رک بآں] کے فرمانرواؤں کا ایک لقب، مسلم مصنفین نے اس لفظ کا مطلب خان خاناں بتایا ہے لیکن Grigoryew (*Vostočniy Turkestan*، ۱ : ۳۹۸) نے یہ تاویل رد کر دی ہے اور گور خان کو تاتاری گورگن (داماد) کا مترادف قرار دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطنت قرہ ختائی کے بانی نے یہ لقب اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ لیو (Liao) خاندان (شمالی چین میں) کے سابق شہنشاہوں کا رشتے دار تھا، لیکن تاحال ایسی کوئی تحریری سند نہیں مل سکی جس سے اس نظریے کی تصدیق ہو سکے۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی بخوبی معلوم نہیں ہو سکا کہ ختائی کی زبان کس حد تک تاتاری سے ملتی جلتی تھی یا اس نے کہاں تک تاتاری الفاظ قبول کر لیے تھے اور آیا گورگن کا گورخان کی شکل میں بدل جانا اس زبان کی بعض صوتی خصوصیات کا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

رهین منت تھا ۔ بلاشبہہ قرہ ختائی کے متعلق فارسی بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گورخان کے دربار میں داماد کے لیے چینی لفظ فوما (*fu-ma*) استعمال کیا جاتا تھا (دیکھیے Defrémery کا حاشیہ اس کی طبع میر خواند، *Histoire des Sultans du Kharezm*، سے متعلق، ص ۱۲۴)، گورخان کے حریف جاموقہ (دیکھیے ۔ مادّۂ چنگیز خان) نے تیرھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں، بظاہر قرہ ختائی کے بادشاہوں کی نقل کرتے ہوے، گورخان کا لقب اختیار کر لیا تھا، زمانۂ مابعد میں یہ لقب نظر نہیں آتا۔

(W. BARTHOLD)

* **گور دُوس** : اسی نام کی 'قضا' کا صدر مقام جو ولایت آیدین کی سنجاق صارُخان میں واقع ہے ۔ یہ قالینوں (خصوصاً سجّادہ، یعنی جا نماز) کی صنعت کی وجہ سے مشہور ہے ۔ ابتدا میں یہ قرہ سی اوغلو کی حکومت میں شامل تھا اور ۱۳۴۰ء میں دوسرے علاقے کے ساتھ ہی یہ بھی سلطنت عثمانیہ کے قبضے میں چلا گیا ۔ جدید شہر کی آبادی تقریباً ۵۰۰۰ ہے جس میں ۴۰۰۰ مسلمان ۱۰۰۰ یونانی ہیں۔

مآخذ : (۱) مُنجّم باشی : ۳ : ۳۶ ؛ (۲) جہان نما، ص ۶۳۵؛ (۳) *Turquie d' Asie*: Cuinet ۳ : ۵۵۶ ببعد.

(J. H. MORDTMANN)

* **گورگانی** : فخرالدین اسعد گورگانی ویس و رامین دربار شاہی سے تعلق رکھنے والی پہلی عشقیہ مثنوی کا مصنف ہے ۔ ذبیح اللہ صفا [تاریخ ادبیات ایران، ج ۲، ۳۶۱] کا خیال ہے کہ اس کی امتیازی حیثیت یہ ہے کہ مصنف نے ایک ادبی اسلوب کا آغاز کیا، اور اس کی پیروی میں منظوم داستانوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، جن میں سے بیشتر قابل توجہ ہیں۔ اس کی زندگی کے صرف وہی مختصر سے حالات معلوم ہیں، جن کا اس کی نظم سے پتا چلتا ہے۔ اس کے سوانح نگاروں نے جو حالات لکھے ہیں، وہ برائے نام ہیں ، لیکن وہ اس بات پر متفق ہیں کہ نظم (ویس و رامین) اس کی تصنیف ہے (سوا دولت شاہ سمرقندی کے جو غلطی سے نظامی نام کے شعرا میں سے کسی ایک کی بتاتا ہے) .

عوفی نے گورگانی کی تین غزلیں درج کی ہیں (طبع محجوب، دیباچہ، ۱۴) ۔ باقی غزلیں اس کی ناپید ہیں ۔ شمس قیس (معجم، طبع میرزا محمد و ای، جی، براؤن، ۸۰) لکھتا ہے کہ نظامی (گنجوی) کی خسرو و شیریں بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے اور فخرالدین اسعد کی ویس و رامین بھی اسی بحر میں ہے ۔ بعد میں (۱۴۰) وہ مصنف کا ذکر فخری کہہ کر کرتا ہے جو شاید اس کا تخلص تھا ۔ اس نظم کے آخری شعر سے پتا چلتا ہے کہ وہ نظم کی تکمیل کے وقت جوان تھا ۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی (طبع مینوی، ۳۶۸، ترجمہ ۷۲؛ طبع محجوب، ۳۵۰، ترجمہ ۷۲؛ ترجمہ Massé، ۴۳، نیچے سے) بیان کرتا ہے (جس سے احساسات عشق بیان کرنے میں اس کی مہارت کا پتا چلتا ہے) "کتنے ہی دن سے واردات عشق مجھ پر گزری ہیں، لیکن ایک دن بھی خوشی کا میسر نہیں آ سکا" .

گورگانی نے یقیناً فلاسفۂ عرب و ایران کے خیالات (دیکھیے دیباچہ ویس و رامین، موضوع خالق لازوال اور اس کی مخلوق) اور فلکیات کا مطالعہ کیا تھا (وصف شب، طبع مینوی، ۸۰؛ طبع محجوب ۶۰، ترجمہ ۷۲) ۔ دیباچے میں سلطان طغرل بیگ اور اس کے وزیر عمید ابوالفتح مظفر کی تعریف کی ہے جسے سلطان نے اصفہان فتح کرنے (۴۴۱ھ/۱۰۵۰ء) کے بعد اصفہان کا حاکم مقرر کیا تھا ۔ عمید ابو الفتح گورگانی کا سرپرست تھا ۔ عمید نے بعض منصب بھی اس کے سپرد کیے تھے ۔ عمید سے گفتگو کے دوران جیسا کہ اس نے تفصیل سے بتایا ہے،

www.besturdubooks.wordpress.com

اس نے یہ کہا (مینوی ۲۵ تا ۲۷؛ محجوب، ۱۸ تا ۲۱؛ ترجمہ ۶، ۷) کہ یہ موضوع اسے ویس و رامین کی داستان عشق سے ملا ہے، جو پہلوی خط میں محفوظ ہے۔ ''یہ ایک مسلسل عشقیہ داستان ہے لیکن افکار و خیالات سے تہی اور عجیب و غریب (متروک) الفاظ پر مشتمل ہے۔ گویا یہ ایک منثور داستان ہے جو رنگینی بیان سے محروم ہے (شاید نظم کے جارجین ترجمے کی طرح)''۔ حاکم اصفہان نے گورگانی کو فرمائش کی کہ ''اسے فارسی میں ترجمہ کر دے اور اسے وہ زینت دے جو تختۂ گل کو ماہ اپریل میں دی جاتی ہے''۔ گورگانی نے یہ کام شروع کر کے ۴۴۷ھ / ۱۰۵۵ء میں یا اس سے تھوڑی دیر بعد اس کی تکمیل کر دی۔ اس کی یہ مثنوی بحر ہزج میں ہے اور ۸۹۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہی بحر بعد کے شعرا نے عشقیہ مثنویوں کے لیے اختیار کی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا گورگانی پہلوی زبان جانتا تھا؟ حاکم اصفہان سے گفتگو کا جو ذکر آیا ہے اگرچہ واضح نہیں تاہم اس کے پیش نظر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ پہلوی زبان جانتا تھا۔ اس کے ایک شعر کے مفہوم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پہلوی زبان سے وہ آشنا تھا، خواہ اس کا یہ علم مکمل نہ بھی ہو ''جو شخص پہلوی جانتا ہو، خراسان اس مقام کا پتا دیتا ہے جہاں سے ہم روشنی حاصل کرتے ہیں (طبع مینوی محجوب باب ۴۸، ج ۴)۔ گورگانی حاکم اصفہان سے اپنی نے گفتگو میں داستان کی بے کیفی اور پہلوی زبان کے عجیب الفاظ کا ذکر کیا تھا۔ اس سوال کے لیے کہ کیا اس نے پہلوی متن سے براہ راست استفادہ کیا یا فارسی ترجمے کے ذریعے دیکھیے محجوب: دیباچہ ص ۲۰۔ بہرحال یہ بہت اہم بات ہے کہ اس نے پہلوی کی اصل داستان کو نئی زندگی دی ورنہ بلا شبہہ وہ پہلوی اکثر کتابوں کی طرح کی ناپید ہو جاتی۔

اس مثنوی میں خصوصاً خیر و شر کی طاقتوں کی بار بار آنے والی تلمیحات، مقدس آتشکدوں (جن کے نام بھی آتے ہیں) اور ان کی دیکھ بھال، مہینوں کے قدیم نام، جشنوں کی تقریبات اور روایتی خصوصیات کے اذکار سے ایران قدیم کی ثقافت نمایاں ہے۔ اس میں کڑی آزمائش کے ایک مقدمے کا بھی حال بیان کیا گیا ہے اور رشتہ داروں کے مابین ایک شادی جو ایران قدیم کے شاہی خانوادے ہی کی خصوصیت تھی کا بھی ذکر آیا ہے۔ نظم کا موضوع المیہ محبت ہے۔ ویس و رامین کے پہلے ایڈیشن ہی میں اس کی مماثلت ''Isenll Tristan'' سے واضح ہو گئی تھی اس لیے اب کوئی ضرورت نہیں کہ مثنوی مذکور کا تجزیہ کیا جائے دیکھیے (Massé ۹۰۰)۔ ممکن ہے کہ اس رومان کی بنیاد تاریخی واقعے پر ہو Minorsky نے یہ واضح کرنا چاہا ہے کہ اس مثنوی میں غالباً اشکانی عہد کے سات شاہی خانوادوں میں سے ایک کی شہزادی اور اشکانی خاندان کے ایک شہزادے کی واردات عشق نظم کی گئی ہیں۔

گورگانی کی اس نظم میں کچھ آثار واقعی ایسے بھی ہیں، جن سے اس زمانے کے رسم و رواج اور لوک گیتوں کا حال جاننے میں مدد ملتی ہے۔ اس کا اسلوب نگارش بعض اوقات بہت مؤثر اور دلنشین معلوم ہوتا ہے (ترجمہ، ۲۰، ۲۱) بالخصوص اس وقت جب کہ وہ دوسرے شعرا کی طرح صنف نازک کے حسن و خوبی کو رسمی انداز میں بیان کرتا ہے (دیکھیے باب ۳۷، ترجمہ ۹۰)۔ محجوب نے متعدد تصورات اور قدیمی محاورات (دیباچہ، ۵۵، ۵۶) اور بعض متروکات کی نشان دہی کی ہے جو خاص خاص معنوں میں استعمال ہوئے ہیں (دیباچہ، ۳۴) اور بعض ایسے الفاظ بھی بتائے ہیں جو پہلوی وضع سے قریب تر ہیں (دیباچہ، ۴۳)۔ اس مثنوی کا اثر دیرپا ثابت ہوا۔ محجوب نے وہ مماثلت بھی بتائی ہے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

جو گورگانی اور بعد کے شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ کچھ ان خیالات کا بھی ذکر کیا ہے، جو گورگانی سے دوسرے شعرا نے لیے ہیں (دیباچہ 98 ff) دس جذباتی خطوط جو ویس نے رامین کو لکھے (مینوی، ص ۳۴۷ تا ۳۸۳؛ محجوب: ۲۵۹ تا ۲۸۶: ترجمہ ۳۱۸ تا ۳۵۱) ۔ ان کی تقلید اوحدی، ابن عماد، عارفی، عماد فقیہ (دس خطوط)، امیر حسینی، کاتبی اور سلیمان ساوجی (۳۰ خطوط) نے کی ہے۔ زیادہ اہمیت اس مسائلت کی ہے جو ویس و رامین اور خسرو و شیریں نظامی کے انداز میں پائی جاتی ہے۔ غالباً نظامی، گورگانی ہی سے متاثر ہوا تھا اگرچہ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے غالباً نظامی کا ارادہ یہ تھا کہ اس کے ماہرانہ اور انتہائی مرصع اسلوب کا تقابل گورگانی کے سادہ اور متین اسلوب سے کیا جا سکے۔

مآخذ: ایڈیشن (۱) Nassau Lees و منشی احمد علی (Bibl. Ind.) کلکتہ ۱۸۶۴ء - یہ برصغیر پاکستان و ہند کے ایک مسودے پر مبنی ہے: (۲) مینوی، تہران ۱۳۱۴ھ/۱۹۳۵ء میں جو تین مسودوں پر مبنی ہے جن میں Bibl. Nat. Paris کا مسودہ بھی شامل ہے اور اس سلسلے کا بہترین مسودہ ہے: (۳) محمد جعفر محجوب، تہران ۱۳۳۷ھ/۱۹۵۹ء - یہ سابق دو مسودوں پر مبنی ہے: (۴) H. Massé، ترجمہ فرانسیسی میں مع مقدمہ، پیرس ۱۹۵۹ء: (۵) گرجستانی تصرف، *Visramiani*، ترجمہ از O. Wardrop (اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ، نیا سلسلہ، xxxiii، لنڈن ۱۹۱۴ء)؛ مطالعات: (۵) ذبیح اللہ صفا: تاریخ ادبیات در ایران، تہران ۱۳۳۶ھ/۱۹۵۸ء، ج ۲، بمدد اشاریہ؛ (۶) *Gr. I. Ph.*، بمدد اشاریہ؛ (۷) K. H. Graf. تجزیہ اور اقتباسات جو جرمن میں بصورت نظم ترجمہ کیے گئے ہیں، در *ZDMG*، ۲۳ (۱۸۶۹ء) ۵۰۷ تا ۵۴۳؛ (۸) v. Minorsky : *Note sul wis u Rāmin a Parthia Romance, in BSOAS xi/4*، ۱۹۴۶ء؛ (۹) صادق ہدایت، در پیام نو، تہران ۱۳۲۴ھ/۱۹۴۶ء، شمارہ ۱، ۲؛ (۱۰) ایم مینوی، در سخن، تہران ۱۳۳۳ - ۱۳۳۴ھ/۱۹۵۶ء، شمارہ ۱، ۲؛ (۱۱) A. Bausani : *Storia della letteratura persiana*، میلان ۱۹۶۰ء، ۶۲۱ تا ۶۲۶؛ (۱۲) J. Rypka : *Iranische Litera-turgeschichte*، لائپزگ ۱۹۵۹ء، ۱۷۶ - ۱۷۸۔

(H. Massé)

گوڑ: بنگال کا پرانا پایہ تخت جو مالدا کے ضلع (مغربی بنگال) میں عرض البلد ۲۴ درجے ۵۴ دقیقے شمال اور طول البلد ۸۸ درجے ۸ دقیقے مشرق میں دریائے گنگا کے مشرق میں اسی دریا کے ایک تنگ اور متروک دھارے کے کنارے واقع ہے اور مالدا کے شہر سے کوئی بارہ میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ گوڑ کا نام بہت قدیم ہے اور فرشتہ لکھتا ہے کہ صدیوں پہلے اس شہر کی بنیاد ایک ہندو شنکل نامی نے ڈالی تھی، بعد کے زمانے میں اسے لکھنوتی کہنے لگے جو ''لکشمن وتی'' کی ایک مختصر شکل ہے اور یہ نام بھی بنگال کے ایک ہندو راجا کے نام سے لیا گیا ہے۔ ۱۱۹۷ء یا ۱۱۹۸ء میں مسلمانوں کا اس پر قبضہ ہوا۔ ۱۲۴۳ء - ۱۲۴۴ء میں منہاج الدین یہاں آیا جو اپنی تصنیف طبقات ناصری (Raverty کا ترجمہ، ۱: ۵۸۴) میں اس شہر کا کچھ حال لکھتا ہے۔ وقتاً فوقتاً یہ شہر بنگال کے مسلمان بادشاہوں کا پایہ تخت بنتا رہا گو وہ اس مقام یعنی گوڑ کے علاوہ پانڈوا میں بھی رہا کرتے تھے جو گوڑ سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر شمال مشرق میں ہے۔ ۱۵۳۸ء میں شہنشاہ ہمایوں بھی یہاں مقیم رہا، اس نے اس شہر کا نام جنت آباد رکھ دیا کیونکہ وہ گوڑ کے نام کو منحوس سمجھتا تھا جو فارسی زبان میں گور یا ضریح سے ملتا جلتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کے سپہ سالار

www.besturdubooks.wordpress.com

منعم خان نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن ۱۰۷۵ء میں اسے یہ شہر خالی کرنا پڑا کیونکہ یہاں وبا پھیل گئی تھی۔ سب سے آخر میں آخری بار جو شہزادہ یہاں رہا، وہ سلطان شجاع تھا جو سترھویں صدی کے وسط میں یہاں آیا تھا۔ اب یہ شہر بالکل کھنڈر ہو چکا ہے لیکن اس میں ایک عالی شان تالاب موجود ہے جسے ''ساگر دیگھی'' کہتے ہیں۔ مسجدوں کے آثار باقیہ کی حفاظت حکومت کرتی ہے۔

امپریل گزیٹیر آف انڈیا کی جلد ۱۲ میں گوڑ کا مفصل حال درج ہے۔ سولھویں صدی میں یہاں پرتگیزی بھی آئے تھے اور ۱۶۸۳ء میں سرولیم ہیجز William Hedges بھی آیا تھا۔ اس نے اپنے روزنامچے میں (Hakluyt Soc. 1887 - 89) اس شہر کا ذکر کیا ہے۔ اس سے قبل کے حالات کی تفصیل کے لیے دیکھیے Henry Creighton: *Ruins of Gaur Described*، لنڈن ۱۸۱۷ء، لیکن J. H. Ravenshaw کی تصنیف گوڑ جو اس کی بیوہ نے شائع کی، زیادہ صحیح حالات کی حامل ہے (لنڈن ۱۸۷۸ء) - *Archaeological Reports of India*، جلد ۱۵ میں بھی اس کا ذکر ہے۔ نیز دیکھیے Dr. Buchanan: *Eastern India* اور *A Note on Maj. Francklin's art. Description of Gaur*، جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، ج ۶۳، جزو ۱، ص ۸۵ ببعد؛ اور اسی رسالے میں الٰہی بخش کی تصنیف خورشید جہاں نما پر تنقید ج ۶۴، جزو ۱، ص ۱۹۴؛ بنگال کے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ اور گوڑ کے کچھ حالات کے متعلق دیکھیے، غلام حسین: ریاض السلاطین، ترجمہ از عبدالسلام، کلکتہ ۱۹۰۲ء اور Stewart: *Hist. of Bengal*.

(H. BEVERIDGE)

گوک آلپ ضیاء: ترک مفکر جن کا اصلی نام محمد ضیا تھا، ۱۸۷۵ یا ۱۸۷۶ء میں دیار بکر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۱ء کے بعد سے وہ اپنے ادبی نام (گوک آلپ) سے معروف ہو گئے۔ ضیاء نوجوان ترکوں کے وطن پرستانہ اور آئین پسندانہ تصورات سے اپنے والد کی بدولت آشنا ہوئے جو انھیں ایک جدید وضع کے ہائی سکول میں داخل کرنے کے بعد جہاں وہ جدید علوم اور فرانسیسی زبان کی تعلیم حاصل کر سکیں، انتقال کر گئے۔ گوک آلپ نے اپنے چچا سے عربی، فارسی اور اسلامی علوم نقلیہ کی تحصیل کی اور مسلمان فقہا، فلاسفہ اور صوفیہ کی تصانیف سے استفادہ کیا۔ ان کے دماغ میں راسخ العقیدہ مذہب، تصوف اور جدید علوم کے باہمی تصادم نے، جس میں ان کے چچا کی جانب سے ان کی استانبول جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی مخالفت سے مزید اضافہ ہو گیا، انھیں خود کشی کرنے پر آمادہ کر دیا، لیکن ان کے ہم شہری ڈاکٹر عبداللہ جودت [رک بآں] نے، جو عمر میں ان سے بڑے تھے، انھیں اس ارادے سے باز رکھا۔ ان کی بعد کی زندگی ان تینوں اثرات کے مابین ذہنی کش مکش کا ایک ہنگامہ نظر آتی ہے جسے تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ان کی انقلاب پسندی اور آزاد خیالی کے دور کا آغاز استانبول میں مدرسۂ بیطاری میں داخلے اور خفیہ انجمن اتحاد و ترقی کا رکن بننے سے ہوا، ۱۸۹۷ء میں انھیں گرفتار کرلیا گیا، ایک سال قید کی سزا ہوئی اور واپس دیار بکر بھیج دیا گیا۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد ضیاء دیار بکر میں سرکردہ عثمانیت پسند، آزاد خیال مصنف اور خطیب بن گئے۔ ان کی ایک نصب العین پسند، ہمدرد خلق اور قوم پرست ہستی میں تبدیلی جو ان کی زندگی کے دوسرے دور کی نشاندہی کرتی ہے، سیلونیکا میں وقوع پذیر ہوئی، جہاں وہ ۱۹۰۹ء میں ''انجمن اتحاد و ترقی'' کے ایک اجتماع میں نمائندے کی حیثیت سے گئے تھے اور اس انجمن کی مرکزی مجلس

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کے کارکن منتخب ہو جانے کے بعد وہیں مقیم ہو گئے۔ یہاں وہ اہل قلم کے ایک گروہ کے شریک کار بن گئے جن کا تعلق گنج قلمرو اور یکی فلسفہ مجموعہ سی نامی اخباروں سے تھا۔ یہ لوگ زبان اور ادب کو ایک عوامی رنگ دینے اور ایک نئے نصب العین کی نشو و نما میں دلچسپی رکھتے تھے جو اس معاشرتی تبدیل ہیئت میں رہنمائی کر سکے، جس کی ابتدا ان کے خیال میں ۱۹۰۸ء کے انقلاب سے ہوئی تھی۔ اس گروہ نے دو مختلف رجحانوں کی پرورش کی؛ ایک مادّی اور اشتراکی، اور دوسرا نصب العینی اور قوم پرستانہ۔ گوک آلپ ان میں سے دوسرے رجحان کے رہنما بن گئے اور پہلا رجحان جلد ہی ختم ہو گیا۔

۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۹ء تک گوک آلپ استانبول میں رہے۔ یہ ان کی زندگی کا مؤثر ترین دور تھا۔ قازان، قریم اور آذربیجان سے جو پڑھے لکھے لوگ ہجرت کر کے آئے تھے، ان سے شناسائی کی بدولت گوک ضیاء کی وطن پرستی میں پین تورانی رنگ بڑھ گیا، اگرچہ وہ ان لوگوں کے نسل پرستانہ رجحانات کے حامی نہ تھے۔ وہ سلطنت عثمانیہ کے ترکوں کے مابین ابتداءً قوم پرست اور نصب العین پسند ہی رہے، جنھیں ان کے نزدیک اس انقراض پذیر سلطنت کی غیر ترک قومیتوں کے افکار کے مقابلے کے لیے احساس قومیت پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ ان کا کلیدی تصور ثقافت کو تمدن سے جدا سمجھنا تھا جس کی تعریف وہ یوں کرتے تھے کہ وہ ان اقدار اور اداروں پر مشتمل ہے جو کسی تمدن میں مشترک طور پر شامل اقوام کو ایک دوسری سے ممیز کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک جدید ترکی قوم کی تشکیل مشرقی تمدن کے دائرے سے مغربی تمدن کے حلقۂ اثر میں منتقل ہو کر عمل میں آئے گی، اس تبدیلی میں اسلام کے وہ عناصر جو ترکی ثقافت کا جزو لاینفک بن چکے ہیں، ایک زندہ روحانی قوت کی حیثیت سے باقی رہیں گے، ترک قوم صرف اس حد تک مغربی رنگ اختیار کرے گی، جہاں تک کہ وہ جدید تمدن کو اپنی ثقافت اور اپنے مذہب سے ہم آہنگ بنانے میں کامیاب ہو سکے گی۔ مقالات کے ایک سلسلے کے ذریعے اور ان لکچروں کی مدد سے جو وہ جامعۂ استانبول میں بحیثیت معلم عمرانیات دیتے رہے، انھوں نے اپنے اس نقطۂ نظر کی مزید تشریح و توضیح کی تاکہ یہ بتائیں کہ اسے ان اصلاحات میں کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے جن کی تعلیم، زبان، خاندان قانون، معاشیات اور مذہب میں ضرورت تھی۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد انگریزوں نے گوک آلپ کو کئی اور ترک سیاست دانوں اور روشن خیال لوگوں سمیت مالٹا میں جلا وطن کر دیا۔ ۱۹۲۱ء میں رہائی کے بعد وہ اس قومی تحریک میں شامل ہو گئے جس کی قیادت مصطفٰی کمال کر رہے تھے۔ اگرچہ وہ کمال پاشا کی اصلاحات کی مکمل تائید کرتے رہے، تاہم وہ زیادہ انتہا پسند کمالی حکومت کے ایک ممتاز ترین نصب العین پرست کا مرتبہ حاصل نہ کر سکے۔ انھوں نے ۱۹۲۴ء میں وفات پائی۔ اس وقت وہ بیوک مجلس ملّی کے رکن تھے۔

گوک آلپ شعر بھی کہ لیتے تھے، لیکن دراصل وہ مضمون نویس تھے۔ ان کی واحد کتاب: ترک مدنیتی تاریخی، جسے انھوں نے اپنے انتقال سے کچھ عرصے پہلے لکھنا شروع کیا تھا، ناتمام رہ گئی، اس کی ایک جلد جو زمانۂ قبل از اسلام سے متعلق ہے، ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی (استانبول ۱۳۴۱ھ) ۔ بحیثیت مفکر انھیں پوری ترک قوم میں شہرت حاصل ہوئی لیکن ان کے بعض تصورات کمال پاشا کی اصلاحات سے ماند پڑ گئے، بعض کو مصطفٰی کمال کی مخالف پین تورانی جماعت نے توڑ مروڑ کر پیش کیا، اور بعض کو ان کے

www.besturdubooks.wordpress.com

انتقال کے بعد یکسر رد کر دیا گیا ۔ جدید ترکی کا ایک غیر مذہبی قومی ریاست کی حیثیت سے قیام بہت حد تک اسی تعیین جہت Orientation کا رہین منت ہے جسے گوک آلپ کے تصورات نے مرتب کیا تھا ۔ ان تصورات کا ایک غیر ارادی اثر ترکی کے باہر ہوا، مثلاً معلوم ہوتا ہے کہ ساطع الحصری نے، جو ۱۹۱۹ء میں عرب قومی تحریک میں شامل ہونے اور ترکی کو خیر باد کہنے سے پہلے ان کے بے تعصب مخالفین میں سے تھا، اس نے گوک آلپ کے نظریۂ قومیت ان کے معاشرتی فلسفے، ان کی غیر مذہبیت اور ان کے قومی تعلیم کے تصور کو اپنا لیا۔

مآخذ: گوک آلپ کی شائع شدہ ادبی تصانیف: (۱) فزل الما، استانبول ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۱ء؛ (۲) یکی حیات، استانبول ۱۹۱۸ء، ۱۹۱۱ء؛ (۳) آلیتن عشق، استانبول ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۲ء؛ (۴) ضیاء گوک آلپ کلیاتی، ج ۱: شعرلر و خلق مثلرلری، طبع F.A. Tansel، انقرہ ۱۹۵۲ء، ان کے مضامین کے مجموعے: (۵) ترک لشمک، اسلام لشمک، معاصر لشمک، استانبول ۱۹۱۸ء؛ (۶) ترکجی لینگ اساسلری، انقرہ ۱۳۳۹ھ، استانبول ۱۹۳۰ء: (۷) ترک تسوره سی، استانبول ۱۳۳۹ھ: (۸) طوغرو یول، انقرہ ۱۹۳۹ء؛ (۹) مانتا مکتوپلری، طبع علی نزهت گوکسلی، استانبول ۱۹۳۱ء؛ (۱۰) ضیا گوک آلپ و چنار آلتی، طبع علی نزهت گوکسلی، استانبول ۱۹۳۹ء: (۱۱) فرقه ندر، طبع (E. B. Şapalyo) زنگولاق ۱۹۳۷ء: (۱۲) ضیاء گوک آلپ حیاتی، صنعتی، اثری، طبع علی نزهت گوکسل، استانبول ۱۹۵۲ء، (۱۳) یکی ترکه ینلن هدفلری، انقرہ ۱۹۵۶ء؛ (۱۴) ضیاء گوک الپن ایلکیازی حیاتی ۱۸۹۳-۱۹۰۹ء، طبع شوکت بیسان اوغلو، استانبول ۱۹۵۶ء؛ (۱۵) *Turkish Nationalism and Western civilisation. selected essays of Ziya Gokalp*، ترجمہ و طبع نیازی برکس، لنڈن و نیویارک ۱۹۵۹ء، ان کی زندگی اور تصانیف پر مضامین اور کتابیں: (۱۶) نیازی برکس *Ziya Gokalp, his contribution to Turkish Nationalism*، در *MEG*، ج ۸، (۱۹۵۴ء) ص ۳۷۵ تا ۳۹۰؛ (۱۷) J. Deny: *RMM Ziya Goek Alp*، در RMM، ج ۶۱ (۱۹۲۵ء)، ص ۱ تا ۳۱؛ (۱۸) کاظم نامی دو رو: ضیاء گوک آلپ، استانبول ۱۹۴۹ء؛ (۱۹) امین علی شیر گل: برفکر آدمنک رومانی، استانبول ۱۹۴۱ء؛ (۲۰) ضیاء الدین فخری: *Ziya Gokalp, sa vie et sa sociologie*، پیرس ۱۹۳۵ء؛ (۲۱) A. Fischer: *Aus der religiösen Reformbewegung*، لائپزگ ۱۹۲۲ء؛ (۲۲) Richard Hartmann: *Ziya Gokalp's grundlagen des turkischen Nationalismus*، در OLZ ج ۲۸ (۱۹۲۵ء) عمود ۵۷۸ تا ۶۱۰؛ (۲۳) Uriel Heyd: *Foundations of Turkish Nationalism: the life and teachings of Ziya Gokalp*، لنڈن ۱۹۵۰ء، (دیکھیے ص ۱۷۳، گوک آلپ کے لیتھو گراف شدہ یونیورسٹی لکچروں اور غیر شائع شدہ تصانیف کے لیے)؛ (۲۴) احمد محیی الدین: *Die kulturbewegung im modernen Turkentum*، لائپزگ ۱۹۲۱ء؛ (۲۵) علی نزهت گوکسل: ضیاء گوک آلپ: حیاتی واثرلری، استانبول ۱۹۴۹ء؛ (۲۶) صفت اورفی (عرفی): ضیاء گوک آلپ و مفکوره، استانبول ۱۹۲۳ء؛ (۲۷) Ettore Rosse: *Uno scrittore turco contemporaneo: Ziya Gokalp*، در *Om*، ج ۴ (۱۹۲۴ء) ص ۵۷۴ تا ۵۹۵؛ (۲۸) Enver B. Sapolyo: ضیاء گوک آلپ اتحاد و ترقی و مشروطیت، استانبول ۱۹۴۳ء؛ (۲۹) عثمان طولغه: ضیاء گوک آلپ و اقتصادی فکرلری، استانبول ۱۹۴۹ء؛ (۳۰) جاوید الجوتنقل: ضیاء گوک آلپ حقنده بربلیوگه افیادینه میسی استانبول ۱۹۴۹ء؛ (۳۱) جاوید ۱ طوتنقل: ضیاء گوک الیک دیار بکر غزته لرنده چقان یاز یلری، استانبول ۱۹۵۴ء: (۳۲) ترک یوردو، ۱۳۳۰ھ، سال ۴، ۱

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

شمارہ ۳؛ (۳۳) ح، اولکن : ضیاء گوک آلپ، غیر مؤرخ .
(نیازی برکس)

* گوک تپہ : (نیلی پہاڑی)، ایک ترکمانی قلعہ جو اسکوب لیو Scobelew کی مہم (۱۸۸۰-۱۸۸۱ء) کی وجہ سے مشہور ہو گیا - یہ نام دراصل اس قلعے کا تھا جو بعد ازاں کہنہ گوک تپہ کے نام سے مشہور ہوا اور جسے ۱۸۷۹ء میں ترکمانوں نے خالی کر دیا تھا - زیادہ وسیع مفہوم میں اس سارے نخلستان کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا جس میں قبیلۂ تکہ نے روسیوں کی آمد پر اپنی تمام فوجیں جمع کر لی تھیں - سب سے مستحکم قلعہ دنگل تپہ تھا جس کی ۱۸۷۹ء میں بڑی کامیابی سے مدافعت کی گئی - اسکوب لیو Scobelew کی آمد سے کچھ ہی مدت پہلے اس قلعے کے استحکامات کو بہتر بنانے کے لیے کئی مستحکم مورچے (کہا جاتا ہے کہ انگریز افسر بٹلر کی زیر ہدایت) تعمیر کر لیے گئے تھے، لیکن محصورین (تقریباً ۱۲۰۰۰ آدمی جو کسی ایک رہنما کے ماتحت نہیں تھے) کے پاس صرف ایک توپ تھی جو ۱۸۶۸ء میں ایرانیوں سے چھینی گئی تھی - دوران محاصرہ میں دو ہلکی توپیں روسیوں سے بھی چھین لی گئیں لیکن ترکمان ان سے کچھ کام نہ لے سکے - روسی فوج کی تعداد ۸۰۰۰ تھی اور ان کے پاس ۷۰ توپیں تھیں - ۱۲ (۲۴) جنوری ۱۸۸۱ء کو بیس دن کے محاصرے کے بعد گوک تپہ ایک عام حملے کے بعد فتح ہو گیا اور چار دن کے لیے سپاہیوں کو لوٹ مار کی کھلی چھٹی دے دی گئی - جو ترکمان محاصرے یا لوٹ مار کے دوران میں ہلاک ہوئے ان کی تعداد ۶۰۰۰ سے ۸۰۰۰ تک بیان کی جاتی ہے - روسیوں کو وسط ایشیا میں جو فتوحات حاصل ہوئی تھیں، ان سب کی نسبت انھیں کہیں زیادہ قربانیاں دے کر یہ کامیابی نصیب ہوئی - ان کے ہلاک یا زخمی سپاہیوں کی کل تعداد ۱۰۰۰ سے زیادہ تھی - علاوہ بریں گوک تپہ کے سامنے لڑی جانے والی لڑائیاں ہی صرف ایسی تھیں جن میں روسی فوج سے اس کے جھنڈے اور توپیں چھینی گئیں، دیکھیے ان جنگوں کے تازہ ترین بیانات M. Teremjew: *Istoriya zawoyewaniya Srednei Azii*، ۱۰۷ ببعد .

گوک تپہ آج کل ٹرانس کسپین ریلوے کے اس سٹیشن کا نام ہے جو دنگل تپہ کے نزدیک [اشخ آباد (اشک آباد، اشخ آباد) سے تیس میل مغرب میں] تعمیر کیا گیا ہے - یہاں ۱۸۸۰-۱۸۸۱ء کی مہم سے متعلق ایک عجائب گھر بھی ہے اور جب گاڑی (دس پندرہ منٹ کے لیے) اس سٹیشن پر ٹھیرتی ہے تو مسافر اسے دیکھنے جاتے ہیں .

(W. BARTHOLD)

* گوکچای : ترکی گوکچہ تنگز ("نیلا سمندر") ارمنی سوانگہ (سو- وانک سے "سیاہ حجرہ") روسی آرمینیا (حکومت ارون یا اریوان) میں میٹھے پانی کی ایک جھیل - یہ سطح سمندر سے ۶۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور ۶۲ مربع میل کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے، اس کے پانی کا نکاس ایک ندی میں زنگہ کے ذریعے ہوتا ہے جو دریائے آرکس Araxes میں جا گرتی ہے - جیسا کہ Le Strange نے اشارہ کیا ہے (*The Lands of the Eastern Caliphate* ص ۱۸۳) یہ نام پہلی بار حمد اللہ القزوینی کے ہاں نظر آتا ہے - عہد تاتار سے قبل کے [المستوفی] مسلمان مآخذ میں اس جھیل کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ملتا - جس خانقاہ پر اس کا ارمنی نام رکھا گیا ہے، وہ اس کے شمال مغربی کنارے پر ایک جزیرے میں واقع ہے - آج کل گوکچای اس لیے مشہور ہے کہ یہاں مچھلیوں کی بہتات ہے (Trout، ترکی اشخن، ارمنی گگرکنی Gegarkuni)، دیکھیے Weidenbaum : *Putevoditel po Kawkazu*، ص ۳۱ .

(W. BARTHOLD)

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

* **گوکسون** : (قدیم ککسس Cucusus)، ایشیائی ترکی میں ایک گاؤں، صوبۂ حلب کی "سنجاق" مرعش کی قضا "اندرین" کے ایک 'ناحیہ' کا صدر مقام ۔ یہ چکنی مٹی کے پہاڑوں سے گھرے ہوئے ایک نشیبی اور دلدلی میدان میں واقع ہے اور صرف درختوں کے تنوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں پر مشتمل ہے ۔ بلندیوں پر آج بھی کئی ارمنی قلعوں کے کھنڈر موجود ہیں ۔ اس کے ارد گرد کا تقریباً سارا علاقہ صحرا ہے ۔ سینٹ کری سوسٹم St. Chrysostom، نے اپنی جلا وطنی کے دوران میں ۴۰۷ء میں کچھ عرصہ یہاں گزارا ۔ پہلی صلیبی جنگ میں فرنگیوں نے تین روز گرکسون (کوکسون Cocson، کوسور Cosor) میں بسر کیے تھے، کیونکہ انہیں یہاں خاصا سامان رسد مل گیا تھا ۔

مآخذ : (۱) Ch. Texier : *Asie Mineure* ص ۵۸۰؛ (۲) Michaud : *Hist. des Croisades* طبع ہفتم، ۱ : ۱۳۲ ۔

(CL. HUART)

* **گوک صو** : "نیلا دریا"، ترک متعدد دریاؤں کو اس نام سے پکارتے ہیں ۔ ان میں سے مشہور ترین دریائے سلیفکہ ہے جسے ارمینک صو بھی کہتے ہیں ۔ قدما اسے کلیکڈنس Calycadnus اور از منۂ وسطیٰ کے مصنفین سلف Saléph کہتے تھے، جس میں ۱۰ جون ۱۱۹۰ء کو شہنشاہ فریڈرک غرق ہو گیا تھا ۔

مأخذ : (۱) Ritter : *Erdkunde*، ۱۹ : ۲ ص ۳۰۶ ببعد ۔

(CL. HUART)

* **گوکلان** : ایک ترکمانی قبیلہ جو دریائے گورگن اور اترک (رک بآں) کی بالائی گذرگاہوں کے درمیان کے پہاڑوں، یعنی ایرانی علاقے میں آباد ہے، لیکن اس کے بعض افراد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ روسی علاقے میں، یعنی جیوا، قرہ قلعہ اور کندر میں آباد ہیں ۔ یہ قبیلہ حسب ذیل شاخوں میں منقسم ہے : چگر، کرک، بایندر، کیئی، ینگک، سغری، قرہ، بلخان، ای درویش، ارکلی اور شیخ خوجہ ۔ گوکلان کی کل تعداد کا صحیح صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ۔ Schuyler ان کی کل آبادی ۲۰۰۰ کبتکہ = ۱۵۰۰۰ افراد بتاتا ہے اور Vambéry بھی اس سے متفق ہے، لیکن اس کے برعکس Yate کے خیال میں یہ صرف ۲۰۰۰ کبتکہ (= ۱۰۰۰۰ نفوس) ہے ۔ Vambery نے جن دوسرے بیانات کے اقتباس پیش کیے ہیں، ان میں اس سے زیادہ تعداد درج ہے ۔ اس کی توجیہ یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ اندازے بہت قدیم زمانے میں لگائے گئے تھے اور اس دوران میں ان کی تعداد کم ہو گئی ہے ۔ گوکلان خانہ بدوش نہیں، بلکہ کاشتکاری کرتے اور ریشم کے کیڑے پالتے ہیں، خاصے خوشحال ہیں اور شاہ کو سالانہ خراج کی ایک مقررہ رقم ادا کرتے ہیں ۔ قطعی طور پر یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ وہ ان علاقوں میں کب سے آباد ہیں، لیکن غالباً وہ عہد سلاجقہ میں یہیں موجود تھے، ان کے ہمسایوں یعنی یموتوں Yomuts سے جو مغرب میں آباد ہیں اور بجنرد کے کردوں سے اکثر لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں ۔ گوکلان بظاہر تساہل پسند مسلمان ہیں لیکن اپنے مذہبی مقتداؤں (خوجہ گان) کا بے حد احترام کرتے ہیں ۔

مآخذ : (۱) Vambéry : *Das Türkenvolk*، ۳۹۳ ببعد؛ (۲) Schuyler : *Turkistan* ۲ : ۳۸۲؛ (۳) Yate : *Khurasan and Sistan*، ص ۲۱۲ ببعد؛ (۴) Sykes : *Ten Thousand Miles in Persia, etc.*، ص ۱۸، ملاحظہ ہوں (مختلف بیانات) ۔

(CL. HUART)

* **گوگو** : Gogo، سوڈان کا ایک شہر، دریائے نائیجر کے کنارے، ٹمبکٹو سے تقریباً ۲۵۰ میل

www.besturdubooks.wordpress.com

مشرق میں، ۱۶° ۱۲′ م عرض بلد شمالی اور ۴۲′ ۵۳ طول بلد مشرقی (گرینوچ) پر واقع ہے۔ عرب جغرافیہ دانوں کے یورپی مترجمین نے "گوگو" کئی طریقوں سے لکھا ہے۔ لیو افریکانس (Leo Africanus) کے ہاں ہمیں اس کی حسب ذیل صورتیں ملتی ہیں Kaogha، Caucau، Kaokao اور Gago؛ البکری (Description de l' Afrique، ترجمہ de Slane، ص ۳۹۹) اس کی ایک عجیب و غریب توجیہہ پیش کرتا ہے کہ "یہاں کے باشندے کہتے ہیں ان کا شہر گوگو (Kao Kao) کے نام سے اس لیے مشہور ہو گیا کہ ان کے ڈھولوں سے یہ آواز بہت صاف نکلتی ہے"۔ ہوڈس Houdas کے نزدیک (تاریخ السوڈان، ترجمہ، ص ۶، حاشیہ ۳) یہ سب "کو کوئی کوریہ" Kookoy Korya کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں، جس کا مطلب ہے "بادشاہ کا شہر"۔ ان دو اسما میں سے پہلے کو لے کر اس مقام کا نام رکھ دیا گیا۔

گوگو سلطنت سنغئی (Songhai) (دیکھیے مادّہ ہای سوڈان، سنغئی) کا صدر مقام تھا۔ اس کی بنیاد ساتویں صدی عیسوی میں پڑی۔ جب دیہ (زا) الایمان دریاے نائیجر کے کنارے گگیہ (عرب مصنفین کے ہاں کُکیۃ) میں مقیم ہو گئے تو سنغئی کی ایک جماعت "سرکو فرن" کو جو ان علاقوں میں آباد تھی شمال کی طرف نقل مکانی کر کے ایک نیا شہر گوگو بسانا پڑا۔ یہ شہر دریا کی بالائی جانب تقریباً سو میل کے فاصلے پر اس کے بائیں کنارے پر آباد کیا گیا۔ [. . . تفصیل کے لیے دیکھیے ذیل لائیڈن بذیل مادّہ].

مآخذ: (۱) البکری: *Description de l'Afrique Septentrionale*، ترجمۂ de Slane، ص ۳۹۹؛ (۲) الیعقوبی: *Historiae*، طبع Houtsma، جلد ۱، ص ۲۲۰؛ (۳) ادریسی، ترجمۂ دُخویہ، ص ۹۳؛ (۴) ابن بطوطہ: *Voyages*، ترجمۂ Defrémery، جلد ۴، ص ۳۳۵؛ (۵) Leo Africanus، کتاب ۷، طبع Schefer، جلد ۳، ص ۲۹۸ ببعد؛ (۶) السعدی: تاریخ السودان، ترجمۂ Houdas، پیرس ۱۹۰۶ء (*Public de l' Ecole des Langues orient viv*، سلسلۂ چہارم، جلد ۱۳)؛ (۷) H. Barth: *Reisen*، جلد ۴، ص ۶۰۵ ببعد، جلد ۵، باب ۹، ص ۲۱۶ ببعد؛ (۸) نزھت الھدی، *Hist. de la Dyn saadienne au Maroc*، طبع Houdas، متن ص ۸۸ تا ۹۵، ترجمہ ص ۱۵۵ تا ۱۶۶ (*Publ, de l' Ecole des Lang orient viv*، سلسلۂ سوم، جلد ۲ و ۳)؛ (۹) Hourst: *La Mission Hourst* (پیرس ۱۸۹۸ء)، ص ۱۵۸ ببعد؛ (۱۰) E. F. Guatier: *A. travers le Sahara francais in*، *La Geographie*، ۱۵ فروری ۱۹۰۷ء؛ (۱۱) F. Dubois: *Tombouctou la mysterieuse* (پیرس ۱۸۹۷ء)، باب ۷؛ (۱۲) M. Delafosse: *Haut Sénégal et Niger*، سلسلۂ اول، جلد ۲، *L. Histoire*، پیرس ۱۹۱۲ء.

(G. YVER)

(۱) نیز دیکھیے: M. Hartmann: *Zur Geschichte der westlichen Sudan, Mitteil. des Seminars f. orient Sprachen*، جلد ۱۵ (۱۹۱۲)، حصہ ۳، *Afrik. Stud.*، ص ۱۵۵ ببعد؛ (۲) ایضاً *Kuga und Kugu Orientalist. Litteraturzeitung*، ۱۹۱۱ء، عمود ۴۶۵ ببعد؛ (۳) H. von Mžik: *Kūgā, Kūgā und Gāna*، وھی کتاب، ۱۹۱۲ء، عمود ۱۹۳ ببعد؛ (۴) J. Marquart: *Die Benin Sammlung des niederländ. Reichsmuseums f. völkerkunde in Leiden* (لائیڈن ۱۹۱۳ء)، ص ۹۵ تا ۱۰۷ و اشاریہ.

ہارٹمن Hartmann کے خیال میں البکری کا "کوغہ" گوگو تھا اور دیگر جغرافیہ دانوں کا گوگو ودای کا ملک ہے۔

مارکوارٹ Marquart نے بتایا ہے کہ (*Benin*-

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

Sammlung، ص ۱۰۶) کہ سوڈان میں کم از کم سات مقامات ایسے ہیں جن کے نام ایک ہی طرح یا قریب قریب ایک جیسے لکھے جاتے ہیں، اور پھر وہ ان پر تفصیلی بحث کرتا ہے۔

(ادارۂ اؤ لائیڈن)

* **گول** : (ترکی) بہت سے ساکن پانی کا اجتماع، جھیل یا جوہڑ، نیز یہ ایشیائی ترکی کے دو ناحیوں کا نام ہے، ان میں سے ایک کوپرو کی قضا (سنجاق، آماسیہ، ولایت سیواس) میں ہے اور اس میں ۴۳ گاؤں شامل ہیں، دوسرا ولایت قسطمونی کے صدر مقام کے ساتھ منسلک ہے اور اس میں ۶۱ گاؤں ہیں۔

مأخذ: (۱) سالنامہ ۱۳۲۵ء، ص ۸۲۰، ۸۳۳۔

(CL. HUART)

* **گولّہ** : Goletta، تونس کی ایک بندرگاہ نیز رک بہ تونس۔

* **گولت سیہر** : (Ignaz Goldziher) اسحاق گولت سیہر ایک مشہور مستشرق، جو ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۲۱ء میں فوت ہوا۔ وہ قومیت کے لحاظ سے ہنگیرین Hungarian اور مذہباً یہودی تھا۔ یورپ میں اسلامی علوم کے مطالعے کی تحریک میں اس کا بڑا حصہ ہے اور اس نے حدیث نبوی کے مطالعے پر خاص توجہ مبذول کی۔

گولت سیہر ۱۸۵۰ء میں ہنگری کے شہر بوڈاپسٹ Buda-Pest میں پیدا ہوا، اور تحصیل علم کے لیے اپنے شہر کی یونیورسٹی میں داخل ہوا، جہاں اس نے مشہور مستشرق وامبیری Vambery سے استفادہ کیا جو ترکستان میں ایک درویش کے لباس میں سفر کر چکا تھا۔ بعد ازاں وہ لائپزگ (جرمنی) یونیورسٹی میں آ گیا، جہاں اس نے وہاں کے مشہور عربی دان پروفیسر فلائشر Fleischer سے تلمذ حاصل کیا اور اس کے فیض صحبت سے عربی زبان پر عبور حاصل کیا اور اس کی نگرانی میں کام کر کے ۱۸۷۰ء میں ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی۔ اس نے شام اور مصر کا سفر بھی کیا، اور کچھ عرصے کے لیے جامع الازہر کے درس میں بھی شریک رہا۔

گولت سیہر نے جرمن اور فرانسیسی مجلّوں میں بہت سے تحقیقی مضامین لکھے لیکن اس کی سب سے مشہور کتاب *Muhammdanische Studien*، یعنی Muh. Studies ہے جو اس نے جرمن زبان میں دو جلدوں میں لکھی تھی۔ اس کی دوسری جلد میں علم حدیث سے بحث کی گئی ہے، اور حدیث نبوی کی جمع و تدوین کی تاریخ کے علاوہ وضع حدیث کے اسباب و محرکات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ نقد حدیث اہل اسلام کے لیے کوئی نئی بات نہیں کیونکہ علمائے سلف نے کمزور حدیثوں کو خود ہی چھانٹ کر الگ کر دیا ہے اور کھوٹے کھرے کی پہچان کے اصول قائم کر دیے ہیں لیکن تنقید حدیث کا کام اگر اغیار کے ہاتھوں انجام پائے تو یہی تنقید بسا اوقات تنقیص حدیث کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور موضوع حدیثوں کا بار بار ذکر کرنے سے پڑھنے والا شخص حدیث کے سارے ذخیرے سے بدظن ہو جاتا ہے۔

گولت سیہر کی دوسری اہم کتاب *Die Richtungen der Islamischen Koran ausbergung* ہے۔ یہ ان لیکچروں کا مجموعہ ہے جو اس نے ۱۹۱۸ء میں علم تفسیر کے ارتقاء اور مفسّرین کے طبقات کے مخصوص رجحانات پر دیے تھے۔ امام السیوطی نے مفسرین کے طبقات کی ترتیب بلحاظ زمانہ کی تھی، لیکن گولت سیہر نے ان کے طبقات ان کے مخصوص رجحانات کے اعتبار سے قائم کیے۔ مثلاً ان کے نزدیک ایک گروہ ایسے علما کا ہے جنھوں نے قرآن مجید کی تفسیر اسلامی روایات اور احادیث کی روشنی میں کی ہے، جیسے امام الطبری وغیرہ۔ ایک

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

طبقہ معتزلی عقائد کے مفسرین کا ہے جن کے سرخیل علّامہ الزّمَخْشری ہیں اور ایک گروہ متصوفہ (مثلاً امام القُشَیری) کا ہے اور سب سے آخر میں زمانۂ حال کے مفسرین ہیں جو عہد حاضر کے طرز خیال اور نظریات سے متأثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے قرآن مجید کو اسی انداز میں سمجھا ہے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ایک مصری فاضل عبدالقادر نے اس کتاب کو مذہب التفسیر الاسلامی کے نام سے عربی میں ترجمہ کر دیا ہے، جس کا مطالعہ مسلمان علما کے لیے از بس مفید ہے۔

کیمبرج اور وی انا کی یونیورسٹیوں نے گولت سیہر کو ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری عطا کی اور دنیا کی بہت سی علمی مجالس نے اسے اپنا اعزازی رکن بنایا۔

گولت سیہر نے جو کثیر تعداد میں مضامین، مقالات اور مستقل کتابیں لکھیں ہیں، برنارڈ ہیلر B. Heller نے ان کی فہرست تیار کر کے ایک کتاب کی شکل میں ۱۹۲۷ء میں پیرس سے شائع کر دی تھی۔

مصادر: (۱) ابوالقاسم سحاب: فرہنگ خاور شناسان (مطبوعۂ ایران)، ص ۱۴۷، ۱۴۸؛ (۲) *Die Arabischen Studein in Encyclopaedia* :Fuck, J. (لائپزگ ۱۹۵۵ء)، ص ۲۲۶ تا ۲۳۱؛ (۳) *Bibliographie des ouvres de Iqnaz* : Barnard Heller *Goldziher*، پیرس ۱۹۲۷ء۔

(شیخ عنایت اللہ)

* **گولڈن ہورڈ**: Golden Horde (رک بہ مادّۂ قِپچاق مغول)۔

* **گولڑوی**: رک بہ گولڑہ شریف نیز مہر علی پیر۔

⊗ **گولڑہ شریف**: راولپنڈی سے گیارہ میل کے فاصلے پر کوہ مارگلا کے دامن میں ایک قصبے کا نام گولڑہ ہے۔ راولپنڈی سے پشاور کو جاتے ہوئے یہ ریلوے کا دوسرا سٹیشن ہے۔ قصبہ سٹیشن سے ہٹ کر شمال کی جانب پہاڑ کے دامن میں کوئی دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ قطب شاہی اعوانوں کی آبادی ہے جو ایک قصبے کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اسے گولڑہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں بابا گولڑہ کی اولاد آباد ہے جو حضرت قطب شاہ کے نویں بیٹے تھے۔ تاریخ الاعوان (طبع دین محمد پریس لاہور ۱۹۵۶ء، ص ۲۹ تا ۳۲) کے مطابق قطب شاہ حضرت علی کرم اللہ تعالٰی وجہہٗ کے تیسرے فرزند محمد بن حنفیہ کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کے بزرگ مدینۂ منورہ سے ہجرت کر کے ہرات آئے اور پھر غزنی پہنچے۔ میر قطب شاہ کے والد شاہ عطاء اللہ سبکتکین کے سالار لشکر تھے۔ میر قطب شاہ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے اور جہاد کرتے رہے۔ بابا گولڑہ کا نام عبداللہ گولڑہ تھا۔ نسب ناموں میں انھیں گوہر علی، گورژہ اور گوہر شاہ بھی لکھا جاتا ہے (تاریخ الاعوان، ص ۴۱)۔ ان کی والدہ ایک راجپوت چوہان راجا چھتری کی لڑکی بیان کی جاتی ہے۔ ان کا قیام سون سکیسر ضلع سرگودھا میں بھی رہا، خوشاب سے سکیسر جاتے ہوئے چڑھائی کے بعد جب وادی میں داخل ہوتے ہیں تو ایک مقام وہاں بھی ہے جسے ''بابا گولڑہ'' کہا جاتا ہے۔ وہاں نشان کے طور پر پتھروں کا ڈھیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بابا نے چند روز وہاں گزارے تھے۔ راولپنڈی تحصیل میں گولڑہ کے علاوہ اعوانوں کے اور بھی متعدد گاؤں ہیں۔ ۱۸۹۳-۱۸۹۴ء کے راولپنڈی ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں یہاں کے لوگوں کا ذکر اچھے الفاظ میں نہیں۔ ۱۸۶۵ء میں لاہور سے طبع ہونے والی گرفن کی تصنیف پنجاب کے رؤسا (انگریزی) میں بھی گولڑہ کے اعوانوں کے متعلق کچھ اسی طرح

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کا ذکر ہے (ص ۵۷۱) ۔ گولڑہ کے اس سے زیادہ تاریخی حالات دستیاب نہیں ہو سکے ۔ البتہ راولپنڈی کے متعلق یہ پتا چلتا ہے کہ انند پال کو شکست دینے کے بعد سلطان محمود غزنوی یہاں سے گزرا تھا (امپیریل گزیٹیر آف انڈیا، جلد ۲۱، ص ۲۶۴) ۔ انیسویں صدی کے آغاز میں شاہ شجاع اور شاہ زمان راولپنڈی میں پناہ گزین ہوے تھے ۔ سکھوں کی فوج نے گجرات کی لڑائی کے بعد ۱۴ مارچ ۱۸۴۹ء کو راولپنڈی میں ہتیار ڈالے تھے (محولۂ بالا امپیریل گزیٹیر، ص ۲۷۲) ۔ اس کے بعد یہ شہر، اس کا مضافاتی علاقہ اور یہ صوبہ یعنی پنجاب انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا ۔ ٹیکسلا کا مشہور قدیمی شہر گولڑہ سے مغرب کی طرف ہے، بنا بریں بدھوں کے آثار اس علاقے میں ملتے ہیں ۔ ان کوائف سے واضح ہوتا ہے کہ گولڑہ کے ارد گرد تاریخ بگڑتی اور بنتی رہی ہے ۔ اب راولپنڈی کے قریب اسلام آباد میں دارالحکومت بن جانے سے گولڑہ ایک بار پھر تاریخ ساز ماحول میں آ گیا ہے ۔ دارالحکومت قصبے کی شرقی حدود کے ساتھ واقع ہے ۔ گولڑہ کی موجودہ شہرت کی وجہ یہ ہے کہ یہاں حضرت پیر مہر علی شاہ قدس سرہ العزیز ایسے نامور چشتی بزرگ ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوے ۔ پیر مہر علی شاہ گیلانی سید تھے ۔ ان کے آباو اجداد پہلے ساڈھورہ ضلع انبالہ میں رہتے تھے ۔ ان کے والد کا نام پیر نذرالدین تھا ۔ ان کے جد امجد پیر روشن الدین فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد یہاں گولڑہ میں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے تھے ۔ اس علاقے میں جو سادات پہلے سے آباد تھے، وہ زیادہ تر شیعہ تھے ۔ پیر نذر الدین بڑے متقی بزرگ تھے، مگر اپنے علم و فضل اور روحانی مرتبے کے لحاظ سے ان کے فرزند پیر مہر علی شاہ کو جو شہرت نصیب ہوئی اس کی وجہ سے اس موضع کی شہرت لازوال ہو گئی ۔ پیر مہر علی شاہ نے یہاں چشتیہ سلسلے کی ایک مشہور خانقاہ قائم کی، عمارات بننے لگیں، درسگاہ قائم ہوئی، شاندار مسجد بنی اور دور دراز سے ہر پائے کے لوگ حصول فیض کے لیے پہنچنے لگے ۔ ان کا انتقال ۲۹ صفر ۱۳۵۶ھ/ ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء کو ہوا اور تدفین اگلے روز مسجد شریف کے جنوب کی طرف باغ میں ہوئی ۔ عالیشان مقبرہ تعمیر ہوا جس پر آیات، احادیث اور اقوال کندہ ہیں ۔ وسیع مجلس خانہ بھی قریب بنایا گیا ہے جہاں ہر روز باقاعدگی سے قوالی ہوتی ہے ۔ ہر سال ۲۹ صفر کو عرس منایا جاتا ہے ۔ ہزاروں مرید پاکستان، ہندوستان، سعودی عرب اور دیگر ممالک سے حصول ثواب کے لیے شامل ہوتے ہیں ۔ اس عرس کے ختم ہونے پر دوسرا عرس میلاد النبی کے سلسلے میں بھی شان و شوکت کے ساتھ منایا جاتا ہے ۔ اس کے بعد ۱۱ ربیع الآخر کو حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا عرس بڑے اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے ۔ تینوں مواقع پر زائرین کی سہولت کے لیے سپیشل گاڑیاں چلائی جاتی ہیں.

گولڑہ شریف میں سکھوں کی تحصیل اور قلعے کے کھنڈر اور آثار اب تک موجود ہیں ۔ سٹیشن جنکشن ہے جہاں سے کوہاٹ کو گاڑی جاتی ہے اور تھانہ، نیشنل بنک، ہسپتال، ڈاک خانہ، تارگھر، ٹیلیفون آفس بھی بن چکے ہیں ۔ یہ قصبہ راولپنڈی اور اسلام آباد سے پختہ سڑکوں کے ذریعے ملا ہوا ہے، جن پر بسیں چلتی رہتی ہیں ۔ حضرت پیر مہر علی شاہ کے مزار کے علاوہ حضرت پیر روشن دین شاہ، پیر سید رسول شاہ، پیر فضل دین شاہ، اور سید پیر نذر دین شاہ کے مزارات ہیں ۔ آستانۂ عالیہ کی مسجد اور دیگر عمارات بھی قابل دید ہیں ۔ اور قصبہ اب بھی رشد و ہدایت کا سرچشمہ بنا ہوا

www.besturdubooks.wordpress.com

ہے (دیکھیے فیض احمد : مہر منیر، ص ۵۲۰، لاہور ۱۹۶۹ء) ۔ (پیر مہر علی شاہؒ کے بعد ان کے فرزند، پیر غلام محی الدینؒ گدی نشین ہوے ۔ ان کا انتقال ۱۹۷۵ء میں ہو گیا ۔ اب ان کے صاحبزادے شاہ غلام محی الدین گدی نشین ہیں) مآخذ مقالے میں درج ہیں [عبدالغنی رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

* **گولِک بوغاز** : قدما کے مشہور درۂ Pylae Ciliciae [Cicilian Gates =] کا ترکی نام ۔ یہ نام اس کے قریب کے ایک مقام گولک سے لیا گیا ہے جس کی آبادی Cuinet کے بیان کے مطابق ارد گرد کے دیہات کو ملا کر ۱۸۵۰ تھی ۔ ارمنی نوشتوں میں ہمیں گولک کے بجاے گُگلگ Guglag ملتا ہے جسے لاطینی میں Gogulat یا Coqelaquus بنا لیا گیا، تاہم لاطینی وقائع نگار ہمیشہ Porta Judae ہی لکھتے ہیں ۔ عرب وقائع نگاروں کے ہاں ہمیں محض دَرْب یا دَرْبُ السَّلامۃ ملتا ہے ۔ زیادہ تفصیلی بیانات کے لیے مندرجۂ ذیل تصانیف دیکھیے۔

مآخذ : (۱) Ritter : *Erdkunde*، ج ۱۹، حصہ ۲، ص ۲۷۳ ببعد؛ (۲) Ramsay : *Historic Geogr. of Asia Minor*، ص ۳۴۹ ببعد؛ (۳) Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۱۳۳ ببعد؛ (۴) Cuinet : *La Turquie d' Asie*، ۲ : ۴۹۰۔

(A. DIRR)

گولکنڈہ : ایک قدیم شہر اور قلعے کا نام جو کسی زمانے میں مسلمان بادشاہوں کی سلطنت تلنگانہ کا صدر مقام تھا ۔ ابتدا میں اس شہر کے محل وقوع پر کچی مٹی کا ایک قلعہ تھا جو ہندو راجاؤں نے کسی زمانے میں تعمیر کرایا ہوگا اور جسے بعد میں دکن کے بہمنی خاندان کے بادشاہوں نے مستحکم کیا اور اس کی زیب و زینت میں اضافہ کیا۔

سلطان محمود شاہ بہمنی نے ۱۴۹۵ء میں سلطان قلی قطب الملک کو مغربی تلنگانہ کا حاکم مقرر کیا ۔ اس نے گولکنڈے کو اپنا انتظامی صدر مقام بنایا، قلعے کی چار دیواری اور دیگر استحکامات کو پتھر سے دوبارہ تعمیر کیا، اور اس نئے شہر کا نام محمد نگر رکھا ۔ لیکن یہ نیا نام اس شہر کے قدیم نام کی جگہ نہ لے سکا ۔ ۱۵۱۲ء میں وہ خود مختار ہو گیا اور اس نے گولکنڈے کو اپنا پایے تخت بنایا، چنانچہ قطب شاہی بادشاہوں کا صدر مقام ۱۵۹۱ء تک یہی شہر رہا ۔ اس سال میں محمد قلی قطب شاہ نے جو اس خاندان کا پانچواں بادشاہ تھا بھاگ نگر کا شہر جو پرانے قلعے سے سات میل کے فاصلے پر واقع ہے، تعمیر کرایا جس کا نام بعد میں حیدرآباد ہو گیا ۔ بادشاہ اپنے درباریوں سمیت اس شہر میں آ گیا ۔ گولکنڈہ اپنی اصلی حالت میں قلعے سمیت قائم رہا اور جب کبھی کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق ہوتا تو بادشاہ اپنے درباریوں سمیت یہاں آ جایا کرتا تھا ۔ عبداللہ قطب شاہ جو اس خاندان کا ساتواں بادشاہ تھا، ۱۶۵۶ء میں اسی جگہ اورنگ زیب کے ہاتھوں محصور ہوا جو ان دنوں سلطنت مغلیہ کی جانب سے دکن میں وائسرائے تھا ۔ لیکن اسے اپنے والد کے احکام سے مجبور ہو کر محاصرہ اٹھا لینا پڑا ۔ جب اورنگ زیب خود تخت پر بیٹھا تو وہ اس کام میں مشغول ہو گیا کہ دکن میں جو دو ریاستیں باقی بچ رہی تھیں ان کا بھی خاتمہ کر دے ۔ اس نے ۱۶۸۷ء میں بیجاپور پر قبضہ کر لینے کے بعد ابوالحسن قطب شاہ کا جو گولکنڈے میں قطب شاہی خاندان کا آٹھواں اور آخری بادشاہ تھا، محاصرہ کر لیا ۔ آٹھ مہینے کے محاصرے کے بعد قلعہ سر ہو گیا اور بادشاہ کو گرفتار کر کے دولت آباد بھیج دیا گیا جہاں بارہ سال کے بعد وہ فوت ہو گیا۔

جنوبی ہندوستان میں گولکنڈے کا شہر ہیروں

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

اور جواہرات کی منڈی ہونے کی وجہ سے مشہور تھا، کیونکہ جس ریاست کا یہ پائے تخت تھا اس میں اس قسم کی کانیں بہت تھیں۔

مأخذ: (۱) T.W. Haig: *Historic Land-marks of the Deccan*.

(T. W. HAIG)

* **گُوم**: (عربی تحریر میں قوم) شمالی افریقہ کے عرب علاقوں میں مسلح گھڑ سواروں کے دستے یا قبیلے کے لڑنے والے آدمیوں کو جس نام سے پکارا جاتا ہے اس کی یہی صورت اور تلفظ ہے۔ اس کے مشتق گُومَۃ کا مطلب ہے گُوم کی فوجی جماعت یا دستے یا ''ایک دلیرانہ یلغار، شورش یا بغاوت''۔ عربی میں اس کی جو تحریری صورت ''قوم'' ہے وہ بھی شمالی افریقہ کی بولیوں میں ''لوگ، قوم، قبیلہ'' وغیرہ کے معنوں میں پائی جاتی ہے (Beaussier: *Dict pract. arab-fransais des dialetes parles en Algerie et en Tunisie*)۔ تاہم یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ تحریری عربی میں قوم کے معنی ''دشمن'' یا ''لوٹ مار پر جانے والے لوگوں کی ایک جماعت'' بھی ہو سکتے ہیں (Dozy: تکملہ، جلد ۲: ص ۴۲۴ ب)۔

ترکوں نے الجزائر اور تونس کی قدیم بربر ریاستوں کے گُوم کو فوج میں سرکاری عہدے دیے۔ انھوں نے ملک میں اپنے فوجی قبضے کے نظام کا دارومدار انھیں پر رکھا تھا۔ انھوں نے تمام قبائل کو ''مخزن'' یعنی امدادی افواج اور رَعِیّۃ میں بانٹ رکھا تھا۔ مخزن اکثر محاصل سے آزاد تھے اور رَعِیّۃ کو تمام ٹیکس ادا کرنے پڑتے تھے۔ جب مؤخرالذکر جماعت سے تعلق رکھنے والے ایک یا زیادہ قبائل ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیتے تھے یا کسی وجہ سے بغاوت برپا کر دیتے تھے تو ترکی فوج بڑی تیزی سے باغیوں کے علاقے میں جا پہنچتی تھی۔ یہ فوج اپنی تعداد کی کمی کو گُوم کے گھڑ سواروں کے انتہائی تیز رفتار دستوں سے پوری کرتی تھی [.... تفصیل کے لیے دیکھیے ۷۷ لائڈن بذیل مادّہ].

مآخذ: (۱) W. Estērhāzy: *De la domination turque dans l' ancienne d' Alger*، (پیرس ۱۸۴۰ء)، ص ۲۶۱ ببعد؛ (۲) Soualah: *Cours moyen d' arabeparlé*، (الجزائر ۱۹۰۹ء) ص ۱۰۰؛ (۳) Larcher: *Legislation Algérienne*، (پیرس ۱۹۰۳ء)، جلد ۱، شمارہ ۲۹۸، ص ۳۱۷؛ (۴) Menerville: *Dict. de Législation Algérienne*، ص ۲۰؛ (۵) *Circulaire du Gouverneur Général de l' Algérie*، مورخہ ۲۱ تا ۲۵ مارچ ۱۸۶۷ء؛ (۶) Hugues et Lapra: *Code Algérien*، (پیرس ۱۸۷۸ء)؛ (۷) *Arrêté du Gouvern. Général de l'Algérie 11th December 1872*، بار چہارم۔ موجودہ انتظامات کے لیے دیکھیے *Circulaire du Gouvern. Général de l' Algérie du 29 April 1910*.

(A. COUR)

* **گُومُش خانہ**: ''چاندی گھر'' (جدید یونانی میں اس کا ترجمہ Αργυροῦπολις کیا جائے گا) ولایت طرابزون (Trapezunt) کی ایک سنجاق کا صدر مقام جو ۱۹۱۳ء تک Chaldia کے یونانی اسقف اعظم کا مرکز رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صرف ۲۵۰ برس پہلے آباد ہوا تھا اور اولیا (۲: ۳۴۳) کے بیان کے مطابق یہ مقام وہی جانجہ ہی ہے جو سلیمان اول سے عثمان دوم تک چاندی کے سکوں کی ٹکسال کی وجہ سے مشہور رہا۔ گومش خانہ پہلے پونٹس Pontus کے ساحلی علاقوں میں کان کنی کا مرکز تھا اور قدیم زمانے میں بھی اپنی چاندی کی وجہ سے مشہور تھا۔ اٹھارھویں صدی (سلطان محمود اول کے عہد) میں یہاں کچھ عرصے کے لیے غُروش ضرب کیے گئے۔ ۱۸۲۸ء-۱۸۲۹ء کی جنگ کے دوران روسی عارضی طور پر ضلع گومش خانہ پر

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

قابض ہو گئے ۔ ان کے جانے کے بعد یونانی باشندوں کا بڑا حصہ جو زیادہ تر کانوں میں کام کرتا تھا ترک وطن کر گیا اور کان کنی کی صنعت پر زوال آ گیا ۔ حال میں یورپی کمپنیوں نے سیلاب زدہ کانوں میں کام شروع کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن ان میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ۔ یہاں چاندی ملا سیسا نکلتا ہے ۔ موجودہ آبادی ۳۰۰ کے قریب ہے جس میں نصف یونانی ہیں، پانچ یونانی گرجاؤں کی قیمتی آرائش و زیبائش اس زمانے کی یادگار ہے جب یہاں کی یونانی آبادی ۵۰۰۰ کنبوں پر مشتمل تھی اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قدیم باشندے کس قدر خوشحال تھے (دیکھیے (۱) جہاں نما ص ۶۲۲، ۶۲۳؛ (۲) Hamilton : *Researches*، ۱ : ۲۳۴ ببعد؛ (۳) Triantaphyllides : Ταπουτικα، ص ۹۷ ببعد؛ (۴) Sava Joannides : Ιστορία Τραπεζούντος، ص ۱۴۱، ۲۴۸ ببعد؛ (۵) Cuinet : *La Turquie d' Asie*، ۱ : ۱۲۲ ببعد؛ منظر در (۶) Texier : *Descr. de l' Armenie, la Perse etc.* پلیٹ ۲)۔

(J. H. MORDTMANN)

گومل : ایک دریا کا نام جو پاکستان کی شمال مغربی سرحد میں افغانستان کے سلسلۂ کوہستان سے نکلتا ہے اور جنوب مشرق کی جانب بہتا ہوا درۂ گومل کے ذریعے وادی سندھ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے دریائے سندھ سے اتصال سے پہلے توی، کندر اور ژوب کے پانی بھی اس میں آ ملتے ہیں۔ اس کا پانی شدید طغیانی کے بغیر دریائے سندھ تک نہیں پہنچتا کیوں کہ یہ سارا پانی نہری آبپاشی کے سلسلے میں ختم ہو جاتا ہے۔

پاکستان۔افغان سرحد پر درۂ گومل ایک اہم درہ ہے۔ اس دریا نے بھی اس کے ساتھ ساتھ اپنے گزرنے کا راستہ بنا لیا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ آسانی ہو گئی ہے کہ راستے میں ہر جگہ پانی مل سکتا ہے۔ اس درے کی زیادہ سے زیادہ بلندی ۳۵۱۲ فٹ (نزد دومنڈی) ہے [اس درے کے نام کی مناسبت سے ڈیرہ اسمٰعیل خاں (پاکستان) میں گومل یونیورسٹی قائم کی گئی ہے]۔

مأخذ : *Imp. Gaz. of India*، ۱۹۰۸ء، ج ۳۔

(M. LONGWORTH DAMES)

گوہر شاد آغا (بیگم) : امیر تیمور کے بیٹے میرزا شاہرخ کی بیوی ان نامور خواتین میں سے ہے جن کا تدبر اپنے زمانے میں ضرب المثل تھا ۔ تمام مآخذ کی رو سے ان کا نام علم و فن کے عظیم قدر دانوں میں شامل کیا جا سکتا ہے ۔ موزۂ ہرات کے ایک کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ کے والد کا نام امیر الکبیر غیاث الدین تھا۔ اس کی شاہانہ شان و شوکت کے سلسلے میں دو واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے ۔۔ ۸۲۲ھ/۱۴۱۹-۱۴۲۰ء میں اس کے بیٹے میرزا محمد جوکی بہادر کی شادی بادشاہ مغولستان کی دختر سہرنگار آغا سے ہوئی ۔ گوہر شاد آغا نے جشن کا جس پیمانے پر انتظام کیا، اسے دیکھ کر مؤرخین وقت نے حیرت کا اظہار کیا ہے۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اس کا بیٹا میرزا الغ بیگ حاکم ماوراء النہر سمرقند میں رہتا تھا ۔ اس نے اپنی والدہ کو سمرقند آنے کی دعوت دی ۔ میرزا محمد جوکی بہادر کو لے کر وہ اوائل ربیع الاوّل ۸۲۳ھ / مارچ ۱۴۲۰ء میں ماوراء النہر گئی ۔ میرزا الغ بیگ نے حوالی بخارا میں، خوش آمدید کہنے کے لیے شاہانہ جشن منعقد کیا ۔ اس سے پہلے ۸۲۰ھ / ۱۴۱۷-۱۴۱۸ء میں میرزا الغ بیگ ہرات آیا تھا اور گوہر شاد آغا نے اس کا شاندار استقبال کیا تھا ۔ ان امور سے واضح ہوتا ہے کہ مہد علیا گوہر شاد آغا کو شہزادوں کے معاملات میں بڑا دخل حاصل تھا ۔ گوہر شاد کو میرزا علاء الدولہ سے بڑی محبت تھی ۔ اس بات سے رنجیدہ خاطر ہو کر میرزا عبداللطیف ربیع الاول ۸۴۵ھ / اگست

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۱۴۴۱ء میں سمرقند چلا گیا کہ کیوں دوسرے فرزندوں کی طرف توجہ کم ہے۔ مگر میرزا عبداللطیف سے خود شاہرخ کو بہت لگاؤ تھا۔ اس نے گوہر شاد سے کہا کہ میرے فرزند ارجمند کو تمہارے سلوک نے مجھ سے جدا کر دیا ہے۔ چنانچہ گوہر شاد نے سمرقند کا سفر اختیار کیا، میرزا الغ بیگ نے حسب معمول عزت و احترام میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا اور گوہر شاد ۸۴۵ھ/ مارچ ۱۴۴۲ء میں میرزا عبداللطیف کو ساتھ لے کر واپس ہرات آئیں۔ شاہرخ بڑا خوش ہوا (دیکھیے میر خواند: روضۃ الصفا، مطبوعۂ بمبئی ۱۲۷۱/ ۱۸۵۴-۱۸۵۵ء ج ۶، ص ۲۳۹، ۲۴۰)۔

شاہرخ رمضان ۸۰۷ھ/جولائی ۱۴۰۴ء میں تخت نشین ہوا اور اس نے شہر ہرات کو اپنا دارالسلطنت مقرر کیا۔ جوں جوں اسے عروج حاصل ہوتا گیا، گوہر شاد آغا کا ستارۂ اقبال بھی بلند ہوتا رہا۔ شاہرخ کی ایک اور بیوی آق سلطان آغا بھی تھی، لیکن اسے کوئی شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ شاہرخ نے مشہد مقدس کو خوبصورت بنانے کے لیے بڑی کوشش کی۔ گوہر شاد آغا نے بادشاہ کے نیک عزم کی تکمیل میں بڑی عالی ہمتی اور بلند نظری سے اس کا ساتھ دیا۔ اس نے وہاں حضرت امام علی ابن موسی الرضا کے قبے کے نزدیک عالیشان مسجد جامع تعمیر کرائی جو اپنے فنی کمال کے ساتھ اب بھی موجود ہے اور اس کا شمار دنیا کی عظیم ترین مساجد میں ہوتا ہے۔ ۸۲۱ھ/ ۱۴۱۸ء-۱۴۱۹ء میں شاہرخ مشہد مقدس کی زیارت کے لیے گیا اور مسجد کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ مسجد انہیں ایام میں مکمل ہوئی تھی۔ مسجد کے دروازے کی محراب پر ملکہ کے بیٹے میرزا بایسنغر کے ہاتھ کا خط ثلث میں کتبہ ہے جس کے آخر میں لکھا ہے: کتبہٗ راجیاً الی اللہ بایسنغر بن شاہرخ بن تیمور گورگان فی ۸۲۱۔ اس بات سے یہ واضح ہے کہ یہ سارا کنبہ بڑا باذوق تھا۔ مسجد جامع کا فنی حسن بے نظیر سمجھا جاتا ہے۔ راہنمای مشہد میں لکھا ہے کہ ''بدون شک جامعی است کہ ہیچ یک از مساجد ایران باآن نمیتواند سر برابری داشتہ باشد۔ ۔ ۔ ہیچوقت از نماز گزار و عبادت کنندہ خالی نیست۔ ۔ ۔ گوہر شاد آغا همسر میرزا شاہرخ پسر تیمور با این اقدام نام خود را در تاریخ عالم اسلام بخلد و جاویدان ساختہ است۔ ۔ ۔ مسجد گوہر شاد از جنبۂ قدمت تاریخی و زیبائی ساختمان وظرافت بنا و کاشیہای نفیس و قیمتی کہ دارد یکی از جالب توجہ ترین بناهای مذهبی اسلام بشمار میرود، (ص ۱۲۹، ۱۳۰) [امیر علیشیر نوائی: مجالس النفائس (تہران ۱۳۲۳ش، ص ۱۰۴) میں مولانا حاجی کا ذکر کرتے ہیں جو مشہد مقدس میں گوہر شاد بیگم کی مسجد جامع میں خطیب تھے، سنی العقیدہ تھے اور حضرت امام علی موسی رضا کے روضۂ منورہ میں بڑے معروف تھے۔ مسجد جامع کے علاوہ حضرت امام رضا کے احاطۂ مزار میں ملکہ گوہر شاد نے دو بڑے ایوان بھی تعمیر کرائے تھے جو دارالحفاظ اور دارالسیادت کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ بھی نفیس کاشی کاری سے مزین تھے۔ دارالسیادت قبۂ شریف کی بائیں طرف ہے اور دارالحفاظ قبۂ شریف اور دارالسیادت کے مابین واقع ہے جس کے مشرقی دروازے سے مسجد میں داخل ہوتے ہیں اور مغربی سمت کا دروازہ دارالسیات کی طرف کھلتا ہے۔ تیسرا دروازہ مغرب کی طرف ہے۔

گوہر شاد نے ہرات میں بھی عمارات تیار کرائیں۔ ۸۲۰ھ/ ۱۴۱۷ء میں ہرات کے شمال میں جوے انجیر کے کنارے ملکہ کے مدرسے کی بنیاد رکھی گئی۔ ساتھ ہی مسجد جامع اور بیت المغفرہ نامی گنبد تعمیر ہوا۔ ملکہ نے ان کے لیے وقف قائم کیے۔ ساری عمارات کی تکمیل ۸۴۱ھ/ ۱۴۳۷-

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۱۴۳۸ء میں ہوئی۔ مسجد اور مدرسے کی رسم افتتاح کے لیے ۸ صفر ۸۳۶ھ/ ۴ اکتوبر ۱۴۳۲ء کو بروز جمعہ شاہرخ خود گیا۔ اس کے نام کا خطبہ شیخ شہاب الدین بن شیخ رکن الدین بن شیخ اسلام شیخ شہاب الدین بسطامی نے پڑھا۔ محمد شفیع لاہوری مصحح مطلع سعدین و مجمع بحرین، مطبوعۂ لاہور ۱۹۴۹ء، ص ۱۴۶۳ پر منشآت عبداللہ مروارید خطی نسخۂ کتابخانۂ پنجاب یونیورسٹی ورق ۳۰۔ ب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ بیت المغفرہ اور مسجد جامع کے حفّاظ کی تنخواہیں بعد میں بھی جاری رہیں۔ اور سلطان حسین میرزا بایقرا (۸۷۳ھ/ ۱۴۶۹ء تا ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۶ء) کے زمانے میں خواجہ حافظ حسین علی حفّاظ کی ایک جماعت کے ساتھ اس کام پر مقرر تھا۔ موصوف نے ان کی تعیناتی کے حکم کا متن دے دیا۔ میر علیشیر نوائی مجالس النفائس (ص ۷۶، ۹۱، ۹۲، ۲۵۳، ۲۶۶) میں مدرسۂ مہد علیا گوہر شاد بیگم کے ایک مدرس مولانا کمال الدّین مسعود شیروانی کا ذکر کرتے ہیں۔ ظہیر الدّین بابر بابر نامہ میں ہرات کی سیر گاہوں میں گوہر شاد آغا کے مدرسے، بیت المغفرہ اور مسجد جامع کا ذکر کرتا ہے۔ وہ ہرات میں ۹۱۲ھ میں گیا تھا۔ خلیلی افغان آثار ہرات (مطبوعۂ ہرات ۱۳۰۹ شمسی، ص ۱۷۸) میں لکھتے ہیں کہ گوہر شاد آغا کی مسجد اور اس کے مدرسے کا اب ہرات میں وجود نہیں۔ امیر عبدالرحمن نے ایک انگریز انجینئر کے کہنے پر انہیں گرا دیا تھا۔ گوہر شاد آغا کا تعمیر کردہ گنبد البتہ باقی ہے جس میں وہ خود، شاہرخ، اس کے بیٹے بایسنغر اور محمد جوکی بہادر اور دیگر تیموری شہزادے مدفون ہیں۔ چہار مینار جو ان عمارات سے متعلق ہیں، ابھی باقی ہیں۔ ان کی بلندی ۱۲۰ تا ۱۵۰ قدم ہے۔ طامس ولیم بیل لکھتا ہے کہ بیت المغفرہ کا گنبد سنہری ہے۔ موزۂ ہرات میں ایک کتبہ ہے جو خطاط جعفر جلال (اضافت ابنی) کا لکھا ہوا ہے اور مدرسۂ مہد علیا گوہر شاد سے متعلق ہے۔ جملہ معلومات کا وہ بہت بڑا ماخذ ہے۔ مدرسے کی عمارت پر میرک ہروی نے کئی کتبے لکھے تھے۔

اپنے زمانے کی اس برگزیدہ خاتون کا حشر بڑا المناک ہوا۔ ۲۵ ذوالحجہ ۸۵۰ھ/ ۱۲ مارچ ۱۴۴۷ء کو شاہرخ فوت ہو گیا۔ اسے مذکورۂ بالا گنبد میں دفن کیا گیا۔ اس موقع پر میرزا عبداللطیف ابن میرزا الغ بیگ گورگان نے گوہر شاد آغا اور ترخانیوں کو تاراج کرایا اور پھر قید کر لیا اس بنا پر کہ ان کی ہمدردیاں میرزا علاء الدّولہ سے ہیں۔ میرزا علاء الدّولہ نے لڑ کر انہیں آزاد کرایا۔ پھر سلطان ابو سعید کا زمانہ آیا تو اپنے خلاف مزاحمت ختم کرانے کے لیے وہ ہرات آیا اور قلعے کا قبضہ نہ ملنے پر گوہر شاد سے بڑے اچھے ماحول میں ملاقات بھی کی، لیکن اسے بہکایا گیا کہ وہ تو خفیہ طور پر میرزا سلطان ابراہیم سے ساز باز کر رہی ہے۔ انہیں ایّام میں سلطان ابراہیم کے حریف میر شیر حاجی نے سلطان ابو سعید کو کہلا بھیجا کہ مہد علیا کے ہوتے ہوئے وہ ان کے پاس یعنی سلطان ابو سعید کی خدمت میں ہرات حاضر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ سلطان نے اس نامور خاتون کو ۹ رمضان المبارک ۸۶۱ھ/ ۳۱ جولائی ۱۴۵۷ء کو قتل کرا دیا اور اس کا پچاس سال کا اندوختہ لوٹ لیا گیا۔ بعد میں میرزا یادگار محمد نے اپنی جدہ کا انتقام لینے کے لیے اپنی تلوار کے وار سے سلطان ابو سعید کو ۸۷۲ھ/ ۱۴۶۷-۱۴۶۸ء میں قتل کر دیا جب اوزون حسن نے سلطان کو گرفتار کر کے اسی کے حوالے کیا تھا۔

مآخذ: (۱) کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی: مطلع سعدین و مجمع بحرین، لاہور ۱۹۴۹ء، ص ۳۵۲؛

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

۳۷۹، ۳۸۷، ۴۲۵، ۶۴۵، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۱ ببعد؛ (۲) غیاث الدین خواند امیر : حبیب السیر، بمبئی ۱۸۵۷ء، ۳: ۳، ص ۱۳۱، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۷، ۱۷۷، ۱۹۰، ۱۹۱؛ (۳) براؤن، ای جی : *A Literary History of Persia*، ج ۳، کیمبرج ۱۹۲۴ء بمدد اشاریہ؛ (۴) بیل، ٹی ۔ ڈبلیو : *An Oriental Biographical Dictionary*، لنڈن ۱۸۹۴ء، بذیل مادّہ؛ (۵) ظہیر الدین بابر : *The Memoirs of Babar*، ج ۲، ترجمہ انگریزی بیوریج، ص ۳۰۵؛ (۶) میر علی شیر نوائی: مجالس النفائس، تہران ۱۳۲۳ ش، ص ۷۶، ۹۱، ۱۰۴، ۵۲۳ - ۲۶۶؛ (۷) میر خواند : روضۃ الصفا، ج ۶ تہران ۱۳۳۹ ش، ص ۷۱۳، ۷۱۹، ۷۲۷؛ (۸) غلام رضا ریاضی : رہنمای مشہد، مشہد ۱۳۳۴ ش ص ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۲۹ - ۱۳۲؛ [عبد الغنی رکن ادارہ نے لکھا].

(ادارہ)

* **گھیبا** : راجپوت نسل کا ایک مسلمان قبیلہ جس کا جودھرا قبیلے سے تعلق ہے اور تحصیل پنڈی گھیب ضلع اٹک پنجاب کے خاصے بڑے علاقے میں آباد ہے ۔ اگرچہ یہ کوئی بہت بڑا قبیلہ نہیں تاہم معاشرتی اعتبار سے اس کے افراد کو خاصا اونچا مقام حاصل ہے ۔ وہ پنوار راجپوتوں کی ایک شاخ ہیں اور ٹوانہ اور سیال قبائل کے رشتے دار ہیں۔ روایت کے مطابق ان کے بانی (دھارا نگر کے ایک راجپوت) راے شنکر پنوار کے تین بیٹے ٹیو، سیو اور گھیو تھے ۔ ان میں سے پہلا ٹوانوں کا، دوسرا سیالوں کا اور تیسرا گھیبوں کا جد امجد تھا ۔ گھیبے قریب قریب خود مختار ہی رہے حتی کہ رنجیت سنگھ نے انھیں مغلوب کر لیا ۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے کس زمانے میں اسلام قبول کیا تھا ۔ [ٹوانے اور سیال پنجاب میں غالباً پندرھویں صدی عیسوی کے ختم ہونے سے پیشتر آئے ہوں گے اور گھیبے ان دونوں کے کچھ عرصے بعد آئے اور دریاے سندھ اور سوان کے درمیانی وسیع اور پہاڑی علاقے میں آباد ہو گئے اور اسے اپنے ہمسایہ اعوانوں، کھکھڑوں اور جودھروں سے سکھوں کے زمانے تک بچائے رکھا ۔ افغان حملہ آوروں نے بھی انھیں مطیع نہ کیا کیونکہ یہ شاہراہ سے دور رہتے تھے ۔ نیز جب وہ گزر رہے ہوتے تھے تو گھیبے انھیں خراج ادا کر دیتے تھے ۔ ان میں سے ایک راے جلال سکھوں کے زمانے میں تھا جس نے اپنے علاقے کا انتظام خوب کیا ہوا تھا ۔ ۱۸۳۰ء میں راے محمد نے بالا کوٹ کی لڑائی میں سید احمد شہید کے خلاف سکھوں کی امداد کی تھی ۔ یہ قوم پرجوش، توانا، اور سخت کوش ہے].

مآخذ : (۱) *Imp. Gazetteer of India*، فصل متعلقہ پنجاب ۱۹۰۸ء؛ [(۲) گرفن وسیسی : تذکرۂ رؤسائے پنجاب، لاہور، ۱۹۱۱ء، ص ۲۶۷، ۳۵۰، ۳۵۱؛ (۳) *A Glossary of the Tribes and Castes*، ج ۲، لاہور، ۱۹۱۱ء، ص ۲۸۵].

(LONGWORTH DAMES [و ادارہ])

گیخاتو : ایران کے ایلخانی خاندان کا ایک مغل شہزادہ (۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء تا ۶۹۴ھ/۱۲۹۵ء) جو ارغون [رک بآں] کا بھائی اور جانشین تھا ۔ اس کا لقب ایرن چین دورجی (در وصاف تورجی) یعنی ''سب سے قیمتی موتی'' تھا جو اسے تخت نشینی کے بعد اپنے بدھ راہبوں (وصاف کی رو سے چینی راہبوں) سے ملا تھا اور جسے وہ اپنے سکوں پر کندہ کرواتا تھا ۔ وصاف کی رو سے گیخاتو کے عہد حکومت میں جو کرنسی نوٹ جاری کیے گئے تھے، ان پر بھی یہی نام لکھا گیا تھا ۔ تخت نشینی سے پہلے وہ ایشیاے کوچک کا حاکم تھا ۔ اس کے پیشرو کے برعکس اس کے دور حکومت میں مسلمانوں کو خاص طور پر مراعات حاصل ہو گئیں ۔ صدر الدین احمد الخالدی (جو اپنے مولد کی نسبت سے الزنجانی اور اپنے کاغذی

www.besturdubooks.wordpress.com

سکے کے ناکام تجربے کی وجہ سے الچاوی کے نام سے بھی مشہور تھا) جسے ۶ ذوالحجہ ۶۹۱ھ / ۱۸ نومبر ۱۲۹۲ء کو صاحب دیوان (وزیر) مقرر کیا گیا تھا صدر جہاں کے خطاب سے نوازا گیا، اور دہ ہزاری کا فوجی منصب عطا کیا گیا۔ اس کے بھائی قطب الدین احمد کو قاضی القضاۃ کی حیثیت سے قطب جہاں کا خطاب حاصل تھا۔ صدر جہاں نے کاروبار سلطنت سے مغل امیروں کو سراسر بے دخل کر دیا تھا۔ شاہی جاگیروں کے لگان ''اینجو'' اور عام ریاستی لگانوں ''دلا'' میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ وزیر کو اس عہدے سے علٰحدہ کرنے کے سلسلے میں امیروں کی تمام کوششیں رائگاں گئیں۔ گیخاتو کے حکم سے سازشیوں کو وزیر کے حوالے کر دیا گیا لیکن اس نے انھیں معاف کر دیا اور آئندہ اس قسم کی شکایات پیش کرنے کی سختی سے ممانعت کر دی۔ اس خاندان کے دیگر حکمرانوں خصوصاً اپنے پیش رو ارغون کے برعکس گیخاتو نے اپنے مختصر عہد حکومت کو کسی طرح کے ظلم وستم سے داغدار نہیں کیا، لیکن دوسری طرف اس نے اپنی فضول خرچی اور ہر کہ و مہ پر نوازشات کر کے ریاست کا حال پتلا کر دیا۔ جانوروں کی ایک متعدی بیماری ''موت'' پھیل جانے سے حالات اور بھی خراب ہوگئے۔ دربار کے اخراجات پورے کرنے کے لیے خزانۂ شاہی کو قرض لینا پڑا لیکن اسے واپس ادا کرنے کی اس میں سکت نہ تھی، ان حالات سے مجبور ہو کر مغربی ایشیا میں پہلی اور آخری بار چینیوں کے نمونے پر کاغذی سکہ (چاو) جبراً چلانے کی کوشش کی گئی (۶۹۳ھ/۱۲۹۴ء) لیکن اس اقدام سے مشکلات اور بڑھ گئیں اور بادشاہ اور اس کے وزیر کا وقار بہت کم ہو گیا۔ دو ہی ماہ بعد یہ نوٹ واپس لے لیے گئے اور جیسا کہ Dorn : *Grunder. d. Iran. Phil.*، ۲ : ۵۷۰ نے بتایا ہے، فارسی زبان میں چاو کا لفظ بھی باقی نہ رہا۔ یورپ کے کرنسی نوٹوں کو ہمیشہ عربی نام ''قائمہ'' سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن بارھویں / اٹھارھویں صدی تک لفظ چاو فارسی زبان میں ملتا تھا اور اس کے معنی ''جعلی سکہ'' لیے جاتے تھے (F. Tuefel : *Quellenstudien zur neueren Geschichte der chanate*، ص ۴۷)۔

گیخاتو کو تخت سے اتارنے اور قتل کرنے کے بارے میں دیکھیے بائیدو، ۱ : ۵۹۱۔

مآخذ : (۱) تاریخ وصاف، مطبوعہ ہند، ص ۲۵۹ ببعد؛ (۲) D. Ohsson : *Histoire des Mongols*، ۴ : ۸۲ ببعد؛ (۳) Hammer-Purgstall : *Geschichte der Ilchane*، ۱ : ۳۹۶ ببعد؛ (۴) Howorth : *History of the Mongols*، ۳ : ۳۵۷ ببعد۔

(W. BARTHOLD)

گیزہ : (جیزۃ) مصر کا ایک شہر۔

گیسو دراز : ''سید محمد حسینؒ گیسو دراز چشتی''۔ نام محمد، لقب صدرالدین، کنیت ابوالفتح، عرف گیسو دراز تھا۔ ان کے والد ابن یوسف عرف راجو قتال تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت امام حسینؓ تک پہنچتا ہے۔ آبائی وطن خراسان اور حنفی المذہب چشتی المشرب تھے۔ بارھویں پشت کے جد ابوالحسن جندی قبل فتح دہلی غالباً راے پتھورا کے زمانے میں (۵۳۶ / ۱۱۴۱ تا ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء) مجاہدین کی ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ ہرات سے دہلی آئے، ایک معرکے میں شہید ہوے۔ ان کے والد سید یوسف المتخلص بہ راجہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ (م ۷۲۵ھ / ۱۳۲۴ء) کے مرید تھے۔ علوم ظاہری و باطنی میں کامل تھے۔ ۷۲۸-۷۲۹ھ میں محمد تغلق کے عہد میں جدید پاے تخت دولت آباد میں دیگر اولیاء اللہ کے ساتھ گئے۔ ۷۳۱ھ / ۱۳۳۰ء میں ان کی وفات ہوئی۔ مدفن خلد آباد میں ہے۔ گیسو دراز دہلی میں پیدا ہوے تھے، سنہ ولادت میں

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

اختلاف ہے - یعنی ۷۲۰ھ (لطائف)؛ ۷۲۱ھ (سیر محمدی)؛ ۷۲۳ھ (تاریخ حبیبی)؛ ۷۲۵ھ، مگر (بقول مقالہ نگار) ۷۲۱ھ زیادہ مستند ہے - سکونت بداؤں دروازۂ سہر ولی (جوامع) تھی - دولت آباد گئے تو نو سال کے تھے - ابتدائی تعلیم والد اور نانا سید علاء الدین میر میراں کے مرید شیخ نظام الدین بداؤنی سے پائی - لڑکپن ہی سے نہایت متقی اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے - خواجہ برہان غریب نے ایک خاص محفل میں فرمایا: ''شما را نعمتے از آخوند مولانا محمود برسد، حیران بودیم کجا ما و کجا دہلی (جوامع)'' - گیسو دراز ۷۳۵ھ/۱۳۳۵ء میں والدہ کے ساتھ دولت آباد سے چل کر دہلی آ گئے - اس وقت خواجہ گیسو دراز کی عمر پندرہ سال تھی - سولھویں سال حضرت خواجہ نصیر الدین روشن چراغ دہلی کے مرید ہوئے - حظیرۂ شیر خان (جہاں پناہ) میں مجاہدہ اور ریاضتیں کیں اور حسب ایمائے پیر کہ ''ما را با تو کارہا ست'' ۱۹ سال کی عمر میں قاضی عبد المقتدر شریحی الکندی، تاج الدین بہادر، شرف الدین کیتھلی (سیر محمدی) اور عماد الدین تبریزی (حدائق الانس) جیسے متبحر علما سے صرف و نحو، اصول فقہ، حدیث تفسیر، معقول و منقول وغیرہ، کی تکمیل کی اور علم باطنی میں بھی مدارج اعلیٰ طے کیے - حظیرۂ شیر خان میں ملا نصیر الدین تھانیسری دانشمند، شیخ آدم مولانا عمر وغیرہ سے علمی مباحثے ہوا کرتے تھے - آپ کی تصانیف مدح و فضیلت صحابہؓ سے مملو ہیں - مرشد نے انھیں اپنی وفات سے چند روز قبل ۷۵۷ھ میں خلافت سے سرفراز فرمایا - اس وقت ان کی عمر ۳۶ سال سے کچھ زائد تھی - مرشد کی مسند سنبھالنے کے بعد چوالیس سال رشد و ہدایت کے کام میں بسر کیے - یہ بیان غلط معلوم ہوتا ہے کہ روشن چراغ دہلوی کے بعد دہلی کا تابناک دور ختم ہو گیا (مشائخ چشت) کیونکہ سلطان فیروز تغلق اور بڑے بڑے علما مولانا حسین دہلوی، نصیر الدین قاسم، مولانا معین الدین توہانی، شیخ زادہ نور الدین اجودھنی، فرزندان و بزرگان شیخ فرید گنج شکرؒ کے علاوہ ہزار ہا اشخاص ان کے مرید و معتقد تھے جن کی زندگی کا مقصد رشد و ہدایت تھا.

گیسو دراز نے ۴۰ سال کی عمر میں بی بی رضا خاتون سے عقد کیا - ماہ محرم ۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء تا ۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء میں انھوں نے امیر تیمور کے حملے اور دہلی کی تباہی کی پیشین گوئی کی اور خود مع متعلقین سلطان ناصر الدین کے عہد میں دولت آباد چلے گئے - اثنائے سفر میں امراء، سلاطین، علما و فضلا اور صوفیہ نے ان کا خیر مقدم کیا.

دولت آباد میں عضد الدولہ صوبیدار نے حسب الحکم سلطان فیروز بہمنی ان کا استقبال کیا اور نذر پیش کی - بالآخر وہ گلبرگہ گئے اور متصل قلعۂ گلبرگہ مقیم رہے - اور یہاں تقریباً بیس اکیس سال تک ارشاد و ہدایت کے بعد بتاریخ ۱۶ ذوالقعدہ ۸۲۵ھ/یکم نومبر ۱۴۲۲ء واصل بحق ہوئے ''مخدوم دین و دنیا'' (سیر محمدی) اور ''بہ سپہر ولایت بودند'' (مجمع الاولیا) وفات کی تاریخیں ہیں - ان کا عالیشان مقبرہ مع خانقاہ سلطان احمد شاہ بہمنی (۸۳۸ھ) نے بنوایا جو ان کا مرید و معتقد تھا - انھیں خصوصاً خواجہ احمد دبیر سے بہت الفت تھی، کہا کرتے تھے ''(باعث) آمدن من در دکن احمد دبیر است'' (شوامل) - احمد دبیر نے قبل ۸۲۵ھ شہادت پائی.

اولاد: دو بیٹے سید محمد اکبر عرف میاں بڑے (۷۶۳ - ۸۱۲ھ) اور سید یوسف عرف سید محمد اصغر اور تین صاحبزادیاں تھیں - بی بی فاطمہ ستی (م ۸۰۳ھ بمقام سلطان پور)، بی بی بتول منسوب بہ سید سالار لاہوری، اور بی بی امۃ الدین - گیسو دراز کے اخلاف اب بھی دکن میں موجود

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ہیں، تاریخ محمدیہ، روضتین (روضۂ بزرگ و خرد)، ایک مدرسۂ دینیہ اور ایک کتابخانہ ان کی یادگار ہے ۔ عرس دھوم دھام سے منایا جاتا ہے ۔ سلاطین دکن ان کا بہت احترام کرتے تھے ۔

خلفا : ان کے چالیس کاملین تھے (سیر محمدی و تبصرۃ الخوارقات)۔

بعض اقوال : (۱) الشریعۃ افضل من الحقیقۃ؛ (۲) ''دیوانہ با خدا باش و ھشیار یا محمد'' (محبت نامہ) ۔ شاہ کمال (شوامل) نے اس کی اس طرح ترجمانی کی ہے : ''عینیت سے مست ہوں اور غیریت سے ہوشیار''؛ (۳) ''ماھیت او تعالی عین ذات اوست'' ۔ (ماھیت حق، غیر ماھیت خلق ہے (شاہ کمال)؛ (۴) ''قھرہ لطفہ، لطفہ قھرہ''، معرفت جمع اضداد کا نام ہے (شاہ کمال)؛ (۵) لا تجلّی فی صورۃ مرّتین : (تجلی کو تکرار نہیں، حقیقت کو تبدل نہیں'' (شاہ کمال)؛ (۶) الواحد فی الواحد، باینھمہ صورت دوئی باقیست : (اسمار الاسرار) ۔ دو ذات ایک وجود (شاہ کمال)؛ (۷) سالک کے لیے دو چیزیں لازم ہیں : تزکیۂ نفس و توجّہِ تام، (مراد انہماک و مواظبت)؛ (۸) شغل اوّہ تجلی جلالی ہے ۔ جسم پرزے پرزے ہو جاتا ہے اور تجلی رحمانی سے اصلی حالت [پر لوٹ آتا ہے] (اجودھن میں شیخ منور فضل سے حضرت گیسو دراز کا چشم‌دید واقعہ مشہور ہے)؛ (۹) ''عشق جانِ کائنات است، عشق لاعین و لاغیر است، باچشم (. . . .)،'' ۔ گیسودراز کو شیخ ابن العربی سے بعض مسائل میں اختلاف تھا، علامہ جمال الدین مغربی، شیخ نصیر الدین تھانیسری، اور میر اشرف جہانگیر سمنانی سے مباحثے ہوے ۔ مگر نفس توحید وجودی (وحدۃ الوجود) میں اختلاف نہ تھا۔

تصانیف : گیسو دراز کی ۱۰۰ تصانیف بیان کی جاتی ہیں ۔ مشہور تصانیف میں سے بعض (جو مستند ہیں اور حیدر آباد میں طبع ہو چکی ہیں، درج ذیل ہیں ۔

(۱) شرح آداب المریدین (شیخ عبدالقاھر سہروردی) و خاتمہ بفارسی (عربی قلمی، پٹنہ لائبریری)؛ (۲) شرح زبدۃ الحقائق (تمہیدات عین القضاۃ ھمدانی)؛ (۳) شرح رسالہ قشیریہ (شیخ عبدالکریم ھوازن القشیری)، (۴) حدائق الانس؛ (۵) شرح الھامات غوث اعظم الموسوم بہ جواھر العشاق؛ (۶) استقامۃ الشریعۃ بطریقۃ الحقیقۃ، تالیف ۷۹۲ھ؛ (۷) اسمار الاسرار تالیف قبل ۸۲۰ھ؛ (۸) شرح فقہ اکبر (امام ابو حنیفہ)؛ (۹) دیوان گیسو دراز، الموسوم بہ ''انیس العشاق'' تقریباً تین ہزار بیت؛ (۱۰) رسالہ برھان العاشقین؛ (مختصر چیستان، دو صفحہ) جس کی مختلف شرحیں سید محمد کالپوی، عبدالواحد بلگرامی اور شیخ رفیع الدین محدث وغیرہ نے لکھی ہیں؛ (۱۱) جوامع الکلم (ملفوظات) مرتبۂ سید محمد اکبر حسینی فرزند گیسو دراز، تالیف ۸۰۲–۸۰۳ھ، مطبوعہ؛ (۱۲) مکتوبات گیسو دراز ۔ مرتبۂ ابو الفتح علاءالدین قریشی گوالیری ۔ تالیف ۸۵۲ھ؛ (۱۳) تفسیر ملتقط ۔ (کتبخانہ شیخ علاءالدین جنیدی، گلبرگہ صدر المشائخ)، غیر مطبوعہ؛ (۱۴) وجود العاشقین، قلمی مکتوبۂ محمد علی معمار ۲۲، جلوس محمد شاھی ۔ کتب خانۂ آصفیہ (مطبوعہ)۔

تصنیفات جن کا ملفوظات وغیرہ میں ذکر ہے اور ان کا درس بھی دیا ہے ۔

(۱) تفسیر بطرز کشاف؛ (۲) حواشی کشاف (میر محمدی)؛ (۳) ترجمۂ مشارق، تالیف ۸۱۰ھ (تاریخ حبیبی)؛ (۴) شرح فصوص الحکم (جوامع الکلم)؛ (۵) حواشی قوت القلوب؛ (۶) شرح رسالۂ ابن العربی؛ (۷) شرح قصیدۂ حافظیہ؛ (۸) شرح تعرّف؛ (۹) ضرب الامثال۔

قدیم اردو کی تصنیفات: معراج العاشقین،

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

اور رسالۂ شکار نامہ (نثر) ان سے منسوب ہیں۔

مآخذ: (۱) حمید شاعر قلندر: خیر المجالس، ۷۵۴ - ۷۵۷ھ، قلمی، کتبخانۂ آصفیۂ حیدرآباد؛ (۲) مخدوم زادہ سید اکبر حسینی: جوامع الکلم، قلمی، کتبخانۂ آصفیۂ حیدر آباد ۸۰۲ - ۸۰۳ھ؛ (۳) سید محمد حسینی گیسو دراز: حدائق الانس، مطبوعۂ حیدرآباد، قبل ۸۲۵ھ؛ (۴) میر محمد علی سامانی: سیر محمدی، مطبوعۂ الٰہ آباد ۱۳۴۷ھ؛ (۵) ملفوظ سید یداللہ حسینی: محبت نامہ، قلمی، کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد ۸۴۳ھ؛ (۶) عبد العزیز بن شیر ملک: تاریخ حبیبی، قلمی، کتبخانۂ (شیخ علاءالدین سجادۂ شیخ روضہ گلبرگہ، ۸۴۹ھ؛ (۷) ابو الفتح قریشی گوالیاری: مکتوبات گیسو دراز، قلمی، کتبخانۂ آصفیہ حیدرآباد ۸۵۲ھ؛ (۸) نظام حاجی غریب یمنی: لطائف اشرفی، مطبوعہ، (نویں صدی ہجری)؛ (۹) سید من اللہ حسینی نبیرہ گیسو دراز: شوامل الجمل در شمائل الکمل ملفوظ۔ خاص قلمی نسخۂ ابو محمد عمر الیافعی حیدر آباد، ۸۲۴ - ۸۷۷ھ؛ (۱۰) سید علی اللہ عرف سید بابو: تبصرۃ الخوارقات، قلمی کتبخانۂ آصفیۂ حیدرآباد، (۹۸۱ ہجری)؛ (۱۱) شیخ عبد الحق محدث دہلوی: اخبار الاخیار، مطبوعۂ مجتبائی دہلی، ۱۳۰۹ھ؛ (۱۲) علی اکبر: مجمع الاولیاء، کتبخانۂ نواب سالار جنگ، حیدرآباد، ۱۰۴۳ھ؛ (۱۳) جہان نما علی شاہ: تاریخ محمدیہ (خاندان گیسو دراز)، مطبوعۂ عزیز دکن حیدرآباد - (۱۳۰۸ - ۱۳۱۸ھ)؛ (۱۴) بشیر الدین احمد دہلوی: وقایع دہلی، مطبوعہ؛ (۱۵) عبد الحق: اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ، مطبوعۂ کراچی، طبع ثانی ۱۹۵۳ء؛ (۱۶) سید احمد خان: آثار الصنادید، مطبوعہ۔

(سخاوت مرزا [تلخیص از ادارہ])

* **گیگا**: [گیفہ، گیقۃ] (Gega)، ایک البانوی قبیلہ رک بہ آروولق۔

* **گیلان**: صحیح معنوں میں گیلون، Gelae کا ملک) سلسلۂ کوہ البرز کے شمال اور بحیرۂ خزر کے جنوب میں ایران کا ایک صوبہ۔ اس کے مشرق کی جانب طبرستان یا مازندران ہے اور اس کی شمالی حد دریائے کُر اور اَرس (Araxes) کے مقام اتصال تک پھیلی ہوئی ہے۔ تاہم ملکی تقسیم کے اعتبار سے اسے روس سے استارہ ندی علیحدہ کرتی ہے۔ اس کا صدر مقام رشت ہے۔ اس کا اندرونی علاقہ دلدلی ہے (لہٰذا عوام اس ملک کے نام کا اشتقاق گل (کیچڑ) سے کرتے ہیں) یہ جنگلوں اور شہتوت کے گھنے باغوں سے پٹا ہوا ہے۔ اس کا پہاڑی علاقہ دَیلَم کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کے باشندے اپنے آپ کو گیلک کہتے ہیں۔ لاہیجان کے قریب سفید رود سمندر میں جا گرتا ہے، ابریشم بافی کی صنعت یہاں عام ہے اور زراعت میں چاول کی کاشت کو اہمیت حاصل ہے۔

یہاں کی مسلسل مرطوب ہوا کے اثر سے طبیعت میں سستی پیدا ہوتی ہے، معتدل اور مرطوب موسم سرما کے دوران میں بھی گرم ہوائیں چلنے لگتی ہیں اگر بلندی سے نگاہ دوڑائی جائے تو جنگل ایک بے کنار ہرے بھرے سمندر کا منظر پیش کرتے ہیں، ان جنگلوں میں ایک خاص قسم کا شیر پایا جاتا ہے۔

حال ہی میں جو اصلاحات عمل میں آئی ہیں، ان کی وجہ سے گیلان ایک اول درجے کی خود مختار ولایت بن گیا ہے، اس کا دارالحکومت رشت ہے اور بندرگاہ انزلی [رک بآں] جو محض ایک گاؤں ہے، گیلان کی کل آبادی تقریباً دو لاکھ پچاس ہزار ہے (تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق سترہ لاکھ) اور محاصل ۲۰۲۷۸ تومان، صوبہ چار بلوکون میں منقسم ہے (۱) تالش (صدر مقام کرگانہ رود)؛ (۲) لاہیجان؛ (۳) لنگہ رود (جس میں رود سر اور رانکہ شامل ہیں) اور منجل (مع رحمت آباد) پہلے یہ

www.besturdubooks.wordpress.com

حسب ذیل پانچ اضلاع پر منقسم تھا : رانکو، لاھیجان، رشت، فومن اور گسکر ۔ ایک زمانے میں فومن دارالحکومت سمجھا جاتا تھا اور اس کے اھم ترین مقامات تولم، لاھیجان، بمشہر، کوتم، سلوس اور جبشم تھے، تاھم مقامی باشندے صرف اس کی یہ جغرافیائی تقسیم تسلیم کرتے ھیں کہ سفید رود صوبے کو دو ضلعوں میں تقسیم کرتا ھے : بیہ پس (ضلع رشت) اور بیہ پیش (ضلع لاھیجان) ۔ ملک کی مقامی بولی میں بیہ دریا کو کہتے ھیں (احمد رازی : ھفت اقلیم، منقول در شیفر Schefer : *Chrest. Pers.*، ۲ : ۱۰۴ [مخطوطۂ شیرانی کتاب خانۂ پنجاب یونیورسٹی، ورق ۵۴۳ الف] دیکھیے (۱) Melgunof، ص ۲۳۰، حاشیہ؛ (۲) Dorn : *Caspia*، ص ۳۶) ۔ گیلان ایک مدت تک آزاد رھا اور پھر اسے ھولاگو نے فتح کر لیا ۔ اس نے ۱۲۲۷ء میں شیران کے دفاعی استحکامات منہدم کر کے زمین کے برابر کر دیے ۔ بالآخر صفویوں کے زمانے میں یہ صوبہ ایران میں شامل ھو گیا ۔ عباس اول کے عہد میں رشت دارالحکومت تھا ۔ تالش جو شمال میں ھے، اس سے علیحدہ کر دیا گیا اور اس کا بیشتر حصہ ''عہد نامۂ گلستان'' ۱۸۱۳ء) کے تحت روس کے حوالے کر دیا گیا۔

یاقوت نے جیلان نامی ایک قبیلے کا ذکر کیا ھے جو اصطخر سے نقل مکانی کر کے بحرین چلا گیا تھا ۔ امرؤ القیس کے ایک شعر کی رو سے انھوں نے کان کنوں اور معماروں کی حیثیت سے وھاں کے حکمرانوں کی ملازمت اختیار کر لی تھی (Van Vloten : *Wien. Zeitschr. f.d. Kunde d. Morgenl.* : ۸، ۶۲، ۱۸۹۴ء)، جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ھے وہ غالباً گیل تھے۔

معلوم ھوتا ھے کہ قدیم بادشاہ گیل (عربی جیل) کا لقب اختیار کرتے تھے (دیکھیے (۱) فرھنگ الطبری؛ (۲) المسعودی : مروج، ۱ : ۳۵۹؛ (۳) ناصر خسرو : سفر نامہ، ص XXII و ۱۶)۔

مآخذ : (۱) *Bibl., Geogr. Arab.*، ج ۱ (الاصطخری)، ص ۲۰۴ و ۲۰۵؛ ج ۲ (ابن حوقل)، ص ۲۶۷ ببعد؛ ج ۳ (المقدسی)، ص ۵۱ و ۳۵۵ و ۳۶۰ و ۳۶۷ ببعد)؛ (۲) یاقوت ۲ : ۱۷۹؛ (۳) Dorn : *Muhamm. Quellen zur Geschichte der Südlichen Küstenländer des Kaspischen Meeres*، ج ۲، ۳، ۴؛ (۴) Barbier de Meynard : *Dict. Geogr. hist. et litt. de la Perse*، ص ۱۸۷ ببعد؛ (۵) Alex. Chodzko : *Le Ghilan et les Marais caspiens* (*Nouv. Annales des Voyages*، ۱۸۴۹ — ۱۸۵۰ء)؛ (۶) G. Melgunof : *Das südliche Ufer des Kaspischen Meeres, etc.*، (لائپزگ ۱۸۶۸ء)، ص ۲۲۷ تا ۲۸۸؛ (۷) Fr. Spiegel : *Erânische Altertumskunde*، ۱ : ۷۷؛ (۸) Dorn : *Caspia*، بمواضع کثیرہ، دیکھیے اشاریہ؛ (۹) Marquart : *Eränšahr*، ص ۱۲۴ ببعد؛ (۱۰) Ch. Schefer : *Chrestomathie persane*، ۲ : ۱۲۷ و ۲۳۰؛ (۱۱) *Revue du Monde musulman*، ۲۲ (۱۹۱۳ء) : ۸۲ ببعد؛ ۲۸۲ ۔

(CL. HUART)

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ل

⊗ ل : حرف لام، عربی حروف تہجی کا تیئیسواں، فارسی حروف تہجی کا ستائیسواں اور اردو حروف تہجی کا بیالیسواں حرف جس کی عددی قیمت از روے ابجد تیس ہے۔ سیبویہ (کتاب سیبویہ، طبع قاہرہ، ۱۳۱۷ھ، ص ۴۰۵) اور ابوالبرکات ابن الانباری (اسرار العربیۃ، طبع دمشق ۱۹۵۷ء، ص ۴۲۰ ببعد) کے بیان کے مطابق عربی حروف تہجی کے لیے جو سولہ مخارج مقرر ہیں، ان میں سے آٹھواں مخرج (ادا کرنے کی جگہ) حرف لام کے لیے مختص ہے جو زبان کے داہنے کنارے سے لے کر زبان کی نوک کے آخر تک کے اس حصے پر مشتمل ہے جو ضواحک، ناب، رباعیہ اور ثنیہ دانتوں کے اوپر بالائی تالو کے ساتھ ٹکراتا ہے (وَمِنْ حَافَةِ اللِّسَانِ اِلٰی مُنْتَهَی طَرَفِ اللِّسَانِ مَا بَيْنَهَا وَبَيْنَ مَا يَلِيْهَا مِنَ الْحَنَكِ الْاَعْلٰی وَمَا فَوْقَ الضَّاحِكَ وَالنَّابَ وَالرُّبَاعِيَّةَ وَالثَّنِيَّةَ مَخْرَجُ اللَّامِ، کتاب سیبویہ، ص ۴۰۵، طبع قاہرہ، ۱۳۱۷ھ)۔

صوتی اعتبار سے لام حروف مجہورہ (جہر سے، یعنی نمایاں اور سخت انداز میں ادا ہونے والے) میں سے ہے اور ان کی ضد حروف مہموسہ (ہمس سے، یعنی دھیمی اور نرم آواز سے ادا ہونے والے) ہیں جن کا مجموعہ اس جملے میں ہے: سَتَشْحَثُكَ خَصْفَةٌ یعنی اس کا رنگ تجھے تیز بنا دے گا؛ اس مجموعے سے باہر والے تمام حروف مجہورہ ہیں۔ ایک اور صوتی صفت کے لحاظ سے لام کو حروف مُذَلَّقَہ یا حروف الذَّلَق [نیز حروف الذَّلَاقَة]، یعنی تیز آواز سے ادا ہونے والے حروف میں شامل کیا گیا ہے (اور ان کا مجموعہ اس جملے میں ہے: فَرَّ مِنْ لُبٍّ: وہ عقل سے بھاگا)۔ حروف مذلقہ کی ضد حروف مُصْمَتَہ (صَمْت سے، یعنی چپکے سے ادا ہونے والے حروف) ہیں (ابن الانباری: اسرار العربیۃ، طبع دمشق ۱۹۵۷ء، ص ۴۲۲؛ کتاب سیبویہ، طبع قاہرہ، ۱۳۱۷ھ، ص ۴۰۵)۔ ابن منظور (لسان العرب بذیل مادّہ) نے حروف ذَلَق صرف تین (راء، لام اور نون) بتائے ہیں، گویا اس کے نزدیک فاء میم اور باء حروف ذلق کے ضمن میں نہیں آتے؛ الزبیدی (تاج العروس، بذیل مادّہ) کا بیان ہے کہ چونکہ حروف ذَلَق تیزی سے ادا ہوتے ہیں، انسانی زبان کو زور صرف کرنا پڑتا ہے اور گفتگو میں آسان لگتے ہیں، اس لیے کلام عرب میں کوئی خُماسی کلمہ (پانچ حرفی کلمہ) ان سے خالی نہیں ہوتا۔

قواعد لسانی کے اعتبار سے لام حروف عاملہ میں سے ہے اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں: ایک لام بحیثیت حرف جر اور دوسری لام جازم کے طور پر۔ لام جب حرف جر کے طور پر استعمال ہو تو

www.besturdubooks.wordpress.com

کبھی تو اسم پر داخل ہوتا ہے اور کبھی فعل پر عمل کرتا ہے؛ جب اسم پر داخل ہو تو کئی ایک معانی اور مقاصد کے لیے آتا ہے: (۱) انتہاء کے لیے جیسے کُلٌّ یَجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی، یعنی ہر ایک مقررہ مدت کی انتہا تک چلتا ہے؛ (۲) ملکیت کے لیے جیسے اَلْمَالُ لِزَیْدٍ: مال زید کی ملکیت ہے، ملکیت کا لام اگر اسم ضمیر کے شروع میں آئے تو مفتوح ہوتا ہے جیسے لَکَ (تیرا، تیرے لیے) اور لَہٗ (اس کا، اس کے لیے)، لیکن ضمیر واحد متکلم کے ساتھ مکسور آئے گا جیسے لِیْ (میرا، میرے لیے)؛ (۳) شبہ ملکیت جیسے اَلْبَابُ لِلدَّارِ (دروازہ گھر کا یا گھر کے لیے)؛ (۴) تعدیہ کے لیے جیسے وَھَبْتُ لِزَیْدٍ مَالاً: میں نے زید کو مال بخشا؛ (۵) تعلیل کے لیے جیسے جِئْتُ لِاُکْرِمَکَ: میں تیری عزت کے لیے آیا ہوں؛ (۶) لام زائدہ جارہ جیسے لِزَیْدٍ ضَرَبْتُ: میں نے زید کو مارا (شرح ابن عقیل علی الالفیۃ، ص ۹۸ تا ۹۹؛ اسرار العربیۃ، ص ۲۵، ۲۶۱)؛ (۷) لام قسم جیسے [لَتُبْلَوُنَّ فِیْ اَمْوَالِکُمْ وَ اَنْفُسِکُمْ (۳ [اٰل عمرٰن]: ۱۸۶)، یعنی تمہارے مال و جان میں تمہیں ضرور آزمایا جائے گا؛ (۸) لام استحقاق، جیسے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (۱ [الفاتحۃ]: ۱)، ساری تعریف اللہ کے لیے ہے؛] (۹) لام اختصاص جیسے اَلْجَنَّۃُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ: جنت مؤمن کے لیے مختص ہے؛ (۱۰) لام ضَرُوْرَۃ جیسے خُلِقَ الْاِنْسَانُ لِلْعِبَادَۃِ، انسان عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، (السیوطی: البہجۃ المرضیۃ فی شرح الالفیۃ، ص ۹۹ تا ۱۰۱).

جب حرف لام مکسورہ فعل پر داخل ہوتا ہے تو یہ معنی دیتا ہے: (۱) تعلیل: جیسے، یَاْکُلُ الْاِنْسَانُ لِیَعِیْشَ، انسان کھاتا ہے تاکہ زندہ رہے؛ (۲) تاکید نفی کے لیے، اسے لام جُحُود (انکار) بھی کہتے ہیں جیسے، مَاکَانَ زَیْدٌ لِیَدْخُلَ دَارَکَ: زید کو تو تیرے گھر میں داخل ہی نہیں ہونا تھا۔ لام بمعنی اِلّا بھی آتا ہے (ابن الانباری: کتاب الانصاف، مطبع لائیڈن ۱۹۱۳ء، ص ۲۴۵).

لام بطور حرف جازم جسے "لام امر" یا "لام طلب" بھی کہتے ہیں، جیسے وَلْیَحْکُمْ اَھْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فِیْہِ ط (۵ [المآئدۃ]: ۴۷) یعنی اہل انجیل کو چاہیے کہ جو احکام اللہ نے اس میں نازل فرمائے ہیں اس کے مطابق حکم دیا کریں؛ کبھی لام غیر عاملہ بھی ہوتا ہے، جسے کبھی تو "لام تاکید" یا "لام ابتدا" کا نام دیا جاتا ہے، جیسے لَزَیْدٌ اَفْضَلُ مِنْ عَمْرٍو، یعنی زید یقیناً عمرو سے افضل ہے؛ کبھی اسے "لام الجواب" کہا جاتا ہے، جو لَوْ (اگر)، لَوْلَا (اگر ایسا نہ ہوتا) اور قسم کے جواب میں آتا ہے، جیسے لَوْعُدْتُّمْ عُدْنَا (تم نے دوبارہ کیا تو ہم بھی کریں گے)، لَوْلَا عَلِیٌّ لَھَلَکَ عُمَرُ رض (اگر علی رض نہ ہوتے تو عمر رض ہلاک ہو گئے ہوتے)، وَاللّٰہِ لَزَیْدٌ کَرِیْمٌ (بخدا زید تو سخی ہے) (کتاب الانصاف، ص ۱۷۴، ۲۶۴)؛ [مزید تفصیلات کے لیے نیز دیکھیے: (۱) مجد الدین الفیروز آبادی: بصائر ذوی التمییز، ۴: ۴۰۸ تا ۴۱۲ (قاہرہ ۱۹۶۹ء)؛ (۲) معجم متن اللغۃ، ۵: ۱۳۳ تا ۱۳۵ (بیروت ۱۹۶۱ء)].

مآخذ: (۱) ابن منظور: لسان العرب، بذیل مادہ؛ (۲) الزبیدی: تاج العروس، بذیل مادہ؛ (۳) ابوبکر ابن الانباری: کتاب الانصاف، لائیڈن ۱۹۱۳ء؛ (۴) ابن عقیل: شرح ابن عقیل علی الالفیۃ، مطبوعہ قاہرہ؛ (۵) السیوطی: البہجۃ المرضیۃ فی شرح الالفیۃ، مطبوعہ قاہرہ؛ (۶) وھی مصنف: شرح شواھد المغنی، قاہرہ ۱۹۵۶ء؛ (۷) ابو البرکات عبدالرحمٰن ابن الانباری: اسرار العربیۃ، دمشق، ۱۹۵۷ء؛ (۸) سیبویہ: کتاب سیبویہ، قاہرہ، ۱۳۱۷ھ.

(ظہور احمد اظہر)

اَللّٰات: زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا ایک مشہور بت جسے طائف کے شہر میں بنو ثقیف نے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

پرستش کے لیے ایک بتخانے میں رکھا ہوا تھا۔ یہ بت سفید پتھر کا بنا ہوا تھا اور اسے نقش و نگار سے خوب آراستہ کیا گیا تھا۔ اسلام سے پہلے عربوں میں بت پرستی کا عام رواج تھا۔ عربوں کے دیگر مشہور بتوں (= اصنام) میں عزّٰی، منات اور ھبل خاص طور پر قابل ذکر ہیں.

اللّات کے بارے میں مختلف اقوال ہیں: ابن جریر نے ایک قول یہ بیان کیا ہے کہ عربوں نے اللہ تعالیٰ کے ناموں کے چند مؤنث نام بنا کر بتوں کے نام رکھ لیے تھے اور اللہ کا مؤنث اللّات بنا لیا؛ دوسرا قول ابن الکلبی (م ۲۰۴ھ) کا ہے کہ بنوثقیف کا ایک شخص صِرمۃ بن غنم ستو بنا کر حاجیوں کی مہمان نوازی کیا کرتا تھا (کتاب الاصنام؛ لسان العرب؛ بذیل مادۂ لت)؛ جب وہ مر گیا تو لوگ اس کی قبر پر جمع ہونے لگے اور اسے پوجنا شروع کر دیا (ابن کثیر: تفسیر) ۔ لغوی طور پر اللات لَتّ، یلُتّ (بمعنی پانی یا مکھن میں ستو ملانا) سے اسم فاعل ہے (لسان العرب)، جس کے معنی ہیں ستو تیار کرنے والا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اللات ایک آدمی تھا جو حاجیوں کے لیے ستو تیار کرتا تھا (الصحیح، کتاب التفسیر، بذیل سورۃ النجم [۵۳]، باب ۲).

عرب بالخصوص بنو ثقیف اس بت کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اسے ایک پہاڑ کی چٹان پر نصب کر رکھا تھا۔ حرم کعبہ کی طرح اس علاقے کو بھی مقدس اور حرمت والا قرار دیتے اور اس پر چادر اور غلاف چڑھاتے اور اس کا طواف کرتے تھے۔ بنو مالک بن ثقیف کا خانوادہ آل ابی العاصی اس کے متولی تھے (جمھرۃ، ص ۴۹۱).

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اللات اور دوسرے دو بتوں کا ذکر یوں فرمایا ہے: اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۙ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَاۗءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَاۗءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (۵۳ [النجم]: ۱۹ تا ۲۳)، یعنی بھلا تم لوگوں نے لات اور عزی کو دیکھا اور تیسرے منات کو (کہ یہ بت کہیں خدا ہو سکتے ہیں)؟ (مشرکو!) کیا تمھارے لیے تو بیٹے ہوں اور اللہ کے لیے بیٹیاں؟ یہ تقسیم تو بہت بے انصافی کی ہے۔ یہ (بت) تو صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے گھڑ لیے ہیں۔ خدا نے تو ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔ یہ (کافر) لوگ محض ظن (فاسد) اور خواہشات نفس کے پیچھے چل رہے ہیں، حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں واضح طور پر فرما دیا کہ یہ بت جنھیں تم نے خدا سمجھ رکھا ہے ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ تم نے خود ہی انھیں خدا کی بیٹیاں قرار دے دیا ہے۔ یہ سب کچھ تمھاری اپنی افترا ہے اور من گھڑت باتیں ہیں.

حدیث میں ان بتوں کو طَاغِیَۃ (جمع: طَوَاغِیت) بھی کہا گیا ہے۔ جب بنو ثقیف نے اسلام قبول کر لیا تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے حضرت ابو سفیانؓ بن حرب اور مغیرہؓ بن شعبہ کو اس بت کے انہدام کے لیے روانہ فرمایا۔ ابن حزم نے منہدم کرنے والوں میں حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کا نام لکھا ہے (جمھرۃ، ص ۴۹۱)۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے اسے منہدم کرنا شروع کیا تو بنو ثقیف کی بعض عورتیں اس انہدام کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ننگے سر چیخ پکار کرتی ہوئی نکل آئیں۔ بہر حال حضرت مغیرہؓ نے اللات کو منہدم کر دیا اور بت خانے میں نذر و نیاز

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کا جمع شدہ مال و زر لے کر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کی خدمت میں حاضر ہوے۔

بنو ثقیف کے سردار حضرت عروہؓ بن مسعود کے ذمے کچھ قرض تھا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اس مال میں سے وہ قرض ادا کر دیا جائے۔ اسی طرح اس مال میں سے حضرت قاربؓ بن الاسود بن مسعود کا قرض بھی ادا کیا گیا۔ یہ دونوں صحابی بنو ثقیف سے پہلے مشرف باسلام ہو چکے تھے (جوامع السیرۃ، ص ۲۵۸)۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم نے لات اور عزّٰی کی قسم کھانے سے منع فرما دیا اور حکم دیا کہ جو کوئی حلف اٹھاتے وقت لات یا عزی کا نام لے تو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا پھر سے اقرار کرے اور آئندہ کبھی لات کی قسم نہ کھائے (البخاری: الصحیح، کتاب التفسیر، سورۃ النجم، باب ۲؛ ابن کثیر: تفسیر)۔

مآخذ: (۱) قرآن مجید (۵۳ [النجم]: ۱۹ تا ۲۳)؛ (۲) البخاری: الصحیح، کتاب التفسیر، سورۃ النجم، باب ۲؛ (۳) ابن کثیر: تفسیر، بذیل سورۃ النجم، (۴) ابن منظور: لسان العرب، بذیل مادّۂ ل ت؛ (۵) ابن حزم: جوامع السیرۃ، ص ۲۵۷، ۲۵۸؛ (۶) وھی مصنف: جمھرۃ انساب العرب، ص ۴۹۱، [عبدالقیوم رکن ادارہ نے لکھا]۔

(ادارہ)

* **لاذقیّہ**: شمالی شام کی ایک بندرگاہ ہے۔ اس کا بانی سلوقوس اول ہے جس نے اس کا نام اپنی والدہ Laodike کے نام پر رکھا۔ سلطنت سلوقی کے آخری دور میں یہ اس اتحاد اربعہ کا رکن تھا جو شام کے چار سب سے اہم شہروں یعنی انطاکیہ Antiocheia، افامیہ Apameia، سلوقیہ Seleuceia، اور لاذقیہ Laodiceia کے درمیان ہوا تھا۔ جسٹینین اول کے عہد میں اسے تھیوڈوریس کے نئے صوبے کا صدر مقام بنا دیا گیا تھا۔

جب عربوں نے حمص کے والی حضرت عُبادہؓ بن الصامت الانصاری کی زیر سرکردگی شہر پر فوج کشی کی تو یہاں کے باشندوں نے جم کر مزاحمت کی۔ عبادہؓ نے لاذقیہ کے قریب پڑاؤ ڈال دیا اور اتنی گہری خندقیں کھدوائیں جن میں سوار بھی بغیر دکھائی دیے آگے بڑھ سکتے تھے۔ وہ نمائشی پسپائی کے بعد رات کو واپس آئے اور اہل شہر کو بے خبری میں آ لیا، جنھوں نے بلا تامّل شہر کا بڑا دروازہ کھول رکھا تھا۔ اس طرح عُبادہؓ شہر میں داخل ہوگئے۔ پھر قلعے پر حملہ کیا گیا اور عبادہؓ نے اس کی فصیل پر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ عیسائی رعایا کا ایک حصہ البُسَیْد (البلاذری، طبع De Goeje، ص ۱۳۳ سطر ۴ میں البُسَیْد ہے جس کی تصحیح کر لینی چاہیے: Ed. Schwarz، در Wellhausen: Z.D.M.G.، ج ۴۰، ص ۲۴۶) بھاگ گیا۔ انھوں نے شہر میں واپس آنے کی درخواست کی جسے خراج کے طور پر ایک معیّنہ رقم کی ادائی پر منظور کر لیا گیا۔ گرجا پر انھیں کا قبضہ رہا۔ عبادہؓ نے ایک نئی مسجد بنوائی جس میں بعد کو توسیع کی گئی (البلاذری: کتاب مذکور، ص ۱۳۲ ببعد)۔ تقریباً ۹۷ھ (بقول البلاذری: ۱۰۰ھ) میں یونانیوں نے بحری بیڑے کے ساتھ لاذقیّہ کے ساحل پر حملہ کیا، شہر کو جلا ڈالا اور اس کے باشندوں کو قیدی بنا کر لے گئے (البلاذری: کتاب مذکور، Brooks: J.H.S.، ۱۸۷۸ء، ۱۸: ص ۱۹۵)۔ حضرت عمر (ابن عبدالعزیزؒ) نے شہر کو از سر نو تعمیر و مستحکم کیا۔ اور باشندوں کو زر فدیہ دے کر قید کرنے والوں سے چھڑایا۔ عمرؒ کی وفات کے بعد یزید [ابن عبدالملک] نے شہر کی بحالی کی تکمیل کی۔ ایک دوسری روایت کے مطابق یزید نے اس شہر کے استحکامات کی تجدید کی اور حفاظتی فوج میں اضافہ

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

کیا (البلاذری : کتاب مذکور و مسعودی : مروج الذہب، پیرس، ۸ : ۲۸۱)۔

Nicephoros Phokas نے یہ قصبہ اور شام کا سارا شمالی علاقہ ۹۶۸ء میں بوزنطیوں سے فتح کر لیا (یحییٰ بن سعید الانطاکی، طبع Kračkovsky و Vasiliev در *Patrolog. Oriental.*، ۱۹۲۴ء، ۱۸ : ۸۱۶)۔ یحییٰ بن سعید کے قول کے مطابق جس کا بیان Rosen کے نزدیک اللاذقیہ کی ایک مقامی روایت سے لیا گیا ہے، ۹۸۰ء میں شہنشاہ باسل دوم نے یہاں کا حاکم ایک شخص کُرمُرُوک نامی کو بنایا۔ اس نے طرابلس پر فوج کشی کے دوران میں جو فاطمیوں کے قبضے میں تھا، بڑی بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ جب نزّال اور ابن شاکر کی ماتحتی میں عربوں نے شہر کا محاصرہ کیا تو اس نے باہر نکل کر حملہ کیا اور اسی کے دوران میں گرفتار ہوا اور قاہرہ میں اس کا سر اڑا دیا گیا (Rosen : *Zapiski Imp. Akad. Nauk*، ۴۴ : ۱۶ ببعد و ۱۵۳ ببعد)۔ Michael Burtzes (= البُرجی) نے ۹۹۲ء میں شہر میں مسلمانوں کی ایک بغاوت فرو کی اور انھیں بلاد روم کی طرف نکال دیا (یحییٰ، طبع Rosen، کتاب مذکور، ص ۳۰، ۲۳۷)۔ ۱۰۸۶ء میں اللّاذقیہ بنو مُنقذ شَیزَری کے قبضے میں تھا (Derenbourg : *Ousâma*، ص ۲۷ ببعد) مگر انھیں بھی اسے ملک شاہ سلجوقی کے حوالے کر دینا پڑا۔ اگست ۱۰۹۸ء میں شہر پر نارمنڈی کے کونٹ نے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد یہ شہر جلدی جلدی مختلف ہاتھوں میں جاتا رہا۔ پہلے بوزنطیوں نے اس پر قبضہ کیا، پھر ٹارنٹو کے بہمنڈ Bohemund of Tarento کے ہاتھ آیا۔ دوبارہ اس پر بوزنطیوں کا تسلط ہو گیا اور آخر کار ۱۸ ماہ کے محاصرے کے بعد انطاکیہ کے Tancred نے اسے فتح کر لیا (Röhricht : *Gesch. des Kgrs. Jerusalem*، ص ۴۵، حاشیہ ۸)۔ ۱۱۰۴ء میں ہم پھر یونانیوں کو خشکی اور تری کی طرف سے شہر کا محاصرہ کیے ہوئے پاتے ہیں۔ معاہدۂ دول Devol (۱۱۰۸ء) میں بہمنڈ Bohemund نے شہنشاہ Alexius Comnenos کو دوسرے علاقوں کے علاوہ اسے στρατηγίς بھی دینے کا وعدہ کیا (Anna Comnena : *Alexias*، بون، ۲ : ۲۴۱، سطر ۶) اس کے بعد جلد ہی Tancred نے پیزا کے ایک بحری بیڑے کی مدد سے شہر پر قبضہ کر لیا جو اس دوران میں پھر مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ ۱۱۳۶ء میں حلب کے حاکم نے اسے فتح اور تاراج کیا۔ ۱۱۵۷ء اور ۱۱۷۰ء میں یہاں دو سخت زلزلے آئے جن میں صرف شہر کا بڑا یونانی گرجا ہی محفوظ رہا۔ ۲۳ جولائی ۱۱۸۸ء کو شہر پر صلاح الدین نے قبضہ کر لیا (عماد الدین : فتح، ص ۱۴۱؛ ابو شامہ : کتاب الروضتین، طبع قاہرہ ۱۲۸۷-۱۲۸۸ھ، ۲ : ۱۲۸؛ *Hist. Orient des Crois*، ۴ : ۳۶۱)۔ ۱۱۹۷ء کے موسم خزاں میں بہمنڈ Bohemund سوم اللاذقیہ یا کم از کم ایک حصۂ شہر کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۲۲۳ء میں اہل حلب نے شہر یا اس کے قلعے کو ان عیسائیوں کے خوف سے تباہ کر دیا جو پانچویں جنگ صلیبی میں حصہ لینے آ رہے تھے، لیکن اس کے بعد بھی (۱۱۹۷ء سے) آدھے شہر پر فرنگیوں کا قبضہ رہا۔ ۱۲۷۵ء میں بیبرس نے فرنگیوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اس حصۂ شہر کو اس کے حوالے کر دیں۔ ۱۲۸۱ء میں اللّاذقیہ پر سنقُر امیر دمشق کا قبضہ ہو گیا اور سلطان کو معاہدے (۳۰ جون) کے ذریعے اس شہر سے مجبوراً دست بردار ہونا پڑا، لیکن سنقُر کے زوال کے بعد ایک اور امیر نے اسے بیبرس سے واپس لے لیا (۲۰ اپریل ۱۲۸۸ء)۔ اس کے جلد ہی بعد ایک

www.besturdubooks.wordpress.com

اور زلزلے کی وجہ سے شہر کے متعدد مضبوط برج یعنی برج کبوتر، روشنی کا مینار اور سمندر کے بروج بالکل تباہ ہو گئے ۔ دفاعی مورچوں کی تباہی کا کام بڑے بڑے قلعہ شکن آلات نے مکمل کر دیا۔

اللّاذقیہ کا ضلع جو اب تک آل ایّوب کے ماتحت حلب کا ایک حصہ شمار ہوتا تھا (یاقوت: معجم، طبع Wüstenfeld، ج ۴: ۳۳۸ و ابن الشّحنہ، طبع بیروت ص ۲۳۱) تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں طرابلس کے نئے صوبے میں شامل کیا گیا۔ (عمری: التعریف، ص ۱۸۲، در R. Hartmann: Z.D.G.M.، ۱۹۱۶ء، ص ۳۵؛ خلیل الظاھری: زبدۃ، طبع Ravaisse، ص ۴۸؛ دیوان الانشاء، پیرس، نسخۂ خطی، عربی ۴۴۳۹، ورق ۹۴، ۱۵۲، ۲۴۳، در van Berchem: *Voyage en Syrie*، ص ۲۹۰، حاشیہ ۳؛ القلقشندی: صبح الاعشی، ۴: ۱۴۵، ترجمہ Gaudefory-Demombynes: *La Syrie*، ص ۱۱۳ ببعد)۔ عرب جغرافیہ نویس اور مؤرخ شہر کی بہت سی ایسی قدیم عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں جو سلامت رہ گئی تھیں ۔ وہ دو قلعوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو ایک پہاڑی پر واقع تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط تھے ۔ اس پہاڑی سے پورا شہر زیر قدم دکھائی دیتا تھا (بہاء الدین، در *Hist. Or. des Crois*، ۳: ۱۱۰) ۔ شہر کے ایک بڑے دروازے کا بھی ذکر ملتا ہے جسے بہت سے آدمی مل کر کھولتے تھے (البلاذری، وھی کتاب، ص ۱۳۲) ۔ دیر الفاروس کی شان دار خانقاہ بھی تھی (المسعودی: مروج الذھب، ۸: ۲۸۱؛ الدمشقی، طبع Mehren، ص ۲۰۹؛ ابوالفداء: تقویم، ترجمہ Reinaud-Guyard، ۲/۲: ۳۵؛ در ابن بطوطہ، ۱: ۱۸۳، الفاروس)، جو "تل فاروس" کے نام سے موسوم تھی ۔ یہ ٹیکرا اب بھی شہر کے شمال میں اسی نام سے مشہور ہے (M. Hartmann: *Z.D.P.V.*، ۱۴: ۱۶۶ و نقشہ) ۔

Raoul کے Caen نے لاذقیہ کی مختصر کیفیت لکھی ہے (*Gesta Tancredi*، باب ۱۴۴؛ Röhricht نے *Z.D.P.V.*، ۱۰: ۳۱۶ میں فرنگی ماخذوں سے شہر کی عمارات کی ایک فہرست مرتب کی ہے) ۔ زلزلوں اور اس غارتگری کے باوجود جو شہر کو صدیوں کے دوران میں اکثر پیش آتی رہیں، یہ بہ ظاھر مکمل طور پر کبھی ویران اور غیر آباد نہیں رہا ۔ اس کے نفیس اور اونچے مکانات اور سنگ مرمر کی سیدھی سڑکیں ابن الأثیر اور ابو شامہ (*Hist. Or. des Crois*، ۱: ۷۲۰ و ۴: ۳۶۱) نے دیکھی تھیں ۔ ان کا بیان ہے کہ انھیں شہر کی غارتگری کے دوران میں بڑا نقصان پہنچا تھا (دیکھیے نیز الیعقوبی، طبع ڈخویہ *B.G.A.*، ۷: ۲۵۸) اور یہ اس شہر کی شان و شوکت کا پتا دیتی ہیں ۔

اس شہر کی سیدھی سڑکوں اور مربع نقشے (دیکھیے Th. Schreiber، در *Festschrift für H. Kiepert*، ۱۸۹۸ء، ص ۳۳۵ تا ۳۴۸) کو رومی سلطنت کے معماروں سے منسوب کیا جاتا ہے (A. v. Gerkan: *Griech. Stadtanlagen*، ۱۹۲۴ء، بمواضع کثیرہ)، لیکن حال میں Cultrera نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ قدیم یونان کے ابتدائی دور ھی میں موجود تھے اور بہت پہلے، یعنی Miletus کے Hippodamos نے (پانچویں صدی عیسوی) میں اسے قدیم مشرق کے فن تعمیر سے حاصل کیا تھا (*Architettura Ippodamea*، در *Memorie dell' Accad. dei Lincei*، سلسلہ ۵، ج ۱۷، ص ۳۰۴، ۳۳۳ ببعد، ۴۷۳؛ Cumont: *Fouilles de Doura Europos*، پیرس ۱۹۲۶ء، ص xix، حاشیہ ۴، ۲۵ ببعد، ۳۸۳)۔

مآخذ: (۱) الخوارزمی: کتاب صورۃ الارض، طبع v. Mzik، در *Bibl. arab. Hist. u Geogr.*، ۳: ۱۹، عدد ۲۶۷؛ (۲) الفرغانی، *Element. Astron.*، طبع Golius، ص ۳۸؛ (۳) البتانی: الزیج الصابی، طبع Nallino:

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Pubbl. del R. Osservat di Brera in Milano XL.، ۲ : ۳۹ و ۳ : ۲۳۷، عدد ۱۲۲؛ (۴) الیعقوبی، B.G.A.، ۷ : ۳۲۴ ببعد؛ (۵) البلاذری، طبع ڈخویہ، ص ۱۳۲ ببعد؛ (۶) یاقوت: معجم، طبع وسٹنفلڈ، ۴ : ۳۳۸؛ (۷) صفی الدین: مراصد الاطلاع، طبع Juynboll، ۳ : ۱؛ (۸) الدمشقی، طبع Mehren، ص ۲۰۹؛ (۹) ابوالفداء، طبع Reinaud، ص ۲۰۷؛ (۱۰) یحییٰ بن سعید الانطاکی، طبع Rosen، ص ۱۶ ببعد، ۳۰، ۱۵۳ ببعد ۲۳۷، در Zapiski Imp. Akad. Nauk، ۱۸۸۳ء، ۴۳؛ (۱۱) المسعودی: مروج، ۸ : ۲۸۱؛ (۱۲) ابن بطوطہ: تحفۃ النظار، طبع پیرس، ۱ : ۱۷۹ تا ۱۸۳؛ (۱۳) ابوالفداء: تاریخ، طبع Reiske، ۱ : ۲۲۶، ۳ : ۲۶۴، ۳۶۴؛ ۴ : ۸۸، ۱۰۸، ۳۱۶؛ ۵ : ۳۵۲؛ (۱۴) المقریزی: Hist. des Sult. Mamlouks، ترجمہ Quatremère، ۲/۱ : ۳۰، ۲۰۰، ۲۲۱؛ (۱۵) کمال الدین، در Freytag: Z.D.M.G.، ۱۱ : ۲۲۸، بمواضع کثیرہ؛ (۱۶) الادریسی، طبع Gildemeister، در Z.D.P.V.، ۸ : ۲۳؛ (۱۷) خلیل الظاہری: زبدہ، طبع Ravaisse، ص ۴۸؛ (۱۸) عمری: التعریف....، ص ۱۸۲، در R. Hartmann: Z.D.M.G.، ۷۰ : ۳۰؛ (۱۹) الجیعان ابوالبقاء، در R. L. Devonshire، B.I.F.A.O.، ۱۹۲۱ء، ۲۰ : ۱۰؛ (۲۰) K. Ritter: Erdkunde، ۱۷/۱ : ۹۲۷ تا ۹۳۲؛ (۲۱) Renan: Mission de Phénicie، ص ۱۱۱ ببعد، ۸۰۲؛ (۲۲) M. Hartmann: Das Liwa el-Ladhkije، در Z.D.P.V.، ۱۸۹۱ء، ص ۱۵۱ تا ۲۵۵ مع نقشہ، گوشوارۂ ششم؛ (۲۳) Le Strange: Palestine under the Moslems، ص ۴۹۰ تا ۴۹۲؛ (۲۴) Caetani: Annali dell' Islām، ۳ : ۷۹۴، ۷۹۹، ۸۰۲؛ (۲۵) van Berchem: J. A.، ۱۹۰۲ء، ص ۴۲۵؛ (۲۶) van Berchem اور Fatio: Voyage en Syrie، ۱، در M.I.F.A.O. ۱۹۱۳ء جلد ۳۷ : ۲۸۹ ببعد؛ (۲۷) Gaudefroy-Demombynes: La Syrie à l'époque des Mamelouks، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۱۱۳ ببعد؛ (۲۸) Probst: Die Geogr. Verhältn Syriens u. Paläst. nach Wilh v. Tyrus، لائپزگ ۱۹۲۷ء، ۱ : ۲۵ ببعد؛ (۲۹) Das land der Bibel، ۴، ج ۵/۶؛ (۳۰) قدیم شہر پر دیکھیے راقم کا مقالہ Laodikeia، عدد ۱، در Pauly-Wissowa: Realenzykl، ج ۱۲، عمود ۷۱۳ تا ۷۱۸۔

(E. HONIGMANN)

(۲) فرانسیسی میں عموماً La'taquié یا Lattakie کہلاتا ہے، اگست ۱۹۲۰ء میں فرانسیسی انتداب کی قائم کردہ خود مختار حکومت Etat des Gouvernement de Lattaquié (Alaouites) کا صدر مقام بنا؛ ۱۴ مئی ۱۹۳۰ء کو Haut-Gommissaire نے اس کے آئین کا نفاذ کیا۔ یہ شہر جو پہلی عالمی جنگ سے قبل ویران اور غلیظ نظر آتا تھا، اب ایک صاف ستھرا اور رو بہ ترقی شہر بن گیا ہے۔ اس کی آبادی کوئی ۲۵ ہزار ہے [۱۹۶۸ء میں ۶۷۶۰۴] جن میں اٹھارہ ہزار سنّی مسلمان، چار سو آرتھوڈکس یونانی، ایک ہزار ارمنی، پانسو مارونی (Maronites)، تین سو رومن کیتھولک، اور تین سو ستر پروٹسٹنٹ تھے۔ علوی ریاست کا رقبہ، (فرانسیسی انتداب کے مجموعی رقبے، یعنی ایک لاکھ ساٹھ ہزار کلومیٹر میں سے) صرف چھے ہزار پانسو مربع کلومیٹر ہے اور آبادی دو لاکھ ساٹھ ہزار۔ یہ رقبہ اس خط سے شروع ہوتا ہے جو سیدھی طور پر راس البسیط سے جسر الشغر کنارِ نہر العاصی (oronets) تک پھیلا ہوا ہے اور جنوب کی طرف سو میل کے فاصلے پر نہر الکبیر (Eleutheros) تک چلا جاتا ہے۔ اس کی مشرقی سرحد کا فاصلہ ساحل سے اوسطاً چالیس میل ہے اور کہیں کہیں یہ نہر العاصی کی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اس کی معاون نہر ساروت کی طرف مڑ جاتی ہے۔

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

اس ریاست میں دو سنجاقین ہیں: Lattaquie اور طرطوس جو ایک بلدیہ ہے، اور رواد، نیز ایک خود مختار میونسپلٹی Lattaquie .

سنجاق لاذقیہ (Sandjak Lattaquie) پانچ قضاؤں پر مشتمل ہے: لاذقیہ (Lattaquie)، جبلہ، مصیاف، بانیاس اور الحفہ (بابنا کے جنوب میں Lattaquie سے شمال مشرق کی طرف) ۔ قضاے لاذقیہ (Lattaquie) کی آبادی ۵۳ ہزار ہے جس میں پچیس ہزار کے قریب سنّی ہیں، بیس ہزار علوی، چار ہزار تین سو آرتھوڈکس یونانی، ایک ہزار دو سو ارمنی، چھے سو مارونی، چار سو پچاس پروٹسٹنٹ (ان میں سے زیادہ تر وہ مقامی لوگ ہیں جنھوں نے امریکی مبلغین کی مساعی سے اپنا مذہب تبدیل کر لیا ہے) اور تین سو رومن کیتھولک ہیں، علوی لوگ زیادہ تر پہاڑوں پر آباد ہیں اور لاذقیہ (Lattakie) کے گرد جو ساحل کی آبادی ہے وہ مشترک نوعیت کی ہے .

موجودہ لاذقیہ (Lattakie) پرانے شہر کے مشرق کی جانب واقع ہے، جس کی دہری فصیلیں اب بھی بعض مقامات پر پہچانی جا سکتی ہیں۔ شہر کے شمال مغرب میں وہ شہر خموشاں ہے جس کا ذکر رینان Renan نے ۱۸۶۰ء میں کیا ۔ یہ کوئی ایک ہزار گز وسیع ہے اور Boulevard Billote سے کچھ زیادہ دور نہیں ۔ شہر کی شمالی جانب ایک بڑے گرجا کے کھنڈر ہیں اور مشرق کی جانب ایک قدیمی نہر کے ۔ قلعہ (chateau de laiche) شہر کے اسی نام سے موسوم ہے جو صلیبیوں نے رکھا تھا ۔ یہ قدیمی شہر سے مشرق کی جانب اور موجودہ شہر سے شمال مشرق کی طرف ایک پہاڑی پر واقع تھا ۔ شہر کے اندر مشہور ترین قدیمی یادگار Tetrapylon (چوبرجی) ہے جو اس دوراہے پر واقع ہے جہاں شمالاً جنوباً چلنے والی ایک ستون دار سڑک اس سڑک سے ملتی ہے جو اس سے نسبتہً چھوٹی ہے اور شرقاً غرباً چلتی ہے ۔ اس سے ۵۰۰ گز کے فاصلے پر ایک عمارت ہے جس کے ستون قرنتی (Corinthian) ہیں اور جو Temple of Bacchus بھی کہلاتی ہے [یعنی دیر باکوس (عیاشی کے دیوتا کا مندر)] اور ''کنیسۃ المعلقہ'' بھی جو ایک پرانے گرجا کی بنیادوں پر تعمیر کیا گیا تھا ۔ شہر کے مغربی جانب قدیمی بندرگاہ کا ایک تنگ راستہ ہے، جس کی حفاظت ان برجوں کے ذریعے ہوتی ہے جو صلیبیوں نے چودھویں صدی مسیحی میں پرانے ملبے سے تعمیر کیے تھے ۔ موجودہ بندرگاہ کے مقابلے میں قدیمی بندرگاہ مشرق اور جنوب کی جانب زیادہ دور تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کا ایک حصہ چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا تھا [آج کل لاذقیہ جمہوریہ شام کے پانچ بڑے شہروں میں سے ایک ہے جن میں اس کے علاوہ دمشق، حلب، حمص، حماۃ اور دیر الزور شامل ہیں] .

مآخذ: (۱) P. jacquot: *L'état-des Alaouites* (*Gouernment de Laitaquie*)، بار دوم، بیروت ۱۹۳۱ء.

(E. HONIGMANN)

لاذِیق: (لادِیق) ایشیاے کوچک میں چند قصبوں کا نام .

۱۔ قدیم ''لادیق سوختہ''؛ اس قصبے کا یہ نام غالباً ان بھٹیوں کی وجہ سے ہو گیا جو پارہ نکالنے والے علاقے میں اس کے ارد گرد تھیں اور یہ ان کا مرکز تھا ۔ یہ کرمان بنی قونیہ کے شمال کی طرف اس فوجی سڑک پر واقع تھا جو ایشیاے کوچک کے درمیان سے گذرتی تھی ۔ حاجی خلیفہ بھی اس کے جدید نام یورگان لادیق یا کرمان کے لاذقیہ سے واقف ہے .

مآخذ: (۱) حاجی خلیفہ: جہان نما، ص ۶۱۱؛ بعد، (۲) ابن بی بی، طبع Houtsma، در *Recueil de textes*

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

relat. à l' hist. des Seljoucides ۳ : ۲۳، ۲۵۰ = ۳، ۸؛ ۹؛ (۳) Cramer : *Asia Minor* ۲ : ۳۳ : Hamilton (۴) : *Travels in Asia Minor* ۱۹ : ۳۶۷ ببعد؛ (۵) Ramsay : *Class. Review* ص ۲۰؛ (۶) Sarre : *Reise in Kleinasien* ؛ (۷) Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate* کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۱۳۶ و ۱۴۹ .

۲ - لاذق (حاجی خلیفہ : لاذقیہ) قدیم Laodicea ad Lycum جرمیان کے جنوب مشرقی حصے میں واقع تھا - البتّانی اسے یونانی مآخذ کی پیروی میں ''لاذقیہ نروجس'' (لکھتا ہے) حالانکہ بطلمیوس اس کا وقوع کاریہ Caria میں بتاتا ہے - ابن بطوطہ کے قول کے مطابق یہ ایک بڑا شہر تھا جس میں جامع مسجدیں، خوبصورت باغ، رواں ندیاں اور چشمے اور عمدہ منڈیاں تھیں - وہاں کی یونانی عورتیں اون [سوت، قطن] کی خوشنما اور پائدار چیزیں بناتی تھیں جن پر زری کا کام ہوتا تھا - ابن بطوطہ اہل شہر کی مہمان نوازی کی تعریف لیکن ان کی اخلاق باختگی کی مذمت کرتا ہے - اس شہر کی تاریخ کے لیے (جو اب اسکی حصار کہلاتا ہے) دیکھیے مادہ دِکزلی .

مآخذ : (۱) البتانی : *Opus astronomicum*، طبع Nallino ۲ : ۳۹ و ۳ : ۲۳۷ (شمارہ ۱۱۶)؛ (۲) ابن بطوطہ : تحفۃ النظّار (مطبع پیرس) ۲ : ۲۷۰ ببعد ۳۵۷؛ (۳) حمد اللہ المستوفی : نزھتہ القلوب مطبوعۂ بمبئی، ص ۱۶۲؛ (۴) علی یزدی، مطبوعۂ کلکتہ، ۲ : ۴۴۸ ببعد؛ (۵) حاجی خلیفہ : جہان نما، ص ۶۳۱ ببعد؛ (۶) Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۱۴۰ و ۱۵۳ ببعد؛ (۷) Sarre : *Reise in Kleinasien*، برلن ۱۸۹۶ء، ص ۱۲ .

۳ - لاذیق، جو اماسیہ کے جنوب میں واقع تھا .

مآخذ : (۱) ابن بی بی، طبع Houtsma، بمراجع کثیرہ؛ (۲) Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate* ص ۱۴۶ .

(E. Honigmann)

لار : فارس کے جنوب مشرق میں بلوک لارستان کا صدر مقام - لارستان اور اس کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں - بظاہر یہ وہی خطہ ہے جس کو هَنْتان هوخْت اژدها کی سر زمین کہتے تھے - یہ اژدھا ارد شیر پاپکان کے ہاتھوں مارا گیا تھا - ایرانی اساطیر کے مطابق اردشیر کا دشمن دہ الار میں رہتا تھا - یہ کوجران کے رستاق میں واقع تھا جو صوبۂ اردشیر خرّہ (طبری : ج ۱ : ص ۸۲۰) کا ایک ساحلی رستاق تھا (رساتیق السیف) - Nöldeke کارنامک (ص ۵۰) کے ترجمے میں گلار (؟) اور کوچاران کے متبادل الفاظ لاتا ہے - شاہنامہ، طبع Mohl، ۵ : ۳۰۸ میں کجاران آیا ہے - آخری بات یہ کہ ساتویں صدی کے ارمنی جغرافیے میں ایران کے ایک شہر خجہرستان (خوژیہرستان) کا ذکر ملتا ہے (دیکھیے Marquart : *Eränšahr*، ص ۴۴) - لار کے نام کے شروع میں الف کا سابقہ جزیرۂ لار کے نام سے قبل بھی پایا جاتا ہے (دیکھیے بیان ذیل) - Marquart کے خیال میں کُجہران قلعۂ دیگ دان ہی ہے جو سیراف کے قریب واقع ہے - اس کے برعکس فارس نامۂ ناصری میں کوجر - کوہجر کا ذکر آتا ہے جو لارستان سے متصل بلوک گلّہ دار میں واقع ہے - یہ بلوک ابن بطوطہ کے ہاں قدیم زمانے کا فال / پال / بال ہے، چنانچہ خنج بال = خنج + بال) - ایک بیت کے مطابق جو فردوسی سے منسوب کیا جاتا ہے (دیکھیے Vullers : *Lexicon* بذیل مادۂ لاد) مگر شاہ نامہ کے معروف نسخوں میں کہیں نہیں ملتا، اس شہر کو ابتدا میں لا کہتے تھے (جسے گرگین میلاد نے فتح کیا جو دور کیخسرو کیانی کا ایک پہلوان تھا) - وہ بیت یہ ہے :

www.besturdubooks.wordpress.com

صفاهان بگودرز کشواد داد
بگرگین میلاد هم لاد داد؛ م)

د کے ر سے تبدیل ہو جانے کی یہ ایک نہایت عجیب مثال ہے جو ارمنی اور نواح بحیرۂ خزر کی تاتی بولی میں خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی ہے (Darmesteter : *Et.-Iraniennes*، ۱ : ۷۳) ۔ فارس نامۂ ناصری (ص ۲۸۱) میں ایک اور روایت بھی دی ہے کہ لار کے لوگ فارس میں دماوند (دیکھیے سطور ذیل) سے آئے تھے کیونکہ وہاں کی سردی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

عرب جغرافیہ دان لار کا ذکر ہی نہیں کرتے اور یہ اس لیے کہ ان قدیم راستوں کا گزر یہاں سے نہیں ہوتا تھا جو فارس کے اہم شہروں کو سیراف اور قیس یا (براہ فسا اور فرگ) ہرموز سے ملاتے تھے (دیکھیے نزھۃ القلوب، ص ۱۸۵ و ۱۸۷) ۔ حمد اللہ مستوفی کے نزدیک لار سمندر کے کنارے ایک ولایت ہے اور صرف ابن بطوطہ ہی اس کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ ایک بڑا اہم شہر ہے جس میں چشمے اور بہت سے دریا اور باغات ہیں۔

لار کے مقامی شاہی خانوادے مذکورہ قبل بیت کو سند مان کر اپنا سلسلہ نسب گرگین بن میلاد سے ملاتے تھے جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ لار کا شہر گرگین کو کیخسرو نے عطا کیا تھا ۔ ان کی تاجپوشی کے لیے بھی ان کا آبائی تاج ہی استعمال ہوتا تھا اور یہ بھی اس مال غنیمت میں شامل تھا جو ۱۰۱۰ء میں صفویوں کے ہاتھ آیا۔

لار کا پہلا حکمران جس نے اسلام قبول کیا (نواح ۱۰۰ھ) جلال الدین ایرج تھا ۔ امیر قطب الدین مؤید پاقوی (۵۹۴ھ تا ۶۴۸ھ) کے عہد سے تاریخوں کا سلسلہ زیادہ قابل اعتماد ہو جاتا ہے ۔ اس کے چودہ جانشینوں کے نام معلوم ہیں، لیکن یہ یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس ترتیب سے حکمران ہوئے [تفصیل کے لیے دیکھیے Le Strange لائیڈن بذیل مادّہ]۔

مآخذ : (۱) Defrémery : *Voyage d'Ibn Batoutah dans La Perse*، پیرس ۱۸۴۸ء، ص ۷، ۸۱؛ (۲) قاضی احمد غفاری : جہان آرا؛ مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ عدد ۱۴۱ ورق ۱۰۵ الف ۔ ب ۔ اس کتاب کی ایک نقل کے لیے مقالہ نگار محمد خاں قزوینی کا متشکر ہے؛ (۳) اسکندر منشی : عالم آرای، طہران ۱۳۱۴ھ، ص ۴۲۴ تا ۴۲۸؛ (۴) منجّم باشی : صحائف، ۲ : ۶۶۶ (بہ تتبع فاضل نیشاپوری (؟) و غفاری) ہفت اقلیم رازی، اقلیم ثالث بذیل لار؛ (۵) حاجی خلیفہ : جہان نما، ص ۲۶۱؛ (۶) شیخ علی حزین : تذکرہ، طبع بلفور (Belfour)، لندن ۱۸۳۱ء، ص ۸۰، ۱۷۹ تا ۲۱۷ و ۲۴۶؛ (۷) حسن فسائی : فارس نامۂ ناصری، طہران ۱۳۱۴ء؛ ۲ : ۱۸۱ تا ۲۹۱ (ایک عمدہ تصنیف جو قیمتی مواد سے بھرپور ہے)؛ (۸) عہد صفویّہ کے سیاحوں کے حوالوں کے لیے دیکھیے (ا) Ritter : *Erdkunde*، ۸ : ۷۳۶ و ۷۴۹ و ۷۵۷ اور (ب) Curzon : *Persia*، ۲ : ۱۱۴؛ (ج) A. Dupre : *Voyage en Perse*، پیرس ۱۸۱۹ء، ۱ : ۴۲۳؛ (د) Stack : *Six months in Persia*، لندن ۱۸۸۲ء، ۱ : ۱۳۳ تا ۱۴۵؛ (۹) جنوبی ایران کا نقشہ، پیمانہ ۱ : ۲،۰۰،۰۰۰ (International Series)، مطبوعۂ *Survey of India*، ۱۹۱۲ء۔

۲۔ خلیج فارس کا ایک جزیرہ جو اب ابو شعیب [شیخ شعیب در لیسترینج] کے نام سے پکارا جاتا ہے، Nearchus اپنے جہاں گردی دورے میں میں اس مقام سے گزرا ہے مگر کسی نام کا ذکر نہیں کرتا ۔ یونانیوں نے صید مروارید کی بہت تعریف کی ۔ ابن خرداذبہ اس جزیرے کو الآر کہتا ہے ۔ Le Strange کے قول کے مطابق اس کے لیے

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

عرب جغرافیہ دانوں کے ہاں اللّان اور لان کی اختلافی قراءتیں بھی موجود ہیں ۔ فارس نامہ، طبع Le Strange، ص ۱۴۱ میں اسے کورۂ اردشیر خرہ سے متعلق لکھا ہے ۔ یاقوت (۴ : ۳۴۱) کا بیان ہے کہ یہ جزیرہ قیس اور سیراف کی بندرگاہ کے درمیان واقع ہے ۔ اس کا رقبہ ۱۳ × ۲ ½ میل ہے ۔ اس کے مشرق میں ہتوار (چتوار) کا چھوٹا سا جزیرہ واقع ہے ۔ لار سے تقریباً دس میل شمال کی جانب فارس کے ساحل پر نخیلو کی چھوٹی سے بندرگاہ ہے ۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ آیا شہر اور جزیرہ لار کے ناموں میں کوئی تعلق ہے ۔ لارک (چھوٹے لار) نام کا ایک جزیرہ ہرموز کے جزیرے کے جنوب میں واقع ہے ۔

مآخذ: (۱) Tomaschek : *Die Kustenfahrt Nearchs*، در *Sitzber. Wiener Akad*، (ج ۱۲۱)، ۱۸۹۰ء، ص ۵۵ ۔

۳۔ ماژندران کی ایک مرتفع وادی جو ہزارپی کے منابع پر واقع ہے۔ لار کی بلندی ۸۵۰۰ سے ۶۵۰۰ فٹ کے درمیان ہے ۔ یہ دماوند کے مغرب میں ہے ۔ سردیوں میں وادی غیر آباد ہو جاتی ہے ۔ گرمیوں میں یہاں خانہ بدوش لوگ اپنے خیمے نصب کر دیتے ہیں ۔ طہران کے لوگ بھی یہاں گرمیاں گزارنے آ جاتے ہیں ۔ Stahl کو (*Peterm. Mitteil Erganzungsheft*، عدد ۱۱۸، ۱۸۶۹ء ص ۶۱۹) دریاے لار کے دائیں کنارے پر قدیم بستیوں کے نشانات ملے ہیں ۔ بعض اوقات یہ مقام لاریجان کہلاتا ہے جو لاریج کی جمع ہوگی، یعنی لار کے باشندے ۔ اسی اشتقاق سے عربی اللارز کی بھی تشریح ہو جاتی ہے (البلاذری، ص ۸ اس صفحے پر کوئی ذکر اللارز کا نہیں ہے؛ م) جو طبرستان کا ایک ضلع ہے (مگر وہ ابن رستہ کی فہرست ص ۱۴۹ میں موجود نہیں) ۔ اللارز المصمغان کے مقبوضات میں شامل تھا جس پر ۱۳۱ھ/۷۴۸ء میں ابو مسلم نے قبضہ کر لیا تھا (Marquart : *Erānšahr*، ص ۱۲۷ تا ۱۳۷) ۔ معلوم ہوتا ہے لاریجان کا نام خصوصیت کے ساتھ لار کی مرتفع وادی کے نیچے اس مقام کو دیا گیا تھا جو زمانۂ حاضرہ میں پلور کے پل کے نزدیک واقع ہے ۔ دیکھیے ابن اسفند یار کی تصنیف میں دہ فلول مترجمۂ Browne : *G.M.S.*، ص ۶۷ ۔ لاریجان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آبادی کے اعتبار سے یہ طبرستان کا قدیم ترین علاقہ ہے ۔ روایت ہے کہ اس علاقے کا گاؤں ورکہ فریدون کی جنم بھومی تھی ۔ Stahl نے دماوند کی ڈھلانوں پر ایک میلا ہوتے دیکھا ہے جو ضحاک کی یاد میں منایا جا رہا تھا (۱۱ اگست؛ دیکھیے Morier : *Second Journey*، ص ۳۰۷) ۔ اسپہبدوں کے دور حکومت میں لاریجان میں ایک خاص مرزبان مقیم تھا (ابن اسفند یار، کتاب مذکور، ص ۱۵ و ۱۸۳ و ۲۵۰) ۔ ضلع لاھیجان (لاری جان) کے متعلق دیکھیے مادۂ لاھیجان ۔ شپگل Spiegel (*Varena*، در *Z. D. M. G.* ۱۸۷۶ء ۳۲ : ۷۱۶ تا ۷۲۶) کا خیال تھا کہ ورک (ابن اسفند یار ص ۱۵، ورکہ فریدون = Thraētaona کا وطن) اور اوستائی خطہ Varena میں کچھ تعلق ہے ۔ ورکہ کے متعلق تو یہ معلوم نہیں کہ کہاں واقع تھا البتہ لاریجان میں وانہ نام کا ایک گاؤں موجود ہے۔ فارسی بولیوں میں ر کے غائب ہونے پر دیکھیے *Grundriss d. iran Phil. I/ii* ص ۳۰۱ و ۵۵۹ ۔

(V. MINORSKY)

لاردہ : (لریدہ)، قدیم الِرْدہ Ilerda؛ شمالی اندلس میں ایک شہر سرقسطہ اور برشلونہ کے مابین اسی نام کے صوبے کا سب سے بڑا مقام ہے جس کی آبادی تقریباً ۲۹۰۰۰ نفوس ہے ۔ یہ دریاے سگری Segre (عربوں کا وادی

www.besturdubooks.wordpress.com

ثغر کے دائیں کنارے پر ۶۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے (یاقوت نے معجم البلدان میں اس لفظ کو غلطی سے لریدہ Lerida کا دوسرا نام بتایا ہے) اور ارغون کے میدانوں کے مدخل پر ایک اہم جنگی مقام ہے۔

لاردہ پر، جو بلاشبہہ اصل کے اعتبار سے ہسپانوی ہے، ۴۹ ق م قبل مسیح میں جولیس سیزر نے اس خانہ جنگی کے دوران میں جو اس کے اور پومپئی Pompay کے درمیان ہوئی تھی، قبضہ کر لیا۔ ۵۴۶ء میں وہاں ایک کونسل کا اجلاس ہوا۔ آٹھویں صدی کے نصف اول میں اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس کا اور سرقسطہ کا حال ایک ہی سا رہا ہے اور الثغر الاعلیٰ (Upper Irantera) کی حفاظت کے لیے یہ ایک اہم مقام رہا ہے۔ بعد میں یہ سرقسطہ کے بنو ہود کی خود مختار سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ سلیمان بن ہود المستعین باللہ (م ۱۰۴۶ء) کی وفات پر مملکت کی جو تقسیم ہوئی، اس میں یہ اس کے بیٹے یوسف کے حصے میں آیا، لیکن سرقسطہ کے فرمانروا احمد المقتدر نے اسے پھر لے لیا۔

مآخذ: الادریسی: صفة الاندلس، طبع Dozy و de Goeje، متن ص ۱۹۰، ترجمہ، ص ۲۳۱؛ (۲) ابوالفداء: تقویم البلدان، ص ۱۸۰ تا ۱۸۱؛ (۳) یاقوت: معجم البلدان، ۷: ۳۱۳؛ (۴) ابن عذاری: البیان المغرب، ج ۳، طبع E. Levi-Provençal، پیرس ۱۹۲۷ء دیکھیے اشاریہ؛ (۵) محمد عنایت اللہ: اندلس کا تاریخی جغرافیہ، ص ۳۲۰ تا ۳۲۲۔

(E. Levi Provençal)

* **لارَنْدہ**: ایشیائے کوچک کا ایک شہر (جو ایک حکمران خاندان کے نام پر جو یہاں چودھویں صدی عیسوی مسیحی میں حکومت کرتا تھا، قرمان بھی کہلاتا ہے) اسی نام کی قضا اور قونیہ کی سنجاق کا صدر مقام۔ قونیہ اس شہر سے جنوب مشرق کی طرف ۳۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ شہر سطح سمندر سے چار ہزار فٹ بلند ہے اور اس میں دو ہزار مکان، ساڑھے سات ہزار باشندے، ایک سو پانچ مسجدیں، اکیس جامع مسجدیں، درویشوں کی چار خانقاہیں، پانچ سو پندرہ دکانیں، تیس گودام، نو قہوہ خانے، چار کاروان سرائیں، چودہ نانبائیوں کے تنور، سات حمام، پانچ چکیاں، ایک فوجی گودام، ایک سو دس فوارے، ایک پارک، ایک یونانی سکول، دس مسلم سکول اور اکیس مدرسے ہیں۔ اس میں ایک ویران قلعے، کچھ مسجدوں اور دوسری تاریخی یادگاروں کے کھنڈر بھی ہیں جن میں سب سے پرانے قرمان اوغلو کے زمانے کے ہیں (ایک مسجد امیر موسیٰ کی بھی ہے جس کے ستون قدیم عمارتوں سے لیے گئے تھے)۔ یہ شہر ۱۴۶۴ء میں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوا تھا۔

شمال کی طرف قرہ طاغ ہے جسے قرون وسطیٰ کی ویران خانقاہوں کے کھنڈروں نے ڈھک رکھا ہے بن بر کلیسہ = ۱۰۰۱ گرجا۔

مآخذ: (۱) علی جواد: جغرافیائے لغاتی، ص ۶۰۶؛ (۲) حاجی خلیفہ: جہان نما، ص ۶۰۶؛ (۳) ابن بطوطہ، پیرس، ۲: ۲۸۴؛ (۴) سامی بے: قاموس الاعلام، ۷: ۳۶۴۴، بذیل مادہ قرمان؛ (۵) Texier: *Asie Mineure*، ص ۶۵۸۔

(Cl Huart)

لاری: (لَرِن) ایک چاندی کا سکہ جو سولھویں اور سترھویں صدی میں خلیج فارس اور بحر ہند میں رائج تھا۔ اس کا نام لارستان (رک بآں) کے دارالحکومت لار (رک بآں) کے نام سے ماخوذ ہے، جہاں یہ سب سے پہلے مضروب ہوا۔ دیکھیے Pedro Texeira (*Travels*، Hakl. Soc. ۱۹۰۲ء، ص ۳۴۱)، یہ مصنف کہتا ہے "لار کا شہر بھی ہے جس کے نام پر یہ سکہ لاری (Lārī)

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

کہلاتا تھا جو خالص ترین چاندی کا بنایا جاتا تھا عمدگی سے سانچے میں ڈھلا ہوا یہ سکہ تمام مشرق میں رائج تھا - Sir Thomas Herbert ۱۶۲۷ء میں لار کا ذکر کرتے ہوئے (*Some Years' Travels*، لنڈن ۱۶۶۵ء، ص ۱۳۰) کہتے ہیں "اس بازار کے قریب لرن (Larnes) ڈھالے جاتے ہیں جو مشہور قسم کے سکے ہیں۔" لرن کا وزن تقریباً ۴ گرین (۹۰۴ گرام) تھا اور اپنی خالص چاندی کی وجہ سے بہت مشہور تھا - یہ قیمت میں دس انگریزی پنس (Herbert) یا فرانسیسی کراؤن کے پانچویں حصے (Tavernier) یا ساڑھے پرتگیزی رایس (reis) کے برابر تھا .

لرن وضع قطع میں دوسرے سکوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ چاندی کی کوئی چار انچ لمبی پتلی سلاخ ہے جسے موڑ کر دوہرا کر دیا گیا ہے اور پھر اس کے دونوں طرف عام سکوں کی طرح ٹھپے سے نقش کندہ کر دیے گئے ہیں - William Barret نے ۱۵۹۴ء میں البصرہ کے سکوں کا حال بیان کرتے ہوئے اس کا اچھا نقشہ کھینچا ہے اور اس کی بہت تعریف کی ہے (*Principal Voyages* : Hakluyt، گلاسگو ۱۹۰۴ء، ۶ : ۱۲) - وہ کہتا ہے "مذکورہ لرن ایک عجیب سکہ ہے کیونکہ یہ عیسائی ملکوں کے دیگر تمام رائج سکوں کی طرح گول نہیں بلکہ چاندی کی ایک چھوٹی سی سلاخ ہے، اتنی موٹی جتنا ہٹ کے پر کا قلم، جس سے ہم لکھتے ہیں اور لمبائی میں اس کا کوئی آٹھواں حصہ جسے اس طرح موڑا جاتا ہے کہ دونوں سرے عین وسط میں آ ملتے ہیں اور اس جگہ ترکی حروف میں مہر لگی ہوتی ہے - یہ جزائر ہند میں بہترین رائج الوقت سکہ ہے اور چھے لرن ایک ڈوکٹ Ducat کے برابر ہوتے ہیں" .

ایران کے شاہ عباس اعظم نے لار کی مملکت کو سر کر لیا تو وہاں سے ان سکوں کا اجرا ختم ہو گیا (Chardin : *Voyages* ایمسٹرڈم ۱۷۳۵ء، ۳ : ۱۲۸)، مگر وہ اس قدر مقبول ہو چکے تھے کہ بحر ہند کی دوسری ریاستوں نے بھی اسی نمونے کے سکے اختیار کر لیے - سولھویں صدی کے نصف آخر میں شاہانِ ہرمز کے علاوہ شاہانِ ایران نے شیراز سے اور سلاطینِ عثمانیہ نے بصرے سے لرن جاری کیے - ہندوستان میں بیجاپور کے عادل شاہی خاندان اور دوسرے حکمرانوں نے سترھویں صدی میں اسی طرح کے سکے مضروب کیے - مغربی ہندوستان میں بھی لرن کئی مقامات سے دستیاب ہوئے ہیں، جس سے پتا چلتا ہے کہ ان کا رواج وہاں کس قدر عام تھا - جزائر مالدیپ کے سلطان نے سترھویں صدی کے اوائل میں اپنے الگ لرن مضروب کیے جیسا کہ F. Pyrard de Laval کے سفر نامے (*Voyage* Hakl. Soc. ۱۸۸۷ء، ۱ : ۲۳۲ ببعد) سے پتا چلتا ہے - سیلون میں بھی نہ صرف وہاں کے باشندوں نے بلکہ کولمبو کے پرتگیزی تاجروں نے بھی یہی سکے ڈھالے - اس جزیرے میں ان کو بل دے کر کچھ مچھلی پکڑنے کے کانٹے سے مشابہ بنا دیا گیا ہے جس سے مچھلی کانٹا fish hook روپے کی اصطلاح نکلی - ان سکوں پر یا تو کوئی نقش ہوتا ہی نہیں اور یا عربی خط کی بھدی سی نقلیں کندہ ہیں - سیلون میں یہ "مچھلی کانٹا" سکہ اٹھارھویں صدی تک چلتا رہا - لرن کی نوع کا ایک مسخ شدہ سکہ اب بھی خلیج فارس کے عرب ساحل پر الحسا میں موجود ہے (*Heart of Arabia* : Philby، ۲ : ۳۱۹) جہاں اسے طویلہ یعنی "لمبا" (سکہ) کہتے ہیں - یہ فقط ایک انچ لمبا ہوتا ہے اور تانبے کا نہیں تو بہت کھوٹی چاندی کا ہوتا ہے اور اس پر کسی نقش کی کوئی علامت نظر نہیں آتی - Palgrave (*Journey etc.*، لنڈن ۱۸۶۵ء، ۲ : ۱۷۹) نے اس کا حال بیان کیا ہے، نیز لکھا ہے کہ ایک ضرب المثل

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

ہے ''حسا کے سکّے کی مانند'' طویل جس کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے جو مقامی سکے کی طرح گھر سے باہر کسی مصرف کا نہ ہو۔

مآخذ: (۱) Yule: *Hobson-Jobson*، بذیل مادّہ؛ (۲) H. W. Codrington در *Numismatic Chronicle*، لنڈن ۱۹۱۴ء، ۱۶۲ تا ۱۶۴؛ (۳) وہی مصنف: *Ceylon Coins and Currency*، کولمبو ۱۹۲۴ء، اشاریہ بذیل مادّہ؛ (۴) O. Codrington: *Journal of the Bombay Branch, R. A. S.*، ۱۸: ۳۶، ۳۷؛ (۵) J. Allan در *Numismatic Chronicle*، لنڈن ۱۹۱۲ء، ص ۳۱۹ تا ۳۲۴؛ (۶) H. H. Wilson: وہی کتاب ۱۸۵۲ء، ص ۱۸۰؛ (۷) R. Knox: *Historical Relation of Ceylon*، گلاسگو ۱۹۱۱ء، ص ۱۵۶؛ (۸) Tavernier, Chardin اور دوسرے سیّاح۔

(J. ALLAN)

* **لاز**: جنوبی قفقاز کی ایک قوم (قدیم آئبیری نسل جو اب جارجی کہلاتی ہے) جو اس وقت بحیرۂ اسود کے سواحل کے جنوب مشرقی کونے پر آباد ہے۔ لاز کی قدیم تاریخ بوجہ اس تذبذب کے جو قفقاز کے نسلی نظام تسمیہ پر مسلط ہے پیچیدہ ہو گئی ہے، ایک ہی نام صدیوں کے دوران میں مختلف گروہوں (یا جماعتوں) پر بولا جاتا رہا ہے۔ یہ امر کہ Phasis کا اطلاق دریاے رئین پر بھی ہوتا تھا اور دریاے چوروخ Čorokh، (یعنی قدیم Akampsis) پر بھی یہاں تک کہ دریاے Araxes کے منابع پر بھی، بہت سی مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔

قدیم ترین یونانی مصنف لاز کا بالکل ذکر نہیں کرتے۔ یہ نام فقط سنہ عیسوی شروع ہونے کے بعد ہی ملتے ہیں (Pliny: *Nat - Hist*، ۴: ۴؛ Arrian: *Periplus*، ۱۱: ۲؛ بطلمیوس ۵: ۹، ۵)۔ لزوئی Lazoi کا قدیم ترین مسکن جو معلوم ہو سکا ہے، وہ شہر لازوس Lazos یا ''قدیم لازک ''Lazik'' ہے جس کی جگہ Arrian مقدس بندرگاہ (Noworossiisk) سے ۶۸۰ سٹیڈیا Stadia (تقریباً ۸۰ میل) جنوب کی طرف اور ۱۰۲۰ سٹیڈیا (تقریباً ۱۰۰ میل) پتیس Pityus سے شمال کی طرف معین کرتا ہے، یعنی تاپسے Tuapse کے قرب و جوار میں۔ کیسلنگ Kiessling کی راے میں لزوئی Lazoi کرکٹائی Kerketai کا ایک جزء ہے؛ یہ کرکٹائی ابتدائی عیسائی صدیوں میں زی گوئی Zygoi یعنی چرکس [رنگ بان] کے غلبے سے دب کر جنوب کی طرف ہجرت کر آئے تھے۔ زی گوئی Zygoi وہی ہیں جو اپنے آپ کو adighe (adzîghe) کہتے ہیں؛ کیسلنگ کرکٹائی کو ایک جارجی قوم خیال کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ Arrian کے زمانے (دوسری صدی قبل مسیح) میں، لزوئی پہلے ہی سے سخم Sukhum کے جنوب میں بس رہے تھے۔ طربزون کے مشرق میں ساحل کے ساتھ ساتھ آباد قومیں بالترتیب یہ تھیں: کولچی Colchi اور سنّی Sanni؛ میچلی لونز Machelones؛ Heniochi؛ Zydritae؛ لزائی Lazai، شاہ ملسّس Malassus کی رعایا، جو روما کا شاہی اقتدار تسلیم کرتا تھا؛ Apsilae؛ Abacsi (دیکھیے Abkhaz)؛ Sanigae سباسٹو پولس (= سخم Sukhum) کے قرب میں۔

آئندہ صدیوں میں لاز نے اس قدر اہمیت اختیار کر لی کہ تمام قدیم دول جس (Colchis) کا نام بدل کر لازیکا Lazica کر دیا گیا [. . . . . تفصیل کے لیے دیکھیے ۱۱ لائیڈن بذیل مادّہ].

مآخذ: بڑے بڑے بوزنطی مآخذ مندرجۂ ذیل مقامات میں ملیں گے: (۱) Dietrich: *Byzantinische Quellen zur Länder-und völkerkunde*، لائپزگ ۱۹۱۲ء، ۱: ۵۲ تا ۵۸؛ (۲) Dubois de Montpéreux: *Voyage autour du Caucase*، پیرس ۱۸۳۹ء، ۲: ۷۳ اور اٹلس، سلسلہ ۱: نقشہ ۱۴:

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

لزیکیہ کے میدان جنگ کا نقشہ؛ (۳) Vivien de St. Martin : *Etudes de geographie ancienne*، پیرس ۱۸۵۲ء، ۲ : ص ۱۹۶ تا ۲۱۸ *Etude sur la Lazique de Procope*؛ (۴) Hermann : *Lazai* و *Heniochoi* از Kiessling، در *Real-Encyclopädie* از Pauly-Wissowa، ۲۳ : ص ۱۰۴۲، اور ۸ : ۲۵۸ تا ۲۸۰؛ (۵) Koch : *Wanderungen im Oriente*، ویمر، ۱۸۴۶ - ۱۸۴۷ء، ۲ : *Reisen im pontischen Gebirge*؛ (۶) Bianchi : *Viaggi in Armenia, Kurdistan e Lazistan*، میلان ۱۸۶۳ء (مصنف نے اصلی لازستان کو نہیں دیکھا)؛ (۷) Kazbek : *Tri mesiatza v turetskoi Gruzii, Zap. Kawk Otd Geogr. obšč*، تفلس ۱۸۷۵ء، ۱۰/۱ : ص ۱ تا ۱۴۰؛ (۸) Deyrolle : *Lazistan et Armenie*، پیرس ۱۸۷۵ - ۱۸۷۶ء؛ (۹) *Tour du monde Nouv. Dict.* در *Lazistan* : Vivien de. St. Martin، *Geogr. Universelle*، پیرس ۱۸۸۷ء؛ (۱۰) Proskuriakow : *Zametkio Turtsii Zap. Kowk. Otd Geogr. Obšč*، تفلس، ۱۹۰۵ء، ۲۵؛ (۱۱) N. Y. Marr : *Iz poezdki v turetskii Lazistan, Bull. de L'Akad Imp. des Sciences* سینٹ پیٹرز برگ، ۱۹۱۰ء ص ۵۳۷ تا ۵۷۰، ۶۰۷ تا ۶۳۲؛ (۱۲) N. Y. Marr : *Gruzin pripiski greč. Ewangelia iz koridii* وہی کتاب، ۱۹۱۱ء، ص ۳۱۷؛ (۱۳) N. Y. Marr : *Krešceniye armian etc., Zap.*، ۱۹۰۵ء، ۲۶ : ۱۶۵ - ۱۷۱؛ (۱۴) G. Vechapeli : *La Georgie Turque*، برن ۱۹۱۹ء، ص ۱ تا ۵۲ (جارجیا کے قوم پرستوں کا زاویۂ نگاہ)۔

(۱) G. Rozen : *Über die Sprache d. Lazen, Abh. B. Ak. W. Phil. hist. Class*، ۱۸۴۳ء، ص ۱ تا ۳۸؛ (۲) Peacock : *Original vocabularies of 5 West-Cauc. Languages J.R.A.S* ۱۸۸۷ء، ۱۹ : ص ۱۴۵ تا ۱۵۶؛ (۳) Adjarian : *Etude sur la langue laze M.S.L.*، ۱۸۹۹ء، ۱۰ : ص ۱۴۵ تا ۱۶۰، ۲۲۸ تا ۲۴۰، ۳۶۴ تا ۴۰۱، ۴۰۵ تا ۴۴۸؛ (۴) N. Marr : *Grammatika anskago (Lazskago) yazika* سینٹ پیٹرز برگ Grammar Christomathie)، ۱۹۱۰ء، ۲۸ : ۲۴۰، (Glossary)؛ (۵) Kipshidze : *Dopeln. Svědeniya o. č. anskom yazike*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۱ء۔

(V. MINORSKY [و تلخیص از ادارہ])

لازار [= لَعْزَر؛ عربی بائیبل میں : لِعَازَر؛ فارسی ایلعازر؛ انگریزی : Lazarus]؛ ایک نام جس کا ذکر صرف دو انجیلوں میں ہے : (۱) ایک مُردہ جسے یسوع مسیح (حضرت عیسیٰ[۴]) نے زندہ کر دکھایا؛ یہ شخص حضرت عیسیٰ[۴] کا دوست اور مریم اور اس کی بہن مرتھا کا بھائی تھا ۔ حضرت عیسیٰ[۴] نے اسے اس کی موت کے بعد چوتھے دن قبر سے زندہ کیا ۔ یوحنا کی انجیل کے مطابق یہ حضرت عیسیٰ[۴] کا سب سے آخری بڑا معجزہ تھا (اَنجیل یوحنّا، باب : ۱۱ — ۱۲)؛ (۲) ایک فقیر اور مفلوک الحال شخص جو ایک نہایت ہی امیر شخص کے دروازے پر پڑا رہتا، اس کے دستر خوان سے بچے کھچے ٹکڑے کھا کر اپنا پیٹ بھر لیتا ۔ کبھی کبھی تو کتے بھی آ کر اس کے زخموں کو چاٹنے لگتے ۔ موت کے بعد اسے حضرت ابراہیم[۴] کے قریب جگہ ملی اور اس امیر شخص کو عذاب میں مبتلا ہونا پڑا ۔ ایک تمثیل (انجیل لوقا، باب ۱۶ : ۱۹ تا ۳۱)۔

اناجیل اربعہ میں حضرت عیسیٰ[۴] کے معجزات کا ذکر بڑے شد و مد کے ساتھ آتا ہے ۔ ان اناجیل میں ان کے لاتعداد معجزات کا ذکر ہے : ان کا کوڑھیوں کو شفا دینا، فالج زدہ اور مرگی کے مریضوں کو ٹھیک کر دینا، مادر زاد اندھوں کو بینائی عطا کرنا، گونگوں کو گویائی بخش دینا، اپاہجوں، لنگڑوں اور سوکھے ہوئے اعضا والے

www.besturdubooks.wordpress.com

مریضوں کو تندرست کر دینا، بخار کے مریضوں کا بخار اتار دینا، پانی کے بھرے ہوے مٹکوں کو مے میں تبدیل کر دینا، فقط پانچ روٹیوں اور دو مچھلیوں کو پانچ ہزار افراد کے پیٹ بھرنے کے لیے کافی بنا دینا، بلکہ ان میں سے بہت کچھ بچا بھی لینا، فقط روٹیوں اور چند مچھلیوں کو چار ہزار اشخاص کی بھوک مٹانے کے لیے کافی بنا دینا، جھیل کے طوفان کو روک دینا، پانی پر چلنا، آئندہ واقعات کی اطلاع دینا، مردوں کو زندہ کرنا اور خود مردوں کا جی اٹھنا اور بغض دیگر معجزات کا ذکر ہے (حوالے کے لیے دیکھیے، اناجیل اربعہ: متی، مرقس، لوقا، یوحنا).

یہ حیرانی کی بات ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے تعلق میں لازار کا ذکر صرف یوحنا ہی نے کیا ہے اور اسے مریم اور مرتھا [= مرثا] کا بھائی قرار دیا ہے۔ لازار کے جی اٹھنے کے بعد وہ اس کا ذکر بھی کرتا ہے کہ حضرت یسوع عید فسح [= الفصح] کی تقریب سے چھے دن پہلے بیت عنیا (Bethany) میں آئے اور مرتھا اور مریم کے گھر ایک دعوت میں شریک ہوے۔ لازار کھانے کی میز پر حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ بیٹھا۔ مریم نے بیش قیمت عطر حضرت عیسیٰؑ کے پاؤں پر ڈالا اور اپنے بالوں سے آپ کے پاؤں پونچھے (دیکھیے باب ۱۲: ۱ تا ۳).

مرقس کا بیان اس سے مختلف ہے۔ اس میں حضرت یسوعؑ کا شمعون (= سمعان) کوڑھی کے ہاں ٹھیرنے کا ذکر ہے۔ عطر ڈالنے والی عورت کا نام نہیں لیا گیا اور نہ لازار ہی کا ذکر ہے۔ (دیکھیے مرقس، باب ۱۴: ۱ تا ۹).

انجیلیات کے ماہرین کو اس تضاد نے کشمکش میں ڈال رکھا ہے۔ (دیکھیے E. A. Abbot: "LAZARUS" در *Encyclopaedia Biblica*، مطبوعہ لنڈن، (۳: ۲۷۴۳ تا ۲۷۵۱)، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں لازار پر کوئی علٰحدہ مضمون نہیں لکھا گیا.

اناجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے رفع آسمانی سے قبل صرف تین مُردوں کے زندہ کرنے کا ذکر ہے: اول رئیس کی بیٹی جسے پہلی تین انجیلوں والے نقل کرتے ہیں؛ دوسرے والدین کا وہ مردہ اکلوتا بیٹا جس کا ذکر لوقا (باب ۷: ۱۱-۱۷) کرتا ہے اور تیسرا لازار جسے صرف یوحنا نقل کرتا ہے.

قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کا ذکر عمومی طور پر کیا ہے۔ ان معجزات میں اللہ تعالٰی کے حکم سے مردوں کو زندہ کرنے کا ذکر بھی ہے (۳ [آل عمرٰن]: ۴۹)، لیکن قرآن حکیم نے کہیں بھی نام لے کر لازار کے جی اٹھنے کا ذکر نہیں کیا۔ احادیث اور تفاسیر کی جملہ کتابیں بھی لازار یا لعازر کے ذکر سے خالی ہیں.

طبری نے اپنی تاریخ میں بھی کہیں اس معجزے کا ذکر نہیں کیا۔ ویسے وہ عمومی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر کرتا ہے (الطبری: تاریخ الامم و الملوک، ۱: ۴۳۳ تا ۴۳۴، قاہرہ ۱۳۵۷ھ)؛ تاہم ثعلبی یوحنا کی انجیل کا ہی تتبع کرتے ہوے لکھتا ہے: ''العازر مر گیا، اس کی بہن نے حضرت عیسیٰؑ کو خبر بھیجی، حضرت عیسیٰؑ اس کی وفات سے تین دن (یوحنا میں چار دن مذکور ہیں) بعد آئے اور متولی کی بہن کے ساتھ اس کی قبر پر گئے جو چٹان میں تھی۔ انھوں نے اسے زندہ کر اٹھایا''.

ابن الاثیر الجزری نے اپنی کتاب الکامل فی التاریخ میں عیسائی اور یہودی روایات کا سہارا لیتے ہوے نہ صرف عازر کے جی اٹھنے کا بیان کیا ہے بلکہ سام بن نوح، حضرت عزیر اور یحیی بن زکریا کے زندہ ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔ مسلمان اہل علم نے ابن الاثیر کے اس بیان کی تردید کی ہے۔

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

(ابن الأثیر الجزری: الکامل فی التاریخ، ۱: ۱۸۰، حاشیۂ شیخ عبدالوهاب النجار، قاهره ۱۳۷۸ھ).

مآخذ: (۱) قرآن مجید؛ (۲) صحاح سته؛ (۳) محمد ابن جریر الطبری، جامع البیان عن تأویل القرآن (قاهره ۱۹۵۷ء)، ۶: ۳۲۴ تا ۳۳۷)؛ (۴) وهی مصنف: تاریخ الامم و الملوک (قاهره ۱۳۵۷ھ)، ۱: ۳۳۴ تا ۳۴۴)؛ (۵) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم (لاهور ۱۳۹۲ھ)، ۱: ۳۶۴ تا ۳۶۵؛ (۶) ابن الأثیر الجزری: الکامل فی التاریخ (قاهره ۱۳۷۸ھ)، ۱: ۱۸۰؛ (۷) الثعلبی: قصص الانبیاء (قاهره ۱۳۲۵ھ)، ص ۳۰۷؛ (۸) E.A. Abbot: *LAZARUS*، در *Encyclopaedia Biblica*، ۳: ۲۷۴۴ تا ۲۷۵۱؛ (۹) اناجیل اربعه: متی، مرقس، لوقا، یوحنا؛ (۱۰) *The New English Bible*، لندن ۱۹۶۱ء؛ (۱۱) A. R. Buckland: *The Universal Bible Dictionary*؛ (۱۲) رحمة الله کیرانوی: اظهار الحق (اردو ترجمه: بائیبل سے قرآن تک، کراچی ۱۳۸۸ھ، ۱: ۳۲۱ تا ۳۲۴).

(امان الله خان)

* لالہ زانی: رک به محمد لاله زاری.

⊗ لام: رک به ل.

* لام، بنو: ایک خانه بدوش عرب قبیله جو دریائے دجله کے زیریں حصے (علی غربی؛ علی شرقی، عماره) میں آباد بتایا جاتا ہے.

خورشید آفندی (وسط انیسویں صدی عیسوی) کے فراهم کرده اعداد و شمار کے مطابق بنی لام کے ۴۴۰۰ خاندان دجلے کے غربی حصے میں (عماره اور شطّ الحیّ کے مابین) اور ۵۰۷۰ شرقی حصے میں ایرانی سرحد کے ساتھ ساتھ مندلی سے لے کر دلدلی علاقے (خور) تک جس میں کرخه ندی گم هو جاتی ہے، آباد تھے - بنو لام کے ۱۷۴۵ خاندان ۱۷۸۸ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیان ایران چلے گئے (پشت کوه کے جنوبی حصے یعنی والیان حویزه کے علاقے میں)؛ کچھ گروه کرخه کے مشرق اور فلاحیه میں جا بسے.

بنو لام کا دعوی ہے که ان کے بزرگ شروع میں نواح مکّه سے آئے تھے (*Voyage* : Lyclama a Nijeholt، ۳: ۲۲۵) اور ان کا نام دراصل ان کے قبیلے کے سردار فرج لام کے نام پر مشهور ہے - بنو لام جن میں سے بیشتر شیعی تھے، حویزه کے والیوں (المشعشع، سادات عرب، رک بآں) کے ساتھ، جو صفوی عهد میں ایرانی سیاست میں عملی حصه لیتے رہے، دوستانه تعلقات رکھتے تھے - سنه ۱۶۷۸ء، ۱۷۱۵، ۱۷۴۲ء اور ۱۷۴۸ء میں بنو لام نے حویزه کے سردار کی انگیخت پر بغداد کے پاشاؤں کے خلاف بغاوت کی - ان کے تعلقات پشت کوه کے لور والیوں سے زیاده خوشگوار نه تھے، جنهوں نے انهیں بیات، دیه لران اور بکسایه نامی گانوں سے محروم کر دیا تھا، لیکن بالعموم بنو لام کے اپنے لور همسایوں سے خاصے اچھے مراسم تھے.

علی رضا پاشا نے ۱۸۳۶ء میں اور نجیب پاشا نے ۱۸۴۳ء کے بعد بنو لام کو بھاری شکستیں دیں - ایران کی مرکزی حکومت نے بھی (۱۸۴۱ء میں معتمدالدوله کی مهمیں) بنو لام کو کرخه کے بائیں ساحلی علاقے سے باهر نکال دیا، لیکن شمال میں اور مشرق میں پشت کوه کے پہاڑوں کی اور جنوب میں خور (دلدلی علاقے) کی پناه حاصل هونے کی وجه سے وه اتنے محفوظ تھے که ۱۹۱۴ء تک بنو لام نے ترکی اور ایران کے درمیان اپنا ایک خود مختار علاقه قائم رکھا - عماره، پائے پل اور دزفول کے درمیان بنو لام اور سگوند لورون کی موجودگی کے باعث اس سیدھے راستے سے تجارتی آمد و رفت مسدود تھی.

انیسویں صدی میں اس قبیلے کا باهمی اتحاد ختم هو گیا - دریائے دجله کے دائیں اور بائیں کناروں پر هر گروه کا ایک الگ شیخ هونے لگا - ۱۸۲۱ء میں جندیل کے باهمت بیٹے مذکور (متکور) کو شیخ عرار کی

www.besturdubooks.wordpress.com

معزولی کے بعد اپنے گروہ کا سردار بننا نصیب ہوا، لیکن Layard نے یہ دیکھا کہ اس زمانے میں بھی اس کا اپنے حریفوں پر کوئی اقتدار نہ تھا ۔ لیڈی بلنٹ Lady Blunt نے شیخ مِزبان اور اس کے بیٹے بُنّی کا ذکر کیا ہے ۔ شیخ غضبان ولد بُنّی نے ۱۹۱۴ء کی لڑائی کی ابتداء میں اہواز میں انگریزی فوج پر حملہ کیا لیکن جلد ہی اس کا کام تمام کر دیا گیا۔

مآخذ: (۱) دیکھیے نیز البطیحہ؛ (۲) Layard: *A Description of the Province of Khuzistan*، در *J.R.G.S.* ۱۸۴۶ء، ص ۴۵ تا ۴۸؛ (۳) A. v. Kremer: *Nachrichten über d. am. linken Ufer d. Tigris wohnenden Araberstamm d. Beni Lam S. B. Ak. Wien*، ۱۸۵۰ء، ص ۲۵۱ تا ۲۵۴ (عمدہ بیان اور مقبول عام گیتوں: دُوَیر، عتابہ اور تطویح کے نمونے؛ (۴) خورشید افندی: سیاحت نامۂ حدود، روسی ترجمہ، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۷ء، ص ۷۶ تا ۸۱؛ (۵) Lady A. Blunt: *A Pilgrimage to Najd*، لنڈن ۱۸۸۱ء، ۲: ۱۱۳ تا ۲۲۳، (بغداد، علی غربی، دِزفُول، شوستر، بہبہان، دیلم)؛ (۶) Huart: *Histoire de Bagdad*، پیرس ۱۹۰۱ء، ص ۱۴۴؛ (۷) Longrigg: *Four Centuries of Modern Iraq*، آکسفرڈ ۱۹۲۵ء؛ [(۸) عمر رضا کحالہ: معجم قبائل العرب، بذیل مادہ].

(V. MINORSKY)

لامَس صو: (ترکی زبان کا لفظ جس کے معنی ہیں لامس کی ندی؛ عربی: لامِس)؛ ولایت کیلیکیا (Cilicia) کی ایک ندی جو کوہ طارس (Taurus) سے نکلتی ہے۔ اس کا منبع آیاش اور مَرسینہ کے درمیان طرسوس سے ایک دن کی مسافت پر واقع ہے ۔ قدیم زمانے میں یہ ندی کوہستانی کیلیکیا اور میدانی کیلیکیا کے درمیان حدّ فاصل کا کام دیتی تھی ۔ اس کے کنارے پر کئی بار یونانیوں سے قیدیوں کے تبادلے ہوئے اور زرِ فدیہ کی ادائی عمل میں آئی ۔ ان تبادلوں میں سے پہلا ہارون الرشید اور قیصر نِقفورس اوّل Nicephorus کے عہد میں ۱۸۹ھ / ۸۰۵ء میں عمل میں آیا؛ دوسرا اسی خلیفہ اور اسی قیصر کے عہد میں ۱۹۲ھ / ۸۰۸ء میں؛ تیسرا خلیفہ الواثق اور قیصر میخائل Michael ثالث ''دائم الخمر (the Drunkard)'' کے عہد میں محرّم ۲۳۱ھ (ستمبر ۸۴۵ء) میں؛ چوتھا ۲۴۱ھ / ۸۵۶ء میں اور پانچواں ۲۴۶ھ / ۸۶۰ء میں اسی قیصر اور خلیفہ المتوکّل کے عہد میں؛ چھٹا ۲۸۳ھ / ۸۹۶ء میں خلیفہ المعتضد اور قیصر الیون سادس Leo VI کے عہد میں؛ ساتواں جو ''فداء الغدر'' کہلاتا ہے، اسی قیصر اور خلیفہ المُکتفی کے عہد میں ۲۹۲ھ / ۹۰۵ء میں؛ آٹھواں تین سال بعد ۲۹۵ھ / ۹۰۷ء میں؛ نواں ۳۰۵ھ / ۹۱۷ء میں خلیفہ المقتدر اور قیصر قسطنطین Constantine Porphyrogenetos کے عہد میں؛ دسواں ۳۱۳ھ / ۹۲۵ء میں انھیں حکمرانوں کے عہد میں؛ گیارھواں ۳۲۶ھ / ۹۳۸ء میں اسی قیصر اور خلیفہ الرّاضی کے عہد میں؛ بارھواں ۳۳۵ھ / ۹۴۶ء میں المُطیع کے عہد خلافت میں سیف الدولہ الحَمْدانی امیر حلب کی وساطت سے طے پایا ۔ اس دریا پر اس جگہ کوئی پایاب راستہ یا پل تھا جسے تاوان دے کر چھڑائے ہوئے قیدی عبور کیا کرتے تھے ۔ سمندر کے قریب اس دریا پر اسی نام (Lamus) کا ایک شہر بھی آباد تھا۔

مآخذ: (۱) الطبری، طبع de Goeje، ۳: ۷۰۶، ۷۰۷، ۱۳۳۹، ۱۳۵۳، ۱۴۲۶، ۱۴۴۹، ۲۱۵۳، ۲۲۵۴، ۲۲۸۰؛ (۲) المَقْریزی: الخطَط، ۲: ۱۹۱ ببعد؛ (۳) البلاذُری: فتوح، ۱۹۸؛ (۴) ابن مسکویہ: تجارب الامم، ۶: ۴۸۶، ۵۳۲، در

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

Fragmenta Historicorum crabicorum، طبع de Goeje لائیڈن (۱۸۷۱ء)؛ (۵) ابن الاثیر: الکمل، طبع Tornberg، ۷: ۱۶؛ (۶) *N. E.* : Silvestre de Sacy، ۱۸۱۰ء، ج ۸، منقول درالمسعودی: مروج، ۹: ۳۵۶ تا ۳۶۲، ۳۷۵ عدد ۶۴ و ۶۵؛ (۷) المسعودی: تنبیه، ص ۱۸۹ تا ۱۹۶، مترجمۂ *Livre de* : Carra de Vaux *l'Avertisement*، ص ۲۴۱، ۲۵۵ ببعد؛ (۸) Huart ; *Histoire des Arabes*، پیرس ۱۹۱۳ء، ۲: ۱۱۸ ببعد: (۹) Fr. Beaufort : *Karamania*، ۱۸۱۷ء، ص ۲۴۴، فرانسیسی ترجمہ از Eyriés : *Caramanie*، پیرس ۱۸۲۰ء، ص ۱۸۳، ۲۳۳؛ (۱۰) V. Langlois : *Voyage dans la Cilicie*، پیرس ۱۸۶۱ء، ص ۱۰۵ (رومی کاریز کی تصویر).

(C. HUART)

لامعی: ترکی کے شاعر شیخ محمود بن عثمان بن علی النقاش کا تخلص۔ وہ سلطان سلیمان اوّل کے ابتدائی عہد کا مشہور صوفی مصنف اور شاعر تھا۔ یہ نہ صرف ترکی سلطنت کی انتہائی سیاسی ترقی کا زمانہ تھا، بلکہ اس دور میں علم و ادب کو بھی غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ لامعی بُرسہ [بورسہ] میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ سلطان بایزید کے خزانے کا دفتر دار تھا۔ تیمور لنگ اپنی یورش کے بعد اس کے دادا کو ماوراءالنہر لے گیا، جہاں اس نے نقاشی، زردوزی اور مصوری کا فن سیکھا۔ وہاں اس فن کا بہت چرچا تھا۔ لامعی کے دادا نے اپنی واپسی پر ایشیائے کوچک میں پہلی نقش دار زین سے عوام کو روشناس کیا۔ لامعی کا تصوف کی طرف میلان تھا۔ وہ ملّا آخوین اور ملّا محمّد بن الحاجی حسن زادہ سے دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد شیخ عارف باللہ سیّد احمد البخاری نقشبندی کا مرید ہو گیا۔ اس نے ساری زندگی صوفیانہ طور پر کامل سکون اور گوشہ نشینی میں گزار دی اور دنیوی تفکرات سے آزاد رہا، کیونکہ اسے سلطان سلیم اور سلطان سلیمان کی سرپرستی حاصل رہی جو اکثر اسے اور اس کے کثیر خاندان کو نوازتے رہتے تھے۔ وہ بُرسہ میں اپنی وفات ۹۳۸ یا ۹۴۰/ ۱۵۳۲ یا ۱۵۳۳ء تک تصنیف و تالیف ہی میں مشغول رہا اور بُرسہ کے قلعے میں اپنے دادا کی بنا کردہ مسجد میں دفن ہوا۔

اس کی تصانیف نثر و نظم تنوع اور خوبی کے اعتبار سے واقعی حیرت انگیز ہیں، لیکن اس کی تحریروں میں طبع زاد مواد کم ہے اور ترجمے و تضمینات زیادہ، جو اس دور کی خصوصیت تھی جس میں فارسی نمونوں کی غلامانہ تقلید کو تصنیف و تالیف کا انتہائی کمال سمجھا جاتا تھا۔ لامعی نے عموماً جامی کے کلام کی پیروی کی جو اس دور میں ایران کے مشہور ترین شاعر متصور ہوتے تھے۔ جامی کی تقلید کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں نقشبندی سلسلے سے وابستہ تھے؛ چنانچہ اس لحاظ سے لامعی کو ''جامی روم'' کہتے تھے۔ وہ تمام ترکی مصنفوں سے زیادہ پر نویس تھا۔ اس کی روحانی طرز کی نو مثنویاں یادگار ہیں۔ ترکی ادب میں لامعی کی خاصی اہمیت ہے مگر فان ہامر von. Hammer نے اس ضمن میں بہت مبالغے سے کام لیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب *Gesch. d. Osm. Dichtkunst* (۲: ۲۰ تا ۱۹۵) میں لامعی پر طویل ترین مقالہ لکھا ہے۔

لامعی کا طرز تحریر نسبتاً صاف اور سادہ ہے۔ اس میں اس بے جا عبارت آرائی کا کوئی نشان نہیں ملتا جو بعد کے دور کی نظموں پر قدما کی روش کی مصنوعی تقلید کی وجہ سے غالب ہے، لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ جو حسن و خوبی اس کے کلام میں ہے وہ زیادہ تر ان فارسی نمونوں کی وجہ سے ہے، جو اس کے پیش نظر تھے، اسی لیے ضیا پاشا نے اپنی

www.besturdubooks.wordpress.com

کتاب خرابات میں اسے ناقابل التفات سمجھا۔

شرف الانسان میں اس کی تصانیف کی تعداد ۴۴ دی گئی ہے، لیکن حقیقۃً وہ اس سے زیادہ ہے۔ اس کی تصانیف نثر میں حسب ذیل ہیں: جامی کی کتب تصوف کا ترجمہ: نفحات الانس (تراجم صوفیۂ کرام، جس کا ذیلی عنوان فتوح المجاهدین لترویح قلوب المجاهدین ہے) اور شواهد النبوة (مطبوعۂ قسطنطنیہ ۱۲۹۳ھ) "شرف الانسان" خود لامعی کے نزدیک اس کا شاہکار ہے اور یہ عربی کے رسائل اخوان الصفا کے بائیسویں جزو کا ترکی ترجمہ ہے۔ ان رسائل کی کل تعداد ۵۱ ہے اور اس جزو کا عنوان انسان اور حیوان کے مابین کشمکش ہے (طبع و ترجمہ از Dieterici، برلن ۱۸۸۵ء لائپزگ ۱۸۷۹ و ۱۸۸۱ء: *Thier und Mensch konige der Genien vor denr*۔ اس کی دینی کتابیں حسب ذیل ہیں: معما اسماء الحسنیٰ، خدا کے ۹۹ ناموں پر میر حسین نیشاپوری کے سو اشعار کا ترجمہ اور ان کی شرح اور مفتاح النجات فی خواص السور والآیات۔ اس نے کتب ذیل بھی لکھیں: مکتوبات کا ایک مجموعہ مسمّٰی بہ منشآت، شرح دیباچۂ گلستان سعدی، عبرت نما (حکایات اور تمثیلی کہانیوں کا ایک مجموعہ جو قسطنطنیہ میں لیتھو میں چھپا بلا تاریخ) اور مجمع اللطائف یا لطائف نامہ (ایک مجموعہ جو جرأت آمیز حکایات پر مشتمل ہے اور جو بالکل Boccaccio کی Decameron کے انداز پر ہے۔ لامعی کے بیٹے عبداللہ لامعی نے جو خود بھی مشہور شاعر تھا، اس کتاب کی تکمیل کی)۔ آخر میں خالص شاعری کی طرف توجہ کرتے ہوئے، اس نے دو مناظرے مخلوط نظم و نثر میں لکھے، (یہ انداز مناظرہ بعد میں بہت مقبول ہوا): ایک مناظرۂ بہاروشتا (گرمی و سردی میں مناظرہ)، مطبوعۂ قسطنطنیہ ۱۲۹۰ھ اس کتاب کا عنوان ہے "مناظرۂ سلطان بہاربا شہریار شتا) اور دوسرا مناظرۂ نفس و روح ہے۔

لامعی کی منظوم تصانیف میں جن کی اہمیت نسبۃً بہت زیادہ ہے، اس کا ضخیم دیوان ہے، جس میں تقریباً دس ہزار ابیات ہیں اور جس میں حسن کلام اور طبع زاد افکار کا وافر حصہ ہے۔ قصائد اور غزلیات کے علاوہ اس میں شہر انگیز بورسہ بھی شامل ہے (جو ۱۲۸۸ھ میں قسطنطنیہ میں علٰحدہ چھپا ترجمہ از Pfizmaier: *Verherrlic- hung der Engiz Bursa*، وی انا ۱۸۳۹ء۔

اس کی مثنویاں اثر دوام رکھتی ہیں۔ ان میں سے بعض کہانیاں فارسی روایات سے ماخوذ ہیں، اور انہیں عوام پسند رنگ میں پیش کیا گیا ہے، مثلاً سلامان وابسال (سلطان سلیم کے نام سے منتسب ہے) جو جامی سے اخذ کی گئی ہے اور ویسہ و رامین (سلطان سلیمان کے نام منتسب ہے) جو فخر جرجانی (م ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء) سے ماخوذ اور نظامی العروضی السمرقندی کا ترجمہ ہے؛ واسق و عذرا جس کا ترجمہ عنصری (م ۴۴۱ھ/۱۰۴۹ء) کی اصل فارسی مثنوی سے سلطان سلیمان کی خواہش پر کیا گیا (ترجمہ از von Hammer وی انا، ۱۸۳۳ء)، فرہاد نامہ (ترجمہ از von Hammer: *Stuttgart*، ۱۸۱۲ء)؛ ہفت پیکر (جس کی بنا ہاتفی کی ہفت منظر پر ہے، جو خود نظامی کی ہفت پیکر سے ماخوذ ہے)۔ اس نے دو تمثیلی ڈرامے 'گوی وچوگان' اور 'شمع و پروانہ' بھی لکھے (آخر الذکر شاید اہلی شیرازی کے فارسی اصل سے لیا گیا ہے)۔ ان کے علاوہ لامعی نے دو دینی مثنویاں بھی لکھی ہیں جن کے نام یہ ہیں: مقتل حضرت امام حسینؓ جس سے شیعیوں کے تعزیے کی یاد تازہ ہوتی ہے (نسخۂ خطی مصور در کتب خانہ عاشر (افندی، عدد ۲۴۹) اور منقبت (یامناقب) اویس القرنی۔

www.besturdubooks.wordpress.com

آخر میں اس کی سیاسی تمثیلیں ہیں، یعنی حسن و دل جو فتاحی نیشاپوری کی اصل فارسی اور آھی کے ترکی ترجمے سے لی گئی ہے اور جس کا ترجمہ، تشریح اور آھی کے ترکی ترجمے سے مقابلہ R. Dvorak نے کیا ہے، اور خرد نامہ اور جابر نامہ.

مآخذ: (۱) مذکورہ تصانیف کے علاوہ دیکھیے، سہی: ھشت بہشت، قسطنطنیہ ۱۳۲۵ء، ص ۵۰؛ (۲) لطیفی: تذکرہ، قسطنطنیہ ۱۳۱۴ھ، ص ۲۹۰ تا ۲۹۴؛ طاش کوپری زادہ: (۳) شقائق النعمانیہ، ترجمہ از مجدی، قسطنطنیہ ۱۲۶۹ھ، ص ۳۳۱ تا ۳۳۳، ۵۰۳؛ ترجمہ از O. Rescher، قسطنطنیہ ۱۹۲۷ء، ص ۲۸۰ تا ۲۸۱؛ (۴) اسمٰعیل بلیغ: گلدستۂ ریاض، بروسہ ۱۳۰۳ھ، ص ۱۷۶ تا ۱۸۰؛ (۵) محمد ناجی: اسامی، قسطنطنیہ ۱۳۰۸ھ، ص ۲۷۰؛ (۶) محمد ثریا: سجلّ عثمانی، قسطنطنیہ ۱۳۱۵ھ، ۴: ۸۶؛ (۷) سامی: قاموس الاعلام، ۵: ۳۹۷۳؛ (۸) بروسہ لی محمد طاہر: عثمانلی مؤلفلری، قسطنطنیہ ۱۳۳۳-۱۳۳۴ھ، ۲: ۴۹۲؛ (۹) Gibb: *A History of Ottoman Poetry*، ج ۳؛ (۱۰) Wickerhauser: *Chrestomathie*، وی انا ۱۸۵۳ء، ص ۳۷۹ تا ۳۸۱، ۳۰۵ تا ۳۰۸؛ (۱۱) Smirnow: *Obrazcovyja Proizwedenija Osmanskoj Literatury*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۰۳ء، ص xiv، ۲۳۸ تا ۲۴۱؛ (۱۲) Basmadjian: *Essai sur l'histoire de la litterature ottomane*، قسطنطنیہ ۱۹۱۰ء، ص ۴۵ تا ۴۶؛ (۱۳) برلن، وی انا، لنڈن، میونخ، گوتھا اور قسطنطنیہ وغیرہ کے قلمی نسخوں کی فہرستیں؛ (۱۴) حاجی خلیفہ: کشف الظنون، طبع Flügel، لائپزگ ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۸ء.

(TH. MENZEL)

⊗ **اللّان**: ایک قوم، اللّان وھی لآن قوم ہے جس کا قدیم اعراب نے الان نام رکھا تھا۔ اسی میں بطور سابقہ ال حرف تعریف لگا کر اللّان بنا لیا گیا۔ قفقار کے موجودہ Ossetians لوگ انھیں لوگوں کی یادگار ہیں۔ اسلامی فتوحات کے ابتدائی دور میں یہ لوگ کوہ کزبک کے ارگرد اَوَر (سَرِیر) کے مغرب اور جارجیا (جُرز) کے شمال میں آباد تھے۔ انھیں کے نام پر عرب درۂ دَرِیل کو باب اللان کہتے تھے۔ بعض عرب مصنفین (یاقوت اور ابوالفداء) نے قوم الان کا نام علان اور العلان لکھا ہے۔ بہر حال اسلامی مآخذ میں یہ نام بصورت الان (بالتخفیف) ابن الاعثم (الاعصم) الکوفی۔ دیکھیے Zeki Velidi Togan: *Ibn Fadlans Reiseberi Cht* - اور اللان (بالتشدید) (دیکھیے حدود العالم، طبع Facsimile، ورق ۳۸ الف و ناحیات اللان و دارالان) پایا جاتا ہے۔ انھیں لوگوں کا جو ایرانی النسل تھے، ایک اور نام آس بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ اس قبیلے کے ایک فرقے کا نام ہو۔ یہ دونوں نام یونانی اور لاطینی مآخذ میں اس قبیلے کے لیے استعمال ہوے ہیں، جو ارل خزر کے نواح میں آباد تھے (دیکھیے W. Tomaschek: *Kritik der ältesten Nachrichten über den Skythischen morden*، ۱: ۲۸۱)؛ Αλανάϱοη کے واسطے جن کی سکونت Moganor کے پہاڑی علاقوں میں دکھائی گئی ہے، دیکھیے اس مصنف کی *Zur historischen Topographie Von Persien* ۷۶ (Issoi 'Agiavoi') ایران کے مشرق میں بسنے والے قبائل اور بالخصوص طخاری قبیلے کے تاریخی مسائل میں دلچسپی لینے والے محقق الان اور آس قبیلے کے لوگوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں، جو خوارزم کے نواح اور عام وسطی ایشیا میں بستے تھے (دیکھیے G. Haloun: *Zur Uetsi Frage*, *ZDMG*، ۹۱، ورق ۲۴۳) - خوارزم کے نواح میں بسنے

www.besturdubooks.wordpress.com

والے الان قبائل کا ذکر ایرانی قصہ کہانیوں میں داخل ہو گیا (دیکھیے ایف ۔ دلف : *Glossar Zur Firdozi's Sch hnamee* بہ ذیل مادّۂ الن و الن دز)؛ چنانچہ آج کل بھی اس علاقے کے بعض جغرافیائی نام اس قبیلے کی یاد دلاتے ہیں (مثلاً *Alan-Kuduk* جو روسی نقشوں میں Barsakilmes کی دلدل کے پاس دکھایا گیا ہے) ۔ البیرونی کی تجدید نہایات الاماکن (فتح لائبریری کا واحد نسخہ عدد ۳۳۸۶) میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ الان اور اس قبائل نواحی خوارزم میں آباد تھے ۔ اس کا خیال ہے کہ دریاے آمو ازمنۂ قبل از اسلام میں نواح خوارزم سے گزر کر طاس Özboy پر بہتا ہوا بحیرۂ خزر میں جا گرتا تھا ۔ اس زمانے میں اس طاس کا نام ''مزدبست'' اور سارے علاقے کا نام ''ارض البعناکیہ'' (سرزمین پچناکیاں) تھا ۔ اس طاس مزدبست میں لان اور اس قبائل کے کچھ لوگ آباد تھے ۔ بعدہ جب دریاے آمو نے اپنی گزرگاہ بدلی اور وہ بحیرۂ ارل میں گرنے لگا جس سے مزدبست کا علاقہ خشک ہو گیا تو یہ لوگ گھر بار چھوڑ کر ساحل خزر پر جا آباد ہوے اس بات کے ثبوت میں کہ یہ قبائل اولاً ایرانی خوارزمیوں اور پچناکی ترکوں کے درمیان بستے تھے، البیرونی یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اس کے عہد میں وہ ایک ایسی زبان بولتے تھے جو خوارزمی اور پچناکی زبان سے مرکب تھی ۔

[.... تفصیل کے لیے دیکھیے ۷ لائیڈن بذیل مادّہ)].

مآخذ : (۱) J. Kulakovskiy : *Alani po Klass icheskim i Vizantiyskim istachnikam*، ۱۸۹۹ء؛ (۲) Bleichsteiner : *Das Volk dev Alanen Bertchte dis Fors chungsinstintutes F. Osten und Orient* ۲، Wien ۱۹۱۸ء؛ (۳) Hannes Skold : *Die Lund*، ۱۹۳۵ء؛ (۴) حدود العالم (طبع مع ترجمۂ انگریزی V. Minorsky : ۴۳۴)؛ (۵) ابھی حال ھی میں J. Marmatta : *Studies in the Language of the Iranian Tribes in South Russia, Acta Orientalic*، ۱ : بوڈا پسٹ ۱۹۵۱ء، ۲۶۱ - ۲۷۴ .

(A. Zeki Velidi Togan [و تلخیص از ادارہ])

besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

زیادات و تصحیحات

جلد ۱۷

زیادات

صفحہ	عمود	سطر	زیادات
۳۱۴	۱	۱۰ کے بعد	شیخ نظر محمد ثواقب المناقب کی تصنیف (۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء) سے پہلے وفات پا چکے تھے (شرافت نوشاہی : شریف التواریخ، مخطوطہ، ۳ : ۵۱۰)۔
۳۱۴	۱	۲۱ کے بعد	۔ ان کا انتقال ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء میں ہوا۔
۳۱۵	۱	۷ کے بعد	کنجاہ کی دیگر ممتاز شخصیات میں غنیمت کے چچا شیخ ابوالبقاء اور فارسی شاعر اور قاضی کنجاہ قاضی خوشی محمد کے علاوہ اولیا و مشائخ میں شیخ مٹھا مجذوب (م ۱۰۸۶ھ/۱۶۶۵ء)، اور میاں ادھم (مرید شاہ محمد غوثؒ)، شعرا میں لطف اللہ موہب، شیخ محمد زاہد قادری (دیوان مملوکہ شریف کنجاہی) اور موتی رام پروانہ اور انشا پردازوں میں منشی بھوج راج روشن بھی قابل ذکر ہیں۔

تصحیحات

صفحہ	عمود	سطر	غلط	صواب
۲	۲	۲۲	حضرث	حضرت
۱۴	۲	۳۰	ڈیفریری	ڈیفریمری
۱۵	۱	۲۷	سعد بن	سعدین
۲۱	۲	۲۳	مبنت کاری	منبت کاری

www.besturdubooks.wordpress.com

صفحہ	عمود	سطر	غلط	صواب
۲۲	۲	۲۸	حسین	حسن
۲۳	۱	۱	جعفر	جعفرالصادق
۲۳	۱	۱	محمد	محمد النقی
۲۴	۱	۴	اور عمارات پر	اور عمارت پر
۲۷	۱	۱	فَلَمّا	فَلَمّا
۳۰	۲	۱۱	یاب	باب
۳۱	۱	۸	ھے	ھیں
۳۱	۲	۲۳	جن جس میں	جن میں
۳۲	۲	۱۵	نوحں	نوحی
۳۲	۲	۱۹	البرمکی	البرمکی
۳۳	۲	۲۲	نہامہ	تہامہ
۴۳	۱	۱	خلیل	خیل
۴۳	۲	۲۶	نصحیت	نصیحت
۴۶	۲	۳۴	مدارس	مدراس
۵۶	۲	۸	بکانگو	کانگو
۸۴	۲	۸	اثباب	اثبات
۸۹	۱	۲	اشترکیۂ	اشتراکیۂ
۸۹	۱	۱۴	بالکار خود مختار	بالکل
۹۱	۱	۳۱	کر دیا گیا	کر دیا
۱۰۲	۲	۱	کا پرورش	پرورش
۱۰۳	۲	۲۴	کے متعلق	متعلق
۱۲۸	۲	۲۴	لمغرفة	لمعرفة
۱۳۵	۲	۸	۵۳ درجے	۹۳ درجے
۱۳۷	۲	۲۷	صنعتوں	صنعتوں
۱۴۴	۱	۲	قادم	تا دم
۱۴۵	۱	۱۹	بنو فارم	بنو دارم
۱۴۵	۱	۲۵	تہذیین	تہذیبیں
۱۴۶	۱	۱۹	علیھم، السماء	علیھم السماء
۱۴۷	۱	۲۶	ناصر الدین اللہ	ناصر لدین اللہ
۱۴۹	۱	۳۰	خیر آباد	خیر پور(میرس)
۱۴۹	۲	۱۷	مدینۃ الحسین اور مختصر	مدینۃ الحسین او مختصر

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

صفحہ	عمود	سطر	غلط	صواب
۱۴۹	۲	۱۸	تاریخ کربلا	تاریخ الکربلاء
۱۴۹	۲	۲۲	فاضل : تاریخ	مرتضی حسین فاضل : کربلا، تاریخ و تعمیر، در ہفت روزۂ رضاکار، لاہور، محرم ۱۳۹۱ھ
۱۵۴	۱	۴	جالی	جاتی
۱۶۱	۱	۲۹	ذکر ہے	ذکر کیا ہے
۱۷۴	۲	۲۱	چچا	چچا
۱۷۷	۱	۳۲	ور	اور
۱۸۵	۲	۲۵	کر	کو
۱۸۶	۲	۱۷	سے آئے	آئے
۱۸۷	۱	۱۲	ملاطیہ	ملطیہ
۱۸۹	۲	۷	ایژون	ایرون
۱۸۹	۲	۲۹	ملاطیہ	ملطیہ
۱۹۲	۲	۱۳	بارے	بارے میں
۱۹۶	۲	۸	رو	روسے
۱۹۹	۱	۱۶	سر دریا	سیر دریا
۲۰۲	۲	۱۵	غچنۂ	غنچۂ
۲۰۵	۱	۱۶	عربرن	عربوں
۲۱۱	۱	۱۹	قرأت	قراءت
۲۲۰	۱	۱۴	قاموس اعلام	قاموس الاعلام
۲۲۲	۱	۱۲	اریون	اریوان
۲۳۰	۱	۸	رائج تھے	رائج
۲۳۴	۲	۹	سنجاقوں	سنجاق
۲۳۷	۱	۸	ہیں	ہے
۲۴۹	۲	۱۲	ابیل	اپیل
۲۵۱	۲	۲	کے درمیان	درمیان
۲۵۳	۲	۲۱	کر دے گئے	کر دیے گئے
۲۵۵	۲	۳۲	کرنانک	کرناٹک
۲۷۳	۲	۳۱	وغیرہ ہم	وغیرہم
۲۷۴	۲	۲	مدتوں	مدتوں سے
۲۷۸	۱	۱۶	ملک بخارا	بخارا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

صفحہ	عمود	سطر	غلط	صواب
۲۸۱	۲	۳۰	یبغو	یبغوکے
۲۸۲	۱	۱۳	۱۵۰۰ فٹ	۱۵۰۰۰ فٹ
۲۸۷	۱	۲۶	اکثرت	اکثریت
۲۸۹	۲	۱۷	علحدہ	علیحدہ
۲۹۶	۲	۲۱	ابراھیم پہلے صدر۔	ابراھیم صدر
۲۹۹	۲	۲۹	۱۹۷۹ء	۱۹۷۸ء
۳۰۳	۲	۲	انھیں ان کی	انہیں کی
۳۰۵	۲	۱۰	جشتیہ	چشتیہ
۳۰۹	۲	۲۵	شرینی	شیرینی
۳۱۲	۲	۱۹	ے۔ غلام	غلام
۳۱۲	۲	۲۱	احمد اللہ	احمد اللہ
۳۱۹	۲	۱۴	گیا۔ بقول	بقول
۳۲۰	۲	۱۷	کی یوسف	یوسف
۳۲۰	۲	۲۵	انجیل	بائبل
۳۲۱	۲	۲۳	گیے	گئے
۳۲۴	۱	۲	خضرت	حضرت
۳۴۵	۲	۲۲	سوپ	سوپ ڈٹ
۳۵۴	۲	۲۹	لا الہ اللہ	لا الہ الا اللہ
۳۵۵	۲	۲۴	الاایجاد	الایجاد
۳۷۹	۲	۱۷	آباء اجداد	آباو اجداد
۳۹۸	۲	۱۴	سنمبل	سنبل
۴۱۳	۱	۲۳	۷۵۴ء	سمت ۸۱۰
۴۱۳	۲	۲۶	محمد بیگ لاھوری	احمد بیگ لاھوری
۴۱۳	۲/	۳۰	حولے	حوالے
۴۱۳	۲	۳۲	رسالۃ الاعجاز	رسالہ الاعجاز
۴۱۴	۱	۹	محمد اکرم	اس نامعلوم صاحبزادے
۴۱۴	۲	۱۰	دیون	دیوان۔
۴۱۴	۲	۲۴	(۱۲۰۱ - ۱۲۷۴ھ / ۱۸۳۵ - ۱۷۶۷ء)	(۱۲۰۱ھ/۱۸۳۵ء تا ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء)
۴۱۵	۱	۵	جس کے رقعات چھپ	جس کے رقعات چھپے
۴۳۳	۱	۱۲	[رک بہ]	[رک بآں]

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

صفحہ	عمود	سطر	غلط	صواب
۳۳۳	۲	۵	ھونی	ھونے
۳۴۸	۲	۱۱	منعت	منعت
۳۶۷	۲	۲۶	گُرْتنگ	گُرْنگ
۳۶۸	۱	۱۵	ضُمّ	ضمہ
۳۱۸	۱	۲۷	المنشور	المنشور
۳۸۶	۲	۲۳	بنائی جاتی	بنائے جاتے
۳۸۷	۱	۳۰	الایہ	الآیۃ
۳۹۱	۱	۳۱	پہنچاتے	پہچانتے
۳۹۸	۲	۲۲	وریلتانی	قورلتای
۵۰۰	۱	۲۹	لیتا	لینا
۵۰۲	۲	۱۹	کی آمد	آمد
۵۰۲	۱	۳۰	کیقباد معز الدین، شاہ دہلی	کیقباد، معزالدین : شاہ دہلی
۵۱۵	۲	۱	بھی	لبی
۵۲۳	۲	۱۲	سرکودہ	سرکودھا
۵۳۱	۲	۲۶	کی لحاظ	کے لحاظ
۵۵۶	۱	۲۵	قنقار	قنقاز
۵۶۵	۱	۲۲	وجہیہ	وُجیہ
۵۶۸	۱	۲۵	کورکانی حاکم اصفہان سے اپنی نے گفتگو میں	کورکانی نے حاکم اصفہان سے اپنی گفتگو میں
۵۶۸	۱	۳۱	پہلوی	پہلوی کی
۵۶۸	۱	۳۲	کی طرح کی	کی طرح
۵۷۵	۱	۸	توجیہہ	توجیہ
۵۷۵	۱	۲۳	جاعت	جماعت
۵۸۲	۲	۲۵	دارالسیات	دارالسیادت
۵۸۵	۱	۲۶	ایشا	ایشیا

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

فہرست عنوانات

(جلد ۱۷)

عنوان	صفحہ
ک	۱
کابل	۱
کاتب	۴
کاتب چلبی : رک به حاجی خلیفه	۶
کاتب رومی : رک به علی بن حسین	۶
کاتبی : شمس الدّین	۶
الکاتبی (دبیران)	۷
کات	۸
کارته	۱۰
کارتهیج : رک به قرطاجنه	۱۱
کاروان	۱۱
کاروان سرائے : رک به فندق	۱۲
کاروندل : رک به معبر	۱۲
کارون	۱۲
کازرون	۱۴
کازرونی	۱۴
کازموف : رک به قاسموف	۱۵
کاسا بلانکا : رک به دارالبیضاء	۱۵
الکاسانی	۱۵
کاستیوم : رک به لباس	۱۶
کاشان	۱۶
کاشانی : رک به عبدالرزاق	۱۷
کاشانی : حاجی میرزاجانی	۱۷
کاشغر	۱۸

عنوان	صفحہ
کاشف	۱۹
کاشفی : حسین واعظ	۲۰
کاشی	۲۱
الکاشی : جمشید بن مسعود	۲۲
کاظم خان شیدا : رک به پشتو	۲۲
کاظمی	۲۲
کاظمین	۲۲
کاغذ	۳۲
الکاف	۳۳
کافر	۳۳
کافرستان	۳۷
کافور (camphor)	۳۹
کافور : ابوالمسک الاخشیدی	۳۹
کاکا صاحب	۴۱
کاکویه (بنو)	۴۳
کالی کٹ	۴۶
کامران	۴۷
کامران شاه دُرّانی	۴۷
کامران میرزا	۴۷
کام روپ	۴۸
کامل	۴۹
الکامل : رک به الملک الکامل	۵۲
کانسو	۵۲
کانگو	۵۵

www.besturdubooks.wordpress.com

عنوان	صفحه
کانم	٥٩
کانم، بورنو	٦٠
کانو	٦٣
کانَ و کانَ	٦٤
کانُون	٦٤
کانی ابوبکر	٦٥
کاوین (کابین) : رک به مهر و نکاح	٦٧
کاهن : رک به الکهّان	٦٨
الکاهنه	٦٧
کائتانی	٦٨
کبائر	٦٩
کبتاشی : رک به استانبول	٧١
کبد	٧١
کبرد	٨٧
الکبریت	٨٩
کبکچی اوغلو مصطفی	٩١
کُبو	٩٢
کَبیر	٩٢
الکبیر : رک به الله؛ الاسماء الحسنی	٩٤
کبیر پنتهی	٩٤
کتاب	٩٤
کتاب الأسطقص	٩٦
کتاب الله : رک به قرآن	٩٧
کتاب الجلوة	٩٧
کتاب خانه	١٠٢
کتاب الفهرست : رک به النّدیم	١٠٨
کتابیات	١٠٨
کُتامه	١١٢
کتب سماویه : رک به انجیل؛ تورات: زبور؛ صحیفه؛ قرآن	١١٣
الکتبی : رک به ابن شاکر الکُتبی	١١٣

عنوان	صفحه
الکتانی	١١٣
کتخدا :	١١٣
کتمان : رک به تقیّه	١١٤
کتنگه	١١٤
کُتی	١١٧
کتک	١١٩
کتای (خطای) : رک به الصّین	١١٩
کثیر عزّة	١١٩
کچه	١٢١
کچهی	١٢٣
الکحل	١٢٣
کختا	١٢٧
کدمل	١٣٢
کر	١٣١
الکرّیسی	١٣٢
کراچی	١٣٣
کرامة	١٣٨
کراست علی	١٤٠
کرامرس (J. H. Kramers)	١٤٣
کربلاء	١٤٤
کرت	١٤٩
الکُرة	١٥١
کرج	١٥٣
کرج	١٥٥
الکَرخ	١٥٧
کرخا	١٦٠
الکرخی	١٦١
کرد : رک به اقریطش (Crete)	١٦٢
کُرد	١٦٢
کردستان	٢١٩
الکرّاز	٢٢٤

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

عنوان	صفحه
ترابية	٢٢٤
ترسون	٢٢٧
ترسی	٢٢٨
ترش : رك به كرج	٢٢٩
ترشونی	٢٢٩
ترشی	٢٣٠
ترك : رك به حصن الأكراد	٢٣٠
الكرك	٢٣٠
كركره لی	٢٣١
كركور	٢٣١
كركوك	٢٣٣
كرم	٢٣٦
كرماشتی	٢٣٨
كرمان	٢٣٩
كرمان شاه	٢٥٠
كرمانی : رك به خواجو كرمانی	٢٥٣
كرمسين : رك به كرمان شاه	٢٥٣
كرمة	٢٥٣
كرميان : رك به گرميان	٢٥٥
كرنانك	٢٥٥
كرنال	٢٥٦
كرنك : رك به الاقصر	٢٥٨
كرنكو (F. Krankow)	٢٥٨
كروجا : رك به كرولو	٢٥٩
كروسيدز : رك به صليبی جنگيں	٢٥٩
كرويا (قرويه)	٢٥٩
كريبية	٢٦٠
كريت : رك به اقريطش	٢٦١
كريم	٢٦١
كريم خان زند	٢٦٢
كريمر : رك به فان كريمر	٢٦٢

عنوان	صفحه
كريميا : رك به قريم	٢٦٣
كسائی : حكيم مجد الدين	٢٦٣
الكسائی (صاحب قصص الانبياء)	٢٦٣
الكسائی : علی بن حمزة	٢٦٥
كسب	٢٦٦
كسر	٢٦٧
كسر : رك به كسرة	٢٦٧
كسرة	٢٦٧
كسری	٢٦٧
كسف : رك به خسوف	٢٦٨
كسف : رك به كشف	٢٦٨
كسكر	٢٦٨
كسكس	٢٦٨
كسلة	٢٧١
كسوة : رك به كعبه؛ محمل	٢٧١
كسوف (و خسوف)	٢٧٣
كسيلة	٢٧٧
كش	٢٧٨
كشف	٢٧٩
كشكول	٢٨٠
كشم	٢٨٤
كشمير	٢٨٢
كشميری زبان و ادب	٣٠٧
كشيش طاغی	٣١٢
كعب (بنو)	٣١٣
كعب بن الأشرف	٣١٣
كعب بن جعيل التغلبی	٣١٥
كعب بن زهير	٣١٧
كعب رض بن مالك	٣١٨
كعب الأحبار	٣١٩
كعبة	٣٢١

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

عنوان	صفحه
کف	۳۳۵
کنارة	۳۳۶
کفالة	۳۳۶
کفر : رک به کافر	۳۳۷
کفرة	۳۳۷
کفة	۳۳۷
کفیل : رک به کفالة	۳۳۸
کلاب بن ربیعة	۳۳۸
الکلا بازی	۳۳۹
کلات نادری	۳۴۰
کلام	۳۴۰
کلانتر	۳۴۲
کلب	۳۴۳
الکلب	۳۴۵
کلب بن وبرة	۳۴۶
کلبرگة : رک به حسن آباد؛ گلبرگه	۳۴۸
الکلبی	۳۴۸
کلثوم بن عیاض القشیری	۳۴۹
کلک	۳۵۰
کلکته	۳۵۰
کلز	۳۵۳
کلمة	۳۵۴
کلوة	۳۵۶
کلة	۳۵۸
الکلی : رک به القلی	۳۶۰
کلیب بن ربیعه	۳۶۰
کلیدالبحر	۳۶۲
کلیلة و دمنة	۳۶۳
کلیم، ابوطالب	۳۷۲
کلیم الله	۳۷۹
(شاه) کلیم الله جهان آبادی	۳۷۹

عنوان	صفحه
الکلینی	۳۸۳
کماخ	۳۸۶
کمالک	۳۸۷
کمال پاشازاده	۳۸۷
کمال خجندی	۳۹۰
کمال الدین	۳۹۱
کمال الدین اسمٰعیل	۳۹۴
کمال الدین پارسی	۳۹۴
کمال رئیس	۳۹۷
کمال، محمد نامق	۳۹۸
کمان کش	۴۰۷
کمبایت (کهمبایت)	۴۰۹
کمبره جی : رک به خمبره جی	۴۰۹
الکمیت	۴۰۹
کنانة	۴۱۱
کنجاه	۴۱۳
کندوری	۴۱۵
کندة	۴۱۶
الکندی : ابو عمر محمد بن یوسف	۴۱۸
الکندی : ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق	۴۲۰
الکندی : عبدالمسیح بن اسحٰق	۴۲۲
کنعان	۴۲۳
کنعان پاشا	۴۲۴
کنفری	۴۲۶
کنکور	۴۲۸
کنور (کنانور)	۴۲۸
کنیة	۴۲۸
کنیسة	۴۲۹
کوئته	۴۳۸
کوئل : رک به علیگڑه	۴۴۳
کهار	۴۴۳

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

عنوان	صفحه
کوپری	۴۳۴
کوپری حصار	۴۳۴
کوپریلی	۴۳۵
کوپک	۴۳۲
کوتاهیه	۴۳۲
کوت العمارة	۴۳۳
کوتل	۴۳۴
کوٹ مٹھن	۴۳۴
اَلْکَوْثَر	۴۳۵
کوثی	۴۳۷
کوچک بیرام : رک به عیدالفطر؛ بیرام	۴۳۸
کوچک قینارجه	۴۳۸
کوچک (میرزا) وصال	۴۳۸
کوچم خان	۴۳۸
کورانی (گورانی)	۴۳۸
کور اوغلو	۴۵۰
کورمدفان	۴۴۱
کوزا	۴۵۱
کوزه گری : رک به فن	۴۵۲
کوسیم والده	۴۵۲
کوسه میخال	۴۵۳
کوشک	۴۵۳
کوطة : رک به کوتله	۴۵۴
الکوفة	۴۵۴
کوفیة	۴۵۸
کوکب	۴۵۹
کوکبان	۴۶۰
کوکبری	۴۶۱
کوکه	۴۶۲
کوکچه : رک به بدخشان	۴۶۲
کوکلتاش	۴۵۲

عنوان	صفحه
کولوم پشار	۴۶۶
کومبوک (قولوق)	۴۶۷
کومیة	۴۶۷
کونگ	۴۶۷
کورت	۴۶۸
کوهاٹ	۴۷۰
کوه بابا	۴۷۱
کوه مکلی	۴۷۲
کوه نور	۴۷۶
کوی	۴۷۹
الکویت	۴۷۹
کیانی : رک به حکایة؛ حدیث	۴۸۶
نهرباه	۴۸۶
اَلْکَهْف	۴۸۷
اَلْکَهّان	۴۹۰
کیا [کیایا] : رک به کتخدا	۴۹۵
کیخسرو (شاه ایران)	۴۹۵
کیخسرو (سلجوقی فرمانروا)	۴۹۶
کیسان	۴۹۹
کیسانیه	۵۰۰
کیقباد (شاه ایران)	۵۰۲)
کیقباد (سلجوقی فرمانروا)	۵۰۳
کیقباد (شاه دهلی)	۵۰۶
کیکاؤس (شاه ایران)	۵۰۷
کیکاؤس (دو سلجوقی فرمانروا)	۵۰۸
کیکاؤس بن سکندر بن قابوس بن وشمگیر	۵۱۲
کیل	۵۱۳
گ	۵۱۵
گابون	۵۱۶
گاردا فوئی	۵۱۸

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

عنوان	صفحہ
گرسیف	۵۱۷
گزرون : رک بہ کارزون	۵۱۸
گاگوز	۵۱۸
گاور : رک بہ گبر	۵۱۹
گاور طاغی	۵۱۹
گایوس	۵۱۹
گب (E. J. W. Gibb)	۵۱۹
گب (A. R. H. Gibb)	۵۲۰
گبر	۵۲۱
گبن	۵۲۱
گبن (E. Gibbon)	۵۲۱
گجرات (پاکستان)	۵۲۲
گجرات (بھارت)	۵۲۴
گجراتی	۵۳۸
گجرانوالہ : رک بہ گوجرانوالہ	۵۴۰
گدالہ	۵۴۰
گرامی، غلام قادر	۵۴۱
گرای	۵۴۲
گرج : رک بہ گرج	۵۴۳
گرجستان : رک بہ گرج	۵۴۳
گرچانی	۵۴۴
گردیزی	۵۴۴
گرہ	۵۴۵
گرگان : رک بہ جرجان	۵۴۵
گرگانج	۵۴۵
گرم سیر	۵۴۷
گرمیان اوغلو	۵۴۷
گزولی : رک بہ جزولی	۵۴۸
گزہ : رک بہ غزہ	۵۴۸
گکھکھڑ :	۵۴۸
گل	۵۵۱

عنوان	صفحہ
گل بابا	۵۵۳
گلبدن بیگم	۵۵۳
گلبرگہ : رک بہ احسن آباد	۵۵۴
گلپایگان	۵۵۴
گل خانہ	۵۵۴
الگلدکی	۵۵۵
گلڈ (Guild) : رک بہ صنف	۵۵۵
گلزار عبدالعلی	۵۵۵
گلستان (کتاب)	۵۵۵
گلستان (مقام)	۵۵۶
گلشنی : (ایک شاعر)	۵۵۶
گلشنی (شیخ ابراھیم)	۵۵۶
گلگت	۵۵۷
گمرون	۵۵۸
گناہ : رک بہ سیئۃ	۵۵۸
گنج شکر : رک بہ فریدالدین گنج شکر	۵۵۸
گنج العلوم عین الدین : رک بہ عین الدین	۵۵۸
گنجہ	۵۵۸
گندو : رک بہ پل	۵۵۹
گندھارا : رک بہ قندھار	۵۵۹
گنڈاپور	۵۵۹
گنگا	۵۵۹
گنی	۵۶۰
گو : رک بہ گوگو	۵۶۱
گواد (Guad) : رک بہ واد، وادی	۵۶۱
گوالیار	۵۶۱
گوجر (گجر، گجر)	۵۶۲
گوجرانوالہ	۵۶۵
گورخان	۵۶۶
گوردوس	۵۶۷
گورگانی	

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

عنوان	صفحه
گوژ	۵۶۹
گوک آلپ ضیا	۵۷۰
گوک تپه	۵۷۳
گوکچای	۵۷۳
گوکسون	۵۷۳
گوک صو	۵۷۳
گوکلان	۵۷۴
گوگو	۵۷۴
گول	۵۷۶
گولته	۵۷۶
گولت سیهر (I. Goldziher)	۵۷۶
گولدن هورد : رك به قپچاق؛ مغل؛	۵۷۷
گولژوی : رك به گولژه شریف	۵۷۷
گولژه شریف	۵۷۷
گولک بوغاز	۵۷۹
گولکنده	۵۷۹
گوم	۵۸۰
گوش خانه	۵۸۰
گومل	۵۸۱
گوهر شاد آغا (بیگم)	۵۸۱
گهیبا	۵۸۳
گیخاتو	۵۸۳
گیزه (جینزه)	۵۸۵
گیسودراز	۵۸۵
گیکا (گیفه، گیفه) : رك به آروولق	۵۸۸
گیلان	۵۸۸
ل	۵۹۰
اللّات	۵۹۱
لاذقیه	۵۹۳
لاذیق	۵۹۷
لار	۵۹۸
لاردہ	۶۰۰
لارنده	۶۰۱
لاری	۶۰۱
لاز	۶۰۳
لازار (لعزر)	۶۰۴
لاله زانی : رك به محمد لاله زاری	۶۰۶
لام : رك به ل	۶۰۶
لام، بنو	۶۰۶
لامس صو	۶۰۷
لامعی	۶۰۹
اللّان	۶۱۱

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

ناشر ..... مسٹر عبدالقادر قریشی، رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور

مقام اشاعت ..... لاہور

سال طباعت ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء

مطبع ..... جدید اردو ٹائپ پریس، ۳۹ چیمبرلین روڈ، لاہور

طابع ..... مرزا نصیر بیگ، ناظم مطبع

..... صفحہ ۱ تا ۶۴

مطبع ..... مطبع عالیہ، ۱۲۰۔ ٹمپل روڈ، لاہور

طابع ..... سید اظہار الحسن رضوی، ناظم مطبع

..... صفحہ ۶۵ تا ۱۲۶

مطبع ..... نیو لائٹ پریس، ۳۰۔ افتخار بلڈنگ بہاول شیر روڈ، چوبرجی، لاہور

طابع ..... چوہدری محمد سعید، ناظم مطبع

..... صفحہ ۱۲۷ تا ۳۸۴

مطبع ..... پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور

طابع ..... :مسٹر جاوید اقبال بھٹی، ڈی جی آرنیکنالوجی، اے ایم آئی او پی (لندن) ناظم مطبع

..... صفحہ ۳۸۵ تا آخر و سرورق

بار ثانی: مئی ۲۰۰۴ء/ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ

زیر نگرانی: ڈاکٹر محمود الحسن عارف

www.besturdubooks.wordpress.com

besturdubooks.wordpress.com

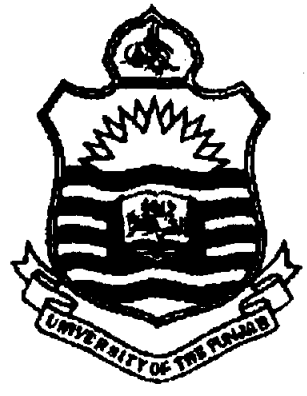
Urdu

Encyclopaedia of Islam

Under the Auspices

of

THE UNIVERSITY OF THE PUNJAB LAHORE



Vol.17

(Kaaf ..... Allan)

Reprint..... May 2004/ Rabi-II. 1425

www.besturdubooks.wordpress.com